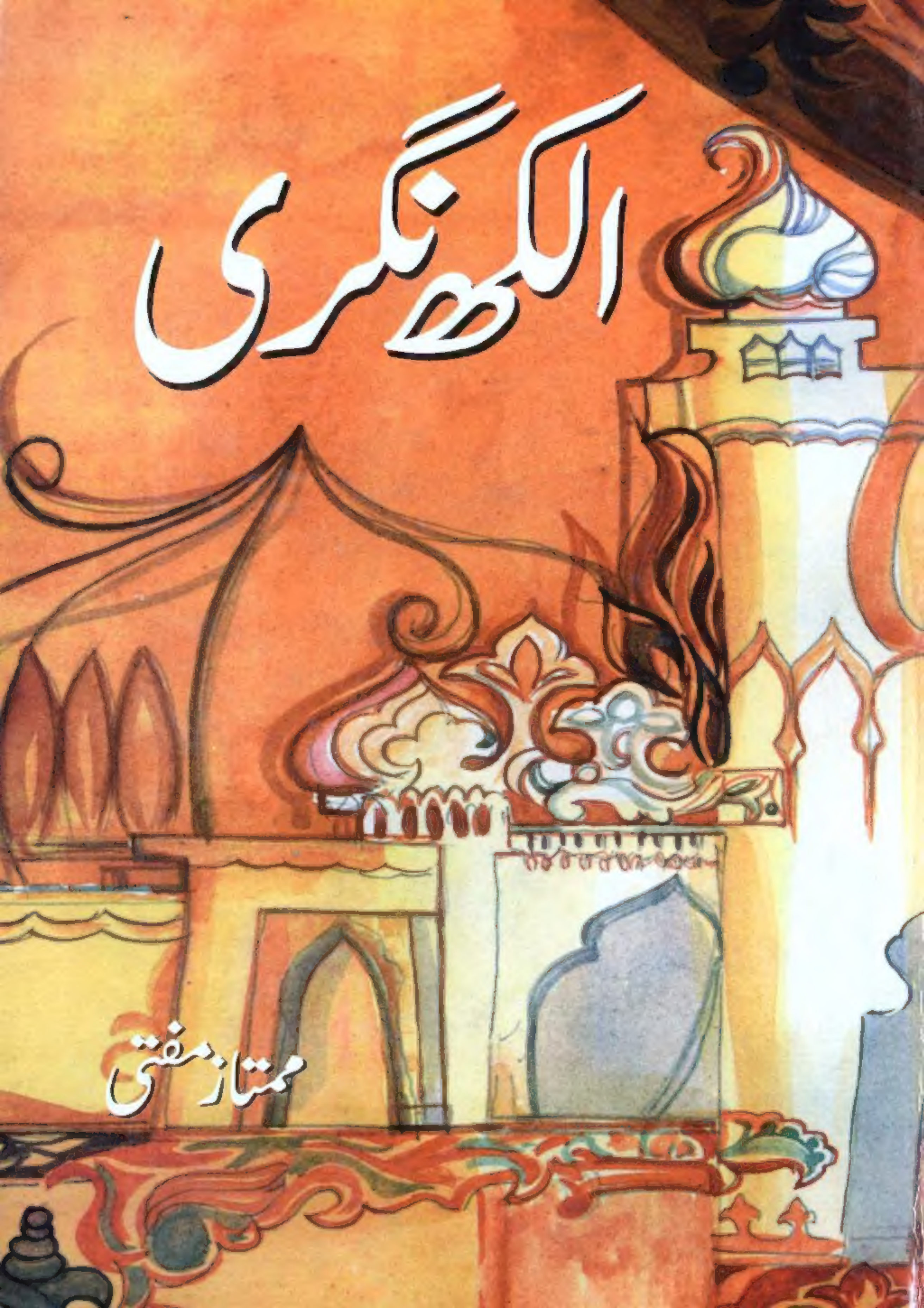

الکھ نگری
ممتاز مفتی

الکھ نگری

"علی پور کا ایلی" کا دُوسرا حصّہ

ممتاز مفتی

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
اُردو بازار لاہور

الٰہی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ISBN-969-503-077-7

اکتوبر 2001ء
محمد فیصل نے
زاہد بشیر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت: =/550 روپے

محترمہ ڈاکٹر عفت شہاب

محترم خواجہ جان محمد بٹ

محترم سید سرفراز شاہ

کے نام

جن کی کرم نوازیوں نے

مجھے کیا سے کیا بنا دیا

ممتاز مفتی

۱۹۹۲ء

پہلی بات

مفتی کوئی ذات نہیں بلکہ خاندان مفتیاں اپنے لکھنے لکھانے کی صفت کی وجہ سے مشہور تھا جو بادشاہوں، راجوں، مہاراجوں کے درباروں سے وابستہ لکھنے لکھانے کا کام کرتے تھے۔ درباروں میں تاریخی حالات وواقعات، احکاماتِ شاہی لکھنے والے یہ قلم کار لکھنے کے اس حد تک عادی تھے کہ گھر میں بھی اپنے معمولات زندگی کو لکھ کر (Document) کرلیا کرتے تھے۔ ممتاز مفتی کے والد مفتی محمد حسین گھر میں موجود آلو پیاز کی تفصیلات بھی لکھ لیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے لکھنے لکھانے کی یہ موروثی صفت ممتاز مفتی کو بھی منتقل ہوئی مگر اس کے ساتھ ہی حالات وواقعات کی تبدیلی کا ایک انتشار بھی انہیں سہنا پڑا۔ قیام پاکستان، ہندو مسلم فساد، بے گھر ہو کر دربدر کی ٹھوکریں، خونی رشتوں اور باپ سے بغاوت، ہجرت، پھر اپنے وطن میں مسلسل سیاسی عدم استحکام اور سب سے بڑھ کر اخلاقی، سماجی اور معاشرتی قدروں میں یک دم اتنی بڑی تبدیلی، غرض یہ کہ ممتاز مفتی کو تبدیلی زمانہ کے بہت بڑے بڑے تھپیڑے کھانے پڑے۔ غصہ تو ان میں تھا ہی، پھر تبدیلی کی اتنی بڑی لہر نے باپ سے بغاوت کو رشتے داروں، معاشرے، سماج اور سکہ بند روایات سے بغاوت تک پھیلا دیا اور ان کی ساری زندگی اسی لڑائی اور بغاوت کو نبھاتے گزر گئی۔ یہ ان کی معاشرے کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔

ممتاز مفتی کے لکھے کو یہ داد تو دینی پڑے گی کہ ان پر جو بیتی وہ انہوں نے کسی لگی لپٹی کے بغیر سچ سچ لکھ دی۔ لوگوں کا خیال ہے یہ قصے کہانیاں ہیں۔ میں بھی، جو ہر واقعے کو دلیل، عقل اور سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی ہوں، پہلے میرا بھی یہی خیال تھا اور میں شرماتا رہتا تھا۔ اس کی حقیقت تو اس وقت کھلی جب میں نے ان کی وفات کے بعد ان کی ذاتی ڈائریاں دیکھیں۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بڑا تفصیلی روزنامچہ لکھنے کے عادی تھے حتیٰ کہ یہ تک لکھ لیتے تھے کہ آج کون سی دوا کتنی مقدار میں کھائی۔ ان کی ڈائریاں پڑھ کر ''علی پور کا ایلی'' اور ''الکھ نگری'' میں درج واقعات کی کڑیاں ملتی چلی گئیں اور مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ نہیں یہ محض داستان آرائی نہیں۔ ممتاز مفتی حقیقتاً باغی آدمی تھا اور اس نے اپنی اس سرشت کو اپنی آپ بیتی میں بڑی شدت سے برتا اور

رواج سے ہٹ کر نتائج سے بے پرواہو کر اور اپنی ذات پر کوئی ملمع چڑھائے بغیر وہ لکھ دیا جو حقیقت تھی۔ اس انکشاف حقیقت کے بعد مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اگر میں نے حالات و واقعات کی کڑیاں ملاتی ہوئی ان کی یہ ڈائریاں ان کے چاہنے والوں اور ان پر اعتراض کرنے والوں تک نہ پہنچائیں تو یہ بہت بڑی بددیانتی ہوگی۔ ممتاز مفتی کی ڈائریاں کتابی صورت میں مرتب کر کے میں اس بوجھ سے جلد از جلد آزاد ہونا چاہتا ہوں۔

ممتاز مفتی باغی آدمی تھا۔ سب سے پہلی بغاوت اس نے اپنے باپ کے خلاف کی اور اس کا احوال اپنی آپ بیتی ''علی پور کا ایلی'' میں لکھ دیا۔ وہ پہلی خودنوشت ہے جسے اردو کا گُرو گرنتھ کہا گیا ہے۔ دوسری بغاوت معاشرے کے خلاف تھی جس کا احوال اپنی دوسری آپ بیتی ''الکھ نگری'' اور ''تلاش'' میں لکھا جو ممتاز مفتی کی تلاش خدا کی روئیداد ہے۔ ان کی کتابوں ''گہما گہمی''، ''چپ'' اور ''اسمارائیں'' میں شامل افسانے جن کو لوگ جنسی کہانیاں بھی کہتے ہیں دراصل ایسے نفسیاتی افسانے ہیں جو معاشرے کے خلاف ان کی بغاوت کی عکاسی کرتے ہیں۔

قبل ازیں مفتی صاحب کی کتب دیگر ادبی پبلشرز کے تحت شائع ہوتی رہی ہیں۔ بعدازاں میں نے محسوس کیا کہ ممتاز مفتی کو پڑھنے والوں میں صرف ادیب و شاعر حضرات ہی نہیں بلکہ صوفی ازم اور اسلام کو پڑھنے والے لوگ اور عام لوگوں میں بھی ممتاز مفتی کی کتابیں یکساں مقبول ہیں۔ خاص طور پر ان کی کتابیں ''لبیک'' اور ''تلاش'' عام نظر آتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ ممتاز مفتی کی کتابوں کے لیے میں نے الفیصل ناشران کے محمد فیصل صاحب کا انتخاب کیا ہے جو نہ صرف ادبی کتابوں کے ناشر کے طور پر بلکہ اسلامی کتابوں کی اشاعت کے حوالے سے بھی بڑے پبلشر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ممتاز مفتی کی بیشتر کتابیں فیصل صاحب ہی شائع کر رہے ہیں۔

عکسی مفتی

۷ جنوری ۲۰۰۱ء۔ اسلام آباد

کتاب کی بات

یہ کتاب میری آپ بیتی 'علی پور کا ایلی' کا دوسرا حصہ ہے۔ علی پور کا ایلی میں 'میں نے یہ بات چھپائی تھی کہ میں ہی ایلی ہوں۔ پھر بھید کھل گیا اور میں نے تسلیم کر لیا کہ میں ایلی ہوں۔

الکھ نگری میری آپ بیتی کا دوسرا حصہ ہے جو ۱۹۴۷ء سے شروع ہو کر آج تک کے عرصے پر مشتمل ہے۔

علی پور کا ایلی میں میرا سب سے بڑا مشاہدہ عورت تھی۔

الکھ نگری میں میرا سب سے بڑا مشاہدہ قدرت اللہ ہے۔

علی پور کا ایلی میں نے احتجاجاً" لکھی تھی۔ اردو ادب میں جتنی بھی خود نوشتیں تھیں سب دھلی دھلائی 'کلف لگی' استری شدہ تھیں کوئی لکھنے والا اپنی کمیوں' کجیوں اور کج رویوں کی بات نہیں کرتا تھا۔ میں نے سچی باتیں لکھنے کا تہیہ کیا اور علی پور کا ایلی وجود میں آئی۔

جب میں نے الکھ نگری لکھنے کا ارادہ کیا تو میرے دوست اور ساتھی بگڑ گئے۔ کہنے لگے ' بے شک تم سچ کہنے کے زعم میں اپنے غلیظ پوتڑے چوک میں بیٹھ کر دھوؤ' لیکن خبردار ہمارا ذکر نہ کرنا۔

اس پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ الکھ نگری نہیں لکھوں گا۔

قدرت اللہ کی وفات کے بعد جب شہاب نامہ شائع ہوا اور میں نے آخری باب "چھوٹا منہ بڑی بات" پڑھا تو حیران رہ گیا کہ قدرت اللہ نے اپنی زندگی کی چوتھی سمت کا راز کیسے کھول دیا۔ راز کھولنا تو اس کی سرشت میں نہ تھا۔ اس پر کچھ دانشوروں نے کہا کہ آخری باب قدرت اللہ نے نہیں لکھا' بلکہ اس کے حواریوں نے لکھ کر شہاب نامے میں شامل کر دیا ہے۔

اگر قدرت اللہ شہاب نامہ میں آخری باب کا اضافہ نہ کرتا تو میں الکھ نگری لکھنے پر مجبور نہ ہوتا۔

میں قدرت اللہ سے اس لیے متاثر نہیں ہوا تھا کہ وہ بزرگ تھا یا اس لیے کہ اس کی زندگی میں چوتھی سمت کو دخل حاصل تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ بڑا انسان تھا۔ اس کا مسلک محمد ہڈ (Mohammad Hood) تھا۔

وہ قدم اٹھانے سے پہلے سوچا کرتا تھا کہ ایسے حالات میں حضور ﷺ کا رد عمل کیا ہوتا۔ اس کے نزدیک افضل ترین عبادت (Identification with Mohammad) تھی۔

اس کتاب کے پہلے تیئس باب ایلی کی زندگی کا تسلسل ہیں۔ اس کے بعد میری زندگی میں کایا پلٹ قسم کی تبدیلی واقعہ ہوئی اور پھر باقی زندگی قدرت اللہ شہاب کے گرد گھومتی رہی۔

اس کتاب میں واقعات کو تسلسل کے مطابق نہیں بلکہ موضوعات کے مطابق تحریر کیا گیا ہے۔ تسلسل کے مطابق لکھتا تو یہ کتاب ڈائری کی شکل اختیار کر لیتی۔ یہ بات مجھے پسند نہ تھی۔ موضوعات کے مطابق لکھنے میں کہیں کہیں زمان و مکان کی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔

۱۹۵۶ء سے میں نے باقاعدہ ڈائری لکھنی شروع کی تھی۔ اس کتاب کا قدرت اللہ شہاب سے متعلق حصہ ان ڈائریوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

میں نے اپنی دیگر تحریروں میں اپنی آپ بیتیوں کا جگہ جگہ تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں مجھے ان واقعات کو دھرانا پڑا۔ یہ ایک مجبوری تھی۔

دیباچہ برائے بار دوم

۱۹۹۵ء

گذشتہ تین سال کے دوران مجھے الکھ نگری کے متعلق اتنے خطوط موصول ہوئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ گراں قیمت ہونے کے باوجود اتنے لوگوں نے الکھ نگری کا مطالعہ کیا ہے۔

مجھے حکم ہے کہ ہر خط کا جواب لکھو لیکن خط و کتابت کی عیاشی میں پڑنے سے گریز کرو۔ مجھے ہر ہفتے تقریباً" پندرہ بیس خط موصول ہوتے ہیں۔ بیشتر خطوں میں الکھ نگری کے حوالے سے سوال پوچھے جاتے ہیں۔

درحقیقت میں الکھ نگری سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک یہ کہ یہ کتاب میں نے ہسپتال میں مکمل کی تھی مجھے یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ شاید میں کتاب مکمل نہ کر سکوں۔ اسی وجہ سے میں اسے "رش" کرنے پر مجبور تھا۔ دوسری وجہ ظاہر ہے کہ ایک اتنے بڑے انسان کا احاطہ کرنے کے لئے میرا قلم بہت چھوٹا تھا۔

قدرت اللہ کئی ایک سطحوں پر جیتے تھے۔ میں صرف ایک سطح تک محدود تھا۔

سیانے کہتے ہیں قرآن حکیم کا ہر لفظ' مفہوم کے حوالے سے گلاب کے پھول کے مانند ہوتا ہے' ایک پنکھڑی اٹھاؤ تو نیچے ایک اور پنکھڑی ہوتی ہے۔ اسے اٹھاؤ تو نیچے ایک اور پنکھڑی ہوتی ہے' پنکھڑی در پنکھڑی" مفہوم در مفہوم۔ یہی حال بزرگوں کا ہے وہ بیک وقت کئی ایک سطحوں پر جیتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے مفتی صاحب! عقیدت کوئی اچھی چیز نہیں اس میں شدت ہے اور شدت کوئی اچھا وصف نہیں آپ عقیدہ پالیے چونکہ عقیدے میں توازن ہے۔

جواب میں میں ان سے کہا کرتا تھا کہ شہاب صاحب میرے اندر تو عقیدت ہی عقیدت ہے

شدت ہی شدت۔ میں عقیدے اور توازن سے محروم ہوں۔ جو چیز میرے اندر ہی موجود نہیں وہ میں کیسے پال سکتا ہوں۔

شہاب صاحب عام بزرگوں کی طرح نہ تھے وہ دانشور بزرگ تھے۔ وہ محبت کو برداشت کرنا جانتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ ٹیڑھی لکڑی کو زبردستی سیدھا کیا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔

لگتا ہے وفات کے بعد وہ زیادہ فعال ہو گئے ہیں زیادہ پر اثر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے میرے دل میں وہم پیدا کر دیا کہ جب تک میں عقیدے پر کتابچہ نہ لکھوں گا تجھے چھٹی نہیں ملے گی۔

چونکہ میں جاننا چاہتا ہوں اس لئے مجبوراً" میں نے عقیدے کا مطالعہ شروع کر دیا۔

مشاہیر نشرو اشاعت کا خیال ہے کہ شہاب نامہ گذشتہ پانچ سال میں بیسٹ سیلر (Best Seller) رہا ہے ایک اندازے کے مطابق گذشتہ پانچ سال میں شہاب نامے کی ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ اسلام آباد کے ایک مقامی کتب فروش کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے ساڑھے چار ہزار جلدیں فروخت کی ہیں۔

شہاب نامے کے حوالے سے الکھ نگری کی فروخت میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

سنگ میل نے الکھ نگری کی پہلی ایڈیشن جو دو ہزار کاپیوں پر مشتمل تھی ۱۹۹۴ء میں بڑی محنت اور محبت سے شائع کی تھی۔ دوسری ایڈیشن انہیں دسمبر ۱۹۹۴ء میں شائع کرنی چاہیے تھی لیکن سنگ میل کا مصنف کے ساتھ معاہدہ کرنے کا رویہ بدل گیا ہے' معاہدے میں وہ کاپی رائٹ کو رہن رکھ لیتے ہیں۔ یہ بات مجھے گوارہ نہ تھی ——— اس پر قدرت اللہ نے گورے کو میرے پاس بھیج دیا۔ لہٰذا اب دوسری ایڈیشن طاہر اسلم گورا اپنے اشاعتی ادارہ گورا پبلشرز' پیش کر رہے ہیں۔

ممتاز مفتی

جون' ۱۹۹۵ء

مندرجات

۴ - کرشن نگر

۵ - راول دیس

۶ - خواجہ جان محمد بٹ

۷ - قدرت اللہ شہاب

۸ - 007

۹ - ہالینڈ

۱۰ - عزیز و اقارب

۱۱ - واپسی

۱۲ - دیس نکالا

۱۳ - رسمی معمولات

۱۴ - آخری ایام

۱۵ - ضمیمہ (خطوط)

ممتاز مفتی (۱۹۴۷ء)



ممتاز مفتی ڈاکٹر اشفاق حسین (ہومیو) ۱۹۸۶ء

پاکستان

1

۱۔ ہُوں نہیں ہُوں
۲۔ ۲۶ ہنڈنیاں
۳۔ پرمیلا، پرمیتمے، شکنتلا
۴۔ شاہ کاکو کا بالکا



خورشید بیگم (بیگم اشفاق حسین)



احمد بشیر   ممتاز مفتی   اشفاق حسین (۱۹۴۴ء)

پہلا باب

ہوں نہیں ہوں

رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ میں ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان کیوں چلا آیا؟ حالانکہ بمبئی میں مجھے چار ایک کانٹریکٹ مل چکے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ہزاروں روپے کمانے کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود میں بمبئی میں مطمئن نہیں تھا۔ سہاسہا۔ اکھڑا اکھڑا۔

لاہور پہنچ کر میں یوں مطمئن ہو گیا تھا جیسے پنچھی گھونسلے میں آ بیٹھا ہو۔ حالانکہ لاہور میرا کوئی گھر نہ تھا' ذریعہ معاش نہ تھا' کیا میں اس لیے مطمئن ہو گیا تھا کہ پاکستان میں آ گیا تھا۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ مجھے پاکستان سے کوئی لگاؤ نہ تھا' میں نے کبھی پاکستان کو اپنایا نہ تھا۔ جب قیام پاکستان کی تحریک چل رہی تھی تو میں حیران ہوا کرتا تھا کہ مسلمان پاکستان بنانے کے لیے کیوں بے تاب ہو رہے ہیں۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح شعور تھا کہ ہندوؤں کے دل مسلمانوں کے خلاف تعصب سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ مسلمان کسی میدان میں آگے بڑھیں' ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا ہندو اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود مجھے قیام پاکستان سے قطعی ہمدردی نہ تھی۔ شاید اس لیے کہ میں نے خود کو کبھی مسلمان نہ سمجھا تھا۔ میں برائے نام مسلمان تھا۔ مردم شماری کا مسلمان۔

میرے دل میں ہندوؤں کی بڑی عزت تھی۔ بحیثیت قوم وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان میں عجز تھا' مٹھاس تھی' تحمل تھا' رکھ رکھاؤ تھا' استقامت تھی۔ وہ مسلمانوں کی طرح جذباتی نہ

تھے۔ جوش میں نہیں آتے تھے۔ اپنی موم بتی دونوں سروں پر جلانے کے شوقین نہ تھے۔

میرے ذہن میں سیاست کا خانہ سرے سے خالی ہے۔ سیاسی خبروں سے مجھے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی۔ سرسری طور پر سرخیاں پڑھ لیتا اور متن کو نظرانداز کر دیتا۔ مسلمانوں کے اخبارات جذبات میں رنگے ہوتے تھے اس لیے میں روزنامہ ٹریبون پڑھا کرتا تھا۔

قائد اعظم مجھے پسند نہ تھے۔ ان میں عجز نہ تھا۔ خالی وقار ہی وقار اور پھر اس قدر خود اعتمادی اور اصول پرستی' اصول انسان کے لیے بنتے ہیں۔ انسان اصولوں کے لیے نہیں بنا۔ سب سے بڑھ کر مجھے یہ اعتراض تھا کہ قائد طبعاً" سیکولر تھے۔ مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے' لیکن اسلام سے باخبر نہ تھے۔ شخصیت پر اسلام کا رنگ نہ تھا۔

مغربی مفکر

درحقیقت میں خود سیکولر خیالات کا مالک تھا۔ مذہب کو اچھا نہیں جانتا تھا۔ اپنے مذہب پر شرمسار تھا۔ میرے دل میں شک و شبہات یوں بھن بھن کرتے جیسے بھڑوں کا چھتا لگا ہو۔ یہ چھتا میں نے بڑی محنت سے پالا تھا۔ مغربی علماء نے میری رہبری کی تھی۔

کالج میں میں ایک نالائق لڑکا تھا۔ مشکل سے بی اے پاس کیا تھا۔ پھر محبت کا ایک بہت بڑا بلبلا پھٹا تو غم غلط کرنے کے لیے اتفاقاً" میرے ہاتھ کتاب لگ گئی اور میں مطالعے میں ڈوب گیا۔ یہ ایک راہ فرار تھی۔ علم حاصل کرنا مقصود نہ تھا۔

اس زمانے میں اردو کی کتابیں عام نہ تھیں۔

سکولوں میں اردو صرف آٹھویں جماعت تک پڑھائی جاتی تھی۔

نویں جماعت میں اردو زبان لازمی نہ تھی۔

کالجوں میں اردو زبان سرے سے رائج ہی نہ تھی۔

مشرقی زبانوں کی درسگاہیں الگ تھیں۔

ایم اے' ایم او ایل کرنے کے بعد صرف انگریزی میں بی اے پاس کرنا پڑتا تھا۔ پھر کہیں بی اے کی ڈگری حاصل ہوتی تھی۔

ایسے طلباء کو جو مشرقی علوم کے بعد بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرتے تھے۔
از راہِ تمسخر۔ وایا بھٹنڈا کہا جاتا تھا۔
میں مشرقی زبانوں اور ادب سے قطعی طور پر کورا تھا۔
اس لیے میرا مطالعہ صرف انگریزی تک محدود تھا۔
اس کے علاوہ چونکہ اس کی حیثیت فرار کی تھی۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ سمت نہ تھی۔
اس مطالعہ سے مجھے صرف ذہنی آوارگی حاصل ہوئی۔ میرے خیالات سیکولر ہو گئے اور میں مذہب سے دور ہوتا گیا۔

اللہ میاں

میرا ذہن مغربی مفکروں نے ترتیب دیا تھا۔ جس گھر میں میں نے پرورش پائی تھی۔ وہاں خدا کا نام بچوں کو ڈرانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اماں کہتیں نہ نہ یہ نہ کرو اللہ میاں ناراض ہوں گے۔ دادی اماں کہتیں ایسا کرو گے تو اللہ میاں غصے ہوں گے۔

ان دنوں میرے ذہن میں جو اللہ کا تخیل تھا اس میں دو باتیں پیش پیش تھیں ایک تو اللہ میاں بہت بڑے تھے۔ بڑے زبردست تھے دوسرے وہ بڑے زود رنج تھے بات بات پر ناراض ہو جایا کرتے' لیکن اللہ میاں کی ناراضگی کی دھونس بڑوں پر نہیں صرف بچوں پر چلتی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ گھر میں کبھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ میاں اس بات پر خوش ہوتے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اللہ میاں خوش ہونا جانتے ہی نہ تھے۔

مکتب میں داخل ہوا تو وہاں جا کر اللہ میاں کی ایک اور بات ظاہر ہوئی۔ پتہ چلا کہ اللہ میاں نے ایک دوزخ تخلیق کر رکھا ہے۔ انہوں نے ایک بہت بڑی بھٹی تیار رکھی ہے اور ان کا واحد شغل یہ ہے کہ بندوں کو پکڑ پکڑ کر اس بھٹی میں ڈالتے جائیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جوانی میں میں ذہنی طور پر اللہ کا منکر رہا اور جذباتی طور پر اللہ سے خوف زدہ رہا۔ مشکل یہ تھی کہ میری شخصیت کا بنیادی جذبہ خوف تھا۔ میں ایک ڈرا ہوا سہا ہوا۔ تنہا۔ اکیلا بچہ تھا۔ یہ خصوصیت صرف بچپن پر محدود نہ تھی۔ زندگی بھر میں ایک ڈرا ہوا سہا ہوا فرد رہا۔ رات پڑتی اندھیرا چھا جاتا تو مجھ پر خوف طاری ہو جاتا۔ اس وقت خدا یاد آ جاتا۔ دن کے

اجالے میں خدا کی کوئی حیثیت نہ رہتی۔ بلکہ دن کے وقت میں خدا کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

لاہور پہنچ کر دوسرا جذبہ جو میرے دل میں پیدا ہوا۔ حیرت کا تھا حیرت کی بات تھی کہ میں صحیح سلامت لاہور کیسے پہنچ گیا۔ پہنچنے کے امکانات بہت کم تھے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس خیال کو توجہ سے ہٹادوں۔ دوسری باتوں کی طرف توجہ مبذول کرلوں' لیکن جتنا میں اس خیال کو ذہن سے نکالتا اتنا ہی وہ مسلط ہوتا۔ پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے' لیکن ایسے ہوتا ہے۔ خوف یا تو خطرے کے آنے سے پہلے اور یا اس کے گزر جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ خطرے کے وقت انسان چند ساعت کے لیے بے خوف ہو جاتا ہے۔ خطرہ گزر چکا تھا' لیکن اب اس کی ایک ایک تفصیل میرے ذہن میں آ رہی تھی۔ خوف طاری ہو رہا تھا۔ خوف اور حیرت۔ وہ کوائف جو خطرے کے دوران دھندلے پڑ گئے تھے۔ اب وضاحت سے سامنے آ رہے تھے۔ سوچتا۔ قتل و خون کے اس جھگڑے میں میں کیسے بچ نکلا۔ حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

اتفاقات

تیس ستمبر کو میں ٹرک لے کر لاہور سے بٹالے پہنچا تھا' جو پٹھانکوٹ روڈ پر امرتسر سے ۲۴ میل دور۔ ضلع گورداسپور میں واقع ہے اور جو خلاف اصول خلاف توقع بھارت میں شامل کر دیا گیا تھا۔ تاکہ اپنے والدین بھائی بہنوں اور بیٹے کو پاکستان لے آؤں۔ بٹالے کے ہندوؤں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ تیس ستمبر کے بعد مسلمانوں کو سمجھ لیں گے۔ پہلی اکتوبر کو بٹالے کے مسلمانوں پر بہت بڑا حملہ ہونے والا تھا۔ اگرچہ تقسیم چودہ اگست کو ہو چکی تھی' لیکن شہر میں مسلمان فرنٹیر فورس مقیم تھی جسے تیس ستمبر کی رات کو وہاں سے ہٹالیا جانا تھا۔

اگر میں ایک دن کی تاخیر سے بٹالے پہنچتا تو مفتیاں محلے کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی ہوتی۔ اور وہاں جلتے ہوئے ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہ ہوتا۔ میرا عین وقت پر پہنچ جانا کیا محض اتفاق تھا۔

پھر جب ہم ٹرک میں سوار بٹالے سے امرتسر کی جانب آ رہے تھے' تو سڑک پر کوئی بلوائی نہ تھا' صرف کوے تھے' کتے تھے' چیلیں تھیں اور گدھ تھے' جو سڑک پر پڑی ہوئی لاشوں کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بلوائیوں کو اطلاع مل چکی تھی کہ گورداسپور سے مسلمانوں کی

پہلی ریفوجی ٹرین آرہی ہے۔ یہ خبر سن کر تمام بلوائی ریلوے لائن کے دو رویہ قطاریں بنائے ٹرین کی انتظار میں کھڑے تھے۔

انہوں نے ہاتھوں میں درختوں کی ٹہنیاں اٹھا رکھی تھیں تاکہ دور سے جھاڑیوں کی قطاریں معلوم ہوں۔ سڑک سے ریل کی لائن صاف نظر آتی تھی۔

بلوائیوں نے ہمارے ٹرک کو سڑک پر چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ دیکھ کر نعرے بھی لگائے تھے۔ اکھنڈ بھارت سے جانے نہ پائے' لیکن وہ ڈرتے تھے کہ اگر سڑک کی طرف آئے تو ریفوجی ٹرین ہاتھ سے نکل جائے گی۔ ٹرین میں سوار ہزاروں مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنے کی لذت کے مقابلے میں ٹرک کے چند ایک مسلمانوں کو قتل کرنے کی کیا حیثیت تھی۔

رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ اگر اس روز ریفوجی ٹرین کی آمد آمد نہ ہوتی تو ہم سب کی بوٹیاں سڑک پر بکھری ہوتیں۔ کیا یہ بھی ایک اتفاق تھا۔

پھر جب ہم امرتسر میں داخل ہو رہے تھے تو سپاہی نے ہاتھ دکھا کر ہمیں روک لیا تھا اور ساتھ ہی سڑک کے پہلو میں چھپے ہوئے بلوائیوں کو اشارہ کر دیا تھا۔ بلوائی ٹرک کی طرف دوڑے تھے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ چوک کے سپاہی کی جگہ ایک رومی ٹوپی والا ابھر آیا۔ اس نے ہمارے ٹرک کو راستہ دے دیا تھا۔ ٹرک چل پڑا اور بلوائی پیچھے رہ گئے۔ پھر ٹرک ڈرائیور نے جو ایک فوجی تھا۔ ٹرک کو سڑک سے اتار کر کھیتوں میں ڈال دیا تھا۔

وہ رومی ٹوپی والا کون تھا۔ سکھوں کے گڑھ میں رومی ٹوپی۔ بات میری سمجھ سے بالا تر تھی۔

امرتسر سے اٹاری تک یہاں وہاں سکھوں کے جتھے موجود تھے۔ وہ ٹرک کو دیکھ کر چنگھاڑتے تھے۔ نعرے لگاتے تھے۔ کرپانیں ہلاتے تھے' لیکن کسی نے ٹرک پر حملہ نہیں کیا تھا۔ کیوں۔ وہ یوں کھڑے تھے جیسے کسی نے ان کو کیل دیا ہو۔

کیا یہ سب اتفاقات تھے۔

پھر مجھے بمبئی سے لاہور آنے سے متعلق تفصیلات یاد آ جاتیں۔

بمبئی میں احمد بشیر اور مجھے قطعی طور پر علم نہ تھا کہ قیام پاکستان سے پہلے ہی پاکستان کو جانے کے راستے بند کر دیے جائیں گے اور مسلمانوں کے قتل و خون کا بازار گرم ہو جائے گا۔ بمبئی

میں ہمارے پاس روپیہ ختم ہو گیا تھا۔ ضروری تھا کہ لاہور جا کر پبلشر سے رقم حاصل کی جائے۔ میں نے احمد بشیر سے کہا تم جاؤ۔ وہ نہ مانا لہٰذا مجھے خود لاہور آنا پڑا۔ وقت یہ تھی کہ ہمارے پاس کرایے کی رقم بھی نہ تھی۔ لہٰذا ادھار مانگنا پڑا۔ بمبئی میں ادھار حاصل کرنا آسان کام نہیں۔

جس گاڑی سے میں لاہور پہنچا۔ وہ آخری گاڑی تھی۔ اس کے بعد امرتسر سے لاہور کا راستہ بند ہو گیا۔ حملے شروع ہو گئے اگر قرض حاصل کرنے میں ایک دن کی تاخیر ہو جاتی' تو میں کبھی لاہور نہ پہنچ پاتا۔ اگر میں لاہور نہ پہنچتا تو ٹرک لے کر بٹالے نہ پہنچ سکتا اور عین ممکن تھا کہ میرے تمام عزیز بٹالے میں ہی ختم ہو جاتے۔

اتنے سارے اتفاقات۔

میری حیرت بڑھتی جاتی تھی۔ اگر میرا اللہ پر ایمان ہوتا تو سمجھتا کہ یہ سب اللہ کا کرم ہے۔ یوں حیرت شکر گزاری کے جذبات میں بدل جاتی' لیکن میرے ذہن میں اللہ کے کرم کا کوئی مفہوم نہ تھا۔ لہٰذا میں حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا رہا کھاتا رہا۔

لاہور

یہ ان دنوں کی بات ہے جب برصغیر درد زہ میں مبتلا تھا۔ پاکستان کی پیدائش کا اعلان ہو چکا تھا۔ لیکن عمل جاری تھا اور یہ عمل اس قدر حیران کن اذیت ناک اور خونیں تھا کہ مسلمان شاک کے عالم میں تھے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے۔

مسلمانوں نے کئی سال آزادی کی جدوجہد میں گزارے تھے اور اب ان کی کوششیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ وہ آزادی کی جدوجہد میں اس قدر مصروف تھے کہ انہوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو دشمن انتقامی کارروائی کر سکتا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی توجہ نہ دی تھی۔ کہ دشمن منصوبہ بندی سے کام لے رہا ہے اور اپنے پلان کو عملی صورت میں لا رہا ہے۔ وہ شبخون مار کر قیام پاکستان پر ضرب مار سکتا ہے۔ ایسی ضرب جو نوزائیدہ مملکت کو اس قدر کمزور کر دے کہ وہ سالہا سال اپنے قدم جمانے میں قابل نہ رہے۔ اس شبخون کی وجہ سے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ بہاؤ لاہور کی طرف تھا۔ لاہور خون کی بو سے متعفن ہو رہا تھا۔ امرتسر اور اس کے گرد و نواح میں مسلمانوں نے وہ وہ کچھ دیکھا

اور بیتا تھا کہ ان کے ذہنوں پر دیوانگی مسلط تھی۔ وہ لاہور کے مسلمانوں کو للکار رہے تھے۔ انتقام پر ابھار رہے تھے۔

میں اپنے مکان کی چھت پر کھڑا شہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ چاروں طرف خاموشی طاری تھی۔ یہاں وہاں اکا دکا لوگ سر لٹکائے چل پھر رہے تھے۔ دور کہیں کہیں دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

یہ وہ لاہور نہیں تھا جس سے میں واقف تھا۔ دن بھر خاموشی چھائی رہتی۔ لمبے وقفوں کے بعد شور کا ریلا سنائی دیتا جیسے بہت سے لوگ چیخ رہے ہوں چنگھاڑ رہے ہوں اور پھر سے بھیانک خاموشی چھا جاتی۔ رات کے وقت بار بار آوازیں سنائی دیتیں۔ گولیاں چلتیں۔ پٹاخے چھوٹتے۔ نعرے لگتے۔ چیخوں کی آوازیں سنائی دیتیں اور پھر ڈراؤنی خاموشی طاری ہو جاتی۔

چار ایک دن تو میں چھت پر کھڑا ہو کر یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر ایک روز گھبرا کر باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے کی خواہش زور پکڑے جاتی۔ دل میں ایک کشمکش لگ جاتی۔ اس تکلیف دہ کشمکش سے مخلصی پانے کے لیے میں باہر نکل گیا۔

بازاروں میں کوئی کوئی راہ گیر چلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ڈرا ڈرا سہا سہا۔

بازاروں میں کہیں کہیں لاشیں پڑی گل سڑ رہی تھیں۔ نالیوں میں خون جما ہوا تھا۔

کہیں کہیں گروہ ہلڑ مچا رہے تھے۔ وہ اشتعال پر مائل تھے۔ یہ بھی خوف کی ایک صورت تھی۔

یہ گروہوں کے دن تھے فرد سر چھپائے گھر بیٹھا تھا۔

تذلیل

دفعتاً" نوجوانوں کے ایک گروہ نے میرا راستہ روک لیا۔ مجھے سائیکل سے اتار لیا۔

کون ہے تو ایک نوجوان نے ہاکی سٹک گھماتے ہوئے پوچھا۔

کوئی بھی ہوں۔ تجھے اس سے مطلب' میں نے غصے میں کہا۔

ہندو ہے' ہندو ہے۔ سب چلانے لگے۔

سیدھی طرح سے بتا دے ان کے لیڈر نے کہا نہیں تو۔

نہیں تو کیا۔ میں غصے میں بولا۔

ہندو ہے ہندو۔ پکڑ لو پکڑ لو ایک لڑکا چلایا۔

کلمہ پڑھ کر سنا۔ لیڈر نے رعب جھاڑا۔

نہیں سناتا میں غصے میں بولا۔

ہندو ہے ہندو۔ آوازیں آئیں۔

وہ سب میری طرف بڑھے دھکے دینے لگے اور دھکیل کر میدان کی طرف لے گئے۔

میرا دل چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر کہوں میں ہندو ہوں۔ ہندو' لیکن مجھ میں جرات نہ تھی۔

نوجوانوں کے تیور دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ ہٹ جاؤ' ہٹ جاؤ میں چلایا۔ تم ایک مسلمان کو ناحق تنگ کر رہے ہو۔

ابے جا جا۔ ہم نے دیکھے ہیں تجھ سے مسلمان ایک بولا۔

ساڈے نال چلاکیاں کرنا ایں

پکڑ لو پکڑ لو چھوٹے بچے چیخنے لگے۔

مجھے پسینہ آگیا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں۔

اگر میں ابتدا ہی میں کلمہ پڑھ کر سنا دیتا تو بات نہ بڑھتی۔ اب کلمہ پڑھنا میرے لیے مشکل ہوا جا رہا تھا۔ میری انا مجروح ہوئی تھی' لیکن نوجوانوں کا رویہ سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔

ایک نوجوان چھرا لہرا رہا تھا۔

عین اس وقت سڑک پر ایک سائیکل سوار گزرا۔ اس نے مجمع دیکھ کر تفریحاً" نعرہ لگایا۔ پکڑ لو جانے نہ پائے اس نعرے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

نوجوانوں میں تازہ وحشت جاگی۔

علی علی نوجوانوں نے نعرہ لگایا۔

میری انا کی ساری پھونک نکل گئی۔ ٹھہرو میں چلایا ٹھہرو اور پھر کلمہ پڑھنے لگا۔

جھوٹا کلمہ جھوٹا کلمہ چھوٹے بچوں نے شور مچا دیا۔

اس پر سب مجھے ٹھڈے مارنے لگے۔ دو ایک نے گھونسے بھی مارے۔

اس وقت سامنے محلے سے ایک نوجوان بھاگا بھاگا آیا۔ بولا کیا بات ہے۔

چھوٹے بچے چلائے جھوٹا کلمہ پڑھ رہا ہے۔

سر پر بودی ہے ایک بولا۔

گلے میں جنئو بھی ہے دوسرے نے کہا۔

تھوڑ نو وارد بولا۔ ابھی پتا چل جاتا ہے' اس کی بانہیں پکڑلو اچھی طرح مضبوطی سے آزار بند کھول دو۔

میرا دل ڈوب گیا۔ یہ ذلت کی انتہا تھی۔ پھر مجھے پتہ نہیں۔ گردو پیش پر اندھیرا چھا گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ سب مجھے چھوڑ کر قہقہے لگاتے ہوئے سڑک کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔

یہ تذلیل کی انتہا تھی۔ میرے اپنے شہر میں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں۔ میرے اندر ایک وحشت جاگی۔ ان جانے میں میں چلایا۔ میں مسلمان نہیں ہوں۔ میں مسلمان نہیں ہوں۔ پھر مجھے یاد نہیں کب سائیکل اٹھایا۔ کب وہاں سے چل پڑا۔

ہوش آیا تو دیکھا کہ میں ریلوے سٹیشن کے سامنے کھڑا ہوں۔

گوشت کی گٹھڑیاں

سامنے مسافر خانے میں' فٹ پاتھ پر سڑک پر مہاجر مرد عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی گردنیں لٹکی ہوئی تھیں۔ کندھے مڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں یوں کھلی تھیں۔ جیسے بند ہونے کی قوت نہ رہی ہو۔ چہرے حیرت اور خوف و ہراس سے بدنما ہو رہے تھے۔

پھر شور بلند ہوا۔ امرتسر سے گاڑی آگئی۔ امرتسر سے گاڑی آگئی۔ سب لوگ پلیٹ فارم کی طرف بھاگے' لیکن مہاجر جوں کے توں بیٹھے رہے' جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

میں نے سائیکل کو تالہ لگایا اور ان جانے میں اندر کی طرف چل پڑا۔ پلیٹ فارم پر پہنچا تو بو کا ایک ریلا آیا۔ میں رک گیا۔ لوگ ناک پر رومال رکھے گاڑی کے ڈبوں میں داخل ہو رہے تھے۔ جب وہ باہر نکلتے تو چہروں پر کراہت کے آثار نمایاں ہوتے۔

میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ گاڑی میں داخل ہوں۔ اس کے باوجود میں ادھر کھنچا جا رہا تھا۔ یوں

جیسے خوف نے ہپناٹائیز کر رکھا ہو۔ بادل ناخواستہ میں ڈبے کی طرف بڑھا۔ دروازے میں رک گیا۔ وہاں خون کا چھپڑ لگا ہوا تھا۔ سامنے ایک بوڑھی عورت گٹھڑی کی طرح پڑی تھی۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں دونوں ہاتھ پیٹ پر تھے۔ سامنے پیٹ سے نکلی ہوئی آنتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

دیر تک میں بڑھیا کو گھورتا رہا۔ خون کی بو سے طبیعت مالش کر رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ نظر دھندلی پڑتی جا رہی تھی۔ گاڑی کے اندر داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی دروازے میں کھڑے کھڑے ڈبے کا جائزہ لیا سارے ڈبے میں کٹے ہوئے گوشت کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ دو بازو اوپر تختے سے لٹک رہے تھے' دو کٹے ہوئے سر فرش پر لڑھک رہے تھے۔ ایک بچہ ہک سے لٹک رہا تھا۔

گھبرا کر میں باہر نکل آیا اور پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر دھڑام سے گر گیا۔ جی کچا ہو رہا تھا۔ پلیٹ فارم گھوم رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔

جب طبیعت سنبھلی تو قریب ہی سے آوازیں سنائی دیں یہ گاڑی شملے سے آئی ہے۔ سنٹرل گورنمنٹ کے ملازموں کی گاڑی ہے۔

قریب ہی دو شخص آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

یاد ہے جب لاہور سے ہندو گورنمنٹ سرونٹس کی گاڑی گئی تھی تو ان کے گلوں میں ہار ڈالے گئے تھے۔

شاید شملے میں ان کے گلوں میں بھی ہار ڈالے گئے ہوں۔

ہاں۔ اور ساتھ ہی امرتسر کے غنڈوں کو ہشیار کر دیا گیا ہو کہ پہنچنے نہ پائیں۔

یہی ہندو مسلمان کا فرق ہے مسلمان اپنے ہاتھ سے قتل کرتا ہے ہندو دوجے کے ہاتھ سے قتل کراتا ہے۔

ہر دو لعنت ہر دو لعنت میرے دل سے آواز آئی۔

عین اس وقت ایک شخص گاڑی سے نکل کر چیخنے لگا۔ کوئی بچ کر نہ جائے۔ کوئی بچ کر نہ جائے۔ اس کے منہ سے کف جاری تھا۔ آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا۔ میری مٹھیاں از خود بند ہو گئیں۔ بازو ہوا میں لہرایا۔ کوئی بچ کر نہ جائے میرے منہ سے چیخ سی نکلی اور میں جوش میں اٹھ بھاگا۔ میری کنپٹیاں پھڑک رہی

تھیں۔ آنکھوں تلے گوشت کی گٹھڑیاں بندھی پڑی تھیں۔

باہر مہاجروں کے انبوہ کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے وہ بھی کٹے ہوئے گوشت ہوں۔ صدمے کی گٹھڑیاں ہوں ———— بے بسی کی گٹھڑیاں۔ جیتی جاگتی لاشیں۔ کوئی بچ کر نہ جائے میں نے جوش میں دہرایا۔ دفعتاً" مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک ہندو کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔

نہیں نہیں دل سے آواز آئی فکر تونسوی ہندو نہیں ہے میں لڑکھڑایا اور بنچ پر بیٹھ گیا۔

فکر تونسوی

فکر تونسوی میرا ہم کار تھا دوست تھا ساتھی تھا۔ گزشتہ تین سال ہم نے اکٹھے گزارے تھے۔

فکر میں عجز کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ گردن اٹھا کر نہیں لٹکا کر چلتا تھا۔ اسے باتیں کرنے کی نہیں بلکہ سننے کی عادت تھی۔ اس نے کسی معاملے میں کبھی اپنے رائے پیش نہ کی تھی گمان ہوتا کہ اس کی اپنی رائے ہے ہی نہیں۔ حالانکہ وہ ایک دانشور تھا در حقیقت وہ دل کی گہرائیوں میں جیتا تھا اور وہ اتنی گہری تھیں کہ کوئی لہر ابھر کر سطح پر نہیں آتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ کے سوا کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

فکر غربت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے کبھی شکایت نہ کی تھی۔ برتاؤ سے بے اطمینانی کا اظہار نہ ہوا تھا۔ ایسے لگتا جیسے اس نے غربت کو اپنا گھونسلا بنا رکھا ہو۔

فکر اور مجھ میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ اس کے باوجود ہم دونوں ساتھی بن گئے تھے۔

جب برصغیر کی تقسیم کا سوال اٹھا تو فکر نے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا تھا۔ جب لاہور میں ہندوؤں اور سکھوں کا وہ تاریخی جلوس نکلا جس میں سکھوں کے ہاتھوں میں ننگی کرپانیں تھیں اور ہنڈیاں قیام پاکستان پر سیاپا کر رہی تھیں۔ تو بھی فکر تونسوی میں کوئی اضطراب پیدا نہ ہوا تھا۔ جب لاہور میں چھرا بازی کی وارداتیں شروع ہوئیں تو بھی وہ چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

ایک روز میں نے پوچھا، فکر اگر پاکستان بن گیا تو۔

تو کیا اس نے پوچھا۔

تو تم کیا کرو گے۔

کچھ بھی نہیں وہ بولا۔

اگر فسادات یونہی بڑھتے گئے تو۔

بڑھتے جائیں اس نے بے پرواہی سے کہا۔

تم بھارت جانے کا تو نہیں سوچ رہے۔

میں کہاں جاؤں گا۔ میں اسی دھرتی کا بوٹا ہوں اس نے جواب دیا۔

واقعی فکر تونسوی اسی دھرتی کا بوٹا تھا۔

جس ادارے میں ہم دونوں کام کرتے تھے اس کا مالک چودھری برکت علی ایک وسیع القلب شخص تھا زبان کا کڑوا بات کا کھرا اور منہ پر آئی کہہ دینے والا۔

اس نے فکر تونسوی سے کہا تھا۔ فکر تم ہمیں چھوڑ کر جانا چاہو تو بے شک جاؤ تمہاری مرضی' لیکن ہم ہمیشہ کے لیے تمہیں پاس رکھیں گے۔ اپنی حفاظت میں رکھیں گے۔ کسی کی جرات نہ ہو گی کہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔

پھر ایک روز فکر متفکر نظر آ رہا تھا۔ چونکہ جس ہندو محلے میں وہ رہتا تھا وہاں کے سب لوگ بھارت جا رہے تھے۔ یہ پہلا دن تھا کہ اس کے چہرے پر فکر کے آثار نظر آئے۔

چند ایک روز کے بعد دفتر کی سامنی سڑک پر غنڈے راؤنڈ کرنے لگے تھے۔

ادارے کا مینجر کٹر قسم کا مسلمان تھا۔

وہ اکثر مذاق میں کہتا فکر تونسوی اب اپنا انتظام کر لو ورنہ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری وجہ سے وہ اس دفتر کو آگ لگا دیں گے۔

ایک روز میں نے پوچھا فکر تمہارے کٹڑے کے لوگ سب چلے گئے۔

سب چلے گئے' وہ بولا۔

تم اکیلے رہ گئے ہو۔

میں تو ہمیشہ سے اکیلا ہوں وہ مسکرایا اس کی پھیکی مسکراہٹ میں دکھ تھا۔

عین اس وقت غنڈوں کا ایک جتھا دفتر کے باہر آ کھڑا ہوا۔ مینجر گھبرا گیا۔ وہ باہر نکل گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ لوٹا۔

ہجوم باہر نعرے لگا رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا۔ اندر ہم سب پر گھبراہٹ طاری تھی' لیکن فکر تونسوی چپ چاپ بیٹھا لکھ رہا تھا۔

مینجر سیدھا میرے پاس آیا بولا آج سے میری ذمہ داری ختم۔ اگر وہ اندر آ کر فکر کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیں تو مجھ پر الزم نہ دھرنا۔

بات کیا ہے دفتر کے کارکنوں نے پوچھا۔

بات سامنے دھری ہے وہ بولا۔ ساتھ ہی فکر کی طرف اشارہ کیا۔

امرتسریوں کے جتھے بازاروں میں گھوم رہے ہیں۔ امرتسر میں ہزارہا مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے محلوں کو آگ لگا دی گئی دوکانوں کو لوٹ لیا ہے۔ جو بچ کر یہاں پہنچے ہیں انہوں نے لاہوریوں کو چوڑیوں کا تحفہ بھیجا ہے۔ مطلب ہے تم مرد نہیں ہو چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھو۔ ہم انتقام لیں گے۔ جتھے والے کہہ رہے تھے۔ اپنے ہندو سٹاف کو نکال دو نہیں تو ہم دوکان کو آگ لگا دیں گے۔ یہ کہہ کر مینجر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ چلو فکر تونسوی میں نے کہا۔ چلو گھر چلیں۔

احمق نہ بنو مینجر چلایا۔ اسے ساتھ لے کر باہر نکلے تو وہ تم کو بھی چھرا گھونپ دیں گے۔

گھونپ دیں۔ غصے کی وجہ سے مجھ میں جرات پیدا ہو گئی تھی۔ میں مسلمان نہیں ہوں۔

یہ میری دلیری نہ تھی۔ بلکہ خوف کی انتہا تھی۔ خوف حد سے بڑھ جائے تو انسان ڈسپریٹ ہو کر بے خوف ہو جاتا ہے۔

یہ دوستی کا جذبہ بھی نہ تھا اور قربانی کے جذبے سے تو میں سراسر کورا تھا۔ یہ صرف ضد تھی۔ غصہ تھا۔ مسلمانوں کے خلاف غصہ۔

پھر جب میں فکر کو اپنے سائیکل پر بٹھا کر گھر لے جا رہا تھا تو دفعتاً" ڈسپریشن کا وہ دھندلکا صاف ہو گیا خوف سے پسینے آنے لگے۔ اگر کسی نے راستے میں روک لیا تو ——————

دقت یہ تھی کہ فکر سائیکل پر آگے بیٹھا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کے خیالات اور جذبات ہندویت سے کورے تھے۔ لیکن خیالات اور جذبات کو کون پوچھتا ہے۔ وہ تو شکل دیکھتے ہیں اور شکل سے فکر تونسوی ٹھیٹھ رام لال تھا۔ چہرے پر ہندو پن کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

سائیکل چلاتے ہوئے میں نے اپنا منہ باہر نکالا ہوا تھا' اور باہر' اور باہر تاکہ رام لال کے پیچھے چھپا نہ رہے۔ میرا چہرہ چلا چلا کر کہتا رہے میں مسلمان ہوں۔ یہ میرے آگے بیٹھا ہوا شخص ہندو سہی' لیکن میں مسلمان ہوں۔ میرا خیال رکھنا۔

میں ایسے راستے سے گھر کو جا رہا تھا جہاں ہجوم سے مڈھ بھیڑ ہونے کا امکان نہ تھا۔ پھر بھی میرا دل ڈوبا رہا تھا۔

تم مجرم ہو میرے دل سے آواز اٹھ رہی تھی تم نے ہندو کو پناہ دے رکھی ہے۔

نہیں نہیں فکر تونسوی ہندو نہیں ہے۔

وہ ہندو نہیں تو تم بھی تو مسلمان نہیں ہو۔ وہ نوجوان احمق تھے جنہوں نے تمہارے جسم کو دیکھ کر تمہیں چھوڑ دیا تھا۔

ہوں۔ نہیں ہوں

میرے دل سے کئی ایک آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ میرے دل میں گویا کئی ایک افراد چھپے ہوئے تھے۔ ان کے خیالات مختلف تھے۔ متضاد تھے۔ وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ کبھی آواز آتی۔ کوئی بچ کر جانے نہ پائے۔ کبھی۔ نہیں میں مسلمان نہیں ہوں۔

یہ آوازیں سن کر میں سوچ میں پڑ جاتا۔ مسلمان کون ہے۔ وہ جو چھرا ہاتھ میں پکڑے سڑک پر گھوم رہا ہے' یا وہ جو ہندو کو پناہ دے بیٹھا ہے۔

میرے سامنے مجید ملک آ کھڑا ہوا۔ وہ ایک خوب صورت جوان تھا۔ اسے عورتوں سے دلچسپی تھی۔ شراب سے شغف تھا۔ وہ مغربی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ لیکن قیام پاکستان کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے بیٹھا تھا اس کے لکھے ہوئے اداریے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی چنگاری بھڑکاتے تھے۔

ایک روز میں نے پوچھا تھا۔ ملک نماز تو نہیں پڑھتا' روزے تو نہیں رکھتا۔ وضع انگریز نما ہے۔ اس کے باوجود کیا تو خود کو مسلمان سمجھتا ہے۔

میں ———— میں تو کٹر مسلمان ہوں۔ اس نے فخر سے کہا۔

وہ کیسے۔

اگر بازار میں ہندو اور مسلمان لڑ رہے ہوں۔ ملک نے کہا تو میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کس بات پر لڑ رہے ہو۔ یہ نہیں پوچھوں گا کہ کون حق پر ہے۔ پوچھے بغیر سوچے سمجھے بغیر ہندو کو گھونسے مارنا شروع کر دوں گا۔

تو کیا مسلمان وہ ہے جو تعصب سے بھرا ہو' میں نے پوچھا۔

ایک نہیں دو تعصب۔ مسلمانوں کے حق میں تعصب غیر مسلم کے خلاف تعصب۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا' میں اس حد تک پکا مسلمان ہوں کہ اگر چھت پھٹ جائے اور ایک فرشتہ اتر آئے اور مجھ سے کہے۔ مجید ملک مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے فرماتے ہیں جا کر اسے کہہ دو کہ اسلام جھوٹا مذہب ہے۔ 'عیسائیت سچی ہے' تو میں ان سے کہوں گا کہ جاؤ باری تعالیٰ کی خدمت میں عجز و احترام سے عرض کرو کہ مجید ملک کو آپ کا پیغام ملا۔ شکریہ لیکن مجید ملک مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔

میرے دل سے آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ میں کون ہوں' میں کون ہوں۔

ہاں مجھ میں تعصب ہے۔ پہلے نہیں تھا اب ہے۔

اگر قیام پاکستان پر ہندو شبخون نہ مارتا۔ اگر مسلمان کا قتل عام نہ ہوتا تو مجھ میں تعصب پیدا نہ ہوتا۔ تقسیم کے عمل نے مجھے مسلمان بنا دیا ہے۔ میں مسلمان ہوں۔

اسٹیشن سے نکل کر رفع حاجت کے لیے میں لیٹرینز کی طرف چل پڑا۔ لیٹرینز سٹیشن سے کچھ فاصلے پر تھیں۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں کی لمبی قطاریں بنی ہوئی ہے۔ قریب کی نئی نئی بنی ہوئی تھیں۔ پرلے سرے پر پرانی ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ چھتیں گری ہوئی دروازے اکھڑے ہوئے نئی کوٹھڑیوں کے سامنے گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اس لیے میں ایک ٹوٹی ہوئی کوٹھڑی میں جا گھسا۔

کالا صندوق

مہاراج مہاراج۔ میرے روبرو ایک معمر ہندو کھڑا تھا میں ڈر گیا۔

دیا کرو' دیا کرو مہاراج' وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

تو کون ہے' میں نے پوچھا۔

مہاراج میں ہندو ہوں۔ دو دن سے یہاں چھپا بیٹھا ہوں۔

یہ کیا ہے میں نے کالے صندوق کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا یہ میرا سامان ہے مہاراج۔ بس یہی میری مایا ہے۔ سارے جیون میں بس یہی کمایا ہے۔

ہوں' میں نے چھاتی پھلا کر کہا۔

مہاراج بس مجھے اتنا بتا دو کہ کس طرح بھارت میں پہنچ جاؤں۔

امرتسر کو کوئی گاڑی نہیں جاتی' میں نے جواب دیا۔

تو مہاراج میں کیا کروں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے بچاؤ مہاراج۔ بڑا پن ہو گا۔ یہ کہہ کر وہ میرے پاؤں پڑ گیا۔

نہیں نہیں ایسا مت کرو۔ میں نے اسے ڈانٹا۔

لالہ اٹھ کر رونے لگا۔

ٹھہرو میں نے کہا تم سیالکوٹ چلے جاؤ۔ وہاں سے جموں پہنچ جانا۔

سیالکوٹ کی گاڑی کس وقت جائے گی مہاراج۔ رات کی گاڑی ہو۔ آدھی رات کی۔

میں پتہ لگاتا ہوں۔ ابھی آؤں گا۔ تم یہیں بیٹھے رہنا یہاں سے ہلنا نہیں۔

میں سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ کالا صندوق میرے سامنے معلق ہو گیا۔ پھر اس کا ڈھکنا کھل گیا۔ وہ سونے کے زیوارات سے بھرا ہوا تھا۔

کوئی بچ کر نہ جائے میرے دل سے آواز بلند ہوئی۔

ہاں میں مسلمان ہوں۔ میرے دل میں تعصب ہے کاش کہ میرے پاس کوئی چھری ہوتی۔

میں نے سامنے دوکاندار کے قریب چھری پڑی ہوئی دیکھی۔

سیالکوٹ کو گاڑی کب جائے گی' میں نے دوکاندار سے پوچھا۔

کچھ پتا نہیں' دوکاندار بولا۔ آج کل گاڑیوں کا کچھ پتہ نہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے چھری اٹھا کر دور رکھ دی۔

دیر تک میں مسافر خانے کے شالوں کے گرد گھومتا رہا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ لالہ کے پیٹ میں چھری گھونپنے کے بعد صندوق کیسے گھر لے جاؤں گا۔ سائیکل پر اتنا بڑا صندوق کیسے رکھا جائے گا۔

رات کے وقت دوبارہ آؤ۔ گھر میں بڑی چھری موجود ہے پھر جو میں نے دیکھا تو میں لالہ جی کی کوٹھڑی کے پاس کھڑا تھا ہاتھ میں روٹی کا پیکٹ تھا۔ دو روٹیاں اور دال۔

میرے اندر کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ تو تو اسے روٹی کھلا رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں چھرا کیسے گھونپے گا۔ تو مسلمان نہیں مسلمان بزدل نہیں ہوتا ڈرپوک نہیں ہوتا۔

نہیں نہیں آواز آئی۔ ضروری ہے کہ وہ زندہ رہے اور کالے صندوق کی رکھوالی کرے۔ آدھی رات تک۔

نہیں نہیں۔ صندوق تو ایک ضمنی چیز ہے۔ مقصد تو ہندو کو قتل کرنا ہے۔ صندوق تو مجبوراً گھر لے جانا پڑے گا۔

کوٹھڑی میں داخل ہو کر میں نے روٹی کا پیکٹ لالہ جی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رات کے دو بجے گاڑی سیالکوٹ جائے گی۔ آدھی رات سے پہلے یہاں سے باہر نہ نکلنا اور دیکھو یہ دھوتی اتار کر اسے دوہرا کر لو اور چادر کی طرح باندھ لو۔ لالہ میرے پاؤں پڑ گیا۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے۔

سائیکل چلاتے ہوئے پہیے چیخنے لگے۔ بھگوان تیرا بھلا کرے۔ بھگوان تیرا بھلا کرے۔ گھبرا کر میں سائیکل سے نیچے اتر آیا۔ وہ آواز میرے ارادے کو کھوکھلا کر رہی تھی۔

لالہ کے جڑے ہوئے ہاتھ۔ اس کی آہ و زاری ———— نہیں نہیں میں بڑبڑایا۔ میں مسلمان ہوں' یہ باتیں مجھ پر اثر نہیں کر سکتیں۔

قلعہ گوجر سنگھ کے دروازے کے قریب ایک الاؤ جل رہا تھا۔ ارے یہ تو کتابیں ہیں۔ میں رک گیا۔ سائیکل کھڑی کی اور کتابیں دیکھنے لگا۔ سکس لائیف ان سمویا۔ گیتا نجلی' برنارڈشا' ہیولاک' ان کتابوں کو کیوں جلا رہے ہو۔ مجھے غصہ آنے لگا۔

ہٹ جا یہاں سے' ایک بھا مجھے نے مجھے ڈانٹا۔

خبردار ان کو ہاتھ مت لگا۔ دوسرا بولا۔

لیکن یہ تو کتابیں ہیں۔ میں نے کہا۔

کون ہے تو' ایک نے آکر مجھے گردن سے پکڑ لیا۔

میں ڈر گیا۔ میں مسلمان ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔

دوڑ جا یہاں سے' دوسرا بولا نہیں تو۔

میں بھاگ کر سائیکل پر چڑھ گیا۔ سائیکل کے پیچھے چیخنے لگے میں مسلمان نہیں ہوں۔ میں مسلمان نہیں ہوں۔

بھاماجھا غصے میں چیخ رہا تھا۔ انہوں نے امرتسر میں قرآن پاک جلائے تھے۔ حدیث شریف کو آگ لگائی تھی۔

میں چھری لینے کے لیے جارہا ہوں۔ میں نے خود کو تسلی دی آج رات کے بعد کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا باورچی خانے میں گیا۔ سامنے شلف پر بڑی چھری رکھی ہوئی تھی۔ اس کی دھار پر ہاتھ پھیرا۔ اونہوں یہ تو کھنڈی ہے۔ اب کیا کروں۔

تو یہاں کیا کر رہا ہے' میری بیوی داخل ہو کر بولی۔ اس کی تو خبر لے جسے تو نے کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے۔

دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ فکر تونسوی کی صبح سے خبر ہی نہیں لی۔

ہاتھ کا دباؤ

میں نے دروازہ بجایا۔ کھول بھئی۔

فکر نے کنڈی کھول دی۔ وہ کھاٹ پر اوندے منہ پڑا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔

فکر تونسوی' میں نے کہا۔ میں ———— میں ———— یعنی تم۔ میں نے بات کرنے کی شدید کوشش کی' لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا جو بات میرے ذہن میں پھنسی ہوئی تھی اسے کہنا بے حد مشکل تھا۔

خیر تو ہے۔ فکر نے پوچھا۔

میں نے سر نفی میں ہلا دیا۔ حالات۔ حالات۔ یہ جگہ۔ تم خطرہ۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔

ہوں۔ فکر بولا۔ میں سمجھتا ہوں۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ یہاں خطرہ ہے۔ میں گھر۔ اپنے گھر۔ اونہوں' میں نے کہا' تمہارا گھر شاید جل کر راکھ ہو چکا ہے۔

وہ گھبرا گیا۔

انہوں نے ریفوجی کیمپ بنا دیا ہے' میں نے کہا۔

وہ اٹھ بیٹھا اس کا چہرہ رد عمل سے خالی تھا۔

پھر ہم دونوں ٹیکسی میں ریفوجی کیمپ کی طرف جا رہے تھے جہاں ہندوؤں کے لیے فوج کا ایک حفاظتی دستہ موجود تھا۔

رخصت ہوتے وقت فکر تونسوی نے ہاتھ ملاتے ہوئے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔ وہ نگاہ اتنا کچھ کہہ رہی تھی جو فکر کبھی کہہ نہ سکا تھا۔ اس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ چہرہ ویسے ہی گونگا تھا' لیکن ہاتھ بولے جا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ ہاتھ کا "تک" اور بڑھ گیا۔ وہ تک مجھ سے اتنا کچھ کہہ رہا تھا جو فکر کبھی زبان سے نہ کہہ سکا تھا۔ اس کے ہاتھ کی باتیں محسوس کر کے میں شرمسار ہوا جا رہا تھا۔

کیمپ سے نکل کر میں نے سکھ کا سانس لیا۔ میں مسلمان ہوں۔ میں نے سوچا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ میں نے ایک ہندو کو پناہ دی تھی۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا باورچی خانے گیا اور بڑی چھری کو سل پر تیز کرنے لگا۔

کل صبح کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ میری نگاہوں میں کالا صندوق معلق تھا۔

دوسرا باب

چھبیس ہندنیاں

جوں جوں میں چھری تیز کئے جا رہا تھا توں توں میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ خیال آتا یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ایک بے بس نہتے لالہ کے پیٹ میں چھری بھونکنا بہادری کا کام نہیں۔ مسلمان تو جہاد کرتا ہے۔ میدان میں کھڑا ہو کر لڑتا ہے۔ "ٹٹی" میں چھپے ہوئے ہندو کو چھرا نہیں مارتا۔

پھر میری نگاہ میں کالا صندوق ابھرتا اور ان جانے میں چھری تیز کرنے کا عمل تیز تر ہو جاتا۔

دروازہ زور سے بجا۔

میرے ہاتھ سے چھری گر گئی۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کہیں پولیس تو نہیں آ گئی۔ شاید انہیں لالہ اور کالے صندوق کی خبر مل گئی ہو۔ میں نے چھری کو شلف پر برتنوں میں چھپا دیا اور نیچے اتر گیا۔ دروازہ کھولا تو سامنے اشفاق حسین کھڑا تھا۔

تم اشفاق حسین تم' تم تو گورداسپور میں تھے۔ وہاں سے کیسے آئے۔ کب آئے۔ کیا امرتسر کے راستے سے آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

کسی وقت بیٹھ کر بتاؤں گا اس نے جواب دیا۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ میں تو قیامت سے گزر کر آیا ہوں۔ وہاں کے مسلمانوں پر کیا بیتی' یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ معدہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ دل کو دھڑکن لگ جاتی ہے۔ احمد بشیر بھی بمبئی سے آ گیا ہے۔

احمد بشیر آگیا ہے؟ کب آیا؟ کیسے آیا۔ کہاں ہے؟

مجھے نہیں پتہ کیسے آیا۔ ملو گے تو پوچھ لینا۔

پر وہ ہے کہاں۔ میں نے پوچھا۔

ایمن اباد۔ جس گاڑی سے وہ آیا تھا وہ لاہور نہیں رکی تھی۔ سیدھی گوجرانوالے چلی گئی تھی۔ اس نے تمہیں بلایا ہے۔

کیوں بلایا ہے۔

ضروری کام ہے۔ ابھی جانا ہے۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔

میرے سامنے کالا صندوق معلق ہو گیا۔ کل۔ میں نے کہا کل چلیں گے۔

کل جانا بے کار ہو گا۔ اشفاق حسین نے کہا۔

تمہیں نہیں پتہ۔ اوپر آؤ نا میں تمہیں بتاؤں۔

میں اسے سیدھا باورچی خانے میں لے گیا۔ چھری دکھا کر بولا۔ یہ دیکھو یہ۔

وہ چھری کو دیکھ کر حیران نہ ہوا۔ بولا' یہ تو چھری ہے۔

میں اسے تیز کر رہا ہوں۔ مجھے ثابت کرنا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔

اسے بات سمجھ میں نہ آئی۔

میں نے پر اسرار انداز سے کہا۔ وہ ہندو ہے۔ ریلوے سٹیشن کی ایک "ٹی" میں چھپا بیٹھا ہے۔ اور میں کالے صندوق کی بات کرتے کرتے رک گیا۔ اور میں آج رات یہ چھری اس کے پیٹ میں گھونپ دوں گا۔

اشفاق حسین ہنسنے لگا۔ بولا۔ کل ۔ تم نے دس ہندوؤں کے پیٹ میں چھرا گھونپ دینا۔ دس۔ بیس پچاس۔ جتنے چاہو۔ ایمن اباد میں میں تمہیں ایک کلہاڑی دوں گا۔ بلیڈ کی طرح کاٹنے والی ———— اور ———— جتنا سونا چاہو لوٹ لینا۔

ایمن آباد کے ہندوؤں کو لوٹنا ہے کیا میں نے پوچھا۔

وہ قریب تر ہو گیا۔ نہیں اس نے سرگوشی کی۔ وہاں اب کوئی ہندو نہیں رہا۔ کل ایمن آباد سے ہندو ریفوجی گاڑی گزر رہی ہے۔ بڑے سٹیشنوں پر کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہاں فوج موجود ہوتی ہے۔ گوجرانوالے کے لوگوں نے ایمن آباد کو خبردار کر دیا ہے کہ گاڑی لاہور نہ پہنچے۔ ایمن آباد

کی عزت کا سوال ہے۔ اگر ہم گاڑی کو نہ روک سکے تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ گوجرانوالے کے لوگ طعنے دیں گے۔

ہوں۔ تو یہ بات ہے۔

ہندوؤں نے مسلمانوں کی کئی ریفوجی گاڑیاں کاٹی ہیں۔ انبالے' لودھیانے' بیاس' امرتسر' اٹاری۔ ہمیں انتقام لینا ہے۔ چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ احمد بشیر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

ہوں۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن وہ کالا صندوق۔ ان جانے میں میرے منہ سے نکل گیا۔

کون سا کالا صندوق اس نے پوچھا۔

میں گھبرا گیا' لیکن اب بات کہہ دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ لالہ کا کالا صندوق۔ میں نے اسے ساری بات سنانی چاہی۔

لیکن اس نے میری بات کاٹ دی۔ بولا ریفوجی گاڑی میں بہت سے کالے صندوق مل جائیں گے۔ چلو اب وقت ضائع نہ کرو۔

ایمن آباد کی شیخانیاں

ایمن آباد لاہور سے بتیس میل دور واقعہ ہے جو مغلوں کے زمانے کا قصبہ ہے۔ جہاں دوسرے لوگوں کے علاوہ دو قومیں آباد تھیں۔ ایک تو ہندو دیوان تھے۔ جن کے جدامجد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خزانچی تھے۔ جب گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر خریدا تھا۔ تو رقم دیوانوں سے قرض لے کر ادا کی تھی۔

مشہور تھا کہ دیوانوں کے تہہ خانے سونے کی اینٹوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ دیوان پرانے رئیس تھے۔ مغلئی ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ خود بھی حسین و جمیل تھے اور جمالیات کی حس رکھتے تھے۔

دوسری قوم شیخوں کی تھی جو نو مسلم تھے۔ ان کا پیشہ چھوٹا کاروبار تھا۔ دوکانداری پھیری ریڑی۔ وہ کٹر مسلمان تھے۔ سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اچھا کھاتے تھے۔ باتیں کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ ان کی باتیں بڑی جاذب تھیں۔ محنت سے روپیہ کماتے اور احتیاط سے خرچ کرتے۔ بیوی ان کی واحد کمزوری تھی۔ انہوں نے ہمیشہ سے بیوی کے سامنے سر تسلیم خم کر رکھا تھا۔ اسی

وجہ سے ایمن ابادپر شیخانیاں راج کرتی تھیں۔

شیخانیوں کی چار ایک خصوصیات تھیں۔ خوش شکل تھیں۔ اچھی پوشاک پہنتی تھیں۔ سگڑ تھیں۔ پکانے کے فن میں ماہر تھیں۔ انہیں بننے سنورنے کا شوق تھا۔ بن سنور کر وہ میاں کو سرنگوں رکھنے کے رموز میں مشاق تھیں۔ اسی وجہ سے ایمن آباد میں شیخانیوں کی چلتی تھی۔

جب ہم ایمن اباد پہنچے تو شیخوں اور شیخانیوں کی آپس میں ٹھنی ہوئی تھی۔

ایک طرف شیخانیاں حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ دوسری طرف شیخوں کے نوجوان لڑکے پلاننگ میں مصروف تھے۔ تیسری طرف قصبے کا واحد رئیس نو بہار عمر رسیدہ شیخوں کی محفل لگائے بیٹھا تھا۔

ریفوجی ٹرین کی خبر سن کر شیخانیاں مشتعل تھیں۔ ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ ریفوجی ٹرین پر حملہ نہیں ہو گا۔

اے خواہ مخواہ کی کلٹ پیٹ کرنا۔

چاہے وہ کافر ہیں۔ چاہے انہوں نے مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی ہے پر بہن ہم اپنے ہاتھ خون سے کیوں رنگیں۔

بالکل۔ ہمیں اللہ کو جواب دینا ہے۔

اگر بدلہ ہی لینا ہے تو گوجرانوالہ کے لوگ لیں۔ لاہور والے لیں۔ ایمن آباد والے کیوں گنہگار بنیں۔

اللہ تیرا بھلا کرے بہن۔

میں کہتی ہوں لڑکیو! ایک بات پلے باندھ لو کہ ایمن آباد کے شیخ تو حملہ نہیں کریں گے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کیسے نہیں کریں گے ماسی سرداراں۔ وہ تو صمدو کے احاطے میں بیٹھے کلہاڑیاں تیز کر رہے ہیں۔

میں کہتی ہوں۔ ہم سب اپنے اپنے گھر کا ذمہ لیں۔

اے بہن اپنے اپنے میاں کا ذمہ تو ہم لے لیں گی، لیکن جو ان لڑکوں کا ذمہ کون لے گا۔

اس پر سب ہنس دیں۔ بات کا مقدم سامنے آگیا۔

اپنی طاقت کا احساس نسوں میں خون دوڑا دیتا ہے۔ گال گلال ہو جاتے ہیں۔
پھر ماں برکتے کہتی۔ آخر ہم نے ہندو دیوانوں کو بھی بچالیا تھا یاد ہے۔ وہ تو مشکل کام تھا۔
گاڑی کو بچانا ویسا مشکل تو نہیں۔
ماں برکتے سچ کہتی تھی۔ اگر شیخانیاں ایکا کر کے مزاحمت نہ کرتیں تو کوئی دیوان زندہ سلامت ایمن آباد سے باہر نہ نکلتا۔

دیوان

اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔
دیوانوں کی کئی ایک لڑکیاں لاہور کے کالجوں میں زیر تعلیم تھیں دیوان چمن لال نے حالات کا رخ دیکھ کر بیٹی کو خط لکھا کہ لاہور میں رہنا خطرے سے خالی نہیں اس لیے فوراً ایمن آباد پہنچ جاؤ۔
دیوان ایمن آباد کو محفوظ جگہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علاقے کے لوگ کبھی ان پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کریں گے اور کریں بھی تو دیوانوں کے محل نما مکانات قلعوں کی طرح مضبوط تھے۔ اسلحہ کی کمی نہ تھی۔ اسی وجہ سے ایمن آباد کو چھوڑ کر جانے کا انہوں نے پروگرام نہ بنایا تھا۔ علاقہ کے مسلمان دیوانوں کے قرض دار تھے۔ ان میں بڑے زمیندار بھی شامل تھے۔ سود پر قرض دینا ان کے کاروبار کا ایک حصہ تھا۔
بہر حال دیوان چمن لال نے اپنی بیٹی ششکنتلا کو لاہور سے بلا بھیجا۔ خط لکھنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لڑکی کا اکیلے سفر کرنا مناسب نہیں' اس لیے اپنے چھوٹے بیٹے کرشن کو لاہور بھیج دیا کہ ششکنتلا کو حفاظت سے ساتھ لے آئے۔
اگلے روز انہوں نے اپنے نوکر کو سٹیشن پر بھیج دیا تاکہ انہیں ریسیو کر لے۔ سارا دن چمن لال انتظار کرتے رہے۔ نہ ششکنتلا نہ کرشن اور نہ ہی نوکر پہنچا۔
شام کو تانگے والوں نے شور مچا دیا کہ پل کے نیچے تین لاشیں پڑی ہیں۔
یہ سن کر دیوانوں کے ہوش اڑ گئے۔
ادھر شیخانیاں اکٹھی ہو گئیں۔ انہوں نے شیخوں سے پوچھ گچھ کی۔ انہیں کچھ علم نہ تھا۔

اس پر شیخانیاں غصے میں آ گئیں۔

ایمن آباد میں کچھ ہو اور شیخوں کو کچھ علم نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آئندہ سے ایسا نہیں ہو گا۔

انہوں نے اعلان کر دیا کہ اگر کسی نے دیوانوں پر انگلی اٹھائی تو اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔

شیخوں کو علم تھا کہ حقہ پانی بند کرنے کا مفہوم کیا ہے۔ وہ ڈر گئے انہوں نے بھرے بازار میں اعلان کر دیا کہ خبردار کسی نے دیوانوں پر ہاتھ اٹھایا تو اسے ایمن آباد سے بے عزت کر کے باہر نکال دیا جائے گا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ تمام دیوان بخیر و عافیت ایمن آباد چھوڑ کر بھارت چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد لٹیروں نے دیوانوں کے محلے پر ہلہ بول دیا۔ چند ہی گھنٹوں میں ایمن آباد کی گلیاں دیوانوں کے کاٹھ کباڑ سے بھری ہوئی تھیں۔ بوسیدہ ریشمی رضائیاں۔ ہاتھیوں کے ہودے' میزیں کرسیاں' پلنگ پیڑے' صوفے۔ قالین' تصویریں' کتابیں۔

ہاں اگر شیخانیاں دخل نہ دیتیں تو ایمن آباد کے دیوان زندہ بچ کر نہ جا سکتے۔

ادھر نوبہار کی حویلی سے بڑے بوڑھوں کا اکٹھ ہو رہا تھا۔ بڑے بوڑھے گاڑی پر حملہ کے خلاف تھے۔ نوبہار بظاہر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا' لیکن در پردہ گاڑی پر حملے کے حق میں تھا۔ اس کا کہنا تھا اگرچہ گاڑی پر حملہ کرنا بری بات ہے پر ایمن آباد کی عزت کا سوال ہے۔ وہ کاٹ پیٹ کے خلاف تھا لیکن لوٹ کے حق میں تھا۔

نوجوان

صمدو کے احاطے میں نوجوان بڑے جوش و خروش میں تقریریں کر رہے تھے۔ انہیں علم تھا کہ بڑے بوڑھے اور شیخانیاں حملے کے خلاف، ہیں اور نوجوانوں کو باز رکھنے کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کریں گے' لہٰذا وہ ہر فرد سے حلف لے رہے تھے کہ مخالفت کے باوجود ہم حملہ کر کے رہیں گے۔

احمد بشیر اس محفل میں پیش پیش تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ اگر حملہ آوروں کی تعداد ستر'

اسی سے کم ہوئی تو بات نہیں بنے گی۔ جگ ہنسائی ہو گی۔

جب اشفاق اور میں احاطے میں پہنچے تو حلف اٹھانے کی رسم ادا ہو رہی تھی۔

اشفاق حسین کو دیکھ کر احمد بشیر کا جوش و خروش اور بڑھ گیا۔

پھر وہ دونوں سٹیج پر کھڑے ہو کر نوجوانوں کو شرم دلانے لگے۔ اشفاق حسین نے کہا قسموں سے کسی کو پابند نہیں کیا جا سکتا۔ نوجوانوں کی عزت کا سوال ہے۔ جو شخص راستے میں حائل ہو اسے ہٹا دو چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

میں چپ چاپ کھڑا سن رہا تھا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

پھر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی احاطے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی نوجوانوں نے شور مچا دیا۔ شاہ جی آ گئے شاہ جی آ گئے۔

شاہ جی ایک برخواست شدہ ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اپنی ملازمت کے دوران وہ ایک مانا ہوا تشدد پسند پُلسیّہ تھا۔ تقسیم سے متعلق فسادات میں اس کا تشدد عود کر آیا تھا۔ جب بھی ارد گرد سے مسلمانوں پر حملے کی خبر آتی تو وہ ایمن آباد میں انتقام کا نعرہ لگاتا۔ اسی وجہ سے وہ وہاں کے نوجوانوں کا لیڈر بن چکا تھا۔

ٹیڑھی انگلی

شاہ کے آتے ہی شور شرابا ختم ہو گیا۔ اور نوجوانوں کی توجہ شاہ پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اسے پکڑ کر سٹیج پر لے آئے۔

شاہ نے تقریر شروع کر دی۔ بولا مخالفت کو دور کرنا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ اگر مخالفت یونہی قائم رہی تو جلسے میں گنتی کے چند لوگ شامل ہوں گے۔ یہ وقت لڑائی جھگڑے کا نہیں۔ مقابلے کا نہیں۔ دوستو گھی ٹیڑھی انگلی سے نکلتا ہے۔ تصادم سے بات نہیں بنے گی۔ سمجھے۔ ایسی چال چلو کہ مخالفت ختم ہو جائے۔

کس طرح کس طرح چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔

صبر کرو' وہ بولا۔ بے صبری نہ دکھاؤ۔ انتظار کرو۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔

پھر اس نے اشفاق' بشیر اور دوسرے پر جوش لیڈروں کو اکٹھا کیا اور وہ دیر تک زیر لبی باتیں

کرتے رہے۔

اگلے روز ایمن آباد میں یہ خبر پھیل گئی کہ ہندو ریفوجیوں کی گاڑیوں کی آمد ملتوی ہو گئی ہے اس کی جگہ انبالے سے مسلمان زخمیوں کی گاڑی آ رہی ہے جو سیدھی جہلم جائے گی۔

شیخانیوں نے یہ خبر سنی تو ان کے دلوں سے بوجھ اتر گیا۔ انہوں نے بڑے شوق سے مسلمان زخمیوں کے لیے پراٹھے پکائے۔

اسی روز شام کے وقت ایمن آباد کے نوجوان ہاتھوں میں ٹارچیں اٹھائے پراٹھوں کی پوٹلیاں بغلوں میں دبائے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ سٹیشن شہر سے سات میل کے فاصلے پر تھا۔

راستے میں ایک مقررہ مقام پر وہ رک گئے۔ وہاں شاہ اور صوبہ موجود تھے۔ نوجوانوں نے وہاں بیٹھ کر پراٹھے کھائے اور پھر برتن وہیں رکھ کر ہتھیار اٹھا لیے جو پہلے سے ہی وہاں پہنچا دیے گئے تھے۔ پھر وہ ٹولوں میں بٹ کر سٹیشن کی طرف چل پڑے۔

ٹیڑھی انگلی نے واقعی بہت کام کیا۔

مخالفت بے اثر ہو چکی تھی۔

رکے گی، نہیں رکے گی

سٹیشن پر پہنچ کر وہ پلان کے مطابق بیک یارڈ میں اگی ہوئی جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئے۔

میرے دائیں ہاتھ اشفاق حسین تھا بائیں ہاتھ احمد بشیر۔

سامنے سٹیشن ویران پڑا تھا۔ صرف سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں ایک بتی ٹمٹا رہی تھی۔

دیر تک ہم ان جھاڑیوں میں دبکے بیٹھے رہے، پھر اندھیرا چھا گیا تو میں نے محسوس کیا کہ جھاڑیوں کے علاوہ بہت سے لوگ درختوں کے آس پاس ٹہل رہے ہیں۔

دفعتاً" احمد بشیر نے میرے ہاتھ میں ایک سوٹا تھما دیا۔

یہ سوٹا کیوں دے رہے ہو میں نے پوچھا۔

سوٹا نہیں کلہاڑی ہے اشفاق حسین نے کہا۔

ذرا دھیان سے پکڑو بہت تیز ہے اس کی دھار۔ احمد بشیر بولا۔ اور تیار ہو جاؤ۔ اشفاق حسین نے

کہا۔ سگنل ہوتے ہی ہمیں سٹیشن پر رش کرنا ہے۔
وہ دیکھو احمد بشیر نے کہا شاہ سٹیشن پر پہنچ چکا ہے۔

شاہ اور میجر

گاڑی یہاں رکے گی پلیٹ فارم سے شاہ کی دبدبہ بھری آواز آئی۔
نہیں گاڑی نہیں رکے گی۔ سٹیشن ماسٹر نے جواب دیا۔
میں کہتا ہوں رکے گی۔ شاہ غرایا۔
میرے سٹیشن پر خون خرابا نہیں ہو گا۔ سٹیشن ماسٹر بولا۔
اتنے میں صوبہ اپنی لنگڑی ٹانگ جھلاتا ہوا آ گیا۔ کہنے لگا پٹڑی اکھاڑ دی گئی ہے۔ گاڑی بے شک نہ رکے۔
شاہ نے کانٹے والے کو آواز دی۔
جی کانٹے والا دور سے بولا۔
سگنل اونچا کر لو۔ آگے پٹڑی ٹوٹی ہوئی ہے۔
حوالدار، حوالدار، سٹیشن ماسٹر چلایا۔ یہ محض میری ڈیوٹی میں مداخلت کر رہا ہے۔ سٹیشن ماسٹر دیر تک چلاتا رہا کسی نے جواب نہ دیا۔
شاہ نے قہقہہ مارا۔ کہاں ہے تیرا حوالدار۔ پلس تو حقہ پینے اور تماشا دیکھنے آئی ہے۔
فتے، فتے سٹیشن ماسٹر چلایا۔ سگنل گرا دو۔
سگنل گرایا تو حادثہ ہو گا صوبہ بولا۔
اسٹیشن سے باہر چاہے کچھ ہو جائے۔ میرے سٹیشن پر کچھ ہوا تو میں افسروں کو کیا جواب دوں گا۔
تیرے باپ کا سٹیشن ہے کیا۔ شاہ نے دھونس دی۔
سالہ ڈرتا ہے صوبہ بولا۔ حرف نہ آئے۔
دیر تک سٹیشن ماسٹر سگنل کی طرف دیکھتا رہا، لیکن سگنل ڈاؤن نہ ہوا۔ فتہ کانٹے کے پاس بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

دیکھو شاہ جی سٹیشن ماسٹر ڈھیلا پڑ گیا۔ گاڑی کے ساتھ بلوچ رجمنٹ کا دستہ ہو گا۔ وہ فائر کھول دیں گے۔

ان کو ہم سمجھ لیں گے۔ شاہ نے کہا اور جھاڑیوں میں چھپے ہوئے نوجوانوں کو اشارہ کیا۔

اس پر ساٹھ ستر نوجوان ہاتھوں میں کلہاڑیاں اٹھائے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے پلیٹ فارم کی طرف دوڑے۔ یہ دیکھ کر سٹیشن ماسٹر کے اوسان خطا ہو گئے۔

اندھیرے میں لائن لگا لو۔ صوبے نے حکم چلایا اور خاموشی سے انتظار کرو۔

کچھ دیر تک شور شرابا قائم رہا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

پھر شاہ بولا۔ دیکھو جب تک میں اللہ اکبر کا نعرہ نہ لگاؤں کوئی اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھے۔

سٹیشن ماسٹر اپنی لالٹین جلاتا ہوا کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس اثناء میں پولیس والے سٹیشن پر آ گئے تھے اور ایک بنچ پر بیٹھ کر یوں اطمینان سے ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگے تھے۔ جیسے سب اچھا ہو۔

دور سے گاڑی کی روشنی نظر آئی تو ایمن آباد کے نوجوان جوش کی وجہ سے مضطرب ہو گئے، لیکن پولیس والے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ سٹیشن ماسٹر بتی ہاتھ میں لیے بار بار سگنل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کانٹے کے پاس بہتہ آرام سے بیٹھا تھا۔ اس نے سگنل نہیں گرایا تھا۔

ریفوجی ٹرین

گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔

گاڑی میں کوئی روشنی نہ تھی۔ دروازے بند تھے۔ کھڑکیوں پر لکڑی کے تختے چڑھے ہوئے تھے۔

گاڑی کے رکتے ہی گارڈ اور بلوچ سپاہی نیچے اتر آئے۔

اسٹیشن ماسٹر میجر نے کہا۔ گاڑی کیوں رکی ہے۔

گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ شاہ بولا۔

تم کون ہو۔ میجر غرایا۔

میں بھی ہوں شاہ نے جواب دیا۔

گاڑی آگے جائے گی میجر چلایا۔

ہماری لاشوں پر آگے جائے گی۔ صوبے نے لنگڑی ٹانگ سے ہٹ لگاتے ہوئے کہا۔

کچھ پرواہ نہیں میجر بولا چاہے لاشوں پر جائے مگر جائے گی۔

مسلمانوں کی بیسیوں گاڑیاں کٹ چکی ہیں شاہ نے کہا۔

یہ گاڑی بہرحال نہیں کٹے گی میجر بولا۔

ہم مسلمانوں کے خون کا بدلہ لیں گے صوبے نے کہا۔

ہم فائرنگ کا حکم دیں گے۔ میجر بولا۔

دے دو حکم۔ شاہ بولا ہم تمہاری بندوقوں سے نہیں ڈرتے۔ یہ کہہ کر شاہ نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ جواب میں ستر نوجوانوں کے نعرے سے سبھی لرز گئے۔ نوجوانوں نے بڑھ کر فوجی سپاہیوں کو گھیرے میں لے لیا۔

گاڑی میں سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ اندر ہندنیاں چیخ رہی تھیں۔ باہر حملہ آور چنگھاڑ رہے تھے۔ درمیان میں میجر غصے سے بل کھا رہا تھا۔

کھولو فائرنگ شاہ غصے میں چلایا۔ مسلمان ادھر غنڈوں کے ہاتھوں کٹ رہے ہیں ادھر فرض شناس افسروں کے ہاتھوں کٹیں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اس کے منہ سے کف جاری تھا۔ مارو مسلمانوں کو مارو۔ لاشوں کے پشتے لگا دو۔

میجر خاموش کھڑا تھا۔ سپاہی اثر سے بھیگے ہوئے تھے۔ لنگڑا صوبہ بھیڑ کو کاٹ کر داخل ہوا۔ میجر' وہ بولا۔ آگے ریل کی پٹڑی اکھڑی ہوئی ہے۔ گاڑی آگے نہیں جا سکتی۔

کہاں سے اکھڑی ہوئی ہے حوالدار بولا۔

یہاں سے ایک ڈیڑھ میل دور صوبے نے جواب دیا۔

تمہارا مطلب ہے ہمارے تھانے کی حدود میں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ساری مصیبت ہمارے سر پر آ پڑے گی۔ پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل چلایا۔

مصیبت تو مسلمانوں کے سر پر پڑی ہوئی ہے۔ ادھر بھی کٹ رہے ہیں۔ ادھر بھی کٹ رہے ہیں۔ اور تم۔ تم کو اپنی نوکریوں کا فکر ہے۔

نوکری کا فکر نہیں۔ ڈیوٹی لگی ہوئی ہے میجر بولا۔

تو کرو ڈیوٹی فائرنگ کھولو۔ منہ کیا تک رہے ہو۔ شاہ بولا۔

آؤ میجر آؤ تھانے دار بولا۔ آؤ دیکھیں پٹڑی کہاں سے کٹی ہوئی ہے۔

ہاں میجر بولا پٹڑی کو ٹھیک کرنا ضروری ہے پھر وہ فوجی جوانوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ہم ابھی آتے ہیں۔ گاڑی کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں ٹارچیں جلا کر چل پڑے۔

کہو بھئی جوانوں صوبہ بولا کیا ارادے ہیں۔ فائرنگ کھولو گے۔

ہمیں جو حکم ملے گا۔ وہی کریں گے۔

تمہیں کیا حکم ملا ہے۔ شاہ نے پوچھا۔

جو صاحب حکم دیں گے۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے تم صاحب کی واپسی کا انتظار کرو صوبہ بولا۔

اس پر شاہ نے اشارہ کیا۔ تمام نوجوان کلہاڑیاں اٹھائے گاڑی پر پل پڑے۔

پھر شور شرابے کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔

گاڑی کے اندر ہندنیاں چیخیں مار رہی تھیں۔

باہر نوجوان چنگھاڑ رہے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر کلہاڑیاں چل رہی تھیں۔

اس پر گاڑی کے اندر کہرام تیز تر ہو گیا۔

پھر ہجوم میں کوئی چلایا۔ وہ دیکھو گاڑی کی چھت پر۔

چھت پر ایک جوان بھاگ رہا تھا۔

دو نوجوان چھت پر چڑھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد چھت سے ایک لاش پلیٹ فارم پر آ گری۔ یہ منظر دیکھ کر گاڑی والوں نے از خود دروازے کھول دیے چند ہندو باہر نکل آئے۔

"پھر کوئی چلایا۔ گاڑی کی پچھلی طرف سے لوگ نکل کر بھاگ رہے ہیں۔ چند نوجوان ادھر بھاگے۔

مرنے والوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

ہندو ہاتھ جوڑ کر منتیں کر رہے تھے۔ حملہ آور اپنا جوش و خروش قائم رکھنے کے لیے چنگھاڑ رہے تھے۔

دیر تک خوان خرابہ جاری رہا پھر حملہ آوروں کی توجہ لوٹ کی طرف مبذول ہو گئی۔ صندوق سوٹ کیس بستر ٹوکریاں دھڑا دھڑ پلیٹ فارم پر ڈھیر ہونے لگیں۔

میری پنیاں

اس وقت اس ڈبے کا دروازہ کھلا جسے اشفاق اور بشیر کلہاڑیوں سے کلٹ رہے تھے ایک ادھیڑ عمر کی ہندنی باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈول تھا جس میں پنیاں تھیں۔

بھگوان کے واسطے مجھے نہ مارو۔ بھگوان کے واسطے مجھے نہ مارو۔ وہ ہاتھ باندھ کر ان کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ مجھے اپنے پاس رکھ لو۔ نوکر بنالو' پر مارو نہیں۔

وہ ملتجی نگاہوں سے اشفاق کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے پیچھے پیچھے کئی ایک لٹی پٹی بھدی بدنما ہندنیاں کھڑکیوں میں آگئیں وہ سب ہاتھ جوڑے منتیں کر رہی تھیں۔ بھگوان کا واسطہ دے رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر احمد بشیر کا جوش مدھم پڑ گیا۔ اتنا خون دیکھ کر میرا دل مالش کرنے لگا جی چاہتا تھا کہ اس منظر سے دور بھاگ جاؤں۔

پلیٹ فارم پر اس وقت بہت سے کالے صندوق پڑے ہوئے تھے' لیکن مجھے کالا صندوق یاد ہی نہ رہا تھا۔

عمر رسیدہ ہندنی نے جھک کر اشفاق کے پاؤں پر سر رکھدیا۔ میں جندگی بھر تیری سیوا کروں گی۔ مجھے ساتھ لے چل۔

اشفاق لاحول پڑھ رہا تھا۔ بکواس بند کر۔ پیچھے ہٹ جا۔ وہ مصنوعی غصے میں چلا رہا تھا۔

اس اثناء میں دو نوجوان اشفاق حسین کے قریب آکھڑے ہوئے۔ ایک نے ہاتھ بڑھا کر ہندنی کے ڈول سے ایک پنی اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔

ہندنی شیرنی کی طرح اٹھ بیٹھی۔ میری پنیاں میری پنیاں وہ ڈول کی طرف لپکی۔

نوجوان کا منہ جس نے پنی منہ میں ڈالی تھی۔ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے پنی ہاتھ پر اگل دی۔ پنی میں سے سونے کا بندہ نکل آیا۔ اسے وہ چلایا ان پنیوں میں سونے کے زیور چھپائے

ہوئے ہیں۔

یہ سن کر ہندنی ڈول پر گٹھڑی بن کر بیٹھ گئی۔

نوجوان ڈول پر جھپٹے۔ اشفاق اور بشیر کلہاڑیاں اٹھا کر ہندنی کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں یوں ہندنی کو بچانے پر تل گئے' جیسے وہ ہندوؤں کو مارنے کی بجائے اتنی دور سے چل کر ان کی رکشا کرنے آئے ہوں۔

لٹیرے تعداد میں زیادہ تھے۔ ہندنی کو بچانے کے لیے احمد بشیر نے پنیوں کے ڈول کو ٹھڈا مارا۔ سارے لڈو پلیٹ فارم پر بکھر گئے۔ حملہ آور ہندنی کو چھوڑ کر لڈوؤں کے پیچھے بھاگے۔

ہندنی بین کرنے لگی۔ اشفاق حسین نے ہندنی کو گھسیٹنا شروع کر دیا تاکہ حملہ آوروں کی توجہ سے دور ہو جائے۔

خون بھری گٹھڑی

احمد بشیر سوچ رہا تھا کہ کس طرح اشفاق کی مدد کرے کہ اچانک گاڑی کی کھڑکی سے ایک گٹھڑی باہر آ گری۔ احمد بشیر نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اس کے ہاتھ خون سے لت پت ہو گئے۔ وہ ایک ہندو لڑکی تھی جس کی پیٹھ پر زخم آیا تھا۔ احمد بشیر نے اسے دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا اور گاڑی سے دور لے گیا۔ ایک بنچ پر اسے لٹا کر اس نے پلیٹ فارم سے مٹی اکٹھی کی اور اس کے زخم پر چھڑکنے لگا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے زخمی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ گاڑی اور پلیٹ فارم میری نظروں میں گھوم رہے تھے۔ دل مالش کر رہا تھا۔ میں نے بشیر کو کہنی ماری' چلو چلیں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

تم میرا سائیکل لے آؤ' وہ بولا۔

جب میں سائیکل لے کر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اشفاق حسین اور احمد بشیر دونوں زخمی لڑکی پر جھکے ہوئے ہیں۔ اشفاق نے لڑکی کو اٹھا کر سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا دیا اور خود سائیکل چلانے لگا۔ میں اور بشیر سائیکل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے تاکہ لڑکی کو سہارا دیئے رکھیں۔

جب ہم شاہراہ پر پہنچے تو دیکھا کہ سامنے سے فوجی گاڑیوں کا ایک دستہ آ رہا ہے۔ رک جاؤ

اشفاق نے کہا۔ چھپ جاؤ۔

ہم تینوں رک گے اور سڑک کے کنارے اگی ہوئی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ جھاڑیوں میں ایک ادھیڑ عمر ہندنی چھپی ہوئی تھی۔

جب ہم ایمن آباد پہنچے تو آدھی رات کا وقت ہو گا۔ بازار ویران تھا' لیکن گھروں میں بتیاں جل رہی تھیں۔ لوگ جاگ رہے تھے شیخانیاں ہاتھ چلا چلا کر باتیں کر رہی تھیں' جب شیخانیوں نے جوانوں کو پراٹھے دے کر سٹیشن کی طرف رخصت کیا تھا تو وہ بہت خوش تھیں۔

بپھری شیرنیاں

پھر صوبے کی ماں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس نے سرداراں کو بتا دیا کہ صوبہ سارا دن چھرے اور کلہاڑیاں ڈھونڈتا رہا ہے۔ یہ سن کر شیخانیوں کو شک پڑ گیا پھر نو بہار نے صاف کہہ دیا کہ مسلمان ریفوجیوں کی خبر نوجوانوں نے اس لیے اڑائی تھی تاکہ مزاحمت سے بچیں اور تصادم نہ ہو۔

اس پر شیخانیاں غصے سے لال ہو گئیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں دھوکا دیا گیا ہے۔ ان کی توہین کی گئی ہے۔

انہوں نے گھر گھر پیغام پہنچا دیا کہ لٹیروں اور قاتلوں کو ذلیل کیا جائے۔ ان سے ایسا برتاؤ کیا جائے کہ عمر بھر یاد رکھیں۔

اگرچہ شیخانیاں قتل و غارت کے خلاف تھیں لیکن اس وقت ان کے غصے کی وجہ یہ تھی کہ نوجوانوں نے گھر والیوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر قدم کیوں اٹھایا تھا۔ یہ گھر والیوں کے اقتدار کے خلاف سازش تھی۔ اگر اس کا سدباب نہ کیا تو ان کی صدیوں پرانی برتری کی روایت ختم ہو جائے گی۔

اس کے باوجود گھر والیاں بیٹوں بھائیوں کے لیے فکر مند بھی تھیں۔ مائیں چراغ لیے دروازوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بہنیں کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔

نوجوان دلہنوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ لب خاموش تھے۔ اظہار کی اجازت نہ تھی۔

جب ہم گھر پہنچے تو اشفاق کی بیوی خورشید سیڑھیوں میں کھڑی تھی۔ اس نے خون سے

رنگی گٹھڑی کو اپنی مضبوط بانہوں پر اٹھالیا۔ ادھیڑ عمر ہندنی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

گھر والیاں خون سے لتھڑی ہوئی گٹھڑی کو دیکھ کر سارا غصہ بھول گئیں۔ ان کی توجہ زخمی لڑکی پر مرکوز ہو گئی۔ ایک دودھ گرم کرنے کے لیے دوڑی' دوسری دوپٹہ پھاڑ کر پٹی بنانے لگی۔ تیسری زخموں کی مرہم تلاش کرنے لگی۔

اشفاق بشیر اور میں یوں چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے تھے جیسے گاڑی لوٹ کر نہیں بلکہ خود لٹ کر آئے ہوں۔ عمر رسیدہ ہندنی دروازے سے باہر زمین پر بیٹھ گئی تھی کسی نے اس کا نوٹس نہ لیا تھا۔

جب گھر والیاں زخمی ہندنی کے زخموں کے مرہم پٹی سے فارغ ہو ئیں تو انہوں نے حیرت سے عمر رسیدہ ہندنی کی طرف دیکھا۔

ایک بولی۔ ماں تو یہاں زمین پر کیوں بیٹھی ہے۔

ماں ——— ہندنی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ دوسری نے اٹھ کر اس کی بانہہ پکڑ کر اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔

ایک بولی ماسی تو نے ماں کو دودھ نہیں پلایا۔

میں ابھی لائی خورشید نے کہا۔ پھر ہندنی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ بہن تو آرام سے بیٹھ۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھ۔

ہندنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

جب وہ گاڑی سے اتری تھی تو چیخی تھی۔ چلائی تھی' لیکن آنکھوں سے آنسو نہیں نکلا تھا۔ اب بے ساختہ آنسو رواں تھے۔

عین اس وقت نیچے گلی سے شیخانیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ گھر کی تمام عورتیں نیچے اتر گئیں۔

دراصل وہ ایمن آباد کی شیخانیوں کا جلوس تھا وہ ہر گھر پر رکتیں دروازہ کھٹکھٹاتیں اور پوچھتیں کہ گھر میں کوئی ہندنی تو نہیں لائی گئی۔

بن بیاہے لوگوں کے گھر میں ان کا رویہ مختلف ہوتا۔ بڑی بوڑھیاں گھر میں داخل ہو جاتیں۔ پھر لالٹین اٹھا کر سارے گھر کی تلاشی لیتیں کہ گھر میں ہندنی کو چھپا تو نہیں رکھا۔ اگر کوئی

ہندنی مل جاتی تو اسے ساتھ لے آتیں اور کسی ذمہ دار شیخانی کے سپرد کر دیتیں۔ یہ سے لے ماسی اسے تو اپنے گھر میں رکھ لے۔ انہیں صرف ایک خطرہ تھا کہ ایمن اباد میں کسی ہندنی کی آبرو نہ لٹ جائے۔

اس رات شیخانیوں کا جلوس ایمن آباد کی گلی گلی میں گھو تا رہا۔

اس رات ایمن آباد سے کل چھبیس ہندنیاں بر آمد ہوئیں۔

تیسرا باب

پرمیلا، پیتمبے، شکنتلا

ایمن آباد میں ہندنیوں کی آمد نے ہل چل مچا دی۔

معمر شیخوں نے جب دیکھا کہ شیخانیوں نے اتنا بڑا کام کر دکھایا ہے۔ تو انہوں نے سوچا کہ ہم کیوں پیچھے رہ جائیں۔

اگلے روز وہ سب نوبہار کی حویلی میں اکٹھے ہو گئے۔ بڑی باتیں ہوئیں۔ اتنی کہ ڈھیر لگ گئے۔ بات بھی درست تھی شیخوں کا شیخانیوں سے مقابلہ جو ٹھن گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ ہم کون سا کارنامہ سرانجام دیں۔ ہر کسی نے اپنی اپنی تجویز پیش کی جس پر دل کھول کر بحث ہوئی۔

بیت المال

آخر نو بہار فیصلہ کن انداز میں بولا' بھئی سیدھی بات ہے۔ شیخانیوں نے ہندنیوں کی عصمتیں بچائی ہیں۔ تو ہم لوٹ کا مال اکٹھا کرتے ہیں۔ ایک مال خانہ بناتے ہیں۔ جب لٹے پٹے مسلمان بھارت سے آئیں گے تو ان میں تقسیم کر دیں گے تاکہ وہ آباد ہو سکیں۔

اس تجویز پر سارے لوگ واہ واہ کرنے لگے۔

ایمن آباد سے دیوانوں کے انخلا کے بعد نو بہار ایمن آباد کا واحد سرمایہ دار تھا۔ اسے تقسیم

سے چنداں دلچسپی نہ تھی' لیکن لوٹ کا مال ———— کیا مضائقہ ہے۔ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کا نادر موقعہ تھا۔

اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ شیخ نو مسلم تھے اور بنیوں کے خواص ابھی ان میں باقی تھے۔ لیتا ہوتا تو ہاتھ آگے بڑھاتے۔ دینا ہوتا تو ہاتھ پیچھے کر لیتے۔

شیخوں کی اس خصلت پر کسی زندہ دل شیخ نے ایک لطیفہ گھڑ رکھا تھا کہ ایک شیخ کسی گڑھے میں گر گیا۔ بہت کوشش کی' لیکن باہر نکل نہ سکا۔

اتنے میں ایک آدمی ادھر سے گزرا۔ شیخ نے با آواز بلند شور مچایا کہ مجھے اس گڑھے سے نکالو۔ راہ گیر نے اپنا ہاتھ بڑھایا بولا شیخ جی مجھے اپنا ہاتھ دیں۔ لیکن شیخ چپ چاپ کھڑا رہا۔

راہگیر نے کئی ایک بار کہا۔ شیخ جی اپنا ہاتھ دیں' لیکن شیخ نے ہاتھ نہ دیا۔ راہ گیر حیران تھا کہ گڑھے سے نکلنا تو چاہتے ہیں' لیکن ہاتھ نہیں دیتے۔

اتنے میں ایک بوڑھا شیخ آ گیا۔ راہ گیر نے کہا میں کب سے کہہ رہا ہوں کہ دیجئے اپنا ہاتھ۔ لیکن یہ ہاتھ بڑھاتے ہی نہیں۔ اس پر بوڑھا ہنسنے لگا۔ بولا برخوردار شیخ دے گا نہیں۔ تم کہو شیخ جی لیجئے میرا ہاتھ۔ تو وہ جھٹ اپنا ہاتھ بڑھا دے گا۔

بہر حال ایمن آباد کے شیخ سودے کے پکے تھے چاہے منہ زبانی ہو۔ گواہ کوئی نہ ہو۔ سودا ہو گیا تو ہو گیا۔ جیسے پتھر پر لکیر پڑ گئی ———— وہ امانت میں خیانت نہیں کرتے تھے۔ بے شک ان میں مال کی حرص تھی لیکن دوسرے کے مال کو ہتھیانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

نو بہاران تفصیلات کو اچھی طرح سے جانتا تھا اس لیے شیخوں کو آلہ کار بنانے کے لیے اس نے اپنی بات کی وضاحت کی بولا بھائیو لوٹ کا مال ہم پر حرام ہے۔ ہمیں اللہ نے کھانے پینے کو بہت دے رکھا ہے۔ وہ مال دراصل ان مسلمانوں کا حق ہے جو بھارت سے لٹے پٹے یہاں آئیں گے۔

شیخ ہمدم نے کہا۔ بے شک یہ مال ہم پر حرام ہے ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ شیخ ہمدم کے پاس اللہ کی دی ہوئی ایک کچی کوٹھری تھی۔ جو برسات کے دنوں میں چوتی تھی اور شیخ ہمدم اسے پکا کرنے کے خواب ایک مدت سے دیکھ رہا تھا۔

سب نے شیخ ہمدم کی بات پر واہ واہ کی۔

پھر نو بہار بولا۔ بھائیو میں معافی چاہتا ہوں۔ بوڑھا ہوں ہمت نہیں کہ تمہارے ساتھ گھر گھر جا کر لوٹ کا مال بر آمد کروں۔ یہ نیک کام تمہیں ہی کرنا ہو گا۔

بالکل بالکل۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

البتہ میں یہ خدمت کر سکتا ہوں نو بہار بولا کہ اپنی کوٹھی کا ایک کمرہ اور دو ایک تجوریاں مال خانے کے لیے وقف کر دوں۔ آپ بے فکر ہو کر مال اکٹھا کریں اور اسے بیت المال میں جمع کرا دیں۔ مال کی فہرست بنا کر اپنے پاس رکھ لیں جب بھی چاہے پڑتال کر لیں۔ میرا منشی ہر چیز کا حساب کتاب رکھے گا۔ ہم مال کی رکھوالی کریں گے اور جب مسلمان مہاجرین یہاں آئیں گے تو آپ کے حوالے کر دیں گے تاکہ آپ اپنے ہاتھوں سے تقسیم کر سکیں۔

اس پر چاروں طرف سے سبحان اللہ ——————— اللہ آپ کو جزائے خیر دے کا شور اٹھا۔ جسے سن کر نو بہار کے چہرے پر خوشی کی سرخی دوڑ گئی اور اس کی ہتھیلیوں میں کھجلی ہونے لگی۔

پھر چاروں طرف شور مچ گیا۔

سبھی اس بات پر متفق تھے کہ یہ کار خیر فی الفور شروع کر دیا جائے۔

منہ کالا

ابھی محفل برخواست نہیں ہوئی تھی کہ احمداں گکے زین روتی پیٹتی ہوئی حویلی میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکا تھا۔ احمداں نے اس کے گلے میں دوپٹہ باندھ رکھا تھا۔ جسے کھینچتی ہوئی وہ اسے اندر لا رہی تھی۔ لڑکے کے منہ پر کالک ملی ہوئی تھی۔

حویلی کے دروازے میں کھڑی ہو کر احمداں سیاپا کرنے لگی۔ کبھی دونوں ہاتھ چھاتی پر مارتی' کبھی گالوں پر اور کبھی سر پر اور ساتھ چیخے جاتی۔

لوگو میں لٹ گئی۔ میرے گھر کی عزت خاک میں مل گئی۔ ہمارے منہ پر کالک مل گئی۔

کیا ہوا کیا ہوا احمداں۔ سب حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

احمداں نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ بولی اس سے پوچھو۔ کیا کرتوت کی ہے اس نے۔

اب بولتا کیوں نہیں اس نے دوپٹے کو کھینچ کر لڑکے کو گھسیٹا۔ اب بتا انہیں اپنی کرتوت۔

یہ لڑکا ہے کون' ایک نے پوچھا۔

پتہ نہیں کون ہے' دوسرے نے کہا۔

ارے یہ تو احمداں کا پتر بالا ہے۔

بالا۔ حیرت بھری سرگوشی پھیل گئی۔

یہ کیا حلیہ بنایا ہے تو نے بالے' کسی نے پوچھا۔

منہ پر کالک کیوں ملی ہے۔

اس نے نہیں' میں نے ملی ہے۔ یہ کالک' احمداں چلائی۔ ابھی تو میں اسے گدھے پر بٹھا کر سارے گاؤں میں پھراؤں گی۔

پر اس نے کیا کیا ہے احمداں۔

احمداں بات کا پتہ بھی چلے۔

بات کا پتہ دینے کے لیے تو میں اسے یہاں لائی ہوں۔ یہ کہہ کر احمداں نے اپنی جھولی میں لگائی ہوئی گرہ کھولی اور اس میں سے چار طلائی زیور نکال کر شیخوں کے سامنے پھینک دیئے۔

تو کیا تو نے اس کا منہ اس لیے کالا کیا ہے کہ یہ لوٹ کا مال لے آیا ہے۔

احمداں لوٹ کا مال کون نہیں لایا۔

سبھی لائے ہیں۔

تو اس کو کیوں ذلیل کر رہی ہے احمداں۔

مال کے لیے منہ کالا نہیں کیا میں نے احمداں بولی۔ اسے پوچھو کہ یہ گاڑی سے کسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور پھر جب رات کو محلے والیاں گھر آئی تھیں تو اس نے ہندنی کے منہ میں رومال ٹھونس کر محلے والیوں سے کہہ دیا تھا کہ میں تو کسی کو بھی ساتھ نہیں لایا۔

اور پھر رات بھر یہ گھر میں اکیلا رہا۔ پتہ نہیں اس بے چاری کے ساتھ منہ کالا کیا کہ نہیں۔ سارے ایمن اباد کی کری کرائی پر پانی پھیر دیا۔

لیکن تو کہاں تھی احمداں۔

تو اندھی بہری بنی بیٹھی رہی کیا۔

جو میں گھر میں ہوتی تو پھر بات ہی کیا تھی۔ اس کی کیا مجال تھی کہ میرے ہوتے ہوئے کچھ

کرتا۔ میں تو اپنے میکے سمبڑیال گئی ہوئی تھی۔ بہن رحماں کو ملنے' احمداں بولی مجھے پتہ ہوتا کہ میرے پیچھے خاندان کا منہ کالا ہو جائے گا تو میں کیا گھر چھوڑ کر جاتی کہیں۔

نوبہار بولا۔ یہ زیور تو اٹھالو شیخ صاحب ان سے بیت المال کی بسم اللہ کریں۔

احمداں بولی۔ اے چودھری تجھے زیور کی پڑی ہے۔ میں کہتی ہوں اس لڑکے کا فیصلہ کرو پہلے۔ چاہے گدھے پر چڑھا چاہے میری آنکھوں کے سامنے چھری سے گلہ کاٹ دو۔ کیا مجال جو میں کچھ کہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھوں میں ہے۔

میں کھڑا حیرت سے احمداں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ جٹی تھی' لیکن اتنا جذبہ۔

میں تو ان سب لوگوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ مجھے خیال آتا کہ چاروں طرف کشت و خون کا بازار گرم ہے' لیکن ایمن آباد کے مسلمان کیسے مسلمان ہیں۔ جو ہندنیوں کی عصمتوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔

مائیں بیٹوں کا منہ کالا کر کے گدھوں پر بٹھا کر گاؤں میں گھمانے کی تجویز پیش کر رہی ہیں۔

احمداں کو اس ہندو لڑکی سے ہمدردی تھی جسے اس کے گھر میں آئے صرف ایک رات گزری تھی اور پیٹ جایا اپنا بیٹا اس کی نظر میں مجرم بنا کھڑا تھا۔

ان جانے میں میرے دل میں فخر کی ایک رو دوڑ گئی۔ میں مسلمان ہوں۔ میں مسلمان ہوں دل سے آواز اٹھی۔ ابھی ایک رات پہلے جب میں اشفاق حسین اور احمد بشیر کے ساتھ ایمن آباد کے ریلوے سٹیشن کے سامنے جھاڑیوں میں بیٹھا گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ تو مجھے یہ فکر تھا کہ اگر میں کسی ہندو کے پیٹ میں چھرا نہ گھونپ سکا تو کس منہ سے دعویٰ کروں گا کہ میں مسلمان ہوں۔ آج میں احمداں پر فخر محسوس کر رہا تھا جو ہندو لڑکی کی عصمت کی حفاظت کر رہی تھی اور اپنے بیٹے کا منہ کالا کر کے اسے بڑوں کے سامنے گھسیٹ لائی تھی۔

کتنی عجیب تھی میں نے سوچا کہ کل ایمن اباد کے مسلمان کہہ رہے تھے کہ اگر ہندوؤں کی گاڑی صحیح سلامت لاہور پہنچ گئی تو ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہو گا اور آج وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ایمن اباد میں ایک ہندنی کی عزت لٹ گئی تو ان کی اپنی عزت خاک میں مل جائے گی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسلمان کیا چیز ہے۔ اسلام کیا شے ہے۔

بہر حال میں بڑے غور و خوض سے اس ڈرامے کی ہر تفصیل کو دیکھ رہا تھا جو اس روز ایمن

آباد میں میرے سامنے کھیلا جارہا تھا۔

پھر شیخوں نے ایک کمیٹی بنائی۔ انہوں نے ہاتھ میں قرآن کریم اٹھایا اور وہ گھر گھر دروازہ کھٹکھٹا کر لوٹا ہوا مال برآمد کرنے لگے تاکہ اسے بیت المال میں جمع کرا دیں۔

ہم تینوں بھی ان کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔

تابا۔۔۔سنیارہ

پہلا دروازہ جو انہوں نے بجایا۔ تابے سنار کا تھا۔ تابا ایک طویل بیماری کے بعد فوت ہو چکا تھا' اس کا سارا اثاثہ علاج معالجے پر صرف ہو چکا تھا۔ تابے کے چار بیٹے تھے۔ جن میں سے تین بے کار تھے۔ سارا دن پتنگیں لوٹتے۔ گلی ڈنڈا کھیلتے اور بازار میں سانڈھوں کی طرح جھوم جھوم کر گھومتے پھرتے۔ اس کا چوتھا بیٹا گوجرانوالے میں کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اسی کے سہارے گھر چلتا تھا۔

دروازہ بجا تو تینوں لڑکے باہر نکل آئے اور قسمیں کھانے لگے کہ ہم تو گاڑی سے کچھ بھی نہیں لائے نہ کوئی ہندنی نہ سامان۔

شور شرابا سن کر ان کی ماں چادر لیے باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں جوتی تھی۔ باہر نکل کر اس نے بیٹوں کے سروں پر دھایں دھایں جوتیاں مارنا شروع کر دیں۔ تمہارا ستیاناس ہو۔ تم پر قرآن کی مار پڑے۔ مرجاؤ' کیڑے پڑ جائیں۔

اندر آ جاؤ بھائی وہ بولی۔ دونوں ٹرنک صحیح سلامت پڑے ہیں اور ان میں سے یہ زیور نکلے ہیں۔ اس نے زیور کی پوٹلی قرآن پاک پر رکھ دی۔

پھر وہ انہیں اندر لے گئی دونوں صندوق حوالے کرتے ہوئے بولی اور یہ دونوں تالے بھی لے لو جو ان پر لگے ہوئے تھے۔ اس کی باتیں سن کر میں حیران رہ گیا۔ چلو چلیں۔ گھر چلیں۔ میں نے ساتھیوں سے کہا۔

جب ہم گھر پہنچے تو دیکھا کہ زخمی لڑکی شکنتلے چارپائی پر پڑی ہے اسے تازہ پٹی بندھی ہوئی ہے اور ادھیڑ عمر کی ہندنی جس کا نام کور تھا۔ صحن کے ایک کونے میں اینٹوں کا چولہا بنا کر بیٹھی چاول ابال رہی ہے۔

اشفاق حسین نے یہ دیکھ کر غصے میں اپنی بیوی خورشید کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ اس کی بڑی بیٹی بھاگی بھاگی آئی بولی امی تو باہر عورتوں میں بیٹھی ہیں۔

اشفاق حسین نے پوچھا شکنتلے کو پٹی کس نے باندھی ہے۔

ڈاکٹر شریف آیا تھا۔ وہ بولی۔ وہ باندھ گیا ہے پٹی۔

ہوں۔ اشفاق حسین کا غصہ کچھ مدھم پڑ گیا پھر وہ کہنے لگا یہ کور کو کھانے پکانے پر کیوں لگا دیا ہے۔ اسے میں اس لیے تو نہیں اٹھا کر لایا کہ اس سے گھر کا کام کرائیں۔

اشفاق حسین کی آواز سن کر اس کی بیوی بھاگی بھاگی آئی۔ بولی میں کور سے گھر کا کام تو نہیں کروا رہی۔ کل سے اس نے نہ کچھ کھایا ہے۔ نہ پیا ہے۔

کیوں' اشفاق حسین غرایا۔

ایسے کیسے کھائے۔ ہمارے ہاتھ کا نہیں کھاتی۔ کہتی ہے دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔ میں کیا اسے بھوکی رہنے دیتی۔ میں نے کہہ دیا کور جو تو ہمارے ہاتھ کا نہیں کھاتی تو اپنا چولہا بنا لے ادھر ویڑے میں سوکھا راشن لے لے اور اپنے ہاتھ کا پکا اور کھا۔

اوہ یہ بات ہے' اشفاق حسین ٹھنڈا پڑ گیا۔

مسلے اور دھرم بھرشٹ

میں نے تو بلکہ ماں جیواں خالہ رکھی اور ماہی مہراں کو بلا لیا ہے اور ان سے کہہ دیا ہے کہ گھر گھر جا کر لوگوں سے کہہ دیں کہ کوئی کسی ہندنی کو اپنے ہاتھ کا کھانے پر مجبور نہ کرے۔ اے جب یہ واپس اپنے اپنے گھر جائیں گی تو کیا کہیں گی کہ ایمن آباد کے لوگوں نے ہمارے دھرم کا بھی خیال نہ کیا۔ زبردستی اپنے ہاتھ کا کھلا کھلا کر ہمارا دھرم برشٹ کرتے رہے۔ خورشید نے کہا۔

کور بیٹھی سن رہی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

شاید وہ سوچ رہی تھی کہ یہ مسلے کر کیا رہے ہیں۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر خوف کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں کرنے اور ایسا سلوک روا رکھنے میں ضرور ان کی کوئی چال ہے۔ بھلا مسلے ایسے ہو سکتے ہیں کبھی۔ وہ تو ایک

خونخوار قوم ہے جو گوشت کھاتے ہیں اور بات بات پر غصے سے بھوت بن جاتے ہیں۔

کور نے کسی مسلمان کو قریب سے نہ دیکھا تھا اور اب اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

کئی ایک دن اس کی آنکھوں پر خوف کا غلام چڑھا رہا۔ پھر خوف دور ہو گیا اور خالی حیرت سے وہ گرد و پیش کو دیکھتی رہی۔

اشفاق حسین روز صبح شکنتلے کو اپنی کمر پر اٹھا لیتا اور ڈاکٹر شریف کی دوکان پر جا پہنچتا۔ وہاں اسے دیر تک انتظار کرنا پڑتا، چونکہ بہت سی ہندنیاں جو اس روز ایمن آباد میں لائی گئی تھیں زخمی تھیں۔ جبھی ڈاکٹر شریف نے کہہ دیا تھا کہ زخمیوں کو دیکھنے کے لئے میں گھروں میں نہیں جا سکتا۔ انہیں اٹھا کر میری دکان پر لایا جائے۔

ڈاکٹر شریف ہندو زخمیوں کی مرہم پٹی کی کوئی فیس نہیں لیتا تھا۔ حالانہ ایمن آباد کے شیخوں نے فیصلہ کیا تھا کہ زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے محلے وار چندہ لگایا جائے اور چندے سے جو رقم موصول ہو وہ ڈاکٹر شریف کو ماہانہ کے طور پر دی جائے، لیکن ڈاکٹر نے رقم لینے سے انکار کر دیا تھا۔

صبح سویرے اس کی دوکان پر زخمیوں کو لایا جاتا۔ اس وقت ایمن آباد کے مقامی مریض ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرتے رہتے۔

چند ایک دنوں کے بعد شکنتلے کی پیٹھ کا زخم اچھا ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی کمر سیدھی ہونے لگی۔ پھر گھر والوں کو پتہ چلا کہ وہ بچی نہیں بلکہ نوجوان لڑکی ہے۔

ادھر شکنتلے کو اشفاق حسین کی پیٹھ پر چڑھنے سے لاج آنے لگی۔ اس نے ضد کرنی شروع کر دی کہ میں اپنے پاؤں چل کر شریف کی دوکان پر جاؤں گی، لیکن اشفاق حسین نہ مانا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ خود چل کر گئی تو اس کی پیٹھ پر دباؤ پڑے گا۔ اس دباؤ سے زخم کا پھر سے ہرے ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اشفاق حسین کے مکان کے ملحق خالہ سرداراں کا گھر تھا۔

خالہ سرداراں

خالہ سرداراں اشفاق حسین کی دور کی رشتہ دار تھی۔ وہ ایک پاک باز، خدا ترس، سگھڑ،

لڑاکا اور طرح دار بیوہ تھی۔ سارے قصبے میں اس کا دبدبہ تھا۔ نوجوان اس سے ڈرتے تھے۔ بڑے بوڑھے اس سے دبتے تھے۔ جس بات پر خالہ سرداراں کھڑی ہو جاتی اسے منوا کر رہتی۔ اس کا صرف ایک بیٹا تھا جو جہلم میں دکان کرتا تھا۔ دکان اتنی چھوٹی تھی کہ زیادہ آمدنی نہ تھی۔ گزارہ مشکل سے ہوتا تھا' لیکن خالہ سرداراں بڑی غیور تھی۔ گھر میں روکھی مسی کھا کر باہر شیرنی بن کر نکلتی جیسے گوشت کھا کر آئی ہو۔ حالانکہ اسے بیوہ ہوئے سات آٹھ سال ہو چکے تھے' لیکن رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔ وہ بن ٹھن کر باہر نکلتی ۔ گردن اٹھا کر چلتی اور اپنے بانکپن میں ذرا فرق آنے نہ دیتی۔ اس کے باوجود کسی کی مجال نہ تھی کہ آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھے۔

خالہ کا دیور یوسفا گاڑی سے پرتیماں کو اٹھا لایا تھا۔ خالہ نے یوسفے کو گھر میں داخل ہونے نہ دیا تھا۔ پرتیماں کی بانہہ پکڑ کر یوسفے کو دھتکار دیا تھا۔

پھر اس نے اپنے بستر پر دھلا ہوا کھیس بچھا کر پتیماں کو بٹھایا تھا۔ اس کے جسم کا بند بند ٹٹولا تھا۔ بیٹی کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ زخم تو نہیں لگا پھر جب اس کی تسلی ہو گئی تو وہ پیتیمے کو سینے سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

پتیماں پندرہ برس کی زرد رو لڑکی تھی۔ اس نے اسی سال میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ باپ کسی چھوٹے سٹیشن پر سٹیشن ماسٹر تھا۔ دو بڑے بھائی تھے۔ ماں مر چکی تھی۔ باپ اور بھائی کو قتل ہوتے دیکھ کر اس کے ہوش قائم نہ رہے تھے۔ اور وہ یوسفے کی باہوں میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

خالہ سرداراں کو روتے دیکھ کر پتیماں کی چیخیں نکل گئیں وہ اتنی شدت سے روئی کہ خالہ سرداراں کو اپنا رونا بھول گیا۔ اور وہ اسے تھپکنے لگی۔ پھر وہ دونوں روتے روتے سو گئیں تھیں۔

اگلے روز خورشید صبح سویرے خالہ سرداراں کی طرف جا پہنچی۔ حالانکہ وہ خورشید کی خالہ نہیں تھی' پھر بھی خورشید اسے خالہ سرداراں ہی کہا کرتی تھی۔ وہ سارے محلے کی خالہ تھی ہر کوئی اسے خالہ سرداراں کہا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بڑے بوڑھے بھی اسے خالہ سرداراں کہہ کر بلاتے تھے۔ خورشید نے دبی زبان سے بات کی بولی' خالہ تو پتیماں کو مجھے دے دے۔ تجھ پر خواہ مخواہ کا خرچہ پڑے گا۔ گھر میں دو چولہے جلیں گے۔ بڑوں نے فیصلہ جو کر دیا ہے کہ ہندنیوں کو اپنا چولہا

چونکا کرنے دو تاکہ ان کا دھرم بھرشٹ نہ ہو۔

خالہ سرداراں یہ سن کر شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ بہت بڑے بنے پھرتے ہو تم۔ میں مانتی ہوں۔ میرے پاس کھلانے کو حلوے مانڈے نہیں ہیں، لیکن آپ چاہے چٹنی کھاؤں اسے سونے کا نوالہ کھلاؤں گی۔ خالہ سرداراں ایسی گئی گزری بھی نہیں جتنا تم سمجھتی ہو۔

اس روز سارا دن خالہ سرداراں کی آواز سارے محلے میں گونجتی رہی۔ لوسن لو بہن، وہ ہر آتے جاتے سے قصہ چھیڑ لیتی۔

اسی روز اس نے پتیماں کا چولہا چونکا الگ کر دیا۔

تیسرے دن خالہ سرداراں اس کے چولہے پر جا بیٹھی۔ بولی بیٹی میں بھی تیرا پکایا ہوا کھاؤں گی۔ تو میرے ہاتھ کا کھانا نہیں کھا سکتی نا۔ میں تو تیرے ہاتھ کا کھا سکتی ہوں۔ تیرا دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔ پر میرا تو نہیں ہوتا۔

ساری عمر مجھے یہ آرزو رہی کہ میری بھی ایک بیٹی ہو۔ خالہ سرداراں آبدیدہ ہو کر بولی۔ اب ملی بھی آخری عمر میں تو میں اسے اپنے ہاتھ سے کھلا نہیں سکتی۔ ارے مجھے کتنا چاؤ تھا۔ خالہ سرداراں دہائیں کر کے رونے لگی۔

پرتیماں نے چولہا چونکا چھوڑ کر خالہ سرداراں کو دونوں بازوؤں میں تھام لیا اور اس کے گلے لگ کر رونے لگی تو میری ماتا ہے، تو میری سچی ماتا ہے۔ میری اپنی ماتا بچپنے میں سورگ باش ہو گئی تھی پھر پتا جی نے دوسرا بیاہ کر لیا اور میں سوتیلی کے گھر پلی۔ پتا جی نے بھی منہ موڑ لیا۔ جیون میں کسی نے مجھے اتنا پیار نہیں دیا تھا جتنا تو نے دیا ہے۔ تو مجھ سے پوچھتی ہے۔ پرتیماں تو میرے گھر میں اتنی حیران پریشان کیوں رہتی ہے۔ تجھے یہ گھر گھر نہیں لگتا کیا؟

میں تیرے گھر میں اتنی حیران اس لیے ہوں کہ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں سپنا دیکھ رہی ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ آنکھ نہ کھل جائے۔

خالہ سرداراں اپنا رونا بھول گئی اس نے پرتیماں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

مجھے کبھی کسی نے پیار نہیں دیا تھا۔ پتیماں بولی۔ پیار ملا بھی تو کہاں ملا۔

خالہ سرداراں غریب عورت تھی۔ وہ مشکل سے اپنا گزارہ کرتی تھی۔ پتیماں کے آنے سے اسے خاصی مشکل پڑ گئی تھی۔ کئی ایک دن تو وہ پتیماں کو اچھا کھلاتی رہی چونکہ اسے

معلوم تھا کہ بنتیاں اچھے گھر کی لڑکی ہے اور اچھا کھانے کی عادی ہے۔ پھر ایک دن وہ ہاتھ جوڑ کر بنتیاں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بولی بیٹیئے میری عزت اب تیرے ہاتھ میں ہے۔ یہاں مسور کی دال اور پودنے کی چٹنی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لڑکے نے جہلم سے دو مہینے سے خرچہ نہیں بھیجا۔ مجھے پتہ ہے تو اچھا کھانے کی عادی ہے پر میں مجبور ہوں۔ اگر مجھ میں توفیق ہوتی تو تیری خاطر تواضع کرتی۔

بنتیاں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

پھر بیٹیئے اٹھ بیٹھی اور گھر کا کام کرنے لگی۔ وہ کھانا پکاتی' برتن مانجتی' کپڑے دھوتی۔

پھر ایک روز وہ خورشید کے گھر آ گئی اور اشفاق حسین سے کہنے لگی۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ پھر وہ دونوں صحن میں جا کھڑے ہوئے اور دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔

اس بات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشفاق حسین گوجرنوالے جا کر کھدر کے کرتے اور رنگین دھاگا لے آیا اور بنتیاں فارغ وقت میں کرتوں پر پھول بوٹیاں کاڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

جب خالہ سرداراں کو پتہ چلا کہ بنتیاں پیسہ کمانے کے لیے کام کرتی ہے تو۔ غصے سے اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ بنتیاں کو تو کچھ نہ کہا' سیدھی خورشید کے گھر پہنچی۔ اشفاق حسین اور خورشید کو وہ وہ سنائیں کہ خدا کی پناہ۔ اشفاق حسین اور خورشید گردنیں لٹکائے سنتے رہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چونکہ خالہ سرداراں کے سامنے بولنا ممکن نہ تھا۔

ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد وہ آبدیدہ ہو گئی۔ کہنے لگی۔ میں نے اسے بیٹی بنایا ہے۔ اب کیا خالہ سرداراں بیٹی کی کمائی کھائے گی۔ نہ نہ میں تو مرتے مرتے مر جاؤں گی' لیکن بتیماں کی کمائی نہ کھاؤں گی۔

بتیماں بھی خورشید کے گھر آ پہنچی تھی اور اندر چھپ کر سن رہی تھی۔ وہ باہر نکل آئی اور بولی۔ تو نے مجھے اپنی بیٹی سمجھا ہی نہیں خالہ سرداراں' ورنہ تجھے میری محنت مزدوری اتنی نہ کھلتی۔ میں نے تو تجھے ماتا سمجھا ہے۔ ہمیشہ سمجھوں گی۔

ملاپ

عین اس وقت سیڑھیوں سے ششکنتلے نے چیخ کر کہا۔ بھابھی میری ماتا جی مل گئی۔ سب

سیڑھیوں کی طرف بھاگے دیکھا تو شکنتلا اور کور کے ساتھ ایک اور عورت کھڑی ہے۔

چونکہ شکنتلا کا پیٹھ کا زخم بھر چکا تھا اور ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس لیے اب اشفاق حسین کو اسے پیٹھ پر اٹھا کر ڈاکٹر کی دوکان پر لے جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لہٰذا صبح سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر کور شکنتلا کو ساتھ لے کر دوکان پر پہنچ جاتی۔ وہاں وہ اپنی باری کا انتظار کرتیں اور پھر دوا لگوا کر گھر لوٹ آتیں۔

اس روز جب وہ دوا لگوا کر چکری چوک میں پہنچیں تو شکنتلا نے کور سے کہا۔ رک جا میں ذرا پانی پی لوں۔

چکری چوک بازار کے عین درمیان میں واقع تھا' وہاں سے چار ایک گلیوں کے راستے نکلتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے اس کا نام چکری پڑ گیا تھا۔

چکری چوک میں ایک بوڑھا برھ کا درخت تھا' جس کے ساتھ ہی ایمن آباد کا اکلوتا مندر تھا۔ ہندوؤں کے جانے کے بعد لوگوں نے مندر کے تمام بت توڑ ڈالے تھے اور مندر کے راستے پر برھ تلے بہت سے خوانچے والوں اور ریڑھی والوں نے اپنے اڈے جما لیے تھے۔ برھ کے تنے کے پاس لوگ چوسر اور شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر کمیٹی کا نلکا تھا۔

شکنتلا کو پیاس لگی تو کور اسے مندر کے نلکے کی طرف لے گئی۔ نلکے پر چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت مندر کی طرف منہ کیے بیٹھی ہاتھ دھو رہی تھی شکنتلا نے اوک سے پانی پینا شروع کیا ہی تھا کہ عورت نے ایک چیخ ماری اور لپک کر شکنتلا کو گود میں لے کر والہانہ انداز سے اسے چومنے لگی۔ شکنتلا نے حیرت سے عورت کی طرف دیکھا اور چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ ماتا جی۔

چوسر بازوں نے کھیل چھوڑ کر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ خوانچے والے دوڑے دوڑے آ گئے۔ سارے بازار میں شور مچ گیا۔

لڑکی چیخیں مارے جا رہی تھی۔ ماتا جی۔ ماتا جی' چادر والی عورت کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

لوگ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے دیکھ رہے تھے' ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔ بازار سے لوگ دوڑ دوڑ کر آ رہے تھے کیا ہوا۔ کیا ہوا۔

اس روز سارے ایمن آباد میں ساوتری اور شکنتلے کے ملاپ کی باتیں ہوتی رہیں۔

شکنتلے سمجھتی تھی کہ ماتا جی سرگباش ہو گئیں۔ ساوتری سمجھتی تھی کہ اس کی بیٹی مر چکی ہے' اب زندگی کس کام کی۔

جب وہ دونوں گھر پہنچیں تو محلے کی ساری شیخانیاں اکٹھی ہو گئیں۔

ایک طرف ماں بیٹی ایک دوسری کو سینے سے لگا لگا کر رو رہی تھیں دوسری طرف شیخانیاں انہیں دیکھ دیکھ کر آنسو بہا رہی تھیں۔ ماحول جذبات سے اس قدر چپ چپ کر رہا تھا کہ اشفاق اور بشیر دونوں گھبرا کر بیٹ اٹھا کر کھیلنے کے بہانے باہر نکل گئے۔

مجھے مسلمان کرلو

پھر ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا اور ایمن اباد کے شیخوں کی توجہ ادھر لگ گئی۔

ماں بیٹی کے ملاپ کے ہنگامے کے سلسلے میں شیخانیوں کا اکٹھ ہو رہا تھا۔ شیخانیاں بن ٹھن کر آئی تھیں۔ کتر کتر باتیں ہو رہی تھیں۔ فقرے کسے جا رہے تھے۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ چائے چل رہی تھی کہ ایک شیخانی کھڑکی سے جھانک کر بولی اے لو احمداں آ رہی ہے۔ ادھر' ساتھ وہ لڑکی ہے کیا نام ہے اس کا۔

ضرور کوئی بات ہو گی جو احمداں آ رہی ہے۔

وہ تو نہیں آئی کبھی ادھر' تیسری نے کہا۔

لیکن ساتھ لڑکی کو کیوں لا رہی ہے۔

میں کہتی ہوں بالے نے کوئی نیا گل تو نہیں کھلایا۔

اے ذرا لڑکی کو تو دیکھو کیسے بانکپن سے چل رہی ہے۔

وہ تو ہے ہی بانکی۔ جبھی تو لڑکے دیوانے ہو رہے ہیں۔

بے چارے بالے کا کیا قصور ———— یہ لڑکی تو جہاں بھی رہے گی۔ یہی کچھ ہو گا۔

اتنے میں احمداں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔

سنا ماسی ادھر کیسے آئی ہو' ایک نے پوچھا۔

اے کیا بتاؤں بات ہی ایسی ہے میں تو زچ ہو گئی ہوں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔

میں نے کہا تمہارا مشورہ لوں بس اب اس معاملے کا فیصلہ تمہیں نے کرنا ہے۔ میرے بس کی بات نہیں یہ۔

تو بات تو کر ماسی۔

اے معاملہ بتائے گی تو ہی ہو گا نا فیصلہ

اسی لیے تو آئی ہوں میں' احمداں نے کہا۔

اے یہ لڑکی پر میلا ضد کر رہی ہے میں نے اسی کئی بار سمجھایا ہے۔ ڈانٹا ہے منتیں کی ہیں' پر یہ مانتی نہیں میری بات۔ کہتی ہے مجھے مسلمان کر لو۔

ساری شیخانیاں ہکی بکی رہ گئیں۔ انگلیاں ہونٹوں پر ٹک گئیں۔

طیفو اور احمداں

احمداں سمبڑیال کی ایک جٹی تھی۔ اونچا لمبا قد' بھرا بھرا جسم اور نشیلی آنکھ۔

ایمن آباد کا لطیف ککے زئی جو وہاں طیفو رنگیلا کے نام سے مشہور تھا۔ اور جسے محلے والیاں بات بات پر چھیڑا کرتی تھیں۔ طیفو یہ محلہ ہے یہاں آنکھیں اٹھایا نہ کر' جھکا کر چلا کر اور طیفو جھکی جھکی آنکھوں کو مزید جھکا کر کہا کرتا تھا' ہاں بھیناں۔

طیفو نے ایمن آباد میں کبھی گردن نہیں اٹھائی تھی۔ قصبے کی ہر بوڑھی اور جوان عورت اس کی بہن تھی' لیکن قصبے سے باہر نکل کر طیفے کی گردن کبھی نہ جھکی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں پھوٹتی رہتی تھیں۔ عورتوں کو سیدھی راہ سے ہٹانے۔ بہلانے پھسلانے میں طیفہ سارے علاقے میں مشہور تھا۔

ایک مرتبہ جب قصبے کے بڑے بوڑھے جمیلے کی شادی پر اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے تو طیفے کی بات چل پڑی۔

شیخ عنایت اللہ بولے' طیفے چھوٹی چھوٹی چال مچھلیاں پکڑنا کوئی بات نہیں مزا تو جب ہے کہ کوئی ڈولا مچھی شکار کر کے دکھائے۔

اس پر جیجا لہار بولا۔ شیخ جی اپنے سمبڑیال میں ایک جٹی ہے۔ یہ قد بت۔ دلیر ایسی کہ بوڑھوال کے ڈاکو سمبڑیال آئے تھے' ڈاکہ ڈالنے۔ ایک ڈاکو کی دینی احمداں جٹی کے ہاتھ آ گئی۔

بس پھر کیا تھا۔ ڈاکو نے اپنا پورا زور لگا دیکھا۔ جھٹکے دیے۔ دھکے دیے۔' لیکن جٹی سے بانہہ چھڑا نہ سکا۔ پہلے تو اس کے ساتھی ہنسی مذاق میں تماشا دیکھتے رہے' پھر جب معاملہ طول پکڑ گیا تو وہ اپنے ساتھی کو چھڑانے کے لیے آگے بڑھے۔ اس پر جٹی نے انہیں للکارا۔ بولی۔ بڑے مرد بنے پھرتے ہو۔ پہلے چوڑیاں پہن آؤ پھر ساتھی کی مدد کے لیے آگے بڑھنا۔ وہ وہیں رک گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ڈاکو اپنے ساتھی کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ طیفے تو اگر سمبڑیال کی جٹی کی بانہہ پکڑ کر اسے یہاں لے آئے تو جانیں۔

اس پر سبھی ہنسنے لگے۔

ایک بولا' طیفہ تو چھوٹے موٹے مال کا بیوپاری ہے۔

دوسرا کہنے لگا۔ جٹی اس کے بس کا روگ نہیں۔

طیفہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔

چھ مہینے کے بعد سارے قصبے میں شور مچ گیا۔ طیفہ جٹی احمداں کو لے آیا ہے۔ طیفہ جٹی احمداں کو لے آیا ہے۔ طیفہ جٹی احمداں کو لے آیا ہے۔

پھر احمداں' طیفے کا بیاہ بڑی دھوم دھام سے ہوا' جس میں سارے شیخوں اور شیخانیوں نے شرکت کی۔

احمداں جٹی کے آنے کے بعد طیفے کی زندگی یکسر بدل گئی۔ اس نے رنگ رلیاں چھوڑ کر کاروبار شروع کر دیا اور چند ہی سال میں لکڑی کے کاروبار میں چل نکلا۔

طیفہ زیادہ تر باہر رہا کرتا تھا۔ گھر میں احمداں اس کا بڑا بیٹا بالا اور دو چھوٹی بچیاں۔ نغمہ اور گوگی رہا کرتی تھیں۔

بالا

جب بالا پرمیلا کو گاڑی سے اٹھا کر لایا تھا تو اس کا باپ گھر پر نہیں تھا۔ اس روز احمداں بھی اپنی دونوں بیٹیاں ساتھ لے کر سمبڑیال گئی ہوئی تھی۔

بالا بہت خوبصورت جوان تھا۔ ایمن آباد کی ساری لڑکیاں اس پر ریجھی ہوئی تھیں۔ جب وہ گلی سے گزرتا تو لڑکیاں کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوتیں۔ اسے سلام کرتیں۔ اشارے کرتیں

——— بالے کو لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر سرسری طور پر مسکراتا' جھوٹی گلیڈ آئی چمکاتا اور آگے نکل جاتا۔

کام کے معاملے میں بالا بے حد نکما تھا۔ باپ نے زبردستی اسے سکول میں داخل کر دیا تھا' مگر وہ مشکل سے آٹھ جماعتوں تک چل سکا۔ پھر اس نے سکول چھوڑ دیا۔

اب اس کا کام آوارہ گردی کرنا۔ اکھاڑے میں ڈنڈ بیٹھک لگانا اور جوان لڑکوں کے ساتھ گیند بلا کھیلنا تھا۔

جب احمداں جی واپس ایمن آباد میں آئی اور اس نے دیکھا کہ گھر میں ایک ہندو لڑکی بیٹھی ہے' تو اس نے جوتا اٹھا لیا اور مار مار کر بالے کا بھرکس نکال دیا پھر وہ اس کا منہ کالا کر کے بڑوں کے سامنے لے گئی۔

وہاں سے واپس آکر اس نے بالے کو گھر سے نکال دیا اور کہہ دیا خبردار جو تو نے اس گھر میں قدم رکھا تو۔

پھر وہ پرمیلا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کا منہ دھلایا۔ کپڑے بدلوائے کھانا کھلایا اور پھر پیار سے بولی۔ ہے بیچاری کیا حال بنا ہے تیرا۔ ہے میں کیا کروں یہ لڑکا ہاتھوں سے نکلا ہوا ہے۔ میں تو بس مار پیٹ ہی کر سکتی ہوں نا۔ مار کھا لیتا ہے پر اپنا چالا نہیں چھوڑتا۔ یہ بتا لڑکی کل رات کو اس نے ———

وہ رک گئی۔ پھر بولی۔ تو اکیلی تھی نا یہاں' اس نے ———

وہ پھر رک گئی۔

پرمیلا نے سر جھکا لیا' جھکائے رکھا۔

اس کے بعد جب پرمیلا احمداں سے بہت مانوس ہو گئی تھی' جب وہ اس کی ہر بات کا آزادانہ جواب دینے لگی تھی۔ تب احمداں نے کئی بار اس سے یہی سوال کیا تھا' بار بار کیا تھا' لیکن جب بھی وہ یہ سوال پوچھتی پرمیلا سر جھکا لیتی۔ اس کے چہرے یا انداز سے کبھی پتہ نہ چلا تھا کہ اس رات کیا ہوا تھا' کچھ ہوا بھی تھا یا نہیں۔ یہ تفصیل آج تک سربستہ راز رہی تھی۔

اگر پرمیلا ہلکی سی جنبش سے سر ہلا دیتی' چاہے نفی یا اثبات میں یا اس کے چہرے پر نفرت' حقارت' غصہ یا شرم کا جذبہ جھلک جاتا' تو احمداں کے سینے سے بوجھ اتر جاتا' لیکن ایسا نہ ہوا۔

پرمیلا

پرمیلا معصوم بچی نہ تھی وہ ایک دانی پردہانی لڑکی تھی۔ بی ۔ اے کر چکی تھی۔ شکل و صورت ایسی نہ تھی کہ اسے خوبصورت کہا جا سکے' لیکن تھی بڑی جاذب نظر اور اتنی تیکھی تھی کہ دھار کی طرح کاٹ کرتی تھی۔

بات چیت کرنے میں تو اس کا جواب نہ تھا۔ ایسی برجستہ اور لذیذ باتیں کرتی کہ کوئی سنے تو سنتا ہی رہ جائے اور اتنی موقعہ شناس تھی کہ محفل کا رنگ دیکھ کر بات کرتی تھی۔

چند ہی دنوں کے اندر اندر پرمیلا گھر پر یوں چھا گئی کہ احمداں ہر بات اس کے مشورے سے کرنے لگی۔

ایک دن پرمیلا نے کہا موسی۔ وہ احمداں کو موسی کہا کرتی تھی۔ موسی بیٹے کو گھر سے نکالے رکھنا اچھا نہیں لگتا۔ اب جو وہ اپنے چاچے کے گھر رہتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ لڑکا چاچا کے گلے منڈھ دیا۔

احمداں بولی میں تو چاہتی ہوں کہ وہ گھر آ جائے' پر مجھے اس پر اعتبار بھی ہو۔ وہاں چاچے کے گھر کے چوبارے پر کھڑا ہو کر ادھر دیکھتا رہتا ہے' جو یہاں آ کر اس نے تجھ پر ہاتھ ڈالا' تو میں تجھے کیسے منہ دکھاؤں گی۔

پرمیلا نے ہلکی سی مسکراہٹ بھی ہونٹوں پر نہ آنے دی۔ الٹا فکر مند ہو کر بولی۔ ہاں یہ تو ہے۔

احمداں بولی' اے بالے میں سبھی عیب تھے لیکن لڑکیوں کو منہ نہیں لگایا کرتا تھا۔ پتہ نہیں تیرے آنے پر کیوں بدل گیا ہے۔

بہرحال بالے کو گھر بلا لیا گیا اور ماں نے شرط لگا دی کہ جب تک پرمیلا کے پاؤں پڑ کر معافی نہ مانگے گا میں اسے معاف نہیں کروں گی۔

بالا پرمیلا کے پاؤں پڑا تو پرمیلا نے اپنے پیر پیچھے نہ ہٹائے الٹا انہیں اور آگے بڑھا دیا۔ اس پر بالے کی آنکھ میں چمک لہرائی۔

چند ہی دنوں میں بالے میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو گئی۔ اس نے آوارہ گردی کرنا

چھوڑ دیا۔ وہ بیشتر وقت گھر پر گزارنے لگا۔

پھر ایک روز ماں سے کہنے لگا۔ ماں میں دسویں کا امتحان دوں گا۔ حیرت سے ماں کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ یہ سن کر پرمیلا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس کے بعد بالا دسویں کی کتابیں خرید لایا۔ ماں پہلے تو حیرانی سے بیٹے کی طرف دیکھتی رہی' پھر اس نے ماسٹر خیر الدین کو گھر بلا کر بیٹے کی ٹیوشن لگا دی۔

رات کو پڑھتے وقت بالا ماں سے کہنے لگا۔ ماں میں یہ سوال پرمیلا سے سمجھ لوں کیا۔

پہلے دن تو احمداں کو سمجھ نہ آیا کہ بالے کو کیا جواب دے۔ وہ دیر تک کبھی بالے اور کبھی پرمیلا کی طرف دیکھتی رہی۔ پرمیلا چپ چاپ بیٹھی چھوٹی نغمہ سے یوں باتیں کرتی رہی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

پھر احمداں بولی' پرمیلی یہ کیا کہتا ہے بالا۔

مجھ سے کہا کچھ موسی۔ پرمیلا نے ان جان ہو کر پوچھا۔

اس کے بعد بالے کے سبق میں ایسے سوال کچھ زیادہ ہی آنے لگے جو اسے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بار بار ماں سے پوچھنا پڑتا۔ اماں میں یہ بات پرمیلا سے پوچھ لوں۔

حتیٰ کہ یہاں تک نوبت آ گئی کہ بالا سارا کا سارا سبق پرمیلا سے پڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر احمداں نے ماسٹر خیر دین کو جواب دے دیا۔

پرمیلا سارا دن گھر کے کام میں لگی رہتی۔ نغمہ اور گوگی کے منہ دھلاتی ان کے کپڑے بدلتی۔ گھر کے کپڑے دھوتی۔ استری کرتی' بستر بناتی' چادریں بدلتی' اور بالے کو پڑھاتی رہتی۔ دو مہینے کے اندر اندر اس نے احمداں کے گھر کا حلیہ ہی بدل دیا۔

پہلے گھر ایسے لگتا تھا جیسے کوجروں کا ہو' پرمیلا نے سارا طور طریقہ بدل کر رکھ دیا۔ ڈرائنگ روم کو نئے فیشن کے مطابق سجایا۔ ڈائننگ میز منگوا کر دالان میں سیٹ کر دیا۔ بچوں کو کرسیوں پر بیٹھا کر نیپ کن لگا کر کھانے کی عادت ڈالی۔ بیڈ روم میں شلفوں پر لگے ہوئے برتنوں کو اٹھوا کر انہیں از سر نو سیٹ کیا۔ باورچی خانے کو نئے طریقے سے سنوارا۔ یوں سارے گھر کا حلیہ ہی بدل گیا۔

پرمیلا نے پہلے روز ہی اپنا چولہا چونکا الگ کرنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ احمداں نے بڑا

ہی اصرار کیا تھا۔ کہنے لگی' ارے لوگ کیا کہیں گے کہ لڑکی کو اپنے ہاتھ کا کھانے پر مجبور کر رکھا ہے۔

پر میلا نے جواب دیا' موسی ہمارے خاندان کے لوگ چھوت چھات کو نہیں مانتے۔ ہم گوشت کھاتے ہیں۔ ہمیں کسی چیز کی پرہیز نہیں' پھر میں لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے الگ چولہا چوکا کیوں کروں۔

ایک روز رات کے وقت جب بچیاں سو چکی تھیں۔ احمداں دودھ گرم کرنے کے بعد دہی جمانے کے لیے اسے جاگ لگا رہی تھی اور قریب ہی بالا بیٹھا پڑھ رہا تو پر میلا بولی۔ موسی ایک بات کہوں۔

احمداں سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایسی بات تو پر میلا نے کبھی نہیں کی تھی۔

اے کہہ دے نا' پوچھتی کیوں ہے۔ احمداں نے کہا۔

جو تو مانے موسی تو کہوں۔ جو تو وچن دے تو۔ یوں بات کر کے کیوں گنواؤں۔

کیسی بات کر رہی ہے تو۔ احمداں بولی۔ میں نے پہلے تیری بات روکی ہے کبھی' تو بات تو کرنا۔

پر میلا بولی۔ میرا جی چاہتا ہے موسی کہ مسلمان ہو جاؤں۔

احمداں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔

موسی میرے پتا۔ ماتا اور دونوں بھائی میرے سامنے مارے گئے تھے۔ اب میرا کوئی نہیں رہا۔ اب میں وہاں جا کے کیا کروں گی۔ اب تو موسی تو ہی میری ماتا جی ہے۔ یہی گھر میرا گھر ہے۔

اے تو اس لیے مسلمان ہونا چاہتی ہے لڑکی' احمداں نے پوچھا۔

اس لیے نہیں موسی۔

تو پھر

مجھے تمہارا مذہب اچھا لگتا ہے' اس لیے۔

احمداں یہ بات سن کر چار ایک دن تو سوچتی رہی۔

پھر لطیف دو روز کے لیے گھر آگیا۔

گھر کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

ایک دن تو وہ بڑے غور سے پرمیلا کی طرف دیکھتا رہا کہ کیسے اٹھتی ہے' کیسے بیٹھتی ہے' کیسے چلتی پھرتی ہے۔ اس روز تو اس کی نظریں شبہات سے بھری ہوئی تھیں۔ پر اگلے روز مطلع صاف ہو گیا۔ اس نے پرمیلا کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھدیا۔ بولا۔ لڑکی تو ہماری بیٹی سمان ہے۔

جب احمداں نے اسے بتایا کہ پرمیلا مسلمان ہونا چاہتی ہے تو وہ ہنس کے بولا' اس میں کیا برا ہے۔ تجھے ایک سگھڑ بہو مل جائے گی۔ تو بات تو کر کے دیکھ محلے والوں سے۔ اگلے روز احمداں پرمیلا کو ساتھ لے کر شیخانیوں کے محلے میں پہنچی۔

جب احمداں نے شیخانیوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو پہلے تو وہ حیران رہ گئیں' پھر کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

پھر یہ مسئلہ مردوں کی کانفرنس میں جا پیش ہوا۔ وہاں پتہ چلا کہ چھبیس ہندنیوں میں سے تین ایسی ہیں جو اسلام قبول کرنا چاہتی ہیں۔

پھر متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ اگر کسی ہندنی نے مذہب بدل لیا تو اس میں ایمن آباد کی عزت پر حرف آئے گا۔ لوگ کہیں گے ایمن آبادیوں نے جان بوجھ کر مذہب کا پرچار کیا اور لڑکیوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔

بہر حال فیصلہ ہوا کہ کسی ہندو لڑکی کو مذہب بدلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

بازیابی

پھر تارکین وطن کی بازیابی شروع ہو گئی۔

ایک دن ایک سکھ میجر' ضلع ڈپٹی کمشنر اور پولیس کے بہت سے سپاہی ایمن آباد آ گئے۔

نو بہار کی حویلی میں ہندنیوں کی فہرستیں بننے لگیں۔

جب فہرستیں بن چکیں تو ہندو عورتیں حویلی میں لائی گئیں۔

اس روز ایمن آباد پر ایسی کیفیت طاری تھی۔ جیسے اپنی بیٹوں کی ڈولیاں وداع ہو رہی ہوں۔

ہندنیاں' شیخانیوں سے چمٹ چمٹ کر مل رہی تھیں۔ شیخانیاں بار بار آنسو پونچھ رہی تھیں۔ بے شک ہندنیوں کو اپنے دیس میں جانے کی خوشی ہو رہی تھی' لیکن وہ ایمن آباد کو

چھوڑتے ہوئے دکھ محسوس کر رہی تھیں۔

جب ہندو عورتیں اور لڑکیاں تو ہمار کی حویلی میں پہنچ گئیں اور ان کی گنتی کی گئی تو معلوم ہوا کہ پریتماں اور پرمیلا نہیں پہنچیں۔

ڈپٹی کمشنر اور سکھ میجر پہلے احمداں کے گھر پہنچے۔ احمداں پہلے ہی حیران پریشان کھڑی تھی۔ بولی اے کیا بتاؤں بھراؤ۔ میں تو آپ حیران ہوں۔ پرمیلا یہیں گھر پر تھی۔ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئی ہے۔ میں تو گھر کا کونا کونا چھان آئی ہوں' اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ میں تو آپ شرمندی ہو رہی ہوں کہ تم کہو گے لڑکی کو چھپا لیا ہے۔ دو دفعہ حویلی گئی ہوں کہ وہاں آپ سے آپ تو نہیں پہنچ گئی۔ وہاں بھی نہیں ملی - اڑوس پڑوس میں بھی دیکھ چکی ہوں۔ کتنی بدنامی ہے میری اس بات میں۔

پھر دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر وہ تخت پوش پر بیٹھ گئی۔

اس پر میجر اور سپاہی اجازت لے کر گھر میں گھس گئے۔ انہوں نے گھر کا کونہ کونہ دیکھ لیا' لیکن پرمیلا کا وہاں نام و نشان نہ تھا۔

پھر وہ خالہ سرداراں کے گھر پہنچے۔

خالہ سرداراں کے گھر پہلے ہی جھگڑا جاری تھا۔ خالہ سرداراں پریتماں کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی کہ اللہ کے واسطے میری لاج رکھ لے۔

نہیں جاؤں گی

لیکن پریتماں اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ کہتی تھی کہ میں نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔ محلے والیاں سمجھا سمجھا کر تھک گئیں' لیکن کوئی پریتماں کا ارادہ بدل نہیں سکا تھا۔

آخر خالہ سرداراں ہار گئی اور پھر چیخیں مار مار کر اس نے پریتماں کو سینے سے لگایا اور چلا کر بولی اگر یہ نہیں جانا چاہتی تو میں دیکھوں گی کہ کون اسے لے کر جاتا ہے۔

عین اس وقت سکھ میجر اور پولیس وہاں پہنچ گئے۔

میجر نے کہا لڑکی ہمارے حوالے کر دو۔

خالہ سرداراں بولی۔ اگر لڑکی جانا چاہتی ہے تو بے شک لے جاؤ' لیکن اگر وہ جانا نہیں چاہتی

تو کوئی اسے نہیں لے جا سکتا۔

سکھ میجر بولا لڑکی کو گلی میں لے آؤ۔

پریتماں چلا کر بولی میں گلی میں نہیں آؤں گی۔

تم اندر آ جاؤ۔ سرداراں نے کہا۔

سکھ میجر ڈیوڑھی میں کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ خالہ سرداراں پریتماں کو سہارا دیے ڈیوڑھی میں لے آئی۔

سکھ میجر بولا۔ ہم لڑکی سے اکیلے میں ملیں گے۔

خالہ سرداراں بولی ساری بات میرے سامنے ہو گی۔ اے میں اپنی بیٹی کو غیروں کے ہاتھ میں کیسے دے دوں بھلا۔

سکھ میجر نے پوچھا لڑکی تو کیوں نہیں جانا چاہتی۔

پریتماں نے جواب دیا۔ کیوں کا کیا مطلب ہے بس میں نہیں جانا چاہتی۔

سکھ میجر نے کہا' لڑکی تم پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے نا۔

پریتماں نے جواب دیا' ہاں مجھ پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں۔

پھر بڑے بوڑھے آ گئے' وہ سب اصرار کرنے لگے۔ بولے تجھے کوئی زبردستی نہیں لے جائے گا' تو صرف اتنا بتا دے کہ تو کیوں نہیں جانا چاہتی۔

پریتماں سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر کے بعد سر اٹھا کر بولی' میں صرف ایک صورت میں جا سکتی ہوں کہ میرا بھائی جو امرتسر میں رہتا ہے وہ آ کر مجھے لے جائے۔

وہ نہیں آ سکتا میجر غرایا۔ راستے بند ہیں۔

تو نہ آئے' وہ بولی میں یہاں خوش ہوں بہت خوش ہوں۔

یہ سن کر خالہ سرداراں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

تجھے ہم پر اعتبار نہیں کیا' سکھ میجر نے گویا دھمکی دی۔

نہیں' وہ بولی۔

مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔

مجھے پتہ ہے کیمپوں میں کیا ہوتا ہے' پریتماں نے کہا۔

میجر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

پھر جب ہندنیاں ایمن آباد سے وداع ہونے لگیں تو قصبے کے سب لوگ وہاں موجود تھے۔ شیخانیاں آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ہندنیوں کی آوازیں گلو گیر تھیں۔

احمداں جب ہندنیوں کو وداع کر کے گھر لوٹی تو دیکھا کہ پرمیلا بیٹھی گوگی کے کپڑے دھو رہی ہے۔

احمداں کی تو پاؤں تلے سے زمین نکل گی' بولی تو کہاں چھپی رہی پرمیلے تو نے تو میری عزت دو کوڑی کی کر دی۔

موسی میں نہیں جاؤں گی' وہ بولی۔

تو کیا تو جان بوجھ کر چھپ گئی تھی۔

پرمیلا نے جواب نہ دیا۔

کہاں چھپی تھی تو۔

پرمیلا خاموش بیٹھی رہی۔

اے جواب تو دے لڑکی۔

ماتا جی کہہ جو دیا میں نہیں جاؤں گی۔ اس روز پہلی مرتبہ پرمیلا نے احمداں کو ماتا جی کہا تھا۔

ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ پڑوسن کی لڑکی جانو آ گئی۔ آتے ہی بولی' میں بتاؤں یہ کہاں چھپی ہوئی تھی۔ ہمارے گھر کے پاس جو چھتا گندا نالہ ہے وہاں۔

ہے ری' احمداں نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی۔ سارا دن تو گندے نالے میں بیٹھی رہی۔ تیرا دماغ نہ پھٹ گیا بو سے۔

سکھ میجر کو گئے ابھی آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ ایک داڑھی والا مسلمان میجر ٹرک لے کر آ گیا۔ وہ چپ چاپ خالہ سرداراں کے گھر جا پہنچا۔ پیتماں سے کہنے لگا۔ تیرے بھائی کا دوست ہوں۔ میں تجھے لینے آیا ہوں۔ میرے ساتھ چلے گی۔

پتیماں بولی۔ ایک شرط پر جاؤں گی۔

کیا' میجر نے پوچھا۔

بولی اگر تو میری بانہہ میرے بھائی کے ہاتھ میں دینے کا وعدہ کرے تو۔

لیکن داڑھی والے میجر نے کہا۔ میں باڈر کے پار جا نہیں سکتا۔

تو پھر میں نہیں جاؤں گی' پرنیماں نے جواب دیا۔

اچھا بہن میجر بولا۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ میں خود تجھے امرتسر لے کر جاؤں گا اور تیری بانہہ تیرے بھائی کے ہاتھ میں پکڑا کر آؤں گا۔

پھر میجر احمداں سے ملا' اسے سمجھایا کہ اگر ہندو لڑکیاں ادھر سے نہ گئیں تو مسلمان لڑکیاں ادھر سے کیسے آئیں گی۔ میں شام کو پھر آؤں گا تو سوچ لے۔

اسی شام جب وہ سارے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے چائے پی رہے تھے تو داڑھی والا میجر پھر آگیا بولا۔ بہن پرمیلا میں تمہیں لینے آیا ہوں۔

پرمیلا نے آنکھ اٹھا کر میجر کی طرف دیکھا اور ہکّی بکّی رہ گئی۔ پھر اس نے احمداں کی طرف دیکھا۔ احمداں سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو گال پر ڈھلک آئے۔

میجر بولا اگر تو نہ جائے گی پرمیلا تو ادھر کی مسلمان لڑکیاں نہیں آئیں گی۔ مسلمانوں کی عزت کا سوال ہے'

تم مجھے مسلمان کیوں نہیں کر لیتے۔ پرمیلا نے منت کی۔

میجر حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

پرمیلا نے آخری مرتبہ احمداں کی طرف دیکھا۔ بولی۔ مجھ سے کتنا بڑا مذاق کیا جا رہا ہے' موسی جب میں ہندو تھی تو مجھے مسلمان زبردستی اٹھا لائے۔ اب جب میں دل سے مسلمان ہو چکی ہوں تو تم مجھے ہندوؤں کے حوالے کر رہے ہو۔ یہ کہہ کر وہ دہاڑیں مار کر رونے لگی۔

احمداں نے محسوس کیا جیسے اس کا سینہ پھٹا جا رہا ہو۔

پھریالے کا ضبط پاش پاش ہو گیا۔ بولا پرمیلے مجھے اپنے ساتھ لے چل۔

اس پر پرمیلا نے اک چیخ ماری اور اچھل کر بے دھڑک بالے کو گلے لگا لیا۔

احمداں اور میجر ہکے بکے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

چوتھا باب

شاہ کاکو کا بابا

چار ایک دن کے بعد اشفاق حسین اور احمد بشیر مجھے لاہور کی گاڑی میں بٹھا کر چلے گئے تو دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں نے احمد بشیر سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ بمبئی سے ایمن آباد کیسے پہنچا تھا۔

دراصل ایمن آباد میں ہماری مصروفیت میں اس قدر شدت تھی کہ کوئی اور بات سوجھتی ہی نہ تھی۔

اداسی

گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ بخار اتر گیا اور ایک بے نام ڈیپریشن طاری ہو گیا۔

وہ ایک لوکل گاڑی تھی جو ہر سٹیشن پر رکتی تھی۔ ان دنوں عام طور پر لوکل گاڑیوں میں بہت بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اس روز گاڑی خالی خالی سی تھی۔ جس ڈبے میں میں بیٹھا تھا۔ اس میں صرف چار چھ مسافر تھے۔ سب چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میں نے مسافروں کا جائزہ لیا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

شام کا وقت تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ چاروں طرف اداسی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کھیت

ویران پڑے تھے۔ کہیں سے بانسری یا ماہیے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پٹڑی پر کوئی راہ گیر نہیں چل رہا تھا' نہ ہی ڈھور ڈنگروں کے گلے کی گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جب میں لاہور سے چلا تھا تو میرے ذہن میں صرف دو چیزیں تھیں۔ ایک کالا صندوق اور ایک خوبصورت ہندنی' لیکن ایمن آباد میں دونوں چیزیں میرے دل سے نکل گئی تھیں۔

میں صرف اس لیے ایمن آباد گیا تھا کہ خود پر یہ ثابت کر دوں کہ میں مسلمان ہوں' کسی ہندو کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں' لیکن ایمن آباد میں میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے ہندوؤں کی رکشا کے لیے آیا ہوں۔ ہندنیوں کی عصمت کی حفاظت کرنے آیا ہوں۔ اس خیال پر میری ہنسی نکل گئی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ ایسا کیوں ہوا۔

میں کون ہوں؟

مسلمان کون ہے۔ کیا وہ جو لاہور کی سڑکوں پر چھرا لے کر نعرے لگا رہا تھا کہ کوئی بچ کر نہ جانے پائے یا وہ جو ایمن آباد میں زخمی ہندنیوں کے سر پر دست شفقت پھیر رہا تھا۔

لاہور میں جب میں مہاجرین کی زندہ لاشوں کو دیکھتا تھا تو میرے دل میں ان غنڈوں کی عزت پیدا ہو جاتی جو سڑکوں پر چھریاں اور برچھے لیے پھر رہے تھے۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ میں چلا چلا کر کہوں۔ کوئی بچ کر نہ جائے۔

لیکن ایمن آباد میں جب میں شیخانیوں کی وارننگ سنتا کہ خبردار کسی ہندنی کی عزت پر آنچ نہ آئے تو میرا جی چاہتا کہ میں بھی ان کی بات کو دہراؤں۔ خبرار کسی ہندنی کی عزت پر آنچ نہ آئے۔

میرے دل میں خیال آتا کہ میں کیا ہوں' کون ہوں۔ مسلمان کون ہے۔ تقسیم سے پہلے میرے دل میں یہ خیال کبھی نہ آیا تھا۔ میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ مسلمان کون ہے۔

غالباً اس لیے کہ میں برائے نام مسلمان تھا۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ برائے نام مسلمان کا بیٹا تھا۔ گھر میں میری ماں اور دادی نمازیں پڑھا کرتی تھیں۔ اس لیے میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ مسلمان وہ ہے جو نمازیں پڑھے اور روزے رکھے۔

مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ مسلمان ایک کردار ہے' ایک رخ ہے' ایک رویہ ہے۔

تقسیم سے تقریباً ایک سال پہلے جب لاہور میں سکھوں اور ہندوؤں نے پہلا جلوس نکالا تھا' اس وقت میں از راہ اتفاق احمد بشیر کے ساتھ مال روڈ پر گھوم رہا تھا۔

منفی مقصد

اس جلوس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ اتنا بڑا جلوس ننگی کرپانیں۔ سکھ انہیں لہرا رہے تھے۔ ہندنیاں سیاپا کر رہی تھیں۔ وہ سب چلا رہے تھے۔ نہیں بننے دیں گے پاکستان یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ نہیں بننے دیں گے تو ایک منفی مقصد ہے' مثبت نہیں۔ منفی مقصد کے لیے اتنا شور شرابا تشدد کی ننگی دھمکی۔

منفی مقصد پر تو لوگ شرماتے ہیں' اسے چھپا کر رکھتے ہیں کہ کوئی جان نہ لے' لیکن وہ لوگ تو منفی مقصد کو جھنڈا بنا کر لہرا رہے تھے۔ دھمکی دے رہے تھے کہ پاکستان بن گیا تو خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ ان کا نعرہ تو اکھنڈ ہندوستان ہونا چاہیے تھا۔ انہیں پاکستان سے نفرت کیوں ہے۔

وہ پہلا دن تھا جب میرے دل میں پاکستان کے مطالبے سے ہمدردی پیدا ہوئی تھی اور میں نے یہ جانا تھا کہ ہندو ہندوستان کی عظمت نہیں چاہتے بلکہ ہندو کی عظمت کے خواہاں ہیں۔

پھر بھی میرے دل میں بات اپنی پوری اہمیت کے ساتھ نہیں ابھری تھی۔ کیسے ابھرتی' زندگی بھر میں دیکھتا رہا تھا کہ لکھ پتی ہندو بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر گردن لٹکا کر نمسکار کرتا تھا اور مسلمان مونچھ مروڑ کر چھاتی پھلا کر سلاما علیکم کہتا تھا۔ ہندو جی مہاراج سے بات شروع کرتا تھا۔ مسلمان تو تڑاخ کے بغیر کلام نہیں کرتا تھا۔

بمبئی میں چھرا چلنا شروع ہوا تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں مسلمان ہوں۔ پہلی بار میں نے جانا کہ چھرے باز۔ چھرا چلانے سے پہلے مجھ سے نہیں پوچھے گا کہ تم سچے مسلمان ہو یا منہ زبانی مسلمان ہو۔

بمبئی سے آنے کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ میرا گاؤں بٹالہ ہندوستان میں شامل ہو گیا ہے تو میرے دل میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ جلد از جلد اپنے عزیزوں کو بٹالے سے نکال لاؤں۔ بٹالہ میرا اپنا گاؤں جہاں میں پل کر جوان ہوا تھا۔ دیار غیر محسوس ہونے لگا تھا۔

جب میں اپنے عزیزوں کو لانے کے لیے بٹالے پہنچا تھا' تو بٹالہ وہ بٹالہ نہیں تھا۔ نہ گلیاں وہ

گلیاں تھیں' نہ بازار وہ بازار تھے' نہ محلّہ وہ محلّہ تھا۔ محلّے والوں پر خوف و ہراس طاری تھا۔

ہندوؤں کے جی مہاراج میں دھونس ملفوف تھی جی مہاراج' ذرا فرنٹیئر فورس کو یہاں سے جا لینے دو' جی مہاراج۔

سارے شہر کے مسلمان اپنے گھروں میں یوں بیٹھے تھے جیسے مسافر ہوں۔ ایک چھوٹے سے اعلان نے مسلمان اکثریت کے علاقے کو یوں ہلا دیا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔

سراب

دفعتاً گاڑی کو شدید جھٹکا لگا۔ میں اچھل کر سامنے والی سیٹ پر جا گرا۔ پھر میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا۔ پر ایسے ہوا۔ میں سمجھا لاہور آگیا ہے۔ بیگ اٹھا کر میں گاڑی سے اتر گیا۔ سوچنے لگا یہ کس پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی کی ہے انہوں نے۔

روشنیوں کی طرف چلتے ہوئے دفعتاً مجھے خیال آیا کہ وہ جو قلیوں کی قطار میں نے کھڑکی سے دیکھی تھی۔ وہ کیا ہوئی اور وہ ٹی سٹال۔ گیٹ پر جلی حروف میں کالا شاہ کاکو لکھا ہوا تھا۔ میں مڑا کہ گاڑی میں پھر سے بیٹھ جاؤں' لیکن گاڑی جا چکی تھی۔ لائن خالی پڑی تھی۔ سٹیشن ویران تھا۔

پھر دور سے ایک جھولتی ہوئی بتی دکھائی دی جو میری جانب آ رہی تھی۔ جب وہ قریب آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا مدقوق آدمی میرے سامنے کھڑا ہے۔

یہ کون سا سٹیشن ہے۔ میں نے پوچھا۔

کالا شاہ کاکو۔

لاہور یہاں سے کتنی دور ہے۔

دو سٹیشن آگے۔

آپ کون ہیں۔

اسٹیشن ماسٹر۔

لاہور کو گاڑی کب جائے گی۔

دبلے پتلے آدمی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ بولا آپ تو لاہور کی گاڑی سے اترے

ہیں۔

غلطی سے اتر گیا۔ میں سمجھا لاہور آ گیا۔

سٹیشن ماسٹر نے مشکوک نظر سے مجھے دیکھا۔ آپ سمجھے یہ لاہور ہے۔

پتہ نہیں۔ مجھے ایسا کیوں لگا۔

گاڑیاں تو بہت آتی ہیں وہ بولا پر رکتی نہیں۔ صبح والی رکے گی۔

یہاں کوئی ویٹنگ روم ہے۔

اس نے نفی میں سرہلا دیا۔ اسی بنچ پر پڑے رہو' لیکن ——————

لیکن کیا میں نے پوچھا۔

آج کل اسٹیشن محفوظ نہیں ہے۔ کوئی جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اسٹیشن ماسٹر چل پڑا۔

اکیلا

دیر تک اسٹیشن ماسٹر کے ہاتھ کی بتی ہلتی نظر آتی رہی۔ پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔

زندگی بھر۔ میں کبھی اتنا اکیلا نہ ہوا تھا۔

مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔

چور کا خوف نہیں' ڈاکو کا خوف نہیں۔ اکیلے کا خوف' اندھیرے کا خوف' گہری خاموشی کا خوف۔

کچھ دیر کے بعد وہ خوف ناقابل برداشت ہو گیا۔

میں اٹھ بیٹھا۔ ٹہلنے لگا۔ چلو حرکت ہی سہی۔ پاؤں کی چاپ ہی سہی۔ دیر تک ٹہلتا رہا۔ جی چاہتا تھا کہ لاہور کی جانب پیدل ہی چل پڑوں۔

دفعتاً" دور روشنی کی ایک کرن چمکی۔ میں رک گیا۔

پھر وہ روشنی جھولنے لگی۔ اسٹیشن ماسٹر ہے' میں نے سوچا' شاید کوئی چیز بھول گیا تھا' لینے آیا ہے۔ مجھے تسلی سی ہو گئی۔

پراسرار وہ

وہ میرے پاس آکر رک گیا۔ بولا آپ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں۔ میرے ساتھ چلئے۔

کہاں۔

وہ سامنے میرا کوارٹر ہے۔

اس کی بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ آپ صرف مجھے لینے کے لیے واپس آئے ہیں کیا۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ہاں وہ کہتا ہے' اسے لے آؤ۔

وہ کون

پتہ نہیں' سٹیشن ماسٹر بولا۔ کہ کون ہے' ایک بابا ہے' مسافر ہے۔ میں اسے گھر لے گیا تھا۔ آج شام کو۔

اسے کیسے پتہ چلا کہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھا ہوں۔

میں نے بتایا تھا وہ بولا۔ میں نے کہا ایک مسافر غلطی سے یہاں اتر گیا ہے۔ لاہور جانا تھا اسے۔ یہ سن کر بابا بولا' تو اسے ساتھ کیوں نہیں لے آیا۔ یہاں پڑ رہتا کھاٹ پر۔ جا اسے لے آ سٹیشن سے۔ سٹیشن ماسٹر رک گیا۔ پھر بولا چلو نا وہ انتظار کر رہا ہے۔

انتظار کیوں کر رہا ہے میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں' وہ بولا۔ میں نے بابا سے کہا' بابا روٹی کھا لے۔ بابا بولا: وہ آ جائے گا تو اکٹھے کھائیں گے۔

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

بابا کو مجھ سے دلچسپی کیوں ہے' میں نے پوچھا۔

خدا ترسی ہو گی' سٹیشن ماسٹر نے کہا۔ یہ بابے زندگی بھر خود مسافر رہتے ہیں۔ مسافروں کی عزت کرتے ہیں۔

اچھا میں نے کہا اور بیگ اٹھا کر اس کے پیچھے چل پڑا۔

ہم دونوں کوارٹر پر پہنچے تو میں نے دیکھا کہ باہر میدان میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں۔ ایک چارپائی پر بابا چادر لپیٹے بیٹھا تھا۔ گندمی رنگ' گول چہرا۔ مزدور جیسے بڑے بھدے ہاتھ پاؤں'

چھوٹی داڑھی۔

بارڈر کے محافظ

السلام علیکم میں نے کہا۔

وعلیکم وہ بولا۔ پھر اسٹیشن ماسٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔ جا تو روٹی لے آ۔ تردد نہ کرنا جو ہے' لے آ۔

اس کے جانے کے بعد مجھ سے کہنے لگا' بیٹھ جا' تو لاہور جا رہا تھا۔ ہاں میں نے کہا' غلطی سے یہاں اتر گیا۔

کوئی بات نہیں وہ بولا۔ غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ بندہ بشر ہے غلطی نہ کرتا تو ہم سے کیسے ملتا۔

لاہور کا رہنے والا ہے تو۔

جی نہیں مشرقی پنجاب سے آیا ہوں۔ مہاجر ہوں۔

ہوں وہ بولا۔

وہاں لاکھوں مسلمان شہید کر دیے گئے ہیں' میں نے کہا۔

جو اللہ کی مرضی وہ بولا۔ پھر وقفے کے بعد کہنے لگا' اچھا ہوا دونوں کے لیے اچھا ہوا۔

اچھا ہوا؟ مجھے غصہ آنے لگا۔

انہیں شہادت نصیب ہوئی اور ہمارے باڈر پر لاکھوں محافظ کھڑے ہو گئے۔ شہید مرتا نہیں نا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ محافظ کا مطلب' کس کے محافظ۔

اللہ پاکستان کی حفاظت کر رہا ہے نا' وہ بولا۔ جسے بناؤ' اس کی حفاظت تو کرنی پڑتی ہے۔

مجھے پھر غصہ آنے لگا۔ یہ حفاظت ہو رہی ہے کیا۔

دفعتاً" بابا نے موضوع بدلا۔ بولا تو پنڈی کیوں نہیں چلا جاتا۔

مجھے لاہور میں نوکری تلاش کرنی ہے بابا۔

مل جائے گی' وہ بولا پر پکی نہیں ملے گی۔ پکی نوکری تجھے وہیں ملے گی۔
نہیں بابا میں نے چڑ کر کہا میں پنڈی نہیں جاؤں گا۔

لال ٹوپی

از خود نہیں جائے گا نا' نہ جا' پر جانا تو پڑے گا۔
کیوں پڑے گا' میں نے اسے ڈانٹا۔
وہ مسکرایا بولا' بابو جی یہ آنا جانا اپنے بس میں نہیں ہوتا۔
تم مجھے پنڈی کیوں بھیج رہے ہو زبردستی۔
ہم کیوں کریں زبردستی۔ ہماری کیا حیثیت ہے۔ وہ لال ٹوپی والا بڈھا تجھے بلا رہا ہے۔
بڈھا مجھے بلا رہا ہے۔
میں سوچ میں پڑ گیا۔
بات سمجھ میں نہ آئی۔ وہ کون ہے' لال ٹوپی والا۔
وہی ——— جو تیرے ٹرک کو پاکستان لایا تھا۔
میں سوچ میں پڑ گیا۔ امرتسر کا نقشہ میری نگاہوں تلے پھر گیا۔ وہ مجھے کیوں بلا رہا ہے۔
مجھے کیا پتہ۔ بابو جی۔ میں تو بروالا ہوں۔ سب ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں۔ بابو جی۔ حکم سن کر لیس سر لیس سر کرتے ہیں۔
مجھے بابا کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ وہ عام باباؤں کی طرح نہیں تھا۔
کس کام پر لگے ہوئے ہیں بابا' میں نے پوچھا۔
اسٹیشن ماسٹر کھانا لے آیا۔ ٹرے میں وہی تھا دال تھی چٹنی تھی' اچار تھا اور روٹی تھی۔
آجا تو بھی کھالے' بابا نے سٹیشن ماسٹر سے کہا۔
نہیں بابا وہ بولا مجھے سٹیشن پر جانا ہے۔ گاڑی پاس کرانی ہے۔
تو ادھر آجا' اس نے مجھے کہا اس چارپائی پر۔
روٹی کھاتے ہوئے میں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ بابا یہ سب کس کام پر لگے ہوئے ہیں۔

آنے والا

تجھے نہیں دکھتا۔ وہ بولا۔ یہ جو ملک بنایا ہے تو کسی بات کے لیے بنایا ہے' ایسے ہی تو نہیں بنا دیا۔ اب اس ڈولتی کشتی کو پار بھی تو لنگھانا ہے کہ نہیں۔

مجھے شرارت سوجھی' میں نے پوچھا بابا' کس لیے بنایا ہے یہ ملک۔

کہتے ہیں' وہ بولا۔ یہاں تخت بچھے گا۔ پھر وہ آ کر اس پر بیٹھے گا۔

وہ کون' میں نے پوچھا۔

بولا۔ وہی جو آنے والا ہے' جس کے انتظار میں سب بیٹھے ہیں۔

یہ انتہا تھی۔ میرا صبر و تحمل جواب دے گیا۔ میں نے کہا بابا ایک بات کہوں۔

کہہ' وہ بولا۔

تو غصے تو نہیں ہو گا۔

نہیں' اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

بابا' میں نے کہا۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتا' نہ ہی میں بابوں کو مانتا ہوں۔

نہ مان' وہ بولا۔ تیری مرضی ہے چاہے مان نہ مان۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کرتے کہ ضرور مان۔ اپنی اپنی قسمت ہے کوئی مان لیتا ہے کوئی نہیں مانتا وہ رک گیا۔

پھر کچھ دیر کے بعد بولا۔ پھر وقت وقت کی بات ہے جب وقت آئے گا تو' تو آپ ہی آپ مان لے گا۔

نہیں بابا' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

تجھے نہیں پتہ بابو' وہ بولا۔ وہ بڑے ڈاہڈے ہیں بڑے زور آور ہیں' جب منوانا چاہتے ہیں منوا لیتے ہیں۔ جسے منوانا چاہتے ہیں' اسے منوا لیتے ہیں۔

نہیں بابا۔ میں نے اسے ٹوکا۔

مداری کا روپیہ

وہ جلال میں آ گیا' بولا بابو وہ جب چاہیں گاڑی سے اتار لیتے ہیں۔ تو بھی تو اتر گیا تھا گاڑی

سے ' نہیں اترا کیا۔ تو نے دیکھا کہ قلیوں کی قطار کھڑی ہے۔ سٹال پر لوگ چائے پی رہے ہیں۔ دیکھا تھا نا۔ تو سمجھا لاہور آ گیا ہے۔ تو گاڑی سے اتر آیا۔

یہ سن کر میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔ کیا تم نے مجھے یہاں اتارا ہے جواب دو۔

تجھ سے ملنا جو تھا۔ تجھے بتانا تھا کہ ' ادھر چلا جا وہ تیری اڈیک میں ہے۔ مجھ سے شہر نہیں جایا جاتا۔ میں نے کہا چلو یہیں مل لیتے ہیں۔ اب تو سو جا صبح تجھے گاڑی پکڑنا ہے۔ آرام کر لے۔ یہ کہہ کر بابا چادر تان کر لیٹ گیا۔

ساری رات مجھے نیند نہ آئی۔

اس بابے میں اتنی طاقت ہے کہ مجھے مسمرائز کر سکے۔ کالا شاہ کاکو کے سٹیشن پر مجھے لاہور کا سراب دکھا سکے۔ کیا میں اپنی آنکھوں پر قادر نہیں ہوں۔ اپنے حواس پر قادر نہیں ہوں۔

یہ بابے کون ہیں۔ وہ رومی ٹوپی والا کیوں مجھے وہاں بلا رہا ہے۔ پاکستان کیوں بنایا گیا۔ بنا نہیں ' بنایا گیا ہے۔ کیوں۔ یہ امتیاز کیوں۔ ساری رات میں خیالات کی پھانسی پر لٹکا رہا۔ پھر پتہ نہیں کب نیند آ گئی۔

صبح سٹیشن ماسٹر مجھے بلا رہا تھا اٹھ بابو گاڑی آنے والی ہے۔ میں جاگ پڑا۔ میں نے اٹھ کر بیگ اٹھایا۔

دیکھا تو بابے کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ بستر پر کوئی سلوٹ نہ تھی جیسے وہاں کوئی سویا ہی نہ ہو۔

دفعتاً" مجھے خیال آیا شاید بابا بھی میرے ذہن کی تخلیق ہو جس طرح میں نے سٹیشن پر قلیوں کی قطار دیکھی تھی ویسے ہی بابا بھی دیکھا ہو۔

سٹیشن ماسٹر کہہ رہا تھا۔ یہ بابے بھی ایک معمہ ہیں۔ مداری کے روپے کی طرح کبھی غائب ہو جاتے ہیں ' کبھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان کا بھید آج تک کسی نے نہیں پایا۔

II

کمپ

۵۔ ڈھکے چھُپے کوایف
۶۔ عورتیں ہی عورتیں
۷۔ کنڈلی والیاں
۸۔ زنانی اور جنڑا
۹۔ ہیراسیاں



صغرا خانم (والدہ) (۱۹۶۶ء)



اقبال بیگم (بیوی) (۱۹۷۰ء)



ممتاز مفتی، مسعود، عماد، عمر، عکسی، اعظمی (چھڈیار)



مظہر مفتی، فزا مفتی

پانچواں باب

ڈھکے چھپے کوائف

لاہور پہنچ کر میں نڈھال ہو کر چارپائی پر گر گیا

مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میری زندگی میں ایسے واقعات کیوں پیش آنے لگے ہیں۔ وہ شاہ کاکو کا بابا کون تھا۔ اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ میرا راستہ کاٹے۔ مجھے مشورہ دے۔

لاہور کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ کیوں جاؤں۔ زبردستی ہے کیا۔ نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی زندگی کا خود مالک ہوں۔ میں جیسے چاہوں گا جیوں گا۔ جہاں چاہوں گا' رہوں گا ———— اور' اور وہ ———— وہ کون ہے جو مجھے پنڈی میں بلا رہا ہے۔ میں اس کی حاضری کیوں دوں ———— کیوں۔

نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ میں لاہور چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھ میں اپنا آپ دوسرے کے حوالے کرنے کی صلاحیت ابھی تک پیدا نہیں ہوئی۔ اللہ کرے کبھی نہ ہو۔ اس کے باوجود میرے دل کی گہرائیوں میں ایک خوف دبکا بیٹھا تھا۔

اس روز سارا دن میں چارپائی پر پڑا رہا۔ میری بیوی اقبال بیگم غصے میں میرے گرد بڑبڑاتی

رہی۔ وہ بچی تھی گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ دوکان دار قرض دینے سے ہچکچانے لگے تھے۔ پبلشر نے مزید روپیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دنوں کاروبار ٹھپ ہو چکے تھے۔ لوگوں کی توجہ یا تو ان دکانوں اور مکانوں کو لوٹنے پر مرکوز تھی' جو ہندو پیچھے چھوڑ گئے تھے اور یا ان زخمی لٹے پٹے مہاجرین کی طرف لگی ہوئی تھی جو مشرقی پنجاب سے لاہور پہنچ رہے تھے۔

جاگتے کے خواب

ان دنوں نوکری تلاش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے دل میں کئی بار آرزو پیدا ہوتی تھی۔ کہ کسی ہندو کے مکان میں چپکے سے گھس جاؤں اور وہاں سے سارا مال اکٹھا کر کے لے آؤں۔

پھر اماں آ گئی۔ اسے دیکھ کر ایسے محسوس ہوا' جیسے اس کی تمام تر مظلومیت اور دکھ میری وجہ سے تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا اس کے باوجود میں محسوس کرتا جیسے وہ میرے طور طریقے سے ناخوش ہو۔

مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنا انداز کیسے بدلوں۔ میرے دل میں خود کو بدلنے کی خواہش بھی تو پیدا نہ ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے میں اماں کے روبرو جانے یا اس کے پاس بیٹھنے سے خوف زدہ تھا۔

اماں چلی گئی تو میں پھر سے جاگتے کے خواب دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

جاگتے میں خواب دیکھنا میری طبعی کمزوری تھی' ایک بیماری' ایک کمپلشن۔ ان خوابوں کے تین موضوع تھے۔ رومان' دولت' شہرت۔

ویسے بات سامنے دھری تھی۔ جو لوگ زندگی میں کچھ کر دکھانے کی ہمت نہیں رکھتے وہ حقائق کی بے رحم دنیا کو تیاگ کر فینٹیسی کی مدد سے ایک اپنا جہان بنا لیتے ہیں اور خوابوں سے تسکین حاصل کرنے کے شغل کو اپنا لیتے ہیں۔

جاگتے کے خوابوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آنکھ نہیں کھلتی۔ جوں جوں حقائق تلخ تر ہوتے جاتے ہیں۔ توں توں خوابوں میں جاذبیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

عکسی کی آواز سن کر میں چونکا۔ عکسی بذات خود میرے لیے جاگتے کا خواب تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔

مجید ملک

ابو ———— یہ ———— اس نے اخبار میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اخبار کی سرخیاں پڑھتے پڑھتے مجید ملک کا نام دیکھ کر میں چونکا۔

وہ ایک اشتہار تھا۔ ریفوجی کیمپس کے لیے مقرروں کی ضرورت ہے جو مہاجرین کو حوصلہ اور ان کے موریل کو تقویت دیں۔ نیچے مجید ملک کمانڈنٹ ریفوجی کیمپس لکھا ہوا تھا۔

میری تمام تر توجہ مجید ملک پر مرکوز ہو گئی۔ مجھے یہ خیال نہ آیا کہ کمپ میں ملازمت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ خیال کیسے آتا۔ مجید ملک میرا محبوب تھا۔

وہ مجید ملک جس کی طرف متوجہ ہو کر میں نے ساوی کو کھو دیا تھا۔ ساوی چیختی رہ گئی تھی کہ مجید ملک تیرا دوست نہیں ہے' میرا بھائی ہے اور بھائی کا کام بہن سے محبت کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی خیر خواہی کرنا ہوتا ہے اور تجھے نہیں پتہ کہ خیر خواہی کے جنون میں لوگ کیا کیا نہیں کرتے۔ ساوی نے بار بار مجھے تاکید کی تھی کہ مجید ملک سے نہ ملنا' اس سے بچ کر رہنا۔ اس کی شخصیت اس قدر جاذب ہے کہ وہ تجھے اپنی جانب متوجہ کر لے گا۔ وہ پیش منظر بن جائے گا اور میں پس منظر ہو کر رہ جاؤں گی۔

ساوی چیختی چلاتی رہی' لیکن میں مجید ملک کی جانب بڑھتا گیا' بڑھتا گیا اور بالآخر اس کی شخصیت کے رنگین بھنور میں ڈوب گیا ———— وہ مجید ملک۔

پھر کچھ دیر کے بعد میں ریفوجی کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر میں مجید ملک کے سامنے بیٹھا تھا۔

آخاہ آپ ہیں' مجید ملک مجھے دیکھ کر چلایا۔ تشریف رکھیے' تشریف رکھیے۔ کیا پئیں گے آپ ٹھنڈا یا گرم۔

وہی پر کشش انداز۔ وہی جاذب گرم جوشی۔ وہی محبوبانہ بے نیازی۔ وہی ادھ کھلا ہونٹ جیسے ابھی ابھی کوئی لطیفہ سنا ہو' وہی بھرا بھرا جسم' وہی باتوں کی پھلجھڑیاں' وہی شگفتہ بے تکلفی۔

کہیے کہاں ہوتے ہیں آپ آجکل۔

فی الحال تو کہیں نہیں۔

کیا سکول ماسٹری چھوڑ دی۔

ہاں چھوڑ دی۔

متعلقین فسادات سے متاثر ہوئے کیا۔

سب بچ گے۔

اوہ' بڑی خوشی کی بات ہے۔

آپ کی شادی کیسی رہی۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ نے کسی سکول ٹیچر سے شادی کرلی ہے۔

وہ فوت ہو گئی۔

اوہ۔ بر سبیل تذکرہ۔ ساوی کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے میاں ریاست کے نواب ہیں۔ چار بچے ہیں۔

اب کہاں ہے ساوی میں نے پوچھا۔

ریاست نے پاکستان سے الحاق کر لیا تھا' لیکن چونکہ پاکستان سے ملحق نہ تھی اس لیے انڈیا نے بزور قبضہ کرلیا۔

اور وہ لوگ میرا مطلب ہے۔

ہاں وہ لوگ مشکلات میں ہیں۔ مشکلات تو ہوں گی۔ ہم نے جو جوا کھیلا ہے۔ پاکستان بنایا ہے اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ کر رہے ہیں' وہ مسکرایا۔

ایک گھنٹہ ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔

جب میں رخصت ہونے لگا تو اس نے ایک ٹائپڈ خط میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ بولا یہ ایک معمولی سی آفر ہے۔ معمولی سی آسامی ہے۔ اگر آپ کے کام کی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ پھاڑ دیجیے۔

ریفوجیوں کا موریل بڑھانے کے لیے' مائیک لگا کر ان سے باتیں کرتا ہوں گی' ہمدردی کی باتیں' حوصلے کی باتیں۔ اسلام کی باتیں' جہاد کی باتیں' ہجرت کی باتیں۔

گھر پہنچ کر میں نے وہ خط پڑھا۔ ڈھائی سو کی آفر تھی۔ ڈھائی سو میرے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ آفر منظور کرنے سے پہلے کیوں نا میں ریفوجی کیمپ دیکھ آؤں' میں نے سوچا۔

والٹن ریفوجی کیمپ

ریفوجی کیمپ لاہور سے دس بارہ میل دور والٹن میں واقعہ تھا۔ ایک وسیع میدان میں یہاں وہاں ٹوٹی ہوئی بوسیدہ بارکیں تھیں اور ہوائی جہازوں کے ہینگر تھے' جو عرصہ دراز سے بے مصرف پڑے تھے۔ ان بارکوں اور ہینگروں کے اندر اور باہر میدان میں جگہ جگہ پناہ گزینوں کے جھرمٹ لگے ہوئے تھے۔ دس پندرہ افراد اس درخت تلے بیٹھے ہیں' بیس' پچیس بارک کے باہر سائے میں پڑے ہیں' بیس تیس خالی میدان میں ڈھیر ہو رہے ہیں۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی' ریفوجی ہی ریفوجی نظر آ رہے تھے۔

بوڑھے سر تھامے ہوئے بیٹھے تھے' بوڑھیاں منہ کھولے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے پڑی تھیں۔ بچے سہمے ہوئے تھے' نوجوانوں کے چہروں پر اکتاہٹ تھی' لڑکیاں یوں بیٹھی تھی جیسے وہ لڑکیاں نہ ہوں بلکہ نو عمری میں ہی بوڑھی ہو گئی ہوں۔

مٹیار عورتیں صرف جسم ہی جسم تھیں۔ انہیں یہ شعور ہی نہیں تھا کہ وہ عورتیں ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نسائی چمک کا نام و نشان نہ تھا۔ عورت میں اگر نسائی شعور نہ رہے' اگر اسے احساس نہ رہے کہ وہ عورت ہے تو وہ جسم کا ایک تودہ بن کر رہ جاتی ہے۔ بے حس' بھدے جسم کا تودہ۔ اس میں چمک نہیں رہتی' جاذبیت نہیں رہتی' توجہ طلبی نہیں رہتی' تسخیر کی خواہش نہیں رہتی۔

سارے پناہ گیر شاک کے عالم میں تھے۔ وہ جذبات سے خالی ہو چکے تھے۔ وہ حسیات سے خالی ہو چکے تھے۔ ان پر بوجھل مایوسی مسلط اور محیط تھی ———— دکھ اور غم سے وہ چور چور تھے' لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ان میں غم کھانے کی صلاحیت ہی ختم ہو چکی ہو۔ دکھ اور غم ان کے چہروں پر دائمی نقوش چھوڑ گے تھے۔ مزید غم کھانے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ اس لیے ان پر بے حسی اور مایوسی کے غلاف چڑھ گئے تھے۔

میں نے انہیں دیکھ کر شدت سے محسوس کیا کہ اگر وہ فسادات میں مرجاتے تو بہتر ہوتا۔ یوں زندگی کے سوتے خشک ہو جانے کے بعد زندہ لاشوں کی طرح جیئے جانا' میں نے شدید جھرجھری محسوس کی۔

ریفوجیوں کا یہ انبوہ کئی ایک کیپوں میں بٹا ہوں تھا۔ شاید پانچ یا سات کیمپ تھے۔

میری تعیناتی کیمپ نمبر ایک میں ہوئی تھی' جو فیروز پور روڈ پر برلب سڑک واقع تھا۔ اس لیے میں کیمپ نمبر ایک میں گھومتا رہا' دیکھتا رہا' دیکھتا رہا' حتیٰ کہ مزید دیکھنے کی ہمت نہ رہی۔ دل دکھ سے بھر گیا۔ ذہن پر بے نام غم کے بادل چھا گئے۔ پھر میں یوں چل پھر رہا تھا جیسے نیند میں تھا۔

چلتے چلتے دفعتاً" مجھے یاد آیا کہ میرا کام ان مردہ گٹھڑیوں میں جینے کی ہمت پیدا کرنا ہو گا۔ ان کا مورال استوار کرنا ہو گا۔ ان دھواں دھواں تاریک خالی طاقوں میں امید کا دیا جلانا ہو گا۔

اونہوں' یہ کیسے ہو سکتا ہے' یہ نہیں ہو گا' یہ نہیں ہو سکتا۔ کیمپ کا ایک چکر لگانے کے بعد میرے اپنے احساسات شل ہو چکے تھے' میں خود زندگی سے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

پاکستان کے محافظ

ان دنوں میرا شعور پختہ نہ تھا مجھے باتوں کا علم نہ تھا' میں اس حقیقت سے واقف نہ تھا کہ قیام پاکستان پر جتنا بھی کشت خون ہوا تھا' ہو رہا تھا' وہ پاکستان کی بنیادوں پر چونے گچی کا کام کر رہا تھا' پاکستان کی بنیادوں کو پختہ کر رہا تھا' اس کے قیام کو مضبوط تر کر رہا تھا' اس نوزائیدہ مملکت کو استحکام بخش رہا تھا۔

قدرت نے ہندو کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ عدم تشدد کے داعی کو تشدد پر ابھارا تھا کہ اس نئی اسلامی مملکت کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی قوت حاصل ہو جائے۔

ان دنوں میں محض ایک دانشور تھا۔ چیزوں کو پرکھنے کے لیے میرے پاس صرف ایک کسوٹی تھی۔ عقل و دانش کی کسوٹی۔

میں سمجھتا تھا کہ عقل و دانش انسان کی واحد رہبر ہے' اس کا واحد امتیاز ہے۔ ان دنوں میں

ارسطو کے قول کے چکر میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ انسان ایک ذی عقل حیوان ہے۔ مجھے شعور نہ تھا کہ قدرت کے بہت سے اسرار عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔

خون کا وہ کھیل جو ہندو سیاست مشرقی پنجاب میں کھیل رہی تھی' اس پر مجھے غصہ آتا تھا' لیکن میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ صرف میں ہی نہیں سارے پاکستانی بھارت کے خلاف غصے سے کھول رہے تھے۔ ان کے دلوں میں بھارت کے خلاف نفرت کی ایک دیوار ابھر رہی تھی۔ یہی نفرت کی دیوار پاکستان کے قیام کی ضمانت تھی۔ حب علی ابھی پیدا نہیں ہوا تھا لہٰذا بغض معاویہ کے سہارے علیحدگی کے جذبے کو سینچا جا رہا تھا۔

بھارت کا گورداسپور کو ہتھیا لینا اور کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر لینا' یہ دونوں عمل پاکستان کے قیام کے ستون بن گئے تھے۔

اگر بھارت تقسیم کے وقت مسلم کشی کی پالیسی نہ اپناتا اور تقسیم کے عمل کو خندہ پیشانی سے تسلیم کر لیتا تو بھارت اور پاکستان کے درمیان نفرت کی دیوار استوار نہ ہوتی اور عین ممکن تھا کہ صلح اور آشتی کے جذبات تقویت پاتے رہتے اور دونوں ملک اس قدر قریب آ جاتے کہ پاکستان کا وجود متزلزل ہو کر رہ جاتا۔

لیکن قدرت کو پاکستان کا قیام منظور تھا۔ اس لیے ہندوؤں کی آنکھوں پر دبیز پردہ ڈال دیا گیا اور ان سے ایسی حرکات کا ارتکاب کرایا گیا جو بھارت کے مفاد کے منافی تھیں۔

رہا لاکھوں شہیدوں کا مسئلہ' وہ مسلمان جو پنجاب میں صرف اس لیے تہہ تیغ کر دیے گئے تھے کہ وہ مسلمان تھے' کلمہ گو تھے' یہ لاکھوں شہید مرے نہیں تھے' چونکہ شہید مرتا نہیں۔ یہ لاکھوں شہید پاکستان کی سرحدوں پر دائمی محافظ بن گئے تھے۔

ان سب باتوں کا مجھے شعور نہ تھا۔

ارے' دفعتاً" میں نے آنکھ اٹھائی تو سامنے وہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے بچے کھچے اوسان خطا ہو گئے۔ اسے دیکھ کر میں سمٹنے لگا' سمٹتا گیا' سمٹ سمٹ کر بالشتیہ بن کر رہ گیا۔

وہ ابھرنے لگی' ابھرتی گئی۔ حتیٰ کہ ساری کائنات پر چھا گئی۔ میں بھول گیا کہ کون ہوں' کیوں وہاں آیا ہوں' وہ جگہ کون سی جگہ ہے' ساری کائنات میں صرف دو فرد باقی رہ گئے تھے۔ ایک بالشتیہ' جو ہر لحظہ معدوم ہوا جا رہا تھا اور ایک وہ' جو فرش سے عرش تک محیط و مسلط تھی۔

وہ گاؤں کی ایک مٹیار تھی۔

اس کا قد لمبا تھا' جسم بھرا ہوا تھا' جوانی پھٹی جا رہی تھی' رنگ سانولا تھا' نقش تیکھے تھے' آنکھیں مدھ بھری تھیں اور انداز میں بے نیازی کے انبار لگے ہوئے تھے۔

وہ کھڑی افق کی طرف دیکھ رہی تھی' کسی خیال میں اس قدر محو تھی کہ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ سامنے کھڑا شخص سمٹ سمٹ کر بالشتیہ بن چکا ہے اور مسلسل اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔

عام عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھو تو وہ یوں چونک کر متوجہ ہوتی ہے جیسے کانٹا چبھ گیا ہو' لیکن وہ طبعاً" اتنی بے نیاز تھی کہ اسے پتہ بھی نہ چلا۔

پھر دفعتاً" گویا وہ جاگ پڑی۔ اس کی نگاہیں افق سے لوٹ آئیں۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ کچھ اس طرح کہ یہ کیا شے ہے۔ پھر اس کی نگاہ میں تحقیر بھرا تبسم جھلکا۔ ایسی تحقیر جو مجھے کاٹ کر رکھ گئی' جیسے اس کی نگاہ کہہ رہی ہو' تو کیا شے ہے۔ ایک پلپلا کیڑا۔

پھر وہ مڑی اور ہینگر میں داخل ہو گئی۔

دفعتاً" مجھے ہوش آ گیا۔ مٹیار کی اس ایک نگاہ نے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

میں نے اپنے ٹکڑے چنے انہیں جوڑا اور پھر چپ چاپ بائیسکل پر سوار ہو کر گھر کی طرف چل پڑا۔

دو مظلوم

گھر جا کر میں چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

میری بیوی اقبال بیگم میری طرف دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ بات کیا ہے۔

اقبال بیگم اور میں ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے تھے' رشتے کے لحاظ سے ہم بے حد قریب تھے' لیکن اس کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے سے اجنبی تھے' ایک دوسرے سے دور'

بے تعلق۔

اقبال بیگم ایک بہت ہی پاکیزہ اور نیک خاتون تھی۔ اللہ نہ کرے کہ آپ کی شادی کسی نیک خاتون سے ہو جائے۔ ہمارے باہمی ملاپ میں یہی ایک رکاوٹ تھی۔

میں طبعی طور پر کسی پاکیزہ اور نیک خاتون سے محبت نہیں کر سکتا۔ میرے بس کی بات نہ تھی۔ اس معاملے میں میں بالکل مجبور تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ کسی پاکیزہ اور نیک خاتون سے محبت کروں اور یوں اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو محفوظ کر لوں اور خوشی خوشی زندگی گزاروں' لیکن میں مجبور تھا' کوئی نیک اور پاکیزہ خاتون میرے دل میں جذبہ پیدا نہیں کرتی تھی۔ شاید نیک خاتون کسی کے دل میں جذبہ پیدا نہیں کر سکتی۔

میں صرف ایسی عورت سے محبت کر سکتا ہوں جس میں شر ہو' شوخی ہو' شرارت ہو۔ محبت کے پس منظر پر بے وفائی' چالاکی' عیاری اور بے پرواہی کی واضح دھمکی موجود ہو۔

مجھے بدمعاش عورت سے عشق ہے۔ جب تک عورت میں ہرجائی پن کا عنصر نہ ہو۔ وہ میری توجہ کو جذب نہیں کر سکتی۔

اقبال بیگم سے محبت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رہا جسمانی تعلق تو اس سلسلے میں اقبال بیگم مجبور تھی۔ فطری طور پر اس کے لئے خاوند سے جسمانی ملاپ ایک تکلیف دہ امر تھا۔ اس کے لیے سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ میاں قریب نہ آئے۔ کسی نا کسی طرح سر سے ٹلا رہے۔ عالم مجبوری میں وہ ملاپ کو بڑی ہمت اور صبر سے برداشت کر لیتی تھی' ملاپ کے یہ مواقع ہماری زندگی میں عام نہ تھے بلکہ دور دور تھے۔ ملاپ کی اس تفصیل کے حوالے سے اقبال بیگم ناعورت تھی۔

اس کے برعکس میں جسم کا محتاج تھا۔ تخلیے کا نہیں صرف کانٹیکٹ کا۔ جنسی لحاظ سے میں "ہی مین" نہ تھا بلکہ اوسط مرد سے کم تر تھا۔ جسم کی یہ کمی میری ذہنی خواہش کی جھولی میں جا پڑی تھی۔ خواہش کا ایک جھکڑ چلتا تھا اور بس میری زندگی میں خواہش کی تکمیل کے مواقع مفقود تھے۔ اس لیے میں جاگتے میں خواب دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ فینٹیسی میرے کردار کا اہم جزو تھا۔ بہر طور خواہش کے اس جھکڑ سے بچنے کے لیے مجھے ایک جسم کی ضرورت تھی' ایک

گرم اور ہمدردی سے بھرا ہوا جسم۔ اقبال بیگم مجھے وہ کانٹیکٹ مہیا نہ کر سکی تھی۔

اس کی سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ میاں اسے ہاتھ نہ لگائے لیکن اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرے۔ باتیں سنے۔ چونکہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھی اور مجلسی زندگی سے گریز کرتی تھی۔ اس لیے اقبال بیگم کی باتیں رسمی باتیں تھیں۔ رکھ رکھاؤ کی باتیں' لین دین کی باتیں۔ مناسب اور غیر مناسب سے متعلق باتیں' ان باتوں سے مجھے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا میں مجبور تھا اور اقبال سمجھتی تھی کہ وہ ایک بدنصیب اور مظلوب عورت ہے۔

دراصل دونوں ہی مظلوم تھے۔

اقبال کو ان دنوں مجھ سے یہ شکایت تھی۔ کہ میں کھاٹ پر پڑا سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ نوکری تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

اقبال میرے سرہانے آکھڑی ہوئی۔ بولی' آپ کچھ کرتے کیوں نہیں۔

میں چونک کر جاگا۔ کیا کروں میں نے پوچھا۔

نوکری تلاش کرو نا۔ اس طرح کب تک گزارہ ہو گا۔

نوکری تو مل گئی ہے۔ میں نے کہا۔

مل گئی ہے' وہ حیرت سے چلائی۔

ہاں مل گئی ہے۔

مجھے کیوں نہ بتایا کہ مِل گئی ہے۔

مجھے خیال نہیں رہا۔

ایسی بے خیالی بھی کیا۔

ہاں غلطی ہوئی۔ کل ہی تو ملی تھی آفر۔ ابھی اس کے جواب میں ہاں کرنا باقی ہے۔

ہاں کرنا باقی ہے۔

میں نے جیب سے مجید ملک کا خط نکالا۔ یہ آفر ہے' میں نے کہا۔

وہ کیا ہوتی ہے آفر۔

خط ہوتا ہے' میں نے خط لہراتے ہوئے کہا۔

خط میں لکھا ہوتا ہے اگر آپ کو یہ نوکری منظور ہے تو ہمیں اطلاع دے دیں۔

کتنی تنخواہ ہے۔

دو سو پچاس۔

کس دفتر میں ہے یہ نوکری۔

دفتر میں نہیں۔

تو پھر۔

کیمپ میں ہے۔

وہ کونسی جگہ ہوتی ہے کیمپ۔

جہاں مہاجرین کو رکھا جاتا ہے۔

کام کیا کرنا ہو گا۔

ان کا موریل اونچا کرنا ہو گا۔ میرا مطلب ہے تقریریں کرنا۔

اقبال کا منہ اتر گیا۔ اسے نوکری پر اعتبار نہ رہا' بھلا تقریریں کرنے کی نوکری بھی پکی ہو سکتی ہے کیا۔

ہاں لگتا ہے یہ کچی نوکری ہے' میں نے جواب دیا۔

اقبال سے بات کرتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ باتوں کی وضاحت کرنی پڑتی تھی۔ سادہ باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے بڑی کوفت ہوتی تھی۔

اقبال بیگم کی نیکی' سادگی اور پاکیزگی کا مجھے شدت سے احساس تھا۔ کئی بار میرے دل میں اقبال بیگم کی ان خصوصیات کا احساس اس شدت سے ہوتا تھا' جذبہ احترام اس شدت سے ابھرتا کہ میں محسوس کرتا جیسے اسے بیوی بنا کر میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہو۔

جس وقت اقبال بیگم نے سرہانے کھڑے ہو کر مجھ سے بات کی تھی۔ اس وقت میرے روبرو "وہ" کھڑی تھی۔ بے نیاز' بے پروا وہ ساری کائنات پر چھائی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر اور نگاہوں میں تحقیر کی چھری چل رہی تھی۔

وہ مٹیار دراصل میری آئیڈیل عورت تھی۔ اونچا لمبا قد' بھرا بھرا جسم' بے نیاز' بے پروا' یہ

خصوصیات میرے ذہن کی آئیڈیل عورت کی خصوصیات تھیں۔ ہر مرد کے ذہن میں ایک آئیڈیل عورت ہوتی ہے۔ جس کی تلاش میں وہ سرگرداں رہتا ہے۔

میں نے زندگی میں کئی ایک محبتیں کی تھیں' لیکن مجھے کبھی اپنی آئیڈیل عورت میسر نہ آئی تھی۔

ہر مرد کی محبت کے کوائف منفرد ہوتے ہیں۔ میں کسی لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔ لڑکی میری نگاہ میں یوں لگتی تھی جیسے کچا پھل ہو' مجھے کچے پھل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اپنے آپ کو ایک لڑکی کے سپرد کر دینا میری دانست میں ایک احمقانہ بات تھی۔ عورت کی سب سے بڑی خصوصیت ایک گود ہے' ہمدردی بھری' ممتا بھری گود۔

وہ مرد' لڑکی کی محبت کے خواہاں ہو سکتے ہیں' جو اسے اپنا لینے کے خواہش مند ہوں۔ جو اس کے آقا بننے کی آرزو رکھتے ہوں' جو اس کے محبوب بننا چاہتے ہوں۔

میں محبوب طبیعت کا مالک نہ تھا۔ عورت کو اپنا لینے کا خواہش مند نہ تھا۔ الٹا میری خواہش تھی کہ میں اپنا آپ صرف اس کے حوالے کروں' جسے شعور ہو کہ آپ سے کیسے برتاؤ کرنا ہے۔ آپ کے محبت کے مطالبات کیا ہیں۔ کس طرح آپ کو جذبہ محبت سے سرشار رکھنا ہے۔

جذبہ محبت کے قیام اور استحکام کے لیے صرف محبت کرنے کا عمل ہی کافی نہیں ہوتا' وفا ہی کافی نہیں ہوتی مجھے محبت کے جذبہ سے سرشار رکھنے کے لیے بے وفائی کی دھمکی از بس ضروری تھی۔

میری محبت کے کوائف میں عورت کا تیار ہونا ضروری تھا۔ میں صرف ممتا بھری عورت سے محبت کر سکتا تھا۔

میری محبت کے کوائف کے متعلق دوسری اہم بات یہ تھی کہ محبوبہ کے نقاب میں ابھرے ہوئے تار ہوں۔ میں اتنی قوت کا مالک نہیں تھا کہ تخیل کے زور پر ان ابھرے ہوئے تاروں کو گنتا رہتا۔ میرا مطالبہ تھا کہ محبوب عملی طور پر ان تاروں کو ابھارے اور اپنے برتاؤ میں بے وفائی کی کلیاں ٹانکے۔ انداز میں بے پروائی پیدا کرے اور اگر محبت کے پس منظر میں اجتناب کی جھلک بھی ہو جائے تو سبحان اللہ۔

ہاں میں نے کئی ایک عورتوں سے محبت کی تھی۔ شہزاد میں ماں کا عنصر موجود تھا۔ بے وفائی اور بے توجہی کی نمایاں جھلک بھی تھی اور بے پروائی اور اجتناب بھی۔

سادی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس میں صرف جرأت کی اپیل تھی۔

آج تک مجھے اپنی آئیڈیل عورت نہ ملی تھی۔

لیکن اب دفعتاً" ریفوجی کمپ کے بڑے ہینگر کے باہر وہ کھڑی تھی۔ وہ مینار جس کی مجھے جنم جنم سے تلاش تھی۔

اور جب اس نے میری جانب تحقیر بھری نگاہ سے دیکھا تھا اور میرے ٹکڑے ہوا میں اڑے تھے' تو دفعتاً" مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میں گھر آپہنچا ہوں' جیسے مجھے دنیا کی سب سے بڑی دولت مل گئی تھی۔

اس وقت میں زندگی کے ایسے مقام پر کھڑا تھا جب بظاہر کسی عظیم جذبے سے متاثر ہونے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔

میں ایک تھکا ہوا ہارا ہوا شخص تھا۔ زندگی کے میدان میں ہر قدم پر میں شکست سے دوچار ہوا تھا۔ بیٹے کی حیثیت سے اپنے والد "فادر ہاسٹیلٹی" کی وجہ سے "ایڈ جسٹ منٹ" پیدا نہیں کر سکا تھا۔ فادر ہاسٹیلیٹی میرے بند بند میں رچی بسی تھی۔ جو اندر ہی اندر مجھے کھائے جا رہی تھی۔ گھر سے اچھے تعلقات پیدا نہیں کر رہی تھی۔ سماج سے اچھے تعلقات پیدا کرنے سے معذور تھا چونکہ ازلی طور پر اکیلا تھا۔

اکیلا' تنہا' مجھے لوگوں سے ملنے میں کوفت محسوس ہوتی تھی۔ طبعاً" میں سماج کے گھونسلے سے گرا ہوا "بوٹ" تھا۔

محبت میں میں مسلسل ناکام رہا تھا۔

مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے میں ٹوٹ چکا تھا اور اب اس میدان میں قدم رکھنے سے ڈرتا تھا۔

چونکہ عورت کا ڈسا ہوا تھا لہٰذا اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے میں نے اقبال بیگم سی پاکیزہ اور نیک عورت سے شادی کر لی تھی۔

مجھے علم نہ تھا کہ عورت سے بار بار ڈسے جانا' میرا مقدر ہے۔
اگر میں تھکا ہارا نہ ہوتا۔ تو ریفوجی کیمپ کی اس مُیار کو دیکھ کر' وہیں دھرنا مار کر بیٹھ جاتا۔
جس طرح میرے دوست سمیع نے کیا تھا۔

سمیع اور خانہ بدوش

سمیع بھی عورت کا ڈسا ہوا تھا۔ اسے بھی میری طرح عورت سے ڈسے جانے کا جنون تھا۔ وہ بھی محبت کے میدان کا ہارا ہوا سپاہی تھا۔ اس نے بھی اپنی زندگی کو نئے خطوط پر چلانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس نے ایک نیک اور پاکیزہ عورت سے شادی کر لی تھی اور وہ عرصہ سات سال سے پر سکون گھریلو زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس وقت ان کے چار بچے تھے۔ میاں بیوی میں اتفاق تھا' محبت تھی۔ گھر میں اطمینان اور سکون کا دور دورہ تھا۔

پھر ایک دن دروازہ بجا۔ اس وقت سمیع دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ سمیع باہر نکلا۔ دروازے پر وہ ———— کھڑی تھی۔

وہ ایک خانہ بدوش عورت تھی۔

پتہ نہیں اس ایک ساعت میں کیا کیا اسرار و رموز عمل میں آئے۔ خانہ بدوش نے اپنا ڈنک دکھایا۔ سمیع نے للچائی ہوئی نظر سے ڈنک کی طرف دیکھا۔ شاید اس مختصر سی ملاقات کے کوائف مختلف ہوں۔ بہر حال وہ کوائف بے حد پر اثر تھے۔ خانہ بدوش نے بے زبانی کی زبان میں جو کچھ کہا وہ سمیع نے سنا۔ اتنی توجہ سے سنا کہ وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں جا اترا' اس کے احساسات پر چھا گیا۔

پھر خانہ بدوش چل پڑی اور سمیع اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس کے بعد سمیع اپنے گھر نہ پہنچا۔ اس کے دوست اور رشتے دار سمیع کی تلاش میں نکلے۔

سمیع کی تلاش کچھ مشکل نہ تھی۔ شہر کے لوگوں نے جگہ جگہ مکانوں کے دروازوں پر اسے خانہ بدوش کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

پھر وہ خانہ بدوشوں کے ڈیرے پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ڈیرے کی حدود سے باہر سمیع

بیٹھا ہوا ہے۔

انہوں نے سمیع سے بات کی' لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ سمیع سے بات نہیں کی جا سکتی۔ ہر بات کے جواب میں وہ ایک عجیب سی احمقانہ مسکراہٹ مسکرا دیتا تھا۔

پھر وہ خانہ بدوشوں کے سردار سے ملے۔

سردار بولا' اسے لے جاؤ۔ اس کا یہاں بیٹھنا ہماری بدنامی کا باعث ہے۔ دیکھ لو ہم نے اسے ڈیرے کے اندر آنے نہیں دیا۔ ہمارا قانون ہے کہ اگر کوئی ہماری بیٹی سے بیاہ کرنا چاہے تو اسے ہم میں شامل ہونا پڑے گا' ہم سا بننا پڑے گا۔ پہلے دو سال وہ ہمارے ڈیرے کی حدود سے باہر بیٹھے۔ اگر ہمیں اس کی وفاداری کا یقین آ جائے' تو پھر دو سال ہمارے ڈیرے میں گزارے' پھر لڑکی سے رشتے کی بات کرے۔

پھر وہ اس خانہ بدوش مٹیار سے ملے۔

وہ ان کی بات سن کر ہنس پڑی بولی۔ چلے جاؤ۔ بے کار ہے۔ اسے یہاں سے کوئی نہیں اٹھا سکتا' اسے یہاں سے کوئی نہیں لے جا سکتا۔

لیکن کیوں انہوں نے پوچھا۔

مجھے پتہ ہے' وہ ہنسی' میں جانتی ہوں۔

آج بھی سمیع وہیں بیٹھا ہے' کیوں بیٹھا ہے۔ صرف وہ خانہ بدوش مٹیار جانتی ہے کہ کیوں بیٹھا ہے۔ محبت کے ڈھکے چھپے کوائف کا بھید کس نے پایا ہے۔

چھٹا باب

عورتیں ہی عورتیں

جس کیمپ میں میری تعیناتی ہوئی تھی وہاں کچھ بوڑھے مرد تھے باقی بچے اور عورتیں ہی عورتیں۔ بوڑھی عورتیں' نوجوان عورتیں' ادھیڑ عورتیں۔ ان میں سے بیشتر عورتیں تو شاک کے عالم میں تھیں۔ لٹی پٹی کھوئی ہوئی اپنی ہی نگاہوں میں گری ہوئی' بے زار' جیسے زندگی میں کچھ باقی نہ رہا ہو۔ ان کی مایوسی کے متعلق اندازہ لگانا مشکل تھا۔

شاید اپنے املاک کے کھو جانے کی وجہ سے ان کی یہ کیفیت تھی یا شاید اس لیے کہ عزیز و اقارب ان کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیئے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ شرمساری ہو' وہ ندامت جو زبردستی کی بھینٹ چڑھ جانے کی وجہ سے عمل میں آتی ہے اور عورت کو اپنی ہی نگاہوں میں گرا دیتی ہے۔ ان کی عزت نفس چور چور تھی۔

چاہے کوئی بھی وجہ ہو' ان میں پھر سے جینے کی آرزو کا کوئی آثار نہ تھا۔ وہ بھول چکی تھیں کہ وہ عورتیں ہیں۔

ٹک ٹک ٹک ٹک

کیمپ میں ایک چوتھائی ایسی عورتیں بھی تھیں جو زندگی سے بے تعلق نہیں ہوئی تھیں۔

ان کی نسائی حس بیدار تھی۔ نسائی کمپیوٹر ٹک ٹک ٹک چل رہے تھے۔ اس افتاد کے باوجود جو ان پر پڑی تھی' نسائی ٹرانسیسٹر پیام نشر کر رہے تھے "میری طرف دیکھو' میں عورت ہوں" نہیں اتنی شدت سے نہیں' مجھے اکھاڑو نہیں' میں تو پہلے ہی اکھڑی ہوئی ہوں۔

ان پیغامات کی وجہ سے کیمپ کے کارندے بوکھلائے ہوئے پھر رہے تھے۔ بیچاروں کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں' کیا نہ کریں۔ ان کے دل مہاجرین کے دکھوں پر آب دیدہ تھے۔ جذبہ ہمدردی چھلک رہا تھا۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ دکھی مہاجروں کی خدمت کریں' ان کو تسلی دیں' ان کے دلوں میں پھر سے امید کا دیا جلا دیں' "غم نہ کھاؤ بہن اگر تمہارا بھائی شہید ہو گیا ہے تو میں جو ہوں۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔"

ٹک ٹک ٹک ٹک۔ کمپیوٹروں کی آوازیں ان کے کانوں میں پڑتیں۔ وہ گھبرا جاتے۔ در پردہ لاحول پڑھتے۔ "ہاں بہن مجھے اپنا بھائی جانو"۔ ٹک ٹک ٹک ٹک' سانپ بہشت میں گھس آتا' پھر وہ وہاں سے بھاگ اٹھتے' نہیں میں ایسا کمینہ تو نہیں ہوں۔ لاحول ولا قوۃ

کیمپ کے کارکن ان جانی کشمکش میں مبتلا تھے۔

شوق تحقیق

میں خود عجیب کیفیت میں مبتلا تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے شعور ہوا تھا کہ میں مسلمان ہوں' اگرچہ مجھے مسلمان کے مفہوم کا علم نہ تھا' لیکن یہ شعور سوچ بچار کا نہیں' جذبے کا نتیجہ تھا۔ تازہ جذبے میں بہت قوت ہوتی ہے۔ اس جذبے کی وجہ سے میرا دل ہمدردی سے چھلک رہا تھا۔ لیکن ساری دقت اس نفسیاتی زاویہ نظر کی تھی' جس میں میں رچا بسا ہوا تھا۔

بی۔ اے کے بعد میں نے مطالعہ شروع کیا تھا' پتہ نہیں کیوں' لیکن فکشن سے میں نفسیات میں جا نکلا تھا۔ ان دنوں نفسیات کا مضمون ابھی بچہ ہی تھا۔ بہت کم کتابیں دستیاب تھیں۔ وہ بھی بازار میں نہیں ملتی تھیں۔ اسی وجہ سے میں نے پنجاب پبلک لائبریری کی طرف رجوع کیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال میں لائبریری کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ پھر میں نفسیات کی ایک شاخ

علم جنس میں جا نکلا تھا۔

جنس کے مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنس میں میری عملی دلچسپی کم سے کم تر ہو گئی۔ دل میں یہ ایمان ابھر آیا کہ بنی نوع انسان کے بیشتر مسائل جنس کی وجہ سے ہیں۔ ہر عورت کی طرف دیکھ کر میں اندازہ لگاتا کہ یہ کیسی عورت ہے' اس کا نظام آرزو کس رنگ میں رنگا ہوا ہے' اس کے "ایرو جینک" زون کون سے ہیں' مطالبات کیسے ہیں' کس حد تک لاشعوری ہیں' کس حد تک شعوری۔

کیمپ میں جا کر میں ایک عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ بڑی ہمدردی سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا۔ جذبہ خدمت سے بھیگ جاتا۔ لٹے پٹے مہاجرین کے دکھ کو شدت سے محسوس کرتا۔ پھر ان جانے میں کمپیوٹروں کی ٹک ٹک سنائی دیتی۔ چونک جاتا' احساس شرمندگی چاروں طرف سے گھیر لیتی' لیکن میں اس احساس کو خود پر طاری ہونے نہ دیتا تھا۔ ٹک ٹک کو ان سنی کر دینے کی کوشش میں لگ جاتا۔ نہیں نہیں' یہ عورتیں نہیں' یہ تو مہاجرین میں ظلم و تشدد کے مارے ہوئے' ہوس۔ ملک گیری کے ہاتھوں ستائے ہوئے' جو ظلم سہہ سہہ کر احساس خودی کھو چکے ہیں۔

ابھی میں خود کو سمجھا بجھا رہا ہوتا کہ نسائی پیغامات کی ٹک ٹک پھر سے سنائی دیتی۔" ادھر دیکھو میں کون ہوں' دنیا کا بڑے سے بڑا صدمہ میری آرزوئے زیست کو کچل نہیں سکتا۔"

چار ایک دن تو میں کیمپ میں بوکھلایا ہوا گھومتا رہا' اپنے آپ سے لڑتا جھگڑتا رہا۔ لیکن اپنے آپ سے کوئی کب تک لڑتا جھگڑتا رہے' پھر میں نے ہتھیار ڈال دے۔ "یہ عملی جنس تو نہیں ہے' عملی جنس کی تو اہلیت ہی نہیں' یہ تو محض شوق تحقیق ہے' تحقیق کا ایسا موقع پھر کب ملے گا' اتنی ساری عورتیں اور جذباتی ہیجان سے چور چور۔

پھر میں نے عورتوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اب وہ میری نظر میں مہاجرین نہیں تھیں بلکہ عورتیں تھیں۔ رنگ برنگ کی عورتیں' جسمی عورتیں' غم خور عورتیں' مسکاتی عورتیں' خوف زدہ عورتیں' ہمدردی کی خواہاں عورتیں' ماتا بھری عورتیں' محبوبہ عورتیں' ہر جائی عورتیں' سانپ عورتیں' اذیت پسند عورتیں' شکایتی عورتیں۔

جسمی عورت

کیمپ کی عورتوں کو دیکھ کر بیتے ہوئے دنوں کی یادیں آنے لگیں۔ ہاں یہ جسمی عورت ہے۔ کتنی مظلوم ہے یہ جسم کے ہاتھوں ستائی ہوئی۔ ہر وقت کی ٹک ٹک ٹک ٹک نہ موقع کا خیال' نہ ماحول کا لحاظ۔ جسم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں' مہا اتیا چاری' اور پھر اس ظلم کا کسی کو شعور نہیں ہے۔ مجبوری اور لاچاری کی انتہا ہے۔ مرد کی ایک نظر پڑ جائے تو اندر کی نسائی گھڑی ٹک ٹک کرنے لگتی ہے۔

عام طور پر نسائی کمپیوٹر اور مردانہ نگاہ پیام کے درمیان دل حائل ہوتا ہے۔ نگاہ سیدھی دل پر پڑتی ہے' اگر دل اسے قبول نہ کرے' تو نسائی کمپیوٹر چالو نہیں ہوتا۔ قبول کر لے' تو ٹک ٹک شروع ہو جاتی ہے' لیکن جسمی عورت میں نگاہ پیام کا تعلق براہ راست جسم سے ہوتا ہے۔ ادھر نگاہ پڑی ادھر ٹک ٹک شروع ہوئی۔ چناؤ کا اختیار نہیں ہوتا۔ جذبات کا دل سے نہیں بلکہ جسم سے براہ راست جوڑ ہوتا ہے۔ اس لیے کنٹرول نہیں ہوتا' بریک نہیں ہوتی۔

جسمی عورت کو میں ڈی ٹائپ کہا کرتا تھا۔ یعنی جس سے صرف ایک نوعیت کا تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ڈی ٹائپ سے مجھے گھن آتی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں خود جسمی مرد نہیں تھا۔ الٹا جسم میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ میرا جسم جذبات کا تابع تھا۔ میں خیال کو جذبات کی بھٹی میں ڈال دیتا۔ آنچ تیز کرتا اور تیز' اور تیز۔ خود ساختہ شدت پیدا کرنے میں مجھے خاصی محنت کرنی پڑتی تھی۔ پھر کہیں جا کر جسم سے نحیف سی آواز پیدا ہوتی۔ "مجھے پکارا؟"

جب میں حسن منزل میں جمال کے ساتھ رہتا تھا اور شام کو ہم دونوں سیر کو اکٹھے نکلتے تھے۔ کسی ڈی ٹائپ راہ گیر کو دیکھ کر میں ناک بھوں چڑھاتا تو جمال کا منہ سرخ ہو جاتا۔

اس پر جمال چلاتا' یار تو اس معاملے میں اس قدر احمق کیوں ہے۔ اندھے یہی تو کام کی چیز ہے۔ جو کام کی چیز ہو اسے دیکھ کر تو نفرت سے منہ موڑ لیتا ہے' واہ بھئی واہ۔

جمال بار بار مجھے سمجھاتا' دیکھ اگر میں تیرے گھر آؤں' باہر سے آواز دوں۔ تیرا ابا تجھ سے پوچھے کون ہے یہ۔ کیا کرتا ہے' کیسا لڑکا ہے' قابل اعتماد ہے یا نہیں' آوارہ تو نہیں۔ پوچھ کچھ

کرنے کے بعد وہ تجھ سے کہے اچھا جا اسے مل لے۔ یا میں آواز دوں اور تو سوچے سمجھے بغیر، پوچھے بغیر فٹاک سے باہر نکل آئے۔ کس نے مجھے پکارا' کسی نے مجھے پکارا۔

بھلا یہ بتا کہ دونوں میں سے کون سی صورت اچھی لگتی ہے۔

میں نہیں سمجھا' میں کہتا۔

بھئی یہ عورت جسے تو ڈی ٹائپ کہہ کر نفرت سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اس کی بات کر رہا ہوں میں۔ میں پھر بھی نہیں سمجھا۔

بھئی اس کو آواز دو تو یہ کسی سے پوچھتی نہیں' سوچتی نہیں کہ آواز دینے والا کون ہے' کیا کرتا ہے' قابل اعتماد ہے یا نہیں' وقت کٹی کا رسیا ہے یا ساتھی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بن سوچے سمجھے' دل سے پوچھے بغیر ذہن سے مشورہ کئے بغیر باہر نکل آتی ہے۔ "لو میں آگئی۔" جمال مسکراتے ہوئے کھجانے لگتا جیسے واقعی کوئی آگئی ہو۔

بات ہوئی نا۔ ادھر بٹن دبا ادھر بتی جل گئی' نہ چمنی صاف کرو' نہ تیل ڈالو نہ بتی کترو اس کے باوجود تو لالٹین کا دیوانہ ہے' کیوں اندھے یہی تو اصلی اور سچی عورت ہے نگاہ سے بٹن دبایا اور روشنی ہی روشنی۔

جمال کی بات معقول تھی لیکن میں طبعی طور پر لالٹین پسند تھا' چمنی صاف کرنا' بتی کترنا اور تیل ڈالنے میں ہی تمام تر لذت تھی۔ ساری رونق اہتمام کی تھی۔

اس ضمن میں ہر مرد پر فطری طور پر کچھ مجبوریاں عائد ہوتی ہیں۔

جمال بٹن دبا کر جگ مگ کرنے پر مجبور تھا۔ میں اہتمام پر مجبور تھا۔

شعلہ

بچپن میں جمال کی آرزو تھی کہ اس لڑکی سے شادی کرے جس سے اسے محبت ہو۔ بی اے میں کتابیں پڑھ پڑھ کر اور لاج کے پڑھے لکھے ساتھیوں کی باتیں سن سن کر اس کی یہ آرزو تقویت پکڑ گئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ماں باپ کی بات ماننے سے مسلسل انکار کرتا رہا تھا۔ ماں باپ چاہتے تھے کہ وہ اپنی چچا زاد شعلہ سے شادی کر لے۔

پھر ایک روز اتفاق سے اس نے شعلہ کو دیکھ لیا۔

شعلہ ڈیوڑھی سے باہر نکل رہی تھی' جمال داخل ہو رہا تھا۔ اس وقت جمال کو علم نہ تھا کہ یہی شعلہ ہے' وہ سمجھتا تھا کہ لڑکی ہے۔ اس لیے حسب عادت نگاہ سے بٹن دبایا' شعلہ لپکا' اتنا لپکا' اتنا لپکا کہ جمال کا سب کچھ جھلس گیا۔ پھر وہ مسکرا کر باہر نکل گئی۔ جمال نے اندر جا کر چھوٹے بھائی سے چوری چوری پوچھا۔ یہ کون لڑکی تھی جو ابھی ابھی گئی ہے۔ وہ تو شعلہ تھی' بچے نے کہا۔ اس پر جمال کا جسم از سر نو دھڑ دھڑ جلنے لگا۔

اسی شام وہ ماں سے کہہ رہا تھا' جلدی کر دو' ابھی کر دو' نکاح کل ہی پڑھوا دو اور آٹھ دن کے اندر جمال کا شعلہ سے بیاہ ہو گیا تھا۔

پھر جمال کہا کرتا تھا یار مجھے تو اب پتہ چلا ہے کہ محبت کسے کہتے ہیں' حد ہو گئی۔ بس ایک بار اس کی طرف نگاہ ڈالوں تو ظالم وہیں کپڑے پھاڑ کر "میں آ گئی۔" "میں آ گئی"۔ چلاتی ہوئی باہر نکل آتی ہے' چاہے ابا بیٹھا ہو' چاہے چاچا دیکھ رہا ہو۔ پھر اسے کوئی اور دکھتا ہی نہیں دھڑ دھڑ جلنے لگتی ہے۔ بات ہوئی نا۔

روئی روئی

پھر غم خور عورت تھی جس کے وجود سے دکھ کی پھوار رستی رہتی ہے۔ ستا ہوا چہرہ' اداس انداز' آنسو پی جانے والی آنکھیں' اب روئی' ہونٹ ایسے جیسے کراہ دبا کر بیٹھے ہوں' سانس یوں لیتی جیسے آہیں بھر رہی ہو۔ اسے دیکھ کر ہمدردی کا ایسا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جی چاہتا کہ اسے دکھ سے نجات دینے کے لیے' سب کچھ قربان کر دیں اور پھر سادھو بن کر جنگل کو نکل جائیں اور ساری زندگی بن باس میں گزار دیں۔

مہاجرین کے کیمپ میں ایسی عورتیں بہت زیادہ تھیں' لیکن وہ سب غم خور عورتیں نہیں تھیں۔ وہ تو دکھی عورتیں تھیں۔ انہوں نے دکھ جھیلے تھے' ان پر ظلم ڈھائے گئے تھے۔ غم خور عورت تو وہ ہوتی ہے جو اطمینان بھرے حالات میں بھی دکھی نظر آتی ہے اور دوسرے کو ہمدردی کے جذبے سے یوں بھر دیتی ہے کہ وہ چپ چپ کرنے لگتا ہے' جس طرح جلیبیاں شیرے میں

بھیگ کر چپ چپ کرتی ہیں' جیسے مینا اور پال چپ چپ کیا کرتے تھے۔

میرے روبرو مینا اور پال آ کھڑے ہوئے۔

پال سے میں ناؤ گھر میں متعارف ہوا تھا۔ پال کا چہرہ ناک ہی ناک تھا۔ اتنی لمبی اور اوپر سے نیچے تک پھیلی ہوئی ناک میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ لوگوں کے چہرے پر تو ناک ہوتی ہے۔ پال کے چہرے پر ناک تھا۔

شاید وہ ناک اتنا لمبا نہ تھا جتنا کہ دکھتا تھا۔ زندگی میں ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو ہوتی کم کم ہیں پر دکھتی بہت زیادہ ہیں' اتنا دکھتی ہیں کہ دیکھنے والے کو یقین نہیں آتا کہ اتنی نہیں' جتنی کہ دکھتی ہیں۔

پال کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بھڑک کر جینے کا عادی تھا۔ چھوٹے سے جسم میں اتنی ساری جان تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہو۔ مجھے علم نہ تھا کہ اس میں جان نہیں ہے' صرف دکھتی ہے' یا اگر ہے تو اس کی نوعیت مختلف ہے۔ شاید اس راز کو کبھی نہ جان سکتا اگر پال مجھے اپنا راز دان نہ بناتا پتہ نہیں پال نے راز دانی کے لیے از خود میرا چناؤ کیا تھا یا یہ اتفاقیہ امر تھا۔ بہرحال ایک روز پال نے ترنگ میں آکر کہہ دیا پتہ ہے میں تمہیں کہاں لے جا رہا ہوں۔

ہاں تم اپنے پھوپھا کے گھر جا رہے ہو۔

پھوپھی تو فوت ہو گئی ہے۔ پھوپھا نے نئی کر لی ہے۔ اب یہ پھوپھا کا گھر نہیں ہے پال نے کہا۔

تو پھر تم جاتے کیوں ہو؟ میں نے پوچھا۔

مینا

اس گھر میں میری محبوبہ رہتی ہے' پال نے کچھ اس انداز سے یہ خبر دی جیسے ایک تکلیف دہ بات ہو' اس کا ناک اور لمبا ہو گیا۔ دھار نکل آئی اور اس نے چہرے کو کاٹ کر لہو لہان کر دیا۔ میں حیرت سے پال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایک ایسا خوش باش آدمی دفعتاً

ریزہ ریزہ کیسے ہو گیا ہے۔ مجھے ایسے لگا جیسے اڑتی ہوئی تیتری کے پر جھڑ گئے ہوں اور وہ سنڈی بن کر زمین پر رینگنے لگی ہو۔

جب ہم پھوپھا کے گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ میاں بیوی اپنی شادی کی سالگرہ منانے کے لیے پک نک پر گئے ہوئے ہیں۔

پال کا شور شرابا سن کر ایک لڑکی اوپر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔

وہ ایک پتلی دبلی' گلابی سی لڑکی تھی۔ اس نے نیچے دیکھے بغیر کسی اور سمت نظریں جھکا لیں اور تصویر بن کر کھڑی ہو گئی' یوں جیسے روبرو نہیں بلکہ اکیلی کھڑی ہو۔ تن تنہا' گرد و پیش میلوں تک کسی کا وجود نہ ہو۔

اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا تباہ ہو چکی ہو' وہ اکیلی بچ گئی ہو اور دکھ بھرے انداز میں کھڑی سوچ رہی ہو کہ اب کیا ہو گا۔

نیچے صحن میں پال نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی فیلٹ اتار کر ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھی' اسے مروڑنے میں شدت سے مصروف تھا۔ اس نے ایک بار بھی سر اٹھا کر بالکونی کی طرف نہ دیکھا۔

مینا ان لڑکیوں میں سے تھی جو جھکی جھکی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتی ہیں۔ بلکہ جو صرف جھکی جھکی آنکھوں سے ہی دیکھ سکتی ہیں' نظریں اٹھا کر نہیں۔

اس وقت پال کے چہرے پر دکھ کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ناک نے پھیل کر سارا چہرہ ڈھانپ دیا تھا' اس کی دھار کاٹ کیسے جاری تھی۔ خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے' لیکن اتنے دور نگاہیں جھکائے کھڑے رہے' کھڑے رہے صدیاں بیت گئیں۔

میں ڈیوڑھی میں چھپا ان دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک ان جانا گہرا سکوت طاری رہا۔

پھر پال کی آواز سنائی دی' کہاں گئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ بات نہ ہو بلکہ کراہ ہو۔ پال نے نہ تو آنکھیں اٹھائیں' نہ مینا کو مخاطب کیا۔

"پتہ نہیں" اوپر سے مینا نے بالکونی کے ستون کو مخاطب کر کے آہ بھری۔

تم سامنے نہیں آتی۔ پال نے اپنی ٹوپی سے پوچھا۔

کھڑی تو ہوں، بادلوں میں کسی نے سسکی بھری۔

روز آیا کرو۔

کوئی آنے دے بھی۔

سوتیلی سے دبتی ہو۔

اونہوں۔

ابا سے۔

اونہوں۔

کس سے۔

کسی سے نہیں۔

وہ گھر سے نکال دے گی۔

اللہ کرے۔

پھر کیا کرو گی۔

کچھ نہیں۔

رل جاؤ گی۔

اس گھر میں رہنے کی نسبت اچھا ہو گا۔

ابا نہیں اپناتے کیا۔

اپناتے ہیں ——— سوتیلی کو۔

اور تمہیں۔

کوئی نہیں ——— وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔

میں جو ہوں۔

منہ زبانی ——— آواز میں بلا کر دھار تھی۔

ایک بجلی سی گری، پال تڑپا، تڑپتا رہا، خاموشی چھائے رہی، لیکن وہ تڑپ سارے صحن میں

لہراتی رہی۔ مینا کو دیکھے بغیر پتہ تھا کہ تڑپ سے سارا آنگن بھرا ہوا ہے' لیکن وہ یوں مطمئن تھی' جیسے یخ تالاب میں بیٹھی ہو۔

وہ ایک عجیب منظر تھا' ان جانا' پر اسرار' لذیذ میری حیرت لذت میں بدلتی جا رہی تھی۔

پھر پال نے منہ زبانی کا دھب دھونے کے لیے باغ میں ملنے کا پروگرام بنایا۔ شاید اس لیے کہ اسے ایک رازدان مل گیا تھا۔ تیسرے آدمی کے بغیر ملاقات ممکن نہ تھی۔

پہلی مرتبہ جب وہ باغ میں ملے تو دونوں نے زبردستی مجھے بنچ پر درمیان میں بٹھا دیا اور خود میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ میرے لیے یہ بات بڑی انوکھی تھی۔ طالب اور مطلوب' دوری حاصل کرنے کے لیے' مجھے استعمال کر رہے تھے۔

پال بڑے غور سے بنچ کی بناوٹ کا مطالعہ کر رہا تھا۔

مینا اپنی انگلیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس سے پوچھو پال نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ یہ ڈرتی کیوں ہے۔

ہاں ڈرتی ہوں' مینا نے مجھ سے کہا' کہہ دو صرف ایک شخص سے' صرف ایک۔ میں نے پال کی طرف دیکھا۔

پال نے شدید جھرجھری لی' جیسے کوئی اسے ذبح کر رہا ہو' پھر دکھ میں بھیگے ہوئے غصے سے چلایا۔ امی سے یا ابا سے۔

میں نے مینا کی طرف دیکھا' مینا نے سر نفی میں ہلا دیا اور ایک گہری آہ بھری۔

پوچھو کس سے' پالؔ نے کراہ کر کہا۔

میں نے مینا کی طرف دیکھا کہ وہ ہے ایک شخص اس سے اس کی آنکھیں اور بھی جھک گئیں۔ چہرے پر گلابی لہر دوڑ گئی۔

پال نے خوشی بھری آہ بھری۔

یونہی وہ باغ میں ملتے رہے۔ درمیان میں تیسرے آدمی کو بٹھا لیتے اور گھنٹوں اس کے توسط سے باتیں کرتے۔ حتیٰ کہ بنچ کے ارد گرد کی فضا آہوں اور کراہوں سے بوجھل ہو جاتی جوں جوں بوجھل ہوتی' توں توں مینا کا رنگ نکھرتا' پال کی آنکھوں سے مسرت کی پھوار اڑتی اور میں بھیگ

بھیگ جاتا۔

شروع شروع میں تو میں اس صورت حال سے گھبراہٹ سی محسوس کرتا رہا تھا' لیکن پھر مجھے لذت آنے لگی۔ عجیب لذت تھی وہ دکھ میں لپٹے ہوئے رومان کی لذت۔ میرا جی چاہنے لگا تھا کہ میں کسی لڑکی کو اپنا روگ بنا لوں اور پھر آنسوؤں سے بھیگی بھیگی باتیں کروں۔ آہوں اور کراہوں کے جال میں پھنس کر تڑپوں۔ شاید اسی لیے' میں نے بینا سے اکیلے میں ملنے کی کوشش کی تھی' دو ایک بار۔

ہائیں۔ تم بھی

بینا میں نے پوچھا تھا' تم چاہتی کیا ہو۔

کچھ بھی نہیں۔

پھر پال سے ملاقاتوں کا مقصد۔

بربادی اور کیا۔

کیوں۔

بس۔

پال تم سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتا۔

پتہ نہیں۔

تم اسے کہتی کیوں نہیں۔

کیا۔

کہ مجھ سے بیاہ کر لو۔

بینا ہنسی' دبی دبی ہنستی چلی گئی۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے ہنستے دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ نبات کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ یوں جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔ اس کے باوجود یوں لگتا تھا جیسے وہ کیف و سرمستی کے عالم میں ہو۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی' میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔

کس منہ سے اسے کہوں وہ بولی کہ مجھ سے شادی کر لو۔

کیوں۔

اب کیا فائدہ اس نے لمبی آہ بھری۔

کیا مطلب۔

اس کی شادی تو ہو چکی ہے۔ مینا کا بند بند دکھ بھری خوشی سے ناچ رہا تھا۔

کب ہوئی۔

دس بارہ دن ہو گئے' اس نے آہ بھری۔

اس نے ہمیں تو نہیں بتایا۔

مجھے بھی تو نہیں بتایا۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن' لیکن میں نے چلا کر کہا وہ تو ابھی تک تم سے ملتا ہے ہمدردی کے مارے میں نے بے خبری میں مینا کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

ہاں۔ مینا نے اپنے ہاتھ حوالے کرتے ہوئے آہ بھری۔

مجھے غصہ آ گیا پھر تم اس سے کیوں ملتی ہو۔

کیوں نہ ملوں' اس کی بھویں تن گئیں۔

وہ شادی شدہ ہے۔

کیا فرق پڑتا ہے' وہ بولی۔

حیرت سے میری آنکھیں ابل آئیں۔

مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ یہی ہو گا' وہ آہ بھر کر بولی۔

غصے میں میں نے اس کے دونوں ہاتھ زور سے بنچ پر پٹخ دیے اور اٹھ بیٹھا۔

مینا نے ایک چیخ ماری۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ خوشی کی چیخ ہو۔ میں نے مڑ کر مینا کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ چوٹ کی وجہ سے وہ انہیں سہلا رہی تھی۔ میں نے شدید ندامت محسوس کی اور معافی مانگنے کے لیے تڑپ کر نگاہ اوپر اٹھائی۔ حیرت سے میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا' مینا کا چہرہ لذت بھری مستی سے سرشار تھا۔ اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ ہائیں تم بھی۔

اس روز مجھے احساس ہوا تھا کہ دکھی عورت کی اپیل کتنی خوفناک اور دیوانہ کن ہوتی ہے۔ وہ اپنا بند بند کاٹ کر رکھ دیتی ہے لیکن اس کاٹ میں کتنی لذت ہوتی ہے۔

کیمپ دکھی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان کے پاس جا بیٹھوں۔ دل ہمدردی کے جذبات سے ابل رہا تھا۔ مینا میرے روبرو آ کھڑی ہوئی' اس کا دبا دبا قہقہہ گونجتا۔ حتیٰ کہ سارا کیمپ قہقہوں سے بھر جاتا۔ مجھے ایسے لگتا جیسے دکھی عورت کا راز فاش ہو گیا ہو۔

گڈ ٹائم

کیمپ میں ہنسوڑ عورتیں کہیں نظر نہیں آتی تھیں۔ ہوں گی تو بہت لیکن بیتے ہوئے حادثات نے ان کی ہنسی پر دکھ کے غلاف چڑھا رکھے تھے ہنسی کی دھار زنگ آلود ہو چکی تھی۔

ویسے بھی مجھے ہنسوڑ عورت سے دلچسپی نہ تھی ہنسی فرحت ضرور پیدا کرتی ہے' لیکن فرحت ایک سطحی جذبہ ہے۔ اس کا گھاؤ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس طبعاً" میں گہرے گھاؤ کا قائل تھا۔ تالاب پر منوں پھول پھینک دو تو وہ ارتعاش پیدا نہیں ہوتا جو ایک پتھر پھینکنے سے ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے آج کل کی ٹوتھ پیسٹ مسکراہٹیں صرف گڈ ٹائم کی دعوت دے سکتی ہیں اور بس پھر گڈ ٹائم کے بعد تنہائی اور بھی گہری ہو جاتی ہے اور خاموشی اور بھی بوجھل۔

پرانے زمانے کی عورت بڑی سیانی تھی وہ گڈ ٹائم سے دامن بچاتی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ شور کے بعد خاموشی سناٹا بن جاتی ہے۔ جس سے بچنے کے لیے پھر سے شور پیدا کرنے کی خواہش جاگتی ہے۔ اور یوں شور اور سناٹے کا سائیکل چلتا ہے۔ چلتا رہتا ہے جس میں عورت ڈوبے جاتی ہے' ڈوبے جاتی ہے۔

کیمپ میں گڈ ٹائم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مہاجرین صدمے کے عالم میں تھے۔ ویسے ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کا ٹرانسمیٹر صدمے میں بھی خاموش نہیں ہوتا۔ ٹک ٹک کرتا رہتا ہے' لیکن ایسی عورتیں زیادہ تر تہذیب جدید کی پیداوار ہیں' وہاں کیمپ میں تو صرف دیہاتی عورتیں تھیں۔

بہرحال کیمپ کے کارکن مرد بھی اسلامی اور قومی جذبات سے اس قدر بھیگے ہوئے تھے کہ

ان میں گڈ ٹائم کا احساس نہ رہا تھا۔ کیسے رہتا' جب چاروں طرف دکھ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو' لہریں ٹکرا کر پھوار اڑا رہی ہوں تو خشکی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی بھیگے بغیر نہیں رہتے۔

اس کے باوجود کیمپوں میں کارندوں کے ہاتھوں زیادتیاں ہوتی تھیں' لیکن یہ زیادتیاں اتفاقا" ہو جاتی تھیں' گڈ ٹائم کی نیت سے نہیں۔

گڈ ٹائم تو تب عمل میں آتا ہے' جب دونوں فریق شعوری طور گڈ ٹائم کی طرف قدم اٹھائیں۔

جذبہ ہمدردی

ساری شرارت جذبہ ہمدردی کی تھی۔ جذبہ ہمدردی بڑا ظالم جذبہ ہے۔ اس کی شدت دیوانہ کُن ہے اور وقت یہ ہے کہ روپ بدل لیتا ہے۔ پٹ سے چت ہو جاتا ہے شمل کی طرف بہنے والا دھارا دفعتا" پلٹ کر جنوب کی طرف بہنے لگتا ہے اور اس میں تیرنے والا جوڑا ان جانے میں' اچانک ڈوبنے لگتا ہے' ڈوب جاتا ہے۔

میری نگاہ تلے ظفر محمود آ کھڑے ہوئے۔

ظفر محمود میرے خالو تھے۔ وہ ایک باعزت وکیل تھے۔ زندگی صراط مستقیم ہی صراط مستقیم تھی۔ چار بچے تھے گھر پر راج کرنے والی بیگم تھی' میاں سر تسلیم خم کو اپنا چکے تھے۔ زندگی ہموار اور پر سکون لے پر چل رہی تھی۔ پھر ایک روز رات گئے' ایک برقعہ پوش خاتون وکیل صاحب کی بیٹھک میں آ داخل ہوئی۔

اندر داخل ہوتے ہی' نوشابہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ظفر گھبرا گئے۔ ان کے پاس کبھی کوئی موکل ایسا نہ آیا تھا' جو بات کیے بغیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پہلے تو وہ بڑے معزز انداز میں بار بار پوچھتے رہے "بات کیا ہے بی بی"۔ "آپ بات تو بتائیں"۔ "اوہو یوں روئے جانے کا فائدہ"۔

"کس نے آپ کو دکھ پہنچایا ہے۔" "بی بی بات نہیں کرو گی تو میں مشورہ کیسے دونگا۔"

"اہو ہو بتاؤ بھی نا کہ بات کیا ہے۔"

ظفر سخت پریشانی میں نوشابہ کے سامنے ادھر سے ادھر' ادھر سے ادھر گھومتے رہے اور

نوشابہ بات کیے بغیر روتی رہی' روتی رہی یہاں تک کہ ظفر محمود نوشابہ کے آنسوؤں سے سر سے پاؤں تک بھیگ گئے۔

پھر وہ بھول گئے کہ وہ وکیل تھے اور ان کے سامنے موکلہ بیٹھی تھی۔

ظفر محمود نے زندگی بھر بہت سے دکھی لوگ دیکھے تھے' لیکن وہ دکھ سے کبھی سرشار نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ پروفیشن کا معاملہ تھا۔ ان کی نگاہ میں صرف ایک زاویہ نظر تھا' قانونی زاویہ۔ ان کی توجہ کبھی موکل کے دکھ پر مرکوز نہ ہوئی تھی۔ دکھ کے چھینٹے اڑتے رہتے تھے اور وہ قانون کی چھتری لگائے' بھیگنے سے محفوظ رہتے۔

اگر اس روز نوشابہ بھی آتے ہی بات چھیڑ دیتی تو ظفر محمود کی توجہ بات کے قانونی پہلو پر جا ٹکتی۔ قانون کی چھتری کھل جاتی' پھر چاہے نوشابہ کتنے ہی آنسو بہاتی' چاہے آہوں اور کراہوں سے سارے کمرے کو بھر دیتی' اس سے کچھ فرق نہ پڑتا۔

بے چاری نوشابہ بھی ان جانے میں ماری گئی تھی۔

نوشابہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ ان عورتوں میں سے تھی جن پر ادھیڑ عمر میں بہار آتی ہے۔ اس نسائی بہار کے متعلق کوئی اصول نہیں چلتا' کسی پر تو نوجوانی میں آ جاتی ہے' کسی پر جوانی میں آتی ہے' کسی پر ادھیڑ عمر میں' کسی پر سرے سے آتی ہی نہیں۔

آج کل تو خیر "لڑکی دور" ہے۔ ہر لڑکی خوف زدہ رہتی ہے کہ کہیں نسائی بہار نہ آ جائے۔ وہ اس کوشش میں لگی رہتی ہے کہ سدا لڑکی ہی رہے۔

پرانے زمانوں میں صدیوں مّیار کا دور دورہ رہا' نسائی بہار کی دھوم رہی۔ لوگ لڑکی کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے' اس لیے لڑکیاں دعائیں مانگتی تھیں کہ نوجوانی ہی میں بہار آ جائے۔ ان دنوں یہی بہار یا بلوم عورت کی کائنات تھی۔ یہی خواہش تھی کہ جلد عورت بن جاؤں۔ وقت' وقت کی بات ہے۔ آج کل لڑکی کو صرف ایک ڈر ہے۔ ہر وقت کا ڈر کہ کہیں عورت نہ بن جاؤں۔

بہرحال بات تو نوشابہ کی ہو رہی تھی۔ نوشابہ پورے جوبن پر تھی۔ اس جوبن میں چھچھورا پن نہ تھا۔ وہ ایک معزز خاتون تھی۔ وہ ظفر محمود کے ہاں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے یا اسے کام میں لانے کے خیال سے نہیں آئی تھی' الٹا اسے تو اس راز کا پتا ہی نہ تھا کہ ہمدردی کا جذبہ کام

میں لایا جا سکتا ہے' کہ وہ ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سے بڑے بڑے معرکے سر کیے جا سکتے ہیں' وہ ظفر کو بھگو دینے کے خیال سے نہیں رو رہی تھی بلکہ اس لیے رو رہی تھی کہ وہ دکھی تھی۔

ہاں تو ظفر محمود پہلے تو بڑے اضطراب میں اس کے سامنے ٹہلتے رہے پھر وہ اس قدر بھیگ گئے کہ اس کے پاس آ بیٹھے اور اس کے سر پر دست شفقت پھیرنے لگے۔

نہ رو۔ بی بی۔ رونے سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اپنی جان ہلکان کرنے کا فائدہ۔ تو مجھے بتا تو سہی کہ تجھ پر بیتی کیا ہے۔

یوں ہمدردی کی شدت نے نوشابہ کو آپ سے تم بنا دیا اور شفقت بھرا ہاتھ جو سر پر دھرا تھا اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

نوشابہ کی بپتا اگرچہ شدت بھری تھی مگر طویل نہ تھی۔ ہاں اس کی آہوں اور کراہوں نے اسے ضرور طویل بنا دیا تھا۔ لیکن اس وقت حالات خود اس قدر طول پکڑ چکے تھے کہ بات کی طوالت بار معلوم نہ دیتی تھی۔

بات صرف اس قدر تھی کہ میاں کی وفات کے بعد نوشابہ کے سوتیلے بیٹوں نے اسے تین کپڑوں میں گھر سے نکال دیا تھا۔ خالی گھر سے نکالا ہوتا تو بھی اس قدر دکھ کا باعث نہ ہوتا' انہوں نے نوشابہ کی تذلیل کی تھی' اس تذلیل میں تشدد اور بدکلامی کے ایسے عناصر تھے کہ نوشابہ کی عزت نفس تار تار ہو گئی تھی۔

اس بہیمانہ برتاؤ کی تفصیلات سنکر ظفر محمود کے رونگٹے کھڑے ہو گئے پھر وہ آبدیدہ ہو گئے۔ جب ہمدردی کا جذبہ اپنے جوبن پر پہنچا تو پتہ نہیں کیسے' ان جانے میں اک کایا پلٹ عمل میں آئی' جذبہ ہمدردی نے اپنا مداری پن دکھایا اور چند ہی ملاقاتوں میں بے سمجھے بوجھے ظفر محمود نے اپنی بیگم اور بچوں پر ظلم ڈھا دیا۔ انہوں نے نوشابہ سے نکاح پڑھوا لیا۔

نوشابہ حیران رہ گئی' میرا یہ مقصد تو نہ تھا۔

خود ظفر ہاتھ ملنے لگے' یہ میں نے کیا کر دیا۔

وہ دونوں ہی مظلوم تھے۔ لیکن انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ ساری شرارت جذبہ ہمدردی کی ہے۔

کیمپ میں نوشابائیں بھی تھیں۔ جنہوں نے کیمپ کے کارندوں کو اپنے دکھ کی داستانیں سنائی تھیں اور کارندوں نے جذبہ ہمدردی سے سرشار ہوکران کے سروں پر دست شفقت پھیرے تھے اور پھروہ مقدس ہاتھ آنسو پونچھنے لگے تھے۔ اور پھر ——— "میرا یہ مقصد تو نہ تھا" اوہ "یہ میں نے کیا کر دیا۔" کی سرگوشیاں ابھری تھیں' اور نوشابائیں از سرنو رونے لگی تھیں' بین کرنے لگی تھیں' کہ یہ کیا ہوا۔ دشمنوں کے ہاتھوں سے تو بچ نکلی تھی اپنوں نے لوٹ لیا۔

میں نے بھی اپنے آپ پر جذبہ ہمدردی طاری کر رکھا تھا۔ میری خواہش تھی کہ کسی دیہاتی نوشابہ کے پاس جا بیٹھوں اور جذبہ ہمدردی سے سرشار ہو کر کہوں۔ بڑا ظلم ہوا ہے تم پر بی بی' مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے' پر یہ بتا کہ ہوا کیسے۔ کیا ان درندوں کی اپنی بہو بیٹیاں نہ تھیں۔ میرا بھی جی چاہتا تھا کہ ایک بار کسی کو اپنی آپ بیتی سنانے پر آمادہ کرلوں' ایک بار کسی میں جذبہ ہمدردی کا سہارا لینے کی آرزو پیدا ہو جائے——— باقی رنگ تو جذبہ ہمدردی خود بھر دیتا ہے۔

کیمپ میں قیام کے دوران پتہ نہیں جذبہ شوق تحقیق' انگلی پکڑ کر مجھے کہاں لے جاتا۔ اور پھر میرے جذبے کی شمع کس کس رنگ میں جلتی اور اس زریں موقعے سے میں کیا کیا پا لیتا ——— مگر سب کھو دیا' سب کھو گیا۔ چونکہ میرے روبرو وہ آ کھڑی ہوئی' بنفس نفیس' اور ساری کائنات اس کے روبرو ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گی۔ پھر میری نظر میں نہ کیمپ رہا' نہ مہاجرین رہے' نہ عورتیں رہیں' نہ وہ دکھ بھرا ماحول رہا۔ جب ذاتی لاگ لگاؤ کا عفریت سر اٹھاتا ہے تو گرد و پیش دھندلا جاتا ہے ۔ سب کچھ معدوم ہو جاتا ہے۔ پھر ذات کا جن ابھرتا ہے۔ ابھرے چلا جاتا ہے حتیٰ کہ زمین اور آسمان سب اس کی اوٹ میں آ جاتے ہیں۔

یہی کیفیت میری تھی۔

ناجو

ناجو کو دیکھتے ہی سب کچھ معدوم ہو کر رہ گیا تھا۔

ناجو میری آئیڈیل عورت تھی۔

زندگی بھر میں نے' چوری چوری' لاشعوری طور پر' ناجو کی آرزو کی تھی' ان جانے میں ناجو کی آرزو کی تھی' لیکن ناجو مجھے کہیں دکھائی نہ دی تھی۔

میں نے جوانی میں تین محبتیں کی تھیں۔ تسلیم شہزاد اور سادی۔ تسلیم تو محض ایک بہانہ تھی چونکہ میں نے تسلیم کو پورے طور پر دیکھا بھی نہ تھا۔ بس دو ادھوری جھلکیاں' سفید دھب اور بھوری لٹ۔ تسلیم سے محبت رچانے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ محبت اپنے باپ کے طرز عمل کے خلاف احتجاج تھا۔ دوسرے یہ محبوب سے محبت نہ تھی بلکہ محبت کرنے کے عمل سے محبت تھی۔نوجوانی میں کسی سے محبت کرنے کی آرزو ہر نوجوان کے دل میں بیدار ہوتی ہے۔ ان دنوں سماجی حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ محبت کرنے کے سب راستے مسدود تھے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیان روایات کی دیواریں کھڑی تھیں۔ ان دیواروں کو توڑنے کے لیے سرکش نوجوانی نے ہر نوجوان کے دل میں محبت کرنے کی آرزو کی جوت جگا رکھی تھی۔

پھر میرے روبرو شہزاد اور سادی آ گئیں۔

شہزاد میری آئیڈیل نہ تھی' لیکن شہزاد میں ناجو کی دو ایک خصوصیات کی واضح جھلک تھی۔ بے نیازی اور بے پروائی کی عجب شان تھا اور سادی میں بلا کی جرات تھی' شوخی تھی۔

میں کسی وفا کی دیوی سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک محبوب میں بے پروائی اور بے وفائی کا عنصر نہ ہو تا وہ مجھے اپیل نہیں کرتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ایک نگاہ لگاؤ کی ہو اور پھر غلط انداز نگاہوں کا ایک تسلسل۔ یہ تسلسل میری محبت کے کوائف کی ایک لازمی کڑی تھی۔ میری محبت کے کوائف ویسے تو بہت سے تھے' لیکن چار ایک بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔

ہر شخص کی محبت کے کوائف منفرد ہوتے ہیں۔ ہم اپنی محبتوں کو محبوب کے اوصاف کی کھونٹوں پر نہیں لٹکاتے' بلکہ اکثر اور بیشتر محبوب کی خامیاں ہم میں لگاؤ کے دیے جلا دیتی ہیں۔

درپردہ ہر شخص اپنے ذہنی آئیڈیل سے محبت کرتا ہے۔ اس آئیڈیل میں مثبت اور منفی دونوں اوصاف ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی میں آئیڈیل محبوب کہاں ملتے ہیں۔ وینس ڈی مائیلو کی طرح کسی کا بازو ٹوٹا ہوتا ہے' کسی کی ناک مڑی ہوتی ہے۔ کسی کی ٹھوڑی کرم خوردہ ہوتی ہے۔ اس لیے سمجھوتے کا سہارا لیے بغیر بات نہیں بنتی۔

لیکن ناجو عین اصل تھی۔ اصل اور ہو بہو

زندگی بھر میں اس کی تلاش میں سرگرداں تھا۔
آج وہ میرے روبرو کھڑی تھی۔
کتنا عظیم اتفاق تھا۔
مجھے اپنی نگاہ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
دیر تک میں اپنے آپ کو چٹکیاں بھرتا رہا کہ سو تو نہیں رہا' یہ عالم خواب تو نہیں ہے۔

ساتواں باب

کنڈلی والیاں

جب بھی محبت طاری ہوتی تو مجھ پر حوالگی اور سپردگی کا جنون مسلط ہو جاتا تھا۔

جذباتی طور پر میں ایک مجذوب ہوں۔ محبت کا جذبہ طاری ہوتا تو اندر کا مجذوب، عقل و خرد کے کپڑے پھاڑ کر، باہر نکل آتا۔ اس وقت صرف ایک خواہش بھوت بن کر سوار ہو جاتی تھی کہ اپنا سب کچھ محبوب کے قدموں میں رکھ کر خود کو ناپید کردوں۔ سب کچھ دیوی کی بھینٹ کردوں۔

نسائی خواہش

جسمانی طور پر مجھ میں صرف ایک خواہش پیدا ہوتی تھی صرف لمس کی خواہش "پیشن" نہیں۔ کہ محبوب کا پاؤں پکڑلوں یا ہاتھ تھام لوں۔ میری زندگی کے بہترین لمحات وہ تھے جب میں شہزاد کا ہاتھ تھامے بیٹھا رہتا تھا یا اس کے پاؤں سے کھیلتا رہتا تھا، اور شہزادے کے جسم کی خوشبو اردگرد چاروں طرف سے مجھے گھیرے رکھتی۔ تھکتا نہ تھا۔

اپنی نوعیت میں یہ خواہش مردانہ نہ تھا بلکہ نسائی خواہش ہے۔ لیکن اسکا کیا کیا جائے کہ جذبہ محبت نسائی خواہشات پر قائم ہے۔

مرد کا جذبہ چھوٹے چھوٹے طوفانوں سے مرتب ہوتا ہے' طوفان آتا ہے چلتا ہے' پھر سکون طاری ہو جاتا ہے' جب تک طوفان کا دوسرا ریلا آئے' دوسرا ریلا آئے نہ آئے۔

طوفان میں شدت ہوتی ہے' تسلسل نہیں ہوتا۔ پٹیشن ہوتی ہے' ٹنڈرنس نہیں ہوتی۔ ریلا ہوتا ہے' روانی نہیں ہوتی۔ جوش ہوتا ہے' قیام نہیں ہوتا۔

جب تک محبت میں نسائی جذبہ شامل نہ ہو قیام پیدا نہیں ہوتا۔ اگر مرد میں خالص مردانہ جذبہ ہوتا تو محبت کی بہلی کے پہیئے زمین میں گڑ کر رہ جاتے۔ شاید اسی مقصد کی تکمیل کے لیے کہ محبت میں تسلسل پیدا ہو' اللہ نے دنیا کو آباد رکھنے کے لیے ہر مرد میں کہیں نا کہیں نسائی کلی ٹانک رکھی ہے۔

ایک غدود کی کمی بیشی سے کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔

بہر حال مجھ میں نسائی کلیاں کچھ زیادہ ہی ٹانکی گئی تھیں۔ اتنی زیادہ کہ مردانہ اپیل بہت کمزور رہ گئی تھی۔ محبت میں میری کامیابی کا دار و مدار صرف اس بات پر تھا کہ محبوب توجہ کے تسلسل کو محسوس کرے' سپردگی کو جانے' لیکن یہ تو تبھی ممکن ہو سکتا ہے' جب قرب تک نوبت پہنچے۔ دور سے یہ اپیل صرف جذبہ ترس پیدا کر سکتی ہے' ترس یا تحقیر ——— لیکن ——— ان دنوں مجھے ان حقائق کا احساس نہیں تھا۔

محبت کی کیفیت میں مجھ میں کبھی کشمکش پیدا نہ ہوئی تھی۔ اگر محبت کا جزو اعظم سپردگی ہو تو کشمکش کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

یہ پہلی بار تھی کہ اس سانولی ممیار نے میرے اندر کشمکش جگا دی تھی۔

کیمپ کی طرف جاتے ہوئے میں سوچتا' نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ اس بارک کی طرف نہیں جاؤں گا' جہاں وہ رہتی ہے۔

بارکوں میں جانا میرا کام نہیں تھا۔ میرا فرض صرف یہ تھا کہ صندوق سے مائیک نکالوں' اسے میز پر فٹ کروں اور پھر مہاجرین سے باتیں کرنا شروع کر دوں۔ ایسی باتیں جو ان میں امید کا دیا جلائیں' جینے کی آرزو پیدا کریں' گرد و پیش پر اعتماد پیدا کریں۔

کیمپ میں گھومتے پھرتے پندرہ روز ہو چکے تھے' لیکن میں نے کبھی صندوق سے مائیک نہیں نکالا تھا۔ کیمپ والوں نے کبھی میری آواز نہیں سنی تھی۔ دوسرے کیمپوں سے باقاعدہ

تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ ان تقریروں کو سن کر میں گھبرا جاتا اور دور کسی ایسی جگہ جا کر پناہ لیتا جہاں کسی مقرر کی آواز نہ پہنچتی ہو۔

کیمپ میں پہنچتے ہی میں سیدھا مائیک کے صندوق کے پاس جاتا۔ پھر دفعتاً" اندر سے آواز آتی "پہلے میں ذرا ادھر ہو آؤں۔" میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ادھر سے میرا مطلب کیا ہے۔ کون سا ادھر ———— پھر میں چل پڑتا' چلتا رہتا' چلتا رہتا۔

اس آوارہ گردی کے دوران ———— اندر سے آواز آتی رہتی' نہیں' میں نہیں جاؤں گا' نہیں' میں نہیں جاؤں گا۔ پھر دفعتاً" میں دیکھتا کہ دروازے میں کھڑا ہوں۔ بارک کے اندر جھانک رہا ہوں ———— اور سامنے وہ کھڑی ہے۔

لے دیکھ

وہ ہمیشہ کھڑی رہتی تھی' کبھی بیٹھی ہوئی نظر نہیں آئی تھی۔ یوں کھڑی رہتی جیسے راج ہنس گردوپیش کا جائزہ لے رہا ہو۔

سانولی مٹیار ان عورتوں میں سے تھی' جن کی تمام تر شخصیت کھڑے ہو کر ظہور میں آتی ہے۔

اس کا جسم کھڑے ہونے کے لیے بنا تھا۔ بیٹھ جاتی تو اوٹ میں آ جاتی۔

وہاں پہنچ کر میں گویا پتھر کا بن جاتا' نہ آگے بڑھتا' نہ پیچھے ہٹتا' آگے بڑھنے سے مجھے خوف آتا تھا' پیچھے ہٹنے کی طاقت نہ رہتی۔ وہاں کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہتا' اس وقت یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ مٹیار کی نگاہ تحقیر آلود ہے یا لوگ دیکھ رہے ہیں' وہ کیا کہیں گے۔

ایک دن جب میں بارک کی دہلیز پر کھڑا تھا تو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی میرے سامنے آ کھڑا ہوا' بولا۔

"تو یہاں کھڑا ہو کر کیا دیکھتا رہتا ہے۔"

"یہ بابو کیمپ والوں میں سے ہے۔" پاس بیٹھا ہوا بوڑھا بولا۔

"تو جا اپنا کام کر" ادھیڑ عمر والا غصے میں بولا "جا جا خبردار جو پھر ادھر آیا تو۔"

معاً" وہ تڑپ کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔" چاچا تجھے کیا تکلیف ہے "وہ غرا کر بولی "دیکھتا ہی

ہے نا' تو دیکھنے دے۔ تیرا کیا لیتا ہے پھر وہ تن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی "لے دیکھ" اُدھر سے دیکھ' ادھر سے دیکھ" وہ پہلا دن تھا جب اس کے ہونٹوں پر تحقیر نہ تھی۔

"دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔" چاچا۔ وہ چچا سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تو خواہ مخواہ گرمی کھاتا ہے۔" اسے دیکھ' وہ میری طرف اشارہ کر کے بولی "یہ بے چارا کیا دیکھے گا ——————" اور پھر خراماں خراماں چل پڑی۔

ساری پارک کے لوگ منہ اٹھا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"میرا اپنا بے چارہ"

مجھے یاد نہیں کہ کب اور کیسے میں اپنے بائیسکل تک پہنچا' وہ راستہ کیسے طے کیا۔

پھر جب میں بڑی سڑک پر سائیکل چلاتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا تو میری گردن اٹھی ہوئی تھی' آنکھوں میں چمک تھی' ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔

عام حالات میں اس روز کے واقعہ کو میں اپنی توہین سمجھتا۔ میری گردن لٹک جاتی' آنکھیں دھندلا جاتیں' دل دھک دھک کرتا —————— لیکن اس روز مجھے توہین کا احساس نہیں تھا۔ میں تو اسے اپنی فتح سمجھ رہا تھا۔ مُیار نے پہلی مرتبہ میرا نوٹس لیا تھا' مجھے اپنایا تھا۔ مجھے "بے چارہ" پر غصہ نہیں آیا تھا۔ جب اس نے بے چارا کہا تھا تو اس کی ساری ممتا اس کے سینے میں ابھر آئی تھی۔ نہیں نہیں' اس نے خالی بے چارہ نہیں کہا تھا۔ "میرا اپنا بے چارہ" کہا تھا۔ جب کوئی بے چارہ کہہ کر اپنا لے' تو پھر بے چارہ' بے چارہ نہیں رہتا۔ بے چارہ تو وہ ہوتا ہے' جو کسی کا نہ ہو —————— اور —————— اور —————— وہ کس طرح جست بھر کر آئی تھی۔ "مجھے ہی دیکھتا ہے نا تمہارا کیا لیتا ہے۔" اور پھر اس نے نگاہوں سے کہا تھا' "لے دیکھ" "ادھر سے بھی' ادھر سے بھی۔" "دیکھ اندھے دیکھ ——————" پارک میں بیٹھے ہوئے کسی شخص کو جرات نہ ہوئی تھی کہ اسے ٹوکے۔

گھر میں چارپائی پر لیٹے ہوئے' میں اسے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ اور وہ روبرو کھڑی پوز بدل بدل کر دکھا رہی تھی' ادھر دیکھ' ادھر دیکھ۔"

دوپہر سے شام پڑ گئی لیکن میں دیکھتا ہی رہا' دیکھتا ہی رہا۔ پھر میری بیوی میرے قریب آ

کھڑی ہوئی

"آپ بٹ بٹ کیا دیکھ رہے ہیں' اس اللہ ماری دیوار کی طرف" وہ بولی۔

شادو

میں نے سر اٹھایا۔ "بے چاری" اسے کیا پتہ کہ سامنے کون کھڑی ہے۔ میں نے پھر منہ موڑ کر دیوار کی طرف بٹر بٹر دیکھنا شروع کر دیا۔

"اے چھوڑو بھی۔" اقبال جھنجلا کر بولی۔

اس پر ناجو دیوار سے جست بھر کر اقبال کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر گردن اٹھائی "تجھے کیا تکلیف ہے۔" وہ بولی' "دیکھتا ہی ہے نا۔"

"حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔" اقبال بڑبڑائی۔

"تجھے کچھ پتہ بھی ہو" ناجو غرائی۔ "میری طرف دیکھ" وہ تن کر کھڑی ہوگئی۔ "میری کوئی حد نہیں۔"

"اے چھوڑو بھی اب" اقبال نے ہاتھ چلایا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے میں اسے جانتا ہوں۔ سالہا سال سے جانتا ہوں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

تم سے کون سر کھپائے اقبال نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا اور چل پڑی۔

شیرنی کو دونوں ہاتھ کمر پر رکھے' سینہ ابھارے' گردن اٹھائے دیکھ کر دفعتاً شادو میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کنڈلی والیوں کی شادو۔ بولی ہٹ جاؤ' آگے سے ہٹ جاؤ' میرے ذہن میں پرانی یادیں ابھریں۔ کنڈلی والیاں کی یادیں۔

پھر ناجو شادو کا بھیس بدل کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی جس طرح پچیس سال پہلے کنڈلی والیاں میں اس ہنگامے کے دوران وہ جست بھر کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

ان دنوں میں پندرہ سولہ سال کا تھا ——— وہ منظر میرے ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکا تھا' جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

کنڈلی والیاں ایک گاؤں تھا' جہاں ہم شادی پر گئے تھے۔ ساری شرارت ارجمند کی تھی۔

کنڈلی والیاں

کنڈلی والیاں میں ارجمند کے دوست محمود کی بڑی بہن کی شادی تھی۔ محمود نے ارجمند کو بلایا تھا۔ ارجمند اکیلا جانا نہیں چاہتا تھا' اس لیے اس نے شادی سے پندرہ روز پہلے ہی کنڈلی والیاں کا پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

محلے کی کسی لڑکی کو دیکھ کر ارجمند حسب عادت سینے پر ہاتھ رکھ لیتا' پھر رومال گرا کر اسے اٹھانے کے بہانے یوں جھکتا جیسے کورنش بجا لا رہا ہو۔ جب وہ چلی جاتی تو حسب عادت کہتا' "اچھی ہے بیچاری مطلب ہے خاصی ہے' ایبسنکرانٹڈی رچانے کے لیے گزارہ ہے۔ اگر بال کنڈل والے ہوتے تو شاید بات بن جاتی۔ ارے یار کنڈل کے پیچ دیکھنے ہوں تو کبھی کنڈلی والیاں چلو۔ ہئے کیا مٹیاریں ہیں وہاں کی' جبھی تو گاؤں کا نام ہی کنڈلی والیاں پڑ گیا ہے۔ بال یوں پیچ در پیچ جیسے جال لٹک رہے ہوں' پنڈا پیچ در پیچ' ادھر ابھار' ادھر خم' ادھر جوبن' ادھر بل کھاتی کمر۔ ہئے کیا نقشہ ہے اور پھر اینچ اتنی جیسے ناگن کنڈلی مار کر بیٹھی ہو۔ ادھر تم نے سر نکالا' ادھر اس نے پھن پھیلایا۔ یہاں محلے میں تو سپاٹ عورتیں ہیں' نہ بانکپن' نہ چھبن' نہ پھنکار' نہ پھن۔ یہاں تو کیچوے ہی کیچوے ہیں' بے جان رینگتی ہوئی سنڈیاں۔

میں سوچنے لگا کہ ارجمند کنڈلی والیوں کے گن کیوں گانے لگا ہے۔ ہر بات میں کنڈلی والیوں کا تذکرہ کیوں لے بیٹھتا ہے' بات کیا ہے؟

ایک روز میں نے کہا "یار یہ کنڈلی والیاں کہاں واقع ہے۔ کتنی دور ہے تو وہاں کب گیا تھا۔"

ہئے ہئے' وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا' یہی تو قیامت ہے کہ اپن وہاں گئے ہی نہیں۔ بد نصیبی۔ بالکل بدنصیبی کنوئیں پر بیٹھے ہیں پر پیاسے ہیں۔ محمود نے کئی بار بلایا پر اپن یہاں کپ کیپ میں اتنے مصروف رہے کہ عقل و خرد جواب دے گئی۔ دیکھ لو۔ ناپختہ مال کے انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کب تیار ہو اور بیس کوس پر تیار مال ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ واہ کیا مٹیاریں ہیں کنڈلی والیوں کی۔ اب پھر محمود نے بلایا ہے۔ اس کی بہن کی شادی ہے۔

شادی آہا ہا وہ چلایا۔ یعنی دیکھنے دکھانے کی جنت' ملنے ملانے کے مواقع' کہنے سننے کے بہانے' واہ واہ ایک تو کنڈلی والیاں اور دوسرے شادی' سونے پر سہاگا' ارے احمق شادی کے دوران تو ادھ بھری بھی چھلک جاتی ہے' پھر بھری ہوئی کے کیا کہنے' اندازہ لگا لو۔

جاگتے کے خواب

جب ارجمند چلا گیا تو رضا بولا "چل یار اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دیں' دو دن کے لیے ہو آئیں۔

"وہاں جانے کے لیے یہ اتنا بے تاب کیوں ہے" میں نے پوچھا۔

"مار کھانے کے لیے اس کی ہڈی بوٹی چلاؤں چلاؤں کر رہی ہے" رضا نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو جھلاتے ہوئے کہا۔

میں نے حیرانی سے رضا کی طرف دیکھا۔

"یہ پانی پت سے کچر کچر بولنا سیکھ آیا ہے' رضا ہنسنے لگا۔" ادھر زبان چلتی ہے۔ زبان کے زور پر لڑکیاں پھنستی ہیں۔ ادھر زبان نہیں چلتی' ہاتھ چلتا ہے۔ گاؤں میں جا کر زبان چلانے سے باز نہیں آئے گا۔ مار کھائے گا' ایمان سے۔"

لیکن رضا' میں نے پوچھا' یہ لڑکی پھنسا کر کرے گا کیا؟

"کیا پتہ رضا نے منہ بنایا۔"

"پھر بھی۔"

بس اک عادت ہے سو پوری کرتا رہتا ہے۔ تو بھی تو اس کے ساتھ پھرتا ہے تو کس خیال سے پھرتا ہے۔"

"کسی خیال سے بھی نہیں۔"

"تو پھرتا کیوں ہے۔"

"مجھے اچھی لگتی ہیں —————— دور سے۔"

"مجھے تو دور سے بھی اچھی نہیں لگتیں۔"

"مجھے اچھی تو لگتی ہیں پر ساتھ ڈر بھی لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا" رضا نے پھر اپنی ہاکی سٹک گھمائی۔

"پتہ نہیں دل دھک دھک کرتا ہے۔"

"تو پھر تو کنڈلی والیاں نہ جا۔"

"کیوں۔"

"اس علاقے کے لوگ اونچے لمبے ہوتے ہیں۔ ادھر جٹیاں رہتی ہیں۔ دوآبہ ہے نا۔ اونچے قد۔ یہ بدن' بانہہ پکڑ لیں تو چھڑائی نہ جائے۔

"اچھا۔" میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اونچی لمبی بھرے جسم کی جٹیاں آ کھڑی ہوئیں۔ جی چاہنے لگا کہ کوئی میری بانہہ پکڑ لے' ایسی پکڑ لے کہ پھر چھڑائی نہ جا سکے۔

"یہ تیری آنکھیں کدھر لگ گئیں۔" رضا نے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "نہیں نہیں کچھ بھی نہیں۔"

"بول پھر جانا چاہتا ہے کیا۔"

"کہاں۔"

"ادھر کنڈلی والیاں میں۔"

"کیا وہاں واقعی کنڈلی والیاں رہتی ہیں۔"

"مجھے کیا پتہ "رضا بولا۔" چل چل کر دیکھ لیں گی۔"

"اور اگر وہاں پٹائی ہو گئی تو۔"

"میں جو تیرے ساتھ ہوں گا۔" رضا نے مجھے حوصلہ دیا۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ ساری رات کنڈلی والیاں میرے گرد ناچتی رہیں اور میں اس امید پر کھڑا رہا کہ کوئی میری بانہہ پکڑ لے' ایسی کہ چھڑائی نہ جا سکے۔

دراصل میں ایک تخیلی فرد تھا۔ میرا جسم ٹھنڈا تھا اور ذہن گرم۔ سارے جسم کی گرمی ذہن میں منتقل ہو گئی تھی۔

ساری رات میں سو نہ سکا۔

"چیت یا"

اگلے روز جب ہم تینوں کنڈلی والیاں پہنچے تو دوپہر کا وقت تھا۔ محمود ہمیں بڑے تپاک سے ملا اور حویلی میں لے گیا۔

حویلی گاؤں سے آدھ میل دور تھی' جسے وہ لوگ مردانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

اس وقت حویلی میں پانچ سات آدمی بیٹھے تھے۔ جب ہم اکیلے ہوئے تو ارجمند نے محمود کا گریبان پکڑ لیا بولا۔ "کیوں بے تو ہمیں حویلی میں بٹھانے کے لیے لایا ہے کیا۔ یہاں بیٹھ کے کیا تیرا منہ دیکھیں۔ کہاں ہیں وہ تیری کنڈلی والیاں۔"

محمود اور ارجمند پانی پت اکٹھے رہے تھے۔ محمود کا باپ بھی ڈاکٹر تھا۔ اس لیے دونوں پانی پت کی ڈسپنسری میں انکرائیڈی کا کھیل کھیلتے رہے تھے۔

"ابے احمق محمود نے کہا یہ گاؤں ہے پانی پت کی ڈسپنسری نہیں۔ یہاں سر اٹھا کر دیکھا نہیں جاتا' سر لٹکا کر چلنا پڑتا ہے۔ یہاں تیری انکرائیٹڈی نہیں چلے گی۔"

کیسے نہیں چلے گی' ارجمند بولا۔ اپن تو گاؤں میں جاتے ہیں۔ ایسا منتر پھونکوں گا کہ کنڈلی مارنا بھول جائیں گی۔

"یہاں منتر نہیں چلتے۔" محمود ہنسا "یہاں جنتیاں رہتی ہیں۔ جوتی اتار لیتی ہیں۔ شرما کر پیچھے نہیں ہٹتیں۔"

"پہلے اپن کو دکھا تو سہی۔" ارجمند نے کہا۔

"شام کو تجھے گاؤں لے چلوں گا۔ وہاں ہماری گاؤں والی حویلی پر ایک چوبارہ ہے۔ وہاں ٹکا دوں گا تم کو۔"

"چوبارے کے نیچے وہڑے میں عورتوں کا اکٹھ ہو گا۔ بس تم نے دیکھ لینا۔"

دور بیٹھ کر ——— اونہوں یہ اپنا ایمان ہے۔ اپن تو میدان کے پہلوان ہیں' ارجمند نے کہا۔

بس دو ہی دانے ہیں ہمارے گاؤں میں۔ دیکھو گے تو آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ ایک تو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے' شادو۔ عورت نہیں چیتا ہے بلکہ "چیت یا" یہ اونچا قد' مست آنکھیں اور جوبن پھٹا پڑتا ہے۔ اتنی جان ہے اس میں کہ سارا گاؤں ڈرتا ہے اس سے " محمود

نے کہا۔

"زنانی سے ڈرتا ہے۔" ارجمند نے منہ بنایا۔

"ہاں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور دلیر اتنی ہے کہ اکیلی دو جوانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ بڑے رشتے آئے پر وہ نہیں مانی۔ شہر کا ایک غنڈا پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس نے دھمکیاں دی تھیں۔ شادو نے ڈانگ مار کر اس کی بانہہ توڑ دی۔"

نہ نہ نہ نہ ارجمند بولا۔ اپن تو صلح پسند آدمی ہیں' اس پہلوان کو چھوڑ کسی اور کی بات کر۔

رضا اور میں بڑے غور سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ رضا کے انداز میں بے پرواہی تھی۔ لیکن میرا دل دھک دھک کر رہا تھا' میں چاہتا تھا کہ محمود اس "چت پا" کا قصہ سناتا جائے۔ دلیر عورت پر میری جان نکلتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں شرما کر پیچھے ہٹ جانے والی عورت سے کوئی دلچسپی نہ تھی ———— آگے بڑھ کر بانہہ پکڑ لینے والی عورت سے مجھے عشق تھا۔ جو اتنے سارے مردوں میں آگے بڑھ کر کہے۔ "مجھے ہی دیکھنا ہے نا۔ دیکھنے دے' تجھے کیا تکلیف ہے۔"

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھ میں جرات نہ تھی۔ میں جھجک کر ڈر کر پیچھے ہٹ جانے والا مرد تھا۔ اس لیے میری آرزو تھی کہ کوئی ایسی ہو جو آگے بڑھ کر بانہہ پکڑ لے' ایسے کہ پھر چھڑائی نہ جاسکے۔

پھر محمود ہمیں اپنے کھیتوں میں لے گیا۔ وہاں ایک بار پھر شادو کی بات چل پڑی اور میرا سارا وجود گویا کان بن گیا۔

"شادو پر میرے بڑے بھائی کی نظر تھی۔" محمود زیر لب بولا "لیکن اس نے نہ کر دی' بولی' بابو تیرے گھر میں میرا گزارہ نہیں' میں تو کسی اپنے جیسے کے گھر جاؤں گی۔ مخمل پر گاڑھے کی ٹلی نہیں لگتی۔"

بھائی نے کہا "مخمل کی تو تو خود ہے۔" کہنے لگی "تو مجھے ایسا دیکھے ہے جیسا میں دکھتی ہوں۔ دکھنے پر نہیں جاتے' اصل پر جاتے ہیں' تو مجھے نہیں جانتا۔"

محمود نے پھر سے بات شروع کی' اس علاقے کا جانا پہچانا ڈاکو جیرا ہے۔ جیرے نے کہلوا بھیجا۔ شادو وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے تو۔ یہاں آجا میرے پاس' میرے گھر والی بن کر۔

"پھر" ارجمند نے پوچھا۔

شادو نے نہ کر دی' محمود نے جواب دیا۔ جیرا بھر گیا۔ اس نے کہلا بھیجا جو آپ نہ آئے گی تو میں خود آ کر لے آؤں گا۔ شادو نے کہا "اسے کہہ دینا بے شک آ جا۔ پر اکیلے آنا' بے خبری میں نہیں' خبر دے کر آنا مرد کی طرح۔ میں بھی کسی دوجے کو خبر نہیں دوں گی' پھر جو تو لے جائے تو میں تیری' جو خالی ہاتھ جائے تو پھر منہ پر کالک ملے رکھنا' جیون بھر۔"

"جیرا آیا کیا" رضا نے لاٹھی ٹیک کر پوچھا۔

"ابھی تو نہیں آیا" محمود بولا" شاید آجائے' کسی روز آجائے' پر سوچ سمجھ کر ہی آئے گا جو خالی ہاتھ جانا پڑا تو پھر کسی کو منہ دکھانے جوگا نہیں رہے گا۔"

"نر عورت ہے۔" رضا بولا۔

وہ نر عورت میرے حلق میں پھنسی ہوئی تھی' بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

نہ بھئی نہ ارجمند کہنے لگا ہم تو کرشن اور گوپیوں جیسا ملاپ چاہتے ہیں' دنگا فساد نہیں۔ یہ شادو تو عورت نہیں سورما ہے۔"

"یہاں دوابے کی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں' جی دار' نڈر' کرد کھانے والی شہر کی بنی سجی گڑیاں نہیں ہوتیں' محمود بولا۔

مایوسی

شام کو جب ہم گاؤں میں گھومنے گئے تو ہماری عجیب حالت تھی۔

رضا تو بے پرواہی سے سوٹا ٹیکتا جا رہا تھا۔ ارجمند گھبرایا' گھبرایا تھا' اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انکرائنڈی کا روپ بھرے یا سنجیدگی سے چلتا جائے' جیسے وہ بزرگوں کے روبرو کیا کرتا تھا۔

میرے سارے بدن پر سرخ چیونٹے رینگ رہے تھے۔ سریوں بھن بھن کر رہا تھا جیسے کندھوں پر بھڑوں کا چھتہ اٹھائے پھر رہا تھا۔

محمود کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

گاؤں کی عورتیں سبھی اونچی لمبی تھیں۔ جسم سوکھی لکڑی کی طرح سخت تھے سینے تنے ہوئے تھے' گردنیں اکڑی ہوئی تھیں۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ بیگانوں کو دیکھ کر جھینپ کر پیچھے نہیں ہٹتی تھیں' بلکہ یوں بے باکی سے کھڑی رہتیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو' جیسے وہ گنتی شمار میں ہی نہ ہوں۔ جس طرح شہری بیگمات خوانچے والوں کے روبرو یوں کھڑی رہتی ہیں جیسے وہ مرد ہی نہ ہوں۔

دو ایک نے تو گھور کر ہمیں دیکھا تھا اور پھر محمود سے پوچھا تھا' کون ہیں یہ محمود کے جواب پر کہ مہمان ہیں شہر سے آئے ہیں' تو ان کی نگاہوں میں نرمی آگئی تھی۔ بسم اللہ کہہ کر وہ اپنے کام کاج میں مصروف ہو گئی تھیں۔

ارے' ارجمند انہیں دیکھ کر چلایا۔ یہ کیا چیزیں ہیں' نہ ہائے' نہ اوئی اللہ۔ نہ کھسر پھسر' نہ شرم' نہ جھینپ انہیں تو پتہ ہی نہیں کہ یہ عورتیں ہیں۔ یہ ہم کہاں آپھنسے ہیں۔"

"انہیں پتہ نہیں" محمود بولا۔

تو پھر یہ مردوں کو دیکھ لبھاتی کیوں نہیں۔

"یہ شہروالوں کو مرد نہیں سمجھتی۔" محمود ہنسا۔

"بڑا اپمان ہے ہمارا۔" ارجمند بولا "عورت ذات تو محبوب ہوتی ہے' اسے تو ہر مرد کو مرد سمجھنا چاہیئے۔ محمود ہنسا' بولا: "شہر کی عورت محبوب ہوتی ہے۔ گاؤں کی نہیں۔ یہاں کی عورت تو عاشق ہوتی ہے۔ کوئی بہادر اور بے نیاز مرد گزر جائے تو اسے دیکھے گی۔ ہر کسی کو نہ دیکھتی ہے' نہ اپنا آپ دکھاتی ہے۔"

کچھ دیر ہم گاؤں میں گھومتے پھرے۔

مجھے صرف ایک لگن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح شادو نظر آئے' لیکن اس کے گھر کا دروازہ باہر سے بند تھا۔

"کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ شادو" محمود نے بند دروازے کو دیکھ کر کہا۔

شادو کے گھر کے سامنے کچھ دیر تک ہم منڈلاتے رہے' لیکن وہ نہ آئی۔ گاؤں کی گلیوں میں اول تو گھومنا پھرنا بہت معیوب ہوتا ہے' کھڑے رہنا تو بالکل ہی مجرمانہ فعل ہے' لہذا وہاں زیادہ دیر کے لیے رکنا ممکن نہ تھا۔

چوبارے میں پہنچ کر میں تو لیٹ گیا۔ شادو کو نہ دیکھنے کی وجہ سے' مجھ پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ارجمند تو گاؤں میں آکر اپنی تمام تر حیثیت کھو چکا تھا۔ "لاحول ولا قوۃ" وہ گنگنا رہا تھا' یہ

کوئی جگہ ہے' یہاں کی عورتیں تو بانس ہیں بانس' نہ جھینپنا' نہ لبھانا' نہ آنکھیں مٹکانا' نہ نظریں چرانا۔ لاحول ولا قوۃ ۔"

صرف رضا نارمل تھا۔ نہ وہ خوش تھا' نہ غمگین' البتہ صورت حالات پر اسے ہنسی آ رہی تھی۔ وہ بار بار ارجمند پر فقرے کستا تھا' کہتا "بس ہار گئے نا۔ ان کنڈلی والے سانپوں کو رام نہیں کرو گے کیا' اٹھ کر دیکھو تو کھڑکیوں کی درزوں سے۔ ارد گرد کے گھروں کے صحن صاف نظر آتے ہیں۔"

"چپ رہ" ارجمند چلاتا "جو بکواس کی تو دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گا۔"

شادی اگلے روز تھی۔ ابھی ہمیں گاؤں میں دو راتیں بسر کرنا تھیں۔

پھنس گئے یار' ارجمند بار بار آہ بھر کر کہتا' "ہم تو یہاں دو روز کے لیے قید ہو گئے۔ مروا دیا سالے محمود نے۔"

کنڈل بنڈل

رات کو نیچے صحن میں گیس جلا کر رکھ دیا گیا تو ارجمند کی باچھیں کھل گئیں۔ "بات ہوئی نا" وہ اٹھ کر کھڑکی کی درز سے جھانکنے لگا "اب یہاں اکٹھ ہو گا۔ ساری گاؤں والیاں آئیں گی۔ اب پتہ چلے گا۔ گاؤں کی گلیوں میں گھومنے پھرنے سے تو کچھ نظر ہی نہیں آیا۔"

"اکٹھ کس لیے ہو گا۔" میں نے پوچھا "شادی کی رات تو کل ہے۔"

"اماں تجھے کچھ پتہ بھی ہو" ارجمند بولا "دیکھ نیچے دریاں بچھ رہی ہیں۔ یہاں ساری گاؤں والیاں اکٹھی ہوں گی' ڈھولک بجے گی' گیت گائیں گی۔"

رات کو ہم تینوں کھڑکیوں سے لگ کر دیکھتے رہے۔ نیچے صحن میں پندرہ بیس عورتیں تھیں' ان میں زیادہ تر بچیاں تھیں' کچھ بوڑھیاں تھیں' صرف چار پانچ مٹیاریں تھیں۔ ان کے ناک نقشے بھدے تھے۔ رنگ سانولے تھے' عام سے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ انداز میں نہ شوخی تھی' نہ بانکپن' اور ان کے گیت اتنی لمبی سروں والے تھے کہ ایسے معلوم پڑتا تھا جیسے رو رہی ہوں' بین کر رہی ہوں۔

"بہت تیرے کی۔" ارجمند چلا رہا تھا۔ "بہت دھوکا ہوا ہم سے۔ یہ کنڈل والیاں تو بنڈل

نکلیں۔"

میں چپ چاپ کھڑکی سے لگا' دیکھے جا رہا تھا۔

"تو کیا دیکھ رہا ہے بابو۔" رضا بار بار مجھ سے پوچھتا۔

"اسے کیا پتہ کہ دیکھنے والی چیز کیا ہوتی ہے۔ بالکل کورا تھا یہ۔ وہ تو اپن نے آ کر اسے باقاعدہ لیسن دیے' گر سکھائے' پھر کہیں کچھ سدھ بدھ پیدا ہوئی۔ کیوں بے سچ ہے یا نہیں۔"

میری تمام تر توجہ پڑوس کے گھر کی طرف مرکوز تھی۔ میں اس امید پر کھڑکی سے لگا ہوا تھا کہ شاید شادو نظر آ جائے۔

پڑوس والے گھر کا صحن چاندنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ صحن کی ایک جانب درخت کے تلے چھپر سا پڑا تھا۔ چھپر میں چولہا جل رہا تھا۔ ایک اندھی لالٹین کے گرد دو سائے حرکت کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک سایہ درمیان والی دیوار پر آ کھڑا ہوتا اور دیوار کے اوپر سے محمود کے گھر میں جھانکتا' لیکن ایسے زاویے سے دیکھتا کہ گیس کی روشنی اس کے چہرے پر نہیں پڑتی تھی۔

"ارے پگلے" ارجمند چلایا" کیوں اپنی آنکھیں خراب کر رہا ہے تو' ہٹا' ادھر رکھا ہی کیا ہے' جسے تو دیکھ رہا ہے۔"

"یہ شادو کو ڈھونڈ رہا ہے۔" رضا نے کہا۔

"ابے انہی میں بیٹھی ہو گی کہیں' یہ جو تھرڈ کلاس مال نیچے صحن میں ڈھیر ہو رہا ہے۔ اب سمجھ آئی اپن کو یہ محمود جو ہے نا یہاں گاؤں میں رہ کر اس کا سٹینڈرڈ کتنا لو ہو گیا ہے۔

ارجمند نے لپک کر مجھے اٹھا لیا اور چارپائی پر دے مارا۔ کیوں خوامخواہ اپنا پٹرول خرچ کر رہا ہے تو' ادھر کوئی حرکت نہیں ہو گی۔ بیٹھ یہاں تاش کھیلیں آرام سے۔

کچھ دیر تک ہم تاش کھیلتے رہے پھر اکتا کر سو گئے۔

جیرا ڈاکو

رات کو کسی نے میرے شانے جھنجھوڑے۔ میں ڈر کر اٹھ بیٹھا' دیکھا کہ رضا مجھ پر جھکا ہوا ہے۔

"کیا بات ہے۔" میں نے پوچھا۔

"آہستہ بولو۔" رضا نے کہا۔

ارجمند بیٹھا آنکھیں مل رہا تھا۔

"کیا بات ہے" ارجمند نے زیر لب پوچھا۔

"نیچے کچھ ہے۔" رضا بولا۔

"کیا ہے؟" میں نے جھرجھری لی۔

"گڑ بڑ ہے۔ ادھر آؤ دکھاؤں۔ آواز پیدا نہ ہو۔"

ہم کھڑکیوں کی طرف بھاگے۔

"کھڑکی نہ کھولنا" رضا کی سرگوشی سنائی دی۔

ہم نے کھڑکی کی درز سے دیکھا۔ نیچے چاند کی چاندنی میں صحن صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دریاں جوں کی توں بچھی ہوئی تھیں' درمیان میں بجھا ہوا گیس پڑا تھا۔

"صحن تو بالکل خالی پڑا ہے۔" ارجمند نے زیر لب بولا۔

درخت کے نیچے دیکھ اندھے' رضا بولا۔

صحن کے ایک کونے میں درخت کے نیچے دو آدمی کھڑے تھے' ٹھوڑی اور منہ پر رومال لپیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے ملیشیے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں ڈانگیں پکڑی ہوئی تھیں۔

"ہاں ہیں۔" ارجمند بولا "یہ ڈاکو تو نہیں؟"

"باہر گلی میں بھی ہیں۔"

میں نے گلی کی طرف دیکھا۔ وہاں دو آدمی کھڑے تھے' منہ پر ویسے ہی ٹھاٹھے بندھے تھے' صرف آنکھیں ننگی تھیں۔

ہم تینوں یہ منظر دیکھ کر سہم گئے۔ ارجمند نے لپک کر چوبارے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

کچھ دیر تو صحن والے دونوں آدمی آپس میں باتیں کرتے رہے' پھر ان میں سے ایک اندر چلا گیا۔ دوسرا وہیں کھڑا رہا۔

پھر یک دم اندر کہرام مچ گیا۔ اس روز گھر میں صرف عورتیں ہی تھیں۔ مرد باہر کی حویلی میں سوئے ہوئے تھے۔

عورتوں کا شور سن کر ارد گرد کے گھروں میں حرکت ہوئی۔ ایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس پر گلی میں کھڑے ایک ڈاکو نے چلا کر کہا "کوئی گھر سے باہر نکلا تو خبردار۔ اپنے اپنے گھروں کے اندر رہو۔ کسی نے دخل دیا تو جیرا کبھی نہیں بخشے گا۔

اس اعلان کے بعد چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں' مدہم آوازیں۔

"یہ تو جیرا ہے۔"

"جیرا آگیا جیرا۔"

"باہر نہ نکلنا جیرا ہے"

پھر آہستہ آہستہ وہ آوازیں مدہم پڑتی گئیں۔

نیچے عورتوں کی آوازیں بھی ختم ہو گئیں۔

سارے گاؤں پر سناٹا چھا گیا۔

میری نگاہیں شادو کے گھر پر لگی ہوئی تھیں۔

صحن ویران پڑا تھا۔

پھر دیوار پر ایک سایہ سا ابھرنے لگا' اس کونے کی جانب جہاں درخت تلے ڈاکو کھڑا تھا۔ آہستہ آہستہ سایہ ابھرتا گیا۔

پکڑ دھکڑ

دفعتاً" کسی نے چھلانگ ماری۔ درخت تلے کھڑا ڈاکو چونکا۔ "کون ہے۔" وہ چلایا۔ اس کی آواز میں رعب تھا' دھمکی تھی۔ پھر ایک ساعت کے لیے درخت کے نیچے پکڑ دھکڑ سنائی دی۔

"ارے یہ تو عورت ہے۔" ارجمند چلایا۔

"اس نے ڈاکو کی بنی پکڑ رکھی ہے۔" رضا بولا۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

ڈاکو نے بہت کوشش کی کہ بنی چھڑا لے۔ وہ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے صحن کے درمیان میں آ گئے۔

دفعتاً" میرا دل چلتے چلتے رک گیا' گلا بند ہو گیا۔ اور سر بھن سے کٹ کر چھت سے جا لگا۔

میرے سامنے چاند کی چاندنی میں شادو کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ڈاکو کی بینی پکڑ رکھی تھی۔

ڈاکو نے ایک بار پھر اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ شادو نے لپک کر اس کے چہرے کا رومال نوچ لیا۔

"ہوں۔" وہ بولی "تو ہے جیرے۔"

جیرا خاموش کھڑا رہا۔ وہ تھک کر لمبے سانس لے رہا تھا۔

"میرے گاؤں پر ہی پڑنا تھا تو نے۔" شادو بولی۔

"تیرے گاؤں پر تو نہیں پڑا میں۔"

"یہ بھی تو میرا ہی گھر ہے۔' وہ بولی۔ اس گاؤں کے سارے گھر میرے ہیں۔"

"تو میرے ساتھ چل' میں تیرے گاؤں کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

اپنی بینی چھڑا لے تو میں تیرے ساتھ چلی جاؤں گی۔

جیرے نے ایک بار پھر کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ شادو گیند بن کر اس کی بانہہ پر لٹک گئی۔ دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے میں گڈمڈ رہے' لیکن بینی نہ چھٹی' پھر دونوں ہانپنے لگے۔

"چھوڑ دے مجھے" جیرا غرایا۔

"چھوڑ دیتی ہوں پر میری شرط پوری کرنی ہو گی۔ منہ کالا میں اپنے ہاتھوں سے کروں گی اور پھر تو یہاں سے خالی ہاتھ چلا جائیو اور زندگی بھر اس گاؤں کا رخ نہ کیجیو۔"

"دیکھ" وہ بولا "تیری کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تو۔"

"اب اپنے ساتھیوں کو بلائے گا تو ——————— مرد کے نام پر بٹہ لگائے گا۔ اگر مرد ہے تو پہلے بینی چھڑا پھر گاؤں کی کسی چیز کو ہاتھ لگانا۔"

اتنے میں جیرے کا وہ ساتھی جو اندر گیا تھا۔ ایک گٹھڑی اٹھائے باہر نکلا۔ جب اس نے دیکھا کہ عورت نے جیرے کی بینی پکڑ رکھی ہے تو اس نے گٹھڑی صحن میں رکھی اور ڈانگ اٹھا کر شادو کی طرف لپکا۔ شادو نے ایک ہاتھ اٹھا لیا کہ اس کے وار کو روکے۔ "بڑا شیں مرد ہے تو" وہ چیخ کر بولی۔ "جیسا سردار ویسا اس کا ساتھی۔"

رک جا' جیرا غصے میں گرجا۔

اس کا ساتھی رک گیا۔ پھر وہ گٹھڑی کی طرف لپکا۔

"خبردار" شادو چلائی۔" سردار سے مال زیادہ پیارا ہے تجھے' جب یہ بنی چھڑا لے گا تو میں خود گٹھڑی اس کے حوالے کر دوں گی۔"

مسجد کا مینار

چلا جا۔ دوڑ جا یہاں سے جیرے نے اسے ڈانٹ کر کہا اور وہ گٹھڑی اٹھائے بغیر چپ چاپ باہر نکل گیا۔

"بیٹھ جا" جیرے نے شادو سے کہا۔ "جو بنی ہی چھڑانی ہے تو میں ٹھیک سے چھڑاؤں گا۔"

اس پر شادو نے جیرے کی کلائی چھوڑ دی۔ "بیٹھ جا" وہ بولی۔ وہ دونوں دری پر بیٹھ گئے۔ جیرے نے اپنی بائیں بانہہ اوپر اٹھائی' "لے پکڑ اب۔"

شادو نے دونوں ہاتھ دری پر رگڑے اور جیرے کی بائیں کلائی پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"سردار" باہر سے جیرے کے ساتھیوں کی آواز آئی۔" باہر کی حویلی سے لوگ آ رہے ہیں۔ ابھی وقت ہے آ جا۔"

"تو جا" جیرا بولا "میں تمہارے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔"

"ہم تجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے' سردار" ایک ساتھی اندر داخل ہو کر چلایا۔

"میں جو کہتا ہوں کرو۔" جیرا گرج کر بولا "جاؤ' سب چلے جاؤ۔"

"جا جا' چلا جا۔" شادو نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ جو گاؤں کے مرد آ گئے تو مشکل ہو جائے گا۔"

اپنی زبان سے پھرتی ہے' اب جیرا غصے میں کہنے لگا" لے پکڑ۔ وقت نہ گنوا۔" اس نے کلائی آگے بڑھا دی۔

"تیری مرضی۔" شادو نے پھر سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

جیرے نے پوری طاقت سے ایک جھٹکا دیا پھر دوسرا لیکن شادو توری کی طرح اس کے بازو سے لٹکی رہی۔

"ٹھہر جا" شادو نے جیرے کی کلائی چھوڑ کر کہا "ٹھہر جا"۔ پھر وہ دروازے کے قریب جا

کھڑی ہوئی۔

"کہاں ہے جیرا' کہاں ہے جیرا" باہر سے آوازیں سنائی دیں۔ باہر گلی مردوں سے بھری ہوئی تھی ان کے ہاتھوں میں ٹوکے تھے' لاٹھیاں تھیں' گنڈاسے تھے۔

شادو نے گلی سے باہر جھانکا پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر سینہ ابھار کر کھڑی ہو گئی۔

"خبردار" وہ بولی "کوئی اندر نہ آئے۔"

"وہ پڑا ہے تمہارا مال" اس نے گٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔"لے لو اپنا مال"۔ اتنے میں عورتیں آ گئیں۔ "اپنی چیزیں گن لو بی بی۔" وہ بولی۔ عورتوں نے گٹھڑی کھول کر چیزیں گننی شروع کر دیں۔

"تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔" شادو نے مردوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں نے اسے قول دیا ہے۔ گاؤں کی طرف سے قول دیا ہے کہ کوئی اسے انگلی نہیں لگائے گا۔ میں ذمہ لیتی ہوں' اب یہ زندگی بھر اس گاؤں میں نہیں آئے گا' ہٹ جاؤ' راستہ دو۔" وہ چلائی۔

"ہٹ جاؤ راستہ دو۔" وہ پھر غرائی۔ مرد آگے سے ہٹ گئے۔

چاند کی چاندنی میں وہ یوں کھڑی تھی جیسے ویرانے میں مسجد کا ایک مینار کھڑا ہو۔

آٹھواں باب

زنانی اور جنڑا

ساری رات کنڈلی والیوں میں میں چوبارے سے شادو کو دیکھتا رہا۔ چاندنی سے بھرے ہوئے ویہڑے میں، درخت کے نیچے، شادو میری بنی پکڑے ہوئے بیٹھی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ یونہی میری بنی پکڑے بیٹھی رہے، بیٹھی رہے، اور اسی طرح زندگی بیت جائے۔

جاگتے سپنے

چوبارے کی کھڑکی سے میں خود ہی اس منظر کو دیکھ رہا تھا اور ویہڑے میں، درخت کے سایہ تلے، خود ہی شادو کے ہاتھوں میں اپنی کلائی تھمائے بیٹھا تھا۔ ہر چند منٹ کے بعد میں شادو سے کلائی چھڑانے کی شدید جدوجہد کرتا، ساتھ ہی ڈرتا کہ کہیں وہ کلائی چھوڑ نہ دے، کہیں بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے، کہیں لمس ٹوٹ نہ جائے، کہیں شادو اس کھیل سے اکتا نہ جائے، بور نہ ہو جائے، کہیں اس پر یہ بھید نہ کھل جائے کہ یہ مقابلہ نہیں کھیل ہے، ایک ایسا کھیل جس پر زندگی کی ساری سنجیدگیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

یہ شادو جس نے میری بنی پکڑ رکھی تھی، کنڈلی والیاں کی شادو نہ تھی، بلکہ کیمپ کی نلجو تھی۔ سانولی رنگت، تیکھے نقش، کھا جانے والی آنکھیں اور ایک عجیب شان بے نیازی۔

محمود کے ویہڑے میں ۲۵ سال پرانا واقعہ نئے ساز و سامان کے ساتھ' از سرِ نو بیتا جا رہا تھا۔

دفعتاً" وہ اٹھ بیٹھی۔ چیتے کی طرح انگڑائی لے کر کھڑی ہو گئی۔ رک جاؤ وہ کیمپ والوں کو ڈانٹ کر بولی' خبردار جو کسی نے حرکت کی تو' میں نے اسے زبان دی ہے۔ مجھے اپنا وعدہ نبھانا ہے۔ ٹھہرو میں اسے کیمپ سے باہر چھوڑ کر آتی ہوں' چل وہ مجھ سے بولی' ڈر نہیں میں تیرے ساتھ ہوں اور پھر میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا' جس طرح کنڈلی والیاں میں جیرا شادو کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔ پھر گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ اور پیچھے بیٹھی ہوئی تاجو مجھ سے چمٹی جا رہی تھی۔ اور وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی' زور سے' اور زور سے۔

دفعتاً" میں نے محسوس کیا کہ کوئی میری چارپائی کے سرہانے کھڑا ہے۔

کیا ہوا ہے آپ کو' اقبال پوچھ رہی تھی۔

کچھ بھی نہیں میں نے گھبرا کر کہا۔

ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے۔

کیا کہہ رہا تھا' میں نے حیرت سے پوچھا۔

کہہ رہے تھے "زور سے اور زور سے۔"

نہیں میں نے تو نہیں کہا کچھ۔

صاف آواز آ رہی تھی۔

تم نے خواب دیکھا ہو گا۔

خواب تو آپ دیکھ رہے ہیں' جاگتے کے خواب' کئی دنوں سے دیکھ رہے ہیں آپ۔ پتہ نہیں کون سا خواب ہے' جو ختم ہونے میں آتا ہی نہیں۔ ختم ہو تو کچھ اور نظر آئے۔

میرا خیال تھا کہ اقبال بیگم کو کچھ پتہ نہیں۔ وہ ایک نیک پاک اور پرہیزگار عورت تھی۔ اسے زندگی کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ نہ ہی وہ شوہر کی محتاج تھی' جس طرح عورتیں ہوتی ہیں۔اس کے باوجود جب بھی میں جاگتے کے خواب دیکھتا اور ان میں کوئی عورت پیش ہوتی تو معلوم نہیں کیسے' اقبال بیگم کو پتہ چل جاتا تھا۔ بن جانے' پتہ چل جاتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی۔

میں اٹھ بیٹھا۔ میرا پیٹ خراب ہے۔ نیند نہیں آتی۔ نیند نہ آئے تو ڈراؤنے خواب آتے

ہیں۔

یہ تو سہانے خواب معلوم دیتے ہیں' وہ بولی۔ پیٹ خراب نہیں کچھ اور خراب ہے یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

دفعتاً" ناجو سامنے آ کھڑی ہوئی' بولی یہ بے چاری تو معصوم ہے' اسے کیا پتہ خوامخواہ اس سے بحث کیوں کرتا ہے تو۔

نہیں نہیں تمہارا وہم ہے' میں نے اقبال بیگم سے کہا' کوئی بات نہیں۔

بات تو آپ کے ماتھے پر لکھی ہوئی ہے' اس نے جواب دیا۔

سچ کہتی ہے' ناجو مسکرائی' بات ماتھے پر لکھی جاتی ہے' چھپانے سے نہیں چھپتی۔ اور پھر تیرا ماتھا تو اتنا بڑا ہے۔

میرے ماتھے پر تو کچھ بھی نہیں لکھا ہوا' میں نے اقبال سے کہا۔

ناجو قہقہہ مار کر ہنسی۔

آپ سے کون سر کھپائے' اقبال بیگم نے آہ بھری۔ آپ تو یہاں ہیں ہی نہیں۔ میں بھی بے وقوف ہوں جو بات کرتی ہوں۔ جب سننے والا ہی موجود نہیں' تو بات کرنے کا فائدہ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

اگلے روز صبح سویرے ہی میں کیمپ کی طرف چل پڑا۔ صبح کے وقت میرا وہاں کوئی کام نہ تھا۔ اور کام تو میں نے کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ کام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں کیمپ میں باقاعدگی سے جاتا تھا۔

حسب معمول میں بکس ٹینٹ سے نکل کر ادھر کو چل پڑا۔

اتنی قریب۔ اتنی دور

دفعتاً" میں رک گیا۔ ہنگر کے باہر' بالکل ایک طرف' وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ ایک دو ٹانکے لگاتی پھر دور نہ جانے کدھر دیکھنے لگتی' دیکھتی رہتی' دیکھتی رہتی' یوں جیسے کھو گئی ہو اور سلائی کا کپڑا گود میں پڑا رہتا' پڑا رہتا' پھر وہ چونکتی' لمبی آہ بھرتی اور پھر سے کپڑا اٹھا کر اسے سینے لگتی۔

پہلے تو میں کھڑا رہا' کھڑا رہا اور وہ دور نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی بیٹھی رہی۔ پھر میں اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا میرا جی چاہتا تھا کہ اس سے جا کر پوچھوں کیا ہے تجھے' جیسے اقبال بیگم مجھ سے پوچھا کرتی تھی۔

میں سوچنے لگا کیا یہ بھی جاگتے میں سپنے دیکھتی ہے۔ کیا اس وقت یہ بھی گھوڑے پر سوار ہے اور کسی جیرے سے کہہ رہی ہے۔" زور سے اور زور سے۔"

ان دنوں میں ساری دنیا سے دور تھا۔ گھر سے' دوستوں سے' حقائق سے۔ سب کچھ ناجو کی اوٹ میں آگیا تھا اور وہ میرے روبرو یوں کھڑی تھی' جیسے کوئی گلیور بالشتیے کے سامنے کھڑا ہو۔ اس کے باوجود میں اس سے کس قدر دور تھا' کالے کوسوں' مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں کھوئی ہوئی ہے۔ کتنی عجیب بات تھی۔

دفعتاً" وہ چونکی ایک آہ بھری اور پھر سے کپڑا اٹھا کر ٹانکے لگانے لگی۔

میں ٹکٹکی باندھے' اسے دیکھے جا رہا تھا۔

ناجو نے میری طرف نہیں دیکھا تھا' لیکن بن دیکھے جان گئی تھی کہ چند ایک قدم دور' میں بیٹھا اسے دیکھ رہا ہوں۔

کیا سی رہی ہے تو' میں نے مدہم آواز میں پوچھا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی سیتی رہی۔

تو سیتے ہوئے اچھی نہیں لگتی' میں نے کہا۔

اس نے آنکھیں اٹھا کر غور سے میری طرف دیکھا اور پھر سے کپڑا سینے لگی۔

دیر تک میں خاموش بیٹھا رہا۔ پھر سے بات چلانے کی جرات نہ ہوئی۔

صدیاں بیت گئیں۔ میں دیکھتا رہا اور وہ سر جھکائے ٹانکے لگاتی رہی۔

پتلون پھنسے بابو

پھر دفعتاً" اس نے سر اٹھا کر پوچھا' تو یہاں کیوں آتا ہے۔

میں حیران رہ گیا' اس نے خود بات چھیڑی تھی۔

بول کیوں آتا ہے' اس نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔

میرے بند بند میں تاریں بجنے لگیں' تیرے لیے میں نے جواب دیا۔
کیا ملے گا تجھے' اس نے پھر ٹانکا لگاتے ہوئے کہا۔
نہ ملے۔ میں کیا مانگتا ہوں' کچھ تجھ سے۔ کچھ کہتا ہوں۔
کیوں نہیں کہتا کچھ' وہ بولی۔ کیوں نہیں مانگتا۔
تو ناراض ہو جائے گی' اس لیے۔
وہ قہقہہ مار کر ہنسی' میں کیوں ناراض ہونے لگی خوامخواہ۔
پھر مجھ سے گھبراتی کیوں ہے۔
خوامخواہ' وہ مسکرائی۔
شرماتی جو ہے۔
تجھ سے؟ اس نے قہقہہ لگایا۔ کوئی گاؤں کا جنتڑا ہوتا تو شرماتی بھی' وہ رک گئی۔
اور یہ جو اتنے سارے مرد ہیں کیمپ میں یہ جنتڑے نہیں ہیں کیا' میں نے پوچھا۔
یہ تو شہر کے ہیں' وہ بولی۔
شہر کے جنتڑے نہیں ہوتے کیا۔
یہ تو بابو ہوتے ہیں' پتلونوں میں پھنسے ہوئے بابو۔ تو بھی تو بابو ہے۔
اچھا۔
یہ بابو کچھ نہیں کہتے۔ تو بھی تو کچھ نہیں کہتا نا ———— وہ چپ ہو گئی۔ پھر مدہم آواز میں بولی۔ جو کچھ نہیں مانگتا' کچھ نہیں کہتا' اس سے کیا شرمانا۔
میں سمجھتا تھا کہ کچھ نہ مانگنا ایک بہت بڑی خوبی ہے' جو مرد کے خلاف ساری بدگمانیوں کو دھو دیتی ہے۔ اس کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔
وہ بھی مرد ہوتا ہے کیا' وہ جھکی جھکی نگاہوں سے سیتے ہوئے بولی' جو کچھ نہ مانگے' کچھ نہ کہے اور یہ بابو لوگ مانگیں بھی تو منت کر کے مانگتے ہیں۔ کبھی مرد بھی منت کرتا ہے بھلا۔
میں نے کبھی اس زاویے سے نہ سوچا تھا۔ میرا سارا فلسفہ دھجیاں بن کر اڑ گیا اور میں خاموش ہو گیا۔
نہ جانے کب تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اب مجھے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے

کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ کیسے دیکھتا' جب میری نگاہوں میں مانگ ہی نہ تھی تو کیسے دیکھتا۔ میں سوچنے لگا' اگر اب میں دیکھوں بھی تو کیے گی' ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا مرد کا کام نہیں' اس کا کام ہے جو بے بس ہو چکا ہو' جو بے بس ہو جائے وہ کیا مرد ہوتا ہے۔

دیر تک میں سر جھکائے سوچتا رہا۔ اس کی خوشبو سے گردو پیش بھرا ہوا تھا۔ اس کی موجودگی کے احساس نے مجھے گود میں اٹھا رکھا تھا' تھپک تھپک۔

ناجو-چتری

دفعتاً" وہ پھر بولی' تیرا نام کیا ہے۔

میرا نام ہے مفتی۔

مفتی وہ قہقہہ مار کر ہنسی' نام تو بابوؤں ایسا نہیں۔

تیرا کیا نام ہے' میں نے پوچھا۔

ناجو' وہ بولی۔

ناجو————یہ کیسا نام ہے۔

یہ اصلی نام نہیں' وہ بولی' گھر میں تو سب مجھے چتری کہتے ہیں۔

چتری————میں نے حیرانی سے دہرایا۔

ہمارے گھر میں ایک ککڑی تھی۔ چتری' اس کے پروں پر کالے سفید تمکنے تھے۔ کالا سفید' کالا سفید' بابا کو وہ بہت پیاری تھی۔ بابا نے میرا نام بھی چتری رکھ دیا' وہ ہنسنے لگی' بس۔

اس وقت وہ بچوں کی طرح معصوم باتیں کر رہی تھی۔ شیرنی پتہ نہیں کیا ہوئی تھی۔ اس وقت تو وہ یوں لگ رہی تھی' جیسے بھیڑ کا چھوٹا سا لیلا ہو' جو کلانچیں بھرتا ہے' شوخیاں کرتا ہے۔

تو بھی کیا تمکنوں والی ہے میں نے پوچھا۔

"میں؟" ٹانکا لگاتے ہوئے بولی۔

تو بھی کیا کالی سفید' کالی سفید ہے۔

پتہ نہیں' وہ ہنسی۔

کہاں کی ہے تو۔

دفعتاً" وہ سنجیدہ ہو گئی' اداس۔ اب تو کہیں کی بھی نہیں' وہ آہ بھر کر بولی' کبھی تھی کہیں کی۔

کہاں کی۔

قلعہ جٹ خاناں' اس نے کہا۔

وہ کہاں ہے جٹ خاناں۔

اب تو کہیں بھی نہیں' اس نے ایک آہ بھری' گاؤں کو انہوں نے تہہ کر ڈالا۔ گاؤں والوں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ یہ کہتے ہوئے چتری نے کپڑا ایک طرف رکھ دیا اور ٹکٹکی باندھ کر افق کی طرف دیکھنے لگی۔ ہاں وہ زیر لب گنگنائی۔ میں نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا کچھ بھی نہیں ——— نہ پٹھانوں اور جاٹوں میں پھوٹ پڑتی' نہ سکھ ہمارے گاؤں کا گھیرا ڈالتے' نہ حملہ ہوتا نہ ملٹری آتی' نہ کچھ' نہ کچھ ——— وہ خاموش ہو گئی۔

دیر تک وہ کھوئی کھوئی بیٹھی رہی۔

میں نے محسوس کیا جیسے وہ ایک دم پتھر سے چینی کی بن گئی ہو۔ اور اور ——— اگر کسی نے اسے چھیڑا تو وہ چور چور ہو کر گر پڑے گی اور وہاں درخت تلے چینی کے چورے کا ڈھیر لگ جائے گا۔

دیر تک میں خاموش بیٹھا رہا۔

پتہ نہیں کہاں تھی وہ۔ اس درخت تلے نہیں تھی بہر حال ——— پھر وہ مدھم آواز میں بولی جو میں نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

کیوں؟

نہ بابا' ماں مرتے' نہ بھائی ذبح ہوتا' نہ پٹھان مورچہ لگاتے' نہ جاٹ کٹ مرنے کی پرتگیا کرتے۔

یہ سب تو پاکستان بننے کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ فسادات تو مشرقی پاکستان کے ہر گاؤں میں ہوئے ہیں' تیری وجہ سے نہیں' میں نے کہا۔

تجھے نہیں پتہ' وہ بولی۔

تو بتا مجھے' میں نے کہا۔

نہیں۔ نہیں وہ آہ بھر کر بولی۔ دکھ کو پھر سے بیتنے کا کیا فائدہ' وہ خاموش ہو گی۔

میں بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یااللہ زنانی بھی کیا شے ہے' کبھی تو چیتا بن جاتی ہی' کبھی دوسرے کی رکشا کرنے کے لیے سورما بن جاتی ہے' کبھی "کچ دے گلاس ورگی" بن جاتی ہے' میں بیٹھا سوچتا رہا۔ اس کی طرف تکتا رہا اور سوچتا رہا۔

پھر یک دم نجو تڑپ کر مڑی۔ تو مجھے کیوں دیکھتا رہتا ہے اس طرح۔

تو مجھے اچھی لگتی ہے نا' بڑی اچھی لگتی ہے تو مجھے۔

اس کی گردن جھک گئی۔ بالوں کی لٹ لٹک گئی۔ افق کی طرف دیکھنے کی بجائے اس کی نگاہیں زمین پر گڑ گئیں۔ پھر وہ "رون ہاکی" ہو کر بولی' بس یہی میری بپتا ہے۔ اسی وجہ سے میں کبھی آباد نہ ہو سکی' کبھی آباد نہیں ہو نگی۔ یہی میری بد نصیبی ہے۔

کیا میں نے پوچھا۔

اچھی لگتی ہوں

کہ میں اچھی لگتی ہوں' وہ آہ بھر کر بولی۔ اگر میں اچھی نہ لگتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ نہ خون خرابا ہوتا نہ میری بربادی ہوتی' وہ چپ ہو گئی۔

پھر تو کیوں اچھی لگتی ہے' میں نے پوچھا۔

میں تو اچھا نہ لگنے کے لیے منہ بھی نہیں دھویا کرتی تھی' نئے کپڑے نہیں پہنتی تھی کہ کہیں اچھی لگنے لگوں۔ میں نے کبھی بندے نہیں پہنے' چوڑیاں نہیں پہنی' ریشم نہیں پہنا' اخروٹ نہیں ملا' پھر بھی سب یہی کہتے ہیں کہ تو اچھی لگتی ہے۔ پتہ نہیں کیسے اچھی لگتی ہوں' کس بات پر۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر سلسلہ کلام شروع کیا۔ ہمارے گاؤں میں ایک تو پٹھان رہتے تھے اور دوسرے جاٹ۔ پٹھان زمیندار تھے' پیسے والے تھے' جاٹ پیسے والے نہیں تھے' پر کھاتے پیتے تھے' مونچھ مروڑ کر رکھتے تھے۔

تو پٹھان ہے کیا۔ میں نے پوچھا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسی' تو تو بالکل ہی کورا ہے وے۔

کیوں۔

میں پٹھان دکھتی ہوں کیا۔

مجھے کیا پتہ میں نے کہا۔

تجھے تو کچھ بھی نہیں پتہ' وہ پھر ہنسنے لگی۔ پھر بولی ہمارے گاؤں کی پٹھانیاں ایسی ایسی تھیں کہ بس دیکھتے رہو میدے سندھور سے گندھے ہوئے منہ' یہ ذات' چوڑے' اتنا رعب' اتنا رعب کہ دیکھا نہ جائے۔ انہیں کوئی نہیں کہتا تھا تو مجھے اچھی لگتی ہے۔ ہر کوئی مجھے ہی کہتا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہے میرے میں کہ لوگ کہتے ہیں تو ہمیں اچھی لگتی ہے۔ ہر راہ گیر بٹ بٹ دیکھتا ہے۔ جو مجھے پتہ چلے کہ وہ کیا چیز ہے تو میں اسے نکال کر باہر پھینک دوں۔ میں بڑی دکھی ہوں' بڑی دکھی ہوں' اس اچھے لگنے کی وجہ سے۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری' پھر تو بھی یہی کہتا ہے کہ تو مجھے اچھی لگتی ہے۔

اور کیا کہوں۔

یہ اچھا لگنا' مجھے کھا گیا۔ کلنک کا ٹیکہ لگا ہے میرے ماتھے پر' وہ پھر خاموش ہو گئی۔

جب میں چھوٹی تھی تو زمیندار پٹھان کا لڑکا مجھ سے کھیلا کرتا تھا۔ ہر وقت میرے پیچھے پیچھے لور لور۔ ہزار ادھر ادھر ہوتی پر وہ کتے کی طرح میرے پیچھے پیچھے لگا رہتا۔ میں جو کہتی وہی کرتا۔ میں جو چیز چاہتی کہیں نہ کہیں سے لے آتا۔ پھر بابا کہنے لگا' چتری اب نوجوان ہو گئی ہے' تو لڑکوں سے نہ کھیلا کر۔ میں نے اس کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ رک گئی اور انگلیوں میں کپڑے مروڑنے لگی۔

پھر میں نے پوچھا۔

پھر وہ لڑکا ہمارے گھر کے ارد گرد منڈلاتا رہا' چار ایک دن منڈلاتا رہا۔ اماں نے کہا' جا اسے سمجھا دے کہ ہمارے گھر کے چکر نہ لگائے' لوگ کیا کہیں گے۔

پھر تو اس سے ملی کیا' میں نے پوچھا۔

ہاں ملی۔ ناجو نے جواب دیا' میں نے کہا اب تو نہ آیا کر ادھر۔

جواب میں وہ بٹ بٹ میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

تو ایسے کیوں دیکھتا ہے مجھے' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' تو مجھے اچھی لگتی ہے' اسی طرح جس طرح تو نے کہا ہے' اسی طرح جس طرح سب کہتے ہیں میں نے کہا' بابا غصے ہوتا ہے' وہ بولا' اگر تو مجھ سے نہیں کھیلے گی تو میں کنویں میں چھلانگ لگا دوں گا۔ یہ سن کر میں تو ہکی بکی رہ گئی۔ کیوں لگائے گا تو چھلانگ' میں نے پوچھا۔ بس لگا دوں گا' وہ بولا۔ تو پھر لگا دے' میں نے کہا' میں تو اب باہر نہیں نکلوں گی' بابا غصے جو ہوتا ہے' پکی بات۔

پکی بات' اس نے پوچھا۔

ہاں پکی بات' میں نے کہا۔

اسی رات اس نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔

سچ' میں نے نابو سے پوچھا۔

ہاں' وہ بولی' سچ۔

تجھے پتہ تھا وہ چھلانگ لگا دے گا۔

ہاں پتہ تھا۔

پھر تو نے اسے کیوں نہ روکا۔

میں کیوں روکتی۔

ہوں' میرا دل بیٹھ گیا' پھر

پھر رات بھر پٹھان اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ ہمارے گھر بھی آئے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا' سب کچھ بتا دیا اور وہ چلے گئے' پھر صبح کنوئیں سے اس کی لاش نکل آئی۔

اس پر پٹھان غصے میں آ گئے۔ وہ جاٹوں کے خلاف ہو گئے۔ بڑا فساد ہوا۔ بڑا جھگڑا ہوا۔ سدا کی دشمنی ہو گئی۔ سارا گاؤں جو پہلے ایک تھا آپس میں بٹ گیا۔ سارے مجھ پر الزام دھرتے تھے' کہتے تھے' چتری نے ہمارے بیٹے کو کنویں میں دھکیل دیا۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔

یہ سن کر میرے دل پر اک اداسی چھا گئی۔ ایسے محسوس ہوا جیسے میں نے خود کنوئیں میں چھلانگ لگا دی ہو۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ صرف اوپر سے دھندلی سی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا' اوپر چتری کا بڑا سا چہرہ نیچے کی طرف جھانک رہا تھا۔

ہیراسیاں

پھر وہ ہیرا تھا' چتری نے بات پھر سے شروع کی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا' پتہ نہیں کیسے دیکھ لیا۔ پھر وہ دھرنا مار کر ہمارے گھر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اماں کہنے لگی' یہ یہاں کیوں بیٹھ گیا ہے۔ میری سہیلیوں نے کہا چتری ضرور یہ تیرے لیے بیٹھا ہے۔ اس پر میں ڈر گئی' اب کیا ہو گا۔ میرے دل میں کھتر پھتر ہونے لگی۔ ہئے ہیرا میرے لیے بیٹھا ہے' میرے لیے۔

اس وقت گاؤں کے سارے مرد باہر کھیتوں پر گئے ہوئے تھے' کٹائی کے دن تھے نا۔ میں آنکھ بچا کر باہر نکلی۔ باہر جو نکلی تو وہ بٹ بٹ میری طرف دیکھنے لگا۔

میری طرف کیوں دیکھتا ہے تو' میں نے جھوٹ موٹ پوچھا۔

جھوٹ موٹ کیوں' میں نے کہا۔

ان دنوں میں جوان تھی' اس نے آہ بھر کر کہا' مجھے پتہ تھا' جدھر بھی جاتی تھی لوگ بٹ بٹ میری طرف دیکھتے تھے نا۔ ان کی نظریں جونکوں کی طرح میرے منہ سے لٹک جاتی تھیں۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ میری طرف دیکھتے ہیں۔ ڈر بھی جاتی تھی میں ان کی بھوکی نظروں سے' پر خوش بھی ہوتی تھی' اندر ہی اندر۔ اوپر سے تیوری چڑھائے رکھتی تھی نا۔

ہاں تو پھر کیا کہا اس نے' میں نے پوچھا۔

وہی جو سب کہتے ہیں' تو مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔

پھر تو نے کیا جواب دیا۔

کیا کہتی میں۔ اس بات کے جواب میں کیا کہا جا سکتا ہے بھلا۔

جنڑا

وہ پھر چپ ہو گئی اور وقفے وقفے کے بعد آہیں بھرنے لگی۔

یہ ہیرا تھا کون' میں نے پوچھا۔

ہیرا ایک جنڑا تھا۔ ایسا مرد تھا وہ کہ ——— وہ رک گئی۔ اگر وہ سکھ نہ ہوتا تو

وہ سکھ تھا کیا۔

ہاں۔ ہمارے گاؤں سے دس میل دور ہیرے کا گاؤں تھا۔ سارا گاؤں سکھوں کا تھا۔ ہیرا اس گاؤں کا زمیندار تھا۔ نجو نے آہ بھری' ہیرا سیاں' لوگ اس کے غلام تھے۔ اتنا اچھا تھا وہ۔ لوگوں کو برابر بٹھاتا تھا۔ دکھ سکھ میں ساتھ دیتا تھا اور منہ سے نکلا وچن نبھاتا تھا۔ چاہے کچھ ہو جائے' منہ سے نکلی بات۔ ہو کے رہے۔

ہیرا سیاں کی بات کرتے ہوئے چتری پھر سے شیرنی کا روپ دھارے جا رہی تھی۔ اس کے انگ انگ میں زنانی جاگ اٹھی تھی۔

پھر کیا ہوا' میں نے پوچھا۔

پھر کیا ہونا تھا وہ آہ بھر کر بولی۔ ہیرے نے مجھے بڑے پیغام بھیجے' منتوں بھرے پیغام' کہ اک بار مجھ سے مل لے' صرف ایک بار۔ پھر جو جی چاہے کرنا' میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔

تو اسے ملی کیا۔

نہیں۔

کیوں' ڈرتی تھی۔

نہیں' زنانی جنٹرے سے نہیں ڈرتی۔

پھر کیوں نہ ملی۔

میں اپنے آپ سے ڈرتی تھی۔

اپنے آپ سے۔

اس نے سر اثبات میں ہلایا' جو اک بار مل لیتی تو پھر اس کی ہو جاتی۔

کیوں' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

ہیرے میں وہ سارے گن موجود تھے جو زنانی مرد میں چاہتی ہے' اس نے آہ بھری۔

ہوں' پھر کیا ہوا۔

پھر اس نے ہر جتن کر دیکھا۔ اس نے کہلوا بھیجا چتری جو تو ہاں کر دے تو میں دھرم چھوڑ دوں گا' زمیندارا چھوڑ دوں گا' وطن چھوڑ دوں گا۔ تو ساتھ چلے تو بدیس چلے جائیں گے۔ اک بار حامی بھر لے۔

وہ پھر خاموش ہو گئی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی' گو بوند ایک بھی نہ

پڑی تھی۔

کچھ دیر کے بعد نجو نے لمبی سانس بھری۔ پھر پاکستان بن گیا۔ اس نے کہلوا بھیجا' چتری اب بھی مان جا ورنہ تجھے پتہ ہے۔ میں جنتڑاں ہوں' تیرے گاؤں کا ایک آدمی بھی پاکستان نہیں پہنچے گا۔ سیدھی طرح نہ مانے گی تو پھر میں بھی ہیراسیاں ہوں۔

پھر؟ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

پھر کیا' اس نے آہ بھری۔

کیا کہا اس نے۔

جو اس نے کہا تھا کر دکھایا' اور کیا۔

کیا گاؤں کا کوئی آدمی نہ بچا؟ میں نے پوچھا۔

کوئی نہیں' اس نے سر نفی میں ہلایا۔

تو کیسے بچ گئی' میں نے پوچھا۔

نہ بچتی تو اچھا ہوتا' چتری نے آہ بھر کر کہا۔

کیوں؟

اب کیا دھرا ہے' اس کے منہ سے کراہ سی نکلی۔

کیوں' یہ جگہ پسند نہیں آئی تجھے۔

یہ ——— یہ جگہ چاہے اچھی ہو پر یہ میری دنیا نہیں ہے۔

یہ بیگانی دنیا ہے۔ وہ بولی۔

اچھا ——— لیکن کیوں؟

بس یہاں بابو لوگ رہتے ہیں نہ جنترے ہیں نہ زنانیاں۔

تو مجھے بات تو سنا کہ ہوا کیا؟ میں نے اس کی بہت منت کی۔

گھراد

ہونا کیا تھا جس روز پاکستان بنا اسی رات ہیرا اپنے آدمی لے کر آ گیا۔ انہوں نے ہمارے گاؤں کا گھیراؤ کر لیا۔

گاؤں والے پہلے ہی قلعہ بند ہو کر بیٹھے تھے۔ ہیرے نے خانوں کو کہلا بھیجا' اگر چتری کو میرے حوالے کر دو تو گاؤں کے ایک ایک آدمی کو خود پاکستان پہنچا کر آؤں گا' نہیں تو جٹ خانوں کا ایک آدمی بھی قلعے سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔ دونوں میں سے ایک بات چن لو۔ ہم تمہیں ایک گھنٹے کی مہلت دیتے ہیں۔

اس پر گاؤں کے جاٹ مل بیٹھے۔ سب نے یک زبان ہو کر ہا' ہم کٹ مریں گے' لیکن لڑکی حوالے نہیں کریں گے۔

جاٹوں کا خیال تھا کہ پٹھان ساتھ نہیں دیں گے' اس لیے کہ وہ پرانا جھگڑا اسی طرح سے چلا آ رہا تھا۔

کون سا جھگڑا؟ میں نے پوچھا۔

وہی' میرا جھگڑا' جب ان کے لڑکے کو میں نے کہا تھا بے شک مار دے چھلانگ۔ میرا بابا کہنے لگا بھائیو! پٹھانوں سے بات کر لو۔ اتنے میں بڑا خان خود ہمارے گھر میں آ گیا۔ اندر نہ آیا۔ باہر دروازے میں کھڑا ہو کر بابا سے کہنے لگا' نتھیے تیرا ہمارا لاکھ جھگڑا ہو پر تیری بیٹی گاؤں کی بیٹی ہے۔ ہماری بیٹی ہے۔ ہم خان ہیں' کٹ مریں گے پر لڑکی ہیرے کے حوالے نہیں کریں گے۔

بس پھر کیا تھا' چار دن گاؤں کے گرد ہیرے نے گھیرا ڈالے رکھا۔ وہ تو کبھی ہمارا قلعہ نہ توڑ سکتے' لیکن پانچویں دن ملٹری والے ہیرے کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بس اس روز سب کو پتا چل گیا کہ آج آخری دن ہے۔

میری ماں نے آدھی رات کے وقت میری انگلی پکڑ لی۔ لوہے کے ایک بڑے سے ڈرم میں مجھے ڈالا' کھانے کے لئے چار میٹھی روٹیاں اور پانی کی ایک بوتل رکھی' پھر گاؤں کے پچھواڑے کی دیوار میں کھلنے والے دروازے سے ڈرم کو گاؤں سے باہر رکھ دیا' دیوار کے پاس۔

تو ڈرم میں رہی کیا' میں نے پوچھا۔

ہاں ایک رات اور دو دن۔

اسی رات ہمارا گاؤں سر ہو گیا۔ بلوائی اندر آ گھسے اور گاؤں کے سارے مرد کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔ جوان زنانیوں کو وہ ساتھ لے گئے۔ ہیرے نے گاؤں کا کونہ کونہ چھان مارا' لیکن میں اس کے ہاتھ نہ لگی۔ کسی کو خیال نہ آیا کہ گاؤں کی چار دیواری کے باہر تلاش کرے۔ بس میری بد

نصیبی' اس نے آہ بھری' میں پھر بچ گئی۔

وہ پھر خاموش ہو گئی۔

ہم دونوں نہ جانے کتنی دیر چپ چاپ بیٹھے رہے' یوں لگا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔

آسمان پر گرد کی ایک تہہ سی بدلی کی طرح چھا گئی تھی' سورج اس کی اوٹ میں آ گیا تھا۔ فضا میں گرد کا گیروا رنگ پھرا ہوا تھا۔ سب کچھ بھورا نظر آ رہا تھا۔ ہوا تیزی سے چلنے لگی تھی۔ چاروں طرف گرد آلود ویرانی چھا رہی تھی۔

دفعتاً" کسی نے میرا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا۔

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا' پیچھے چتری کا چاچا کھڑا تھا۔

ہوش کر' وہ بولا' کچھ خبر ہے تجھے۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ سب تیرے بیری ہو رہے ہیں' بوڑھے نے کہا' باری باری آ کر تجھے دیکھتے ہیں کہ تو چتری کے پاس کیوں بیٹھا ہے۔

زنانی

کیوں نہ بیٹھے' شیرنی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ لیے۔ اس کا سینہ تن گیا' آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔

میں نہیں کہتا' بوڑھے نے کہا' وہ کہتے ہیں۔

وہ کون ہیں' چتری نے آگے بڑھ کر چلا کر پوچھا۔

وہ ——— جو سامنے کھڑے ہیں۔ بوڑھے نے اشارہ کیا' وہ۔

ہم سے بیس پچیس قدم پرے چھ سات کیمپ کے کارندے کھڑے ہمیں گھور رہے تھے۔

یہ بابو جو سامنے کھڑے ہیں' چتری با آواز بلند حقارت سے بولی۔

انہیں دھمکا نہیں کاکی بوڑھے چچا نے کہا' وہ اسے پکڑ لیں گے۔ وہ اتنے سارے ہیں' یہ اکیلا ہے۔

کون کہتا ہے یہ اکیلا ہے شیرنی غرائی یہ اکیلا تو نہیں' میں جو اس کے ساتھ ہوں۔

چتری نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھا دیا اور پھر مجھے ان بابوؤں کی طرف گھسیٹنے لگی۔
میں نے محسوس کیا جیسے کسی طوفان کی زد میں آگیا ہوں۔
مجھے گھسیٹتے ہوئے وہ ان کی رو برو جا کھڑی ہوئی۔ کیا کہتے ہو تم' وہ غرائی۔
سارے بابو گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔
پھر ایک آگے آکر کہنے لگا' یہ تیرے پاس کیوں بیٹھا تھا۔
میں نے اسے بٹھایا تھا اپنے پاس وہ غرائی۔
یہ کیمپ کا کام کیوں نہیں کرتا' دوسرا بولا۔
نہیں کرتا' پھر' اس نے جواب دیا۔
تیرا کیا لگتا ہے یہ' تیسرا بولا۔
تو کون ہے پوچھنے والا' وہ اسے گھورنے لگی۔
تو اس کی وکیل ہے کیا۔
ہاں ہوں' اس نے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ خبردار جو کسی نے اس پر ہاتھ اٹھایا تو چتری نے اپنے چاچا کے ہاتھ کا ڈنڈا چھین لیا اور اسے لہرا کر بولی کس میں ہمت ہے کہ اس پر ہاتھ اٹھائے۔
"یہ تیرا کیا لگتا ہے" پیچھے ہٹتے ہوئے ایک بابو نے کہا۔
"لگتا ہے۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا' تو کون ہے پوچھنے والا؟"
وہ سب پیچھے ہٹ گئے اور اپنے اپنے خیمے کی طرف چل پڑے۔
"تو کیا دیکھ رہا ہے میری طرف"" اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا' اٹھا اپنا سائیکل۔ چل ———" میں چپکے سے اپنے بائیسکل کی طرف چل پڑا۔
میں دیکھوں گی کون تیرا پیچھا کرتا ہے' نجو نے سوٹا لہراتے ہوئے کہا' بڑے بابو بنے پھرتے ہیں۔"
بس اب جانے دے۔" چاچا بولا۔
ان میں سے ایک بھی جنترا نہیں چاچا۔ پتلونیں پہن کر مٹکتے ہیں یہ' انہیں کیا پتہ کہ زنانی کیا ہوتی ہے۔"
دفعتاً" وہ میری طرف مڑی۔ تو ابھی یہیں ہے۔ چڑھ اپنے سائیکل پر' چڑھ۔

دیکھ وہ چلائی' اب نہ آنا ادھر۔

میں سائیکل سے نیچے اتر آیا' کیوں نہ آؤں میں غصے میں بولا۔

میں جو کہتی ہوں' وہ غرائی۔

تو مجھے روکنے والی کون ہے' میں تن کر کھڑا ہو گیا۔

وہ تیری ہڈیاں توڑ دیں گے۔

توڑ دیں——— پھر۔

کیوں اپنی جان کا لاگو ہو رہا ہے تو' وہ بولی۔

تجھے اس سے کیا' جان میری اپنی ہے' تیری نہیں۔

تو تو پاگل ہے وے۔

ہاں ہوں——— پھر۔

اس پر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی' جان تو ہے نہیں تجھ میں اور مستی دکھاتا ہے——— جو تو جنڑا ہوتا تو میں تجھے کبھی یہاں آنے سے نہ روکتی' چل اب چڑھ سائیکل پر۔

میں چپکے سے سائیکل پر سوار ہو گیا۔

وہ وہاں کھڑی سونٹا لہراتی رہی۔

کچھ دور جا کر میں نے پیچھے دیکھا' وہ وہیں کھڑی تھی۔

پھر جب میں سڑک پر پہنچا تو پیچھے نگاہ ڈالی۔

وہ وہیں کھڑی تھی' اکیلی۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔' چھاتی تنی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی گلیور بالشتیوں کی نگری میں استادہ ہو۔

نواں باب

ہیرا سیاں

اگلے روز جب میں کیمپ پہنچا تو دیکھا کہ بڑی سڑک پر چند لوگ کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھے اور میرا سائیکل روک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے تیور اچھے نہ تھے دو ایک گھونسے تان کر میری طرف لپکے' لیکن ایک معمر آدمی نے انہیں روک لیا۔ پھر وہ خود میری جانب بڑھا' دیکھ بابو' وہ بولا' آج تو میں نے انہیں روک لیا ہے' لیکن اگر تو پھر کبھی کیمپ میں آیا تو مار مار کر تیرا بھرکس نکال دیں گے۔ خبردار جو تو نے کیمپ میں پاؤں دھرا۔

افسروں کو تیری رپورٹ کر دی گئی ہے کہ آج تک تو نے کیمپ میں کبھی اپنی ڈیوٹی ادا نہیں کی۔ تو یہاں آ کر کیمپ کی عورتوں کو تاڑتا رہتا ہے۔

گھر پہنچ کر میں دھڑام سے چارپائی پر گر گیا۔

مجھے یہ فکر نہیں تھا کہ پھر سے ملازمت کی تلاش میں دربدر ہونا پڑے گا' مجھے یہ افسوس تھا کہ چتری سے ملنے کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔

میرا گھر

ممتاز' ہلکی سی آواز آئی میں چونکا' دیکھا کہ اماں دروازے کی چوکھٹ سے لگی کھڑی ہے۔

میں نے اماں کی طرف دیکھا' اس کے چہرے پر دکھ اور بے بسی کے انبار لگے ہوئے تھے' جیسے انڈا چور چور ہو گیا ہو اور ابھی بہنے لگے گا۔

اب کیا ہو گا بیٹا' اس نے اپنی بات کو پھر دہرایا۔

اب اماں کے دل میں کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ اب وہ صرف میرے لیے جیتی تھی۔ ڈرتی تھی' کہ مجھے کوئی تکلیف نہ ہو' پریشانی نہ ہو۔

پھر میری بیوی اقبال بیگم تھی۔ بنیادی طور پر وہ بھی ایک دکھی عورت تھی۔ دس سال پہلے اس کی پہلی شادی ہوئی تھی۔ اس کے ہونے والے خاوند نے بارہا اپنے والدین سے کہا تھا کہ میری شادی نہ کرو' میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔ لیکن ماں باپ جہیز کے لالچ میں اندھے ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برات کی رات دولہا گھر نہ آیا۔

سات سال اقبال بیگم بیٹھی دولہا کا انتظار کرتی رہی' اس کے دل میں دولہا کے لیے نفرت پیدا ہو گئی۔

اقبال بیگم پڑھی لکھی نہ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کسی کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے۔ رسموں کی باتیں' دین لین کی باتیں' شریعت کی باتیں' چھوٹی باتیں۔ مجھے باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں تو تخیل کا مارا ہوا تھا۔ اقبال بیگم گھر میں اکیلی تھی۔ اس لیے وہ اپنی چھوٹی بیٹی سویرا کے ساتھ مصروف رہتی تھی۔

گھر میں عکسی تھا۔ اس کی عمر چھ سال کی ہو گی۔ وہ عام بچوں کی طرح نہ تھا۔ حالات نے اسے کنفیوز کر رکھا تھا۔

جب وہ تین سال کا تھا تو باپ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ایک سال کے بعد باپ لوٹ آیا اور ماں چلی گئی' ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر چلی گئی اور اب وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ اسے اپنے گرد و پیش پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ پتہ نہیں کون کب اسے چھوڑ کر چلا جائے گا ہمارا گھر ایک ویرانہ تھا۔ جہاں کے مقیم قریب رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور تھے' ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہ تھا۔

ان دنوں ہم اچھرے کے ایک چوبارے میں رہتے تھے۔ یہ چوبارہ ایک احاطے میں تھا۔ گھر میں ہم تین فرد اور دو بچے تھے۔

میری ماں، بیوی اور میں۔

اماں ایک دکھی اور غم خور عورت تھی۔

میری پیدائش کے بعد گھر میں سوکن آگئی تھی۔ اور اماں اپنے ہی گھر کی نوکرانی بنا دی گئی تھی۔ ہانڈی روٹی کے عوض اسے نو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ ہم تین جی تھے' اماں' بڑی بہن اور میں۔ اماں پر پابندی تھی کہ وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد' ہمارے لیے الگ چولہا جلائے۔ بچپن میں ہم نے رات کا کھانا کبھی جاگتے میں نہ کھایا تھا۔ گھر میں بھنڈیاں پکتیں تو اماں ہمارے لیے بھنڈیوں کی ٹوپیاں بھون دیتی۔ گھر میں کریلے پکتے تو اماں ہمارے لیے کریلوں کا بور تل دیتی۔

اماں ایک محنت کش عورت تھی۔ سوئی سلائی کے کام میں تاک تھی۔ فارغ وقت میں وہ پتنگ بنایا کرتی تھی۔ ڈور پر ماجھا لگایا کرتی تھی' کتابوں پر جلدیں باندھا کرتی تاکہ بہن اور میرے چاؤ پورے کر سکے۔ دکھ سہتے سہتے وہ ٹوٹ چکی تھی' چور چور ہو چکی تھی۔ لیکن چورے کا ڈھیر نہیں بنی تھی۔ اماں کی مجھ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ اور میں نے اس کی ہر امید کو بڑی بے دردی سے توڑا تھا۔

پتہ نہیں اماں کو کیسے پتہ چل جاتا تھا۔ جب بھی میری زندگی میں کوئی واقعہ ہوتا تو اماں کو پتہ چل جاتا۔ اس کا چہرہ چور چور ہو جاتا' جیسے ابھی بہہ نکلے گی۔

جب سے اماں نے حاجی صاحب کی بیعت کی تھی۔ حاجی صاحب اسے ہونے والی بات سے آگاہ کر دیا کرتے تھے' پتہ نہیں کیسے کر دیا کرتے تھے' حالاں کہ حاجی صاحب دلی میں رہتے تھے۔

مجھے بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اماں کو کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن مجھے پتہ تھا کہ اسے پتہ چل جاتا ہے۔ بن بتائے' پتہ چل جاتا ہے اور وہ مضمحل ہو جاتی ہے۔

اماں کا چہرہ میرے حال کا انڈکس تھا۔

چار ایک دن میں سوچتا رہا کہ چتری کی خبر کیسے حاصل کروں۔ کیمپ میں جانے کی مجھ میں جرات نہ تھی۔ اگر احمد بشیر ہوتا تو کوئی مشکل نہ ہوتی۔ احمد بشیر میں بلا کی دلیری تھی' وہ میرا واحد ساتھی تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے بحث نہ کی تھی' مجھے کبھی کسی بات سے روکا نہ تھا۔ میری بات سن کر وہ کہتا' چلو ٹھیک ہے' کر لیں گے۔

چراغ

چار چھ دن گھر میں بے یارو مدد گار پڑا رہا۔ مجھے یوں پڑے دیکھ کر اماں کا چہرہ کچھ اور چور چور ہو گیا۔ اقبال کو شک پڑ گیا کہ میری نوکری چھوٹ چکی ہے' اب کیا ہو گا۔

عکسی کچھ اور کھو گیا۔ گھر کی اداسی اور گہری ہو گی۔

شام کے وقت دروازہ بجا۔

کھولا تو میرے روبرو چراغ کھڑا تھا۔ جسے ہم پیار سے گانی کہا کرتے تھے۔

گانی میرا بچپن کا دوست تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ اور سونٹے کے سہارے کے بغیر چل نہ سکتا تھا۔

گانی اگرچہ لنگڑا تھا' لیکن تھا بہت دلیر۔

ہجرت سے پہلے وہ امرتسر میں دکان کرتا تھا۔

تو گانی' میں نے حیرت سے پوچھا' امرتسر سے کیسے آیا تو' امرتسر میں تو لاکھوں مسلمان شہید کر دیے گئے۔

کوئی بات نہیں' وہ بولا' امرتسر کا کوئی مسلمان چار ہندوؤں کو مارے بغیر نہیں مرا۔ میں نے نو مارے تھے۔ اس کے بعد میں مارا بھی جاتا تو کوئی غم نہ ہوتا۔ لیکن میں بچ گیا' قافلے میں شامل ہو گیا۔ اب ہم تو بے جا رہے ہیں۔ چار دن کے لیے یہاں رکے تھے۔ میں نے کہا تجھے مل لوں۔

گانی کے آنے سے گھر میں چہل پہل ہو گئی۔

رات کو میں نے گانی سے کہا' میرا ایک کام کرے گا۔ کیمپ میں جا کر پتہ لگا دے کہ چتری کا کیا حال ہے۔ میں نے اسے ناجو کی ساری کہانی سنا دی۔

وہ ہنسا بولا چور چوری سے جائے گا ہیرا پھیری سے نہیں جائے گا۔ تو کسی چتری کے چکر میں پھنسا ہی رہے گا عمر بھر۔

اگلے روز وہ کیمپ سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ کہنے لگا' چتری تو اپنی ماسی کی حویلی میں چلی گئی ہے' جاتے ہوئے وہ یہ پرچی اپنے چاچے کو دے گئی تھی۔ کہ اگر کیمپ والا بابو آئے تو اسے دے دینا۔

پرچی پر لکھا تھا۔ بیرے کی ماڑی۔ کھوڑ والا کھوہ' ٹالیاں والا۔
دیکھتا کیا ہے گانی بولا۔ اپنا پتہ لکھ کر دے گئی ہے کہ تو ملنا چاہے تو۔
کون ہے یہ' گانی نے پوچھا۔
پتہ نہیں کون ہے' کیمپ میں ملی تھی۔ جٹی ہے' بانہہ پکڑ لے تو چھڑانی مشکل ہو جائے۔
وہ ہنسا' تو جب بھی ہاتھ مارتا ہے' اونچا مارتا ہے' گرے تو ہڈیاں چور ہو جائیں۔
نہیں ہاتھ مارنے کی بات نہیں۔
تو پھر' وہ بولا۔
صرف ایک بار ملنا چاہتا ہوں اسے صرف ایک بار۔
اکیلے نہ جانا' باڈر کا علاقہ ہے' وہ رک گیا۔ پھر بولا' ہم نے پرسوں ٹوبے جانا ہے۔ اگر تو کل جائے تو میں تیرے ساتھ چلوں گا۔

ٹالیاں والا۔ کنڈکٹر نے گھنٹی بجاتے ہوئے کہا۔
بس رک گئی۔
کھوڑ والا کھوہ کدھر ہے' گانی نے پوچھا۔

بیرے کی ماڑی

وہ سامنے' کنڈکٹر نے اشارہ کیا' بیرے کی ماڑی کے پاس۔ اس ڈنڈی پر چلا جا۔ ذرا دھیان سے' یہ باڈر کا علاقہ ہے۔
ہم دونوں بس سے اتر کر ڈنڈی پر چل پڑے۔ دیر تک ہم دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔
بڑی ویرانی ہے' میں نے کہا۔
لوگ گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بارڈر لگتا ہے نا' گانی بولا۔
یہاں تو گاؤں خالی پڑے ہیں۔
ہاں شام پڑ رہی ہے نا۔
یہی وہ گاؤں ہے کیا۔

انہوں نے یہ پتہ دیا ہے۔ کھوڑ والے کھوہ کے پاس بیرے کی ماڑی میں' اپنی ماسی کے پاس رہتی ہے۔

یہاں اجاڑ میں رہتی ہے کیا؟

پتہ نہیں' گانی بولا' یہ جاٹ لوگ ڈرتے نہیں۔

اور اگر وہ یہاں نہ ملی تو۔

تو اسی بس سے واپس چلے جائیں گے' یہ آخری بس ہے نا۔

ہمارے دائیں ہاتھ ڈنڈی سے پچاس گز کے فاصلے پر چار ایک کچے گھر بنے ہوئے تھے۔ میں نے غور سے اس آبادی کی طرف دیکھا' شاید کوئی آدمی نظر آ جائے۔ وہاں ہو کا عالم طاری تھا۔ کسی گھر سے دھواں تک نہ نکل رہا تھا۔ دو مریل سے کتے گندگی کے ڈھیر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان میں بھونکنے کی بھی سکت نہ تھی۔

یہ گاؤں دیکھ رہے ہو' میں نے گانی سے کہا۔

ہاں۔

لٹا پٹا' معلوم دیتا ہے۔

ہاں۔ اب بارڈر پولیس آ گئی ہے نا' گانی نے کہا' اب لوگ واپس اپنے گھروں میں آ جائیں گے۔" آہستہ آہستہ۔

ہم پھر خاموش ہو گئے۔

کھوڑ والا کھوہ ویران پڑا تھا۔

پھر ہماری توجہ بیرے کی ماڑی کی طرف مبذول ہو گئی۔ بیرے کی ماڑی ایک دو منزلہ پختہ حویلی تھی۔ جو چاروں طرف سے بند تھی۔ باہر کی چار دیواری کے پیچھے ایک وسیع صحن تھا۔ صحن کے ایک طرف اونچی اور سیدھی دیواریں کھڑی تھیں۔

پرانی ڈراؤنی سی حویلی تھی۔ نچلی منزل میں ایک بڑا سا لوہے کا دروازہ تھا۔ اوپر کی منزل میں جگہ جگہ تنگ کھڑکیاں کھلتی تھیں' جن پر سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

باہر کی چار دیواری کا پھاٹک ٹوٹا ہوا تھا۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

صدر دروازے پر پہنچ کر گانی نے زور سے دروازہ بجایا۔ مکان میں کوئی حرکت پیدا نہ

ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر دروازہ بجایا۔ کوئی ہے' وہ چلایا' پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔

اونہوں حویلی خالی پڑی ہے' میں نے کہا' یہاں کوئی نہیں ہے۔

خالی ہوتی تو دروازے پر تالہ لگا ہوتا' گانی نے کہا' یہ دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ یہ کہہ کر گانی نے پھر دروازہ بجایا۔ اور ہم پھر گوش بر آواز کھڑے رہے۔

ہوس اور قدر

چھٹی ساتویں بار دروازہ بجایا تو اوپر کی منزل کی کھڑکی کھل گئی۔ کون ہے' ایک زنانہ مگر رعب دار آواز آئی۔

کیمپ سے آئے ہیں' گانی نے چلا کر کہا۔

کیا کام ہے' آواز پھر آئی۔

چتری سے ملنا ہے' میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد دیر تک خاموشی طاری رہی' پھر وہی آواز آئی' رک جاؤ اور کھڑکی بند ہو گئی۔

کچھ دیر بعد صدر دروازہ کھلا۔

سامنے ایک اونچی لمبی بھارے بدن کی عورت کھڑی تھی' اس کے پیچھے اندھیرے میں ایک اور زنانی تھی۔

اندر آ جاؤ' عورت نے ڈانٹ کر کہا۔

ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

تو ہے کمپ والا بابو' اونچی لمبی عورت نے گانی سے پوچھا' گانی نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

میں ہوں کمپ والا بابو' میں نے جواب دیا۔

تو ——— عورت نے ایک تحقیر بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

کیوں چتری ——— یہی ہے وہ' اونچی لمبی عورت نے مڑ کر کسی سے پوچھا' تو اس کی بات کرتی تھی' وہ پھر ہنسی۔

شرمندگی سے مجھے پسینہ آ گیا۔

عورت نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لمبی کلہاڑی کو ایک طرف پھینک دیا اور چتری سے مخاطب

ہو کر بولی' تیری کوئی بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی آج تو ڑی۔ پھر وہ میری طرف مڑی' چل اندر اب یہاں کیوں کھڑا ہے' اس نے مجھے ڈانٹا۔

اندر جا کر ہم بے حد حیران ہوئے۔ کسی کمرے میں کوئی سامان نہ تھا۔ سارا گھر لٹا پٹا معلوم ہوتا تھا۔

مجھے پتہ تھا' چتری نے کہا' مجھے پتہ تھا تو آئے گا۔

تیرا تو مغز چل گیا ہے' ماسی نے کہا۔ اس بے چارے کی زندگی کیوں حرام کر رہی ہے تو خوامخواہ۔

تجھے اس کا کیا پتہ' چتری نے کہا۔

پتے کا مطلب' ماسی بولی' سب کچھ سامنے دھرا ہے۔ تجھے نہیں دکھتا کیا' اندھی ہے۔

وہاں کیمپ میں بس اسی کا دم تھا' چتری نے کہا۔ وہ خاموش ہو گئی' پھر بولی۔

اور دو جے سارے مجھے یوں دیکھتے تھے جیسے میں کوئی کھانے کی چیز تھی ہر کوئی چاہتا کہ اٹھا کر منہ میں ڈال لے۔

پھر کسی نے ڈالا منہ میں' ماسی ہنسی۔

ہے کسی کی مجال' چتری تن کر کھڑی ہو گئی۔

یہ کیسے دیکھتا تھا' ماسی نے پوچھا۔

اس کی نظر میں قدر تھی' ہوس نہیں تھی' چتری نے کہا۔

مرد تو دیکھتا ہی ہوس سے ہے۔ وہ مرد ہی کیا جو ہوس سے نہ دیکھے۔

چھوڑ بھی ماسی' چتری ہنس کر بولی۔

وہ ہیرا بھی تو تجھے ہوس سے دیکھے تھا۔

خالی ہوس نہیں' چتری نے کہا۔ اب تو ان کو چائے بھی پوچھے گی کہ نہیں۔

لے میں تو بھول ہی گئی ابھی لاتی ہوں' یہ کہہ کر ماسی اندر چلی گئی۔

من کا بھید

یہ کون ہے تیرے ساتھ چتری نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اسے کیمپ میں تو نہیں دیکھا

کدی۔

یہ میرا دوست ہے۔

بابو تو نہیں دکھے ہے' وہ ہنسی۔

تو یہاں اکیلی رہتی ہے کیا' میں نے پوچھا۔

ماسی ہے' ماسٹر ہے' میں ہوں۔

ارد گرد کے گاؤں تو سب ویران پڑے ہیں' گانی بولا۔

سب لوگ گھربار چھوڑ کر چلے گئے تھے' بارڈر جو بن گیا تھا۔ اب واپس آ رہے ہیں' اپنے اپنے گھروں کو۔ ملٹری جو آگئی ہے باڈر پر۔ ماسی ماسٹر بھی چلے گئے تھے۔ پر اب واپس آ گئے ہیں' میری ماسی ٹاہلیاں والے میں بیاہی گئی تھی نا۔

یہ گھر تیری ماسی کا ہے کیا؟ میں نے پوچھا۔

نہیں وہ بولی' یہ سکھوں کی حویلی تھی۔ وہ چلے گئے تو ماسٹر یہاں آگیا۔ یہ حویلی بند ہے نا۔

یہ تو اچھا خاصہ قلعہ ہے' گانی نے کہا۔

ہاں۔

مجھے پتہ تھا تو آئے گا۔ چتری بالاخر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

کیسے پتہ تھا' میں نے پوچھا۔

بس دل کہتا تھا۔ میں چاچے کو کہہ آئی تھی کہ جو بابو آئے تو میرا پتہ دے دینا۔

پر تو یہاں کیوں آ گئی۔

بس آ گئی۔

کیمپ کو کیوں چھوڑ دیا۔

وہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

جو آنا ہی تھا تو ادھر جاتی' بارڈر سے دور۔ تو تو بالکل بارڈر پر آ گئی۔

یہاں ماسی کا گھر جو تھا۔

یہاں تو ہر وقت کا خطرہ ہے۔

ہمیں نہیں کہتا کوئی کچھ۔

تو اب یہیں رہے گی۔

پتہ نہیں۔ جب تک جی چاہے گا رہوں گی۔

تیرے جی کا بھی بھید نہیں پایا۔

میں نے خود نہیں پایا۔ تو کیا پائے گا' وہ ہنسی۔

کسی نے پایا بھی ہے' گانی بولا۔

زنانی کے پلے اور ہوتا ہی کیا ہے۔ بس اک جی کا بھید ہی تو ہوتا ہے' جو وہ کھل جائے تو باقی رہا کیا۔

گانی قہقہہ مار کر ہنسا۔

یہاں آنے میں بھی تو بھید ہو گا کوئی' گانی نے کہا۔

ہاں ہے' چتری نے جواب دیا۔

کھولنا نہیں چاہتی نا' میں نے اسے چھیڑا۔

کیوں نہ کھولوں گی تجھ پر' وہ دکھی انداز میں بولی' اپنا کوئی رہا ہی نہیں ہے۔ بس اک تو ہے جو اپنا بن گیا تھا ادھر کیمپ میں۔ ساری باتیں تو میں نے بتا دی تھیں تجھے۔

وہ ہیرا سیاں والی بات نا۔

ہاں ہیرے کی بات۔ اچھا ہے جو تو آج آ گیا ہے۔ عین موقعے پر آیا ہے تو۔ یہ سگری' میری ماسی جو ہے یہ بھی میری ساتھی ہے جس طرح یہ تیرا ساتھی ہے' اسی طرح۔ ماسی میری ہر بات مانتی ہے' روک نہیں بنتی۔ پر منہ سے طرف داری نہیں کرتی' منہ سے روکتی ہے' نصیحتیں کرتی ہے' پر میں اس کی بات مانوں نہ مانوں۔ غصے نہیں ہوتی۔ کہتی ہے' جو چاہے کر۔

اور ماسٹر' میں نے پوچھا۔

وہ نہیں دیتا دخل۔

تیری بات مانتا ہے کیا؟

میں نے کبھی دل کی بات بتائی ہی نہیں اسے۔

ماسی بتا دیتی ہو گی گانی نے کہا۔

اونہوں، ماسی میرا بھید رکھتی ہے، بتاتی نہیں، جبھی تو آج ماسی نے ماسٹر کو باہر بھیج دیا ہے۔ بیلوں کی جوڑی لانے کو۔

تجھے پتہ تھا آج ہم آرہے ہیں، میں نے پوچھا۔

مجھے کیسے پتہ ہوتا بھلا۔

تو پھر ہماری خاطر ماسٹر کو باہر نہیں بھیجا۔

نہیں نہیں تمہاری خاطر نہیں، وہ ہنسی۔

پھر کس کی خاطر بھیجا ہے اسے، میں نے پوچھا۔

آج ہیرا جو آرہا ہے، آدھی رات کو آئے گا۔

سچ، کیسے آئے گا بارڈر پار کر کے، ادھر تو بڑی فوج ہے۔

اس نے مجھے کیمپ میں کہلوا بھیجا تھا کہ ماسی کے گھر آجا۔

اسے پتہ ہے اس گھر کا، گانی نے پوچھا۔

ہاں یہاں آتا جاتا رہا ہے۔ اس ماڑی کا مالک اس کا دوست تھا۔ یہاں آکر ٹکا کرتا تھا وہ، کئی کئی دن۔

کیا پیغام بھیجا تھا اس نے تجھے کیمپ میں، میں نے پوچھا۔

بس یہی کہ میں تجھے ایک بار پھر ملنا چاہتا ہوں۔

تو ماسی کے گھر آجا۔ چاہے رات کی رات کے لیے آ، پر آجا۔

مانگنا، دینا

سگری دودھ کے دو گلاس اٹھائے آگئی بولی، وہ ہیرا تو اس کا ہو گیا ہے۔ ملنا کیا ہے، بس کہے گا، چتری یا تو میرے ساتھ چل یا پھر مجھے اپنے پاس رکھ لے یہی کہے گا نا وہ تجھے۔

ہاں، چتری ہنسی، یہ تو وہ مجھے پہلے ہی کہہ چکا ہے، کئی بار۔

پر وہ تو سکھ ہے، گانی بولا۔

وہ کہتا ہے، ماسی نے کہا، جو تو مجھے اپنا بنا لے تو میں اپنا دھرم چھوڑ دوں گا۔

ہاں یہی کہتا ہے وہ، چتری ہنسی۔

تو پھر کیا کہتی ہے' ماسی نے پوچھا۔

میں کسی کی خاطر اپنا اللہ رسولؐ کیوں چھوڑوں۔

وہ جو اپنا واہگرو چھوڑنے کے لیے تیار ہے' ماسی نے کہا۔

نہ' چتری بولی' میں کسی کا دھرم کیوں چھڑواؤں۔

تجھے کچھ پتہ بھی ہو' ماسی بولی' زنانی اور مرد دھرم کے بندھن سے نہیں بندھتے۔

یہ بتا' میں نے چتری سے کہا' تو بندھن سے بندھی ہے کہ نہیں۔ دھرم کو چھوڑ۔

یہ کیا پوچھا ہے تو نے' ماسی ہنسی' پتہ نہیں تجھے' زنانی آپ سے بندھن میں نہیں پڑتی۔ مرد اس کے بندھن میں پڑ جائے تو لاچار ہو جاتی ہے۔ مرد کا بندھن زنانی کو باندھ لے ہے۔

مجھے ہیرے کے بندھن سے کوئی واسطہ نہیں' چتری بولی۔

سب منہ زبانی کی باتیں ہیں' ماسی نے کہا۔

جو تجھے ہیرے کی قدر نہ ہوتی تو اسے ملنے کے لے یہاں ٹالیاں والے کیوں آتی۔

اس نے جو کہلوا بھیجا تھا کہ ایک بار مل لے' چتری نے کہا۔

بس تو مجبور ہو گئی۔ اس کی لگن' تیری مجبوری' ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ میں بھی جوانی میں مجبور ہو کر یہاں واہگے آ بیٹھی تھی' ماں باپ بھائی بہنوں کو چھوڑ کر' دیس سے دور۔

سچ کہتی ہے تو ماسی' گانی نے پوچھا۔

بس دو ہی باتیں ہیں' وہ بولی' جب زنانی مجبور ہو جاتی ہے۔

کس بات پر مجبور ہوتی ہے زنانی' میں نے پوچھا۔

کوئی چھاتی بجا کر زنانی کو سہارا دے تو مجبور ہو جاتی ہے۔ کوئی بے بس ہو کر زنانی سے سہارا مانگے تو مجبور ہو جاتی ہے بس یہی دو مجبوریاں ہیں' تیجی کوئی نہیں۔ کیا کہتا ہے تو' اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں کیا کہہ سکتا ہوں' میں نے جواب دیا۔ کہہ کیوں نہیں سکتا' ماسی نے کہا' ———— تو نے چتری سے سہارا مانگا تھا اور وہ ہیرا جو ہے' اس نے اسے سہارا دیا تھا۔ اب بھی دے رہا ہے۔ پتہ ہے تجھے جو سہارا مانگے' زنانی اسے ماں بن کر پیار کرتی ہے' جو سہارا دے اسے زنانی بن کر پیار کرتی ہے۔

میں ہیرے کو پیار نہیں کرتی' چتری نے غصے میں کہا۔ اس نے میرے گاؤں کے بچے بچے کو کٹوا دیا' میرے اپنوں کا صفایا کر دیا' نہ نہ میں اسے پیار نہیں کرتی' کبھی نہیں کروں گی۔

کس کے لیے سارے گاؤں کو کٹوایا ——— تیرے لیے نا' ماسی چلا کر بولی۔

تجھی کے لیے منہ کالا کیا ——— تیرے لیے' اب وہ کس کے لے بارڈر پار کر کے آ رہا ہے ادھر ——— تیرے لیے نا۔ اور پھر کیا دینے کو تیار نہیں وہ' دھن دولت دھرم۔

سچ کہتی ہے تو ماسی' گانی بولا۔

پر میں اسے نہیں اپناؤں گی۔ چتری غصے میں آ گئی۔ اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں اسے یہاں اپنے پاس نہیں رکھوں گی' ہمارا ساتھ نہیں ہو گا۔

یہ تیری مرضی ہے' ماسی نے کہا۔

تو دیکھ لینا ماسی۔

میری طرف سے جو مرضی ہے کر۔ مجھے وہ پیارا تو نہیں' تو پیاری ہے۔ جو تو چاہے گی وہی ہو گا۔

لیکن وہ باڈر پولیس سے بچ کر آئے گا کیسے' گانی نے پوچھا۔

وہ تو آواز دیے بغیر گولی چلا دیتے ہیں' میں نے لقمہ دیا۔

من میں زنانی سے ملنے کی دھن لگی ہو تو جنترا گولی کو نہیں جانتا۔ وہ ضرور آئے گا۔ چاہے کیسا بھی ہے وہ' پر ہے جنترا ماسی نے کہا۔

تو جنترے کی قدر کرتی ہے کیا' گانی نے چتری سے پوچھا۔

تم شہر والے کیا جانو کہ جنترا کسے کہتے ہیں' چتری نے تلخی سے جواب دیا' تم شہر والے کیا جانو کہ زنانی کون ہوتی ہے۔ شہر میں تو بابو ہوتے ہیں اور بنی بجی گڑیاں ہوتی ہیں۔ وہ کیا جانیں بندھن کو' وہ تو بس اپنے پر ورق لگاتی رہتی ہیں' جیسے فرنی کی پلیٹیں ہوں۔

پر اندر سے وہی بچ بچ' ماسی نے نفرت سے ہاتھ ہلایا۔

دیر تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

یہ چتری وہ چتری

میں غور سے چتری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ چتری تو نہیں تھی جسے میں کیمپ میں ملا کرتا

تھا۔ اس وقت نہ وہ رانی تھی' نہ شیرنی۔ شاید اس لئے کہ کیمپ میں وہ احساس مدافعت سے بھری رہتی تھی۔ اسے اپنے گردو و پیش پر غصہ آتا تھا' یا شاید اس لیے کہ کیمپ میں لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز رہتی تھیں۔ اور ان نگاہوں تلے وہ ابھرتی اور ابھر ابھر کر رانی بن جاتی۔ یہاں بیرے کی ماڑی کے ویرانے میں وہ سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس چھائی ہوئی تنہائی نے اسے سمیٹ لیا تھا۔ پھر ہیرے کا خیال بھی تو تھا۔ اس کی تمام تر توجہ ہیرے پر لگی ہوئی تھی۔ ہیرا چاہے چتری کے لیے قابل قبول تھا یا نہیں' لیکن ہیرے کی لگن اتنی عظیم تھی' اتنی شدت بھری تھی۔ اس بھرپور لگن نے چتری کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ اس آغوش میں وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے ایک بچی ہو۔

سگری نے سچ کہا تھا' عورت صرف دو صورتوں میں مجبور ہوتی ہے' ایک جب کوئی اسے سہارا دے' اعلانیہ سہارا' ساری دنیا کے خلاف اٹھ کر بہانگ دہل سہارا۔ اور دوسرے جب کوئی بے بسی سے چور چور ہو کر اس کا سہارا مانگے۔

ہاں ماسی سچ کہتی تھی' میں نے سوچا۔ میں نے چتری کا سہارا مانگا تھا۔ اسی لیئے وہ میری جانب متوجہ ہوئی تھی۔ میں نے کبھی کسی عورت کو سہارا نہیں دیا۔ مجھ میں سہارا دینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ میں جنتزا نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے پر بے بسی طاری کر کے عورت سے سہارے کی بھیک مانگی ہے۔ وہ شہزاد تھی' وہ بھی سہارا دینے کی شوقین تھی شاید اس لیے کہ اسے سہارا دینے والا کوئی نہ تھا۔ سہارا صرف وہ دے سکتا ہے جو عظیم تر ہو۔ جس کی آغوش میں سر رکھ کر فکروں سے چھٹکارہ مل جائے' اپنے دکھوں' غموں کی گٹھڑی اس کے کندھوں پر رکھ کر خود کو نجات مل جائے۔

کیا ہے تجھے' چتری نے مجھ سے پوچھا' کس سوچ میں پڑا ہے۔

میں چونکا' کچھ بھی نہیں' میں نے جواب دیا۔

سگری اٹھ بیٹھی۔ بولی رات ہو گئی ہے۔ آج ہمیں دروازہ کھلا رکھنا ہے اور پھر کھلے دروازے کے پاس بیٹھ کر پہرہ دینا ہے۔

کیوں کھلا کیوں رکھنا ہے۔ گانی نے پوچھا۔

ہیرے کو دروازہ کھٹکھٹانا نہ پڑے' جو رات کو لوہے کا دروازہ بجا تو باڈر والے چوکنے ہو

جائیں گے۔ اور جو بارڈر والے چوکنے ہو گئے تو ہیرے کو چھپانا مشکل ہو جائے گا۔

تو ڈرتا تو نہیں، سگری نے گانی سے پوچھا۔

اونہوں، اس نے جواب دیا، موقعہ آیا تو دو ہاتھ کر لوں گا۔

بڑے گردے کا کام ہے وہ بولی۔

تو فکر نہ کر، گانی نے کہا، آرام سے سرتلے بانہہ رکھ کر سو جا میں بیٹھوں گا۔ دروازے پر پہرہ دینے کے لیے۔

سگری نے غور سے گانی کی طرف دیکھا، تو دے گا پہرہ، اکیلا۔

تجھے یقین نہیں آتا کیا، گانی ہنسا۔

دکھتا تو نہیں تو، ماسی بولی۔

پہلے تو دیکھنا سیکھ ماسی، گانی نے جواب دیا۔

رے، ماسی نے حیرت سے گانی کی طرف دیکھا، منہ زبانی تو نہیں بول، ہاتو۔

گانی نے قہقہہ لگایا۔

چل اٹھ، وہ گانی سے مخاطب ہو کر بولی، چل کے برچھے نکالیں۔

گانی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا، چتری بولی، کیا ہے تجھے۔

مجھے تو کچھ نہیں پر تو وہ چتری نہیں ہے۔

میں بدل گئی کیا، وہ مسکرائی۔

پتہ نہیں تو، تو نہیں رہی۔

جو میں، میں نہیں تو کون ہوں میں۔

پتہ نہیں کون ہے۔

تیرا مغز تو نہیں پھر گیا۔

میرا تو کچھ بھی نہیں پھرا۔ تیری نظر پھری ہوئی ہے، اس کے انتظار میں بیٹھی ہے نا، اس لیے۔

اس نے سر لٹکا لیا، سگری بھی یہی کہتی ہے۔

کہتی ہے۔ دیکھ ہیرے نے تیری خاطر سب کچھ کیا ہے۔ دنیا جہان کو ہلا دیا۔ اپنے بیگانوں

سے متھا لگایا ہے' لیکن تیرے دل میں نہیں بیٹھا وہ۔ ماسی سچ کہتی ہے' میرے دل میں نہیں بیٹھا وہ پتہ نہیں کیوں نہیں بیٹھا۔

تجھے کیسے پتہ چلا کہ نہیں بیٹھا' میں نے پوچھا۔

جو بیٹھا ہوتا تو میں یوں بھری ہوتی جیسے گابھن بھری ہوتی ہے' پر میں تو خالی ہوں۔ تجھے مجھ پر یقین نہیں آیا کیا' بول۔

آتا ہے' آتا ہے' میں نے جواب دیا' اتنا آتا ہے۔ جتنا کسی اور پر نہیں آیا کبھی۔

مجھے بھی تجھ پر اتنا ہی بھروسہ ہے جتنا کسی اور پر نہیں۔ میں تو دعائیں مانگتی تھی کہ تو آ جائے' جلدی آ جائے۔

کیوں؟

تجھ سے پوچھنا تھا۔

کیا۔

کہ ہیرے کو کیا جواب دوں۔

تیرا دل کیا کہتا ہے۔

میرا دل نہیں مانتا۔

تو پھر نہ کر دے' پوچھنے کا سہارا کیوں لیتی ہے۔

تجھ سے پوچھ کر دل "ہولا" ہو جائے ہے نا۔

اب آ بھی جا چتری' نیچے سے ماسی کی آواز آئی۔

وہ بلا رہی ہے تجھے' میں نے کہا۔

چتری اٹھ بیٹھی۔

ایک بات پوچھوں' میں نے کہا۔

پوچھ۔

جو تو ہیرے کے ساتھ جانا چاہے تو یہ ماسی سگری تجھے جانے دے گی؟ روکے گی تو نہیں۔

وہ تو نہیں روکتی۔ منہ زبانی چاہے جو مرضی ہے کہے پر روکتی نہیں۔ وہ تو مجھے اپنا دل بھون کے کھلا دے' قسم ہے۔

ہیراسیاں

جب وہ نیچے پہنچے تو گانی اور سگری دونوں ڈیوڑھی میں لحاف بچھا رہے تھے۔ دو بھالے اور دو لمبے دستوں والی کلہاڑیاں دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ ہم لحاف پر بیٹھ گے۔

دیر تک وہاں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

ماسی نے کہہ دیا تھا کہ باتوں کی آواز باہر سے کسی نے سن لی تو مشکل پڑ جائے گی۔ اس لیے ہم خاموش بیٹھے تھے۔ سب کی نظر دروازے پر تھی۔ دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ لوہے کی سلاخیں نکلی ہوئی تھیں۔

ڈیوڑھی میں گھٹاٹوپ اندھیرا تھا' کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ کون کہاں بیٹھا ہے۔

دو ایک بار گانی نے دروازے کے پٹ کھول کر' درز سی بنا کر' باہر جھانکا۔ باہر تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی تھی' لیکن کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دور کوئی کتا رو رہا تھا۔

پھر دفعتاً" جھاڑیوں میں سے آواز سی آئی۔ سگری نے اٹھ کر کلہاڑی اٹھالی۔ گانی بیٹھے بیٹھے بھالے سے کھیلنے لگا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔

پھر گانی اٹھ کر دروازے کی درز سے جھانکنے لگا۔

جھاڑیوں میں دیکھ ماسی' اس نے زیر لب کہا۔

حرکت کی آواز پھر سنائی دی۔

کوئی ہے' گانی نے آہستہ سے کہا۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

چتری اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

کوئی آ رہا ہے' گانی بولا۔

سگری لپک کر گانی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

وہی ہے وہ بولی۔ دروازہ کھول دے۔

گانی نے پٹ کو کچھ اور کھول دیا۔

ایک اونچا لمبا آدمی اندر داخل ہو گیا۔

کون ایں توں، اس نے گانی کو گھورا۔

اپنا ہی ہے، سگری بولی۔ یہ دونوں اپنے مہمان ہیں۔

بھلا، نووارد ایک طرف ہو گیا۔

سگری نے بڑھ کر دروازے کو کنڈی لگا دی اور سیڑھیں چڑھا دیں۔

پھر ہم پانچوں اوپر کی منزل پر آ گئے۔

لو تم یہاں بیٹھو، سگری نے ہیرے سے کہا، ہم ادھر بیٹھتے ہیں۔

سگری نے اشارہ کیا ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

ساتھ والے کمرے میں ہم بچھے ہوئے گھاس پر بیٹھ گئے۔

ہم تینوں چپ چاپ وہاں بیٹھے رہے۔

گانی نے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن بات اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

میرا تو بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، اس لیے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہاں بیٹھے بیٹھے صدیاں بیت گئی ہوں۔

دفعتاً میں نے مڑ کر دیکھا تو دروازے میں چتری اور ہیرا کھڑے تھے۔

سگری انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔

کیوں ہو گئی بات، سگری نے پوچھا۔

ایہہ نہیں مندی، ہیرے نے کہا، ایہوں کیا اے بھانویں میرے نال چل، بھانویں مینوں ایتھے اپنے کول رکھ لے۔ بھانویں چل دونوں سری لنکا چلے چلیے۔ نہ اوتھے پاکستان دا جھگڑا نہ ہندوستان دا۔

کیا کہتی ہے یہ، سگری نے پوچھا۔

کہندی اے، اساں اکٹھیاں نہیں رہنا۔

پھر تو کیا کہتا ہے، سگری نے پوچھا۔

اساں کہنے ایں، جے رہنا ایں تے اکٹھیاں ای رہنا ایں۔

سگری ہنسی، پھر۔

فیر کی ماسی، صلح نال نہ منے گی تے چک کے لے جاں گے۔ اپنے ساتوں کسے ہور جوگا چھڈیا ای نہیں۔

کیوں میں نے کیا کیتا ہے، چتری چمک کر بولی، میں نے کوئی وچن دیا تھا تجھے۔

تو نہیں دتا پر اساں اپنے آپ نال وچن دتا اے کہ ہیرا سیاں تیرا گھر چترو ای آ کے آباد کرے گی۔ تے اساں گھر آباد کر کے رہاں گے۔ آپاں وی ہیرا سیاں ایں ماسی۔ اج توڑی تے نہیں ہوئی ایہہ گل کہ ہیرا سیاں مونہوں گل کڈھے تے اونہوں پورا نہ کرے۔

میں وی چتری ہاں، وہ سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، شیرنی اپنے کچھار سے باہر نکل آئی تھی۔

عین اس وقت دروازہ زور سے بجا۔

اس وقت کون ہو سکدا ہے، سگری گنگنائی۔

ماسٹر تے نہیں آگیا، چتری بولی۔

ذرا کھڑکی توں دیکھ توں، ماسی نے گانی سے کہا۔

گانی کھڑکی کی طرف لپکا۔

آواز پیدا نہ کرنا، میں نے گانی سے کہا۔

کچھ دیر گانی دیکھتا رہا، پھر وہ ہمارے قریب آ کر بولا۔

وہ تو باڈر پولس والے ہیں، دس بارہ ہیں۔

دس بارہ چتری نے دہرایا، اس کے چہرے پر فکر نمایاں تھا۔

انہیں کیسے پتہ چلا، سگری بولی۔

آخری فیصلہ

ہیرے نے سگری کی بات کاٹ کر کہا، اچھا چتری تو ساتوں اک گل دس دے، ایہہ تیرا آخری فیصلہ اے۔

چتری خاموش کھڑی رہی جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ نیچے بار بار دروازہ بج رہا تھا۔

اچھا اساں فیر چلے، ایں۔ مر جانا منظور اے پر قید نہیں ہونا، ہیرا بولا۔

ٹھہر میں پچھواڑے دیکھ لواں' ماسی بولی۔ شاید باڈر والوں نے حویلی کو گھیر رکھیا ہو' ماسی نے کہا۔

چھڈ ماسی' ہن جو ہووے سو ہووے ۔ جے جیوندے رہے چترو تے فیر تینوں چک کے نہ لے گئے تے ساڈا ناں وی ہیرا نہیں' یہ کہہ کر وہ چل پڑا۔

ٹھہر جا' ماسی بولی' پچھواڑے کی طرف ایک چور دروازہ ہے۔

سانوں پتہ اے' ہیرا بولا' اسی ایس حویلی دا پت پت جاندے آں ایہہ حویلی ساڈے پرانے متر رگھ بیرے دی اے۔ اچھا ماسی' ہیرے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے' واہ گرو ماسی' ساڈا سمبند کوئی ٹٹ نہیں گیا ماسی' ایہہ تے جنم جنم دا بندھن اے' فیر ملاں گے جے جیوندے رہے تے۔

لاج کی بات

ٹھہر جا ہیرے' چتری چلائی۔

کی کہنی ایں تو' ہیرا رک گیا۔

میں تینوں اکلے جان نہیں دواں گی۔

کیوں۔

تو میرے لئی آیا ہے نا یہاں' میں تجھے خود چھوڑ کے آؤں گی۔

اوہناں گولی مار دتی تے فیر' ہیرے نے کہا۔

مار دیں' چل میں تینوں چھڈ آؤں' چتری چل پڑی۔

کتھوں تک جاویں گی ساڈے نال' ہیرا مسکرایا۔

جد تو باڈر پار پہنچ جائے گا تے میں آ جاؤں گی۔

عقل کر چتری' سگری نے کہا۔

نہیں ماسی ایہہ اکیلا نہیں جائے گا' میں ساتھ جاؤں گی' یہ میری لاج کی بات ہے۔

وہ دونوں چل پڑے آگے آگے چتری تھی' پیچھے پیچھے ہیرا سیاں تھا۔

جب وہ چلے گئے تو گانی نے دوڑ کر صدر دروازہ کھول دیا۔ پولیس والے اندر آ گئے۔

مخبر نے اطلاع دی ہے ان کے افسر نے کہا کہ ایک سکھ ادھر آیا ہے۔

خود دیکھ لو' حویلی کھلی پڑی ہے' سگری نے کہا۔

اور یہ دو کون ہیں' اس نے پوچھا۔

ہم کیمپ سے آئے ہیں' میں نے کہا۔

کون سے کیمپ سے۔

والٹن کیمپ سے۔ اس کی بہن کی لڑکی چتری کا پتہ لگانے آئے ہیں' وہ کیمپ سے گم ہو گئی ہے۔

پورا آدھ گھنٹہ پولیس حویلی کی تلاشی لیتی رہی' پھر وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔

پولیس کے جانے کے بعد گانی نے کہا' ان سپاہیوں پر نظر رکھنی چاہیئے۔

کیوں' میں نے پوچھا۔

کہیں وہ پچھواڑے کی طرف جا کر تلاش نہ کریں۔

اب کیا ہے' سگری نے کہا' اب تو وہ کب سے نکل گئے ہوں گے۔ میں ذرا نیچے جا کر چور دروازہ بند کر آؤں۔

کون سا دروازہ' میں نے پوچھا۔

جس دروازے سے وہ گئے ہیں' ماسی نے کہا۔

لیکن چتری نے واپس جو آنا ہے' میں چلایا۔

ماسی مسکرانے لگی۔

اونہوں' ماسی نے سر نفی میں ہلایا' اس کے گال پر دو آنسو ڈھلک آئے۔

کیا بات ہے ماسی' میں نے مضطرب انداز سے پوچھا۔

چتری اب کبھی واپس نہیں آئے گی' ماسی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

مگر کیوں' میں چلایا' تم نے چتری کا فیصلہ نہیں سنا تھا کیا۔

سنا تھا ماسی نے جواب دیا' پہلے ہیرے نے اسے سہارا دینا چاہا تھا۔ چتری نے اس کا سہارا لینے سے انکار کر دیا تھا ——— لیکن اب وہ اسے سہارا دینے گئی ہے۔ خود اس کا سہارا بن کر گئی ہے۔ اب وہ نہیں آئے گی۔

دسواں باب

مانی کی کہانی

اس روز اماں بہت خوش تھی۔ غیراز معمولی خوش تھی۔ کہہ رہی تھی' سب ٹھیک ہو جائے گا' انشاء اللہ۔

کیسے ٹھیک ہو جائے گا' اقبال غصے میں بولی۔

ہو جائے گا ہو جائے گا' اماں نے اسے تسلی دی۔

لیکن کیسے اقبال نے کہا' تلاش نہیں کریں گے تو نوکری کیسے ملے گی۔ نوکری نہ ملی تو کھائیں گے کیا۔

مل جائے گی نوکری' میں نے کہا۔

ڈھونڈے بغیر ہی مل جائے گی کیا۔ سارا دن تو یہ گھر پڑے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں کس خیال میں کھوئے رہتے ہیں' گردو پیش کا ہوش ہی نہیں۔

وہ کہتے ہیں' فکر نہ کرو مل جائے گی' اماں نے کہا۔

کون کہتے ہیں' اقبال غصے میں بولی۔

عین اس وقت دروازہ بجا۔

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے احمد بشیر کھڑا تھا۔

ہم دونوں



مفتی محمد حسین (والد) (۱۹۵۳ء)؟



احمد بشیر (مانی) (۱۹۴۷ء)

تم ایمن آباد سے آ گئے کیا' میں نے پوچھا۔

ہاں وہ بولا' اس نے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ تھما دیا۔ یہ ملک حبیب نے دیا تھا مجھے کہ تمہیں دے دوں اور کہا تھا' اگر یہ آفر منظور ہو تو کل مجھے اطلاع دے دے۔

آفر۔ میں نے حیرت سے دہرایا۔

ان کے دفتر میں ایک جگہ خالی ہے۔

نوکری ہے کیا' اقبال نے پوچھا۔

ہاں نوکری ہے' وہ بولا۔ ایک ہفت روزہ اخبار میں نوکری ہے

پھر تو کچی ہوئی نا' اقبال نے منہ پھلا کر کہا۔

شکر ہے' اماں گنگنائی' مل تو گئی۔

مانی

احمد بشیر ان دنوں ابھی احمد بشیر نہیں بنا تھا' ابھی وہ بشیر احمد تھا۔ اسے اپنا نام ناپسند تھا اور چونکہ شخصیت میں فنکار کی جھ لگی تھی اس لیے اس نے اپنا نام بشیر رومانی رکھ لیا تھا اور رومانی کے حوالے سے گھر میں سب اسے مانی کہہ کر بلاتے تھے۔

مانی کے آنے سے مجھے حوصلہ ہو گیا۔ وہ میرا واحد ساتھی تھا۔ ۱۹۴۷ء کی ابتدا میں ہم دونوں مانی اور میں فلم کا کام کرنے کے لیے بمبئی چلے گئے تھے۔ بمبئی میں ہم نے کرشن چندر کے وسیع و عریض مکان کوور لاج کے ایک کمرے میں بستر لگائے تھے۔ کرشن چندر نے کوور لاج کو ادب سرائے بنا رکھا تھا۔ وہاں ادیب فن کار آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ رہائش کے لیے جگہ مل جاتی تھی۔ کھانا پینا ان کے اپنے ذمے ہوتا تھا۔

چند ایک ماہ ہم دونوں کوور لاج میں مقیم رہے۔ پھر ہمارے پاس روپیہ ختم ہو گیا۔ اور روپے کا انتظام کرنے کے لیے مجھے لاہور آنا پڑا۔ ابھی میں لاہور پہنچا ہی تھا کہ تقسیم کی وجہ سے راستے بند ہو گئے۔ میرا واپس بمبئی جانا ممکن نہ رہا۔ اس لیے مانی بمبئی میں اکیلا رہ گیا تھا' اکیلا اور بے زر۔

اگرچہ مانی اور میں قریبی دوست تھے' لیکن دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔

میں ایک پٹا ہوا مہرہ تھا' زندگی کی بھیڑ سے گزر چکا تھا اور اب تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا۔ ڈر' خوف' احتیاط کا مارا ہوا وقت کاٹ رہا تھا۔

مانی ابھی زندگی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔

مانی ان دنوں ایک گرین یوتھ تھا۔ وہ بے حد خوب صورت تھا۔ دلیر اس قدر تھا کہ ڈر یا احتیاط سے سرے سے واقف ہی نہیں تھا۔ ان جھک تھا۔ کسی سے دبتا نہ تھا۔ ذاتی مفاد کا اسے کبھی خیال نہ آیا تھا۔ دنیاداری سے قطعی کورا تھا۔

میرے لیے مانی کا ساتھ ایک بہت بڑی نعمت تھی' اس لیے کہ جب بھی میں چاہتا مانی کے بے پناہ جذبے کا دیا رگڑ دیتا۔ جن نمودار ہو جاتا "بول کیا چاہتا ہے۔" پھر جو بھی میں کہتا' مانی سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل شروع کر دیتا۔

لیکن مانی کے لیے میں ایک مسلسل رکاوٹ تھا۔ اسے ہر وقت' ہر بات' پر ٹوکتا رہتا تھا۔ ایسے نہ کرو' ویسے نہ کرو' یوں نہ کرو' ووں نہ کرو۔ دراصل مجھے ٹوکنے کی اور نصیحتیں کرنے میں لذت آنے لگی تھی۔ یوں میں ایک عفریت بن گیا تھا۔

پھر ہم دونوں اکیلے جا بیٹھے۔ میں نے کہا' مانی یہ بتا کہ تو بمبئی سے بچ کر کیسے آ گیا۔ یہ معجزا کیسے ہوا۔

میں خود حیران ہوں' مانی نے کہا کہ کیسے یہاں پہنچ گیا۔ میں تو سیدھا تجھے آ کر ملتا مگر جس گاڑی میں میں آیا تھا۔ وہ لاہور نہیں رکی تھی۔ سیدھی گوجرانوالے چلی گئی تھی۔

کوور لاج

مانی چارپائی کے قریب سٹول پر بیٹھ گیا اور اپنی کہانی سنانے لگا۔ یار تو چلا آیا تو میں وہاں بری طرح سے پٹ گیا۔ نہ جیب میں پیسہ تھا' نہ کوئی ساتھی' نہ مددگار۔ وہ حالت ہوئی میری کہ حد ہو گئی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ بڑا ہی مزا آیا۔

ہم نے کوور لاج کے ہال کمرے میں بوریے ڈال لیے۔ ادھر میرا جی تھا ادھر راج کمار اور مہادیو شنکر اور درمیان میں میں۔ تجھے پتہ ہی ہے کہ وہاں بھانت بھانت کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ تیرے ہوتے ہوئے تو ہم صبح سویرے باہر نکل جاتے تھے اور سارا دن گھومتے پھرتے تھے۔ اکیلا

پروین عاطف (ہمشیرہ احمد بشیر)



اُنس ، ثاقب ، قدرت اللہ شہاب ، تہمینہ مفتی ، نامی

رہ گیا تو میں نے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ کیسے نکلتا باہر۔ جیب میں پیسہ ہوتا تو نکلتا نا۔ مجبوراً" سارا دن وہاں بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ ترقی پسندی کی باتیں کیمونسٹ پارٹی کی باتیں' قیام پاکستان کی باتیں۔

مہندر ناتھ اور وشوامتر عادل تو قیام پاکستان کے حق میں تھے۔ کہتے تھے اگر یہ عوامی مطالبہ ہے تو اسے پورا ہونا چاہیے۔

میراجی کچھ کہتا تھا' ہاتھوں میں گولے گھماتا چپ چاپ بیٹھا رہتا۔

اور کرشن کو تو تم جانتے ہی ہو۔ وہ تو کوور لاج میں یوں بیٹھا رہتا تھا جیسے دیوتا مندر میں بیٹھا ہو۔ کبھی کبھی کسی بات پر ہلکی سی ہنسی ہنس دیتا جیسے بھینٹ قبول کر لی ہو۔

راج کمار

راج کمار بھی کوئی بات نہ کرتا تھا۔ وہ میری ہی عمر کا لڑکا تھا لیکن ایسے لگتا جیسے' وہ بہت سیانا ہو' جیسے اس نے بہت کچھ دیکھا ہو۔ اتنا کچھ کہ وہ اندر سے بوڑھا ہو گیا ہو۔

راج کمار ایک فلم ایکسٹرا تھا۔ اسے کرشن کی پہلی فلم میں ایکسٹرا کا رول ملا تھا اور اب وہ بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ کب کوئی بڑا رول ملے' شہرت حاصل ہو اور فلم میں کیریئر بن جائے۔

راج کمار کو مجھ سے بڑی ہمدردی تھی' گونگی ہمدردی کبھی پیار سے میری طرف دیکھ لیتا' کبھی ہمدردی سے میرا ہاتھ دبا تا۔ اسے علم تھا کہ میری جیب خالی ہے اور مجھے روٹی کھانی ہے اور پھر میراجی کی روٹی بھی میرے ذمے ہے اور میراجی بڑی امید بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھتا رہتا تھا کہ کب میں اشارہ کروں کہ چلو کچھ کھا پی آئیں۔

ایک روز راج کمار مجھے ایک طرف لے گیا' بولا: بھاپے یہ بمبئی ہے یہاں کوئی کسی کو ادھار نہیں دیتا۔ یہ تو یہاں کا اصول ہے بھاپے کہ دوجے سے لینا ہے' دینا نہیں۔ تو یہاں کب تک بیٹھا رہے گا۔ وہ تیرا ساتھی جو روپیہ لینے لاہور گیا ہے' وہ اب نہیں لوٹے گا' نہ ہی وہ کچھ بھیج سکے گا۔ کیسے بھیجے گا' راستے بند ہو چکے ہیں۔ جگہ جگہ فساد ہو رہے ہیں' چھرے چل رہے ہیں۔

ہاں یہ تو ٹھیک ہے' میں نے کہا۔

پھر تو کس امید پر بیٹھا ہے' وہ بولا۔

پتہ نہیں۔

کب تک یہاں فاقے کرے گا تو' اس نے کہا دیکھ میں بہت غریب ہوں۔ اور پیسہ ملنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ کیسے ملے گا' یہاں فلم کا کام رک گیا ہے فلم کے کام میں مسلمان ہی مسلمان ہیں پر اب وہ مسلمانوں سے کام نہیں لیں گے۔ پھر فلم کا کام کیسے چلے گا' پتہ نہیں چلے نہ چلے۔

راج کمار نے جیب سے دس کا نوٹ نکالا' میرے پاس اس وقت صرف یہی ہے' دو چار دن تیری روٹی چل جائے گی۔

میں جھجک کر پیچھے ہٹا تو وہ بولا' نہیں نہیں یہ تو ادھار دے رہا ہوں میں۔ مجھے بھیج دینا جب وطن پہنچے تو۔ اگر میرے پاس پیسہ ہوتا تو میں تجھے کرایہ دے دیتا تاکہ تو ادھر لاہور چلا جاتا۔ اب تو یہاں نہیں رہ سکتا ہے۔ یہاں رہنا اب بہت مشکل ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے زبردستی وہ نوٹ میری جیب میں ڈال دیا۔

میراجی

پیسے ملنے پر میں نے پھر باہر جانا شروع کر دیا۔ صبح سویرے اٹھتا اور منہ دھو کر چل پڑتا۔ میرا جی مجھے تیار ہوتے دیکھ کر' فٹ سے اٹھ بیٹھتا اور میرے ساتھ چل پڑتا۔ وہ بے چارا خود میری طرح تھا' جیب میں پیسہ نہ تھا' کام ملتا نہ تھا' اس نے کبھی کوشش ہی نہ کی تھی کہ کام ملے۔ وہ کام کاج سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس کی کیفیت اس کشتی کی تھی جو بادبان بغیر' چپو بغیر سمندر میں پڑی تھی' نہ کوئی سمت تھی' نہ جدوجہد تھی' نہ آرزو تھی' نہ امید تھی۔ کوور لاج میں آتے جاتے لوگوں کے ساتھ چل پڑتا اور انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر گزارہ کر لیتا۔ لوگوں کو متاثر کرنا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

خیر' مانی نے کہا' تو ہم بے مقصد باہر نکل جاتے' کبھی خواجہ غلام عباس کے گھر جا پہنچتے جو سیوا جی پارک میں رہتا تھا کبھی وشوا متر عادل کے ہاں پہنچ جاتے' کبھی ساحر کے۔ سارا دن آوارہ گردی کرتے۔ شام کو دادر میں سکھوں کے ہوٹل میں تنوری روٹی اور دال کھاتے۔

محمد علی سٹریٹ یعنی جہاں حلال ملتا تھا' مسلمانوں کے علاقے میں تھا۔ وہاں چھرا بازی بہت

زوروں پر تھی۔ فسادات روز بروز شدت اختیار کیے جا رہے تھے۔

ویسے تو چھرا بازی سبھی علاقوں میں ہوتی تھی، لیکن مسلمان محلے خصوصی طور پر توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ کبھی وہاں دھماکے ہوتے، کبھی آگ لگ جاتی اور چھرا تو خیر اعلانیہ چلتا تھا۔

اس کے باوجود میں تو کھانے کے لیے وہاں جانے پر ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ مجھے چھرے کی پرواہ نہ تھی۔ لیکن ساری مصیبت میراجی کی وجہ سے تھی۔ مسلمان علاقے کا نام سن کر اس کے پسینے چھوٹ جاتے تھا۔ ٹانگیں لڑکھڑانے لگتیں۔ پھر مجھے اس پر ترس آ جاتا اور میں اعلان کرتا، "چلو میراجی دادر میں جا کر جھٹکا کھائیں"۔

مانی وقفے کے بعد بولا۔ پھر ایک اور بات ہوئی۔ کرشن کے چند رشتے دار لاہور سے بمبئی آ پہنچے۔

درگا، مہندر

کرشن کی بیوی کوور لاج کی نچلی منزل میں رہتی تھی۔ وہ ایک بڑی پاکیزہ خاتون تھی۔ جسم بھاری تھا، رنگ پیلا تھا، سفید سوتی ساڑھی پہنتی تھی اور چپ چاپ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ کرشن کے ملنے والوں یا آتے جاتے لوگوں سے نہیں ملتی تھی۔ ہر لحاظ سے وہ ایک ماں تھی۔ لیکن کرشن کو وہ اپنا دیوتا سمجھتی تھی اور چپ چاپ اس کی سیوا میں لگی رہتی۔

ساتھ والے کمرے میں درگا رہتی تھی۔ درگا بمبئی کی گھاٹن تھی۔ نہ اس کا کوئی آگا تھا نہ پیچھا۔ بالکل ان پڑھ، بھرا جسم، چھوٹا قد، سانولا رنگ۔ پر بہت تیکھی تھی وہ، معصوم اور تیکھی۔ سوئی کی طرح چبھ جاتی، کرشن کے بھائی مہندر نے اسے گھر ڈال رکھا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی کی طرح رہتے تھے۔

کرشن کی بیوی مجھ پر بڑی مہربان تھی۔ مجھ میں بچپنا ہے نا اور وہ ماں تھی، سکہ بند ماں، درگا بھی مجھ سے جھجکتی نہ تھی، اور مہندر کو تو تو جانتا ہی ہے۔ وہ کرشن کی ضد تھا۔ کرشن دیوتا تھا، مہندر انسان تھا، سر سے پاؤں تک انسان۔ اتنا پیارا آدمی کہ اس پر دم نکلتا تھا، مانی ہنسنے لگا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا، اس نے سلسلہ کلام جاری کیا، کرشن کے گھر کچھ رشتے دار آ گئے۔ یہ لوگ پنجاب سے آئے تھے۔ انہوں نے آ کر وہاں کے حالات بیان کئے تو کوور لاج میں ایک کھچاؤ

کا عالم طاری ہو گیا۔ ان رشتہ داروں میں ایک پندرہ سولہ برس کی لڑکی تھی' وہ سیدھی مانگ نکالتی تھی' سفید دھوتی پہنی تھی اور درگا کے ساتھ باغ میں ٹہلا کرتی تھی۔ باغ میں چیکو کے درخت تھے جو پکے ہوئے پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔

چیکوؤں کے یہ پیڑ مالک مکان کی ملکیت تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے ایک چوکیدار رکھا ہوا تھا۔ ایک دن میں باغ میں جا نکلا دیکھا تو درگا اور سانولی لڑکی للچائی ہوئی نظروں سے' چیکوؤں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں نے درگا سے کہا چوکیدار کو چائے پلانے کے بہانے لے جا۔ واپس آئے گی تو جھولی بھر چیکو لے لینا مجھ سے۔ اس شرارت پر ہم تینوں کا بچپنا فتاک سے باہر نکل آیا۔ سانولی اور درگا ہنس ہنس کر دوہری ہو گئیں۔

پھر یہ ہمارا معمول بن گیا۔ درگا چوکیدار کو کسی بہانے اندر لے جاتی اور میں چیکو توڑ توڑ کر سانولی کی جھولی بھر دیتا اور وہ بچوں کی طرح ہنسے جاتی' ہنسے جاتی۔

مجھے وہ سانولی لڑکی بڑی اچھی لگتی تھی۔ اس میں اتنا بچپنا تھا' اتنا بچپنا تھا جتنا مجھ میں تھا اور پھر اسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ وہ لڑکی ہے۔ حالانکہ وہ سولہویں سال میں قدم رکھ چکی تھی۔

پھر ایک اور بات چل نکلی۔ انہوں نے چیکو کھانے کے لیے مجھے گھر بلانا شروع کر دیا۔ وہاں ہم صحن کے ایک کونے میں بیٹھ جاتے اور چوری چوری کچے پکے چیکو کھاتے اور بے تکی باتیں کرتے اور ہنستے چلے جاتے اور سانولی کی ہنسی سے مسرت کی ایک پھوار نکلتی اور میں بھیگ جاتا۔

سانولی

مجھے سانولی کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ اس کا کھڑا ہونا' ہنسنا اور اپنی خبر ہی نہ ہونا۔ مانی ہنسنے لگا۔

تم تو جانتے ہو' لڑکیاں تو میں نے کئی ایک دیکھی ہیں' ان سے دوستانہ بھی لگایا ہے' ملاقاتیں بھی کیں ہیں' کئی ایک مجھے اچھی بھی لگتی تھیں' مگر وہ اچھا لگنا اور تھا یہ اچھا لگنا اور تھا۔ جب میں اس سے ملتا' تو میرا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ لڑکی کو دیکھتا تو میرے دل میں خواہش ابھرتی۔ لیکن اسے دیکھ کر کبھی خواہش نہیں ابھری تھی۔

بس جی میں آتا میں چیکو توڑ توڑ کر پھینکتا جاؤں۔ اور وہ جھولی بھرتی جائے اور ساتھ ساتھ ہنستی جائے۔

اس کے بعد ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی باتیں سننے سے مجھے دلچسپی نہ رہی۔ وہ باتیں جنہیں میں پہلے بڑے غور سے سنتا تھا' اب بے معنی سی لگنے لگیں۔ اس لیے شام کو میں اکیلا سمندر کے کنارے چلا جاتا' اور وہاں گھنٹوں کھڑا رہتا بیٹھ جاتا' ٹہل لگاتا اور پھر رات کو گھر آ کر چپکے سے لیٹ جاتا۔ پھر دیکھتا کہ میں چیکو کے درخت پر چڑھا ہوا ہوں' چیکو توڑ رہا ہوں اور وہ نیچے جھولی پھیلائے کھڑی ہنس رہی ہے' ہنسے جا رہی ہے۔

میں نے تمہیں خطوں میں یہ ساری باتیں لکھی تھیں۔ میں تمہیں ہر دوسرے دن خط لکھا کرتا تھا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ فسادات کی وجہ سے سب گڑ بڑ ہو گیا ہو گا اور ڈاک وہاں نہیں پہنچ پائے گی۔ اس کے باوجود میں تمہیں باقاعدگی سے خط لکھا کرتا تھا کہ شاید کوئی خط پہنچ ہی جائے۔ دراصل میں وہاں اکیلا تھا نا' دل کی بات کہنے کو جی چاہتا تو خط لکھنے بیٹھ جاتا۔

دس روپے کتنی دیر چلتے بھلا اور پھر میرے ہاتھ میں۔ میں نے کبھی پیسے گنے ہی نہ تھے۔ بس ختم ہو گئے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی چلو اب باہر جانے سے جان چھوٹی۔ چیکو توڑو' جھولی بھرو اور کھاؤ۔

دو دن میں نے چیکوؤں پر گزارہ کیا' لیکن میں بڑا ہی خوش تھا۔ نہ مجھے یاد تھا کہ پیسے نہیں ہیں نہ یہ کہ میں نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔

سانولی کی بات سن کر مجھ میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اب میں مانی کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ سانولی تھی' یہ سانوری تھی' وہ معصوم تھی' یہ بے نیاز تھی' وہ لڑکی تھا' یہ زنانی تھی نمیار زنانی۔

پھر مانی نے اپنی بات شروع کی۔

بے نام بوجھ

پھر حالات بہت ہی خراب ہو گئے۔ مسلمانوں کی حالت بہت ہی نازک ہو گئی۔ بمبئی کے گرد و نواح میں مسلمانوں کے گاؤں پر بھی حملے ہونے لگے۔ مرد کو تہہ تیغ کر دیا جاتا۔ عورتوں سے بد

سلوکی کی جاتی' ایسی کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اخباروں میں یہ خبریں چھپنا بند ہو گئیں۔ لیکن خبر بھی بلیک آؤٹ ہو سکتی ہے کیا۔ اخباروں کے صفحات سے اتر جائیں تو زبان خلق پر چڑھ جاتی ہیں ———— ہزار سال کے بعد ہندوؤں کے ہاتھ حکومت لگی تھی۔ وہ مسلمانوں کے خون سے چراغاں کر کے خوشیاں منا رہے تھے۔

ان خبروں کا کوور لاج پر بھی اثر پڑا' حالانکہ وہاں دانشور رہتے تھے' فن کار رہتے تھے' سب پر ایک بے نام سا بوجھ پڑ گیا' جو روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ غصہ دبا رہے تھے' شرمندگی چھپا رہے تھے۔ ان مسائل پر بحثیں بند ہو گئیں' گفتگو معطل ہو گئی۔

جوں جوں بوجھ بڑھتا جاتا' راج کمار کی توجہ میری طرف منعطف ہوتی جاتی۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کر کوور لاج میں میں اکیلا مسلمان تھا۔ ویسے شاید میرا جی بھی مسلمان ہی تھا' لیکن اسے کوئی مسلمان نہیں گنتا تھا۔ وہ خود بھی خود کو مسلمان نہیں سمجھتا تھا۔

ایک روز راج کمار مجھے چیکو کے باغ میں لے گیا' کہنے لگا' بھاپے یوں کب تک چلے گا۔ ملک کا بٹوارہ ہو چکا ہے اور بھاپے تو یہاں نہیں رہ سکتا۔

ہاں' میں نے سر ہلایا۔

اور تو کب تک چیکو کھا کھا کر گزارہ کرے گا' وہ بولا۔

میں نے بات کرنے کی کوشش کی پر اس نے کاٹ دی۔

مجھے پتہ ہے تو نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا———— دو دن سے میرا جی تیرا منہ تک رہا ہے۔ یہ لے اس نے جیب سے پچاس روپے نکالے اور میری جیب میں ڈالتے ہوئے بولا' یہ قرض ہے بھاپے' میں بہت غریب ہوں' یہ رقم مجھے ضرور بھیج دینا اور ہاں اب یہاں نہ رکنا اگر یہ رقم بھی خرچ ہو گئی تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔

اسی شام میں کرشن سے ملا۔ میں نے کہا میں جا رہا ہوں ایک مہینے تک واپس آ جاؤں گا۔ کوور لاج میں سبھی اس خوش فہمی میں بیٹھے تھے کہ کہ یہ فسادات اور خون ریزیاں زیادہ دیر تک نہیں چلیں گی۔ جلد ہی دونوں ملکوں میں آمدورفت جاری ہو جائے گی۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا' مانی نے کہا میں سوچتا تھا' پندرہ بیس دنوں کی بات ہے' پندرہ بیس دنوں کے بعد میں واپس آ جاؤں گا۔ چیکوؤں کی بہار ختم ہونے سے پہلے' پھر آتے ہی چیکو چرانے کا کام جاری ہو جائے گا۔

درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر میں چیکو توڑوں گا اور سانولی ہنس ہنس کر انہیں اکٹھا کرے گی اور پھر ہم تینوں صحن میں بیٹھ کر کچے پکے چیکو کھایا کریں گے۔

اسی لیے میں نے سانولی' درگا اور جگت ماتا کو خدا حافظ نہ کہا۔ بلکہ چپ چاپ سوٹ کیس اور تھیلا اٹھائے کوور لاج سے باہر نکل گیا۔ دروازے میں پہنچا تو اتفاق سے میں نے مڑ کر دیکھا' سامنے ہال' کمرے کی کھڑکی میں میراجی مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

چھت کی ایک ٹیرس پر سانولی کھڑی تھی۔ اس نے سفید دھوتی پہن رکھی تھی' ٹھوڑی ہاتھوں میں تھامی ہوئی تھی' بال کھلے تھے۔ اسے دیکھ کر میراجی دھک سے رہ گیا۔ اسے کیسے پتہ چل گیا کہ میں جا رہا ہوں' میں نے سوچا۔ پھر میں نے ہاتھ ہلایا۔ اسے تسلی دینے کے لیے یہ پہلا اشارہ تھا جو میں نے سانولی کو کیا تھا۔ اس وقت مجھے شعور نہ تھا کہ یہ آخری اشارہ ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔

گھٹن

کچھ دیر کے بعد مانی نے پھر سے بات شروع کی کہنے لگا۔ ان دنوں ریل گاڑیوں میں وارداتیں عام ہونے لگی تھیں۔ مہا سبھائی اور جن سنگھی مسافر بن کر ڈبے میں بیٹھ جاتے تھے اور پھر مسلمانوں کو چھرا بھونک کر بھاگ لیتے۔ چھرا بھونکنے والی ٹولیاں منظم طور پر سفر کرتی تھیں۔ ایک ٹولی اتر جاتی' تو دوسری سوار ہو جاتی۔

اسی وجہ سے سفر کرنے والے پھونک پھونک کر بات کرتے تھے کہ دوسرے کو پتہ نہ چل جائے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ مسافر ایسے کپڑے پہنتے تھے۔ جن سے کچھ پتہ نہ چلے۔ قمیض اور پتلون محفوظ لباس سمجھا جاتا تھا۔ ڈبے میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھتے تھے۔ خود بات نہیں کرتے تھے' دوسرا کرتا تو جواب نہ دیتے ہر کسی کے دل میں خوف و ہراس تھا۔ ہر کسی کی نگاہ شک بھری ہوتی۔ پوچھنے پر بھی کوئی کسی کو نہ بتاتا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

جب میں بمبئی سنٹرل پہنچا تو مجھے اچھی طرح پتہ تھا کہ ٹکٹ لینا بے کار ہے چونکہ خوف و ہراس کے مارے ٹی ٹیوں نے چیکنگ چھوڑ رکھا تھا۔ انہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ جب میں بکنگ آفس گیا تو کھڑکی خالی تھی۔ بکنگ کلرک نے حیرت سے میرے طرف دیکھا۔ پھر

جب میں نے لاہور کا نام لیا تو اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئیں۔

ڈبے میں داخل ہوا تو وہاں خاصی بھیڑ تھی۔ پچیس مسافروں کے ڈبے میں چالیس آدمی سوار تھے۔ اندر گیا تو سب گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے لاپرواہی سے سیٹی بجانی شروع کر دی۔ کونے میں اپنا سوٹ کیس اور تھیلا رکھا اور خود باہر نکل کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی چل پڑی۔

راستے میں اسٹیشن یوں ویران پڑے تھے جیسے دیو پھر گیا ہو' گاؤں سنسان تھے' کوئی حرکت نظر نہ آتی تھی' کوئی کتا تک نہیں بھونک رہا تھا۔ کوئی جانور بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔

دروازے میں کھڑے کھڑے شام پڑ گئی۔ اندھیرا چھا گیا تو میں اندر چلا گیا۔ جہاں میں نے سوٹ کیس رکھا ہوا تھا اس کے قریب بیٹھے لالہ جی کو میں نے گھور کر دیکھا۔ وہ ڈر کر پیچھے سرک گیا اور میرے لیے جگہ بنا دی۔ بیٹھ کر میں نے مسافروں کا جائزہ لیا' سامنے ایک ڈاڑھی والا مولوی بیٹھا زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ ڈبے میں وہ واحد اعلانیہ مسلمان تھا' ماتھے پر محراب تھی' سیٹ تلے پاندان رکھا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد پانچ نوجوان کھڑے تھے۔ یہ نوجوان مولانا کے ساتھی تھے۔ باقی سب ہندو اور سکھ تھے۔

ڈبے کے دوسرے حصے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مولانا غلط جگہ پر بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے سوچا۔ پھر دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ ہندوستان میں تمدنی تقسیم تو سالہا سال سے رائج ہے۔ دو قومی نظریہ' نظریہ تو نہیں' یہ تو ایک حقیقت ہے۔ پھر جھگڑا کس بات کا۔

میرے ساتھ بیٹھا ہوا لالہ یوپی کا ہندو تھا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھتا' چوری چوری۔ میں دیکھتا تو دوسری طرف دیکھنے لگتا۔

آخر وہ نہ رہ سکا' زیر لب پوچھا کہاں جاؤ گے۔

میں نے بے پرواہی سے چلا کر کہا' لاہور جاؤں گا۔

لاہور ——— سارے مسافر اچک اچک کر حیرت سے میری طرف یوں دیکھنے لگے جیسے انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ ——— یہ کون شخص ہے جو ان دنوں لاہور جا رہا ہے اور پھر بلند آواز میں لاہور جانے کا اعلان کر رہا ہے۔ میرے اس اعلان کا ایسا اثر ہوا جیسے کسی نے ٹھہرے پانی میں پتھر پھینک دیا ہو۔

اور تم کہاں جا رہے ہو۔ میں نے شرارتاً" لالہ سے پوچھا۔

لالہ جی کا رنگ فق ہو گیا' سخت گھبراہٹ طاری ہو گئی' ہم اپنے گھر جا رہے ہیں' وہ بولا۔

کہاں ہے تیرا گھر' میں نے بھرپور پوچھا۔

وہ غصے میں آگیا' تجھے اس سے کیا لینا دینا' وہ مجھے گھورنے لگا۔

چاہے بھاڑ میں جاؤ' میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

ڈبے پر سکوت طاری ہو گیا۔ سارے مسافر گھبرا گئے کہ پتہ نہیں اب کیا ہو گا۔

انہیں پریشان کرنے کے لیے میں لپک کر اٹھ بیٹھا اور کھڑا ہو کر سیٹی بجانے لگا۔

سب مسافروں کی آنکھیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ سب یہ سمجھ رہے تھے کہ ابھی چھرا چمکے گا اور پتہ نہیں کون ڈھیر ہو جائے گا۔

دلّی

ساری رات ' وہ سب چوکنے بیٹھے رہے۔ میں کبھی بیٹھ جاتا' کبھی اٹھ کھڑا ہوتا۔ میری ہر حرکت پر وہ سب چونک پڑتے تھے۔

یونہی رات کٹ گئی۔ پھر دن چڑھا لیکن دن گھٹن کو توڑ نہ سکا۔ یونہی وقت گزرتا گیا لیکن یوں جیسے چیونٹی رینگ رہی ہو۔

اب دلی آنے والی تھی۔ داڑھی والا مسلمان بہت خوش نظر آ رہا تھا وہ اپنا سامان لپیٹنے لگا۔ غالباً" اسے دلی اترنا تھا اور وہ خوش تھا کہ بخیرو عافیت سفر کٹ گیا۔

گاڑی دلی کے پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔

دلی سب کا شہر تھا۔ مسلمان سمجھتے تھے' ہمارا شہر ہے' ہندو سمجھتے تھے' پہلی بار ہمارا شہر ہمارے ہاتھ میں آیا ہے۔

دلی پہنچنے پر سب خوش تھے۔

انہوں نے اپنے بستر ٹوکریاں سوٹ کیس' صندوق سنبھالنے شروع کر دیے تھے۔

گاڑی ابھی رکی نہیں تھی کہ بہت سے لوگ چلتی گاڑی میں اندر گھس آئے۔

پلیٹ فارم پر بڑی بھیڑ تھی۔ مسافروں میں زیادہ تر سکھ تھے۔ ان کے چہرے خشونت بھرے

تھے' نگاہوں میں دھمکی تھی' مونچھیں کچھ زیادہ ہی اکڑی ہوئی تھیں' پہلوؤں میں لمبی لمبی کرپانیں لٹک رہی تھیں۔

وہاں تقریباً" سب مسافروں کو اترنا تھا۔ آگے مشرقی پنجاب تھا' جہاں فسادات ہو رہے تھے۔ وہ علاقہ خطرناک تھا' ادھر جانے کو کوئی تیار نہ تھا۔

دفعتاً" ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ ڈبے میں بھاگڑ پڑ گئی۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ دروازے میں مولوی صاحب ڈھیر ہو رہے تھے۔ ان کا دھڑ نیچے لٹک رہا تھا' ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ نیچے خون کا دھارا بہہ رہا تھا۔

دفعتاً" ایک چھریرے بدن کے نوجوان نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور پلیٹ فارم پر بھاگنے لگا۔

ہٹ جاؤ۔ہٹ جاؤ

پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا۔ میں نے بے سوچے سمجھے اسی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی اور اس نوجوان کے پیچھے بھاگا۔ پکڑو پکڑو میں چلائے جا رہا تھا۔ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھتے اور پیچھے ہٹ کر مجھے راستہ دے دیتے۔

سٹیشن کے دوسرے سرے پر میں نے اسے پکڑ لیا۔ دو ایک گھونسے مارے اور پھر گھسیٹ کر اسے واپس لانے لگا۔

اس کے ہاتھ میں چھرا نہیں تھا' لیکن آستین خون سے بھری ہوئی تھی۔

پھر چند ایک سکھ آ گئے' کیا ہوا' کیا ہوا' انہوں نے پوچھا۔

اس لڑکے نے مولوی صاحب کو قتل کیا ہے' میں نے کہا۔

تو جھگڑا کیا ہے' ایک سکھ نے مونچھ پر تاؤ دے کہا' پولیس کے حوالے کر دو بس۔

پاگل ای اوئے

اتنے میں ایک سکھ پولسیا آ گیا۔

اس نے قتل کیا ہے' میں نے کہا۔

پولیس والے نے لڑکے کا ہاتھ مجھ سے چھڑا کر خود پکڑ لیا۔ کچھ ایسے انداز سے جیسے وہ قاتل کو پکڑنے کی بجائے اس کی رکشا کر رہا ہو۔ چل تھانے' وہ لڑکے کو گھور کر بولا۔ دفعتاً" میں نے محسوس کیا جیسے وہ سب مجھ پر درپردہ ہنس رہے تھے۔ اور اس کا' چل تھانے نے محض ایک ڈرامہ تھا' جو میرے سامنے کھیلا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسے لگا جیسے وہ سب فرزانے تھے اور فرزانوں میں میں واحد دیوانہ تھا۔

پاگل ای اوے' پاگل ای اوے' وہ سب مجھ پر آوازے کس رہے تھے۔ دفعتاً" میرا دل مالش کرنے لگا۔ میں اپنے ڈبے کی طرف بھاگا۔

ارے ———— میری نگاہ ٹرین کے پائیدان پر پڑی وہاں ایک اور مسلمان ڈھیر ہو رہا تھا۔ میں رک گیا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا کوئی اس لاش کی طرف دیکھ ہی نہ رہا تھا۔ ابھی لاش میں حرکت موجود تھی ابھی جان پوری طرح سے نہیں نکلی تھی۔ کسی نے اسے سہارا تک نہ دیا تھا۔ کسی نے اس کے منہ میں پانی تک نہ چوا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ ریل کے ملازم دور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پولیس والے یوں کھڑے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ پھر ایک سپاہی چلانے لگا۔ بھنگی ادھر آ کر صفائی کرو جلدی۔

اس پر میرا ذہن سن ہو کر رہ گیا۔ میں واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ میں پھر سے اپنے ڈبے کی طرف بھاگا۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ بھنگی ایک لاش کو گھسیٹ کر لے جا رہا ہے۔ جس کی وردی پر صلیب کا نشان ٹانکا ہوا تھا' بڑا سا نشان تاکہ لوگ دور سے دیکھ کر سمجھ جائیں کہ وہ عیسائی ہے' مسلمان نہیں۔

میرا دل پھر سے مالش کرنے لگا۔

جب میں اپنے ڈبے کے پاس پہنچا تو مولوی صاحب کی لاش پائیدان سے لڑھک کر پلیٹ فارم پر گری ہوئی تھی' منہ کھلا تھا' بہت سی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

مجھے ایک شدید قے آئی اور سب کھایا پیا نکل کر مولوی صاحب کے خون میں شامل ہو گیا۔

میں نے بڑی مشکل سے دروازے کا ہینڈل پکڑا اور پوری طاقت سے اندر کود گیا' مجھ میں

جان نہیں رہی تھی۔

بے زاری

ڈبے کے اندر پہنچ کر دروازے کے قریب ہی میں دھڑام سے گر گیا اور وہیں لیٹ گیا۔ مانی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا پھر بولا:

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا تھا۔ گردو پیش گھوم رہا تھا۔ لوگ میرے ارد گرد کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگے چھرے تھے۔ آدم بو' آدم بو' وہ سب چلا رہے تھے۔ مجھے ایسے لگتا تھا جیسے وہ سب آدم خور ہوں۔

میرے دل میں ڈر نہیں تھا' خوف نہیں تھا' ایک عجیب سی بے زاری تھی۔ جیسے دفعتاً" میں نے محسوس کیا ہو کہ زندگی جینے کے قابل نہیں رہی' انسانیت کا جنازہ نکل گیا ہو' محبت' اخلاق' ہمدردی سب ختم ہو چکے ہوں۔

زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خود کو زچ محسوس کیا۔ بے بسی کے احساس نے مجھے ادھموا کر دیا تھا' بیکار ہے' سب بے کار ہے۔

میں نے کچھ ایسے محسوس کیا جیسے سب کچھ بے معنی ہو چکا ہو۔ اب جو کچھ گزرنا ہے جان پر گزر جائے' بے شک گزر جائے۔ مجھ میں کوئی امید نہ رہی تھی' تڑپ نہ رہی تھی' نہ ڈر تھا' نہ خوف' نہ جینے کی خواہش تھی۔

پتہ نہیں کتنی دیر میں وہاں بے جان پڑا رہا۔

پھر باہر' کوئی چلا رہا تھا۔

کوئی گواہ ہے' کوئی گواہ ہے۔

کوئی ہے جس نے مولوی صاحب کو قتل ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

کوئی ہے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ چلا کر کہوں' ہاں میں نے دیکھا ہے۔ میں نے اس ہندو نوجوان کو مولوی صاحب کے پیٹ میں چھرا بھونکتے دیکھا ہے۔ میں نے اس نوجوان کو کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اس نوجوان کو پکڑ لیا تھا۔ میں نے اسے پولیس کے سپرد کر دیا

تھا۔ میرے اندر کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ پولیس۔ ہاہاہا۔

کوئی ہے، کوئی ہے۔

باہر سے مسلسل آوازیں آتی رہیں۔

میں چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میرے اندر کوئی کہہ رہا تھا، کیا فائدہ ——————کیا فرق پڑتا ہے۔

کوئی ہے، کوئی ہے۔

پولیس والے کی آواز مدہم پڑتی گئی ——————اور مدہم ——————اور مدہم۔

میرے اندر کی آواز اونچی ہوتی گئی ——————کیا فرق پڑتا ہے اور میں ویسے ہی بے حس، بے جان، پڑا رہا۔

گیارھواں باب

مان سنگھ

چائے پیتے ہوئے' مانی نے ایک جھرجھری لی اور پھر سر اٹھا کر بولا۔

پتہ نہیں میں کتنی دیر گاڑی کے فرش پر بے جان پڑا رہا۔ پھر دفعتاً" گاڑی کو ایک جھٹکا لگا اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا کہ گاڑی مدہم رفتار سے چل رہی ہے۔ باہر پلیٹ فارم پر مبہم سے سائے حرکت کر رہے ہیں۔

کچھ دیر تو مجھے سمجھ میں ہی نہ آیا کہ میں کہاں ہوں اور میرے روبرو وہ سائے سے کیا ہیں۔ اس وقت مجھے قطعی یاد نہ تھا کہ میں بمبئی سے آ رہا ہوں اور مجھے لاہور جانا ہے' اور دلی کے سٹیشن پر خون کی چھپڑیاں دیکھ کر میرا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ معدہ مالش کرنے لگا تھا' سر چکرانے لگا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا تھا۔

ٹاٹا

دراصل میری یہ کیفیت خون اور لاشوں کو دیکھ کر نہیں ہوئی تھی بلکہ لوگوں کی بے حسی کو دیکھ کر' میں نے محسوس کیا تھا جیسے دفعتاً" سب سہارے ٹوٹ گئے ہوں' جن کے زور پر میں جی رہا تھا' انسانیت کے سہارے' جن کی وجہ سے زندگی جینے کے قابل محسوس ہوتی ہے۔

دفعتاً" میں نے محسوس کیا تھا جیسے روشنیاں بجھ گئی ہوں اور گاڑھا ڈراؤنا اندھیرا چاروں طرف سے میری جانب یورش کر رہا تھا۔

اس وقت سب کچھ میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہ رہا تھا۔ جیسے کوئی مریض کسی بڑے اپریشن کے بعد آنکھیں کھولتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ مدھم سائے وضاحت پکڑتے گئے۔

ارے یہ تو دلی کا ہی سٹیشن ہے' ہاں وہ رہا انتڑیوں کا ڈھیر ———— وہ جمعدار ہے۔ لیکن یہ دلی کا سٹیشن کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ وہ دھندلکا چھٹتا گیا' پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ واضح طور پر نظر آنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ سامنے وہی سب انسپکٹر کھڑا ہے۔ انسپکٹر قہقہے مار رہا تھا ———— اور ———— اور اس کے ساتھ وہی چھریرے جسم کا نوجوان کھڑا تھا' جس نے مولوی صاحب کے پیٹ میں چھرا بھونکا تھا' اور پھر کھڑکی سے چھلانگ لگا کر دوڑا تھا اور میں اس کے پیچھے بھاگا تھا' سکھ پولسیا اور وہ لڑکا دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگا رہے تھے۔

دفعتاً" لڑکے کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے پولسیے کی توجہ میری طرف دلائی' انگلی کے اشارے سے' مجھے دیکھ کر دونوں پھر سے ہنسنے لگے اور ساتھ ہی ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے ٹاٹا کرنے لگے ———— میں سو رہا ہوں کہ جاگ رہا ہوں' میں نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پلیٹ فارم پھر سے میری نگاہوں میں دھندلا پڑنے لگا۔ میں نے گھبرا کر منہ موڑ لیا۔

چار نہنگ

اندر ڈبے میں دھندلی روشنی میں لوگ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ سامنے سیٹ پر چار نہنگ سکھ بیٹھے تھے۔ سروں پر نیلی پگڑیاں ان پر تیز دھار چکر'ہاتھ میں اونچے لمبے نیزے' جسم پر لمبے ڈھیلے کرتے' کمر پر پیٹیاں جن سے کرپان لٹک رہے تھے' ٹانگیں ننگی تھیں' کھیرے تھیلوں جیسے' پاؤں ننگے۔

ان کے چہروں پر عجیب قسم کی کرختگی تھی۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں' جیسے نشہ کر رکھا ہو۔ بھوئیں تنی ہوئیں تھیں' گال ابھرے ہوئے تھے' داڑھیاں کس کے بندھی ہوئی تھیں۔

ادھر کی سیٹ پر دو شخص بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ہی ادھیڑ عمر کے تھے۔ ایک پنڈت معلوم ہوتا

- تھا۔ خدوخال خوبصورت تھے' ہونٹ یوں کھلے کھلے تھے۔ جیسے مسکراہٹ دبائے بیٹھا ہو۔ آنکھوں سے خوش مزاجی کی پھوار اڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی شخص چادر میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے منہ پر ٹھاٹھا باندھ ہوا تھا' صرف آنکھیں ننگی تھیں۔ وہ مجھے یوں گھور رہا تھا' جیسے نگاہوں سے تول رہا ہو۔ لیکن اس کی نگاہوں میں خونخواری نہ تھی' نہ ہی ماتھے کی گھوری میں دھمکی تھی' باقی سیٹیں خالی پڑی تھیں۔

بیٹھ جاؤ مہاراج' پنڈت نے مجھے مخاطب ہو کر کہا' بیٹھ جاؤ جی۔

میں نے پنڈت کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

چاروں نہنگ۔ مجھ پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہیں خاصی پریشان کن تھیں۔ اس کے باوجود مجھے خطرے کا احساس نہ تھا۔

تم جانتے ہی ہو' مانی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا' پتہ نہیں مجھے خطرے کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ بس نہیں ہوتا۔ البتہ ان نہنگ سکھوں کی کڑی نگاہوں تلے مجھے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ جب بھی میں گھبرا جاتا تو چادر میں لپٹے ہوئے شخص کی طرف دیکھنے لگتا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی مٹھاس تھی۔

مخولیا کاکا

کچھ دیر کے بعد نہنگوں کی ٹکٹکی سے گھبرا کر میں نے بے سوچے سمجھے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی'

سناؤ سردار جی ایہہ فوجاں کدھر چلیاں نے۔ اس پر وہ اور بھی تن کر بیٹھ گئے۔

تینوں کیہہ' ایک نے تیوری چڑھا کر کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ چادر تلے کوئی ہاتھ دبا رہا ہے۔ میں نے پنڈت کی طرف دیکھا۔ پنڈت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے منع کیا اور ساتھ ہی ہاتھ دبایا۔ میں نے ٹھاٹھا بندھے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دبے دبے قہقہے کی پھوار اڑ رہی تھی۔

تو کدھروں آیا ایں' دوسرے سکھ نے گویا مجھے لٹھ ماری۔

بمبئی توں' میں نے جواب دیا۔

جایں گا کتھے' تیسرے ننگ نے مجھے گھورا۔

عین اس وقت پنڈت نے میری بانہہ پکڑ کر جھٹکا دیا' مگر میں پنڈت کی بات نہ سمجھا۔ اور بے سوچے سمجھے میں نے کہا۔

لہور جاریا آں' سردار جی۔

ڈبے پر گویا کسی نے بم پھینک دیا۔

لاہور؟ ---------- لاہور ---------- ؟ دو ایک دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔ پھر خوفناک بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔

ٹھاٹھا بندھے شخص نے چادر منہ پر لے لی اور وہ گٹھڑی بن کر لڑھک گیا۔ ان مہربان آنکھوں کا سہارا ابھی غروب ہو گیا۔ چند ایک ساعت کے لیے ڈبے پر موت کی سی خاموشی طاری رہی۔

پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ سب پنڈت کی طرف دیکھنے لگے۔ پنڈت دیر تک اپنی ٹانگوں پر ہاتھ مار مار کر ہنستا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' پھر وہ بولا۔ کیوں مخول کرتا ہے کاکا' سردار جی تیرے پتا سے بڑے ہیں۔ آدھی بات کیوں بتاتا ہے انہیں۔

پھر وہ ننگوں سے مخاطب ہو کر بولا' مہاراج یہ لاہوری سیاں گاؤں کا رہنے والا ہے۔ ہمارے دھرم سالہ سے بیس کوس پر ہے اس کا گاؤں۔

اس کی بات سن کر بھی بات سمجھ میں نہ آئی۔ میں اس کی بات کو رد کرنے والا ہی تھا کہ اس نے چادر تلے میرے بازو کو شدید جھٹکا دیا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگا' کیوں کاکا بیس کوس ہی ہے یا کم۔

بڑا مخولیہ کاکا ہے یہ' پنڈت نے کہا۔ یہ جوان اتنا نہیں سمجھتے کہ کون سے مخول کا ہوتا ہے' کون سے نہیں ہوتا۔

ننگوں کے انداز میں کچھ ملائیت آ گئی۔ لیکن بڈھے کے شکوک باقی تھے۔

کیا ناواں اے تیرا' بڈھے نے مجھ سے پوچھا۔

مانی میں نے جواب دیا۔

پنڈت پھر قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا ------ پھر وہی آدھی بات ------ کاکا

صاف کہہ نا کہ نام مان سنگھ ہے' لوگ پیار سے مانی بلاتے ہیں۔

ایک دم چاروں نہنگوں سے گویا مائع اتر گئی۔ یوں جیسے دفعتاً انہوں نے اپنے ذرہ بکتر اتار دیے ہوں۔

ان کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں' آنکھوں سے آہنی کھوپے اتر گئے' جسموں کا تناؤ دور ہو گیا ——— دفعتاً مجھے احساس ہوا ——— خطرے کا احساس ——— شدید خطرے کا احساس ——— میرا دل ڈوب گیا۔

ڈبے کے سارے لوگ میری نگاہوں میں دھندلا گئے۔ نہنگوں کے نیزے میری آنکھوں میں چبھ گئے۔ گھبرا کر میں اٹھ بیٹھا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا' گھٹا ٹوپ اندھیرا' آسمان پر کوئی کوئی تارا ٹمٹا رہا تھا' مطلع گرد آلود تھا۔ اس وقت مجھے موت کا ڈر نہیں تھا' مانی نے کہا' میں مرنا نہیں چاہتا لیکن موت سے ڈرتا بھی نہیں۔ مر جاؤں تو چلو مر گیا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اس وقت بھی مجھے ڈر کا احساس نہ تھا۔ لیکن زندگی پر میرا بھروسہ نہیں رہا تھا۔ انسان پر کوئی امید نہ رہی تھی۔ انسان کا لفظ ہی بے معنی ہو گیا تھا۔ انسان دم توڑ چکا تھا۔ پیچھے ہندو رہ گئے تھے۔ مسلمان رہ گئے تھے۔

جگہ خالی ہے

لیکن یہ پنڈت بھی تو ہے' یہ کیا شے ہے' یہ مجھے بچانے پر کیوں مصر ہے۔ کیوں مجھے مان سنگھ بنائے بیٹھا ہے۔ میرے لاہور کو سکھوں کا ایک گاؤں ظاہر کرنے پر مصر ہے' میں سوچ میں ڈوب گیا۔

دفعتاً باہر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک روشنی سی ابھری۔ ایک نہنگ بولا یہ کیا شے ہے۔ میں نے غور سے دیکھا' پھر چیخوں کی آوازیں سنائی دیں' لوگ بچاؤ بچاؤ پکار رہے تھے۔

جب گاڑی قریب پہنچی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک گاؤں ہے' جس میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی ہے۔ ریل کی پٹڑی کے عین قریب' اس قدر قریب کہ میں نے آگ کی تپش محسوس کی۔ پھر ریل کی پٹڑی کے قریب بہت سی مشعلیں لہرانے لگیں۔ وہ مشعلیں دوڑ رہی تھیں' دوڑ رہی تھیں اور ساتھ قہقہے مار رہی تھیں۔

پھر گاڑی روکو' گاڑی روکو' آوازیں سنائی دیں' گارڈ کی بوگی سے سرخ بتی جھول رہی تھی۔ گاڑی آہستہ ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آوازیں بلند ہو گئیں۔ گاڑی رکتے ہی' پٹڑی پر کھڑے لوگ ڈبوں میں داخل ہونے لگے۔

چار پانچ نوجوان لڑکے ہمارے ڈبے میں گھس آئے۔ جگہ ہے مہاراج' ایک نے نہنگوں سے پوچھا۔ نہیں' مہاراج پنڈت بولا' یہاں کوئی جگہ نہیں۔ میں سخت حیران تھا' سارا ڈبہ خالی پڑا ہے اور یہ کہہ رہا ہے جگہ نہیں ہے۔

نہیں نہیں مہاراج' میں نے چلا کر کہا' آجاؤ آجاؤ بڑی جگہ ہے۔ میری بات سن کر وہ رک گئے اور تشویش بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

پنڈت کا قہقہہ گونجا۔ بولا۔ مان سیاں تو مخول کرنے کے بغیر نہیں رہے گا کیا۔کاکا اپنوں سے مخول نہیں کیا کرتے۔

نہنگ ہنسنے لگے۔ کر لینے دو اسے مخول' بڈھا بولا' مخول اپنوں سے ہی کرتے ہیں دشمنوں سے نہیں۔ نوواردوں نے قہقہہ لگایا' بلے اوے مان سیاں اور پھر ایک ایک کر کے گاڑی سے اتر گئے۔ میں سوچ میں پڑ گیا' مائی نے کہا' یااللہ سارا ڈبہ خالی پڑا ہے اور انہوں نے کہہ دیا ہے کہ جگہ نہیں ہے پھر وہ آنے والے بھی تو اندھے نہ تھے۔ انہوں نے خود دیکھا تھا کہ ڈبہ خالی پڑا ہے' لیکن وہ یوں اتر گئے' جیسے واقعی ڈبے میں جگہ نہ ہو۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ گھبرا کر میں پھر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

گاڑی سے کچھ آوازیں سی آ رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسی آوازیں ہیں۔

پھر کسی نے چلتی گاڑی سے کوئی بھاری سی چیز باہر پھینک دی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ دیکھوں کیا چیز گری ہے' لیکن اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر ایک اور گٹھڑی باہر گری۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک اور۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کھڑکی سے باہر لٹک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دفعتاً" میرے منہ پر پانی کا ایک چھینٹا سا پڑا میں نے منہ اندر کر لیا۔

مان سنگھ آنکھ میں کوئلہ پڑ گیا ہے' پنڈت نے پوچھا۔ میں نے پنڈت کی طرف منہ موڑا۔ سارا ڈبہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

نردوش، نرمل

جا منہ دھو، مان سیاں، پنڈت نے کہا۔ میں نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ میرا ہاتھ خون آلود تھا۔ وہ پانی نہ تھا۔ بلکہ تازہ خون تھا۔

میرا دل مالش کرنے لگا اور میں غسل خانے کی طرف بھاگا۔

ابھی میں منہ دھو رہا تھا کہ پیچھے سے دروازہ کھلا۔ پنڈت کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ کیوں مہاراج! میں نے با آواز بلند کچھ کہنا چاہا، لیکن پنڈت نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

پنڈت کا منہ زرد ہو رہا تھا، چہرہ فکر آلود تھا۔ تو نے اپنے گھر جیتے جی پہنچنا ہے یا نہیں، وہ مدہم آواز میں بولا ——————— تیرا دماغ چلا ہوا تو نہیں کاکا۔

میں نے کچھ کہنا چاہا۔ چپ وہ بولا، ننگوں نے سن لیا تو تیری لاش ریل سے باہر پٹڑی پر پڑی ہو گی۔ اس وقت مجھے سمجھ میں آیا کہ ریل سے بھاری چیزیں جو نیچے پٹڑی پر پھینکی جا رہی تھیں لاشیں تھیں۔

کاکا ان دنوں ادھر پنجاب میں سفر کرنا جان ہتھیلی پر رکھنا ہے۔ میں تو انبالے اتر جاؤں گا۔ تیرا کیا بنے گا۔

میں نے پوچھا، پنڈت جی ایک بات بتاؤ گے، تم مجھے کیوں بچا رہے ہو۔ کیوں میری سہائتہ کر رہے ہو۔

وہ مسکرا پڑا، پتہ نہیں کاکا، تو اتنا نرمل اور نردوش دکھتا ہے، اتنا بھولا بھالا سیدھا۔

میں بھولا بھالا نہیں ہوں پنڈت جی، بڑا چالاک ہوں، میں نے کہا۔

پنڈت مسکرایا، پتہ نہیں تو کیا ہے کاکا، پر تو نردوش دکھتا ضرور ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ تجھے کچھ ہو جائے۔ اب انبالہ آنے والا ہے، میں اتر جاؤں گا تو دھیان سے رہنا۔ اپنے آپ کو مان سنگھ بتانا۔ یہ نہ بتانا کہ تو لاہور جائے گا اور یہ پتلون اتار دے، کوئی کرتا پاجامہ پہن لے۔ انبالے سے آگے بڑی سخت جگہیں آئیں گیں، سنا تو نے۔

یہ کہہ کر پنڈت غسل خانے سے باہر نکل آیا۔

میں نے پنڈت کو آواز دی، مہاراج میرا تھیلا پکڑا دینا۔ تھیلے سے میں نے کھدر کا جو گیا

پاجامہ کرتا نکالا اور اسے پہن لیا اور اوپر ایک چادر لپیٹ لی۔

جب میں غسل خانے سے باہر نکلا تو گاڑی انبالے کے سٹیشن پر رکی ہوئی تھی' اور پنڈت جی گاڑی سے اتر رہے تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گاڑی سے اتر گیا۔

ٹھاٹھے والا

اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ چند ایک بابو سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ گیٹ پر ٹکٹ لینے کے لیے کوئی نہ تھا جا کاکا' پنڈت نے کہا' بھگوان تیری رکشا کرے اور دیکھ اب تو ڈبہ نہ بدلنا۔ یہیں بیٹھے رہنا اور وہ جو ٹھاٹھا باندے ہوئے ہے نا۔

ہاں ہاں جو آپ کے پیچھے بیٹھا تھا' وہی نا میں نے کہا۔

ہاں اس سے خبردار رہنا' پنڈت بولا۔

نہنگ ہے وہ' میں نے پوچھا

پتہ نہیں کیا ہے۔ اس کا بھید سمجھ میں نہیں آیا۔ پنڈت نے دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے پرنام کیا اور باہر چلا گیا اور میں اپنے ڈبے کی طرف چل پڑا۔

ایک نوجوان لڑکا بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔

اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولا' اگلے ڈبوں کی جگہیں تو ہم صاف کر چکے ہیں۔ پچھلے ڈبوں میں ابھی جگہیں باقی ہیں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔

دفعتاً" مجھے سمجھ آیا کہ جگہ ہے کیا؟ کا کیا مطلب ہے کہ چھرا بھونکنے کو کوئی ہے۔

ہاں ہاں' میں نے اسے کہا ہم سب دیکھ لیں گے' مہاراج۔

تم یہاں سے چڑھے ہو نا اس نے پوچھا۔

ہاں ہاں یہاں سے' میں نے کہا۔

کتنے ہو۔

چھ ہیں' میں نے کہا۔

جالندھر تک ڈیوٹی ہے نا' اس نے پوچھا۔

ہاں میں نے کہا' جالندھر تک۔

پھراس نے منہ میرے کان کے قریب کر کے' گارڈ اور ڈرائیور دونوں' بھولنا نہیں' یہ کہہ کر وہ تیزی سے چل پڑا۔

اچھا تو میں ڈیوٹی پر ہوں' میں نے سوچا یہ سب اعجاز کھدر کے جوگیا سوٹ کا ہے۔ پنڈت مجھے نہ بتاتا تو اب بھی میں پتلون پہنے ہوتا اور لوگ مجھے شک کی نظروں سے دیکھتے۔

جب میں ڈبے میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو نہنگ اوپر کے تختوں پر لیٹ گئے ہیں اور دو نچلی سیٹ پر لیٹے خراٹے لے رہے ہیں۔

ٹھاٹھے والا جو پہلے گٹھڑی بنا ہوا تھا۔ میری سیٹ پر دراز تھا۔ اس کا سر میری جانب تھا۔ میں اس کے قریب تھوڑی سی جگہ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ پھر شاید مجھے اونگھ آ گئی۔

دفعتاً" گاڑی کا زبردست جھٹکا لگا اور میں ٹھاٹھے والے پر جا گرا۔ اس کے بازوؤں نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ نہنگ جاگ اٹھے "کی ہویا اے" ایک نے پوچھا۔ میں پتہ لاناایں' کہہ کر دوسرا گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

ایہہ دونوں سوں گئے نے' بڈھا نہنگ بولا۔

کون سوں گئے' اوپر سے نہنگ نے پوچھا۔

کچھ دیر تو میں ہرنامے کی گرفت میں پڑا رہا اتنے میں وہ نہنگ واپس آگیا اور آتے ہی بولا' کوئی گل نہیں سردار جی' اپنے ارمان نال سوں جاؤ۔

گڈی دی لین وچ کسی نے درخت کٹ کے سٹ دتا سی' ایسی لئی گڈی جھٹکا کھا کر رک گئی۔ فیر پتہ نہیں کسے نے ڈرائیور تے گارڈ دوناں نوں قتل کر دتا۔

ملیچھ سن' بڈھے نے پوچھا۔

ہاں' وہ بولا' دونوں۔

گڈی کیویں اگے چلے گی' ڈرائیور جو نہ ہویا' بڈھے نے پوچھا۔

کنے بے وقوف نے اے کاکے' بڈھا نہنگ بولا۔ گارڈ تے ٹھیک ہے پر ڈرائیور نہ ہویا تے گڈی کون چلاؤ۔

ہے اناں کول آدمی۔

بھلا بھلا۔ فیر ٹھیک ہے' بڈھا بولا۔

یہ سن کر میں نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن ہرنامے نے مجھے بھینچ لیا۔ اس کی گرفت بڑی تگڑی تھی۔ میں بے بس ہو کر پڑ گیا۔

گاڑی چل پڑی۔ نہنگ پھر اپنی اپنی جگہ لیٹ گئے۔

ماں کی گود

دفعتاً" میں نے محسوس کیا کہ میری پیٹھ پر نرم نرم اور گرم چیز لپٹی ہوئی ہے۔ پہلے تو میں سوچتا رہا یہ ملائم ملائم گرم گرم کیا ہے۔ پھر جرأت کر کے میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹٹولا ——— ارے میں تو ہکا بکا رہ گیا' وہ تو عورت کا جسم تھا۔

مانی خاموش ہو گیا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیا کہا وہ ٹھاٹھے والا عورت تھی' میں نے مانی سے پوچھا۔

یار میں تو حیران رہ گیا' مانی نے کہا۔

وہ ہرناما نہیں تھا' ہرناموں تھی۔ ہرناموں نے میرا ہاتھ اپنے جسم سے ہٹا دیا۔ پھر مدہم آواز میں بولی۔ چپ کر کے پیارہ۔ میں تینوں سیٹ توں تلے اترن نہیں دیاں گی' سنیا ای' اس کی آواز ماتا بھری تھی۔ اڑیا' وہ بولی جے توں ایسے طرح نسدا ۔بھدا ریا تے ایہ تیرے ڈھڈ وچ چھرا بھونک دین گے۔ اپنی جوانی تے ترس کر' اڑیا' توں تے بالکل ای کچا ایں۔

اس کی بات سن کر' جوان عورت کا وہ گرم جسم' پتہ نہیں کیسے ماں کی ٹھنڈی گودی بن گیا۔ میری جھجک دور ہو گئی اور میں ہرناموں سے چمٹ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے مجھے تھپکنا شروع کر دیا۔

تو کہاں جائے گی' میں نے پوچھا۔

ہولی بول' وہ بولی——— میں ماجھے دی آں۔ پنڈ جانی آں پئی۔ امبر تسر توڑی تیرے نال ایں ——— دیکھ اڑیا' وہ کچھ وقفے سے بولی' تو میرے نال پنڈ چل' میرے کول رہو' جدو رولا گولا مک جاوے گا' تے میں آپ جا کے تینوں چھڈ آواں گی۔ میرا آکھا من اڑیا۔ میں تینوں سینے نال لا کے رکھاں گی۔ کسے دی مجال نہیں کہ ہرناموں دے مان سیاں ول اکھ چک کے تکے۔ دس اڑیا میرے نال چلیں گا۔

میں نے اپنے ہاتھ پر دباؤ محسوس کیا۔ پتہ نہیں اس ہاتھ کے دباؤ اور اڑیا میں کیا تھا۔ دفعتاً میں کی ٹھنڈی گود سے ناری ابھری اور اس نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر دو تپتے ہونٹ آگے بڑھے' میری طرف عین اس وقت ساتھ والے ڈبے سے ایک چیخ کی آواز آئی۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اور تختے پر لیٹے ہوئے ننگ نے نیچے چھلانگ ماری۔

ٹھہر جاناں سیاں میں دیکھنا واں جاکے' اس نے لپک کر اپنا تھیلا اٹھایا اور ساتھ والے ڈبے میں جا داخل ہوا۔

ہرناموں نے اٹھ کر میری کلائی پکڑ لی۔ ساتھ والے ڈبے سے ننگ نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور وہ تینوں اپنے اپنے نیزے اٹھا کر ادھر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں اور ہرناموں اکیلے رہ گئے۔ ہرناموں نے اپنا ٹھاٹھا اتار دیا' چادر سرکا دی اور پھر بھرپور نگاہ سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

وہ ایک اونچی لمبی' جٹی تھی۔ جس کا انداز مردانہ تھا۔ بڑے بڑے ہاتھ' مضبوط باہیں' گٹھا ہوا جسم اور ستا ہوا چہرہ صرف آنکھیں نسایت سے بھیگی ہوئی تھیں۔

بول' اس نے میرے بازو کو جھٹکا دیا' چلیں گا میرے نال بھیڑیا چار دن ساڈے نال وی رہ لے۔ دس کی کہنا ایں بول وے' میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے میرے تیور بھانپ کر اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ کہنے لگی۔

اڑیا نہ نہ کریں۔ سوچ لے حالے تے امبر سر دور اے۔ یہ کہہ کر اس نے میرے سر کو جھٹکا دے کر مجھے سیٹ پر لٹا دیا۔ ہاں' وہ بولی امبر سر تک تے تو میرے نال ایں نا۔ اس نے مجھے بھینچ کر ساتھ لٹا لیا۔ میں نے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی۔

نہ اڑیا' میرے نال لڑ' تے نہ۔ چار گھڑی دا میل اے فیر پتہ نہیں ملنا وی اے کہ نہیں ———— پر اڑیا' تو ملیا وی تے کیہڑے ویلے۔

اس کے انداز میں اتنی منت تھی' اتنی مانگ تھی' اتنی محبت تھی کہ میں چپ چاپ اس کے ساتھ لیٹ گیا۔

جب ننگ واپس آئے تو میں نے چادر میں لپٹے لپٹے پوچھا۔

سردار جی کیا ہوا تھا ادھر۔

ننگ بولا! کچھ بھی نہیں کاکا' گڈی دے باہروں لوکی پتھر مار دے نے۔ اک پتھر شیشہ توڑ کے آیا تے منڈے دے سر تے لگیا۔ آپاں نے پٹی بن دتی اے۔

تسی وی تانکیاں تے تختے چڑھا لوو۔ باہروں پتھر بازی ہوندی اے پئی۔

جوان ننگ کھڑکیوں کے تختے چڑھا کر پھر سے اوپر تختوں پر چڑھ گئے اور ڈبے پر خاموشی چھا گئی۔

گھی کے نوالے

ہرناموں اٹھ بیٹھی اس نے ایک ہاتھ سے میری کلائی پکڑے رکھی دوسرے ہاتھ سے کونے میں رکھا ہوا تھیلا اٹھایا۔ اس میں سے ایک پوٹلی نکالی اور پھر سے لیٹ گئی۔

پھر جو میں نے دیکھا تو وہ میرے منہ میں کچھ ڈال رہی تھی۔ وہ ایک نوالہ تھا۔ گھی میں تلے ہوئے پراٹھے میں مولیاں بھری ہوئی تھیں۔

بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ارادہ تھا کہ دلی کے سٹیشن پر کھا پی لوں گا۔ لیکن دلی کے سٹیشن پر تو میرے حواس باختہ ہو گئے تھے اور اس کے بعد کے واقعات سے میرا ذہن گڈمڈ ہو چکا تھا' کھانے پینے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

ہرناموں نے نوالہ منہ میں ڈالا تو دفعتاً" میری بھوک جاگ اٹھی۔ میں نے کہا' مجھے دے دے پراٹھا۔

وہ ہنسی' بولی اونہوں' دواں گی نہیں' کھوانواں گی۔ لے کھا۔ اس نے میرے منہ میں ایک اور نوالہ ٹھونس دیا۔

مجھے یوں کھاتے ہوئے دیکھ کر' وہ ہنسنے لگی' وے صبر کر لینجا' ہابڑا پیا ہویا ای۔

دیر تک وہ میرے منہ میں نوالے ڈالتی رہی اور میں کھاتا گیا' کھاتا گیا۔

ننگ خراٹے لے رہے تھے۔ ہرناموں ہنس رہی تھی اور میں چبڑ چبڑ پراٹھے کے نوالے کھا رہا تھا۔ اس وقت مجھے یاد ہی نہ رہا تھا کہ میں اپنی جان بچانے کے لئے مان سیاں بنا ہوا ہوں اور وہ گاڑی مسلمانوں کے خون سے لت پت ہو رہی ہے اور ہندو غنڈے ہر ڈبے میں جھانک جھانک کر پوچھ رہے ہیں۔ جگہ ہے مہاراج؟

ہرناموں نے میری جنس کو بیدار نہ کیا تھا۔ الٹا میں ڈرتا تھا' کہیں وہ کوئی مطالبہ نہ کر دے۔ کہیں پھر سے جلتے ہوئے دو ہونٹ میرا منہ ٹٹولنا شروع نہ کر دیں۔

سب سے بڑی بات تو ہرناموں کی محبت تھی۔ زندگی بھر کسی نے اتنی محبت سے میرے منہ میں نوالے نہیں ڈالے تھے۔ میری اپنی ماں نے کبھی مجھے اتنی محبت سے نہیں کھلایا تھا۔

اور پھر اس کا مجھے' اڑیا' کہنا اس قدر بھرپور نظروں اور بھیگی بھیگی نگاہوں سے میری طرف دیکھنا۔

صرف یہی نہیں' مانی نے مسکراتے ہوئے کہا' تجھے پتہ ہے میں اڈونچر کا مارا ہوا ہوں۔ ہرناموں میرے لیے ایک پُر اسرار اڈونچر تھی۔ وہ ایک پُر اسرار عورت تھی جو فسادات میں اکیلی سفر کر رہی تھی' اتنی دلیر تھی کہ صورت حال سے ذرا خائف نہ تھی' ٹھاٹھا باندھ کر ڈاکو کے روپ میں سفر کر رہی تھی اور چادر کی اوٹ میں ایک مسلمان لڑکے سے عشق لڑا رہی تھی۔ اسے مولیوں والے پراٹھے کے نوالے کھلا رہی تھی۔ مانی ہنسنے لگا۔

وہ ایک عجیب سچوایشن تھی' مانی نے چلا کر کہا' باہر خون ہی خون تھا' لاشیں ہی لاشیں تھیں' کچا گوشت تھا اور چادر کے اندر ایک ماجھے کی سکھنی مسلمان سے عشق لڑا رہی تھی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ وہ یونہی میرے منہ میں پراٹھے کے نوالے ڈالتی رہے' ڈالتی رہے اور ساتھ مجھے بے تحاشا کھاتے دیکھ کر ہنستی رہے۔ میرا مذاق اڑاتی رہے۔ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے میرا سر سہلاتی رہے' حتیٰ کہ امرتسر آ جائے۔ بلکہ امرتسر کبھی آئے ہی نہیں' یا آ بھی جائے تو گاڑی چلتی رہے۔ امرتسر نکل جائے' لاہور نکل جائے۔ ہندوستان نکل جائے' پاکستان نکل جائے' پھر نہ ہندو رہے' نہ مسلمان رہے' کچھ بھی نہ رہے' صرف اس چادر کا آسمان ہو جو ہم دونوں نے اوپر تان رکھی تھی اور اس آسمان تلے' وہ ہو اور میں ہوں' اور گھی کے وہ نوالے میرے منہ میں ڈالتی رہے' ڈالتی رہے۔

وے۔ اڑیا

اب خواب نہ دیکھو' میں نے مانی سے کہا' یہ بتاؤ کہ پھر کیا ہوا۔

مانی ہنسا' بولا دو دن کا بھوکا تھا۔

اتنا کھایا اتنا کھایا کہ غنودگی طاری ہو گئی' اندر پراٹھوں کی گرمی' باہر ہرناموں کی گرمی۔ بس آنکھ لگ گئی۔

پتہ نہیں کتنی دیر سوتا رہا۔

پھر گاڑی کو ایک جھٹکا لگا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے باتھ روم جانے کی حاجت محسوس کی۔ لپک کر باتھ روم میں جا داخل ہوا۔ اس وقت ہرناموں سو رہی تھی۔

پھر دفعتاً" شور سنائی دیا' امرتسر آ گیا' امرتسر آ گیا۔

نہنگ جاگ اٹھے' چلو چلو وہ چلانے لگے' ہرنام سیاں' اٹھ امبر سر آ گیا۔ وہ سب اپنا اپنا سامان اٹھا کر گاڑی سے اترنے لگے۔

مان سیاں' مان سیاں'

ہرناموں مجھے آوازیں دے رہی تھی۔

مان سیاں' کتھے چلا گیا ایں اڑیا۔ پھر وہ باتھ روم کی طرف آئی۔ میں اٹھ کر دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔

مان سیاں' اس نے آوازیں دیں۔ اینہے وی نہیں' کتھے چلا گیا ایں اڑیا' پھر وہ چلی گی۔

پھر باہر پلیٹ فارم سے اس کی آوازیں آتی رہیں' آتی رہیں۔ مان سیاں' کتھے چلا گیا ایں۔ مان سیاں۔

دیر تک اس کی آوازیں آتی رہیں۔

"تو ڈرتا تھا کیا" میں نے پوچھا' جو باتھ روم سے باہر نہ نکلا۔

ہاں ڈرتا تھا' مائی نے جواب دیا' ہرناموں سے نہیں' خود سے ڈرتا تھا کہ کہیں ہرناموں کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گاؤں نہ چلا جاؤں۔

مائی نے میری جانب عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ کہنے لگا' تو یقین نہیں کرے گا' ممتاز' اب بھی میں اکیلے میں ہرناموں کی آوازیں سنتا ہوں۔

مان سیاں' مان سیاں۔

وے بھیڑیا' کتھے چلا گیا ایں۔

"اس کی محبت نے مجھے حلال کر دیا ممتاز۔"

"سکھ تو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہو رہے تھے۔" مانی نے کہا "ہندو انہیں استعمال کر رہا تھا۔ اس لیے وہ بپھرے ہوئے تھے سکھ جینا جانتے ہیں ممتاز' وہ پیٹ بھر کر کھاتے ہیں' پیٹ بھر کر پیتے ہیں۔ پیٹ بھر کر دشمنی کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ پیٹ بھر کر پیار کرتے ہیں۔ خون بہانے پر آئیں تو ہولی مچا دیتے ہیں' رکشا کرنے پر آئیں تو سینے سے لگا لیتے ہیں۔ ہاں وہ جینا جانتے ہیں"۔ یہ کہہ کر مانی خاموش ہو گیا۔

ہم دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

"پھر تم ان کے ساتھ گاؤں کیوں نہ گئے" میں نے پوچھا۔

"بس نہیں گیا' پتہ نہیں کیوں نہ گیا" مانی نے آہ بھری۔

"پھر ہوا کیا" میں چلایا۔

پھر ہرناموں کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں' حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔

میں باتھ روم سے باہر نکلا تو ڈبہ خالی پڑا تھا۔ ساتھ والا ڈبہ بھی خالی تھا' ہماری ساری بوگی خالی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے ہرناموں کے جانے کے بعد ساری زندگی خالی ہو گئی ہو۔

"لیکن وہ سب گاڑی سے اتر کیوں گئے تھے" میں نے پوچھا۔

"اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی' مانی نے جواب دیا' لیکن اگلے سٹیشن پر بھید کھل گیا۔ وہاں مجھے پتہ چل گیا کہ فرنٹیر فورس کے پٹھان سپاہیوں نے گاڑی کو اپنے چارج میں لے لیا تھا۔ اگلے سٹیشن پر سینکڑوں کٹے پھٹے لٹے پٹے مسلمان مہاجرین کی بھیڑ گاڑی میں آ داخل ہوئی حتیٰ کہ ہمارے ڈبے میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔

"چاہیئے تو یہ تھا کہ فرنٹیر فورس اور مسلمان مہاجرین کو دیکھ کر مجھے تسلی ہو جاتی ——— مانی نے کہا' لیکن الٹا مجھے تو دکھ سا لگ گیا تھا۔ مجھے وہ بھیڑ بری لگنے لگی تھی۔ جی چاہتا تھا کسی کونے میں پڑ کر اس بھیڑ سے خود کو محفوظ کر لوں۔

پھر دفعتاً" میں نے دیکھا کہ میرے کندھوں سے ایک چادر لٹک رہی ہے۔ ارے یہ چادر کہاں سے آئی۔ اس چادر سے خوشبو کا ایک ریلا آیا' ہائیں' میں حیران رہ گیا۔ ہرناموں کی خشبو میرے ارد گرد منڈلانے لگی۔ میں نے بڑھ کر تختے پر بیٹھے ہوئے مہاجرین کو ڈانٹا' ہٹ جاؤ ادھر

سے۔وہ سر لٹکائے ہوئے ڈر کر نیچے اتر آئے اور میں تختے پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ چادر سے اپنا منہ سر ڈھانپ لیا۔ ہرناموں کی خشبو نے چاروں طرف سے مجھے آگھیرا۔ ایک ہاتھ بڑھ کر مجھے تھپکنے لگا دوسری بانہہ نے مجھے کلاوے میں لے لیا۔

پھر مجھے پتہ نہیں کب اٹاری آیا' کب لاہور آیا جب میں جاگا تو گاڑی گوجرانوالے کے سٹیشن پر کھڑی تھی۔

بارھواں باب

لِزّا ، اوشا ، ہرناموں

ہرناموں کی بات کرتے کرتے، دفعتاً" مانی اٹھ بیٹھا "ذرا ٹھہرو" وہ بولا "میں ذرا باتھ روم سے ہو آؤں۔"

ہرناموں کی بات نے مانی کے دل میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔ بیتے ہوئے دنوں کی یاد پھر سے تازہ ہو گئی تھی مانی کی ہرناموں نے میرے ذہن میں چنگاری لگا دی تھی۔ ٹھنڈی راکھ سے پھر سے دھواں نکلنے لگا۔

دوجٹیاں

میں نے محسوس کیا جیسے چادر میں لپٹا پڑا ہوں اور کوئی نامعلوم ہاتھ میرے منہ میں گھی کے نوالے ڈال رہا ہے۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ ہرناموں مجھے اپنے گاؤں لے جائے، اپنے گھر میں رکھ لے۔

دفعتاً" دیوار پر چتری آ کھڑی ہوئی، دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے تھے، سینہ ابھرا ہوا تھا، آنکھوں سے گویا شعلے نکل رہے تھے۔

"تو کون ہوتی ہے، اسے نوالے کھلانے والی" وہ ہرناموں سے مخاطب ہو کر بولی۔

"یہ تو میرا مان سنگھ ہے" ہرناموں نے جواب دیا۔

"تیرا مان سنگھ نہیں" چتری نے ہونٹ نکالے۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ جی چاہتا تھا کہ چتری پھر سے کہے' یہ میرا مان سنگھ ہے' کہتی رہے' ہرناموں چادر اتار کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ اس کا منہ تمسخر سے لال ہو گیا۔ تو اُس نے میری طرف ناک چڑھا کر دیکھا" تو کون ہے"۔ پھر وہ چتری سے مخاطب ہوئی۔ "کیا یہ ہے تیرا مان سنگھ ؟ ——— یہ ؟" اس کے انداز میں بلا کی تحقیر تھی۔ میں بڑی امید سے چتری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صرف ایک بار کہہ دے' صرف ایک بار "ہاں یہ میرا مان سنگھ ہے۔"

پتہ نہیں کیوں ہمیشہ سے میری خواہش تھی کہ کوئی ٹیار مجھے اپنا لے' کہے۔ "یہ میرا ہے۔" ان دنوں مجھے شعور نہ تھا کہ یہ ایک نسائی خواہش ہے۔ مجھے علم نہ تھا کہ عورت یہ چاہتی ہے کہ کوئی مرد اسے اپنا لے۔ اسے کہے" تو میری ہے۔"

"جنڑے" اور مجھ میں صرف یہی فرق تھا۔ مانی بھی "جنڑا" نہیں تھا۔ اپنی بے نیازی اور بے پرواہی کے باوجود وہ بھی ایک کھلنڈرا بچہ تھا۔ اسے بھی صرف ماں کی گود میسر آ سکتی تھی' زنانی کی نہیں۔

مانی ایک خوبصورت نوجوان تھا' اتنا خوبصورت کہ اسے دیکھ کر دم نکلتا تھا۔ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ اسے عورتوں یا لڑکیوں سے دلچسپی نہ تھی' تھی بھی تو سرسری۔ مانی کو صرف ایک شوق تھا۔ مہم جوئی کا شوق' ایڈونچر کا شوق۔ لڑکیوں کو تاکنے یا ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے اسے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ ہاں اگر اس میں ایڈونچر کا عنصر شامل ہو جاتا تو وہ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر میدان میں کود پڑتا۔

بی اے کرنے کے بعد پہلی نوکری جو مانی کو ملی تھی ایک بوڑھے انگریز کرنیل کے یونٹ میں تفریحی ٹیم کے انچارج کی تھی۔ اس کے عہدے کا نام پوسٹ تھا۔

انٹرویو

دراصل مانی اس سویلین نوکری کا امیدوار نہ تھا۔ وہ تو باقاعدہ فوجی نوکری کے لیے انٹرویو میں حاضر ہوا تھا۔ بدقسمتی سے انٹرویو سے پہلے ہی بوڑھے کرنیل کی دونوں جوان بیٹیوں کے ہتھے

چڑھ گیا۔

"مس" اس نے اپنی طبعی بے نیازی سے پوچھا "آپ کو پتہ ہے یہاں آج انٹرویو ہو رہا ہے۔"

"یس" بڑی لڑکی بولی، "ہو رہا ہے۔"

"کہاں ہو گا' مس۔"

"یہیں ہو گا۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"یہ تو رہائشی کوٹھی نظر آتی ہے۔"

"ہوں۔ ہے۔"

"کس کی کوٹھی ہے یہ۔"

"یہ کرنل صاحب کی کوٹھی ہے۔"

"کون سا کرنل۔"

"جو انٹرویو کریں گے۔"

"تم بیٹھ جاؤ۔" چھوٹی نے لقمہ دیا۔ "چائے پیئے گا۔"

"پلا دو تو پی لوں گا۔" مانی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ چھوٹی نے بیرے کو بلایا "بیرے چائے لاؤ۔"

اگر مانی غور سے ان لڑکیوں کو دیکھ لیتا' ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کی طرف توجہ دیتا' تو یقیناً اسے سمجھ میں آ جاتا کہ وہ دونوں شرارت پر آمادہ ہیں۔ لیکن وہ وہاں یوں بے نیازی سے بیٹھا گرد و پیش کی طرف دیکھتا رہا جیسے وہ لڑکیاں ہی نہ ہوں۔ حالاں کہ وہ دونوں عام میموں سے زیادہ جاذب نظر تھیں۔

دیر تک وہ وہاں بیٹھا گپیں ہانکتا رہا حتیٰ کہ باقاعدہ انٹرویو جو ایک قریبی پارک میں جاری تھا' اختتام پذیر ہو گیا اور کرنل صاحب فارغ ہو کر ٹہلتے ٹہلتے کوٹھی میں آ پہنچے۔

کرنل صاحب کی آمد پر دونوں لڑکیوں نے ایک دوسری کو اشارہ کیا' اور وہ دونوں بھاگ کر اپنے پاپا سے لپٹ گئیں' اور اسے گھسیٹ کر اندر لے آئیں۔ کچھ دیر تک وہ اندر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ کرنل لڑکیوں کو دھمکا رہا تھا۔ لڑکیاں اس سے لاڈ کر رہی تھیں۔ ہنس رہی

تھیں، پوپلی آوازوں میں کچھ کہہ رہی تھیں۔

مانی باہر بیٹھا حیران ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

پھر کرنیل باہر نکل آیا۔ دونوں لڑکیاں اس سے لپٹی ہوئی تھیں۔

باہر آ کر وہ مانی کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ گھور کر بولا۔

"ہیلو ینگ مین۔"

مانی اٹھ بیٹھا۔"یس سر۔"

"تم انٹرویو میں کیوں نہ آیا۔"

"انٹرویو میں آیا سر۔"

"تم یہاں کیوں بیٹھا۔"

"انہوں نے بولا ادھر بیٹھو۔"

لڑکیوں نے پھر سے اودھم مچا دیا۔" ڈیڈ پلیز، پلیز ڈیڈ۔"

"تم ان کا کلاس فیلو ہے کیا۔"

مانی بات نہ سمجھا، کن کا کلاس فیلو اس نے پوچھا۔

"ناؤ سٹاپ اٹ ڈیڈ۔" بڑی بولی۔

"پلیز ڈیڈ" چھوٹی نے کہا،"یہ فیور نہیں مانگتا۔"

"تم نوکری مانگتا۔" کرنیل نے پوچھا۔

"ہاں صاحب نوکری مانگتا۔"

"ہم نے دے دیا نوکری، سب کا سب سمجھا۔"

مانی سمجھا شاید اسے دے دی ہے نوکری، بولا،"تھینک یو سر۔"

بڑی لڑکی نے کہا "ڈیڈی، وہ انٹرٹین منٹ یونٹ جو ہے۔ جو ابھی آپ نے بنانا ہے، ہے نا۔"

چھوٹی نے شور مچا دیا۔ "پلیز ڈیڈ پلیز، اسے جاب دے دو۔"

"تم انٹرٹین کر سکتا ہے۔" کرنیل نے مانی سے پوچھا۔

"میں کیا نہیں کر سکتا صاحب۔" مانی نے سوچے سمجھے بغیر جواب دیا، اے ینگ مین، ینگ

مین سر۔

"ہی لکس اٹ ڈیڈ،" بڑی بولی۔

"ہی از سوینگ" چھوٹی نے کہا۔

"یس ڈینجراسلی ینگ۔" کرنل نے تیوری چڑھالی۔

"فل آف ڈینجر اینڈ پلے 'ڈیڈ"۔

"تم انٹرٹینر بننا پسند کرے گا،" کرنل نے مانی سے پوچھا۔

"انٹرٹینر؟" مانی نے دہرایا۔

"سویلین آفیسر" کرنل نے وضاحت کی۔

"یس سویلین آفسر سر' ناٹ انٹرٹینر" مانی نے کہا۔

"یہ تو پوئٹ ہے ڈیڈ،" بڑی بولی۔

"پوئٹ؟" کرنل نے حیرت سے مانی کی طرف دیکھا۔

"نو نو نو۔ نو پوئٹ سر،" مانی چلایا۔

"تم شرماتے کیوں ہو" بڑی نے مانی کو گھورا۔

"ہی از سو ہمبل ڈیڈ۔" چھوٹی نے شور مچایا۔

پھر وہ دونوں باپ سے چمٹ گئیں۔ ایک کندھے سے لٹک گئی' دوسری گردن سے اور ان کی چیخوں سے ہنگامہ مچ گیا۔

"آل رایٹ آل رایٹ۔" بوڑھے کرنیل نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ مانی کے روبرو آکر بولا' "تم سویلین آفیسر ہے' تمہارا کام انٹرٹین منٹ یونٹ کا چارج ہے اور تمہارا ڈیزگنیشن پوئٹ ہے' پوئٹ۔"

میمیں ہی میمیں

ان دو نوجوان میموں کی سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مانی کو کرنل صاحب کی کوٹھی کی انیکسی میں رہنے کے لیے ایک بنا سجا کمرہ عارضی طور پر مل گیا۔ محکمہ ابھی بنا نہیں تھا۔ لہٰذا کام وام تھا نہیں۔ البتہ ایک مصروفیت ضرور تھی۔ دونوں نوجوان لڑکیاں اس کے گلے کا ہار بنی رہتی تھیں۔

ان کا مطالبہ تھا کہ سپاہیوں کو انٹرٹین کرنے سے پہلے مانی ان دونوں کو انٹرٹین کرے۔

لڑکیوں کی طرف توجہ دینا مانی کی سرشت میں نہ تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ تو خود ان کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔ توجہ صرف وہی دیتے ہیں جنہیں کوئی پوچھتی نہیں۔ اس لیے توجہ دیتے ہیں کہ شاید اس طور کوئی پوچھے۔ پھر بھی نہ پوچھے تو اور توجہ دیتے ہیں۔ اور' اور حتیٰ کہ توجہ میں وہ جنونی شدت پیدا ہو جاتی ہے' جسے عشق کہتے ہیں۔

مانی کو بن مانگے توجہ ملتی تھی' اتنی توجہ کہ وہ اکتا جاتا تھا۔ اس کے برعکس میں توجہ کی طلب کا کاسہ اٹھائے دربدر پھرتا تھا۔ محرومی کی وجہ سے اپنی توجہ میں شدت کی پھونک بھرتا رہتا تھا۔ بھرتا رہتا تھا۔

اتنی سی بات نے ہم دونوں کی زندگیوں میں کتنا بڑا فرق پیدا کر رکھا تھا۔ اتنی سی بات نے مانی کو مانی بنا رکھا تھا اور مجھے مفتی۔

ہاں تو مانی دونوں میموں کو ایک ڈیڑھ مہینے تک ٹالتا رہا' منہ زبانی انٹرٹین کرتا رہا۔

منہ زبانی بھی کیا نعمت ہے۔ اس میں قیام ہوتا ہے' لذت ہوتی ہے' حرکت ہوتی ہے' جسے انگریزی میں ''پلے'' کہتے ہیں۔ رومان محبت اور عشق' تینوں وہ دیے ہیں' جو ''پلے'' کے تیل کے زور پر روشن رہتے ہیں۔

ممکن ہے مانی اس مسلسل روشنی سے تنگ آ کر تبدیلی کی خاطر کسی وقت منہ زبانی کو تیاگ کر اندھیرے میں پناہ لے لیتا۔ لیکن اس کے اعصاب پر کرنیل کا خوف سوار تھا۔

ممکن ہے منہ زبانی پلے کی یہ روشنی چند ایک ماہ تک اس کے بنے سجے کمرے کو منور رکھتی' لیکن قیامت یہ ٹوٹی کہ بوڑھے کرنیل کی نئی اور نوجوان بیوی لزا لندن سے چل کر گھر آ پہنچی۔ اس بی بی نے آتے ہی صورت حالات کو بھانپ لیا اور وہ اپنی سوتیلی بیٹیوں کے ساتھ زبردستی اس کھیل میں شامل ہو گئی۔

پھر مانی کے لیے دقتیں پیدا ہو گئیں۔

نوہینکی پینکی

لزا ایک جہاندیدہ عورت تھی۔ اپنی سوتیلی بیٹیوں کی طرح معصوم نہ تھی۔ اس لیے وہ منہ

زبانی کی قائل نہ تھی۔

کرنیل نے جب دیکھا کہ لزا کی توجہ انیکسی پر مرکوز ہے' تو وہ چوکنا ہو گیا' بیٹیوں کی توجہ انیکسی پر مرکوز ہوتا اور بات تھی۔ لیکن لزا بیوی تھی۔

ایک روز وہ لزا کے پیچھے پیچھے انیکسی میں آیا اور پردوں کے پیچھے چھپ کر دیکھتا رہا۔ جب لزا مانی کا طواف کرتے کرتے ہار کر چلی گئی تو وہ پردے سے باہر نکل آیا۔

مانی نے کرنیل کو دیکھا تو اس کا دم خشک ہو گیا۔ کرنیل بولا "دیکھو بابو تم نے آرمی کو انٹرٹین کرنا ہے' تم نے فوک کو انٹرٹین کرنا ہے' ہماری میم صاحبہ کو نہیں' سمجھا۔"

"آپ میم صاحبہ کو روک لیں۔" مانی نے مظلوم بن کر ہمدردی طلب نگاہوں سے اپیل کی۔

"ہم میم صاحبہ کو نہیں روک سکتا" کرنیل بولا' لیکن ہم تم کو روک سکتا ہے۔ یہ کہہ کر کرنیل نے پستول نکال لیا۔ تو گڑ بڑ' تو ہینکی پینکی ' نہیں تو' اس نے پستول کی طرف اشارہ کیا اور انیکسی سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز جب میمیں مانی کے ناشتے کے ساتھ انیکسی میں داخل ہوئیں تو کمرہ خالی تھا۔

لوچ ہی لوچ

مانی کے اخراج کی وجہ صرف کرنیل کا ڈر نہیں تھا۔ اگر صورت حالات رسمی انٹرٹین منٹ تک محدود نہ ہوتی۔ اگر اس کھیل میں ایڈوینچر کا عنصر شامل ہو جاتا' تو کرنل کا ڈر جھاگ بن کر بلبلوں کی طرح اڑ جاتا۔ بالکل ایسے جیسے اوشا رانی کے ساتھ ہوا تھا۔

مانی کو اوشا رانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے نزدیک وہ ایک رنگین کھیل تھی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اوشا خوبصورت نہ تھی۔ خوبصورت تھی یا نہیں' دل آویز ضرور تھی۔ بے انداز دل آویز تھی۔ وہ بن سج کر باہر نکلتی تو ایسے لگتا جیسے ریشمیں "چمن" ہو جو بڑی لے سے جھول رہا ہو' اس کے جسم میں لوچ تھا' بات میں لوچ تھا۔ بھووں میں لوچ تھا' نگاہوں میں لوچ تھا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ وہ ایک رنگین لوچ تھی۔

گورداسپور میں اوشا رانی' مانی کے ماموں اشفاق حسین کی بیٹھک کے مقابل میں ایک وسیع و

عریض کوٹھی میں رہتی تھی۔ اشفاق حسین کی شخصیت اس قدر رنگیلی تھی کہ ہم اسے پیار سے رنگی کہہ کر بلایا کرتے تھے۔

رنگی کی بیٹھک میں ہر آنے جانے والا اوشا کو حریص نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اوشا کو بھی علم تھا کہ ہم سب اس کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر اس کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

اوشا کے کمرے کی کھڑکی رنگی کی بیٹھک سے دور لیکن عین مقابل میں کھلتی تھی۔ راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ایک نیچی نیچی چار دیواری تھی اور بس پھر وسیع میدان تھا' جس میں سبزیوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔

اوشا کے کمرے کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہتی تھی۔ کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر' چلتے پھرتے وہ ہمیشہ کھڑکی سے جھانک کر گزرا کرتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی رنگی کی بیٹھک کی طرف نظر بھر نہ دیکھا تھا۔ دیکھتی بھی تو یوں جیسے رنگی کی بیٹھک کا وجود ہی نہ ہو' جیسے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے منتظر ہی نہ ہوں۔ آتی اور کوئی لوچ دکھا کر چلی جاتی اور بیٹھک میں بیٹھے ہوئے جوانوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے۔ اکثر ان میں سے ایسے ہوتے' جنہیں اشارہ کرنے کی سدھ بدھ نہ رہتی چلی جاتی تو سبھی سوچنے لگتے کہ اب کی بار آئی تو میں ماتھے پر ہاتھ رکھوں گا' میں سینہ تھام لوں گا میں ———— وہ دوبارہ آتی تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے یا سینہ تھامنے کی مہلت ہی نہ ملتی۔ وہ یوں آتی اور چلی جاتی جیسے سپرنگ والا دروازہ کھلتے ہی بند ہو جاتا ہے۔

جب پہلی مرتبہ مانی اپنے ماموں اشفاق حسین کے گھر آیا تھا تو بیٹھک کی صورت حال دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

پھر اس نے ایک بہت بڑی دیدہ دلیری کی۔ وہ اوشا کی کھڑکی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ رنگی اور اس کے دوستوں نے منتیں کیں' دھمکیاں دیں کہ وہ رکاوٹ نہ بنے' لیکن مانی پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ادھر اوشا حیران ہوئی کہ یہ کیا چیز ہے' انسان ہے کہ جانور' جو میری طرف پیٹھ کئے بیٹھا ہے' اس کی اتنی جرات۔ اس روز اوشا کی حرکات و سکنات میں لوچ کی جگہ غصہ بھرا ہوا تھا' اسے جھٹکے لگ رہے تھے۔

اگلے روز مانی سب پر برس پڑا' بولا "یارو تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ایک لڑکی نے تم سب کو پاگل کر رکھا ہے تکون سی شکل ہے' سوکھا سا جسم ہے' چلتی ہے تو ساتھ جھولتی بھی ہے' جیسے چولیں ڈھیلی ہوں۔"

"تجھے کیا پتہ کہ لڑکی کیا ہوتی ہے۔" رنگی غصے میں بولا۔

"مجھے نہیں پتہ" مانی نے قہقہہ مارا "میں تو ایک نہیں تین چھوڑ کر آیا ہوں۔ اور وہ تینوں دیسی نہیں ولایتی تھیں' خالص میمیں۔"

میموں کا نام سن کر بیٹھک پر سناٹا چھا گیا۔

اگر یہ لڑکی تمہیں اتنی ہی پسند ہے مانی نے کہا تو اس سے بات کرو' رومان لڑاؤ' روز شام کو سیر کو جاتی ہے' اس کا پیچھا کرو۔ کچھ حاصل حصول ہو اور یہ بھوتنی تمہارے اعصاب سے اترے۔

"نہ نہ نہ نہ" رنگی بولا۔ "کہیں اس سے بات کرنے کی حماقت نہ کر بیٹھنا' اس کا باپ سیشن جج ہے سات سال کے لیے اندر کر دے گا۔" "اور جب وہ سیر کو جاتی ہے تو پتہ ہے کون اس کے ساتھ ہوتا ہے' بندوق والا گورکھا' جو ان کی کوٹھی کے دروازے پر ہر وقت کھڑا رہتا ہے" رضی نے کہا۔

"پھر کیا ہوا۔" مانی چلایا "سات سال اندر ہی کر دے گا نا۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔"

ہے ہمت

اسی شام سے مانی نے سیر کے لیے باہر جانا شروع کر دیا' جب اوشا اور گورکھا کوٹھی سے باہر نکلتے تو وہ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔

پہلے روز وہ اوشا کے پیچھے پیچھے گیا تو بیٹھک والوں کا برا حال تھا' ڈر کے مارے منہ سے بات نہ نکلی تھی۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ چپ چاپ بیٹھے رہے پھر رنگی بولا "یارو تم بیٹھو یا نہ بیٹھو میں تو اندر باتھ روم میں جا رہا ہوں۔ ڈر کے مارے میرے معدے نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔" یہ سن کر سب چلے گئے اور بیٹھک کے دروازے بند کر دیے گئے۔

جب مانی سیر سے واپس آیا تو ایک ایک کر کے سبھی بیٹھکیے واپس آ گئے۔

"کیا ہوا' کیا ہوا۔" وہ باری باری مانی سے پوچھنے لگے۔

"کچھ بھی نہیں۔" مانی نے جواب دیا۔" ہونا کیا تھا۔ البتہ آج رات اسے نیند نہیں آئے گی۔"

"وہ کیسے۔" سب نے بیک آواز پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ میں نے اس سے باتیں کیں' بہت سی باتیں کیں' ———— لیکن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر ایک بار بھی نہیں دیکھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ باتیں کیں اور دیکھا نہیں۔"

"جب بھی میں بات کرتا تھا' اونچی آواز سے کرتا تھا اوشا کی طرف پیٹھ موڑ کر کرتا تھا۔"

" اور وہ گن مین" رنگی نے پوچھا۔

"وہ گن مین غصے سے بھوت بن جاتا تھا' جب بھی میں بات کرتا' لیکن میں نے تو گن مین کی طرف دیکھا' نہ اوشا کی طرف۔"

"یہ کمال ہے۔" رضی بولا۔

"لیکن تم نے کیا بات کی۔" رنگی نے پوچھا۔

"بس میں نے یہ کہا' یہ تو نے کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے۔ لوگوں کو تگنی کا ناچ نچانے کا مطلب۔ اگر کسی نے بانہہ پکڑ لی تو کیا ہو گا۔"

چار ایک دن مانی اوشا کے پیچھے پیچھے گیا۔ پانچویں دن آ کر بولا۔ "آج میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو۔" رنگی نے پوچھا۔

"اوشا کے کمرے میں' اس سے ملنے کی لیے۔"

"اس نے بلایا ہے کیا۔"

اونہوں' اس نے مجھے دھمکی دی ہے۔ میں نے کہا تھا' فقیر کے منہ نہ لگ شریمتی' نہیں تو کسی روز تیرے گھر آ کر تجھے اٹھا کر لے آؤں گا۔

"تو نے صاف صاف کہہ دیا۔" رضی نے پوچھا۔

"ہاں صاف صاف' روبرو کھڑے ہو کر' اس کی بانہہ پکڑ کر۔"

"اور وہ گن مین۔" رنگی بولا۔

"گن مین آج اس کے ساتھ نہیں تھا" مانی نے جواب دیا۔

"پھراس نے جواب دیا تجھے۔" رضی نے پوچھا۔

"ہاں" مانی نے کہا "اس کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ بولی "ہے اتنی ہمت کسی میں۔"

"پاگل ہو گیا" رنگی نے کہا "اگر تم گئے تو وہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دے گی۔"

"کر دے۔" مانی نے کہا۔

"تمہارا نام و نشان نہیں ملے گا۔"

"نہ ملے۔"

"مذاق نہ کرو مانی۔" رضی نے کہا۔

"مذاق نہیں کر رہا۔"

"تمہیں اوشا سے دلچسپی ہے کیا۔"

"بالکل نہیں۔"

"تم یہ محض اپنا دل بہلانے کے لیے کرو گے۔"

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر۔"

"اس نے مجھے للکارا ہے۔ اگر میں نہ گیا تو زندگی بھر اپنی نگاہوں میں گرا رہوں گا۔" مانی نے کہا۔

اگرچہ رنگی، مانی کا ماموں تھا لیکن وہ دونوں ہم عمر تھے، بے تکلف دوست تھے۔ ساتھی تھے۔ رنگی مانی کو اچھی طرح جانتا تھا اسے پتہ تھا کہ مانی کو وہاں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس کے باوجود وہ اس کی منتیں کرتا رہا کہ ایسی حرکت نہ کرنا۔

رات کو نو بجے مانی نے اپنے گرد ایک بھوسلی چادر لپیٹی اور بڑے اطمینان سے کوٹھی کی چار دیواری پر پاؤں رکھ کر اوشا کی کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھر کر، اوشا کی کھڑکی کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ حسب معمول کھڑکی کھلی تھی، لیکن کمرہ خالی تھا۔ وہ کھڑکی کے راستے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

بیٹھک میں رنگی اور میں دروازے سے لگ کر درزوں سے دیکھ رہے تھے۔ ہمارے ہونٹ

خشک تھے' دل دھک دھک کر رہے تھے۔

ہمارا اندازہ تھا کہ ابھی کوٹھی سے شور شرابے کی آواز بلند ہو گی۔ پھر گن مین بندوق اٹھائے اندر کی طرف بھاگے گا' فائر ہوں گے اور بالآخر پولیس کا دستہ بیٹھک کا دروازہ آ کھنکھنائے گا۔

دیر تک ہم وہاں بیٹھے انتظار کرتے رہے' لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ کوٹھی پر خاموشی طاری رہی۔

پھر رنگی نے اپنی ستار اٹھالی اور کلیان کی سروں کو چھیڑ کر اپنے دل کے دکھ کا اظہار کرنے لگا۔ پچھلے پہر تک ہم کلیان جوگ اور بھاگ سے اپنے دل کا اضطراب بہلاتے رہے۔ پھر وہیں پڑے پڑے سو گئے۔

اگلے روز سارا دن اوشا کی کھڑکی بند رہی اور کوٹھی پر سکوت طاری رہا۔ شام کو اوشا سیر کرنے کے لیے بھی باہر نہ نکلی۔

اگلی رات نو بجے کے قریب مانی یوں بیٹھک میں داخل ہوا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو' جیسے وہ سگریٹ خرید کر واپس آیا ہو۔

"کیا ہوا کیا ہوا۔" ہم دونوں مانی کی طرف لپکے۔

"کچھ بھی نہیں' ہونا کیا تھا۔" مانی ہنسا۔

"چوبیس گھنٹے تم وہاں رہ کر آئے ہو اور کہتے ہو کچھ نہیں ہوا۔"

چور سپاہی

"بس' ساری رات ہم تاش کھیلتے رہے' چور سپاہی' بھابھی دیور' ساتھ چنے' مونگ پھلیاں اور چلغوزے کھاتے رہے۔ جب دن چڑھا تو اس نے مجھے اپنے باتھ روم میں بند کر دیا اور کھلا کھلا کر میرا توبرہ بھرتی رہی۔ کبھی پنیاں لے آتی' کبھی بنی ہوئی دال' کبھی مٹھائی' کبھی حلوہ۔"

"وہ تجھے دیکھ کر ڈری نہیں تھی کیا۔"

"ڈری تھی۔ چلانے لگی تو میں نے کہا چلائے گی تو تیری اپنی بدنامی ہو گی۔ میں کہوں گا تو نے مجھے بلایا تھا اس لیے میں آ گیا۔"

"پھر۔" رنگی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"کافی دیر تک وہ ڈری ڈری رہی گم سم بیٹھی رہی۔"

میں نے کہا ڈرتی کیوں ہے ری' میں تجھے کھا نہیں جاؤں گا۔ اور دیکھ میں تیرا عاشق نہیں ہوں' تجھ سے محبت کرنے نہیں آیا اور بی بی تو کوئی ایسی حور پری بھی نہیں ہے۔ تجھ سے تو میں خود کہیں زیادہ خوبصورت ہوں۔ ہاں' دیکھ لے مجھے غور سے دیکھ نا' بھر کر نگاہ ڈال' میں کوئی جھوٹ تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔"

"تو اس کے پاس بیٹھا تھا کیا۔" رنگی نے پوچھا۔

"نہیں میں نے کرسی کو دور سرکا لیا تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی تھی اور میں دیوار کے ساتھ۔ بڑی دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر میں نے جیب سے تاش نکالا' چلو چور سپاہی کھیلیں' میں نے کہا۔ چور سپاہی نہیں آتی تو بھابی دیور سہی۔ اس پر بھی وہ چپ رہی' تو میں نے جیب سے چنے مونگ پھلیاں اور چلغوزے نکالے' چل تاش نہیں تو یہی کھاتے ہیں۔ آخر وقت بھی تو گزارنا ہے کسی طور۔ پھر وہ مسکرا پڑی۔ بس پھر ہم دونوں ساری رات تاش کھیلتے رہے اور چنے کھاتے رہے۔"

آنا اور جانا

"جب پچھلا پہر ہوا تو وہ بولی' اب آپ چلے جائیں۔ میں نے جواب دیا خود ہی تم نے بلایا تھا' اب خود ہی گھر سے نکال رہی ہو۔ میں آیا تیری مرضی سے ہوں۔ شریمتی' جاؤں گا اپنی مرضی سے پھر اس نے میری بڑی ہی منتیں کیں' پاؤں کو ہاتھ لگایا' دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیے لیکن میں نہ مانا۔ میں نے کہا شریمتی کل کا دن میں تیرا مہمان رہوں گا۔ صبح مجھے اپنے غسلخانے میں بند کر دینا۔ اور پھر اچھی اچھی چیزیں پکا پکا کر کھلاتی رہنا' جس طرح ماں بچے کو چوگا کھلاتی ہے۔ پھر رات پڑے گی تو میں چلا جاؤں گا۔"

"سارا دن میں غسل خانے میں بند رہا اور وہ مجھے چوگا کھلاتی رہی۔ رات پڑی تو میں نے کہا' لے اب میں جاتا ہوں۔ تو بھی ساری عمر یاد رکھے گی کہ ایک چور آیا تھا ایک دن۔ رات بھر خزانے کے پاس بیٹھا رہا لیکن خزانے کو ہاتھ نہیں لگایا اور دیکھ کہیں میری محبت میں گرفتار نہ ہو

جانا' نہیں تو ساری عمر بیٹھی روئے گی۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا ہوں۔ وہ اب بھی کھڑکی میں کھڑی مجھے دیکھ رہی ہے۔ یارو کوئی بیٹری ہو تو دینا' میں اسے ہلا کر ٹاٹا کر لوں۔"

ہاں مائی ایڈونچر "کا بھوکا تھا' عورت کا نہیں۔ ہر تاموں اس کے لیے ایک ایڈونچر تھی عورت نہیں تھی۔

تیرھواں باب

الاٹمنٹ

ان دنوں کرشن نگر ویران پڑا تھا۔

کرشن نگر ہندوؤں کا محلہ تھا' متمول ہندوؤں کا۔ محلے کے تمام مکانات پختہ تھے۔ بہت سے کوٹھیوں کی طرز پر بنے ہوئے تھے۔

کرشن نگر کے ہندو منظم طریقے سے بھارت جا چکے تھے۔ تمام مکانات خالی پڑے تھے۔ مقفل۔ یہ مکانات سازو سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ قالین' کرسیاں' صوفے' پلنگ پیڑھے۔ منظم انخلاء کے باوجود ہندو صرف روپیہ پیسہ زیور اور دوسری قیمتی چیزیں ساتھ لے کر جا سکے تھے۔ گھر کا باقی فرنیچر جوں کا توں چھوڑ گئے تھے۔

جب وہ گئے تھے تو انہیں پورا یقین تھا کہ صرف چند ہفتوں کی بات ہے' یا شاید چند ماہ' اس کے بعد وہ اپنے اپنے گھروں میں لوٹ آئیں گے۔ سامان شاید لٹ لٹا جائے۔ لیکن املاک کو کوئی خطرہ نہیں۔

پتہ نہیں اس پختہ یقین کی بنیاد کیا تھی' لیکن یہ یقین ان کے دلوں میں بٹھا دیا گیا تھا۔ کس نے بٹھایا تھا' معلوم نہیں شاید کسی سیاسی پارٹی نے بٹھایا ہو۔ بہرحال قراین سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوؤں کو یقین تھا کہ تقسیم ایک عارضی چیز ہے اور چند ماہ کے اندر اندر پھر سے جیسا تھا' ویسا ہی

ہو جائے گا' اسی بنیاد پر یہ افواہ عام تھی کہ کئی ایک ہندو مہاجر جو کسی مجبوری کی وجہ سے اپنی دولت ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے' انہوں نے اپنے گھر کے کسی کونے میں اسے دبا دیا تھا تاکہ جب واپس آئیں اسے نکال لیں۔

اس زمانے میں مسلمانوں کی توجہ پاکستان کے لیے ایثار و قربانی پر مرکوز تھی۔ قوم کے ذہن حرص و ہوس سے خالی تھے۔ البتہ چند ایک افراد ضرور ایسے تھے جو قومی کرائسس کے باوجود ذاتی مفاد کو نہ بھول سکے تھے۔

اس لیے کچھ لوگ ہندو محلوں میں اس امید پر گھومتے پھرتے کہ کوئی امیرانہ گھر دیکھ لیں اور رات کے اندھیرے میں دیوار پھلانگ کر سیم وزر کی تلاش کریں۔ سیم و زر نہیں' تو چلو ساز و سامان تو ہو گا ہی۔

اس پر مفلوج انتظامیہ نے ہندو علاقوں میں پولیس متعین کر رکھی تھی۔ بلیاں چھیچھڑوں کی رکھوالی کر رہی تھیں۔

پوچھے' بن پوچھے

دوپہر کا وقت تھا ہم دونوں مانی اور میں کرشن نگر میں گھوم رہے تھے۔

ان خوبصورت مکانات کو دیکھ کر میری تمام تر حرص و ہوس جاگ اٹھی تھی۔

آہا کتنا خوب صورت مکان ہے یہ۔ اگر مجھے مل جائے تو زندگی سنور جائے۔ ٹھاٹھ سے رہیں اس میں۔ پھر میری نگاہ تلے مکان کا اندرونی حصہ ابھرتا۔ قیمتی صوفے' خوبصورت بڑے بڑے قالین' میزیں کرسیاں' بیڈ' ریشمی پردے' میں ایک مخملی صوفے پر بیٹھ جاتا اور پھر رئیسانہ انداز سے چاروں طرف دیکھتا۔

مانی میری حریص نگاہوں کو دیکھ کر کہتا' ہاں ہاں اچھا مکان ہے' موزوں رہے گا۔ میں دیوار پھلانگ کر اندر سے کھڑکی کھول دوں۔

اس پر مجھے غصہ آتا کہ پوچھ کیوں رہا ہے یہ کیا پوچھنے کی بات ہے' خوامخواہ میرا جی چاہتا کہ مانی پوچھے بغیر دیوار پھلانگ کر اندر کود جائے اور کھڑکی کھول کر زبردستی مجھے اندر گھسیٹ لے۔ پھر ہم کھڑکی بند کر کے اندر بیٹھ رہیں۔ جب رات پڑ جائے تو ایک ایک کمرے کا جائزہ لیں۔ ساز و

سامان دیکھیں الماریاں کھول کر تلاشی لیں اور پھر دفعتاً" ہمیں وہ طاقچہ مل جائے' جس میں گھر والے زیور چھپا کر رکھ گئے تھے۔

اور ——————— اور ———————

چڑھوں دیوار پر' مانی پھر پوچھتا۔ مجھے پھر غصہ آ جاتا کہ پوچھ کیوں رہا ہے' بن پوچھے کیوں نہیں کر گزرتا۔

اپنے منہ سے یہ کہتا کہ ہاں مجھے ساز و سامان کی ہوس ہے سیم و زر کی خواہش ہے' میرے لیے ممکن نہ تھا۔ یہ میری مجبوری تھی اور اپنی مجبوری کو چھپانے کے لیے میں نے اخلاق اور شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اپنی شرافت کا رعب جمانے کے لیے میں سیخ پا ہو کر مانی کو گھورتا۔ تم چاہتے ہو کہ ہم چوروں کی طرح مکان میں گھس جائیں' ساز و سامان کی حرص میں اندھے ہو جائیں' لاحول ولا قوۃ۔

مانی شرم سے گردن لٹکا لیتا' جیسے اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہو۔

میں سمجھا شاید ——————— وہ رک جاتا' چلو جیسے بھی تم چاہو' اور وہ آگے چل پڑتا۔

مجھے از سرنو غصہ آ جاتا کہ وہ آگے کیوں چل پڑا ہے۔ ایسے موقعوں پر میری مرضی کے تابع کیوں ہو جاتا ہے' من مانی کیوں نہیں کرتا ——————— پھر مجبوراً" میں بھی مانی کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔

ارے' کچھ دور چلنے کے بعد میں پھر رک جاتا' یہ مکان ——————— یہ تو اس سے بھی اعلیٰ ہے' اس سے دگنا ساز و سامان ہو گا۔ پردوں کی کوالٹی ہی بتا رہی ہے۔

مجھے اپنے گھر کا سامان یاد آ جاتا' ٹوٹی ہوئی کرسیاں' جھولتی ہوئی چارپائیاں اور کھوکھے کی میزیں۔ مجھے زندگی بھر آرزو رہی تھی کہ گھر میں ایک ڈرائینگ روم بناؤں۔

کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوں' صدر دروازے پر ٹاٹ نہ لٹکے' میری یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی تھی۔ تنخواہ اتنی قلیل تھی کہ ہانڈی روٹی کا خرچ بھی پورا نہ ہوتا تھا۔

پھر اتفاق سے اخبار میں خبر آئی کہ ہندوؤں کے متروکہ مکانات لٹے پٹے مہاجرین کو الاٹ کرنے کے لیے مجسٹریٹ متعین کر دیے گئے ہیں۔

اگر میں اکیلا ہوتا تو مکان الاٹ کرانے کی مجھ میں کبھی ہمت پیدا نہ ہوتی' لیکن مانی جو تھا'

اس میں بلا کی جرأت تھی۔

میں نے مانی سے بات کی۔

ہاں مکان تو چاہیئے' مانی نے جواب دیا۔ مکان حاصل کرنا تو کوئی پرابلم نہیں۔

پرابلم کیوں نہیں' میں نے پوچھا۔

اچھا ——————— ہو گی ——————— مجھے تو نہیں لگتی۔

بھئی ہزاروں سائل ہوں گے۔ الاٹ منٹ مجسٹریٹ کی منتیں کرنی پڑیں گی۔ مہاجر ہونے کے ثبوت دینے پڑیں گے۔ پتہ نہیں اور کیا کیا کرنا پڑے' تم سمجھتے کیوں نہیں۔

میں تو سیدھی بات جانتا ہوں۔

کیا۔

میرے ساتھ چلو۔ متروکہ مکانوں میں سے کوئی ایک پسند کرو' باقی میرا کام ہے۔

تو کیا کرے گا۔

دیوار پھلانگ کر مکان کے اندر داخل ہو جاؤں گا۔ اندر لگے ہوئے قفل توڑ دوں گا۔ اور پھر ہم اس پر قابض ہو جائیں گے۔

اور اگر کچھ دنوں کے بعد مجسٹریٹ نے گھر سے نکال دیا تو۔

نکالے گا تو دیکھا جائے گا۔

اور اگر پولیس نے مقدمہ کر دیا تو۔

جو سامان مکان سے ملے گا اس کا کچھ حصہ پولیس کو دے دیں گے۔

مانی کی بات معقول تھی' پریکٹیکل تھی۔ میری اندرونی خواہش کے عین مطابق تھی' لیکن اسے تسلیم کر لینے سے وہ بھرم ٹوٹتا تھا جو اپنے متعلق میں نے مانی کے دل میں پیدا کر رکھا تھا۔ وہ مان ریزہ ریزہ ہوتا تھا جو میں نے اپنی نیکی اور شرافت کے متعلق اپنے جاننے والوں میں پیدا کر رکھا تھا۔ میں نے یہ بھرم خود اپنے دل میں پیدا کر رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خود اپنی نظر میں گر جاؤں۔

حفظ ماتقدم کے لیے' مانی کی بات سن کر' مجھے غصہ آگیا' یعنی از خود مکان پر قابض ہو جائیں' چور بن جائیں' ڈاکہ ماریں۔ تم کیسی باتیں کرتے ہو مانی' نہیں ایسا نہیں ہو گا' کبھی نہیں'

ہم قانونی طور پر مکان الاٹ کرائیں گے۔

اس فیصلے کے بعد ہم دونوں کرشن نگر میں گھوم پھر رہے تھے۔ اپنے لیے مکان پسند کر رہے تھے تاکہ کوشش کر کے اسے اپنے نام الاٹ کرالیں۔

جوں جوں میں سامان سے بھرے ہوئے مکان دیکھتا توں توں میرے اندر کی حرص جاگتی اور آنکھوں تلے مال خزانے کے ڈھیر لگ جاتے۔ میرا جی چاہتا کہ مانی مجھ سے پوچھے بغیر دیوار پھلانگ کر مکان کے اندر داخل ہو جائے اور مکان پر قبضہ کرے۔ مجھے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ وہ پوچھتا کیوں ہے۔

اس کے برعکس مانی یہ سمجھتا تھا کہ میرے لیے اس کی تجویز ناقابل قبول ہے۔ اس لیے ناگوار گزرتی ہے اور وہ ندامت سے سر لٹکا کر آگے چل پڑتا۔ چلو نہ سہی، جیسے تم کہو۔

اس روز گھوم پھر کر ہم نے چار پانچ مکان پسند کیے، ان کے نمبر نوٹ کیے اور واپس گھر آ گئے۔

زیور سے لدی پھندی ہندنی

ساری رات مجھے نیند نہ آئی۔

ساری رات میں ان مکانات میں گھومتا رہا۔

کبھی سازو سامان کا جائزہ لیتا، کبھی الماریوں کی تلاشی لیتا، کبھی صحن کے کونے میں کدال سے زمین کھودتا۔ زمین سے آوازیں آتیں، ہاں ہاں میں یہیں ہوں۔ تھوڑی سی گہرائی اور ہے، اور کھودو ———— اور کھودو۔

ایک مکان میں گھومتے پھرتے تو ایک حادثہ رونما ہو گیا ———— میں نے ایک نیم چھتی کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے سوچا شاید اس کا کوئی دوسرا دروازہ بھی ہو۔

دفعتاً میں نے دیکھا کہ سامنے ایک کھڑکی ہے، جس میں شیشہ لگا ہوا ہے۔ میں نے ایک چوٹ ماری شیشہ چور چور ہو گیا، بازو اندر ڈالا۔ چٹخنی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔

ارے میں حیران رہ گیا۔ سامنے پلنگ کے ایک کونے پر، ریشمیں چادر میں لپٹا ہوا، کوئی

بیٹھا تھا۔

پہلے تو میں ڈر کر پیچھے ہٹا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا۔ دفعتاً چادر میں حرکت ہوئی' ایک ریشمی گٹھڑی سی لڑھک کر میرے قدموں میں آگری۔

میری رکشا کرو مہاراج' میری رکشا کرو۔

میں حیران رہ گیا۔ وہ گٹھڑی ایک جیتی جاگتی ہندنی تھی۔ اس کا جسم سونے کے زیورات سے لدا ہوا تھا۔

میرے پاس بڑا دھن دولت ہے۔ سب کچھ لے لو مگر مجھے مارو نہیں۔

پھر میں نے غور سے دیکھا تو وہ خالی ہندنی ہی نہیں تھی۔ وہ ایک حسین و جمیل دلہن تھی' جوانی' حسن' عورت' دھن دولت سبھی کچھ میرے قدموں پر پڑا تھا۔

ساری رات میں کرشن نگر کے متروکہ مکانوں میں جاگتے کے خواب دیکھتا رہا۔

میری شخصیت میں فینٹنسی کو بہت بڑا دخل ہے۔ فطری طور پر میں جاگتے کے خواب دیکھنے پر مجبور ہوں۔ زندگی کا ہر متوقع واقعہ چاہے وہ طربیہ ہو یا المیہ' وقوع پذیر ہونے سے پہلے اسے دنوں ہفتوں بناتا رہتا ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے۔ جاگتے میں خواب دیکھنا میری گھٹی میں پڑا ہے۔

ساری رات میں کرشن نگر کے متروکہ مکانات میں' ساز و سامان' خفیہ خزانوں اور زیور سے لدی پھندی حسین و جمیل ہندنیوں سے گھرا رہا۔ پھر میری آنکھ لگ گئی اور میں سوتے میں وہی خواب دیکھنے لگا۔

اگلے روز جب ہم دونوں کرشن نگر پہنچے۔ تو چوک میں الاٹمنٹ مجسٹریٹ کھڑا تھا۔ اس کے اردگرد لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

اس بھیڑ کو چیر کر مجسٹریٹ کے پاس جانا بے حد مشکل تھا۔ اس لیے ہم دونوں بھیڑ میں شامل ہو گئے۔

چیزیں ہی چیزیں

آدھ گھنٹے کے بعد مجسٹریٹ کا قافلہ روانہ ہوا۔ اور ہم قافلے کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

مجسٹریٹ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب قسم کی بے تعلقی اور بے حسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سائل اس کے روبرو کھڑے ہو کر اپنی بدقسمتی کا رونا روتے' تو وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں جمائیاں لینے لگتا۔ کہتا ٹھیک ہے ٹھیک ہے' آپ کی باری آئے گی۔ وہ سائلوں کی طرف غور سے دیکھتا ہی نہ تھا' نہ ان کی بات توجہ سے سنتا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوتا تھا' صرف مسلسل اکتاہٹ۔

مجسٹریٹ کا نائب بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے قافلے کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کاغذوں کا پلندہ تھا' جسے وہ چلتے چلتے دیکھتا جاتا تھا' یوں جیسے بہت مصروف ہو۔

چلتے چلتے وہ ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ یہ مکان ہے سر' اس نے مجسٹریٹ سے کہا' اور جواب سنے بغیر کارندوں سے بولا۔ تالہ توڑ دو۔

ایک آدمی نے بڑھ کر تالے پر ہتھوڑے مارنے شروع کر دیے۔ چند ایک ضربوں کے بعد تالہ ٹوٹ گیا' دروازہ کھول دیا گیا۔ داخل ہونے سے پہلے نائب نے دہلیز پر کھڑے ہو کر مجمعے سے کہا۔

آپ سب لوگ یہیں انتظار کریں۔ کوئی شخص اندر داخل نہ ہو۔ مجسٹریٹ صاحب ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد دوسرا مکان الاٹ کریں گے۔

اس دوران میں چھ سات کارندے مکان میں داخل ہو چکے تھے۔

پھر مکان سے چیزیں نکالنے کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ ایک شخص بائیسکل اٹھائے باہر نکلا۔ اور پھر پتہ نہیں کس طرف چلا گیا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی نکلا اس نے سلائی کی مشین اٹھا رکھی تھی' پھر تیسرا آدمی ایک میز اٹھائے باہر نکلا۔

باہر کھڑے لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک کارندے نے ان کی نگاہوں کو بھانپ کر کہا' بھئی یہ سب سامان مال خانے میں رکھا جا رہا ہے تاکہ حاجت مند مہاجرین میں بانٹا جائے۔ اس پر لوگوں میں اطمینان کی رو دوڑ گئی' اضطراب ختم ہو گیا اور وہ اطمینان سے گلی میں بکھر کر یہاں وہاں بیٹھ گئے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک اندر سے سامان آتا رہا۔ اس کے بعد مجسٹریٹ باہر نکلا۔ نائب نے لوگوں

کو آواز دی وہ سب دوڑ کر جمع ہو گئے۔ نائب بولا۔ ضروری کارروائی مکمل ہو گئی ہے۔ اب وہ صاحب پیش ہوں جن کے نام مکان الاٹ کیا گیا ہے۔ اس پر ایک موٹا تازہ متمول شخص آگے بڑھا۔

نائب نے اس کے ہاتھ میں ایک فارم تھما دیا پھر وہ فارم پر کرنے میں مصروف ہو گئے۔

دیر تک فارم بھرنے کی کارروائی مکمل ہوتی رہی۔ اس دوران میں ایک کارندہ اندر سے ایک کرسی لے آیا اور مجسٹریٹ کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

فارم مکمل ہونے کے بعد نائب نے مجسٹریٹ کو جھنجھوڑا۔ وہ جاگ پڑا۔ الاٹ منٹ آرڈر پر دستخط کیے اور پھر یہ قافلہ آگے چل پڑا۔ نائب آگے آگے تھا' وہ مکانات کے نمبر دیکھتا جاتا تھا۔ ایک مکان کے سامنے وہ رک گیا اور کارکن کو تالہ توڑنے کا حکم دیا۔ پھر مکان سے قیمتی اشیاء نکالنے کا طویل عمل شروع ہو گیا۔

ہو جائے گا' ہو جائے گا

دوسرے مکان کی الاٹ منٹ کے بعد' نائب نے اعلان کیا کہ مجسٹریٹ صاحب لنچ کے وقفے کے بعد تشریف لا کر مزید الاٹ منٹ کریں گے۔

چار دن ماڈل ٹاؤن اور کرشن نگر میں الاٹ منٹ مجسٹریٹ کی اردل میں سائلوں کے قافلے کے ساتھ ساتھ جوتے چٹخاتے رہے۔

اس دوران میں ہم نے دو ایک مرتبہ مجسٹریٹ سے درخواست کی تھی کہ ہم بھی امیدوار ہیں۔ ہمارے نام پر بھی ایک مکان الاٹ کیا جائے۔ جواب میں مجسٹریٹ ہو جائے گا ہو جائے گا' کہہ کر پھر سے اونگھنے لگا تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ہو جائے گا' ہو جائے گا۔ پر یقین آنے کی بجائے مزید شکوک پیدا ہو جاتے تھے۔ اول تو وہ سائل کی طرف دیکھتا ہی نہ تھا۔ بس ایک سرسری نگاہ' اس نگاہ میں بے پرواہی اور بے تعلقی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی۔

مجسٹریٹ کا طریق عمل کسی قاعدے یا اصول پر مبنی نہ تھا' نہ تو اس نے سائلوں سے درخواستیں لی تھیں' نہ کوئی فہرست بنائی تھی' نہ کبھی پوچھا تھا کہ تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو۔ سائلوں سے اس نے کبھی بات نہ کی تھی۔ جب بھی کوئی آہ و زاری کرتا یا اپنی روداد غم سناتا تو وہ

اول تو اسے سنتا ہی نہیں تھا۔ مجبوراً" سنتا پڑتا تو وہ آنکھیں موندھ کر بیٹھ رہتا۔ ——— یوں لگتا جیسے گیان دھیان میں مصروف ہو۔ بہر حال سائلوں کی منتوں' ساجتوں کے جواب میں وہ صرف ایک لفظ کہا کرتا تھا' بھئی ہو جائے گا۔ اور بس۔

اس کا طریق کار ایک سربستہ راز تھا۔ جس کی کنجی نائب کے ہاتھ میں تھی۔

نائب ایک چلتا پرزہ ہوشیار آدمی تھا۔ وہ مسلسل مصروف رہتا تھا۔ جب کوئی کام نہ ہوتا اس وقت بھی اس کے انداز سے ایسا لگتا جیسے شدت سے مصروف ہو۔

سوتا مجسٹریٹ جاگتا نائب

نائب کے ہاتھوں میں ہر وقت کاغذوں کا ایک پلندہ پکڑا رہتا۔ ہر چند ایک منٹوں کے بعد وہ اس پلندے کو کھولتا' دیکھتا' از سر نو ترتیب دیتا اور پھر سے لپیٹ کر ہاتھ میں پکڑ لیتا۔ جتنا ہی مجسٹریٹ سویا سویا تھا' اتنا ہی نائب جاگا جاگا رہتا۔ بلکہ بعض اوقات شک پڑنے لگتا کہ وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جاگ رہا ہے۔

وہ مجسٹریٹ کا نائب نظر نہیں آتا تھا' بلکہ مجسٹریٹ کو یوں چلاتا تھا جیسے اس کے ہاتھ کی چرخی ہو۔ اب یہ کرنا ہے جناب۔ اب ادھر جانا ہے جناب۔ اب بی ۳۶۴ کی الاٹ منٹ ہے' جناب! اس کا لہجہ تحکمانہ تھا' لگتا تھا جیسے بار بار جناب جناب کہہ کر وہ احکامات کو شوگر کوٹ کر رہا تھا۔

مجسٹریٹ بغیر چوں و چرا کے نائب کے کہنے پر عمل کرتا تھا۔ یوں جیسے سڑکیں کوٹنے والا انجن مستری ڈرائیور کے طابع فرمان ہو۔

سائلوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ مجسٹریٹ کے پیچھے پیچھے پھرنے والے سائلوں میں بد دلی بڑھتی جا رہی تھی۔ چونکہ الاٹ منٹ آرڈر ایسے لوگوں کو مل رہے تھے جنہیں کسی نے کبھی دیکھا نہ تھا۔

ہر روز دو ایک نئے لوگ ہجوم میں شامل ہو جاتے اور الاٹ منٹ آرڈر لے کر چلے جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیچھے پیچھے پھرنے والے لوگ اور ہیں اور الاٹ منٹ حاصل کرنے والے اور۔ اس کے علاوہ ہجوم کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ پر اسرار مال خانہ جس میں ہر مکان کی قیمتی اشیاء منتقل کی جاتی ہیں۔ مہاجرین کا مال خانہ نہیں' بلکہ مجسٹریٹ' نائب' پولیس اور کارندوں کا مال خانہ

ہے۔

ان سب کوائف کے باوجود پیچھے پھرنے والوں میں احتجاج یا اشتعال کی بجائے مایوسی پھیل رہی تھی۔

منہ پر نہ نہ دل میں ہاں ہاں

اس پر مانی اور میں بیٹھ کر سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ ہم دونوں غم و غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ مانی کو مجھ پر غصہ تھا کہ میں نے اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے صراط مستقیم کو چھوڑ کر الٹا راستہ اختیار کیا تھا۔ اگر میں اس کی تجویز مان جاتا تو آرام سے کسی گھر میں داخل ہو کر ہم مدت سے اس پر قابض ہو چکے ہوتے۔

مجھے مانی پر غصہ تھا کہ اپنی تجویز پر عمل کرنے کے لیے وہ مجھ سے پوچھنے پر کیوں مصر تھا۔ اگر وہ پوچھے بغیر مکان پر قبضہ کر لیتا تو اس خوامخواہ کی بادیہ پیمائی سے نجات مل جاتی۔

بہرطور اب میرے لیے ممکن نہ رہا تھا کہ مانی سے کہوں' آؤ کسی مکان پر قبضہ کر لیں۔ اس میں اعتراف شکست تھا۔

اس معاملے میں میرے دل کی کیفیت اس عورت کے مصداق تھے' جسے چاہنے والا کہتا ہے' کیا میں تمہارا ہاتھ تھام لوں۔ اجازت ہے' تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ نہیں نہیں' یہ کیسی فضول بات ہے۔ لیکن اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ لے' پھر اسے غصہ آنے لگتا ہے۔ کہ پوچھے بغیر ہاتھ کیوں نہ پکڑ لیا۔ وہ بہانے بہانے ہاتھ آگے بڑھاتی ہے۔ اسے خود بھی اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ وہ ہاتھ کیوں آگے بڑھا رہی ہے۔

بہرحال ہم دونوں نے مل کر مجسٹریٹ کو پھانسنے کی ایک سکیم بنائی۔ مانی کو اس سکیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن چونکہ وہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ لہٰذا وہ اس پر عمل کرنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

فوجی سلوٹ

صبح سویرے ہم دونوں مجسٹریٹ کے گھر چلے جاتے اور وہاں انتظار کرتے۔ جب مجسٹریٹ

باہر نکلتا تو مانی دوڑ کر اس کے رو برو کھڑا ہو جاتا۔ زور سے پاؤں زمین پر مارتا۔ پھر اٹینشن ہو کر فوجی انداز سے سلوٹ مار کر کہتا' صاحب ہم ہفتوں سے آپ کی توجہ کے منتظر ہیں۔

پھر ہم سیدھے کرشن نگر چلے جاتے۔

جب بھی مجسٹریٹ الاٹ منٹ کرنے کے لیے مکان سے باہر نکلتا تو مانی' دھکے دیتا ہوا' بھیڑ کو چیر کر اس کے روبرو جا کھڑا ہوتا۔ زمین پر پاؤں مار کر اٹینشن ہو جاتا اور پھر فوجی سلوٹ مار کر کہتا حضور ہماری طرف بھی توجہ فرمائیے۔

اس طرح دن میں سات آٹھ مرتبہ مجسٹریٹ کو سلوٹ کیا جاتا۔ حتیٰ کہ جب وہ الاٹ منٹ کے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچتا تو دروازے پر ہم دونوں استادہ ہوتے اور حسب معمول مانی اٹینشن ہو کر سلام مارتا۔

پہلے روز ہی' چھٹے سلام پر' مجسٹریٹ نے چونک کر پہلی بار غور سے مانی کی طرف دیکھا۔ وہ پہلی مرتبہ تھی۔ جب اس نے پوری طرح جاگ کر کسی سائل کا جائزہ لیا تھا۔

تیسرے روز مجسٹریٹ کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ اس کی بے حسی پارہ پارہ ہو گئی۔

اس وقت وہ مکان سے قیمتی اشیاء کے انخلاء کے بعد الاٹ منٹ آرڈر بنانے کے لیے باہر نکلا تھا۔ اس روز بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ مانی نے اللہ اکبر کا ایک نعرہ لگایا۔ مجمع سہم گیا پھر وہ لوگوں کو دھکے دیتا ہوا غنڈوں کی طرح آگے بڑھا۔ مجمع سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

مجسٹریٹ کے روبرو پہنچ کر اس نے خود پر ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی۔ دفعتاً" جی حضوریے میں بدل گیا۔ اس نے زمین پر پاؤں مار کر فوجی سلوٹ کیا اور کہنے لگا جناب۔ میری بار کیوں دیر اتنی کری۔ اس درخواست میں دھونس ملفوف تھی۔

نائب فوراً" آگے بڑھا بولا' جناب اب دکان نمبر ۱۰۳۱۔ سی کی الاٹ منٹ کرنا ہے۔

ٹھہرو' مجسٹریٹ نے پہلی مرتبہ نائب کے روبرو بات کرنے کی ہمت کی' پہلے میں ان کو بھگتا لوں۔ کون سا مکان کرانا ہے' اس نے مانی سے پوچھا۔

کوئی سا بھی ہو۔ مانی نے کہا۔ چار دیواری ہو چھت ہو' جہاں ہم پناہ لے سکیں۔ ہمیں سامان کی ہوس نہیں۔

میں نے مانی کی بات سنی اور میرا دل ڈوب گیا۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ مانی نے وہی بات دہرائی تھی جو میں کئی ایک مرتبہ مانی سے کہہ چکا تھا۔

میرے ساتھ آؤ مجسٹریٹ نے کہا اور گلی کی نکڑ کی طرف چل پڑا۔

وہ پہلا دن تھا جب مجسٹریٹ آگے آگے چل رہا تھا اور نائب پیچھے پیچھے وہ پہلا دن تھا کہ مہاجرین کا ہجوم خوشی خوشی ساتھ چل رہا تھا' یوں جیسے تالیاں بجا رہا ہو۔ وہ پہلا دن تھا' جب سائلوں نے محسوس کیا تھا کہ ان کے نام کی الاٹ منٹ ہو رہی ہے۔

آخری مکان کے سامنے مجسٹریٹ رک گیا۔ مکان کے ماتھے پر لکھا تھا "لولی لاج"

لولی لاج مجسٹریٹ نے با آواز بلند پڑھا' یہ ٹھیک ہے نا اس نے پوچھا۔

او کے سر' مانی بولا۔

کارندے نے تالا توڑا۔ اور پھر ضروری کارروائی شروع ہو گی' ہجوم مکان کے سامنے ادھر ادھر بکھر گیا۔ چند لوگ سامنے خالی پلاٹ میں بیٹھ گئے۔ چند دکانوں کی ڈیوڑھیوں کی دہلیزوں میں بیٹھ گئے اور حسب دستور سب لوگ چیزوں کے انخلاء کے عمل کو دیکھنے لگے۔

ضروری کارروائی

ابتدائی دور میں جب وہ چیزوں کے انخلاء کو دیکھتے تھے تو ان کے دلوں میں تحسین کے جذبات ابھرے تھے کہ آنے والے حاجت مند مہاجرین کے لئے سامان اکٹھا ہو رہا ہے۔

پھر ان میں شکوک پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے اور وہ سمجھنے لگے کہ یہ مال خانہ بندر بانٹ کے لئے قائم کیا جا رہا ہے۔ اس پر ان کی نگاہوں میں حقارت جھلکنے لگی تھی۔

اور اب۔ اب وہ حقارت بیزاری میں بدل چکی تھی' انخلا کا وہ طویل عمل ان میں اکتاہٹ پیدا کرتا تھا' ایک عجیب سی بے بسی' مظلومیت اور کسمپرسی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

اس روز مانی چپکا ہوا تھا۔ مجمع کی نگاہوں میں ہیرو بنا ہوا تھا۔ چیزوں کے طویل انخلا کے دوران وہ آوازے کس رہا تھا۔ لے جاؤ' لے جاؤ۔ کوئی چیز باقی نہ رہے۔ ہمیں صرف گھر چاہیئے' خالی گھر۔ یہ گندگی اٹھا کر لے جاؤ۔ بھر لو' بھر لو۔ یہ گندگی اپنے دامن میں بھر لو۔

مجمع میں پہلی بار کسی نے چیزوں کے انخلا کے متعلق بات کرنے کی جرات کی تھی۔ وہ بات

جو ہر سائل کے دل میں ہفتوں سے اچھل رہی تھی۔ وہ بات جو دلوں میں رستا ہوا پھوڑا بن چکی تھی۔

مائی کی باتیں سن سن کر سائلوں کے دلوں میں ہمت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ دبی دبی آواز میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ اتفاق سے نائب باہر نکلا۔

مائی چلا کر بولا' نائب صاحب دیکھئے کوئی چیز اندر نہ رہ جائے' ساری غلاظت دور کر دیجئے۔ لے جایئے' لے جایئے میرے گھر کو پاک کر دیجئے۔

نائب کو یہ سن کر طیش آگیا۔ اس نے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی' ضروری کارروائی کرنا ہمارا فرض ہے' وہ بولا اور ———————

ضروری کارروائی' کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔

ضروری کارروائی' ایک گروہ چلایا۔

ضرور کیجئے ضروری کارروائی' ادھر سے آواز آئی۔

ضروری کارروائی بہت ضروری ہے، کوئی بولا۔

نائب صاحب بہت سیانے ہیں' غیر ضروری کارروائی نہیں کرتے۔

کچھ زیادہ ہی سیانے ہیں۔

اللہ بچائے اس سیانف سے۔

بے زبان زبانیں

چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

نائب نے ہوا کا رخ دیکھ کر تقریر کرنے کا خیال چھوڑ دیا اور چپ چاپ اندر جا داخل ہوا۔

باہر ایک عجیب تبدیلی عمل میں آئی۔ لوگوں کو گویا زبان مل گئی۔

میں پندرہ دنوں سے مجسٹریٹ کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہوں' ایک نے کہا۔

بارہ دن ہو گئے ہیں' وہ میری بات ہی نہیں سنتا۔

یہ مکان آخر کسے الاٹ ہو رہے ہیں۔

پتہ نہیں' بس ایک بار آتے ہیں اور مکان لے کر چلے جاتے ہیں۔

شام پڑ چکی تھی۔ سڑکوں پر بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔

عین اس وقت ایک کارندہ باہر نکلا اور چلا کر بولا۔ جاؤ جا کر لالٹین لاؤ۔

لالٹین' میں نے دہرایا' وہ کس لیے۔

چار ایک آدمی دوڑے۔

لالٹین کیوں' مانی نے ایک دوڑتے ہوئے کارندے سے پوچھا۔

اس مکان میں بجلی نہیں ہے' وہ بولا۔

اوہ میرا دل بیٹھ گیا۔

پھر دیر تک لالٹین ادھر ادھر اچھلتی کودتی رہیں۔

بالآخر مجسٹریٹ باہر نکلا۔

الاٹی حاضر ہو جائے' نائب نے آواز لگائی۔

میں اور مانی دونوں مجسٹریٹ کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور لالٹین کی روشنی میں فارم بھرنے لگے۔

یہ لو الاٹ منٹ آرڈر' مجسٹریٹ نے کاغذ مانی کی طرف بڑھا دیا۔مانی نے زور سے پاؤں زمین پر مارا۔ اٹینشن ہو کر مجسٹریٹ کو سلوٹ مارا اور بولا۔ حضور گھر میں اگر کوئی چیز بچ گئی ہو تو وہ نکال لیں۔

مجسٹریٹ نے گھور کر مانی کی طرف دیکھا۔

جناب اگر کوئی چیز بچ گئی ہو تو' مجھے اجازت دیجئے کہ میں صبح حضور کے گھر پہنچا دوں' مانی نے چیخ کر کہا۔

مجمع سے ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ایک ایسا قہقہہ جس میں کاٹ تھی۔ بلا کی کاٹ' ٹوٹ تھی' قیامت کی ٹوٹ!

چودھواں باب

لولی لاج

کئی ایک روز ہم نئے گھر کا جائزہ لینے میں کھوئے رہے۔

لولی لاج کسی ریلوے کے بابو کا گھر تھا' جو بالکل نیا بنا ہوا تھا اور ابھی تک مکمل نہیں ہوا تھا۔ گھر کے نیچے ایک تہہ خانہ تھا' جو عمارتی سامان سے بھرا ہوا تھا' لوہے کے گارڈر' لکڑی کے سلیپر' پانی کے پائپ' ٹونٹیاں' کابلے' کیل' پیچ' جالیاں' بجلی کی تاریں' سوچ ہولڈر' بیشتر سامان پر سرکاری مہریں لگی ہوئی تھیں۔

لوٹ کا مال

باورچی خانے کے شلفوں میں پتھر کے جار قطار میں لگے ہوئے تھے۔ کسی میں اچار تھا' کسی میں چٹنی مربہ' دیسی گھی' دالیں' چاول' گڑ' کھمبیاں' کھنبیاں' چینی اور جانے کیا کیا۔

چلو دو مہینے کی ہانڈی روٹی کا سامان تو ہو گیا' ماں نے چٹکیاں بجاتے ہوئے کہا۔

نہ نہ نہ اقبال بولی' میں تو یہ سب پھینکوا دوں گی۔

کیوں' میں نے پوچھا۔

نہ ہم نہیں برتیں گے ہندوؤں کی چیزیں۔

کرشن نگر



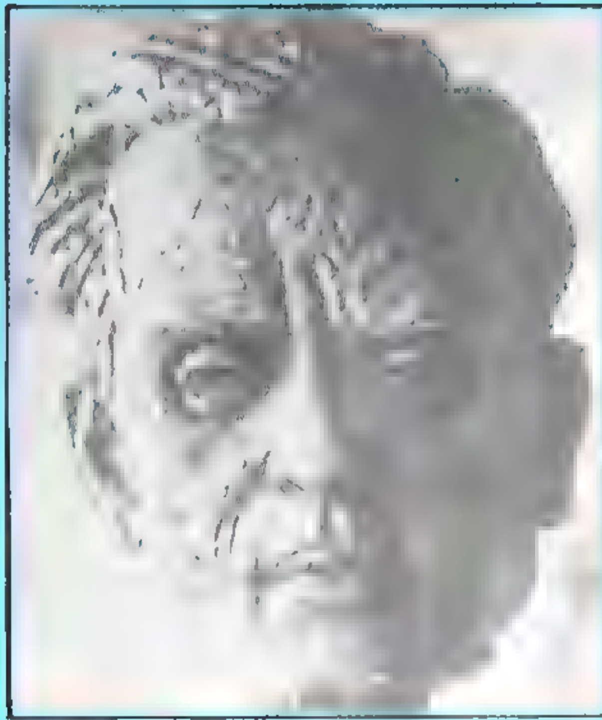
اشفاق احمد



ذوبی



چودھری برکت علی (مکتبہ اردو لاہور)



ذوبی کا بنایا ہوا بسٹ (۱۹۴۸ء)



منشا یاد - ادبی تنظیم رابطہ



ادا جعفری - ادبی تنظیم سلسلہ

بالکل ٹھیک ہے' مانی ہنس کر بولا' تم نہ برتو۔ تم اپنا دھرم بھرشٹ نہ کرو۔ اپنا تو کوئی دھرم ہی نہیں جو بھرشٹ ہو جائے۔ یہ جو گھی ہے' اس کے پراٹھے پکا دیا کرو مجھے' روز صبح شام۔

نہ ایسا نہ کرنا' اماں نے کہا' کہتے ہیں ہندو جاتے وقت کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملا گئے ہیں۔ محلے میں بہت لوگ بیمار پڑے ہیں۔ برا حال ہے کہتے ہیں دو مر بھی گئے ہیں۔

ہے سچ' اقبال نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی۔

مجھے کچھ نہیں ہوتا اماں' مانی چلایا۔

نہ بیٹا احتیاط کرنی اچھی ہوتی ہے۔

میں بڑی احتیاط سے پراٹھے کھاؤں گا اماں' مانی نے قہقہہ لگایا۔

لو یہ تو مذاق اڑاتا ہے' اماں چڑ گئی۔

اے ہٹاؤ' اس بات کو اقبال نے کہا۔

اور وہ پھر سے باورچی خانے کا جائزہ لینے لگے۔ برتنوں کی الماری میں اوپر تھالیاں ہی تھالیاں پڑی تھیں' چھوٹی تھالیاں' بڑی تھالیاں' درمیانی تھالیاں' سیدھی تھالیاں' ڈونگی تھالیاں۔ نچلے دراز کٹوریوں سے بھرے ہوئے تھے۔

یا اللہ اتنی ساری کٹوریاں اور تھالیاں' اماں حیرانی سے الماری میں جھانکنے لگی۔

اماں' مانی بولا' ہندو کوئی ہماری طرح کٹورہ بھر کر آلو گوشت تھوڑا کھاتے ہیں۔ وہ تو بھجیا پکاتے ہیں۔ ایک نہیں چار چار بھجیا۔ ہر کسی کے سامنے بڑی تھالی میں چھ کٹوریاں جاتی ہیں۔ ایک میں کدو دال' ایک میں آلو' ایک میں بھنڈی اور ایک میں بھرتا۔ پھر چٹنی' مربہ' اچار۔ گھر میں چھ کھانے والے ہوں تو چھتیس کٹوریاں تو روزانہ استعمال کی ہوتی ہیں پھر آنے جانے والوں کی بھی تو ہونی چاہیں۔

ہے اتنی ساری' اماں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے جا رہی تھی۔

ڈرائنگ روم میں کرسیاں صوفے اور میزیں پڑی تھیں۔ لیکن فرنیچر کی نوعیت بیٹھک کی سی تھی' ڈرائینگ روم سی نہیں۔ ظاہر تھا کہ لالہ جی ڈرائینگ رومئے نہیں بلکہ بیٹھکنیے تھے۔

بیٹھک کے حوالے سے وہ سامان بہت عمدہ تھا' نہ تو نازک تھا نہ خوب صورت' بھاری تھا'

بھدا تھا' مضبوط تھا۔ اس میں انگریز کے دور کے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم کی واضح جھلک تھی۔

نو دو لیتے

سامان دیکھ کر مجھے اندر ہی اندر دکھ ہوا۔ میرا ڈرائینگ روم کا خوب پورا نہ ہوا تھا۔ اس لیے' لیکن پھر بھی میں بہت خوش تھا' چلو ڈرائینگ روم نہ سہی'۔ بیٹھک تو بجی سجائی مل گئی۔ اگرچہ غالیچہ نہ تھا' لیکن فرنیچر تو تھا۔

بیڈ رومز میں بہت بھاری نواری پلنگ تھے' پیڑھے تھے' بڑے بڑے آئینے' سلیپروں کے بنے ہوئے موٹے ڈگ قسم کے میز۔

صندوق کپڑوں سے بھرے ہوئے تھے' لیکن ان کپڑوں کی نوعیت ایسی تھی جیسے آجکل لنڈے بازار کے فٹ پاتھ پر کپڑوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں اور پرچون فروش "لے جاؤ روپے' دو روپے" کا آوازہ لگاتے ہیں۔

بہرصورت ہم محسوس کر رہے تھے جیسے دفعتاً" غربت سے امارت میں آداخل ہوئے ہوں۔ ایک صاف ستھرا مکان ایک الگ بیٹھک' اتنے سارے برتن اور طرح طرح کے رنگ رنگ کے ہر سائز کے کپڑے' سلے ہوئے' ادھ سلے' ان سلے۔

اس امارت میں صرف ایک کسر تھی وہ یہ کہ گھر میں بجلی نہیں لگی ہوئی تھی۔

بجلی کے بغیر گزارہ تو ہو سکتا تھا لیکن اتنے خوبصورت گھر کو لالٹینوں سے دھندلانا۔ میرے لیے قابل قبول نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ بجلی کے پول کی تاریں مکان کی چھت کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔ میں نے تہہ خانے سے تین ریلوے گلوب لیمپ نکالے' ان میں بلب فٹ کر کے تاریں لگائیں۔ صحن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے نیگیٹو کرنٹ حاصل کی۔ تاریں جوڑ کر بیٹھ گیا۔ جب شام کا دھندلکا ہوا تو میں نے ایک لمبے بانس سے تار لٹکایا جس کے اوپر ہک لگا ہوا تھا۔ بانس کی مدد سے ہک پول کی تار پر اٹکا دیا۔ تینوں بلب روشن ہو گئے۔

پھر ہمارا معمول ہو گیا رات کو ہم مین لائن پر ہک لگا دیتے اور صبح سویرے اسے کھینچ کر الگ کر دیتے مشکل یہ تھی کہ اپنے ازلی خوف کی وجہ سے میں بتیوں کو کیما فلاژ رکھنے پر مصر تھا۔ اس لیے گھر میں مدہم روشنی رہتی۔ مانی اس پر سخت چیں بجبیں ہوتا۔ کہتا تھا' کھلم کھلا بتیاں جلاؤ۔ گھر

کو منور کر دو۔ کوئی پوچھے گا تو میں نپٹ لوں گا اس سے۔

پر اسرار نیم چھتی

پھر گھر میں وہ سر بمہر نیم چھتی تھی۔ یہ نیم چھتی میری توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

مجسٹریٹ الاٹ منٹ کرتے وقت ہر گھر میں کچھ چیزیں کسی چھوٹے کمرے میں رکھ کر اسے مقفل کر کے سر بمہر کر دیتا تھا اور الاٹ منٹ آرڈر دیتے وقت الاٹی سے ایک حلف نامہ لیتا کہ وہ اس بات کا ذمہ لیتا ہے کہ سر بمہر کمرے میں مداخلت نہیں کرے گا۔ محکمہ جب جی چاہے' سر بمہر کمرے کا معائنہ کر سکتا ہے۔ الاٹی اس کمرے کی چیزوں کی حفاظت کرے گا۔ اگر مہریں ٹوٹی ہوئی پائی گئیں تو اس کی ذمہ داری الاٹی پر ہو گی اور وہ سزا کا مستوجب ہو گا۔

لولی لاج میں سر بمہر کمرا ایک نیم چھتی تھی۔ یہ نیم چھتی میرے بیڈ روم میں کھلتی تھی۔

رات کو جب بھی میں پلنگ پر لیٹتا تو میری نگاہ بار بار نیم چھتی کے دروازے کی طرف اٹھ جاتی۔ ان جانے میں' میں للچائی ہوئی نظروں سے نیم چھتی کی طرف دیکھنے لگتا۔ پھر مجھے احساس ہوتا کہ کیا کر رہا ہوں اور میں لاحول پڑھ کر کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتا۔ پھر ہوش آتا تو دیکھتا کہ میری نگاہیں کتاب کی بجائے نیم چھتی کے دروازے پر مرکوز ہیں۔ تنگ آکر میں بتی بجھا کر سو جاتا۔ پھر رات کو خواب میں نیم چھتی میرے سامنے کھڑک سے کھل جاتی۔

دن کے وقت میرے دل میں نیم چھتی کے لیے حقارت پیدا ہو جاتی تھی۔ اس خیال پر شرم محسوس ہوتی کہ رات کو نیم چھتی کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر نیند میں اس کے خواب دیکھتا رہا' لاحول ولا قوۃ' یہ بھی کوئی قابل توجہ چیز ہے بھلا۔ اول تو وہاں دھرا ہی کیا ہے' اگر کچھ ہے بھی تو الاٹ منٹ مجسٹریٹ کے حواریوں نے اسے کھنگال لیا ہو گا۔ محض دکھاوے کے لیے سر بمہر کیا ہے نا۔ فرض کرو' اس میں کچھ قیمتی چیزیں ہیں' تو پڑی ہوں۔ مجھے چیزوں کا لالچ نہیں۔ فرض کرو۔ وہاں زیور پڑے ہیں یا نقد روپوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں' تو لگے رہیں۔ میرے کس کام کے مجھے تو بس ایک ہانڈی روٹی کی ہی پرابلم ہے نا۔ سو وہ کچھ دیر کے لیے تو حل ہو گئی ہے اور کچھ نہیں تو دالیں' چاول' مرچ' مصالحے تو مل ہی گئے ہیں' جب یہ ختم ہو جائیں گے تو دیکھا جائے گا۔ میں کوئی حریص تھوڑا ہوں جو دولت کے لیے مرتا پھروں۔

لاحول ولا قوۃ

سارا دن میرے دل میں نیم چھتی کی تحقیر تلوار کی طرح لٹکتی رہتی۔ لاحول پڑھ کر اکتا جاتا۔ پھر جب رات کو بستر پر لیٹ کر پڑھنے کی کوشش کرتا تو کتاب پر چھپے ہوئے حروف میری نظروں تلے ناچتے اور ناچ ناچ کر بالکل ویسی شکل اختیار کر لیتے جیسے نیم چھتی کی کھڑکی تھی۔ گھبرا کر میں کتاب سے نکل کر نگاہیں ہٹا لیتا۔ پھر ہوش آتا تو سامنے وہی نیم چھتی کی کھڑکی ہوتی۔ پھر ٹھک سی آواز آتی۔ تالہ ٹوٹ جاتا ——— کھڑکی کے پٹ چراوں کر کے کھلنے لگتے۔ ایک درز بن جاتی اور اس درز سے زیورات کے ڈبے جھانکتے۔

چار چھ دن تو یہ کشمکش لگی رہی۔ آخر ایک رات کتاب پھینک کر میں اٹھ بیٹھا۔ آخر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ یہ تو محض کیوراسٹی ہے، لالچ تو نہیں۔ کیوراسٹی تو ایک صحت مند جذبہ ہے۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ اس نیم چھتی میں ہے کیا۔

لیکن سر بمہر تالہ ——— اگر تالے کی مہر ٹوٹ گئی تو کیا ہوگا، کتنی رسوائی ہوگی ——— نہیں نہیں فضول ہے۔ خواہ مخواہ خود کو ذلیل کرنا۔ میں پھر رک جاتا ——— پھر دفعتاً خیال آتا، دیکھوں تو سہی نیم چھتی کتنی بڑی ہے آخر دروازے میں کوئی درز تو ہوگی ——— میں اٹھ بیٹھا۔

نیم چھتی کی کھڑکی کمرے کے دروازے کے عین اوپر تھی۔ اس میں داخل ہونے کے لیے کوئی زینہ نہ تھا۔

ارے وہ اونچا سٹول جو ہے۔ ہاں یقیناً وہ سٹول اسی لیے بنایا گیا ہے کہ نیم چھتی پر چڑھا جا سکے۔

پہلی مرتبہ جب میں نے وہ سٹول دیکھا تھا تو حیران ہوا تھا۔ اتنا اونچا سٹول بیٹھنے کے کام تو نہیں آ سکتا۔ پھر اتنا اونچا بنانے کا مقصد پھر جب انہوں نے باورچی خانے کی الماریوں کے اوپر سے شلفوں کی تلاشی لینی تھی تو اقبال بیٹھک سے وہی سٹول اٹھا کر لے آئی تھی۔ اس وقت میں نے غور سے دیکھا تھا کہ سٹول کی ایک طرف اوپر تک ڈنڈے لگے ہوئے تھے۔ اچھا تو یہ سٹول نہیں بلکہ زینہ ہے۔

میں بیٹھک سے سٹول اٹھالایا۔

دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ اگر بلند بخت جاگ اٹھی تو وہ کیا کہے گی۔ سمجھے گی کہ حرص کی وجہ سے نیم چھتی کو کھول رہا ہوں۔ اس کے دل میں میرے لیے کیا عزت رہ جائے گی۔

میں رک گیا۔

دیر تک اقبال کے سرہانے کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

اقبال سوتے میں خراٹے لے رہی تھی۔

ٹھیک تو ہے' میں نے سوچا' جونہی خراٹے بند ہوں گے۔ میں نیچے اتر آؤں گا۔ یہ سوچ کر میں سٹول پر چڑھ گیا۔ تالے پر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ کپڑے پر تین مہریں لگی ہوئی تھیں۔

میں نے درز سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ کچھ دکھائی نہ دیا۔ دفعتاً" خیال آیا کہ نیم چھتی میں کوئی روشنی تو ہے نہیں پھر اندر سے کچھ دکھائی کیسے دے گا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اقبال کے خراٹے بند ہو گئے۔ میں نے چھلانگ لگا دی۔

آواز سن کر اقبال جاگ اٹھی وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

آپ کیا کر رہے ہیں' وہ بولی —————— اور یہ سٹول یہاں کیسے آگیا۔

جواب میں میں نے کئی ایک بہانے بنائے لیکن اقبال مطمئن نہ ہوئی۔ اقبال کے شکوک جاگنے کی وجہ سے ایک اور مشکل حائل ہو گئی۔

کھل جا سم سم

پھر ایک رات میں نے بڑی محنت سے تالے کے اوپر لپٹا ہوا کپڑا اتار لیا' یوں کہ مہریں جوں کی توں قائم رہیں۔

چابیوں کے گچھے کی مدد سے تالہ کھولا اور لالٹین اٹھا کر نیم چھتی میں داخل ہو گیا۔

وہ ایک چھوٹی سی نیم چھتی تھی۔ چھ سات فٹ چوڑی دس فٹ لمبی۔ اس میں دو روشن دان تھے۔

نیم چھتی میں ایک طرف بڑے بڑے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک حمام' چند تھال' پراتیں' فرشی پیک دان' سر دوش' چھلنیاں۔

برتنوں کے اس ڈھیر کے پاس ہی کپڑوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے فراک' کرتے' قمیض' لنگوٹ' رومال' نیپ کن' ڈسٹر۔

کپڑوں کے اس ڈھیر کے ساتھ ہی لکڑی کا ایک صندوق تھا' صندوق میں گرم کمبل اور چادریں تھیں۔

صندوق کے ساتھ ایک جستی پیٹی پڑی تھی۔

میں نے پیٹی کی طرف دیکھا دل دھک سے رہ گیا ——— لالٹین کا شعلہ لرزا۔ نیم چھتی کی دیواریں گھومنے لگیں۔ میں زمین پر بیٹھ گیا' سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

دیر تک میں یونہی بیٹھا رہا۔ پھر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور پیٹی پر پڑے ہوئے ڈھیر کی طرف دیکھا۔

زیورات کے ڈبے

پیٹی پر خوبصورت ڈبوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈبیاں' بڑی ڈبیاں' چھوٹے بڑے ڈبے' وہ سب ڈبیاں ڈبے سرخ رنگ کے تھے ان پر چھپے ہوئے لیبل لگے تھے۔ لیبلوں پر جیولرز کے پتے لکھے ہوئے تھے۔

اتنے سارے ڈبے ——— شاید چالیس ہوں' اتنے سارے زیورات۔

میرا دل چاہا کہ اٹھ کر ڈبوں کو کھولوں۔ دیکھوں' لیکن ہمت نہ پڑی۔ اگر یہ بھرے ہوئے نکلے تو ——— میرا دل دھک سے بجا ——— اور اگر یہ خالی ہوئے تو ——— مجھے پسینہ آگیا۔

یہ کیا ہو رہا ہے۔ قریب ہی سے آواز آئی۔

میں چونکا ——— مڑ کر دیکھا ——— ارے تو ہے اقبال۔

آپ یہاں کیا کر رہے ہیں' وہ بولی

آ جاؤ آ جاؤ اندر آ جاؤ۔

یہاں چڑھنے کی کیا ضرورت تھی' وہ بولی' یہاں کیا دھرا ہے ——— پوتڑے اور کیا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اقبال کو اشارہ کیا———وہ ڈبے———خاموش۔

اقبال قہقہہ مار کر ہنسی———خالی ڈبوں کو کیا کرنا ہے' وہ بولی' آپ سمجھتے ہیں کہ بھرے ڈبے یوں چھوڑ گئے ہیں لالہ جی اور جو چھوڑ بھی گئے ہوتے تو مجسٹریٹ کے بابو اندھے تھے کیا۔ انہیں ڈبے نظر نہ آئے تھے۔ آپ بھی حد کرتے ہیں۔

ہے' دفعتاً" وہ چلا کر بولی' اس پیٹی میں رضائیاں ہوں گی۔ جو نکل آئیں تو میری پریشانی دور ہو جائے گی' سردی سر پر آئی ہے اور ساری رضائیاں پھٹی ہوئی ہیں۔

یہ کہتے ہوئے وہ نیم چھتی پر چڑھ آئی۔ اس نے ہاتھ مار کر سارے ڈبے فرش پر گرا دیئے۔ اور پیٹی کھول دی۔ پیٹی کھلی تو اس نے خوشی بھری چیخ ماری ہے اللہ وہ چلائی' چار رضائیاں' دو تلائیاں اور تین کمبل' موج ہو گئی۔ یہ مہر لگانے والے بھی کتنے احمق ہیں۔ بے کار کی چیزیں تو باہر چھوڑ گئے اور برتنے کی چیزوں پر مہر لگا دی۔

ایک دو روز تو میں اپنی بیوی کی پریکٹیکل وزڈم پر سر دھنتا رہا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد میرے دل میں پھر سے شکوک پیدا ہونے لگے۔

شاید وہ ڈبے بھرے ہوئے ہوں سارے نہ سہی شاید چند ایک۔ شاید غلطی سے کوئی زیور ڈبے میں ہی رہ گیا ہو۔ کم از کم انہیں کھول کر دیکھ تو لیتے۔

ڈر کا ٹکڑا

میں نے کبھی مانی سے نیم چھتی کی بات نہ کی تھی۔ مجھے یہ ڈر نہ تھا کہ مانی اس سے اپنا حصہ مانگے گا۔مانی ملکیت کی ہوس سے بے نیاز تھا۔ وہ صرف حال میں جیتا تھا۔ اسے صرف آج کی ضرورت کا احساس تھا۔ اس نے کبھی کل کے بارے میں نہ سوچا تھا۔ کھانے کو پلاؤ مل جاتا یا چٹنی' اس کے لیے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر میں نے نیم چھتی کی بات کی تو مانی لپک کر اوپر چڑھ جائے گا۔ ہتھوڑی سے تالہ توڑ دے گا اور کہے گا ہٹاؤ یار سیل ویل کا ٹنٹا۔ کھول دو دروازہ۔ کھلا رہنے دو نیم چھتی کو۔ جو جو چیز چاہیئے نکال لو۔ بلکہ سبھی کچھ نکال لو۔ یہاں ان چیزوں کو کیڑے ہی

کھائیں گے نا۔ کیڑوں سے یہ بہتر نہیں کہ ہم انہیں استعمال میں لے آئیں۔ اگر محکمے والوں نے پوچھا تو میں سمجھ لوں گا ان سے۔

شاید اسی لیے میں نے مائی سے نیم چھتی کی بات نہ کی تھی یا شاید اس کی وجہ خوف ہو۔ جن کے دل میں خوف ہوتا ہے وہ کہہ دینے سے ڈرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بے معنی باتوں کو چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ خوف ایک ایسا مکڑا ہے جو دل کے کونوں میں جالے تن دیتا ہے جن میں احساس گناہ کی مکھیاں لٹکتی رہتی ہیں۔

ان دنوں مائی خود اپنے شغل میں کھویا ہوا تھا۔ مائی کیا' لولی لاج کے سارے افراد اپنی اپنی دھن میں لگے ہوئے تھے۔

اپنی اپنی دھن

اماں ان دنوں چیزیں بانٹنے میں بری طرح سے مصروف تھی۔ سارا دن وہ ادھر ادھر سے چیزیں اکٹھی کرتی رہتی۔ برتن' کپڑے' کھلونے سب کچھ۔ پھر وہ انہیں بانٹتی۔ بالکل ایسے جیسے اندھا ریوڑیاں بانٹتا ہے۔

تقسیم کے بعد بٹالے کے مفتی مختلف شہروں میں بٹ گئے تھے۔ کچھ لاہور آ گئے کچھ لائل پور کی طرف نکل گے۔ ان میں میرے چند قریبی عزیزوں نے کرشن نگر اور اس کے نواحی علاقوں میں مکان حاصل کر لیے تھے۔ والد صاحب کو رام نگر میں ایک مکان الاٹ ہو گیا تھا۔

میری ہمشیرہ اور بہنوئی جو تقسیم سے پہلے ہی کرشن نگر میں مقیم تھے۔ انہیں بھی لولی لاج کے قریب ہی مکان الاٹ ہو گیا تھا۔

اماں سارا دن لولی ح کے کونوں کھدروں سے چیزیں چنتی رہتی' پھر جب شام پڑتی تو وہ کپڑوں' کٹوریوں اور کھلونوں کی پوٹلی بنا کر اسے بغل میں دبا کر چل پڑتی تاکہ اپنوں میں بانٹ سکے۔ اقبال گھر کو سنبھالنے میں مصروف تھی۔ اس نے کبھی اتنی ساری چیزیں نہ دیکھی تھیں۔ شادی کے بعد جس گھر میں اس نے قدم رکھا تھا وہاں دھول اڑتی تھی' نہ تو ضرورت کی چیزیں تھیں اور نہ ہی توجہ دینے والا میاں۔

ایمن آباد کے میاں تاجر لوگ تھے۔ سارا دن وہ اپنی اپنی دکان پر بیٹھے رہتے۔ شام کو جب

ان کے آنے کا وقت ہوتا تو گھر والیاں بن سنور کر بیٹھ جاتیں تاکہ میاں کی توجہ کاروبار سے منعطف کر کے اپنی طرف مبذول کریں' تھکے ہارے میاں کو از سرنو تازگی بخشیں اور اس میں زندگی کا ولولہ پیدا کریں۔ سالہا سال کے تجربے کی بناء پر ایمن آباد کی گھر والیاں اس فن میں تاک ہو چکی تھیں۔

اقبال بیگم میاں کی توجہ کی طالب ضرور تھی۔ لیکن اس کی خواہش تھی کہ وہ توجہ مدہم مدہم رہے' اس میں اتنی شدت پیدا نہ ہو کہ شعلہ بھڑک اٹھے اور ملاپ کی مصیبت پڑ جائے وہ ملاپ کی خواہش سے محروم تھی۔ ملاپ اس کے لیے ایک تکلیف دہ امر تھا۔

جوانی میں جو المیہ اس پر گزرا تھا۔ اس نے ملاپ کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں میاں کے قرب کا خوف طاری کر دیا تھا۔

چوبِ خشکِ صحرا

جب اس کی پہلی شادی ہوئی تھی تو وہ بڑی دھوم دھام سے دولہن بنی تھی۔ پھر سہاگ رات وہ بیٹھی دولہا کا انتظار کرتی رہی تھی' انتظار کرتی رہی تھی۔ سات سال انتظار کرتی رہی تھی' لیکن دولہا نہیں آیا تھا۔ پھر وہ مایوس ہو کر سوکھ گئی تھی۔

سات سال وہ ماں باپ کے گھر میں بیٹھی سوکھتی رہی تھی۔ اس کی نسیں سوکھ گئیں' اعصاب اکڑ گئے' نسائی نظام زنگ آلود ہو گیا تھا۔ اپنے تحفظ کے لیے اس نے شادی کے متعلق دل میں حقارت پال لی۔ پھر وہ اس حقارت کو پنکھا کرتی رہی' حتیٰ کہ وہ ایک پھوڑا بن گیا۔ سات سال میں یہ پھوڑا ناسور بن کر بہنے لگا تھا۔

زنگ آلود

اب اقبال بیگم کے لئے میاں ایک تکلیف دہ رشتہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایمن آباد کے گھر والوں کی طرح اس کا میاں بھی پاس آ بیٹھے۔ اس سے باتیں کرے' اڑوس پڑوس کی باتیں' عزیز و اقربا کی باتیں' آنے جانے والوں کی باتیں' وہ دونوں باتیں کرتے رہیں' کتر کتر باتیں کرتے رہیں' حتیٰ کہ باتوں کا ایک ڈھیر لگ جائے اور پھر تھک کر اپنے اپنے پلنگ پر لیٹ کر سو جائیں۔

ادھر میں ایک تھکا ہارا مسافر تھا۔ میں نے کئی ایک محبتیں کی تھیں اور ان محبتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا تھا۔ مجھے باتیں کرنے کا شوق تو تھا۔ لیکن بلند بخت کو سامنے بیٹھے دیکھ کر سبھی باتیں بھول جاتی تھیں۔ وہ ذہنی عورت نہ تھی۔ اس کے خیالات رسمی اور منجمد تھے۔ اس سے تبادلہ خیال ممکن نہ تھا۔ اپنی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لیے' ذہنی تشدت سے نجات پانے کے لیے میرے پاس دو گھڑی کے جنسی ملاپ کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہ تھا' لیکن بلند بخت کا زنگ آلود نظام ملاپ سے خائف تھا۔ اس کا سارا جسم اس کے خلاف احتجاج کرتا تھا۔

اسی وجہ سے اقبال بیگم کی تمام تر توجہ گھر پر مرکوز تھی۔ سارا سارا دن وہ گھر کی دیکھ بھال کرنے میں بسر کر دیتی۔ فرصت کے اوقات اس غم میں آہیں بھرنے میں کٹ جاتے کہ گھر میں کوئی اس سے باتیں کرنے والا نہ تھا۔

لوبی لاج میں آ کر وہ بالکل ہی گھر میں کھو گئی تھی' چونکہ پہلی مرتبہ اسے چیزوں والا گھر میسر آیا تھا۔ چیزوں کو بنا سجا کر رکھنا اور پھر ہر ہفتے کے بعد ترتیب کو بدل دینا' اس کا من بھاتا مشغلہ تھا۔

ڈرا' سہما

لوبی لاج میں عکسی بہت خوش تھا۔ پہلی بار اسے کھیلنے کے لیے ایک لمبا چوڑا پختہ صحن مل گیا تھا۔ وہ سارا دن چھوٹی چھوٹی چیزیں اکٹھی کر کے صحن میں کھیلتا رہتا' اکتا جاتا تو باہر کا دروازہ کھول کر سامنے چوگان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھتا رہتا۔ اس میں اتنی جرات پیدا نہ ہوئی تھی کہ دروازے کو پار کر کے چوگان میں اتر جائے۔

ازلی طور پر عکسی ایک ڈرا ہوا' سہا ہوا بچہ۔ اس کی عمر صرف چھ سات سال کی تھی' لیکن اس نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا تھا۔

بالپنے میں گھر میں بھیڑ تھی' بہنیں تھیں' بھائی تھے' امی تھی' ابو تھا۔ اور وہ سب اس سے محبت کرتے تھے اور لاڈ لڈاتے تھے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا' ابو چلا گیا۔ پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ سبھی کہتے تھے کہ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔

پھر ابو واپس آ گیا اور چھپ چھپ کر اسے ملتا رہا۔ وہ اسے چھپ چھپ کر کیوں ملتا تھا'

کیوں؟

پھر امی بیمار پڑ گئیں' اور ایک روز وہ اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔

پھر ابو آ گیا اور اسے انگلی لگا کر ایک نئے گھر میں لے گیا جہاں ایک بوڑھی مائی سارا دن اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے بھائی بہن کہاں چلے گئے تھے' پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے' کیوں چلے گئے تھے۔

پھر ان کے گھر ایک امی آ گئی تھی۔ یہ امی ———— وہ امی نہ تھی جو اس کی اپنی امی تھی۔

اب وہ ایک اور نئے گھر میں آ گئے تھے۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ چیزیں بدل رہی تھیں' لوگ بدل رہے تھے۔ کسی پر بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ کہ کب چلا جائے' ہمیشہ کے لیے چلا جائے' کب آ جائے اور اس کے ساتھ رہنے لگے۔ اس کے دل میں ننھے ننھے خوف جاگزیں تھے۔ نہیں میں دروازے کی دہلیز کو پار کر کے چوگان میں نہیں جاؤں گا۔ پتہ نہیں میں کہاں جا پہنچوں۔ وہاں کون لوگ ہوں۔ نہیں میں چوگان میں نہیں جاؤں گا۔

پھر مانی تھا' مانی واحد شخص تھا جو نئے گھر سے بے نیاز تھا' چیزوں سے بے نیاز تھا۔ اس کے لیے لولی لاج میں آنے سے چنداں فرق نہ پڑا تھا۔ ہاں ایک بات ضرور تھی۔ لولی لاج میں آ کر اس کے اردگرد ایک نیا ماحول آ کھڑا ہوا تھا۔

چھیڑ تماشہ

مانی گرد و پیش کے خوبصورت مکانوں سے متاثر نہ ہوا تھا۔ البتہ ان کے مکینوں سے ضرور متاثر تھا۔

گرد و پیش کے مکانوں میں بہت سی نوجوان لڑکیاں آ بسی تھیں۔ ایک تو ان میں جوانی کا زور تھا' دوسرے ان کی نفسیت نو دولتیوں کی سی تھی۔ نئے گھر' نئے کپڑے' نئی چیزیں' نیا محلّہ' نئے لوگ' نیا ماحول۔ اس نئے پن نے ان کی نئی جوانی کو ہوا دی تھی' اور ان میں نئی بے تابی کو جگا دیا تھا۔ وہ یوں پھدکتی پھرتی تھیں' جیسے اولین بہار میں دم ہلانے والی چڑیاں درختوں پر

پھدکتی ہیں۔ دگڑ دگڑ کھڑکی سے منڈیر پر' منڈیر سے کوٹھے پر' کوٹھے سے بالکنی پر' بالکنی سے پھر کھڑکی میں۔ کبھی دوپٹہ سنبھالتیں' کبھی ہنس ہنس کر دہری ہوتی جاتیں' کبھی چیختیں' کبھی جھینپتیں' کبھی اشارے کرتیں' مسکاتیں۔

مانی کو لڑکیوں سے دلچسپی نہ تھی' صرف چھیڑ چھاڑ کا متوالہ تھا۔ یوں جس طرح شریر بچے مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ کر خوش ہوتے ہیں۔

مانی کسی ایک لڑکی کو چھیڑ دیتا تو وہ اس حد تک چھڑ جاتی کہ آپے میں نہ رہتی۔ بھاگتی' دوڑتی' آنکھیں گھماتی' طرح طرح کے پوز بناتی اور خود کو ہر زاویے سے دکھانے کے شوق میں باؤلی ہو جاتی۔ پھر وہ دن بھر چھڑی رہتی اور ایسی مستی دکھاتی کہ مانی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا سارا رس نچڑ جاتا۔ پتہ نہیں مانی کس مٹی سے بنا ہوا تھا۔ وہ لڑکی کو چھیڑ کر آرام سے بیٹھ کر تماشا دیکھا کرتا تھا۔

اگلے روز وہ کسی دوسری لڑکی کو چھیڑ دیتا۔ اور پھر وہ بیچاری اس خوش فہمی کا شکار ہو جاتی کہ توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ پھر وہ پروانہ صفت پر پھڑپھڑاتی' تڑپتی' خود کو ہلکان کر لیتی۔

مانی کی اس تماشہ بین چھیڑ چھاڑ سے محلے کی تمام لڑکیاں یوں چھڑ گئی تھیں جیسے مکھیوں کا چھتہ ہوں۔ ان چھڑی ہوئی بھن بھن کرتی ہوئی مکھیوں کے سامنے مانی یوں مگن بیٹھا رہتا تھا' جیسے سپیرا سانپوں میں بیٹھا بین بجا رہا ہو۔

پندرھواں باب

ننھو، ڈوبی

جب میں ریفوجی کیمپ میں ملازم تھا تو وہاں پہلی بار میں نے اشفاق احمد کو دیکھا۔

ایک روز جب میں کیمپ کے ایک ویران کونے میں سوچ میں ڈوبا ٹہل رہا تھا تو ایک چٹی سفید گلابی جھال میں ڈوبی ہوئی، شگفتگی سے بھری ہوئی، قدرتی طور پر بنی بچی کشمیرن میرے روبرو آکھڑی ہوئی۔ آنکھیں چمکا کر بولی، آپ ممتاز مفتی ہیں نا۔

میں حیران ہوا، یا اللہ یہ میرا نام کیسے جانتی ہے۔ جی، میں نے جواب دیا۔ میں ممتاز مفتی ہوں۔

میرا نام اشفاق احمد ہے، اس نے کہا۔

بہت خوب۔

ہم نے آپ کی آپا پڑھی ہے۔

بہت اچھا کیا آپ نے۔ لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچانا۔

آپ کی تصویریں جو جریدوں میں چھپتی ہیں۔ ویسے بھی ہم نے تصور میں آپ کو کئی بار دیکھا تھا۔

آپ تصور کے رہنے والے ہیں کیا۔

نہیں' وہ بولا ہم مکتسر میں رہتے تھے' فیروز پور ضلع میں سیر کرنے کے لیے قصور آیا کرتے تھے۔ رن تھرو میل میں چڑھ جاتے تھے اور قصور اتر جاتے۔

میں نے حیرت سے سیندھوری میدے سے بنی ہوئی خاتون کی طرف دیکھا۔ یہاں کس سے ملنے آئے ہیں آپ۔ میں ساتھ والے کیمپ میں کلرک ہوں اس نے جواب دیا کبھی آئیے نا ادھر۔

داستان گو

پہلی مرتبہ میں اشفاق احمد سے ملا تو ایسے لگا جیسے گلابی مخمل پر سنہرے تاگے سے بیل بوٹے کڑھے ہوں۔ اس کی بھرپور جوانی' جھلمل جھلمل کر رہی تھی اور اس پر انبساط کی پھل پتیاں ٹانکی ہوئی تھیں۔

پھر ہم آپس میں ملنے لگے۔

پہلے اتفاقاً'' بر سرے را ہے۔ پھر التزاماً'' طے شدہ جگہوں پر ان دنوں ابھی اشفاق' اشفاق احمد نہیں بنا تھا۔ ابھی بننے کا عمل شروع نہیں ہوا تھا۔ غالباً'' صلاحیتیں ابھی خوابیدہ تھیں۔ البتہ ایک خصوصیت اپنے جوبن پر تھی۔ وہ پورے طور پر داستان گو تھا۔

گمان غالب ہے کہ آپ ''داستان گو'' کا مفہوم پورے طور پر نہیں سمجھتے' چونکہ آپ نے کبھی روایتی لوک داستان گو نہیں دیکھے' نہیں سنے۔

روایتی داستان گوئی میں' نغمہ ہوتا ہے' ساز ہوتا ہے' ڈرامہ ہوتا ہے' ساؤنڈ ایفکٹ ہوتے ہیں۔ داستان گو داستان سناتا ہی نہیں' داستان پر فارم کرتا ہے۔ اشفاق ان دنوں بنیادی طور پر پرفارمر تھا۔ اسے بہت سے لطیفے' کہانیاں' داستانوں کے ٹکڑے' ڈراموں کے مکالمے اور ایسی بیسیوں چیزیں یاد تھیں۔ پہلے وہ محفل لگاتا تھا' لگ جاتی تو خود سٹیج بن جاتا اور ایسی ایسی پرفارمنس دیتا کہ محفل باغ باغ ہو جاتی۔

اشفاق کی باتوں میں تفصیلات کی چاشنی تھی۔ بات میں تفصیلات کی پھول پتیاں ٹانکتا۔ ساتھ ہی اس کی شخصیت سے انبساط کی پھوار اڑتی' یوں اڑتی جیسے فوارہ چل رہا ہو۔ اور وہ بھگو کر رکھ دیتی۔

مصور

پھر ایک روز اشفاق مجھے اپنے دوست ذوبی کے ہاں لے گیا۔

ذوبی جانا پہچانا مصور اور بت تراش تھا۔ اس کے نگار خانے میں طرح طرح کے نقش تھے۔ ادیبوں اور فن کاروں کے مجسمے تھے۔ لکڑی سے بنے ہوئے گورکھ دھندے تھے۔ جنہیں دیکھ کر دل کی نچلی منزلوں میں کچھ کچھ ہوتا تھا۔ کیا ہوتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہ آیا۔ کیوں ہوتا تھا' یہ تو خیر دور کی بات تھی۔ مجھے اس بات کا مبہم شعور تھا کہ کچھ ہوتا ہے' ایسے ہوتا ہے جیسے گہری نیلی ساکن جھیل میں کوئی پتھر پھینک دے۔

ایک طرف جہازی تصویروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔

ادھر خالق تھا' جو سورج کی شعاع سے رنگ اخذ کر کے کائنات کو رنگوں سے ترتیب دے رہا تھا۔ ادھر ماں کی کوکھ پھیل پھیل کر کائنات کو احاطہ کئے ہوئے تھی۔ پاس ہی تقاضائے نسائیت کی مستی سے سرشار عورت کے جسم کے بند بند سے خواہش کی پھوار پھوٹ رہی تھی۔

وہاں کھڑا میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا' دیکھتا رہا' یوں دیکھتا رہا جیسے اندھا پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

میرے جوتوں میں گویا میخیں ٹھک گئیں۔ جسم کی ساری زندگی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ ساری کائنات حیرت میں لپٹ گئی۔ حیرت' جس میں لذت تھی' گہرائی تھی' فرحت تھی۔

ذوبی ایک خوش باش نوجوان تھا۔ کم گو تھا لیکن بات میں پھلجھڑی تھی۔ چھوٹا قد' گٹھا ہوا جسم' پچ کس آنکھیں وہ بلا کا ذہین تھا۔ لیکن خدو خال ایسے تھے کہ ذہن کی چمک منظر عام پر نہیں آتی تھی۔ رنگین مزاج تھا لیکن چہرے پر بے نیازی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے' اتنے ڈھیر کہ جمود کا شبہ ہوتا' لیکن جب وہ بات کرتا تو چہرے کے بند دروازے کھل جاتے' بے نیازی کا گرد اڑ جاتا۔ کچھ ایسا منظر بدلتا جیسے کالی گھٹائیں بجلی لہراتی' لیکن کڑک پیدا نہیں ہوتی تھی' چونکہ وہ مدہم سروں میں بات کرنے کا عادی تھا۔

اشفاق اور ذوبی سے ملنے کے بعد میری زندگی میں گویا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ جب میں اس دروازے میں داخل ہوا۔ تو ایک خوبصورت سر سبز گلستان میں جا پہنچا۔

یہ سر سبز گلستان' لارنس باغ کی ایک پر فضا پہاڑی پر ایک چھوٹی سی عمارت تھی' جو اوپن ائیر تھیٹر کے نام سے موسوم تھی۔

اوپن ائیر تھیٹر پر ذوبی نے قبضہ جما رکھا تھا' جہاں دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں اس نے اپنا ورکنگ سٹوڈیو بنا لیا تھا۔

انوکھا کاروباری

ذوبی سارا دن اپنے گھر کے مخصوص کمرے میں جس کی حیثیت بیٹھک کی تھی۔ کمرشل کام کرتا تھا' کتاب کا سرورق' بوتل کا لیبل' اشتہار کی تصویر اور نہ جانے کیا کیا۔

پتہ نہیں۔اسے گھر بیٹھے بٹھائے کام کیسے مل جاتا تھا۔ حیرت کی بات تھی' اس لیے کہ وہ سمجھتا تھا کہ کام وہ ہوتا ہے جو چل کر گھر آئے' وہ نہیں جسے حاصل کرنے کے لیے کہیں چل کر جانا پڑے ------

ذوبی نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ کنواں ہے' پیاسا نہیں۔ حالانکہ اس کے پاس پیسہ نہ تھا' نہ بینک تھا' نہ بیلنس تھا۔ اس کے باوجود اسے کل کا فکر نہ تھا۔ روزانہ بیٹھے بٹھائے ذوبی کو ایک نا ایک کمرشل کام مل جاتا تھا۔ جو وہ بڑی آسانی سے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل کر دیتا جس کے عوض وہ ساٹھ پینسٹھ روپے کما لیتا تھا۔ حالانکہ مارکیٹ میں وہ کام پچیس تیس میں ہوتا تھا۔

ذوبی کا دوسرا اصول یہ تھا کہ مہنگا بیچو' خریدار کو خاطر میں نہ لاؤ۔ کوری بات کرو اور پھر بے نیاز ہو جاؤ۔ ذوبی کو پیسے کی جس قدر شدت سے ضرورت ہوتی اسی قدر وہ گاہک سے بے اعتنائی سے پیش آتا۔ معاوضہ بازار سے دگنا مانگتا اور کسی صورت میں گاہک کو تیار شدہ سکیچ بھجوانے یا پہنچانے کا ذمہ نہ لیتا۔

مجھے ذوبی کی باتیں عجیب لگتی تھیں۔ اقتصادیات کے اصول جو میں نے بی۔اے میں پڑھے تھے' ذوبی کے کاروباری اصولوں کو دیکھ کر ایک ایک کر کے' یوں جھڑ گئے جیسے خزاں میں پتے۔

اوپن ائیر تھیٹر

ہاں تو دن بھر ذوبی گھر کی بیٹھک میں کمرشل کرتا۔ شام کے وقت وہ مال روڈ پر واقع نگار

خانے میں چلا جاتا۔ پھر وہاں سے سیدھا اوپن ائیر تھیٹر میں پہنچتا۔ جہاں اشفاق اور میں پہلے سے منتظر ہوتے' پھر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا' مسرت اور انبساط کا ہنگامہ' جیسے سوڈے میں نمک ڈال دو تو بلبلے اٹھتے ہیں' ویسے ہی اس اکٹھ سے بلبلے اٹھتے' قہقہے لگتے' باتوں کے تار بندھ جاتے۔

اشفاق اپنی ڈگڈگی اٹھا کر میدان عمل میں آ جاتا۔ سنہری باتوں کے غبارے ہوا میں اڑتے' چٹپٹی لذیذ تفصیلات کے پکوڑے تلے جاتے۔ جاذب توجہ کلوز اپ' دلنشیں تفصیلات' نقلیں' عکس' قصے کہانیاں' لوک کتھائیں۔ حتیٰ کہ اوپن ائیر تھیٹر واقعی تھیٹر بن جاتا۔ قہقہے گونجتے' تالیاں بجتیں' لارنس باغ کا سبزا اور بھی سبز ہو جاتا' پھول سر اٹھا اٹھا کر مسکاتے۔

اس انبساط کا سرچشمہ اشفاق احمد تھا۔

ذوبی کی شخصیت کا ایک اور پہلو میرے لیے باعث حیرت تھا۔

نفسیات اور جنس میں میں خود کو بڑا لاڈو خان سمجھتا تھا اور اکثر اوقات جب محفل میں عورت کی بات چھڑ جاتی تو دفعتاً" میں محسوس کرتا جیسے مجھے تخت پر بٹھا دیا گیا ہو اور لوگ مجھے مورچھل کر رہے ہوں' پھر میں اس موضوع پر حتمی انداز سے بات کرتا' یوں جیسے مستریوں کے مجمعے میں کوئی فارن ٹرینڈ انجنیئر آ گیا۔

میں سمجھتا تھا کہ عورت اور جنس کے موضوع پر میں ایک اتھارٹی ہوں۔ ایسی اتھارٹی جسے گفتگو میں رد نہیں کیا جا سکتا۔ جس سے اتفاق رائے نہ کرنا جرم کے مترادف تھا' جسے سن کر حیرت میں نہ آنا جہالت کی علامت تھی۔

بھینٹ' پجارنیں

عورت اور جنس کے بارے میں میری شاہ نشینی اس وقت تک قائم رہتی تھی جب تک کوئی جیتی جاگتی عورت روبرو نہ آتی۔ آ جاتی تو شاہ نشینی ختم ہو جاتی۔ کوئی ان جانی طاقت مجھے تخت سے گھسیٹ کر بوریے پر لا بٹھاتی۔ میرے تمام تر علم کی پھپھوندیاں اڑ جاتیں' ذہن معطل ہو جاتا' دل دھک دھک کرنے لگتا' پسینے چھوٹ جاتے۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا احساس تھا۔ مجھے شعور تھا کہ ہاتھی کی طرح میرے کھانے کے دانت اور ہیں' دکھانے کے اور۔

ذوبی سے مل کر سب سے بڑا حادثہ یہ ہوا کہ میرے دکھانے کے دانت جھڑ گئے۔ میرا علم'

بچ ہو کر رہ گیا۔ اندھیرے اجالے پھر سے گڈ مڈ ہو گئے اور ایک ایسا دھندلکا چھا گیا' جس میں کوئی راستہ' کوئی ڈنڈی بجھائی نہ دیتی تھی۔

میں سوچتا یا اللہ یہ کیا بھید ہے۔ اس پتھر کے بت میں وہ کون سی بات ہے جو عورتوں کو پجارنوں میں تبدیل کر دیتی ہے' روح کی پجارنیں نہیں' ذہن کی نہیں' جسم کی بھینٹ پیش کرنے والیاں بلیاں۔

اس شخص میں وہ کیا بات ہے جسے دیکھ کر نسائی پھول پتیاں جھڑ جاتی ہیں۔ اور ٹنڈ منڈ جسم ابھرتا ہے اور پھر مسلط و محیط ہو جاتا ہے۔

اشفاق کو جنس سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ البتہ نسائیت کے لیے کشش ضروری تھی۔ وہ بھی منہ زبانی' دور سے۔

اشفاق صرف اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا' جو پرے ہٹ کر بیٹھتی تھی۔ اسے گدگدانے کی کوشش کرتا ——— جو بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ اس میں دلچسپی لیتا تھا جو حیا کے دوپٹے میں لپٹے جاتی' لپٹے جاتی۔ آگے بڑھ کر بات کرنے والی' بھڑک کر جلنے والی اور خود کو نشر کرنے والی سے وہ خوف زدہ تھا۔ کوئی بڑھ کر میدان میں نکل آتی یا اس کے انداز سے شبہ پڑتا کہ میدان میں نکل آئے گی' تو اشفاق میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا۔

باہر کا اندر کا

میری بات مختلف تھی' اس بلی کی طرح تھی جو گڑھے میں گر گئی تھی۔ باہر نکلنے کے لیے بہت زور مارا' نہ نکل سکی تو آرام سے بیٹھ گئی بولی' آج کی رات ہم یہیں بسر کریں گے۔

ویسے تو میں عورت سے دور گزر بسر کرنے کا دعوے دار تھا۔ حتی الوسع عورت کے قرب سے گریز کرتا تھا۔ دوستوں میں یوں رہتا' جیسے بے نیاز تھا۔ خارجی طور پر عورت سے دور رہتا تھا۔ لیکن میری داخلی دنیا کسی اور رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کاش میں بھی ذوبی کی طرح ہوتا۔ محترمائیں ہتھیلی پر خود کی بھینٹ اٹھائے میرا طواف کرتیں۔

ذہنی طور پر میں ہر راہ چلتی جاذب نظر عورت سے تعلقات پیدا کر لینے کا عادی تھا' خیال ہی خیال میں محفلیں جماتا' نگاہوں سے چھیڑ خوانی کرتا' بھرماتا' حتی کہ وہ مجبور ہو کر میرے قریب آ

جاتی' اور قریب' اور قریب' اور قریب۔

اوپن ایئر تھیٹر میں ہر نئی آمد میرے منہ پر ایک طمانچے کی حیثیت رکھتی تھی۔ میرا ذہن بھنا اٹھتا۔ یہ کیا ہو رہا ہے' کس اصول کے مطابق ہو رہا ہے۔ وہ کون سی مجبوری ہے جس کے تحت عورت نا عورت بن جاتی ہے' نسائیت اپاہج ہو کر رہ جاتی ہے' رنگ بدرنگ میں بدل جاتا ہے' خشبو اڑ جاتی ہے۔ میری دانست میں عورت اس قدر مجبور نہ تھی' نسائیت اس قدر اپاہج نہ تھی' بدرنگ نہ تھی' بھونڈی نہ تھی۔ جسم کی باندی نہ تھی۔

پٹاخ میرے منہ پر ایک طمانچہ لگتا' چٹاخ دوسرا۔

اشفاق میری بے بسی پر بغلیں بجاتا۔ پھر جذبہ ہمدردی سے میرے قریب آ بیٹھتا اور اپنی مخملی جوانی جو ٹاٹ میں بدل کر جوگیا بن چکی ہوتی۔ اس ٹاٹ کو میرے گرد لپیٹ دیتا تاکہ میں ان اجنبی اور گستاخ حقائق کی بے رحمی سے محفوظ ہو جاؤں۔

اشفاق کے اس جوگیا ٹاٹ میں لپٹے لپٹے مجھے سوجھتی اور میں چپکے سے اپنی تخیلی دنیا میں جا گھستا۔ پھر دبے پاؤں چل کر اس بند کمرے میں جا گھستا' جہاں دیوتا بھینٹ لے رہا ہوتا۔ دیوتا کی جگہ لے لیتا۔ خود تخت پر بیٹھ جاتا۔

پھر ایک روز جب میں ذوبی کی بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ دفعتاً" میرے ذہن میں ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ یہ ہوائی ایک انکشاف تھا۔ میرا خیال تھا کہ دیوتا کا بھینٹ کا یہ کھیل صرف اوپن ایئر تھیٹر تک محدود ہے ارے' میں حیران رہ گیا۔ ذوبی کا سارا گھر دیوتا اور بھینٹ سے بھرا ہوا تھا اور حیرت کی بات تھی کہ گھر کے تمام افراد اس کھیل میں ملوث تھے۔

دیوتا

وہ ایک مختصر سا کنبہ تھا۔ ایک بوڑھی خالہ' ایک نوخیز بیوی' دو گود کے بچے اور ایک نوکر۔ سب افراد خانہ ذوبی کے آگے سر تسلیم خم رہتے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گھر مندر ہو۔ سارے گھر کا ایک واحد مقصد تھا کہ ذوبی کو منایا جائے' بالکل ایسے جیسے مندر میں دیوتا کو منایا جاتا ہے۔

ایک دیوتا کے حضور گھنٹیاں بجاتا۔ دوسرا تھالی میں پوجا کے پھول سجانے کا منتظر رہتا کہ کب اشارہ ہو تو پھیرے لینے شروع کر دے۔ ایک ہاتھ میں ماچس تھامے کھڑا رہتا کہ اذن ملے تو لوبان

جلا دے۔

یہ تو خیر معمولی اور عام سی باتیں تھیں۔ مرد ہمیشہ گھر کا دیوتا بن کر بیٹھا رہا ہے اور افراد اس کے اشاروں پر ناچتے رہے ہیں۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اگر گھر میں کوئی نوجوان لڑکی یا ادھیڑ محترمہ آ جاتی' چاہے قریبی ہوتی یا دور کی' چاہے دو ایک گھنٹے کے لیے یا دو ایک دن کے لیے آتی' اسے دیکھ کر معاً گھر کے ہر فرد کو بلا امتیاز یہ فکر دامن گیر ہو جاتا کہ نووارد دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھائے بغیر جانے نہ پائے۔ اس وقت ہر فرد مکڑی میں بدل جاتا اور اپنی اپنی جگہ جالے تننے میں مصروف ہو جاتا۔ ادھر سے نکل بھاگنے کا راستہ ہے' یہاں جالا تن دو۔ ادھر ایک سوراخ ہے اسے بند کر دو۔ مکھی میں اڑان کی سکت ہے' جلدی سے اس کے پروں کو چھینٹا دے کر بھگو دو۔ اس قدر بھگو دو کہ تتلی سنڈی بن کر رینگنے پر مجبور ہو جائے۔ دیوتا مکڑا' دور بیٹھا اک شان بے نیازی سے اس اہتمام کو دیکھتا رہتا۔ باورچی اس کے اردگرد پکانے پروسنے میں مصروف رہتے حتیٰ کہ ڈش میز پر پہنچ جاتی۔

ان باتوں کی وجہ سے میرا ذہن حیرت کدہ بنا ہوا تھا۔ دل میں ذوبی سے نفرت ابل رہی تھی لیکن میں اسے تحسین بھری نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور تھا ذوبی کی شخصیت کی کشش میرے بند بند میں لہریں لیتی تھی' مجھے ذوبی سے عشق ہو گیا تھا۔

دروازہ۔ بند

ایک روز میں منتظر بیٹھا رہا کہ کب ذوبی کے سٹوڈیو کا دروازہ کھلے۔

اس روز ایک محترمہ قسم کی خاتون ذوبی سے ملنے آئی تھی۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلی مرتبہ آئی ہے۔ اس وقت وہ ایزل لگائے ایک پنسل سکیچ بنانے میں مصروف تھا۔

خاتون صوفے پر بیٹھ گئی۔ ذوبی سکیچ بنانے میں مصروف رہا۔

آپ آذر ذوبی ہیں' خاتون نے پوچھا

جی' اس نے سکیچ سے سر اٹھائے بغیر کہا۔

آپ کو سکیچ سے دلچسپی ہے' کلر سے یا ماڈلنگ سے۔ وہ بڑی بے نیازی سے اپنے کام میں

مصروف رہا۔

کلر سے کچھ کچھ' وہ بولی۔

کچھ کچھ تو بہت کچھ ہوتا ہے۔

نہیں بہت کچھ نہیں' وہ ہنسی۔

ہنسئیے نہیں پلیز'وہ بولا۔

کیوں۔

میرے کام میں خلل پڑتا ہے' ذوبی نے پہلی مرتبہ سر اٹھا کر خاتون کی طرف دیکھا۔

میرے یہاں بیٹھنے سے نہیں پڑتا کیا۔

پڑتا ہے' تھوڑا تھوڑا' مسکرانے سے بہت' ناقابل برداشت۔

وہ ہنسی۔

آپ پھر ہنسنے لگیں۔

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور دبی دبی ہنسی ہنسنے لگی۔

اونہوں' وہ بولا' یہ فاؤل ہے۔

کیوں۔

بس فاؤل ہے۔

اس کے بعد ایک قہقہے کی آواز آئی اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔

مجھے اس بات پر غصہ نہیں آتا تھا کہ دروازہ کیوں بند ہو جاتا ہے۔

دروازہ بند ہو جانے سے' میں بہت اچھی طرح واقف تھا۔ میرا سارا بچپن اور جوانی دروازہ بند ہوتے دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔

ہی ہی ہی ہی' علی احمد ہنستے' تم ادھر ہو جاؤ نا' ادھر کیوں بیٹھی ہو' بے آرامی میں' خوامخواہ' ہی ہی ہی ہی۔

پھر ٹین کا سپاہی میدان میں آ جاتا۔

ربڑ کی گڑیا' ہنستی۔

ٹین کا سپاہی سلوٹوں کے پل باندھ دیتا۔

ربڑ کی گڑیا' چوں چوں کرتی ہوئی پل پر چڑھ جاتی۔

آخر میں' ہی ہی ہی ہی کی آواز آتی۔

پھر ایک معنی خیز خاموشی چھا جاتی۔

اور پھر' چراوں کھٹ سے دروازہ بند ہو جاتا۔

پھر گھر کے سارے در و دیوار سرگوشیاں کرتے' دروازہ بند ہو گیا' دروازہ بند ہو گیا۔ وہ سرگوشیاں میرے کانوں کے ارد گرد منڈلاتیں' میرا منہ چڑاتیں' تمسخر اڑاتیں' دروازہ بند ہو گیا' دروازہ بند ہو گیا' مجھے غصہ آنے لگتا۔ میرے نزدیک دروازہ بند ہو جانا آلودگی کا نشان تھا' غلاظت کا نشان تھا۔ میں بند دروازے والے کمرے کی طرف دیکھتا اور محسوس کرتا جیسے وہ کمرہ ایک پھوڑا ہو جس سے پیپ رس رہی ہو۔ یہ جب کی بات تھی۔

اب بند کمرہ میری نگاہ میں پھوڑا نہ رہا تھا۔ اس میں سے پیپ نہیں رستی تھی۔ اس کے باوجود مجھے بند کمرے پر غصہ ضرور آتا تھا' اس لیے نہیں کہ میرا احساس پاکیزگی جوش کھاتا تھا۔ اب میں خود آلودگی سے اس قدر لت پت ہو رہا تھا' کہ کس منہ سے پاکیزگی کا ڈھونگ رچاتا۔

اب بند کمرے کو دیکھ کر مجھے اس لیے غصہ آتا تھا کہ میرے علم کے منہ پر چٹاخ سے تھپڑ پڑتا۔ میرا احساس ہمہ دانی چور چور ہو جاتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ دروازہ کس اصول کے تحت بند ہوا ہے۔

ذوبی کی شخصیت اور جسم میں کوئی جاذبیت نہ تھی۔ اس کی باتوں میں کوئی کشش نہ تھی۔ اس کا برتاؤ بے نیازی' بے پرواہی اور اکتاہٹ سے بھرا ہوتا تھا۔ پھر دروازہ کیسے بند ہو جاتا تھا۔

معصوم فنکار

اس روز میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ذوبی سے بات کروں گا۔ اسی لیے میں دروازے پر منتظر بیٹھا تھا۔

دروازہ کھل گیا۔

محترمہ باہر نکلیں۔ میں نے نگاہ بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ یوں دھوئی دھائی آنکھوں سے دیکھنے لگی جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے وہ بار سے کوکا کولا پی کر آئی ہوں۔ ارے میرے اندر

کوئی چلایا' یہ کیا بھید ہے۔ وہ نسائیت کی لاج کیا ہوئی۔

پھر میں سٹڈیو میں داخل ہو گیا۔

کمرہ جسم کی تلخ خوشبو سے یوں بھرا ہوا تھا' جیسے ابھی ابھی اگر بتی بجھی ہو۔

سامنے ایزل پر ذوبی دیو تا سمان کھڑا تخلیق میں مصروف تھا' بے نیاز' بے لاگ' بے لگاؤ۔

کھڑکیاں تو کھول دیا کرو' میں نے غصے میں کہا۔

کیوں' ذوبی سر اٹھائے بغیر بولا۔

کمرہ ننگے پنڈے کی بو سے بھرا ہوا جو ہے۔

ذوبی نے سر اٹھایا اور سوں سوں کر کے ہوا کو سونگھنے لگا' کہا ہے بو۔

تمہیں نہیں آئے گی۔

میری ناک خراب ہے کیا۔

خراب نہیں' بو سے بھری ہوئی ہے۔

اچھا ——— کیسی بو

ننگے پنڈے کی بو۔

کہاں ہے ننگا پنڈا' وہ تجاہل عارفانہ سے کہنے لگا' میں نے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔

وہ محترمہ جو آئی تھی۔

کون محترمہ۔

وہ جو ابھی گئی ہے'

وہ جو ابھی گئی ہے۔

اچھا وہ---------اس کا کیا ہے۔

اپنی بو سے کمرہ بھر گئی ہے۔

اچھا' ذوبی نے حیرت سے میری طرف دیکھا' لیکن اس نے تو خوشبو لگائی ہوئی تھی۔

ایک وہ خشبو ہوتی ہے جو محترمہ نے لگائی ہوتی ہے' ایک وہ خوشبو ہوتی ہے جو لگائی نہیں ہوتی ازلی طور پر لگی ہوتی ہیں۔

اچھا' دو خوشبویں ہوتی ہیں کیا۔ مجھے نہیں تھا پتہ' میں تو صرف ایک سے واقف ہوں' جو

لگائی جاتی ہے۔ تم دوسری سے واقف ہو گیا' ذوبی زیر لب مسکرایا۔

میں نے غصے سے ذوبی کی طرف دیکھا۔

اس کے چہرے پر معصومیت کے ڈھیر لگے ہوتے تھے۔

جھوٹے' کمینے' حرامی' میں نے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔

ذوبی نے انگلی ہلانی شروع کر دی' نہ نہ نہ نہ' وہ بولا' بری بات۔

تم سچی بات کیوں نہیں کرتے۔

نہ نہ نہ نہ' فنکار لوگ کبھی جھوٹ نہیں بولتے' بڑے معصوم ہوتے ہیں۔ میں ایک فنکار ہوں' معصوم آدمی ہوں۔

دیکھ ذوبی میں نے پینترا بدلا' میں تیری ان حرکتوں کو برا نہیں مانتا' میں تو صرف جاننا چاہتا ہوں۔ تجھ سے باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔

یہ جو تیرے پاس آتی ہیں۔

کون آتی ہیں۔

یہ لڑکیاں' محترمائیں' یہ کیوں آتی ہیں۔

پتہ نہیں' وہ بولا۔ میں نے ان سے کبھی پوچھا نہیں کہ کیوں آتی ہو۔ کہو تو پوچھوں۔ پھر بتا دوں گا تمہیں۔

یہ بتاؤ کہ تم میں کونسی صفت ہے' جس کی وجہ سے عورتیں تمہاری طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

سچ۔ وہ بولا۔ عورتیں میری طرف کھینچی آتی ہیں' اس کے ہونٹ ڈھلک گے' منہ سے رال ٹپکنے لگی۔

میں نے پھر غصے میں گالیاں بکنی شروع کر دیں۔

اس نے میرے غصے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ معصومیت سے کہنے لگا۔ زندگی بھر میری یہی آرزو رہی ہے کہ عورتیں میری طرف کھینچی چلی آئیں' مگر کبھی کسی نے لفٹ نہیں دی۔

میں حیرت سے کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا' کیا تمہارے ساتھ کیمونی کیشن ہو سکتی ہے۔

وہ کیا ہوتی ہے کیمونی کیشن' اس کے انداز میں بلا کا عجز اور معصومیت تھی۔

بڑے کی تشکیل

دراصل مجھے شعور نہیں تھا کہ قدرت ذوبی میں ایک بڑا آدمی تشکیل کر رہی ہے اور یہ عمل ابھی جاری ہے۔

قصور میں حافظوں کے خاندان میں ایک لڑکا عنایت اللہ تھا۔ طبیعت میں تجسس کا بھانبڑ لگا ہوا تھا۔ کان زیادہ سنتا تھا' آنکھ زیادہ دیکھتی تھی۔

سر اور تال شدت سے متاثر کرتے تھے۔ گلے میں سر نہ ہو' لیکن ذہن سر سے بھرا ہو تو اضطراب جنم لیتا ہے۔

عنایت اللہ کا گھر' ایسا تھا کہ مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ بری طرح رسم زدہ تھا۔ عنایت کے تخلیقی رجحانات کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ بمشکل سے ایک بینجو خریدا' بجانے کا شغل اپنایا' وہ جنون بن گیا۔ عنایت کی نگاہیں لکیریں دیکھتی تھیں۔ انگلیاں لکیریں کھینچنے کے لیے بے تاب رہتی تھیں۔ لکیریں کھینچتا رہتا۔ ٹاٹ پر' تختی پر' دیوار پر' زمین پر' کتابوں پر' ماسٹر سے کئی بار پٹا' کمر پر تختی ٹوٹی' سالا کافر ہے' لکیریں لگاتا ہے' تصویر بناتا ہے۔

دسویں کے بعد تعلیم رک گئی' توفیق نہ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ ڈرائینگ ماسٹر بنوں۔

کہیں سے سن لیا کہ لاہور میں ڈرائینگ سکھانے کا سکول ہے۔ جیب میں ایک روپیہ ڈالا۔ چوری چوری لاہور جا پہنچا۔

مہینوں ریل کے مسافر خانے میں مقیم رہا۔ جیب میں صرف دس آنے تھے۔ روز ایک پیسے کی سوکھی روٹی کھاتا تھا۔ بہت فاقے آئے بہرحال خوشی اس بات پر تھی کہ میو سکول آف آرٹس میں ڈرائینگ سیکھ رہا تھا۔

روٹی کھانے کے کئی ایک جتن کیے ٹیوشن کی' محفلوں میں' پیٹ بھرنے کے لیے' بینجو بجایا۔ تندور والے کو بینجو سناتا کہ ادھار ایک روٹی مل جائے گی۔

اتفاق سے لاہور میں اشفاق احمد سے ملاقات ہو گئی۔ اشفاق نے سمجھایا کہ تیرا نام غلط ہے۔

پھر بڑی محنت سے اس نے عنایت اللہ کا نام آذر ذوبی رکھ دیا۔
تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد' آذر ذوبی نے کمرشل کام شروع کر دیا۔
انہی دنوں ذوبی نے اوپن ائیر تھیٹر میں ہمارے بت بنانے شروع کر دیئے۔

پیش گو

جب ذوبی نے میرا بت بنایا تو میں نے سخت احتجاج کیا۔ میں نے کہا ذوبی' بے شک مجھ میں شر ہے۔ لیکن اتنا گاڑھا تو نہیں جتنا اس بت سے ظاہر ہوتا ہے۔

اچھا' وہ بولا' زیادہ گاڑھا ہو گیا ہے۔

تجھے نظر نہیں آتا کیا' میں نے پوچھا۔

نہیں تو' وہ بولا۔

کیا نظر آتا ہے۔ تجھے' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' مجھے جو نظر آتا ہے' میں نے وہی بنا دیا ہے۔

آج اس بات کو چالیس سال ہو چکے ہیں۔ جوں جوں ماہ و سال گزرتے جاتے ہیں' میرا چہرہ ہو بہو ذوبی کے بنائے ہوئے بت کے عین مطابق ہوتا جا رہا ہے۔ دیکھتا ہوں' حیران ہوتا ہوں' یااللہ یہ شخص بت تراش کے علاوہ پیش گو بھی ہے کیا۔

غم خور۔ دکھی

ذوبی نے اشفاق احمد کا بت بنایا تو میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔

ارے' یہ کیا بنا دیا تو نے۔

کیا بنا دیا' اس نے پوچھا۔

یوں بنا دیا جیسے بالٹی اوندھی پڑی ہو۔

اچھا' وہ بولا' تو کیا بالٹی سیدھی پڑی ہے۔

لیکن بالٹی' کیوں' میں نے پوچھا۔

بھئی سیکٹر فیس ہے' اس نے جواب دیا۔

چہرے کی ساری لکیریں نیچے گرادی ہیں تو نے۔

میں نے گرائیں' وہ بولا۔

اور کس نے۔

وہ تو خود گری ہوئی ہیں۔

یار اشفاق تو باغ و بہار آدمی ہے۔

ہاں ہے۔

گری ہوئی لکیریں تو دکھی آدمی کی ہوتی ہیں۔

ہاں ہوتی ہیں۔

تو نے اشفاق کو دکھی بنا دیا۔

اچھا' دکھی بنا دیا۔

دیکھ تو سوچوں کا مارا ہوا' غم زدہ' اکیلا۔

ہاں یار' وہ بولا' پر مجھے جیسا دکھا ویسا بنا دیا۔ اپنے پلے سے میں نے کچھ نہیں لگایا۔

اشفاق کے ساتھ چند ماہ رہنے کے بعد میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی باغ و بہاریت تو ایک پردہ ہے۔ دراصل وہ اکیلا ہے' چپ ہے' جلتا نہیں' سلگتا ہے' چڑ چڑ کرتا ہے' سوچوں کا مارا ہوا ہے۔ پھر دفعتاً" ذوبی کو اٹلی سے بلاوا آ گیا۔ اسے وہاں تربیت حاصل کرنے کے لیے سکالر شپ مل گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ اٹلی نہیں جائے گا۔ وہ ان دنوں ایک بڑے کنبے کا کفیل تھا' ماں تھی' بھائی تھا' بہن تھی' بیوی تھی' بچے تھے' انہیں سہارا دینے والا کوئی نہ تھا۔

لیکن ذوبی نے اپنے اندر کے سور کو ہشکارا۔ سور نے تھوتھنی نکالی۔ ٹوٹل ودیو آل۔ اور سوٹ کیس اٹھا کر روم روانہ ہو گیا۔

صاحبو بڑے آدمی جن کے اندر تخلیق کاری کی بوٹی لگی ہوتی ہے' جن کی جان پھلن پر آئی ہوتی ہے' بڑے بے رحم ہوتے ہیں' بے غیرت ہوتے ہیں' خود غرض ہوتے ہیں۔

سولھواں باب

نیم چھتی کا رابنسن کروزو

ان دنوں اشفاق احمد مزنگ روڈ کے ایک وسیع و عریض مکان میں رہتا تھا۔

ان کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ والدین' ساتھ آٹھ بھائی بہن' چند ایک بھائی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ والد صاحب ویٹرنری ڈاکٹر تھے' وہ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے حکم کے بغیر گھر میں پتا نہیں ہلتا تھا۔ سردار طبیعت کے مالک ہونے کی وجہ سے گھر میں جائنٹ فیملی سسٹم رائج تھا۔ اشفاق احمد کے بھائی تمام کے تمام صلاحیتوں کے مالک تھے' ٹیلنٹیڈ تھے۔

اشفاق احمد کی والدہ اگرچہ رسمی طور پر تعلیم یافتہ نہ تھی' لیکن بڑی سوجھ بوجھ کی مالک تھی۔ شخصیت کے لحاظ سے وہ بھی سردار طبیعت کی مالک تھی۔ سارے کنبے کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ لیکن جابر خاوند کی وجہ سے' وہ حکمت عملی سے کام لینا سیکھ گئی تھی۔ اس لیے گھر میں بڑے خان کا حکم چلتا تھا اور بڑی بیگم کی حکمت عملی چلتی تھی۔

رابنسن کروزو

اشفاق احمد نے ورثے میں جو صلاحیتیں پائی تھیں' وہ باقی بھائیوں سے ہٹ کر تھیں۔ اس کی شخصیت کا رنگ سارے گھر سے مختلف تھا۔ اس لیے وہ گھر کا حصہ نہ بن سکا تھا۔ وہ گھر میں

رہتا ضرور تھا لیکن بھیگتا نہیں تھا۔ اسے اپنے خاندان پر فخر تھا۔ والدہ کی عظمت کا اعتراف تھا' بھائی بہنوں سے محبت تھی' لیکن وہ گھر میں مکمل مل نہ سکا تھا۔

ان دنوں اشفاق ۲ مزنگ روڈ کی نیم چھتی میں مقیم تھا۔ یہ نیم چھتی گھر سے ملحق ضرور تھی' لیکن بالکل الگ تھلگ تھی۔ آنے جانے کے لیے گھر میں داخل ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ گھر کے صدر دروازے سے ایک زینہ اوپر جاتا تھا۔ زینے کے اختتام پر ایک چھوٹا سا صحن تھا' اس صحن میں نیم چھتی کا دروازہ کھلتا تھا۔ نیم چھتی ایک بہت بڑے کمرے پر بنی ہوئی تھی۔

پہلے روز جب میں نیم چھتی میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا' چاروں طرف کتابوں کے ریک لگے ہوئے تھے۔ فرش پر یہاں وہاں کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں' ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے تمام زاویے نیچے کی طرف گرے ہوئے تھے۔ اس کی پیشانی پر سوچوں کی سلوٹیں تھیں۔ اس کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کے گرد اداسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔

میں گھبرا گیا۔ یااللہ میں کہاں آگیا ہوں۔ یہ وہ اشفاق تو نہ تھا جس سے میں واقف تھا۔ یہ تو کوئی رابنسن کروزو ہے جو اس نیم چھتی جزیرے میں رہتا ہے۔

میرے نزدیک تو اشفاق' وہ اشفاق تھا جو اوپن ائیر میں ڈگڈگی بجا کر محفل کو لالہ زار کر دیتا تھا۔

اس زمانے میں اشفاق ایک عام گریجوایٹ لڑکا تھا۔ ابھی اس کی صلاحیتیں ابھری نہیں تھیں۔ میں نے اسے ملنا صرف اس لیے شروع کیا تھا کہ وہ ایک باغ و بہار شخصیت کا مالک تھا۔

میں خود سے خائف تھا' اکتایا ہوا تھا اور زندگی بسر کرنے کے لیے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔

نیم چھتی کے اشفاق کو دیکھ کر میں بالکل ہی مایوس ہو گیا۔

کال بل

نیم چھتی کے اشفاق کو دیکھ کر میں حیرت میں ڈوب گیا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ایک بھرے بھرے' رستے بستے گھر میں کیوں رابنسن کروزو بنا بیٹھا ہے۔

بظاہر اشفاق کی زندگی دکھ سے آزاد تھی۔ اسے ہر قسم کی سہولت اور آرام میسر تھے۔

ایک الگ کمرہ میسر تھا۔ کتابیں تھیں۔ دو وقت کا کھانا نیچے سے آ جاتا تھا۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی' صرف آواز دینے سے موجود ہو جاتی۔ اپنی سہولت کے لیے اس نے نیم چھتی کا ایک کونہ کھانے پکانے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہاں تیل کا چولہا تھا' سپرٹ لیمپ تھا' کافی کا پرکولیٹر تھا۔ چائے کی کالی چینک تھی' پیالے تھے' جب جی چاہتا چائے بناتا۔

بظاہر وہ ایک بے فکرا نوجوان تھا۔ محبت کے روگ سے محفوظ تھا۔ نسائیت کے سحر سے بے خبر تھا۔ کوئی بری عادت نہ تھی۔ صرف دو شوق تھے "کتاب اور مشین' مطالعے کا رسیا تھا۔ مشینوں کا دلدادہ۔ راہ چلتے نئی مشین کو دیکھ کر رک جاتا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا' کیسے چلتی ہے' کیا کام کرتی ہے۔ کس دھات کی بنی ہوئی ہے۔

پھر بار بار ادھر سے گزرتا۔ ہر بار مشین کو اٹھاتا اور در پردہ اس سے کھیلتا۔ مشینوں کا شوق اس نے ورثے میں پایا تھا۔ وہ ایک پیدائشی مستری تھا۔ لیکن اسے انجینئر بننے سے دلچسپی نہ تھی۔ فائن آرٹس کا شوق تھا۔

ابتدا میں ذوبی سے متاثر ہو کر اس نے پینٹنگ کا شوق آزمایا تھا۔ اس زمانے میں وہ چوری چوری پینٹنگ کیا کرتا تھا' اس نے چار ایک عمل بنائے تھے۔

سب سے پہلا عمل جو اشفاق نے بنایا' اس کا نام کال بل تھا۔ اس میں عورت کے جسم کا وہ حصہ دکھایا گیا تھا' جسے چھیڑنے سے جن بوتل سے باہر نکل آتا ہے۔ یہ عمل مجھے بہت پسند تھا' اس لیے کہ خاتون کا چہرہ جو دکھایا گیا تھا' اس پر ایسی کیفیت نمایاں تھی کہ جن نکلتا ہوا نظر آتا تھا۔

اشفاق کا دوسرا عمل بھی ایک عورت تھی' جس نے اپنی نسائیت سے بھری ہوئی جھجھریاں کندھوں پر اٹھا رکھی تھیں۔

گہری اداسی

اشفاق احمد کے یہ شغل بڑے معصوم تھے' وہ خود بھی معصوم تھا' اس لیے دکھی ہونے کا کوئی جواز نہ تھا۔ لیکن وہ دکھی تھا' بے وجہ دکھی تھا اور صرف دکھی ہی نہیں وہ دکھ "جنریٹ" کرتا تھا۔ ساری نیم چھتی اداسی سے بھری ہوئی تھی اور وہ اوپن ایئر تھیٹر والا رول جو وہ ادا کیا کرتا' محض

ایک ری ایکشن تھا۔

نیچے گھر میں ہر وقت میلہ لگا رہتا تھا۔ خصوصاً" جب بڑے خان باہر نکل جاتے تھے۔ بلی چلی جاتی تو چوہے بہت اودھم مچاتے تھے۔ وہ سب زندگی سے سرشار تھے۔ اکسٹروورٹ تھے۔ بڑے خان کے ڈر کی وجہ سے دبے رہتے لیکن جب وہ باہر جاتے تو اتفاقاً" خود سے باہر نکل آتے۔

گھر والوں کا شور نیم چھتی تک پہنچتا تھا' لیکن اشفاق کی اداسی دور ہونے کے بجائے اور گاڑھی ہو جاتی۔

جس گھر پر باپ اسقدر مسلط ہو کر اس کے حکم کے بغیر پتہ نہ ہلے تو افراد خانہ' اپنے تحفظ کے لیے' اپنی آرزوں کی تکمیل کے لیے' ہیرا پھیری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بڑے خان کے گھر میں ہیرا پھیریوں کی چھچھوندریں چلتی تھیں۔ سب مل کر پلان کرتے' کہ جن کو کیسے قابو میں لیا جائے پھر پلان کو عمل میں لایا جاتا اور کامیابی پر جشن منایا جاتا۔

اشفاق گھر کی ان رونقوں میں حصہ نہ لیتا تھا۔ گھر والے بھی اسے گھر کا فرد نہیں سمجھتے تھے۔

ایک روز نیم چھتی میں بیٹھے ہوئے' میرا جی چاہا کہ اسے چھیڑوں۔

شتو' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

ہوں' وہ بولا۔

یہ سب کیا ہے۔

کیا۔

یہ ذوبی' محترمائیں اور بند دروازہ۔

پتہ نہیں۔

یہ محترمائیں کیوں آتی ہیں' اس کے پاس۔

پتہ نہیں۔

روز نئی سے نئی' روز نئی سے نئی۔

ہاں۔ روز نئی ۔

تم نے انہیں غور سے دیکھا ہے کیا۔

اونہوں۔

کیوں۔

بس خیال ہی نہیں کیا۔

تم لڑکیوں کو نہیں دیکھتے کیا۔

دیکھتا نہیں' بس دکھ جاتی ہے۔

پہلی محبت

تمہیں کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں ہوئی۔

اونہوں' وہ بولا' پھر دفعتاً" مسکرا کر کہنے لگا' نہیں ایک سے ہوئی تھی۔

کون تھی وہ۔

کزن تھی۔

تم نے اظہار محبت کیا تھا کیا۔

اونہوں۔

اس نے کیا ہو گا۔

نہیں۔

پھر محبت کیسے ہوئی۔

پتہ نہیں' وہ بولا' مجھے اس وقت پتہ چلا کہ ہو گئی ہے' جب وہ ایک مہینہ ہمارے گھر میں رہنے کے بعد چلی گئی تھی۔

ارے' وہ کیسے۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔ ہمارے خاندان میں سبھی لڑکیاں خوبصورت ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی' وہ بولا' بس اچھی لگتی تھی' نئی نئی جوانی چڑھی تھی۔ ایک مہینہ ہم اس سے کھیلتے رہے۔ کبھی گیند بلا' کبھی کیڑی کاڑھا' کبھی بارہ ٹہن' وہ مہینہ بڑی رونق میں گزرا پھر اس کے ماں باپ کا خط آ گیا انہوں نے اسے بلا لیا۔

ہم سب نے خوشی خوشی اس کا سامان باندھا۔

میں اس کے لیے بہت سے مکئی کے دانے بھنوا کر لایا۔ پھر ان پر گڑ کی گرم پت چڑھائی۔ بہت سے گنوں کے ٹکڑے کر کے انہیں باندھا' ستو بنوائے۔ اماں نے پنیاں بنائیں۔ ہم سب اس کی تیاری میں مصروف رہے۔

پھر جب وہ جانے لگی تو بولی' شفو مجھے سٹیشن پر چھوڑنے نہیں جاؤ گے کیا۔

نہیں جاؤں گا' میں نے کہا۔

سبھی جا رہے ہیں' وہ بولی' تم کیوں نہیں جاؤ گے۔

نہیں میں نہیں جاؤں گا' میں نے جو کہا۔

کیوں' وہ بولی۔

میں کوٹھے پر چڑھ کر تمہاری گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھوں گا' میں نے کہا۔ ہمارے کوٹھے سے گاڑی جاتی ہوئی صاف نظر آتی ہے۔ ساری کی ساری۔ دیر تک نظر آتی رہتی ہے' یوں لگتا ہے جیسے کھلونا گاڑی ہو۔

غزالہ نے بڑی منتیں کیں کہ میں ساتھ جاؤں' لیکن میں نہ گیا۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل نہیں چاہتا تھا۔

پھر' میں نے پوچھا' پھر کیا ہوا۔

پھر' اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ پھر وہ چلی گئی تو دفعتاً" مجھے محسوس ہوا جیسے سارا گھر خالی گیا ہو۔ خالم خالی۔

مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر خالی کیسے ہو گیا۔ گھر میں سبھی لوگ تھے' اماں تھی' ابا تھے' بھائی تھے' بہن تھی۔ اس کے ساتھ سٹیشن پر تو صرف دو بھائی گئے تھے باقی سب تو گھر پر ہی تھے۔

پھر گھر کیسے خالی ہو گیا' میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں وہ بولا۔ گھر بالکل خالی ہو گیا' بالکل' اتنا خالی ہو گیا جیسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

پھر' میں نے پوچھا۔

ٹپ ٹپ آنسو

پھر میں گھبرا کر کوٹھے پر چلا گیا اور برساتی پر چڑھ کر گاڑی کو دیکھنے لگا۔ جب گاڑی چھک

چھک کرتی ہوئی سامنے آئی تو پتہ نہیں کیا ہوا مجھے' میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور میرا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر رو دوں۔ لیکن میں نے بڑا ضبط کیا۔

کیوں' میں نے پوچھا۔

امی ابا گھر پر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جب بھی میں برساتی پر چڑھ کر گاڑی دیکھا کرتا ہوں تو وہاں کھڑے ہو کر تالیاں بجاتا ہوں' قہقہے لگاتا ہوں' چلا چلا کر گھر والوں کو بتاتا ہوں کہ گاڑی مورنی کی چال چل رہی ہے آؤ دیکھ لو۔

ہوں ———— میں نے آہ بھری۔

میں خوف زدہ ہو گیا' شفو نے کہا' اگر اماں نے دیکھ لیا تو وہ کیا کہے گی' اس لیے چھپ چھپ کر روتا رہا۔

پھر' میں نے پوچھا۔

پھر اشفاق بولا' میں روتا رہا' روتا رہا' روتا رہا۔ دیوار سے لگ کر روتا رہا۔ بھائی جو اسے سٹیشن پر چھوڑنے گئے تھے' وہ گھر واپس آ گئے۔ گاڑی پتہ نہیں کتنے سٹیشن دور جا پہنچی۔ مگر میں دیوار سے لگ کر روتا رہا۔

اور تجھے پتہ چل گیا کہ تجھے اس سے محبت ہو گئی ہے' میں نے پوچھا۔

نہیں' مجھے بالکل پتہ نہیں چلا۔ میں تو حیران تھا کہ میں رو کیوں رہا ہوں' مجھے ہو کیا گیا ہے۔

پھر کزن کے جانے کے بعد مہینوں اور بلاناغہ جب بھی وہ وقت آتا تو میں کھیل کود چھوڑ کر چپکے سے چوری چوری کوٹھے پر چلا جاتا اور جب گاڑی سامنے آتی تو میرے آنسو نکل آتے۔ مہینوں بھر میں گاڑی کو دیکھ کر روتا رہا۔

پھر تجھے پتہ کیسے چلا' میں نے پوچھا۔

مجھے میرے دوست نے بتایا' شفو نے آہ بھر کر کہا اس کا نام وحید تھا۔ اس نے دیکھا کہ میں گاڑی کے وقت کھیل کود چھوڑ کر کوٹھے پر چڑھ جاتا ہوں تو اس نے میرا پیچھا کیا اور مجھے روتے ہوئے پکڑ لیا پھر اس نے مجھ سے پوچھا تو روتا کیوں ہے۔

میں نے کہا' پتہ نہیں۔

کب سے روتا ہے تو' اس نے پوچھا۔

کئی مہینے ہو گئے ہیں میں نے کہا' جب سے وہ گئی ہے۔

وحید نے میرا ہاتھ دبایا اور دبی آواز میں بولا' میں بتاؤں کیا بات ہے۔

میں نے کہا بتا۔

بولا' تجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔

پھر مجھے پتہ چلا کہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔

اس وقت کزن کی کیا عمر تھی۔ میں نے پوچھا۔

وہ اٹھارہ سال کی ہو گی۔

اور تم کتنے بڑے تھے۔

میں نو سال کا تھا۔

میں نے قہقہہ لگایا' احمق وہ کوئی عمر ہوتی ہے محبت کی۔

شفو نے اپنی نگاہیں مجھ پر مرکوز کر دیں اور بلا کی سنجیدگی سے بولا' وہی تو عمر ہوتی ہے' اس کے بعد تو صرف دروازے ہی بند ہوتے ہیں محبت نہیں ہوتی۔

نیم چھتی پر قیامت کی خاموشی چھا گئی۔

میں نے ایسے محسوس کیا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔

دیر تک گہری خاموشی طاری رہی۔

پھر دور بہت دور سے شفو کی مدہم آواز سنائی دی۔ اس کے بعد آج تک میں کبھی نہیں رویا۔ گھر سے کوئی بھی چلا جائے' میں آرام سے بیٹھا رہتا ہوں' جیسے کوئی گیا ہی نہ ہو' کچھ ہوا ہی نہ ہو' میں نے کسی کے جانے پر کوٹھے پر چڑھ کر کبھی گاڑی کی طرف نہیں دیکھا۔

اس روز کے بعد' شفو نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا' میں یوں ہو گیا جیسے کوئی چھپڑ ہو' ایسا چھپڑ جس میں کسی نے پتھر نہیں مارا' جس میں کبھی کوئی لہر نہیں اٹھی' وہ خاموش ہو گیا' دیر تک کمرے پر خاموشی چھائی رہی۔

وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے دیوار کی طرف دیکھتا رہا' ایسے لگتا تھا جیسے وہ کسی جانے والی گاڑی کو دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔

آخر میں نے اس گہری خاموشی کو توڑا۔ بولا۔

اور وہ ——— اس کا کیا حال ہوا۔

کس کا‘ شقو نے چونک کر پوچھا۔

کزن کا۔

پتہ نہیں‘ وہ بولا۔

اسے پتہ چلا گیا۔

کس بات کا۔

کہ تم گاڑی کو دیکھ کر روتے رہے۔

پتہ نہیں‘ وہ بولا‘ پتہ چل بھی جاتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس دیتی۔

ہوں‘ اب وہ کہاں ہے‘ میں نے پوچھا۔

یہیں ہے شقو نے جوابدیا۔ پانچ بچے ہیں۔ بیٹھتی ہے تو کھٹولی بھر جاتی ہے۔

انگور

تمہاری اور کوئی کزن نہیں ہے کیا۔

ہیں‘ بہت سی ہیں۔

نوجوان ہیں۔

ہاں نوجوان بھی۔

تمہارے گھر آتی ہیں کیا۔

آتی ہیں۔

تمہاری طرف توجہ دیتی ہیں کیا۔

ہاں‘ اتنی توجہ کہ میرا جی گھبرانے لگتا ہے۔

کیوں گھبرانے لگتا ہے‘ میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں کیوں۔ اس توجہ سے مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ایسے لگتا ہے‘ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ جیسے وہ یا تو خود کو پیش کرتی ہیں۔ کہتی ہیں ——— میں پکا ہوا انگور ہوں مجھے توڑ لو۔ اور یا پھر جیسے مجھے پکا ہوا انگور سمجھ کر اپنا ہاتھ بڑھاتی ہیں۔

اور تم' میں نے پوچھا۔

مجھے وہ اچھی نہیں لگتیں جو خود کو پیش کریں۔ مجھے تو ایسے ساتھی کی تلاش ہے' جسے یہ احساس ہی نہ ہو کہ وہ پکا ہوا انگور ہے ——— وہ نہیں جو آگے بڑھے۔ بلکہ وہ جو جھجک کر پیچھے ہٹ جائے۔

دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔

اس دوران میں' اندھیرا چھا گیا۔ بتیاں جل گئیں' لیکن ہم چپ چاپ اندھیرے میں بیٹھے رہے۔

پھر میں اٹھ بیٹھا' اچھا میں چلتا ہوں۔

کل اوپن ایئر تھیئٹر آؤ گے' شقو نے پوچھا۔

اونہوں۔

کیوں۔

جی نہیں چاہتا۔ وہاں جا کر ایسے لگتا ہے جیسے ہم بھڑوے ہوں۔ کمرہ بند کرنے اور کھولنے کی ڈیوٹی دے رہے ہوں۔

تم ذوبی سے جلتے ہو کیا' شقو نے پوچھا۔

شاید ——— اور تم

جسم اور روح

اونہوں۔ مجھے اس پر ترس آتا ہے۔

کیوں۔

بیچارہ دلدل میں پھنسا ہے' نکل نہیں سکتا۔

تم اسے نکالنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

نہ نہ نہ' اونہوں' اللہ نہ کرے کہ نکلے۔

کیا مطلب۔

اگر کبھی نکل آیا تو پاش پاش ہو جائے گا۔

وہ کیسے۔

اس وقت وہ جسم کی جنت بنا کر بیٹھا ہوا ہے' اگر کسی وقت روح جاگ پڑی تو اسے خود سے نفرت ہو جائے گی۔ غلاظت کا احساس جاگے گا اور یہ جنت جہنم میں بدل جائے گی۔

بہر حال میں وہاں نہیں جاؤں گا' خدا حافظ' میں نے کہا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

اس رات میں سوچتا رہا' سوچتا رہا' کیا واقعی شفو سچ کہتا تھا۔ روح جاگ اٹھے تو جسم کی جنت جہنم میں بدل جاتی ہے۔

اونہوں' میرے اندر سے آواز آئی۔ کاش کہ مجھ میں بھی وہ بات ہوتی جو ذوبی میں ہے' مجھے بھی وہ ملنے آتیں' دور دور سے' ملنے آتیں۔ دروازے بجتے' لو میں آ گئی۔

سترھواں باب

کلاتھ انسپکٹر، جرنلسٹ

کئی ایک دن میں نیم چھتی کے متعلق سوچتا رہا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اشفاق احمد کون ہے' وہ جو اوپن ایئر تھیٹر میں باغ و بہار ہے' یا جو نیم چھتی میں رابنسن کروزو ہے۔ بہرحال اشفاق احمد میرے لیے دلچسپی کا مرکز بن گیا تھا' دو رخی نے اسے اور بھی جاذب توجہ بنا دیا اور زوبی کی شخصیت نے مجھ پر گویا جادو کر دیا تھا۔

ان دنوں مانی کلاتھ انسپکٹر بن کر شاہدرے گیا ہوا تھا اور میں گھر میں اکیلا تھا۔ مانی کو گئے تین چار مہینے ہو چکے تھے۔

اماں اور اقبال دونوں ہی مطمئن تھیں۔ انہیں رہنے کے لیے ایک صاف ستھرا گھر مل گیا اور مجھے گورنمنٹ آف پنجاب کے ایک ہفتہ وار رسالے استقلال میں ایک آسامی مل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے گزارہ ہونے لگا تھا۔ اس کے باوجود میں مطمئن نہ تھا مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے لاہور اک پڑاؤ ہو جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا جیسے مجھے اس پڑاؤ کو چھوڑ کر کہیں جانا ہو' کہاں' یہ مجھے علم نہ تھا۔

کبھی کبھار مجھے شاہ کاکو کا خیال آ جاتا اور میں سوچ میں پڑ جاتا۔ کیا واقعی مجھے کہیں جانا ہے۔ پھر میں خود کو جھنجھوڑتا نہیں۔ نہیں۔ وہ سارا واقعہ ہی ایک الوژن تھا' بصری دھوکا' یا شاید میں

نے خواب دیکھا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک فلیگ سٹیشن کو دیکھ کر میں سمجھوں کہ لاہور آگیا' نہیں نہیں یہ ممکن نہیں۔

پھر میرے روبرو دلی کے حاجی صاحب آ کھڑے ہوتے جن کے پاس اماں نے مجھے بیعت کے لیے بھیجا تھا۔ جامع مسجد دلی میں' میں نے حاجی صاحب سے کہا تھا' نہیں حاجی صاحب میں خود کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا اور انہوں نے مراقبہ کرنے کے بعد میرے ساتھی سے کہا تھا۔ آپ والدہ صاحبہ سے کہدیں کہ جس بات کا انہیں ڈر ہے وہ ہو کر رہے گی۔ ہاں ادھیڑ عمر میں' انہیں بہت اچھے لوگ ملیں گے۔ بہت اچھے۔

اوکھا

ایک روز میں انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اقبال آ کر کہنے لگی' اللہ خیر کرے۔

کیوں' میں نے پوچھا۔

کہنے لگی' میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مانی واپس آگیا ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑی تکلیف ہوئی۔ پتہ نہیں میرے گھر کے لوگ مانی کے خلاف کیوں تھے۔ میرے لیے تو مانی کا ساتھ حوصلے کا باعث تھا۔

مانی چلا جاتا تھا تو گھر میں اداسی چھا جاتی' آ جاتا تو میرے لیے گھر میں چہل پہل ہو جاتی۔ یہ چہل پہل اماں اور اقبال بیگم کو بہت کھلتی تھی۔

انہیں مانی بہت کھلتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ مانی آ جاتا تو وہ میری توجہ سے محروم ہو جاتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ مانی ایک غیر روایتی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی کوئی بات رسم کے مطابق نہ تھی۔

وہ کہا کرتی تھیں' یہ کیسا شخص ہے اس کی کوئی بات بھی تو سیدھی نہیں۔ ہر بات الٹی' ہر کام الٹا' ہر سوچ الٹی' مانی ان کے لیے ناپسندیدہ شخصیت تھا' جسے زبردستی میں نے گھر پر مسلط کر رکھا تھا۔

میری بیوی کو مجھ پر سب سے بڑا گلہ تھا کہ میں ایسے نہیں تھا جیسے میاں ہوتے ہیں۔ میں گھر میں دو اینٹ کی الگ مسجد بنائے بیٹھا تھا۔ اور مانی یک نہ شد دو شد کے مصداق تھا۔

حالانکہ گھر والوں کو مانی کے آنے سے بڑے فائدے حاصل ہو جاتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس بات کو کبھی نہ گنا تھا۔

مانی جانتا تھا کہ گھر والے اسے اچھا نہیں جانتے' لیکن اس نے کبھی اسے درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔

ان دنوں مانی کو ملازمت کی تلاش تھی۔ سارا دن ملازمت کی تلاش میں گھومتا پھرتا۔

ایک دن وہ خوش خوش گھر میں داخل ہوا' بولا' مجھے ایک نوکری مل گئی ہے۔

کیا واقعی' میں نے پوچھا کون سی نوکری ملی ہے۔

کلاتھ انسپکٹر کی' وہ بولا۔ پر ایک مشکل ہے۔

کیا مشکل ہے۔

وہ کہتے ہیں' شاہدرے میں رہنا پڑے گا۔

یہ تو کوئی مشکل نہیں' میں نے کہا۔

نہیں یار' یہاں لاہور میں مل جاتی تو بہتر تھا۔ اکٹھے رہتے لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔

مانی چلا گیا تو گھر والے بہت خوش ہوئے' چلو جان چھٹی۔ حالانکہ جانے سے پہلے اس نے اقبال سے کہا تھا۔ میں کلاتھ انسپکٹر بن گیا ہوں۔ اب تو کپڑے کا فکر نہ کرنا تجھے جتنا کپڑا چاہیئے' سب میں سپلائی کروں گا۔

مانی کے جانے کے بعد گھر والوں نے بڑی خوشیاں منائی تھیں۔ لیکن میرے لیے بڑی مشکل پیدا ہو گئی تھی۔

پھر اشفاق احمد کے ملنے کے بعد میں نے شامیں اوپن ائیر تھیٹر میں گزارنی شروع کر دی تھیں۔

پھر ایک روز جب میں لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ نیم چھتی کے اور اوپن ائیر تھیٹر کے اشفاق احمد میں اتنا فرق کیوں ہے' تو دروازہ بجا۔ میں چونکا اس وقت کون ہو گا۔

میں ہوں بھئی' باہر سے مانی کی آواز آئی' میں آ گیا ہوں۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

باہر مانی سوٹ کیس اٹھائے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

میں آگیا ہوں' وہ بولا۔

کیا مطلب ہے تمہارا۔

بس آگیا' مانی نے قہقہہ لگایا' نوکری سے استعفےٰ دے کر آگیا۔

لیکن کیوں کسی سے جھگڑا ہو گیا کیا۔

نہیں' مجھ سے جھگڑا کرنے کی کسی میں ہمت ہی نہیں تھی وہاں۔

تو کیا کنڈیشنز آف سروس مناسب نہ تھیں۔

نہیں نہیں' بڑی عمدہ کنڈیشنز تھیں۔ الاؤنسز تھے۔ مراعات تھیں۔

پھر چھوڑ کیوں دی نوکری۔

بس چھوڑ دی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ہر کام کر سکتا ہوں' بیچنے کا کام نہیں کر سکتا۔ مجھے دکانداری سے نفرت ہے۔ تمہیں نہیں پتہ مجھے اپنے گاؤں ایمن آباد سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہاں سبھی لوگ دکاندار لوگ ہیں۔ وہ دو اور دو چار گنتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو گنتے ہیں۔ انہیں گننے کی بیماری ہے۔ جبھی مجھے اپنے رشتے داروں سے نفرت ہے۔ ان کے لیے زندگی دو اور دو چار ہے اور کچھ بھی نہیں شاہدرے پہنچ کر میں نے محسوس کیا جیسے میں ایمن اباد آگیا ہوں۔ وہاں کپڑے کی مل بھی دو اور دو چار ہے۔ وہاں لوگ جذبات کو نہیں گنتے' خیالات کو نہیں گنتے' صرف دو اور دو چار گنتے ہیں۔ اس لیے میں نے استعفےٰ دے دیا۔

تم نے اچھا نہیں کیا' میں نے کہا۔

کیوں؟

پہلے کوئی دوسری نوکری تلاش کر لیتے پھر اسے چھوڑتے۔

لٹک لٹک

ہٹاؤ یار' وہ بولا' تم بھی دو اور دو چار گنتے ہو۔ مجھے بس ایک افسوس ہے کہ تم شاہدرے نہ آئے۔

کیوں؟ میں نے پوچھا۔

جس محلے میں میں نے مکان لیا تھا۔ وہاں بہت جوان لڑکیاں تھیں۔ بہت ساری سارا دن

محلے سے برتن بجنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

برتن بجنے کی آوازیں۔

ہاں۔ تمہیں نہیں پتہ کیا؟

نہیں تو۔

جب کسی گھر سے برتن بجنے کی آوازیں بلند ہونی شروع ہو جائیں تو سمجھ لو کہ وہاں ایک لڑکی جوان ہو رہی ہے۔ اس محلے میں جہاں میں نے مکان لیا تھا' چاروں طرف سے برتن بجنے کی آوازیں آتی تھیں۔

پھر' میں نے پوچھا۔

پھر وہ آوازیں قریب آتی گئیں' اور قریب' اور قریب' حتیٰ کہ وہ کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ کھڑکیوں سے لٹک لٹک کر مجھے دیکھنے لگیں۔

جوان لڑکیاں تو دکھاتی ہیں دیکھتی نہیں میں نے کہا۔

پہلے دکھاتی ہیں۔ تم نہ دیکھو تو پھر خود دیکھنے لگتی ہیں۔

تم نے دیکھا نہیں تھا۔

جس روز میں نے دیکھنا شروع کیا' سارا کھیل بگڑ جائے گا۔

اں میرے دل سے آواز آئی' ذہبی بھی نہیں دیکھتا' کتنا دل گردہ ہے ان لوگوں کا جو نہیں دیکھتے۔

انہوں نے کھڑکیوں سے لٹک لٹک کر مجھ سے استعفیٰ دلوا دیا' حرام زادیاں' مائی چلایا۔

ارے' میں نے کہا' کھڑکیوں سے لٹک لٹک کر تو انہوں نے تمہیں وہیں رہنے پر مجبور کیا ہو گا۔

استعفیٰ دے کر وہاں سے چلے آنے پر تو نہیں۔

اونہوں' تم نہیں سمجھتے' وہ بولا۔

تو سمجھاؤ نا مجھے۔

انہوں نے کھڑکیوں سے لٹک لٹک کر مجھ پر دو اور دو چار حرام کر دیا۔

کیا مطلب۔

اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو میں کچھ دیر اور کلاتھ انسپکٹر بنا رہتا' دو اور دو چار برداشت کیسے جاتا۔

مجھے مانی کی منطق کبھی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ پہلے مجھے مانی کی منطق پر غصہ آیا کرتا تھا۔ اب مجھے پتہ چل گیا ہے۔ کہ غصہ بے کار ہے' غصے کا کوئی فائدہ نہیں' خواہ مخواہ خود کو اذیت دینا۔

دیکھو مانی' میں نے کہا' جب تم یہاں سے گئے تھے' تو گلی کی تمام لڑکیاں کھڑکیوں سے لٹک لٹک کر تمہیں دیکھ رہی تھیں۔

سچ' مانی نے حیرت سے پوچھا۔

تم نے نہیں دیکھا تھا کیا۔

مجھے خیال نہیں آیا ہو گا۔

تم اس گلی کی لڑکیوں سے کھیلتے نہیں رہے تھے کیا' میں نے پوچھا۔

نہیں' مانی بولا۔

تمہارا خیال ہے کہ ہم اندھے ہیں۔

پتہ نہیں' وہ بولا' دیکھو میں انہیں موبے لائز ضرور کرتا ہوں۔ مگر میں ان کے متعلق کبھی سیریس نہیں ہوا' کبھی نہیں' یقین جانو۔

میں نہیں مانتا' نہیں مانتا' میں نے جواب دیا۔

بیوی مال

میری بیوی بھی نہیں مانتی' مانی نے کہا۔

تمہاری بیوی' میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ہاں میری بیوی۔

تم شادی شدہ ہو کیا؟

ہاں' وہ بولا' شادی شدہ ہوں۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم شادی شدہ ہو۔

میں نے بھی نہیں سوچا' مانی نے جواب دیا۔

کیا مطلب' کیا نہیں سوچا۔

کہ میں شادی شدہ ہوں' دراصل انہوں نے بچپن میں ہی میری شادی کر دی تھی۔

اور وہ تمہارے گھر میں رہتی ہے' تمہاری بیوی۔

ہاں' وہ بولا' میرے والدین کے ساتھ رہتی ہے۔

اور تمہیں کبھی احساس نہیں ہوا کہ وہ تمہاری بیوی ہے۔

کبھی نہیں۔

کیوں۔

وہ شادی سے پہلے بھی ہمارے گھر میں رہا کرتی تھی۔ وہ ہمارے گھر میں ہی پلی تھی۔ وہیں جوان ہوئی اس لیے اس کا گھر میں ہونا میرے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے' البتہ اب کی بار اماں نے زیادتی کی۔ جب اسے پتہ چلا کہ میری نوکری لگ گئی ہے' تو اس نے جمیلہ کو میرے پاس بھیج دیا' شاہد رہے۔

تو وہ تمہارے ساتھ رہتی تھی۔ اب کہاں ہے وہ۔

میں نے اسے ایمن آباد کی گاڑی میں بٹھا دیا۔ خود ادھر چلا آیا۔

ارے' میں حیرت میں پڑ گیا۔ عجیب بات ہے یہ' کیا وہ خوبصورت ہے۔

ہاں' اچھی خاصی ہے۔

جوان ہے۔

ہاں' بہت شدت سے۔

تمہارے ساتھ کیسی ہے وہ۔

بہت اچھی۔

تم اس کے ساتھ کیسے ہو۔

بہت اچھا۔

کیا مطلب۔

میں سارا دن اس سے ہنستا ہوں' کھیلتا ہوں۔ گپ اڑاتا ہوں۔ خدمت کرواتا ہوں۔ بالکل ایسے جیسے وہ میری بہن ہو۔

لاحول ولا قوۃ

بس میں اسے بیوی نہیں مانتا' کبھی نہیں مانا۔ صرف تم اس بات کو سمجھ سکتے ہو ممتاز' وہ بولا' صرف تم۔ میرے ماں باپ نہیں سمجھتے' رشتے دار نہیں سمجھتے' کوئی نہیں سمجھتا۔

تم بات تو کرو۔

میں اور جمیلہ ایک ہی گھر میں پلے ہیں۔ وہ میری کزن ہے۔ اس کے والدین نے تعلیم کے لیے اسے ہمارے گھر بھجوا دیا تھا۔ والدہ کو اس سے بڑا پیار تھا۔ اس لیے ہم اکٹھے ہی پلے۔ اکٹھے کھیلتے' اکٹھے پڑھتے' لڑتے جھگڑتے۔

والدہ نے اسے اتنا پیار دیا کہ جمیلہ کے لیے میری ماں ایک آئیڈیل بن گئی۔ پھر جمیلہ پر میری ماں اس قدر اثر انداز ہوئی کہ جب جمیلہ جوان ہوئی تو ہو بہو میری ماں کی سی بن گئی' کاربن کاپی۔ اس کی طرح اٹھتی۔ اس کی طرح بیٹھتی' اس کی طرح چلتی' اس کی طرح آنکھیں اٹھا کر دیکھتی' بات کرتی' ہنستی' مسکراتی۔

پھر ہماری شادی ہو گئی۔

اور جب عروسی رات کو میں اس کے پاس گیا تو دفعتاً" میں نے محسوس کیا' جیسے وہ میری ماں ہو۔

کمرے پر خاموشی چھا گئی' گہری' خوفناک خاموشی۔ پتہ نہیں ہم دونوں کتنی دیر خاموش رہے۔

دیکھو ممتاز' وہ بولا' صرف تم اس بات کو سمجھ سکتے ہو۔ میری ماں نہیں سمجھے گی۔ میرا باپ سکول ماسٹر ذہنیت کا آدمی ہے' اس نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ نیک اور بد۔ وہ مجھے سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا سمجھتا ہے۔ وہ میری پرابلم کو نہیں سمجھ سکتا ہے' وہ سمجھتے ہیں کہ میں جمیلہ کو پسند نہیں کرتا' اس لیے میں نے اس سے ازدواجی تعلقات پیدا نہیں کیے۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ اکٹھے رہنے سے بات بن جائے گی۔ میاں بیوی کا تعلق بحال ہو جائے گا۔ یہ ان کی خوش فہمی ہے' وہ خاموش ہو گیا۔

پھر' میں نے کہا' پھر ہو گا کیا۔

پھر' وہ بولا' پھر یہ ہو گا کہ جمیلہ ہمارے گھر میں بیٹھی بیٹھی گل جائے گی۔ وہ بے چاری پہلے

ہی حیران ہے۔

کس بات پر حیران ہے' میں نے پوچھا۔

حیرانی کی بات تو ہے' میں جب بھی گھر جاتا ہوں' جمیلہ سے بے تکلفی کا برتاؤ کرتا ہوں' گپیں مارتا ہوں' کھیل کھیلتا ہوں' ہم اکٹھے کھانا کھاتے ہیں' چڑی کھیلتے ہیں۔ گانے سنتے ہیں' ستار بجاتے ہیں۔ لڑتے جھگڑتے بھی ہیں' لیکن رات کو میں بیگانوں کی طرح منہ موڑ کر سو جاتا ہوں۔ وہ حیران ہوتی ہو گی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

تم نے اسے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کیا۔

نہیں' وہ بولا' بے کار ہے۔ وہ نہیں سمجھے گی۔

تو اس کا حل کیا ہے' میں نے پوچھا۔

تم میری ماں سے بات کرو۔

پاگل ہو تم' میں نے جواب دیا' اول تو تمہاری ماں مجھ سے نہیں ملے گی اور اگر ملنا گوارا کر لیا' تو میری بات نہیں مانے گی۔ وہ سمجھتی ہے کہ تمہیں سیدھے راستے سے بھٹکانے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

صرف ماں ہی نہیں' سبھی یہ سمجھتے ہیں۔ سارا ایمن آباد ہی یہ سمجھتا ہے کہ جب سے تم نے ایمن اباد میں قدم دھرا ہے' سب نوجوان منحرف ہو گئے ہیں۔

میری ہنسی نکل گئی' میں نے کہا' ان حالات میں میں تمہاری ماں پر کیسے اثر انداز ہو سکتا ہوں۔

لیکن ایک بات ہے' وہ بولا۔

کیا بات ہے۔

ظاہر ہے کہ کچھ لوگوں نے تمہارا اثر قبول کیا ہے۔

میں سمجھا نہیں۔

ایمن آباد میں تین قسم کے لوگ ہیں' وہ بولا' اکثریت تو تجھ پر لاحول پڑھتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ تم سے بہت متاثر ہیں۔ اگرچہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتے۔ مثلاً" ہمارے گھر میں دو ایسے افراد ہیں' جو تم سے متاثر ہیں' میرا چھوٹا بھائی اختر' وہ تو جلتا کوئلہ ہے۔ منہ سے نہیں بولتا۔ لیکن

اس کی ایک ایک حرکت بولتی ہے۔ وہ تم سے اس قدر متاثر ہے کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ عکسی لگا رکھا ہے۔ دوسرے میری چھوٹی بہن ہے۔ وہ ابھی بہت چھوٹی ہے' لیکن بڑی بے چین ہے' بڑی منفرد ہے' وہ بھی تم سے متاثر ہے۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

پھر میری ماں ہے' وہ دودلی ہے۔

دودلی کیا مطلب' میں نے پوچھا۔

ملفوف خاتون

وہ بظاہر رسمی ہے' لیکن اس کے اندر ایک ماڈرن لڑکی چھپی بیٹھی ہے۔ وہ چھپ چھپ کر رسالے پڑھتی ہے' رومان پڑھتی ہے۔ اکیلے میں فلمی گیت گنگناتی ہے۔ میرے باپ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس نے اپنا وہ حصہ دبا دیا ہے۔ اندر کا حصہ' جو سلگتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ در پردہ تمہاری باتوں میں دلچسپی لیتی ہے۔

حیرت ہے' میں نے کہا۔

ہاں' وہ بولا' حیرت ہے۔

پھر بات کیا بنی' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' دیکھو نا ہم دونوں بھائی انگارے ہیں۔ یہ انگارے کہاں سے آئے۔ ابا تو ملائی کی برف ہے یہ انگارے لازماً" ہمیں ماں نے دیئے ہیں۔ اس میں جو ڈھکی چھپی چنگاری ہے' تم اسے اپیل کرو بات بن جائے گی۔ نہ بنی تو کوئی بات نہیں۔ اپنا کیا جاتا ہے۔ ایک جوا ہے' کھیل دیکھیں۔

انہی دنوں اتفاق سے مانی کی والدہ لاہور آ گئیں۔

بغیر اطلاع کیے میں ان کے ہاں چلا گیا۔ دروازہ بجایا' میں مانی کی ماں سے بات کرنا چاہتا ہوں' بڑے تذبذب کے بعد وہ مان گئیں۔ پردہ کر کے بیٹھ گئیں۔

میں نے چھٹتے ہی چوکا مارا۔ دیکھ' میں نے کہا' تو اپنے بیٹے مانی کی بات چھوڑ۔ مانی کی بیوی جمیلہ بھی تو تیری بیٹی ہے' تو نے اسے بڑے پیار سے پالا ہے' اسے بچالے' وہ اس گھر میں بیٹھی

بیٹھی گل جائے گی۔ تیرا بیٹا نہیں بدلے گا۔ جمیلہ جوان ہے' اس وقت اس کی شادی ہو سکتی ہے' پھر نہیں ہو سکے گی۔ اسے طلاق دلوا دے۔ ورنہ وہ بھی اس گھر میں بیٹھی بیٹھی ایسے ہی گل سڑ جائے گی۔ جیسے تو خود سڑ گل رہی ہے۔

پردے میں بیٹھی ہوئی خاتون نے شدید جھرجھری لی۔

تجھے جیون ساتھی نہیں ملا' میں نے کہا۔ تو نے خود کو پتھر بنا لیا' تو جر گئی' اسے بچا لے۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ملفوف خاتون یوں ہل رہی تھی جیسے زلزلہ زدہ ہو۔

اس کے بعد ایک مہینے کے اندر اندر جمیلہ کے لیے ایک رشتہ ڈھونڈ لیا گیا اور مانی نے اسے طلاق دے دی۔

صحافی

اب پھر مانی کی ملازمت کا مسئلہ درپیش تھا۔

ایک روز میں نے مانی سے برسبیل تذکرہ کہا۔ یار تو صحافی کیوں نہیں بن جاتا۔

مانی چونکا' میری طرف دیکھا' پھر خاموش ہو گیا' پھر کچھ دیر کے بعد بولا' اچھا۔

چلو صحافی بن جاتے ہیں۔ اس نے یوں سرسری بات کی جیسے صحافی بننا کھیر کھانے کے مترادف ہو۔

دراصل مانی طبعاً" ایک ایڈونچسرز تھا۔ اسے ہر نئے ایڈونچسرز سے عشق تھا۔ ساتھ بلا کی جرأت تھی۔

اسی شام وہ پاکستان ٹائمز کے نیوز ایڈیٹر' محمود سے جا ملا۔

محمود نے کہا' مولانا چراغ حسن حسرت اردو کا ایک روزنامہ امروز شروع کر رہے ہیں' ان سے مل کر پوچھو شاید کوئی جگہ مل جائے۔

ان دنوں پاکستان ٹائمز کے برآمدے میں مجید بیٹھا کرتا تھا۔ وہ ہمارا پرانا دوست تھا۔ مانی اسے جا ملا۔ کہنے لگا' مجھے مولانا چراغ حسن حسرت سے ملا دو۔ مجید نے کہا' ملائے جاؤ گے تو کھاتے میں رہو گے' خود ملو گے تو شاید۔ یہ پہلا موقع تھا کہ احمد بشیر خود کسی سے ملنے سے ہچکچا رہا تھا۔ امکان غالب ہے کہ وہ مولانا کے لقب کی وجہ سے خائف تھا۔

چراغ حسن حسرت

مولانا چراغ حسن حسرت عالم آدمی تھا۔ اس کا مطالعہ وسیع تھا۔ زبان دان تھا۔ تہذیب و تمدن اس کی نس نس میں رچے ہوئے تھے۔ رکھ رکھاؤ کا شیدائی تھا' منہ پھٹ تھا' لیکن بات کرنے کا سلیقہ جانتا تھا۔ وہ انسانیت کا دلدادہ تھا اور پرانے نوابوں کی طرح پی کر چوباروں میں شدھ راگ سننے کا شوقین تھا۔

مولانا نے بڑے تحمل سے احمد بشیر کی بات سنی' بولا' صاحب تمام جگہیں تو پر ہو گئیں۔ چند روز پہلے آتے تو شاید کچھ ہو سکتا۔ مولانا کا انداز اس قدر سنجیدہ اور فیصلہ کن تھا کہ مائی اٹھ بیٹھا' عین اس وقت چپڑاسی چائے لے آیا۔ اگر چپڑاسی کچھ دیر کے بعد آتا تو مائی کی زندگی کا دھارا کسی اور سمت بہتا' وہ صحافی نہ بنتا۔ احمد بشیر نہ بنتا۔

چائے پیجیے گا' مولانا نے اخلاقاً" کہا۔

مائی بیٹھ گیا' اور وہ دونوں چائے پینے لگے۔

کلرکی کریں گے آپ' مولانا نے کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔

نہیں' مائی نے جواب دیا۔

لکھنے پڑھنے سے دلچسپی ہو گی۔

کچھ ایسی بھی نہیں۔

ترجمہ کر سکتے ہیں آپ۔

ہاں۔

کبھی کیا۔

جروم کے جروم کی کتاب "دے اینڈ آئی" کا کیا تھا' مسودہ بمبئی رہ گیا۔

کیسا تھا۔

خاصا گھٹیا تھا۔

مولانا چونکے۔ آجکل کیا کر رہے ہیں۔

کچھ بھی نہیں۔

گزارہ کیسے ہوتا ہے۔

روٹی ایک دوست کھلا دیتا ہے۔ کپڑے اس کی بیوی دھلوا دیتی ہے۔ سگریٹ ادھر ادھر سے پی لیتا ہوں، چائے کی عادت نہیں۔ بس کا انتظار نہیں کر سکتا، لہٰذا پیدل چلتا ہوں کوئی خاص خرچہ نہیں۔

مولانا کی گھنی بھویں سمٹیں، پھیلیں اور پھر سمٹ گئیں۔ دیر تک وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا رہا پھر کہنے لگا۔

مولانا اگر آپ کو رکھ لیا جائے تو کتنے روپوں کی ضرورت ہو گی۔

پانچ سو، مانی نے کہا۔

پانچ سو، مولانا نے حیرت سے دہرایا۔

مجھے روپیہ خرچ کرنے کا شوق ہے، مانی نے جواب دیا۔

لیکن مولانا، حسرت نے کہا، پانچ سو تو مجھے ملتے ہیں، آپ کو کیسے دے سکتے ہیں۔

تو نہ دیجئے۔ آپ نے پوچھا کتنے کی ضرورت ہے۔ میں نے بتا دیا۔

عجب ہیں آپ، حیرت نے مولانا کا توازن بگاڑ دیا۔

ہیرا منڈی

تجسس نے بات آگے بڑھائی ——— پھر ——— آدھ گھنٹہ کے بعد وہ دونوں سٹفلز میں بیٹھے پی رہے تھے۔

مولانا کو احمد بشیر کے عجب ہونے کے احساس نے متاثر کیا تھا۔ احمد بشیر کو مولانا کی معصومیت پسند آ گئی تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد دونوں کھل گئے۔

مولانا نے باگیشری کے وادی ہموادی گنوائے۔

احمد بشیر نے ایمن کا الاپ سنایا۔

مولانا نے نذیر کے شعر سنائے۔

احمد بشیر نے فحش بولیاں سنائیں۔

پھر جنسیات پر بات چل نکلی۔

مولانا نے فرائڈ کا ذکر چھیڑا۔

احمد بشیر نے ہیوی لاک کی کیس ہسٹریاں سنائیں۔

مولانا نے کام سوترا کی بات کی۔

احمد بشیر نے آسن گنوائے۔

مولانا نے ملایا کی رنڈیوں کے پوز بتائے۔

احمد بشیر نے دیو داسیوں کی حوالگی کی بات بتائی۔

دفعتاً" مولانا ترنگ میں بولے' بات وہ جو بروقت ہو' برمقام ہو۔ اور وہ دونوں ہیرا منڈی کی طرف چل پڑے ———— اور احمد بشیر صحافی بن گیا۔

مانی کے صحافی بننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آدھی آدھی رات کو گھر آنے لگا۔ اس بات پر گھر والے اور بھی چڑ گئے اور مجھے یہ فکر دامن گیر ہو گیا کہ کہیں گھر والے دیکھ نہ لیں کہ وہ کس رنگ میں گھر آتا ہے۔

گھر آ کر وہ قصہ چھیڑ لیتا آج یہ ہوا' یوں ہوا' ایسے ہوا۔ اس کی باتیں اس قدر دلچسپی ہوتیں کہ ہم دونوں رات کے دو تین بجے تک بیٹھے رہتے۔ مجھے یہ بھی ڈر لگا رہتا کہ گھر والے اس کی باتیں نہ سن لیں۔

دو تماش بین

مولانا حسرت اور احمد بشیر کا تعلق اپنی نوعیت میں انوکھا تعلق تھا' جس میں بیک وقت نفرت اور کشش کے دونوں جذبے کار فرما تھے۔ نفرت' مانی کی ناپختگی' تیزی اور شوریدہ سری پر جو مولانا کو ناپسند تھی۔ کشش اس کی بے جھجک جرأت پر جو مولانا کو نصیب نہ تھی۔

دفتر میں مولانا سوفی صد ایڈیٹر ہوتے اور مانی ایک خام صحافی۔ مولانا کی طنز کی دھار میں بلا کی کاٹ ہوتی۔ وہ مانی سے کہتے' مولانا یہ کیا لکھا ہے آپ نے ———— اچھا تو آپ نے یہ نئی ترکیب ایجاد فرمائی ہے۔

معلوم ہوتا ہے' آپ صحافت کو نئے زاویے بخشنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

جوں جوں کام ختم ہوتا مولانا کے لہجے کی تلخی کم ہوتی جاتی۔ آخر وہ کسی نا کسی بہانے مانی کو

بلاتے اور سرسری انداز میں کہتے' آپ نے کام ختم کر لیا مولانا ——— کہیں چل کر چائے کا پیالہ پئیں ——— پھر سٹفلز ——— ہیرا منڈی' جھن جھن کرتے چوبارے' نرہت کرتی ہوئی رنگین انگلیاں' پاس بلاتی ہوئی شوخ نگاہیں۔

مولانا اور احمد بشیر نے تبی کے چوک میں مل کر بھنگڑا ڈالا۔ کھڑکیوں میں بیٹھی ہوئی رنڈیوں پر آوازے کسے۔ تماش بینوں سے چھیڑ چھاڑ کی۔

احمد بشیر کا کہنا ہے کہ ان دنوں جو آزادی اور آسودگی انہیں ہیرا منڈی کے چوباروں کی دہلیزوں پر حاصل ہوئی اور کہیں حاصل نہیں ہوئی۔

اس آسودگی میں ایک خلش تھی' احمد بشیر پر مولانا کو سنبھالنے کی ذمہ داری پڑ جاتی تھی۔ اور یہ فکر دامن گیر رہتا کہ رنڈی مولانا کی جیب سے پیسے نہ اڑا لے۔

دفتر میں احمد بشیر صحافت کے میدان میں بچوں کی طرح قدم قدم چلتا اور مولانا اسے خبردار کرتے۔ ڈانٹتے' رات کو ہیرا منڈی میں مولانا بچے کی طرح لڑکھڑاتے اور احمد بشیر انہیں سنبھالتا' سہارا دیتا' ہمت دلاتا۔

ایک رات احمد بشیر بارہ بجے تک گھر نہ آیا' میں گھبرا گیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔

آوارہ ملزم

رات کے دو بجے دروازہ بجا۔ میں دوڑ کر گیا' دروازہ کھولا باہر دو سپاہی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ احمد بشیر اپنا سائیکل پکڑے کھڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں ڈر گیا۔

سپاہی بولا' کیا یہ آدمی' اس نے احمد بشیر کی طرف اشارہ کیا' آپ کے ساتھ رہتا ہے۔

یہ میرا بھائی ہے' میں نے کہا۔

تو سنبھالو اسے۔

دوسرا سپاہی کہنے لگا' ہم نے اس سے پوچھا کہ اس وقت رات کے دو بجے کہاں سے آ رہے ہو۔ اس نے کہا دفتر سے آ رہا ہوں۔ رات کے دو بجے کون سا دفتر ٹوٹتا ہے۔

احمد بشیر نے قہقہہ لگایا۔ بولا ہماری پولیس اتنی احمق ہے کہ اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ رات کے دو بجے کون سا دفتر ٹوٹتا ہے۔

اور اس شخص کا حلیہ دیکھو' سر ننگا ہے' پاؤں میں جوتا نہیں ہے' دوسرے سپاہی نے کہا۔

میں نے کہا سنتری جی آپ کو علم ہونا چاہیئے کہ یہ صاحب جرنلسٹ ہیں اور روزنامہ امروز میں کام کرتے ہیں۔

یہ سن کر سپاہیوں کا رنگ اڑ گیا اور وہ سلام کر کے بھاگے۔

احمد بشیر نے قہقہہ لگایا' چلا کر بولا' او میاں سپاہی آؤ نا۔ بیٹھو تمہیں چائے پلائیں۔

میں نے کہا' تم نے انہیں بتایا کیوں نہ تھا کہ تم اخبار میں کام کرتے ہو۔

وہ مسکرایا بولا' میں نے کہا ذرا تماشہ رہے گا۔

لیکن تمہارے پاؤں کیوں ننگے ہیں' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' رنڈی کے چوبارے پر بوٹ اتارے تھے' کوئی اٹھا کر لے گیا۔

اٹھارواں باب

پولیس شادی

میری والدہ اور بیوی کو مانی کی عادتیں ناپسند تھیں۔ اس ناپسندیدگی کا اظہار وہ بات بات پر کرتی تھیں۔ مانی کو پتہ تھا کہ وہ ناپسندیدہ ہے' لیکن اس نے یہ بات مجھے کبھی نہ جتائی تھی۔ اسی وجہ سے میں بڑا شرمسار رہتا تھا۔

پھر ایک اور بات تھی' جو خواتین خانہ کو بہت ناپسند تھی۔ کرشن نگر کی اس گلی میں' جہاں لولی لاج واقعہ تھا' مانی کی بڑی دھوم تھی۔

جب وہ باہر نکلتا' تو گلی کی تمام نوجوان لڑکیاں کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوتیں۔ جب وہ گلی میں سے گزر رہا ہوتا تو کئی ایک بالکونیوں سے' اس پر کنکریاں پھینکی جاتیں۔ دبی دبی ہنسی کی آوازیں سنائی دیتیں۔ گیلریوں سے آوازے کسے جاتے' بچ موڑتوں۔

جوانی میں مانی بہت خوبصورت تھا' اس قدر خوبصورت کہ سارا نہیں جاتا تھا۔ مانی کو اس بات کا احساس تھا۔ اسے دیکھا جانا پسند تھا' لیکن وہ خود دیکھتا نہیں تھا۔ ایک لڑکی نما خاتون' سارہ' تو اسے دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئی کہ میلے کچیلے کپڑے پہن کر ہمارے گھر آ گئی۔ کہنے لگی' آپ کو نوکرانی کی ضرورت ہے کیا۔ اس نے اپنی بے چارگی کی ایسی کہانی سنائی کہ گھر والیوں کو ترس آ گیا اور اسے نوکر رکھ لیا۔

سارہ نے گھر کا کام اتنے شوق' چستی اور سلیقے سے کیا کہ گھر والے اس کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ سانولی تھی' مگر بڑی جاذب نظر تھی۔ سارہ ہمارے ہاں تین مہینے بغیر تنخواہ کے کام کرتی رہی۔

پھر گھر والیوں کو شک پڑ گیا۔ پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے' لیکن ایسے ضرور ہوتا ہے کہ لگن چھپائے سے نہیں چھپتی۔ گھر والیوں نے محسوس کیا کہ سارہ کچھ زیادہ ہی لگن سے کام کرتی ہے' سلیقے سے کام کرتی ہے۔ سارہ سب سے گھل مل گئی تھی۔ لیکن مائی کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوئی تھی۔

یوں گھر والیوں کے لیے مائی ناقابل برداشت ہو تا گیا اور میری پوزیشن بہت ہی خراب ہو گئی۔ مائی میرا واحد سہارا تھا۔ اس نے ہر بات میں میرا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ میں بڑا بن کر اس کے ساتھ چڑ چڑ کرتا رہتا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں میں اس کا بے حد شکر گزار تھا۔

پھر وہ واقعہ رونما ہوا' جس کی وجہ سے ہمارا اکٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔

ایک روز میری سوتیلی ہمشیرہ میرے پاس آئی۔ وہ تعلیم یافتہ تھی' سکول میں پڑھاتی تھی مگر بڑی جذباتی لڑکی تھی۔ بڑی موڈی' اس میں قیام نہیں تھا' بات بات پر ادلتی بدلتی رہتی تھی اور بڑی شیخی خور تھی۔

ہمشیرہ

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور ٹپ ٹپ رونے لگی۔ اس بات پر میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا' بات کیا ہے' رو کیوں رہی ہو۔ اس نے میری بات کا جواب نہ دیا اور رونا جاری رکھا۔ دیر تک وہ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ آخر میں کہنے لگی۔

ابا میری بات' نہیں مانتے۔

کونسی بات' میں نے پوچھا۔

شادی کی بات' اس نے جواب دیا۔

تم شادی کرنا چاہتی ہو کیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

کوئی پیش نظر ہے کیا۔

اس نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں ابا سے بات کروں۔

ہاں' وہ بولی۔

ان دنوں والد صاحب رام نگر میں رہتے تھے۔ وہاں انہیں ایک مکان الاٹ ہو چکا تھا۔

شام کو میں والد صاحب سے جا ملا۔

ہم دنوں کے مزاجوں میں بڑا فرق تھا۔ میں غصیل تھا وہ متحمل مزاج تھے۔ میں بات اگل دیا کرتا تھا۔ وہ بات ٹالنا جانتے تھے۔

میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا' آپ ہمشیرہ کی شادی کیوں نہیں کرتے۔

بس یہی تو ایک فکر لگا ہے ہمیں' وہ بولے۔

تو پھر کر دیجئے نا۔

کوئی مناسب رشتہ بھی ملے۔

اگر رشتہ موجود ہو تو۔

کیا پتہ اسے وہ رشتہ پسند بھی ہے یا نہیں' وہ بولے۔

اگر وہ اسے پسند ہو' بلکہ اس کا اپنا چناؤ ہو تو۔

تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے' وہ بولے' لیکن میں بوڑھا ہو گیا ہوں' اگر تم میرا بازو بنو۔ میرا ساتھ دو تو ——————

ابا کی بات بالکل سچی تھی۔ میں نے کبھی ابا کا ساتھ نہ دیا تھا۔ کبھی بیٹے کا حق ادا نہ کیا تھا۔ الٹا میں تو فادر ہوسٹیلٹی کا شکار تھا۔

تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں بات چیت کروں' میں نے کہا۔

بالکل اجازت ہے' وہ بولے۔

میں مطمئن ہو کر گھر آ گیا۔

اگلے روز شام کو ہمشیرہ پھر آ گئی اور میرے روبرو بیٹھ کر رونے لگی۔

میں نے کہا' اب کیوں روتی ہو' اب تو بات طے ہو گئی ہے۔

وہ بولی۔ آج انھوں نے مجھے بہت ڈانٹا ہے' جھڑکیاں دی ہیں۔ کہتے ہیں' تو نے بھائی سے

بات کیوں کی۔ خبردار جو پھر بھائی سے بات کی تو ———

اس پر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا تو فکر نہ کر' ہم کوئی تاریخ مقرر کر لیتے ہیں۔ اس روز تمہارا نکاح ہو جائے گا' پھر ودائیگی مناسب موقع پر ہو جائے گی' لیکن اس بات کو راز رکھنا کسی سے کہنا نہیں۔

گھیراؤ

ہم نے ایک تاریخ مقرر کر لی۔ ہمشیرہ نے چند ایک مہمانوں کو مدعو کر لیا۔

مقررہ تاریخ کو حسب توفیق ہم نے انتظامات کر لیے۔ مہمان خواتین آگئیں۔ نکاح کی رسم ادا ہونے والی ہی تھی کہ باہر گلی میں ہنگامہ ہو گیا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ ہمارے گھر کا گھیراؤ کر لیا گیا ہے۔ باہر کسی نے با آواز بلند کہا تو لڑکی کو بیچ رہا ہے۔ اس پر بہت سی آوازیں آئیں' باہر نکلو اور گھر کے دروازے بجنے لگے۔ پھر مجھے سمجھ میں آیا کہ یہ ہنگامہ ہمشیرہ کی شادی کو روکنے کے لیے تھا۔

لولی لاج میں کھلبلی مچ گئی۔ اماں تھر تھر کانپنے لگی۔ میری بیوی سخت گھبرا گئی۔ ہم نے مہمان خواتین کو پچھلے دروازے سے نکال دیا۔ مائی میرے پاس آیا۔ وہ خوشی کے جذبے سے چھلک رہا تھا۔ یار' اس نے کہا' مجھے باہر جانے کی اجازت دے دے۔

کیوں' میں نے غصے میں کہا' باہر لڈو بٹ رہے ہیں کیا۔

ہاں اس کی آنکھوں سے مسرت کی پھوار اڑ رہی تھی۔

میرا دل خوف سے بیٹھا جا رہا تھا۔

باہر جائے گا تو پٹ جائے گا' ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں' میں نے کہا۔

پھر کیا ہوا' وہ بولا۔

دیکھ' یہ سارا فساد میری وجہ سے ہے۔ مجھے باہر جانا چاہیے' میں نے کہا۔

تو باہر جا کر کیا کرے گا' اس نے پوچھا۔

میں انہیں سمجھاؤں گا۔

باہر کراؤڈ ہے۔ کراؤڈ نہ سنتا ہے' نہ سمجھتا ہے۔ وہ تجھ پر حملہ آور ہو جائیں گے اور پھر

بات بڑھ جائے گی۔

اچھا تو دونوں باہر نکلتے ہیں' اکٹھے' میں نے فیصلہ کر دیا۔

ٹھیک ہے' وہ بولا۔

لیکن ایک بات کا خیال رکھنا مانی' میں نے کہا۔ وہ میرے رشتہ دار ہیں' مار پیٹ نہ کرنا۔

نہیں کروں گا' اس نے جواب دیا۔ پھر اس نے دو چار اخباروں کو رول کیا' کاغذ کی لاٹھی بنالی اور ہم دونوں باہر نکل گئے۔

دروازہ کھلتے دیکھ کر ہجوم آگے بڑھا۔

میں نے چلا کر کہا' دیکھو بھائیو' میری بات سن لو پہلے۔

پکڑ لو پکڑ لو' کی آوازیں آئیں۔ ایک جوان لاٹھی گھماتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے لاٹھی اٹھائی۔ مانی نے پیچھے سے اس کی لاٹھی پکڑ لی۔ دوسرا میری طرف بڑھا تو مانی نے کاغذی لٹھ اس کے سر پر دے ماری اور میری بانہہ پکڑ کر مجھے ہجوم کے اندر لے گیا۔ تاکہ لوگ مجھے پہچان نہ سکیں میں ہجوم کے ریلے میں آ گیا۔ ہجوم کی توجہ میری طرف سے ہٹانے کے لیے' وہ چلایا' دروازہ توڑ دو' دروازہ توڑ دو۔ وہ دروازہ کی طرف بڑھے تو مانی نے پھر شور مچا دیا۔ وہ تو پچھلے دروازے سے بھاگ رہے ہیں' انہیں جانے نہ دو۔

ہجوم کی توجہ پچھلے دروازے کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ پچھلے دروازے کی طرف بھاگے۔

مانی بھاگ کر میری جانب آیا۔ بولا رستہ صاف ہے تو نکل جا ورنہ تیری ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔

ہو جائے' میں نے بے نیازی سے کہا۔

اس وقت ہم دونوں دلیری پر تلے ہوئے تھے۔ مانی طبعی جرأت کی وجہ سے دلیری دکھا رہا تھا۔ میری دلیری خوف کی وجہ سے تھی۔ جب خوف حد سے بڑھ جائے تو فرد مارنے مرنے پر تل جاتا ہے۔

چھاپہ

ہجوم پچھلے دروازے کو بند دیکھ کر واپس آ رہا تھا کہ دوسری جانب سے پولیس کی ایک گارد

آ پہنچی۔ انہیں دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا' میں سمجھا کہ وہ مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے ہیں۔

دراصل ہمارے مہمانوں میں آئی جی پولیس کی بیگم بھی تھی۔ جب وہ گھر پہنچی۔ تو اس نے شور مچا دیا کہ کرشن نگر میں فساد ہو گیا ہے' فوراً" کچھ کیجئے ۔ آئی جی نے تھانے میں فون کیا کہ فوراً" جائے واردات پر پہنچو۔

پولیس نے آتے ہی ڈانٹ ڈپٹ کر کے لوگوں کو بھگا دیا۔ تھانے دار نے حکم دیا کہ گھر کا گھیراؤ کر لو۔ اور خود مجھے گھر کے اندر لے گیا اور تفتیش شروع کر دی۔

لڑکی کو حاضر کرو' وہ بولا۔

ہمشیرہ اندر آ گئی۔

آپ کا نام' وہ بولا۔

ہمشیرہ نے اپنا نام بتایا۔

آپ ورکنگ وومن ہیں کیا۔

ہاں' وہ بولی' میں سکول میں ٹیچر ہوں۔

آپ کی عمر۔

ہمشیرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

مائی کہنے لگا تھانے دار صاحب لڑکیوں سے عمر نہیں پوچھا کرتے خود اندازہ لگا لیجیے۔ لڑکی بالغ ہے' استانی ہے۔

تم کون ہو' اس نے مائی کو گھورا۔

جناب میں جرنلسٹ ہوں' امروز میں کام کرتا ہوں۔

تھانے دار ٹھنڈا پڑ گیا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا' آپ کیا کرتے ہیں۔

یہ رائٹر ہیں' مائی نے جواب دیا۔

کیا نام ہے۔

ممتاز مفتی۔

تھانے دار سوچ میں پڑ گیا۔ ممتاز مفتی' اس نے زیر لب دھرایا۔

پھر وہ سنجیدگی سے بولا' دروغ بیانی مت کیجیے ورنہ کیس آپ کے خلاف جائے گا۔

کل ہمارے دفتر میں آئیں' میں چائے کا پیالہ آپ کو آفر کروں گا' مانی نے جواب دیا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا' آپ کب سے اس مکان میں رہتے ہیں۔

ڈیڑھ ایک سال سے' میں نے کہا۔

اور آپ کا نام ممتاز مفتی ہے۔

جناب۔

نہیں آپ جھوٹ بول رہے ہیں' آپ رائیٹر نہیں ہیں۔ ہمارے رجسٹر میں کسی ممتاز مفتی کا نام درج نہیں ہے۔

تو اب درج کر لیجیے گا' مانی بولا۔

پھر وہ ہمشیرہ سے مخاطب ہوا' کہنے لگا' بی بی بتایئے کہ کیا نکاح آپ کی مرضی سے ہو رہا تھا' یا۔

میری مرضی کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا' وہ غصے میں بولی۔

اچھا' اس نے ہمشیرہ سے کہا' آپ اب اندر جائیں۔

وہ چلی گئی تو تھانے دار نے مجھ سے کہا' آپ اس بی بی کے سوتیلے بھائی ہیں کیا۔

جی' میں نے جواب دیا۔

یہ بتایئے کہ والدین کی رضامندی حاصل کیے بغیر' آپ نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔

دو احمق

میں نے تمام کوائف بیان کر دیے۔

تھانے دار سوچ میں پڑ گیا۔ دیر تک خاموش رہا' پھر کہنے لگا' معاف کیجیے گا۔ آپ بڑے احمق ہیں ——— اگر لڑکی بیان دیتے وقت کہہ دیتی کہ اس کا نکاح زبردستی کیا جا رہا تھا' تو آپ سات سال کے لیے اندر ہو جاتے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا' کہ وہ مجھ پر جھوٹا الزام دھرے آپ کیسے رائٹر ہیں کہ زندگی کے نشیب و فراز سے قطعی ناواقف ہیں۔ اب خیال رکھیے' لڑکی کو والدین سے ملنے نہ دیجیے۔ کل شام کو آٹھ بجے پولیس کا دستہ آپ کی حفاظت کے لیے آ جائے گا۔ اور جب تک

نکاح کی رسم ادا نہ ہو جائے گی۔ مکان کے ارد گرد متعین رہے گا۔

چند روز بعد میرے ایک عزیز کا تبادلہ ہو گیا اور وہ ملتان چلے گئے۔ جاتے ہوئے وہ اپنا مکان مجھے دے گئے۔ ہم نئے مکان میں منتقل ہو گئے اور مانی لولی لاج میں اکیلا رہ گیا۔

جب ہم نئے مکان میں منتقل ہو رہے تھے' تو مانی نے کہا سارہ کو بھی اپنے ساتھ لے جایئے' یہاں یہ اکیلی کیسے رہے گی۔ سارہ بولی میں تو اپنے گاؤں جا رہی ہوں۔ اس پر گھر والیاں مطمئن ہو گئیں۔ سارہ نے اپنی گٹھڑی اٹھائی اور باری باری سب سے مل کر وداع ہو گئی۔

چار ایک دن کے بعد مانی مجھ سے ملا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا' ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

میں نے پوچھا' خیریت تو ہے۔

بالکل نہیں' وہ بولا' خیریت کی تو ایسی تیسی ہو گئی۔

کیا ہوا' میں نے پوچھا۔

وہ آہ بھر کر بولا' یار ہم بڑے احمق ہیں۔

ہاں۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔

سارہ

وہ جو سارہ تھی' ہم اسے کیا سمجھتے رہے اور وہ کیا نکلی' مانی نے کہا۔

بڑی تیکھی تھی' مرچیلی تھی' چالاک تھی' میں نے کہا۔

وہ نوکرانی نہیں تھی' مانی نے کہا۔

تو پھر کیا تھی' میں نے پوچھا۔

اس نے نوکرانی کا سوانگ بھرا ہوا تھا۔ وہ عیسائی تھی' تعلیم یافتہ تھی۔ انگریزی بول سکتی تھی۔ آواز بڑی اچھی تھی' سریلی' فلمی گانے خوب گاتی تھی۔ جب اس نے نوکرانی کا بھیس اتارا تو نیچے سے ایسی فن خیزی نکل آئی کہ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔

چلو چھوڑو اس بات کو وہ تو گاؤں چلی گئی ہے' میں نے کہا۔

اونہوں وہ نہیں گئی۔ وہ میرے ساتھ لولی لاج میں رہتی ہے۔ مانی نے جواب دیا۔

نہیں' میں چلایا' وہ تو ہمارے سامنے خدا حافظ کہہ کر وداع ہو گئی تھی۔

ہاں ہو گئی تھی' وہ بولا' ایک گھنٹے کے بعد دروازہ بجا۔ میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے سارہ کھڑی تھی' وہ اندر داخل ہو گئی اور اندر سے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

پھر' میں نے بے صبری سے پوچھا۔ پھر وہ میرے روبرو بیٹھی تھی' وہ بولا' اور اپنی کہانی سنا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ تو سمجھتا تھا کہ میں نوکرانی ہوں۔ کتنا بھولا ہے تو۔ میں تو تیرے لیے نوکرانی بنی تھی۔ تیرے لیے یہ سوانگ بھرا تھا۔ تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں' میں نے پوچھا۔

بولی' میں سمجھتی تھی کہ تو سمجھ جائے گا۔ لیکن تو تو بڑا کچا نکلا۔

مانی مسکرایا' کھسیانی ہنسی' بولا۔

پھر سارہ آہ بھر کر بولی' ایک دن میں ادھر سے گزری تھی' تو گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ میں نے تجھے دیکھا۔ میرے اندر اک تڑپ جاگی۔ اک ہوائی سی چل گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں تجھ سے مل کر رہوں گی۔

اچھا' میں نے اس سے کہا' بڑے عزم والی ہے تو۔

ہاں ہوں' وہ بولی۔ جس بات پر میں اڑ جاؤں اسے کر کے رہتی ہوں۔ تو میری ہڈیوں میں بیٹھ گیا تھا۔ اور مجھے پتہ تھا کہ تو ہڈیوں سے نکلے گا نہیں۔

بیوقوف میں تو شادی شدہ ہوں' میں نے سارہ سے کہا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے' وہ کہنے لگی' اگر تو شادی شدہ نہ بھی ہو گا تو بھی تو مجھے اپنائے گا نہیں۔ میں نے دو ہی دن میں' یہ بات جان لی تھی۔

کیسے جان لی تھی' میں نے پوچھا۔

کہنے لگی' وہ تو تیرے ماتھے پر لکھا ہوا ہے۔

میں نے کہا' کیا لکھا ہوا ہے۔

کہنے لگی' صاف لکھا ہوا ہے کہ تو پیچھے لگنے والوں میں سے نہیں ہے' پیچھے لگانے والوں میں سے ہے۔

میں نے کہا' اب کیا پروگرام ہے تیرا۔

بولی جتنے دن بھی مل جائیں' ہم اکٹھے رہیں گے۔ ہفتہ دو ہفتے' مجھے پتہ ہے کہ آخر ایک روز مجھے جانا ہی ہو گا۔

رنگیلی ساتھی

اس وقت مانی اور میں گول باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے مانی سے کہا' روتا کیوں ہے تو چند دن عیاشی کرلے۔

نہیں' اس نے جواب دیا' عیاشی نہیں۔ میں تو اک کشمکش میں پھنسا ہوں۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ اسے بازوؤں پر اٹھا کر کسی ڈسٹ بن میں پھینک آؤں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ وہ کیسی رنگ رنگیلی ساتھی ہے تو رک جاتا ہوں۔ وہ خاموش ہو گیا۔

چند ساعتیں خاموش رہا پھر بولا:

ممتاز' وہ لاجواب کمپینین ہے۔ کیا ساتھی ہے۔ اتنی رنگ رنگیلی' اتنی انڈر سٹینڈنگ' گاتی ہے' ناچتی ہے۔ لطیفے سناتی ہے' چٹکیاں بجاتی ہے۔ اس نے لولی لاج کو اندر کا اکھاڑہ بنا رکھا ہے۔

ایک ہفتے کے بعد مانی پھر مجھ سے آملا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا' کیا ہوا' میں نے پوچھا' تو تو شس ہو گیا ہے۔

ہاں' وہ بولا' سارہ چلی گئی ہے۔

کیسے گئی' میں نے پوچھا۔

پرسوں ایک پینیچر سا آدمی آیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا' کہنے لگا میں نے سنا ہے کہ میری بیوی سارہ یہاں رہتی ہے۔

تم کون ہو' میں نے پوچھا۔

بولا' میں اس کا ہسبینڈ ہوں۔

میں نے کہا' پہلے یہاں رہتی تھی' اب جا چکی ہے۔

اگلے روز ایک اور آدمی آ گیا' میں نے کہا' تو کون ہے' کہنے لگا' میں سارہ کا ہسبینڈ ہوں۔

میں حیران رہ گیا۔ پتہ نہیں اس کے کتنے ہسبینڈ ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ سارہ کو گھر سے نکال دوں۔

رات کے دس بجے میں نے شدید سردرد کا بہانہ بنایا' اسے کہا کہ جا جا کر بازار سے چین کلر لے آ' وہ بازار چلی گئی۔ میں نے صدر دروازے پر تالہ لگا دیا۔ اور خود بغلی دروازے سے اندر آ گیا۔

اس نے آ کر دروازہ کھٹکھٹایا' میں چپ چاپ پڑا رہا۔

وہ دروازہ بجاتی رہی بجاتی رہی ' بجاتی رہی۔ رات کے بارہ بج گئے' لیکن میں نے دروازہ نہ کھولا۔

پھر اس نے کھڑکی میں منہ ڈال کر بآواز بلند کہا۔ اچھا بائی بائی۔ تھینک یو فار آل ویز ہیپی ڈیز' اور وہ چلی گئی۔

چلو جان چھٹی' میں نے کہا۔

مانی بولا' نہیں یار لولی لاج اب لولی نہیں رہا۔ میں تو اس قدر اکیلا کبھی نہیں ہوا تھا۔

انیسواں باب

ادب بیتی

علی پور کے ایلی میں میں نے جان بوجھ کر ادب کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ بھید نہ کھل جائے، قاری کو پتہ نہ چلے کہ یہ ناول نہیں بلکہ خودنوشت ہے۔

علی پور کا ایلی میں میں نے اپنے غلیظ پوتڑے چوک میں بیٹھ کر دھوئے تھے، لیکن مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ اپنی حماقتوں، غلاظتوں، کمیوں، کجیوں کو اپناؤں۔

اب جبکہ بات کھل چکی ہے کہ علی پور کا ایلی میری سوانح حیات ہے اور میں اپنی آپ بیتی کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں، تو مناسب ہے کہ میں ادب کے متعلقہ کوائف کو تحریر میں لے آؤں۔

میرے دل میں کبھی آرزو پیدا نہ ہوئی تھی کہ ادیب بنوں میرے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ میں اردو میں لکھنے کا شغل اپناؤں گا۔

جوانی میں میں ایک نالائق لڑکا تھا۔ میری توجہ کتاب کی جانب نہیں تھی۔ سکول میں چونکہ میں ہیڈ ماسٹر کا بیٹا تھا، اس لیے اساتذہ پاس کر دیا کرتے تھے۔

کالج میں شدید احساس کمتری کی وجہ سے میرے لیے جماعت میں بیٹھنا مشکل تھا۔

۲۹ - ۱۹۲۸ء میں جب میں بی - اے میں تھا اور اسلامیہ کالج لاہور کے کریسنٹ ہوسٹل میں رہتا تھا، تو اتفاق سے جو کمرہ مجھے ملا۔ وہ فیاض محمود کے کمرے سے ملحق تھا۔

فیاض محمود ان دنوں کمبائنڈ آنز سکول میں پڑھتا تھا۔ فیاض کو کریسنٹ ہاؤس میں رہنے کی خصوصی اجازت ملی تھی۔ اس پر مطالعہ کا جنون طاری تھا اور اس کے مطالعہ میں بڑی وسعت تھی۔ مطالعہ کے سوا اس کا اور کوئی شغل نہ تھا۔ اس کے ذرائع بہت محدود تھے' لیکن جو پیسہ اس کے ہاتھ آتا' اس کی کتابیں یا رسائل خرید لیتا تھا۔ اس کے کمرے میں فرش پر یہاں وہاں کتابوں اور میگزین کی ڈھیریاں لگی رہتی تھیں' انگریزی ادب' پینٹنگ' فلسفہ' فلم سازی' پامسٹری' سائنس۔

مطالعہ

فیاض اور اس کا بھائی ضیا دونوں کریسنٹ میں مقیم تھے۔ وہ بٹالہ کے ایک معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فیاض نے کبھی مجھے پڑھنے کی ترغیب نہ دی تھی۔ الٹا میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر وہ طنزاً'' کہتا' اچھا تو آپ کتاب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کتاب میں تو کوئی تصویر نہیں ہے' جسے آپ دیکھنا چاہیں گے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی بات میں بڑی کاٹ ہوتی اور انداز میں تحقیر۔

شاید اس تحقیر کی وجہ سے میں چوری چوری فیاض کی کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہتا۔ بہرحال کتاب کی عظمت کا احساس مجھے فیاض نے دلایا۔

پھر محبت کا ایک بلبلہ پھوٹا۔ محترمہ نے مجھے کرسی سے اٹھا کر دھم سے فرش پر پھینک دیا۔ اتنی تذلیل ہوئی کہ میں تنکا تنکا ہو گیا۔ اس شاک کے بعد ہوش آیا تو حسن اتفاق سے میرے سامنے کتاب آ گئی۔ ڈوبتے کے ہاتھ تنکا آ گیا۔ پنجاب پبلک لائبریری نے مجھے پناہ دی۔ یہ مثبت مطالعہ نہ تھا بلکہ فرار تھا' ان دنوں میں گوجرہ ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول میں استاد تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر مبارک اسمٰعیل میں اتنی جان تھی' اتنی بے چینی تھی کہ وہ جن بنا ہوا تھا۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے اسے سوجھی کہ سکول کا ایک جریدہ شائع کرنا چاہیے۔ وہ اتنا بڑا آمر تھا کہ کسی استاد میں روبرو کھڑے ہو کر' بات کرنے کی ہمت نہ تھی۔

جب مضامین کی بانٹ ہو رہی تھی کہ جریدے کے لیے کون' کیا لکھے گا' وہ بولا' ممتاز صاحب آپ اردو سیکشن کے لیے کوئی مزاحیہ چیز لکھیں گے۔

میں نے عرض کی' عالی جاہ میں انگلش ٹیچر ہوں۔ ہائی کلاسز کو انگریزی پڑھاتا ہوں۔ اردو سے ناواقف ہوں۔ انگریزی پڑھتا ہوں' پنجابی بولتا ہوں۔

ہیڈ ماسٹر بولے' سینیئے مسٹر میں اپنی بات دہراتا ہوں۔ ممتاز صاحب آپ اردو میں ایک مضمون لکھیں گے۔

میں نے کہا' جناب والا میں اپنی بات دہراتا ہوں۔

میرے یہ الفاظ دیئے کی رگڑ ثابت ہوئے۔ جن باہر نکل آیا۔ مجبوری میں' رو دھو کر' میں نے ایک نفسیاتی مضمون لکھ دیا۔ جو گھر کے موضوع پر تھا۔

ن م راشد

اس کے بعد چھٹیوں میں میں ملتان گیا۔ میرے والد ان دنوں وہاں سپرانٹنڈنٹ کمپلسری ایجوکیشن تھے۔

ہمارے پڑوس میں راشد رہتا تھا۔ ابھی وہ ن م راشد نہیں بنا تھا۔ ہم دونوں فادر ہوسٹیلیٹی کے مریض تھے۔ اس کا باپ بھی محکمہ تعلیم میں تھا۔ میرا اور اس کا باپ دونوں پروفیشنل رقابت کے شکار تھے۔ جس قدر وہ ایک دوسرے سے الجھتے تھے' اتنا ہی راشد اور میں قریب ہو جاتے تھے۔

راشد کا ایک دوست ملتان سے ایک اردو جریدہ نکالتا تھا' نخلستان۔

دفعتاً" راشد کے دوست کو گاؤں جانا پڑا' جاتے ہوئے وہ رسالے کی اشاعت کی ذمہ داری راشد کو سونپ گیا۔ راشد کہنے لگا' یار رسالے کے لیے مضامین کم ہیں' کچھ بھرتی کی چیزیں شامل کرنی پڑیں گی۔ تاکہ ضخامت پوری ہو جائے۔

راشد کے خاندان کے لوگ اردو فارسی دان تھے۔ میں نے کہا' کیا مشکل ہے۔ تو ہے' تیری بہنیں ہیں۔

نہیں یار' وہ بولا' کم از کم ایک مضمون تو لکھ دو۔

انہی دنوں ملتان میں ایک فلم چلا تھا' بیٹلی دلہن۔ میں نے بیٹلی دلہن کے عنوان سے ایک مضمون لکھ دیا۔

ادبی دنیا

پھر پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ یا تو ادبی دنیا لاہور کے ایڈیٹر' منصور احمد' میری تحریر کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہو گے۔ یا اللہ تعالیٰ نے مجھے تماشہ دکھانے کے لیے ڈگڈگی بجادی۔

مجھے منصور احمد کا ایک خط ملا کہ ہم سالنامہ شائع کر رہے ہیں۔ از راہ کرم ہمارے لیے ایک کہانی لکھ دیں۔

یہ عام سا خط' میری زندگی میں ایٹمی دھماکہ بن گیا۔

زندگی بھر مجھے کہیں سے اہمیت نہ ملی تھی۔ گھر میں کسی کو پرواہ نہ تھی کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کہاں جا رہا ہوں' کب آؤں گا۔ کالج میں مجھے کوئی اہمیت نہ ملی تھی' کہیں بھی تو نہیں ملی تھی۔

اس خط کو پڑھ کر میری ایڑیاں زمین سے اٹھ گئیں۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یااللہ یہ کیا ہوا' اب کیا ہو گا۔

منصور احمد نے مجھ پر تین ظلم کیے۔

ایک تو میری کہانی' جھکی جھکی آنکھیں' سالنامے میں شائع کر دی۔ دوسرے میری کہانی پر ایک تعریفی نوٹ لکھا۔ تیسرے یہ کہ سالنامہ شائع کرنے کے بعد فوت ہو گئے۔

زندگی بھر صرف ایک اڈمائرر ملا تھا' وہ بھی چل بسا۔

اس کے بعد مجھ پر عائد ہو گیا کہ کہانیاں لکھوں۔

عاشق حسین بٹالوی

منصور احمد کی وفات کے بعد پرچے کی ادارت عاشق بٹالوی نے سنبھال لی۔ ایک مشکل کھڑی ہو گئی۔ عاشق بٹالے کا رہنے والا تھا۔ ان کا گھر ہمارے محلے کی ڈیوڑھی کے عین سامنے تھا۔ مفتی محلّہ' جس میں ہم رہتے تھے' ایک قلعہ بند محلّہ تھا۔ آنے جانے کے لیے صرف ایک ڈیوڑھی تھی' مغلیہ ٹھاٹھ کی ڈیوڑھی۔

میں نے دوسرا افسانہ "ڈاکٹر کا استعمال" لکھ کر ادبی دنیا کو بھیج دیا۔ ایک ہفتے کے بعد افسانہ

مجھے واپس مل گیا۔ اس پر جا بجا سرخ پنسل کی لکیریں اور سوالیہ نشانات تھے' نیچے لکھا تھا۔ کوئی طبع زاد چیز لکھیے۔

عاشق بٹالوی بھی سچا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ ایک ڈرا ڈرا سہما سہما' جھجک کا مارا ہوا لڑکا' جس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ سامنے کھڑا ہو کر بات کر سکے' اس میں اتنی صلاحیت کیسے ہو سکتی تھی کہ ایسے ڈھکے چھپے نفسیاتی موضوع پر قلم اٹھا سکے۔

عاشق نے سمجھا کہ وہ افسانہ سرقہ ہے' کسی مغربی افسانے کا چربہ ہے۔

پھر اردو زبان کی بات تھی۔ عاشق اردو دان تھا۔ وہ زبان کی باریکیوں کو سمجھتا تھا اس کے برعکس میں اردو زبان سے بالکل کورا تھا۔

میں نے اردو زبان صرف آٹھویں جماعت تک پڑھی تھی۔ اس زمانے میں اردو لازمی نہ تھی۔ نویں جماعت میں طالب علم دوسرے مضامین لے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے میٹریکولیشن میں اردو چھوڑ کر سائنس اور ڈرائینگ لے لیے تھے۔

زبان کے لحاظ سے میری دوسری کہانی "ڈاکٹر کا استعمال" خامیوں سے بھری ہوئی تھی۔

عاشق حسین نے میری کہانی واپس کر دی تو میں گویا اندھے کنویں میں گر گیا۔ اب کیا کروں۔ کئی ایک دن ڈوبتا تنکے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔

پھر پتہ نہیں کیسے' شاہد احمد نے مجھے ماہنامہ ساقی دلی میں شائع کرنا گوارہ کر لیا۔

خوش قسمتی سے عاشق حسین بٹالوی' ادبی دنیا میں زیادہ دیر نہ رہے۔ ان کی جگہ مولوی صلاح الدین اور میراجی آ گئے۔

صلاح الدین نے آتے ہی مجھے ادبی دنیا کے لیے لکھنے کی دعوت دی اور میری تحریریں پھر سے ادبی دنیا میں شائع ہونے لگیں۔

ایس ایم شریف

پھر سکول میں ہمارے ڈویژنل انسپکٹر ایس ایم شریف آئے۔ انہوں نے مجھے طلب کیا' کہنے لگے' مسٹر ممتاز یہ افسانے لکھنے کا شغل ٹھیک نہیں' اگر بچوں کے والدین کو پتہ چل گیا کہ ہمارے بچوں کو پڑھانے والے جنسی تحریریں لکھتے ہیں تو مشکل پڑ جائے گی۔ میں نے کہا جناب میں تو

افسانے نہیں لکھتا وہ کوئی اور صاحب ہیں۔ شریف مسکرایا' کہنے لگا' بہانے بنانے بے کار ہیں۔ مجھے آپ کے والد صاحب نے بتا دیا ہے۔ شریف میرے والد کے دوست تھے۔ میں ٹھنڈا پڑ گیا۔

وہ بڑی ہمدردی سے بولے' اگر آپ لکھنا چاہتے ہیں تو انگریزی میں لکھیے۔ انگریزی میں لکھی ہوئی چیزوں پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

یہ تو تھی میری افسانہ نویسی کی روداد۔

اب میری پہلی کتاب ان کہی کی اشاعت کہ کہانی سن لیجیے اگر چودھری برکت علی نہ ہوتا تو میری کتاب کبھی نہ چھپتی۔

چودھری برکت علی

چودھری برکت علی پبلشر تھا۔ سکولوں میں پبلشر آیا ہی کرتے ہیں' وہ بھی آیا کرتا تھا۔

میں نے چودھری برکت علی کی شخصیت لکھی ہے' جس میں سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

پہلی بار میں نے اسے سکول میں دیکھا تو خاص توجہ نہ کی۔ ادھیڑ عمر کے باوجود' وہ ایک مستعد سیلزمین تھا۔ سکول میں پبلشرز آتے ہی رہتے تھے۔ بڑے مودب' مہذب' جی جناب' جناب عالی۔ لیکن اس کا انداز منفرد تھا' نہ جی' نہ لیس سر' نہ جناب والا۔ آتے ہی وہ بے تکلفانہ بات چھیڑ کر اپنے گرد ایک جمگھٹا لگا لیتا پھر اس کے قہقہے گونجتے۔

مجھے پبلشروں سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اگرچہ میرے مالی حالات بہت خراب تھے۔ تنخواہ قلیل تھی۔ گھر میں افراد زیادہ تھے' قرض پر گزر بسر ہوتی تھی' لیکن یہ بات کبھی نہ سوجھی تھی کہ پبلشرز سے مالی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دوسری دفعہ وہ مدرسے میں آیا تو تفریح کا وقت تھا۔ اساتذہ سٹاف روم میں بیٹھے تھے۔ اس نے آتے ہی حسب دستور سارے سٹاف کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ دیکھ کر میں سٹاف روم سے باہر نکل گیا اور میدان میں ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔

کچھ دیر کے بعد میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ میرے روبرو کھڑا تھا۔ السلام علیکم کہہ کر وہ میرے پاس آ بیٹھا۔

تمہارا نام کیا ہے۔ اس نے مجھ سے یوں پوچھا جیسے میں سینئر انگلش ٹیچر نہیں بلکہ طالب علم تھا۔

مجھے اس کی بے تکلفی اچھی نہ لگی۔ لیکن اس زمانے میں میں بری طرح سے احساس کمتری کا شکار تھا۔ میرا نام ممتاز حسین ہے۔ میں نے جواب دیا۔

ممتاز حسین' ممتاز مفتی

ان دنوں سکول میں میرا نام ممتاز حسین تھا۔ کسی کو علم نہ تھا کہ میں ممتاز مفتی کے نام سے ادبی جریدوں میں لکھتا ہوں۔ یہ بات میں نے التزاماً" چھپائے رکھی تھی۔ میرے ساتھی اساتذہ رسمی اخلاق کے دیوانے تھے۔ میری تحریریں نفسیات اور جنسیات کا زاویہ لیے ہوئے ہوتیں۔ یہ زاویہ نظران دنوں ممنوع تھا۔ دراصل سکول کی ملازمت کے ابتدائی دور میں ہی مجھے یہ احساس ہو چکا تھا کہ میرے خیالات میرے ساتھی اساتذہ کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔

انہی دنوں از راہ اتفاق میری ایک تحریر ہمارے سٹاف کے ایک ممبر کے ہاتھ آ گئی۔ وہ اس جریدے کو سٹاف روم میں لے آیا اور سب کو مخاطب کر کے اس افسانے پر تنقید کرنے لگا۔ افسانے کے اقتباسات سن کر جملہ اساتذہ نے لاحول پڑھا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے' کہنے لگے کہیں یہ ماسٹرجی آپ کی تصنیف تو نہیں ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ مطمئن ہو گئے پھر مجھ سے کہنے لگے ادب کے نام پر ایسی اخلاق سوز باتیں لکھنا کس قدر افسوسناک بات ہے' کیوں ممتاز صاحب۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اعلان کر دوں کہ ہاں یہ افسانہ میں نے لکھا ہے۔ آپ جو اسے اخلاق سوز سمجھ رہے ہیں' یہ آپ کی ذہنی وسعت کا فقدان ہے' لیکن مجھ میں جرأت نہ پڑی اور میں نے جواب میں سر اثبات میں ہلا دیا' آپ بجا فرماتے ہیں۔ اس روز میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مدرسے میں اپنی تصانیف کو نہیں اپناؤں گا۔

تین ہزار

کب سے سکول میں ملازمت کر رہے ہو' چودھری نے پوچھا۔ چھ سات سال ہوئے۔ میں

نے جواب دیا۔

پھر اس نے اپنا تعارف کرانا شروع کر دیا۔ کہنے لگا' میرا نام چودھری برکت علی ہے۔ میں پنجاب بک ڈپو کا مالک ہوں۔ ہم درسی کتابیں چھاپتے ہیں۔

سوواٹ' میں نے سوچا' چھاپتے ہو تو پڑے چھاپو' لیکن اخلاقاً" با آواز بلند کہا' بہت خوب' اور پھر خاموش ہو گیا۔ چند ایک منٹ کے لیے خاموشی طاری رہی' پھر دفعتاً" وہ جوش میں آ گیا بولا میں تمہیں ایک آفر دینا چاہتا ہوں۔

تو مجھے کیا آفر دے گا' میں نے سوچا۔

ہم کورسز کے علاوہ ہلپ بکس بھی چھاپتے ہیں' وہ بولا۔ تم مجھے میٹریکولیشن کے لیے ایک ٹرانسلیشن گائیڈ لکھ دو۔ میں تمہیں تمہاری تین سال کی تنخواہ سے زیادہ معاوضہ دوں گا۔ آج ہی مجھ سے معاہدہ کر لو۔ آدھی رقم ابھی ادا کر دوں گا' اور آدھی چھ مہینے کے بعد' جب تم مجھے مسودہ دو گے۔

پتہ نہیں ان دنوں میری نفسیت کس سانچے میں ڈھلی تھی کہ تین سال کی تنخواہ مجھ میں کوئی تحریک پیدا نہ کر سکی۔ میں نے کہا' چودھری صاحب' آپ کی بڑی نوازش ہے' لیکن مجھے درسی کتاب لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

غصے سے اس کا منہ لال ہو گیا۔ بولا' تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے مسٹر۔

کچھ کہنے کی غرض سے میں نے کہا' آپ کسی اور ٹیچر سے کیوں نہیں لکھوا لیتے۔

میں نے اس قسم کی آفر کسی اور کو نہیں دی' اس نے مجھے ڈانٹا۔

چودھری جی' میں نے کہا' آخر مجھ میں ایسی کیا بات ہے کہ آپ یہ کتاب مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔

وہ رک گیا' کہنے لگا ہم درسی کتابوں کے پبلشرز بڑے ول انفارمڈ ہوتے ہیں۔ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ کون سی ہلپ بک کس سے لکھوانی ہے۔ مگر تم کیا سمجھو گے تمہارا ذہن ہی ٹھیک نہیں' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مکتبہ اُردو

تین مہینے کے بعد وہ پھر آیا۔ بغیر کسی تمہید کے اس نے حکم چلایا۔ تم فارغ ہو تو میرے

ساتھ چلو۔

اس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ لیکن اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ سوچ رہا تھا یہ کیسا پبلشر ہے' جو منہ میں آئے کہہ دیتا ہے' ذرا نہیں جھجکتا۔طبیعت کا جاٹ ہےانداز تکلم جرنیلی ہے' بات بات پر ڈانٹتا ہے' بات بات پر قہقہے مارتا ہے۔ بات کا کڑوا ہے' لیکن ساتھ ہی بات سے سچائی اور خلوص کی بو آتی ہے۔

ایک ہوٹل پر جا کر وہ رک گیا' بولا' مجھے بھوک لگی ہے' پہلے طعام پھر کلام۔

ان دنوں میں نفسیات کے مطالعے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کس نے کہا تھا کہ کسی کی شخصیت کو جاننا چاہو تو اسے کھاتے ہوئے دیکھو۔

میں چودھری برکت علی کو کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ بڑی بے تکلفی اور اشتیاق سے کھا رہا تھا۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے ٹیبل میزز سے بے نیاز' کوئی دیکھتا ہے' تو پڑا دیکھے' اچھا جانے' برا مانے' سوواٹ۔

خود کھانے کے ساتھ ساتھ وہ مجھے بھی کھلا رہا تھا۔ یہ کھاؤ' یہ عمدہ ہے' یہ اچھا نہیں' یار تم کیسے انسان ہو۔ نہ تمہیں بات کرنی آتی ہے' نہ کھانا آتا ہے' نہ پیسہ کمانا آتا ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے بڑے سرسری انداز میں کہا' اچھا تو ممتاز مفتی آج تک تم نے کتنے افسانے لکھے ہیں۔

اس کے اچانک سوال پر میں گھبرا گیا۔

اب آئیں بائیں شائیں نہ کرنا' اس نے مجھے ڈانٹا۔ میں نے شاہد احمد ایڈیٹر ساقی سے تحقیق کر لی ہے تمہارے گیارہ افسانے میں نے حاصل کر لیے ہیں' سات افسانے تم دے دو' ہم تمہارا مجموعہ چھاپیں گے۔

اس کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

کہنے لگا'ہم نے ایک ذیلی ادارہ بنایا ہوا ہے' جو ادبی کتابیں چھاپتا ہے' مکتبہ اردو مگر غلط فہمی میں نہ رہنا' ادبی کتاب سے تمہیں صرف ڈھائی تین سو روپے ملیں گے' اس سے زیادہ نہیں۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔

اور ہاں' وقفے کے بعد وہ پھر بولا' گھبراؤ نہیں ہم کسی کو نہیں بتائیں گے کہ تم ممتاز مفتی

ہو۔ تمہیں نہیں معلوم پبلشر پردہ رکھنا جانتے ہیں' پردہ رکھنا ان کا کام ہے' پردہ اٹھانا نہیں۔

ٹھیک ہے نا' تمہارا چاؤ پورا ہو جائے گا' اس نے پھر مجھے ڈانٹا۔ لیکن تم احمق ہو' وہ بولا' اگر تم ٹرانسلیشن گائیڈ لکھ دیتے تو تمہیں دو ڈھائی تین ہزار مل جاتے۔ دفعتاً" اسے سوجھی' بولا' چلو ہماری آفراب بھی سٹینڈ کرتی ہے تم اپنا شوق پورا کر لو' ہم تمہاری کتاب چھاپتے ہیں' جب تک تم ہماری ٹرانسلیشن گائیڈ لکھ دو۔ بولو منظور ہے' چند ایک ساعت وہ میری جانب دیکھتا رہا' پھر غصے میں میز پر مکا مار کر بولا' تم بدنصیب ہو' ہٹاؤ' دی آفراز کلوزڈ۔

ان کہی

چھ مہینے کے بعد اس کا خط موصول ہوا لکھا تھا' کتاب چھپ گئی ہے فوراً" لاہور پہنچو۔

لاہور پہنچا تو "ان کہی" چھپی ہوئی تھی۔ لاحول ولا' کیا بیہودہ نام ہے' چودھری برکت علی نے ناک چڑھا کر کہا۔ اس میں سٹال ویلیو نہیں۔ لیکن تمہیں کچھ پتہ بھی ہو۔ خیر' اپنی رائیلٹی لو اور مزے کرو۔ دس فیصد کے حساب سے تین سو روپیہ ہے۔ پھر وہ دفعتاً" رک گیا بولا۔ ممتاز مفتی' یہ بتا کیا کوئی ایسی چیز ہے جسے خریدنے کو تیرا دل چاہتا ہے۔

اس زمانے میں میری سب سے بڑی آرزو تھی کہ ریڈیو خریدوں' لیکن ریڈیو بہت قیمتی تھے۔ میری توفیق نہ تھی۔ چونکہ میری تنخواہ پینتالیس روپے تھے۔ اس لیے اس آرزو کے پورے ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔

میں نے دبی زبان سے کہا' چودھری ریڈیو خریدنے کو جی چاہتا ہے' لیکن ——————

اس نے مجھے جملہ مکمل کرنے نہ دیا۔ میری بانہہ پکڑی گھسیٹ کر دوکان سے باہر لے گیا۔ ایک تانگے میں بٹھا کر وہ مجھے ہال روڈ لے گیا۔ وہاں ہم دو ایک دوکانوں میں گئے' مختلف ریڈیو دیکھے' ان کی قیمتیں پوچھیں' چار پانچ سو سے کم کا کوئی ریڈیو نہ تھا۔ آخر میں اس نے ایک ریڈیو پسند کیا۔ اس کا نام ایکو تھا' قیمت ساڑھے سات سو روپے تھے۔

اس نے وہ ریڈیو تانگے پر رکھا' بولا' بیٹھ جا سیدھا سٹیشن پر جانا۔ ایک گھنٹے کے بعد قصور کی گاڑی جائے گی۔

اس پر میں نے احتجاج کیا' میں نے کہا' دیکھ چودھری میں تیرا قرض کیسے ادا کروں گا۔

کوئی قرض ورض نہیں' وہ چلایا' میری طرف سے تحفہ ہے' جا اب۔ دیکھ اسے خیال سے ساتھ لے جانا' توڑ پھوڑ دیا تو میں مرمت کرا کے نہیں دوں گا۔ اوپر تختے پر نہ رکھنا' اپنے پاس سیٹ پر رکھنا۔

راستے میں میں سوچتا رہا یا اللہ یہ شخص کیسی مخلوق ہے ایک طرف سے ریچھ ہے' دوسری طرف سے فاختہ۔ انسان کی شخصیت سے متعلق میرا سارا علم خس و خاشاک بن کر' زمین پر بکھرا ہوا تھا۔

پیراڈاکس

اس کے بعد ہم دوست بن گئے۔ لیکن نہیں یہ تعلق دوستی کا نہیں تھا۔ یہ تعلق ایک عجیب سا تعلق تھا' جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

اگرچہ وہ میرا ساتھ دیتا تھا لیکن ساتھی نہیں تھا۔ بات بات پر ڈانٹتا تھا۔ لیکن بڑا بن کر نہیں۔ اکثر مدد کرتا تھا' مگر مربی بن کر نہیں۔ اگر کسی بات پر میں ممنون احسان ہوتا' شکر گزاری کا اظہار کرتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس دیتا۔ یار تم کتنے احمق ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں تم پر احسان نہیں دھر رہا۔ میں تو بزنس مین ہوں' حساب کتاب کا کچا نہیں' میں تو تم پر انوسٹ کر رہا ہوں۔

چودھری برکت علی ایک قابل بزنس مین تھا۔ وہ اصراف کا قائل نہ تھا۔ ہمیشہ دو اور دو چار گنتا تھا۔ لیکن وہ ایک عام بزنس مین نہیں تھا۔ بہت بڑا بزنس مین تھا۔ ہر بات کو پلان کرتا تھا۔ انوسٹمنٹ کو بگ بزنس کے حوالے سے دیکھتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ چودھری برکت علی شخصیت اور کردار کے لحاظ سے ایک بڑا آدمی تھا۔ حسابی اتنا کہ نالے کے کنارے پر رک کر سوچ میں پڑ جائے' غنی ایسا کہ سوچے سمجھے بغیر دریا پھلانگ جائے۔ بگڑنے پر آئے تو چھوٹی سی بات پر بگڑ جائے۔ درگزر کرنے پر آئے تو بڑی سے بڑی بات کو نظر انداز کر دے۔ چودھری برکت علی کی شخصیت مجموعہ اضداد تھی' لیکن اس میں منفی عنصر نہ تھا۔ اسے مل کر پہلی بار میں شخصیت میں پیراڈاکس کا مفہوم سمجھا۔

جان ہی جان

اس کا برتاؤ صرف مجھ سے ہی اس نوعیت کا نہ تھا۔ اس کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ یہ

تعلقات سوشل نوعیت کے نہیں تھے۔ رکھ رکھاؤ کا وہ قائل ہی نہ تھا۔ دانستہ آید بکار کا اسے شعور نہ تھا۔ دراصل اس کے اندر بڑی جان تھی، بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پبلشنگ کا کام اس کے اندر کی "لُدھ" کو جذب نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا اس نے بہت سی مصروفیات پال رکھی تھیں۔ پبلشروں کی ایک تنظیم بنا رکھی تھی۔ وہ ایک ہائی سکول چلا رکھے تھے۔ پنجاب بک ڈپو کے علاوہ ادبی کتابیں نشر کرنے کا ایک ادارہ مکتبہ اردو بنا رکھا تھا، جو اعلیٰ ادبی کتابیں چھاپنے کے لیے مشہور تھا۔ ایک ادبی ماہنامہ چلا رکھا تھا، "ادب لطیف"۔

ان دنوں ادب لطیف، چوٹی کا ادبی جریدہ سمجھا جاتا تھا۔ جسے چلانے کے لیے چودھری برکت علی نامور ادیبوں کا تعاون حاصل کیا کرتا تھا۔

ان دنوں چودھری کے بہت سے نوجوان عزیز و اقربا اس کے گرد آ جمع ہوئے تھے، نذیر تھا، رشید تھا، بشیر تھا، یہ نوجوان بڑے ذہین تھے۔ محنتی تھے، وہ برکت علی کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ ان میں کام کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ادب شناسی اور پرنٹنگ میں مہارت حاصل کر لی۔ اور ادبی حلقوں پر چھا گئے۔

اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ شیخوپورہ کے ایک زرعی خاندان نے کس طرح اعلیٰ ادب اور کوالٹی پرنٹنگ پر عبور حاصل کر لیا اور لاہور میں پرنٹرز اور پبلشرز کے حلقوں میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ بہرحال ایک بات واضح تھی کہ یہ سب دیئے چودھری برکت علی کے جلائے ہوئے تھے۔ ان باصلاحیت نوجوان چودھریوں میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ سب اوور امبشس تھے، اور میں میں سے اس قدر سرشار تھے کہ مل کر کام نہ کر سکے۔ ورنہ آج چودھری خاندان کا مقام بہت بلند تر ہوتا۔

باری کمپنی کی حکومت

ایک دن چودھری برکت گہری سوچ میں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا، یہ تو غیر از معمولی بات ہے۔

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔

چودھری سوچ رہا ہے، غیر از معمولی بات ہے، ہے نا، میں نے اسے چھیڑا۔ کیوں، وہ بولا، مجھے سوچنے کی اجازت نہیں کیا۔

عمل کے متوالے عام طور پر سوچتے نہیں۔

وہ ہنسا' اچھا تو مجھے مشورہ دے' میں چاہتا ہوں کہ باری کو کچھ دیں۔

اس میں کیا مشکل ہے' دینا چاہتے ہو تو دے دو' میں نے کہا۔

تم بھی نرے ادیب ہو' اس نے ناک چڑھا کر کہا' ممتاز مفتی دینے کا کوئی طریقہ ہوتا ہے' انداز ہوتا ہے' یہ نہیں کہ دوسرے سے کہا' ہاتھ پھیلا اور دے دیا' یہ کہہ کر وہ غصے میں اٹھ بیٹھا اور چلا گیا۔

باری ایک ادیب تھا' دانشور تھا' اس نے چودھری کے کہنے پر ایک کتاب لکھی تھی' "کمپنی کی حکومت" جسے مکتبہ اردو نے شائع کیا تھا۔ باری مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا' لیکن تھا بڑا خود دار چودھری نے کئی بار اسے کہا تھا۔ باری تو بہت نکما ہے۔ کچھ لکھ' پیسے کما' ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے۔ خالی دانشورانہ باتیں کرنے سے کچھ نہیں ہوتا' لیکن باری جملہ ادیبوں کی طرح خالی دانشورانہ باتیں کر کے گزر اوقات کر رہا تھا۔

ہزار روپیہ

دو ایک دن کے بعد چودھری نے مجھ سے کہا' دیکھ باری کچھ نہیں لکھے گا تو اسے کہہ کہ اپنی تصنیف "کمپنی کی حکومت" پر نظر ثانی کر دے۔

بڑی مشکل سے باری نظر ثانی کرنے پر رضامند ہو گیا۔

جب کتاب کی ریویژن مکمل ہو گئی' تو باری مجھ سے کہنے لگا' یار میں بھی احمق ہوں۔ جس کتاب کی تصنیف پر مجھے صرف تین سو روپے ملے تھے۔ اس پر نظر ثانی کے لیے زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو مل جائیں گے۔ خوامخواہ میں نے تین مہینے ضائع کیے۔

جب چودھری نے نو سو کا چیک کاٹ کر باری کو دیا' تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ چیک نو سو کا ہے۔ نو سو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔

باری نے مجھ سے کہا' یار کل میرے گھر آنا' بہت ضروری کام ہے۔

وہ ایک چھوٹی سی نیم چھتی میں بیٹھا تھا' کمرے میں کوئی سامان نہ تھا صرف ایک دری بچھی ہوئی تھی۔

کہنے لگا' مفتی میری بہت بڑی آرزو تھی کہ یک مشت ایک ہزار روپیہ میرے ہاتھ میں ہو۔ آج وہ پوری ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک ایک روپے کے نوٹوں کے تو بنڈل کھولے۔ پھر ان پرچیوں کو ہوا میں اڑانے لگا۔ اس روز وہ سارا دن ان پرچیوں سے کھیلتا رہا۔

اگلے روز میں نے چودھری کو بتایا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے کی بجائے فکر مند ہو گیا۔ کہنے لگا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اسے ہزار روپے دے دیتا۔ اس کے ساتھ ہی چودھری کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جو ادیب برکت علی کے اداروں میں کام کرتے تھے' انہیں باقاعدہ تنخواہ نہیں دی جاتی تھی' کبھی پچاس دے دیئے جاتے' کبھی پچیس اور کہہ دیا جاتا کہ باقی پھر سہی۔ اس باقی پھر سہی سے ادیب بہت تنگ ہوتے تھے۔

احمد راہی

ان دنوں احمد راہی مکتبہ اردو میں کام کرتا تھا۔

ایک روز احمد راہی کہنے لگا' یار مفتی آج میں چودھری نذیر کا اس چاقو سے پیٹ چاک کروں گا۔ تو یہاں بیٹھ جا اور دیکھتا رہ۔ وہ تماشا دکھاؤں گا کہ یاد کرے گا۔

میں نے کہا' بات کیا ہے۔

کہنے لگا' میری دو مہینے کی تنخواہ دبا رکھی ہے۔ باقی پھر' باقی پھر' کر کے کل اس شخص نے جو کام کیا ہے' میں اسے کبھی نہیں بخشوں گا۔ کل میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ پیچھے نے منڈی سے ایک عمدہ مچھلی خریدی اور میرے گھر چلا گیا۔ میری بیوی سے کہنے لگا بھابھی آج راہی گھر پر نہیں ہے تو میں نے سوچا بھابھی سے پوچھ آؤں کہ کوئی تکلیف تو نہیں' کچھ منگوانا تو نہیں۔ راستے میں یہ مچھلی مجھے اچھی لگی تو میں آپ کے لیے لے آیا۔

اب میری بیوی کہہ رہی ہے۔ چودھری تو بہت اچھا آدمی ہے ضرور تم نے اس سے رقم لے کر کھالی ہے اور اس پر الزام دھر رہے ہو کہ وہ تنخواہ نہیں دیتا۔

آج میں اسے نہیں چھوڑوں گا' احمد راہی نے میز پر مکا مارا۔

اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ احمد راہی خود قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

کہنے لگا یار کمال کی چالاکی کر دکھائی ہے' چودھری نے' لیکن آج میں اسے چھوڑوں گا

نہیں۔

حیرت کی بات تھی کہ کہیں تو ہزاروں روپوں کی رقم بے دریغ ادا کر دی جاتی تھی اور کہیں معمولی رقم کی ادائیگی میں باقی پھر سسی کی کل لگا دی جاتی تھی۔

منٹو

پھر یہ بھی ہوتا تھا کہ مہینے میں ایک یا دو بار منٹو مکتبہ اردو میں آ بیٹھتا۔ چودھری نذیر' بوتل منگا' وہ تقاضا کرتا۔ چودھری گھبرا جاتا تو منٹو چلاتا' ابے ہچکچاتا کیوں ہے۔ ایک نہیں دو کہانیاں لکھ کر دے کر جاؤں گا۔ یہاں تیرے پاس بیٹھ کر لکھوں گا' لیکن دیکھ جانی وا کر لانا' ٹھرا نہ اٹھا لانا' اور ادھار نہ ہو۔ چودھری نذیر گھبراتے' گھبراتے ہچکچاتے' ہچکچاتے' اگر بڑے ادب سے وسکی خریدنے چل پڑتا۔ ادیبوں کی مانگیں طرح طرح کی ہوتی تھیں۔ منٹو دھونس سے مانگتا تھا۔ فکر تونسوی کی مانگ کبھی ہونٹوں تک نہ آئی تھی۔ صرف نگاہوں میں جھلکتی۔ اس میں بھی قیام پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی جلتی کبھی بجھ جاتی' یونہی جلتی بجھتی رہتی۔

فکر تونسوی

فکر تونسوی کامی تھا' گونگا تھا' ادب کا دیوانہ تھا پتہ نہیں کہاں کہاں رلنے کے بعد' کیسے چودھری کے پاس آ پہنچا تھا۔ چودھری بظاہر فکر کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ مگر در پردہ وہ فکر کی قدر کرتا تھا' اس لیے کہ چودھری کے ادارے میں فکر واحد کامی تھا۔ باقی سب منہ زبانی تھے اور چودھری کامی کی بڑی قدر کرتا تھا چونکہ سرمایہ دار ہونے کے باوجود بنیادی طور پر وہ خود شدت سے کامی تھا۔

تقسیم کے بعد پنجاب اور ہندوستان سے آنے والے ادیبوں کا تانتا لگ گیا۔ چودھری پر بہت بوجھ پڑ گیا مہاجر ادیبوں کی مانگوں کا رنگ بدل گیا اور چودھری کی تلخ کلامی دب کر رہ گئی حالات نے اسے ڈی سلف کر دیا۔

اس کے نوجوان عزیزوں نے پر پرزے نکال لیے اور وہ علیحدگی پر ضد کرنے لگے۔ چودھری کا اپنا بیٹا چودھری جیسی صلاحیت کا مالک نہیں تھا۔ وہ چودھری کے کاروبار کو سنبھالنے کی اہلیت نہ

رکھتا تھا۔ چودھری کے اداروں میں کام کرنے والوں میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جو کاروبار میں اس کا ساتھی بن سکتا۔ چودھری کی بیٹی میں صلاحیت موجود تھی۔ لیکن اس کی شادی ایسی جگہ ہوئی جہاں' ''افلوانس'' نے اسے چاٹ لیا۔

چودھری کا مطالبہ تھا کہ میں نوکری چھوڑ کر اس کے ادارے میں کام کروں مجھے علم تھا کہ میں کاروباری صلاحیت سے کورا ہوں اور عملی طور نکما ہوں' اس لیے میں نے اس کی پیش کش کو منظور نہ کیا۔ پھر میں تلاش معاش میں راولپنڈی آ گیا اور ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ رابطہ ٹوٹنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں چودھری سے شرمندہ تھا۔ اس نے بار بار جگہ جگہ میرا ساتھ دیا تھا' لیکن میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا۔ ایک بات یقینی ہے اگر چودھری برکت علی ساتھ نہ دیتا تو ممتاز مفتی سوکھ کر بکھر جاتا اور آج اس نام سے کوئی واقف نہ ہوتا۔

بیسواں باب

پچھ حسین لڑکیاں۔ میوٹنی

وہ ایک تحقیقی کمپنی تھی۔ جو ٹھیکے پر تحقیق کا کام کرتی تھی۔ حکومت پاکستان نے کمپنی کو ایک انوکھی تحقیق پر لگا دیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ حکومت کے ایکسپرٹ اہلکار' پائیلٹوں کے چناؤ کے لئے ساٹھ ستر ہزار امیدواروں سے انٹرویو کرتے تھے۔ انہیں ذہانت اور ایپٹی ٹیوڈ (Aptitude) کے ٹسٹ دیتے تھے۔ ساٹھ ستر ہزار میں سے دو سو نوجوان چن لیتے تھے' جو جسمانی کوائف ذہانت اور رجحان طبع کے لحاظ سے موزوں ترین ہوتے۔ ان دو سو نوجوانوں کو دو سال تربیت دی جاتی' لیکن بعد میں پتہ چلتا ——————— کہ صرف دو یا چار نوجوان جہاز اڑانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یا تو انٹرویو میں مناسب لڑکے نہیں چنے جاتے تھے۔ یا ٹھیک طرح سے تربیت نہیں دی جاتی تھی اور یا امریکہ کے بنے ہوئے ٹسٹ پاکستانیوں کے لیے موزوں نہیں تھے۔

تحقیقی کمپنی کو ان سب باتوں کا کھوج لگا کر نشان دہی کرنی تھی۔

اس زمانے میں میں حکومت پنجاب کے ایک ہفت روزہ پرچہ نکالنے والے ادارے میں شامل تھا۔ اگرچہ میری دو کتابیں چھپ چکی تھیں۔ لوگ مجھے جاننے بھی لگے تھے' لیکن یہ نوکری

مجھے پسند نہ تھی۔

فیاض محمود

ایک روز ضیا آ گیا۔ ضیا بڑا مدھم اور میٹھا آدمی تھا۔ بولا نوکری بدلو گے۔

نوکری ———— میں نے خوشی بھری حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

ہاں' وہ بولا تنخواہ یہاں کی نسبت زیادہ ملے گی اور کام اس قدر دلچسپ ہے کہ

کہاں ہے نوکری۔ کوئی ایڈ چھپا ہے کیا۔

اونہوں ایڈ نہیں چھپے گا۔ چپ چاپ چناؤ ہو جائے گا۔ نوکری سرکاری نہیں ہے۔ لیکن بعد میں شاید ہو جائے۔

چناؤ کون کرے گا میں نے پوچھا۔

کمپنی چاہتی ہے کہ فیاض محمود چناؤ کرے۔

فیاض ———— مجھ میں گویا سیون اپ کی بوتل کھل گئی۔ بلبلے ہی بلبلے' خوشی بھری شوں شوں۔

فیاض اور میں دو ڈھائی سال ایک لاج میں اکٹھے رہے تھے۔ ان دنوں کمبائنڈ آنرز سکول میں پڑھتا تھا اور میں اسلامیہ کالج لاہور میں۔

علی پور کا ایلی میں فیاض کا نام جاہ ہے اور ضیا کا بھلا۔ بھا اور جاہ۔

فیاض نہ ہوتا تو گمان غالب ہے کہ میں کتاب کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوتا۔ فیاض کی زندگی کا واحد شغل مطالعہ تھا۔ اس کا مطالعہ درسی کتابوں پر محدود نہ تھا۔ اس میں بلا کی وسعت تھی۔ اگرچہ اس کے ذرائع محدود تھے' لیکن شوق کا یہ عالم تھا کہ کوئی رقم اس کے ہاتھ لگتی تو وہ فوراً اس کی کتابیں خرید لیتا۔ اس کے کمرے میں یہاں وہاں کتابوں کی ڈھیریاں لگی رہتی تھیں۔

فیاض نے کبھی مجھے مطالعے کی طرف راغب نہ کیا تھا۔ الٹا میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر کہتا آپ؟ آپ کتاب دیکھ رہے ہیں' غالباً" تصویریں دیکھ رہے ہوں گے۔ آئی ایم سوری' اس کتاب میں تصویریں نہیں ہیں۔ اسے وہیں رکھ دیجئے پلیز۔

اس کی آواز میں بلا کی کاٹ ہوتی۔ تحقیر کی جھلک ہوتی۔ اس کے باوجود میں فیاض کا مداح تھا اور فیاض کی کتابیں چرا کر' چھپ چھپ کر پڑھا کرتا تھا۔

میں نے ضیا سے کہا' بھا (اسے سبھی دوست بھا کہا کرتے تھے) میں فیاض سے مل کر اس ملازمت کے متعلق تفصیلات پوچھ لوں گا۔

بے شک پوچھ لو۔ لیکن اسے یہ نہ بتانا کہ یہ اطلاع تمہیں میں نے دی ہے۔

فیاض کا دفتر ایک بارک نما عمارت میں تھا۔ ملحقہ کمرے میں اس کا پی اے بیٹھا تھا۔ پی اے نے کہا آپ اپنا کارڈ اندر بھجوا دیں۔ میں نے کہا میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں ہے۔ اچھا وہ بولا اپنا نام پتہ اس سلپ پر لکھ دیں۔

سلپ اندر گئی تو میں سوچنے لگا' ابھی ابھی میں اندر جاؤں گا۔ وہ میری جانب خوشی بھری حیرت سے دیکھے گا' چھلانگ لگا کر میری جانب بڑھے گا' مجھے گلے سے لگائے گا' تم ممتاز' تم کہاں۔ فسادات میں بٹالے سے کیسے نکلے کیا قافلے میں آئے تھے۔ کون کون پہنچا' کون کون نہ پہنچ سکا۔ آجکل کہاں ہو' کیا کر رہے ہو۔ پتہ نہیں میں کب تک سوچوں میں پڑا رہا۔

پی اے نے مجھے جھنجھوڑا بولا' جائیے' آپ کو بلایا ہے۔ اندر داخل ہوا تو فیاض کسی فائیل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میری طرف دیکھے بغیر بولا' لیس کم ان' ہیو اے سیٹ۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ پھر پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ یہاں سفارش نہیں چلے گی——— جان پہچان پر بھروسہ نہ کیجئے گا ——— بہرحال اپلائی کر دیجئے۔ ہم صرف نوجوان لڑکے لیں گے۔ جو کم از کم ایم ۔ اے ہوں۔ البتہ ہم آپ کو کنسڈر کر لیں گے——— آئی کیو کا مطلوبہ گریڈ پاس کرنا ضروری ہے——— کمرہ تنگ ہوا جا رہا تھا۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

آٹھ دن یہی کیفیت طاری رہی۔ سانپ نکل گیا تھا لکیریں چلتی رہیں' چلتی رہیں۔ میں نے جانا کہ سانپ کی نسبت لکیریں زیادہ زہریلی ہوتی ہیں' چنگل میں پکڑ لیتی ہیں' پھر لپٹ لپٹ کر دم گھونٹتی رہتی ہیں۔

دس پندرہ دنوں کے بعد انٹرویو کی کال آ گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ ابھی تو پرانی لکیروں کا جال ختم ہوا تھا' تازہ لکیروں سے خائف تھا۔

انٹرویو سے ایک دن پہلے بھا آگیا۔

میں نے کہا' نہیں بھا' میں نہیں جاؤں گا۔

کیوں' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' میں فیاض کو انٹرویو نہیں دوں گا۔

شاید کمپنی کے لوگ انٹرویو لیں' وہ بولا' فیاض تو سرکاری ملازم ہے۔

میں نے بھا کی جانب دیکھا۔

آزمانے میں کیا حرج ہے' وہ بولا۔ بن گیا تو ٹھیک ہے نہ بنا تو نہ سہی۔ نتھنگ ٹولوز۔

بھا کی باتوں سے مٹھاس کی ایک پھوار نکلتی ہے' جو لت پت کر دیتی ہے۔

میں تو شدت اور تلخی کا مارا ہوا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ سچ کہہ دینا ازبس ضروری ہے' چاہے وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ خلوص کا یہی تقاضا ہے کہ سچ کہہ دیا جائے۔ انٹرویو کے دوران میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میں نے پینل کی جانب نہ دیکھا۔ کہ کہیں فیاض محمود شامل نہ ہو۔

انٹیلی جنس ٹسٹ سے میں بخوبی واقف تھا۔ کیوں کہ میں نے نفسیات کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ میرا مطالعہ انٹینسو نہ تھا بلکہ ایکٹنسو تھا۔ پھر بھی میں بڑے بڑے ٹسٹوں سے واقف تھا۔ اس کے باوجود میں کنفیوز ہو گیا اور مجھے اس حقیقت کا پتہ چلا کہ جو ٹسٹوں کو جانتے ہیں' وہ اٹک جاتے ہیں جو نہیں جانتے وہ نکل جاتے ہے۔

جب مجھے پتہ چلا کہ میں سیلکٹ کر لیا گیا ہوں' تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

رورشاک ٹسٹ

اس تحقیقی ادارے میں بیس پچیس افراد تھے۔ سب کے سب "بلیو بلڈ" جو تجربے سے آلود نہ ہوئے تھے۔ وہ سب اپنے اپنے مضامین میں ماسٹر تھے۔ نفسیات' حساب' اکاؤنٹس' قانون۔ صرف چار افراد عمر رسیدہ تھے۔ دو نفسیات کے ڈاکٹر اور دو ادیب یوسف ظفر اور میں تحقیق کا موضوع' انسانی شخصیت تھا۔ ادارے کو فوج کے تینوں شعبوں کا تعاون حاصل تھا' اس لیے اسے انٹر سروسز سلیکشن بورڈ سے منسلک کر دیا گیا تھا۔

مجھے نفسیات کے سیکشن میں تعینات کیا گیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں امیدواروں کو رورشاک ٹسٹ دوں۔

لاورک شاک ٹسٹ، سیاہی کے دھبوں سے بنا ہوا ٹسٹ تھا۔ آپ کاغذ پر تھوڑی سی سیاہی گرائیں پھر اسے فولڈ کرلیں تو سیاہی پھیل جائے گی۔ اس پھیلاؤ میں مختلف شکلیں بن جائیں گی اور ان میں سیاہی کی مختلف کیفیتیں ہوں گی۔ کہیں دھبہ بہت گاڑھا ہو گا کہیں درمیانہ، کہیں پھیکا۔ کہیں کہیں کاغذ کی سفیدی چھوٹ جائے گی۔ رورشاک ٹسٹ ایسے ہی بارہ کارڈوں پر چھپے ہوئے سیاہی کے دھبوں پر مشتمل تھا۔

پہلا امیدوار جو ٹسٹ دینے میرے پاس آیا۔ ایک اونچا لمبا جوان تھا۔ اس کی شخصیت پر پاکیزگی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں صراط مستقیمیہ نظر آتا تھا۔ ویسے لگتا تھا کہ صحت مند ہے، ایکسٹروورٹ ہے، گھر بیٹھو نہیں، حرکت کا دل دادہ ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ رجحان مذہبی ہے۔

میں نے اسے پہلا کارڈ دکھا کر کہا، دیکھیے تو آپ کو کیا نظر آتا ہے۔ ایک ساعت کے لیے اس نے کارڈ کی طرف دیکھا اور لاحول پڑھ کر اسے میز پر پھینک دیا۔ اس نے بمشکل تین چار کارڈ دیکھے اور نفرت سے انہیں میز پر الٹا کر کے رکھ دیا۔

میرے اصرار پر، وہ بولا، جناب یہ تو فحش ہیں۔

میں اس کے رد عمل پر بڑا حیران ہوا کہ معصوم سے سیاہی کے دھبوں میں اسے فحاشی کیسے نظر آئی، اتنا پاکیزہ شخص اور اس قدر جنس آلود نگاہ۔

ان سیاہی کے دھبوں پر امیدواروں کے رد عمل نے میرے ذہن میں ایک ہلچل مچا دی۔ ہر کسی کو ان دھبوں میں کچھ نہ کچھ نظر آتا تھا، کسی کو جنگل نظر آتے کسی کو صحرا کسی کو فوجیں دکھائی دیتیں۔ کسی کو ہنگامے نظر آتے جن میں مار پیٹ ہو رہی ہوتی اور سبھی امیدوار یقین کامل سے بات کرتے تھے۔ یوں نہیں کہ میرا اندازہ ہے کہ، یا لگتا ہے کہ، بلکہ یوں کہ آپ کو نظر نہیں آ رہا کیا۔ یہ دیکھئے یہ سکندر اعظم کی فوج ہے۔ سروں پر یونانی ٹوپیاں ہیں اور ادھر پورس کی فوجیں ہیں، درمیان میں دریا بہہ رہا ہے یہ دیکھئے دریا کی لہریں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔

ایک رنگیلا امیدوار آیا۔ کارڈ دیکھتے ہی بولا، بھئی واہ، اس کی آنکھوں میں لذت کی پھوار اڑ رہی تھی۔ بھئی، وہ چلایا، یہ تو پنڈت کو کاکے آسنوں کی تصویریں ہیں۔ اس نے باری باری

کارڈوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ واہ' واہ۔ اس خاتون پر کیا سرشاری کا عالم ہے اور یہ دیکھو یہاں کرب اور لذت کا میل ہو رہا ہے۔

انسانی شخصیت

رورک شاک نے میرے ذہن میں تہلکہ مچا دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ ہم سب ایک سا دیکھتے ہیں' ایک سا سنتے ہیں۔ مجھے شک پڑنے لگا۔ اگر ہم عام سے سیاہی کے دھبوں کو ایک سا نہیں دیکھتے' تو بیرونی منظر کو ایک سا کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری نظر کا رخ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے۔ کیا یہ رخ ساری شخصیت کے رخ کا آئینہ دار ہے یا شخصیت کے کارڈ پر ایک دھبے کی حیثیت رکھتا ہے' جس طرح سفید بکری پر کالے دھبے ہوتے ہیں۔

انسانی شخصیت کی بھول بھلیاں میں یہ میری پہلی جھانک تھی۔ اس سے پہلے میں انسانی شخصیت کو ایوان عام کے مترادف سمجھتا تھا۔ انسانی شخصیت کو سمجھنے میں میں خود کو بڑا پاٹے خان مانتا تھا۔ رورشاک ٹسٹ نے میرا سارا کلف اتار دیا۔ میری مونچھ گر گئی۔ گردن ڈھلک گئی۔

ایک روز جب میں ایک امیدوار کا رورشاک ٹسٹ لینے کی تیاری کر رہا تھا تو ڈاکٹر لطیف آ گئے۔ ڈاکٹر لطیف ہمارے سیکشن کے انچارج تھے۔

ڈاکٹر لطیف کو ہم 'یس سر یس سر' کہہ کر ٹرخا دیا کرتے تھے۔ جس طرح سیکرٹیریٹ میں بیورو کریٹ وزراء کو 'یس سر یس سر' کہہ کر ٹرخا دینے کے عادی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر لطیف کی شخصیت ہی ایسی تھی۔ وہ چال ڈھال یا بول چال سے ڈاکٹر لگتے ہی نہ تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے منڈی کے آڑھتی ہوں۔

اس کے برعکس ڈاکٹر اسد تھے' جو سعادت حسن منٹو کے چاچا تھے۔ ان کی شخصیت سارے سیکشن پر یوں چھائے رہتی' جیسے خیمہ لگا ہوا ہو۔ ڈاکٹر لطیف کی طرح ان کے برتاؤ میں ٹیس نہیں تھی۔ پنجابی بولتے تھے' پینڈو لہجہ تھا' انداز بے تکلف اپنے ماتحت لڑکوں کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے۔ ان کے انداز سے معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ ڈبل ڈاکٹر ہیں' فرانس کے ڈی ایس سی اور انگلستان کے پی ایچ ڈی۔ ان کا سیکشن الگ تھا۔ ہم جو ڈاکٹر لطیف کے سیکشن میں تھے' حسرت سے ان کے سیکشن کی جانب دیکھا کرتے تھے۔

ہاں تو ایک روز جب میں ایک جوان امیدوار کا رور شاک لینے کی تیاری کر رہا تھا تو ڈاکٹر لطیف آ گئے۔

نوجوان امیدوار کچھ زیادہ ہی صحت مند تھا۔ چہرہ سرخی سے دمک رہا تھا۔ قد کا اونچا لمبا' بھرا ہوا جسم' سر پر سولہ ہیٹ' لباس خاصہ بن ٹھن' انداز میں خود اعتمادی۔

ڈاکٹر لطیف آئے تو نوجوان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ادب کے لیے ٹوپی اتاری۔

آیئے آیئے آپ میرے ساتھ چلیئے' ڈاکٹر لطیف نے کہا' پھر مجھے مخاطب کر کے بولے' آپ کو یہ ٹسٹ لینے کی چنداں ضرورت نہیں۔

لیکن ڈاکٹر' میں نے کہا' ابھی تو میں نے انہیں ٹسٹ کیا ہی نہیں۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے' وہ بولے۔ نیور مائنڈ' یہ کہہ کر وہ نوجوان کو ساتھ لے گئے۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر لطیف واپس آئے بولے' مسٹر مفتی جو کیس واضح ہو' دور سے نظر آ رہا ہو' آبوئس ہو' اس پر وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

لیکن مجھے خانہ پری بھی تو کرنی ہے' میں نے کہا۔

ہیلتھ کنسرن

لکھئے' وہ بولے' اے کیس آف ہیلتھ کنسرن۔

میں نے کہا' یہ نوجوان تو بہت صحت مند تھا۔

صحت مند دکھتا ہے' وہ بولے' ہے نہیں۔ جو لوگ ہیلتھ کنسرن کے عادی ہوتے ہیں' جنہیں ہر وقت اپنی صحت کا خیال دامن گیر رہتا ہے' یہ چیز صحت کے لیے اچھی نہیں۔ یہ طرز عمل صحت پر برا اثر رکھتا ہے۔ آج میری صحت گری گری سی ہے' ایسے لوگ ہیلتھ کنسرن کے بیمار ہوتے ہیں۔ اور ہیلتھ کنسرن جملہ بیماریوں سے زیادہ خوفناک ہے۔ ڈاکٹر لطیف نے کہا' چار قسم کے امیدواروں کو آوٹ رائٹ ریجکٹ کر دیا کرو' ہیلتھ کنسرن' نروس' اینگزائیٹی ' اور فنکارانہ صلاحیت۔ ایسے لوگ فوج کے قابل نہیں ہوتے۔

میرے لیے یہ باتیں نئی تھیں' انوکھی تھیں۔

صحت کا خیال رکھنے والے لوگ میرے نزدیک صحت مند لوگ تھے۔ پہلی مرتبہ میں نے جانا

کہ شعوری طور پر صحت پر مرکوز ہونا' بہت بڑی بیماری ہے' ایسا ہی فعل ہے جیسے درخت کی جس ٹہنی پر بیٹھے ہو اسے کاٹنا۔

اس تحقیقی کمپنی میں کام کرنا ہمارے لیے یوں تھا جیسے ایلس ونڈر لینڈ میں جا پہنچی ہو۔ روز ہمارے سامنے ایک حیرت انگیز حقیقت آ جاتی اور ہم اسے دیکھ کر حیران رہ جاتے۔

تحقیق کا یہ کام ہمارے لیے مداری کے پٹارے سے کم نہ تھا۔ صرف نفسیات کے طالب علم ہی نہیں بلکہ دوسرے آرٹس میں دلچسپی رکھنے والے بھی' عالم حیرت میں تھے۔

ایک روز ڈاکٹر نے کہا' آیئے آپ کو نروس نوجوان کا تماشہ دکھائیں۔ وہ ہمیں میڈیکل سیکشن میں لے گئے' جہاں امیدواروں کا میڈیکل ٹسٹ ہوتا تھا۔

انہوں نے میڈیکل انچارج سے بات کی کہ ہم نروس امیدوار کے متعلق تحقیق کرنا چاہتے ہیں' آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ میڈیکل انچارج نے ہاں بھرلی۔

ایک نروس امیدوار کو بلایا گیا' اسے کہا کہ اب آپ کا میڈیکل ٹسٹ ہو گا۔

میڈیکل انچارج نے کہا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب تو گئے ہوئے ہیں وہ کچھ دیر کے بعد آئیں گے۔ اصلی ٹسٹ تو وہی لیں گے۔ البتہ اگر آپ چاہیں تو ہم غیر سرکاری طور پر امیدوار کے کوائف ٹسٹ کر سکتے ہیں۔

یوں امیدوار کے غیر سرکاری ٹسٹ لیے گئے۔ اس کے جملہ کوائف اس ٹسٹ میں نارمل نکلے۔ نبض کی رفتار' بلڈ پریشر' دل کی دھڑکن' ٹمپریچر' ای سی جی' سب نارمل تھے۔

امتحان

پھر کسی نے با آواز بلند اعلان کیا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب آ گئے اور پلان کے مطابق' میڈیکل انچارج کے نائب اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے امیدوار سے ہاتھ ملایا اور حکم دیا کہ نوجوان کے ٹسٹ لیے جائیں۔ ٹسٹ لینے والا عملہ وہی تھا' جس نے امیدوار کے غیر سرکاری ٹسٹ لیے تھے۔

دوبارہ ٹسٹ لیے گئے تو ہر چیز ابنارمل ہو گئی۔ نبض کی رفتار بڑھ گئی' دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں' ای سی جی مشین کا بنایا ہوا نقشہ بدل گیا۔ دونوں نتائج ہمیں دکھائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دونوں ٹسٹ دو مختلف امیدواروں کے ٹسٹ ہوں۔ ایک فرد کے نہیں۔

اس حقیقت کو دیکھ کر میرے دل میں امتحان کا ایک نیا مفہوم ابھرا' ایک خوفناک مفہوم۔

مجھے اپنی ہمشیرہ کے بیٹے ریاض کی بات یاد آگئی۔ ریاض بڑا محنتی اور پڑھاکو لڑکا تھا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی آوارگی نہ تھی' الٹا وہ خود عاید کردہ ڈسپلن کا پابند تھا۔ وقت پر جاگتا۔ وقت پر پڑھتا اور وقت پر سوتا تھا۔ اس کے والدین ذات میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ انہیں اپنی اولاد کے مشاغل میں دلچسپی نہ تھی۔

بی اے کرنے کے بعد ریاض نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ریاضی میں ایم اے کرے گا۔ ایم اے میں دو سال تعلیم پانے کے بعد جب وہ امتحان دینے کے لیے جا رہا تھا تو ظاہر تھا کہ وہ خود اعتمادی سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے امتحان کی تیاری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا' لیکن کمرہ امتحان میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ سر چکرانے لگا۔ سانس لینے کی تکلیف ہو گئی' اس لیے وہ پرچہ دیے بغیر گھر آ گیا۔

اگلے سال وہ پھر امتحان دینے گیا' لیکن پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ امتحان کے کمرے میں داخل نہ ہو سکا۔

امتحان کے لیے اس کی تیاری مکمل تھی۔ اسے خود پر بھرپور اعتماد تھا۔ کمرہ امتحان میں داخل ہونے کی بظاہر کوئی رکاوٹ نہ تھی' لیکن وہ امتحان کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے تین چار مرتبہ امتحان کے کمرے میں داخل ہونے کی پورے عزم سے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر اس نے ایم ۔ اے کرنے کا ارادہ ہی چھوڑ دیا۔

پھر ہمارے تحقیقی سنٹر میں امتحان کا ایک نیا مفہوم سامنے آ گیا۔ سنٹر میں پانچ چھ لڑکے علیگڑھ کے طلباء تھے۔

ان کے نفسیات کے پروفیسر ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ اگرچہ ان کا تعلیمی ریکارڈ شاندار تھا' ایف اے سے ایم اے تک وہ ہر امتحان میں فسٹ کلاس فسٹ رہے تھے' اس کے باوجود انہیں پاکستان میں کوئی ملازمت نہ ملی تھی۔ اس پر سنٹر کے علیگ وفد کی صورت میں سنٹر کے کمانڈنٹ کے پاس گئے اور اس سے درخواست کی کہ پروفیسر صاحب کو سنٹر میں ملازمت دے دی جائے۔

فسٹ کلاس فسٹ

کمانڈنٹ نے پروفیسر کے تعلیمی ریکارڈ کو اچھی طرح جانچا اور پروفیسر کی قابلیت کی بناء پر اسے سنٹر میں لینے پر آمادہ ہو گئے اور اس بات کی اجازت دے دی کہ پروفیسر کے جملہ ٹسٹ لے لیے جائیں۔

پروفیسر ٹسٹوں سے بخوبی واقف تھا' اس لیے لڑکوں کو یقین تھا کہ آسانی سے پاس ہو جائے گا اور ذہانت کا مطلوبہ گریڈ حاصل کر لے گا' لیکن وہ ذہانت کا مطلوبہ گریڈ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ یہ حیران کن بات تھی۔ پروفیسر کے ٹسٹ دوبارہ لیے گئے' پھر بھی وہ کامیاب نہ ہوا۔ اس عمل کو تین چار مرتبہ دھرایا گیا' لیکن پروفیسر ذہانت کا مطلوبہ معیار حاصل نہ کر سکا۔

اس پر تحقیقی سنٹر میں ہل چل مچ گئی۔ ایک خصوصی کانفرنس بلائی گئی جس میں اس مسئلے پر بحث ہوئی کہ نفسیات کا ایک پروفیسر جس کا تعلیمی ریکارڈ نمایاں قابلیت کا حامل تھا' جو ہر امتحان میں فسٹ ڈویژن حاصل کرتا تھا اور اول آتا تھا' جسے دس سال نفسیات پڑھانے کا تجربہ تھا اور جملہ نفسیاتی ٹسٹوں سے واقف تھا' وہ ذہانت کے ٹسٹ میں مطلوبہ معیار کیوں حاصل نہ کر سکا۔

ایسا کیوں ہوا۔ وہ کیا عوامل تھے' جن کی وجہ سے ایسا ہوا۔

کمانڈنٹ نے کہا۔ یہ مسئلہ ایک فرد کا نہیں' ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا ہر فسٹ کلاس فسٹ ذہانت کے میدان میں پیچھے رہ جاتا ہے۔یہ ایک تحقیقی مسئلہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ لڑکوں کا ایک گروپ بنا دیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ مختلف کالجوں میں جائیں۔ ان طالب علموں کو چنیں' جو امتحانوں میں فسٹ کلاس پوزیشن حاصل کرتے ہیں۔ پھر انہیں ذہانت کا ٹسٹ دیں۔ بار بار دیں تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے اور نتائج ریکارڈ کر کے' اسمبلی میں پیش کریں۔

گروپ نے دو ماہ کے بعد رپورٹ دی تو ہم سب پر حیرت طاری ہو گئی۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ واقعی فسٹ کلاس فسٹ طلباء ذہانت میں عام طالب علموں کی نسبت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

پھر ایک اور ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حکومت کی طرف سے تحقیقی ادارے کے لڑکوں کو رسالپور جانے کی اجازت مل گئی۔

کچھ دیر پہلے تحقیقی ادارے نے پاکستان ائر فورس کو ایک عرضی دی تھی کہ کمپنی کے تحت جو لڑکے فلائنگ کی صلاحیت پر تحقیق کر رہے ہیں' انہیں موقع دیا جائے کہ وہ خود اڑ کر پائیلٹ کی

مشکلات اور مسائل کو جان سکیں۔ کمپنی والوں کا خیال تھا کہ شاید اس بات کی اجازت نہ ملے' چونکہ یہ سکیورٹی کا معاملہ تھا۔

غیراز توقع اجازت ملی تو سنٹر میں خوشی بھرا شور مچ گیا۔ پھر رسالپور جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

یوسف ظفر

ارے یوسف ظفر' میں نے اسے اطمینان سے کتابوں کی فہرست بناتے ہوئے دیکھ کر کہا' تجھے پتہ نہیں کہ ہم پائلٹ کی تربیت حاصل کرنے رسالپور جا رہے ہیں۔

پتہ ہے' بھائی جی پتہ ہے' وہ بولا۔

تو تم تیاری نہیں کر رہے۔

تیاری تو میری بیوی کرے گی۔ میں تھوڑی کروں گا' چیزیں ہی پیک کرنی ہیں نا' وہ بولا۔

تم تو بالکل بے تعلق بیٹھے ہو۔

بھائی جی' وہ بولا' یہ سب شوراشوری کیا ہے۔

کیا ہے' میں نے پوچھا۔

یہ سب ''مچ ایڈو اباوٹ نتھنگ'' ہے۔

کیا مطلب۔

خوامخواہ بات بڑھائی جا رہی ہے۔ چاٹی میں پانی ڈال کر اسے بلوہ رہے ہیں ہم' بھائی جی۔

تحقیق کے کام میں ——— میں نے کچھ کہنا چاہا۔

اس نے میری بات کاٹ دی بولا' تحقیق کیسی ——— بھائی جی' بات تو سامنے دھری ہے۔ امریکی ٹسٹ غلط ہیں۔ وہ ہم پر لاگو نہیں ہوتے۔

پھر' میں نے پوچھا۔

پائلٹ کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ تانگہ ڈرائیور کو دیکھ لو' بس ڈرائیور کو دیکھ لو' انجن ڈرئیوار کو دیکھ لو' جو اوصاف ان میں موجود ہیں۔ وہی اوصاف جہاز کے ڈرائیور میں ہونے چاہئیں۔

مثلاً' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' بھائی جی پتہ ہے بہترین پائیلٹ کون ہے۔

کون ہے' میں نے پوچھا۔

بھاابھا بہترین پائلٹ ہے' وہ بولا۔

یوسف ظفر جانا پہچانا شاعر تھا۔ ادبی حلقوں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ وہ حلقہ ارباب ذوق کا ایک فعال رکن تھا۔ حلقے کے بنیادی ممبروں' ضیا جالندھری' مختار صدیقی' قیوم نذر کا ساتھی تھا۔

یوسف ظفر کا قد چھوٹا تھا' لیکن چھوٹے قد میں اتنی جان تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ حرکت کا دلدادہ تھا۔ شاعر ہونے کے باوجود گھر بیٹھو نہیں تھا' ایکسٹرو ورٹ تھا' بے چین تھا۔ جوشیلا تھا' اس کی زندگی پسند ناپسند کے محور پر گھومتی تھی' جو پسند تھا وہ اچھا تھا' جو ناپسند تھا' وہ برا تھا۔

یوسف ظفر گھریلو آدمی نہیں تھا۔ گھر کے متعلق اس کا رویہ غیر ذمہ دارانہ تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو گھر ذہن سے یکسر خارج ہو جاتا۔ اس کا گھر بیوی کی فہم و فراست کی وجہ سے چل رہا تھا۔ اگرچہ وہ شیخ برادری سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس میں شیخوں کے سے اوصاف نہ تھے۔ اسے پیسے سے پیار نہ تھا نہ ہی وہ اسے سنبھال کر رکھ سکتا تھا۔ اس نے پیشے کے طور پر دوکانداری کو آزما دیکھا تھا۔ تلاش معاش میں اس نے کئی ایک جگہوں کو آزما دیکھا تھا۔ لیکن بات نہ بنی تھی۔

ریسرچ سنٹر میں اسے لائبریری سیکشن کا چارج دے دیا گیا۔ اور وہ لائبریری کے لیے مناسب کتابوں کے چناؤ میں اس حد تک مصروف تھا کہ اسے خبر ہی نہ تھی کہ سنٹر میں کیا ہو رہا ہے' سنٹر کے نوجوان ظفر کی عزت کرتے تھے۔ اگرچہ یوسف ظفر مخلص دوست تھا' لیکن ان جانے میں وہ خود کو برتر سمجھتا تھا۔ اس لیے نوجوانوں میں گھلنے ملنے سے احتراز کرتا تھا۔ سطح پر تیرتا ضرور تھا' لیکن ڈبکی نہیں لگاتا تھا۔

رڈیلا ئینڈنس

یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ پاکستان بنے کو ڈھائی سال ہو چکے تھے' لیکن بھارت کے حریفانہ

رویے کی وجہ سے پاکستان ابھی اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکا تھا۔

پاکستان ایئر فورس کے پاس گنتی کے چند ایک پائیلٹ تھے۔ اور وہ بھی پاکستانی نہیں بلکہ پول تھے۔ چند ایک ٹوٹے پھوٹے جہاز تھے۔

رسال پور میں چند ایک بارکیں تھیں۔ چند ایک سڑکیں' چند ایک جیپیں۔ دیکھنے میں وہ ایک ویرانہ تھا۔ وہاں صرف دو باتیں جاذب توجہ تھیں۔ ایک تو تمبو کی طرح چھایا ہوا ڈسپلن اور دوسرے آسمان کی طرح چھایا ہوا نور خان۔

نور خان رسال پور کا کمانڈنٹ تھا۔

لوگ نور خان سے ڈرتے تھے' لیکن ساتھ ہی نور خان کے لیے ایک بے نام کشش محسوس کرتے تھے۔

نور خان نے اسمبلی روم میں ہم سے خطاب کیا۔ بولا' لڑکو ہم یہاں کسی غیر فوجی کو آنے نہیں دیتے آپ کو ہم نے صرف اس لیے اجازت دی ہے کہ آپ پاکستان کی بہبود کے لیے ایک اہم مسئلے پر تحقیق کر رہے ہیں۔ یہاں آپ کو دو باتوں کا خیال رکھنا لازم ہو گا۔ ایک یہ کہ ہمارے ڈسپلن میں خلل اندازی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ملک کی سکیورٹی پر آنچ نہ آئے۔

رسالپور میں ہمارا قیام مختصر تھا۔ جس کے دوران پہلے ہمیں فلائنگ پر چند ایک لکچر دیئے گئے۔ پھر ہوائی جہازوں میں بٹھا کر کل پرزوں کے متعلق معلومات فراہم کی گئیں اور بالآخر پول پائیلٹ کے تحت کو پائیلٹ کی حیثیت سے اڑنے کے چند مواقع فراہم کیے گئے۔

پائیلٹوں کو ہدایات دی گئیں۔ کہ ہمیں ایکرو بیٹک فلائنگ کی جملہ کیفیتوں سے شناسا کیا جائے۔

پہلی مرتبہ جب میں کو پائیلٹ کی حیثیت سے جہاز میں بیٹھ کر اڑا تو میں نے محسوس کیا' جیسے مجھے ملک شیکر میں ڈال کر بجلی کا بٹن آن کر دیا ہو' میرے جسم کا بند بند بلوہ دیا گیا' پائیلٹ کے مسائل پر غور فکر کیا کرتا' مجھے تو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس وقت میں گویا روئی کا گالا تھا۔ جو دھنکا جا رہا تھا۔

پائیلٹ اور میرے درمیان ٹیلیفون رابطہ تھا۔ وہ بول رہا تھا' سمجھا رہا تھا' میرے کانوں میں شاں شاں کے سوا کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ جہاز کبھی جھولتا تھا' کبھی جھومتا تھا' کبھی پائیلٹ

مشین کو بند کر دیتا اور جہاز فضا میں یوں گرنے لگتا' جیسے پتھر پانی میں گرتا ہے' میرا دل ڈوب جاتا' پھر دفعتاً" مشین پھر سے چلنے لگتی۔ مجھے ایسا دھکا لگتا جیسے نچوڑنے کے بعد کپڑے کو پھٹک دیتے ہیں۔

دفعتاً" فون پر پائیلٹ چلایا' تیار ہو جاؤ۔ اب ہم نیچے سے اوپر کی طرف جھپٹ لگائیں گے پھر اوپر سے نیچے کی طرف جھپٹ لگائیں گے۔ ہشیار رہنا' تم اندھے ہو جاؤ گے۔

یوشیل گو بلائنڈ مین مائنڈ یو۔ فسٹ رڈ بلائینڈنس پھر بلیک بلائینڈنس۔

خوف سے میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ یا اللہ' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ حالانکہ ان دنوں میں اللہ سے واقف نہ تھا۔ میں ایک عقلیہ آدمی تھا۔ سولہ آنے دانش ور۔ مجھے علم نہ تھا کہ اللہ بے بسی کی عالم میں ہمارے لیے ایک عظیم سہارا ہے۔ تھکے ہارے ہوئے بوجھل سر کے لیے ایک تکیہ ہے جس پر سر رکھ کر ہم سکون پا سکتے ہیں۔

ان جھپٹ اڑانوں میں مجھ پر کیا کیا نہ بیت گیا۔

پہلے خون کا ایک دریا بہنے لگا' جس میں میں تنکے کی طرح ڈول رہا تھا۔

پھر میں گویا ٹائم ٹنل میں گر گیا۔ سرنگ میں گاڑھا بوجھل اندھیرا تھا' جیسے وہ اندھیرے کی دلدل ہو۔ سرنگ کی دونوں دیواریں تنگ ہوئی جا رہی تھیں۔ اور تنگ اور تنگ۔

سرنگ سے باہر نکلا تو ٹھن کی آواز آئی جیسے کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ میرا سر منوں بوجھل ہو کر میری چھاتی پر لٹک گیا۔

میرا سر' میرا سر۔ میں فون پر چلایا۔

نیور مائنڈ پائیلٹ چلایا' گیو اے پنچ ان یور تمی۔

پیٹ پر گھونسا مارو' یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بوجھل سر ہے گھونسا پیٹ پر' کوئی تک ہے کیا۔ وہی بات ہوئی ماروں گھٹنا' پھوٹے آنکھ۔

مارو مارو۔ پائیلٹ چیخنے لگا۔

میں نے پیٹ پر زور سے گھونسا مارا۔ ٹن سے سر اوپر ابھرا۔ اتنے زور سے ابھرا جیسے گردن کا منکا ٹوٹ گیا ہو۔ پھر مجھے پتہ نہیں۔ جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ پائیلٹ مجھے یوں جہاز سے نکال رہا تھا جیسے کریش کے بعد لاشوں کو نکالتے ہیں۔

چھ حسین لڑکیاں

رسال پور سے واپسی پر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ تحقیقی سنٹر تنکا تنکا ہو کر بکھر گیا۔

اس روز انسپکشن ڈے تھا۔ ہر مہینے دو مہینے کے بعد ایک انسپکشن ڈے آیا کرتا تھا۔ اس روز بڑے افسر آکر سینٹر کا معائنہ کیا کرتے تھے کہ آیا سنٹر ٹھیک طور پر چل رہا ہے۔ ڈسپلن میں ڈھیل تو نہیں پڑی' سیکیورٹی او کے ہے یا نہیں۔ انسپکشن ڈے پر ہم سب بالکل الرٹ ہوتے' صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتے' عمارت سپک اینڈ سپین ہوتی' باغیچے کی اینٹوں پر سفیدی پھری ہوئی ہوتی۔

ارے یہ کیا۔ سارے ریسرچ اسسٹنٹس کی آنکھیں خانوں سے باہر نکل آئیں۔ افسروں کے پیچھے پیچھے قطار میں چھ لڑکیاں خراماں خراماں آ رہی تھیں۔

ان کے آتے ہی اعلان ہوا' تحقیقی سنٹر کے تمام افراد اسمبلی ہال میں جمع ہو جائیں۔ جہاں ایک اہم خطاب کیا جائے گا۔

ہال میں لڑکیاں سٹیج پر بیٹھی تھیں۔ درمیان میں ایک افسر بڑے طمطراق سے روسٹرم پر کھڑا تھا۔ اس نے خطاب شروع کیا۔ بولا لیڈیز اینڈ جینٹل مین۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کمپنی نے اس تحقیقی یونٹ کو تشکیل دیتے وقت ایک اہم بات کو نظرانداز کر دیا۔

اس تحقیقی یونٹ میں ہر مضمون کا ایک ماسٹر موجود ہے۔ جو اس مضمون کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس یونٹ میں عمر رسیدہ لوگ بھی ہیں' فنکار بھی ہیں' ادیب بھی ہیں جو اپنے اپنے مضمون اور آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن اس یونٹ میں کوئی خاتون نہیں ہے جو نسائی زاویہ نظر کی نمائندگی کرتی ہو۔

آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ اس کمی کو پورا کر دیا گیا ہے۔ چند خواتین کو اس یونٹ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لڑکوں کی نگاہیں سٹیج پر بیٹھی ہوئی چھ لڑکیوں پر مرکوز تھیں۔ وہ انہیں نگاہوں سے ٹٹول رہے تھے' جانچ رہے تھے' نثار ہو رہے تھے' پتہ نہیں روسٹرم پر کھڑا افسر کیا کہہ رہا تھا' کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ چھ لڑکیاں عام لڑکیاں نہیں تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ان کا چناؤ کسی تحقیقی ماہر نے نہیں بلکہ ہالی وڈ کے کسی فلم ڈائرکٹر نے کیا ہو۔

وہ سب کی سب اس قدر حسین تھیں کہ ان کی طرف دیکھنا مشکل تھا۔ یہ احساس طاری ہو جاتا کہ نگاہوں سے وہ میلی ہو جائیں گی اور اگر دیکھتے تو سانس لینا مشکل ہو جاتا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ وہ حسین تھیں، سونے پر سہاگہ اس وجہ سے تھا کہ انہیں علم تھا کہ وہ حسین ہیں۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ نوجوان لڑکے دیکھنے کے مشتاق ہوتے ہیں لیکن ان میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ ہمت نہیں پڑتی، جھینپ جاتے ہیں۔ وہ سب جانتی تھیں کہ ان کا حوصلہ کیسے بندھایا جاتا ہے۔ دیکھے جانے پر چونکتی نہیں تھیں۔ انہیں دکھنے کا فن آتا تھا۔ بندھی ٹکٹیوں کے زیر اثر یوں اطمینان سے بیٹھی رہتی تھیں جیسے پتہ ہی نہ ہو کہ دیکھا جا رہا ہے۔

ہر لڑکی کا انداز مختلف تھا، چھب مختلف تھی۔ ایک کتابی چہرہ تھی۔ ایک سکیر فیس تھی، ایک ہنسوڑ تھی، بات بات پر مسکراتی تھی۔ لیکن اس کی مسکراہٹ گویا ایک ذاتی پرائیویٹ فعل تھا، وہ کسی دوسرے پر مسکراہٹ نہ پھینکتی تھی۔ ایک نیلی آنکھوں والی تھی، وہ آنکھیں نہیں تھیں، گویا دو گرداب تھے، جن میں وہ ڈبوتی نہ تھی بلکہ خود ڈوب جاتی تھی۔ ایک سادہ مرادی تھی، جسم ہی جسم، وہ جسم کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکتا تھا۔ ایک مرچیلی تھی، اسے دیکھ کر سوں سوں کرنے کو جی چاہتا تھا۔

انتظامیہ نے ہر سیکشن میں ایک لڑکی متعین کر دی لیکن سیکشن زیادہ تھے، اس لیے دو تین سیکشن محروم رہ گئے۔

ہمارا سیکشن بھی محروم رہا۔ میرے ساتھی اس محرومیت پر بڑے غمزدہ تھے۔ ہم حسرت بھری نگاہوں سے دوسرے سیکشنوں کو دیکھتے تھے۔

ہم اس بدقسمتی پر سر لٹکائے بیٹھے تھے کہ یوسف ظفر آ گیا۔ یوسف ظفر کے انداز میں طبعاً ایک بے نام سی "ای لیشن" تھی۔ اس روز "ای لیشن" کچھ زیادہ ہی چمکی ہوئی تھی۔ آتے ہی بولا۔ گڈ لک بوائز۔ گڈ لک۔ ہم بچ گئے، جان بچی سو لاکھوں پائے۔ پھر ہمارے چہروں پر چھائی ہوئی حسرت و یاس کو محسوس کر کے کہنے لگا، بھائی جی۔ فتنہ دور ہی رہے تو اچھا ہے۔ دور کے ڈھول سہانے۔

بالکل ٹھیک مسٹر ظفر، ڈاکٹر لطیف نے داخل ہو کر کہا، وے آر اے ڈیمانڈ، توجہ پر ڈیمانڈ، حسیات پر ڈیمانڈ، ذہن پر ڈیمانڈ، اچھا ہوا کہ ہمارے سیکشن کا ماحول ملوث نہیں ہوا۔

بے شک ہمارے سیکشن کا ماحول ملوث نہیں ہوا تھا' لیکن ذہن بری طرح سے ملوث ہوئے تھے۔ ہمیں بار بار دوسرے سیکشنوں میں جاکر پرابلمز ڈسکس کرنے کی ضرورت پڑنے لگی۔ نفسیات کے سیکشن میں جو لڑکی متعین ہوئی تھی وہ ایم۔ اے انگلش تھی' دفعتاً" نفسیات کے سیکشن کے لڑکوں کو احساس ہوا کہ ان کی انگریزی کمزور ہے اور رپورٹ لکھتے ہوئے صحیح لفظ نہیں مل رہے۔ لہٰذا وہ بات بات پر کتابی چہرے کے پاس جاتے اور اپنے ڈریفٹ کی تصیح کراتے۔ اکاؤنٹس سیکشن میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہنسوڑ کے پاس جاتا جو پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے تھی اور اس سے اکاؤنٹس کے بارے میں مشورہ کرتا۔ ہنسوڑ کے دانت چمکتے' بار بار چمکتے اور اکاؤنٹس کی پرابلمز آپ ہی آپ حل ہو جاتیں۔

لڑکیوں کی آمد کے بعد۔ باہمی مشوروں کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ تحقیق کے عمل میں ذہنوں کی بجائے نگاہیں چلنے لگیں۔ حسیات کی تاروں پر جذبات کے مضراب چلنے لگے۔ ادارے میں تحقیق کا رخ ہی بدل گیا۔

ادھر ادارے کے سپروائزروں نے محسوس کیا کہ سپرویژن میں تواتر کی ضرورت ہے۔ انسپکشنز ماہوار کے بجائے ہفتہ وار ہو گئے۔ سپروائزرز جب بھی آتے ایک چکر لگانے کے بعد کمرے میں جا بیٹھتے۔ انہیں گرم ٹھنڈے سے انٹرٹین کرنے کے لیے لڑکیاں بلالی جاتیں۔

چند ایک ماہ کے بعد ادارے میں ایک خبر گشت کرنے لگی کہ سپروائزرز نے محسوس کیا ہے کہ تحقیقی یونٹ میں تعلیمی ڈگریوں کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہیئے۔ اہمیت کا دار و مدار صلاحیتوں پر ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد سننے میں آیا کہ ایک کمیٹی تحقیقی یونٹ کے ارکان کی صلاحیتوں کا جائزہ لے رہی ہے۔

تحقیق کا نیا رخ

تحقیقی ادارے کے لڑکوں نے ان خبروں میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ تحقیق کے نئے رخ میں اس قدر کھو چکے تھے کہ انہیں ترقی' پروموشن اور الاؤنس میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ جب بھی وہ اکٹھے ہوتے تو گفتگو کا موضوع ایک ہی ہوتا۔

ایک کہتا یار آج تو نیلی جھیلوں میں ایک طوفان چل رہا تھا۔ لہریں اٹھ رہی تھیں' گھمنگھیریاں گھوم رہی تھیں۔

دوسرا کہتا' ہمارے ہاں تو جسم نے دھاندلی مچا رکھی ہے' ابھرا بھر کر جھانکتا ہے' یوں لپیٹ میں لے لیتا ہے کہ سدھ بدھ ماری جاتی ہے۔

تیسرا چلاتا' یارو اپنا تو جنازہ نکل گیا۔ ظالم کے دانتوں کا لشکارا سارے سیکشن میں یوں چکارا مارتا ہے۔ جیسے آسمانی بجلی چمکتی ہو۔ ہم تو بھائی "الیکٹرو کیوشن" ہو گئے۔

پھر ایک روز "ری ایولیوایشن" کا نتیجہ نکل آیا تمام لڑکیاں سیکشنوں کی انچارج بنا دی گئیں۔

لڑکوں نے اس خبر کو یوں سنا جیسے انہیں اپ گریڈ کر دیا گیا ہو۔ سارا دان لڑکے۔ لڑکیوں کو مبارک باد دیتے رہے۔

یوسف ظفر اس روز غصے سے بل کھا رہا تھا۔ یہ سرا سر زیادتی ہے' وہ کہہ رہا تھا' پولٹیکل سائنس کی ایم۔ اے کو اکاؤنٹس سیکشن کا انچارج لگا دیا گیا ہے اب چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اپروول کے لیے اپنا کام ہنوڑ کر بھیجا کرے گا۔ کوئی تک ہے کیا۔

شکر کرو' ڈاکٹر لطیف نے کہا' کہ یہ آرٹس کی لڑکیاں ڈاکٹروں پر مسلط نہیں کی گئیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے' یوسف ظفر چلایا۔

کیا نہیں ہو سکتا' ڈاکٹر بولا' کیا نہیں ہو رہا۔

پھر ایک نیا حکم موصول ہوا کہ ہر سیکشن انچارج اپنے ماتحتوں کے کام کے متعلق ہفتہ وار رپورٹ لکھے گا۔

اس پر بھی لڑکے چیں بچیں نہ ہوئے۔ نفسیات کا ایم۔ اے' انگریزی کی ایم۔ اے سے کہتا' میڈم آپ نے میری ہفتہ وار رپورٹ نہیں لکھی۔

کتابی چہرہ اک شان بے نیازی سے کہتی' آپ کی رپورٹ تو ڈاکٹر صاحب لکھیں گے۔

وہ جواب دیتا' نہیں میڈم' ڈاکٹر صاحب تو ایڈوائزر ہیں۔ سیکشن انچارج تو آپ ہیں۔

ہنوڑ جو پولیٹیکل سائنس کی ایم۔ اے تھی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی ہفتہ وار رپورٹ یوں لکھتی' مسٹر معین ہماری گائیڈنس میں تسلی بخش ترقی کر رہا ہے۔

بنیاد کا ٹیڑھ

سیانے کہتے ہیں بنیاد کے ٹیڑھ کبھی نہیں جاتے چاہے دیوار کو کتنی اونچی کر لو۔ سچ کہتے ہیں۔

طبعی طور پر میری شخصیت کے بنیادی خواص چار ہیں۔ احساس کمتری جسے میں آج بھی عجز کے پردے میں چھپائے پھرتا ہوں۔

فادر ہو سٹیلٹی' جواب اتھاریٹی ہوسٹیلٹی میں بدل چکی ہے۔

جنسی جنوں' جواب آنکھوں میں تو دم ہے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

اور آخر میں شدت جسے میں ہمیشہ ایک خوبی سمجھتا رہا اور خلوص کا ایک اہم جزو مانتا رہا۔

۱۹۸۵ء میں مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ شدت ایک عیب ہے' بہت بڑا عیب۔ جو راستے کی ایک عظیم رکاوٹ ہے۔ اللہ کے راستے کی رکاوٹ نہیں' انسانیت کے راستے کی رکاوٹ ہے۔

۱۹۵۰ء میں جب میں اس تحقیقی سنٹر میں کام کر رہا تھا تو میری عمر ۴۵ سال کی تھی۔ غربت نے مجھ پر ایک پرانا لنڈے سے خریدا ہوا اوور کوٹ لٹکا رکھا تھا۔ ساری زندگی جذبات کی دلدل میں لت پت رہنے کے بعد میں کنارے پر لگا سوکھ رہا تھا۔

اس کے باوجود میری جذباتی جبلت ختم نہ ہوئی تھی' بلکہ دب گئی تھی۔ ان چھ حسین لڑکیوں سے میں بھی متاثر ہوا تھا لیکن ان نوجوان بنے ٹھنے لڑکوں کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت نہ تھی۔ میرا کوئی چانس نہ تھا' ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی جانب متوجہ نہ کر سکتا تھا۔ غالباً" اسی وجہ سے صورت حال پر مجھے غصہ آتا تھا۔

ایک دن بھری محفل میں میں نے کہہ دیا کہ یارو یہ سنٹر اب ریسرچ سنٹر نہیں رہا۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ بازار حسن ہو۔ بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس لیے کہ ہم میں عزت نفس کا احساس نہیں رہا۔ ہم اپنی تذلیل پر خوش ہو رہے ہیں' پھولے نہیں سماتے۔

بالکل درست کہتے ہو' یوسف ظفر بولا۔

لیکن اس کا حل کیا ہے' کسی نے باآواز بلند پوچھا۔

میں استعفےٰ دے کر جا رہا ہوں' میں نے کہا۔

نہیں یہ زیادتی ہے' یوسف ظفر بولا' ہمیں صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

تم مقابلہ کرو' میں نے غصے میں کہا' میں تو جا رہا ہوں۔

یہ بات میں نے سوچ سمجھ کر نہیں کی تھی۔ اتفاقیہ منہ سے نکل گئی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیوں میں اس کا پابند ہو گیا۔

میری اس بات پر تمام نوجوان بگڑ گئے۔ وہ بولے' ہم صورت حال سے بالکل مطمئن ہیں۔

یہ جھگڑا بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ کچھ لوگ استعفیٰ دینے کے حق میں تھے کچھ خلاف تھے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ استعفیٰ کسے دیا جائے۔ کمپنی کے ناظم کو یا سرکاری کمانڈنٹ کو۔ میں کمپنی کے ناظم کے حق میں تھا چونکہ میں فیاض محمود کے سامنے جانے سے ہچکچاتا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ استعفیٰ دینے کی کوئی وجہ نہ لکھی جائے' ہر ریسرچ اسسٹنٹ الگ الگ استعفیٰ پیش کرے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد استعفیٰ پیش کیا جائے۔

یوسف ظفر استعفیٰ پیش کرنے کے حق میں نہ تھا۔

کچھ لڑکے اس کے ہم خیال تھے۔

آخر ایکشن کا دن آ گیا۔

نو بجے کے قریب میں کمانڈنٹ کے کمرے میں داخل ہوا۔

مے آئی کم ان سر۔

یس کم ان۔

اندر داخل ہو کر میں نے فیاض محمود کے سامنے اپنا استعفیٰ رکھ دیا۔ وہ چونکا' ہوں' وہ بولا' کیا کوئی بہتر ملازمت مل گئی ہے۔

نو سر میں نے بڑے نارمل انداز میں جواب دیا۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ فیملی افیرز کیا ہیں' جن کی بناء پر آپ استعفیٰ دے رہے ہیں۔

ساری سر' میں نے خشک انداز میں جواب دیا' میں اپنے فیملی افیرز کو ڈسکس کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس نے میری بات کی کاٹ کو محسوس کر کے ایک جھرجھری لی۔

دراصل میں فیاض محمود سے انتقام لے رہا تھا۔

تحقیقی ادارے میں شمولیت سے پہلے جب میں اسے ملا تھا تو اس نے لاتعلقی سے کہا تھا یس

کم ان اور پھر ایک فائل کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ لک مین' وہ بولا' آپ کو اس سے بہتر ملازمت نہیں ملے گی۔ سوچ لیجئے۔

نیور مائنڈ سر' میں نے آخری وار کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دفتر کا صدر دروازہ بند تھا' وہاں سیکیورٹی کا ایک آدمی کھڑا تھا۔ مجھے باہر جانا ہے' میں نے کہا۔

آپ ویٹنگ ہال میں بیٹھئے سر' میں اجازت لے لوں۔

ویٹنگ ہال ایک لمبی بارک تھی جس میں دس پندرہ کرسیاں رکھی ہوئی تھی۔

ابھی میں بیٹھنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ یوسف ظفر داخل ہوا۔

ارے تم' یوسف ظفر' میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

ہاں میں' وہ بولا۔

تم تو استعفیٰ دینے کے حق میں نہ تھے۔

میں نے اپنا ارادہ بدل لیا' بھائی جی۔

کیسے میں نے پوچھا' وجہ۔

فیصلے وجہوں کے محتاج نہیں ہوتے' بھائی جی۔

تیسرا لڑکا داخل ہوا' یار وہ غصے میں بھوت بنا ہوا ہے۔ جب دسواں لڑکا ویٹنگ ہال میں داخل ہوا ایک گرج ناک آواز آئی۔

میوٹنی میوٹنی۔

کلوز دی گیٹ۔ نو ون گوز آوٹ۔

راول دیس



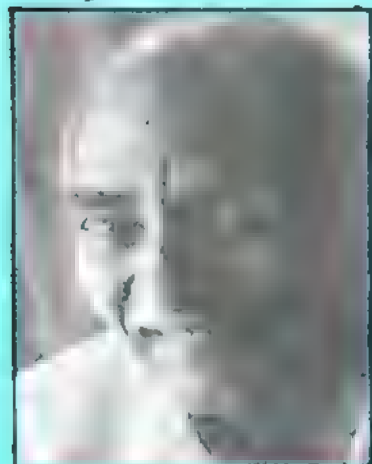
محمود نظامی



محمد عمر



عماد الدین



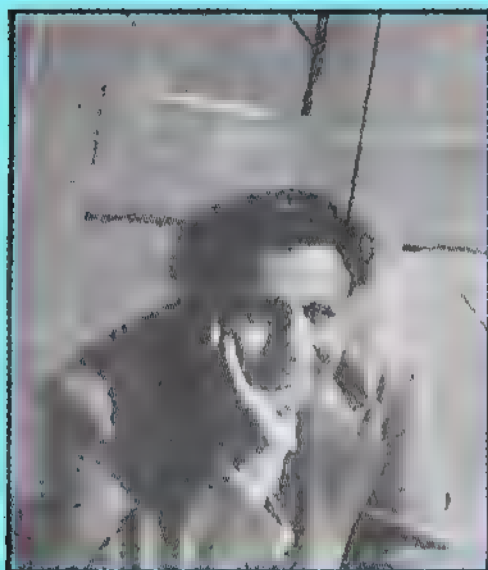
سجاد حیدر



مسعود قریشی



حمید اعظمی



محمد حسین



بانو قدسیہ



مسز چھٹہ (والدہ بانو قدسیہ)

اکیسواں باب

مجاہد ریڈیو

وہ میوٹنی جو دراصل کمپنی کے افسران کے رویے کے خلاف ایک احتجاج تھی۔ خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ افسران نے اپنی حسن پسندی پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنی رپورٹوں میں اسے سچ مچ کی بغاوت کی شکل دے دی۔ تحقیقی کمپنی ٹوٹ گئی۔ جن ارکان نے استعفٰے نہیں بھی دیے تھے ان کی نوکری بھی ختم ہو گئی۔ لڑکیوں کو ازدواجی سہارے مل گئے۔

بین

کمانڈنٹ نے حکومت پاکستان کو ایک سرکلر خط لکھ دیا کہ بغاوتی لڑکوں کو سرکاری نوکری سے بین کر دیا جائے۔ تیس پینتیس نوجوان لڑکوں کے کیریئر ختم ہو گئے۔

اس پر لڑکے طیش میں آ گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس مصیبت کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر تھی۔ میں نے ہی انہیں احتجاج پر مائل کیا تھا۔ وہ سچے تھے' قصور واقعی میرا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ چونکہ میں نے بات بگاڑی تھی۔ اب اسے سنوارنے کی ذمہ داری بھی مجھ پر تھی۔

وہ چاہتے تھے کہ میں فیاض سے ملوں' اس کی منت سماجت کروں کہ لڑکوں پر لگائی گئی بین کو اٹھا دے۔

فیاض کے پاس جا کر اس کی منت کرنا مجھے گوارہ نہ تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ میں فیاض کو جانتا تھا۔ فیاض بہت پڑھا لکھا عالم آدمی تھا اور وہ علم کے تکبر کا شکار تھا۔ ایک بڑے خاندان کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود اس نے بڑی تنگ دستی اور عسرت میں زندگی گزاری تھی۔ اپنوں نے اس سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اور اب جب وہ ایک باعزت مقام پر پہنچ چکا تھا' وہ دنیا سے انتقام لے رہا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ فیاض میری بات نہیں مانے گا' کسی کی بات نہیں مانے گا۔

پھر یہ تھا کہ اس زمانے میں مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا' ایثار نہ تھا کہ دوسروں کی بھلائی کی لیے اپنی تذلیل گوارا کرتا۔

لڑکوں کا مطالبہ تھا کہ ساری بات پریس میں لائی جائے تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ ایک تحقیقی کام جو قوم کے مفاد میں تھا' صرف چند حسین لڑکیوں اور چند باہوس افسروں کی بھینٹ چڑھ گیا۔

میں اس بات پر مصر تھا کہ بات پریس میں نہیں آئے گی۔ آ گئی تو بات بنے گی نہیں' بلکہ اور بگڑ جائے گی۔ میں نے بارہا انہیں سمجھایا تھا کہ پریس میں آنے کا وہاں فائدہ ہے' جہاں طاقت ور پبلک اوپنین ہو' جو حکومت پر اثر انداز ہو سکے۔ الٹا ہمارے ہاں حکومت اس قدر طاقت ور ہے کہ وہ پبلک اوپنین کو اپنے کام میں لا سکتی ہے۔

میرا اندازہ تھا کہ افسران خود خائف تھے کہ پریس میں نہ آ جائے اور اپنے تحفظ کے لیے وہ سخت اقدامات پر تل گئے تھے۔

ہم روز آپس میں ملا کرتے تھے۔

پہلے تازہ خبریں سنائی جاتیں۔

پھر ان پر تبصرہ ہوتا' پھر ساری سچویشن کا جائزہ لیا جاتا۔

اور آخر میں یوسف ظفر اور مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ ہوتی' ہمیں مورد الزام ٹھہرایا جاتا اور مجھ پر منہ زبانی چارج شیٹ لگایا جاتا۔

ایک دن ایک ایسی ہی روٹین میٹنگ میں شمولیت کے لیے جب یوسف ظفر اور میں لارنس باغ کے ریستوران میں پہنچے۔ تو دیکھا کہ پندرہ نوجوان چائے کے پیالے سامنے رکھے اپنے سروں

کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے' چپ چاپ بیٹھے تھے۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔

ہمیں دیکھ کر چند ایک نے سر اٹھائے۔

کیا خبر ہے' یوسف ظفر نے پوچھا۔

تحقیقی کمپنی کا نام اپروود کنٹریکٹرز کی لسٹ سے خارج کر دیا گیا ہے' اقبال نے کہا۔

اس پر انکوائری انسٹیٹیوٹ کر دی گئی ہے' سعید بولا۔ اور ایک سرکولر لیٹر حکومت کو لکھ دیا گیا ہے کہ میوٹنی والوں پر بین لگا دی جائے۔

کیسی بین' یوسف ظفر نے پوچھا۔

کہ ہم میں سے کسی کو سرکاری نوکری میں نہ لیا جائے۔

یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا' یوسف ظفر بولا' ہم سب کمپنی کے ملازم تھے' سرکار کے نہیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

یہاں کیا نہیں ہو سکتا' اقبال غصے میں چلایا۔

یوسف ظفر نے بات کہنے کی کوشش کی' یہ بات قانون کے خلاف ہے۔

کیسا قانون' اقبال نے پوچھا۔

کہاں ہے قانون' سعید بولا۔

یہ سب تمہارا کیا کرایا ہے' معین نے غصے میں کہا۔

اب تم ہی اسے ٹھیک کرو گے' اقبال بولا۔

تم فیاض محمود سے کیوں نہیں ملتے' سعید مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

اسے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں' معین بولا' ہمیں گورنمنٹ سروس سے بین کرنے کے لیے سرکلر اسی کے کہنے پر لکھا گیا ہے۔

وہ سب غصے میں بھوت بنے ہوئے تھے اور ہم دونوں ان کے سامنے مجرموں کی طرح گردنیں لٹکائے کھڑے تھے۔

محمود نظامی

عین اس وقت ایک صاحب داخل ہوئے۔

ارے آپ نظامی صاحب' یوسف ظفر اسے دیکھ کر چلایا' آپ یہاں کیسے۔

دیکھ لو بھائیو' نظامی نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا' چار دنوں سے میں انہیں تلاش کر رہا ہوں' لاہور کا کونہ کونہ چھان مارا ہے اور یہ کس معصومیت سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ یہاں کیسے۔

میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ مخل ہوا ہوں لیکن مجبوری کی بات ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے بات کر لوں۔

نظامی کا انداز بڑا بے تکلف تھا۔ نوجوان مسحور ہو گئے۔ بولے' بے شک' بے شک' آپ ان سے بات کر لیں۔ ہم اپنی بات چیت کل پر ملتوی کر دیتے ہیں۔ دوستو کل اسی وقت یہاں۔

لوہن ایئر ریستوران کے باہر نظامی کی جیپ کھڑی تھی۔ یہ جیپ کہاں سے لی' یوسف ظفر نے پوچھا۔

یہ جیپ تمہیں لینے آئی ہے' وہ ہنسا۔

لیکن ہم تو یہاں بری طرح سے پھنسے ہوئے ہیں۔ یوسف ظفر نے مختصر طور پر نظامی کو چھ خوبصورت لڑکیوں کی کہانی سنائی۔

نظامی کی آنکھوں سے مسرت کی ایک پھوار اڑی۔ بولا۔ چھ خوبصورت لڑکیاں آئی نہیں بھیجی گئی تھیں۔ تاکہ آپ یہاں سے فارغ کر دیے جائیں۔

نظامی صاحب' یوسف ظفر نے کہا' پندرہ نوجوانوں کے کیریر کا سوال ہے۔ انہیں گورنمنٹ سروس سے بین کر دیا گیا ہے۔ ہم انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔

افراد کا سوال اہم نہیں' نظامی نے کہا' اس وقت قوم کی خدمت کا سوال ہے' قوم کو آپ کی ضرورت ہے' آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔

کہاں' میں نے پوچھا۔

مجاہدوں کے محاذ پر' وہ بولا۔

لیکن ہم پر تو بین لگی ہوئی ہے' یوسف ظفر نے کہا۔

دیکھو بھائی' نظامی نے کہا' یہ بین وین کی باتیں وہاں جا کر طے کر لیں گے' میں تمہیں تیاری کے لیے صرف چوبیس گھنٹے دے سکتا ہوں۔ کل اس وقت ہم سڑک پر ہوں گے۔ پرسوں شام

تک ہمیں منزل پر پہنچنا ہے۔ بہت لمبا سفر ہے۔ یوسف ظفر نے بات کرنی چاہی لیکن نظامی نے اسے خاموش کر دیا۔ نو آرگومینٹ' وہ بولا' دی نیڈ یو اینڈ آور نیڈ از گریٹر دین اپی تھنک۔ ایلس۔

مجاہدین

اگلے روز ہم تینوں راولپنڈی کی جانب جا رہے تھے۔ راولپنڈی میں رات بسر کرنے کے بعد' ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ سارا دن ہم پہاڑوں میں چکر کھاتے رہے۔ چار بجے کے قریب جیپ رک گئی۔

ہمارے سامنے عجیب منظر تھا۔ چاروں طرف برف کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس میں یہاں وہاں جلے ہوئے ٹوٹے ہوئے مکانات تھے۔ دور سے تڑ تڑ کی آوازیں آ رہی تھیں' پتہ نہیں کون کہاں فائرنگ کر رہا تھا۔

سات آٹھ آدمی سڑک سے ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے خاکی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کندھوں پر بندوقیں لٹکائی ہوئی تھیں۔

نظامی کو دیکھ کر وہ سب اٹھ بیٹھے اور جیپ سے سامان نکالنے لگے۔

نظامی نے تڑ تڑ کی آواز سن کر کہا' کیوں بھئی' یہ بھٹیارن کب سے دانے بھون رہی ہے۔

وہ سب مسکرائے' ایک بولا' آج تو صبح سے ہی دانے بھوننے میں لگی ہے۔

یہ منظر دیکھا' نظامی نے کہا' کیوں جوانوں بات سمجھ میں آ گئی۔ ہم نے کہا' بالکل آ گئی۔ بولے اینی کویسچن۔ ہم نے کہا' نو کویسچن۔ بولے' بہرحال ایک بات واضح کر دوں۔ یہ آزاد کشمیر ریڈیو سٹیشن ہے۔ یہ اسلام کا محاذ آزادی ہے۔ یہاں کوئی افسر نہیں۔ سب سپاہی ہیں۔ کوئی مخصوص ڈیوٹی نہیں' ہر کام آپ کا کام ہے۔ کوئی ڈیوٹی کے اوقات نہیں' دن رات ہر وقت آپ ڈیوٹی پر ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ ریڈیو سٹیشن آپ نے چلانا ہے۔ اور یہ ریڈیو اسٹیشن نہیں بلکہ محاذ آزادی ہے' حق کی آواز ہے اور آپ ملازم نہیں مجاہد ہیں۔ اور میں' میں یہاں آپ کی خدمت کرنے پر مامور ہوں۔

میں تو محاذ اور مجاہد کے لفظوں کے مفہوم سے پورے طور پر واقف نہ تھا۔ یوسف ظفر کے

دل میں اسلامی جذبہ یوں بھرا ہوا تھا جیسے مالٹا رس سے بھرا ہوتا ہے۔ نظامی کی بات سن کر یوسف ظفر کی ایڑیاں ہوا میں اٹھ گئیں' گردن تن گئی۔ اس نے گرد و پیش پر نظر ڈالی اور یوں محسوس کرنے لگا جیسے بطخ تالاب میں آ پہنچی ہو۔

ٹرک ریڈیو

میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ وہ ایک سرسبز پہاڑی علاقہ تھا۔ نیچان اوچان سے بھرا ہوا۔ یہاں وہاں کہیں کہیں ٹوٹی پھوٹی عمارتیں تھیں' کچھ گری ہوئی' کچھ جلی ہوئی ظاہر تھا کہ وہ دشمن کی بم باری کا شکار ہوئی تھیں۔ میں نے یوسف ظفر سے پوچھا' یہاں بمباری ہوتی ہے کیا۔ نظامی بولا' بھئی یہ محاذ ہے۔ دشمن کا مقصد یہ ہے کہ حریت پسندوں کی آواز کو خاموش کر دیا جائے۔ یہ آواز وادی میں گونجتی ہے اور اہل کشمیر کے دلوں میں آزادی کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ ظاہر ہے آزاد کشمیر ریڈیو غنیم کے دلوں میں کانٹا بن کر چبھا ہوا ہے۔ یہ کہہ کر نظامی چلا گیا۔

میں نے یوسف ظفر سے پوچھا' یار آزاد کشمیر ریڈیو ہے کہاں۔

یوسف ظفر نے چاروں طرف دیکھا' بولا ہوگا یہیں کہیں۔ میں سمجھا تھا کہ آزاد کشمیر ریڈیو' ایسے ہی ہو گا جیسے ریڈیو سٹیشن ہوتے ہیں۔ ایک خوب صورت بلڈنگ' جاذب نظر سٹڈیوز' امپورٹڈ مشینیں۔

پیچھے سے نظامی کی آواز آئی' اپنے ہم کاروں سے ملئے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ ہمارے سامنے چار نوجوان کھڑے مسکرا رہے تھے۔ مسعود قریشی' محمد عمر' حمید اعظمی اور عماد الدین۔ وہ ہمیں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ کہنے لگے'

آیئے ہم آپ کو آپ کی رہائش گاہ دکھا دیں۔

میں نے کہا' یہ بتایئے کہ آزاد کشمیر ریڈیو کہاں ہے۔

اس پر وہ ہنسنے لگے۔ بولے آیئے پہلے ہم آپ کو آزاد کشمیر ریڈیو دکھاتے ہیں۔

درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں' باہر کی طرف ابھری ہوئی چٹان کے نیچے' ایک جائنٹ قسم کا ٹرک کھڑا تھا۔

ارے میں چلایا' یہ تو ٹرک ہے۔

جی یہی ہے آزاد کشمیر ریڈیو' انہوں نے کہا۔

وہ ایک اونچا لمبا ٹرک تھا' جس کے اگلے حصے میں مشینیں لگی ہوئی تھیں' ایسی جیسے لنڈے بازار سے خریدی گئی ہوں۔

ٹرک کے پچھلے حصے کے گرد پرانی رضائیاں لپٹی ہوئی تھیں تاکہ آواز میں گونج پیدا نہ ہو۔ بیچ میں ایک مائیکروفون رکھا تھا۔ یہ آزاد کشمیر ریڈیو کا واحد سٹڈیو تھا۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے کہا' لیکن ٹرک میں کیوں۔

اس پر عماد انجینئر بولا' اس لیے کہ دشمن تاک میں بیٹھا ہے کہ کسی نہ کسی طور پر مجاہدوں کی اس آواز حریت کو چپ کرا دے۔

آزاد کشمیر ریڈیو دشمن کا سب سے اہم ٹارگٹ ہے' مسعود بولا۔

اعظمی نے کہا' اسی وجہ سے یہ یونٹ موبائیل ہے' آج یہاں ہے' کل وہاں اور پرسوں پتہ نہیں کہاں۔

عمر غصے میں چلایا' لیکن وہ کبھی اسے زد میں نہیں لے سکیں گے' کبھی نہیں' اس کے منہ سے جھاگ اڑا۔

انشاء اللہ' اعظمی نے کہا' حق کی آواز کو دبایا نہیں جا سکتا۔

تراڑکھل میں آزاد کشمیر ریڈیو سے متعلق صرف چودہ پندرہ افراد تھے۔ وہ سب جذبے سے یوں نچڑ رہے تھے' جیسے جلیبیاں شیرے سے نچڑتی ہیں۔ ان کے سروں پر صرف ایک جنون سوار تھا کہ حق کی آواز فضا میں گونجتی رہے۔ کشمیری عوام کے دلوں میں آزادی کی امید کا دیا روشن رہے۔ جارح کے دل میں دھڑکا لگا رہے۔

وہاں ہر قسم کے لوگ موجود تھے' انجینئر۔ نیوز مین۔ اناؤنسر۔ سکرپٹ رائٹرز۔ لیکن انتظامیہ سے متعلق کوئی فرد نہ تھا۔ نہ پروڈیوسر' نہ ڈیوٹی افسر' نہ پروگرام مینجر۔ اگر انتظامیہ کے متعلق کوئی تھا بھی تو وہ دوسرے کاموں میں اس حد تک مصروف تھا کہ اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ وہ انتظامیہ سے متعلق ہے۔ پروڈیوسر سکرپٹ لکھتے تھے' چوکیدار اور ڈرائیور اناؤنسمنٹ کرتے تھے' ڈائریکٹر لالٹینیں جلاتا تھا۔

مینجر ٹرک کے پلگ صاف کرتا تھا۔

دن میں تین یا چار بار بلاوا آ جاتا۔ آ جاؤ' سب اکٹھے ہو جاؤ۔ بلاوا آتا تو سب' اکٹھے ہو جاتے' میٹنگ بھی انوکھی میٹنگ ہوتی' کبھی درختوں کے جھنڈ تلے' کبھی کسی جلی ہوئی بارک کی اوٹ میں اور کبھی کھلے میدان میں۔ سنو سنو نظامی وہی آواز میں کہتا' تازہ خبر آئی ہے۔

ان دنوں ہمارے لیے سب سے اہم بات خبر تھی۔ چونکہ آواز حق کو نشر کرنے میں تازہ ترین خبر کو جاننا اہم تھا۔ ڈرائیور' چوکیدار اور قاصد بھی خبر کو غور سے سنتے تھے۔ تاکہ مائیک پر بولنا پڑے تو تازہ ترین حالات سے باخبر ہوں' یہ خبریں بھی عجیب نوعیت کی خبریں ہوتی تھیں۔ کسی مجاہد کی جرات کی حیران کن داستان' کسی جانباز کی جان کی قربانی کی تفصیلات' نہتے شہریوں کی مجاہدانہ دلیری۔

میٹنگ ختم ہوتی تو سب اپنی اپنی جگہ سوچنے لگتے کہ خبر کو پروگراموں میں کیسے ڈھالا جائے۔ پروگرام کا فارمیٹ کیسا ہو۔ نام کیا ہو۔

استاد' معلم

ویسے تو ہم سب ایمرجنسی میں مائیک پر بولا کرتے تھے' لیکن ہمارے پاس چار بہت بڑے فنکار موجود تھے۔ محمد حسین' تاج' نور اور امیر خان۔

محمد حسین چوٹی کا فنکار تھا۔ ان دنوں مجھے علم نہ تھا کہ یہ شخص صرف اس لیے بھیجا گیا ہے کہ ریڈیائی اور ادبی تحریروں میں میری راہ نمائی کرے۔ بن بتائے' سمجھائے کہ مکالمے کا مفہوم کیا ہے۔ کردار کیسے بنتے ہیں اور ڈرامے کس طرح لکھے جاتے ہیں۔ آج مجھے اس بات پر فخر ہے کہ محمد حسین میرا استاد تھا۔ اور ریڈیو آزاد کشمیر میرا معلم تھا۔ جس نے مجھے بات کہنا سکھایا۔

تاج اور امیر خان دو گمبھیر آوازیں تھیں' جن کے پاس دل دہلا دینے والی گھرج تھی۔ اور نور ایک ابھرتا ہوا فنکار تھا جو بعد میں شہرت سے ہمکنار ہوا۔

آزاد کشمیر ریڈیو میں پروگرام عجیب انداز سے مرتب ہوتے تھے۔ ایک روز نظامی نے خبر سنانے کے بعد کہا یارو۔ یہ کیسا دشمن ہے جسے جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔ یوسف ظفر جوش میں آ گیا۔ بولا میں کھولوں گا ان کے جھوٹ کا پول۔ مسعود چلایا۔ ڈھول کا پول۔ تاج بولا' دو گمبھیر آوازیں' میں اور امیر خان۔

محمد حسین نے کہا ہاں دو آوازیں' ایک نہلا' دوسری دھلا۔

ٹھیک ہے اعظمی چلایا' نہلے پر دھلا' عمر بولا پٹاخ پٹاخ یوں جیسے پٹائی ہو رہی ہو۔ نظامی نے قہقہہ لگایا۔ جھوٹے کو اس کے گھر پہنچا کر آنا ہو گا۔

ڈھول کا پول

اسی روز شام کو ڈھول کا پول نشر ہو رہا تھا۔ تاج اور امیر خان نشر کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ یوسف ظفر پرچیوں پر لائنیں لکھ لکھ کر دیے جا رہا تھا۔ وہاں اتنا وقت میسر نہ تھا کہ سکرپٹ پورا لکھ کر دیا جائے اور پھر نشر ہو۔ اس لیے سکرپٹ ساتھ ساتھ لکھا جاتا تھا اور نشر کرنے والوں کو یوں دیا جاتا تھا' جیسے چڑیا بچوں کو چوگا دیتی ہے۔

بہرصورت ڈھول کا پول نشر ہو رہا تھا' نہلے پر دھلا پڑ رہا تھا' پٹاخ پٹاخ پٹائی ہو رہی تھی۔ نظامی کھڑا سن رہا تھا۔ یار یہ ہاتھ ذرا کمزور رہا۔ اگلا ہاتھ سُنیئے' یوسف ظفر کہہ رہا تھا ہم نے کسر پوری کر دی ہے۔ اس پٹاخ پٹاخ کی آواز کئی ایک سال وادی میں گونجتی رہی۔

ایک روز محمد حسین میرے پاس آیا' بولا' مفتی جی' ایک پروگرام ذرا ہٹ کے ہو جائے۔ دبانگ آوازوں میں پٹائی تو ہوتی ہی رہتی ہے' ایک پروگرام دھیمی آواز میں ہو جائے۔ میں نے کہا کیا مطلب۔ کہنے لگا۔ بھارت کے دل کی باتیں باہر لائی جائیں۔ میں نے کہا مثلاً بولا پنڈت جی بچوں کو پڑھائیں۔ بولو بالکو ب سے بول۔ ایسا بول بولو جو اوپر سے میٹھا ہو' اندر بس گھلی ہو۔ اوپر سے شانت دکھو پرنتو اندر کرودھ ہو غصہ ہو۔ مکھ پر ہنسی ہو' بغل میں چھری۔ کچھ ایسا ہو۔ محمد حسین نے کہا۔

اگلے روز آزاد کشمیر سے ایک پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ بھارت کی نئی پستک۔ مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ محمد حسین پنڈت کی آواز میں بالکوں کو گر سکھا رہا تھا۔ بالکو بولو بھ سے بھارت۔ بالکو بھارت کا کام ہے کہ جو ملے اسے ہتھیا لے۔ دوجے کی چیز پر اپنا حق جتائے۔ مہاراج یہ تو بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔

نظامی بولا' واہ محمد حسین آج تو رنگ لگا دیا۔

ایک روز میٹنگ میں نظامی بولا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ مجاہدوں کی آواز سن کر بھارتیوں کے

چھکے چھوٹ جاتے ہیں' ڈر کر چلاتے ہیں وہ آ گئے۔

مسعود بولا' نظامی جی پروگرام بن گیا۔

نظامی نے پوچھا' کیا۔

مسعود بولا' ہم آ گئے۔

تاج اور امیر خان اپنی گمبھیر آوازوں میں بولے ہم۔ م۔ م۔ م۔ آ گئے......

اگلے روز آزاد کشمیر سے نیا پروگرام نشر ہو رہا تھا' ہم آ گئے۔

دو مجاہد بھارتی بھگوڑوں میں بھگ دڑ مچا رہے تھے۔

اعظمی بولا' نظامی جی' بھارتی سنار کی ٹک ٹک کے جواب میں ایک لوہار کی ہو جائے۔

عمر نے کہا' ضرب کلیم۔

اگلے روز آزاد کشمیر ریڈیو پر ایک لوہار کی اور ضرب کلیم' دونوں ضربیں گونج رہی تھیں یوں آزاد کشمیر ریڈیو کے پروگرام مرتب ہوتے تھے۔

ان جذبے کے زور پر سوچے ہوئے پروگراموں میں' ہمارے فن کار پھول پتیاں لگاتے رہتے' حتیٰ کہ ان کی شکل ایسی بن جاتی کہ کئی ایک پروگرام آزاد کشمیر ریڈیو کی پہچان بن گئے۔ وادی کے لوگ ان پروگراموں کا انتظار کرتے تھے اور جب وہ نشر ہوتے تو گھر والیاں اس قدر محو ہو جاتیں کہ ہانڈی روٹی کی طرف توجہ نہ رہتی' ہانڈیاں لگ جاتیں' روٹیاں جل جاتیں اور انہیں خبر ہی نہ ہوتی' محنت کش کام چھوڑ کر بیٹھ جاتے۔

خطوط

اس دور دراز جگہ پر بھی ہمیں بے شمار خط موصول ہوتے تھے' ڈاکیا روز ایک بھرا ہوا تھیلا لے آتا۔ یہ خط نہیں تھے۔ بلکہ جذبات نامے تھے۔ اسلامی جذبات' قومی جذبات' ملی جذبات۔ کشمیریوں کے دل آزاد کشمیر ریڈیو سے نشر ہونے والی آوازِ حق کے احترام سے یوں بھرے ہوتے تھے کہ الفاظ سے ایک پھوار نکلتی جو پڑھنے والوں کی بھگو کر رکھ دیتی۔

ان خطوط کو پڑھ کر ہمیں احساس ہوتا تھا کہ ہماری آواز کو سامعین کس عقیدت سے سنتے ہیں۔ کس لگن سے آزاد کشمیر کی آواز کا انتظار کرتے ہیں اور کس جذبے سے آزاد کشمیر ریڈیو کی

آواز حق کو دعائیں دیتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ ان خطوط کے مطالعے سے ہی مجھے احساس ہوا کہ واقعی ہم قوم کی خدمت کر رہے ہیں اور سامعین کے دلوں میں ہم سب کا کس قدر احترام ہے۔

جب بھی ہم یہ خطوط نظامی صاحب کو دکھاتے' تو وہ کہتے نہ بھئی مجھے یہ خط نہ دکھاؤ۔ یہ خط پڑھ کر اس قدر تفاخر پیدا ہوتا ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سب اسلام اور قوم کے خادم نہیں بلکہ ہیرو ہیں۔ اس احساس تفاخر سے بچو ورنہ گڑ بڑ ہو جائے گی۔ یاد رکھو ہمارا کام خدمت کرنا ہے۔

اہل کشمیر کے خطوں کے علاوہ ہمیں پاکستان سے بھی خط موصول ہوتے رہتے تھے۔ ان خطوط میں لکھا ہوتا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں بھی چند روز کے لیے آپ کے ساتھ قوم و ملک کی خدمت کروں۔ میں اس بات کا خواہش مند ہوں کہ آزاد کشمیر ریڈیو میں کچھ دیر کام کروں۔

یوں مجاہد ریڈیو میں کئی لوگ خدمت کا جذبہ لے کر آتے اور دنوں یا مہینے کے لیے ہمارے ساتھ مل کر کام کرتے۔

پہلے مشہور ادیب اعجاز بٹالوی آئے پھر معروف شاعر ن م راشد اس کے بعد اشفاق احمد اور نصیر انور' صحافیوں میں انوار' ممتاز ملک یہ فہرست کافی طویل ہے۔

میں مجاہد ریڈیو کا ممنوں احسان ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ جس نے مجھے صرف لکھنا ہی نہیں سکھایا بلکہ اسلامی جذبے سے بھی شناسا کیا' ورنہ میں ایک مغرب زدہ فرد تھا' منہ زبانی مسلمان۔

بائیسواں باب

راولپنڈی

میرا خیال تھا کہ چھ مہینے کے بعد میں واپس لاہور چلا جاؤں گا اور وہاں نوکری تلاش کروں گا۔

ہمارا بیج مجاہد ریڈیو سے فارغ ہوا تو ہم سب پنڈی آ گئے۔ پنڈی میں چھ سات دن رکنے کا پروگرام تھا۔

ان دنوں پنڈی ایک چھوٹا سا شہر تھا' پتلی پتلی سڑکیں' تنگ گلیاں' گڈمڈ محلے' پرانے بوسیدہ مکانات پرانی وضع کی دکانیں۔ ہوٹلوں کے سامنے بازار میں دیو قامت چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں' جن پر بیٹھ کر لوگ چائے پیتے اور حقے کے کش لگاتے۔

شہر سے ذرا فاصلے پر صدر کا علاقہ تھا۔ جو مقابلتاً" صاف ستھرا تھا۔

لیکن وہاں اداسی چھائے رہتی تھی۔

پنڈی کو دیکھ کر میں بہت مایوس ہوا۔ بس کی بات ہوتی تو میں پنڈی میں نہ رکتا۔

دو ماہ پہلے یوسف ظفر اور میں نے پبلک سروس کمشن کو ملازمت کے لیے درخواستیں دی تھیں۔ انٹرویو پنڈی میں ہونا تھا۔ لہٰذا ہمیں پنڈی میں رکنا پڑا۔ انٹرویو سے ایک دن پہلے سڑک پر بیٹھے ہوئے ایک بڈھے فقیر نے مجھے اشارہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ بھیک مانگے گا۔

قریب گیا تو وہ بولا' تو آگیا' اچھا کیا کہ آگیا' دیر سے آیا' پر آگیا۔
اچھا ہوا' اب جانا نہیں' بالکل نہیں' وہ کچھ دیر رک کر بولا۔
مجھے بات سمجھ میں نہ آئی کہ بڈھا کیا کہہ رہا ہے۔
بڈھے نے پھر سر اٹھایا۔ بولا جا امتحان دے۔
امتحان کی بات سن کر میں چونکا۔ اسے کیسے پتہ چلا کہ مجھے انٹرویو دینا ہے کہ میں امتحان کے لیے رکا ہوا ہوں۔
پھر دفعتاً" مجھے شاہ کاکو کا بابا یاد آگیا۔ وہ بھی یہی کہتا تھا' اوپر چلا جا جہاں پہاڑیاں ہیں' تجھے وہاں جانا ہو گا۔

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی' سامنے مری کی پہاڑیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔
کیا واقعی مجھے اس شہر میں رہنا ہے۔ نہیں میں یہاں نہیں رہوں گا' نہیں میں یہاں نہیں رہوں گا۔ یہ بڈھے فقیر لوگوں پر اثر ڈالنے کے لیے اناپ شناپ بولتے رہتے ہیں۔ ان کی باتوں کے فریب میں نہیں آؤں گا۔
اگلے روز پبلک سروس کمشن نے انٹرویو کے فوراً بعد میرے ہاتھ ایک حکم نامہ تھما دیا۔ لکھا تھا' آپ فوراً وزارت کشمیر افیئرز کے ذیلی دفتر آزاد کشمیر پبلسٹی ڈائریکٹوریٹ میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے جائن کر لیں۔
اس حکم پر میں ہکا بکا رہ گیا' کیوں کہ یہ حکم پبلک سروس کمشن کے دستور سے ہٹ کر تھا۔
کشمیر پبلسٹی ڈائریکٹوریٹ صدر میں بائیں نمبر چونگی کی سڑک پر سولجر ہوم میں واقع تھا۔
یہ ایک چھوٹا سا دفتر تھا جس میں صرف بیس پچیس آدمی کام کرتے تھے۔
دفتر کا ڈائریکٹر' ضیاالاسلام ایک بنا ٹھنا مستعد آدمی تھا۔ ایسے لگتا تھا۔ جیسے ابھی ابھی ڈرائی کلینر لانڈری سے ڈبے میں بند ہو کر آیا ہے۔ ضیاالاسلام بڑا محنتی آدمی تھا۔ وہ صبح شام دفتر کے کام میں ڈوبا رہتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے کسی اور بات سے دلچسپی نہ ہو۔ اس کی بیوی کراچی میں مقیم تھی۔ اس نے پنڈی آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے میاں ہوٹل کے ایک سوئٹ میں مقیم تھا۔ وہ ایک ایکسٹرو ورٹ تھا۔ ترقی کی خواہش اس کے بند بند میں رچی ہوئی تھی۔

اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس کا برتاؤ بہت روکھا تھا۔ کام میں سخت گیر تھا۔ کسی سے بھیگتا نہ تھا۔ خود پسند تھا۔ احساس برتری کی وجہ سے سوشل زندگی سے محروم تھا۔ ہوٹل میں اکیلے بیٹھ کر روٹین کام میں جتا رہتا۔

پبلک ریلیشنز کا یہ دفتر از سر نو تشکیل ہوا تھا۔ فیڈرل پبلک سروس کمشن نے اس دفتر کے لیے چار ایک نئے افسر سلیکٹ کیے تھے۔ جنہیں مختلف قسم کے کام بانٹ دیے گئے تھے۔ ان افسروں میں ایک خاتون بھی تھی' ربیعہ فخری۔

ربیعہ فخری

ربیعہ فخری گریجویٹ تھی' اہل زبان تھی' سادہ مزاج تھی' ملنسار تھی۔ اس میں کوئی نسائی نخرہ نہ تھا۔ کمرے میں داخل ہوتی تو یہ احساس نہ ہوتا کہ کوئی خاتون آئی ہے۔ نہ تو وہ خصوصی میک اپ کرتی تھی اور نہ اسے بناوٹ سجاوٹ کا شوق تھا۔ طبعاً" وہ ایک محنتی لڑکی تھی۔

ربیعہ کے جسم کے نچلے حصے میں ایک عجیب ساخم تھا۔ جو چلتے وقت خاصہ نمایاں ہو جاتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی ڈبے پر تانگے کا پہیہ گزر گیا ہو۔ اور اس میں ایک دائمی "چب" پڑ گیا ہو۔ پی آر ڈی میں میرا کام ریڈیو پبلسٹی سے متعلق تھا۔ اس لیے ریڈیو کے کارکنوں سے میرا رابطہ بحال رہا۔

ریڈیو میں جانے پہچانے شاعر اور ادیب تھے۔ مختار صدیقی تھے۔ یوسف ظفر تھا۔ مسعود قریشی تھا۔ عزیز ملک تھا۔

ریڈیو میں ادبی محفلیں لگتی تھیں۔ پھر ہم سب حلقہ ارباب ذوق میں چلے جاتے۔ شام کو صدر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں محفل لگ جاتی۔

یوں راولپنڈی میں ادبی گہما گہمی میں چند ایک سال گزر گئے۔

راولپنڈی میں ' میں بہت سی شخصیتوں سے متعارف ہوا۔ مثلاً شبیر شاہ تھا' جو تھا تو صحافی' مگر مجاہدانہ کردار کا مالک تھا۔ پھر غلام دین وانی تھا' جو کشمیری لیڈر تھا' جس کی طبیعت میں بیک وقت عجز و انکسار بھی تھا اور شدت بھی۔ وہ خود دیانتدار تھا اور دوسروں کی بد دیانتی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

راولپنڈی میں، میں سات سال مقیم رہا۔ اس دوران میں ایک چار یاری بن گئی، جو آج تک دائم و قائم ہے۔ یہ چاروں مسکٹیئر ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے۔ ہم پانچوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی، ہماری طباع مختلف تھیں، مشاغل الگ الگ تھے، اس کے باوجود ہم ساتھی بن گئے۔ آج چالیس برس گزر چکے ہیں، لیکن اس ساتھ میں فرق نہیں آیا۔

پہلے ہم گپ شپ میں وقت گزارا کرتے تھے، گپیں مارتے بحثیں کرتے، ایک دوسرے کا پھلکا اڑاتے، تاش کھیلتے ہوٹل بازی کرتے۔

پھر ہم نے اس چار یاری کو ایک تعمیری انجمن بنا دیا اور اسے "لکھ یار" کا نام دیا۔ مقصد یہ تھا کہ سب کو تخلیقی کام کی طرف راغب کیا جائے۔ چونکہ سب ریڈیو پروگراموں کے پروڈیوسر تھے۔ اس لیے ادب فن اور علمی معلومات سے باخبر تھے۔ ویسے پروگرام پروڈیوس کرنا بذات خود ایک آرٹ ہے۔

ہماری یہ تنظیم کچھ زیادہ دیر نہ چلی۔

پھر ہم نے ایک اور تنظیم بنائی۔ چھڈ یار۔ یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ اس وقت ہم میں دو ساتھی اور شامل ہو چکے تھے۔ ہم کل ساتھ رکن تھے۔ عمر، مسعود، عماد، اعظمی، اشفاق احمد، عکسی اور میں۔

ہماری مشکل یہ تھی کہ ساتوں بہت سیانے تھے، ضرورت سے زیادہ سیانے۔ ہمارا ہر رکن مذہب، سیاست، ادب، دفتریات، سائنس، فلسفہ غرض یہ کہ ہر موضوع پر حرف آخر تھا۔ اس لیے دوسروں کو سمجھانا اور راہ راست پر لانا اپنا اپنا فرض اولین سمجھتا تھا۔ اور چونکہ حرف آخر تھا اس لیے دوسروں کی بات سننا اور اسے سمجھنا اس کی شان کے منافی تھا۔

دنیا داری میں ہم سب ایسپ کے سیانے کوے کی طرح پانی کی سطح اپنی چونچ تک ابھارنے کے لیے مرتبان میں پتھر پھینکتے رہتے تھے۔

ہم ساتوں رنگ رنگ کے منکے تھے۔ کوئی چوکور، کوئی گول، کوئی مخروطی، جو بدقسمتی سے ایک لڑی پر وئے گئے تھے۔ اس لڑی کا نام تھا "چھڈ یار"۔

چھڈ یار ایک چوکڑی ہے جو اتفاقاً وجود میں آ گئی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک روز ان جانے میں ہم سب پر ایک دیانت بھرا لمحہ نازل ہو گیا۔ اس کے تحت ہم سب نے محسوس کیا کہ سیانف

اور معتبری کا بوجھ جملہ بوجھوں سے زیادہ بوجھل ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم ہر سال آٹھ دس دن کے لیے تمام بوجھوں اور بندھنوں پر چھڈ یار کہہ کر باہر نکل جایا کریں' چھڈ یار کے بنیادی قوانین بظاہر بڑے آسان ہیں' پر ہیں بے حد مشکل:

۱۔ کہ ہر سال دس بارہ دنوں کے لیے چھڈ یار منانا لازم ہو گا۔

۲۔ کہ باہر جاتے وقت اپنے اپنے سیانے معزز عہدے دار کو گھر چھوڑ کا جانا ضروری ہو گا۔

۳۔ کہ باہر جانے سے پہلے ہر کوئی اپنے اندر کے دم بخت مظلوم بچے کو باہر نکالے گا۔ اس کا منہ دھوئے گا' چومے گا' پچکارے گا۔ پھر کندھے پر بٹھا کر ساتھ لے جائے گا۔

۴۔ کہ اس آؤٹنگ کے دوران کوئی رکن عقل کی بات کرنے کی کوشش نہیں کرے گا' اور نہ دوسروں کو عقل سکھانے کی عیاشی کا سزاوار ہو گا۔ البتہ بحث کرنے پر کوئی پابندی نہیں' کیونکہ بحث ایک معصوم اور بے ضرر وقت کٹی ہے' بحث سے کبھی کوئی قائل نہیں ہوا۔ بحث نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔

محمد عمر

چھڈ یار کے سات بنیادی رکن ہیں۔ سب سے پہلے محمد عمر لیڈر ہے' جس کی جملہ خوبیوں کی وجہ سے اسے متفقہ طور پر لائف لیڈر منتخب کیا گیا۔ پہلی خوبی یہ ہے کہ وہ سیانف اور معتبری کے بوجھ سے ہمیشہ کے لیے ازلی طور پر آزاد ہے۔ اس کے اندر کا بچہ ہمہ وقت اس کے کندھے پر سوار رہتا ہے۔ پہاڑوں پر پہنچ کر اس کے اندر کا شرپا بیدار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا جی چاہتا ہے کہ کسی ہلیری کو کندھوں پر اٹھا کر چوٹی پر گاڑ سکے' جس طرح ہمارے تمام شرپے کیا کرتے ہیں۔ لیڈر کا صرف ایک مطالبہ ہے کہ اسے چودھری کہہ کر بلایا جائے۔ مطالبہ صرف کہہ کر بلانے کا ہے' سمجھنے کا نہیں۔ پکارنے کے بعد چاہے آپ اسے اپنے کام میں لگائے رکھیں۔ وہ سودا لائے گا' آپ کے لیے کھانا پکائے گا' برتن دھوئے گا' چائے پکائے گا اور ضرورت پڑے تو آپ کے پاؤں دبائے گا' لیکن خبردار! اسے مسلسل چودھری جی کہنا ضروری ہو گا' ورنہ نتائج کی ذمے داری خود آپ پر ہو گی۔ اس لحاظ سے لیڈر کی حیثیت خالص مرد جیسی ہے۔

مسعود قریشی

ہمارا دوسرا رکن مسعود قریشی شاعر ہے۔ شاعر کا زاویہ نگاہ سائنسی ہے۔ نثر نگار کی طرح سوچتا ہے۔ غیر شاعرانہ طبیعت کا مالک ہے' لیکن شعر کہتا ہے۔ اچھے اور پُر معنی شعر۔ شاعر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دفتر کو مندر کا رتبہ دے رکھا ہے۔ شاعر کے اندر کا بچہ طویل دفتری تپسیا کے باوجود ابھی تک زندہ ہے۔ اس کی ذمے داری شاعر پر نہیں' بچے پر ہے۔ وہ اس قدر جاندار تھا کہ کوشش کے باوجود نہیں مر سکا۔

حمید اعظمی

ہمارا تیسرا رکن حمید اعظمی ہے۔ اللہ نہ کرے کہ آپ کو اس کے ماتحت کام کرنا پڑے۔ اگر وہ آپ کا ماتحت بن جائے تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہو گی۔ حاکم کی حیثیت سے وہ مسلسل تیوری ہے۔ خاوند کی حیثیت سے چون و چرا ہے' لیکن ساتھی کی حیثیت سے باغ و بہار شخصیت ہے۔ مسلسل مفرح مسکراہٹ' خدمت گار' مٹھاس کا ایسا مرتبان جس سے پھوار اڑتی رہتی ہے۔ مزاح اور حاضر جوابی کی بنا پر اسے اعلیٰ درجے کا مزاح نگار ہونا چاہیے تھا۔ کیوں منہ زبانی رہ گیا؟ یہ بھید آج تک نہیں کھلا۔ بہر طور اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے ہم نے اس کا نام وِٹ رکھ دیا ہے۔

اشفاق احمد

ہمارا چوتھا رکن اشفاق احمد داستان گو ہے ——— داستان گو بڑا گنی آدمی۔ بڑا معروف جانا پہچانا۔ مگر طبیعت کا براہمن ہے۔ ذات پات کا بڑا قائل ہے۔ اونچا بیٹھ کر بات کرتا ہے' لیکن بات کا دھنی ہے ——— باتوں کا ایسا جال پھیلاتا ہے کہ سننے والوں میں خود اسیر ہونے کی خواہش چٹکیاں لینے لگتی ہے' ذات کا پٹھان ہے' اندر سے خالص اوپر سے "کاٹھا"۔

عماد الدین

ہمارا پانچواں رکن عماد الدین انجینئر ہے ——— انجینئر تضادات کی کھچڑی ہے۔ ایک

پلو میں ایمان بندھا ہے' دوسرے میں سائنس۔ ایک جیب میں فنون کا شوق' دوسری میں مشینوں کی پرستاری۔ اعمال کٹر مسلمان کے۔ خیالات کٹر مادہ پرست کے' کندھے پر تصوف کا چولا' ماتھے پر جحت کا ٹیکہ۔

عکسی مفتی

ہمارا چھٹا رکن عکسی مفتی فوک لوریا ہے' جو اعزازی طور پر ڈرائیور کا کام کرتا ہے۔ اسے مناظر سے دلچسپی نہیں' لوگوں سے ہے۔ لوگوں سے بھی نہیں' ان کے رہت بہت سے ہے۔ وہ ایسا بادام ہے جس میں دو مغز ہیں۔

ایک صوفی فلاسفر ہے۔ دوسرا شدھ انگریز۔ جب وہ ایوولیوشن (ارتقاء) کی بات چھیڑ دے تو پھر آپ کا اللہ حافظ ہے۔

اور وہ ہمیشہ تاک میں بیٹھا رہتا ہے کہ کب موقع ملے اور ایوولیوشن کی بات چھیڑے۔

آخر میں میں ہوں۔ میں جو "میں میں" کے سوا کچھ بھی نہیں۔

چھڑیار تنظیم کی ابتدا اتفاقیہ طور پر ہوئی۔

مئی ۱۹۷۷ء میں چار یاری کا اکٹھ ہوا۔ ان دنوں سیاسی صورت حال سخت پریشان کن تھی۔ ہم سب سیاست میں کورے ہیں۔ سیاست کو بالکل نہیں سمجھتے' لیکن سمجھتے ہیں کہ خوب سمجھتے ہیں۔ لہٰذا سیاست پر بات کرنا ہمارے لیے بہت بڑی عیاشی ہے۔

ہمارا دوسرا وصف یہ ہے کہ ہمیں کسی ازم سے وابستگی نہیں۔ ہم سب کو ایک فکر دامن گیر رہتا ہے کہ امن و امان قائم رہے۔ اگر ہمیں یہ یقین دلایا جائے کہ امن عامہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو سیاسی لڑائیاں' جھگڑے' فساد ہوتے ہیں' تو بسم اللہ ہوں' ہم صورت حال پر کتابی بحثیں کر کے دل خوش کر لیتے ہیں۔

ان دنوں ملک کی سیاسی صورت بڑی پریشان کن تھی۔ سیاسی لیڈروں کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مذاکرات میں باتیں ہوتی ہیں۔ "سب اچھا' سب اچھا" کی رپورٹیں ہوتی ہیں' نہ نتیجہ ہوتا ہے نہ فیصلہ۔

لوگ گھبرا کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں' کیونکہ کسی ستم ظریف نے قوم کو یاد دلایا تھا کہ ہمارا

ایک نصب العین ہے۔ ایک منزل ہے۔ ایک سمت ہے۔

اس روز سیاسی صورت حال پر ہماری بحث ہوئی۔ اتنی بحث ہوئی کہ ایک نے اکتا کہ کہا۔ "چھڈ یار۔"

دوسرا بولا "ہاں چھڈ یار۔"

چھڈیار کی یہ اتفاقیہ تحریک زور پکڑتی گئی حتیٰ کہ سب چلانے لگے۔ "چھڈیار۔"

ایک بولا۔ "خبردار! یہ فرار ہے۔"

دوسرا ہنسا۔ "فرار سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں' آنکھیں بند کر لو اور خود کو محفوظ کر لو۔"

تیسرے نے کہا۔ "خوش فہمی ایک دھوکا ہے۔"

چوتھے نے کہا۔ "خوشی کیا ہے؟ خوش فہمی۔"

پانچویں نے کہا۔ "چھڈیار۔"

"چھڈیار' چھڈیار" چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

یوں اتفاق رائے سے چھڈیار تنظیم کا فیصلہ ہو گیا۔

جب بھی ہم باہر پک نک پر جاتے ہیں' تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جائیں تو جائیں کہاں؟ یہ سوال بہت ٹیڑھا سوال ہے' جب بھی یہ سوال اٹھتا ہے۔ چھڈیار کے ارکان مچھلی منڈی کھول کر بیٹھ جاتے ہیں' تو تو' میں میں ہوتی ہے۔ ہمکا تمکا ہوتا ہے' جو تم بیزار ہوتی ہے' منہ زبانی۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب دانشور ہیں' وہ بھی اعلیٰ درجے کے۔ اس لیے آج تک ہم سب کسی بات پر متفق نہیں ہو سکے۔

ہمار لیڈر پہاڑوں کے حق میں ہے۔ وہ پہاڑوں میں پیدا ہوا' وہیں پل کر جوان ہوا۔ اس میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ پہاڑ پر یوں چڑھ جاتا ہے' جیسے بکری۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ کہ اپنی اس عظیم صلاحیت کی نمائش کرے۔ نمائش تبھی ہو سکتی ہے جب ناظرین موجود ہوں۔ چھڈ یار اسے صرف اس لیے محبوب ہے کہ اس کے لیے ناظرین مہیا کرتا ہے۔ لیکن اس کے لیے پہاڑ پر جانا از بس ضروری ہے۔ اس لیے وہ پہاڑوں پر جانے کے حق میں ہے۔ کہتا ہے پک نک سے پہاڑ نکال دو تو کوفت بن جاتی ہے۔ لہٰذا میدانی علاقے میں جانا بے معنی ہے۔

لوک رسیا سیاحت کا دیوانہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پہاڑ پتھر ہیں' پتھروں سے کیا دل چسپی۔ اصل چیز تو لوگ ہیں۔ لوگوں کو دیکھو' ان سے باتیں کرو' انہیں سمجھو۔ انجینئر بہت گھوما پھرا آدمی ہے' اس نے پاکستان کے دور دراز علاقوں کو دیکھا ہے۔ وہ سب تفصیلات جانتا ہے۔ لہٰذا ہر بات کے بیچ میں بول اٹھتا ہے' ادھر جاؤ گے تو یہ ہو گا' ادھر جاؤ گے تو وہ ہو گا۔

لیڈر کو اس بات پر غصہ آتا ہے کہ انجینئر کیوں جانتا ہے۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ جاننے کا حق صرف لیڈر کو حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ نہیں جانتا' تو بھی جانتا ہے' کیوں کہ لیڈر ہے۔

یوں راولپنڈی میں ادبی گہما گہمی اور چار یاری میں وقت گزرتا رہا۔

پھر محمد حسین اور ریڈیو کی مصروفیات تھیں۔

محمد حسین

راولپنڈی آ کر جوں جوں مجھے محمد حسین کے قریب جانے کا موقعہ ملا توں توں مجھ پر محمد حسین کے جوہر کھلے۔

محمد حسین بنیادی طور پر گونگا آدمی تھا۔ محفل میں بات کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ ویسے دیکھنے میں وہ نہایت معقول اور سنجیدہ آدمی نظر آتا تھا۔ ریڈیو کے دوسرے فنکار محمد حسین سے بالکل مختلف تھے۔ مثلاً تاج تھا' نور تھا' امیر خان تھا۔

یہ تینوں صداکار بڑے پائے کے فنکار تھے۔ تاج کو اپنی کھرج پر ناز تھا' امیر خان کو اپنی ڈیلیوری پر فخر تھا اور نور کو اپنی نوجوانی پر بھروسہ تھا۔ یہ لوگ فنکار طبیعت کے مالک تھے۔ محمد حسین طبعاً" ان سے ہٹ کر تھا' نہ اس میں تفاخر تھا' نہ جوش نہ جذبہ۔ محمد حسین کی آواز بالکل ہی معمولی نوعیت کی تھی اور شاید اسی لیے وہ چھوٹی آواز کے زیر و بم میں غیر معمولی دسترس رکھتا تھا۔ ریسرسل میں محمد حسین کا ادا کیا ہوا مکالمہ' عام سا مکالمہ سنائی دیتا تھا' لیکن جب وہ مائک کے ذریعے لاؤڈ سپیکر سے ادا ہوتا تو میں اسے سن کر حیران ہو جاتا تھا۔

محمد حسین تھیٹر میں کام کر چکا تھا۔ وہ تھیٹر کے لب و لہجہ سے پورے طور پر واقف تھا۔

ان دنوں راولپنڈی کا ریڈیو سٹیشن پشاور روڈ پر واقعہ تھا۔ ان دنوں پشاور روڈ ایک ویران سڑک تھی۔ سرشام ہی بسیں ریڈیو سٹیشن سے آگے' چوہڑ ہرپال کی طرف جانا بند کر دیتی تھیں۔

چونکہ چوہڑ ہرپال اور ریڈیو سٹیشن کے درمیان ویرانے میں غنڈے بس کو روک کر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔

رات کے گیارہ بجے ریڈیو نشریات ختم ہوتی تھیں۔ محمد حسین اور میرے پاس سواری کے لیے سائیکل تھے۔ ہم دونوں رات گیارہ بجے اپنے اپنے سائیکل نکالتے اور راولپنڈی شہر کی طرف چل پڑتے۔ راستے میں کوئی نا کوئی بات چھڑ جاتی اور ہم دونوں باتوں میں اس قدر محو ہو جاتے کہ پیدل ہی کمیٹی چوک پہنچ جاتے۔ سائیکلوں پر سواری کی نوبت ہی نہ آتی۔

روز بلا ناغہ ہم دونوں آدھی رات کے وقت ریڈیو سٹیشن سے چل کر کمیٹی چوک پہنچتے اور وہاں سے اپنے اپنے گھر کی جانب روانہ ہو جاتے۔

اندر سبھا

ایک روز محمد حسین کہنے لگا مفتی جی کچھ کریں۔

کیا کریں' میں نے پوچھا۔

کوئی ایسی بات جو عام طور پر ریڈیو پر نہیں کی جاتی۔

مثلاً' میں نے پوچھا۔

بولا' مثلاً کوئی تھیٹر کریں۔

ریڈیو پر تھیٹر کیسے ہو گا' میں نے پوچھا۔

بولا' اس کا آپ فکر نہ کریں۔

مثلاً کون سا والا تھیٹر کریں' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' مثلاً اندر سبھا کریں۔

اندر سبھا' میں نے حیرت سے محمد حسین کی طرف دیکھا۔

دسویں جماعت میں نے ڈیرہ غازی خان سے پاس کی تھی۔ میرے والد ان دنوں ڈیرہ غازی خان کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان دنوں ڈیرہ غازی خان میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی۔ انہوں نے شہر کے بڑے اہلکاروں کو اعزازی پاس دے رکھے تھے۔ میرے والد کو بھی کمپنی والوں نے ایک مستقل پاس دے رکھا تھا۔ طبعاً" والد صاحب بڑے سوشل واقعہ ہوئے

تھے۔ شہر کے بڑے اہل کاروں سے ان کا رابطہ تھا۔ وہ اکثر دوسرے اہلکاروں کے ساتھ تھیٹر دیکھا کرتے تھے۔ مجھے بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ اتفاق سے اس کمپنی میں بڑے پائے کے اداکار تھے اور وہ آغا حشر کے کھیل پیش کیا کرتے تھے۔ اس لیے میں آغا حشر کے ڈراموں سے بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ انہوں نے چار ایک بار اندر سبھا بھی پیش کیا تھا۔ اندر سبھا میں تمام تر مکالمے گیتوں کی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ چونکہ اندر سبھا ایک غنایہ ہے۔

جب محمد حسین نے اندر سبھا کا نام لیا تو مین حیرت زدہ ہو گیا۔

عقل کی بات کرو محمد حسین میں نے کہا' اندر سبھا کی بندشیں کون نکالے گا۔

اس کا آپ فکر نہ کریں' وہ بولا۔

تم گانا جانتے ہو' میں نے پوچھا۔

نہیں وہ بولا میں گا نہیں سکتا' لیکن میں اندر سبھا کے گانوں کی بندشوں سے واقف ہوں۔ آپ سکرپٹ کو ریڈیو کے مطابق ڈھال لیں' بس باقی میں سب سنبھال لوں گا۔

میں نے سکرپٹ لکھ کر محمد حسین کے حوالے کر دیا۔

سکرپٹ لے کر محمد حسین سازندوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دس پندرہ دن وہ سازندوں سے ریہرسل کرواتا رہا ایک دن کہنے لگا' آج آپ فارغ ہیں تو ذرا ہماری ریہرسل سن لیں۔

ریہرسل سن کر میں حیران رہ گیا۔ اندر سبھا کے گیتوں کی تمام دھنیں ہو بہو روایتی تھیں۔ محمد حسین نے ایسی عمدہ کاسٹنگ کی تھی اور میوزک بالکل تھیٹر کے رنگ میں ترتیب دی تھی۔

جس روز سٹیشن سے اندر سبھا نشر ہوا' تو چاروں طرف سے لوگ مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ سبھی لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اندر سبھا میں نے پروڈیوس کیا ہے۔

محمد حسین کو کریڈٹ لینے کا شوق نہ تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم فن کار تھا۔

محمد حسین کو میں نے سچے دل سے اپنا استاد مان لیا۔

آج محمد حسین اس دنیا میں نہیں ہے لیکن جب بھی میں کسی افسانے' ڈرامے یا فیچر کے مکالمے لکھتا ہوں تو محمد حسین میرے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی مدھم عجز بھری آواز میں کہتا ہے' نہیں مفتی جی یوں نہیں' اگر ووں ہو جائے تو کیسا رہے۔ اس وقت میرے دل میں احساس جاگتا ہے کہ محمد حسین نے مجھے کیا کچھ دیا ہے اور اس کی دین کا سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ آج تک

جاری و ساری ہے۔

نظام سقّہ

ایک روز محمد حسین کہنے لگا' مفتی جی مجھے ایک سٹیج ڈرامہ لکھ دیں۔

کیا کرو گے' میں نے پوچھا۔

بولا' میرا جی چاہتا ہے کہ راولپنڈی میں ایک ڈرامہ سٹیج کروں۔

کس موضوع پر ڈرامہ چاہتے ہو' میں نے پوچھا۔

بولا موضوع وضوع نہیں' مجھے نظام سقہ کا کھیل لکھ دیجئے۔

پاگل ہو گئے ہو محمد حسین' میں نے کہا' نظام سقہ کا کھیل تو ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے۔ بخاری صاحب نے خود سکرپٹ لکھا تھا۔

مجھے علم ہے' وہ بولا۔

مجھ سے کوئی نئی چیز کیوں نہیں لکھواتے۔

میں سقے کا رول کرنا چاہتا ہوں' وہ بولا۔

لوگ کہیں گے مفتی نے بخاری کی نقل ماری ہے۔

نہیں کہیں گے' وہ بولا' آپ کی لکھی ہوئی چیز کی بات ہی اور ہو گی۔

میں اسے کئی ایک دن سمجھاتا رہا لیکن وہ نہ مانا۔ کہنے لگا مفتی جی دلیل کی بات نہیں۔ چاؤ کی بات ہے' چاؤ میں دلیل نہیں ہوتی' عقل نہیں ہوتی' خالی چاؤ ہوتا ہے۔

تو نظام سقہ سٹیج کرے گا کیا' میں نے پوچھا۔

ہاں سٹیج کروں گا۔

جھوٹ موٹ کی سٹیج یا پردوں والی اصلی سٹیج پر۔

بولا پردوں والی اصلی۔

خرچہ کہاں سے لائے گا۔

میرا ایک دوست ہے پرانا۔ دلی کا دوست' اس نے پانچ ہزار کی حامی بھری ہے۔

پانچ ہزار میں بات بن جائے گی کیا۔

گزارہ ہو جائے گا۔

میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اچھا' سقہ کون سی بولی بولے گا۔

وہ میں کرلونگا' آپ سیدھی زبان لکھ دیں۔

نہیں یہ نہیں ہوتا' میں نے کہا۔

تو پھر۔

نمونے کے طور پر تو سقے کی زبان بولتا جا میں لکھتا جاتا ہوں۔

وہ بولتا گیا' میں لکھتا گیا۔ چار ایک دن میں وہ بولی یاد کرتا رہا۔

پھر ایک مہینے میں سکرپٹ تیار ہو گیا۔

میں نے کہا محمد حسین اب تو اسے ریوائز کر دے۔

کہنے لگا' یوں نہیں مفتی جی۔ جملے لکھنے سے نہیں بنتے بولنے سے بنتے ہیں۔

یہ ایک عظیم حقیقت تھی' جو میں نے محمد حسین سے سیکھی۔

کہنے لگا' جب میں ریہرسل میں بولوں گا تو فقرے آپ بیٹھ جائیں گے۔

ریہرسلوں میں فقرے بیٹھ گئے۔

پھر وہ کاسٹ کا انتظام کرنے کے لیے لاہور چلا گیا۔

دس دن کے بعد وہ چھ ایک ڈنگی چبی عورتوں کو لے کر آ گیا۔

میں نے ان خواتین کو دیکھ کر کہا' محمد حسین یہ کیا چیزیں لے آیا ہے تو۔

کہنے لگا' مفتی جی' یہ دیکھنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ تو سٹیج پر سننے کی چیزیں ہیں۔

آٹھ دس دن وہ کاسٹ کو ریہرسل کرواتا رہا۔ پھر کہنے لگا' مفتی جی اب آپ پوسٹر لگوا دیں۔

آرہا ہے' آرہا ہے

پبلسٹی کا ہم نے ایک نیا انداز سوچا تھا۔

سب سے پہلے ہم نے ایک وال پوسٹر لگایا۔ جس پر ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا' اوپر لکھا تھا' آرہا ہے' آرہا ہے۔

دوسرے پوسٹر پر لکھا تھا' پنڈی شہر میں آرہا ہے۔ نیچے جلی عبارت میں لکھا تھا' ڈھائی پہر کا

بادشاہ۔

تیسرے پوسٹر میں بات واضح کر دی تھی۔ نظام سقہ' ڈھائی پہر کا بادشاہ' ریلوے انسٹیٹیوٹ کے ہال کی سٹیج پر۔

ابھی دوسرا پوسٹر ہی لگایا تھا کہ پنڈی کی انتظامیہ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ انہوں نے چھاپا مارا اور محمد حسین اور اس کی کاسٹ کو تھانے میں لے گئے۔ تھانے سے محمد حسین نے مجھے فون کیا۔

ایس پی راولپنڈی کو یقین دلانے میں کئی ایک گھنٹے لگے کہ یہ اشتہار سٹیج ڈرامے کا ہے۔

پہلے روز پنڈی کے سرکردہ لوگوں اور اہلکاروں کے لیے ایک خصوصی اعزازی شو تھا۔ ہال کچھا کھچ بھرا ہوا تھا' وقت ہو چکا تھا' لیکن پردہ نہیں اٹھ رہا تھا۔ ہال میں سیٹیاں بج رہی تھی۔ لوگ بے چین ہو رہے تھے۔ میں سٹیج کے اندر گیا۔ دیکھا تو پہلا منظر بالکل تیار تھا۔ لیکن محمد حسین سر پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ کاسٹ نے مجھ سے شکایت کی کہ محمد حسین پردہ اٹھانے نہیں دیتا۔

محمد حسین کی حالت دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا۔ وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح سر پکڑے بیٹھا تھا۔

کیوں محمد حسین کیا ہوا۔

نہیں مفتی جی' یہ کھیل نہیں ہو سکتا' وہ بولا۔

کیوں نہیں ہو سکتا' میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں' وہ بولا' مجھ میں سکت نہیں۔ جان نکل گئی ہے۔ آپ اعلان کر دیں کہ آج کھیل نہیں ہو گا۔

میں نے محمد حسین کو بہت سمجھایا' لیکن اس کی سدھ بدھ ماری ہوئی تھی۔ باہر ہال میں لوگ آوازے کسنے لگے تھے۔

میں نے کاسٹ کو الرٹ کیا اور پھر پردہ اٹھوا دیا۔

پردہ اٹھا تو کچھ دیر کے لیے محمد حسین پھٹی پھٹی آنکھوں سے پبلک کو دیکھتا رہا۔ اس پر پبلک نے پر زور تالی بجا دی۔

تالی کی آواز سن کر فن کار جاگا اور کھیل شروع ہو گیا۔

نظام سقہ راولپنڈی کی سٹیج پر دس دن چلا۔ کھیل بہت کامیاب رہا۔ محمد حسین نے سقے کا رول اتنی کامیابی سے ادا کیا کہ شہر میں دھوم مچ گئی' لیکن اقتصادی طور پر خرچہ پورا نہ کر سکا' لہٰذا اسے بند کرنا پڑا۔ قرضوں کا ایک طومار کھڑا ہو گیا۔ جنہیں ادا کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ بڑی کوفت ہوئی۔

تبادلہ

ایک دن میں نے محمد حسین سے پوچھا۔ محمد حسین تجھے کبھی محبت بھی ہوئی ہے۔

بولا۔ ہو بھی تو میں کیا کر سکتا ہوں بھلا۔

کیوں۔ تم ایک بڑے فن کار ہو' تمہیں شہرت حاصل ہے۔

شہرت تو حاصل ہے مفتی جی لیکن ——————

لیکن کیا' میں نے پوچھا۔

بولا' خط آتے ہیں۔ خطوں میں واہ واہ ہوتی ہے۔

شہر میں جاتے ہو تو لوگ اشارے کرتے ہیں' وہ دیکھو' محمد حسین ہے۔

ہاں' وہ بولا' لوگ تحسین بھری نظروں سے دیکھتے ہیں' لیکن مفتی جی تحسین اور چیز ہے' محبت اور چیز ہے۔ لوگ فنکار کو جانتے ہیں۔ محمد حسین کو کون جانتا ہے۔

بکواس نہ کرو' میں نے کہا' میرے سوال کا جواب دو۔ تمہیں کبھی محبت ہوئی کسی سے۔

محبت تو نہیں مفتی جی' وہ بولا۔ ایک لڑکی آتی ہے ریڈیو سٹیشن پر وہ۔ مجھے اچھی لگتی ہے۔

کون ہے وہ' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا کسی بڑے خاندان کی ہے' بڑی معصوم ہے' زائد بات نہیں کرتی' سنجیدہ رہتی ہے۔

تم نے کبھی محبت کا اظہار کیا ہے۔

نہیں' وہ بولا' اس کے روبرو میں سن ہو کر رہ جاتا ہوں۔ اندر سے جان نکل جاتی ہے۔

اس زمانے میں جنس اور عورت کے متعلق میرے خیالات بڑے بے مہار تھے چونکہ وہ مغربی مشاہیر کے مشاہدات سے اخذ کیے گئے تھے۔

میں سمجھتا تھا کہ خاتون اگر شاید کہے تو مطلب ہوتا ہے ہاں' نہ کہے تو مطلب ہوتا ہے شاید اور اگر ہاں کہہ دے تو جان لو کہ وہ عورت ہی نہیں۔

پتہ نہیں میں نے محمد حسین کو کیا کیا پٹی پڑھائی کہ میری تلقین کے زیرِ اثر محمد حسین نے ایک دن سٹوڈیو میں اس معصوم لڑکی کی بانہہ پکڑلی۔ اس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا' باقاعدہ انکوائری ہوئی۔

اشفاق احمد نے منت سماجت کر کے قدرت اللہ کی سفارش کرا دی۔ جس کی وجہ سے ریڈیو کے افسران نے محمد حسین کو سزا دینے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ محمد حسین کسی صورت پنڈی سٹیشن پر نہیں رہے گا۔ لہٰذا انہوں نے محمد حسین کا لاہور تبادلہ کر دیا۔

ناقدری۔ موت

لاہور جا کر محمد حسین نے فلمی دنیا سے رابطہ پیدا کر لیا۔ فلم والے محمد حسین کی صلاحیتوں کو نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے اسے دو ایک سائیڈ رول دیئے' جو فروعی قسم کے تھے۔ فلم میں محمد حسین کی حیثیت ایک مسخرے کی بن گئی۔

گمان غالب ہے کہ اس ناقدری کی وجہ سے محمد حسین نے پینے کا شغل اپنا لیا۔ فلمی حلقوں میں صرف ایک طالش تھا جو محمد حسین کی صلاحیتوں کا احساس رکھتا تھا' وہ خود ایک بڑا فنکار تھا لیکن فلمی دنیا نے اسے بھی وہ مقام نہ دیا۔ جس کا وہ حقدار تھا۔

۱۹۶۰ء میں مجھے اشفاق کا خط موصول ہوا کہ محمد حسین بیمار ہے۔

میں لاہور پہنچا۔ اشفاق مجھے ہسپتال لے گیا۔ وہاں محمد حسین کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میں ایک نروس آدمی ہوں۔ اور کرائسس کی کیفیت کو برداشت نہیں کر سکتا' اس لیے میں لاہور سے بھاگ آیا۔

اشفاق احمد خود محمد حسین کو استاد مانتا تھا۔ چونکہ محمد حسین نے اشفاق احمد کے بیسیوں ریڈیائی ڈرامے پیش کیے تھے۔' ان ڈراموں نے تہلکہ مچا دیا تھا اور اشفاق احمد کی عظمت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے ہر ممکن کوشش کی' لیکن محمد حسین کا جگر گل کر حلوہ بن چکا تھا' اس لیے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

پی آر ڈی

دفتر میں پہلے دو ایک سال تو ڈائرکٹر صاحب مجھ پر بہت خوش رہے۔

پھر دفعتاً" بغیر کسی وجہ کے ضیاء الاسلام نے بات بات پر مجھ سے الجھنا شروع کر دیا۔ میری ہر بات پر اعتراض کرنے شروع کر دیئے۔ بڑھتے بڑھتے بات اس قدر بڑھ گئی کہ اس نے میرے خلاف رپورٹیں کرنی شروع کر دیں۔ اور میری سنیاریٹی کو نظرانداز کر کے میری ترقی روک دی' پھر مجھ پر دو سنگین کیسز کر دیئے۔

اس نے منسٹری سے مطالبہ کیا کہ میرے خلاف باقاعدہ انکوائری کی جائے۔ انہی دنوں اشفاق احمد پنڈی آیا' صورت حال دیکھ کر گھبرا گیا' کہنے لگا' اگر تو چاہے تو میں تیری سفارش کرا دوں۔

کس کی سفارش' میں نے پوچھا۔

بولا میرا ایک دوست ہے جو بڑے اونچے عہدے پر فائز ہے' تو کہے تو میں اسے کہوں کہ وزارت امور کشمیر کے سیکرٹری سے بات کرے۔

میں نے جواب دیا' اچھا ایسی بات ہے تو کروا دے سفارش۔ لیکن میرا ڈائریکٹر بڑا انتقامی اور ضدی قسم کا آدمی ہے۔ وہ وزارت کے افسروں کی بھی چنداں پرواہ نہیں کرتا۔

سیکرٹری کی بات کو کیسے ٹال سکتا ہے' اشفاق نے کہا۔

اچھا تو کرا دے سفارش' میں نے کہا۔

سفارش

دو تین مہینے گزر گئے۔ سفارش کی بات میرے ذہن سے نکل گئی۔

اس دوران میں ضیاء الاسلام نے مجھ سے دفتر کا سارا کام لے لیا اور رپورٹ کر دی کہ یہ شخص زائد ہے۔ میرے دفتر میں اس کی کوئی ضرورت نہیں' اس نے دفتر کے تمام عملے کو خبردار کر دیا کہ مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔ مجھے کوئی دفتری کاغذ نہ بھیجا جائے۔ ان دنوں دفتر میں مس فخری واحد افسر تھی' جس نے میرا ساتھ دیا۔

میرے لیے وہ دن خاصی پریشانی کے دن تھے۔ ہرچند ایک دنوں کے بعد وزارت کے افسر آ

جاتے اور انکوائری کے سلسلے میں مجھ سے جرح کرتے رہتے۔

ایک روز حکم نامہ موصول ہوا کہ ممتاز مفتی فوراً سیکرٹری وزارت امور کشمیر کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔

میں سمجھا کہ شاید سیکرٹری نے مجھے ریپریمانڈ کرنے کے لیے بلایا ہے یا شاید وارننگ دینے کے لیے۔

ان دنوں اظفر صاحب ہمارے سیکرٹری تھے۔

اظفر سیکرٹری ہونے کے باوجود ایک دیانت دار نمازی اور پرہیزگار آدمی تھا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو اس نے بیٹھے بیٹھے مجھ سے ہاتھ ملایا' بولا' تشریف رکھیے۔

آپ ممتاز مفتی ہیں' اس نے پوچھا۔

جی۔

بھئی یہ دفتر میں آپ کے متعلق اس قدر جھگڑا کیوں ہے۔

جی بہت جھگڑا ہے۔

کیوں' اس کی وجہ کیا ہے۔

مجھے علم نہیں۔

اتنی شکائتیں ہو رہی ہیں اور آپ کو علم نہیں۔

جی مجھے علم نہیں۔ میرا ڈائریکٹر میرے خلاف ہو گیا ہے۔

آخر کوئی بات ہو گی جس کی وجہ سے وہ آپ سے ناخوش ہے۔

یقیناً" ہو گی' لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔

کیا وہ آپ سے خوش بھی تھے کبھی۔

جی وہ مجھ سے بہت خوش تھے۔

یقیناً" آپ نے کچھ کیا ہو گا کہ وہ ناراض ہو گئے۔

جی میں نے کچھ نہیں کہا۔

اچھا۔ آپ نے مصالحت کی کوشش کی۔

جی نہیں۔

کیوں۔

جو شخص بغیر وجہ مخالف ہو جائے' اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے جواب دیا۔

دیکھیے جناب' اگر وہ مجھے ناراضگی کی وجہ بتاتے تو میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرتا۔

اظفر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے سر اٹھایا' کہنے لگے۔

آپ ادیب ہیں۔

جی۔

آپ قدرت اللہ شہاب کو جانتے ہیں۔

صرف نام سنا ہے۔

ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے کبھی۔

جی نہیں۔

آپ ان سے کبھی نہیں ملے۔

جی نہیں' کبھی نہیں۔

اظفر پھر خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دراز کھولا اس میں سے ایک کاغذ نکالا' بولے' قدرت اللہ شہاب نے مجھے یہ خط لکھا ہے۔

لکھتے ہیں' ممتاز مفتی میرے عزیز دوست ہیں۔ وہ آپ کے ایک ذیلی دفتر میں کام کر رہے ہیں اور بڑی مشکلات میں گرفتار ہیں' ہو سکے تو ان کی مدد کریں۔

وہ خاموش ہو گئے' پھر میری جانب دیکھا' کہنے لگے قدرت اللہ شہاب کا بیان ہے کہ آپ ان کے عزیز دوست ہیں' لیکن آپ کا کہنا ہے کہ آپ انہیں نہیں جانتے۔

جی۔ میں انہیں نہیں جانتا۔ میں نے جواب دیا۔

پھر وہ کیوں کہتے ہیں کہ آپ ان کے عزیز دوست ہیں۔ اظفر نے پوچھا۔

جناب یہ بات آپ ان سے پوچھئے کہ وہ مجھے کیوں دوست سمجھ رہے ہیں۔ اور کیوں میری سفارش کر رہے ہیں۔

ان سے بات تو میں کروں گا' اظفر نے کہا۔

اظفر ایک باکردار آدمی تھا۔ وہ دیانت دار تھا۔ ساتھ ہی منہ پھٹ تھا۔ وہ سینئر افسر تھا۔ قدرت اللہ اس کے برعکس جونیئر افسر تھا' اسے اس لیے اہمیت حاصل تھی کہ وہ صدر کا سیکرٹری لگا ہوا تھا۔ اظفر' شہاب کی اس حوالے کی اہمیت سے متاثر نہ تھا' اس لیے گمان غالب ہے کہ اظفر نے مجھ سے ملاقات کے بعد شہاب کو فون پر زبردست ڈانٹ پلائی ہے۔

اظفر سے ملاقات کے بعد مجھے یاد آیا کہ شاید اشفاق کے کہنے پر شہاب نے میری سفارش کی ہو۔ اس خیال پر مجھے اپنے رویے پر بڑی ندامت ہوئی لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میرے لیے قدرت اللہ شہاب سے ملنا ہمیشہ کے لیے ناممکن ہو چکا تھا۔

تیئسواں باب

نیم چھتی میں کالی بلی

راولپنڈی آجانے کے بعد بھی اشفاق سے میرے تعلقات جوں کے توں قائم تھے۔

جب بھی میں لاہور جاتا تو اشفاق کے ہاں ٹھہرتا تھا۔

۱۹۴۹ء میں اشفاق نے گورنمنٹ کالج میں ایم۔ اے کے لیے داخلہ لے لیا تھا۔

نیم چھتی ویران ہو چکی تھی۔ زوبی پینٹنگ کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے روم جا چکا تھا۔ اوپن ایئر تھیٹر واپس سرکاری تحویل میں جا چکا تھا۔ اس لیے اشفاق کی زندگی' کالج اور نیم چھتی تک محدود ہو چکی تھی۔ سارے لاہور میں اشفاق کا کوئی دوست نہ تھا۔ صرف دو افراد تھے جن کی نیم چھتی میں رسائی تھی' محمد حسین اور میں۔

اشفاق سارا دن نیم چھتی میں یوں پڑا رہتا' جیسے بھینس جوہڑ کے کیچڑ میں لت پت پڑی رہتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ بھینس لت پت کے عالم میں خوش رہتی ہے' اشفاق نیم چھتی میں دبی دبی آہیں بھرتا رہتا تھا اور ساتھ ساتھ مطالعہ میں مصروف رہتا۔

جب بڑے خان گھر پر نہ ہوتے تو نیچے خان منزل میں ہڑبونگ مچ جاتا' شور شرابا' کھیل کود' قہقہے۔ بلی کے جانے کے بعد چوہے دھما چوکڑی مچاتے۔ ان کے شور کی آوازیں نیم چھتی تک پہنچتی۔ اشفاق کے کان کھڑے ہو جاتے' لیکن وہ حتی الوسع نیچے خان منزل میں قدم نہ دھرتا تھا۔

نہ ہی کبھی اس کے دل میں شوق پیدا ہوا تھا کہ وہ نیچے جاکر گھر والوں کی دھماچوکڑی میں حصہ لے۔

اشفاق کی والدہ خود اس کا کھانا لے کر نیم چھتی میں آتی تھی۔ وہ اشفاق کی منتیں کرتی کہ چل نیچے چل' وہ سب تیرا انتظار کر رہے ہیں' لیکن اشفاق اسے ٹال دیتا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اشفاق نیم چھتی میں راہن کروسو کی زندگی گزارنے پر کیوں مصر تھا۔

دو اشفاق

اشفاق کی شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔

ایک وہ اشفاق جو سارا دن نیم چھتی میں پڑا آہیں بھرتا رہتا' یا اس کمرے میں' بے مقصد آوارہ چہل قدمی کرتا رہتا' جیسے وہ کمرہ نہیں بلکہ دشت کا ایک حصہ ہو۔

دوسرا وہ اشفاق جو باتوں کا رسیہ تھا۔ باتوں کے جھاڑ فانوس سجاتا۔ ممکری یا نقال کے جوہر دکھانے کے لیے بے تاب رہتا' ڈرامہ کھیلتا' ڈگڈگی بجاتا اور لوگوں کو مسحور کر دیتا۔

پتہ نہیں لگتا تھا کہ کون سا اصل ہے اور کون سا نقلی۔

سارا دن نیم چھتی میں چپ چاپ پڑا رہنے کے بعد' وہ اپنی پسواج پہنتا اور ہونٹوں پر تبسم سجا کر کالج چلا جاتا۔

پھر آہستہ آہستہ نیم چھتی کی فضا مزید مکدر ہوتی چلی گئی' خاموشی اور گہری ہوتی گئی' آہوں میں کراہیں شامل ہوتی گئیں' کتابیں گرد آلود ہوتی گئیں' اشفاق احمد کی بادیہ پیمائی بڑھتی گئی۔

محمد حسین نے ایک روز مجھے الگ لے جاکر کہا' مفتی جی یہ اشفاق کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔

کیا ہوتا جا رہا ہے' میں نے پوچھا۔

کچھ ہوتا جا رہا ہے' وہ بولا۔

محمد حسین عظیم فنکار تھا۔ اسے مکالمے ادا کرنے میں کمال حاصل تھا۔ وہ آواز کے ایسے ایسے شیڈ نکالتا تھا کہ مکالمے میں جان پڑ جاتی تھی' اشفاق اور میں' ہم دونوں محمد حسین کے فن کے مداح تھے' لیکن محمد حسین کی یہ صلاحیت صرف سٹیج اور مائیک تک محدود تھی۔ عام زندگی

میں وہ ایک گونگا فرد تھا۔ اسے بات کرنی نہیں آتی تھی۔ بات کا مفہوم سمجھانا مشکل تھا۔

کیا ہوتا جارہا ہے‘ میں نے پوچھا۔

آپ تو وہ ایک دن رہ کر پنڈی چلے جاتے ہیں‘ میں تو اشفاق کو اکثر ملتا رہتا ہوں۔

پھر تم نے کیا دیکھا۔

پتہ نہیں کیا ہے‘ پر کچھ ہے‘ اشفاق وہ اشفاق نہیں رہا۔

تم نے اس سے پوچھا نہیں کیا‘ میں نے کہا۔

بے کار ہے‘ وہ بولا۔

کیوں‘ میں نے پوچھا۔

مجسمہ

آپ تو جانتے ہی ہیں‘ اشفاق دل کی بات کسی سے نہیں کہتا۔ پہلے میں نے اس بات کو پورے طور پر نہیں جانا تھا کہ اشفاق دل کی بات کسی سے نہیں کہتا۔

میں بھی اشفاق کی باتوں اور محفل آرائی سے اس قدر متاثر تھا کہ میں نے اس کے دوسرے پہلو کو قطعی اہمیت نہ دی تھی۔

زوبی نے جب اوپن ائر تھیئٹر میں اشفاق کا مجسمہ بنایا تھا‘ تو میں اسے دیکھ کر پنجے جھاڑ کر زوبی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

میں نے کہا‘ زوبی یہ کیا بنایا ہے تو نے۔

مجسمہ ہے‘ وہ بولا۔

کس کا مجسمہ ہے یہ۔

اشفاق احمد کا ہے۔

میں نہیں مانتا‘ میں نے غصے سے کہا۔

نہ مانو‘ وہ بولا‘ میں کب کہتا ہوں کہ مانو۔

یہ اشفاق کا مجسمہ نہیں ہو سکتا۔

اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔

تم دیکھتے نہیں چہرے کی تمام لائنیں نیچے کی طرف ڈھلک رہی ہیں۔

ہاں نیچے گر رہی ہیں۔

تم نے تو اسے دکھی بنا دیا ہے۔

اچھا' دکھی بنا دیا ہے۔

بھئی وہ تو باغ و بہار آدمی ہے۔

مجھے نہیں پتہ' وہ بولا' مجھے تو جیسے دکھائی دیا ویسا بنا دیا۔

بڑی دیر کے بعد مجھے پتہ چلا کہ واقعی زوبی نے ٹھیک مجسمہ بنایا تھا۔ اشفاق حقیقتاً ایک اداس' دکھی' چپ شخصیت کا مالک ہے۔ وہ دل کی بات کسی سے نہیں کہتا' چاہے وہ کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔

وہ راز داں بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا' اکیلا تنہا۔

کالی بلی

مفتی جی' محمد حسین بولا' کوئی محبت وحبت کا جھنجھٹ تو نہیں پال بیٹھا۔

نہیں' میں نے جواب دیا' یہ بات نہیں۔

شاید ہو' وہ بولا۔

محمد حسین' میں نے جواب دیا' اشفاق کو لڑکیوں کا شوق نہیں ہے۔ وہ عاشق مزاج نہیں ہے۔ الٹا وہ تو خود محبوب طبیعت کا مالک ہے۔ اچھا یہ بتا محمد حسین۔

جی' وہ بولا۔

تجھے کیسے خیال آیا کہ محبت کا جھنجھٹ ہے۔

محمد حسین اس سوال کو سن کر گھبرا گیا۔ کہنے لگا جی وہ جو کالی بلی ہے اسے دیکھ کر میں نے سوچا شاید۔

کالی بلی' کون سی کالی بلی۔

ایک کالی بلی ہے۔ پتہ نہیں کس کی ہے۔ کہاں سے آتی ہے۔ وہ بلی نیم چھتی میں آتی ہے۔ اشفاق اس کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے دودھ منگوا کر رکھتا ہے۔ جب وہ آتی ہے تو

اس کو بڑے شوق سے دودھ پلاتا ہے' پھر اسے گود میں لٹا کر اس پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے۔

میری ہنسی نکل گئی' اس سے کیا پتہ چلتا ہے۔

نہیں' محمد حسین بولا' جب وہ بلی پر ہاتھ پھیر رہا تھا تو خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے ہاتھ تلے بلی نہیں کوئی اور ہو۔

محمد حسین سچ کہتا تھا۔ میں نے بھی محسوس کیا تھا جیسے بلی محض ایک علامت ہو۔

چوکی بھری' چٹی سفید

مجھے پتہ تھا کہ اگر میں نے کھل کر بات کی تو وہ گھبرا کر خود کو سمیٹ لے گا' جیسے کچھوا خطرے کے وقت اپنا سر خول میں چھپا لیتا ہے' اس لیے میں نے بائی دی وے پوچھا۔

میں نے کہا' یار تیرے گھر والے تیری شادی کا سوچ رہے ہیں۔

وہ چونکا' سچ' تجھے کیسے معلوم ہوا۔

میں نے کہا' پیچھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے جھوٹ بولا۔

کیا واقعی' وہ گھبرا گیا' پھر آہ بھر کر بولا' وہ اپنا چاؤ پورا کر کے رہیں گے۔

وہ تجھ سے مشورہ نہیں کریں گے کیا' میں نے پوچھا۔

کیا فرق پڑتا ہے' وہ بولا۔

کیوں تمہاری رضامندی سے ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

تو نہیں سمجھتا' وہ آہ بھر کر بولا۔

تو سمجھا نا مجھے۔

خاندان میں سے کوئی لڑکی چن لیں گے۔

تمہارے خاندان میں کوئی خوبصورت لڑکی نہیں ہے کیا۔

ساری ہی خوبصورت ہیں' چٹا سفید رنگ' چوکی بھر جاتی ہے۔

کیوں چٹے سفید رنگ کو کیا ہے۔ میری تو جان نکلتی ہے ہر چٹے سفید رنگ پر۔

مجھے زہر لگتا ہے' اس نے جھر جھری لے کر کہا۔

تو خاندان سے باہر کی لڑکی سے کر لینا۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کیوں' میں نے پوچھا۔

خاندان سے باہر کی لڑکی وہ کبھی قبول نہیں کریں گے' اس نے مایوسی بھرے انداز میں کہا' تجھے نہیں پتہ ممتاز ہم پٹھان ہیں پٹھان' غیرت کے مارے ہوئے' ناموس کے دیوانے' ضدی' ہٹ دھرم'

ظاہر تھا کہ اشفاق اپنے خاندان سے باہر شادی کرنے کا متمنی تھا اور کوئی خصوصی خاتون زیر توجہ تھی۔

اشفاق کی شادی کے متعلق میں نے اشفاق کی شخصیت میں مختصر سا تذکرہ کیا تھا۔ اقتباس درج ذیل ہے۔

ایک آنہ

جنس کے لحاظ سے مرد کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو جذبات کے دریچے کھولے بغیر جنس کے ایوان میں چہل قدمی کرنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ کہ جب تک جذبات کے برآمدے میں چہل قدمی نہ کریں' جنس کی کوٹھڑی میں داخل نہیں ہوتے اور تیسرے وہ کہ جذبات کے پھول کھل بھی جائیں تو بھی جنس کے کانٹوں میں الجھنے سے گھبراتے ہیں۔

اشفاق احمد تیسری قسم سے تعلق رکھتا تھا۔

ان دنوں اشفاق احمد کی آرزو تھی کہ شوخ اور طرح دار لڑکیوں کو اپنی باتوں کے رنگین جال پھینک کر اپنی طرف متوجہ کرے۔ انہیں متاثر کرے۔ اشفاق کو علم نہ تھا کہ لڑکی چھڑ جائے تو کیا ہوتا ہے۔ اشفاق سلگن ہے' وہ صرف سلگنا جانتا ہے' بھڑک کر جلنا نہیں۔ اس کے برعکس لڑکی کا مطالبہ ہوتا ہے کہ بھڑک کر جلو۔ اس لیے اشفاق قرب سے خائف تھا' وہ فاصلہ برقرار رکھنے کا متمنی تھا۔ خود کو محفوظ رکھنے کا خواہشمند تھا' نسائی نفسیات کے مطابق فاصلہ نہیں بلکہ قرب محفوظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اشفاق کے لیے فاصلہ محفوظ تھا' وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور تھا۔

زندگی میں اشفاق دو مرتبہ پیچھے ہٹا تھا' الٹے پاؤں بھاگا تھا' ہونکتا ہوا نیم چھتی میں پہنچا تھا'

سچے دل سے باتوں کے جال بننے سے توبہ کی تھی۔ لیکن باتوں کے جال بننے پر وہ ازلی طور پر مجبور تھا۔ بار بار توبہ ٹوٹی۔

پھر گورنمنٹ کالج میں ایک محترمہ منظر خاص پر آ گئی۔

وہ محترمہ بڑی چترکار تھی۔ اوپر سے جدید' اندر سے قدیم' اوپر سے سادمرادی' اندر سے بن ٹھن' اوپر سے ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ' اندر سے جذباتی ہلچل' اوپر ذہن ہی ذہن' نیچے دل ہی دل۔ وہ محترمہ درو پدی اور گیشیا کا سنگم تھی۔

وہ محترمہ متاثر ہو کر پیچھے ہٹنے کی عظمت سے واقف تھی۔

وہ محترمہ ان مشرقی خواتین میں سے تھی جو پیچھے ہٹنے والے مردوں کو پہچانتی ہیں اور خود پیچھے ہٹ کر انہیں پیچھے ہٹنے کی خفت سے بچا لیتی ہیں۔

پھر ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔

سیانے کہتے ہیں بڑے واقعات چھوٹی سی بات سے جنم لیتے ہیں۔

ایک روز محترمہ کالج کے برآمدے سے گزر رہی تھی۔

اشفاق نے سوچا' کوئی منفرد بات کر کے توجہ طلب کروں۔ اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک آنہ صرف ایک آنہ۔ کس لیے؛ محترمہ نے پوچھا۔

سگریٹ پیوں گا۔

محترمہ نے پرس کھولا ایک انی ہتھیلی پر رکھ دی۔

بس پھر کیا تھا پنڈورا کا بکس کھل گیا۔

بات چل نکلی۔ اشفاق سارا دن موقعہ ڈھونڈتا کہ ہاتھ پھیلائے۔

محترمہ بھی منتظر رہنے لگی' پھر اہتمام کرنے لگی کہ ٹوٹی انی جیب میں موجود رہے۔ بات بڑھی تو محترمہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگی۔

اشفاق اس فکر سے آزاد ہو گیا کہ اب کیا ہو گا۔ اس لیے وہ آگے بڑھنے لگا' اور آگے' اور آگے۔ اس کے لیے یہ انوکھا تجربہ تھا جس میں آگے بڑھنے کی لذت تو موجود تھی لیکن فاصلہ کم ہونے کا خدشہ نہ تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے واپسی ممکن نہیں رہتی۔

ان تفصیلات کا علم مجھے بعد میں ہوا۔

اشفاق کی خاموش سسکن اور دبی ہوئی آہوں کو دیکھ دیکھ کر محمد حسین اور میں کڑھتے رہے۔ محمد حسین بار بار کہتا' مفتی جی کچھ کرو۔

میں نے کہا اتا پتا چلے تو۔

محمد حسین بولا' یہ آجکل نہروالے بنگلے پر جاتا ہے۔

پھر ایک روز نہروالے بنگلے کا راز کھل گیا۔

مجھے کہیں جانا تھا۔ اشفاق بولا' میں تجھے چھوڑ آتا ہوں' راستے میں مجھے ایک چھوٹا سا کام ہے۔

ہم دونوں موٹر سائیکل پر چل پڑے۔ نہروالے بنگلے پر اس نے مجھے نہر کے کنارے اتار دیا کہنے لگا تو یہاں انتظار کر میں ابھی آیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ باہر نکلا تو کھڑکی میں شیشے کے پیچھے کالی بلی کھڑی تھی۔

جب اشفاق سکوٹر پر سوار ہونے لگا تو میں نے سرسری انداز میں کہا' یہاں مسز چٹھہ رہتی ہے کیا۔

اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا' تجھے کیسے پتہ چلا۔

باہر تختی جو لگی ہے۔

مسز چٹھہ

مسز چٹھہ کو میں جانتا تھا۔

وہ محکمہ تعلیم پنجاب میں بڑی افسر تھی۔

میں نے بارہ سال محکمہ تعلیم پنجاب میں ٹیچر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ ہیڈ آفس میں نے مسز چٹھہ کو دو ایک بار دیکھا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ ناک تلوار کی دھار تھی۔ خدوخال میں اس قدر کرختگی تھی کہ ملائمیت کا نام و نشان نہ تھا۔ دفتر کا چھوٹا سٹاف اس کے نام پر تھر تھر کانپتے تھے' وہ بلا کی ڈ-سپلی نیرین تھی۔ جب وہ میکلیگن کالج کی پرنسپل بنی تھی' تو کالج کی لڑکیاں بھتنیاں بنی ہوئی تھیں' چھ مہینے کے اندر مسز چٹھہ نے ان کا سارا بھوت نکال دیا اور کالج پر سناٹا

چھا گیا۔

تقسیم سے پہلے میری ماں نے بٹالے میں اپنے گھر کی نچلی منزل میں لڑکیوں کا ایک سکول کھول رکھا تھا۔ مقصد صرف مصروفیت تھی۔ میری ماں ازلی طور پر ایک کامی تھی۔

یہ سکول جیسے کیسے سات آٹھ سال چلتا رہا۔ پھر پتہ نہیں کیسے امدادی لسٹ پر آگیا۔ اور سکول کو باقاعدہ ایڈ ملنے لگی۔ اس کے بعد محکمہ تعلیم کے افسر سکول کا معائنہ کرنے کے لیے آنے لگے۔

ایک بار مسز جنتھہ بھی آئیں۔

اس روز سے اماں مسز جنتھہ کی مداح بن گئی۔ اماں کی زبانی مسز جنتھہ کی تعریفیں سن سن کر ہمارے کان پک گئے۔

اماں مسز جنتھہ کے ذکر پر سبحان اللہ' سبحان اللہ کا ورد کرنے لگتیں۔ کہتی' افسر ہو تو' ایسا ہو' پانچ وقت کی نمازن ہے۔ ساری تنخواہ غریبوں کو خیرات دینے میں خرچ کر دیتی ہے۔ اور اس کا گھر ——— ایسا گھر ہے جہاں سے اسلام کی خوشبو آتی ہے۔

تقسیم کے بعد اماں کہنے لگی ممتاز تجھے پتہ ہے' جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا کشت و خون ہو رہا تھا تو مسز جنتھہ گورداسپور سے بھاگی نہیں بلکہ مسلمانوں کی جانیں بچانے کے لیے ڈٹ کر وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے جوان بیٹے کو ایک جیپ اور بندوق دلا دی۔ ایک ڈرائیور کا انتظام کر دیا اور کہا جاؤ بیٹا یہ جہاد کا وقت ہے سڑک پر جاؤ اور مسلمانوں کی جانیں بچاؤ۔

پھر جب لولی لاج میں میری ہمشیرہ کی شادی ہو رہی تھی۔ اور گھر والوں نے لولی لاج پر حملہ کر دیا تھا اور پولیس نے آکر ہمارے مکان کا گھیراؤ کر لیا تھا تو اماں دوڑی دوڑی میرے پاس آئی تھی' بولی' تجھے پتہ ہے ممتاز مہمانوں میں مسز جنتھہ کی بیٹی بھی آئی ہے اس کا بھائی باہر کھڑا ہے کہ ہمیں مدد کی ضرورت ہو تو وہ کام آئے۔ اماں کے کہنے پر میں نے ایک نگاہ بانو قدسیہ پر ڈالی تھی۔

مجھے ایسے لگی جیسے ہندنی ہو۔ ماتھے پر بندی نہیں تھی۔ لیکن دکھتی تھی۔

مجھے کیا پتہ تھا یہ لڑکی ایک روز کالی بلی بن کر اشفاق کی نیم چھتی میں آکر براجمان ہو جائے گی۔

اماں کی اس حمد و ثنا کے باوجود میرے ذہن میں مسز جنتھہ کی ناک کی دھار ویسے ہی تیز

رہی۔

میں نے محمد حسین سے کہا' یار اس معاملے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ خاتون مسز چنبھہ کی بیٹی ہے اور مسز چنبھہ اشفاق کو کبھی قبول نہیں کرے گی' اشفاق کے ماں باپ کی رضامندی کے بغیر ——— اونہوں' وہ تو جوتے مار کر ہمیں گھر سے نکال دے گی۔

پھر اشفاق روم چلا گیا۔

دو سال کے بعد واپس آیا تو ہمارا خیال تھا کہ روم کی گہما گہمی میں دھیان کسی اور طرف لگ جائے گا اور بات آئی گئی ہو جائے گی۔ لیکن اشفاق نے آتے ہی کلی بلی کی تلاش شروع کر دی۔

دراصل اگر اشفاق بھانبڑ ہوتا تو دو سال میں بھڑ بھڑ کر کے راکھ ہو جاتا' لیکن وہ تو سلگن تھا۔ سلگن ایک نسائی خصوصیت ہے وہ تو لگی رہتی ہے۔ ادھر بانو قدسیہ بھی خاتون تھی' مشرقی رنگ کی خاتون' دونوں ہی سلگن تھے۔

یہ دیکھ کر محمد حسین از سر نو سلگنے لگا' مفتی جی کچھ کرو' مفتی جی کچھ کرو' مفتی جی کچھ کرو' میں ازلی احمق ہوں۔ دوسروں کے پھڈے میں ٹانگ اڑانا میری پرانی عادت ہے۔

اندر سے' اوپر سے

میں نے ایک دن اشفاق کی ماں سے بات کی' میں نے کہا' اماں' تو اس کی شادی کیوں نہیں کرتی۔

وہ بولی' میں تو آج کر دوں۔ یہ مانتا نہیں۔

میں نے کہا' جہاں یہ چاہتا ہے وہاں کر دے۔

بولی خاندان سے باہر نہیں ہو سکتی۔

اشفاق کی ماں سے میری چار ایک ملاقاتیں ہوئیں۔

پہلے تو وہ میری بات سننے کی روادار نہ تھی۔

آہستہ آہستہ وہ مائل بہ کرم ہوتی گئی۔

میں نے کہا اماں تیرا پتر تو پڑا پڑا گل سڑ جائے گا۔

بولی گل گیا ہے' میں دیکھتی ہوں' دکھتی ہوں۔

تو پھر کچھ کراماں۔

بولی میں کیا کر سکتی ہوں' میری کون سنتا ہے' اس گھر میں۔

میں نے کہا' اماں تو اس گھر میں اتنے سارے جنوں کو سنبھالتی ہے' کوئی ایسی چالاکی کر کہ بات بن جائے۔

وہ بولی' نہیں بڑے خان نہیں مانیں گے۔

میں نے کہا' کوئی مانے نہ مانے اگر تو مان جائے تو ہم کر دیں گے۔

وہ بولی' مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔

میں نے کہا' دیکھ اماں تو ایک بار سچے دل سے کہہ دے کہ ہاں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ نیک کام کردو۔

بولی اندر سے تو تمہارے ساتھ ہوں اوپر سے نہیں' مجبور ہوں۔

میں نے کہا ٹھیک ہے ہمیں اوپر کی پرواہ نہیں۔ دل سے ہمارا ساتھ دے بس۔

ککھو

اشفاق احمد کے بہت سے بھائی ہیں۔ سارے ہی ٹیلنٹڈ ہیں' فرق یہ ہے کہ اشفاق کی ٹیلنٹ کا رخ اور ہے۔ اس لیے وہ سارے خاندان سے وکھرا ہے' یوں جیسے راجپوتوں میں براہمن ہو۔

اشفاق کا ایک بھائی جسے ہم ککھو کہتے تھے منفرد کردار کا مالک تھا۔ طاقت ور' دلیر' ان جھک' منہ پر بات کہہ دینے والا' کڑوی سے کڑوی بات کہہ دینے والا۔ ڈانٹ کر بات کرنے کا عادی' دنیا داری سے بے پرواہ' بات کا پکا' غنڈا' سچ کا ساتھ دینے والا۔ ککھو ایک منفرد اور عظیم کردار کا مالک تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے ککھو سے بات کی۔

نہیں' وہ چلا کر بولا۔ میں شفو کی زندگی تباہ ہونے نہیں دوں گا۔ گھر والے نہیں مانتے تو نہ مانیں۔

میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کوئی تمہاری جانب کیڑی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔

ٹھکو نے ہمیں ہمت عطا کی اگر ٹھکو نہ ہوتا تو اشفاق کے گھر میں آج گلابی اور چٹے سفید جسم سے ایک چوکی بھری ہوتی۔

مسز جنبھہ کی ناک کی دھار کو بانو قدسیہ نے کند کر دیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سمن آباد کے ایک کوارٹر میں ایک رات مولوی صاحب بیٹھے' اشفاق اور قدسیہ کا نکاح پڑھ رہے تھے' محمد حسین اور میں تھر تھر کانپ رہے تھے کہ بڑے خان پولیس لے کر نہ پہنچ جائیں۔ باہر ٹھکو کھڑا ہمیں حوصلہ دے رہا تھا۔ مرد بنو وہ کہہ رہا تھا' حوصلہ رکھو۔ جب تک میرے دم میں دم ہے تمہاری طرف کوئی کیڑی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔

چوبیسواں باب

دُعا

عزیز ملک

عزیز ملک کو میں نے حلقہ ارباب ذوق میں چار ایک بار دیکھا تھا۔ وہ حلقے کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ وہ راولپنڈی کا مانا ہوا نثر نگار تھا۔ اس کی تحریریں روایتی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں' لیکن بڑی طرحدار اور جاذب توجہ تھیں۔

شخصیت کے لحاظ سے عزیز ملک خاصہ سوکھا آدمی تھا۔ بھیگتا نہیں تھا' اخلاق کا رسیہ تھا۔ رسمی اخلاق اور بس' ایک روز یوسف ظفر نے کہا' چلو ملک کے پاس چلتے ہیں' جانے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا لیکن یوسف ظفر کی بات کو ٹالنا بہت مشکل تھا۔

راولپنڈی صدر کے گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے ہم ایک پرانی حویلی میں پہنچے۔ عزیز ملک بڑے تپاک سے ملا۔ دو گھنٹے ہم ملک کے پاس بیٹھے رہے۔ اس روز ملک کے اخلاق میں بھیگ تھی' باتوں میں روانی تھی' خلوص تھا' اگرچہ انداز میں مٹھاس تھی' لیکن ایسے معلوم پڑتا تھا جیسے نیچے بلا کی تلخی ہو' جیسے راکھ کے نیچے انگارے دبے ہوئے ہوں۔ اس گفتگو کے دوران مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک معروف حکیم کا بیٹا ہے۔ طور حکمت میں بڑی دسترس رکھتا ہے مذہب کے متعلق

خواجہ جان محمدؒ بٹ



۲۴۔ دُعا
۲۵۔ مردِ قلندر
۲۶۔ وہ اللہ، یہ اللہ
۲۷۔ بھائی جان



عزیز ملک



غلام دین دانی



راجہ شفیع



حاجی رفیع الدین دہلوی

خواجہ جان محمد بٹ (بھائی جان)



راجہ شفیع ، ممتاز مفتی ، عزیز ملک ، غلام دین وانی

اس کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ ادب' حکمت اور اسلام کے متعلق وہ بے تکان گفتگو کر سکتا تھا۔ میرے دل میں عزیز ملک کی عزت پیدا ہو گئی۔

ایک روز عزیز ملک مجھ سے آکر ملا' کہنے لگا معلوم ہوتا ہے آپ پریشان ہیں میں نے کہا' ہاں' ہوں۔ اس پر میں نے ملک کو دفتر کے متعلق تمام حالات بتا دیئے۔ میری بات سن کر وہ بہت متاثر ہوا' کہنے لگا اگر آپ چاہیں تو میں کسی بزرگ سے درخواست کروں کہ آپ کے لیے دعا کریں۔

کہنے کو تو میں نے ہاں کہہ دیا' لیکن ان دنوں نہ میں بزرگ کے مفہوم سے واقف تھا' نہ دعا کی طاقت کا شعور رکھتا تھا۔

تین بزرگ

بزرگ کا لفظ پہلی مرتبہ میں نے جالیہ کے گھر میں سنا تھا۔ جالیہ میری قریبی عزیزہ تھی۔ پتہ نہیں اس کا نام کیا تھا۔ سبھی جالیہ کہہ کر بلاتے تھے۔ جالیہ کے گھر میں اس کی بیٹیوں اور ان کے بچوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی' یوں جیسے لٹے پٹے ہوئے مہاجروں کا کیمپ ہو۔ اس بھیڑ کے باوجود سارا گھر جالیہ سے بھرا ہوا تھا' یوں جیسے جالیہ کے سوا کوئی رہتا ہی نہ ہو۔

جالیہ کا چوڑا چکلا سرخ و سفید چہرہ' لمبی سیاہ چمکدار اور چاروں طرف لٹکی ہوئی زلفوں میں' یوں دمکتا تھا' جیسے انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے ہوں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب مستی بھری چمک تھی۔ آواز میں ایسی کھنک تھی کہ جب وہ بولتی تو شلفوں پر سجے ہوئے برتن جل ترنگ بجاتے۔

داتا

جالیہ سارا دن ایک کوٹھڑی میں چارپائی پر بیٹھی رہتی تھی' سر کی چادر ڈھلک جاتی' گلے اور ہاتھوں میں موتیے کے ہار ابھر ابھر نکلتے' کوٹھڑی خشبو سے بھری بھری رہتی۔ ہاتھ کی تسبیح دانہ دانہ چلتی رہتی۔ ہر چند ساعت کے بعد جالیہ کا پر رعب والہانہ نعرہ گونجتا ———— داتا ———— سارا گھر سہم جاتا۔ گھر پر خوف نہیں رعب طاری ہو جاتا' پتہ نہیں داتا کا یا

جالیہ کا۔

جالیہ کی کوٹھڑی سے صرف دو آوازیں گونجتی تھیں ایک نعرہ' دوسرا قہقہہ۔ یہ قہقہہ عجیب تھا' اس میں تمسخر نہ تھا' مسرت نہ تھی' مستی نہ تھی۔ انا سے محروم۔ اس قہقہے میں بے نیازی ہی بے نیازی تھی۔ جب بھی کوئی جالیہ سے کسی کی شکایت کرتا یا بدقسمتی کا رونا روتا تو جواب میں وہ ایک بھرپور قہقہہ لگاتی' یوں جیسے وہ شکوہ کرنے والے یا بدقسمتی کا رونا رونے والے کو چھوٹی چھوٹی محرومیوں اور رنجشوں سے بے نیاز ہونے کی دعوت دے رہی ہو۔ کہہ رہی ہو' چھوڑو' ہٹاؤ' یہ رام لیلا' ایسی ہی ہے۔ یہ کلفتیں ہی تو اس پنگھٹ کی رنگ پچکاریاں ہیں۔ کھیلنے والا ہولی کھیل رہا ہے۔ کھیلنے دو' اسے کھیلنے دو۔ جس رنگ میں چاہے کھیلے۔ اس کھیلن میں ہی جیون ہے' اس کے کھیلن کی وجہ سے ہی دھرتی ہری بھری ہے۔

یہ واقعہ ۱۹۲۱ء کا ہے جب میں جالیہ کے گھر میں پناہ گزین کی حیثیت سے گیا تھا۔

۱۹۲۱ء میں میٹریکولیشن کر کے میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گیا تھا۔ ابا نے مجھے ریواز ہاسٹل میں ایک سیٹ دلوا دی تھی۔ لیکن ہاسٹل میں رہنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ چاروں طرف گلیور ہی گلیور تھے۔ جن کے درمیان ڈرا ہوا' سہا ہوا' ایک بالشتیہ۔

اس زمانے میں اسلامیہ کالج میں لڑکے نہیں بلکہ چودھری اور وڈیرے پڑھا کرتے تھے' اونچے لمبے' بڑی بڑی مونچھیں' کلف دار طرے' جب وہ گاؤں سے لاہور آتے تو تانگے کے پائیدان پر ایک کامی حقہ پکڑے بیٹھا ہوتا۔ ہوسٹل میں ایک کامی مٹھی چاپی کے لیے ساتھ رہتا' پاجامے کی جگہ چادر بندھی ہوتی' بے تکلف کھجاتے' قہقہے لگاتے' مونچھ مروڑتے' بے رحم نگاہوں سے گھورتے' ایسی گھوری کہ دم رک جاتا' جان نکل جاتی۔

ایک ڈرا ہوا' سہا ہوا' اکیلا' نوکرانی کا بیٹا' بھلا ان گلیوروں کے ساتھ کیسے رہ سکتا تھا۔ اس لیے میں ہوسٹل سے بھاگ آیا تھا۔ اور جالیہ کے گھر پناہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جالیہ کا گھر بھاٹی دروازے میں تھا اور بھاٹی دروازہ' ہیرا منڈی کی شاہراہ تھا۔ ان دنوں ہیرا منڈی میں گھومنا پھرنا معیوب نہ تھا الٹا فیشن میں تھا۔

ایک دن میں نے جالیہ کی بہو سے پوچھا' یہ داتا کا نعرہ کیوں لگاتی ہے۔ یہ داتا کی بالکی ہے نا'

وہ بولی۔

داتا کون ہے' میں نے پوچھا۔

لاہور کا بڑا بزرگ ہے' اس نے کہا۔ ہر جمعرات یہ اس کے مزار پر جاتی ہے۔ داتا کا مزار ہمارے گھر کے سامنے ہی تھا۔ ایک روز میں مزار کی طرف چل پڑا۔ چھوٹے بازار میں داتا پر ایک رسالہ مل گیا' اسے لے کر میں گھر آ گیا' رات بھر پڑھتا رہا۔ پتہ چلا کہ داتا ایک سخی آدمی تھا۔

اتفاق کی بات ہے جس روز میں مزار پر گیا وہ جمعرات کا دن تھا۔ ان دنوں ہیرا منڈی کی گنی چنی طوائفیں ہر جمعرات کو جلوس کی صورت میں داتا کے دربار جایا کرتی تھیں۔ راستے میں یہ جلوس مجھے مل گیا میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں جلوس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ مزار پر پہنچ گیا' لیکن دربار میں نہ پہنچا۔

اس کے بعد میں ہر جمعرات کو مزار پر پہنچتا' لیکن دربار میں حاضری نہ ہوتی۔ شاید داتا نے اپنی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے اس جاذب نظر جلوس کو کام پر لگا رکھا ہو۔

حاجی صاحب

دوسرے بزرگ کا تذکرہ اماں کرتی رہتی تھی۔ ان کا نام حاجی رفیع الدین تھا۔ دلی میں بلیماراں محلے میں رہتے تھے۔ سلسلہ چشتیہ تھا۔ انہیں سبھی حاجی صاحب کہہ کر بلایا کرتے تھے۔

پتہ نہیں حاجی صاحب کیسے اور کب بٹالے آئے اور مفتیاں محلے میں پہنچے' جہاں ہم رہتے تھے۔ اماں نے ان کی بیعت کر لی۔ ان دنوں مجھے نہ تو بزرگ کا پتہ تھا' کہ کیا ہوتا ہے' کیسے ہوتا ہے' نہ ہی بیعت کا علم تھا۔

لیکن حاجی صاحب نے مجھے بری طرح زچ کر رکھا تھا۔ یہ کیسا بزرگ ہے' میں سوچتا' جو دوسروں کے معاملات میں خوامخواہ مداخلت کرتا ہے۔ بھلے آدمی تو اللہ اللہ کر جو بزرگ کا کام ہے' میرا پیچھا چھوڑ۔ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔

کوائف یوں تھے کہ ان دنوں میں ایک خاتون کے عشق میں سرشار تھا۔ خاتون کے عشق میں سرشار ہونا تو ایک عام سے بات ہوتی ہے۔ میری مشکل یہ تھی کہ وہ خاتون شادی شدہ تھی' بچوں والی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بدقسمتی کہ میرا عشق وصال سے بے نیاز تھا۔ وصال کے تصور ہی سے خوف طاری ہو جاتا تھا' اگر ایسا نہ ہوتا تو دس بارہ وصالوں کے بعد جی بھر جاتا اور

میں واپس گھر آ جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سولہ سال میں محترمہ کی کھڑکی میں ٹنگا رہا۔ محترمہ بھی بڑی بے نیاز تھی۔ وہ ملاپ نہیں چاہتی تھی۔ صرف یہ آرزو تھی کہ کوئی ٹنگا رہے۔ کچھ وقفے ایسے بھی آتے تھے' جب محترمہ کا شوہر اکیلا اپنی ملازمت پر چلا جاتا اور مجھے موقعہ مل جاتا۔ آدھی رات کو میں کوٹھے پھلانگ کر وہاں جا پہنچتا اور پھر محترمہ کے پاؤں سے کھیلتا رہتا۔ مجھے خوبصورت ہاتھوں اور پیروں سے کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔

ان وقفوں کے دوران میں انتظار کرتا کہ کب اماں سو جائے تو میں جا کر گورے ہاتھ پاؤں سے کھیلوں' جب اماں خراٹے لینے لگتی تو میں دبے پاؤں چل پڑتا' لیکن جونہی اماں کی چارپائی کے قریب پہنچتا تو اماں ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ جاتی اور بڑی منت اور لجاجت سے کہتی' نہ ممتاز نہ۔

میں اپنی چارپائی پر لوٹ جاتا اور از سر نو انتظار کرتا کہ کب اماں گہری نیند سوئے اور میں ادھر پہنچ جاؤں۔

یہ واقعہ روز ہوتا تھا' کبھی کبھی رات میں دو دو' تین تین مرتبہ۔

ایک دن میں نے اماں سے کہا' اماں یہ بتا کہ تو اس وقت کیسے جاگ اٹھتی ہے' جب میں تیری چارپائی کے قریب سے گزرتا ہوں۔

اماں نے کہا' مجھے حاجی صاحب جگا دیتے ہیں۔

یہ سن کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ یہ کیسے بزرگ ہیں' جو عین موقعہ پر اماں کو جگا دیتے ہیں' خوا مخواہ میری زندگی میں دخل دیتے ہیں۔

پھر مجھے خیال آتا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دلی کے بلیماراں کوچے میں بیٹھا ہوا آدمی ہاتھ بڑھا کر' بٹالے میں سوئی ہوئی اماں کو جگا دے اور وہ بھی آدھی رات کے وقت۔

بہر صورت حاجی صاحب کے خلاف میرا دل غم و غصہ سے بھرا ہوا تھا۔

ایک رات جب اماں خراٹے لے رہی تھی اور میں دبے پاؤں اس کی چارپائی سے گزر رہا تھا تو اماں کو حسب معمول حاجی صاحب نے جگا دیا۔ اماں ہڑبڑا کر اٹھی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا' بولی' نہ ممتاز نہ' اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔

میں نے کہا' اماں ڈال سے ٹوٹا ہوا بھی کبھی جڑتا ہے تو کیوں اپنے آپ کو پریشان اور دکھی کر رہی ہے۔ بات بھی صحیح تھی۔ قصور میرا تھا' لیکن اماں میرے قصور پر خود کو سزا دے رہی تھی۔

بیعت

اگلے روز اماں مجھے ایک کمرے میں لے گئی اور ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

یہ کیا کر رہی ہو اماں۔

تیری منت کر رہی ہوں تو میرے ایک بات مان لے پھر جو مرضی ہے کرنا میں نہیں ٹوکوں گی۔

کیا مان لوں اماں' میں نے پوچھا۔

بس میرا ایک کہا مان لے پھر جو مرضی ہے کرنا۔

کیا مان لوں بتا بھی نا۔

تو دلی جا' حمید کو میں تیرے ساتھ بھیج دیتی ہوں' وہاں جا کر حاجی صاحب کی بیعت کر لے۔

بیعت کیا ہوتی ہے اماں۔

چاہے کچھ بھی ہوتی ہے تو جا کر بیعت کر آ۔

جائے گا نا' اماں نے منت سے پوچھا۔

میں نے جواب دیا' اچھا ماں کر آؤں گا' بیعت۔

اگلی رات جب میں محبوبہ کے ہاں گیا تو میں نے جاتے ہی کہا' میں دلی جا رہا ہوں۔

کوئی کام ہے کیا' وہ بولی۔

اماں کہتی ہے جا کر حاجی صاحب کی بیعت کر آ۔

یہ بھی کر دیکھ' وہ بولی' پر یاد رکھ جو ہمارا بالکا ہے' وہ کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ حاجی صاحب ہے کون' میں نے پوچھا۔

یہاں آئے تھے' بہت سے محلہ والوں نے ان کی بیعت کر لی تھی' مجھے بھی کہتے تھے۔

کیا کہتے تھے۔

کہتے تھے تو بھی حاجی صاحب کی بیعت کر لے۔

تو نے کیا کہا۔

میں نے کہا' میں نے تو پہلے ہی سے بیعت کر رکھی ہے۔

کیا واقعی' میں نے حیرت سے پوچھا۔

بولی' ہاں' اور میرا مرشد بڑا طاقت ور ہے۔

سچ کون ہے وہ۔

بولی' تو جو ہے۔

اس پر میں نے محسوس کیا جیسے مجھے تخت پر بٹھا کر تاج پہنا دیا گیا ہو۔

دو ایک دن میں اماں نے مجھے دلی بھیجنے کے تمام انتظامات مکمل کر لیے۔

دلّی

دلی میں حمید اور میں ایک عزیز کے گھر ٹھہرے۔

اگلے دن ہم بلی ماراں گئے' تنگ اور گھومتی ہوئی گلیاں ہی گلیاں۔ حاجی صاحب کا مکان ایک بند گلی میں واقع تھا۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک نوجوان لڑکا باہر نکلا۔ حمید نے کہا' ہم پنجاب سے آئے ہیں۔

حاجی صاحب سے ملنا ہے۔ لڑکا ہمیں بیٹھک میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ایک پتلا دبلا' پست قد آدمی داخل ہوا۔

ارے' میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

میرے سامنے ایک نحیف و نزار آدمی کھڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں مشکل سے جسم کو اٹھائے ہوئے تھیں اور سر چل رہا تھا۔ انداز میں بے بسی بھری ہوئی تھی۔ وہ ہمیں بڑے تپاک' اخلاص اور عجز سے ملے۔ پھر حمید بے جملہ لوگوں کی خیریت پوچھنے لگے۔

میں نے سوچا یہ نحیف و نزار بڈھا' جس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی اور سر جھول رہا ہے۔ یہ میرا ہاتھ کیسے پکڑے گا۔ چلو جو بھی ہے' مقصد تو اماں کو خوش کرنا ہے نا۔

دراصل میں سمجھتا تھا کہ حاجی صاحب توند پھیلائے' گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ارد گرد مریدوں کی بھیڑ ہو گی۔ جیسے ہمارے ہاں پیروں کا وطیرہ ہے۔ سرزنش کرنے والی' کھنک دار آواز سے بات کریں گے' مربیانہ انداز سے سر پر ہاتھ پھیریں گے۔ لیکن یہاں تو بات بالکل الٹ تھی۔

خیر خیریت پوچھنے کے بعد حاجی صاحب بولے' فرمائیے کیا حکم ہے۔

حمید نے کہا' جناب ان کی والدہ نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ فرماتی ہیں کہ ممتاز کو اپنی بیعت میں لے لیں تو کرم نوازی ہو گی۔

ان کا حکم سر آنکھوں پر' حاجی صاحب بولے۔

یہ کیسا پیر ہے کہ اپنے مریدوں کی بات کو اپنے لیے حکم سمجھتا ہے' میں نے سوچا۔

بہر صورت حاجی صاحب سے مل کر میں بہت مایوس ہوا۔ ساتھ خوش بھی۔ مایوس اس لیے کہ یہ بیچارہ خود کو نہیں سنبھال سکتا تو مجھے کیا سنبھالے گا' خوش اس لیے کہ یہ میرا کیا بگاڑ لے گا۔

عین اس وقت حاجی صاحب نے میری طرف دیکھا۔ دو کالی سیاہ سرمے کی دھار والی' بانکی رسیلی' مدھ بھری آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے پتہ نہیں کتنی بڑی وولٹیج نے مجھے دھکا مارا ہو۔

چشتیہ آنکھ

وہ پہلا دن تھا جب میں نے چشتیہ آنکھ کو دیکھا تھا۔

ان دنوں نہ میں چشتیہ سے واقف تھا نہ چشتیہ آنکھ سے۔ نہ اللہ کا مفہوم سمجھتا تھا نہ اسلام کا۔ اسلام میرے نزدیک فرسودہ رسموں کا ایک گٹھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ بزرگ وہ ہوتا ہے جو معجزے دکھا سکے' کل ہونے والی بات آج بتا سکے' پھونک مارے تو بیماری دور ہو جائے مافوق الفطرت طاقتوں کا حامل ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ بزرگ ایک طرح کا مداری ہوتا ہے۔

میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ ارے' یہ حاجی صاحب تو ایک انسان ہے۔ نحیف و نزار انسان' اس سے بات کی جا سکتی ہے۔ اس کی بات کاٹی جا سکتی ہے۔ اس پر میرے دل میں حوصلہ پیدا ہو گیا۔

اسی شام ہم تینوں حاجی صاحب' حمید بخاری اور میں دلی کی جامع مسجد میں جا پہنچے۔

آپ وضو کر لیں' حاجی صاحب نے کہا۔

میں گھبرا گیا چونکہ وضو کے کوائف میں بھول چکا تھا۔

حمید نے مجھے ٹوکا' نہ نہ نہ ایسے نہیں۔

حاجی صاحب نے حمید سے کہا' انہیں ٹوکیے نہیں' جیسے چاہیں وضو کریں۔

وضو کے بعد انہوں نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا۔

اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیجیے' وہ بولے۔

ایک بات پوچھوں' میں نے کہا۔

جی فرمایئے۔ حاجی صاحب بولے۔

یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔

آپ کی والدہ محترمہ کا حکم بجالا رہا ہوں۔ آپ کو بیعت کر رہا ہوں۔

بیعت کیا ہوتی ہے' میں نے پوچھا۔

آپ اپنا آپ میرے حوالے کر رہے ہیں۔

میں نے ہاتھ کھینچ لیے۔ نہیں حاجی صاحب' میں نے کہا' میں اپنا آپ کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔ میرے پاس اپنا آپ کے سوا اور ہے ہی کیا۔ میں یہ دوسرے کے حوالے کیسے کر دوں۔

حاجی صاحب یہ سن کر رک گئے۔ انہوں نے حیرت بھری نظر مجھ پر ڈالی پھر آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا۔ دیر تک وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ حمید بھی پتھر کے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔

پھر حاجی صاحب نے مراقبے سے سر اٹھایا۔

اپنی خفت مٹانے کے لیے میں نے کہا' جناب اگر آپ اپنی طاقت سے مجھے نیک بنا دیں تو مجھے ایسی نیکی مطلوب نہیں۔ میں اس نیکی کا آرزو مند ہوں جو میرے دل سے پھوٹے کسی کی بخشی ہوئی نہ ہو۔

سبحان اللہ' حاجی صاحب نے زیر لب کہا۔

پھر حاجی صاحب مخاطب ہو کر کہنے لگے' حمید صاحب آپ والدہ صاحبہ کی خدمت میں میری جانب سے عرض کر دیں کہ جس کام سے آپ انہیں روکنا چاہتی ہیں۔ وہ ہو کے رہے گا' آپ اس پر آزردہ نہ ہوں۔ یہی رضائے الٰہی ہے۔ والدہ صاحبہ سے کہہ دیں کہ ان کا مستقبل روشن ہے۔ انہیں بہت اچھے لوگ ملیں گے۔ ان کا حصہ وہیں ہے۔

شام کو حاجی صاحب نے مجھ سے کہا' اگر ناگوار نہ ہو تو آیئے آپ کو دلی کی سیر کرا لائیں۔

میرا جی چاہا کہ قہقہہ مار کر ہنسوں۔ یہ نحیف و نزار بڈھا جس کی ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں اور سر یوں جھولتا ہے' جیسے پلاسٹک کے باوے کا تاگا ڈھیلا ہو گیا ہو۔ یہ بھلا مجھے دلی کی سیر کیا کرائے گا۔

طلسمی سرمہ

ان دنوں چاوڑی بازار دلی کی واحد سیر گاہ تھی جہاں دلی کے بانکے گھوما پھرا کرتے تھے۔

حاجی صاحب' میں نے کہا' کیا آپ نے چاوڑی کی سیر کی ہے کبھی۔

بھائی صاحب' وہ بولے' ہم تو وہیں رہا کرتے تھے۔

چاوڑی میں' میں نے حیرت سے دھرایا۔

جی' وہ بولے' وہیں ہماری کیسٹ کی دوکان تھی۔ بڑی دوکان کلکتہ میں تھی۔ یہاں اس کی براِنچ تھی۔

پھر چھوڑ کیوں دی آپ نے وہ دکان میں نے پوچھا۔

بولے' بلاوا آ گیا تو چھوڑ دی۔

بلاوا آ گیا۔ کیسا بلاوا۔ کس نے بلایا۔ میری ذہن میں کئی ایک سوالات پیدا ہوئے لیکن اس وقت ہم بازار میں پہنچے ہوئے تھے۔ خاصی بھیڑ تھی۔ اس لیے میں نے حاجی صاحب سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

بازار ختم ہوا تو میں نے کہا' حاجی صاحب آپ نے کبھی عورت سے بھی محبت کی ہے۔

وہ بولے' محبت تو نہیں ہوس کی ہے۔ ہم چار دوست تھے۔ جوانی کا عالم تھا۔ عورتوں کے پیچھے پھرا کرتے تھے۔ پھر ہمیں ایک سادھو مل گیا۔ ہم نے اس کی خدمت کی۔ وہ خوش ہو گیا۔ صلے کے طور پر اس نے ہمیں ایک نسخہ دیا۔ وہ نسخہ تیار کرنے میں چھ مہینے لگے' چونکہ اس نسخے میں ایک وظیفہ بھی شامل تھا' جو ویرانے میں بیٹھ کر پڑھنا تھا۔

وہ نسخہ کیا اثر رکھتا تھا' میں نے پوچھا۔

حاجی صاحب بولے' وہ ایک قسم کے سرمے کا نسخہ تھا۔

سادھو نے کہا تھا اس سرمے کی ایک ایک سلائی لگا کر تم جس عورت سے آنکھیں چار کرو گے وہ تمہاری مطیع ہو جائے گی۔

آپ نے اسے آزمایا کیا۔

ہاں صرف ایک بار' وہ بولے۔

کیا واقعی عورت مطیع ہو جاتی تھی۔

ہاں' وہ بولے۔

دوسری بار کیوں نہ لگایا۔

اس لیے کہ عورت کا ذہن شل ہو جاتا تھا' باقی ایک بے جان بت رہ جاتا تھا' ہم نے فیصلہ کیا کہ بے جان بت کو کیا کرنا ہے' بجھی ہوئی لالٹین کو اٹھائے پھرنے کا کیا فائدہ' اس لیے ہم نے وہ سرما دریا میں پھینک دیا۔

پھینک کیوں دیا' میں نے سوچا' کسی کو دے دیتے۔

ممتاز صاحب' وہ بولے' ساری لذت طلب میں ہے۔

حصول تو اک بے جان کیفیت ہے۔

ایمان اور شکوک

دلی سے واپسی سفر میں' میں مسلسل سوچ میں کھویا رہا۔ حاجی صاحب کی شخصیت نے کنفیوز کر کے رکھ دیا تھا۔ حاجی صاحب میں بزرگوں والی کوئی بات نہ تھی۔ ان کا عجز' اخلاق' رواداری اور وسعت خیال۔ وہ ایک اعلیٰ انسان تھے' بزرگ نہیں۔

میرے روبرو ایک طرف حاجی صاحب کھڑے تھے دوسری طرف میرے اپنے مرشد تھے' برٹرینڈرسل' ایڈلر' فرائڈ' نیٹشے' کافکا' داستووسکی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

کہ ہر بات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھو۔ اسے جانچو' پرکھو' ٹھونک بجا کر دیکھو' پھر ایمان لاؤ۔ بند آنکھوں سے جو ایمان لایا جاتا ہے اس میں استحکام نہیں ہوتا۔

حاجی صاحب کہہ رہے تھے۔ ایمان آنکھیں کھول کر حاصل نہیں ہوتا۔ آنکھیں کھولیں تو وسوسے جاگتے ہیں' جو راہ کھوٹی کر دیتے ہیں۔ بند آنکھوں کا ایمان سچا ایمان ہے۔

یہ واقعہ ۱۹۲۵ء کا ہے۔

پاگ والا بابا

تیسرا بابا جس سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا' انہیں پاگ والا بابا کہتے تھے۔ اماں زبردستی مجھے ان کے پاس لے گئی تھی۔ یہ واقعہ ۱۹۴۵ء کا ہے۔

بٹالے سے دس بارہ میل دور بڑی سڑک پر ایک گاؤں ہے' جینتی پور۔ ایک بابا جس نے سر پر ایک اتنی بڑی پگڑی لپیٹ رکھی تھی' اپنی گٹھڑی اٹھائے جینتی پور کی مسجد میں آ کر بیٹھ گیا۔ دو تین روز تو لوگ سمجھتے رہے کہ مسافر ہے' چلا جائے گا' لیکن چوتھے روز جینتی پور کے لوگ گھبرا گئے۔ وہ نمبردار کے پاس گئے' کہنے لگے مسجد میں ایک بابا آ بیٹھا ہے اور اس کا جانے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا۔ مسجد تو اللہ کا گھر ہوتی ہے۔ وہاں مستقل رہائش کر لینا ٹھیک بات نہیں۔

یہ سن کر نمبردار کو غصہ آ گیا وہ سیدھا مسجد میں گیا۔ بابا کو ڈانٹا ڈپٹا اور اس کا سامان نکال کر باہر پھینک دیا۔

بابا وہاں سے اٹھ کر بڑی سڑک پر ایک گھنے درخت کی چھاؤں تلے جا بیٹھا۔

اسی رات نمبردار کی ایک بھینس بلاوجہ مر گئی۔ اگلے دن دوسری بھینس بیمار پڑ گئی۔ نمبردار گھبرا گیا۔ لوگوں نے کہا' یہ بابا کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ اس پر گاؤں والے بابا کی خدمت میں حاضر ہوئے' اس کی منتیں کیں' بابا ہم سے غلطی ہوئی ہمیں معاف کر دے۔ بے شک تو مسجد میں ڈیرہ کر لے یا تو چاہے تو ہم ایک مکان خالی کروا دیتے ہیں۔

بابا نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ وہ خود سے باتیں کرنے میں لگا رہا' اکھڑی اکھڑی باتیں' بے معنی باتیں۔

وہ مایوس ہو کر واپس آئے تو پتہ چلا کہ نمبردار کی دوسری بھینس بھی مر چکی ہے۔

اس پر علاقے میں پاگ والے بابا کی دہشت پھیل گئی۔ بابا سارا دن درخت تلے ٹہل لگائے رکھتا اور خود سے باتیں کرتا رہتا۔ جب نماز کا وقت آتا' تو قریبی کھیت میں جا کر نماز ادا کرتا اور پھر سے درخت تلے ٹہلنا شروع کر دیتا۔ کسی نے کبھی بابا کو لیٹے ہوئے یا سوئے ہوئے نہ دیکھا تھا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میری زندگی کا وہ طوفان چل چکا تھا جس سے اماں خائف تھی' جس کے بارے میں حاجی صاحب نے کہا تھا کہ یہ ہو کے رہے گا۔

اتنی دھول اڑی تھی کہ ہم بھگوڑوں کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ ہم پناہ ڈھونڈتے رہے تھے اور محلے والے لاٹھیاں اٹھائے' ہمیں تلاش کرتے رہے تھے۔ اب وہ طوفان ختم ہو چکا تھا اور اپنے عقب میں بدنامی' اداسی اور ویرانی چھوڑ گیا تھا۔

جب ہم بابا کے ڈیرے پر پہنچے تو وہ کھیت میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ اماں بھاگ کر اس کے پیچھے کھڑی ہو کر نماز پڑھنے لگی۔

بابا نے سلام پھیر کر پیچھے دیکھا' غصے میں بولا' تو نے اللہ سے بیاہ کیا ہے کیا۔

کیا ہے' بابا جی اماں نے کہا۔

اچھا کیا' وہ بولا۔

اماں نے مجھے اشارہ کر کے قریب بلایا اور بابا سے کہنے لگی' یہ میرا بیٹا ہے بابا جی۔

تیرا بیٹا ہے ——— تو میں کیا کروں۔

اس کے لیے دعا کریں۔

میں دعا کرنے والا کون ہوں۔ وہ جانے اس کا کام جانے' میں کون ہوں۔ اللہ اپنے کام آپ جانے۔ وہ سب جانتا ہے۔ اللہ اپنے کام آپ کرتا ہے' میں کون ہوں۔

کیا نہیں کیا

آپ اللہ والے ہیں نا' اماں نے کہا۔

بابا جوش میں اٹھ بیٹھا اور ہم دونوں کے گرد چکر کاٹنے لگا۔

وہی کرتا ہے۔ پھر کون کرتا ہے وہی جانے۔ اس کے کام ہیں وہی جانے۔------- میں کون ہوں۔ دیر تک بابا بولتا رہا اور ہم دونوں کے گرد چکر لگاتا رہا' بالآخر وہ میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔

کیا نہیں کیا' بولو' کیا نہیں کیا۔ جب یہ امرتسر میں چھپا بیٹھا تھا اور وہ لاٹھیاں اٹھائے ڈھونڈ رہے تھے اللہ نے اس کا منہ کالا کر دیا کہ وہ پہچان نہ سکیں اور انہوں نے نہ پہچانا اور آگے لنگ گئے۔ کیا نہیں کیا' کیا نہیں کیا' وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔

وہ میرے پاس آ کر پھر رک گیا۔ کیا نہیں کیا اللہ نے۔ بولو ——— جدید ساہیوال

میں تھا تو شاہ جی نے اسے پناہ دی۔ نہیں دی۔ بولو۔ کیا نہیں کیا اللہ نے۔ کیا نہیں کیا' وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔

میرے پاس آ کر پھر رکا۔ جدیہ باغبانپورے میں چھپا ہوا تھا تو صوفی صاحب نے اسے حفاظت میں لیا۔ نہیں لیا کیا' بولو۔

کیا نہیں کیا اللہ نے۔ قصور میں شاہ جی نے خود حفاظت کی۔ نہیں کی' بولو۔

کہتے ہیں نہیں کیا۔ نہیں کیا تو چلو نہیں کیا۔ سب اس کی مرضی ہے کرے یا نہ کرے۔ کوئی زور ہے اس پر۔

میں حیرت سے بابا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہر اس شہر کا نام لیے جا رہا تھا جہاں ہم بھگوڑوں نے پناہ لی تھی۔ یہ کیسے جانتا ہے کہ امرتسر میں میرا منہ کالا کر دیا گیا تھا۔ میرے منہ پر اگزیما نکل آیا تھا۔ پھنسیوں سے پیپ اور پانی رس رہا تھا۔ جراح نے کپڑا جلا کر میرے منہ پر تھوپ دیا تھا۔ لاٹھیاں والے دوبار میرے سامنے سے گزر گئے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔

اس کو کیسے پتہ چلا کہ میں ساہی وال' باغبانپورے اور قصور میں چھپا رہا تھا۔

بابا ہمارے گرد گھوم رہا تھا۔ اماں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ سڑکوں پر لوگ کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے کیونکہ بابا کبھی کسی کو پاس آنے نہیں دیتا تھا۔

بابا پھر سے میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔ میں کیا کروں' میں کیا کروں۔ میں کون ہوں۔ دلی میں اس بڈھے نے کہا تھا' اللہ سے بیاہ کر لو۔ اس نے کہا نہیں کرنا۔ پھر میں کون ہوں۔ بولو۔ اس کا ناواں لکھا ہوا ہے۔ وخت وخت کی بات ہے۔ وہ لال ٹوپی اور لمبا۔ اسے ٹھیک کر دیں گے۔ میں کیا کروں۔

جاؤ' جاؤ' جاتے کیوں نہیں' بابا نے غصے میں کہا' ادھر جدھر پہاڑیاں ہیں جاؤ۔ وہاں جاؤ جہاں تمہارا ناواں ہے۔

انسان اور بزرگ

گھر پہنچ کر چار ایک دن تو مجھ پر پاگ بابا کی باتوں کا شدت سے اثر رہا' پھر وہ مدھم پڑتا گیا۔ میری عقل و دانش پھر سے لوٹ آئی۔

حاجی صاحب کے کردار کا مجھ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ واہ' کیا خوب انسان ہے' کس قدر وسعت قلب ہے۔ کسی بات کا برا نہیں مانتے' کسی بات پر آزردہ نہیں ہوتے' کسی بات پر سرزنش نہیں کرتے نصیحت نہیں کرتے لیکن میری دانست میں یہ اوصاف تو ایک اچھے انسان کے اوصاف تھے۔

میری دانست میں بزرگ وہ تھا جو عام انسان سے مختلف ہو' جو مافوق الفطرت قوتوں کا حامل ہو' جو ہونے والی بات کو پہلے سے ہی جانتا ہو اور انسان کی تقدیر بدلنے کی قوت رکھتا ہو۔

مجھے ایسی شعبدہ بازی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ان دنوں میں تو میں عقل و خرد کا دیوانہ تھا اور مذہب کو بنیادی طور پر ایک تعصب سمجھتا تھا۔

سرکار قبلہ

عزیز ملک کو میں ایک ادیب اور عالم آدمی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ پچیس برس ایک بزرگ کی خدمت میں حاضری دیتا رہا ہے۔

چند ایک روز کے بعد ملک مجھ سے پھر ملا۔ کہنے لگا' میں نے آپ کے بارے میں ان بزرگ سے تذکرہ کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ ہم تو اس لائق نہیں کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے دوست کو سرکار قبلہ کی خدمت میں لے جائیں اور ان سے کہیں' کہ وہ خود ان کی خدمت میں دعا کے لیے گزارش کریں۔

یہ سب باتیں میرے لیے بے معنی تھیں۔ میں ان کے مفہوم سے نا آشنا تھا۔ لیکن عزیز ملک کے حسن اخلاق اور جذبہ ہمدردی کی وجہ سے میں نے اس کے ساتھ جانا قبول کر لیا۔

ملک نے کہا میں جمعہ کے روز آؤں گا' آپ تیار رہیے گا تاکہ میں آپ کو سرکار قبلہ کی خدمت میں لے جاؤں۔

جمعہ کے روز عزیز ملک آگیا اور ہم دونوں چل پڑے۔ چلتے چلتے ہم مریڑ جا پہنچے۔

دُعا

مریڑ راولپنڈی صدر کا ایک مضاف ہے۔ ان دنوں مری روڈ سے مریڑ تک ایک ویرانہ تھا۔

اس ویرانے میں کھیت بھی تھے۔ بہرحال ان دنوں وہاں کوئی آبادی نہ تھی۔ ریل کی پٹڑی پار کرنے کے بعد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے عقب میں قبرستان تھا۔

قبرستان میں ایک چھوٹا سا چوگان تھا جس کے ایک جانب کنواں تھا۔ چوگان کے گرد خار دار تار لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک پختہ تھڑا بنا ہوا تھا' دوسری طرف ایک چھوٹی سی چار دیواری تھی' جس میں ایک کھڑکی کھلتی تھی۔

جب ملک اس کھڑکی میں داخل ہوا تو میں گھبرا گیا۔ میں سمجھا تھا کہ سرکار قبلہ کسی فرد کا نام ہے' جس کی خدمت میں مجھے لے جایا جا رہا ہے۔ کسی قبر پر دعا کرنے کے لیے جانا میرے لیے ناقابل قبول بات تھی۔ کسی بزرگ سے دعا کرانے میں پھر بھی کوئی بات تھی' لیکن کسی قبر سے مخاطب ہونا' کسی مرحوم و مغفور کو دعا کے لیے کہنا' میری دانست میں ایک مضحکہ خیز بات تھی۔ اگر مجھ میں جرأت ہوتی تو میں عزیز ملک سے کہتا' ملک تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو' ادیب ہو' صاحب عقل و دانش ہو' تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔ اب میں اس مٹی کے ڈھیر سے کیا کہوں' کیسے درخواست کروں کہ دعا کرو۔ یار ملک کیوں میرا مذاق اڑا رہے ہو۔———— لیکن مجھ میں جرأت نہ تھی۔ مجبوراً" میں ملک کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

اندر سفید ٹائیلوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ قبر پر ایک پتھر استادہ تھا۔ جس پر جلی الفاظ میں لکھا تھا۔ سائیں اللہ بخش نقشبندی' قلندری اور پتہ نہیں کیا کیا۔ نہ مجھے نقشبندی کے مفہوم کا علم تھا۔ نہ قلندری کا۔ میرے لیے ساری بات ہی مہمل تھی۔ ملک صاحب نے دونوں ہاتھ اٹھائے' کچھ پڑھتا رہا۔ پھر فارغ ہو کر بولا' مفتی صاحب آپ کو کوئی آیت آتی ہے کیا۔ میں نے کہا جی' الحمد' کہنے لگا' اور درود شریف بھی۔ میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ اور اپنی گزارش پیش کر دی۔

یہ گزارش گزارش نہ تھی' منت نہ تھی' التجا نہ تھی' جب سامنے قابل احترام ہستی کے وجود کا احساس ہی نہ ہو' تو منت کیسی' التجا کیسی۔

اس سارے عمل میں نہ ذہن شامل ہوا نہ دل۔ زبان نے بھی ایک رسم ادا کر دی۔

چار دیواری سے باہر نکل کر میں نے صدق دل سے کہا' شکر ہے جان چھوٹی۔

ملک صدر میں رہتا تھا' میں شہر میں۔ ہمارے راستے الگ الگ تھے۔ اس لیے ملک نے خدا حافظ کہا' اور رخصت ہو گیا' چھ سات دن گزر گئے۔ پہلے چند ایک دن تو جب بھی مجھے یہ بات یاد

آتی' میں اپنی حماقت پر ندامت محسوس کرتا پھر آہستہ آہستہ میں اس واقعے کو بھول گیا۔

جمعہ کی چھٹی

چھ ایک دن کے بعد ملک پھر آگیا' مضطرب سا تھا۔ بولا' مفتی صاحب ہم سے ایک غلطی سر زد ہو گئی ہے۔

وہ کیا' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' میں بھائی جان سے ملا تھا۔

کون بھائی جان' میں نے پوچھا۔

وہی بزرگ جنہوں نے ہمیں دعا کے لیے سائیں اللہ بخش کے مزار پر بھیجا تھا۔

میرے دل میں چڑچڑ ہونے لگی۔ اپنی ضعیف الاعتقادی پر غصہ آنے لگا۔ پتہ نہیں اب یہ کیا "طوطا مینا" کہانی سنائے گا' میں نے سوچا۔ جی' میں نے کہا' کیا غلطی ہوئی۔

ہم نے سرکار قبلہ کے مزار پر جمعہ کے روز حاضری دی۔ بھائی جان فرماتے ہیں' کہ صاحب مزار جمعہ کے روز اپنے مزار پر موجود نہیں ہوتے۔

یہ سن کر میرا جی چاہا کہ قہقہہ مار کر ہنس دوں۔ کیا خوب' صاحب مزار اپنے مزار پر موجود نہیں ہوتے۔ میں نے حیرت سے ملک کی طرف دیکھا۔ بظاہر اس قدر معقول لیکن بہ باطن اس قدر مجہول۔

ملک بولا' بھائی جان فرماتے ہیں کہ ایک بار پھر سرکار قبلہ کے مزار پر حاضری دو۔

مائی گاڈ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔

میرا جی چاہتا تھا کہ ملک سے صاف صاف کہہ دوں۔ بس ملک صاحب اب مجھے اور نہ بناؤ۔ بہت ہو لیا۔ مجھے کسی کی دعا کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے' جو ہوتا ہے۔ ہونے دو۔ میں نے غصے میں سر اٹھا کر ملک کی طرف دیکھا۔ ملک کی شخصیت اس قدر سنجیدہ اور پروقار ہے کہ اس سے بات کرنا ممکن نہیں۔

میں اسے کچھ کہہ نہ سکا۔

اس کے باوجود میرے اندر بھتنے ناچ رہے تھے۔ صاحب مزار اپنے مزار پر حاضر نہیں ہوتا'

جمعے کے دن چھٹی کرتا ہے۔ درخواستیں وصول نہیں کرتا' لاحول ولا' مٹی کے تودے تلے دبا ہوا سرکار قبلہ۔ اندر ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ برٹرینڈرسل مسکرا رہا تھا۔ میں نے کہا نہ تھا' شک کرو ہر بات پہ شک کرو "سیپٹیسزم" ضعیف الاعتقادی کے خلاف بہترین ہتھیار ہے۔ بکسلے سرتھامے بیٹھا تھا۔ فرائیڈ گہری سوچ میں پڑا تھا۔ مارکس گھونسہ تانے کھڑا تھا۔ چند روز کے بعد ملک پھر آگیا۔ بولا اگر بار خاطر نہ ہو تو چلیے سرکار قبلہ کی حاضری دے آئیں۔

میں چپ چاپ ملک کے پیچھے پیچھے چل پڑا' یوں محسوس کر رہا تھا جیسے قربانی کا بکرا تھا۔ طبیعت غم و غصہ سے بھری ہوئی تھی' اس روز مجھے سائیں اللہ بخش کا مزار یوں لگ رہا تھا جیسے مداری کا ڈیرا ہو۔

میں نے تمسخر آمیز انداز میں الحمد پڑھی' درود پڑھا۔ غیر دعائیہ انداز میں دعا کی' یوں جیسے کوئی کسی کا مذاق اڑاتا ہے۔

چاردیواری سے باہر نکل کر میں نے سچے دل سے لاحول پڑھا' چلو جان چھٹی۔ ملک اس کار خیر کی تکمیل پر بہت خوش تھا۔ اس کی خوشی پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ملک نے مجھے خدا حافظ کہا اور صدر کی جانب چل پڑا۔

وہاں سے میرا گھر ایک آدھ میل کے فاصلے پر تھا۔ مریڑ گاؤں کے سامنے ریلوے لائن کی پٹڑی تھی۔ پٹڑی کے آگے مری روڈ تک یا تو کھیت تھے اور یا خالی زمین پڑی تھی۔

رقت

جونہی میں کھیتوں میں داخل ہوا میرے اندر ایک مدھانی سی چلی۔ سوڈے کی ایک بوتل کھل گئی' بلبلے ابھرے' ابھرتے گئے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا جیسے میری پھپھوندیاں ہوا میں اڑیں' اور میں پھوٹ پھوٹ کر بھیں بھیں رونے لگا۔

پتہ نہیں کتنی دیر میں وہاں کھڑا بھیں بھیں کر کے باآواز بلند روتا رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا' قرب و جوار میں کوئی نہ تھا۔

پھر میں حیرت میں ڈوب گیا' مائی گاڈ یہ کیا ہوا۔

زندگی بھر میں صرف دو ایک مرتبہ رویا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب میں جذبات کے

تھپیڑے کھا رہا تھا۔

طبعاً" میں رونے سے قطعی طور پر محروم ہوں۔ میں نے کبھی آنسو نہیں بہائے' بڑے سے بڑے صدمے پر بھی مجھے رونا نہیں آتا۔ دکھ کی بات سن کر میں چپ ہو جاتا ہوں۔ مجھے دھچکا نہیں لگتا' شاک نہیں ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ دکھ بوند بوند میرے دل میں گرتا رہتا ہے' گرتا رہتا ہے۔

اس روز بغیر وجہ کے' بے اختیار بھیں بھیں کر کے رونے پر میں بوکھلا گیا۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میرے دل میں یہ وہم بھی نہ آیا تھا کہ شاید اس عمل کو صاحب مزار سے کوئی تعلق ہو۔

خیر میں نے خود کو سنبھالا۔ آنسو پونچھے' منہ صاف کیا اور آگے چل پڑا۔ ابھی چند ایک قدم ہی چلا تھا کہ وہی ہیجان ابھرا۔ سوڈے کی بوتل کھلی' بلبلوں کا ایک طوفان ابھرا۔ میں بیٹھ گیا' بازوؤں سے اپنا سر چھپا لیا۔ خود کو سنبھالنے کی شدت سے کوشش کی۔ لیکن اس وقت گویا میں' میں نہ تھا۔ میری میں دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک سوچنے والا میں' ایک بے اختیار میں۔ سوچنے والا حیران کھڑا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسے خود پر اختیار نہ رہا تھا' وہ بے بس لاچار کھڑا تھا' مائی گاڈ' مائی گاڈ۔

اس آدھ میل کے فاصلے کے دوران مجھ پر تین دورے پڑے۔ سوچنے والا میں زچ ہو کر رہ گیا۔ وہ یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی اجنبی ہو۔ بے بسی سے چور' خوف و ہراس سے ادھ موا۔

اس کے بعد مری روڈ آ گئی۔ لوگ چل پھر رہے تھے۔ تانگے سواریوں کی تلاش میں چکر لگا رہے تھے۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا' لوگ دیکھ کر کیا کہیں گے۔ اگر کسی واقف کار نے دیکھ لیا تو ——— میں نے مفلر سے منہ سر لپیٹ لیا۔ تاکہ کوئی پہچان نہ سکے اور بھاگنا شروع کر دیا۔ پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔

چوک میں لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

کالج روڈ پر لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھا رہے تھے' کچھ تمسخر سے ہنس رہے تھے۔

گھر کے دروازے پر میں نے خود کو اچھی طرح سنبھالا' منہ پونچھا' آنکھیں صاف کیں' چہرے پر سنجیدگی سجائی اور اندر داخل ہو گیا۔ میں سخت خوف زدہ تھا' اگر گھر میں دورہ پڑ گیا تو۔

دورے سے نہیں' میں اپنی بیوی سے ڈرتا تھا۔

میری بیوی ایمن آباد کے شیخوں میں سے ہے۔ وہ سب تو مسلم ہیں۔ انہیں بت پرستی کسی صورت میں گوارہ نہیں۔ لہذا نہ وہ پیر کو مانتے ہیں' نہ فقیر کو' نہ مزار کو' نہ معجزات کو' نہ کشف کو۔ وہ صرف اللہ کو مانتے ہیں' قرآن کے احکامات کو مانتے ہیں اور بس۔ ان کا بس چلے تو پیغمبروں کو بھی بندے سے زیادہ حیثیت دینے سے انکار کردیں۔

میں کسی بابا یا بزرگ کی بات کروں' تو میری بیوی کے چہرے پر تمسخر بھری مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ اس مسکراہٹ میں کاٹ ہوتی ہے۔ اس کاٹ کی دھار بہت تیز ہوتی ہے۔ میں اس مسکراہٹ سے ڈرتا ہوں۔ پہلے ہی وہ میرا مذاق اڑایا کرتی تھی' چونکہ میں باڑا سنٹر والے بابا کے ہاں جایا کرتا تھا۔

پچیسواں باب

مردِ قلندر

باڑا سنٹر کا بابا

پنڈی میں باڑا سنٹر کے بابا کے پاس میں صرف اتفاق سے جا پہنچا تھا۔ اس عمل میں نہ طلب کا دخل تھا‘ نہ یقین کا‘ نہ ایمان کا‘ ہوا یوں کہ ایک روز صدر بازار میں گھومتے ہوئے مجھے قیوم مل گیا۔ قیوم میرا بہت پرانا بے تکلف دوست تھا۔ وہ ملتان کا رہنے والا تھا۔ اسے پنڈی میں دیکھ کر میں حیران ہوا۔

ارے تم یہاں‘ میں چلایا۔

کیوں‘ وہ بولا‘ میرے پنڈی آنے پر بین لگی ہے کیا۔

مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔

کیسے دیتا‘ ساتھ والد محترم ہیں۔ با ادب‘ باملاحظہ ہوشیار کا عالم ہے۔ دوست کی گنجائش نہیں۔

چلو کسی ہوٹل میں بیٹھ کر بات کریں‘ میں نے کہا۔

اونہوں‘ وہ بولا‘ ہوٹل نہیں‘ چل‘ میں تجھے ایسی جگہ لے چلتا ہوں جہاں فسٹ کلاس

کڑک چائے ملے گی۔ اور ایسی رنگین محفل کہ رنگ رس میں ڈوبے بیٹھے رہو گے۔

وہ مجھے باڑا اسنتر بابا کے حجرے میں لے گیا۔

صدر بازار کی ایک گلی میں وہ ایک لمبا سا کمرہ تھا۔ فرش اور دیواریں مٹی سے لپے پتے ہوئے تھے۔ فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دونوں دیواروں کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگ قطار میں احترام سے گٹھڑیاں بنے بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے درمیان میں' ایک پہلوان نما آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر اور بھویں مُنڈھی ہوئی تھیں اور کان باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے کان دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ جیک دی جائنٹ کلر ہو۔ اس نے جسم پر سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کے سامنے چوکی پر دو مٹی کے دیے جل رہے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا' جیسے میں کسی اور دنیا میں آگیا ہوں۔ مٹی کے دیوں کی روشنی نے ماحول کو پر اسرار بنا رکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے الف لیلےٰ کا کوئی باب کھل گیا ہو۔

قیوم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بڑے طمطراق سے اسلام علیکم کہا' یوں لگا جیسے کسی نے سم سم پھونک دیا ہو۔ دیواروں سے لگی ہوئی لاشوں میں حرکت ہوئی' وہ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور قیوم سے باری باری ہاتھ ملانے لگے۔ آخر میں بابا کی باری تھی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے قیوم سے ہاتھ ملایا' اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ پھر ہم ایک طرف بیٹھ گئے۔

بسم اللہ' بسم اللہ بابا چلایا' مہمان آئے ہیں۔

اس پر خدمت گار اٹھا' اس نے ایک بہت بڑی کیتلی اٹھائی اور پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ چائے گرم تھی' کڑک تھی اور خوشبو کے بغیر لذیذ تھی۔

جن

قیوم اور میں اندھیرے کونے میں بیٹھ کر' زیرِ لب باتیں کرنے لگے۔

ابے یہ "لائینزڈن" تو نے کیسے ڈھونڈا' میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا' بولا' یہ امریکہ۔ محترم والد صاحب کی دریافت ہے۔

ماحول کی وجہ سے ہم کھل کر ذاتی باتیں نہ کر سکے۔ ادھر بابا پینڈو انداز میں بے تکلف باتیں

کیے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں عالمانہ نہیں تھیں' لیکن وہ بڑی بڑی باتیں سادہ لفظوں میں بیان کر رہا تھا۔

میں نے قیوم سے پوچھا' یار یہ بابا کیا چیز ہے۔

وہ کہنے لگا' تجھے کیسا لگتا ہے۔

میں نے کہا' یار مجھ کو تو یہ جن لگتا ہے' جن۔

اس پر بابا نے شور مچا دیا۔ کہنے لگا' دیکھو بھائیو' یہ پہلا آدمی ہے' جو آج ہمارے ڈیرے پر آیا ہے اور اس نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ کہتا ہے بابا جن ہے۔

سب کی نگاہیں ہماری طرف اٹھ گئیں۔

میں نے زیر لب کہا' یار اس نے تو سن لیا۔

قیوم بولا۔ اس کے کان کھڑے رہتے ہیں' بہت سنتا ہے یہ۔

تجھے پتہ ہے' بابا نے منہ موڑ کر ہمیں مخاطب کر کے کہا۔

بولنا لذت ہے' سننا دکھ ہے۔

ارے یہ جن تو بڑا حاضر جواب ہے' میں نے سوچا چلو اسے چھیڑو۔ میں نے وہاں باتوں کی پھلجھڑیاں چلانی شروع کر دی۔

وہاں محفل میں ادب اور احترام کی وجہ لوگ چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے اور بابا کو بار بار کوئی نا کوئی بات چھیڑنی پڑتی تھی۔ میں نے باتیں شروع کیں تو سب میری طرف دیکھنے لگے۔ بابا خوش ہو کر بولا۔ لو بھئی ہمارے ڈیرے پر آج جلیبیاں تلنے والا آ گیا۔

بابا کی خوش مزاجی مجھے بھی پسند آئی۔

روز کی حاضری

اس کے بعد بابا اور میں دوست بن گے۔ بابا لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ کہنے لگا تو روز ڈیرے پر آیا کر۔ بس ہم نے تیری حاضری پکی کر دی ہے۔ میری حاضری کو نہ تو عقیدت سے تعلق تھا' نہ پیری مریدی سے' نہ روحانیت سے۔ وہ حاضری تو لذت کلام کی وجہ سے تھی۔ میں بے تکلف باتیں کیا کرتا۔ محفل میں رونق پیدا ہو جاتی۔ بابا التفات بھری نظروں سے دیکھتا۔ اس

نے کبھی میری باتوں کا برا نہ مانا تھا۔ الٹا وہ بڑی گرم جوشی سے مجھے ملتا۔ بات بات پر مجھ سے پوچھتا' کیوں مفتی ٹھیک ہے نا یہ بات۔ بابا میری بات کو بہت اہمیت دیتا تھا۔

اس لذت کے لیے' میں روز ڈیرے پر جانے لگا۔ وہاں چائے عام ملتی تھی' مفت اور بار بار مہینے کے مہینے گیارہویں کے دن بابا گیارہ دیگیں پکاتا تھا اور ہمیں بڑی محبت سے کھلاتا تھا بلکہ وہ مجھے مجبور کرتا کہ تبرک گھر لے جاؤں۔

میری بیوی بابا کے پاس جانے پر میرا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ میں نے اسے بار بار سمجھایا تھا کہ دیکھ میں بابا سے کوئی منت نہیں مانگتا' کوئی مسئلہ نہیں پوچھتا۔ نہ طلب ہے' نہ مانگ اور نہ ہی عقیدت ہے' وہ تو میرا دوست ہے' بڑا اچھا دوست ہے' لیکن میری بیوی میرا مذاق اڑاتی رہی۔

ہاں تو اس روز میں گھر جانے سے ڈر رہا تھا۔ اگر گھر میں مجھے دورہ پڑ گیا تو کیا ہو گا۔ میری بیوی کیا کہے گی۔ خود کو محفوظ کرنے کے لیے میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ کر منہ پر رضائی لے لی۔

یہ دیکھ کر بیوی بولی کیوں خیریت تو ہے۔

میں نے رضائی سے منہ نکالے بغیر جواب دیا' طبیعت ٹھیک نہیں' نیند آجائے تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔

وہ مطمئن ہو کر باہر چلی گئی اور باورچی خانے میں مصروف ہو گئی۔ لیٹ کر میں سوچنے لگا' یہ کیا ہو رہا ہے' کیوں ہو رہا ہے۔ دراصل ابھی تک مجھے بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ یہ سب سائیں اللہ بخش کا چمتکار ہے۔

دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ اس واقعہ کے بارے میں نہ سوچوں اپنے خیالات کا رخ بدلوں میں نے زبردستی افسانے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ ہاں تو اب مجھے ایک افسانہ لکھنا چاہیئے' اس کا مرکزی خیال کیا ہو۔

عین اس وقت ایک چار دیواری دوڑتی ہوئی آئی اور میری رضائی میں گھس گئی۔ اس چار دیواری نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا پھر وہ مرقد ابھرا' ابھرتا گیا۔ سائیں اللہ بخش کے مرقد پر ایک بڈھا آبیٹھا' سر پر رومی ٹوپی تھی' ہاتھ میں حقہ۔

اس وقت دفعتاً" جیسے میری نگاہوں سے پردہ اٹھ گیا۔ حاجی رفیع الدین نے سر اٹھایا' بولے'

انہیں بہت اچھے لوگ ملیں گے۔

پاگ والا بابا بولا' جاؤ' اوپر پہاڑیوں کی طرف' وہاں لال ٹوپی والا تمہیں اڈیک رہا ہے۔

امرتسر کے چوک میں کھڑا سپاہی تحلیل ہو گیا۔ اس کی جگہ رومی ٹوپی والا کھڑا ہو گیا' اس نے ہمارے ٹرک کو راستہ دے دیا۔ امرتسر کے غنڈے ٹرک کے پیچھے بھاگے لیکن فوجی ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی' اور تیز' اور تیز۔

دفعتاً" میرے اندر بلبلے اٹھے' ہوائی چلی' میں نے رضائی منہ میں ٹھونس لی۔

پھر جو مجھے ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ بیوی سرہانے کھڑی آپ ہی آپ بڑبڑا رہی ہے' یہ بھیں ۔بھیں کی آواز کہاں سے آئی۔ میں نے جھٹ خراٹے لینے شروع کر دیئے وہ حیرت سے کبھی میری طرف دیکھتی' کبھی اِدھر اُدھر۔

غلط بابا۔ صحیح بابا

اگلے روز جب میں چائے پی رہا تھا تو وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گئی بولی' ایک بات پوچھوں۔

پوچھو' میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

بولی' آپ نے بابا بدل لیا ہے کیا۔

میں گھبرا گیا' بات سمجھ میں نہ آئی۔

بولی' رات مجھے خواب میں اشارہ ہوا ہے۔

واقعی اسے خواب میں اشارے ہوا کرتے تھے۔ گھر میں کوئی بات وقوع پذیر ہوتی تو پہلے ہی اسے خواب میں اشارہ ہو جاتا تھا۔ اس بات پر مجھے بہت حیرت ہوتی کہ یہ کیا بھید ہے' جو نہیں مانتے انہیں اشارے ہو جاتے ہیں' جو مانتے ہیں انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس روز جب اقبال بیگم نے بابا بدلنے کی بات کی تو مجھے حیرت ہوئی۔

بہرحال میں نے مصنوعی تعجب سے پوچھا' کیا اشارہ ہوا ہے تجھے۔ بولی' آج صبح جب میں ادھ سوئی ادھ جاگی پڑی تھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک سبز پوش بزرگ اندر داخل ہوئے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے تیرے میاں نے جو بابا اب اپنایا ہے وہ صحیح ہے' پہلے والا غلط تھا۔

میں کھسیانی ہنسی ہنسا' بی بی یہ تیرا وہم ہے۔ میں نے کوئی بابا نہیں اپنایا——— وہ

باڑا سنٹر والا بابا تو میرا دوست تھا' مجھے اس سے عقیدت نہیں تھی۔

انہوں نے تو مجھے نیا بابا دکھا بھی دیا' وہ بولی۔

کیسا تھا' میں نے پوچھا۔

بولی سر پر رومی ٹوپی ہاتھ میں حقہ تھا۔

دفعتاً" میرے سامنے وہ چار دیواری ابھری۔ مرقد پر بابا لال ٹوپی پہنے ہاتھ میں حقہ لیے بیٹھا تھا۔ میرے اندر وہی ہوائی چلی' بلبلے اٹھنے میں دیوانہ وار اٹھ بھاگا۔ باتھ روم میں داخل ہو کر میں نے اندر سے کنڈی لگائی اور تولیہ منہ میں ٹھونس لیا۔

وہ باتھ روم کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی' کیا ہوا کیا ہوا' وہ بولی۔ خیریت تو ہے۔ پتہ نہیں اس نے بھیں بھیں کی آوازیں سنی یا نہیں۔ دیر تک وہ باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹاتی رہی اور پھر مایوس ہو کر چلی گئی۔

جب رقت کے دورے سے فارغ ہوا تو پہلی مرتبہ میں نے بے بسی میں اللہ کو پکارا' یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

ہم قلم بھائی

آٹھ دس روز مجھ پر یہ کیفیت طاری رہی۔ گھر والوں کو پتہ چل گیا۔

دفتر والوں کو علم ہو گیا۔ گھر والے حیران تھے کہ یہ کیا ہوا۔ دفتر والے سمجھتے تھے کہ بڑے صاحب نے مجھے زچ کر دیا ہے اور میرا ذہنی توازن ڈول گیا ہے اور میں ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں۔ بڑے صاحب نے سنا تو وہ بہت خوش ہوئے' غالباً" وہ یہی چاہتے تھے کہ میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں اور ان کے قدموں میں بچھ جاؤں۔

پھر میں ملک صاحب کی طرف بھاگا۔ میں نے ملک کو ساری بات سنائی۔

ملک نے میری بات بڑے غور سے سنی۔ اس کے چہرے پر نہ تشویش کا عالم تھا' نہ حیرت کا' ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی' جیسے وہ جانتا ہو۔

دیکھئے مفتی صاحب' وہ بولا۔ ظاہر ہے کہ آپ پر رقت طاری کی گئی ہے۔ کیوں طاری کی گئی' اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔ رقت ایک معمولی سی چیز ہے آپ گھبرائیے نہیں۔

معمولی سی چیز ہے' میں نے حیرت سے ملک کی طرف دیکھا۔

ملک صاحب دس دن سے میری زندگی حرام ہو چکی ہے۔ میں بغیر کسی وجہ کے بچوں کی طرف بھیں بھیں کر کے رونے لگتا ہوں۔

ہاں وہ بولا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔

کیا یہ رقت اس بابا نے طاری کی ہے جس کے مزار پر ہم گئے تھے۔ یقیناً' وہ بولا۔

ملک صاحب کیا یہ بابے اس قدر طاقت ور ہوتے ہیں۔

بہت طاقتور ہوتے ہیں' ملک نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا اور سرکار قبلہ تو بڑے طاقت ور بزرگ ہیں۔

لیکن میں نے تو ان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

ملک مسکرایا' بولا' مفتی صاحب مجھے علم نہیں۔ البتہ آپ کے آنے سے بہت پہلے ہمیں پتہ تھا کہ آپ آ رہے ہیں۔

میں نے حیرت سے ملک کی طرف دیکھا۔

وہ بولا' بہت پہلے مجھے بھائی جان نے بتایا تھا کہ آپ کے ایک ہم قلم بھائی آنے والے ہیں۔

ہم قلم بھائی' میں نے حیرت سے دہرایا۔

مجھے یہ علم نہ تھا کہ آپ آ رہے تھے' بہرحال انہوں نے کہا تھا کہ ملک صاحب ہم میں آپ اکیلے قلم کار ہیں' لیکن جلد ہی آپ کا ایک قلم کار بھائی آ رہا ہے۔

پھر—— ملک بولا' آپ کو یاد ہو گا۔ میں نے آپ کو ایک مقالہ دکھایا تھا' آپ نے اس مقالے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ پھر میں نے وہی مقالہ حلقہ ارباب ذوق کی محفل میں پڑھا تھا اور آپ نے اس پر تنقید کر دی تھی۔ اس بات پر مجھے بہت غصہ آیا تھا جب میں وہ مقالہ آپ کو دکھا چکا تھا تو پھر بھری محفل میں آپ نے کیوں تنقید کی۔

میں نے بھائی جان سے شکایت کی' وہ مسکرا کر بولے' کوئی بات نہیں وہ آپ کے بھائی ہیں۔ اس روز ہمیں پتہ چلا کہ وہ آنے والے قلم کار آپ ہیں۔

ملک کی بات سن کر معاملہ اور بھی سنگین ہو گیا۔ میرا سارا ریشنل سلف سن ہو کر رہ گیا۔

یہ سائیں اللہ بخش کون ہیں' میں نے پوچھا۔

ملک نے اٹھ کر الماری کھولی اور ایک کتابچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ عنوان تھا۔ مرد قلندر۔ نیچے ملک کا نام درج تھا۔

یہ کتاب آپ نے لکھی ہے کیا' میں نے پوچھا۔

جی ہاں' وہ بولا' اسے پڑھ لیجیے ساری بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔

اور یہ بھائی جان کون ہیں' میں نے پوچھا۔

ان سے بھی آپ کی ملاقات جلد ہو جائے گی' وہ بولا۔

ملک صاحب میں تو گھبرا گیا ہوں۔ یہ آپ مجھے کس الف لیلوی دنیا میں لے آئے ہیں۔

ملک ہنسا' کہنے لگا' مفتی صاحب گھبرایئے نہیں۔ ابھی تو آپ اللہ والوں کی دنیا کی دہلیز پر بیٹھے ہیں۔ ابھی تو پتہ نہیں آپ کو کیسے کیسے مشاہدات سے گزرنا ہو گا۔

یہ اللہ والوں کی دنیا ہے یا مداری خانہ ہے' میں نے چڑ کر کہا۔

نہ نہ ایسا نہ کہیے' ملک بولا' اللہ کی شان میں ایسے الفاظ منہ پر نہ لایئے۔

سائیں اللہ بخش

"مرد قلندر" سائیں اللہ بخش کا تذکرہ تھا۔

مقدمہ یوسف ظفر کا لکھا ہوا تھا۔

یہ تذکرہ عزیز ملک نے خواجہ جان محمد کے نام معنون کیا ہوا تھا۔ اس تذکرے میں سائیں اللہ بخش کے حالات زندگی اور ان کی لکھی ہوئی پنجابی نظمیں شامل تھیں۔

اس تذکرے کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ادبی انداز میں لکھا ہوا تھا۔ عام تذکروں کی طرح اس میں احترام اور کشف و کرامات کا گاڑھا قوام نہ تھا۔ نظموں میں پاکستان کی عظمت اور آنے والے نشاۃ ثانیہ کا ذکر تھا۔

تذکرہ پڑھنے کے بعد میری تشنگی دور نہ ہوئی' بھید نہ کھلا۔

سائیں اللہ بخش کی زندگی کے کوائف سادہ تھے۔ مرد قلندر سے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

آپ اعوان خاندان سے تھے۔ آبا کوٹلی سیالکوٹ سے آئے تھے' باپ کا نام عید محمد تھا۔ انہوں نے فن طباخی میں نام پیدا کیا تھا۔ جب سردار ایوب خان شاہ کابل نظربند ہو کر پنڈی میں

لائے گئے تھے' تو عید محمد کا تقرر شاہی مطبخ میں بطور باورچی ہو گیا تھا۔

مسجد میں آپ نے قرآن کریم کی تعلیم پائی۔ مدرسے میں پانچویں جماعت تک پڑھے' پھر تعلیم سے دل اچاٹ ہو گیا۔ بچپن سے ہی کُشتی سے رغبت تھی' بہت شہ زور تھے۔ بزرگوں کی خدمت میں حاضری دینے کا اشتیاق تھا۔

لال کڑتی میں فضل الدین نقشبندی رہتے تھے' ان کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے عقیدت ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بیعت کر لی۔ توجہ پہلوانی سے ہٹ کر عبادت کی طرف مبذول ہو گئی۔ ذکرِ الٰہی میں ایسا جی لگا کہ باقی سب کچھ دھندلا گیا۔

والد نے مرنے سے پہلے اپنا فرض پورا کرنے کی غرض سے آپ کی شادی کر دی۔ لیکن قلب پر استغراق کا عالم طاری تھا۔ شادی کے قیود و بند کے پابند رہنا ممکن نہ تھا' اس لیے دو ہفتے کے بعد اہلیہ سے علیٰحدگی اختیار کر لی اور اسے آزاد کر دیا۔ اس کے بعد ۴۵ سال تجرد کی زندگی گزاری۔

اس کے بعد استغراق اس حد تک پہنچ گیا کہ خود پر اختیار نہ رہا۔ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے' لیکن سجدے میں جاتے تو سر اٹھانے کا ہوش نہ رہتا۔ نماز ختم ہو جاتی' نمازی اپنے اپنے گھر پہنچ جاتے لیکن آپ وہیں سجدے میں پڑے رہتے۔

اس پر محلے والوں نے فیصلہ کیا کہ آپ کا مسجد میں نماز ادا کرنا مناسب نہیں۔

استغراق کی یہ شدت آپ کو اپنے ہادی سے ملی تھی۔

آپ کے ہادی فضل الدین نقشبندی نے ایک بار دریائے جہلم کے کنارے چلہ کشی کی تھی۔ وہاں سرکنڈوں کا جنگل تھا۔ آپ پر عالم استغراق اس شدت سے طاری ہوا کہ سرکنڈے آپ کے جسم میں پیوست ہو گئے اور آپ کو خبر ہی نہ ہوئی۔

ہادی کے وصال کے بعد آپ قلمی گروں کے ایک ٹولے کے ساتھ شامل ہو کر لمبے سفر پر چلے گئے' کشمیر' گلگت' لداخ غیر علاقہ اور افغانستان میں گھومے پھرے۔ اس سفر کا مقصد درگاہوں پر حاضری دینا اور اولیائے کرام سے اظہار عقیدت کرنا تھا۔

دو سال کے بعد آپ واپس پنڈی پہنچے۔

بندو خان

اس دور میں آپ پر باوا احمد خان کی رفاقت کا بہت اثر ہوا۔

باوا صاحب فقر میں خاص مقام رکھتے تھے' آپ کو بندو خان کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ بندو خان سے آپ کو بہت فیضان حاصل ہوا۔

پھر ایک ایسا واقع ہوا کہ آپ کی طبعی اور موروثی خصوصیت 'شدت کو تازیانہ لگا جس کے زور پر آپ نے استغراق کی کیفیت پائی تھی۔

ہوا یوں کہ بندو خان نے ایک نو مسلم عیسائی خاتون سے عقد کر لیا۔ خاتون کی پچھ لگ بیٹی تھی' جو مشن والوں کے زیر اختیار رہتی تھی۔ ماں نے چاہا کہ بیٹی کو اپنے پاس بلا لے۔ مشن والوں نے لڑکی کو ماں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ باوا صاحب نے عدالت میں چارہ جوئی کر دی۔ مقدمہ چلا۔ اس پر پنڈی کے مسلمانوں میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا' لیکن لڑکی چونکہ عیسائی باپ کی بیٹی تھی' اس لیے باوا صاحب کا دعویٰ خارج ہو گیا۔ مسلمان مقدمہ ہار گئے' مسلمانوں کی بہت تذلیل ہوئی

باوا صاحب نے فرمایا اللہ بخش' ایسا تو ہمارے ساتھ کبھی نہ ہوا تھا۔

دونوں بزرگوں میں غم و غصے کا ایک طوفان اٹھا اور برطانوی حکومت پر مرکوز ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد جنگ عظیم شروع ہو گئی۔

بہرصورت تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مرد قلندر کی غم و غصہ بھری نگاہ حکومت برطانیہ پر مرکوز ہو چکی تھی۔ برطانیہ کا انحطاط شروع ہو گیا۔ اب صرف وقت کی دیر تھی۔

اس کے بعد مرد قلندر کی توجہ قیام پاکستان پر مبذول ہو گئی۔

اور پھر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے مناظر سامنے آ گئے۔

سائیں اللہ بخش کی نگاہوں کے سامنے جب مستقبل کے مناظر جھلکیاں دکھاتے' تو ان کے اظہار کے لیے انہوں نے شعرو سخن کو اپنا رکھا تھا۔ وہ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ تخلص حجام تھا۔

نمونہ کے طور پر اس قبیل کی ایک نظم درج ذیل ہے۔

اللہ کی اماں ہے

آج کل ہر چیز گراں ہے۔

گرداب میں سارا جہاں ہے

پر چاراجوں سے بدگماں

آثار قیامت کا نشاں ہے۔

ہندو ہندو، مسلماں مسلماں ہے۔

عیش کوشی پر پیر مغاں ہے۔

سب خلق بے داماں ہے۔ اللہ کی اماں ہے۔

ہر مذہب کا الٹ بیاں ہے۔

شامت نفس سے چاک گریباں ہے۔

دھوکے پہ ہر دکاں ہے۔

ہر سو قتل کا ساماں ہے۔

کہیں بہار کہیں خزاں ہے۔

ہر کس زیر داماں ہے۔

مرد خدا بھی بدگماں ہے

صغریٰ قیامت کا نشاں ہے۔

گلشن و دہر بے اماں ہے۔

شہنشاہ کا فاسد ایماں ہے۔

ہمسر خالق لرزاں ہے۔

مسافر راہ رواں ہے۔

راہ کعبے کا گراں ہے۔

بدلا رنگ جہاں ہے۔

کھلی تیغ بر آں ہے۔

خون لہروں میں رواں ہے۔

چرخ گردوں گرداں ہے۔ اللہ کی اماں ہے۔
بلند مسلم کی اذاں ہے۔
کفر دمڑ کے ہے لرزاں ہے۔
گوہر پتھر میں عیاں ہے۔
ہند کربل کا نشاں ہے۔
ہر سو آہ و فغاں ہے۔
لخت جگر ہراساں ہیں۔
طوطی و مرغ حیراں ہیں۔
کھلا جوہر جواں ہے۔
اٹھی گرد گرداں ہے۔
شجاعتِ صفتِ سجاں ہے۔
ہر سو عش عش کا بیاں ہے۔
میدان خوں کا نشاں ہے۔
غازی سر میداں ہے۔
در کفر شور و فغاں ہے۔
جام صراحی سے جدا ہے۔
شیروں نے چھوڑا چراگاہ ہے۔
عدل پہ مسلم کا نشاں ہے۔ اللہ کی اماں ہے۔
آزاد تختِ ایراں ہے۔
خوش شاہ ایراں ہے۔
بلند شرع کا نشاں ہے۔
آمد مہدی کا نشاں ہے۔
مہدی بالغ جواں ہے۔
اٹھا عربی نشاں ہے۔

سورۂ الحمد کا بیاں ہے۔

اللہ کی اماں ہے۔

۴۵ سال تجرد کی زندگی گزارنے کے بعد سائیں اللہ بخش نے نکاح ثانی کیا۔ حرم ثانی انہوں نے خوشی سے نہیں کیا تھا' ظاہر تھا کہ سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔

حرم ثانی بہت سی تلخیوں کا باعث بنا اور آپ نے ان تلخیوں کو بڑے حوصلے اور صبر سے برداشت کیا۔

۱۹۵۳ء میں مئی کے آخری ہفتے میں مختصر سی بیماری کے بعد ۳۱ مئی کو وصال سے ہمکنار ہو گئے۔

تذکرہ

عزیز ملک نے سائیں اللہ بخش کا تذکرہ "مرد قلندر" بڑے جذبے سے تحریر کیا ہے۔ عزیز ملک جانے پہچانے صاحب طرز ادیب ہیں۔

اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں رسمی انداز نہیں اپنایا گیا۔ حضور اقدس' سرکار قبلہ عالی مقام' حضرت جیسے رسمی احترام کے القابات سے سجایا نہیں گیا۔ کرامات اور معجزوں کے ذکر سے بوجھل نہیں بنایا گیا۔

عزیز ملک نے یہ تذکرہ مذہبی نہیں بلکہ ادبی انداز میں تحریر کیا ہے۔ میں عزیز ملک کا بیان نہیں اپنا سکا۔ میں نے تو معلومات پیش کرنے کے خیال سے سادہ اور روکھے پھیکے انداز میں سائیں اللہ بخش کی زندگی کے موٹے موٹے واقعات پیش کر دیئے ہیں۔

مرد قلندر کے مطالعہ کا مجھے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کوئی تذکرہ نہ پڑھا تھا۔ کتاب پڑھ کر میں نے سوچا' ٹھیک ہے یہ ایک بزرگ کے حالات زندگی ہیں' لیکن اس بزرگ نے میری زندگی میں کیوں مداخلت کی ہے۔ کیوں ایسے حالات پیدا کیے کہ میں ان کے مزار پر حاضری دوں اور پھر رقت طاری کر کے میرا تماشا بنا دیا۔ کیوں؟

ان دنوں میں اس واقعہ کو کرم نوازی نہیں بلکہ مداخلت بے جا سمجھتا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ دلی میں حاجی رفیع الدین نے فرمایا تھا' انہیں مستقبل میں اچھے لوگ ملیں

گے' پھر باگ والے بابا نے کہا تھا' جاؤ۔ اوپر پہاڑیوں کے پاس وہاں لال ٹوپی والا تمہارا منتظر ہے۔

مجھے رہ رہ کر خیال آتا کہ مرد قلندر کیوں میرا منتظر ہے۔

میں تو اک عام' معمولی سا آدمی ہوں' منہ زبانی مسلمان ہوں' اللہ سے ناواقف ہوں' کسی بیرونی مدد کے زور پر نیک بننا نہیں چاہتا' پھر ایک بزرگ' صاحب نظر بزرگ' جو ان تفصیلات سے واقف ہے' وہ کیوں میرا منتظر ہے' اس نے کیوں مجھے اپنے مزار پر بلایا ہے۔ کیوں مجھ پر رقت طاری کی ہے۔

مرد قلندر کے مطالعے نے مجھے اور بھی کنفیوز کر دیا۔

پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ یہ بھائی جان کون ہے۔ اسے بھائی جان کیوں کہتے ہیں۔ سرکار قبلہ کیوں نہیں کہتے۔ اس کے لیے مرد قلندر جیسا لقب کیوں نہیں تجویز کیا گیا۔

میں ایسے خیالات میں ڈبکیاں کھا رہا تھا کہ ملک صاحب آ گئے۔ کہنے لگے' بھائی جان پنڈی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ وہ کل بعد از دوپہر یوسف ظفر کے مکان پر تشریف لائیں گے۔ آپ ان سے مل لیں۔

بھائی جان

اگلے روز بھائی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

میرا خیال تھا کہ بھائی جان بھی سائیں جی قسم کی چیز ہوں گے' بال جٹادھاری ہوں گے' آنکھوں میں سلفے کی لاٹ ہو گی' پیشانی پر وہ تفاخر ہو گا جو اللہ والوں کی پیشانیوں پر ہوتا ہے۔ حلق میں دل ہلا دینے والا "کھنگورا" ہو گا' گردن میں کاٹھ کے منکوں کی مالا ہو گی۔

میرے سامنے ایک پر وقار انسان کھڑا تھا' اونچا لمبا' خوب صورت متوازن' خود اعتمادی سے بھرپور' جس میں سے اخلاق کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے روبرو ایک بزنس ایگزیکٹیو کھڑا ہے' جو چاک و چوبند ہے' اصولوں کا پابند ہے۔ وقت کی اہمیت کا احساس رکھتا ہے' زائد بات منہ سے نکالنے سے گریز کرتا ہے اور باوقار انداز سے خوش اخلاقی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

بھائی جان کو دیکھ کر میں بالکل ہی کنفیوز ہو گیا۔ تذکرہ پڑھ کر مرد قلندر کی جو شخصیت

میرے ذہن میں مرتب ہوئی تھی' بھائی جان کی شخصیت اس سے قطعی طور پر مختلف بلکہ متضاد تھی۔

سائیں اللہ بخش میں شدت تھی' جذبہ تھا' دبا دبا غم و غصہ تھا' اپنی طاقت پر مان تھا۔ بھائی جان میں ہوش مندی تھی اور سب سے بڑی بات کہ توازن تھا۔

اس زمانے میں میں بزرگ اور انسان کو دو مختلف کیفیتیں سمجھتا تھا۔ بزرگ سے ڈرتا تھا۔ انسان سے عقیدت پیدا ہو جاتی تھی۔

بھائی جان کی شخصیت کا بنیادی جزو انسانیت تھا۔ اس ابتدائی ملاقات میں میں بھائی جان سے کوئی بات نہ کر سکا۔ میں ان سے دو باتیں پوچھنا چاہتا تھا یہ کہ آپ نے یا مرد قلندر نے مجھ پر رقت کیوں طاری کی اور کیا سائیں اللہ بخش یا آپ اتنے طاقت ور ہیں کہ ایک پڑھے لکھے مضبوط ارادے کے شخص پر بھیس بھیس کر کے رونا عاید کر سکتے ہیں۔ میں بھائی جان سے بات اس لیے نہ کر سکا کہ وہاں یوسف ظفر اور عزیز ملک موجود تھے۔ عزیز ملک تو احترام کی وجہ سے خاموش تھا مگر یوسف ظفر حسب عادت محفل کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ ہر قسم کی محفل میں بات کرنے کے فن سے واقف تھا اور طبعی طور پر سردار شخصیت ہونے کی وجہ سے محفل میں نمایاں حیثیت اختیار کر لیا کرتا تھا۔

راجہ شفیع

عین اس وقت نیچے سے آواز آئی۔ یوسف ظفر' یوسف ظفر' یوسف ظفر نے اس آواز کو چنداں اہمیت نہ دی اور بھائی جان سے باتیں کرنے میں مصروف رہا۔

تیسری چوتھی آواز پر بھائی جان رک گئے' بولے کوئی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔

ٹھیک ہے جناب' ٹھیک ہے یوسف ظفر نے جواب دیا۔ دو ایک بار آواز دے کر چلا جائے گا۔

لیکن یہ صاحب ہیں کون بھائی جان نے پوچھا۔

میرے ایک دوست ہیں' محمد شفیع محکمہ ری ہیبلیٹیشن میں کلرک ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اس محفل میں شریک ہوں۔ یہ ماحول ان کے لیے ساز گار نہیں۔ لیکن مناسب ہو گا کہ

آپ ان سے بات کر لیں۔ بھائی جان نے کہا۔

یوسف ظفر نے عزیز ملک کو اشارہ کیا۔ عزیز ملک کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ پردہ سرکایا' بولا' راجہ صاحب اس وقت یوسف ظفر مصروف ہیں' آپ پھر کسی وقت تشریف لائیے گا۔

راجہ شفیع بولا۔ جناب ایسی بھی کیا مصروفیت ہے جس میں مجھے شامل نہیں کیا جا سکتا۔

بھائی جان یہ سن کر مسکرا دیے۔

یوسف ظفر بڑا مضمحل ہوا۔

عزیز ملک بولا' راجہ صاحب ایک ایسی ہی مصروفیت ہے۔

راجہ شفیع چلایا' ملک صاحب مجھے علم ہے ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں آپ کے پاس۔

بھائی جان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

راجہ با آواز بلند بولا' یوسف ظفر سے کہہ دو کہ کچھ پروا نہیں بے شک وہ مجھے ان بزرگ سے نہ ملوائے۔ میں خود اس بزرگ سے مل کر آپ کو دکھا دوں گا۔ راجہ شفیع نے یہ بات ایسے دھماکے سے کہی جیسے منہ پر ہاتھ پھیر کر کہی ہو۔ اس کی آواز میں عزم تھا دھونس تھی۔

راجہ شفیع بنیادی طور پر یوسف ظفر کا دوست تھا۔ وہ پوٹھوہار کا رہنے والا ایک بانکا جوان تھا۔ طبعاً" وہ لاہور کا بھا ماجھا تھا' جذباتی' محبتی' خدمتی' دلیر' ان جھک' خوش لباس' باوقار اوپر سے جدیدیت کا متوالہ' اندر سے روایت کا پابند' دوستوں کا دوست' اونچے اور قابل لوگوں سے دوستی رکھنا باعث فخر سمجھتا تھا۔

چھبیسواں باب

یہ اللہ، وہ اللہ

رقت کی بات ختم ہوئی تو مجھے اللہ کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ مجھے جگہ جگہ اللہ کا احساس ہونے لگا۔

آسمان کی طرف دیکھتا تو ایک گھمبیر آواز آتی، ہاں میں ہوں۔ پھر ایسے محسوس ہوتا جیسے سارے آسمان پر ان کا تخت بچھا ہوا ہو۔

درخت کی طرف دیکھتا تو یوں لگتا جیسے ہر پتے کے پیچھے اللہ چھپا بیٹھا ہو۔ ڈال ڈال کا جھولنا بنائے جھول رہا ہو۔

ان دنوں دفتر میں میری کوئی حیثیت نہ تھی، نہ ہی میرے پاس کوئی کام تھا۔ دفتر کا کوئی فرد میرے قریب نہیں آتا تھا۔ وہ سب ضیاء الاسلام سے خائف تھے۔ میں سارا دن دفتر میں اکیلا بیٹھا رہتا تھا۔

اجنبی ساتھی

جب ضیاء الاسلام نے مجھے زائد قرار دیا تھا تو میں نے سوچا تھا چلو اچھا ہوا۔ دفتر میں بیٹھ کر میں اپنا کام کیا کروں گا۔ افسانے لکھوں گا یا مطالعہ کروں گا۔ دو ایک دن تو میں اس خوش فہمی میں

مبتلا رہا۔ پھر وہ منتوب اکیلا پن مجھ پر حاوی ہو تا گیا اور اینگزائیٹی کی دیمک چاٹنے لگی۔

ایک روز دفعتاً" مجھے ایسے لگا جیسے کوئی میرے کمرے میں داخل ہو گیا ہو۔ وہ چپکے سے دبے پاؤں آیا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے ایک تسلی سی ہو گئی کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔

پھر وہ روز آنے لگا۔ روز بلاناغہ ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر وہ ہر چند ساعت کے بعد مدھم آواز میں کہتا' سب ٹھیک ہے۔

گھر جاتا تو وہ میری چارپائی کے سرہانے آبیٹھتا۔ سب ٹھیک ہے' سب ٹھیک ہے۔

میں گھبرا گیا' یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا مجھے ہیلوسی نیشن آنے لگے ہیں۔ کیا میں مینٹل ہو گیا ہوں۔

میں نے عزیز ملک کا دروازہ جا کھٹکھٹایا' ملک صاحب یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کون ہے جو دفتر میں میری ساتھ والی کرسی پر بیٹھ رہتا ہے۔ میری چارپائی کے سرہانے کھڑا رہتا ہے۔ جو ہر چند منٹ کے بعد' سب ٹھیک ہے' سب ٹھیک کہہ کر مجھے تسلیاں دیتا رہتا ہے۔

ملک مسکرایا' بولا' یہ تو بلکہ اچھا ہے کہ آپ کا حوصلہ بندھایا جا رہا ہے۔

نہیں ملک صاحب مجھے جھوٹی تسلیاں نہیں چاہئیں میں نہیں چاہتا کہ میرا حوصلہ بندھایا جائے۔

آپ کے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' ملک نے کہا۔ آپ کی قوت ارادی سے زیادہ طاقت ور قوت آپ پر مسلط ہو گئی ہے۔

نہیں ملک صاحب نہیں' میں اپنی زندگی خود جینا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں مینٹل ہوتا جا رہا ہوں۔ دفعتاً" میری زندگی میں اللہ کیسے داخل ہو گیا ہے۔

ملک کی باتیں مجھے مطمئن نہ کر سکیں۔

روایتی' رسمی

۱۹۰۵ء میں میں ایک متوسط مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔

محلے میں روایت اور رسمی اسلام رائج تھا۔ بڑی بوڑھیوں کا راج تھا' جن کی زبانیں قینچی کی طرح چلتی تھیں۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی' محلے کے مرد گھنگھار

کر نیچی نگاہ اور لٹکی ہوئی گردن سے محلے کے میدان سے گزر جانے کے عادی تھے۔

جس گھر میں میں پیدا ہوا وہ نسبتاً کھاتا پیتا گھر تھا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں پانچ افراد تھے' دادی اماں' اماں' آپا' نئی امی اور ابا۔ دادی اماں بیشتر وقت جائے نماز پر بیٹھی رہتی تھی۔ اماں گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ نئی امی محلے کی نہیں تھی' باہر سے آئی تھی۔ بڑی خوبصورت' جاذب نظر اور بارعب تھی۔ وہ گھر والوں میں گھلتی ملتی نہ تھی۔ اور ابا کبھی کبھار نظر آتے تھے۔ گھر میں میری حیثیت ایک لاوارث بچے کی سی تھی' کوئی پوچھتا نہ تھا۔ البتہ رسمی روک ٹوک جاری رہتی تھی۔

اللہ کا خوف

اماں کہتی' نہ بیٹا ایسے نہیں کیا کرتے۔ ایسے کرو گے تو اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے۔ دادی اماں کہتیں' نہ نہ لڑکے ایسے مت کرو' اللہ میاں غصے ہوں گے۔ اماں' دادی اماں اور محلے والیاں بات بات پر اللہ کی دھونس دیا کرتی تھیں۔ اور میں اس دھونس کو مانتا تھا۔

ان دنوں اللہ کے متعلق دو باتیں واضح تھیں۔ ایک یہ کہ اللہ میاں بہت بڑے' بہت ہی بڑے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ بڑے زود رنج تھے۔ بات بات پر ناراض ہو جاتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ناکارہ باتوں پر غصہ کھاتے تھے۔ مثلاً نعمت خانے سے پوچھے بغیر کچھ کھا لیتا تو وہ ناراض ہو جاتے۔ شام کو دیر سے گھر آتا تو ناراض ہو جاتے۔ شور مچاتا تو ناراض ہو جاتے۔ نئی امی کی شکایت کرتا تو ناراض ہو جاتے۔ دادی اماں کی جائے نماز پر بیٹھ جاتا تو ناراض ہو جاتے حالانکہ دادی اماں خود سارا سارا دن جائے نماز پر بیٹھی رہتی تھیں' اس سے ناراض نہیں ہوتے تھے۔ میں جھوٹ بولتا تو اللہ میاں ناراض ہو جاتے۔ ابا جھوٹ بولتے تو ان سے کوئی نہ کہتا کہ نہ ایسا نہ کہو اللہ میاں ناراض ہوں گے۔ اللہ میاں کی ناراضگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔

گھر میں اتنے سارے لوگ تھے کوئی کسی سے نہیں کہتا تھا کہ یوں نہ کرو اللہ میاں ناراض ہوں گے۔ اللہ میاں کی ناراضی کی دھونس صرف مجھ پر چلتی تھی۔ شاید اس لیے کہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ محلے میں بھی کوئی کسی بڑے کو نہیں کہتا تھا کہ یوں نہ کرو اللہ میاں ناراض ہوں گے۔ وہاں بھی بات بات پر چھوٹوں کو ٹوکا جاتا تھا اور اللہ کی دھونس چلائی جاتی تھی۔ ظاہر تھا

کہ اللہ میاں نے صرف چھوٹوں پر اتنی ساری پابندیاں لگا رکھی تھیں۔

اللہ میاں کے متعلق ایک اور بات ظاہر تھی کہ اگرچہ وہ بات بات پر ناراض ہوتے تھے لیکن کبھی کسی بات پر خوش نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کسی بڑے نے مجھے یہ نہیں کہا تھا سچ بولو اس لیے کہ سچ بولنے پر اللہ میاں خوش ہوتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اللہ میاں خوش ہونے کی صلاحیت سے قطعی طور پر محروم تھے۔ چونکہ کبھی کسی نے مجھے اللہ میاں کی خوشی کی خبر نہ سنائی تھی۔ چاہے میں سارا دن سچ بولتا' پوچھے بغیر نعمت خانے سے کوئی چیز نہ کھاتا اور سرشام ہی محلے کی چوگان سے گھر آجاتا' چاہے آپا سے بالکل لڑائی نہ لڑتا' کوئی مجھ سے یہ نہ کہتا کہ آج اللہ میاں تم سے بہت خوش ہیں۔ ظاہر تھا کہ اللہ میاں میں خوش ہونے کی عادت ہی نہ تھی' وہ صرف ناراض ہونا ہی جانتے تھے اور ناراض تو وہ بات بات پر ہو جاتے تھے۔

مولوی صاحب

پھر میں مکتب میں داخل ہو گیا اور مولوی صاحب سے پڑھنے لگا۔ جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب میں اللہ میاں کی صفات موجود تھیں ایک تو وہ بہت بڑے تھے' قابل تعظیم تھے' سب کچھ جانتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں دیکھ کرڈر کے مارے ہمارا دم نکلتا تھا۔

مولوی صاحب کے چہرے پر ہر وقت ایسا تناؤ رہتا تھا جیسے ماجھا لگی ڈور ہو جو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ خدوخال میں ہر وقت ایک دھونس نیم مستور' نیم عریاں دبکی رہتی تھی۔ ناراض نہ بھی ہوتے تو بھی معلوم پڑتا کہ اب ہوئے' کہ اب ہوئے۔ آواز میں کاٹ تھی۔ منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ میں دھار تھی۔ کھنکارتے تو ایسے لگتا جیسے کہیں بجلی گری ہو۔

مولوی صاحب کی باتیں سننے کے بعد اللہ میاں کی تصویر میں ایک تفصیل کا اضافہ ہو گیا' پہلے تو وہ خالی ناراض ہوتے تھے اب انہوں نے اپنے مقابل ایک بہت بڑی بھٹی گرم کر لی جس میں سے ہر وقت آگ کے شعلے نکلتے رہتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک لمبی لاٹھی اٹھالی اور گنہ گاروں کو پکڑ کر آگ کی بھٹی میں جھونکنا شروع کر دیا۔ مولوی صاحب نے ہم پر واضح کر دیا کہ انکی ذات کے سوا ہم سب گنہگار تھے۔ جو مولوی صاحب کا حکم نہیں مانتے تھے' جو سبق یاد نہیں کرتے تھے' جو دنگا فساد کرتے تھے' سب کے سب گنہگار تھے اور ان کا انجام اللہ میاں کی بھٹی

میں جلنا تھا۔

مولوی صاحب کی تلقین کے مطابق' اچھے کام صرف تین تھے' نماز پڑھنا' روزے رکھنا اور مولوی صاحب کے احکامات پر عمل کرنا۔ درحقیقت یہ کام بھی اچھے کام نہ تھے چونکہ یہ کام تو فرائض میں داخل تھے اور فرض وہ ہوتا ہے جسے عمل میں لانا آپ پر عاید کر دیا گیا ہو' جسے کرنا لازم ہو۔ فرض تو ہر صورت میں ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ اس لیے اسے اچھا کام نہیں کہا جا سکتا۔

جوں جوں میں اللہ میاں کی اس تصویر سے مانوس ہوتا گیا' توں توں میرے دل میں اللہ میاں کی دہشت بڑھتی گئی اور ساتھ ہی یہ احساس بڑھتا گیا کہ میں گنہگار ہوں اور بالآخر مجھے اس بھٹی میں جلنا ہے جو اللہ نے جلا رکھی ہے۔

یوں میرے لیے اللہ میاں کا خیال تکلیف دہ ہوتا گیا۔ اس تکلیف سے بچنے کا صرف ایک طریقہ تھا کہ حتی الوسع اللہ میاں کے خیال سے بچوں۔ اللہ میاں کو بھلائے رکھنا' تسکین دہ تھا۔ دقت یہ تھی کہ اللہ کے خیال سے بچ کر رہنا بہت مشکل تھا۔ مدرسے میں مولوی صاحب تھے۔ گھر میں دادی اور اماں تھے اور محلے میں بڑے بوڑھے تھے' جو بات بات پر اللہ میاں کا تذکرہ چھیڑ دیتے تھے۔ مکتب کے بعد مجھے اسلامیہ سکول میں داخل کرا دیا گیا۔

گریز

ان دنوں اسلامیہ سکول کچھ زیادہ ہی اسلامیہ تھے۔ دینیات کی کتابیں کچھ زیادہ ہی گناہ اور آگ کے شعلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اساتذہ کرام کے لہجے کچھ زیادہ ہی کرخت تھے۔ اور معاشرے میں اپنی سہولت کے لیے اللہ میاں کے خوف کو استعمال کرنا کچھ زیادہ ہی عام تھا۔ ماں اپنی آسائش کے لیے بچوں کو ڈراتی تھی۔ بڑے بوڑھے اور اساتذہ اپنا رعب جمانے کے لیے اللہ کا نام استعمال کرتے تھے۔

کسی نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ اپنی آسائشیں حاصل کرنے کے لئے وہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کا خوف بو رہے ہیں' ایسا خوف جو زندگی بھر ان کے نفس لاشعور کا حصہ بنا رہے گا اور وہ اس سے نجات نہیں پا سکیں گے۔ بڑے ہو کر ان بچوں کو کبھی یقین نہیں آئے گا کہ اللہ میاں مخلوق سے بے حد محبت کرتے ہیں کہ وہ سراسر رحمت ہیں۔

انہیں کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ بچوں کے دلوں میں وہ بنی نوع انسان کی بھیانک تصویر کھینچ رہے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ہر بندہ گناہ سے آلود تھا۔ انسان کا دل شر سے بھرا ہوا تھا۔

جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا' توں توں یہ بات واضح ہوتی گئی کہ بچاؤ کا صرف ایک طریقہ ہے کہ بڑے بوڑھوں کی باتوں پر کان نہ دھرا جائے۔ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا جائے۔

میں فطری طور پر ایک کمزور' نروس اور ڈرپوک نوجوان تھا۔ اگر نفس غیر شاعر آڑے نہ آتا تو خاطر خواہ نتائج پیدا نہ ہوتے۔ نفس غیر شاعر ہمارا محافظ ہے۔ وہ تلخ یادوں کو ہمارے شعور سے جذب کر لیتا ہے۔ یوں میں نے تلخ حقائق سے خود کو محفوظ کر لیا۔ اس کے دو نتیجے مرتب ہوئے' ایک تو یہ کہ بڑے بوڑھوں کی باتیں مضحکہ خیز ہو کر رہ گئیں اور دوسرے اللہ سے گریز پیدا ہو گیا۔

یہ گریز اللہ کی اس خوفناک تصویر کا رد عمل تھا جو بڑے بوڑھوں نے میرے دل میں نقش کی تھی اور جس میں اساتذہ نے رنگ بھرے تھے۔ لیکن یہ گریز درحقیقت سطحی تھا۔ دل کی نچلی تہوں میں احساس گناہ اور اللہ کے ڈر کے عفریت جوں کے توں قائم تھے۔

اس گریز کو تقویت دینے کے لیے میں نے کئی ایک ڈیفنس میکینزم اختراع کئے۔ سوچتا یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ دوزخ کی بھٹی اس لیے گرم کی گئی ہے کہ گنہ گاروں کو ڈرایا دھمکایا جا سکے۔ اللہ کو ہیڈ کانسٹیبل کا روپ اس لیے دیا گیا ہے کہ اخلاقی غنڈے دبے رہیں اور جنت کو حوروں اور پھلوں سے اس لیے سجایا گیا ہے کہ بچے بہلے رہیں ساری بات ہی بڑے بوڑھوں کا بنایا ہوا ڈھکوسلا ہے۔

یہ ڈھکوسلے کا مفروضہ دن کی روشنی میں تو پتھر کی دیوار کی طرح کھڑا رہتا لیکن رات کے اندھیرے میں روئی کے گالے کی طرح پھواں پھواں ہو جاتا ——————— کسی درز' ستون یا کھڑکی کی اوٹ سے اللہ میاں جھانکتے۔ ان کا خوفناک چہرہ معلق ہو جاتا۔ تیوری چڑھا کر کہتے "ہم تجھے سمجھ لیں گے۔" بازار یا گلی میں کسی لنگڑے لولے کو دیکھتا تو اللہ میاں اس کی اوٹ سے جھانکتے اور دھمکی آمیز آواز میں کہتے' دیکھ تیری حالت بھی ایسی ہی ہو جائے گی۔ کوئی عزیز و اقارب فوت ہو جاتا تو میت کی اوٹ سے جھانک کر کہتے یہی حشر ہو گا تیرا بھی۔ اس پر مجھے پسینہ

آجاتا۔ تمام تحفظات روئی کے گالوں کی طرح اڑ جاتے اور میں محسوس کرتا کہ اللہ میاں کو رد کرنے کی کوشش عظیم گناہ ہے اور میں اس گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ لیکن اگلے روز جب سورج کی روشنی گرد و پیش کو منور کر دیتی تو مجھے اپنے خدشات پر ہنسی آتی اور اپنے بے معنی خوف کو رد کرنے کے لیے میں لاحول پڑھتا۔ ان دنوں مجھے لاحول کے مفہوم کا علم نہ تھا مجھے احساس نہ تھا کہ لاحول پڑھ کر میں اللہ کے خوف کو رد نہیں کر رہا بلکہ اس کی تصدیق کر رہا ہوں۔

اگر میں پیدائشی طور پر اللہ کے وجود سے منکر ہوتا تو اور بات ہوتی دل اور دماغ آپس میں برسرپیکار نہ ہوتے۔ ذہنی کشمکش کا آرا نہ چلتا۔ اس کے برعکس اگر اللہ پر میرا ایمان پختہ ہوتا اور میں انہیں سچے دل سے مانتا تو بھی دل اور ذہن میں اک ہم آہنگی ہوتی اب میرے الحاد کی نوعیت ایسی تھی جیسے سمندر کی سطح پر برف کا ایک تختہ جما ہوا ہو۔ یہ تختہ بہت ہی پتلا تھا' اکثر ٹوٹ جاتا تھا اور میں ایمان کے پانیوں میں ڈبکیاں کھانے لگتا۔ پھر رینگتا پھسلتا گرتا پڑتا پھر سے برف کے تختے پر چڑھ جاتا۔

میرے دل میں پشتوں کا ایماں موجزن تھا۔ ذہن الحاد کی ایک ناؤ تھی جو ایمان کے ڈونگے پانیوں میں ڈول رہی تھی۔

مغربی مشاہیر

کالج میں جب میں مغربی مشاہیر کے افکار سے واقف ہوا تو میرے زاویہ نظر میں بہت سی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

جیمز جین کے کائنات کے بیان کو پڑھ کر میں ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ جینز بولا' یہ سات آسمانوں کا کیا مطلب ہے۔ جناب والا آسمان تو وجود ہی نہیں رکھتا۔ یہ نیلا نیلا جو آپ کو دکھائی دیتا ہے۔ یہ تو خلا ہے۔ ہوا نے روشنی کی نیلی لہریں جذب کر لی ہیں۔ یہ تم سات آسمانوں کے چکر میں کیسے پڑ گئے۔ یہاں تو کروڑوں سورج ہیں اربوں زمینیں ہیں' لاکھوں سسٹم ہیں۔ نہ جانے اس کائنات کی وسعت کیا ہے۔ اور یہ وسعت لحظہ بہ لحظہ پھیلتی جا رہی ہے' جیسے پانی پر بلبلہ پھیلتا جاتا ہے یہ بھی تو پتہ نہیں کہ کتنی کائناتیں ہیں یہ تو ایک عظیم حیرت انگیز تخلیق ہے' اسے

آسمانوں اور زمینوں پر محدود نہ کرو۔

ڈراون بولا' میاں عقل کی بات کرو۔ کیا سات دن میں یہ وسیع و عریض کائنات تعمیر کی جا سکتی ہے۔ نہ میاں تخلیق جادو کا کھیل نہیں۔ ہاتھ کی صفائی نہیں' شعبدہ بازی نہیں۔ تخلیق کائنات تو ایک عظیم کارنامہ ہے' حیرت انگیز' یہ تو ارتقاء کا مسئلہ ہے۔ صدیوں کا ارتقاء ———— اور پھر دن' دن تو ایک بے معنی سا لفظ ہے' جو زمین پر رہنے والوں نے اپنی آسائش کے لیے بنا رکھا ہے۔

برٹرینڈرسل نے میری پیٹھ ٹھونکی تسلی دی' کنفیوز ہونے کی کوئی بات نہیں۔ دیکھو ہر بات کو بغور دیکھو۔ مشاہدہ کرو اور سوچو۔ بن دیکھے ایمان لے آنا تو ضعیف الاعتقادی ہوتی ہے۔ اونہوں' ایسا نہیں' ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی ہر بات پر شک کرو اسے دیکھو ٹھونک بجا کر دیکھو۔ شک کرنے کی عادت بہت اچھی عادت ہے۔ اس طرح انسان دھوکہ نہیں کھاتا۔ شک کرو' وسوسی بنو اور دانشور کہلاؤ۔

فلسفی

پھر فلسفی آگے بڑھے ایک بولا' یہ جو جو کچھ تمہیں دکھتا ہے' کیا ایسا ہی ہے' جیسا دکھتا ہے' سوچنے کی بات ہے۔ دوسرا بولا' اونہوں' ہم تو حواس خمسہ کے قیدی ہیں۔ ہمیں کیا پتہ کہ ظاہر اور حقیقت میں کیا فرق ہے۔

تیسرا بولا۔ اللہ میاں کی بات کرتے ہو۔ اللہ میاں کو کس نے جانا ہے۔ ہاں ان کے بارے میں ایک بات یقینی ہے۔ چاہے وہ وجود رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے مگر ہیں بہت کار آمد شے اگر وہ نہ بھی ہوتے تو بھی اپنی آسائش کے لیے ہم انہیں تخلیق کر لیتے۔ یوں سمجھ لو کہ اللہ میاں تھکے ہوئے سر کے لیے ایک تکیہ ہیں' جس پر سر رکھ کر آپ سکون حاصل کر سکتے ہیں۔ چوتھا ہنسنے لگا بولا' جہنم کے ڈر کے مارے کی ہوئی نیکی نیکی نہیں ہوتی وہ تو اک مجبوری ہوتی ہے۔ نیکی وہ ہے جو اپنے دل سے پھوٹے' مصلحت سے بے نیاز' اجر کی امید سے آزاد' بے مقصد' بے لاگ' بے لگاؤ۔ ذرا سوچو میاں 'سوچو۔ پانچواں بولا' اونہوں سوچو نہیں 'سوچ تو ایک اتھاہ سمندر ہے اس میں ڈبکیاں مت کھاؤ۔ سوچ کی ناؤ تو صرف ڈولنا جانتی ہے۔ باہر کی آنکھیں بند کر لو۔ تو باطن کی

آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ باطن ایک کائنات ہے۔ باہر کی کائنات سے وسیع تر کائنات۔

چھتا چلایا' اونہوں۔ مذہب تو ایک مفروضہ ہے۔ سیدھے سادھے لوگوں کو راستے پر چلانے کے لیے ایک پگڈنڈی ہے۔ مذہب تو وسعت خیال کے راستے کی ایک رکاوٹ ہے۔ مذہب کو چھوڑو اپنے خیالات کو سیکلر بناؤ۔

ان مشاہیر کی باتیں نئی تھیں۔ جاذب تھیں' معقول تھیں' وقت یہ تھی کہ وہ بہت سے تھے' ہر کوئی اپنی ڈفلی پیٹ رہا تھا۔ نوجوان ذہن میں بہت سی نئی باتیں ڈال دی جائیں تو وہ ابلنے لگتا ہے' خمیر اٹھتا ہے' جھاگ پیدا ہوتی ہے' بلبلے ہی بلبلے اتنی ساری باتیں میرے ذہن میں پڑیں تو میں ہکا بکا رہ گیا' کنفیوز ہو گیا۔ جوں جوں زیادہ کنفیوز ہوتا توں توں زیادہ مطالعہ کرتا۔ جوں جوں زیادہ مطالعہ کرتا توں توں زیادہ کنفیوز ہوتا۔

آوارگی

راستہ تلاش کرو' یہ دور مسلسل آوارہ گردی میں صرف ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ آوارہ گردی کی خو پڑ گئی اور آوارگی میں لذت آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آوارگی میری منزل بن گئی۔

اس دور میں یہ عظیم حقیقت میری آنکھوں سے اوجھل رہی کہ ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں سمجھتا رہا کہ ماننے کیلئے جاننا اشد ضروری ہے۔

مجھ میں جاننے کی طلب تو تھی مگر اس طلب کی کوئی سمت نہ تھی۔ یہ جاننا ایلس ان ونڈر لینڈ کے مترادف تھا۔

برٹرینڈ رسل نے مجھے سائنسی زاویہ نظر اپنانے کا درس دیا لیکن یہ بات نہ بتائی کہ سائنس کی تو اپنی کوئی منزل نہیں۔ وہ تو خود آوارگی کی دلدادہ ہے۔ اس کی تگ و دو سمت سے نا آشنا ہے۔

سائنسی زاویے نے مجھے شکی بنا دیا۔ کیوں' کیسے' کس لیے' بیسیوں منفی سوالات میرے ذہن میں مکوڑوں کی طرح رینگنے لگے۔

پرانے خیالات' رسم و رواج بزرگوں کے اقوال روایت سب جھوٹے مفروضے بن کر رہ گئے' پتھر کے بت' جنہیں لوگ عادتاً" اور رسماً" پوجتے تھے۔ ماضی کی مکڑی کے تنے ہوئے جالے

اور انہی جالوں میں ایک طرف اللہ میاں دوزخ کی بھٹی سلگائے اور بہشت کا سبزہ زار سجائے بیٹھے تھے۔

آوارگی کے اس دور میں چند ایک کتابیں اسلام پر بھی نظر سے گزریں۔ یہ کتابیں یا تو مغربی مشاہیر کی لکھی ہوئی تھیں اور یا ہندو مورخوں کی۔

یہ وہ دور تھا جب مغربی مصنف محمدؐ کو ڈی سے نہیں بلکہ ٹی سے لکھتے تھے (Mohamat) اور اسلام کو محمدؐ ازم لکھتے تھے (Mohaametism) یہ ٹی تحقیر کا اظہار تھی۔ عیسائی اور ہندو مصنف اسلام کے خلاف تعصب سے بھرے ہوئے تھے۔ کروسیڈز کی یاد ابھی تازہ تھی۔

تعصّب

عیسائیوں کا اسلام کے خلاف پراپیگنڈا دو بنیادوں پر استوار تھا' ایک یہ کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا اور دوسرے یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا حرم تھا' جس میں کئی ایک بیویاں اور ان گنت لونڈیاں شامل تھیں۔

اس زمانے میں مجھے علم نہ تھا کہ صلیبی جنگوں کے بعد عیسائی طاقتوں نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ اسلام یورپ کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے' جسے زور بازو یا دلیل سے دبانا ممکن نہیں۔ اس خطرے سے مقابلہ کرنے کے لئے مسیحی طاقتوں نے بہت سی خفیہ انجمنیں بنا رکھی تھیں' جن کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اسلام سے متعلق تحقیر کا جذبہ پیدا کیا جائے اور اسے ہوا دی جائے۔ ان انجمنوں کی ریشہ دوانیوں کے زیر اثر مخلص مصنفین بھی اسلام کے خلاف تعصب روا رکھتے تھے۔ اور اسلام پر کیچڑ اچھالتے تھے۔ ناول نگار اپنے موضوع سے ہٹ کر بر سبیل تذکرہ حضور ﷺ پر رکیک حملے کیا کرتے تھے۔

ان تحریروں کا یہ اثر ہوا کہ میرے دل میں حضور ﷺ اور جنس ایسوسی ایٹ ہو گئے۔ جب بھی میں حضور ﷺ کے متعلق سوچتا تو ذہن میں جنس کی عریاں تصاویر ابھرتیں۔

بچپن ہی سے تورانی طور پر میں فینٹیسی (Fantasy) کا عادی ہوں اور چونکہ میری قوت واہمہ جنس کی طرف مائل تھی۔ اس لیے ہر متبرک شخصیت جگہ یا چیز کا خیال میرے ذہن میں عریاں تصاویر کی ایک ریل چلا دیتا تھا۔

اس خطرناک صورت حال سے بچنے کا صرف ایک طریقہ تھا' وہی طریقہ جو بلی کی موجودگی میں کبوتر عمل میں لاتا ہے۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خود کو محفوظ کر لیا۔ میں نے بھی اللہ میاںؐ' حضور ﷺ اور اسلام کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو محفوظ کر لیا۔

ہم جو ہیں

اللہ میاں کی موجودگی کا یہ نیا احساس جو مجھ میں جاگا یا مجھ پر طاری کیا گیا تھا' قطعی طور پر مختلف تھا' متضاد تھا۔ ڈر یا خوف کے احساس سے مبرا تھا۔

اللہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ انداز میں ایک بے نام لگاؤ تھا۔ ان کا وجود حوصلے کا باعث تھا۔ گھبراؤ نہیں' سب ٹھیک ہے۔ تم اکیلے نہیں ہو' ہم جو ہیں۔

میرے لیے یہ احساس بالکل نیا تھا' باعث حیرانی تھا۔ میں یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے کوئی بچہ ماں کی گود میں ڈال دیا گیا ہے۔

ان دنوں میں عالم حیرت میں تھا۔

پہلے میں رقت کے عالم میں بے ساختہ بھیں بھیں کر کے رونے پر حیران ہوا کرتا تھا' یہ کیا ہو رہا ہے۔

اب میں ڈال ڈال' پات پات میں اللہ میاں کو جھانکتے ہوئے محسوس کر کے حیران ہو رہا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔

مجھے علم نہ تھا کہ یہ سب کچھ مرد قلندر کے مزار پر حاضری دینے یا بھائی جان کی توجہ کا نتیجہ ہے۔

عزیز ملک نے بارہا مجھے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اللہ کے بندوں کی توجہ صحرا میں گل و گلزار کھلا سکتی ہے' لیکن مجھے ملک صاحب کی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔

ستائیسواں باب

بھائی جان

بھائی جان سے دو ایک مختصر ملاقاتیں ہوئیں' یوسف ظفر کے ہاں یا عزیز ملک کے گھر' لیکن ان ملاقاتوں میں میں ان سے کھل کر بات نہ کر سکا۔ اس کے باوجود ان کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا۔

میرے اندازوں کے مطابق نہ تو وہ بزرگ نظر آتے تھے' نہ ہی پیر فقیر' سائیں یا درویش۔ وہ ایک متوازن اور باوقار انسان لگتے تھے۔

ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ تھا' عزیز ملک' عزیز ملک اپنی جلالی طبیعت کے باوجود' ذہنی طور پر ایک ٹھہرا ہوا آدمی تھا انٹروورٹ ہونے کے باوجود' وہ حقائق سے چشم پوشی نہیں کرتا تھا اور اس کے جائزے بڑی حد تک خارجی یا ابجکٹیو ہوتے تھے۔ لیکن وہ بزرگوں کے احترام میں گندھا ہوا تھا۔ اس لیے میں نے بھائی جان کے متعلق عزیز ملک سے پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ مرد قلندر کے تذکرے میں عزیز ملک نے دو محبان وطن کے تحت خواجہ جان محمد بٹ اور سائیں کرم دین کا سرسری ذکر کیا تھا۔ میں نے وہ باب از سر نو توجہ سے پڑھا۔ عزیز ملک لکھتے ہیں۔

"مجھے ۱۹۳۶ء کے وہ ایام اب بھی یاد ہیں' جب میں نے جانِ محمد بٹ کو پہلے پہل دیکھا تھا' دراز قامت' سرخ و سپید چہرا' آنکھوں پر دیدہ زیب طلائی چشمہ' سر پر نفیس ململ کی دستار' ایک باوضع حیثیت کا خوش پوشاک' باوقار انسان جو دوسرے کو خواہ مخواہ اپنی جانب متوجہ کرتا تھا۔

بچپن میں والدہ کی وفات کے بعد آپ نے بہت تنگ دستی کے دن دیکھے تھے۔ جوانی تک حالات ناساز گار رہے تھے۔ پھر مسلسل محنت و مشقت کا دور آیا۔ مختلف نوع کے کام کیے' کینٹین چلائی۔ اونچے درجے کے ہوٹلوں کے منیجر رہے۔ چونکہ آپ مری میں مقیم تھے اور ان دنوں مری میں انگریز گورے اور بیرونی سیاح آیا جایا کرتے تھے اس لیے بھائی جان نے مناسب آداب اور اصولوں کے مطابق زندگی کو ڈھال لیا تھا۔ عمر کے آخری دور میں آپ نے فنِ تعمیر کا کام اپنا لیا۔ مری اور اسلام آباد میں آپ کی بنائی ہوئی بہت سی عمارتیں آج بھی ان کی یاد دلاتی ہیں۔

جوانی میں حسن کا یہ عالم تھا کہ میمیں اور خواتین دیکھ کر بس میں نہ رہتی تھیں سائیں اللہ بخش کے دائرہ عقیدت میں آنے کے بعد بھی یہ کیفیت قائم رہی۔ کسی غیبت پسند نے سرکار قبلہ تک یہ خبر پہنچا دی۔ کہنے لگا' اپنے بالکوں کی جانب توجہ رکھیے عالی جاہ۔ آپ کا ایک مرغا مرغیوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔

سائیں اللہ بخش کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا۔ طبیعت میں جلال تو تھا ہی غضب میں آجاتے تھے تو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

سائیں کرم دین

خوش قسمتی سے عین اس وقت سائیں کرم دین آ گئے۔ سائیں کرم دین کی ساری عمر بزرگوں کی حاضری میں گزری تھی' وہ ایسی صورت حالات میں ان کی توجہ کو دوسری جانب منعطف کرنا جانتے تھے۔ سائیں اللہ بخش غصے میں بولے' کرم دین۔ ہمارا مرغا جو مرغیوں کے پیچھے پھرتا ہے تو کیوں نہ اسے حلال کر لیں۔

جواب میں کرم دین بولے۔ سرکار قبلہ کون جانے صورت حال کیا ہے' آیا مرغا

مرغیوں کے پیچھے پھرتا ہے یا مرغیوں نے مرغے کے پیچھے پیچھے پھر کر اس کی زندگی حرام کر رکھی ہے۔ اور وہ بچارہ جان بچاتا پھر رہا ہے۔

کرم دین کی بات سن کر سائیں اللہ بخش مسکرا دیئے اور بات ٹل گئی۔

سائیں اللہ بخش سے بھائی جان کی ملاقات سائیں کرم دین کی وجہ سے ہوئی تھی۔

سائیں کرم دین سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ سیالکوٹ کے ایک بزرگ غلام احمد ان کی تربیت فرماتے رہے۔ پھر ایک دن کہنے لگے' اب مزید تربیت کے لیے تم پنڈی چلے جاؤ۔ وہاں ایک بزرگ تمہیں ملیں گے۔ ان کے احکامات کی پابندی کرنا وہ تمہاری تربیت کریں گے۔

کرم دین' پنڈی آ گئے۔ محنت کش آدمی تھے' ضروریات بہت کم تھیں۔ گزارہ ہو جاتا تھا۔ کرم دین بیکری کے کام میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے صدر میں ایک دکان حاصل کی اور وہاں بیکری کی چیزیں بنانے لگے۔ بیوی بچے تھے نہیں چونکہ عمر بھر شادی نہ کی تھی۔

کرم دین کئی ایک سال پنڈی میں اس امید پر گھومتے پھرے کہ مرشد نے جس بزرگ کی خبر دی تھی' ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ طبیعت کے بہت صابر اور بے نیاز تھے کہ ٹھیک ہے جو مالک کی مرضی۔

پھر ایک روز کسی کام سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک درویش صورت آدمی چلا آتا ہے قریب آ کر وہ رک گیا' کرم دین کو روک لیا' خیریت پوچھی۔

کرم دین سمجھ گئے کہ یہی وہ بزرگ ہیں جن کے پاس انہیں بھیجا گیا ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ پھر وہ انہیں اس کنٹین میں لے گئے جسے خواجہ جان محمد بٹ چلا رہے تھے۔ بھائی جان کی ملاقات سائیں اللہ بخش سے ہوئی اور وہ عقیدت کے بندھن میں ہمیشہ کے لیے بندھ گئے۔

مرد قلندر کے تذکرے سے یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نا میں سائیں کرم دین سے مل لوں۔ ایک مرتبہ راہ چلتے ہوئے عزیز ملک نے مجھے سائیں کرم دین کی بیکری دکھائی تھی۔

صدر بازار کے آخری سرے کے قریب وہ ایک عام سی دوکان تھی۔ بازار کی جانب اس کی شکل و صورت دکان کی سی تھی' لیکن پچھواڑے کی گلی سے وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ صحن کی ایک جانب ایک پینڈو شخص ہاتھ میں ایک بہت بڑا اڑے اٹھائے بھٹی کے سامنے بیٹھا تھا۔

اس کے چہرے پر عجیب سی کرختگی تھی۔ نہ نور' نہ ملائمت' نہ تمدن کے اثرات۔

میں نے جھک کر سلام کیا۔

وعلیکم السلام' انہوں نے میری جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ ذرا ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے بسکٹوں سے بھرا اڑے بھٹی میں ڈال کر بھٹی کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے' آیئے آیئے' بیٹھئے'

ہم دونوں صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا۔

کہنے لگے سرکار قبلہ جسے چاہتے ہیں بلا لیتے ہیں۔ وہ بڑے ڈاڈھے ہیں۔ مرضی کے مالک ہیں۔ کسی کی بات نہیں سنتے۔ کسی کو مزار پر بیٹھنے نہیں دیتے۔ ایک دو آدمیوں نے بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔ بس دو ایک دن بیٹھے تھے' تیسرے دن انہوں نے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ پھر کسی کی جرات نہ ہوئی۔

میں نے کہا سائیں جی میں بالکل' ان جان ہوں۔ اس راستے پر چلنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا' اسلام سے کورا ہوں' بالکل ہی بے خبر ہوں۔

وہ مسکرائے بولے' ہم سب ہی بے خبر ہیں جی۔ پہلے میں سیالکوٹ کے راستوں پر ٹھیڈے کھاتا رہا۔ پھر انہوں نے یہاں بھیج دیا اب پھر یہاں ٹھیڈے کھا رہا ہوں' بس راستہ ہی راستہ ہے' منزل کوئی نہیں ہے۔ شاید ہو' پر ہمیں پتہ نہیں ہمارا کام تو بس چلتے رہنا ہے۔

آپ راستے سے تو باخبر ہیں نا' مانوس تو ہیں۔ میں تو بالکل اناڑی ہوں۔ پہلے مجھ پر رقت طاری کر دی اور اب۔

سائیں جی قہقہہ مار کر ہنسے' بولے' سرکار قبلہ مالک ہیں۔ ایسے تماشے وہ اکثر دکھایا کرتے ہیں۔ دوجے کی مت مار دیتے ہیں۔ بابو جی آپ ان باتوں سے نہ گھبرائیں۔

سائیں جی گھبرانا تو ایک قدرتی بات ہے' جو بے خبر ہوتے ہیں وہ تو گھبرائیں گے۔

بابو جی' سائیں بولے' جد آپ بڈھے کے پاس آ گئے اور بڈھے نے آپ کو اپنا لیا تو گھبراہٹ کی بات تو ختم ہو گی۔ ہمارے پاس دو ایک بابو آتے ہیں۔ اچھے چل رہے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی اسم نہیں' نہ ہی کوئی وظیفہ ہے۔ یہ پیر کا ڈیرا نہیں فقیر کا ڈیرا ہے۔

بس ایک بات کا دھیان رکھیں' رکاوٹوں کی پرواہ نہ کریں۔ بڈھا ہر بات میں رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔ رکاوٹ ڈال کر وہ تماشا دیکھتا ہے' پرکھتا ہے' بچوں کی طرح خوش ہوتا ہے۔ یہ رکاوٹیں اصلی نہیں ہوتیں پرکھنے کی ہوتی ہیں کہ اس بندے میں کتنا حوصلہ ہے۔

بس من مست ہو کر بیٹھ رہو۔ پھر رکاوٹیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔

یہ جو آپ سوچوں میں پڑے ہیں نا بابو جی' ان سے نکل آئیں۔ یہ بھی تو رکاوٹیں ہیں۔ سوچوں میں نہ پڑیں۔ دل میں کہیں لے بڈھے تو جدھر لے جانا چاہے ہے لے چل۔ جو کشتی ڈگمگا رہی ہے تو پڑی ڈگمگائے ڈوب نہیں سکتی' کیسے ڈوبے گی' فقیر ڈوبن نہیں دیتا۔ صرف ڈگمگاتا ہے' چہلیں کرتا ہے' بابو جی بڈھا چہلیں کرلے چہلیں۔ جتنی مرضی ہے کرلے اپنا کیا جاتا ہے۔ ذات کا تو تو کھیون ہار ہی ہے نا' ڈوبن ہار تو نہیں ہے۔

سائیں جی قہقہہ مار کر ہنس پڑے' یہ چلتر ہم پر نہیں چلتے۔

سائیں جی سے مل کر بھی بھید نہ کھلا۔ جیسا گیا تھا ویسا ہی واپس آ گیا۔

کہتے ہیں سوچیں نہ سوچ' کیسے نہ سوچوں' جو ساری عمر سوچوں پر پلا ہو وہ بھلا سوچیں کیسے چھوڑ دے۔

ماننے والے

ایک روز مجھے خیال آیا کہ چلو ایک بار پھر بابے کے مزار کو دیکھوں۔ میرے دل میں سائیں اللہ بخش کی طلب نہیں تھی' میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیا بھید ہے۔ یہ کیسی طاقت ہے۔ یہ طاقت مجھ پر کیوں آزمائی گئی۔ مجھے کیوں چنا گیا۔ مجھ پر کیوں رقت طاری کی گئی۔

مزار پر پہنچا تو دیکھا کہ بھائی جان بیٹھے ہیں۔ انہیں اکیلا دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

آیئے آیئے' بھائی جان بولے' بہت اچھا ہوا آپ آ گئے۔ آیا کیجئے ——— بڈھے سے بیٹھ کر باتیں کیا کیجئے۔ اسے اپنی مشکلات بتایا کیجئے۔ ہم نے جو آپ کو بڈھا دے دیا

ہے۔ اب آپ اسے اپنا لیجئے نا۔

میں نے کہا بھائی جان مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔

کیا' وہ بولے۔

مجھ پر رقت کیوں طاری کی گئی۔

وہ مسکرائے' بولے' وہ مالک ہیں جسے چاہتے ہیں بلا لیتے ہیں۔

آپ ہی نے بلایا تھا مجھے مزار پر۔

ہاں' وہ بولے' مفتی صاحب ہم تو حکم ماننے والے ہیں۔ ماننے والے کا کام ماننا ہے۔ پوچھنا نہیں' مفتی جی ماننے میں سکھ ہی سکھ ہے۔ پوچھنے میں چنتا ہی چنتا ہے۔ اور چنتا ایسی جس کا کوئی انت نہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے اقبال بھی یہی کہتے ہیں کہ مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی' ماننا ہی بندگی ہے۔

میں نے کہا آپ کو علم تو ہو گا کہ۔

انہوں نے میری بات کاٹی بولے' میں عالم نہیں ہوں۔ مجھے مسائل کا علم نہیں۔ سرکار قبلہ نے ہمیں دو حرف بتائے تھے۔ صرف دو حرف۔ آج تک انہیں طوطے کی طرح رٹ رہے ہیں' دریں چہ شک' دریں چہ شک۔

میں نے کہا' جناب میرے جیسے لوگ جنہیں سوچنے کی عادت ہے وہ کیا کریں۔

بولے' کچھ نہیں کرنا' کچھ بھی نہیں۔ بس اپنا آپ حوالے کر دو۔ کہو' لے سائیں لے' یہ میں ہوں' اس سے جو چاہے کر۔

مفتی جی' وہ بولے' جب حضور پہلی بار مجھ سے ملے تھے تو میں بھی سوچتا تھا' ایسے کیسے ہو گا۔ آپ نے تو بات کہہ دی ہے۔ مجھ میں جرات نہیں تھی کہ کہوں۔ سرکار قبلہ بولے' بٹ صاحب سوچ تو ایک روک ہے۔ روک لیتی ہے۔ آگے جانے نہیں دیتی۔ سوچ پہنچاتی نہیں۔ جو چیز کہیں پہنچاتی نہیں اس کا سہارا کیا لینا۔

بھائی جان کی باتیں اتنی معصوم تھیں' اتنی سادہ تھیں کہ جواب میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ باتیں ضعیف الاعتقادی کی باتیں نہ تھیں' وہ جذباتی باتیں نہ تھیں۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو جواب دینے پر اکساتی ہیں۔ بولو' بولو۔ کچھ ایسی ہوتی ہیں جو بولنے

نہیں دیتیں' چپ کرا دیتی ہیں۔

بھائی جان کی باتوں نے مجھے چپ کرا دیا اور میں گھر چلا گیا۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں پریشان تھا۔ یہ میں کہاں آگیا ہوں۔ یہ کون سی دنیا ہے۔

اس کے بعد بھائی جان سے کئی ایک ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سب سے نمایاں بات یہ تھی کہ وہ اپنی جانب توجہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ توجہ سرکار قبلہ کی طرف مبذول کر دیتے تھے' وہ ہر کریڈٹ سرکار قبلہ کے قدموں میں رکھ دیتے۔ ان کی گفتگو کا مرکز سائیں اللہ بخش تھا ---------ان کی گفتگو کا دوسرا موضوع پاکستان تھا۔ کہتے تھے' تم پاکستان کا فکر نہ کریں۔ پاکستان کا فکر کرنے والے موجود ہیں۔ اللہ کا بوجھ آپ خود اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ آپ صرف یہ کریں کہ جب بھی کوئی قدم اٹھانے لگیں تو یہ سوچیں کہ آپ کا یہ قدم پاکستان کے لئے باعث نقصان تو نہیں ہو گا۔

ان کا ایمان تھا کہ پاکستان کے متعلق سرکار قبلہ کا ایک پراجیکٹ ہے' جو ہو کر رہے گا۔

راستے کے متعلق ان کا خیال تھا کہ راستہ تو بہت ہی سیدھا اور صاف ہے اس میں کوئی الجھاؤ نہیں' کوئی ہیرا پھیری نہیں' کوئی مشکل نہیں' ایک تو اللہ سے اپنا تعلق بڑھاؤ۔ اسے پاس بٹھائے رکھو۔ اس سے باتیں کرو' اسے انگلی لگا کر ساتھ لئے پھرو۔ اس سے بہتر ساتھی کوئی نہیں ملے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کے بندوں کے کام آؤ۔ ان کی خدمت کرو۔ ان کو سہارا دو' حوصلہ دو' ان سے میٹھا بول بولو۔ وہ تمہارے میٹھے بول کے محتاج ہیں۔

بھائی جان کہتے تھے' بس اتنی سی بات تو ہے۔

ان دنوں بھائی جان مری میں رہتے تھے۔ مری میں عمارتیں بنانے کے ٹھیکے لیتے تھے۔ مری میں ان کی بڑی شہرت تھی کہ وہ واحد ٹھیکے وار ہے جو تعمیر کے سامان اور مصالحے میں بددیانتی نہیں کرتا' جو پورا مصالحہ لگاتا ہے اور معاملے میں صاف ستھرا ہے۔

بھائی جان کبھی کبھی پنڈی آتے تھے۔ مزار پر حاضری دیتے۔ ہم سب سے ملتے اور پھر وہ واپس مری چلے جاتے۔ یوں تو مزار پر بہت سے لوگ آتے تھے۔ لیکن مزار پر کوئی متولی نہ تھا۔ بھائی جان کہتے تھے۔ سرکار قبلہ مزار پر کسی کو بیٹھنے نہیں دیتے' پیر خانہ بننے نہیں دیتے۔ دو ایک

حریصوں نے بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔ پھر وہ بری طرح سے بھاگے۔ مزار پر چھت ڈالنے نہیں دیتے۔ گنبد بنانے نہیں دیتے' بس یہ ایک چھوٹی سی چار دیواری ہے۔ ہم نے اسے اونچا کرنا چاہا۔ بڑی منتیں کیں' نہیں مانے۔

مزار کے قریب ہی دو ایک گھر بنے ہوئے تھے۔ وہاں ایک گھر میں میرا رہتا تھا۔ میرا مزار کی صفائی کر دیتا تھا۔

بھائی جان سے ملنے والے ہم چند لوگ تھے۔

عزیز ملک تھا' آغا حنیف تھا۔ یہ دو اشخاص ایسے تھے جنہیں بیس پچیس برس سائیں اللہ بخش کی خدمت میں بیٹھنے کا شرف حاصل تھا۔ انہیں سرکار قبلہ سے بہت عقیدت تھی' وہ بھائی جان کا بھی احترام کرتے تھے چونکہ بھائی جان سینئر تھے لیکن بھائی جان کے وسیلے کو نہیں مانتے تھے چونکہ ان کا کہنا تھا کہ ہمارا سائیں اللہ بخش سے براہ راست تعلق ہے۔

حنیف آغا

آغا حنیف ایک خوش شکل' خوش لباس اور خوش گفتار نوجوان تھا۔

وہ ایک نہایت اچھے اور جانے پہچانے شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

دیکھنے میں وہ ایک ماڈرن اور کلچرڈ شخص نظر آتا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ اسے ایک خانقاہ پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ ایک پڑھا لکھا کلین شیو اور مہذب آدمی پیری فقیری کے جال میں کیسے پھنس گیا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ آغا حنیف کو سرکار قبلہ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ بڑی عقیدت اور خلوص سے روزانہ سرکار قبلہ کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ سرکار قبلہ کی لگن اسے نوجوانی ہی میں لگ گئی تھی۔ اور وہ گذشتہ بیس پچیس سال سے سرکار قبلہ کی عقیدت میں سرشار تھے۔

صرف حنیف آغا ہی نہیں' اس کے بھائی بھی سرکار قبلہ کی عقیدت میں سرشار تھے۔

حنیف آغا ملٹری اکاؤنٹس کے محکمے میں ملازمت کرتا تھا' دفتر میں اس کا سٹیٹس ایک اسسٹنٹ کا تھا۔ اگرچہ اس نے افسری کا امتحان پاس کر رکھا تھا لیکن ابھی تک افسر کی حیثیت سے اس کی تقرری نہیں ہوئی تھی۔ نام ویٹنگ لسٹ پر تھا۔ آغا کی خواہش تھی کہ اسے ملازمت میں

سٹیٹس حاصل ہو اور وہ ہر لحاظ سے اونچے عہدے پر فائز ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اس کے علاوہ آغا میں ادبی صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ ایک عالمی لٹریری سوسائٹی "PEN" کا رکن تھا اور مقامی برانچ کا سیکرٹری تھا۔

آغا کی خواہش تھی کہ وہ اکاؤنٹنٹس کی بجائے کسی علمی ادبی محکمہ میں ملازمت حاصل کر سکتا۔

پھر پتہ نہیں راجہ شفیع کس طرح مزار پر آ پہنچا۔

راجہ شفیع

اس روز یوسف ظفر کے مکان کے نیچے سے راجہ شفیع نے چیخ کر کہا تھا' اگر آپ مجھے ان بزرگ سے ملوانا نہیں چاہتے' تو نہ سہی' کوئی بات نہیں۔ میں خود ان سے مل لوں گا۔ پھر پتہ نہیں کیسے وہ از خود مزار پر آ گیا۔ بھائی جان سے ملا۔ پہلی ہی ملاقات میں بھائی جان سے اس قدر عقیدت ہو گئی اور بھائی جان کو راجہ شفیع کی طبیعت اس قدر پسند آئی کہ ہم سب حیران رہ گئے۔

راجہ شفیع طبیعت کے لحاظ سے ایک بانکا آدمی تھا۔ اچھا کھاتا تھا۔ اچھا پہنتا تھا' اچھا جیتا تھا۔

طبیعت کے لحاظ سے راجہ شفیع لاہور کا بھا بھا تھا۔ جذبات سے چھلکتا ہوا۔ خدمت کا رسیہ' عقیدت میں سرشار۔ تھا تو محکمہ ری ہیبلیٹیشن میں ایک کلرک لیکن پنڈی کے بیشتر لوگ اس کے گرویدہ تھے۔ وہ حتی الوسع ہر حاجت مند کا کام کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک مجلسی آدمی تھا' لوگوں سے رابطہ رکھتا تھا۔

راجہ شفیع کا ایک دوست غلام دین وانی بھی مزار پر آنے جانے لگا تھا۔ غلام دین وانی کشمیر کا جانا پہچانا لیڈر تھا۔ اسے سیاست سے بڑی دلچسپی تھی' ساتھ ہی دیانت کا جنون تھا۔ دونوں باتیں ساتھ نہیں چل سکتی تھیں' اس لیے وانی کی سیاست زیادہ تر منہ زبانی تھی۔

رُخ

یہ دور میری زندگی کا ایک عجیب دور تھا۔

میرا رخ بدل چکا تھا۔ نقطہ نظر بدل چکا تھا۔ نگاہ کے سامنے کا منظر بدل چکا تھا۔ سمجھ میں

نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ ایسا لگتا تھا' جیسے کسی ان جانے ہاتھ نے میری گردن کو تھما کر سر کو دوسری جانب موڑ دیا ہو' پہلے میرا رخ مغرب کی جانب تھا۔ اب پتہ نہیں کس جانب کر دیا گیا تھا۔

پہلے میری نگاہ میں بستیاں تھیں' عمارتیں تھیں' کارخانے تھے' بھیڑ تھی' ہجوم تھے' رونق تھی' گہما گہمی تھی۔ اب پھیلاؤ ہی پھیلاؤ تھا' پہاڑ تھے' وادیاں تھیں' آسمان تھا۔ یہ پھیلاؤ ویرانہ نہیں تھا۔ بلکہ آبادی سے زیادہ آباد تھا۔ ہر پتا زندگی سے بھرا ہوا تھا' ہر پتھر میں ایک نظام سانس لے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر چیز ایک ہی مرکز کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ اس پر میں گھبرا جاتا۔ یہ سب کیا ہے۔

پھر ایک مسکراہٹ چاروں طرف پھیل جاتی۔ اوپر گونجتی' میں سر اٹھا کر دیکھتا۔ آسمان سے ایک زیرلبی سنائی دیتی۔ ہاں میں ہوں۔

یہ ایک عجیب کیفیت تھی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب میں رات کے وقت بستر پر لیٹتا تو میرے دل سے ایک احتجاج اٹھتا۔ یہ کیا ہو رہا ہے' کیوں' پھر میں سوچ میں ڈوب جاتا۔

کیا یہ سب کچھ اس رقت کا نتیجہ ہے جو مجھ پر طاری کی گئی تھی۔ کیا میرا دل اس رقت کی وجہ سے اب اس قدر رقیق ہو چکا ہے کہ اس میں سے چھینٹے اڑتے ہیں اور میرا ذہن۔ اسے کیا ہوا۔ وہ تو بالکل ہی اُلٹ پُلٹ ہو گیا ہے۔ ایک معمولی سا سبز پتا دیکھتا ہوں تو اس میں سے "دی گریٹ ڈیزائنر" جھانکتا ہے' ہر ذرے میں ایک کائنات نظر آتی ہے۔

نہیں نہیں' میرے اندر کوئی چیختا' میں اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں اس جادو نگری میں رہنا نہیں چاہتا' اس وقت رضائی میں ایک چار دیواری گھومتی ہوئی آ داخل ہوتی۔ بابا گھورتا' بھائی جان مسکراتے' پھر کوئی کہتا۔ تم جو چاہو کرو' ہم جو چاہیں گے کریں گے۔

دقت یہ تھی کہ میرا اپنا نظام آرزو میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ جس گھوڑے پر میں زندگی بھر سوار رہا تھا اس کی لگام میرے ہاتھ سے چھین لی گئی تھی۔

ڈائریکٹر ضیاء الاسلام

ان دنوں میری زندگی کی سب سے بڑی پریشانی دفتر تھا۔ دفتر میں میں ایک فاضل پرزے کی

طرح بیکار پڑا تھا۔ دفتر کا شاف میرے قریب آنے سے خائف تھا کہ ڈائرکٹر کو پتہ چل گیا تو وہ اس کے غضب کے شکار ہو جائیں گے۔ صرف ایک خاتون ربیعہ فخری تھی جس نے اعلانیہ مجھ سے رابطہ قائم رکھا ہوا تھا۔

ڈائریکٹر صاحب روز بلاناغہ ایک نا ایک آرڈر ایسا اشو کرتے تھے' جس میں میری تذلیل کی جاتی تھی۔ وزارت کو روز میرے خلاف رپورٹیں بھیجی جاتی تھیں۔

حیرت کی بات تھی کہ جس روز میں مزار پر گیا تھا' اس کے بعد دفتر کی پریشانی میرے ذہن میں دھندلا گئی تھی' اس میں کاٹ نہیں رہی تھی۔ جیسے پین کلر (Pain Killer) کھانے کے بعد درد میں ٹیس نہیں رہتی۔ وہ ایک گھٹن میں بدل جاتا ہے۔

ڈائریکٹر صاحب جو اس سے پہلے میرے شانوں پر بیٹھے رہتے تھے۔ اب دور جا بیٹھے تھے اور ان کا غم و غصہ صابون کے بلبلوں میں بدل گیا تھا۔

بھائی جان جب بھی مجھ سے ملتے کہتے' آپ ظلمت کا فکر نہ کریں' اس میں ڈنک نکال دیا گیا ہے۔ اب وہ خالی بھوں بھوں کر رہا ہے۔ کرنے دیں اسے بھوں بھوں۔ بھائی جان ڈائریکٹر ضیاء الاسلام کو ظلمت کہا کرتے تھے۔

اس دور میں میرا واحد ساتھی راجہ شفیع تھا۔ راجہ شفیع ذہنی آدمی نہیں تھا۔ دانش ور نہیں تھا۔ وہ دل کے زور پر جیتا تھا' اس لئے سکھی رہتا تھا۔ اس کی زندگی میں ایک روانی تھی۔ اس میں سے جذبات کی ایک پھوار اڑتی رہتی تھی۔ جو گرد و پیش کو بھگو دیتی تھی۔ اگرچہ وہ پیر فقیر کو بہت ماننے والا تھا لیکن بھائی جان نے اس کے دل میں عقیدت کا ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا جو پہلے کبھی پیدا نہ ہوا تھا۔

راجہ شفیع رسمی خیالات اور عادات اور جذبات میں بری طرح گندھا ہوا تھا۔ اس نے سچے دل سے بھائی جان اور سائیں اللہ بخش کو اپنا پیر مان لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ رسمی انداز سے اپنی عقیدت کا اظہار کرے۔ جب اس کے اظہار کا راستہ روک لیا جاتا تو وہ دکھی ہو جاتا اور دکھ دور کرنے کے لیے میری طرف دوڑتا تھا۔ مجھ سے مل کر وہ شکایت کا اظہار کرتا' کہتا مفتی میں کیا کروں۔

کیوں کیا مشکل ہے' میں اسے پوچھتا۔

بڑی مشکل ہے یار' بڑی مشکل ہے۔ دیکھ نا ہم زمیندار لوگ ہیں' زمینوں سے کنک آتی ہے' دالیں آتی ہیں' گڑ آتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جو چیز آئے وہ بھائی جان کو دوں۔ لیکن کیوں' میں اس سے پوچھتا' تم رسمی مریدوں کی سی حرکتیں کیوں کرتے ہو۔

بھئی کیوں نہ کروں۔ عقیدت اور محبت کا اظہار ایسے ہی تو ہوتا ہے۔ وال لے کر جاتا ہوں تو وہ کہتے ہیں نہیں نہیں لین دین کا معاملہ چھوڑو۔ ہمارا تعلق لین دین کا تعلق نہیں ہے۔ لیکن کیسے چھوڑوں۔ لین دین ہی تو تعلق ہوتا ہے' اس کے بغیر کیسے تعلق ہو سکتا ہے۔

میں اسے سمجھاتا' راجہ بھائی جان رسمی پیر نہیں ہیں۔ پھر تو کیوں رسمی مرید بنتا ہے۔ تو تو زبردستی انہیں رسمی پیر بنا رہا ہے۔

میں کیا کروں' وہ چلاتا' دیے بغیر میری تسلی نہیں ہوتی۔

راجہ کو یہ بات سمجھانا بہت مشکل تھا۔

انکوائری

پھر ایک روز دفتر میں ایک زیر لبی اٹھی اور سارے دفتر میں پھیل گئی۔ لوگ ایک دوسرے کے کانوں میں باتیں کرتے اور پھر میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے۔

وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ مجھے ایک چار دیواری نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان دنوں دفتر میرے لیے بھڑوں کا ایک چھتہ تھا جو مسلسل بھن بھن کرتا رہتا۔ لیکن مکھیاں چار دیواری کے اندر نہیں آسکتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے ڈنک نکال دیئے گئے ہوں اور خالی بھن بھن رہ گئی ہو۔

چاروں طرف سے مجھے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں' انکوائری ہو گی۔ انکوائری تو آئے دن ہوتی رہتی تھی۔ ہر آٹھویں دسویں دن کے بعد وزارت امور کشمیر سے دو افسر آ جاتے۔ آتے ہی وہ ڈائریکٹر کے کمرے میں جا داخل ہوتے۔ پھر کمرے سے غصے بھری آوازیں بلند ہوتیں۔ چائے کے پیالے کھنکتے اور پھر دونوں افسر میرے کمرے میں داخل ہو جاتے۔ ہم انکوائری آفیسرز ہیں' منسٹری سے آئے ہیں۔ آپ ہمارے سوالات کا جواب دیں۔

جی میں گذشتہ تین مہینے سے یہی کام کر رہا ہوں۔

آپ کا مطلب۔

آپ کی وزارت مسلسل سوالات پوچھے جا رہی ہے۔ فیصلہ کرنا نہیں جانتی۔

فیصلہ نہ ہونا آپ کے حق میں ہے۔ ہو گیا' تو آپ کے خلاف ہو گا۔

بسم اللہ میرے خلاف ہو' مگر ہو تو۔ حاکم اگر فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو معاملات لٹکے رہتے ہیں اور یہ بات نظم و نسق کے حق میں نہیں ہے

آپ بہت باتیں کرتے ہیں۔

جی' ملزم کو حق ہوتا ہے کہ وہ باتیں کرے۔

آپ یہ بتائیں کہ آپ کیا کام کر رہے ہیں آج کل۔

کچھ نہیں۔

کیوں۔

اس لیے کہ کام مجھ سے لے لیا گیا ہے۔ مجھے فارغ کر دیا گیا ہے۔

آپ کو کیوں فارغ کر دیا گیا ہے۔

یہ سوال آپ ان سے پوچھیں' جنہوں نے فارغ کیا ہے۔

آپ کے ڈائریکٹر آپ سے ناخوش ہیں۔

ظاہر ہے۔

کیوں ناخوش ہیں۔

ان سے پوچھ کر اگر آپ یہ بات مجھے بتا دیں تو شکر گزار ہوں گا۔

آپ کا رویہ ٹھیک نہیں۔

غالباً

آپ اپنا رویہ ٹھیک کریں۔

یونہی انکوائری افسر مجھ سے پوچھتے رہتے۔

آٹھ دن کے بعد وہ پھر آ جاتے اور وہی سوال دہرانے لگتے' جیسے سوئی اٹکی ہوئی ہو۔ تین ماہ سے یہی عمل دہرایا جا رہا تھا۔

اب کی بار دفتر میں انکوائری کی زیر لبی میں ایک نیا پن تھا۔

پھر ایک دفتری آرڈر آگیا ــــــــــــ لکھا تھا کہ یہ دفتر وزارت اطلاعات کے تحت کر دیا گیا ہے' اس لیے کراچی سے وزارت اطلاعات کے ڈپٹی سیکرٹری انکوائری کے لیے آ رہے ہیں۔ مجھ پر لازم ہے کہ میں دفتر میں حاضر رہوں۔

اتفاق سے ان دنوں بھائی جان پنڈی میں ہی تھے۔

شام کو میں نے ان سے بات کی کہ کراچی سے انکوائری افسر آ رہے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ بھائی جان یہ خبر سن کر فکر مند ہو جائیں گے' لیکن وہ تو یوں کھل اٹھے جیسے خوشخبری ہو۔

بولے بہت اچھا ہے' بہت اچھا۔ انہیں آنے دو۔ آپ بھی کراچی سے ہو آئیں تو مناسب ہے۔

نہیں بھائی جان میں کراچی نہیں جا رہا' انکوائری افسر کراچی سے آ رہا ہے۔

وہ مسکرائے۔ آپ کا محکمہ اب وزارت اطلاعات کے تحت ہو گیا ہے نا' وہ بولے' انشا اللہ سب کچھ سرکار قبلہ کے پروگرام کے مطابق ہو گا۔ انشاء اللہ۔ پاکستان کی عظمت کا دور آ کے رہے گا۔ وہ دن دور نہیں جب پاکستان قابل نظارہ ہو گا۔ سارے مسلم ممالک ایک ہو جائیں گے۔ نشاۃ ثانیہ کا منظر ہو گا۔

بھائی جان کی بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں اپنی انکوائری کی بات کر رہا ہوں اور یہ مجھے نشاۃ ثانیہ کا قصہ سنا رہے ہیں۔ میں بتا رہا ہوں کہ انکوائری افسر کراچی سے آئے گا اور یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ بھی کراچی سے ہو آئیں تو بہتر ہے۔

رات کو سوتے وقت دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ بھائی جان سرکار قبلہ کے پروگرام کی بات کیوں کر رہے تھے کیا میں بھی اس پروگرام میں شامل تھا۔ لاحول ولا قوۃ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری کیا حیثیت ہے کہ بڑوں کے پروگرام میں میرا بھی کوئی حصہ ہو۔ میری حیثیت تو حرف مہمل جیسی ہے جو خانہ پری کے کام آتا ہے۔

پھر مجھے خیال آتا کیا بزرگوں کے بھی کوئی پروگرام ہوتے ہیں۔ نہیں نہیں' ان کے ذاتی پروگرام کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ تو ذات کی نفی کر چکے ہوتے ہیں۔ پھر ذاتی پروگرام کا مطلب۔ پروگرام تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہو سکتا ہے وہ جو قادر مطلق ہے' دی گریٹ پلینر۔

پھر خیال آتا کہ جو مرحوم و مغفور ہو چکے ہوں' کیا وہ دنیاوی معاملات میں دلچسپی لے سکتے ہیں۔ دنیاوی امور سے فارغ ہونے کے بعد پھر سے اس دلدل میں لت پت ہونا۔ نہیں نہیں ساری بات ہی بے معنی ہے۔ بھائی جان کی عقیدت پھلجھڑیاں چلا رہی ہے۔ سرکار قبلہ کے متعلق وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہمیاں رچائے بیٹھے ہیں۔

انکوائری افسر میں ڈپٹی سیکرٹری ہونے کے باوجود اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ السلام علیکم کہہ کر وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ عین اس وقت ڈائرکٹوریٹ کے دو افسر کاغذ پنسلیں اور فائیلیں اٹھائے ہوئے داخل ہوئے۔ بولے' ہمیں ڈائریکٹر صاحب نے بھیجا ہے تاکہ بیانات کو ریکارڈ کرتے جائیں۔

نہیں' وہ بولا' فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ میں ان سے تخلیے میں بات کروں گا۔ جب فارمل انکوائری کا مرحلہ آئے گا تو میں آپ کو بلا لوں گا' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ بولا۔ مفتی صاحب میں نے ساری فائل کا مطالعہ کیا ہے۔ جو جو آپ پر الزامات ہیں اور جو جو جوابات آپ نے دیئے ہیں۔ اب میں آپ سے چند نجی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں آف دی ریکارڈ ہیں۔ جو کچھ بھی آپ کہیں گے اسے آپ کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے بلا خوف خطر کھلے دل سے بات کریں۔

آپ بتائیے کہ ڈائریکٹر صاحب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

ماتحت کی افسر کے متعلق رائے۔ بے معنی سی بات ہے۔

بالکل بے معنی بات ہے' وہ بولا' لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا۔

اچھا' میں نے جواب دیا' آپ ان کے کس پہلو کے متعلق میری رائے جاننا چاہیں گے۔

ان کی شخصیت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے' اس نے پوچھا۔

وہ ایک محنتی آدمی ہے۔ کام میں بہت ایفی شنٹ ہے' خوش پوش ہے' خوش خور ہے۔ ہوٹل میں رہتا ہے۔ مجلسی زندگی سے محروم ہے۔ ہر وقت ذہن پر دفتری زندگی مسلط رہتی ہے۔ تجرد کی زندگی گزار رہا ہے' اس لیے مشکوک ہے' گھر والی سے اچھے تعلقات نظر نہیں آتے۔ اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتا۔ غصیل ہے' ضد پر آ جائے تو خدا بن کر بیٹھ جاتا ہے۔

میری رائے سن کر وہ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔

پھر بولا۔ پہلے آپ سے کیسے تعلقات تھے۔

بہت عمدہ' میں نے جواب دیا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ میں فیورٹ ہوں۔ واقعی میں میں فیورٹ تھا۔

پھر وہ کس بات پر بگڑ گیا۔

مجھے علم نہیں۔

کوئی بات تو ہوئی ہو گی۔

قطعی نہیں۔

ہوں' وہ بولا' آپ پر دو الزام ہیں ایک یہ کہ آپ نے کراچی کا دورہ کیا۔ سیکنڈ کلاس کا کرایہ چارج کیا لیکن سفر تھرڈ میں کیا۔

جی' میں نے جواب دیا' یہ سچ ہے۔

دوسرا الزام ہے کہ آپ نے ایک سیکیورٹی کا کاغذ گم کر دیا۔ جی' میں نے جواب دیا' میں نے اسے جلا دیا لیکن وہ خفیہ کاغذ نہیں تھا۔ ریڈیو کی مانیٹرنگ رپورٹ تھی۔ اسے زبردستی سیکرٹ بنا رکھا تھا۔

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ مفتی صاحب' اگرچہ یہ بات مجھے بتانی نہیں چاہیئے' لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی فائیل وزیراعظم کے پاس بھیجی گئی تھی۔ انہوں نے اس پر لکھا ہے کہ اس افسر پر مسلسل منفی رپورٹیں دی جا رہی ہیں اور رپورٹ لکھنے والے ایک ہی افسر ہیں۔ مناسب ہو گا اگر اسے کسی اور افسر کے ماتحت کام کرنے کا موقعہ فراہم کیا جائے۔ تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ نئے افسر کی اس کے کام اور برتاؤ کے متعلق کیا رائے ہے۔

سمجھ گئے آپ' اس نے پوچھا۔ شاید آپ کا تبادلہ کراچی ہو جائے۔

جی سمجھ گیا' لیکن میں کراچی جانا نہیں چاہوں گا۔

کیوں' کراچی بہت بڑا شہر ہے۔

وہ تو ہے مگر میں پنڈی سے جانا نہیں چاہتا۔

کیوں یہاں کیا دھرا ہے۔

بڑی دیر کے بعد یہاں مجھے ایک مرکز ملا ہے۔ میرا تنکا تنکا بکھرا ہوا تھا' مرکز نے مجھے سمیٹ

لیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ یہاں سے چلا گیا تو پھر بکھر نہ جاؤں۔

کیا میں آپ کے مرکز کے متعلق پوچھ سکتا ہوں۔

بس اللہ کا ایک بندہ ہے' میں نے جواب دیا' نحیف و نزار بندہ

وہ مسکرا کر اٹھ بیٹھا۔

لیکن فائنل انکوائری' میں نے پوچھا۔

اس کی اب ضرورت نہیں رہی۔

جب ڈائریکٹر کو پتہ چلا تو وہ دفتر سے باہر نکل آیا اور غصے میں بولا' یہ کیسی انکوائری ہے' آپ کیسے انکوائری افسر ہیں' میں وزارت کو لکھوں گا۔

ضرور لکھیئے' وہ بولا' اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

ایک ہفتے کے بعد میرے تبادلے کا حکم موصول ہو گیا۔ مجھے ڈی ایف پی کراچی میں فلم آفیسر کی حیثیت سے تعینات کر دیا گیا۔

کورامن اور پھر کن

کراچی روانگی سے پہلے چار ایک بار مزار پر ہماری محفل لگی۔

میرے کراچی جانے پر مختلف قسم کے رد عمل تھے۔ عزیز ملک اور آغا مطمئن تھے۔ وانی اور راجہ شفیع اداس تھے۔ بھائی جان غیر از معمول خوش تھے۔ مجھے بھائی جان کی خوشی کھل رہی تھی۔

بھائی جان کس بات پر خوش تھے۔ نہیں انہیں میرے جانے پر خوشی نہیں ہو سکتی۔ بھائی جان مجھ پر بہت خوش تھے۔ وہ ہمیشہ مجھے دعا دیا کرتے تھے۔ مفتی جی اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

جب میرے تبادلے کا آرڈر موصول ہوا تھا تو انہوں نے کہا تھا۔ مفتی جی' آپ دل برا نہ کیجئے' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وانی اور راجہ کو اداس دیکھ کر انہوں نے کہا تھا۔ کیوں گھبرا رہے ہیں آپ' ہم مفتی کو بہت جلد واپس بلا لیں گے۔

مجھے رہ رہ کر خیال آتا جیسے بھائی جان مجھے از خود التزاما" کراچی بھیج رہے تھے' لیکن کیوں۔

یہ اقدام مجھے ڈائریکٹر کے غم و غصے سے بچانے کے لیے نہیں تھا۔ کیونکہ اس انکوائری کے بعد ڈائریکٹر تو چور چور ہو چکا تھا۔

بھائی جان نے خود کہا تھا' بیچارہ ظلمت۔ اس کی رپورٹیں سب بے کار گئیں۔ اس کے الزامات رد کر دیئے گئے۔ بیچارے کے ہاتھ پلے کچھ بھی نہیں رہا ہے۔

یہ ایک مفروضہ نہیں تھا۔

تبادلے کا حکم نامہ موصول ہونے کے ایک دن بعد مجھے ایک فون آیا۔ پتہ نہیں کون بول رہا تھا۔ آواز بڑی مانوس تھی۔ مفتی۔ مفتی' وہ کہہ رہا تھا' تو ابھی ہمارے ڈیرے پر آ جا۔ ابھی ہمارے ڈیرے پر آ جا۔ ابھی' دیر نہ کر۔

دفعتاً" مجھے احساس ہوا کہ باڑا سنٹر والا بابا بول رہا تھا۔ باڑا سنٹر والے بابے کو میں بالکل بھول چکا تھا۔ عرصہ دراز سے میں نے اس کے ڈیرے پر حاضری دینی چھوڑ دی تھی۔

باڑا سنٹر کے بابے کے دو ایک پیغامات آئے تھے کہ تم آتے کیوں نہیں۔ ہم تمہارا انتظار کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ میرے دل میں بابا کی بڑی عزت تھی۔ عزت نہیں' بلکہ اک لگاؤ سا تھا۔ اس لگاؤ میں روحانیت کا رنگ نہ تھا۔ میں اس کے لیے دوستی کا جذبہ محسوس کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے بعد میں کبھی وہاں نہ گیا تھا۔

بابا کی کال آئی تو میں سمجھا کہ وہ مجھے بلا رہا ہے۔

میں نے کہا' جی باباجی کیا حکم ہے۔

بابا بولا' تو فوراً آ جا یہاں ہمارے پاس۔

میں نے کہا جناب میں ضرور حاضری دوں گا لیکن اس وقت تو میں اپنا چارج ٹھیک کر رہا ہوں۔ میرا تبادلہ ہو گیا ہے' میرا افسر مجھ سے ناراض ہے' وہ ٹھونک بجا کر چارج لے گا۔

آ جا' آ جا' بابا بولا' تیرا ڈائریکٹر یہیں بیٹھا ہے' ہمارے ڈیرے پر۔

مجھے بابا کی بات پر یقین نہ آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرا ڈائریکٹر جو سو فیصد افسر ہے۔ جو سوشل سٹیٹس کا شدت سے قائل ہے۔ جو ایک عقلیہ انسان ہے وہ بھلا بابا کے ڈیرے پر کیسے جا سکتا ہے۔

بابا کہنے لگا' ہم نے تیرے ڈائریکٹر کو بلایا ہے' وہ آ گیا ہے اور تجھ سے صلح کرنا چاہتا ہے' تو

فوراً ہمارے پاس آ جا۔

بابا کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے' اگرچہ بات ان ہونی تھی۔ میرا افسر صرف جھکانا جانتا تھا' وہ جھکنے کی صلاحیت سے محروم تھا کہ وہ خود بابا کے پاس صلح کی درخواست لے کر آئے۔ میرا ذہن اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ بہرصورت میں نے بابا سے کہا' بابا میں اس سے صلح کرنا نہیں چاہتا۔

اس پر بابا غصے میں آ گیا' کیوں نہیں چاہتا' وہ بولا۔

میں نے کہا' بابا میرا جی نہیں چاہتا۔

تو اپنے من کو مار' وہ چلایا۔

نہیں بابا' میں نے کہا' مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔

ہم دیں گے تجھے طاقت' بابا' جلال میں آ گیا۔

ٹھیک ہے' میں نے کہا' جب آپ کی دی ہوئی طاقت مجھ تک پہنچے گی تو میں آ جاؤں گا۔

تو تو آنے سے انکاری ہے' وہ بولا۔

ہاں۔ میں نہیں آؤں گا۔

اس پر بابا۔ جوش میں آ کر بابا بن گیا۔ بولا ہم تیری ایسی تیسی کر دیں گے۔

ضرور کیجئے میری ایسی تیسی۔

ہم بھسم کر دیں گے۔

میں نے کہا اللہ کے واسطے کر دیجئے۔ میری جان عذاب سے نکل جائے۔

یہ واقعہ میں نے بھائی جان کو نہیں سنایا تھا۔ پتہ نہیں میں نے کیوں ان سے کبھی باڑا سنٹر کی بات نہ کی تھی۔

البتہ میں نے عزیز ملک سے تذکرہ کیا تھا۔ ملک نے ساری بات غور سے سن کر کہا تھا۔ ہاں وہ بابا دکان سجائے بیٹھا ہے۔

دوکان' کیا مطلب' میں نے پوچھا۔

ملک نے کہا' جب یہ نیا نیا باڑا سنٹر میں آ کر بیٹھا تھا۔ اس وقت سرکار قبلہ ریلوے سٹیشن کے قریب محفل لگایا کرتے تھے۔ حاجت مند ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

ایک دن ایک آدمی نے آ کر سرکار قبلہ کو اطلاع دی کہ باڑا سنٹر میں ایک بابا نے ڈیرا لگالیا ہے' وہ لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔

ٹھیک ہے' سرکار قبلہ مسکرا کر بولے' اس نے دکان سجائی ہے تو اسے سجانے دو۔ دنیا میں دکانیں بھی ہوتی ہیں۔ دکانیں بھی چلتی ہیں۔ ٹھیک ہے' ہمیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ الٹا اچھا ہے۔ ہم پر زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا۔ مفت کا بوجھ ہی ہے نا۔ کوئی کس کس کا بوجھ اٹھائے۔

میں نے کہا' ملک یہ بتا کیا باڑا سنٹر کے بابا کے پاس کوئی طاقت بھی ہے کہ خالی دکان ہی دکان ہے۔

شاید جن ہے' وہ بولا۔

یہ سن کر میری جان نکل گئی۔ میرے روبرو ایک جن آ کھڑا ہوا۔ بولا میرے مالک کا حکم ہے کہ میں تیری ایسی تیسی کر دوں۔

ملک نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ جس پر سرکار قبلہ کا ہاتھ ہے' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے باوجود جب بھی میں رات کے وقت بستر پر لیٹتا تو جن حاضر ہو جاتا۔ میرے آقا کا حکم ہے کہ تیری ایسی تیسی کر دوں۔ یہ سن کر میرا دل ڈوب جاتا اور بچنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں مارتا۔ پھر ایک چار دیواری آ کر مجھے گھیرے میں لے لیتی۔

اس زمانے میں میں عجیب و غریب کیفیات سے گھرا ہوا تھا۔ باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اگرچہ اس رقت کے بعد' جو مجھ پر طاری کی گئی تھی۔ میرے سلف کا عقلیہ حصہ شل ہو چکا تھا۔ مجھ میں سمجھنے کا جذبہ دب گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس دبے ہوئے اُپلے سے جو اوپر سے راکھ نظر آتا تھا' عقل کی چنگاریاں اڑتی رہتی تھیں۔ سوچ کے بھنور چلتے۔ جب بھی مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر آتی تو میں ''ڈُب جُھلکے'' کھانے لگتا۔

کراچی جانے سے تقریباً" چھ ماہ پہلے' میں نے محسوس کیا کہ میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی ہے۔

آنکھ کا یہ پھڑکن روز بروز بڑھتا گیا۔ آہستہ آہستہ یہ عمل اس حد تک بڑھ گیا کہ تکلیف دہ ہو گیا۔

شروع شروع میں میں نے اپنی بیوی سے پوچھا' میں نے کہا۔

اقبال یہ بتا کہ بائیں آنکھ پھڑکے تو کیا ہوتا ہے۔

پتہ نہیں' وہ بولی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بائیں آنکھ پھڑکے تو یہ اک اشارہ ہوتا ہے کہ تم خوشی کی خبر سنو گے۔

جب آنکھ زیادہ ہی پھڑکنے لگی تو میں نے اقبال سے کہا' یہ اشارہ تو اب اس حد تک شدت اختیار کر چکا ہے جیسے تشدد پر آمادہ ہو۔

وہ ہنسی' پتہ نہیں۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ یہ خیر کا اشارہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا' بی بی ایک بار اشارہ ہو گیا' دو بار اشارہ ہو گیا۔ ٹھیک ہے میں سمجھ گیا کہ کوئی خوشی آنے والی ہے۔ اب سوئی مار مار کر مجھے کیوں بار بار سمجھایا جا رہا ہے۔ کیا اشارہ کرنے والے کا خیال ہے کہ میں کوڑ مغز ہوں۔ آسانی سے بات نہیں سمجھتا۔

وہ بولی جب آنکھ زیادہ پھڑکے تو میری ماں آنکھ کے چھپر پر سیندھور چھڑکا کرتی تھی۔ کہنے لگی' آپ کی آنکھ کے چھپر پر سیندھور چھڑک دوں کیا۔

میں نے کہا' چھڑک دو۔ اس نے میری بائیں آنکھ کے چھپر پر سیندھور چھڑک دیا۔ اس سے پھڑکن میں کمی واقع ہونے کے بجائے اور تیزی آگئی۔

اس پر میں گھبرا گیا۔ میں نے ملک سے بات کی وہ حسب عادت مسکرا دیا۔ بولا۔ ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں' آپ ان کی طرف توجہ نہ کریں۔

میں نے کہا' ملک صاحب کیسے توجہ نہ دوں۔ اگر آپ کی آنکھ کے چھپر پر کوئی تار والا اپنی ٹکٹکی رکھے بیٹھا ہو اور صبح شام ٹک ٹکا ٹک کرتا رہے' تو آپ کیسے توجہ نہ دیں گے۔

پھر میں نے راجہ شفیع سے کہا' یار میں تو مارا گیا میں کیا کروں۔

راجہ بولا' کوئی بات نہیں ایک ڈاکٹر میرا گوڑا یار ہے اس کے پاس لے چلتا ہوں تجھے۔ ویسے بھی مجھے اس کے پاس جانا ہی ہے۔

کیوں جانا ہے' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' بھائی جان کے لیے ایک دوا لانی ہے۔

کون سی دوا' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' کورامن دل کی دوا ہے' بھائی جان استعمال کرتے ہیں۔ کورامن کا توڑا ہو گیا ہے'

بازار میں نہیں آ رہی میں نے ڈاکٹر سے کہا تھا کہ دو چار شیشیاں سنبھال کر میرے لیے رکھ لے۔

ڈاکٹر نے میری آنکھ کو بڑے غور سے دیکھا کہنے لگا' اس پر کوئی پھنسی نہیں' کوئی خرابی نہیں' بالکل ٹھیک ہے۔

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب یہ تو صبح شام یوں شدت سے پھڑکتی ہے' جیسے آٹے کی مشین چلتی ہے اور آپ کہتے ہیں کوئی بات نہیں۔

وہ ہنسا' کہنے لگا یہ ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں۔ کسی اور ڈاکٹر سے پوچھیے تو وہ کہے گا۔ مسکولر کمزوری ہے۔ یہ محض ٹالنے کی بات ہو گی۔ میں آپ کو ٹال نہیں رہا۔

آنکھ کی بات ختم ہوئی تو کورامن کی بات شروع ہو گئی۔

راجہ کہنے لگا' جناب کورامن چاہیئے۔

ڈاکٹر بولا کہ ابھی دس دن ہوئے ہیں میں نے آپ کو دو شیشیاں دی تھیں۔

ہاں' راجہ نے جواب دیا' وہ ختم ہو گئیں۔

ختم ہو گئیں' ڈاکٹر نے سر پیٹ لیا۔ دس دن میں کورامن کی دو شیشیاں ختم' مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں کیا۔ صاف کہہ دیجیے کہ بلیک کر رہا ہوں۔

نہیں نہیں بلیک نہیں کر رہا۔ راجہ نے کہا۔ انہوں نے پی لی ہیں۔

وہ کون شخص ہے جو دس دن میں کورامن کی دو شیشیاں پی جاتا ہے۔ بھئی یہ دوا تو زہر ہے' قطروں کے حساب سے پی جاتی ہے۔

نہیں نہیں' راجہ بولا' ہمارے بھائی جان پیتے ہیں۔

تمہارے بھائی جان جادوگر ہیں یا فراڈ ہیں۔ ڈاکٹر ہنسا۔

خبردار بے ادبی سے بات مت کر' راجہ بولا۔

پھر جو اتفاقاً" دیکھا تو راجہ شفیع کے پیچھے بھائی جان خود کھڑے تھے۔

آپ کب آئے' میں بھائی جان کو دیکھ کر چلایا۔

ابھی آئے ہیں ہم۔ راجہ کے گھر گئے تھے۔ بی بی نے کہا ڈاکٹر صاحب کی طرف گئے ہیں۔ ہم یہاں آ گئے۔

پھر وہ ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوئے کہنے لگے' ہاں دونوں شیشیاں ختم ہو گئی ہیں۔ ہمیں کچھ

زیادہ ہی ضرورت پڑتی ہے کورامن کی۔

ڈاکٹر کی آنکھیں خانوں سے باہر نکل آئیں۔ وہ بت بنا کھڑا تھا۔

اٹھائیسواں باب

کراچی

کراچی پہنچ کر میں نے ایسے محسوس کیا جیسے بوٹ آ لنے سے گر گیا ہو۔ وہ ایک چیختا چلاتا ہوا ویرانہ تھا۔ سڑکوں پر' بازاروں میں' ہجوم کے پھیلاؤ میں اپنی حیثیت کھو جاتی تھی۔ سیکرٹریٹ کے بند کمروں میں لوگ فرعون بنے بیٹھے تھے۔ اپنے دفتر میں پہنچ کر میں نے محسوس کیا گویا سوئی گھاس کے ڈھیر میں گر گئی ہو۔ کسی نے محسوس نہ کیا کہ کوئی آیا ہے۔

کراچی کے سمندر میں میرے لیے صرف دو جزیرے تھے۔ احمد بشیر کا گھر اور قیصر۔

احمد بشیر اب وہ احمد بشیر نہیں رہا تھا' جس نے لاہور اور بمبئی میں میرے ساتھ کئی ایک سال بسر کیے تھے اگرچہ اس کی شخصیت کے بنیادی کوائف وہی تھے۔ اس کے دل میں میری چاہ کم نہ ہوئی تھی' الٹا بڑھ گئی تھی' لیکن اس جن نے وہ چراغ جسے رگڑنے سے وہ حاضر ہوتا تھا' اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس چھوٹی سی تفصیل سے کتنا فرق پڑ گیا تھا۔اب وہ اس حیثیت میں تھا کہ دے سکے اور اس کی خواہش تھی کہ وہ مجھے دے۔ ڈھیروں دے اب احمد بشیر ولیج ایڈ کے دفتر میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا۔ احمد بشیر کو یہ آسامی بڑی مشکل سے حاصل ہوئی تھی۔

بخاری

جب وہ لاہور میں روزنامہ امروز میں کام کر رہا تھا تو زیڈ اے بخاری نے اسے کانٹریکٹ دے

VII

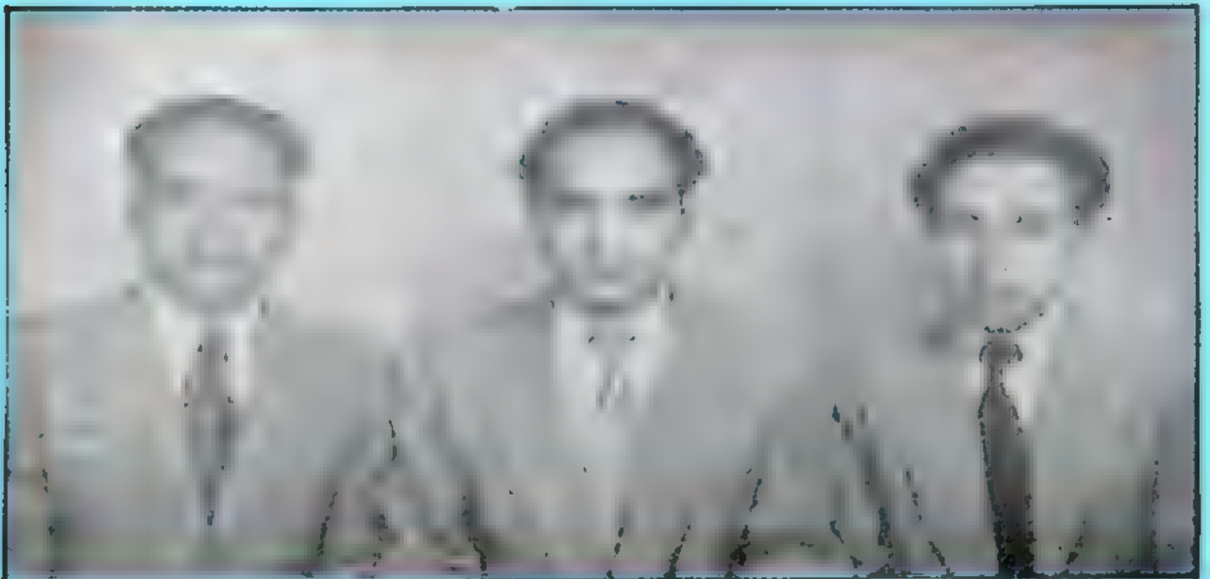
قدرت اللہ شہاب



محترمہ عطیہ موجود



قیصر مفتی



عمر مسعود مفتی (۱۹۵۵ء)



قدرت اللہ شہاب



شہاب ، مودی (بیگم احمد بشیر)
احمد بشیر ، ممتاز مفتی



مودی (بیگم احمد بشیر)

کر کراچی بلالیا تھا۔ زیڈ اے بخاری ' احمد بشیر سے واقف تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب ہم دونوں بمبئی میں تھے تو بخاری وہاں کے ریڈیو سٹیشن کا ڈائرکٹر تھا۔ اس زمانے میں وہ وہاں کا پیر مغاں بنا ہوا تھا۔ پیر مغاں کی بڑی دھوم تھی۔ محفل میں نورتنوں کی بھیڑ تھی' تخلیے میں غلمان تھے۔

سڑک پر نکلتا تو ململ کا کرتا اور براق سا سفید پاجامہ زیب تن ہوتا۔ ہاتھوں میں سگریٹ کا ٹن' ادھر ادھر بنے سجے دو منبچے مصاحب ہوتے۔ حالانکہ ان دنوں بمبئی میں چھرا چل رہا تھا۔ لیکن پیر مغاں پر اک بے نیازی کا عالم طاری ہوتا۔

بخاری پڑھا لکھا تھا' کلچرڈ تھا' فن کار تھا' اعلیٰ پائے کا دانشور تھا' بات پیدا کرنے کا سلیقہ رکھتا تھا۔ بات پکڑنے کا گر جانتا تھا' باتوں میں کوئی اس سے سبقت نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار آواز کی کھرج تھی۔

بمبئی میں ایک روز میں نے احمد بشیر سے کہا' یار تو بخاری سے نہیں ملا۔

اچھا مل لیتے ہیں' وہ بولا۔

اس سے اپنے پرچے فلاں کے لیے مضمون لکھوا۔

لکھوا لیتے ہیں۔ احمد بشیر نے بے نیازی سے جواب دیا۔

وہ دبانگ آدمی ہے۔

پھر کیا ہوا' وہ بولا۔

وہ تم سے بڑا متاثر ہو گا' میں نے کہا۔

کس بات پر۔

وہ خوش شکل نوجوانوں سے بہت متاثر ہوتا ہے' میں نے وضاحت کی۔

احمد بشیر پیر مغان کے پاس جا پہنچا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ ہمارے لیے ایک مضمون لکھیے۔

وہ چونکا۔ کون ہو تم' کہاں سے آئے ہو۔

احمد بشیر ہوں۔ لاہور سے آیا ہوں۔

کسی نے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی کیا۔

نہیں۔

ہوں' پیر مغاں نے قہقہہ لگایا' بات کہہ دینی جانتے ہو۔

اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔

بات کرنا سیکھ لو تو۔

کیا فرق پڑتا ہے' احمد بشیر نے اس کی بات کاٹ دی۔

بے باک' صاف گو' جاذب نظر' افلاطون تم ایسے پسند کرتا تھا۔ پیر مغاں نے مسحور کن نگاہوں سے احمد بشیر کی طرف دیکھا۔ امرد پرستی کے فلسفے کو جانتے ہو۔

جانتا ہوں' مانتا نہیں' احمد بشیر نے جواب دیا۔

سبھی مانتے ہیں صوفی' فقیر' ادیب' شاعر' ایکٹر' موسیقار۔ تم کیا چیز ہو۔

میں نسائی نہیں ہوئی۔ نسائیت سے متاثر ضرور ہوتا ہوں۔

اس کی گھنی' متحرک' تاثر سے بھرپور بھویں ابھریں' سمٹیں بولا' عورت کی محبت تو صرف پیداوارانہ محبت ہے' عام لوگوں کا مشغلہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں زندگی بسر کرنے والوں کی وقت کٹی۔ امرد پرستی فن کاروں کا امتیازی نشان ہے۔

میں فن سے متاثر ہوتا ہوں۔ فن کاروں سے نہیں' احمد بشیر نے کہا۔

پیر مغان ٹھٹھکا' سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے آنکھیں بنائیں۔ بھونڈی سپردگی طاری کی۔ بولا آؤ ہم تم دوست بن جائیں۔

احمد بشیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے پاس سستی عیاشی کے لیے وقت نہیں ہے۔

پیر مغان کا بت اوندھے منہ گر کر پاش پاش ہو گیا۔

احمد بشیر کو بمبئی والی ملاقات غالباً" یاد ہی نہ تھی یا اس نے اسے چنداں اہمیت نہ دی تھی' اس لیے اس نے بخاری کی آفر کو منظور کر لیا اور وہ کراچی آ گیا۔ احمد بشیر کے ساتھ مولانا حسرت بھی تھے لیکن بخاری میں اتنی وسعت قلب نہ تھی کہ وہ مولانا کی علمی حیثیت کے مطابق ان سے برتاؤ کرتا۔ لہٰذا احمد بشیر نے استعفٰی دے دیا۔

گولی مار

اس کے بعد احمد بشیر کراچی میں تلاش روزگار کے لیے بری طرح سے دربدر ہوا۔ ان دنوں

وہ اکیلا نہیں تھا' اس کے ساتھ اس کی بیوی مودی بھی تھی۔ مجبوراً" اسے گولی مار کے ایک چھپر تلے پناہ لینی پڑی۔

اس زمانے میں گولی مار ایک ویرانہ تھا۔ حکومت نے غریب پناہ گیروں کے لیے وہاں چھپر بنوا رکھے تھے۔

ان چھپروں میں غنڈے' جواری' جیب کترے' چور' اچکے اور غریب مہاجر رہتے تھے۔ ویرانی کا یہ عالم تھا کہ شام ہی سے گیدڑ صحن میں آگھستے تھے۔ احمد بشیر کی کٹیا سے باہر ایک گھنا درخت تھا' جو اس کا ڈرائنگ روم تھا۔ واٹر سپلائی کے لیے ایک کھارا کنواں تھا۔ پانی کنویں سے آتا۔ سپلائی کی ڈیوٹی مودی سرانجام دیتی تھی۔ احمد بشیر کراچی کی سڑکوں پر گدھا گاڑی چلاتا تھا۔ مودی ایک فراڈ ویلفیئر انجمن کے لیے سلائی کا کام کرتی تھی۔

احمد بشیر کے دوست صلاح الدین اور ابن انشاء مالی مدد کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے' صرف تاش کھیل کر اس کا دل بہلایا کرتے تھے۔ محفل درخت کے نیچے لگتی تھی۔ چندہ کر کے گیس کرائے پر منگوایا جاتا تھا۔

احمد بشیر ان مراحل سے گزر چکا تھا۔ اس لیے وہ' وہ احمد بشیر نہ رہا تھا جو لاہور کے لولی لاج میں میرے ساتھ رہتا تھا۔ اب وہ ویلج ایڈ کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا۔ اور ایک معقول فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔

اسسٹنٹ ڈائرکٹر بننے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ ابن انشا کو اپنے دفتر میں ایک مستقل آسامی پر بلا لیا تھا۔ اس سے پہلے انشا اسمبلی میں ترجمے کا کام بھاڑے پر کیا کرتا تھا۔

قیصر

قیصر میری ہمشیرہ کا لڑکا تھا جو ان دنوں ایک امریکی دفتر میں معقول تنخواہ پر کام کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے کام میں بہت قابل تھا۔ اس نے اپنی قابلیت کی وجہ سے دفتروں میں بڑی عزت کروائی تھی۔ اگرچہ پرسنل سٹاف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ لیکن صاحب اس کے پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے۔ وہ بہت سے دفتروں میں کام کر چکا تھا۔

ویسے وہ ایک بکھرا ہوا شخص تھا' آوارہ بے سمت' دفتر سے نکل کر وہ سیدھا کافی ہاؤس جاتا اور کونے کی میز پر بیٹھ کر کیمل سٹرنگ سگریٹ اور کافی کے پیالے پیتا رہتا تھا۔ رات کو وہ انگریزی فلم دیکھتا اور آدھی رات کے وقت اپنے بڑے بھائی کے گھر کا دروازہ آ کھٹکھٹاتا اور وہاں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر ڈھیر ہو جاتا۔

صبح سویرے چائے کا ایک پیالہ پی کر وہ دفتر چلا جاتا۔ وہ ایک بگڑا ہوا نوجوان تھا۔ اسے کسی سے لگاؤ نہیں تھا۔ ماں باپ سے اسے نفرت تھی' کھولتی ہوئی نفرت' شاید اس لیے کہ اس نے گھر کی بجائے ایک ویرانے میں پرورش پائی تھی۔

اس کے والد بڑے قابل تھے' لیکن بے حد توجہ طلب تھے۔ ان کی بیوی' میری ہمشیرہ' پتی بھگت تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف متوجہ رہتے اور گھر میں ویرانہ چھایا رہتا۔

بچے اس ویرانے کی پیداوار تھے۔ قیصر کا بڑا بھائی ریاض بھی کراچی میں مقیم تھا۔ اس کی بیوی بڑی حسین تھی اور وہ خود بڑا پوزیسو اور جیلس تھا۔ اگرچہ قیصر بھائی کے ساتھ ہی رہتا تھا' لیکن یہ رہنا برائے نام تھا۔ وہ صبح سویرے وہاں سے نکل آتا تھا اور پھر رات کے بارہ بجے جا کر ڈیوڑھی میں پڑ رہتا تھا۔ بڑے بھائی کے گھر میں بھی اسے گھر نصیب نہ ہوا تھا۔

پتہ نہیں کیوں قیصر کو مجھ سے بہت لگاؤ تھا۔ طبعاً" وہ سوشل نہیں تھا۔ کسی کے قریب نہیں جاتا تھا' کسی کو قریب آنے نہیں دیتا تھا۔ اس کی شخصیت کے دیوان خانے میں ایک سور رہتا تھا' جو شاید اس نے اپنے تحفظ کے لیے پال رکھا تھا۔ زندگی میں چار ایک بار وہ خود کشی کر چکا تھا لیکن حالات سازگار نہ ہوئے تھے اور وہ کامیابی حاصل نہ کر سکا تھا۔

اب اس نے خودکشی کا ایک انوکھا طریقہ اپنا رکھا تھا۔ اس نے اپنی موم بتی دونوں اطراف سے جلا رکھی تھی۔ صبح و شام کافی کے پیالے پیٹ میں انڈیلتا رہتا۔ سگریٹ سے سگریٹ جلاتا' گرد و پیش کو شک و شبہ اور تحقیر بھری نظر سے دیکھتا اور اتنے بڑے شہر میں خود پر تنہائی مسلط کیے بیٹھا تھا۔

کراچی میں میرا تبادلہ ہوا تو قیصر کے لیے گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ گیا۔ حالانکہ نہ وہ بلی کی طرح کسی چھینکے کے ٹوٹنے کا حاجت مند تھا' نہ میرا چھینکا کسی کام کا تھا' چونکہ وہ تو خالی تھا۔

اس سے الٹ میں سراسر حاجت مند تھا............ میری تنخواہ رک گئی تھی۔ اے جی پی آر والے کہتے تھے کہ پہلے پے فکسیشن ہو گی پھر تنخواہ کھلے گی۔ بڑی مشکل سے ایک اکاؤنٹس افسر نے میرے لیے گزارہ الاؤنس منظور کروا دیا تھا۔

کراچی میں میں نے قیصر کو کافی ہاؤس سے تو نکال لیا لیکن اسے کوئی سمت نہ دے سکا۔

.... ان دنوں میری اپنی کوئی سمت نہ تھی۔ وہ چار دیواری دور ہوتی جا رہی تھی۔ بھائی جان کراچی کی آوارہ گردی میں دھند لائے جا رہے تھے۔ بھائی جان کو اپنانے کے لیے تنہائی ضروری تھی۔ اس تعلق کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے دھیان دینا ضروری تھا۔ لیکن نہ مجھے تنہائی میسر تھی نہ دھیان قائم تھا۔

دفتر سے فارغ ہو کر قیصر سیدھا میرے پاس آ جاتا۔ بول کیا پروگرام ہے آج۔ اس نے کبھی مجھے ماموں نہ سمجھا تھا۔ ممتاز کہہ کر بلاتا۔ تو تڑاک سے بات کرتا اور سارا دن کچھ نہ کچھ کھلاتا پلاتا رہتا۔ پھر شام کو سینما دکھانے کے بعد گھر چھوڑ جاتا۔

ان دنوں کراچی کی سڑکوں پر ہم تین آوارہ گرد تھے۔ قیصر' میں اور عکسی۔ عکسی میٹرک کا امتحان دینے کے بعد کراچی آ گیا تھا۔ ہماری آوارہ منڈلی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان میں ایک ماموں ہے اور ایک بیٹا ہے۔

آوارہ گردی سے تھک جاتے تو گھر جا کر شطرنج لگا لیتے۔ شطرنج کھیلنے میں قیصر بہت ماہر تھا اور وہ شطرنج سے کبھی نہیں اکتاتا تھا۔ شام کو ہم احمد بشیر کے گھر جا ڈیرا لگاتے۔

مودی

احمد بشیر غربت کی مہمان نوازی میں بڑا مشاق تھا۔ وہ اپنی غربت کو چھپاتا نہیں تھا بلکہ اس کا تمغہ بنا کر چھاتی پر لگائے پھرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ کوئی بھی کسی وقت گھر آ جاتا تو احمد بشیر پر گراں نہ گزرتا۔ مودی وہ چلاتا' ان کو ایک ایک پیالہ چائے کا ٹھونک دے ——— کیا کہا چینی نہیں' کچھ پرواہ نہیں یہ بغیر چینی کے پی لیں گے ——— کیا کہا' ساتھ کھانے کو ——— کوئی بات نہیں' کوئی بات نہیں۔ میری جیب میں ایک روپیہ پڑا ہے۔ لڑکے کو بھیج۔ چناچور گرم والا بیٹھا ہو گا۔ ابھی ——— کیا کہا' خاطر داری ——— وہ بھی کر دیں گے۔ کل

تنخواہ ملے گی تو کیک منگوا دیں گے۔

مودی احمد بشیر کی بیوی تھی۔ کیا عجیب شے تھی وہ۔ کمرے سے چلی جاتی' تو پتہ نہ چلتا کہ چلی گئی ہے۔ کمرے میں آ جاتی تو پتہ نہ چلتا کہ آ گئی ہے۔

مودی بڑی شوقین مزاج ہے اسے میل ملاپ سے دلچسپی ہے۔ خوب صورت لباس پہننے کا شوق ہے۔ کبھی اتنے پیسے ہاتھ نہیں لگے کہ لباس خرید سکے' اس لیے لنڈے سے میٹریل خریدتی ہے اور ایسا بنا سجا کر پہنتی ہے جیسے کسی اونچے سٹور سے خریدا ہو۔ مودی احمد بشیر کی عادت ہے۔ اسے کھلاتی ہے' پلاتی ہے' سلاتی ہے' جگاتی ہے' اور منہ بنائے بغیر اس کے دانشورانہ لکچر سنتی رہتی ہے۔ اس لیے احمد بشیر کو مودی سے ایسی ہی محبت ہے جیسی اپاہج کو بیساکھی سے ہوتی ہے۔

گھر کے معاملات میں میں نے احمد بشیر سا کوئی اپاہج نہیں دیکھا۔ اس نے' گھر کی کوئی چیز یہاں سے اٹھا کر وہاں نہیں رکھی۔ گھر کے لیے کوئی چیز خود نہیں خریدی۔ کبھی اپنے سلیپر خود تلاش نہیں کیے' کبھی گھڑے سے گلاس بھر کر پانی نہیں پیا۔ اگر مودی نہ ہو تو احمد بشیر کئی بار الٹی قمیض پہن کر دفتر چلا جائے اور اسے خبر بھی نہ ہو۔

احمد بشیر کہتا ہے' مجھے مودی اس لیے پسند ہے کہ وہ بہت معصوم ہے' اسے کچھ پتہ نہیں۔ ویسے مودی کو سب پتہ ہے' لیکن وہ یوں موم کی گڑیا بن کر بیٹھ رہتی ہے' جیسے کچھ پتہ نہ ہو۔ احمد بشیر سمجھتا ہے کہ مودی ذہنی لحاظ سے بچہ ہے' سمجھتی نہیں۔ مودی سمجھتی ہے کہ عملی زندگی میں احمد بشیر بالکل کورا ہے' کچھ بھی نہیں جانتا۔

دونوں سچے ہیں۔ دونوں جھوٹے ہیں۔

ان دنوں مودی پیارنگ سے راگ سیکھ رہی تھی۔ موسیقی میں پیارنگ ہر فن مولا تھے' شدھ راگ' ٹھمری' غزل' گیت اور تھیٹر کی موسیقی۔ مودی کو سکھاتے ہوئے پیارنگ خود جوش میں آ جاتے پھر محفل موسیقی شروع ہو جاتی۔

ابن انشاء

قیصر کو موسیقی سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ محفل کو ختم کرنے کے لیے پانسہ پھینکتا۔ چلو بھئی آج بڑی ظالم پکچر چل رہی ہے' کون میرا ساتھ دے گا' آل انوائیٹڈ۔ مودی فوراً اٹھ بیٹھتی

میں چلوں گی۔ مجھے قیصر زبردستی اٹھا دیتا' چل یار چھوڑ اور ہم فلم دیکھنے چلے جاتے۔

احمد بشیر کے گھر اس کا ایک دوست آیا کرتا تھا۔ ٹھیٹھ پینڈو۔ چہرہ یوں ڈھیلا جیسے چارپائی کی ادواین اتری ہوئی ہو۔ مسکراہٹ میں بے بسی۔ چہرے پر چمک آنے کی کوشش کرتی تھی' ابھی جاتی' پھر بھی چہرہ ڈھلکا ڈھلکا رہتا۔

میں احمد بشیر سے پوچھتا' یار یہ کیا شے ہے۔

یہ ابن انشا ہے' وہ جواب دیتا۔

ابن انشا———— نہیں یار اس کا نام تو خیر دین ہونا چاہیے۔

احمد بشیر مسکراتا۔ خیر دین ہی ہے لیکن اسے کیما فلاج کرنے کے لیے ابن انشا بن گیا ہے۔

اس زمانے میں ابن انشا ابھی ابن انشا نہیں بنا تھا۔ ترقی پسندوں کے ایرے میں آ کر اس نے چند ایک نظمیں ضرور لکھی تھیں۔ ابھی اس کا اپنا رنگ نہیں ابھرا تھا۔

کراچی میں میرا اپنا دفتر گویا سرائے تھا۔ مسافر آتے' چلے جاتے۔ آتے' چلے جاتے۔ جو بیٹھ رہتے وہ دفتری پالٹیکس پر تبصرے کرتے اور چائے کے پیالے پیتے رہتے تھے۔

یہ ڈی ایف پی کا فلمی دفتر تھا۔ اس دفتر پر فلمی رنگ غالب تھا۔ ہم نے یہ شاٹ لیا۔ ایسا شاٹ لیا کہ اس کی کوئی مثال نہیں ملے گی۔ فلمی دفتر کا افسر ہاشم ایک اکھڑا اکھڑا' مغرور' تفاخر کا مارا ہوا فرد تھا۔ جس سے بات کرنا مشکل تھا۔

ہیڈ آفس میں ڈائرکٹر صاحب نورتنوں کا اکھاڑا لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ چھوٹے افسروں کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

دفتر میں' نہ میں گنتی میں تھا' نہ میں شمار میں۔

ویلیج ایڈ

پھر ایک روز اچانک میرے نام ایک حکم نامہ آ گیا۔ لکھا تھا کہ ڈائرکٹر ڈی اے ایف پی نے ڈائرکٹر ویلیج ایڈز کی تجویز کو منظور کر لیا ہے لہٰذا ممتاز مفتی فلم آفیسر کی خدمات پٹے پر ویلیج ایڈ کو منتقل کی جا رہی ہیں۔

یہ حکم نامہ موصول کر کے میں گھبرا گیا۔ احمد بشیر کی طرف گیا تو وہ مونچھ مروڑنے لگا۔ ابن

انشا مسکرانے لگا۔

دیکھا' احمد بشیر بولا' لے آئے نا ہم تجھے اپنے دفتر میں' ویسے تجھ سے کہتے کہ بھئی آ جا ادھر ہمارے پاس تو تو کبھی نہ مانتا۔

انہوں نے اس شام اپنے منصوبے کی کامیابی پر احمد بشیر کے گھر ایک دعوت کا انتظام کر رکھا تھا' جس میں ہم سب مدعو تھے۔ قیصر عکسی اور میں۔

دعوت کے دوران احمد بشیر بولا' تو نے اکبر الٰہ آبادی کا وہ شعر سنا ہے کیا۔

؎ بتاؤں میں مرے مرنے کے بعد کیا ہو گا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا

اب تو پوچھ' ابن انشاء نے کہا کہ یہ شعر تجھے کیوں سنایا گیا ہے۔

احمد بشیر بولا' یہ شعر تجھے اس لئے سنایا گیا ہے کہ تجھے خبردار کر دیں کہ ہمارے دفتر میں آنے کے بعد تیرا کیا حشر ہو گا۔ پہلے تو جناب حفیظ جالندھری جو ہمارے ڈائرکٹر ہیں' تجھ سے مل کر بہت خوش ہوں گے' پندرہ دن تیری تعریفیں ہوتی رہیں گی۔

پھر' ابن انشا نے بات کاٹ کر کہا' پھر تجھ پر شک و شبہات شروع ہوں گے۔ تیرے عیب ظاہر ہوں گے۔

اور' احمد بشیر بولا' ڈائرکٹر صاحب کو پتہ چل جائے گا کہ تیرا ان کے دفتر میں آنا خطرناک سازش کا ایک حصہ ہے۔

اور ڈائرکٹر صاحب تجھ سے بد ظن ہو جائیں گے' انشا ہنسا۔

اور تو ہماری سازشی ٹولی میں شامل ہو جائے گے' احمد بشیر نے جملہ مکمل کر دیا۔

میرے اندر کا سور بھی باہر نکل آیا۔ نہیں ایسا نہیں ہو گا' میں نے کہا ڈائرکٹر مجھ سے بد ظن نہیں ہو گا۔

بھئی یہ اس کی پرانی عادت ہے' انشا نے کہا۔

پڑی ہو' میں نے جواب دیا۔

تیرے پاس ایسا کون سا جادو ہے' احمد بشیر سے پوچھا' جو حفیظ جالندھری اپنی جالندھریت کو چھوڑ کر تجھ پر اعتماد قائم کرے گا۔

ہے' میں نے کہا' اس لیے کہ میری عزت صرف دو ٹکے کی ہے اور جس کی عزت دو ٹکے کی ہو اس سے ڈرو۔ وہ خالص جی حضوریہ ہوتا ہے۔ کمینہ۔ بے ضمیر۔

ولیج ایڈ کا دفتر کراچی صدر میں کیفے ٹیریا کے پاس ایک گلی میں واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی جو پانچ چھ کمروں پر مشتمل تھی۔

حفیظ جالندھری

دفتر میں صرف چار افسر تھے۔ حفیظ جالندھری ڈائرکٹر تھا۔ احمد بشیر اس کا نائب تھا۔ ابن انشا ولیج ایڈ کے مصوّر ماہ نامے کا ایڈیٹر تھا۔ اور میں تھا۔ میرا عہدہ تو فلم آفیسر کا تھا' مگر حفیظ صاحب نے مجھے اپنا پی اے بنالیا تھا۔

پانچ چھ دنوں میں ہم ایک ڈی او لکھتے تھے اور پھر دس دن اسے پالش کرتے رہتے۔ حفیظ صاحب کو اپنی انگریزی پر بڑا ناز تھا۔ وہ مجھ سے کہا کرتے تھے' مفتی ممتاز کیا تجھے علم ہے کہ میں نے انگریزی سے شادی کی تھی۔ یہ زبان میرے گھر کی لونڈی ہے۔ میں جواب دیتا کہ جناب اب بھی آپ اسے غیر منکوحہ لونڈی کی طرح برت رہے ہیں۔

حفیظ صاحب نے کبھی مجھے ممتاز مفتی کہہ کر نہیں بلایا تھا۔ کراچی جانے سے پہلے بھی میں عزیز ملک کے گھر' حفیظ صاحب سے ملا تھا۔ عزیز ملک نے تعارف کرایا۔ اچھا تو آپ ہیں مفتی ممتاز' وہ بولے۔ اس کے بعد ہم کراچی میں دو سال اکٹھے رہے لیکن انہوں نے کبھی مجھے ممتاز مفتی کہہ کر نہ بلایا تھا۔

زندگی میں مجھے بہت سے ادیبوں اور فنکاروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن ابو الاثر حفیظ جالندھری سے عظیم تر شخصیت میں نے نہیں دیکھی۔ نفسیات کے مشاہیر کہتے ہیں کہ ادیب اور فنکار انیل شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ حفیظ صاحب انیل شخصیت کے امام تھے۔

پنجابی میں انیل شخصیت کو "جھیر" کہہ سکتے ہیں دقت یہ ہے کہ لوگ شخصیت کو اخلاق کی ترازو پر تولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہماری تنگ خیالی کی دلیل ہے۔ شخصیت اچھا برا' نیک بد' اونے اعلیٰ کے حوالوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔

ان چار افسروں کے علاوہ دفتر میں ایک ایڈمن سیکشن تھا اور ایک موسیقی سیکشن۔ موسیقی

سیکشن کے انچارج مشہور موسیقار پیارنگ تھے۔ وہاں کیمرے تھے' ستاریں تھیں' طبلے تھے' مردنگ تھے۔ یہ دفتر ہمارے لیے دفتر تھا' کلب تھا' کافی ہاؤس تھا' اکھاڑہ تھا۔

انتیسواں باب

عطیہ

پھر ایک دن قدرت اللہ شہاب کا ٹیلی فون آگیا اس وقت حفیظ اور میں وزارت کے متعلقہ ڈپٹی سیکرٹری کو ڈی او خط میں مہذب گالیاں دینے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھے کہ انشا داخل ہوا' کہنے لگا' جناب مفتی ممتاز کا ایک فون ہے۔ انشا طنزا" مجھے مفتی ممتاز کہا کرتا تھا' خصوصاً حفیظ کے سامنے۔ انشا کے کمرے میں جا کر میں نے چونگا اٹھایا۔

پی اے نے کہا' قدرت اللہ شہاب آپ سے بات کریں گے۔

شہاب کا نام سن کر میں گھبرا گیا۔ میرا بس چلتا تو فون بند کر دیتا' مگر مجھ میں اتنی جرات نہ تھی۔

میرے ذہن میں قدرت اللہ شہاب ایک پھوڑے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

مجھے وزارت امور کشمیر کے سیکرٹری اظفر کی بات یاد آگئی' جس نے مجھ سے پوچھا تھا' کیا آپ قدرت اللہ شہاب کو جانتے ہیں اور میں نے جواب میں کہا تھا' جی نہیں' میں انہیں نہیں جانتا۔

اس پر اظفر نے کہا تھا' لیکن مجھے شہاب صاحب نے ایک خط لکھا ہے' جس میں کہا ہے کہ آپ ان کے عزیز دوست ہیں اور میں نے جواب میں اظفر صاحب سے کہا تھا' جناب یہ بات

آپ قدرت اللہ شہاب سے پوچھیے۔

گمان غالب ہے کہ اظفر نے اسی روز فون پر شہاب سے بات کی ہو گی کہ ممتاز مفتی کہتا ہے کہ میں قدرت اللہ شہاب کو نہیں جانتا۔

اس کے بعد اشفاق احمد نے مجھے خط لکھا تھا کہ قدرت اللہ شہاب راولپنڈی آ رہے ہیں' آپ ان سے ملیئے اور میں نے اسے جواب میں لکھا تھا کہ میں بڑے افسروں سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ اور اشفاق نے میرا وہ خط قدرت اللہ کو بھیج دیا تھا۔

ان دونوں واقعات کے بعد میرا قدرت اللہ شہاب سے ملنا ناممکن ہو چکا تھا۔ قدرت اللہ سے ملنا میرے لیے ایک ناخوشگوار بات بن چکا تھا۔

ملاقاتیں

فون پر کوئی بڑی لجاجت سے کہہ رہا تھا' میں قدرت اللہ شہاب بول رہا ہوں۔ مفتی صاحب' مجھے نفسیات کی کتابیں خریدنی ہیں۔ اگر آپ فارغ ہوں اور میرے ساتھ چل کر میری مدد کریں تو ———— میں ایک بجے آپ کے دفتر پہنچوں گا۔ اگر آپ دفتر سے باہر آ جائیں تو مناسب ہوگا۔ حفیظ صاحب سے میری آمد کی بات نہ کریں۔ پونے ایک بجے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کیوں خیریت' حفیظ نے پوچھا۔

میں نے جواب میں انگلی کھڑی کر دی' جیسے ٹاٹ سکول کے بچے چھٹی مانگنے کے لیے انگلی کھڑی کرتے ہیں۔

حفیظ میرا اشارہ سمجھ گیا' مسکرایا۔ بولا' چھوٹا یا بڑا۔

میں نے کہا' جناب چھوٹا۔

حفیظ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

گلی سے نکل کر میں سڑک پر جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر کے بعد ایک کالی موٹر میرے پاس آ رکی۔

قدرت اللہ شہاب کی تصویریں میں نے اخبارات میں اکثر دیکھی تھی۔ اس لیے میں ان

سے خاصہ مانوس تھا۔

بہرحال موٹر سے ایک بھرے بھرے جسم اور چھوٹے قد کا آدمی باہر نکلا۔ اس نے ایک عمدہ سوٹ اور شوخ نکٹائی پہن رکھی تھی۔

اس نے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

آیئے بیٹھئے' اس نے موٹر کی جانب اشارہ کیا۔

ہم دونوں بیٹھ گئے۔

آپ کو میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا' اس نے بات چھیڑی۔

جی بالکل نہیں' میں نے جواب دیا۔

آپ یہاں کیا کام کرتے ہیں' شہاب نے پوچھا۔

پی اے کا کام کرتا ہوں۔ حفیظ صاحب کے ڈی او لکھتا ہوں۔

آپ لکھتے ہیں یا وہ لکھاتے ہیں۔

وہ لکھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں' انگریزی میری گھر کی لونڈی ہے۔ شہاب مسکرایا۔ آپ ٹھیک ٹھاک کر دیتے ہوں گے' جی' مگر ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ میں نے کچھ کیا ہے۔

ورنہ وہ آپ کی غلطیاں نکالیں گے نا۔

نکالتے ہیں۔ میں نے کہا۔ میں مان لیتا ہوں' بحث نہیں کرتا۔

پھر تو آپ کی اچھی گزر رہی ہے۔

اونہوں' میں نے سرہلایا' میں کہہ دینے والا آدمی ہوں۔ میرے لیے کٹھن ہے۔

ہم ادھرادھر گھوم پھر کر واپس آ گئے۔ مجھے پتہ چل گیا کہ کتاب ایک بہانہ تھا۔ لیکن مقصود کیا تھا' یہ نہ جان سکا۔

تیسرے چوتھے روز پھر شہاب کا فون آ گیا' میں آ رہا ہوں۔

اس روز میں نے پوچھا آپ حفیظ سے کیوں نہیں ملتے۔

کہنے لگا' وہ بڑے آدمی ہیں اگرچہ اپنی طرز کے خوب آدمی ہیں' لیکن مجھے ان سے خوف آتا ہے۔

کیوں میں نے پوچھا' خوف کس بات کا۔

ہم دونوں ساتھ آئی لینڈ میں رہتے ہیں' شہاب نے کہا' اور صبح سویرے حفیظ صاحب اپنی چھوٹی بیٹی کو کندھے پر بٹھا کر میرے گھر آ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں' دیکھ شہاب' میرے لیے بے شک کچھ نہ کر' لیکن اس بچی پر ترس کھا۔ ورنہ یہ معصوم بچی جوان ہو کر پیشہ کرنے پر مجبور ہو گی۔

میں نے حیرت سے شہاب کی طرف دیکھا۔

عجیب آدمی ہیں حفیظ صاحب' خوب آدمی ہیں۔

ہماری صرف دو ملاقاتیں ہوئیں' تیسری بار جب شہاب آیا تو حفیظ میرے پیچھے پیچھے دفتر سے باہر نکل آیا۔ جب شہاب کی گاڑی آئی تو اس نے کہا مفتی ممتاز مجھے بھی اور پھر اپنی انگلی کھڑی کر دی۔ مجھے بھی ساتھ لے چل۔

شہاب نے حفیظ کو کھڑے دیکھا تو گاڑی روکنے کی بجائے اسے اور تیز کر دیا۔

اس روز حفیظ نے مجھ سے پوچھا' مفتی ممتاز یہ شہاب کیسا آدمی ہے۔

میں نے کہا' حفیظ صاحب اگر آئی سی ایس میں میں اس کا ممتحن ہوتا تو انٹرویو میں کبھی اسے پاس نہ کرتا۔

حفیظ کی آنکھ میں چمک لہرائی' بولا کیوں۔

میں نے کہا افسری کے لائق نہیں ہے' اس میں پھوں پھاں نہیں' خاموشی اور سنجیدگی اس کے واحد ہتھیار ہیں۔ یہ سب اوپر کی چونے گچی ہے' اندر سے پتے کی طرح ڈولتا ہے۔

یہ سن کر حفیظ کی باچھیں کھل گئیں۔ اسے میرے خلاف جتنے بھی گلے تھے سب دور ہو گئے۔ کہنے لگا آج میں نے مان لیا کہ تو واقعی دانشور ہے۔ مفتی ممتاز کیا پتے کی بات کی ہے تو نے۔

۱۹۵۸ء میں میری شہاب سے تین چار ملاقاتیں ہوئیں دو بار اشفاق کراچی آیا اور وہ مجھے شہاب کے گھر لے گیا۔ گھر کو دیکھ کر مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کسی اسسٹنٹ کا گھر ہو۔ نہ گھر کی شکل افسرانہ تھی' نہ مزاج۔

شہاب کی بیوی ڈاکٹر عفت شہاب دیکھنے میں یوں محسوس ہوتی تھی جیسے دولبے کی جٹی ہو۔ اس کے انداز سے قطعی معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے۔

ایک بار اشفاق احمد' شہاب کو لے کر میرے گھر آ گیا۔ ہم ان دنوں پاک کالونی میں رہتے

تھے' اس وقت میں اور قیصر شطرنج کھیلنے میں معروف تھے۔ قیصر کی کیمل سٹرنگ سگریٹ بازی کی وجہ سے کمرہ دھواں دھار تھا۔

ایک مرتبہ احمد بشیر نے شباب کو کھانے پر بلایا تھا اور ہم سب نے اکٹھے فرش پر بیٹھ کر آلو گوشت کھایا تھا۔

یہ سب ملاقاتیں' سرسری ملاقاتیں تھیں۔

پھر ایک روز شہاب نے مجھے فون کیا بولا' سنا ہے آپ کی سپر سیشن ہو گئی ہے۔

جی ہو گئی ہے' میں نے جواب دیا۔

آپ ریپریزینٹیشن (Representation) دے رہے ہیں نا۔

جی دے رہا ہوں۔

اس کی ایک نقل مجھے بھجوا دیجئے کل ہی۔ دیر نہ ہو۔

اگلے روز میں شہاب کو ریپریزینٹیشن دینے گیا تو وہ فارغ بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے کاغذات لے کر ایک طرف رکھ دیئے۔ کہنے لگا' میں نے کیس کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ میرا خیال ہے آپکو پروموشن مل جائے گی۔

شاید مل جائے' میں نے کہا۔

شاید کیوں' وہ بولا' آپ کی حق تلفی ہو رہی ہے۔

پچھلے چھ سال سے ہو رہی ہے' میں نے جواب دیا۔

آپ اسے مائنڈ نہیں کرتے کیا' اس نے پوچھا۔

پہلے کرتا تھا۔ اب نہیں کرتا۔

وہ مسکرایا' اب کیا ہوا۔

اب' میں نے جواب دیا' اب 'میں' میں نہیں رہا۔

یہ کیسے ہوا۔

ایک اللہ کے بندے نے مجھے اُلتھ پُلتھ کر دیا۔

ایک دم اس کی دلچسپی جوش میں آ گئی۔

کیسے کر دیا' اس نے پوچھا۔

پتہ نہیں' میں نے کہا' اللہ کے بندوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مداری ہوتے ہیں' تماشے کرتے ہیں

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ کیا آپ کے ساتھ بھی تماشہ کیا' انہوں نے۔

ہاں' میں نے کہا' مجھ پر رقت طاری کر دی۔ دس دن بے وجہ روتا رہا' بیس بیس کر کے روتا رہا۔

کوئی پنڈی کا بزرگ ہے کیا' اس نے پوچھا۔

مرحوم د مغفور ہے۔ مزار ہے' میں نے کہا۔

اچھا' وہ بولا' پنڈی گیا تو ان کے مزار پر حاضری دوں گا۔

اونہوں' میں نے کہا' نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔

وہ ہنس پڑا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا' آپ کو پریڈکشن کا رسالہ ملا کیا۔ پچھلے دنوں ڈھونڈھ رہے تھے نا آپ جی نہیں' میں نے جواب دیا۔

آپ کو ای ایس پی سے دل چسپی ہے کیا۔

ہے' میں نے کہا' اگرچہ نہیں ہونی چاہیے۔

کیوں' اس نے پوچھا۔

وہ منع کرتے ہیں۔

عطیہ

شہاب ہنسنے لگا۔ یہاں کراچی میں ایک سیر SEER ہے اسے مستقبل کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

کوئی اللہ کا بندہ ہے کیا۔

نہیں اللہ کا بندا نہیں۔ ایک خاتون ہے پڑھی لکھی پاکیزہ۔

کہاں ہے' میں نے پوچھا۔

اس نے ایک کاغذ پر پتہ لکھ دیا۔ کاغذ مجھے دیتے ہوئے کہا' میرا نام لے لیجیے۔

دفتر کے باہر قیصر ایک چائے خانے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے سکوٹر پر بٹھا کر وہاں لایا تھا۔

اتنی دیر لگا دی۔ تم تو کاغذ دینے آئے تھے' قیصر نے کہا۔

ہاں یار' میں نے کہا' وہ فارغ بیٹھا تھا' اس نے بات چھیڑ دی۔

ہوں ——————— دیکھ ممتاز' وہ بولا' تو اس شخص سے بچ کر رہنا۔

کیوں' میں نے پوچھا۔

یہ بڑا کلیور آدمی ہے۔ بڑا ذہین ہے ایک نظر میں بات پا لیتا ہے۔

کیا ذہین آدمی خطرناک ہوتے ہیں' میں نے پوچھا۔

نہیں نہیں' وہ بولا' اس کا چہرہ گونگا ہے' ڈمب' ایکسپریشن لس۔ اس کے چہرے سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے' خوش ہے یا ناراض ہے۔ ایسے آدمی سے ہمیشہ بچ کر رہو۔ جس کا چہرہ بلینک ہو۔

نہیں یار' میں نے کہا' شہاب میں بڑا عجز ہے۔ یہ اس کا ہتھیار ہے' وہ بولا۔ اس کے پاس دو ہتھیار ہیں۔ عجز اور خاموشی۔

سِٹنگ

قیصر' احمد بشیر اس کا ماموں اشفاق حسین' انشا اور میں' اگلے روز ہم سب اکٹھے ہو کر عطیہ سے جا ملے۔

وہ ایک سنجیدہ' کم گو' باوقار اور تعلیم یافتہ خاتون تھی' وہاں کمرے میں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔

جی فرمائیے' وہ ہر سائل سے پوچھتی۔ جب وہ اپنی بپتی سنا چکتا تو گردن جھکا کر بیٹھ جاتی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہتی۔ پھر سر اٹھا کر مسکراتی اور سوال کا جواب دے دیتی۔

سب سے پہلے احمد بشیر کے ماموں اشفاق حسین کا نمبر آیا' ہاں فرمائیے عطیہ نے کہا۔

اشفاق حسین خالصتاً" ایک عقلیہ آدمی ہے۔ وہ صرف دلیل کو مانتا ہے۔ جو حقائق دلیل پر نہیں بیٹھتے' انہیں رد کر دیتا ہے۔ کہ وہ کیا مانتا ہے' کیا نہیں مانتا' اس کے بارے میں وہ اظہار

رائے نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ ماننا نہ ماننا اس کا ذاتی معاملہ ہے' جس کا اظہار ضروری نہیں۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ وہ بات بڑھانے کے خوف سے سر اثبات میں ہلا دیتا ہے' حالانکہ دل نفی میں ہل رہا ہوتا ہے۔

اشفاق حسین گھبرا گیا۔ میری کوئی خاص پرابلم نہیں ہے' وہ بولا۔ بس ایک بات ہے میرے راستے میں رکاوٹیں آتی رہتی ہیں۔ معمول کی رکاوٹیں نہیں' غیر معمولی رکاوٹیں۔ جو دوا عام لوگوں پر اثر رکھتی ہے مجھ پر نہیں رکھتی بلکہ الٹا اثر رکھتی ہے۔ حالات کا رخ سازگار نہیں ہوتا۔ وہ ایک مصرعہ ہے نا' شاید آپ نے سنا ہو کہ۔

؎ ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

عطیہ نے کچھ دیر کے بعد مراقبے سے سر اٹھایا بولی' آپ ٹھیک کہتے ہیں' آپ کے ہر کام میں رکاوٹ ہے۔ آپ پر کوئی ایول انفلوانس ہے۔

کب سے ہے' اشفاق حسین نے پوچھا۔

نوجوانی سے' وہ بولی۔

اس کا کوئی علاج بھی تو بتائیے نا۔

عطیہ مسکرائی بولی' میں ایک سیئر ہوں۔ معالج نہیں ہوں۔ مجھے تو جو دکھتا ہے وہ بتا دیتی ہوں۔ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ جو دکھتا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ پھر وقت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ایک چیز مجھے دکھائی جاتی ہے کہ مستقبل میں یہ ہو گا یوں ہو گا۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ کب ہو گا۔ کل ہو گا یا دس سال کے بعد ہو گا۔

دوسرا نمبر ابن انشا کا تھا۔

عطیہ نے حسب معمول پوچھا' جی فرمایئے۔

انشا مسکرایا کہنے لگا' محترمہ میں تو اونٹ ہوں۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ مجھے کوئی چیز راس نہیں آتی۔ کام راس نہیں آتا' آرام راس نہیں آتا' اضطراب راس نہیں آتا' سکون راس نہیں آتا' جینا راس نہیں آتا' مرنا راس نہیں آتا۔

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا' محترمہ خود ہنسنے لگی۔

اس نے ہنستے ہوئے گردن جھکائی اور پھر سر اٹھا کر بولی۔

آپ نے جو پھوڑا پالا ہے' وہ اب پھوٹنے والا ہے' آپ کو بڑی شہرت ملنے والی ہے۔ عزت ملنے والی ہے۔ بہت کچھ ملنے والا ہے۔

کب ملے گا' انشا نے پوچھا۔

بہت جلد' وہ بولی' آپ دہلیز پر کھڑے ہیں۔

کون دے گا۔

دینے والا۔ بہت جلد آپ کو ایک دینے والا ملے گا۔

اس کے بعد قیصر کی باری تھی' وہ بیٹھا مسکرائے جا رہا تھا' سوکھی مسکراہٹ' نہ ماننے والی مسکراہٹ۔

مجھے کچھ نہیں پوچھنا' وہ بولا' میں مستقبل کو جاننے سے خائف ہوں۔

کچھ اپنے متعلق پوچھ لو' احمد بشیر نے کہا۔

اپنے متعلق میں جانتا ہوں' قیصر نے جواب دیا۔

قیصر کے بعد میری باری تھی۔ میں نے کہا' مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔

پروموشن کے بارے میں پوچھ لو' انشاء نے کہا۔

نہیں یہ بہت چھوٹی بات ہے' میں نے جواب دیا۔

بھوکا مر رہا ہے اور کہتا ہے چھوٹی بات ہے' احمد بشیر نے کہا۔

تو رہن دے

آپ ممتاز مفتی ہیں' عطیہ نے پوچھا۔

جی' میں نے جواب دیا۔

شہاب صاحب نے مجھے آپ کے متعلق فون کیا تھا۔

احمد بشیر بولا' دراصل یہ شخص اپنی سرشت کے خلاف کسی کو پیر مان بیٹھا ہے' یہ صابون کا بلبلہ جلد پھوٹ جائے گا۔

عطیہ مسکرائی' وہ بزرگ کہاں ہیں۔ جنہیں پیر مان بیٹھے ہیں۔

پنڈی میں' احمد بشیر نے کہا۔

عطیہ نے مراقبے میں سر جھکا دیا۔ چند ساعت کے بعد سر اٹھایا۔ بولی' وہ خود آ گئے۔ اونچے لمبے گورے چٹے' سر پر رومی ٹوپی تھی۔ ہاتھ میں حقہ تھا۔ پنجابی بولتے ہیں کہنے لگے' تو رہن دے اسی آپے سیدھا کرلاں گے۔

عطیہ کی پنجابی پر سب ہنسنے لگے۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اسے کیسے پتہ چلا کہ وہ رومی ٹوپی پہنتے ہیں' حقہ پیتے ہیں اور پنجابی بولتے ہیں۔ اور وہ خود کیسے آ گئے۔ ایک مرحوم و مغفور بڈھا پنڈی سے کراچی کیسے آ گیا اور پھر لہجہ بھی تو انہیں کا تھا۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ کیسی دنیا ہے جہاں لوگ مرنے کے بعد آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں۔ مادی زندگی کے اختتام پر بھی' ٹوپی پہنے پھرتے ہیں۔ حقہ سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔

پھر مجھے خیال آیا کہ رقت طاری کرنے کے بعد بھی وہ مجھے سیدھا کر رہے ہیں۔ کیا یہ عمل اب بھی جاری ہے' کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے مجھے از خود کراچی بھیجا ہو۔

احمد بشیر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میرا ہاتھ دیکھ دیجئے' وہ کہہ رہا تھا۔

میں اس فن سے واقف نہیں ہوں' عطیہ نے کہا۔

تو کیرو سے دکھوا دیجئے' وہ بولا۔

اچھا وہ بولی' اپنا ہاتھ کھول کر میز پر رکھ دیں۔

عطیہ ٹرانس میں چلی گئی۔ بولی' یو آر کلیور' ویری کلیور —————— ویری ویری کلیور۔

عطیہ کیرو کے انداز میں انگریزی بولے جا رہی تھی۔ احمد بشیر کے منہ پر لڈو پھوٹ رہے تھے' جیسے کلیو ہونا بڑا وصف ہو۔

میرے ساتھیوں میں کوئی فرد بھی ایسا نہ تھا جس سے اس موضوع پر بات کی جا سکتی ہو۔ جب بھی میں کوئی ایسی بات چھیڑتا تو وہ میرا مذاق اڑانے لگتے۔ کہتے' یہ تو کس طرف چل نکلا ہے۔ یہ راستہ تیرا راستہ نہیں ہے۔ اس راستہ پر تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ بی وائی سلف' اب اس بیرحت سر کو چھوڑ۔

جب سے عطیہ نے کہا تھا۔ ہم خود اسے سیدھا کر لیں گے' میرے ساتھی اکثر طنزیہ فقرا دہراتے تھے۔ تو رہن دے' اسی آپے سدھا کراں گے۔

احساسِ قرب

اگلے روز شہاب کا فون آ گیا۔ عطیہ سے ملاقات کیسے رہی۔ میں نے کہا میں خود آ کر بتاؤں گا۔

وہ پہلا دن تھا۔ جب میں نے از خود شہاب سے ملنے کی خواہش محسوس کی تھی۔ پتہ نہیں کیوں' میں نے محسوس کیا تھا کہ شہاب سے اس قسم کی بات کی جا سکتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے دوست سب کہنے والے تھے۔ ان میں سننے والا کوئی نہ تھا۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ انشا سننے والا ہے۔ لیکن دقت یہ تھی کہ انشا اس قدر کنفیوزڈ ذہنیت کا مالک تھا کہ وہ سنتا تو تھا مگر بات پہنچتی نہ تھی۔ ایسے لگتا تھا۔ جیسے اس کے پاس کان تو تھا' لیکن کان میں ریسیور نہیں لگا ہوا تھا۔ اس سے بات کرنی بے کار تھی۔ اس کے برعکس شہاب کان ہی کان تھا۔ ریسیور ہی ریسیور تھا۔

شہاب سے مل کر میں نے کہا' اس خاتون نے مجھے پھر سے کنفیوز کر دیا ہے۔ بڑی مشکل سے گرد ا بیٹھا تھا۔ پانی نترا تھا۔ اس خاتون نے پھر سے اسے گدلا دیا ہے۔ مجھے باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ کو سمجھ میں آتی ہیں کیا۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا' مجھے بھی نہیں آتیں۔

اگر وہ سیئر ہے تو اسے مستقبل کی جھلکیاں نظر آنی چاہئیں۔ صرف مستقبل کی جھلکیاں۔ اس نے سائیں اللہ بخش کو کیسے بلا لیا۔ سائیں اللہ بخش تو ماضی ہے' مستقبل نہیں۔

اچھا——————بلا لیا کیا' شہاب نے پوچھا۔

ہاں' کہنے لگی' وہ خود آ گئے' اونچے لمبے' گورے چٹے' سر پر رومی ٹوپی ہاتھ میں حقہ۔ یہ کیسے ہوا۔

ہاں وہ بولا——————معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون سیئر کے علاوہ بھی کچھ ہے۔

کیا ہے' میں نے پوچھا۔

اعتکاف

پتہ نہیں کیا ہے۔ مگر ہے' کچھ ہے۔ جب یہ پہلی بار ہمارے گھر آئی تھی تو میں بھی حیران ہوا تھا۔ میری بیوی عفت بھی حیران ہوئی ——— اندر داخل ہو کر بولی' مجھے اجازت ہے کیا۔ اس کی گود میں ایک بے بی تھا۔ کرسی پر بیٹھ گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر بولی' ہاں یہی گھر ہے' بالکل یہی ہے۔

میں آپ کی بات سمجھی نہیں' عفت نے کہا۔

خاتون کہنی لگی' میرا ارادہ تھا کہ اعتکاف کروں۔ خواب میں مجھے یہ گھر دکھایا گیا۔ کہا گیا کہ یہ پاکیزہ گھر ہے' اس میں اعتکاف کرو۔ آج صبح سے میں اس گھر کو ڈھونڈتی رہی ہوں۔ شکر ہے مل گیا ہے۔

آپ کو یقین ہے کہ یہ وہی گھر ہے' عفت نے پوچھا۔

بالکل' وہ بولی' اس کمرے سے پچھلا والا جو کمرہ ہے بائیں ہاتھ کو' اس کمرے میں مجھے اعتکاف کرنا ہے۔

یہ سن کر عفت بڑی حیران ہوئی۔ اس خاتون کو یہ کیسے پتہ چلا کہ اس کمرے کے پیچھے بائیں ہاتھ کو ایک اور کمرہ بھی ہے۔ اور وہی ایک کمرہ تھا جو ہمارے گھر میں خالی پڑا تھا۔

پھر ——— کیا اس نے وہاں اعتکاف کیا' میں نے پوچھا۔

ہاں کیا' شہاب بولا' کیسے کیا۔ میں نے پوچھا۔ اس نے بچہ ہمارے حوالے کر دیا اور خود اعتکاف میں بیٹھ گئی۔ ہم باری باری بچے کو بہلاتے رہتے اور وہ ساری رات ٹیں ٹیں کرتا رہتا۔ پھر ایک اور مصیبت تھی بچے کو ماں اپنا دودھ پلاتی تھی' بوتل کا نہیں۔ ہم نے فیڈنگ ٹائم کا ایک نقشہ بنا لیا تھا۔

جب وقت آتا تو ہم بچے کو بے بی کاٹ میں ڈال کر کمرے کے دروازے کے باہر رکھ دیتے اور دروازہ بجا کر خود چلے آتے پھر وہ دودھ پلا کر بچے کو دروازے کے باہر رکھ کر دروازہ بجا دیتی۔

یہ تو بڑی مصیبت ہوئی' میں نے کہا۔

وہ تو شکر ہے' شہاب نے کہا کہ یہ خاتون ایک دن اور دو راتوں کے بعد باہر نکل آئی'

اعتکاف مکمل نہ کیا۔ جب یہ باہر نکلی تو ہم دونوں حیران ہوئے۔

عفت نے پوچھا کہ آپ نے اعتکاف مکمل کیوں نہ کیا۔

وہ بولی۔ وہ مجھے بیٹھنے نہیں دیتے کہتے ہیں جس خاتون کا دودھ پیتا بچہ ہو' اسے اعتکاف پر نہیں بیٹھنا چاہیئے۔

عجیب بات ہے' میں نے کہا' آپ نے عطیہ سے پوچھا نہیں تھا کہ وہ کون ہیں' جو بیٹھنے نہیں دیتے۔

نہیں' شہاب نے سر نفی میں ہلا دیا۔

اور وہ کون تھے جنہوں نے اسے آپ کا گھر دکھایا تھا کہ یہاں اعتکاف کرو' میں نے پوچھا۔

سازش

پتہ نہیں ' وہ بولا' دراصل یہ خاتون بڑی پاکیزہ خاتون ہے' اس سے کچھ پوچھنے کی مجھ میں کبھی ہمت نہیں پڑی آج کل وہ برملا کہتی پھر رہی ہے کہ۔

TELL THAT BLOCK HEADED PATHAN THAT

I SEE HIS DEAD BODY ON A GUN.

کیا کیا کیا' میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ بالکل نہیں جھکتی' شہاب نے کہا۔ اس کے گھر فوجی افسر جاتے ہیں' سول افسر جاتے ہیں' وہ ہر شخص کے سامنے یہی بات دہرا دیتی ہے۔

کسی نے جا کر صدر صاحب کو بتایا کہ ایک خاتون آپ کے بارے میں یہ کہتی ہے۔

صدر ایوب مسکرا دیئے۔

ہی واز ا۔ بموزڈ' شہاب نے مسکرا کر کہا۔

کیا مطلب' میں نے پوچھا۔

صدر ایوب ایک عقلیہ فرد ہیں' شہاب نے جواب دیا۔ ایسی باتوں کو نہیں مانتے' پھر صدر صاحب نے مجھے بلایا۔ کہنے لگے' یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ کون خاتون ہے' کیا چاہتی ہے۔

میں نے کہا' آپ اجازت دیں تو میں پتہ لگاؤں۔

لگالو' انہوں نے بے پرواہی سے کہا۔

پھر کیا آپ اس خاتون سے ملے' میں نے پوچھا۔

ہاں' شہاب نے کہا' ملا تھا۔

شہاب کی یہ عجیب عادت تھی۔ وہ بات رک رک کر سناتا تھا۔ بڑی سے بڑی حیران کن بات یوں سناتا جیسے دو اور دو چار کا پہاڑا پڑھ رہا ہو' مطمئن ٹھنڈا' بے حس' وہ پہلا دن تھا۔ جب میں نے شہاب سے لمبی بات کی تھی۔

عطیہ نے کیا بتایا تھا' میں نے پوچھا۔

کہنے لگی صدر پاکستان کے خلاف ایک سازش ہو رہی ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ انہیں زہر دیا جا رہا ہے اس سازش میں بڑے افسر ملوث ہیں۔

ہمارے پاس کوئی ثبوت بھی ہو محترمہ' میں نے عطیہ سے پوچھا۔

ثبوت وبوت کوئی نہیں' عطیہ نے کہا اگر مرزا کو ڈس آرم نہ کیا گیا تو یہ ہو کر رہے گا۔ کل وہ تین بڑے کراچی پہنچ رہے ہیں' جنہوں نے یہ کام سرانجام دینا ہے۔ یہ کہتے ہوئے عطیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ بولی' ان کی بیگمات مجھے نظر آ رہی ہیں۔

پھر' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

خاتون نے تینوں بیگمات کی نشان دہی کر دی۔ شہاب نے کہا۔ میں نے انٹیلی جنس والوں سے بات کی ہے۔ یہ واقعی اس کی نشاندہی کے عین مطابق تین بیگمات کراچی پہنچیں۔ انٹیلی جنس نے ان سے پوچھ گچھ کی' انہوں نے سازش کا اقبال جرم کر لیا۔

عطیہ کی کہانی سننے کے بعد میں دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

آخری فیصلہ

آپ پیش گوئیوں کو مانتے ہیں' شہاب نے پوچھا۔

مانتا تو نہیں لیکن ماننا پڑ رہا ہے۔

ہاں' شہاب نے جواب دیا' کچھ سچی نکل آتی ہیں کچھ نہیں۔ عطیہ کہتی ہے' کئی ایک باتیں میں دیر سے دیکھ رہی ہوں' ________ مسلسل دیکھ رہی ہوں لیکن وہ وقوع پذیر نہیں

ہوتیں۔

مثلاً میں نے پوچھا۔

مثلاً وہ کئی ہیں' میں کب سے دیکھ رہی ہوں کہ سہروردی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ ایک گھنی داڑھی والا شخص جس کی آنکھیں سبز ہیں' ڈکٹیٹر بن کر آ رہا ہے' جو بہت سخت گیر ہے' اور ہمارے معاشرے کو سدھار کر رکھ دے گا۔

اچھا' میں نے حیرت سے کہا' وہ یہ دیکھ رہی ہے۔

ہاں' شہاب بولا' وہ خود حیران ہے کہ یہ باتیں وقوع پذیر نہیں ہو رہیں۔ ظاہر ہے کہ یقینی نہیں کہ ہربات درست نکلے۔

مطلب ہے کہ آپ نہیں مانتے' میں نے کہا۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا' نہ پیش گوئی کو مانتا ہوں' نہ کشف کو۔

وجہ' میں نے پوچھا۔

میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ (FINALITY RESTS WITH GOD) اگر اس بات پر ایمان قائم ہو جائے تو کشف اور پیش گوئی بے معنی ہو جاتی ہیں۔

وہ پہلا دن تھا کہ میں نے شہاب سے قربت محسوس کی تھی۔ اس سے پہلے چند ایک مختصر ملاقاتوں کے دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ شہاب بڑا ہونے کے باوجود بڑا نہیں ہے اس کے برتاؤ میں عجز تھا۔ روا داری تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کی خاموشی بڑی سنگین تھی۔ وہ اپنی خوش خلقی اور عجز کے باوجود کسی کے قریب نہیں آتا تھا۔ کسی کو قریب آنے نہیں دیتا تھا۔

بھائی جان اور سائیں اللہ بخش سے عقیدت کے بعد مجھ میں کسی اور کے قریب جانے کی خواہش نہ رہی تھی۔ بھائی جان سے میرا تعلق بدستور قائم تھا۔ ان کے خط آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک بار میں عرس پر راولپنڈی بھی گیا تھا۔

ستارہ اور ہلال

خطوں میں بھائی جان سے قدرت اللہ شہاب کی بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ میں انہیں لکھتا رہتا تھا کہ قدرت اللہ شہاب پے   نکیشن میں میری بڑی مدد کر رہے ہیں۔ پھر دفعتاً" بھائی جان

کا ایک خط ملا۔ جس میں ضمنی طور پر شہاب کا تذکرہ تھا۔ لیکن ضمنی ہونے کے باوجود اس میں اپنائیت تھی' حیران کن اپنائیت۔ انہوں نے لکھا کہ (شہاب صاحب) ستارہ کو راز رکھو۔ ہلال گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن ستارہ سدا قائم رہتا ہے۔

بھائی جان کی اس بات نے میرے ذہن میں ہلچل مچا دی۔ شہاب کو ستارہ کا نام کیوں دیا گیا ہے۔ اسے راز رکھو' کیوں' یہ نیا تعلق' کیسے قائم ہوا۔ کیوں قائم ہوا۔

ابھی میں اسی سوچ میں پڑا تھا کہ بھائی جان کے دوسرے خط نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔

لکھا تھا' ستارہ سے ملاقات ہو ہی جائے گی لیکن ہمیں تو انہیں بڈھے سے ملانا ہے۔

اس دن پہلی مرتبہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ قدرت اللہ شہاب کون ہے' جسے بھائی جان سائیں اللہ بخش سے ملانا چاہتے ہیں۔ کئی ایک دن میں اس بات پر سوچتا رہا' سوچتا رہا' لیکن بات سمجھ میں نہ آئی۔

پروگرام

پھر ایک روز بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ بھائی جان اکثر مرد قلندر کے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ ان کا ایک پروگرام ہے' یہ پروگرام پاکستان سے متعلق ہے۔ مرد قلندر کے تذکرے میں بھی اس کا ذکر ہے' قیام پاکستان سے بہت پہلے ۱۹۳۶ء میں سائیں اللہ بخش نے ریاست حیدر آباد دکن کے نواب کو ایک خط لکھا تھا' جس میں انہیں دعوت دی تھی کہ آؤ ہم تمہیں ایک اسلامی مملکت کا خلیفہ بنا دیں۔ جس کے جواب میں نواب دکن نے اپنے ایک بڑے عہدے دار کو مرد قلندر کی خدمت میں بھیجا تھا۔ جس سے سائیں اللہ بخش نے تخلیے میں دو گھنٹے بات چیت کی تھی۔ لیکن نواب صاحب پس و پیش میں پڑ گئے' گھبرا گئے اور تعاون پر آمادہ نہ ہوئے۔

میں نے سوچا شاید شہاب سے اپنائیت اور اس بڈھے سے ملانے کی خواہش اس پروگرام کے حوالے سے ہو۔ شہاب کا چناؤ اس کے عہدے کی وجہ سے کیا گیا ہو۔ مقصد صدر پاکستان سے رابطہ قائم کرنا ہو۔

پھر خیال آتا۔ نہیں' ایسا نہیں۔ اگر یہ مقصد ہوتا تو بھائی جان خط میں یہ نہ لکھتے کہ ہلال تو

ادلتا بدلتا رہتا ہے اور ستارہ ہمیشہ قائم رہتا تھا۔

بہر صورت میرے ذہن میں یہ خیال نہ آیا کہ قدرت اللہ شہاب کی کوئی ذاتی حیثیت بھی ہو سکتی ہے۔

پھر رائٹرز گلڈ کی کونشن سے متعلق رابطے شروع ہو گئے۔ اور ہم سب کو بار بار شہاب سے ملنے کا مواقع ملا۔

حفیظ جالندھری شہاب سے ملنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا تھا۔ لیکن شہاب اسے ملنے سے گھبراتا تھا۔ حفیظ کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا۔ عہدہ' پیسہ اور اس کی سوئی اسی ایک بات پر اٹکی ہوئی تھی۔

احمد بشیر شہاب سے مل تو لیتا تھا لیکن ایک شان بے نیازی سے۔ اس کا کوئی مطالبہ نہ تھا' نہ اسے شہاب کی شخصیت سے کوئی خصوصی دلچسپی تھی۔

جلتا بجھتا

ابن انشا شہاب سے بے حد متاثر تھا۔ اس کا کوئی مطالبہ نہیں تھا۔ لیکن شہاب کا نام سنتے ہی اس کے چہرے پر روشنی ہو جاتی تھی' بجھا ہوا مٹی کا دیا جل اٹھتا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ابن انشا میرے لیے ایک معمہ تھا۔

پہلی مرتبہ ابن انشا کو دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا' یا اللہ یہ کیا چیز ہے' جو جلتی بجھتی رہتی ہے۔ جلتا ہے تو چہرہ مسکراہٹ سے منور ہو جاتا ہے---------۔ مسکراہٹ میں مسرت کم خلوص زیادہ چپ چپ کرتا خلوص اور بجھتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ بجھتا کیوں ہے۔ پر مجھے پتہ چلا کہ یہ تو ازلی طور پر بجھا ہوا ہے۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ اتنی گہری بجھن کے باوجود یہ جلتا کیسے ہے۔

لگتا تھا جیسے اس کی یادوں کے طاقچے میں ایک پھنیئر سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ جس کے خوف کے مارے اس نے یادوں کا طاقچہ بند کر رکھا ہے۔ یادوں سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے' ان جانے میں یا مہا چالاکی سے' اس نے خود پر اندھیرا طاری کر رکھا ہے۔

کبھی سوچتا کہ یہ تو ایک کھلاڑی عورت کے مصداق ہے جو ایک ساعت میں آپ کی طرف

یوں بے گانہ وار دیکھتی ہے' جیسے جانتی ہی نہ ہو۔ دوسری ساعت میں مسکرا کر بے تکلفی سے آپ کی گود میں آ بیٹھی ہے۔

کبھی محسوس کرتا کہ بکار خویش ہوشیار دیوانہ ہے' کبھی ایسے لگتا جیسے کوئی قلندر نفی اثبات کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابن انشا ابھی ابن انشا نہیں بنا تھا۔ ابھی اندھیرے اجالے جدا نہیں ہوئے تھے ابھی وہ دہلیز پر کھڑا ہچکچا رہا تھا' برسرعام نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی بھن کی گڈری میں کوئی صلاحیت چمکتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

بہرصورت شہاب کا نام سن کر ابن انشا روشن ہو جاتا تھا۔ شہاب بھی اس کی کنفیوزڈ باتیں سن کر بہت محفوظ ہوتا تھا۔

پھر میں تھا۔ مجھے شہاب سے محفل میں ملنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اکیلے میں' دو وجوہات کی بنا پر میں اسے ملنے سے دلچسپی رکھتا تھا۔ ایک تو میری پے فکسیشن میں وہ مدد کر رہا تھا۔ دوسرے ان دنوں میری زندگی میں جو عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے تھے' ان سے متعلق نہ تو قیصر سے بات کر سکتا تھا نہ احمد بشیر سے۔ وہ دونوں میرا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے میں یہ باتیں صرف شہاب سے کر سکتا ہو۔ اس امید پر کہ وہ میری ذہنی پریشانی کو دور کر سکے۔

مرسی پٹیشن

انہی دنوں شہاب کے پاس ادیبوں کا ایک وفد آ گیا۔ ایک ادیب نعیم نے خانگی جھگڑے کی بنا پر غصے میں آ کر اپنی بیوی کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ مقدمہ چلا۔ کورٹ نے اسے موت کی سزا دی تھی۔ اب اس کے والد نے صدر پاکستان کی خدمت میں رحم کی درخواست پیش کی تھی۔

شہاب نے وفد سے کہا کہ قتل کے کوائف اس قدر گھناؤنے ہیں کہ صدر صاحب یقیناً رحم کی اپیل کو رد کر دیں گے۔

اس پر نعیم کے والد عطیہ سے جا ملے عطیہ نے مراقبہ کیا اور کہنے لگی کہ اگر دو مہینے کے

لیے پھانسی کی سزا ٹل جائے تو پھر اسے پھانسی نہیں دی جا سکے گی۔

وفد کا مطالبہ تھا کہ کسی طرح دو مہینے کے لیے پھانسی کی سزا کو عمل میں آنے سے روک دیا جائے۔ شہاب نے وفد سے کہا کہ میں عطیہ سے مل کر آپ کو بتا سکوں گا۔

اس سلسلے میں شہاب کے کہنے پر ابن انشا عطیہ سے ملا۔ عطیہ نے کہا' یہ درست ہے' اگر ڈیڑھ دو ماہ تک کوئی ایکشن نہ لیا گیا تو اسے پھانسی نہیں ہو گی۔ پھانسی کی سزا عمر قید میں بدل جائے گی۔

نشاۃ ثانیہ

مزید تصدیق کے لیے شہاب نے عطیہ کو فون کیا۔ عطیہ کہنے لگی' آپ یہاں آ جائیں' میں آپ کو ایک بہت بڑے خوشخبری سنانا چاہتی ہوں۔ جو کسی اور کو نہیں سنا سکتی۔ شہاب عطیہ سے ملنے گیا تو ساتھ مجھے بھی لے گیا۔

اس روز عطیہ بڑے موڈ میں تھیں۔ کہنے لگیں آج کل عرش پر بہت خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ چراغاں ہو رہا ہے۔ حضور دولہا بنے ہوئے ہیں۔ پھولوں کے ہار پہنے ہوئے ہیں۔ گلاب کی پتیاں نچھاور ہو رہی ہیں۔ سب خوشیاں منا رہے ہیں۔

کہتے ہیں' اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہونے والا ہے۔ عرش اور فرش ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے۔ پاکستان اس دور کا گہوارہ ہو گا۔ وہ رک گئی' پھر وقفے کے بعد کہنے لگی' میں نے دیکھا ہے کہ صدر پاکستان کی کرسی خالی پڑی ہے' وہاں کالا جھنڈا لگا ہوا ہے۔ جو شخص ان کی جگہ لے گا وہ بہت سخت گیر آدمی ہو گا۔ اس کی داڑھی گھنی ہے۔ آنکھیں سبز ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ ایک خونین جنگ ہو گی۔ ایسٹ پاکستان ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ کشمیر ہمیں مل جائے گا۔ پاکستان کے علاقے میں وسعت ہو گی۔ ہم دلی پر قابض ہو جائیں گے۔

اس روز عطیہ بڑے جوش میں تھی وہ مسلسل باتیں کیے جا رہی تھی۔ شہاب اور میں چپ چاپ بیٹھے سن رہے تھے۔ پھر شہاب بولا کہنے لگا' محترمہ کچھ ایسی باتیں بھی تو ہیں جو آپ عرصہ دراز سے دیکھ رہی ہیں لیکن وہ وقوع پذیر نہیں ہوتیں۔

ہاں وہ بولی کچھ ایسی باتیں بھی ہیں۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کی بات تو ہو کر رہے گی۔ چاہے آج ہو

یا چالیس سال بعد۔ اور پاکستان نشاۃ ثانیہ کا مرکز ہو گا۔ یہ تو طے شدہ باتیں ہیں۔

عطیہ کی باتیں میرے لیے بے حد پریشان کن تھیں۔ یہ نشاۃ ثانیہ کیا چیز ہے۔ بھائی جان بھی اس کے بارے میں بات کیا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے' تم پاکستان کا فکر نہ کرو۔ پاکستان کا فکر کرنے والے اللہ کے بندے موجود ہیں۔ تم جب بھی کوئی قدم اٹھانے لگو تو سوچو' کیا میرا یہ قدم پاکستان کے لیے باعث نقصان تو نہ ہو گا۔

اس پر مجھے خیال آتا کہ پاکستان کو اتنی اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔ کیا اس لیے کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے۔ مسلمانوں کے تو دنیا میں بیسیوں ملک ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہم پاکستانی تو برائے نام مسلمان ہیں۔ نہ ہمارے کردار میں اسلام کی جھلک ہے' نہ اعمال میں اسلام کا رنگ ہے۔ البتہ ایک وصف ضرور ہے کہ ہم میں اسلام کے لیے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے' جذبہ موجود ہے۔ کیا پاکستان کو یہ شرف اس جذبے کے لیے حاصل ہو گا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

پھر میری توجہ عطیہ پر مرکوز ہو گئی۔ یہ کون خاتون ہے' اسے یہ گفٹ کیسے ملا۔

ای ایس پی کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے مجھی سیئرز کے بارے میں کچھ معلومات حاصل تھیں مجھے علم تھا کہ کچھ لوگوں کو پیدائشی طور پر مستقبل کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اور کچھ لوگوں میں سر کی چوٹ لگنے پر یہ خصوصیت ابھر آتی ہے۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ اس خصوصیت کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے' لیکن حیرت کی بات تھی کہ عطیہ کو مذہب سے گہرا تعلق تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ عطیہ سے اکیلے میں ملوں اور اسے پوچھوں کہ یہ گفٹ اسے کیسے ملا۔ میں نے ٹیلی فون پر عطیہ سے وقت مانگا' وہ مان گئی۔

عطیہ کی کہانی

میں نے کہا محترمہ' آپ کو مستقبل کی جھلکیاں کیسے نظر آتی ہیں۔ وہ مسکرائی' کہنے لگی' کبھی محسوسات کے ذریعے جھلکی نظر آتی ہے' کبھی آنکھوں کے سامنے تصویر آ جاتی ہے' کبھی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور کبھی دیوار پر فلم چلنے لگتی ہے۔

کوئی ایک طریقہ مخصوص نہیں ہے کیا' میں نے پوچھا۔

نہیں' وہ بولی۔

کب سے آپ یہ جھلکیاں دیکھ رہی ہیں۔

بچپن سے ہی۔ جب مجھے پوری طرح شعور نہیں تھا۔

کہنے لگی' شروع شروع میں میں یہ جھلکیاں دیکھ کر ڈر جایا کرتی تھی کہ یہ کیا نظر آ رہا ہے مجھے' مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ مستقبل کی جھلکیاں ہیں۔

پھر اس نے مجھے اپنے بچپن کی مختصر سی کہانی سنائی۔

کہنے لگی' میرے والد بہت پڑھے لکھے پروفیسر ہیں۔ انہیں مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' یہاں تک کہ اللہ کو نہیں مانتے تھے۔ گھر پر بندش لگا رکھی تھی کہ کوئی مذہب کی بات نہ کرے' خدا کی بات نہ کرے۔ کسی کو نماز پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔

وہ ہنسنے لگی' بولی' پتہ نہیں کیوں' شاید اس بندش کی وجہ سے یا ویسے ہی مجھے بچپن سے ہی نماز پڑھنے کا شوق تھا۔ امی نے چوری چوری مجھے نماز سکھا دی تھی۔ پڑوس میں جا کر میں نمازیں پڑھا کرتی تھی اور قرآن پڑھنا سیکھتی تھی۔

ایک دن پڑوسن کی ساس بیمار پڑ گئی۔ اس نے شور مچا دیا کہ جاؤ ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔

اس وقت میں مریضہ کے پاس کھڑی تھی۔ میں نے مریضہ کی طرف دیکھا مجھے یوں نظر آیا جیسے وہ مر چکی ہو۔ میں نے باآواز بلند کہا' اب ڈاکٹر کو بلانے کا کیا فائدہ' یہ تو مر چکی ہے۔ یہ کہہ کر میں گھر چلی آئی۔ ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے مریضہ فوت ہو گئی۔

میری یہ بات سارے محلے میں مشہور ہو گی۔ پھر لوگوں نے مجھ سے پوچھنا شروع کر دیا میرا بیٹا امتحان میں پاس ہو جائے گا کیا' مجھے نوکری مل جائے گی کیا۔ کیا ہم مقدمہ جیت جائیں گے۔

جب میں ان کے سولات پر توجہ دیتی تو مجھ پر محسوسات طاری ہو جاتے۔ اپنے محسوسات کے مطابق میں انہیں بتا دیتی کہ یہ ہو جائے گا یہ نہیں ہو گا۔

عطیہ مسکرائی کہنے لگی ان دنوں میں بچی تو تھی' مجھے احساس ہی نہ تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ مجھے ان باتوں کی اہمیت کا احساس نہ تھا' جو میں کہتی تھی وہ ہو جاتا تھا۔' اس پر سارے محلے میں میری دھوم مچ گئی مجھ سے ملنے لوگ دور دور سے آنے لگے تھے۔

کہنے لگی' لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ امتیازی صلاحیت ہے' غلط سمجھتے ہیں' مستقبل کو جان لینا بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ جب میرے والد فوت ہوئے' تب میں نے جانا تھا کہ یہ کس قدر

تکلیف دہ بات ہے۔

اس روز ناشتے سے فارغ ہو کر میں لیٹ گئی تھی۔ دفعتاً" میں نے دیکھا کہ ایک کفن اڑتا اڑتا کھڑکی سے کمرے میں داخل ہو گیا' اور دوسری چارپائی پر آ کر ٹک گیا۔ ایک آدھ منٹ وہ وہاں پڑا رہا' پھر تحلیل ہو گیا میں نے شدت سے محسوس کیا کہ آج اس کمرے میں کوئی شخص فوت ہونے والا ہے۔

ان دنوں گھر میں صرف تین فرد تھے' میرے والد میرے میاں اور میں یعنی ہم میں سے ایک فوت ہو جانے والا ہے۔ وہ کون ہے رہ رہ کر مجھے خیال آتا۔

پھر یہ بھی ہے مفتی صاحب' وہ بولی کہ کئی ایک مناظر جو میں دیکھتی ہوں' وقوع پذیر نہیں ہوتے۔ بہرحال اس روز دس بجے میں نے کفن کا منظر دیکھا تھا۔ دس بجے سے تین بجے تک مجھ پر گویا نزع کا عالم طاری رہا۔ میں مرمر کر جیتی رہی۔

اس وقت گھر میں میں اکیلی تھی۔ میاں دفتر گئے ہوئے تھے' ابا کالج گئے ہوئے تھے۔ میں بار بار انہیں فون کرتی کبھی میاں کو کبھی ابا کو' اتنی بار فون کیے میں نے کہ انہیں شک پڑ گیا۔ آج کیا بات ہے' تم اس قدر مضمحل کیوں ہو۔ خیرت تو ہے' میاں مجھ سے پوچھتے' لیکن مجھ پر ایک وحشت سوار تھی۔

تین بجے وہ دونوں گھر آ گئے تو مجھے تسلی سی ہو گئی۔

پھر چار بجے کے قریب ابا کے پیٹ میں درد اٹھا اور وہ اسی چارپائی پر لیٹ گئے جس پر کفن ٹکا رہا تھا۔ میرے میاں نے ڈاکٹر کو فون کیا' لیکن ڈاکٹر کی آمد سے پہلے ہی ابا رخصت ہو گئے۔ یہ قصہ سنانے کے بعد عطیہ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس واقعہ کو پھر سے بیت رہی تھی۔

مستقبل کی جھلکیاں دیکھنے کے علاوہ کیا آپ کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے' جسے مافوق الفطرت کہا جا سکے' میں نے پوچھا۔

ہاں' وہ بولی' صرف ایک بار جب ہم نئے نئے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ ان دنوں ہماری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں ہم لاوارثوں کی طرح پڑے تھے۔ ہاتھ پھیلانے کی عادت نہ تھی۔ فاقوں پہ فاقے آ رہے تھے۔

ایک روز صبر و تحمل کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میرے دل سے نکلا' یا اللہ ہمارا کیا بنے گا' کیا یہی ہمارا انجام ہے۔ پھر مجھے کھڑ کھڑ کی آواز آئی۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک منور کاغذ ہوا میں ڈول رہا ہے۔ وہ کاغذ نیچے آیا اور میں نے اسے دبوچ لیا۔ دیکھا کہ اس پر منور حروف میں ایک آیت لکھی ہوئی ہے نیچے اردو میں ترجمہ تھا۔

کیا مفہوم تھا' اس کا' میں نے پوچھا۔

اس میں امید بھرا پیغام تھا کہ مشکل کے دن ختم ہوئے۔ اللہ پر بھروسہ رکھنے والوں کو نوازا جاتا ہے۔

بس اس روز کے بعد حالات بدلتے گئے۔ روزگار کا سلسلہ بندھ گیا۔ ایک معقول مکان مل گیا۔

عطیہ کی کہانی سن کر میں نے جان لیا کہ وہ خالی سیتر ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔

مجھے گم صم دیکھ کر قیصر چلاتا' یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں کہتا ہوں تم شہاب سے میل ملاپ چھوڑ دو۔ وہ تجھے ڈی سلف کر رہا ہے۔ ہٹاؤ' چلو اچھی سی پکچر دیکھیں۔

میری بیوی قیصر کی ہاں میں ہاں ملاتی۔ اسے لے جاؤ۔ فلم دکھا لاؤ۔ یہاں بت بنا بیٹھا رہتا ہے' نہ بات' نہ چیت۔ لے جاؤ اسے' قیصر مجھے کراچی میں گھماتا پھرتا' فلم دکھاتا' لیکن میرے اندر گویا کانٹا لگا ہوا تھا۔ وہ کسی صورت نکلتا نہ تھا۔

دفتر میں ان دنوں ہم سب گویا ریکریشن لیو پر تھے۔ سارا دن تفریح چلتی تھی۔ چونکہ حفیظ صاحب دورے پر لاہور گئے ہوئے تھے۔ وہ دورہ نہیں تھا بلکہ تفریحی ٹرپ تھا کیونکہ وہ اپنی نئی' نوجوان بیوی کو ساتھ لے گئے تھے' ہم سب ان کے اس دورے کو ہنی مون ٹور کہتے تھے۔

پھر دفعتاً" حفیظ صاحب کا تار موصول ہوا۔ مفتی ممتاز کو فوراً لاہور بھیج دو۔ اسے ہدایت کی جائے کہ لاہور میں اس پتہ پر مجھ سے رابطہ قائم کرے۔

ارے' انشا چلایا' ہنی مون میں پی اے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔

نئی بیگم کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنا ہو گا' احمد بشیر نے کہا۔

میں نے کہا' یار احمد بشیر اگر میں لاہور گیا تو وہاں سے ، پنڈی ہو کر آؤں گا۔

اونہوں' وہ تجھے چھٹی نہیں دے گا' انشا بولا۔

احمد بشیر نے کہا' نو پرابلم تو مجھ سے پیشگی چھٹی لے جا۔

لاہور پہنچ کر میں سیدھا حفیظ کے دیے ہوئے پتے پر پہنچا۔ نوکر نے کہا' آپ انتظار کیجیے میں صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔

کچھ دیر کے بعد نوکر نے آ کر کہا وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔ وہ مجھے اوپر والی منزل میں لے گیا۔

اشتعال ٹانک

کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا۔ دو ریشمی رضائیاں اور چند تکیے پڑے تھے۔ ایک طرف حفیظ شال میں لپٹا ہوا تھا' دوسری طرف جانب ایک بنی سنوری جاذب نظر خاتون بیٹھی تھی۔

بیٹھ جا' بیٹھ جا' حفیظ بولا۔ بہت اچھا کیا جو تو آ گیا ہم نے تجھے ایک بہت اہم کام کے لیے بلایا ہے۔ یہ کام بہت ہی اہم ہے۔ اور تجھے اس سلسلے میں بہت بڑا رول ادا کرنا ہے۔ تجھے ہم نے پی اے کی حیثیت سے نہیں بلایا۔ بلکہ جج کی حیثیت سے بلایا ہے۔ تیرے سامنے ابھی ابھی ایک مقدمہ پیش کیا جائے گا۔ دونوں فریق اپنے اپنے بیانات پیش کریں گے اور تجھے بڑے غور و خوض کے بعد۔ عدل و انصاف کی بنا پر فیصلہ سنانا ہو گا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

یا اللہ' یہ کیا بکھیڑا ہے' میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کیسا ڈرامہ ہے' مجرم کون ہے' میں نے حفیظ کی طرف دیکھا اُس کے ماتھے پر تیوری تھی' غصے کی نہیں کرب کی تیوری۔

پھر میں نے خاتون کی طرف دیکھا' وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں دعوت تھی' زندگی تھی۔

مجرم کو حاضر کیا جائے'میں نے ازراہ مذاق کہا۔

عالیجاہ میں حاضر ہوں' حفیظ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اور آپ محترمہ' میں نے خاتون کی طرف دیکھا' وہ مسکرانے لگی۔

ہم دونوں ہی ملزم ہیں' حفیظ نے کہا' دونوں ہی ظالم ہیں۔ دونوں ہی مظلوم ہیں۔

اگر ایسا ہے تو پھر فیصلہ کیسا؟ میں نے کہا۔

وہ دیکھو' وہ دیکھو' حفیظ چلایا۔ جب یہ تیری طرف دیکھتی ہے' تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے' آنکھوں سے مسرت کی پھوار اڑتی ہے' جب میری طرف دیکھتی ہے تو ماتھے پر تیوری پڑ جاتی ہے۔

خاتون قہقہہ مار کر ہنس پڑی بولی' بس ان کا یہی ایک شغل ہے۔ یہ میرے نقاب میں ابھرے ہوئے تار گنتے رہتے ہیں۔ یہی الزام ہے۔ یہی جرم ہے۔ یہی مقدمہ ہے۔

عین اس وقت ملازم چائے کا ایک پیالہ لے آیا۔

چائے پیو مفتی ممتاز' حفیظ نے کہا اور مقدمے کے کوائف پر گہری نظر ڈالو۔

چائے پیتے ہوئے میں حفیظ سے مخاطب ہوا۔ میں نے کہا' حفیظ صاحب آپ اپنا شغل قائم رکھئے۔ محترمہ کے نقاب کے تار گنتے رہیے۔ اس کی اشد ضرورت ہے۔

یہ اشتعال میں آ جاتے ہیں' خاتون نے احتجاجی انداز میں کہا۔

انہیں اشتعال میں آنے کی ضرورت ہے' میں نے کہا۔ حالات کا تقاضا ہے کہ یہ اشتعال میں آئیں۔ اگر یہ اشتعال میں نہ آئیں' محترمہ' تو آپ کوشش کر کے انہیں اشتعال میں لائیں۔

اشتعال میں آنے کی مجھے عادت نہیں' حفیظ نے مشتعل انداز میں کہا۔

حفیظ صاحب' میں نے کہا' یہ ایک مفید عادت ہے۔ جب آپ کی عمر میں کوئی جوان لڑکی سے شادی کرتا ہے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اشتعال میں آئے' بار بار آئے چونکہ اشتعال درحقیقت ایک ٹانک ہے اور حفیظ صاحب آپ کو ٹانک کی ضرورت ہے۔

پھر میں نے خاتون کی طرف دیکھا۔ محترمہ آپ ان کے اس شغل کو برا نہ مانیں۔ یہ عدم اعتماد کا اظہار نہیں ہے۔ غم و غصے کا اظہار نہیں ہے۔ یہ تو خود کو اشتعال دلا کر طاقت حاصل کر رہے ہیں اور محترمہ یہ سب آپ کی خاطر کیا جا رہا ہے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔

حفیظ چلانے لگا' رک جا مفتی ممتاز' رک جا۔

نہیں جناب' میں نے کہا' جج اپنا فرض ادا کر چکا ہے۔ فیصلہ سنا دیا گیا۔ اب بحث نہیں ہو

سکتی۔

جب میں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو حفیظ چلا رہا تھا' رک جا مفتی ممتاز' رک جا۔

جب میں اشفاق کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ وہاں قدرت اللہ شہاب بھی موجود ہے اور وہ دونوں کسی سے ملنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

آپ یہاں کیسے' میں نے شہاب سے پوچھا۔

میں دورے پر آیا ہوں' وہ بولا۔

تم یہاں کیسے' اشفاق نے مجھ سے پوچھا۔

میں یہاں ایک مقدمے کا فیصلہ سنانے آیا تھا۔

اچھا' اشفاق بولا' ملزم کون تھا۔

حفیظ جالندھری کی نئی بیگم۔

جواب سن کر دونوں اشفاق اور شہاب چونکے۔

جرم کیا تھا' اشفاق نے پوچھا۔

بہت گھناؤنا جرم تھا' میں نے جواب دیا۔

شہاب نے بڑے اشتیاق سے میری جانب دیکھا۔

اس کے نقاب میں ابھرے ہوئے تار تھے' میں نے کہا۔

دونوں نے قہقہہ لگایا۔

اور تم اسی کام کے لیے سرکاری طور پر کراچی سے بلوائے گئے تھے' اشفاق نے پوچھا۔

جی جناب۔

قاضی صاحب

گاڑی میں سوار ہونے کے بعد میں نے شہاب سے پوچھا' آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔

میسن روڈ پر' قاضی صاحب سے ملوانے۔

وہ کون ہیں' قاضی صاحب' میں نے پوچھا۔

وہ بھی ہیں' شہاب نے جواب دیا۔ آپ دیکھ لیں گے تو پتہ چل جائے گا۔

میسن روڈ پر ہم ایک مکان پر رک گئے۔ مکان کا صدر دروازہ بند تھا لیکن مکان کا ایک کمرہ ہمارے سامنے تھا۔ اس کمرے میں تین کھڑکیاں تھیں۔ جن پر سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے کمرے کا کچھ حصہ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ کوئی چٹی سفید چیز حرکت کر رہی تھی۔

کہاں ہیں' قاضی صاحب' میں نے پوچھا۔

وہ اس کمرے میں ہیں' شہاب نے جواب دیا۔

دکھتے نہیں۔

ذرا انتظار کرو۔ شہاب نے کہا' شاید وہ کھڑکی میں آ جائیں' وہ اکثر کھڑکی میں آ جایا کرتے ہیں

برآمدے میں ایک کھٹولی پر ایک خاتون بیٹھی تھی۔ اس کی شخصیت سے مٹھاس کی پھوار اڑ رہی تھی۔

دیکھو مفتی' اشفاق بولا۔ قاضی صاحب کھڑکی میں آ گئے ہیں۔

میں نے کھڑکی کی جانب دیکھا۔ کھڑکی میں ایک منور چہرہ مسکرا رہا تھا۔ چہرے پر اتنی تازگی تھی' اتنی شگفتگی تھی جیسے ابھی ابھی لکس صابون سے منہ دھو کر فیرانیڈلولی کریم مل کر آیا ہو۔

بڑی تازگی ہے' میں نے کہا۔

پچھلے تین سال سے انہوں نے منہ نہیں دھویا' شہاب نے مسکرا کر کہا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنا منور چہرہ۔

تین سال سے یہ اس کمرے میں بند ہیں۔ شہاب بولا' باہر نہیں نکلے۔ آٹھ آٹھ دن کھانا نہیں کھاتے۔ گھروالے دروازہ کھول کر' اندر رکھ دیتے ہیں' لیکن وہ جوں کا توں پڑا رہتا ہے۔ اجابت بھی اندر ہی کرتے ہیں۔ غلاظت پڑی رہتی ہے۔

ٹھیک ہے' اشفاق بولا' انہیں خود کا ہوش نہیں ہے۔

اس خاتون کو دیکھتے ہیں آپ' شہاب نے کہا۔ یہ ان کی بہن ہے۔ یہی ان کی واحد خدمت گار ہے۔ اندر جاتی ہے۔ صفائی کرتی ہے' غلاظت اٹھاتی ہے۔

لیکن سب کیا ہے۔ کیوں باہر نہیں نکلتے' کیوں سدھ بدھ ماری گئی' میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں شہاب نے کہا' قاضی ایک خوش شکل نوجوان تھا' تعلیم یافتہ' خوش لباس تین سال ہوئے سارے گھروالے کسی تقریب پر جارہے تھے۔ چلنے لگے تو'

قاضی نے کہا' ایک منٹ رکیے' میں بالوں کو کنگھی کر لوں' اس روز سے آج تک یہ بالوں میں کنگھی کر رہے ہیں۔

ذہنی بیماری ہے کیا' میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر یہی کہتے ہیں۔

مجذوبیت کی کیفیت ہے کیا' اشفاق بولا۔

ہاں کہہ سکتے ہیں' شہاب نے کہا۔

دونوں میں کیا فرق ہے' میں نے پوچھا۔

وہ ایک بیماری ہے' یہ ایک کیفیت ہے' شہاب نے جواب دیا۔

بات سمجھ میں نہیں آئی۔

میری سمجھ میں بھی نہیں آتی' شہاب نے کہا۔ میں بھی اندازے لگاتا ہوں۔

لگائیے اندازہ' میں نے کہا۔

بیماری میں چاروں طرف اندھیرا ہوتا ہے۔ اس کیفیت میں بھی چاروں طرف اندھیرا ہوتا ہے' لیکن ایک ان جانی چوتھی سمت ابھر آتی ہے۔ جو روشن ہوتی ہے' شہاب نے جواب دیا

اگلے روز صبح سویرے ہی اشفاق احمد نے ہمیں جگا دیا۔ کہنے لگا' مجھے لارنس باغ جانا ہے۔

اس وقت لارنس باغ' تمہارا ذہن تو ٹھیک ہے' میں نے پوچھا۔

مجھے ایک فیچر لکھنا ہے' اشفاق نے کہا' ان لوگوں پر جو صبح سویرے اٹھ کر سیر کرتے ہیں' جاگنگ کرتے' ورزش کرتے ہیں۔

شہاب نے کہا' چلو ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔

لارنس باغ میں پہنچے تو وہاں ایک میلہ لگا ہوا تھا۔

کچھ لوگ سڑکوں پر دوڑ رہے تھے' کچھ جاگنگ کر رہے تھے۔ کچھ تیز واکنگ۔ پارکوں میں لوگ مختلف قسم کی ورزشوں میں مصروف تھے۔

ہم لارنس باغ کی اوپن ائیر کنٹین میں بیٹھ گئے۔ شہاب نے اشفاق سے کہا' ہم یہاں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں' آپ واکرز اور جاگرز سے انٹرویو کرلیں۔ اشفاق چائے کا پیالہ پینے کے لیے رک گیا۔ اتنے میں ایک خاکروب آگیا اور جھاڑو سے سوکھے پتوں' کاغذوں اور لفافوں کو اکٹھا کرنے لگا۔

فضل مسیح

اشفاق کو بات کرنے کا چسکا ہے اس نے خاکروب سے بات چھیڑی' کہنے لگا' اے میاں' تم چوہڑے ہو کیا۔ دکھتے نہیں کہ چوہڑے ہو۔

وہ رک گیا' بولا بابو جی۔ میں عیسائی ہوں۔ چوہڑا نہیں ہوں۔

عیسائی تو ہو ٹھیک ہے' اشفاق نے کہا' پر کیا یہ کام تمہارا اجدی کام ہے۔

جی نہیں' وہ بولا' یہ کام ہمارا اجدی کام نہیں ہے۔ یہ کام میرا کام بھی نہیں ہے۔

تو پھر کیوں کر رہے ہو تم یہ کام۔

بس جی مجبوری ہے۔

کیسی مجبوری۔

بس جی۔ میں دفتر میں چپڑاسی تھا' پھر حکم ہو گیا کہ فضل مسیح جھاڑو کا کام کرو۔

کس نے حکم دیا۔

جی میرے مرشد نے حکم دیا۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ مرشد نے سزا دے دی۔ بولا' فضل مسیح تین سال گندگی اٹھاؤ' پھر تین سال جھاڑو لگاؤ۔ چھ سال کے بعد ہم سے آ کر بات کرنا۔

فضل مسیح کی بات سن کر شہاب کے کان کھڑے ہو گئے۔ بولا فضل مسیح عیسائیوں میں بھی مرشد ہوتے ہیں کیا۔

صاحب جی' وہ بولا' یہ تو بندے بندے کی بات ہے' کوئی مرشد مان لیتا ہے' کوئی نہیں مانتا۔ کوئی زبردستی نہیں صاحب جی۔ ایسے بھی ہیں جو مرشد مان کر بھی حکم نہیں مانتے۔ آپ مسلمانوں میں بھی تو یہی ہوتا ہے جی۔

ان کے لیے چائے کا ایک پیالا منگوائیے' شہاب نے کہا۔

فضل نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیے۔ بولا' نہیں سرکار چاہ کی تکلیف نہ کریں۔ چاہ میں نہیں پیتا۔

کیوں نہیں پیتے' اشفاق نے پوچھا۔

حکم نہیں ہے بابو جی' وہ بولا۔

چائے کی منائی ہے کیا۔

نہیں منائی تو نہیں۔ دو جے سے لے کر پینے کا حکم نہیں ہے۔

لیکن کیوں۔

حکم تو حکم ہوتا ہے جی۔ اس میں نہ نہیں ہوتا۔ کس لیے نہیں ہوتا۔ پچھنا نہیں ہوتا جی۔ پچھنا حجت ہے۔ حکم ہے کہ فضل مسیح کسی کا دیا ہوا نہیں کھانا پینا۔ کسی کا دیا ہوا نہیں پہننا۔ ادھار نہیں منگنا چاہے فاقے آئیں' پڑے آئیں فاقے۔

بڑے سخت حکم ہیں' اشفاق نے کہا۔

بابو جی' وہ بولا' جو سخت نہ ہو تو پھر وہ حکم ہی کیا ہوا۔

تم نہ مانو' میں نے کہا۔

فضل مسیح ہنسا بولا' صاحب جی جو مرشد مان کر حکم نہ مانے وہ مرد نہیں چوہڑا ہے' چوہڑا۔

ہم مسلمانوں میں تو بہت سارے ایسے ہیں فضل مسیح جو مرشد تو بنا لیتے ہیں پر حکم نہیں مانتے' میں نے بات کی وضاحت کی۔

بس جی اسی لیے مسلمان رل رہے ہیں۔ کوئی قدر نہیں' کوئی مان نہیں' دکھو دکھ ہو رہے ہیں' انگلاں ہی انگلاں' مٹھ نہ بنے۔

سچ کہہ رہا ہے فضل مسیح' شہاب گنگنایا۔

صاحب صرف مسلمان کی گل نہیں۔ مسلمان ہو' عیسائی ہو' سکھ ہو' ہندو ہو کوئی بھی ہو۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ بس شرط اک ہے حکم منے۔ آگوں بولنا نہیں۔ پچھنا نہیں۔ بس سر جھکا دینا ہے جس قوم نے حکم منیا وہ چڑھ گئی' نہ منیا تو رل گئی۔

شاباشے' اشفاق بولا' تو کھری باتاں کر رہا ہے فضل' پر یہ بتا کہ تیری سزا کے کتنے سال باقی

ہیں۔

فضل نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا بولا۔ وہ تو پورے ہو گئے تھے۔ صاحب جی۔ پر آخری سال میں پھر اک بھل ہو گئی۔ بندہ بشر ہے نا صاحب جی' وہ بولا۔ بھل ہو ہی جاندی ہے۔ سزا میں تین سال اور بڑھ گئے جی۔

تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے' اشفاق نے اسے چھیڑا۔

کیا فرق پڑے گا جی' وہ بولا' میں تو یہی رہوں گا جی۔ جو میں ہوں' میری بھل بھی یونہی رہے گی۔ یہاں تو بھل ہو جائے تو بندہ پرا سچیت کر لیتا ہے۔ مسلمانوں میں تو بھل ہو جائے تو ناواں کاٹ دیتے ہیں۔ اک چانس بھی نہیں دیتے۔ اور پھر مسلمان پیراں نے بڑی اوچی شرطاں لگا رکھیاں ہیں۔ کوئی سالوں سال کھوہ میں لٹک کر نام جپتا ہے' کوئی سالوں سال پیٹ پر پتھر بنے پھرتا ہے۔ کوئی اپنے پترتوں خود نوں قربان کرنے کو اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ توبہ جی' توبہ' یہ تو جنوں کے کام ہیں۔ ان کے لیے سمندر جیسا حوصلہ چاہیئے۔ صاحب جی۔

فضل مسیح اٹھ بیٹھا۔ اچھا صاحب جی' وہ بولا۔ اب میں اپنا کام نپٹالوں۔

ساتھ ہی اشفاق اٹھ بیٹھا' بولا میں بھی اپنا کام نپٹالوں تم یہاں بیٹھو میں ابھی آیا۔

ہم دونوں فضل مسیح کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ یہ فضل مسیح کتنا بڑا آدمی ہے۔ میں نے سوچا جو جانے بغیر ماننے کی ہمت رکھتا ہے۔ زندگی بھر میں نے ماننے کی عظمت کو نہیں سمجھا تھا۔ میں سمجھتا رہا کہ جانے بغیر ماننا ممکن نہیں' جو لوگ آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہیں وہ جاہل ہیں۔ جاننے اور ماننے کا مسئلہ سب سے پہلے میں نے نور بابا کے دربار میں سنا تھا۔

نور بابا

نور بابا سے میرا تعارف اشفاق احمد نے کرایا تھا۔ اشفاق احمد قال کا پروانہ ہے۔ بولنا اس کے لیے زندگی ہے اور خاموشی موت۔ اس لیے وہ بابوں کی ڈھونڈ میں لگا رہتا ہے۔ اسے کسی منزل کی طلب نہیں ہے۔ لیکن نئی نئی باتیں سننے اور باباؤں سے گفتگو کرنے کا شوق اسے ڈیروں اور درگاہوں پر لے جاتا ہے۔

پتہ نہیں وہ کس طرح نور بابا کے دربار میں جا پہنچا نور بابا کا ڈیرا لاہور چھاؤنی میں کیولری

روڈ پر تھا' جو تین چار کنال زمین پر مشتمل تھا۔

ایک طرف مریضوں کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جو ان ڈور مریضوں کا اوپن ایئر وارڈ تھا۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو ادویات کا سٹور روم تھا۔ سٹور سے ملحق ایک قطار میں چار ایک چولھے اور ایک تندور تھا۔ جہاں پانچ چھ سفید ریش بوڑھے بیشتر وقت کھانے پکانے میں مصروف رہتے تھے۔ چولھوں کے قریب دو ہال کمرے تھے جو مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور ان کے ملحق ایک وسیع تھڑا تھا۔ جہاں پانچ وقت باجماعت نماز ادا کی جاتی تھی۔

نور بابا کے دو کام تھے۔ ڈیرے پر کوئی شخص کسی وقت آتا تو اسے کھانا پیش کیا جاتا' جو گوشت روٹی پر مشتمل ہوتا۔ نور بابا کا دوسرا کام مریضوں کو دوا دینا تھا۔ کئی ایک مریض مہینوں ڈیرے پر پڑے رہتے تھے۔

نور بابا دن میں دو بار اوپن ایئر وارڈ کا راؤنڈ کرتا تھا۔ ہر مریض کو دیکھتا اور دوا تجویز کرتا۔ صاحب حیثیت مریض کو اجازت تھی کہ وہ دوا کی قیمت ادا کر دے۔ عام مریضوں کا علاج مفت ہوتا تھا۔

نور بابا ایک بھاری بھرکم باریش بوڑھا تھا' جو ہر وقت ایک لمبا چغہ پہنے مہمانوں کو کھانا کھلانے میں مصروف رہتا تھا۔

وہ ایک خوش گفتار بابا تھا۔ گفتگو میں وہ ایسے بندھے ٹکے جملے استعمال کیا کرتا تھا کہ سن کر حیرت ہوتی تھی۔ یہ فقرے پر مغز ہونے کے علاوہ بندش میں بجے سجائے محسوس ہوتے تھے۔ بابا کے ان جملوں کی بڑی دھوم تھی۔ اشفاق احمد ان جملوں کا دیوانہ تھا۔ گمان غالب ہے کہ اس کا بابا سے تعلق ان جملوں کی وجہ سے تھا۔

ایک دن علاقے کا تھانیدار بابا کے ڈیرے پر آ گیا۔ بابا نے حسب دستور گوشت روٹی پیش کی۔

تھانے دار بولا' ہمیں گوشت روٹی پر نہ ٹرخاؤ۔

تو پھر آپ کی کیا خدمت کریں' بابا نے پوچھا۔

تھانے دار مونچھ مروڑ کر بولا' ہم اپنا حصہ لینے آئے ہیں۔

کیسا حصہ' بابا نے پوچھا۔

تم نے جو یہ پیری مریدی کا دھندا چلا رکھا ہے۔ اس میں ہمارا حصہ بھی ہونا چاہیئے۔

بابا نے کہا' تھانے دار جی اس ڈیرے پر تو گوشت روٹی اور دوا دارو کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تھانے دار بولا' اچھا یوں ہی سہی لیکن کھانا کھانے سے پہلے میں پینے کا عادی ہوں۔ وائٹ ہارس کی ایک بوتل منگوا دو۔

بابا نے کہا' پتر میں تو ان پڑھ ہوں تو کاغذ پر نام لکھ دے۔

تھانے دار نے پرچی پر نام لکھ دیا۔

بابا وہ پرچی لے کر شراب کی دوکان پر چلا گیا۔

لوگ حیران تھے کہ یہ بابا کو کیا ہوا کہ شراب کی بوتل اٹھائے جا رہے ہیں۔

بابا نے بوتل کو چھپایا نہیں تھا بلکہ اعلانیہ بغل کے نیچے دبا رکھا تھا۔

پھر یہ معمول بن گیا۔ رات کو بلاناغہ تھانے دار آتا اور بوتل کا مطالبہ کرتا۔ بابا خود بازار جا کر بوتل خریدتا۔ اور ڈیرے پر پہنچ کر تھانے دار کو پیش کر دیتا۔ تھانے دار مہمان خانے میں بیٹھ کر شراب پیتا اور پھر گوشت روٹی کھا کر گھر چلا جاتا۔

اس پر ڈیرے پر آنے والے لوگوں نے احتجاج کیا۔ کہنے لگے' آپ تھانے دار کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اس میں ڈیرے کی بدنامی ہے۔

گھبراؤ نہیں پتر' بابا جواب دیتا' سبج پکے سو میٹھا ہو۔

پھر ایک روز تھانے دار کو بوتل پیش کرتے ہوئے بابا نے کہا' پتر آج جی بھر کے پی لے۔

کیوں کل کیا ہو گا' تھانے دار نے پوچھا۔

کل تو بوتل کا محتاج نہ رہے گا' بابا نے جواب دیا۔

تھانے دار اس پر قہقہہ مار کر ہنسا۔

اس رات تھانے دار نے اتنی پی کر غٹ ہو کر ڈیرے کے مہمان خانے میں ہی پڑا رہا۔

اگلے روز وہ ڈیرے کی مسجد میں جا کر یوں بیٹھ گیا۔ جیسے پتھر کا بنا ہو۔ یہ کیفیت ہفتوں طاری رہی۔ گھر چھوٹ گیا' نوکری چھوٹ گئی۔ بالآخر وہ اسی مسجد کا امام بن گیا۔

اس پر لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔ وہ بابا سے پوچھتے' بابا جی یہ آپ نے کیا کر دیا۔

بابا جواب دیتا' پتر میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ میں کرنے والا کون ہوں۔ کرنے والا تو وہی ہے'

جو چاہے کر دے' جب چاہے کر دے اور پتر نشہ تو ایک سواری ہے۔ سواری اہم نہیں۔ یہ اہم ہے کہ سواری کا رخ کدھر کو ہے اور پتر وہ جب چاہے رخ بدل دے۔ جسے چاہے جاننے کی پگڈنڈی پر چڑھا دے' جسے چاہے ماننے کی سڑک پر ڈال دے۔

عادت کی قید

وہی بات ہوئی نا جس کا مجھے ڈر تھا' اشفاق کی آواز سن کر میں چونکا۔

کیوں کیا ہوا' شہاب نے پوچھا۔

یہ لوگ جو منہ اندھیرے باغ میں دوڑ لگانے آتے ہیں۔ اشفاق نے کہا' یہ صحت کے لیے نہیں آتے' عادت پوری کرنے کے لیے آتے ہیں۔ اور عادت بہت بڑا آمر ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کوڑا ہے۔ کوڑا لہرا کر حکم دیتی ہے۔ اٹھ اور اپنے معمول کا پالن کر۔ اس کے کوڑے تلے جسم چیختا چلاتا ہے اور ایک حبشی کی طرح بلبلاتا ہے۔

یہ تو کیا تقریر جھاڑ رہا ہے' شہاب نے پوچھا۔

انٹرویو لے کر آیا ہوں وہ بولا' تقریر نہیں جھاڑ رہا۔ ان ورزشوں کی مظلومیت پر نوحہ خواں ہوں۔ وہ بڈھا جو جاگنگ کر رہا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ شروع شروع میں ہم صحت کے خیال سے ورزش کرنے آیا کرتے تھے۔ پھر عادت پڑ گئی۔ ہم نے اب جانا ہے کہ عادت سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہے۔ کہتا تھا اگر کسی وجہ سے یا کسی مجبوری کی بناء پر کسی روز ہم ورزش کرنے کے لیے نہ آ سکیں تو جسم انتقام لیتا ہے۔ معدہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے' پٹھے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ نسیں جام ہو جاتی ہیں۔ سارا جسم ہڑتال کر دیتا ہے۔ اس روز میں' میں نہیں رہتا۔ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ سارا دن یوں پڑا رہتا ہوں جیسے مردہ خانے میں لاش پڑی ہو۔

میرا خیال تھا' اشفاق بولا' کہ صرف بری عادتیں ہی بے بس اور لاچار کر دیتی ہیں۔ مجھے علم نہ تھا کہ ہر عادت ایک مجبوری بن جاتی ہے' چاہے وہ اچھی عادت ہو یا بری۔

شہاب بولا' نمازی اگر نماز نہ پڑھے تو وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس نے کھانا نہ کھایا ہو۔ فاقے کا احساس اسے دکھی بنا دیتا ہے۔

تیسواں باب

ستارہ

راولپنڈی میں راجہ شفیع بڑی بے صبری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا راجہ کیا حال ہے۔

بولا۔ اچھا نہیں۔ تیرے جانے کے بعد میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ کس سے بات کروں۔

بات کیا ہے، میں نے پوچھا۔

بولا۔ بڑی گڑ بڑ ہے۔ کنفیوز ہو گیا ہوں۔

میں نے کہا۔ بھائی جان کا کیا حال ہے۔

بولا۔ انہیں ستارہ ہو گیا ہے۔ ہر وقت ستارہ کی بات۔

ستارہ کیا؟ میں نے پوچھا۔

انہوں نے قدرت اللہ شہاب کا نام ستارہ رکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں۔ ہلال اولتا بدلتا رہتا ہے لیکن ستارہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ جب بھی ان کی بات کرو تو ان کا نام نہ لو۔ انہیں ستارہ کہو اور دیکھو۔ کسی غیر سے ان کی بات نہ کرنا۔ یہ تعلق خفیہ رہے۔ ہاں اگر وہ ہمیں اپنائیں تو اور بات ہے، لیکن ہمیں ان کو اپنانا نہیں چاہئیے۔

بھائی جان کو قدرت اللہ سے کیا تعلق ہے، میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں۔ پندرہ بیس دن ہو گئے۔ بھائی جان شہاب کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔

بھائی جان تو شہاب سے ملے ہی نہیں، کبھی انہیں دیکھا ہی نہیں۔ راجہ بولا، لیکن وہ کہتے ہیں، ملاقات بھی ہو جائے گی۔ ہمارا کیا ہے۔ مقصد تو بڈھے کو ان سے ملانا ہے۔

ارے میں نے کہا۔ کیا سرکار قبلہ کو قدرت اللہ سے ملانا ہے۔

ہاں یہی کہتے ہیں وہ۔ تم نے اپنے خطوں میں قدرت اللہ کے متعلق بھائی جان کو کچھ لکھا تھا کیا۔

ہاں، لیکن برسبیل تذکرہ۔

تم قدرت اللہ سے ملتے رہتے ہو کیا۔ راجہ نے پوچھا۔

کبھی کبھی۔

یہ قدرت اللہ شہاب کیا چیز ہے، راجہ نے پوچھا۔

وہ ایک سی ایس پی افسر ہے اور صدر ایوب کا سیکرٹری ہے۔ میں نے جواب دیا۔

یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، وہ بولا۔ کیسا آدمی ہے وہ۔

چھوٹے قد کا ہے۔ جسم گٹھا ہوا۔ شخصیت میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔ بہت عمدہ انگریزی لکھتا ہے۔ کم لفظوں میں بڑی بات کہہ جاتا ہے۔ وزارت والے اس کے نوٹ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس کی قابلیت کی بڑی دھوم ہے۔ بڑا ذہین آدمی ہے۔ آپ بات شروع کریں تو فوراً ساری بات سمجھ جاتا ہے۔ سنتا ہے، بڑی توجہ سے سنتا ہے۔ بولتا نہیں۔ گونگا ہے۔ چہرے سے دلی جذبات کا اظہار نہیں ہوتا۔

کیا مطلب، راجہ نے پوچھا۔

چہرے سے اس کے خیالات کا اظہار نہیں ہوتا کہ خوش ہے یا ناراض۔ بلکہ جیسے پتھر کا بنا ہو۔ اس کی خاموشی دوسرے کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ لیکن اس میں [illegible] نہیں ہے دکھاوا نہیں "میں" نہیں۔ عجز اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہے۔

ٹھیک ہے، وہ بولا، لیکن بھائی جان اس کا ذکر کیوں کرنے لگے ہیں۔ بات کیا ہے۔

مجھے نہیں معلوم۔

بھائی تو اس کا ذکر یوں کرنے لگے ہیں جیسے اسے اپنا لیا ہو، جیسے وہ سرکار قبلہ کے پروگرام

میں شامل ہو۔

حیرت کی بات ہے' میں نے کہا

ان کی باتوں سے ایسے لگتا ہے جیسے تمہیں کراچی اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تم شہاب سے راہ و رسم پیدا کرو۔ اور اسے دربار میں لے کر آؤ۔

راجہ کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا میں کراچی کسی کام سے بھیجا گیا ہوں۔ اور مجھے اس کا شعور تک نہیں۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا' میں نے راجہ سے کہا۔

کیا تم نے شہاب سے سرکار قبلہ کی بات کی ہے کبھی۔

ہاں۔ دو ایک بار سرسری طور پر ذکر کیا ہے۔ بلکہ ایک بار اسے کہا بھی تھا کہ پنڈی جاؤ تو سرکار قبلہ کے مزار پر ضرور جانا۔ میں نے اسے مزار کا پتہ بھی بتایا تھا کہ پنڈی سے ریل کی پٹڑی پر چک لالہ کی طرف جاؤ تو ایک مضاف گاؤں آتا ہے جس کا نام مریٹر ہے۔ اس گاؤں کے عقب میں مزار ہے۔

پھر کیا وہ مزار پر آئے تھے۔

نہیں۔ میں نے جواب دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میں ریل کی پٹڑی پر چک لالہ کی طرف گیا تھا۔ مگر مجھے کوئی گاؤں نظر نہیں آیا۔ ساتھ اشفاق احمد بھی تھا۔

راجہ خاموش ہو گیا۔ بولا کچھ سمجھ نہیں آتا۔ ملک کہتا ہے کہ تمہارے پنڈی میں آنے سے چھ مہینے پہلے بھائی جان نے اسے بتایا تھا کہ تمہارا ایک بھائی آنے والا ہے جو تمہاری طرح قلم زد ہے۔ جانا پہچانا قلم کار۔

ہاں' میں نے جواب دیا۔ ملک نے مجھے بھی بتائی تھی یہ بات۔

اب وہ شہاب کے آنے کی بات کر رہے ہیں' راجہ بولا۔

جب سے میں مرد قلندر کے حلقہ میں داخل ہوا تھا۔ عجیب عجیب باتیں سامنے آ رہی تھیں۔ ایسی باتیں جو عقل سلیم کے دائرے سے باہر تھیں۔

پہلی مرتبہ میں نے جانا تھا کہ دنیاوی نظام کے ساتھ ساتھ ایک روحانی نظام بھی چل رہا ہے۔ میں نے جانا کہ بزرگ لوگ وفات کے بعد بھی فعال رہتے ہیں۔ پوری بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ حالانکہ میرا رخ بدل چکا تھا' میں عقل کا پابند نہیں رہا تھا۔ پھر بھی میرے دل میں یہ

خواہش سسکتی ہی رہی کہ جانوں کہ بات کیا ہے۔

جب بھی میں بھائی جان سے بات کرتا تو وہ کہتے' مفتی صاحب جاننے کا خبط چھوڑ دیجیے' ماننا سیکھیے۔ جاننے کے عمل میں شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ماننا اصل ایمان ہے۔ دیکھیے نا' ہماری عقل بہت سی باتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس میں اتنی لچک نہیں کہ بات کا احاطہ کر سکتے۔

بھائی جان کی یہ بات میری تسلی کے لیے کافی نہ تھی۔ میرے اندر جاننے اور سمجھنے کا جنون تھا اور اس کی تسکین کی خواہش کو میں تیاگ نہ سکا تھا۔

وہ آ رہے ہیں

اگلے روز جب ہم دربار میں حاضر ہوئے تو بھائی جان بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ لیکن ان کی خوشی میں اک اضطرابی کیفیت تھی۔

مجھے دیکھتے ہی بولے بڑا اچھا ہوا کہ آپ آ گئے وہ بھی آ رہے ہیں۔ مستقل طور پر یہاں آ رہے ہیں۔ انشاء اللہ۔ بہت جلد' اب آپ کا وہاں رہنا بے معنی ہے۔ جس کام کے سبب آپ کو وہاں بھیجا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب آپ کو واپس آ جانا چاہیے۔

کون آ رہے ہیں یہاں" وانی نے پوچھا۔

بھائی جان نے وانی کی بات کا جواب نہ دیا بلکہ اپنی ہی بات میں مگن رہے۔ کہنے لگے۔ چونکہ وہ یہاں مستقل طور پر آ رہے ہیں۔ ہم سب کو احتیاط برتنی پڑے گی۔[1] ہم نے ان کا نام ستارہ رکھ دیا ہے۔ جب بھی ان کی بات کرو۔ ستارہ کا نام لو۔ اور ہمیں دوسروں کی موجودگی میں ان کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ انہیں راز رکھو' یہ ظاہر نہ کرو کہ ہمارا ان سے کوئی تعلق ہے۔ اگر وہ خود تعلق کا اظہار کریں تو اور بات ہے۔

بھائی جان پر اس روز ایسی کیفیت طاری تھی جیسے پی ہوئی ہو۔ نشے میں دھت ہوں۔ وہ بار بار سرکار قبلہ کے پروگرام کا تذکرہ کرتے۔ مرد قلندر کا پروگرام ہو کر رہے گا۔ انشاء اللہ۔

ا۔ ضمیمہ میں خط نمبر ۱۱ اور خط نمبر ۱ ملاحظہ ہو۔

سب کچھ ایسے وقوع پذیر ہو گا جیسے بڈھے نے طے کر رکھا ہے۔

اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ وقت آ گیا ہے۔ شاہ ایران گھوڑے پر چڑھ کر آئیں گے اور ہم۔ ہم تو مجاہد ہیں۔ ہمیں جہاد میں حصہ لینا ہے اور وہ آپ کے دوست بھائی جان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ زیر تربیت ہیں۔ ہاں وہ جلد یہاں دربار میں حاضری دیں گے۔ ہماری اپنی بات نہیں۔ ہم بھی مل لیں گے۔ اصل بات تو بڈھے کو ملانا ہے۔ وہ بھی جلد ہو جائے گا۔ اب ملاقاتیں ہی ملاقاتیں ہوں گی اور کیا۔

اور روز بھائی جان پر عجب کیفیت طاری تھی۔ بولے جا رہے تھے۔ بنا سوچے سمجھے بولے جا رہے تھے۔ اور ہم حیران بیٹھے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

بھائی کی باتوں کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا میں سمجھا کہ قدرت اللہ کی اہمیت اس کے عہدے کے حوالے سے ہے اور مرد قلندر کے پروگرام میں اس نے اسی حوالے کے تحت کوئی کام کرنا ہے۔

اسلامی جمہوریہ

کراچی پہنچ کر میں نے قدرت اللہ سے کہا کہ بھائی جان کہہ رہے ہیں کہ آپ مستقل طور پر راولپنڈی آنے والے ہیں۔ ہاں وہ بولا اس بات کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں' شاید وفاقی حکومت اپنا ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں منتقل کر دے۔ اس کے ساتھ اور بہت سی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ مثلاً ویلج ایڈ کا محکمہ ختم ہو رہا ہے۔ حفیظ کی چھٹی ہو جائے گی۔ احمد بشیر بنیادی طور پر سندھ کا انفرمیشن آفسر ہے' اس لیے وہ سندھ میں تعینات کر دیا جائے گا۔ ابن انشاء کو اسمبلی میں ٹرانسفیر کی حیثیت سے واپس جانا پڑے گا اور آپ واپس ڈی ایف پی میں چلے جائیں گے۔

آج آپ کچھ ڈسٹرب لگتے ہیں۔ میں نے کہا۔

ہاں وہ بولا۔ میں نے ایک بہت بڑا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اب ڈر رہا ہوں کہ شاید اسے نبھا نہ سکوں۔ آپ اب جائیں کل مجھ سے ملیں۔ دعا کریں کہ میں اپنا کام نبھا سکوں۔

میں نے ازراہ مذاق کہا۔ دعا کیسے کر سکوں گا جب تک مجھے علم نہ ہو کہ مشکل کیا ہے۔

ایک معمولی سا دفتری معاملہ ہے' وہ بولا۔ آج کل کابینہ میں یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ آیا

پاکستان کو سیکولر حکومت بنا چاہیے یا اسلامی جمہوریہ کل کابینہ کی میٹنگ میں سینیئر وزیر جناب منظور قادر نے ایک نہایت مدلل تقریر کی جس میں انہوں نے ثابت کیا کہ پاکستان کا سیکولر حکومت ہونا ہمارے لیے فائدہ مند رہے گا۔ اس تقریر کے بعد صدر ایوب نے تمام ارکان کابینہ سے پوچھا تو سب نے منظور قادر کی تجویز کی حمایت کر دی۔

اگرچہ میں کابینہ کا رکن نہیں ہوں لیکن صدر ایوب کی عادت ہے کہ وہ میری رائے بھی پوچھتے ہیں' انہوں نے میری رائے دریافت کی تو میں نے کہا' جناب منظور قادر کی دلیلیں بڑی معقول ہیں۔ لیکن میں ان کا ہم خیال نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ ہونا چاہیے۔ دینی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ دنیاوی نقطہ نظر سے اس میں ہمارا مفاد وابستہ ہے۔

اس پر صدر ایوب نے کہا کہ آپ اپنے دلائل پیش کریں۔ تو میں نے ان سے کہا کہ جناب میں منظور قادر کی طرح قابل آدمی نہیں ہوں۔ جوابی تقریر نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر آپ مجھے مہلت دیں تو میں لکھ کر ایک پیپر پیش کر سکتا ہوں۔

صدر ایوب نے میری بات مان لی...... کل مجھے کابینہ میں وہ پیپر پیش کرنا ہے۔ پتہ نہیں میں کابینہ کو یقین دلا سکوں گا کہ نہیں کہ پاکستان کا اسلامی جمہوریہ ہونا ضروری ہے۔

اگلے روز میں قدرت اللہ سے ملا تو وہ بہت خوش تھا میں نے کہا کیا ہوا۔

ہو گیا' وہ بولا۔

کیسے' میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں کیسے ہوا' وہ بولا۔ ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ حیرت ہے کہ کیسے ہو گیا۔

آپ نے وہ پیپر لکھا تھا کیا۔

سارا دن لوگ آتے رہے ایسے لوگ جنہیں ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ رات تک ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ ساری رات بیٹھ کر لکھوں گا۔ پھر میں بستر میں نہ بیٹھا۔ لاونج میں کارپٹ پر بیٹھ گیا اور لکھنے لگا۔

صبح چار بجے عفت نے جگایا۔ پتہ نہیں کیوں غیراز معمول میں لکھتے لکھتے سو گیا تھا۔

صبح چار سے سات تک میں نے جلدی جلدی پیپر ختم کیا۔ کابینہ میں میں نے جناب منظور قادر سے درخواست کی کہ از راہ کرم آپ یہ پیپر پڑھ دیں چونکہ میرے پڑھنے کا انداز اچھا نہیں

ہے۔

منظور قادر نے وہ پیپر پڑھا۔ صدر ایوب نے ان سے پوچھا کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا قدرت اللہ شہاب کی ان دلائل نے میرا نقطہ نظر بدل دیا ہے۔ میں ان کے خیالات سے متفق ہوں۔ لہٰذا پاکستان کو اسلامی جمہوریہ ہونا چاہیئے۔ ساری کابینہ نے میرے دلائل سے اتفاق کیا۔ پتہ نہیں یہ کیسے ہوا۔

کیا آپ مذہبی نقطہ نظر کی وجہ سے اس خیال کے حامی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

نہیں' وہ بولا' بالکل نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ دنیاوی نقطہ نظر سے پاکستان کا اسلامی جمہوریہ ہونا ضروری ہے۔

ردّوبدل

پھر معلوم نہیں کیسے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ محکموں میں ردّوبدل ہو رہا ہے اور ویلج ایڈ کا محکمہ ختم کیا جا رہا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی لوگوں نے قدرت اللہ شہاب کی جانب یورش کر دی۔ حفیظ جالندھری نے اپنی چھوٹی بچی کو کندھے پر بٹھا کر شہاب کے گھر کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔

انشاؔ نے کہا۔ ٹھیک ہے میں واپس اسمبلی میں چلا جاؤں گا اور پھر سے ترجمے کا کام شروع کر دوں گا لیکن ایک بات کا وعدہ کیجیے۔ اس نے جیب سے ایک تراشا نکالا کہنے لگا۔ یونیسکو کے پروگرام کے مطابق یہاں ایک نیا محکمہ کھولا جائے گا۔ بک کاؤنسل۔ وعدہ کریں کہ آپ مجھے اس محکمے کا ڈائریکٹر بنا دیں گے۔

شہاب نے کہا۔ پتہ نہیں یہ محکمہ کب کھلے شاید آپ کو لمبا انتظار کرنا پڑے۔

کوئی بات نہیں' انشاؔ نے کہا۔ میں انتظار کروں گا۔

عالی نے کہا' مجھے او ایس ڈی بنا دیجیے اور کراچی صدر گھر میں ایک رہائش گاہ الاٹ کر دیجیے۔

احمد بشیر کا کوئی مطالبہ نہ تھا۔ ٹھیک ہے' وہ بولا۔ کہیں نا کہیں تعیناتی تو ہو گی۔ اپنا کیا ہے یہاں سے اڑایا وہاں جا بیٹھا۔

انہی دنوں شہاب نے ایک روز مجھے فون کیا کہنے لگا اگر آپ کو فرصت ہو تو ذرا آ جائیں۔ میں نے کہا فرصت تو ہے مگر گاڑی نہیں ہے۔ گاڑی میں بھجوا دیتا ہوں' وہ بولا جب میں پہنچا وہ ایک خط پڑھنے میں مصروف تھا چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔

میں نے کہا' خیریت تو ہے آج آپ سر میں نہیں ہیں۔

ہاں' وہ بولا مطالبات بہت بڑھ گئے ہیں۔ تھک گیا ہوں۔ یہ بتائیے کہ پنڈی میں عرس کیسا رہا۔

اب کی بار تو بھائی جان آپ ہی کی باتیں کرتے رہے' کہتے تھے' آپ مستقل طور پر پنڈی آ رہے ہیں اور آپ مرد قلندر کے پروگرام کو آگے بڑھائیں گے۔

مرد قلندر کا پروگرام کیا ہے' اس نے پوچھا۔

مجھے نہیں معلوم۔ آپ ان کا تذکرہ پڑھ لیں۔ میں آپ کو لا کر دوں گا۔

ضرور دیجیے' وہ بولا۔

یہ بتائیے آپ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔

کس سلسلے میں۔ میں نے پوچھا۔

آپ کو ڈی ایف پی میں واپس جانا پڑے گا۔

چلا جاؤں گا' میں نے کہا۔ لیکن بھائی جان تو مجھے واپس بلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں جس کام کے لیے آپ کو کراچی بھیجا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب آپ وہاں کیا کر رہے ہیں۔

کس کام کے لیے بھیجا تھا' شہاب نے پوچھا۔

مجھے نہیں پتہ۔ میری تو سدھ بدھ ماری گئی ہے۔ کیا یہ بزرگ لوگ اس قدر طاقت ور ہوتے ہیں۔

ہاں' وہ مسکرایا۔ ان سے ڈرنا ہی چاہیئے۔

بھائی جان تو اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کب آپ آئیں اور دربار میں حاضری دیں۔

اچھا' وہ مسکرایا۔ مجھے بزرگوں سے ڈر آتا ہے۔

عین اس وقت چپن داخل ہوا بولا۔ لاٹ صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ چپن چلا گیا تو شہاب نے کہا میں ذرا حاضری دے لوں آپ نے جانا نہیں۔ میرا انتظار کیجیے اور یہ خط اٹھا کر

جیب میں ڈال لیجیے ابھی آیا میں۔

ایک خط

میں نے خط اٹھا کر دیکھا وہ خط جنوبی ہند میں ملایم سے تھا۔ لکھا تھا۔ میں بعارضہ فالج ۲۵ سال سے صاحب فراش ہوں۔ پہلے تو بالکل ہی حرکت کے قابل نہ تھا اب کبھی کبھار کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ ہاتھ بھی کچھ کچھ چلنے لگا ہے۔ پتہ نہیں میں آپ کو کیوں خط لکھ رہا ہوں۔ میں آپ کو قطعی طور پر نہیں جانتا لیکن دو ایک سال سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ آپ کو خط لکھوں۔

اللہ کا نام لینے کے سوا میرا کوئی شغل نہیں ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ مالی طور پر میں محتاج نہیں ہوں۔

اللہ کی مہربانی ہے کہ مجھے کوئی فکر نہیں کوئی پریشانی نہیں۔ یہ بیماری جو ہے یہ بھی در پردہ اس کی رحمت ہے۔ کیونکہ اس نے مجھے رابطہ عطا کیا ہے۔

مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ ایک عظیم خدمت پر مامور ہیں۔ اس لیے میں روز بلاناغہ آپ کے لیے دعا کرتا رہا ہوں۔ اللہ کرے آپ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں اور وہ دور جس کا ہم سب کو انتظار ہے جلد آئے۔

خط پڑھ کر میں حیرت میں ڈوب گیا' یہ کیا بات ہے میں آپ کو قطعی طور پر نہیں جانتا لیکن میرے دل میں خواہش تھی کہ آپ کو خط لکھوں۔ میں سوچتا رہا کہ قدرت کون سی عظیم خدمت پر مامور ہے اور پھر اس شخص کو کیسے پتہ چلا کہ قدرت اللہ خدمت پر مامور ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ہینڈ رائیٹنگ

ابھی میں بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ قدرت اللہ کا پی اے داخل ہوا' کہنے لگا محترمہ عطیہ کا فون آیا ہے' کہتی ہیں حیدر آباد دکن سے ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں' کہتے ہیں میں شہاب صاحب سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ شہاب صاحب کو بتا دیجئے گا۔

میں نے کہا ٹھیک ہے میں بتا دوں گا۔

پی اے بولا۔ ان سے کہئے کہ عطیہ صاحبہ سے تفصیلات طے کر لیں۔

میں نے کہا عجیب بات ہے' یہ بزرگ اتنی دور سے آئے ہیں شہاب صاحب سے ملنے کے لئے۔

ہاں' وہ بولا۔ انہیں بہت بزرگ ملنے آتے رہتے ہیں۔

ذاتی کام کے لیے ملنے آتے ہیں کیا' میں نے پوچھا۔

نہیں' وہ بولا۔ ویسے ہی ملنے آتے ہیں۔ شہاب صاحب کا بھید نہیں کھلا۔ ان کی باتیں عجیب سی ہیں۔

آپ تو ان کے پی اے ہیں' آپ پر تو بھید کھل جانا چاہیئے۔

بالکل نہیں' بالکل نہیں مثلاً پرسوں کی بات ہے' انہوں نے مجھے ایک نوٹ بھیجا ٹائپ کے لیے۔ میں اس نوٹ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ نوٹ شہاب صاحب نے لکھا ہے۔ اس قدر کچی لکھائی تھی جیسے کسی پانچویں جماعت کے طالب علم نے لکھی ہو۔ شہاب صاحب کے ہینڈ رائیٹنگ سے دور کی مناسبت نہ تھی بلکہ میں نے فون پر شہاب صاحب سے پوچھا بھی۔ سر یہ نوٹ آپ نے بھیجا ہے کیا مجھے ٹائپ کے لیے۔ شہاب صاحب نے یوں سرسری جواب دیا جیسے انہیں احساس ہی نہ ہو کہ لکھائی میں گڑبڑ ہے۔ ذرا ٹھہریئے' میں دکھاتا ہوں آپ کو وہ نوٹ۔ وہ اٹھ کر چلا گیا اور جلد ہی نوٹ لے کر آگیا کہنے لگا دیکھیے کیا یہ لکھائی شہاب صاحب کی ہے۔

اسے دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے مکھی دوات سے نکل کر کاغذ پر چلی ہو اور اس کے پاؤں نے کچھ نقش لگا دیئے ہوں۔

یہ آپ نے پڑھ کیسے لیا' میں نے پوچھا۔

بڑی مشکل سے پڑھا گیا' وہ بولا۔

کیا شہاب صاحب کو بالکل احساس نہیں ہوا کہ لکھائی اس قدر کچی ہے' میں نے پوچھا۔

یہی تو حیرت کی بات ہے' پی اے نے کہا' شہاب صاحب تو ایک نظر میں بات بھانپ لیتے ہیں لیکن اس نوٹ میں انہیں غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ شہاب صاحب میں ایسی چھوٹی

چھوٹی کئی ایک باتیں ہیں جو سمجھ میں نہیں آئیں۔

قدرت واپس آیا تو میں نے اسے عطیہ کا پیغام دیا۔

قدرت نے عطیہ کو فون کیا اور تفصیلات طے کر لیں۔

میں نے کہا' یہ کون بزرگ ہیں' جو آپ سے ملنے آ رہے ہیں۔

پتہ نہیں' اس نے جواب دیا۔

یہ بزرگ لوگ کیسے ہوتے ہیں' میں نے پوچھا۔

آپ کے بھائی جان جو ہیں' اس نے کہا۔

بھائی جان تو دیکھنے میں قطعی طور پر بزرگ نہیں لگتے۔ وہ تو ایسے لگتے ہیں جیسے کوئی بزنس ایگزیکٹو ہو۔ ایک ایکسٹروورٹ' ایکٹو اور اصولی آدمی۔ بزرگ تو لگتے ہی نہیں۔

اچھا تو آپ میرے ساتھ گھر چلیں اور از خود دیکھ لیں' شہاب نے جواب دیا۔

عفت

شہاب کی بیگم' ڈاکٹر عفت دیکھنے میں نہ تو بیگم نظر آتی تھیں' نہ ڈاکٹر۔ وہ ایک ورکنگ وومن تھیں' سادہ مگر پر وقار۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت خوش مزاجی تھی۔ وٹ اور ہیومر دونوں ان کی گفتگو میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ان کی وٹ میں طنز تو ہوتی تھی مگر اس کی دھار نہ ہوتی۔ اس لیے کاٹ نہ ہوتی۔ جب وہ خاموش ہوتیں تو بھی ہونٹ یوں چٹکی بھرے ہوتے جیسے ابھی ابھی کوئی لطیفہ سن کر بیٹھی ہوں یا کوئی پر مزاح بات کہنے والی ہوں۔

بولیں' کیسے آپ کے مزاج اچھے ہیں۔

میں نے کہا' قطعی نہیں۔

کہنے لگیں کوئی پریشانی ہے۔

میں نے کہا' جی۔ بہت بڑی پریشانی ہے۔ آپ کے میاں نے حیران کر رکھا ہے۔

کیوں۔

ان کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی' میں نے جواب دیا۔

وہ مسکرائیں' کہنے لگیں' ظاہر ہے آپ کی سمجھ کا قصور ہے۔

جی' میں نے کہا' لگتا ہے آپ بھی حیرت کے عالم میں ہیں۔ آپ کی سمجھ بھی ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔

خواہ مخواہ' وہ بولیں' لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ خواہ مخواہ صرف ہونٹوں تک محدود تھا۔

یہ آج بزرگ کو دیکھنے آئے ہیں' شہاب نے داخل ہو کر کہا۔

بزرگ بھی کیا دیکھنے کی چیز ہیں' وہ مسکرائیں۔

عین اس وقت گھنٹی بجی۔

وہ آ گئے' شہاب نے کہا' میں چلتا ہوں' بے شک آپ چاہیں تو ڈرائینگ روم میں آ جائیں۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

مریچ

ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے میں نے پردے سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے صوفے پر ایک کالا دھوت' پتلا دبلا شخص بیٹھا تھا۔ یہ کیسا بزرگ ہے میں نے سوچا۔ بزرگ تو بھرے جسم کے ہوتے ہیں' گھنی داڑھی' نورانی چہرہ۔

وہ تیکھی آواز میں بول رہا تھا۔

FLAY YOU ALIVE PUT BRAN ON YOU AND PUT YOU IN THE SUN

ارے' میں چونکا' یہ تو انگریزی بول رہا ہے۔ یہ کیسا بزرگ ہے جو انگریزی بول رہا ہے اور یوں بولتا ہے جیسے لفظوں کی دھار سے کاٹ رہا ہو اور اس عمل میں لذت محسوس کر رہا ہو وہ پھر بولا۔

WE DON'T GIVE WARNINGS WE JUST CUT

THE MAN OUT OF THE LIST. YOU ARE A LUCKY CHAP

ارے' یہ تو وارننگ دے رہا ہے۔ مگر کس بات کی وارننگ۔ نام کاٹنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ کس لسٹ سے نام کاٹنے کی دھمکی۔

وہ بولے جا رہا تھا۔ اس کے ہر لفظ میں دھار تھی اور شہاب چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا لیکن وہ بڑے ضبط سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر مدھم آواز میں بولا۔

WHO ARE YOU. WHAT ARE YOUR CRDENTIALS.

I AM A MESSENGER SENT TO WARN YOU THAT IS ENOUGH

پتہ نہیں کیوں مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں وہاں سے چلا آیا۔

پتہ نہیں اس وقت میرے چہرے کا کیا عالم تھا۔ ڈاکٹر عفت مجھے دیکھ کر گھبرا گئی۔ کیوں کیا ہوا' وہ بولیں

مجھے ایک بات بتائیں پلیز' میں نے اسے کہا۔

پوچھیے۔

یہ بتائیں کہ قدرت اللہ شہاب کون ہے۔ انہوں نے پہلے بات ٹالنے کی کوشش کی' پھر بھر پور نظر سے میری جانب دیکھا اور خوف زدہ ہو کر بولیں' مجھے خود پتہ نہیں' میں تو آپ حیرت زدہ ہوں۔ لیکن یہ بتایئے کہ ہوا کیا۔

خبردار

گھر پہنچا تو قیصر میرا انتظار کر رہا تھا۔

یہ کیا ہوا ہے تمہیں' اس نے میری جانب سے دیکھ کر پوچھا۔

کیا ہوا ہے' میں نے دہرایا۔

تمہاری تو ہوائیاں اڑی ہوئی ہیں۔ کہاں سے آئے ہو تو' اس نے پوچھا۔

شہاب کی طرف گیا تھا۔

کیا ہوا وہاں۔

کچھ بھی تو نہیں۔

کوئی خاص بات نہیں۔ ایک بزرگ آیا تھا شہاب سے ملنے۔ اسے وارننگ دینے حیدر آباد سے آیا تھا۔

دیکھو ممتاز' وہ بولا' شہاب کے متعلق میں ۔نے تمہیں پہلے بھی خبردار کیا تھا۔ ٹھیک ہے' وہ اچھا آدمی ہے' میں مانتا ہوں لیکن وہ اوور انٹیلی جنٹ آدمی ہے اور اپنا بھید نہیں دیتا۔ گنا آدمی ہے۔ ایسے آدمی سے بچ کر رہنا چاہیے یاد رکھو کہ اس کی زندگی میں کوئی

بہت بڑا بھید ہے۔

تمہارا ذہن خراب ہے' میں نے اسے کہا۔

دیکھو' وہ بولا' تم خود کہہ رہے ہو کہ حیدر آباد دکن کا ایک شخص اسے خبردار کرنے کے لیے آیا ہے' بے شک یہ وارننگ کیسی تھی۔ کس بارے میں تھی۔ آخر کوئی بات ہو گی۔ ویسے تو لوگ اتنا لمبا سفر کر کے وارننگ دینے کے لیے نہیں آتے۔

میں مانتا ہوں' میں نے کہا' تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔

دیکھو' وہ بولا' بے شک تم اس سے ملو۔ اگر وہ تمہاری پی فیکیشن میں مدد کرتا ہے تو اس سے یہ کام لو اپنے عہدے کی وجہ سے وہ تمہاری مدد کر سکتا ہے' لیکن تم اس سے متاثر ہوئے جا رہے ہو۔ یہ غلط ہے۔ اسے اپنا پیر نہ بناؤ۔

ہاں ہاں ٹھیک ہے' میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

بیٹھ جاؤ یہاں' اس نے گھسیٹ کر مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ میری بات غور سے سنو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔

بولو کیا کہتے ہو' میں نے پوچھا۔

دیکھو ممتاز' یہ جس راستے پر تم چل نکلے ہو۔

کون سا راستہ' میں نے پوچھا۔

یہی پیروں فقیروں کا راستہ جو تم نے اختیار کیا ہے۔ شاید یہ راستہ درست ہو' مجھے نہیں علم مگر ایک بات کا مجھے علم ہے کہ یہ راستہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ اٹ از ناٹ ان یو۔ تمہیں اس طریق زندگی سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تم جانتے ہو کہ تم بنیادی طور پر کیا ہو۔ اور تمہیں پتہ ہے کہ بی دائی سلف کے سوا چارہ نہیں ہے۔ تم خشکی کے جانور ہو۔ پانی میں ڈبکیاں لگانے سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

قیصر سچ کہتا تھا۔ اس کی باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے رہ رہ کر خیال آنے لگا کہ یہ میں کس بکھیڑے میں پڑ گیا ہوں۔

روحانی نظام

ق: ٹھیک ہے' دنیاوی نظام کے ساتھ ساتھ ایک روحانی نظام بھی چل رہا ہے۔ یہ نظام بالکل ایسا

ہی ہے جیسے دنیاوی نظام' اس میں بھی درجے ہیں۔ کارکن ہیں' افسر ہیں۔ سٹیٹس ہے' پرانوکول ہے۔ فائلیں چلتی ہیں۔ روحانی نظام کے افسر بڑے طاقت ور ہیں' وہ حالات بدل سکتے ہیں' کوائف بدلنے پر قادر ہیں' ذہنیت بدل سکتے ہیں' رخ بدل سکتے ہیں۔ تقدیر بدل سکتے ہیں' اتنا ہی فیورٹ ازم ہے جتنا کہ دنیاوی حاکموں میں ہے۔

مجھے ان سب باتوں کا شعور ہو چکا تھا۔ ٹھیک ہے یہ روحانی نظام قائم ہے تو بسم اللہ قائم رہے۔ میں جانتا تھا کہ طبعی انداز کی وجہ سے میں اس نظام کا حصہ نہیں بن سکتا۔ مجھ میں کوئی روحانی مقام حاصل کرنے کی طلب نہ تھی۔ مجھ میں وہ پاکیزگی نہیں تھی' صلاحیت نہیں تھی۔

ابتداء میں مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہ کیسی دنیا ہے جس سے میں واقف نہیں ہوں۔ ایک تجسس نے مجھے گھیر لیا تھا۔ کہ جانوں کہ بات کیا ہے۔

قیصر ٹھیک کہتا تھا۔ YOU DO NOT BELONG TO IT. پھر میں خوامخواہ اس دلدل میں کیوں پھنستا جا رہا ہوں۔ میرے ساتھی اول تو ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بات مان بھی لیتے تو اسے خود پر طاری کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

چار ایک دن میں ان باتوں پر سنجیدگی سے سوچتا رہا' اگر قدرت اللہ ایک پراسرار شخصیت ہے تو پڑا ہو۔ میں اس کی بارے میں مزید باتیں جاننے کے لیے کیوں بے تاب ہوں۔ ہٹاؤ چھوڑو۔ اسے اپنی زندگی جینے دو' تم اپنی زندگی جیو۔

پُوچھ پچھ

میں نے احمد بشیر سے پوچھا' احمد بشیر تم اس نظام کو مانتے ہو کیا۔

مانتا ہوں' وہ بولا۔ سرسری طور پر مانتا ہوں لیکن اس کے بارے میں میں جاننا نہیں چاہتا۔

کیوں' میں نے پوچھا۔

اس لیے کہ جان کر میں اپنے خیالات کا ایوان کیوں تباہ کروں خواہ مخواہ' احمد بشیر نے جواب دیا۔

کیا تم سچائی کو جاننا نہیں چاہتے۔ میں نے پوچھا۔

سچائی کے کئی ایک پہلو ہوتے ہیں۔ کئی ایک چہرے ہیں' وہ بولا۔ ہر کوئی اپنی طبیعت کے

مطابق ایک چہرہ اپنا لیتا ہے۔

میں نے کہا' یہ بتاؤ کہ شہاب کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔

ٹھیک ہے' وہ بولا ایک ہمدرد افسر ہے۔ اچھا آدمی ہے۔ ہلپ فل ہے۔ بس میرے لیے یہی کافی ہے۔

احمد بشیر سے بات کرنا بے کار تھا۔

میں نے ابن انشا سے پوچھا۔ میں نے کہا' انشاؔ شہاب کے متعلق تیری کیا رائے ہے۔

وہ ہنسا بولا' مفتی میری رائے نہ پوچھو۔

میں نے کہا'کیوں نہ پوچھوں۔

بولا' میری رائے کبھی ٹھیک نہیں ہوئی' کسی کے بارے میں بھی۔

ٹھیک کیوں نہیں ہوتی۔

بھئی میں تو لوگوں کو ا۔ینجائے کرتا ہوں' جج نہیں کرتا۔ ہم تو بھائی آم کھانے کے شوقین ہیں' پیڑ نہیں گنتے۔

چلو یوں ہی سہی' میں نے کہا' یہ بتا کہ شہاب کیسا آدمی ہے۔

مسکرا کو بولا' بڑا پیارا آدمی ہے۔

وہ تو ٹھیک ہے میں نے کہا بڑا پیارا آدمی ہے لیکن پراسرار ہے۔

پڑا ہو' وہ ہنسا' اپنے لیے کیا فرق پڑتا ہے۔

میں نے کہا انشاؔ کبھی کبھی مجھے شک پڑتا ہے کہ شہاب گپت بزرگ ہے۔

نہ نہ بھئی اپنا شک مجھے ٹرانسفر نہ کرو۔ بزرگ بنا کر اسے مجھ پر حرام نہ کرو' نہ مفتی جی۔

بزرگ تجھ پر حرام ہو جاتا ہے کیا۔

مفتی جی ہم تو گنہگاروں کے گاہک ہیں' بندہ ہو' کمزوریوں کا مارا ہوا ہو' بے بس ہو۔ ابھی کل ہی میں شہاب سے کہہ رہا تھا۔

کیا کہہ رہے تھے' میں نے پوچھا۔

میں نے عطیہ سے سنا تھا کہ شہاب سے ملنے کے لیے ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ تو میں نے شہاب سے کہا کہ بزرگوں سے نہ ملا کریں۔ انہیں انکریج نہ کیا کریں۔ وہ مسکرایا' بولا'

کیوں۔ میں نے کہا وہ دوسروں کا راستہ کھوٹا کر دیتے ہیں۔ اتنے میں چپن آیا' کہنے لگا' ایک خاتون ملنے آئی ہیں' کہتی ہیں' اکیلے میں ملوں گی۔

شہاب نے کہا۔ ذرا انہیں بٹھائیں۔ میں ابھی فارغ ہو جاؤں گا۔

جب چپن چلا گیا تو میں نے کہا۔ یہ تو بات ہوئی نا۔ اس جنس سے میل ملاپ رکھنا صحت مند ہوتا ہے' میں نے کہا' انشا کیا شہاب خواتین سے مل کر خوش ہوتا ہے۔

ضرور ہوتا ہو گا' وہ بولا' مجھ سے کہہ رہا تھا کہ خواتین مجھ سے ملنے کے لیے بہت آتی ہیں۔ میں نے کہا' اگر آپ کو ملنا ناگوار ہو تو میری طرف بھیج دیا کریں۔

میں نے کہا' انشا تمہارے دفتر میں کوئی خاتون نہیں ہے۔ کوئی رکھ لی ہوتی ویسے نہیں تو کانٹریکٹ پر رکھ لیتے۔

کہنے لگا' ایک آئی تھی۔ پبلک سروس کمشن نے اپروو کی تھی۔

اتنے میں احمد بشیر داخل ہوا۔

انشا نے کہا۔ اس سے پوچھ۔ تیرے اس دوست احمد بشیر نے اس خاتون کی قدر نہ کی ۔

مصباح

کیوں احمد بشیر سچ کہہ رہا ہے انشا' میں نے احمد بشیر سے پوچھا۔

ہاں آئی تھی' احمد بشیر بولا۔ بڑی طاقت ور تھی وہ۔ اس نے مجھے کھڑکا کے رکھ دیا۔ میں تجھے اس سے ملواؤں گا۔ عجیب لڑکی ہے وہ۔ بڑی انٹلکچول ہے اور تیز اتنی کہ چاہے تو کاٹ کر رکھ دے۔

بتا نا مجھے ساری بات بتا' میں نے کہا۔

وہ بیٹھ گیا اور کہانی سنانے لگا۔ اس کا نام مصباح تھا' وہ بولا' پبلک سروس کمشن نے میرا چناؤ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی پوسٹ کے لیے کیا تھا اور اسے میری نائب کے طور پر سلیکٹ کیا تھا وہ کوئی خاص حسین نہ تھی۔ خدو خال موٹے تھے۔ رنگ گورا تھا۔ لیکن نسائی شوخی سے اس قدر بھرپور تھی کہ اسے دیکھ کر سارے دفتر والے ریجھ گئے۔ مگر مجھے اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی تھی۔

ایک دن وہ میرے کمرے میں آ گئی۔ بولی بتایئے مجھے کیا کیا کرنا ہو گا۔ میں نے بڑے سوکھے انداز میں اسے سارے کام گنوا دیئے' کہ تم نے یہ یہ کرنا ہو گا۔ اگر کوئی مشکل درپیش ہو تو مجھ سے پوچھ لینا۔

اگلے دن وہ پھر آ گئی۔ کہنے لگی' وزارت سے کیا کیا کوائف حاصل کرنے ہیں اور کس طرح کرنے ہیں۔

میں نے اسے ساری بات سمجھا دی کہ یوں وزارت میں جانا ہے' فلاں صاحب سے ملنا ہے۔ انہیں یہ یہ بات سمجھانا ہے۔ میں نے اس کی جانب خاص توجہ نہ دی۔ ڈرل ماسٹر کی طرح سارے مراحل گنوا دیے۔ جی اچھا کہہ کر وہ چلی گئی۔

تیسرے دن وہ پھر آ گئی۔ کہنے لگی' آپ نے کہا تھا بات سمجھ میں نہ تو پوچھ لینا۔

میں نے پھر سے اسے ساری باتیں سمجھائیں۔ اب آپ سمجھ گئی ہیں نا۔ میں نے پوچھا۔

جی سمجھ گئی' اس نے کہا۔

اچھا اب آپ جائیں۔

جی اچھا' اس نے جواب دیا' لیکن جوں کی توں بیٹھی رہی' پر اعتماد' باوقار۔

میں نے فائیل پر کام شروع کر دیا لیکن اسے بیٹھے دیکھ کر میں ڈسٹرب ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ یہ لڑکی طاقتور معلوم ہوتی ہے' چیلنج دے رہی ہی۔ اگر یہ سر چڑھ گئی تو بات خراب ہو جائے گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اسے آج ہی جھاڑ پلا دی جائے۔

میں نے سنجیدگی سے کہا' دیکھیے محترمہ' یہاں عورت ہونے کا فائدہ حاصل نہ کیجیے۔ بھول جائیے کہ آپ عورت ہیں۔

جی بھول گئی' وہ بولی اور ویسے ہی بیٹھی رہی۔

یہ دیکھ کر میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ بہرحال میں نے دفتری لہجے میں کہا' محترمہ آپ کو یہاں کام کرنا ہو گا۔ محنت کرنی پڑے گی۔

جی' وہ بولی' کام کرنا ہو گا' محنت کرنی پڑے گی۔

میں نے کہا' اب آپ اپنے کمرے میں جایئے۔

اچھا جی' وہ بولی' اور بیٹھی رہی۔

میں گھبرا گیا

کیا واقعی' میں نے احمد بشیر سے پوچھا' تم گھبرا گئے۔

ہاں' بھئی' وہ بولا' میں ایسی سچویشن سے واقف نہ تھا۔ اور میں وہاں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا' احمد بشیر کی حیثیت سے نہیں۔ حفیظ صاحب محکمے کے ڈائریکٹر تو تھے۔ لیکن برائے نام ڈائریکٹر تھے۔ چونکہ وہ دفتر کے کام سے واقف نہ تھے۔ دراصل میں دفتر چلا رہا تھا۔ عملی طور پر میں ڈائریکٹر تھا۔

ٹھیک ہے' ٹھیک' انشا بولا۔

تم آگے بات سناؤ میں نے کہا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر دفعتاً" بولی' آپ کے بال گھنگھریالے کیوں ہیں۔

یہ سن کر میری پھونک نکل گئی لیکن میں ضبط کئے بیٹھا رہا۔

پھر کہنے لگی میرا جی چاہتا ہے آپ کے بالوں میں انگلیاں پھیروں اجازت ہے۔

میں نے غصہ میں کہا' حرام زادی' گشتی۔

کیا کہا' وہ بولی' میں سمجھی نہیں پھر کہیے۔

اس پر میں ہنس پڑا۔ اور ہم دوست بن گئے۔

ابن انشا مسکرایا' عجیب لڑکی تھی وہ۔

تم اندازہ ہی نہیں لگا سکتے ممتاز' احمد بشیر بولا' کہ اس میں کتنی جرأت ہے۔ بڑی سے بڑی بات وہ یوں کہہ دیتی ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

پھر کیا ہوا' میں نے احمد بشیر سے پوچھا۔

اگلے دن وہ پھر آئی۔ دوڑی دوڑی آئی' کہنے لگی' آپ مجھے بہن بنا لیں ابھی ابھی فوراً" جلدی کریں ورنہ ———

ورنہ کیا' میں نے پوچھا۔

ورنہ یو ول مس دی چانس۔ دفتر کے سارے سٹاف نے مجھے بہن بنا لیا ہے۔ آپ پیچھے رہ گئے ہیں۔

وہ بھائی بن کر تم پر عشق جھاڑیں گے' میں نے کہا۔

ہاں' وہ بولی' آپ بھی بھائی بن کر عشق جھاڑیں نا۔ اس میں دوہری لذت ہوتی ہے۔

مگر تم میں بہن والی کوئی بات بھی ہو' میں نے کہا' تمہارے تو سگے بھائی تم سے عشق کرتے

ہوں گے۔

ہاں کرتے ہیں' کرتے ہیں' وہ بولی۔

دفتر والوں کو نہ کرنے دو' میں نے کہا۔

کیوں نہ کرنے دوں۔

تمہاری بدنامی ہو گی۔

اچھا پھر کیا ہو گا' وہ بولی——— میں بتاؤں پھر کیا ہو گا۔ پھر آپ کو پسینے آئیں گے۔ نبضیں چھوٹ جائیں گی۔ ٹانگیں لڑکھڑائیں گی۔ ہے نا' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اگلے دن وہ پھر آ گئی' بولی سارے دفتر والے مجھ سے عشق جھاڑ رہے ہیں لیکن کسی کو عشق کرنا نہیں آتا' بالکل اناڑی ہیں۔

میں نے کہا'شکر کرو میں تم سے عشق نہیں کرتا۔ اگر کرتا تو پتہ ہے کیا ہوتا۔

'کیا ہوتا' اس نے پوچھا۔

میں تجھے اٹھا کر لے جاتا اور توڑ پھوڑ کر تنکا تنکا کر کے پھینک دیتا۔

شکر کریں میں آپ سے عشق نہیں کرتی' وہ بولی۔ کرتی تو' وہ وہ کچھ ہوتا کہ آپ کو چھپنے کے لیے جگہ نہ ملتی۔ یہ کہتے ہوئے وہ میری بہت قریب آ گئی۔ میں نے غصے سے کہا ہٹ جاؤ۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ ورنہ———

ورنہ کیا اس نے پوچھا۔

ورنہ میں تجھے چوم لوں گا۔

پھر کیا ہو گا' وہ بولی۔

پھر جہاں جہاں میں چوموں گا وہاں وہاں گلاب اگ آئیں گے۔

یہ سن کر وہ دھم سے کرسی میں گر گئی۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ کہنے لگی' آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ میرا راستہ کھوٹا نہ کریں۔

کیا مطلب' میں نے احمد بشیر سے پوچھا۔ راستہ کھوٹا کرنے سے اس کا مطلب کیا تھا۔

اس کی منگنی ہو چکی تھی نا۔ احمد بشیر بولا۔ یہ ایک مجبوری کا رشتہ تھا۔ اس نے وچن دے رکھا تھا۔ میاں ایک معمر آدمی تھا' قانون دان تھا۔ وہ زندگی سے قطعی طور پر ناواقف تھا' یوں

جیسے پتھر کا بنا ہو۔

کیا لڑکی کو علم تھا' انشاء نے پوچھا۔

ہاں' احمد بشیر نے جواب دیا' اسے علم تھا وہ اکثر بڑی بے بسی سے مجھ سے منت کیا کرتی' نہ نہ ایسا نہ کہیے۔ مجھے بے بس نہ کیجیے۔ اگر بند ٹوٹ گیا تو سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔

اب وہ کہاں ہے' میں نے احمد بشیر سے پوچھا۔

وہ استعفٰے دے کر چلی گئی ہے۔ میں اسے بلاؤں گا' وہ آئے گی ضرور آئے گی۔ ویسے وہ اب گھر سے نہیں نکلتی۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔

کیوں گھر سے نکلنے پر پابندی ہے کیا' انشا نے پوچھا۔

نہیں' وہ بولا' خاوند کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے اس نے خود اپنے پاؤں میں زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ خود سے ڈرتی ہے۔

لیکن یہ سب کیوں' میں نے کہا۔

اس نے نباہنے کا عزم کر رکھا ہے۔ اسے کسی نے مجبور نہیں کیا۔ بس اس نے محسوس کیا کہ گھرانے کی بہتری کے لیے یہ شادی ضروری تھی اور اسے نبھانے کا عزم اس نے خود کیا ہے۔

بہر صورت میں پیغام بھیجوں گا' تو وہ ضرور آئے گی' دو ایک گھنٹے کے لیے' کلفٹن پر' وہ تجھے جانتی ہے ممتاز۔ میں نے کہا جب کبھی ممتاز آئے گا تو میں تجھے اس سے ملاؤں گا۔ میں نے اسے تیرے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا تو تیار رہ' کسی روز ہم تینوں بیچ پر جائیں گے۔

مجھے بھی لے جاؤ تو کوئی حرج ہے' انشاء نے کہا۔

تو قرب کا متحمل نہیں ہو سکتا' احمد بشیر بولا۔

چھلکن

پھر دفعتاً" اعلان ہوا کہ پاکستان کا دارالخلافہ کراچی کی جگہ راولپنڈی مقرر کیا گیا ہے اور مرکزی حکومت کے دفاتر بہت جلد راولپنڈی میں منتقل کر دیے جائیں گے۔ اس خبر نے ساری کراچی میں ہلچل مچا دی۔

کراچی کے رہنے والے اس خبر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اسے ایک مضحکہ خیز اعلان سمجھتے تھے' نہیں یہ نہیں ہو سکتا یہ کیسے' ہو سکتا ہے۔

میں نے قدرت اللہ کو فون کیا۔ میں نے کہا مرکز کے انتقال کا اعلان ہو گیا ہے۔ اب تو سبھی جان گئے ہیں۔

اس نے جواب میں کہا' آپ یہاں آ جائیں چونکہ پریذیڈنسی بہت جلد راولپنڈی شفٹ کر رہی ہے۔

دفتر میں قدرت بے حد مصروف تھا۔ آپ انتظار کریں' وہ بولا۔ کچھ دیر کے بعد ہم گھر جائیں گے۔ وہاں بات کریں گے۔

اس روز قدرت اللہ شہاب کی کیفیت کچھ مختلف سی تھی۔ چہرہ تو ویسے ہی تھا' گونگا' پتھر کا۔ بات کرنے کا انداز مختلف تھا۔ آواز بدلی ہوئی تھی۔ زبان میں لکنت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے پی ہوئی ہو' کچھ زیادہ ہی پی ہوئی ہو۔

باہر نکلا تو قدرت کے پی اے نے مجھے اشارہ کیا۔ پاس گیا تو کہنے لگا' آج پھر وہی کیفیت طاری ہے۔

کہنے لگا' ٹھہریے میں دکھاتا ہوں آپ کو۔ پھر وہ دراز میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

وہ شہاب کا نوٹ تھا' لیکن ہینڈ رائیٹنگ ایسے تھا جیسے کسی بچے نے لکھا ہو۔

بالکل ویسا ہی ہے' پی اے نے کہا' جیسا میں نے اس روز دکھایا تھا۔ یاد ہے۔

ہاں' میں نے کہا' یہ کب کا نوٹ ہے۔

آج کا ہے۔ آپ کی سمجھ میں آتی ہے بات۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتی' وہ بولا۔

ہاں عجیب سی بات ہے' میں نے جواب دیا۔

شہاب صاحب پر کوئی دورہ تو نہیں پڑتا' اس نے پوچھا۔

نہیں تو' میں نے جواب دیا' وہ ایک صحت مند آدمی ہے۔

لگتا تو ایسا ہی ہے لیکن' وہ رک گیا۔

اگرچہ یہ لیکن میرے اندر اک کھورو مچائے ہوئے تھا' لیکن میں نے پی اے کو ٹال دیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے شہاب سے پوچھا' وہ بزرگ کون تھا۔

کون سا' اس نے پوچھا۔

وہ جو اس روز آپ سے ملا تھا۔ کہتا تھا' تمہاری کھال کھینچ کر اس پر نمک چھڑکوں اور دھوپ میں رکھ دوں۔

ہاں وہ' اس کی زبان بری طرح سے تھنتھلائی۔

بڑا تلخ آدمی تھا جیسے سڑی ہوئی مرچ ہو' میں نے کہا۔

ہاں بڑا' وہ بولا۔

بزرگ تو نورانی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے مٹھاس کی پھوار نکلتی ہے۔

ہاں مٹھاس کی پھوار نکلتی ہے۔

وہ تو ایسا نہیں تھا۔

ہاں' وہ بولا' وہ ایسا نہیں تھا۔

جب ولایت ملتی ہے تو حسّیات تیز ہو جاتی ہے اور فرد کی جتنی بھی خصوصیات ہوتی ہیں' وہ سب میگنی فائی ہو جاتی ہیں۔ شہاب نے کہا' اس روز وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

کیا منفی صفات بھی میگنی فائی ہو جاتی ہیں' میں نے پوچھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ جب بزرگی عطا ہوتی ہے تو فرد کو دھو کر استری کر دیا جاتا ہے۔ کوئی الائش باقی نہیں رہتی' کوئی بل نہیں رہتا۔ سب نکل جاتے ہیں۔

نہیں' وہ بولا' بزرگی آزمائش ہوتی ہے' مسلسل آزمائش۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ قدرت نے میری بات ٹالنے کے لیے بات کا رخ بدل دیا ہے۔ قدرت میں یہ عجیب خصوصیت تھی۔ وہ جس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کمال چالاکی سے بات کا رخ بدل دیا کرتا تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا' نہیں میں بات پوچھ کر رہوں گا۔

مجھے یہ بتائیے کہ وہ کون بزرگ تھے' میں نے کہا۔

پتہ نہیں' وہ بولا۔

وارننگ

وہ آپ کو کس بات پر وارننگ دے رہے تھے۔

مجھے پتہ نہیں۔

ایک ایسا واقعہ پہلے بھی ہوا تھا' شہاب نے تھنھلاتے ہوئے کہا۔ صدر صاحب جیل کے معائنے کے لیے گئے تھے۔ ساتھ مجھ لے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ انہوں نے معائنے میں دو گھنٹے لگا دیئے۔ پھر جب ہم اہلکاروں سے رخصت ہو رہے تھے تو جیل کا ایک وارڈر آیا۔

کہنے لگا' جناب شہاب صاحب ہیں کیا۔

میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

کہنے لگا' ایک قیدی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

کون ہے' وہ میں نے پوچھا۔

مجھے نہیں پتہ وہ کون ہے۔ ادھر جو پھانسی والے سیلز ہیں' ان میں ہے وہ اور اس نے وہاں شور مچا رکھا ہے' میں شہاب صاحب سے ملوں گا۔ مجھے شہاب صاحب سے ملاؤ۔

ہوں' میں نے پوچھا' وہ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتا ہے۔

وارڈر بولا' جناب میں نے اس سے پوچھا تھا تم کس بارے میں ملنا چاہتے ہو۔ کوئی شکایت ہے کیا۔

نہیں نہیں' وہ چلایا' مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں' تم اسے بلا کر لاؤ' میں اس سے بات کروں گا۔

شہاب کہنے لگا' میں نے سوچا شاید کوئی وصیت کرنا چاہتا ہو' جیل والوں پر اسے اعتماد نہ ہو۔ اس لیے بہتر ہے میں اس کی بات سن لوں۔

قیدی ہیجڑا

سیل میں داخل ہو کر جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو حیران ہوا' وہ ہیجڑا تھا۔

وارڈر نے سیل کا دروازہ بند کیا۔ باہر تالا لگایا۔ کہنے لگا' صاحب جی جب آپ فارغ ہو جائیں تو مجھے اشارہ کر دیں میں وہاں سامنے کھڑا رہوں گا۔ یہ کہہ کر وہ دور جا کر کھڑا ہو گیا۔

چھوٹتے ہی قیدی بولا' تجھے پتہ ہے کہ تجھ سے بات کرنے کے لیے ہمیں قید ہونا پڑا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہمیں پتہ تھا تو آج جیل کا معائنہ کرنے کے لیے آئے گا۔ اس لیے ہم یہاں اس کوٹھڑی میں آکر بند ہو گئے۔

ہم تجھے بتانے آئے ہیں' وہ بولا'کہ تو ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔ تو سمجھتا ہے کہ تو اس کا سکتر ہے۔ تجھے اس کے حکم بجا لانے میں' یہ غلط ہے۔ تو یہاں اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ اس کے حکم کی تعمیل کرے وہ فیصلے کرے اور تو ان کی تکمیل کرے۔ تو یہاں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تو خود فیصلے کرے۔ اس کا فکر نہ کر' وہ رکاوٹ نہیں بنے گا۔

شہاب ہنسنے لگا' پتہ نہیں وہ کیا کیا بولتا رہا۔ گھنٹوں بولتا گیا' مجھے اس کی باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ پھر میں سمجھا کہ شاید اس کے ذہن کا فیوز اڑا ہوا ہے۔ یہ اکثر ہوتا ہے جو لوگ پھانسی کی سزا پر ہوتے ہیں ان کا ذہنی کنٹرول قائم نہیں رہتا۔

قدرت کی بات سن کر' مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بات ٹال رہا ہے۔ ورنہ قیدی کی باتیں تو بالکل واضح تھیں۔ مجھے سمجھ میں آ رہی تھیں' پھر اسے کیوں سمجھ میں نہ آئیں۔

آپ نے اس قیدی کے متعلق پتہ لگایا کہ وہ کون تھا' میں نے پوچھا۔

میں نے نہیں البتہ عفت نے پتہ لگایا تھا۔ شہاب نے جواب دیا۔ قیدی کے نام پتے کے متعلق تو مجھے علم نہ تھا۔ البتہ میں نے سیل کا نمبر پڑھ لیا تھا۔ گھر دیر سے گیا تو عفت نے پوچھا کہ آدھی رات تک آپ کہاں رہے' تو میں نے ساری بات بتا دی۔ اگلے روز اس نے جیل کے حکام سے پوچھا تھا کہ سات نمبر کے پھانسی سیل میں کون قیدی بند ہے۔ اس کا نام پتہ کیا ہے اور اسے کب پھانسی دی جانے والی ہے۔

اس پر انہوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ سات نمبر کے سیل میں کوئی قیدی نہیں ہے۔ جیل کے قریب جو آبادی ہے وہاں بازار میں کوئی شخص دنگا فساد کر رہا تھا۔ جیل کے وارڈر اس وقت وہاں سے گزرے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ شخص دنگا فساد کر رہا ہے۔ وارڈر نے اسے سمجھایا لیکن الٹا وہ وارڈر سے لڑنے بھڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس پر وارڈر اسے پکڑ کر لے گئے اور ویسے ہی دھونس جمانے کے لیے اسی سات نمبر کے سل میں بند کر دیا۔ آج صبح وہ سل میں موجود نہ تھا پتہ نہیں کس نے اسے سل سے نکال کر بھگا دیا۔

شاید وہ بزرگ ہی ہو' میں نے کہا۔

شاید' قدرت نے جواب دیا شاید' وہ چھلکن کے عالم میں ہو۔ آپ چھلکن سے واقف نہیں ہیں۔

وہ ایک عالم ہوتا ہے' قدرت نے کہا۔ بزرگ لوگ ہمیشہ ضبط سے کام لیتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برتن لبالب بھر جاتا ہے اور پھر ضبط کے باوجود چھلکتا ہے' چھینٹے اڑتے ہیں۔

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر شہاب لڑکھڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس روز مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ قدرت نہیں تھا۔ اس کی کوئی بات بھی حسب معمول نظر نہیں آتی تھی۔ نہ چلنے کا انداز' نہ بات کرنے کا انداز' نہ لہجہ۔

کچھ دیر کے بعد وہ واپس آ گیا۔ آتے ہی کہنے لگا' شاید ہم بہت جلد مستقل طور پر پنڈی چلے جائیں۔ کیا آپ ڈی ایف پی میں رہنا پسند کریں گے۔

میں نے کہا' پسند نہ کرنے کا مطلب' بیگرز آر ناٹ چوزرز۔۔۔۔۔۔

آپ بیگر نہیں ہیں' وہ بولا' جبھی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ آپ چوز کریں۔

کیا چوز کروں' میں نے کہا۔

میرا خیال ہے' آپ اخبار میں چلے جائیں اچھے رہیں گے۔ دراصل مجھے انشا کا فکر ہے۔

وہ سادہ آدمی ہے میں نے کہا۔ جہاں بھی جانا پڑا چلا جائے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں انشا جی کو بالکل نہیں سمجھا۔ اس کا کوئی سرا ہی نہیں ملا مجھے۔ پتہ نہیں چلا کہ کہاں سے شروع ہوتا ہے کہاں جا ختم ہوتا ہے' مجھے تو ایسے لگتا ہے جیسے انشا بھی چھلکن کے عالم میں ہو۔

میں نے جان بوجھ کر چھلکن کی بات کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ قدرت بزرگوں کے بارے میں بات کرے۔ اس روز اگرچہ وہ نہتھلا کر باتیں کر رہا تھا' لیکن غیر از معمول وہ بات کرنے کے موڈ میں تھا۔

چھلکن۔۔۔۔۔۔ چھلکن کیا' وہ بولا۔

ابھی آپ بتا رہے تھے نا کہ کبھی کبھی بزرگ لوگ چھلکن کے عالم میں ہوتے ہیں۔ برتن بھر جاتا ہے اور پھر چھلکتا ہے' چھینٹے اڑتے ہیں۔

ہاں ہاں' وہ بولا' چھلکن کے عالم میں ضبط کے باوجود بات اچھل کر نکل جاتی ہے۔

آپ نے کبھی کسی بزرگ کو چھلکن کے عالم میں دیکھا ہے کیا' میں نے پوچھا۔

صرف ایک بار' وہ بولا' صرف ایک بار۔

نیول افسر

میں ریلوے ٹرین میں دلی جا رہا تھا۔ کسی سٹیشن پر اترا تو گاڑی چل پڑی اور میں دوڑ کر چلتی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ دروازہ کھولنے لگا تو دیکھا کہ وہ ریزرو سیلون ہے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے کسی نے دروازہ کھولا۔ کہنے لگا، آیئے آیئے مسٹر کیو یو الیس آ جایئے۔

وہ ایک انگریز تھا۔ نیوی کا افسر' اس نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اندر سیلون میں لے گیا۔

کہنے لگا' مسٹر کیو یو الیس میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔

لیکن سر' میں نے کہا' میں تو غلطی سے سیلون پر سوار ہو گیا ہوں۔ میری سیٹ تو پیچھے

ہاں' وہ بولا' میں نے دل کیا تھا کہ تم سیلون میں آ جاؤ۔ سو تم آ گئے۔ اچھا کیا تم نے آ گئے۔ میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ انسان جب لبالب بھر جاتا ہے تو اس پر اتنا بوجھ لد جاتا ہے کہ سہارا نہیں جاتا۔ اس لیے وہ خود کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ میں خود کو ہلکا کرنا چاہتا تھا' اس لیے میں نے دل کیا کہ تم غلطی سے سیلون میں آ جاؤ۔

کون ہیں آپ' میں نے اس سے پوچھا۔

میں برٹش نیوی کا افسر ہوں' وہ بولا۔ یہ جو جنگ ہو رہی ہے۔ اس میں دونوں جانب روحانی طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ میں بھی ایک کارکن ہوں۔

لیکن آپ تو عیسائی ہیں' میں نے پوچھا۔

ہاں عیسائی تھا' وہ بولا۔ عارضی طور پر میرا قلب بدل دیا گیا اور عارضی طور پر مجھے طاقتیں دے دی گئی ہیں۔ یہ طاقتیں مجھے کشمیر کے جنگلوں میں عطا کی گئی تھیں۔ تم کچھ پیو گے' اس نے مجھ سے پوچھا۔

نہیں' میں نے جواب دیا۔

پی لو پی لو کیا حرج ہے' وہ اٹھ کر بوتل لے آیا۔

نہیں نہیں' میں نے کہا' آپ پئیں۔ بے شک پئیں۔ یہ تو بچگانہ نشہ ہے' وہ بولا۔ مجھ پر اس وقت جو کیفیت طاری ہے۔ اس کے سامنے سب نشے ہیچ ہیں۔ لیکن اب کچھ زیادہ دن باقی نہیں رہے۔ ہم برطانوی حاکموں کو تو اب جانا ہو گا۔ تمہارے ملک کے بزرگوں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ برطانیہ کو بیک بنی دو دو گوش یہاں سے نکال دیا جائے۔

اس کی باتیں سن کر میں حیران ہو رہا تھا' شہاب نے کہا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ آدمی کون ہے' کوئی فراڈ تو نہیں ہے۔

اس نے میرے خیالات پڑھ لیے' ہنسا' بولا' فراڈ کا کیا مطلب ہے ———— میں کون ہوں ———— میں وہ ہوں جس کا نام لیے بغیر جنگ کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی لیکن تم میرا نام نہیں سمجھ سکتے چونکہ میں نے تمہارے ذہن سے اپنا نام مٹا دیا ہے۔ میں نے اقبال سے بھی رابطہ قائم کیا تھا۔ نہ کرتا تو وہ وہ نہ ہوتا جو اب ہے۔ وہ مجھے ساٹھ سالہ بڈھے فقیر کے روپ میں جانتا ہے۔

کچھ دیر وہ خاموش رہا' میں اس کی باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص' یہ باتیں مجھے کیوں بتا رہا ہے۔

پھر وہ بولا' تمہیں معلوم نہیں کہ چرچل جینیس ہے اور اگر وہ ہماری لائن میں آ جاتا تو عظیم تر ہو جاتا۔ گاندھی خالی ڈھول تھا' لیکن اسے ڈھول بجانا آتا تھا۔ میں ہٹلر سے بھی ملا تھا۔ میں نے اسے خبردار کیا کہ دیکھ تو ازلی طور پر نمبر ٹو ہے۔ اگر تو نمبر ٹو رہا تو عظمت حاصل ہو گی' لیکن اگر تو نے نمبر ون بننے کی کوشش کی تو تباہی ہو گی۔ لیکن مجھے پتہ تھا کہ وہ نمبر ٹو پوزیشین سے کبھی مطمئن نہیں ہو گا۔ اور وہ جو ماؤنٹ بیٹن ہے وہ احمق ہے' وہ تمہارے معاملات میں ٹانگ اڑائے گا۔

پھر وہ دفعتاً" میری طرف متوجہ ہوا' بولا تم بچپن میں شرارتیں کرتے رہے ہو۔ کوڈی پر آٹا لگا کر مرغیاں پکڑتے رہے ہو۔ مزار سے پیسے چراتے رہے ہو۔

تم' اس نے حقارت سے منہ بنایا' تم سطح پر رینگتے ہوئے کیڑے ہو۔ گہرائی میں غوطہ لگاؤ تو موتی ملیں گے۔

خودکشی

اور مجھے معلوم ہے تم نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک بری بات تھی۔ چاہیئے تھا کہ تم کو اس کی سزا ملتی، لیکن تمہارا یہ عمل تمہارے لیے ترپ کا پتا بن گیا۔ تم بڑے خوش قسمت ہو۔

کیا یہ بات سچ ہے، میں نے شہاب سے پوچھا۔

کون سی بات، اس نے چونک کر پوچھا۔

کہ آپ نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔

شہاب نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

لیکن کیوں، کیا محبت میں ناکامی کی وجہ سے خودکشی کا خیال آیا تھا۔

عام طور پر قدرت سے کوئی بات ایڈیوس کرنا بے حد مشکل ہے۔ ایک بات کا سراغ لگانے کے لیے بیسیوں سوال پوچھنے پڑتے ہیں۔ لیکن اس روز وہ بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس کی زبان رک رک چلتی تھی، اس کے باوجود وہ بولتا جا رہا تھا، بولتا جا رہا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں بولا، نہیں محبت کی بات نہیں تھی۔ ان دنوں میں جموں کالج میں پڑھتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے ڈیپریشن کے دورے پڑتے تھے، خوامخواہ، بے وجہ۔ بڑی تکلیف دہ ڈیپریشن تھی۔ میں نے سوچا یہ کیا عذاب ہے چلو زندگی کا قصہ ہی ختم کر دو۔

میں نے سوچا جموں کے نالے توی میں چھلانگ لگا دوں۔ یہ آسان ترین طریقہ تھا۔ نہ کوئی جھگڑا نہ شور شرابا۔ لوگ سمجھیں گے کہ تیرنے آیا تھا ڈوب گیا۔

ہاں تو میں توی پر چلا گیا اور دیر تک ایسا مقام ڈھونڈتا رہا، جہاں پانی گہرا ہو، اور لوگوں کی گزر گاہ سے دور ہو۔ آخر مجھے ایک مناسب مقام مل گیا۔ میں نے اپنا کوٹ اتارا، بوٹ اتارے پھر مجھے خیال آیا کہ چھلانگ مارنے سے پہلے دو نفل کیوں نہ پڑھ لوں۔ نفل پڑھ کر دعا مانگوں گا۔ اللہ تعالیٰ کو سمجھاؤں گا کہ میں نے ناشکری کی وجہ سے خودکشی نہیں کی، قدرت مسکرانے لگا۔

تو پھر کیا آپ نے نفل پڑھے، میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دعا مانگی، میں نے پوچھا۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا' اور مسکرا کر بولا' میں نے بڑی چالاکی سے دعا مانگی۔ میں نے کہا یا باری تعالیٰ میں یہ خود کشی نہیں کر رہا خود کو تیرے حوالے کر رہا ہوں۔

پھر جب میں چھلانگ لگانے لگا تو توی سے ایک بزرگ نمودار ہوئے انہوں نے مجھے روک دیا۔ پاس بٹھایا میرے ہاتھ پکڑ لیے اور مجھے بیعت کر لیا۔

وہ خواجہ خضر تھے کیا' میں نے پوچھا۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

کون بزرگ تھے وہ' میں نے پوچھا۔

ان کا نام لینے کی مجھے اجازت نہیں' وہ بولا۔ وہ ولی کے بہت بڑے' سب سے بڑے بزرگ ہیں۔

وہ کچھ مزید کہنا چاہتا تھا کہ عفت دوڑی دوڑی اندر آئی بولی' ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں آرام کرنا چاہیئے مفتی صاحب آپ پھر کسی وقت آ جایئے گا۔

قدرت نے سر اثبات میں ہلا دیا' ہاں مجھے آرام کرنا چاہیئے۔ عفت نے اسے یوں کلاوے میں لے لیا جیسے وہ کوئی بچہ ہو۔ اور قدرت لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

اکتیسواں باب

ولیج ایڈ

ذوبی

ایک روز ہمارے دفتر کے سامنے ایک نئی نکور کار رکی۔ یہ کون ہو سکتا ہے' بھلا میں نے سوچا' اندر سے ذوبی نکلا۔ وہی ۱۹۴۸ء والا ذوبی۔ کوئی تبدیلی نہ تھی۔ کار کے سوائے۔

میں اسے دیکھ کر چلایا' ارے تو۔

ہاں میں' وہ بولا۔

تو یہاں۔

ہاں یہیں۔

اور یہ گاڑی۔

ہاں یہ گاڑی۔

کہاں سے آئی۔

اس نے انگلی اوپر اٹھائی۔ اس نے دی۔

تو اس کو جانتا ہے کیا۔

جانتا نہیں مانتا ہوں' مجبوراً" وہ بولا۔

کیوں۔

وہ دیتا جو ہے۔

یہاں رہتا کہاں ہے تو۔

بنگلہ ہے پریس ہے۔ سٹوڈیو ہے۔ مصور رسالہ ہے ''منشور''

ارے اتنا کچھ۔

ہاں' اس سے بھی زیادہ سب اُس نے دیا ہے۔

پر تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔

ہاں میں ویسے کا ویسا ہوں۔

جو تو ویسے کا ویسا ہے تو یہ بنگلہ' پریس' سٹوڈیو۔ میں نہیں مانتا۔

چل میں تجھے دکھاؤں' وہ بولا۔

دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

صدر کے مرکز میں اس کا پریس تھا' مشینیں' نوکر چاکر' ساز و سامان۔ اوپر رہائشی کمرے تھے۔ سٹوڈیو تھا۔ اس نے ''منشور'' کے کئی ایک پرچے میرے سامنے ڈھیر کر دیئے۔ پرچے میں انفرادیت کے ڈھیرے لگے ہوئے تھے۔

کہاں آرٹسٹ کہاں ادبی پرچہ۔ ان کا کیا میل ہے' میں نے پوچھا۔

ہے' وہ بولا۔

کیا' میں نے پوچھا۔ کیا میل ہے۔

یہ بھی لکیریں' وہ بھی لکیریں' وہ بولا۔

سب کچھ بدل گیا ہے' میں نے اس کے گھر کا ٹھاٹھ دیکھ کر کہا۔

ہاں' سب کچھ بدل گیا ہے' وہ بولا' لیکن لکیریں نہیں بدلیں۔ نہیں بدلیں گی۔

سٹوڈیو میں قد آدم فریم لگے ہوئے تھے۔ لکیروں والے فریموں نے مجھے جذب کر لیا۔

پختگی' نفاست' انفرادیت۔

ابے او قصور کے بینجو ماسٹر پہلوان یہ باتیں تجھے کیسے سوجھتی ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

کون سی باتیں۔

یہ گھوڑا مرد اور نازک حسینہ۔ یہ سارے عالم پر چھائی ہوئی نسائی کوکھ' یہ بیوی میاں کی گتھی ماں۔

پتہ نہیں' وہ بولا۔

اتنی بڑی سچائیاں۔

اچھا یہ سچائیاں ہیں' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

تجھے پتہ نہیں کیا۔

نہیں' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

پھر بناتا کیسے ہے' میں نے پوچھا۔

جو دکھتا ہے بنا دیتا ہوں۔

منشور کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے شباب کا سکیچ دیکھ کر کہا' یہ تو نے بنایا ہے کیا۔

ہاں' وہ بولا' میں نے۔

اسے جانتے ہو' میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں یہ کیا چیز ہے' وہ بولا۔ ساری کراچی میں اس کا تذکرہ ہے۔

کیا کہتے ہیں لوگ۔

کچھ تعریف سے بھرے ہوئے' کچھ شکوک سے۔

تم کیا کہتے ہو۔

مجھے نہیں پتہ' وہ بولا۔ اس کا چہرہ گونگا ہے۔ خدوخال بولتے نہیں۔ یا بہت بھولا ہے' یا بہت چالاک ہے۔

تم اس سے ملے ہو کبھی۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا' میرا ایک ملنے والا اسے جانتا ہے۔

کیا جانتا ہے۔

کہتا ہے' اس کا سرا نہیں ملتا۔ پتہ نہیں کہاں سے شروع ہوتا ہے' کہاں جا ختم ہوتا ہے۔

تمہارا دوست ہے کیا' ذوبی نے پوچھا۔

نہیں میرا نہیں اشفاق کا دوست ہے' میں نے کہا۔

وہ اشفاق کا دوست ہے' یا اشفاق اس کا دوست ہے۔

پتہ نہیں' لگتا ہے اشفاق اس کا دوست ہے۔

وہ تو ہو گا' ذوبی نے کہا۔

اشفاق کا بھی پتہ نہیں لگتا۔ میں نے کہا۔

کیوں' وہ بولا۔

اس کا بھی سرا نہیں ملتا۔

ہاں۔ نہیں ملتا۔ وہ بولا۔

سچ' اشفاق تو تم سے ناراض ہے' میں نے کہا۔

اچھا' مجھے نہیں پتہ۔

اسے تو پتہ ہے۔

اسے ہو گا' مجھے نہیں۔ پیو گے۔

کیا مطلب۔

اس نے الماری سے بوتل نکالی۔

تم پیتے ہو' میں نے پوچھا۔

ہاں' وہ بولا' بلاناغہ۔

کہاں سے آتی ہے۔

اس نے انگلی اٹھائی۔ وہ دیتا ہے۔

وہ تو منع کرتا ہے۔

ہاں' وہ بولا' دیتا بھی ہے' منع بھی کرتا ہے۔ کچھ لوگ حکم مانتے ہیں۔ ہم کفران نعمت نہیں کرتے ہیں۔

ایک بات پوچھوں' میں نے کہا۔

پوچھو۔

یہ اتنا کچھ جو تمہیں ملا ہے' تم کسی خاتون کے کیپ ہو کیا۔

ہاں' ہوں' وہ بولا۔

کون ہے وہ۔

میری بیوی ہے۔ ملو گیا اس سے۔

نہیں' میں نے جواب دیا۔

فنکار

اشفاق احمد جب روم سے واپس آیا تھا' تو اس کی باتیں سن کر ہمیں ذوبی کے خلاف بغض پیدا ہو گیا تھا۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ذوبی حسد کا مارا ہوا ہے۔ وہ دوسرے کو آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتا۔

لیکن ذوبی کو دیکھ میرا وہ بغض دھل گیا۔ اس کی باتوں میں عجیب سی کشش تھی۔ اس کی باتیں دو ٹوک تھیں۔ ان میں سے سچائی کی بو آتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بے نیاز ہو۔ جو ہے ٹھیک ہے' جو نہیں ہے ٹھیک ہے۔ کوئی بھی بات ہو۔ کیسی بھی ہو' اسے کاٹتی نہیں تھی' ڈنک نہیں مارتی تھی۔ یہ شخص جیسا کیسا بھی ہے۔ پیارا ہے' منفرد ہے' فنکار ہے' میں نے سوچا۔

پھر ذوبی چار ایک بار مجھے ملا۔ صبح سویرے میرے فلیٹ کی گھنٹی بجتی۔ باہر نکلتا تو وہ سیڑھیوں پر بیٹھا ہوتا۔

تم یہاں کیوں بیٹھے ہو' میں پوچھتا۔

کیوں یہاں بیٹھنا منع ہے کیا' وہ پوچھتا۔

اندر چلو صوفے پر بیٹھو۔

تمہارا صوفہ ان سیڑھیوں سے زیادہ صاف نہیں ہے۔

چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں' وہ بے نیازی سے کہتا۔ اور ہم باہر نکل جاتے۔ آوارہ گردی کرتے۔ میں اس سے الٹے سیدھے سوال کرتا رہتا۔

کیا اب بھی لڑکیاں تمہارے سٹوڈیو میں آتی ہیں' میں پوچھتا۔

بہت آتی ہیں۔

خود کو تھالی پر سجا کر لاتی ہیں۔

ہاں' باقاعدہ آرتی بنا کر۔

اور تم دیوتا بن کر ان کی بھینٹ قبول کرتے ہو۔

ہاں' کیوں نہ کروں۔

اور تمہاری بیوی جلتی ہو گی۔

ہاں جلتی ہے۔

پھر ——————

پھر کیا' یہ بیویاں جب تک تمہاری رہتی ہیں' جب تک انہیں جلائے رکھو۔ ٹھنڈی ہو جائیں تو بات ختم ہو جاتی ہے۔

وہ دن یاد آتے ہیں تمہیں' میں پوچھتا۔

کون سے دن۔

وہ لاہور کے اوپن ایئر تھیٹر کے دن۔

نہیں' اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ وہ بولا اور آرٹسٹ ہمیشہ حال میں جیتا ہے یا مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ ماضی کی دلدل میں لت پت نہیں ہوتا۔

قائداعظمؒ کا بت

پھر جب کراچی میں میرے آخری دن تھے تو ایک روز وہ آ گیا بولا' چلو۔

کہاں' میں نے پوچھا۔

تجھ سے ایک کام ہے۔

کیا۔

میرے ساتھ چل۔

ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

کیا کام ہے' میں نے پوچھا۔

بولا' بتانے کا نہیں' دکھانے کا ہے۔

وہ مجھے ہوا بندر سے دور بیچ پر لے گیا۔ گاڑی سے اتر کر دیر تک ہم چلتے رہے۔ آخر وہ

سمندر میں پھیلی ہوئی چٹانوں کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ بیٹھ جاؤ' وہ بولا۔

وہ دو چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آتے ہیں تجھے' اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

کون سے۔

ایک وہ دور کالا کالا' ابھرا ہوا اور ایک یہ سامنے والا' اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

ہاں میں نے جواب دیا آتے ہیں۔

جب باہر سے سمندری جہاز آتا ہے تو کراچی بندرگاہ کی گودی میں جانے کے لیے ان دونوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔

پھر' میں نے پوچھا۔

میرا جی چاہتا ہے کہ قائداعظم کا مجسمہ بناؤں' ایک ٹانگ اس چٹان پر ہو اور دوسری اس جزیرے پر۔ اتنا بڑا مجسمہ ہو کہ جہاز اس کی ٹانگوں کے نیچے سے گزریں۔

اتنا بڑا بت' میں نے پوچھا۔

ہاں اتنا بڑا۔

کیسے بنائے گا۔

تجھے بنا ہوا نظر آتا ہے۔ وہاں قائد کا سر ہو گا۔ اس پر جناح کیپ ہو گی۔ نیچے کالی اچکن' اس سے نیچے سفید شلوار' چٹی سفید اور نیچے جہاز گزریں گے تجھے نظر آتا ہے کیا۔

اونہوں' میں نے سر نفی میں ہلایا۔

مجھے آتا ہے' وہ بولا' میں آدھی آدھی رات کو اسے دیکھنے کے لیے یہاں آ جاتا ہوں۔ بیٹھا رہتا ہوں۔ دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ میرا آخری کام ہو گا۔ پتہ نہیں کتنے سال لگیں گے' لیکن وہ مجھے کھڑا نظر آتا ہے۔ سیدھا پروقار' عظیم۔

دیر تک ہم دونوں وہاں بیٹھے رہے۔

وہ قائد کو دیکھتا رہا میں آذر کو۔

احمق' میں نے کہا۔ نہ دیکھ خواب۔

اور کیا دیکھوں۔ کچھ ہے اور دیکھنے کو کیا' اس نے پوچھا۔

یہ پاکستان ہے' میں نے کہا یہاں' تجھے کون بت بنانے دے گا۔

بت' وہ بولا۔ بت تو بنا ہوا ہے۔ پہلے سے بنا ہوا ہے۔ میں اسے ذہنوں سے نکال کر پتھر کی شکل دیدوں گا نا' بت تو اس نے بنا دیا ہے۔

کس نے بنا دیا ہے' میں نے پوچھا۔

اللہ نے۔ ہم نے' عوام نے' ہم اسے بھول سکتے ہیں کیا۔ اس نے ہمیں ایک پناہ گاہ دے دی۔ میں تو اس بت کو صرف جسم دوں گا۔ صرف جسم۔

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

میں خاموش ہو گیا۔

وہ بھی خاموش ہو گیا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ بادلوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ ایک بادل تیرتا ہوا آیا۔ اور چٹانوں پر معلق ہو گیا۔

وہ دیکھو ——————— وہ بولا۔ بادل بت بن کر کھڑا ہو گیا ہے ایک ٹانگ ادھر۔ ایک ٹانگ ادھر۔ قائد کھڑا ہے۔ کتنا عزم ہے۔ کتنا وقار ہے۔

خودکشی

احمد بشیر نے کہا دیکھو ممتاز یہ خبر بالکل پکی ہے کہ ولیج ایڈ کا محکمہ توڑ دیا جائے گا۔ آج مجھے منسٹری کے ڈپٹی سیکرٹری نے بلایا تھا' کہنے لگا ولیج ایڈ کو بند کرنے کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔

کیا حفیظ کو پتہ چل گیا ہے' میں نے پوچھا۔

ہاں' وہ بولا۔ وہ شدت سے کوشش کر رہا ہے کہ اسے کوئی اور محکمہ مل جائے۔ وہ سارے دفتر کے لیئے کوشش نہیں کرے گا۔ صرف اپنی ذات کی لیے کوشش کرے گا۔ رہے تم' ڈی ایف پی میں تمہاری پوسٹ موجود ہے۔ تم اپنی پوسٹ پر واپس چلے جاؤ گے۔ مجھے بھی وہ پرووآئڈ کرنے پر مجبور ہیں' چونکہ میں پبلک سروس کمشن کا سلیکٹی ہوں۔ انشاء مارا گیا۔ اسمبلی میں اس کی پوسٹ کنٹریکٹ پر تھی۔ تم شہاب سے ملو اسے کہو کہ انشاء کے لئے کچھ کرے۔ مجھے انشاء کا بہت فکر ہے۔

میں نے کہا' بھائی میرے میں نے انشاء سے پوچھا تھا۔ اس نے بے پرواہی سے کہا' ٹھیک

ہے' اپنا لیا ہے یہاں سے اڑایا وہاں جا بیٹھا۔

تم انشاء کو نہیں جانتے' وہ بولا۔

جانتا ہوں' میں نے کہا' وہ ایک کنفیوزڈ آدمی ہے۔ کبھی آن ہو جاتا ہے۔ کبھی آف۔ جلتا بجھتا رہتا ہے۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ یہ بجھ کیوں جاتا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ تو ازلی طور پر بجھا ہوا ہے۔ اب میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ جلتا کیسے ہے۔

احمد بشیر کہنے لگا' وہ بڑا پیارا آدمی ہے۔ خاموش محبت کرنے والا ہے۔ ابن انشاء بہت بڑا فنکار ہے۔ سفر میں ہے۔ اندھیرے اجالے جدا نہیں ہوئے۔ لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ خود کشی نہ کر لے۔

کیوں' میں نے پوچھا' کیا محبت کی ناکامی کی وجہ سے۔

محبت کا مارا ہوا تو ہے' وہ بولا۔ وصل کا متمنی نہیں۔ ملاپ سے خوف زدہ ہے۔ محبت میں اس کی منزل محرومیت ہے۔

تو پھر خود کشی کیوں' میں نے پوچھا۔

خود کشی کی خواہش اس کی ہڈی میں رچی ہوئی ہے۔ جس طرح ہینگ میں بُو رچی ہوتی ہے۔ وہ کئی ایک بار خود کشی کی کوشش کر چکا ہے۔

جب پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ اس پر خود کشی کے دورے پڑتے ہیں تو میں نے اسے تسلی دی۔ میں نے کہا' یہ خواہش تو ہر تخلیق کار میں ابھرتی ہے۔ مجھ کو بھی دورے پڑے ہیں۔ یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ خود کشی کرنے میں کوئی حرج نہیں' البتہ سوچ سمجھ کر کرنی چاہیئے۔ اس لیے جب بھی تم پر دورہ پڑے میرے پاس آ جایا کرو۔ میرے پاس خود کشی کے سب انتظامات موجود ہیں۔

تو کیا وہ تمہارے پاس آیا کبھی' میں نے پوچھا۔

تین بار آدھی رات کے وقت میرے گھر کا دروازہ بجا۔ دیکھا تو انشاء جی کھڑے ہیں' ہوائیاں اڑی ہوئی ہیں۔

پھر تو نے کیا کیا' میں نے پوچھا۔

میں اسے لے کر باہر نکل گیا اور اسے خود کشی کے طریق کار بتاتا رہا۔ حتیٰ کہ دن نکل آیا

اور اس کا دورہ مدھم پڑھ گیا۔

یہ سن کر میں ہنسنے لگا۔

احمد بشیر سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا' اگر میری پوسٹنگ کراچی سے باہر ہو گئی تو انشاء کو کون سنبھالے گا۔ تم سے ابھی وہ پوری طرح سے بے تکلف نہیں ہوا۔ وہ دل کی بات کسی سے نہیں کرتا۔

میرا بھی تو کچھ پتہ نہیں' میں نے کہا۔ شاید میں کراچی سے چلا جاؤں۔ مجھے ڈی ایف پی کے لوگ پسند نہیں ہیں۔ ڈائریکٹر راجہ اندر بن کر بیٹھا رہتا ہے۔ پھر فلم کا انچارج ہے' وہ غنڈہ ہے' بدتمیز ہے۔

تو تو نے شہاب سے بات کی' احمد بشیر نے کہا۔

نہیں ابھی نہیں۔ شہاب مجھے لاہور بھیجنے کی سوچ رہا ہے لیکن بھائی جان کہہ رہے ہیں کہ مفتی کو واپس پنڈی آنا ہو گا۔

بھائی جان اور بابا والا معاملہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا' احمد بشیر نے کہا' یہ تم جانو۔ لیکن انشاء کے لیے ضرور کچھ کرنا چاہیے۔

مخمصہ

گھر آیا تو قیصر میرا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا دیکھو ممتاز' ولیج ایڈ ختم ہو گیا تو تو اپنی پوسٹ پر رپورٹ ہو جائے گا نا' ڈی ایف پی میں۔ شاید شہاب تجھے اپنے ساتھ پنڈی لے جانے کی کوشش کرے۔ اس کے ساتھ بالکل نہ جانا۔

قیصر سے میرا مسلسل جھگڑا تھا۔ میں کہتا قیصر' یہ زندگی نہیں ہے جو تو بسر کر رہا ہے۔ سارا دن کافی ہاؤس میں بیٹھا کافی کے پیالے اور سگریٹ پیتا رہتا ہے اور رات کے بارہ ایک بجے گھر جا کر چارپائی پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔

میں اسے کہا کرتا تھا' تو اپنا گھر بنا۔ آرام سے اس گھر میں رہ۔ باوقار انداز سے زندگی بسر کر۔ وہ میری بات نہیں مانتا تھا۔ کہتا' یہ نہیں ہو سکتا۔

میں بار بار پوچھتا کہ کیوں نہیں ہو سکتا۔

تو وہ جواب دیتا' بس نہیں ہو سکتا۔

میرے بار بار پوچھنے سے وہ زچ ہو گیا تھا' اس لیے اس روز غصے میں بولا' کہا جو ہے کہ نہیں ہو سکتا۔ میں کہہ رہا ہوں۔ تم نہ جاؤ۔ تم چلے گئے تو میں واپس کافی ہاؤس میں چلا جاؤں گا۔ وہاں سے مجھے کوئی نکال نہیں سکے گا۔ مجھے وہاں جانے پر مجبور نہ کرو۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

شہاب کی جانب ہم سب کا رویہ مختلف تھا۔ حفیظ کو شہاب کے خلاف سخت گلہ تھا کہ وہ صدر کے قریب ہونے کے باوجود حفیظ کی مدد نہیں کر رہا تھا۔

ابن انشاء کو شہاب کی ذات سے لگاؤ تھا۔ شہاب کا نام سن کر وہ کھل اٹھتا تھا۔ جب بھی موقعہ ملتا وہ بڑے شوق سے شہاب سے جا کر ملتا۔ لیکن ملاقات کے دوران اس نے کبھی اپنی بات نہ کی تھی۔

احمد بشیر' شہاب سے بے نیاز رہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شہاب ایک اچھا آدمی ہے۔ ہمدرد ہے۔ مخلص ہے' اس کے علاوہ اس نے شہاب کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔

قیصر' شہاب کے خلاف تھا اور میرے دل میں بھی شکوک ڈالتا رہتا تھا۔

اشفاق احمد جب بھی کراچی آتا تو شہاب کے ہاں ٹھہرتا تھا۔ اس کے تعلقات شہاب سے مختلف نوعیت کے تھے۔ زیادہ گہرے تھے' زیادہ قریبی تھے' اور یہ بات تھی بھی درست چونکہ وہ دونوں پرانے دوست تھے۔ لیکن گفتگو میں اشفاق احمد' قدرت سے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ کبھی تو تزاق کا لہجہ اختیار کر لیتا اور کبھی گالی دے کر بات کرتا۔ ایسی بے تکلفی جس کا نہ تو شہاب عادی تھا اور نہ ہی اشفاق احمد۔ اشفاق احمد نے کسی دوسرے دوست سے ایسا رویہ نہ اپنایا تھا۔ اشفاق احمد طبعی طور پر رسمی اخلاق کا قائل تھا۔ وہ اپنے کسی دوست سے لبرٹیز (Liberties) لینے کا عادی نہ تھا۔ شہاب سے اس نوعیت کی بے تکلفی روا رکھنے پر ہم سب حیران ہوا کرتے تھے۔

ن

انہی دنوں مجھے ایک خط موصول ہوا۔ یہ ایک منفرد خط تھا۔ ویسے اس قسم کے خط مجھے کبھی کبھار موصول ہوتے رہتے تھے' جن میں اظہار عقیدت ہوتا تھا۔

ویسے تو یہ بھی ایک ادبی فین کا خط تھا' لیکن اس کا انداز قطعی طور پر مختلف تھا۔ لکھا تھا۔

ہم آپ کو جانتے ہیں۔ ہم آپ کی تصنیفات کے قاری ہیں۔ ہمیں آپ کی تحریر کا انداز پسند ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم آپ سے ملاقات کریں اور آپ سے تبادلہ خیال کریں۔ امید ہے آپ ہم سے تعاون کریں گے۔

اگلے اتوار کو گیارہ بجے آپ صدر کے مرکزی پارک میں تشریف لائیں۔ یہ مرکزی پارک صدر کے چوک میں واقعہ ہے' جس کے مرکز میں فوارہ ہے۔ اس پارک میں کئی ایک بنچیں پڑیں ہیں۔ پارک کے صدر دروازے گیٹ کے قریب جو بنچ ہے اس کے اوپر ایک درخت استادہ ہے۔ یہ واحد بنچ ہے جس پر دوپہر کے وقت سایہ ہوتا ہے۔ آپ اس بنچ پر تشریف رکھیں۔ گیارہ بجے ہمارا ڈرائیور آئے گا۔ آپ سے ملے گا۔ آپ گاڑی میں بیٹھ جائیے گا۔ وہ آپ کو ہمارے گھر لے آئے گا۔ گھر میں میرے میاں' میں اور ہمارے دو نوجوان بچے ہیں۔ آپ سے مل کر ہم سب خوش ہوں گے۔

دوپہر کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے' پھر ہمارا ڈرائیور آپ کو صدر میں اسی مقام پر چھوڑ آئے گا امید ہے آپ ضرور تشریف لائیں گے۔

ملاقات کی خواہاں

"ن"

اس خط کو پڑھ کر میں بہت حیران ہوا۔ نہ تو یہ خط جذباتی تھا' نہ تعریفی تھا۔ ساری بات انوکھی تھی' پر اسرار تھی۔ یوں جیسے مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن کا کوئی ورق ہو' چھ سات دن میں اس خط کو جیب میں ڈالے سوچتا رہا۔ بلا بھی رہی ہیں۔ چوری نہیں اعلانیہ' میاں وہاں موجود ہوں گے اور یہ بات وضاحت سے بتا رہی ہے کہ بچے نوجوان ہیں۔ اپنی عمر پر پردہ نہیں ڈال رہی۔ ظاہر ہے کہ عمر رسیدہ ہے۔

کئی ایک بار مجھے خیال آیا کہ جا کر شہاب کو یہ خط دکھاؤں' اس سے پوچھوں کہ بتاؤں کہ نہ جاؤں۔

مجھے علم تھا کہ خط پڑھ کر قدرت کی آنکھ میں چمک لہرائے گی اور وہ مسکرا کر کہے گا' یہ کیا پوچھنے کی بات ہے جاؤ ضرور جاؤ۔ ایسے مواقع کیا روز روز ملتے ہیں۔ وہاں جا کر محترمہ سے کہنا میرے ایک دوست ہیں کیو یو ایس۔ وہ بھی لکھتے ہیں۔ ایسا اچھا تو نہیں لکھتے۔ جیسا میں لکھتا ہوں۔ بہر حال لکھتے ہیں۔ انہیں بھی پڑھیے۔ شاید آپ انہیں انڈر کنسڈریشن رکھنا پسند کریں۔

میل اپیل

قدرت ایسی باتیں کرنا پسند کرتا تھا' لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ دکھلاوے کی باتیں ہیں کیونکہ جب بھی کوئی خاتون اسے ملنے کے لیے آتی تھی' تو وہ پتھر بن کر بیٹھ جاتا تھا۔

حالانکہ قدرت میں کوئی خصوصی "میل اپیل" نہ تھی پھر بھی لڑکیاں اور خواتین اس کی جانب کھچی آتی تھیں۔

پہلے تو میں سمجھا کہ خواتین کا التفات اس کے عہدے کی وجہ سے ہے۔ پھر جب میں نے فارنر لڑکیوں کو اس کی جانب کھنچے جاتے دیکھا' تو میں سوچ میں پڑ گیا' یا اللہ یہ کیا بھید ہے۔

ایک دن میں نے شہاب سے پوچھا کہ' لڑکیاں اور خواتین آپ کی جانب کھنچی آتی ہیں۔

اچھا' وہ بولا۔ کیا واقعی کھنچی آتی ہیں۔

بالکل' میں نے کہا۔

وہ مسکرایا بولا' آپ کو اس کی کوئی وجہ نظر آتی ہے۔

میں نے سر نفی میں ہلا دیا۔ آپ میں بظاہر کوئی میل اپیل نہیں ہے۔

میرا بھی یہی خیال ہے' وہ بولا۔

میل اپیل ہوتی تو جسم میں ہے' انداز میں ہے' لیکن اظہار آنکھ سے ہوتا ہے' نگاہ سے۔ آپ کو میں نے کبھی گلیڈ آئی چمکاتے نہیں دیکھا۔

مجھے چمکانی چاہئے کیا۔ وہ بولا۔

اس کے روبرو اپنا جنس سے متعلق علم جھاڑنے کا غالباً وہ میرا پہلا موقعہ تھا۔

میں نے کہا' گلیڈ آئی ارادے سے نہیں چمکائی جاتی۔ ارادے سے چمکائی جائے تو غنڈہ پن کا اظہار ہوتا ہے۔ خود بخود جانے بوجھے بغیر چمک جاتی ہے۔

وہ غور سے میری بات سن رہا تھا۔

مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ میں مقناطیسی طاقت کہاں ہے' میں نے کہا۔

مجھے بھی سمجھ میں نہیں آیا' وہ بولا۔ لیکن ارد گرد بیٹس پھڑپھڑاتی رہتی ہیں۔

بیٹس کیا' میں نے پوچھا۔

چمگادڑیں' وہ بولا' میں انہیں بیٹس کہا کرتا ہوں۔

کیا آپ خود انہیں حرکت میں لاتے ہیں' میں نے پوچھا۔

نہیں' وہ بولا' التراما" نہیں۔ غیر ارادی طور پر شاید۔ مثلاً پچھلے سال میں نے پکا ارادہ کیا تھا کہ اب کی بار خالی روزے نہیں رکھوں گا۔ بلکہ ساتھ تراویاں بھی پڑھوں گا۔ ہمارے گھر کے پاس ہی ایک مسجد ہے وہاں۔

فرانسیسی چمگادڑ

پہلے دن ہی دفتر کے کام میں ایسا الجھا کہ لیٹ ہو گیا۔ پھر جو یاد آیا تو بھاگا۔ راستے میں پٹرول ڈلوانے کے لیے رکا۔ پمپ پر پہلے ہی ایک گاڑی لگی ہوئی تھی۔ اس میں ایک فرانسیسی خاتون بیٹھی تھی۔

اس نے میری طرف دیکھا بولی' معلوم ہوتا ہے آپ جلدی میں ہیں۔ چلیئے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔ آپ کی گاڑی یہیں رہے گی۔ بعد میں آکر لے لیجیئے گا۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر آئی۔ اس نے میرے لیے دروازہ کھولا اور پھر کچھ اس طرح سے "آیئے نا" کہا کہ میں اپنی گاڑی چھوڑ کر اس کی گاڑی میں جا بیٹھا۔

کہنے لگی' آپ کا نام کیا ہے؟

میں نے کہا' میں بے نام ہوں۔

بولی' آپ کو جلدی ہے نا۔

میں نے کہا' ہاں بڑی جلدی ہے۔

ضروری کام ہے کیا۔

بہت ضروری۔

اسے کل پر نہیں ٹالا جا سکتا کیا۔

قطعی نہیں۔

تو پھر بتائیے' میں آپ کو کہاں ڈراپ کروں۔

مجھے یاد نہیں رہا کہ کہاں جانا ہے مجھے۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ میں نے کہا آپ سے ملنے سے پہلے مجھے پتہ تھا کہ کہاں جانا ہے' فوراً وہاں پہنچنا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔ لیکن آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر سب بھول گیا ہوں۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ آپ کیا چیز ہیں۔

میں نے کہا' مجھے خود آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا چیز ہوں۔

پھر' میں نے شہاب سے پوچھا۔

پھر کیا' وہ بولا' اگلے روز وہ میرے دفتر میں آ گئی۔ پھر روز دفتر آنے لگی۔ تراویوں کا سارا پروگرام فسخ ہو گیا۔ روز شام کو وہ آ جاتی اور ہم کراچی میں گھومتے پھرتے' جگہیں دیکھتے۔ اس سال بھی روزے سوکھے ہی رہے' تراویوں کے بغیر۔

لیکن اسے آپ کا پتہ کیسے چلا۔ دفتر کیسے پہنچ گئی وہ' میں نے شہاب سے پوچھا۔

ہوا یوں' وہ بولا کہ اگلے دن جب میں صدر گھر سے باہر نکلا تو دروازے پر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ چلا کر بولی' آپ میری گاڑی میں آئیں گے یا میں آپ کی گاڑی میں آ جاؤں' میں اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

میں نے کہا' آپ نے میرا پتہ کیسے لگایا۔

کہنے لگی' گاڑی کا نمبر میں نے دیکھ لیا تھا۔ پٹرول پمپ سے پوچھا۔ وہ بولے۔ اس گاڑی کا ہمارے پاس اکاؤنٹ نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں نہیں پتہ۔ پھر میں رجسٹریشن والوں کے پاس گئی' انہوں نے دو گھنٹے سر کھپائی کر کے بتایا کہ یہ گاڑی کیو یو شہاب کی ہے جو صدر گھر میں نوکر ہیں۔ اس لیے میں یہاں چلی آئی۔

شہاب صاحب یہ بتائیے' میں نے اسے پوچھا' آپ بیٹس کو "ریزسٹ" کیوں نہیں کرتے۔

نہیں کر سکتا' وہ بولا' مجھے اچھی لگتی ہیں ۔ دراصل یہ مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ میں انہیں انٹرٹین نہیں کرتا' ڈیزائر نہیں کرتا' لیکن ریزسٹ بھی نہیں کر سکتا۔

اس معاملے میں میرا مسئلہ قطعی طور پر مختلف تھا۔ میں انہیں ڈیزائر کرتا تھا' انہیں انٹرٹین کرتا تھا۔ انہیں ریزسٹ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ ن سے ملاقات کے کوائف شہاب کو بتاؤں گا۔ دیکھوں کیا کہتا ہے۔

ملاقات

عین اس وقت شہاب کا فون آ گیا۔

میں نے کہا' جناب والا مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ اس نے کہا' ہم راولپنڈی جا رہے ہیں' مستقل طور پر جا رہے ہیں' ملنے کا وقت نہیں ہے۔ میں آپ کو آٹھ دن کے لیے سرکاری طور پر پنڈی بلاؤں گا۔ آپ آ جائیے گا۔ وہاں بات کریں گے۔ اس کے بعد محترمہ ن کی کسی اور سے بات کرنا ممکن نہ رہا۔

اتوار کو گیارہ سے بہت پہلے' میں معینہ مقام پر جا بیٹھا۔ گیارہ بجے کے قریب ایک لمبی سی کالی گاڑی پارک کے گیٹ پر آ رکی۔ ایک باوردی ڈرائیور باہر نکلا۔ میرے قریب آیا۔ بولا' معافی چاہتا ہوں آپ کا اسم گرامی۔

میں نے کہا۔ ممتاز مفتی۔

بولا' تشریف لائیے۔

ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ دیر تک گاڑی چلتی رہی۔ میں ان علاقوں سے قطعی طور پر واقف نہ تھا۔ ایک فراخ گلی میں وہ ایک بنگلے میں داخل ہو گئی۔

ڈرائیور نے گھنٹی بجائی دروازہ کھلا۔

درمیان میں محترمہ کھڑی تھی' دائیں ہاتھ بیٹا' بائیں ہاتھ بیٹی۔ انہوں نے جھک کر آداب کیا اور پھر مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔

محترمہ کا قد چھوٹا تھا۔ بناؤ سنگار سے بے نیاز۔ سادہ لباس ظاہر تھا کہ چٹ کپڑی ہیں۔ چہرے پر متمدن نقوش تھے۔ انداز سے ظاہر تھا کہ پڑھی لکھی ہیں اور باقی وقار ہی وقار۔ لباس اور

انداز میں چمک نہیں تھی۔ توجہ طلبی سے بے نیاز' پر اعتماد۔

آپ کی نوازش ہے کہ آپ تشریف لائے' وہ بولی' بیٹھیے میرے میاں ابھی آتے ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ میں نظریں گاڑ کر اس کی جانب دیکھتا رہا۔ وہ پروقار انداز سے نظریں نیچی کیے بیٹھی رہی۔ میرے یوں احمقانہ طور پر دیکھنے کا اس نے نوٹس نہ لیا۔

میں نے محسوس کیا جیسے اس بے نیاز انداز کے پیچھے ایک ہیجانی کیفیت لہریں لے رہی تھی۔ محترمہ کا ضبط قابل داد تھا۔

پھر ان کے میاں آ گئے۔ ایک ادھیڑ عمر کا کلچرڈ آدمی اور ہم باتوں میں مصروف ہو گئے۔

کھانے کے بعد جب میں رخصت ہوا تو وہ پھر دروازے میں آ کھڑی ہوئیں۔ بولی' آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آپ کا آنا کتنے دیرپا اثرات مرتب کرے گا۔

دیرپا اثرات

آٹھ دن کے بعد مجھے اس کا ایک خط ملا۔ لکھا تھا امکان غالب ہے کہ آپ اس ملاقات پر حیرت زدہ ہونگے۔اس خط میں میں آپ کو صورت حالات سے مطلع کر رہی ہوں۔

میں نے اپنے میاں سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کو اکیلے میں نہیں ملوں گی۔ آپ کو اپنا نام اور پتہ فراہم نہیں کروں گی۔ از راہِ کرم آپ مجھے خط لکھنے کی کوشش نہ کریں' نہ ہی کبھی مجھے فون کریں۔ میں خود آپ کو فون کروں گی اور کرتی رہوں گی۔ خط بھی لکھوں گی' لکھتی رہوں گی۔

از راہ کرم ان پابندیوں کا برا نہ مانیں' میری خاطر۔ ان پابندیوں کو تسلیم نہ کرتی تو آپ سے ملاقات ممکن نہ ہوتی۔ اب مجھ پر لازم ہے۔ کہ ان کا پالن کروں۔

مجھے افسوس ہے کہ اس روز آپ سے بات نہ ہو سکی لیکن کوئی بات نہیں۔ میں آپ کی باتوں سے واقف ہوں۔ چونکہ آپ کی ہر چیز ڈھونڈ کر پڑھتی ہوں۔ بہت سی باتوں میں ہم دونوں ہم خیال ہیں۔ اور یہ بات میرے لیے باعث خوشی ہے۔

آپ کی دوست

"ن"

جنّ

اس خط نے میرے ذہن کو انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دیا۔ یہ خاتون کیا چیز ہے۔ اتنا جذبہ اور پھر اس قدر ضبط۔

ہمارا رابطہ ۳۵ سال قائم رہا' آج تک قائم ہے۔

سال دو سال میں اس کا ایک خط اور ایک فون ضرور آتا ہے۔ اس عرصہ میں ہم نے بیسیوں مکان بدلے۔ کئی بار فون کا نمبر بدلا۔ لیکن اس کے خط پر ہمیشہ صحیح پتہ لکھا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ جیسے ہماری ہر نقل و حرکت کا اسے پورے طور علم ہوتا ہے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ میں لاہور گیا ہوتا اور اس کا فون وہاں آجاتا۔

میں اس سے پوچھا کرتا تھا کہ' تجھے کیسے پتہ چلا کہ میں لاہور آیا ہوا ہوں۔

اس نے جواب میں کہا' ہم آپ کے بارے میں ہر تفصیل کا پتہ حاصل کرتے ہیں۔

کیسے حاصل کرتی ہو۔

ہم اپنے سارے وسائل داؤ پر لگانا جانتے ہیں۔

میں نے چڑ کر کہا۔ تو خاتون ہے یا جن ہے۔

ہم دونوں ہیں' وہ جواب دیتی۔ آپ کو علم نہیں' جن کا صیغہ مذکر نہیں مونث ہے۔

تو مجھ سے ملتی کیوں نہیں' میں پوچھتا۔

پھر کہیے' وہ ہنستی

میں پھر اپنی بات دہراتا۔

پھر کہیے' وہ پھر ہنستی۔ پھر دفعتاً" سنجیدہ ہو جاتی۔ اچھا ہی ہوا کہ ہمارے ملنے کی راہیں مسدود ہو گئیں ورنہ۔

ورنہ کیا' میں پوچھتا۔

ورنہ کیا پتہ ہم کس راستے پر چل پڑتے' یہ کہہ کر وہ چونگا رکھ دیتی۔

بوند بوند بیتی

۳۵ سال کے طویل عرصے کے دوران میں صرف ایک بار اس نے ایک فرمائش کی تھی۔

کہنے لگی، ہم پر ایک کہانی لکھ دیجئے۔

کیا لکھوں، میں نے پوچھا۔

کچھ بھی لکھ دیجئے، وہ بولی۔

میں تو تمہارا نام بھی نہیں جانتا، میں نے کہا۔

مجھے تو جانتے ہیں نا۔ وہ بولی۔

اسے جاننا کہتے ہیں کیا، میں نے کہا۔

آپ جاننا سمجھیں یا نہ سمجھیں میں تو سمجھتی ہوں نا۔ پردہ پڑا رہنے دیجئے، وہ بولی، پردے چاک کرنے سے کہانی نہیں بنتی۔

تو کیا لکھوں، میں نے پوچھا، لکھنے کو کچھ ہو بھی۔

بہت کچھ ہے۔ بہت کچھ۔ صرف محسوسات ہی تحریر میں رنگ بھرتے ہیں نا، یہ کہہ کر اس نے چونگا رکھ دیا۔

چند ایک دنوں کے بعد اس نے پھر فون کیا بولی۔ آپ نے وہ آپ بیتی لکھی۔

نہیں، میں نے جواب دیا۔

تو لکھیے نا، وہ بولی۔ دیکھئے ہر کہانی کا ایک انجام ہوتا ہے، اس کہانی کا بھی انجام ہو جائے۔

انجام کیوں ہو چلنے دو اسے۔

چلتی تو رہے گی۔ ہم نے کبھی کوئی تحریک نہیں چلائی جس میں رک جانے کا خدشہ ہو۔ آپ لکھیے، جلدی لکھیے۔

آپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ شائع ہو گئی ہے۔

ہم خبر رکھتے ہیں۔ کراچی کے کسی پرچے میں چھپوایئے گا۔

میں نے ایک کہانی لکھی۔ عنوان تھا "بوند بوند بیتی"۔[1]

میں مطمئن نہ ہوا۔ ایسے لگا جیسے خالی ڈبہ ہو۔ کہانی صرف عنوان میں تھی۔ متن سوکھا کاٹھ

۱۔ بوند بوند بیتی میرے افسانوں کے آٹھویں مجموعے "کہی نہ جائے" میں شامل ہے۔

تھا۔ میں اسے شہاب کے پاس لے گیا۔ یہ ۱۹۸۳ء کی بات ہے۔

یہ کیا چیز ہے' اس نے پوچھا۔

پتہ نہیں' میں بولا' آپ سے پوچھنے آیا ہوں' اسے پڑھ لیجئے گا' میں پھر آؤں گا۔

اگلے روز میں پھر گیا' بولا بند بند ہے' کھلتی نہیں۔ عنوان کہتا ہے کھلے گی۔ بھیگ ہی بھیگ ہو گی۔ بوندیاں پڑیں گی۔ وہ کیا بول آپ نے دیا ہے اس بیتی میں۔

وہ ہے' بڑی بڑی۔ بوندن

برسے مینہ ہروا

بوندیں تو ہیں' وہ بولا' لیکن مینہ نہیں برسا۔

میں نے کہا ٹھہریئے' اس کہانی کی وجہ تسمیہ سن لیجئے پھر بات کیجئے۔

میں نے محترمہ "ن" کی ساری کہانی سنا دی۔

فورسز بی یانڈ

سن کر بولا' بڑی انوکھی بات ہے۔ ایسا کبھی ہوتا نہیں۔

میں نے کہا' ہاں بڑی انہونی بات ہے۔

قدرت بولا۔ جب انہونی ہوتی ہے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے ہوئی نہ ہو' کروائی گئی ہو۔

میں نہیں سمجھا' میں نے جواب دیا۔

جیسے فورسز بی یونڈ کا ہاتھ ہو۔

فورسز بی یونڈ کا کیا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

شاید ہو' وہ بولا۔ کوئی مقصد ہو۔

مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

شاید آپ کو سکھانا مقصود ہو۔

کیا سکھانا۔

کہ محبت کیسے کی جاتی ہے۔

ان دنوں مجھے علم نہ ہوا تھا کہ شہاب کے گرد جو بیننس منڈلاتی تھیں' وہ خود نہیں آتی

تھیں بلکہ بھیجی جاتی تھیں۔ فورسز بی یانڈ کا مقصد آزمائش تھا۔ اور شہاب نے اس چیلنج کو قبول کر رکھا تھا۔ وہ بیئنس سے انرجی حاصل کرتا اور دوسری جانب موڑ دیتا تھا۔

بتیسواں باب

دربار

ایک روز جب میں دفتر میں پہنچا تو پتہ چلا کہ حفیظ صاحب کئی بار پوچھ چکے ہیں۔

میں سمجھا کوئی ڈی او لکھنا ہو گا۔

پھر جو سر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو حفیظ صاحب دروازے میں کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں ایک کاغذ ہے۔

میں گھبرا گیا۔ کام ہوتا تو حفیظ صاحب مجھے بلوا لیا کرتے تھے' یہ کیسا کام ہے کہ خود چل کر میرے کمرے میں آئے ہیں۔

انہوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں ہونٹوں پر انگلی رکھی اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور زیر لبی میں کہنے لگے' کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ بتاؤ گے تو سب اپنی اپنی کتھا سنائیں گے۔ ہر کوئی اپنی بات کرے گا۔ میں نے سارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ سیکرٹری ٹو پریذیڈنٹ کے تحت ایک پراپیگنڈا یونٹ بنا دیں جو میرے ماتحت کام کرے۔ میں خود عملہ چن لوں گا۔

میں سمجھا نہیں' میں نے کہا۔

کہنے لگے' شہاب نے آپ کو کسی کام کے لیے آٹھ دن کے لیے پنڈی بلایا ہے۔ آپ کسی کو بتائے بغیر فی الفور پنڈی چلے جائیں۔ وہاں قدرت اللہ شہاب کو میرا پروپوزل دے دیں۔ میں نے سب تفصیلات لکھ دی ہیں۔ اسے کہیں کہ یہ کام ضرور کرنا ہے۔

ہلال اور ستارہ

راولپنڈی پہنچ کر میں سیدھا راجہ شفیع کے پاس گیا۔

راجہ شفیع میرا واحد دوست تھا جس سے میں دل کی بات کر سکتا تھا۔

راجہ شفیع لمبا چہرہ لیے بیٹھا تھا۔

کیوں کیا ہوا' میں نے پوچھا۔

سب گڑ بڑ ہو گیا ہے' وہ بولا۔

ہوا کیا' میں نے پوچھا۔

ایسا لگتا ہے جیسے بھائی جان' وہ بھائی جان نہیں رہے جو پہلے ہوا کرتے تھے' راجہ نے کہا۔

کیا کہتے ہیں' میں نے پوچھا۔

آجکل بہت خوش ہیں۔ صبح شام ستارہ کی تعریفیں ہوتی ہیں۔ پنڈی کو دارالخلافہ بنائے جانے پر بہت خوش ہیں۔ سارا کریڈٹ ستارہ کو دیتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ جناب دفتروں میں سبھی لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک عارضی اقدام ہے' چار ایک مہینے کے بعد کیپیٹل پھر سے کراچی منتقل ہو جائے گا۔

کیا واقعی لوگ یہ کہتے ہیں' میں نے پوچھا۔

ہاں سب یک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں' وہ بولا۔

اس پر بھائی جان کیا کہتے ہیں۔

وہ مسکراتے ہیں کہتے ہیں۔ لوگوں کو نہیں پتہ۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ تو پروگرام کی پہلی شق تھی۔ اسے کون روک سکتا تھا۔ لیکن کریڈٹ ستارہ کو جاتا ہے۔ اور اب تو یہ پتھر کی لکیر ہو گئی ہے۔

تو تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو' میں نے پوچھا۔

بھائی جان ہم سے تو بات ہی نہیں کرتے۔ ہماری جانب توجہ ہی نہیں دیتے۔ میں سوچتا ہوں کہ ستارہ سے ملے بغیر یہ کیفیت ہے تو ملنے کے بعد کیا ہو گا۔

ہم دونوں کو بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ستارہ کو اتنی اہمیت کیوں دی جا رہی تھی۔

پہلے میرا خیال تھا کہ یہ اہمیت حوالے کی ہے۔ در حقیقت صدر صاحب کو اہمیت دی جا رہی ہے اور چونکہ صدر صاحب تک پہنچنے کے لیے توسط ضروری ہے' اس لیے ستارہ کو اہمیت دی جا رہی ہے۔

یہ مفروضہ بہت جلد دم توڑ گیا۔ چونکہ بھائی جان اکثر کہا کرتے تھے کہ ہلال کا کیا ہے وہ تو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس ستارہ میں قیام ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مرد قلندر کا ایک خصوصی پروگرام ہے جو اسلام کے نشاۃ ثانیہ سے متعلق ہے بھائی جان کہا کرتے تھے' سرکار قبلہ کا پروگرام عمل میں آ کے رہے گا۔

بحیثیت سیکرٹری ستارہ کے اس پروگرام میں شامل ہونے کی افادیت تو سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن انفرادی حیثیت میں ستارہ کیا کر سکتا تھا۔

لیکن اس روز کراچی میں چھلکن کی کیفیت میں قدرت کی باتیں سن کر مجھے شک پڑنے لگا تھا کہ قدرت وہ نہیں ہے جو بظاہر دکھائی دیتا ہے' وہ کچھ اور ہے۔ اس کی کوئی ذاتی حیثیت بھی ہے' لیکن شک ابھی ڈانواں ڈول تھا۔ اس نے یقین کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔

راجہ سے ملنے کے بعد میں قدرت سے جا کر ملا۔ قدرت ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔

لیجیے میں آ گیا' فرمایئے مجھے کس لیے بلایا ہے۔

بڑا اچھا کیا آپ آ گئے' وہ بولا۔

کوئی سکرپٹ لکھنا ہے کیا' میں نے پوچھا۔

نہیں وہ بات ختم ہو گئی۔ اب آپ آٹھ دن فرلو پر ہیں۔

کیا بات تھی جو ختم ہو گئی۔

اشفاق نے ہفت روزہ لیل و نہار کا چارج لے لیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ "امروز" لاہور میں ——— لیکن میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ آپ کے بھائی جان آپ کو راولپنڈی میں لانا چاہتے ہیں۔

خواب

آپ بھائی جان سے ملے ہیں کیا' میں نے پوچھا۔

نہیں ابھی نہیں، وہ بولا۔

پھر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میری تعیناتی پنڈی میں ہو۔

رات میں نے خواب میں انہیں دیکھا تھا، گلہ کر رہے تھی کہ ابھی تک آپ کو یہاں کیوں نہیں بلایا۔

آپ خوابوں کو مانتے ہیں کیا؟ میں نے پوچھا۔

ہاں کچھ ماننے والی ہوتی ہیں، کچھ نہیں۔ مثلاً میں ایک خواب بار بار دیکھ رہا ہوں۔

بار بار ایک ہی خواب، میں نے پوچھا۔

ہاں، وہ بولا، کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ حیرت کی بات ہے کہ خواب کے کوائف بالکل نہیں بدلتے۔ ایک سے رہتے ہیں، جیسے کاربن کاپی ہو۔ دیکھتا ہوں کہ ہم ہوائی جہاز میں جا رہے ہیں۔ جہاز تھپیڑے کھا رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اب گرا، کہ اب گرا۔ لیکن جلد ہی وہ بخیریت لینڈ کر جاتا ہے۔ اس میں سے صدر ایوب صاحب کی کابینہ کے تمام ارکان باہر نکل آتے ہیں۔ پھر ہم صدر صاحب کو باہر نکالتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں شیشہ توڑنا پڑتا ہے، ہم انہیں کھینچ کر باہر نکالتے ہیں۔

بخیریت، میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں، وہ بولا، اس تفصیل کی وضاحت نہیں ہوتی۔ جہاز سے باہر نکل کر ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ جہاز اڑان کے قابل نہیں ہے۔

پائلٹ اڑانے کی کوشش کرتا ہے اور جہاز کو اڑا کر لے جاتا ہے۔ بس اتنا ہی خواب ہے۔

عجیب خواب ہے، میں نے کہا۔

ہاں، وہ بولا، جب کراچی جیل میں وہ قیدی مجھے ملا تھا۔ سالیسٹری سل والا قیدی، یاد ہے آپ کو، ہاں مجھے یاد ہے۔

اسے میرے اس خواب کا علم تھا۔

اس نے بات کی تھی کیا۔

ہاں اس نے اس خواب کا حوالہ دیا تھا کہنے لگا، اپنا وہ خواب یاد ہے جو تم بار بار دیکھ رہے ہو۔ ہوائی جہاز والا خواب۔ وہ خواب ایک وارننگ ہے کہ تم عبرت حاصل کرو۔

تو کیا آپ نے عبرت حاصل کی، میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا، مجھے بات ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ البتہ جب بھی میں صدر صاحب کے ساتھ ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں تو یہ خواب مجھے یاد آجاتا ہے اور پھر جہاز کو خواہ مخواہ جھٹکے لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ کریش ہوتا نہیں، لیکن خواب کی وجہ سے، میں سمجھتا ہوں کہ اب ہوا کہ اب ہوا۔

دیر تک ہم دونوں اس بات پر ہنستے رہے۔

آپ کو پتہ ہے میں اپنا ہر خواب لکھ لیا کرتا ہوں، میں نے کہا۔

اس کا فائدہ۔ اس نے پوچھا۔

خواب چاہے باہر کی خبر نہ دیں۔ اندر کی خبر تو دیتے ہیں، بہر حال۔

میرے ایک جاننے والے ہیں وہ بولا۔ سات سال ہوئے انہوں نے ایک خواب دیکھنا شروع کیا تھا۔ ابھی تک دیکھ رہے ہیں۔

جاگے نہیں کیا۔

نہیں، وہ بولا۔

کوما میں ہیں کیا؟

نہیں۔ آنکھیں کھلی ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں لیکن جاگے نہیں۔

یہ کیا الف لیلیٰ کی کہانی ہے۔

دنیا میں جگہ جگہ الف لیلوی واقعات ہو رہے ہیں۔ ہم ان کی طرف توجہ نہیں دیتے، اس نے کہا۔

دستار بندی

عین اس وقت فون بجا۔ قدرت نے اٹھایا۔ پھر چونگا مجھے دے کر بولا، آپ کا ہے۔

راجہ شفیع بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ بھائی جان مری سے آئے ہوئے ہیں۔ تم ستارہ سے طے کر لو کہ وہ کب دربار میں آئیں گے۔ تاکہ بھائی جان سے ملاقات ہو جائے۔

کون تھا، قدرت نے پوچھا۔

میں نے کہا' راجہ شفیع ہے کہتا ہے' آپ سے مزار پر آنے کا دن اور وقت طے کرلوں۔

بھائی جان یہاں ہیں' اس نے پوچھا۔

ہاں وہ آج ہی مری سے آئے ہیں۔

تو کل کا دن رکھ لیں۔ کل گیارہ بجے ٹھیک ہے۔ یوں کریں' آپ صبح نو بجے مجھے فون کر لیں۔ کوئی خصوصی مصروفیت نہ نکل آئے ویسے کل مجھے کوئی کام نہیں ہے۔

آپ آئیں گے کیسے' میں نے پوچھا۔

ہاں مجھے راستے کا علم نہیں۔ آپ گیارہ بجے مریٹرپل پر آ جائیں' جہاں اوپر ریل چلتی ہے اور نیچے سڑک ہے گیارہ سے ساڑھے گیارہ تک میرا انتظار کریں۔

اگلے روز صبح نو بجے میں نے صدر گھر فون کیا تو قدرت نے کہا' ایک کام پڑ گیا ہے۔ اگر وہ کام گیارہ بجے تک مکمل ہو گیا تو آجاؤں گا ورنہ میری معذرت کر دیجئے گا۔ بہرحال آپ مریٹرپل پر انتظار کریں۔ اگر پونے بارہ تک نہ پہنچا تو سمجھ لیں کہ نہیں آ سکا۔

اگلے روز میں گیارہ بجے مریٹرپل پر جا کھڑا ہوا۔ بارہ بجے تک انتظار کیا' قدرت نہ آیا۔ وہاں سے میں پیدل مزار پر پہنچا۔

جاتے ہی میں نے بھائی جان سے کہا' جناب وہ نہیں آئے۔ بھائی جان نے میری جانب دیکھا۔ ارے یہ کیا بات ہے' بھائی جان کی آنکھیں اچھلی ہوئی تھیں' ان میں سے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

میں چپ چاپ راجہ شفیع کے پاس بیٹھ گیا۔

راجہ شفیع اور وانی یوں بیٹھے تھے جیسے چوہوں نے پارہ پی رکھا ہے۔

پھر وانی کے ہونٹ میری جانب بڑھے' پر اسرار طریقے سے ہلے' آئے تھے' آئے تھے' وہ بولا۔

کون آئے تھے' میں نے راجہ سے پوچھا۔

وہ وہ وہ' اس نے ہونٹ ہلائے۔

انہیں بتاتے کیوں نہیں' بھائی جان بولے' بھائی جان کی آواز کا سپتک ہی بدلا ہوا تھا' بولے' وہ آئے تھے ستارہ صاحب۔

میرے اندر کے چونک' چنانچہ نے تمسخر بھرا قہقہہ لگایا۔ وہ کیسے آ سکتے تھے۔ راستے میں تو میں کھڑا تھا۔ اور انہیں تو رستہ بھی نہیں آتا تھا۔

وہ آئے تھے' بھائی جان نے دہرایا۔ ملاقات ہو گئی ہے۔ بولے' ہمارا کیا ہے' ہم نے تو بڈھے سے ملانا تھا۔ بھائی جان فضا میں ٹکٹکی باندھے باتیں کرتے جاتے تھے' کسی سے مخاطب نہ تھے۔

سرکار قبلہ تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ پانچ اولیاء کرام تھے۔ انہوں نے ستارہ کی دستار بندی کی۔ ایک منظر تھا' دیکھنے والا منظر۔ شکر ہے ہم اپنے فریضہ سے سبکدوش ہوئے۔ اب ستارہ جانے اور سرکار جانیں لیکن سرکار کا پروگرام عمل میں آکر رہے گا۔ انشاء اللہ۔

اللہ کے فضل سے ایک آفت جو آنے والی تھی' ٹل چکی ہے۔ ہم وحدانی طرز حکومت کے حق میں ہیں۔ بھائی جان خود کلامی کر رہے تھے۔

جمہوریت بے معنی ہے۔ شاہ' ایران کی جانب سے آئیں گے۔ دو بلاک ہوں گے۔ تصادم ہو گا۔ ہم اس روز کے منتظر ہیں۔ ہم تو چاکر ہیں۔ حکم ہے کہ تلوار ہاتھ میں تھامے رکھو۔ سر کٹوانے کے لیے تیار رہو۔ یہی ہمارا مسلک ہے۔ ایک ساعت کے لیے وہ خاموش ہو گئے' پھر بولے' ستارہ زیر تربیت ہیں۔

پتہ نہیں اس روز بھائی جان کو کیا ہوا تھا۔ وہ فضا میں ٹکٹکی باندھے بولے جا رہے تھے۔

نہیں یہ نہیں ہو سکتا

میں اپنے ہی چکر میں گھمن گھیری کھا رہا تھا۔ وہ کیسے آ سکتے تھے۔ راستے میں تو میں کھڑا تھا اور انہیں رستے کا علم نہ تھا۔

اس روز دانی اور راجہ دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے کسی میں جرأت نہ تھی کہ بھائی جان کی باتوں کو ٹوکے بھائی جان اسی روز مری واپس چلے گئے۔ میں نے دانی اور راجہ سے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا۔ وہ کیسے آئے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔

راجہ کہنے لگا' پتہ نہیں کیسے آئے۔ لیکن وہ آئے تھے۔ گاڑی میں آئے تھے۔ یہاں کنویں تک گاڑی لے آئے تھے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قبرستان کے اندر گاڑی لے آنا۔ یہ تو وہی شخص کر سکتا ہے جو مریٹر کی گلیوں سے پورے طور پر واقف ہو۔ لیکن قدرت کو تو راستہ ہی معلوم نہ تھا۔

ایک بار میرے کہنے پر وہ اور اشفاق ریل کی پٹڑی پر چلتے رہے تھے اور انہیں مریٹر کا مضاف نظر ہی نہ آیا تھا۔ اور اب وہ گاڑی لے کر قبرستان کے اندر اس خاص احاطے تک پہنچ گئے' جہاں مرد قلندر کا مزار تھا۔ یہ کیسے ہوا۔ پھر بھائی جان کو اس کیفیت میں ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک ٹھہرے ہوئے باکردار فرد تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ غلو کے حق میں بھی نہ تھے۔ بات بڑھا چڑھا کر نہیں کرتے تھے۔

جب انہوں نے دستار بندی کی بات کی تھی اس وقت وہ بری طرح چھڑے ہوئے تھے۔

میرے دونوں ساتھی راجہ اور والی پیدائشی طور پر ایمانی تھے۔ وہ بات مان لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چونکہ بھائی جان نے کہا تھا' اس لیے بالکل سچ تھا۔ چوں و چرا کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ راجہ شفیع تو بالکل روایتی مرید تھا' وہ سر تسلیم خم کرنے والا تھا۔

ان سے بات کرنا بے کار تھا' اس لیے میں عزیز ملک سے جا ملا۔ عزیز ملک میں غصہ ضرور تھا' طبیعت جلالی تھی لیکن اس کی سوچ بڑی مدلل اور متوازن تھی۔

اس نے بڑی غور سے میری بات سنی۔ کہنے لگا' دستار بندی کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

صبری

کراچی میں حفیظ صاحب بڑی بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں پہنچا تو انہوں نے مجھے کمرے میں بٹھا کر کنڈی لگا دی۔ بولے۔ مفتی ممتاز تو کیا کر کے آیا ہے۔ مجھے ساری بات بتا۔

میں نے کہا حفیظ صاحب میں نے آپ کا پروپوزل شہاب صاحب کو پیش کر دیا تھا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس قسم کا ایک محکمہ بن جائے تو سب کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

پھر کیا کہا اس نے۔

سن کر چپ ہو گئے' سوچ میں پڑ گئے۔

تم نے کہا تھا نا کہ یہ محکمہ حفیظ صاحب کے ماتحت ہو گا۔
وہ تو ظاہر ہے' میں نے کہا۔
ظاہر نہیں۔ اس کی وضاحت کرنی چاہیے تھی۔ بار بار کرنی تھی۔
جی میں نے کی' بار بار کی۔
بات ان کی سمجھ میں آگئی کیا' حفیظ نے پوچھا۔

حفیظ اور جوش

میں حفیظ کو بہت بڑا شاعر مانتا ہوں۔ سبھی مانتے ہیں۔ لیکن لوگ یہ نہیں جانتے کہ ان کی شخصیت ان کی شاعری سے بھی عظیم تر تھی۔ دقت یہ ہے کہ ہم اس بات کو نہیں سمجھتے کہ شخصیت نیک و بد' خیر و شر' مثبت اور منفی سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک عظیم شخصیت اپنی نوعیت میں مثبت بھی ہو۔

میں نے ادبی حلقوں میں دو عظیم شخصیتیں دیکھی ہیں۔ حفیظ صاحب اور جوش صاحب۔ دونوں شخصیتیں بڑی تھیں۔ لیکن رنگ مختلف تھے' انداز مختلف تھے' نیوکلس مختلف تھے۔ جوش کا مرکز "میں" تھا۔ حفیظ کا مرکز "پیسہ" تھا۔ جوش کی میں ایک بہت بڑے جھاڑ دار درخت کی مانند تھی۔ اس کی چھاؤں یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ سلف اسرپٹو شخصیت ایڈمائیرر پیدا کر لیتی ہے۔ اس لیے جوش کے گرد جمگھٹا لگا رہتا تھا اور حفیظ سے لوگ کنی کتراتے تھے۔ مجھے دو سال حفیظ کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ میں ان کی شخصیت کے بیشتر پہلوؤں سے خاصہ واقف ہوں لیکن ان کی شخصیت کو قلمبند کرنا۔ اس کے لیے ایک بڑے فن کار کی ضرورت ہے' جو ان کے اندھیرے اور اجالوں کا تجزیہ کر سکے۔

ولیج ایڈ میں آنے سے پہلے ہی احمد بشیر اور ابن انشاء نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ حسب دستور حفیظ کے شکوک ابھریں گے اور لوہیت کے شکار ہو جائیں گے۔ پھر التفات کے پس منظر پر گلے شکوے اور غم و غصہ کے وا ورولے چلیں گے اور مطلع غبار آلود ہو جائے گا۔

مطلع غبار آلود ہوا تو میں نے اپنی جی حضوری کی قبا پہن لی۔ حفیظ نے شکایات شروع کیں

تو میں نے کہا آپ بالکل درست کہتے ہیں۔ پھر میں نے "سارا قصور میرا ہے" کا وظیفہ شروع کر دیا اور دفتر میں بیٹھ کر باآواز بلند کہنا شروع کر دیا۔ احمد بشیر تم حفیظ کے لیے ایسا پی اے کیوں نہیں تلاش کرتے جو حفیظ کے پائے کا آدمی ہو۔ تم نے خوا مخواہ اونٹ کے گلے میں گھنٹی باندھ رکھی ہے۔بھئی میں اس کے میل کا فرد نہیں ہوں۔ اس قابل نہیں ہوں کہ اس کا پی اے بن سکوں۔

اس ڈرامے کا فوری اثر ہوتا۔ حفیظ خود آتے اور مجھے منا کر لے جاتے۔

حفیظ صاحب نے دیکھا کہ یہ شخص ری ایکٹ نہیں کرتا بلکہ سر جھکا دیتا ہے۔ تو وہ سخت سٹ پٹائے' کنفیوزڈ ہو کر رہ گئے۔ کیوں کہ وہ اپنے سٹاف سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑ چڑ کرنے کی لذت سے محروم ہو گئے۔ وہ بہت بڑے شاعر تھے لیکن فارمل تعلیم سے محروم تھے۔ انہیں بیٹھے بٹھائے شک پڑ جاتا تھا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں غیر تعلیم یافتہ ہوں' ان پڑھ ہوں۔ اس پر اندرونی چڑ چڑ شروع ہو جاتی ہے۔ پھر بھٹیاری اعلانیہ دانے بھونتی رہتی۔

جی حضوری ڈرامہ

وزارت میں ہوم جی' ڈپٹی سیکرٹری ولیج ایڈ سے متعلق تھے۔ اس لحاظ سے ہوم جی بڑا بد قسمت تھا۔ کیونکہ اسے حفیظ سے ڈیل کرنا پڑتا تھا۔ حفیظ صاحب جب بھی ہوم جی سے ملتے تو ان کا رویہ کچھ ایسا ہوتا کہ میاں تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ تم منشی لوگ کیا جانو کہ تخلیق کار کیا ہوتا ہے اور پھر مہا تخلیق کار۔

ہوم جی سے چڑ چڑ کرنے کے بعد جب وہ دفتر آتے تو یوں جھنڈا لہراتے ہوئے آتے جیسے سوم ناتھ کا بت توڑ کر آئے ہوں۔ اس عظیم فتح کا احوال سنانے کے لیے وہ آوازیں دیتے۔ مفتی ممتاز' مفتی ممتاز' آ جاؤ' ایک ڈی او ہو گیا ہے۔ ان کا ڈی او بھی یوں ہوتا تھا جیسے غزل ہوتی ہے۔

جب میں نے اپنے جی حضور ہتھیار سے انہیں گھائل کر لیا تو پھر میں بھی میدان میں اتر آیا۔

ایک روز میں نے ہفتے کی چھٹی کی درخواست بھیج دی۔ درخواست کے آخر میں لکھا کہ از

راہ کرم ڈائریکٹر صاحب کے لیے کوئی مستعد اور قابل پی اے کی تلاش کی جائے چونکہ کوشش کے باوجود میں بطور پی اے ان کی خدمت نہیں کر سکا۔ مجھ میں اتنی صلاحیت نہیں کہ ایک اتنے بڑے دانشور کے ساتھ کام کر سکوں' اس عرضی کے جواب میں حفیظ صاحب جیپ میں بیٹھ کر میرے گھر آ گئے۔ اور لگے آوازیں دینے مفتی ممتاز' مفتی ممتاز۔

اس کے بعد میں نے روٹھ کر گھر آ جانے کا شغل باقاعدگی سے اپنا لیا۔ اور حفیظ صاحب کی جیپ گھنٹوں میرے فلیٹ کے سامنے کھڑی رہتی۔

ایک دن میں نے احمد بشیر اور انشاء کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور کہنے لگا' اب بولو۔ تم تو کہتے تھے کہ بیس دن کے بعد حفیظ صاحب تجھے ان فٹ کر کے باہر نکال دیں گے' اب بولو۔ اب تو حفیظ جیپ میں بیٹھ کر' مجھے منانے میرے گھر جاتا ہے۔

انشاء کہنے لگا' یار ہمیں پتہ نہ تھا کہ تو نہلے پر دہلہ مارے گا۔

ہاں' احمد بشیر بولا' مجھے اندازہ نہ تھا کہ تو کمینگی کی اس حد تک جا سکتا ہے۔

انشاء مسکرا کر بولا' ہم سمجھتے تھے کہ مفتی جی ایک شریف' باعزت انسان ہیں لیکن وہ خاموش ہو گیا۔

جب میں راولپنڈی سے واپس کراچی پہنچا تو دیکھا کہ وہاں ضمیر جعفری' حفیظ کے مہمان کی حیثیت سے براجمان ہے۔ ضمیر جعفری کو میں بہت بڑا مزاحیہ شاعر مانتا ہوں۔ اس کے کلام میں خالص مزاح کے پھول کھلے ہیں۔ طنز کے کانٹوں سے پاک' اس لیے میں ضمیر کا احترام کرتا ہوں۔ کردار کے حوالے سے ضمیر جعفری دفتری ماحول میں بہت بڑا جی حضوریہ ہے مجھ سے بھی بڑا جی حضوریہ۔ اس لیے ضمیر کو دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی کہ میری جگہ پر کرنے کے لیے ایک شخص موجود ہے۔

بشیر اور انشاء اگرچہ مجھ سے متفق نہ تھے۔ انشاء کہتا تھا وہ ممتاز مفتی نہیں ہے کہ پی اے بن کر بیٹھ جائے گا۔ وہ ڈپٹی ڈائریکٹر بنے گا۔ احمد بشیر سے اوپر حفیظ کے نیچے۔

فلمیریا

۱۹۵۹ء میں احمد بشیر فلمیریا کا شکار ہو گیا۔ پتہ نہیں یہ بیماری اسے کب لگی' کیسے لگی۔ اور

پھر اس حد تک چھا گئی کہ نتیجے کے طور پر احمد بشیر سات سال مفلوج رہا۔

۱۹۵۸ء میں کچھ امریکی وظائف کا اعلان ہوا۔ ان میں ایک وظیفہ فلم بنانے سے متعلق بھی تھا۔

احمد بشیر نے ابن انشاء اور مجھے ایک کمرے میں بند کر لیا۔ بڑے راز دارانہ انداز میں کہنے لگا' یہ فلمی وظیفہ ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ تم دونوں شہاب سے قریب ہو۔ تم اسے ملو۔ اس کے سامنے اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ جاؤ۔ اسے کہو کہ یہ وظیفہ میرے نام کر دے۔ ضرورت پڑے تو اس کے گھر کے سامنے بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ جاؤ۔ مگر یاد رکھو کہ حفیظ کو پتہ نہ چلے۔ وہ مجھے اس معاملے میں سپورٹ نہیں کرے گا بلکہ اسے پتہ چلا تو وہ خود فلم ٹریننگ حاصل کرنے سے دریغ نہ کرے گا۔

ولیج ایڈ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر بننے کے بعد احمد بشیر کی تمام تر توجہ دفتری ایڈمنسٹریشن کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ وہ یہ ثابت کرنے پر تل گیا تھا کہ میں دفتری ایڈمنسٹریشن کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔

کہتا تھا' دفتر تو میں چلا رہا ہوں۔ حفیظ تو برائے نام ڈائریکٹر ہے۔

ادھر حفیظ کو یہ زعم تھا کہ احمد بشیر تو صرف کلرکی کر رہا ہے' دفتر تو میرے ڈی او کے زور پر چل رہا ہے۔احمد بشیر حفیظ کے ڈی او کو نہیں مانتا تھا۔ حفیظ احمد بشیر کے نوٹس کو نہیں مانتا تھا۔ دونوں کے درمیان سرد جنگ چل رہی تھی۔ ابن انشاء اس ڈرامے کا واحد ناظر تھا۔

احمد بشیر کا کہنا تھا کہ دیکھو تم سب میرے ماتحت ہو لیکن میں نے تم پر کبھی افسری کا رعب نہیں جمایا۔ تمہیں یوں رکھا ہے جیسے ٹوکری میں پھول رکھتے ہیں۔ اب تم پر فرض ہے کہ تم شہاب کے توسط سے مجھے فلمی ٹریننگ کے لیے امریکہ بھجواؤ۔

انشاء اور میں باری باری شہاب کے پاس جا کر احمد بشیر کے سکالر شپ کے لیے تقاضے کرتے تھے۔ ان دنوں احمد بشیر دفتر کا سارا کام چھوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا دل کام سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ جب بھی انشاء یا میں شہاب سے مل کر آتے تو وہ کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتا۔ کہتا کیا بات ہوئی۔ پوری تفصیل سناؤ۔

گھر میں احمد بشیر کی بیوی مودی حیران تھی کہ میاں کو کیا ہوا۔ اچھا خاصا ہنسنے بولنے والا

میاں۔ دیوار پر نظریں جما کر بت بنا دیوار کی طرف یوں دیکھتا رہتا ہے جیسے وہاں کوئی فلم چل رہی ہو۔ احمد بشیر گھر سے قطعی طور پر لاتعلق ہو گیا تھا۔ اسے صرف ایک دھن لگی ہوئی تھی، فلم، امریکہ، فلم امریکہ، حفیظ صاحب خود محسوس کرنے لگی تھے کہ دفتر کی فضا بدلی بدلی ہے۔

بچہ

ایک روز حفیظ مجھ سے کہنے لگے، مفتی ممتاز دفتر کو کیا ہوا ہے۔

میں نے جواب دیا، کیا ہوا ہے، کچھ ہوا ہے کیا؟

بولے، دفتر کی فضا بدلی بدلی ہے۔

میں نے کہا، حفیظ صاحب دفتر کی فضا تو آپ خود ہیں۔

کیا مطلب؟

دفتر کی فضا آپ بناتے ہیں۔ آپ مسکراتے ہیں تو دفتر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ آپ ماتھے پر تیوری ڈال لیتے ہیں تو دفتر میں سب کے منہ لمبے ہو جاتے ہیں۔

کہنے لگے، مفتی ممتاز تو بڑا چالاک ہے۔

میں نے کہا، جب آیا تھا تو معصوم تھا اب آپ کے ڈی اوز نے چالاک بنا دیا ہے۔

بولے، سچ سچ بتا دفتر میں کیا ہو رہا ہے۔

میں نے کہا، حفیظ صاحب کبھی عقل کی بات کر لیا کریں۔ مجھے دفتر سے کیا تعلق، میں تو آپ کا پی اے ہوں۔

سیانے کہتے ہیں کہ بچہ ضد کر رہا ہو تو اس کی توجہ کسی اور چیز پر منعطف کر دیں۔ اس لحاظ سے حفیظ بھی ایک بچہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی ضد توڑنے کے لیے توجہ اس کی ذات کی طرف منعطف کرنا ضروری تھا۔ اس کی میں میں پھونک بھر دیتے۔ بس بات بن جاتی۔

پھر قدرت اللہ کی وساطت سے احمد بشیر کو فلمی سکالر شپ مل گیا۔ اس خبر سے احمد بشیر کا جنون ٹوٹا نہیں بلکہ اور گاڑھا ہو گیا۔

وہ امریکہ جانے سے پہلے ہی امریکہ پہنچ گیا۔ جس روز ہم اسے ایئر پورٹ پر وداع کرنے گے۔ اس روز اس کا جنون نقطہ عروج تک پہنچ چکا تھا۔ وہ کراچی کے ایئر پورٹ کو نہیں دیکھ رہا

تھا۔ اسے ہم نظر آ رہے تھے' بیوی بچے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس کی توجہ امریکہ اور فلم پر مرکوز تھی۔

غالباً" احمد بشیر واحد مسافر تھا جس نے جہاز کی طرف جاتے ہوئے ایک بار بھی پیچھے نہیں دیکھا تھا۔

امریکہ سے واپس آنے کے بعد وہ بظاہر خاصہ نارمل ہو گیا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں فلمی کھچڑی پک رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں احمد بشیر کے دل میں یہ یقین ایمان کی حد تک پہنچ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فلم بنانے کے لیے پیدا کیا ہے۔

دفتر کے حالات بگڑتے دیکھ کر احمد بشیر کا دل اسسٹنٹ ڈائریکٹری سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اور وہ فلمسازی کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔

ایک روز اس نے مجھے بلایا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کہنے لگا' دیکھ ممتاز دفتر کے حالات اچھے نہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ ولیج ایڈ وائنڈ اپ ہو رہا ہے۔

نیلا پربت

ہاں میں نے جواب دیا۔ ولیج ایڈ وائنڈ اپ کیا جا رہا ہے۔

پتہ نہیں' وہ بولا کہ ہمیں کس محکمے میں تعینات کیا جائے گا۔ ہم' تو اور میں بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں۔

خواہ مخواہ دفتری دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ کوئی تخلیقی کام کریں' اپنا کام' ملازمت نہیں۔

میرا ارادہ ہے کہ فلم بناؤں۔

پیسہ کہاں سے آئے گا' میں نے پوچھا۔

دیکھو کچھ نا کچھ ہو ہی جائے گا۔ کوئی نہ کوئی صورت بن ہی جائے گی لیکن ہمیں ابھی سے کام شروع کر دینا چاہیئے۔

کیا مطلب' میں نے پوچھا۔

جب تک انتظام نہیں ہوتا ہم پیپر ورک ہی مکمل کر لیں۔

پیپر ورک کا مطلب۔

تم ایک کہانی لکھو' صرف آؤٹ لاین۔ میں اسے سینوں میں بانٹ دوں۔ پھر تم اس کے مکالمے لکھ دو۔ اس کام میں تقریباً" چھ مہینے لگ جائیں گے' جب تک پیسے کا انتظام ہو جائے گا۔

ان دنوں میری توجہ کسی اور جانب مرکوز تھی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ فلم کی کہانی لکھوں۔ نہ ہی مجھے پیسہ کمانے کی خواہش تھی۔ لیکن احمد بشیر نے تقاضا کرنا شروع کر دیا۔ مجھے سوچ میں پڑے دیکھ کر قیصر نے پوچھا بات کیا ہے۔ میں نے کہا یار احمد بشیر فلم کے لیے کہانی مانگ رہا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ موضوع کیا ہو۔

بولا' لو یہ بھی کیا سوچنے کی بات ہے۔ لو سٹوری لکھ دو۔ میں نے کہا' لو سٹوری تو پٹ گئی ہے۔

لو سٹوری۔ انشاء کی

کہنے لگا' عام لو سٹوری نہیں۔ انشاء کی لو سٹوری لکھو۔ انوکھی محبت۔ ایسی محبت کہ کسی نے کبھی کی نہ ہو' سنی نہ ہو۔

میں نے کہا' کیا خصوصیت ہے انشاء کی محبت میں۔

کہنے لگا' اس نے بہت سوچ سمجھ کر محبت لگائی ہے۔ ایک شادی شدہ لڑکی سے محبت کی ہے' جو بچوں والی ہے تاکہ میل ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ ایسی عورت سے محبت لگائی ہے جس کے دل میں انشاء کے لیے تضحیک کا جذبہ ہے' ہمدردی کا نہیں۔ اور یہ سب کچھ اس نے جان بوجھ کر کیا ہے کہ کہیں وصال کی صورت پیدا نہ ہو جائے' کہتا ہے محبت تو درد کے لیے لگائی جاتی ہے۔ جو وصال کے لیے محبت لگاتے ہیں وہ تو احمق ہیں۔ قیصر قہقہہ مار کر ہنسا' جواب نہیں انشاء کی محبت کا۔

میں نے کہا' یہ بتا کہ کوائف کہاں سے ملیں گے۔

سبھی جانتے ہیں' احمد بشیر سے پوچھ لے۔

احمد بشیر کہنے لگا' یہ غلط ہے کہ انشاء محبوبہ کے قریب نہیں جاتا۔ کئی مرتبہ موقعہ ملا ہے اسے۔ آمنا سامنا بھی ہوا ہے۔ لیکن جب وہ سامنے آتی ہے تو انشاء کا فیوز اڑ جاتا ہے' پسینے

چھوٹ جاتے ہیں' زبان گنگ ہو جاتی ہے' آنکھیں جھک جاتی ہیں' منہ سے بات نہیں نکلتی۔ جاتا بڑے اشتیاق سے ہے مگر سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔

اور وہ' میں نے اسے پوچھا' محبوبہ۔

کہنے لگا' وہ بڑی تیز طرار ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ پڑھی لکھی ہے' شاید شعر بھی کہتی ہے۔

انشاء سے کیا رویہ ہے اس کا' میں نے پوچھا۔

انشاء کا تمسخر اڑاتی ہے۔ بلکہ اب تو میاں بیوی دونوں مل کر انشاء کے جذبے کو کام میں لاتے ہیں۔ انشاء کا استحصال کرتے ہیں' فرمائشیں کرتے ہیں۔ اور انشاء کو پتہ ہے کہ وہ اسے بنا رہے ہیں۔ پھر بھی وہ پھولے نہیں سماتا۔ فرمائشیں پوری کرنے میں اسے بڑی خوشی ہوتی ہے' جیسے پتہ نہیں کیا پا لیا ہو۔

میری ہنسی نکل گئی۔ میرا خیال تھا کہ محبت میں مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں ہو گا' لیکن انشاء کی محبت کی تفصیلات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔

احمد بشیر کہنے لگا کہ انشاء سے جب ہم کہتے ہیں کہ بیوقوف' وہ تجھے الو بنا رہی ہے۔ جواب میں انشاء کہتا ہے' تم مجھے اس تعلق سے کیوں محروم کر رہے ہو۔ تمہیں نہیں پتہ اس نے مجھے کیا کیا دیا ہے۔ اس نے مجھے درد دیا ہے' شاعر بنا دیا ہے' شہرت دی ہے۔

میں نے کہا' یار احمد بشیر' انشاء کی محبت پر کہانی نہ لکھ دوں تجھے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ ہاں ہے تو بہت ہٹ کر' لیکن اس میں ملاپ کے سین نہیں آ سکیں گے۔ ڈرامہ نہیں بنے گا' کانفلیکٹ کی گنجائش نہیں ہو گی۔

میں نے کہا' چلو دو محبتیں رکھ لیں گے۔ ایک انشاء جیسی دوسری نارمل۔

ایف آر خان

احمد بشیر کہنے لگا' یار وقت ضائع نہ کرو۔ آج کل تمہیں دفتر کا کوئی کام نہیں ہے۔ حفیظ صاحب جوڑ توڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ ضمیر جعفری کو انگلی لگائے' منسٹری کا طواف کر رہے ہیں۔ اس لیے تم آوٹ لائن آسانی سے لکھ سکتے ہو۔ جو بھی لکھنا ہے لکھو۔ پھر ہم آپس میں ڈسکس

کر کے اس میں ردو بدل کر کے اسے فائنل آیز کر لیں گے۔ ایک دفعہ کہانی کی آؤٹ لائن کا فیصلہ ہو جائے' پھر مکالے آسان کام ہے۔

اگلے روز جب میں دفتر میں بیٹھا۔ فلمی کہانی کی آؤٹ لائن لکھ رہا تھا تو ایک زیر لبی سنائی دی۔ منسٹر صاحب آئے ہیں۔ منسٹر صاحب آئے ہیں۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکلا ہال کمرے میں دفتری سٹاف کھسر پھسر کر رہا تھا۔

کون آئے ہیں' میں نے پوچھا۔

وزیر آئے ہیں' زیر لبی سنائی دی۔

کہاں ہیں۔

حفیظ صاحب کے کمرے میں ہیں۔

احمد بشیر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ کہنے لگا' فکر نہ کر ہم بھگتا لیں گے وزیر کو۔ تو اپنا کام مکمل کر لے۔

میں کمرے میں جا کر کہانی کی تفصیلات سوچنے میں کھو گیا۔ کچھ دیر کے بعد حفیظ کا چپڑاسی آیا بولا' جناب آپ کو وزیر صاحب نے یاد کیا ہے۔

وزیر صاحب نے ———— مجھے' میں حیران رہ گیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کون وزیر ہے یہ' میں نے پوچھا۔

جی بریگیڈیر ایف آر خان ہیں۔

جب میں حفیظ صاحب کے کمرے میں پہنچا تو وزیر صاحب نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا' آپ ممتاز مفتی ہیں نا۔

میں نے کہا' جی میں ممتاز مفتی ہوں۔

بولے' آپ فی الفور راولپنڈی چلے جائیں اور وہاں جا کر کیو یو شہاب صاحب کو رپورٹ کریں۔

میں نے پوچھا' جناب مجھے وہاں کتنے دن رہنا ہو گا۔

نہیں نہیں' وہ بولے' آپ کو ٹرانسفر کر دیا گیا ہے۔

کہاں؟ میں نے پوچھا۔
آپ کو راولپنڈی پہنچ کر آرڈرز مل جائیں گے۔

تینتیسواں باب

صدر گھر

راولپنڈی پہنچ کر میں سیدھا شہاب سے جا ملا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولا' اچھا ہوا آپ آ گئے۔
میں نے بریگیڈیر ایف آر خان سے کہا تھا کہ تبادلے کا حکم نامہ آپ جاری کریں گے۔ مجھے آپ کے پاس رپورٹ کرنا ہے۔
وہ سب ہو جائے گا' وہ بولا

او ایس ڈی

بس اتنا بتا دیجیے کہ تبادلہ کہاں ہو رہا ہے' میں نے پوچھا۔
یہاں پنڈی میں' وہ بولا۔
کس دفتر میں' میں نے پوچھا۔
یہاں صدر گھر میں۔ اب آپ میرے ماتحت ہیں۔ میرے او ایس ڈی ہیں۔ آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی۔ لیکن اس میں آپ کو نقصان رہے گا۔ اول تو یہ نئی پوسٹ ہے۔ اس پوسٹ کی منظوری لینی پڑے گی۔ پھر آپ کی پے از سرنو فکس ہو گی۔ یعنی چھ مہینے تنخواہ نہیں ملے گی۔ شاید گزارہ الاؤنس مل جائے لیکن ہمارے پاس ایک الماری نوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں

سے جتنا قرض آپ چاہیں لے سکتے ہیں' لیکن جب تنخواہ ملے گی تو قرض فوری طور پر ادا کرنا ہو گا۔ اگر فوری ضرورت ہے تو ابھی بتا دیجئے۔

نہیں' میں نے جواب دیا' فوری ضرورت نہیں ہے۔

اس پر شہاب نے گھنٹی بجائی پی اے آیا تو اس نے کہا' آپ ان کی جائننگ رپورٹ لے لیجئے یہ ہمارے او ایس ڈی ہیں۔

جائننگ رپورٹ لینے کے بعد شہاب نے کہا' میرا ارادہ تھا کہ آپ کو لاہور امروز میں اکاموڈیٹ کر دیتے' لیکن بھائی جان کی خواہش ہے کہ آپ پنڈی میں رہیں۔ لہٰذا یہاں ایک نئی آسامی بنانی پڑی۔

آپ بھائی جان سے ملے ہیں کیا' میں نے پوچھا۔

بس ایک ہی ملاقات ہوئی ہے۔ بھائی جان خوب آدمی ہے۔ مستعد' با اصول عمل کے دلدادہ۔ ایسے آدمی کہاں ملتے ہیں' جو ذات کی اہمیت سے پاک ہوں' خدمت گزار ہوں۔

اور ہمارے بابا' میں نے پوچھا۔

کون بابا۔

مرد قلندر' ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس بات کے خواہاں ہیں کہ پاکستان کے متعلق جو ان کا پروگرام ہے آپ اس میں شمولیت کر لیں۔

ہاں' وہ بولا' صاحب مزار' میری کار کے ساتھ ساتھ ایک سایہ سا متحرک رہتا ہے' اور بس۔ میری شمولیت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ایک بزرگ آدمی ہیں۔ میں ان کی کیا مدد کر سکتا ہوں بھلا۔

یہ سن کر میں حیران رہ گیا' اتنی بے اعتنائی' کار کے ساتھ ساتھ ایک سایہ متحرک رہتا ہے۔ اس کے برعکس وہ دستار بندی کرتے ہیں۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔

قدرت کا یہ دستور تھا کہ جس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ فوراً موضوع بدل دیا کرتا تھا۔

لاہور چھوڑا

اس نے موضوع بدلا بولا' ابن انشاء لاہور آنے میں کیوں ہچکچا رہا ہے۔ کل میں نے اسے

فون کیا تھا کہ آپ لاہور کیوں نہیں آ جاتے' وہاں ہم آسانی سے آپ کو اکاموڈیٹ کر سکتے ہیں۔

پھر اس نے کیا کہا۔

لاہور آنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔

نہیں وہ لاہور نہیں آئے گا۔ میں نے کہا۔ لاہور انشا کے لیے ایک پھوڑے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لاہور کو بھول جانا چاہتا ہے۔

IT APPEARS THAT LAHORE IS

A SKELETON IN HIS CUP BOARD

قدرت نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔

شاید اس کی وجہ انشاء کی پہلی شادی سے متعلق ہو' میں نے کہا۔

انشاء کی شادی ہو چکی ہے کیا' اس نے پوچھا۔

ہاں' جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ برات گئی تو دولہا کو بہو کاٹ میں بٹھا دیا گیا' لیکن اس نے ضد کی کہ میں بہو کاٹ کے اس بانس پر بیٹھوں گا جس میں گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اور وہ بانس پر بیٹھ کر سسرال گیا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ دو بچے ہوئے اور پھر علیحدگی ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی بہت ہی تکلیف دہ واقعہ ہوا۔ اب اس کی بیوی بچوں سمیت لاہور میں رہتی ہے۔

عجیب بات ہے' وہ بولا۔

مجھے احمد بشیر نے بتایا کہ انشاء لاہور نہیں جائے گا۔ میں نے ازراہ مذاق احمد بشیر سے کہا' یار' آزماؤ تو سہی۔ منسٹری کو کہہ کر انشاء کو کسی کام سے لاہور بھجوا دو۔ دیکھیں کرتا کیا ہے۔

احمد بشیر نے منسٹر سے حکم بھجوا دیا۔ انشا کے نام' کہ لاہور جا کر فلاں فلاں کام کر آؤ۔

انشاء کو حکم نامہ ملا۔ تو اس کا ذہن فیوز ہو گیا۔ سارا دن آرڈر کو سامنے رکھ کر بیٹھا رہا۔ بالکل چپ' کھویا ہوا' بجھا ہوا۔

شام کو ہوش میں آیا' کہنے لگا۔ لاہور ہی جانا ہے نا تو ہو آؤں گا لاہور سے۔ اس میں کیا مشکل ہے۔

اگلے روز احمد بشیر اور میں اسے سی آف کرنے سٹیشن پر گئے۔ جب گاڑی چل پڑی تو میں

007



شبیر شاہ



ایثار راعی



ام بی خالد

غفور ملک ، عفت شہاب ، قدرت اللہ شہاب (گود میں ثاقب شہاب)



ثمینہ
(قدرت اللہ شہاب کی بھانجی)



خواجہ جان محمد بٹ (بھائی جان)
عکسی مفتی ، قدرت اللہ شہاب

نے احمد بشیر سے کہا' کیوں بے تو تو کہتا تھا کہ یہ لاہور نہیں جائے گا۔

میں خود حیران ہوں' وہ بولا۔

اگلے روز جب ہم دفتر میں بیٹھے تھے تو انشاء آ گیا۔ اسے دیکھ کر ہم حیران ہوئے۔

انشاء میں نے کہا' تو تو لاہور گیا تھا۔

انشاء بیٹھ گیا۔ کہنے لگا یار میں خود حیران ہوں کہ یہ کیسے ہوا۔ تم نے مجھے گاڑی میں بٹھا دیا۔ گاڑی چلی تو میں کتاب پڑھنے لگا۔ بڑی دلچسپ کتاب تھی۔

پھر گاڑی رکی۔ کوئی بڑا سٹیشن تھا دیکھا تو سگریٹ ختم تھے۔ میں نے سوچا چلو سگریٹ خرید لو۔ اپنا سوٹ کیس اٹھایا۔ سگریٹ خریدے اور پھر سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔

پھر جو گاڑی رکی۔ تو سارے مسافر اتر گئے۔ دیکھا تو کراچی کا سٹیشن تھا۔ حیران ہوا کہ یہ کیسے ہوا کہ گاڑی کراچی سے چلی تھی اور واپس کراچی آ گئی۔

قدرت ہنس کر بولا' بے حد دلچسپ آدمی ہے۔

میں نے کہا' دلچسپ نہیں لذیذ آدمی ہے۔

شام کو میں راجہ شفیع سے ملا۔ میں نے کہا' راجہ بھائی جان کی بات پوری ہو گئی۔ میری تعیناتی راولپنڈی میں ہو گئی ہے۔ کہاں' وہ خوشی سے چلایا۔ میں نے کہا۔ صدر گھر میں۔

خوشی سے وہ پاگل ہو گیا۔ اس نے دو ایک نعرے لگائے پھر بیٹھ کر سنجیدگی سے کہنے لگا' یار بس میری ایک ہی خواہش تھی' وہ پوری ہو گئی۔ مجھے تو یہ اکیلا پن کھا گیا تھا۔

میں نے کہا' بھائی جان کہاں ہیں۔

کہنے لگا' مری میں ہیں۔ ارادہ کر رہے ہیں کہ مری کا کام ختم کر کے پنڈی میں آ جائیں۔ یہاں مکان کرائے پر لے لیں اور اسلام آباد میں کام کریں۔ لیکن یار' وہ بولا۔ بھائی جان وہ بھائی جان نہیں رہے۔ پہلے ان کی توجہ ستارہ میں اٹکی ہوئی تھی' اب ستارہ کی بیگم ڈاکٹر عفت پر مرکوز ہے۔ کہتے ہیں' ڈاکٹر عفت ہماری بیٹی ہے۔

کیا واقعی' میں نے پوچھا۔

بالکل' وہ بولا۔

راجہ تجھے یاد ہے میری ماں نے مجھ سے منت کی تھی کہ مجھے بھائی جان سے ملوا دو۔ میں

نے بھائی جان سے درخواست کی تو کہنے لگے۔ مفتی صاحب ہم۔ خواتین سے نہیں ملتے۔ کورا جواب دے دیا۔

عفت کو تو انہوں نے بیٹی بنالیا ہے راجہ نے کہا۔ ابھی اس سے ملے نہیں۔ اب وہ ہر وقت خود سے کہتے رہتے ہیں۔ عفت بیٹی کی گود کیوں نہ ہری ہو۔ ضرور ہونی چاہیے۔ ہم نے کبھی کسی کو کالی مرچ دم کر کے نہیں دی۔ لیکن عفت بیٹی کو کیوں نہ دیں' ضرور دیں گے۔ راجہ غصے میں بولا۔ بھائی جان کی ہماری طرف توجہ رہی ہی نہیں۔

صدر گھر میں تعیناتی کی وجہ سے مجھے قدرت کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔

قدرت کی وفات کے بعد' اشفاق احمد کی کتاب "ذکر شہاب" کے لیے میں نے ان پر ایک مختصر مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون سے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

قدرت کی شخصیت

شخصیت کے لحاظ سے پہلی نظر میں قدرت خاصے پھیپھر نظر آتے تھے۔ چھوٹا قد' گٹھا ہوا جسم' بات کرنے سے عاری' گونگی' محفل میں بیٹھتے تو اس قدر سنجیدہ اور خاموش جیسے پتھر کے بنے ہوئے ہوں' اونچائیوں سے خائف رہتے' اگرچہ اس بات کا انہوں نے کبھی کسی سے اظہار نہیں کیا تھا۔ بیورو کریٹس میں بیٹھتے تو جیسے راج ہنسوں میں کوا بیٹھا ہو۔

شور وشغب سے سخت گھبراتے تھے۔ تقریر کرنی پڑ جاتی تو دل بیٹھ بیٹھ جاتا۔ ازلی اکیلے تنہا۔ اپنی ان کمیوں کو چھپانے کے لیے انہوں نے خود پر سنجیدگی بھری چپ طاری کر رکھی تھی۔ یہ سنجیدگی بھری خاموشی پتھر کی طرح سخت تھی۔ دوسرے کو پتھر کی طرح لگتی تھی۔ دوسرا گھبرا جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ اٹھ کر بھاگ جائے۔ خاموشی قدرت اللہ کا واحد ہتھیار تھا۔ اگرچہ موثر تھا' بے حد موثر' مگر جھوٹا بناوٹی تھا۔

کردار کے لحاظ سے قدرت اللہ پتھر کے نہیں تھے۔ الٹا ان میں شدید قسم کی حس تھی۔ ان کی شخصیت کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ ان میں آہنی ضبط تھا۔ اندر بڑے طاقت ور شاک ابزاربر لگے ہوئے تھے۔ ان میں شدید ترین تکلیف کو برداشت کرنے کی قوت موجود تھی۔ اور بڑے سے بڑے کرب کے دوران کیا مجال کہ چہرے پر اظہار کی جھلک نظر آئے۔ ان کا چہرہ گونگا

تھا' ایسا کہ اندر طوفان مچا ہوتا' لیکن باہر سکون ہی سکوں ہوتا۔

قدرت اللہ اس قدر ذہین تھے کہ بات کرنے والا ابھی تمہید باندھ رہا ہوتا کہ وہ ساری بات سمجھ جاتے۔اس کی پڑھنے کی سپیڈ اس قدر تیز تھی کہ میں ابھی دوسرا پیراگراف پڑھ رہا ہوتا کہ وہ سارا کاغذ پڑھ جاتے۔

اس بات پر میں اکثر سٹپٹا جاتا۔مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ قدرت نے سارا صفحہ پڑھ لیا ہے۔ میں پوچھتا آپ کاغذ پر لکھا ہوا۔ لفظ بہ لفظ پڑھتے ہیں یا مفہوم سمجھنے کے لیے نظر گردانی کرتے ہیں۔

وہ کہتے' لفظ بہ لفظ پڑھتا ہوں۔ پھر بھی مجھے یقین نہ آتا۔ وہ کہتے میں نے کوئیک ریڈنگ کا کورس کیا ہوا ہے۔

ان کی یادداشت غضب کی تھی۔ ایک دفعہ دفتر کا ایک ضروری کاغذ گم ہو گیا۔ بہت تلاش کی نہ ملا۔قدرت نے پوچھا کیا میں نے وہ کاغذ پڑھا تھا۔ میں نے کہا' ہاں پڑھا تھا۔پھر پوچھا۔ موضوع کیا تھا۔ میں نے بتا دیا کہنے لگے' میں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چار پانچ منٹ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے آپ لکھتے جائیں۔ میں لکھتا گیا۔ چند دنوں کے بعد اصلی کاغذ مل گیا' موازنہ کیا۔ فل سٹاپ اور کومے تک فرق نہ تھا۔

اس پر میں بہت حیران ہوا۔

ان باتوں پر میری حیرت کی وجہ یہ تھی کہ میں نفسیات کا طالب علم تھا اور میں نے اس موضوع پر بہت مطالعہ کیا تھا اور خود کو نفسیات کا پھنے خان سمجھتا تھا۔

میں نے قدرت سے کہا' یہ بات بڑی حیران کن ہے۔

انہوں نے جواب دیا' سیدھی بات ہے۔

میں نے کہا' کیسے۔

کہنے لگے میری یادداشت Visual ہے۔ لکھی ہوئی چیز سامنے آ جاتی ہے۔ کالج میں میرے پروفیسر مجھ سے بد ظن رہتے تھی' کہتے تھے' امتحان میں تم کتاب سے نقل کرتے ہو۔

قدرت اللہ کی انگریزی بہت عمدہ تھی' اپنے نوٹس وہ دفتری انگریزی کے بجائے ادبی انگریزی میں لکھا کرتے تھے۔ ان کے نوٹس ایک تو مختصر ہوتے۔ دوسرے ان نوٹس میں وہ بین السطور

بات کرنے کا بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ جب ان کا لکھا ہوا نوٹ دفتر میں پہنچتا تو سبھی لوگ باری باری اسے پڑھتے‘ جیسے تبرک ہو اور پھر آپس میں گفتگو کرتے‘ بحث کرتے‘ بین السطور معانی پر کئی دن بحث چلتی۔

قدرت نے کالج کے زمانے میں ریڈر ڈائجسٹ میں ایک مضمون پر ایوارڈ حاصل کیا تھا۔

انہیں اردو لکھنے میں بھی بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ایک تو بہت موزوں لفظ تلاش کرتے تھے۔ دوسرے جذباتی نوعیت کے لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ اور نمائشی طرز تحریر سے احتراز کرتے تھے۔

ایک دن میں نے پوچھا‘ آپ نے کس عمر میں مطالعہ شروع کیا تھا۔ کہنے لگے‘ جب میں پرائمری سکول میں تھا۔

پرائمری سکول میں‘ میں نے مشکوک انداز سے دہرایا۔

کہنے لگے۔ ان دنوں کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ ہر قسم کی کتابیں‘ روزانہ ایک آنے کے کرائے پر۔ مجھے جو پاکٹ منی ملتی تھی‘ وہ میں کتب فروش کو دے دیتا تھا۔ کتب فروش روز مجھے نئی کتاب دے دیتا‘ ہمارے گھر کے باہر ملحقہ ایک احاطہ تھا اس میں کئی ایک کوٹھڑیاں تھیں‘ جو خالی پڑی رہتی تھیں۔ صبح حبیب اور میں‘ دونوں سکول جانے کے لیے تیار ہوتے‘ اپنا اپنا بستہ اٹھاتے۔ چل پڑتے۔ احاطے میں پہنچتے تو میرے کہنے پر حبیب مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے اوپر سے کنڈی لگا دیتا اور پھر وہ اکیلا سکول چلا جاتا۔ جب وہ سکول سے لوٹتا تو کوٹھڑی کی کنڈی کھول کر مجھے باہر نکالتا۔ پھر میں اپنا بستہ اٹھائے یوں گھر میں داخل ہوتا جیسے سکول سے آیا تھا اور پڑھ کر ماں باپ پر بہت بڑا احسان کر رہا تھا۔

دفتر کا سارا اسٹاف مع چپڑاسی بھی اپنی مشکلات کو حل کرنے کے لیے قدرت کے پاس آتے تھے۔ وہ ہر فرد کی بات بڑے غور سے سنتے تھے اور حتی الوسع ان کو مدد کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود شہاب کا سٹاف ان سے خوش نہ تھا۔ لیکن اس نکتے کو بیان کرنے سے پہلے لازم ہے کہ میں صدر گھر کی وضاحت کروں۔

صدر گھر

صدر گھر درحقیقت اقتدار گھر ہوتا ہے۔

نہ وہ گھر ہوتا ہے نہ دفتر ہوتا ہے بلکہ ایک ڈھکا چھپا میدان کار زار ہوتا ہے۔ ایک دروازے سے اقتدار داخل ہوتا ہے تو دوسرے دروازے سے اعتماد' اطمینان اور سکون باہر نکل جاتے ہیں۔

صاحب اقتدار کے گرد دو طاقتیں ہروقت مصروف عمل رہتی ہیں۔ ایک وہ' جو در پردہ ان کو سرنگوں کرنے کے فکر میں گھلتے رہتے ہیں اور موقعہ کی انتظار میں رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ان کو جائز و ناجائز طریقوں سے خوش کرنے اور اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ پھران جی حضوریوں کا آپس میں کمپی ٹیشن چل پڑتا ہے۔ زید آدھ فٹ جھک کر بات کرتا ہے' بکر ایک فٹ جھک جاتا ہے۔ پھر زید سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ آج زید بازی لے گیا۔ اس غم میں بکر کو ساری رات نیند نہ آئی اور وہ صاحب اقتدار کے قریب تر جانے کے منصوبے بناتا رہا۔

صدر گھر میں روغنی مسکراہٹوں کی بھرمار رہتی ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ کون سی اصلی ہے کون سی نقلی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے' لیکن ایسا ہوتا ہے کہ نقلی مسکراہٹ اصلی سے زیادہ چمک دار ہوتی ہے' زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہے۔ زیادہ پر اثر ہوتی ہے۔ اس لیے نقلی مسکراہٹ والے زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔

صاحب اقتدار کتنے ہی زیرک کیوں نہ ہوں وہ کنفیوز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں افراد پر بھروسہ نہیں رہتا۔ سچ اور جھوٹ کی تمیز نہیں رہتی۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ سچ اور جھوٹ کی تمیز کی خواہش نہیں رہتی۔ صرف ایک دھن سوار ہو جاتی ہے کہ اقتدار ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

ایوان صدر چیونٹی گھر کے مصداق ہوتا ہے۔ اوپر سے ساکن' نیچے مسلسل حرکت' اضطراب' بے چینی۔ ان دنوں صدر گھر نہیں بنا تھا پھر بھی مختلف طاقتیں برسرپیکار تھیں۔

سب سے بڑی طاقت سیکیورٹی کی تھی۔ کون اندر داخل ہو سکتا ہے' کون نہیں۔ سکیورٹی واقعی یہ سمجھتی تھی کہ وہ صاحب اقتدار کی زندگی کی محافظ ہے۔ در پردہ وہ اپنے اقتدار کے طالب ہوتے ہیں۔

صدر صاحب کے فوجی اختیارات کی وجہ سے صدر کے دو سیکرٹری تھے۔ سول سیکرٹری اور ملٹری سیکرٹری' ملٹری سیکرٹری اعلانیہ طور پر قدرت اللہ کی ہر تجویز کی مخالفت کرتے تھے۔ اس

بات پر ان کا سٹاف فاتحانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھا۔ وہ سول سیکرٹری کے سٹاف کو بڑی تحقیر سے دیکھتا تھا۔ شہاب کے سٹاف کی خواہش تھی کہ وہ ملٹری سیکرٹری کے حملوں کا ڈٹ کر جواب دیں اور انکے خلاف محاذ آرائی کریں' تاکہ وہ بھی فاتحانہ انداز اختیار کر سکیں۔ لیکن قدرت نے ملٹری سیکرٹری کی محاذ آرائی کا کبھی نوٹس نہ لیا تھا اور ان کی مخالفت کو درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔

نہ تو شہاب اس موضوع پر اپنے سٹاف سے بات کرتا تھا نہ ہی ان کی بات سنتا تھا۔

قدرت کا یہ رویہ اس کے سٹاف کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔

صدر ایوب کے ساتھ قدرت کا رویہ کھٹ مٹھا تھا۔

صدر ایوب بلاتے تو وہ کاغذ پنسل اٹھا کر یوں بھاگا بھاگا حاضری دیتا جیسے کسی زمیندار کا منشی ہو۔ صدر ایوب کے سامنے مئودبانہ کھڑا ہو جاتا۔ جب تک وہ اسے بیٹھنے کو نہ کہتے کھڑا رہتا۔ اس کے انداز میں بے تکلفی یا افسریت کا شائبہ تک نہ ہوتا' سراسر جی حضوریہ۔

اس کے برعکس وہ صدر صاحب کے پہلے بلاوے پر کبھی حاضر نہ ہوتا۔ چپڑاسی آ کر کہتا' لاٹ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ ان دنوں صدر گھر کے چپڑاسی صدر کو لاٹ صاحب کہا کرتے تھے۔ وہ برطانیہ کی رسم ابھی تک قائم تھی۔

ایک دن میں نے پوچھا۔ آپ پہلے بلاوے پر کیوں نہیں جاتے۔ تیسرے بلاوے کا انتظار کیوں کرتے ہیں۔

کہنے لگا' التزاماً" پہلے بلاوے پر نہیں جاتا۔

اس میں کوئی مصلحت ہے کیا۔

ہاں' وہ بولا' تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ ان کے بلاوے کے علاوہ بھی ضروری کام ہو سکتے ہیں۔ اس سے بڑا فرق پڑتا ہے۔

صدر ایوب کے سامنے وہ یوں لیس سر' لیس سر کہتا رہتا جیسے خالص جی حضوریہ ہو۔ جب تک صدر ایوب پوچھتے نہیں تھے وہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ جب وہ اس کی رائے پوچھتے تو خشک انداز میں کہتا کہ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ پھر وہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ جسے صدر بڑے غور سے سنتے۔ وہ قدرت کی اختلاف رائے کی قدر کرتے تھے اور ہر معاملے میں پوچھتے تھے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ حتیٰ کہ کابینہ کی میٹنگ میں بھی ارکان کی

آراء پوچھنے کے بعد وہ قدرت اللہ کی رائے بھی دریافت کیا کرتے تھے' حالاں کہ کابینہ میں قدرت کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ قدرت کی اختلاف رائے کی قدر کرنے کے باوجود صدر اکثر مسکرا کر کہا کرتے۔

Must you throw a brick on my ead whenever I speak

ایک دن میں نے پوچھا' آپ جو صدر صاحب کے سامنے یوں کھڑے ہو جاتے ہیں' جیسے پرائمری سکول کا بچہ مولوی صاحب کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر کیا اس لیے یس' سریس کرتے ہیں۔ کہ وہ سربراہ مملکت ہیں۔

ہاں' وہ بولا اس لیے بھی لیکن زیادہ تر اس لیے کہ صدر ایوب بہت زیرک آدمی ہے۔ میں اس کی ذہانت سے بہت متاثر ہوں۔

اللہ سے قدرت کے تعلقات عجیب سے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

اس نے کبھی اللہ یا اسلام یا پاکستان کی بات نہ کی تھی۔ کبھی تلقین نہ کی تھی' جیسے بھائی جان کیا کرتے تھے۔ اس نے کبھی مجھے نصیحت نہ کی تھی' کسی بات پر ٹوکا نہ تھا۔ ٹوکتا تو سرسری انداز میں ایسے کہ ٹوکنا محسوس نہ ہوتا۔ مثلاً ایک روز پیش گوئی پر بات ہو رہی تھی۔

پیشین گوئی

مطالعے کے ابتدائی دور میں میں نفسیات میں دلچسپی لیتا تھا۔ ان دنوں نفسیات نیا علم تھا۔ پنجاب پبلک لائبریری میں نفسیات کی کتابیں تعداد میں زیادہ نہ تھیں' اس لیے میں نے مطالعے کا رخ سیکس کی طرف موڑ دیا۔ سیکس کے بعد میں ای ایس پی (Extra Sensory Perception) میں جا نکلا۔ یہ مضمون بالکل ہی نیا تھا۔ کتابیں بہت کم تھیں۔ اس لیے مجبوراً مجھے رسائل کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ ان دنوں ایک رسالہ پریڈکشن آسانی سے مل جاتا تھا۔ کیرو کی شخصیات سے میں بہت متاثر ہوا۔

ایک دن میں پریڈکشن پڑھ رہا تھا کہ قدرت آگیا۔ کہنے لگا' میں بھی کالج میں پریڈکشن پڑھا کرتا تھا۔ بڑی مزے کی چیز ہے۔ لیکن پھر میں نے اسے چھوڑ دیا۔

کیا عدیم الفرصتی ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا' میں نے پوچھا۔

نہیں، وہ بولا، مجھے پیشین گوئی پر یقین نہ رہا۔ پہلے بھی یقین کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف دلچسپی کی وجہ سے پڑھا کرتا تھا۔

یقین کیوں نہ رہا۔

بس خیال آیا کہ اگر ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے اور (God (Finality Rests With اس کے بعد پیش گوئی بے معنی ہو جاتی ہے۔

اور کشف، میں نے پوچھا۔

وہ بھی تو پیش گوئی ہے، اس نے جواب دیا۔

اور اگر کوئی بزرگ کشف کی بات کرے تو۔

چاہے کوئی بھی مستقبل کی بات کرلے، اگر آپ "فائینلیٹی اللہ کے ہاتھ میں ہے" پر ایمان رکھتے ہیں، تو آپ کو پیش گوئی پر حتمی یقین نہیں آئے گا۔ چاہے وہ سچی ثابت ہو جائے پھر بھی ہمیں اس پر حتمی یقین نہیں کرنا چاہئے۔

نماز

میں نے قدرت اللہ کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری طرح وہ بھی بے نمازی ہے۔ وہ تو اتفاق کی بات تھی کہ ایک دن میں نے اسے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔

چھٹی کا دن تھا، میں اس کے گھر چلا گیا، میں نے عفت سے پوچھا، شہاب کہاں ہیں۔ بیڈ روم میں ہیں، اس نے کہا۔ میں بیڈ روم میں گیا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ میں نے پھر عفت سے پوچھا، میں نے کہا، بیڈ روم میں تو نہیں ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی کہنے لگی، پتہ نہیں کہاں ہیں۔ اس کی مسکراہٹ بڑی بامعنی تھی۔ میں پھر سے بیڈ روم میں گیا باتھ روم کا دروازہ کھولا تو ڈریسنگ روم میں قدرت نماز پڑھ رہا تھا۔

جب وہ باہر نکلا تو میں نے کہا، آپ چوری چوری نماز کیوں پڑھتے ہیں۔ کیا آپ بھی میری طرح اپنے مذہب پر شرمندہ ہیں۔

وہ مسکرایا، کہنے لگا، آپ شرمندہ ہیں کیا۔

میں نے کہا، بے حد شرمندہ ہوں۔ سارے ہی انٹلکچول شرمندہ ہوتے ہیں۔ بھائی جان

سے ملاقات کے بعد ایک روز مجھ میں بھی خواہش پیدا ہوئی تھی کہ نماز پڑھوں۔

توکیا نماز پڑھی آپ نے' اس نے پوچھا۔

ہاں دس پندرہ دن پڑھی۔ بڑے سیکورٹی ار ینجمنٹس کے ساتھ۔ پہلے چاروں طرف دیکھ کر تسلی کرلیتا کہ کوئی دیکھتا تو نہیں' پھر' چھپ چھپ کر وضو کرتا۔ پھر کمرے میں گھس کر اندر سے کنڈی لگالیتا۔

وہ ہنسنے لگا' ایسی تو کوئی بات نہیں۔

مطلب ہے کہ آپ ہجوم کے درمیان کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں کیا۔

کیوں نہیں' وہ بولا۔

اس سے دو ایک مہینے کے بعد جب ہم دورے پر کراچی گئے ہوئے تھے اور شام کے وقت صدر کے ایک فیشنی ریستوران کے بڑے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کمرہ گاہکوں سے بھرا ہوا تھا تو دفعتاً" مغرب کی اذان کی آواز سنائی دی۔ مجھے قدرت کی وہ بات یاد آگئی۔

میں نے کہا' آپ نے دعویٰ کیا تھا کہ آپ ہجوم کے درمیان کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اس نے مسکرا کر' سر اثبات میں ہلایا۔

کیا آپ اس کمرے میں نماز پڑھ سکتے ہیں' ابھی اس وقت' میں نے پوچھا۔

ہاں وہ بولا۔ بیرا' اس نے بلند آواز دی' جائے نماز لاؤ۔ بیرا حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ قدرت نے بڑے تحکم سے اپنا آرڈر دہرایا۔

کچھ دیر کے بعد ہوٹل کے مینجر نے دور سے کھڑے ہو کر ہماری طرف دیکھا پھر بیرے کو اشارہ کیا۔

بیرا قریب آیا بڑے احترام سے بولا' صاحب اندر نماز پڑھنے کا انتظام موجود ہے۔ آپ تشریف لے آئیں۔

نہیں' قدرت نے کہا' جائے نماز اس کمرے کے اس کونے میں بچھا دو۔

قدرت اس کھچا کھچ بھرے کمرے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ اور کمرے کے تمام لوگ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ڈیلے باہر نکل آئے تھے۔

خطوط

قدرت اللہ شہاب کی شخصیت تضادات سے بھری ہوئی تھی۔

بظاہر وہ ایک خاموش اور مرنجاں مرنجاں آدمی نظر آتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر ایک انقلابی چھپا بیٹھا ہے۔

بظاہر وہ ایک رسمی آدمی تھا۔ رسم و رواج کے مطابق جینے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ لوگوں کو شاک کرنے سے احتراز کرتا تھا' لیکن اندر سے وہ ایک انفرادی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے خیالات شدت سے منفرد تھے۔ وہ ہر بات میں انفرادی رائے رکھتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی انفرادیت کا منہ زبانی اظہار نہ کرتا تھا۔ لیکن اس کے اعمال و افعال سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ خیالات اور کردار کے لحاظ سے ایک منفرد شخص ہے۔

اس میں بلا کی جرأت تھی' لیکن بظاہر یوں لگتا تھا جیسے ایک جی حضوریہ ہے۔

۱۹۶۰ء میں میں نے قدرت اللہ شہاب کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا اس مضمون میں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کو سمجھنے کا عمل ایک ارتقائی عمل ہے' جس میں تین مقام آتے ہیں۔

چند ایک روز کی رفاقت کے بعد آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ اس کی شخصیت کو سمجھتے ہیں۔ وہ ایک سادہ' سنجیدہ' خوشگوار' ملنسار اور ہمدرد شخصیت کا مالک ہے۔

مزید قرب حاصل ہو جائے تو دفعتاً آپ محسوس کرتے ہیں کہ خوشگوار' ملنسار ہونے کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا بعد ہے۔ وہ قریب نہیں آتا۔ قریب آنے نہیں دیتا۔ آپ حیران ہوتے ہیں کہ یہ کیسی شخصیت ہے۔ دروازے چوپٹ کھلے ہیں لیکن اندر داخل ہونا دشوار ہے۔ آپ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر آپ پر واضح ہوتا ہے کہ آپ شہاب کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں سے واقف نہیں ہیں۔

اس کے بعد اگر قرب قائم رہے' تو ایک روز آپ پر انکشاف ہوتا ہے کہ شہاب کی شخصیت کا ایک پہلو کسی انجانی سمت سے تعلق رکھتا ہے' جس کا آپ احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس

وقت قدرت اللہ شہاب آپ کے روبرو اجنبی بن کر آ کھڑا ہوتا ہے۔

یوں شہاب کو جاننے کا عمل سمجھنے سے شروع ہو کر نہ سمجھنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک انوکھی بات ہے جس کا ادراک مشکل ہے اور جسے بیان کرنا بہت دشوار ہے۔

شہاب سے ملنے والے بیشتر لوگ تو پہلی ہی منزل پر رک جاتے ہیں۔ بہت کم لوگ دوسری منزل تک پہنچ پاتے ہیں اور تیسری منزل تک پہنچنا' شاید ہی کوئی پہنچا ہو' مجھے اس کا علم نہیں۔

قدرت میں ایک "میگنیٹک" قسم کی "ول پاور" ہے۔ وہ آپ کی توجہ کو باندھ سکتا ہے' کہ آپ کی توجہ اس حد تک آگے آئے' اس سے آگے نہیں۔

قدرت اللہ کو میں گزشتہ چھ سال سے جانتا ہوں۔ میں بھی دوسری منزل سے آگے نہیں جا سکا۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھے ادراک ہے کہ میں اس کی شخصیت کے ظاہری پہلوؤں سے واقف ہوں۔ "نیوکلس" سے واقف نہیں ہوں۔

قدرت اللہ سے پہلی بار ملکر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں افسری کی ٹیس سرے سے موجود نہیں اس وقت وہ بہت بڑے عہدے پر فائز تھا' چونکہ صدر پاکستان کا سیکرٹری تھا۔ رینک تو بڑا نہ تھا لیکن صدر پاکستان کے قرب کے حوالے سے بڑے بڑے افسر اسکی عزت کرتے تھی۔ اپنی طبعی کم گوئی اور سنجیدگی کے زور پر وہ افسروں سے وقت گزار رہا تھا۔ ادیبوں سے اس کا رویہ دوستانہ تھا۔

مقابلے کے امتحانات پاس کرنے میں اسے دسترس تھی۔ اس نے پہلے اکاؤنٹس کا امتحان پاس کیا۔ پھر پروانشل سروس کا اور پھر آئی سی ایس کا' تینوں امتحانوں میں پوزیشن حاصل کی' حالانکہ اس زمانے میں مسلمان کے لیے مقابلہ کا امتحان پاس کرنا بڑا مشکل تھا۔ قدرت کی یاد داشت "ویژیول" تھی۔ کتاب کا صفحہ سامنے آجاتا تھا۔ ممتحن کو شک پڑتا کہ نقل ماری ہے۔

قدرت میں قابلیت اور ذہانت تو تھیں۔ لیکن نہ قابلیت چمک مارتی تھی۔ نہ ذہانت' دیکھنے میں یوں لگتا جیسے گونگا پہلوان ہو' پڑھنے لکھنے سے واسطہ نہ ہو۔ البتہ ذہنی طور پر بڑا "الرٹ" تھا۔ دوکان میں مال تو تھا' لیکن شوونڈو کا وجود نہ تھا۔ ادیب تو تھا' جانا پہچانا ادیب تھا' لیکن شخصیت میں ادیبانہ رنگ نہ تھا۔ دانشور تو تھا لیکن بات کرنے کی نسبت بات سننے کا شوقین تھا۔ سٹیٹس کانشس نہ تھا طبیعت میں عجز کا رنگ غالب تھا۔ غربت پر نہ تو ناک چڑھاتا نہ معذرت

خواہ ہو تا۔ دوسروں کو اتنی عزت سے بلاتا تھا کہ تو تڑاخ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ لہٰذا مجھے بے تکلفی کا کوئی امکان نظر نہ آیا۔

اشفاق احمد نے قدرت کے ساتھ تو تڑاخ قسم کی گفتگو چلانے کی کوشش کی تھی۔ پتہ نہیں کیوں' حالانکہ اشفاق احمد بھی طبعی طور پر بے تکلفی کا اہل نہیں۔ جواب میں قدرت نے بھی وہی رنگ اپنانے کی سعی کی۔ قدرت کی یہ کوشش بہت بھونڈی تھی۔ ظاہر تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ قدرت کی شخصیت میں "او" اور "اوے" کہنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ اس کی شخصیت کا رنگ ایسا ہے کہ دوسرا آپ آپ کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ اس کی شخصیت پر محترم کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اس کے دوست' احباب' افسر' ساتھی ہم کار' عزیز رشتے دار سب اس کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔

پھر راولپنڈی میں صدر پاکستان کے دفتر میں میری تعیناتی ہو گئی اور میں قدرت اللہ کا ماتحت بن گیا۔ یوں مجھے قدرت اللہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جوں جوں میں اس کے قریب تر ہوتا گیا' توں توں مجھ میں حیرت جاگی۔ یا اللہ یہ کیسا انسان ہے۔ اس وقت مجھے یہ احساس نہ تھا کہ میں سمجھنے سے نہ سمجھنے کی طرف بہے جا رہا ہوں۔

ایک روز دفتر میں ایک سیٹھ آگیا۔ قدرت اللہ نے سیٹھ سے میرا تعارف کرایا۔ سیٹھ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا' یہ جو تمہارا افسر ہے نا' اس پر بھروسہ نہ کرنا' ورنہ مارے جاؤ گے' میں نے پوچھا' کیسے' بولا۔ دیکھو ہم پاکستان کا سیٹھ ہے۔ ہمارا دستور ہے کہ عید پر ہم بڑے افسروں کو عیدی بھیجتا ہے۔ اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ نہ ہم سفارش کرانا چاہتا ہے' نہ کوئی کام کرانا چاہتا ہے۔ ہم تو محبت کی عیدی بھیجتا ہے۔ جب یہ شہاب کراچی آیا تو عید پر ہم نے اس کو بھی عیدی بھیجی۔ اس نے ہمیں فون کیا بولا' سیٹھ ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی بھیجی ہوئی عیدی یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ۔ ورنہ ہم پولیس کو رپورٹ کر دے گا۔

اس پر شہاب نے کہا' جب سیٹھ صاحب کی عیدی آئی تو میں گھر پر نہ تھا واپس آیا تو دیکھا کہ ایک کمرہ مٹھائی کے ٹوکروں سے بھرا ہوا ہے اور دوسرے کمرے میں کپڑے کے تھانوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔

سیٹھ بولا' تو ہماری فہرستیں دیکھ لے بابا۔ ہم ہر اہلکار کو اتنی ہی عیدی بھیجتے ہیں۔ شہاب کو

ہم نے خصوصی عیدی نہیں بھیجی تھی۔

جب سیٹھ چلا گیا تو میں نے شہاب سے پوچھا' یہ کیا کہہ رہا تھا۔

شہاب بولا' یہ سیٹھ ہمیشہ کھری بات کرتا ہے۔ ذرا نہیں جھجکتا۔ خوب آدمی ہے۔

پھر ایک عامل قدرت اللہ سے ملنے کے لیے آگیا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ حالانکہ کپڑے ٹھیک ٹھاک تھی۔ پھر بھی احساس ہو رہا تھا کہ میلا ہے' غلیظ ہے۔ وہ دیر تک قدرت سے عجیب سی باتیں کرتا رہا۔ چلا گیا تو میں نے پوچھا' یہ کون حضرت تھے۔ کہنے لگا' ایک زبردست عامل ہے' شیطانی قوتیں زیر کر رکھی ہیں۔ لوگوں سے اعلانیہ پیسے بٹورتا ہے' بلیک میل بھی کرتا ہے۔ لیکن لوگوں کے کام کر دیتا ہے' بہت خوب آدمی ہے۔

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ کیسی منطق ہے۔ اول درجے کا شیطان ہے' رقم بٹورتا ہے' بلیک میل کرتا ہے۔ لیکن بہت خوب آدمی ہے۔

افراد کے متعلق قدرت اللہ کی رائے دکھلاوے کی نہیں ہوتی تھی۔ نہ ہی وہ احتیاط کی وجہ سے کمٹ منٹ کرنے سے گریز کرتا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ کسی کے متعلق منفی رائے قائم کرنا نہیں چاہتا تھا وہ تفریحی غیبت سے بھی گریز کرتا تھا۔

قدرت کا گھر

قدرت اللہ کے گھر کے کوائف عام گھروں سے قطعی طور پر مختلف تھے۔

مثلاً قدرت کی بیگم ڈاکٹر عفت ایم بی بی ایس تھیں' لیکن گھر میں کوئی بیمار پڑتا تو بازار سے دو شاندہ منگوایا جاتا۔ مکہ معظمہ میں حج کے دوران محترمہ کیمسٹوں کی دوکانوں پر ایسبغول تلاش کرتی رہیں۔ جب قدرت اللہ ہالینڈ میں سفیر تھے تو محترمہ پاکستان سے ترپھلا منگوایا کرتی تھیں۔ پانچ روپے کے ترپھلا پر چالیس روپے محصول ڈاک کا خرچ آتا تھا۔ محترمہ یوں شوقیہ نفل پڑھا کرتی تھیں' جیسی آج کل لوگ وٹامن کی گولیاں پھانکتے ہیں۔

قدرت کا بیٹا ثاقب شہاب' کے جی' میں پڑھتا تھا۔ گھر میں سبھی اسے پیار سے مولوی صاحب کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ یہ اس کا پٹ نیم تھا۔ عمر کے لحاظ سے مولوی صاحب کی سائنسی معلومات بہت وسیع تھیں۔ بات بات پر مولوی صاحب کہا کرتے تھے' سائنس پڑھتا ہوں کوئی مذاق تھوڑا

ہے۔

ایک بار قدرت پتلون کا ناپ دینے درزی کی دکان پر گیا' مولوی صاحب ساتھ تھے۔ قدرت نے پتلون کی موری کے متعلق ہدایات دیں تو مولوی صاحب بولے' ابو اگر آپ غرارے پہنیں گے تو میں آپ کو اپنے ساتھ باہر نہیں لے کر جایا کروں گا۔

چھ برس کی رفاقت میں میں نے صرف ایک بار قدرت کو غصے میں آتے دیکھا ہے۔ شام کا وقت تھا۔ میں قدرت کے گھر میں بیٹھا تھا۔ ایک سائل آگیا' اس نے اپنی بدقسمتی اور مفلوک الحالی کا تذکرہ سنانا شروع کر دیا۔ چونکہ اہل زبان تھا' اس لئے چٹخارے لے لے کر بیان کرتا رہا' قدرت اسے تسلیاں دیتا رہا' گھبرایئے نہیں۔ اللہ نے چاہا تو گزارے کی کوئی صورت بن جائے گی۔

آخر میں سائل اٹھ بیٹھا اور غصے میں بولا' لعنت بھیجئے اس ملک پر جس کی خاطر ہم تباہ حال ہوئے اور پیشتر اس کے کہ وہ جملہ ختم کرتا قدرت نے اٹھ کر اس کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ مارا اور بولا' گٹ آوٹ۔

قدرت کا کہنا ہے کہ غصہ آتا ہے تو اسے آنے دو' روکو نہیں' نہ ہی خود میں جذب کرو۔ رد عمل پیدا نہ ہو۔ چھلنی بن جاؤ کہ وہ گزر جائے قیام نہ کر سکے۔

ادیب

قدرت اللہ ایک جانا پہچانا ادیب تھا اس کے باوجود اس کی گفتگو یا رویے سے کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ اسے ادب سے کوئی تعلق ہے۔ ادب عام طور پر شخصیت پر چھاپ لگا دیتا ہے' جو چھپائے نہیں چھپتی۔ قدرت کی شخصیت پر ایسی کوئی چھاپ نہ تھی۔

نفسیات کی رو سے ادیب کی شخصیت میں تضاد' نمائش اور شدت تین بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔

ادیب کی شخصیت فقیر خانے کے مصداق ہوتی ہے جہاں معذور شہنشاہ بستے ہیں' جہاں گونگے بولتے ہیں' اندھے دیکھتے ہیں' لنگڑے دو پاؤں پر چلتے ہیں۔

اپنے دکھ کو بھلانے اور دوسروں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھکنڈے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ کوئی علاج بالمثل کو اپنا کر ابوالدکھ حفیظ جالندھری کی طرح

دکھ کی دکان سجا کر بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی ثناء اللہ جٹادھاری روپ دھار کر لوہے کے گولوں کا تماشہ دکھاتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے ہم ثناء اللہ نہیں' میرا جی ہیں۔ ثناء اللہ کون تھا۔ ہم اسے نہیں جانتے۔ کوئی کالی شلوار لہرا لہرا کر کہتا ہے' اگر میں پنجاب پرلیس برانچ کے مولوی محمد حسین کو ننگی کا ناچ نہ نچادوں تو میرا نام منٹو نہیں۔ کوئی اشفاق احمد کی طرح تلقین شاہیاں ایجاد کر لیتا ہے۔ کوئی سادھو منش انشا کی طرح مزاح کی قبا اوڑھ کر قہقہے لگاتا پھرتا ہے۔

قدرت میں نہ نمائش تھی' نہ شدت' نہ تضاد۔ اس کے کردار میں نمائش کا فقدان تھا۔ اس کی تحریر میں چونکا دینے والی کوئی بات نہ تھی۔ اس کے جملوں میں توجہ طلبی کا عنصر نہ تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت ادب کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔ اسے ایک ضمنی یا تفریحی چیز سمجھتا ہے۔

قدرت میں ایک عجیب خصوصیت تھی۔ اس نے کبھی کسی کو نصیحت نہ کی تھی۔

دوسروں کو روکنا ٹوکنا نصیحتیں کرنا بڑوں کا عام دستور ہے۔ دوسرا بات مانے یا نہ مانے' چاہے گھر جا کر مضحکہ اڑائے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دوسروں کو نصیحت کرنا بذات خود ایک خوش کن عمل ہے۔ ایک ساعت کے لیے نصیحت کرنے والے کی حیثیت پیدا ہو جاتی ہے۔ برتری کا احساس' اجلے پن کی لذت' بزرگی کا زعم' نصیحت کرنا ایک عام سی عشرت ہے۔ معصوم سی لذت۔

اگر آپ چند ساعت کے لیے اجلے کپڑے پہن کر میلے لوگوں کو صفائی کی تلقین کریں۔ تو یہ معصوم سی بات ہے۔ قدرت اللہ اس عوامی لذت سے سراسر منکر ہے وہ کبھی اجلے کپڑے پہن کر آپ کے پاس نہیں بیٹھے گا۔ اس نے کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے ظاہر ہو کہ وہ دوسروں سے برتر ہے۔ اس نے کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' غیر مناسب ہے۔ آپ اس کے پاس بیٹھ کر شراب پئیں۔ وہ ٹوکے گا نہیں۔

ایک روز دفتر میں ایک اعلیٰ افسر قدرت اللہ سے ملنے آ گیا۔ اس نے بڑے پتے کی بات کہہ دی۔ کہنے لگا' کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمارے دل میں بھی پاکستان کا درد ہے۔ ہم بھی صبح شام کام کرتے ہیں۔ ملک کے لیے جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن جب نکتہ چینی کا موقعہ ہوتا ہے تو لوگوں کی زبان پر ہمارا نام آ جاتا ہے اور جب واہ واہ کی محفل جمتی ہے تو لوگ شہاب' شہاب

کرنے لگتے ہیں۔

بے شک نیک نامی قدرت اللہ کے مقدر میں لکھی ہے۔ تمام افسر ماتحت' کارکن' چپڑاسی' حتیٰ کہ عام لوگ قدرت اللہ کے گن گاتے تھے۔

دفتر میں روزانہ بیسیوں لوگ قدرت اللہ سے ملنے آتے تھے جو ملنے میں کامیاب ہو جاتے وہ خوشی خوشی گھر لوٹ جاتے' جیسے مل لینا ہی تکمیل کار ہو۔ جنہیں مسلسل انتظار کے بعد ناکام جانا پڑتا تھا۔ وہ بھی اپنی ناکامی کا باعث قدرت کو نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ حالات کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔

دفتر میں قدرت کے نام کئی ایک خط موصول ہوتے تھے۔ ان خطوط میں عام طور پر قدرت کی تعریف و توصیف ہوتی تھی۔ اپنی تعریف پڑھ کر وہ جھینپ جاتا تھا۔ وہ ان خطوں کا جواب نہیں دیتا تھا۔ کبھی کبھار ایسا خط بھی موصول ہوتا جس میں قدرت کے خلاف شکایات لکھی ہوتیں۔ اس کے رویے پر کڑی نکتہ چینی ہوتی ایسا خط دیکھ کر اس کے چہرے پر بشاشت کے آثار ظاہر ہوتے۔ ایسے خط وہ ملنے والوں کو پڑھنے کے لیے دے دیتا۔ اور پھر بغیر تاخیر کے جواب لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔

صدر گھر کے چپڑاسی قدرت اللہ پر بہت خوش تھے۔ وہ اس کے روبرو نجی باتیں کرنے سے بالکل نہ گھبراتے تھے۔

قدرت کی بیگم ڈاکٹر عفت ہر روز صبح شام دو مرتبہ صدر گھر کے گرد و نواح میں مقیم جونیئر سٹاف کے گھروں کے راؤنڈ لگاتی تھیں۔ بیماروں کو دوائیں دیتیں اور ساتھ ہی دودھ پینے کے لیے رقم بھی۔

قدرت کی نیک نامی کو دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا' یہ سونے کا چمچہ اسے کس نے عطا کیا' کہ سبھی اس کے گن گانے پر مجبور ہیں۔ حالانکہ اس میں کسی کا دوست بننے کی صلاحیت سرے سے ہی موجود نہیں۔ اس کی شخصیت میں وہ کھونٹیاں تھیں ہی نہیں' جن پر دوستی کی گٹھڑی ٹانگی جا سکتی ہے۔

اوصاف ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں لاتے' کمزوریاں لاتی ہیں۔ بے بسیاں' محتاجیاں' کج رویاں لاتی ہیں۔ شاید اس کے جواز میں کہا جائے کہ قدرت اللہ ایک نیک آدمی

ہے۔

یقین جانئے کہ میں نیک آدمیوں کی عزت کرتا ہوں۔ انہیں احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں' لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے نیک آدمی سے عجیب سی بو آتی ہے۔ نیک آدمی قریب آئے تو مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کا بند بند چلا چلا کر کہہ رہا ہو' ہٹو۔ بچو نیک آدمی آرہا ہے' با ادب باملاحظہ ہوشیار۔ پتہ نہیں کیوں نیک آدمی میں نیکی کے اتنے ڈھیر لگ جاتے ہیں کہ آدمی دب جاتا ہے۔

بے شک قدرت اللہ ایک نیک آدمی ہے۔ لیکن اس میں سے نیکی کی بو نہیں آتی۔ اس کی آمد پر ہٹو بچو کا احساس نہیں ہوتا' قریب جاکر گھبراہٹ نہیں ہوتی۔

محبت

قدرت اللہ کی محبت کے کوائف بھی الوکھے تھے۔

قدرت جنس کی اہمیت سے منکر نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ جنس کے شعلے کی آگ کو جذب کر کے معدوم کردو تاکہ صرف روشنی ہی روشنی باقی رہ جائے۔

نوجوانی کے اولین دور میں قدرت کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ اس کی بڑی سے بڑی آرزو یہ تھی کہ محبوبہ ایک جائے نماز پر اس کے ساتھ کھڑی ہو کر نماز پڑھے۔ حیرت کی بات ہے کہ محبوبہ اس کے ساتھ کھڑی ہو کر نماز پڑھا کرتی تھی۔

پھر اس کی زندگی میں ایک حسین و جمیل بیگم داخل ہوئی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ اس کے گھر نوجوان اور ادھیڑ عمر شوقین مزاجوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ بیگم کو عشاق کی بھیڑ لگانے سے دلچسپی تھی۔ قدرت بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا اور ایسا جادو جگایا کہ بھیڑ چھٹ گئی۔ رنگ رلیوں کی جگہ قرآن خوانی ہونے لگی' لیکن محترمہ آگ کو نہ تیاگ سکی۔ شعلہ عام سے ہٹ کر مخصوص ہو گیا۔ شعلوں کی شوقین روشنی پیدا نہ کر سکی۔ جب اس نے دیکھا کہ کسی صورت بات نہیں بنتی تو وہ قدرت کو اپنے شعلے سے بھسم کرنے کے لیے آگے بڑھی۔ قدرت اپنے کپڑے بچاتا ہوا بھاگا۔ پر یہ تعلق ایک المیہ میں بدل گیا۔

قدرت محبت میں بڑا ظالم ہے' وہ دیتا نہیں لیتا ہے۔ محبوبہ کے شعلے کو بھسم کر کے اسے

روشنی میں بدل دیتا ہے' ٹھنڈی روشنی جو جلاتی نہیں بلکہ منور کرتی رہتی ہے۔

دراصل محبت میں قدرت بہت بڑا خود غرض فرد ہے۔ وہ محبوبہ کے شعلوں کو کام میں لاتا ہے۔ اس سے حدت حاصل کرتا ہے اور پھر اس حدت کو روشنی میں بدل کر خود کو منور کر کے کسی اور سمت متوجہ ہو جاتا ہے۔

قدرت ایک انوکھا تپسوی ہے جس کی خواہش ہے کہ کوئی راج نرتکی اس کے گیان دھیان کو توڑنے کے لیے اس کے گرد ناچ ناچ کر ہار جائے اور پھر تپسوی کے چرنوں میں بیٹھ کر خود گیان دھیان میں کھو جائے اور بالآخر تپسوی سے بے نیاز ہو کر کسی اور طرف متوجہ ہو جائے۔

اس لحاظ سے قدرت ایک اتیہ چار ہے جو ازلی خواہش کا رخ بدلنے کے لیے عورت کو استعمال میں لاتا ہے۔ جو تن کی آگ کو نور میں بدلنے کے لیے نسائی شعلے کو از خود قرب کی دعوت دیتا ہے۔ وہ انوکھا فن کار ہے جو آگ کو آگ سے بجھاتا ہے۔ ڈوبنے سے بچنے کے لیے پانی میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

میں نے راج نرتکیوں کو اس کے گرد جسم کا ناچ ناچتے دیکھا ہے۔ ایسی راج نرتکیاں جن کے ایک آسن کا متحمل ہونا مشکل نظر آتا تھا۔ میں نے قدرت کو ان کے درمیان بدھ بنے بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔

آگ کو نور میں بدلنے کی جانکاہ جدوجہد میں میں نے اسے سمندر کے ساحل کی تپتی ریت پر مگرمچھ کی طرح تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔

قدرت کے متعلق بزرگوں کے خط آیا کرتے تھے جن میں لکھا ہوتا کہ یہ شخص دین اور دنیا دونوں لوٹ لے گیا ہے۔ دین کے بارے میں تو مجھے علم نہیں۔

دنیا لوٹنے کی ایک تفصیل ملاحظہ ہو۔

سکندر مرزا کے دور میں صدر گھر میں رکشا کا داخلہ ممنوع تھا لیکن قدرت اللہ روز دفتر رکشے میں آتا تھا جب قدرت کا رکشا چیختا چلاتا' دھواں اڑاتا صدر گھر میں داخل ہوتا تو سکندر مرزا قلم رکھ کر بیٹھ جاتے' ماتھے پر تیوری پڑ جاتی۔

ایک روز جب قدرت کے رکشے نے بہت اودھم مچایا' تو وہ میٹنگ میں تھے۔ بولے کوئی

ہے' جو ہمیں اس رکشے سے نجات دلائے۔ یہ سن کر سارا دفتر حرکت میں آگیا۔ مشوروں اور پیشکشوں کا تانتا بندھ گیا۔

کسی نے کہا صدر گھر میں موٹریں بے کار کھڑی رہتی ہیں۔ آپ چاہیں تو ایک آپ کے ہاں بھجوا دیں۔ دوسرا بولا' آپ پسند کریں تو ڈیوٹی کار آپ کو دفتر لے آیا کرے۔

پھر بات کراچی کے سیٹھوں تک پہنچی۔ کئی ایک سیٹھوں نے کار تحفے کے طور پر دینے کی پیش کش کر دی۔

آخر ایک کلرک کو سوجھی بولا' حضور پسند کریں تو جی پی فنڈ سے کار خریدنے کی عرضی لکھ لاؤں۔ حساب کتاب جوڑنے پر معلوم ہوا کہ کاٹ کٹوتی کے بعد قدرت کی نقد تنخواہ ایڈمنسٹریٹو افسر جتنی بنتی تھی۔ کلرک بولا۔ جناب رول قانون کے مطابق آپ کار خرید سکتے ہیں اور رقم قسطوں میں ادا کر سکتے ہیں۔

بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت نے ایک کار خرید لی۔

چونتیسواں باب

غفور ایڈووکیٹ

قدرت اللہ شہاب کے گھر بچہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر ہوتا بھی تو یا تو پیدائش سے پہلے ضائع ہو جاتا' یا پیدائش کے بعد چند دنوں میں فوت ہو جاتا۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میاں اور بیوی دونوں میں خونی نامناسبت ہے۔ اس لیے ماں کا جسم بچے کی پرورش کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

کئی ایک بہی خواہوں نے قدرت کو مشورہ دیا تھا کہ اولاد کے لیے دوسری شادی کر لیں۔ قدرت یہ مشورہ سن کر مسکرا دیتا تھا۔ اس نے ایسے مشوروں کو کبھی جواب نہ دیا تھا۔ عفت خود ڈاکٹر تھی۔ وہ اس مسئلے کے متعلق پوری واقفیت رکھتی تھی' لیکن اس نے اس موضوع پر کبھی اظہار خیال نہ کیا تھا۔

قدرت اللہ کو بزرگوں کے خط اکثر موصول ہوتے رہتے تھے۔ ان خطوط میں لکھا ہوتا۔ ہم نے سنا ہے کہ آپ کے گھر بچہ نہیں ہوتا' ہم دعاگو ہیں کہ اللہ اپنے فضل و کرم سے آپ کو بچے سے نوازے۔

بچہ کیوں نہ ہو

قدرت سے ملنے کے بعد بھائی جان نے عفت کو بیٹی بنا لیا تھا۔ اس بات پر میں بہت حیران

ہوا تھا۔ چونکہ بھائی جان اصولی طور پر کسی خاتون سے نہیں ملا کرتے تھے۔

پھر بھائی جان اس بات کا غم کھانے لگے کہ عفت کے گھر بچہ کیوں نہیں ہوتا۔

بھائی جان اکیلے میں بیٹھے بیٹھے بڑبڑانے لگتے۔ کیوں نہ ہو عفت بیٹی کے گھر بچہ' کیوں نہ ہو۔ حالانکہ قدرت یا عفت نے کبھی ان سے درخواست نہ کی تھی کہ وہ بچے کے لیے دعا کریں۔

پھر ایک دن بیٹھے بٹھائے بھائی جان کہنے لگے' کیوں نا ہم عفت بیٹی کو کالی مرچیں دم کر کے دیں۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے' ہم نے کبھی کسی کو کالی مرچیں دم کر کے نہیں دیں' لیکن مفتی صاحب بیٹی کے لیے انسان کیا نہیں کرتا۔ اس کے بعد بھائی جان نے عفت کے لیے کالی مرچیں دم کر کے دینی شروع کر دیں۔

عفت بھی بھائی جان کا بڑا احترام کیا کرتی تھی۔ ان کے احکامات پر پوری طرح عمل کیا کرتی تھی۔ کہتی تھی' میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایک ہمدرد باپ مل گئے ہیں۔

بچہ ہو گا

پھر ایک دن شہاب کے نام ایک خط موصول ہوا۔ لکھا تھا۔ مکرمی' میں آپ کو ذاتی طور پر نہیں جانتا' نہ ہی کبھی آپ سے ملنے کا موقعہ ملا۔ لیکن آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں باقاعدگی سے تہجد کے وقت حاضری دیتا ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے کبھی ناغہ نہیں ہوا۔

جب سے میں نے سنا تھا کہ آپ کے گھر بچہ نہیں ہوتا' تب سے میں تہجد میں بلاناغہ آپ کے لیے اولاد کی دعا کرتا رہا ہوں۔

کل رات میری گود میں ایک بچہ ڈال دیا گیا اور حکم ہوا کہ آپ کو یہ خوش خبری سنا دوں کہ ایک سال کے اندر اندر اللہ تعالیٰ آپ کو ایک بیٹے سے نوازیں گے۔

یہ خط خوشاب کے ایک ایڈووکیٹ غفور صاحب کی جانب سے تھا۔ قدرت نے اس خط کو چنداں اہمیت نہ دی۔

بزرگوں کی جانب اس کا رویہ عجیب سا تھا۔ جب بھی کسی بزرگ سے ملتا تو اس کی بڑی

عزت کرتا تھا۔ بزرگ کوئی بات کرتا' تو بڑے احترام سے جی ہاں کرتا رہتا۔ مگر اس کی بات کو عملی طور پر چنداں اہمیت نہ دیتا۔

مثلاً ایک بزرگ کا مدینہ منورہ سے خط موصول ہوا لکھا تھا کہ ہم مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر آپ کے لیے دعائیں کر رہے ہیں۔

خط پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ لیکن قدرت پر کوئی اثر مرتب نہ ہوا۔

میں نے کہا' دیکھئے کتنی بڑی بات ہے کہ ایک بزرگ مسجد نبوی میں بیٹھ کر آپ کے لیے دعائیں کر رہے ہیں۔ لیکن آپ میں شکر گزاری کا جذبہ پیدا نہیں ہو رہا۔

اس نے سرسری طور پر لیکن بڑی سنجیدگی سے کہا' شاید ان کی ڈیوٹی لگی ہوئی ہو کہ مسجد نبوی میں بیٹھ کر ہمارے لیے دعائیں کریں۔ وہ اپنی ڈیوٹی ادا کر رہے ہیں۔

یہ بات سن کر میں چونکا۔ اس کی بات میں تفاخر کی جھلک تھی۔ لیکن تفاخر تو اس کے کردار میں نہیں تھا۔ اس کے برعکس اس کے کردار کا بنیادی وصف تو عجز تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔

پھر دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ عام لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ عجز سے بھیگا ہوتا ہے' لیکن بزرگوں کے متعلق اس کے رویے میں تفاخر کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ یہ دورخی میرے لیے حیران کن تھی۔ مرد قلندر سائیں اللہ بخش کے متعلق بھی اس نے کتنی بے حسی سے کہا تھا' ہاں ایک سایہ سا میری گاڑی کے ساتھ ساتھ متحرک رہتا ہے۔ بہرحال خوشاب کے ایڈووکیٹ کے خط کو چنداں اہمیت نہ دی گئی۔

ایک سال کے اندر اندر لندن سے خبر آئی کہ عفت کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ ان دنوں عفت لندن گئی ہوئی تھی۔

اس خبر کے موصول کرنے کے بعد بھی خوشاب کے ایڈووکیٹ کے خط کا کسی کو خیال نہ آیا۔

کراسڈ فنگرز

قدرت لندن سے واپس آیا تو اس نے بھائی جان کو ثاقب کی پیدائش کے متعلق تفصیلات سنائیں۔

کہنے لگا' مجھے ڈاکٹر نے بتایا کہ عفت کے پیٹ کی روز پیمائش ہوتی تھی۔ ایک روز پیمائش کی تو دیکھا کہ پیٹ سکڑ گیا ہے۔ مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ شاید بچہ ضائع ہو گیا ہے۔ میں نے مریضہ سے کہا کہ ان حالات میں آپریشن ضروری ہے' بچے کو بچانے کا یہی واحد امکان ہے۔ شاید بچہ بچ جائے' لیکن یہ بات یقینی نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے کہا کہ حیرت کی بات تھی کہ عفت آپریشن کرانے پر رضامند ہو گئی۔ حالانکہ ان حالات میں کوئی ماں آپریشن کرانے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

عفت نے کہا' آپریشن کیجئے لیکن مجھے بیہوش نہ کیجئے میں بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

ڈاکٹر نے کہا' عفت کی یہ خواہش بھی حیران کن تھی۔ بچے کو دیکھنے کے لیے وہ آپریشن کی تکلیف کو جھیلنے کے لیے تیار تھی۔

ہم نے اس کی خواہش کا احترام کیا۔ اسے کلوروفارم نہ دیا بلکہ لوکل اینستھیسیہ کر دیا۔ اٹھارہ ٹیکے لگائے' لیکن اثر نہ ہوا۔ آپریشن کے دوران وہ ہوش میں تھیں۔ دو کٹ لگائے۔ بچہ نکالا۔ بچے میں زندگی کا کوئی آثار نہ تھا۔ صرف یہ ہوا کہ بچے کا پیشاب خطا ہو گیا۔ عفت بچے کو مردہ دیکھ کر غش کھا کر' بے ہوش ہو گئی۔

بچے کو ہم نے انکیوبیٹر میں ڈالا۔ دو گھنٹے مردہ حالت میں پڑا رہا۔ ڈاکٹر نے کہا' حیرت کی بات ہے کہ مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی۔ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں' خدا کو نہیں مانتا۔ ایسے کیسز ہمارے پاس روز آتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں میں اس بچے کے انکیوبیٹر کے پاس دو گھنٹے بیٹھا رہا۔ اور اپنی انگلیوں سے صلیب بنا کر بیٹھا رہا' یوں جیسے دعا کرتے ہیں۔ حالانکہ میڈیکل سائنس کے لحاظ سے یہ بچہ مردہ تھا۔ اور اس کے پاس بیٹھ کر دعا کرنا بے معنی تھا۔

ڈاکٹر نے کہا' پورے پانچ گھنٹے کے بعد ماں کو ہوش آیا۔ اس نے اشارے سے پوچھا کہ کیسا ہے۔ میں نے سچ سچ بتا دیا۔ پھر بچے میں زندگی کے آثار پیدا ہونا شروع ہوئے۔ یہ حیرت کی بات تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

عفت لندن سے آئی تو اس نے بتایا کہ میں نے پوری توجہ بھائی جان پر مرکوز کر رکھی تھی۔ بھائی جان کی قمیض کے دو ایک ٹکڑے میں نے اپنے جسم پر باندھ رکھے تھے۔

ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو مجھے پتہ چل گیا کہ امید کی کوئی صورت نہیں۔ پھر جب توقع کے

خلاف بچے نے حرکت کی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ دس دن انہوں نے مجھے بچے کو دیکھنے نہ دیا۔ چونکہ اسے زکام تھا۔ دس دن ہم ہسپتال میں رہے۔ نرسیں نہیں چاہتی تھیں کہ ہم ہسپتال چھوڑیں۔ وہ ثاقب کو چمکیلی آنکھوں والا بچہ کہہ کر بلایا کرتی تھیں۔

عفت نے کہا کہ شہاب دو دن پہلے لندن پہنچ گئے تھے۔ لیکن جاتے ہی بیمار ہو گئے۔ بخار تھا۔

ڈاکٹروں نے بچے کو دیکھنے کی اجازت نہ دی۔ ہم دونوں ہسپتال میں مقیم تھے۔ لیکن بچے کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی۔

بھائی جان نے کہا ہماری تمام تر توجہ عفت بیٹی پر مرکوز رہتی تھی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے سینے میں ایک تیر چل گیا۔ ہمارا تو دل ڈوب گیا۔ ثاقب کا فکر لگ گیا۔ جو ہماری حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔

ثاقب کی پیدائش پر سول افسروں کا مطالبہ تھا کہ ایک جشن منایا جائے۔

قدرت نے سی ایس پی افسروں کی دعوت کی' لیکن اس دعوت میں ناچ گانے کی جگہ قوالی کا انتظام کیا۔ ڈرائنگ روم میں فرش بچھا دیا گیا۔ مہمانوں کو فرش پر بٹھایا اور قوالی کی محفل شروع ہو گئی۔

قدرت کا یہ اقدام عام رواج سے ہٹ کر تھا' منفرد تھا۔ قدرت کی عادت میں داخل تھا' وہ ہمیشہ کوئی نا کوئی ایسی بات عمل میں لاتا تھا' جس پر لوگ حیران ہوتے تھے۔

بے وقت ملاقاتی

قوالی کی محفل جوبن پر تھی کہ گھنٹی بجی۔

ایک نوکر میرے پاس آیا۔ کہنے لگا' جناب باہر ایک صاحب تشریف لائے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھے شہاب صاحب سے ملنا ہے۔ انہیں ایک ضروری پیغام دینا ہے۔

میں نے کہا شہاب صاحب تو اس وقت مہمانوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کا باہر جانا مشکل ہے۔ آپ ان سے پیغام لے لیں۔

نوکر نے کہا' جناب میں نے انہیں بتایا تھا کہ صاحب کا اس وقت آپ سے ملنا مشکل ہے'

لیکن وہ کہتے ہیں پیغام کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا۔

یہ سن کر میں خود باہر گیا۔

دروازے پر ایک چھوٹے قد کا آدمی کھڑا تھا۔ اس کی ڈاڑھی مہندی رنگی تھی۔ انداز عوامی تھا۔ وہ شخص بڑے اخلاق سے مجھے ملا۔ کہنے لگا۔ میرا نام غفور ہے۔ میں خوشاب کا رہنے والا ہوں۔ ایڈووکیٹ ہوں اور لاہور میں پریکٹس کر رہا ہوں۔

دفعتاً" مجھے یاد آیا۔ اچھا تو یہ صاحب وہ غفور ایڈووکیٹ ہیں۔ جن کی گود میں تہجد کے دوران ایک بچہ ڈال دیا گیا تھا اور انہیں کہا گیا تھا کہ قدرت اللہ کو یہ خوش خبری سنا دیں کہ ایک سال کے اندر اندر ان کے گھر بیٹا ہو گا۔

میرے دل میں غفور صاحب کے لیے گہرا جذبہ احترام پیدا ہوا۔

میں انہیں بڑی عزت سے ریسیپشن میں لے آیا۔ کرسی پر بٹھایا۔ میں نے کہا' جناب' میں نے آپ کا خط پڑھا تھا' جو آپ نے قدرت اللہ کو لکھا تھا۔

غفور کہنے لگے' جناب مجھے شہاب صاحب سے بڑی شکایت ہے۔ انہوں نے میرے خط کا جواب نہ دیا۔ چلئے خط کا جواب نہ دیتے' لیکن جب بچہ پیدا ہوا تھا' اس وقت تو مجھے اطلاع دیتے۔

آپ بجا کہتے ہیں۔ کیا آپ کبھی شہاب صاحب سے ملے ہیں' میں نے پوچھا۔

جی نہیں' وہ بولے' ملاقات کا موقعہ نہیں ملا البتہ اخباروں میں ان کی تصویریں دیکھتا رہتا ہوں۔

میں نے کہا جناب اس وقت یہ پوزیشن ہے کہ اندر قوالی ہو رہی ہے اور سی ایس پی افسر شہاب صاحب کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کا باہر آنا ممکن نہیں۔

ٹھیک ہے' میں سمجھتا ہوں' وہ بولے' دراصل میں مدینہ منورہ سے آیا ہوں اور مدینہ منورہ کے ایک درویش نے مجھے دو تحفے دیئے تھے ایک میرے لیے دوسرا اس بچے کے لیے اور مجھے حکم دیا تھا کہ وطن پہنچتے ہی یہ تحفہ پہنچا دیا جائے۔ لیکن میں پہلے بچے کو دیکھوں گا۔ دیکھنے کے بعد تحفہ پیش کروں گا۔

میں نے کہا' جناب تشریف رکھیں میں بچے کی والدہ کو بلا لاتا ہوں۔

میں نے عفت سے بات کی تو اسے بھی غفور صاحب کا خط یاد آگیا۔ وہ بڑے شوق سے غفور صاحب سے ملنے کے لیے باہر نکلی۔

میں نے غفور صاحب سے کہا' آپ ان سے بات کرلیں۔ میں باہر آپ کا انتظار کروں گا۔

غفور کا حج

پون گھنٹے کے بعد غفور صاحب باہر نکلے۔ میں حیران تھا کہ پیغام تو چھوٹا سا تھا۔ باتوں میں اتنی دیر کیسے لگ گئی۔

بہرحال غفور صاحب میرے ساتھ بیٹھ گئے۔

میں نے پوچھا آپ حج کرنے گئے تھے یا عمرہ کرکے آئے ہیں۔

غفور صاحب بولے' میں حج کرکے آیا ہوں۔

میں نے حج کے لیے عرضی دی۔ والدہ میرے ہمراہ جا رہی تھیں' لیکن ہماری عرضی منظور نہ ہوئی۔ مجھے مدینہ شریف میں حاضری دینے کا بہت شوق تھا۔ بڑی امید باندھ رکھی تھی۔ پوری نہ ہوئی' تو دھچکا لگا۔ بہرحال میں تہجد میں آہ و زاری کرتا رہا۔

پھر ایک خواب دیکھا۔ دیکھا کہ ایک صاحب آئے اور انہوں نے جدہ کا ٹکٹ میری جیب میں ڈال دیا۔

اگلے روز پتہ چلا کہ کچھ لوگ جنہوں نے حج پر جانے کی عرضی دے رکھی تھی اور وہ منظور ہو چکی تھی' لیکن حالات کی وجہ سے انہوں نے حج پر جانے کا ارادہ توڑ دیا ہے۔ لہٰذا میری عرضی پر نظرثانی کی گئی ہے اور منظوری دے دی گئی ہے۔

میری آرزو تھی کہ سیدھا مدینہ شریف پہنچوں۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ مکہ شریف پہنچا تو جی چاہا کہ حج پر روانہ ہونے سے پہلے ایک بار مدینہ شریف کی حاضری دے آؤں۔

ویسے اس خواہش کا پورا ہونا تقریباً ناممکن تھا ان دنوں مکے سے مدینہ شریف کو کوئی گاڑی نہ جاتی تھی۔ اس کے باوجود میں اللہ کے حضور آہ و زاری کرتا رہا' دعائیں کرتا رہا۔

پھر وہی خواب دیکھا' ایک صاحب آئے اور انہوں نے ایک ٹکٹ میری جیب میں ڈال دیا۔

میں والدہ صاحب کو لے کر مدینہ شریف کی سڑک پر جا کھڑا ہوا۔ کھڑا رہا' کھڑا رہا' مجھے کامل

یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی صورت بن جائے گی۔

آخر ایک میل وین آ گئی۔ ڈرائیور نے ہمیں دیکھ کر گاڑی روک لی کہنے لگا' آپ مدینہ شریف جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا' جناب اسی امید پر کھڑا ہوں۔

وہ بولا' تو بیٹھیے' بسم اللہ۔

ایک روز مسجد نبویؐ میں تلاوت میں مصروف تھا کہ ایک شخص آیا کہنے لگا' آپ فلاں چوک میں مجھ سے کل مغرب کے وقت ملئے۔ پھر دفعتاً" بولا' آپ مدینہ شریف شہر سے واقف ہیں کیا۔

میں نے کہا' جی نہیں۔

اس نے مجھے راستہ سمجھایا۔ پھر تاکید کی کہ کل مغرب کے وقت مجھ سے ضرور ملیے گا۔

اگلے روز میں چوک میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں اک ہجوم ہے۔ بہر حال میں وہاں کھڑا رہا۔

آخر وہ صاحب تشریف لائے' ان کے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا۔ انہوں نے بنڈل مجھے تھما دیا۔ بولے' اس بنڈل میں دو تحفے ہیں۔ ایک آپ کے لیے ہے اور ایک اس بچے کے لیے جس کی ولادت کے لیے آپ تہجد میں دعائیں مانگا کرتے تھے۔ وطن پہنچتے ہی یہ تحفہ اسے پہنچا دیا جائے' تاخیر نہ ہو۔

غفور صاحب بولے' میں آج ہی لاہور پہنچا تھا۔ اس ڈر سے کہ تاخیر نہ ہو' آج ہی پنڈی چلا آیا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے نامناسب وقت پر حاضر ہوا ہوں۔

میں نے پوچھا' آپ نے تحفہ دے دیا۔

کہنے لگے' بچے سے مل آیا ہوں۔ تحفہ صبح نو بجے پہنا دوں گا۔

غفور صاحب سے مل کر میں بہت خوش ہوا۔ ایک تو ان کا انداز بزرگوں کا سا نہ تھا۔ بڑا ہی عوامی انداز تھا۔ جیسے بزرگی سے دور کا واسطہ نہ ہو۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ بات چھپاتے نہ تھے' برملا کہہ دیتے تھے۔

انوکھے خط

پھر ایسا ہوا کہ غفور صاحب پر عائد ہو گیا کہ وہ صدر ایوب کو باقاعدہ خط لکھیں۔

ان کا پہلا خط جو صدر ایوب کو موصول ہوا' ایک انوکھا خط تھا۔ لکھا تھا' محترمی' ارباب بست کشاد نے مجھے حکم دیا ہے کہ روزانہ باقاعدگی سے آپ کو خط لکھوں۔ خط لکھنے کا مقصد کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنا نہیں ہے' نہ ہی آپ سے قرب حاصل کرنا ہے' حصول اقتدار نہیں ہے' آپ کو خوش کرنے کا مقصد نہیں ہے۔

جناب والا' یقین کیجئے جس قدر میرے خطوط پڑھنا آپ کے لیے ناگوار ہو گا' اتنا ہی میرے لیے آپ کو خط لکھنا ناگوار ہے۔ یہ ایک مجبوری ہے۔ چونکہ حکم ماننا میرے لیے فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ چاہے میرے خط پڑھیں یا نہ پڑھیں' ان پر عمل کریں یا نہ کریں' یہ آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ باقاعدگی سے آپ کی خدمت میں خط بھیجنا مجھ پر فرض کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اس جسارت پر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔

صدر ایوب کو غفور صاحب کا پہلا خط ملا تو وہ سخت کنفیوز ہو گئے۔ انہیں بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔ عقل و شعور والا ہے ایڈووکیٹ ہے' لیکن ایسی لا یعنی باتیں لکھ رہا ہے۔ وہ ارباب بست و کشاد کون ہیں' جنہوں نے اسے خط لکھنے پر پابند کیا ہے اور پھر خط لکھنے کا مقصد کیا ہے۔

صدر ایوب صاحب نے فوراً گھنٹی بجائی شہاب صاحب کو بلاؤ۔

صدر صاحب سے ملنے کے بعد شہاب واپس آیا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے غفور صاحب کا خط میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے کہا' اس خط کا صدر صاحب پر کیا اثر ہوا۔

قدرت بولا' اس خط نے صدر صاحب کو سخت کنفیوز کر دیا ہے۔ انہیں بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔

غفور صاحب باقاعدہ صدر ایوب کو خط لکھتے رہے' اس دوران میں قدرت اللہ شہاب کو امریکی دباؤ کے تحت سفیر کی حیثیت سے ہالینڈ میں تعینات کر دیا گیا۔

غفور صاحب نے اپنے خطوں میں صدر ایوب کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ قدرت اللہ شہاب کو ملک سے باہر سے بھیجنا' ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا۔ اس کے علاوہ وہ ہر مشکل

کے وقت صدر ایوب کو مشورے دیتے رہے۔

مثلاً ۱۲ جنوری ۱۹۶۶ء کو انہوں نے مجھے ایک خط لکھا' جس میں سے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

شہاب کی آمد کی منظوری تو سرکار عالم نے عرصہ نو دس ماہ سے عطا فرمادی تھی۔ لیکن نہ معلوم عمل در آمد ہونے میں کیا دیر ہے۔

میں نے خود شہاب کو لکھا تھا کہ وہ واپس آ جائیں' لیکن انہوں نے اس بات کو پسند نہ کیا تھا۔ ان کے نہ آنے سے ملک و ملت کو جو نقصان ہوا ہے حد تحریر سے باہر ہے۔

یہاں چار درویشوں نے صدر پر اتنے زور کا غلبہ حاصل کیا ہوا ہے کہ بعض معاملات میں ان کی عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہے کہ پوری قوم نے یک جہتی سے ان کا ساتھ دیا ہے۔

میں نے صدر صاحب کو مختلف اوقات میں ہدایات بھیجیں' لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہیں موصول نہیں ہوئیں یا اگر موصول ہونے کے بعد انہوں نے عمل نہیں کیا تو پوری قوم کی بد نصیبی ہے۔

شہاب اگر وقت پر واپس آ جاتے۔ مسٹر بھٹو کے ہمراہ شامل ہو کر سکیورٹی کاؤنسل کی میٹنگ ہائے میں حصہ لیتے تو پھر تو کوئی نتائج بھی بر آمد ہوتے۔

میں نے صدر صاحب کو لکھا تھا کہ وہ جتنا بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا لیں' جب تک شہاب ان ملاقاتوں میں شامل نہ ہوں گے وہ قطعی ناکام رہیں گے۔

افسوس ہے کہ صدر نے سخت غلطی کی ہے۔ قوم کا اعتماد کھو دیا ہے' لیکن چار درویش کامیاب ہیں۔ کل لاہور میں طلباء نے مظاہرے کیے' یہ صلح حدیبیہ خدا کرے فتح مکہ کو سامنے لے آوے۔

شاستری کی ذلیل موت کا ذکر میں نے چار ماہ ہوئے' صدر کو تحریر کر دیا تھا۔ شہاب کو بھی لکھا تھا۔ خدا جانے صدر میں کیوں اتنی بصیرت نہیں' جب کہ میں نے انہیں مکمل اور مفصل حالات کے علاوہ مکہ شریف سے ایک تعویز لا کر دیا تھا اور میں

وہاں وعدہ کر آیا تھا کہ ایوب کافر سے نہ ڈرے گا۔ اچھا جو خدا کو منظور۔

ستائیس جنوری ۱۹۶۶ء کو غفور صاحب نے قدرت اللہ شہاب کو ہالینڈ میں خط بھیجا۔ اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

بعد فراغت تہجد یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ میرے بہت سے خطوط سنسر والوں نے روک لیے ہیں۔ اور آپ تک ان خطوط کی رسائی نہیں ہوئی۔ حالانکہ ان میں جو کچھ تحریر تھا' وہ ملک و ملت کی بہبودی کے لیے تھا اور اگر ان ہدایات پر عمل ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ ہمیں نہ صرف نصرت و کامرانی عطا فرماتے' بلکہ آج تک اسلامی بلاک مستقل خطوط پر قائم ہو جاتا۔

ان بھلے مانسوں کو بھی کچھ ہاتھ نہ آیا اور کام اس واسطے رک گیا کہ جناب صدر صاحب کو پروگرام کسی صحیح وساطت سے نہ پہنچ سکا۔ نہ معلوم وہ کس ردی کی ٹوکری میں پڑے ہوں گے۔

اعلان تاشقند کو لوگ تو بہت برا سمجھتے ہیں' لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس احسن قدم سے خدا نے ہماری عزت رکھ لی ہے' ورنہ یہ پورا سال جن خطرات سے پر تھا ان کا انداز نہیں لگایا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر رحم فرمائے۔ سال رواں بڑی اہمیت کا سال ہے۔ جس میں بڑی بڑی تبدیلیاں واقعہ ہوں گی۔ اللہ رب ذوالجلال کا سایہ عاطفت پاکستان کے عوام پر رہے گا۔ آپ دعا کریں۔

وہ بزرگ بابا جن نے صدر صاحب کے لیے تعویذ دیا تھا۔ کئی مرتبہ مجھے خواب میں ملے ہیں۔ اور جب بھی ملتے ہیں۔ تو مجھے دیکھتے ہی ہنس پڑتے ہیں۔ اور پھر یہ انہوں نے کہا کہ کہو اپنے یار سے اب تمہیں مکہ شریف بھیجے۔

میں نے مسٹر اے۔ بی اعوان کو خط لکھا ہے کہ وہ میرے یار سے کہیں کہ مجھے مکہ شریف بھیجے' لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یار زیادہ دنیا دار ہے۔ پیسہ اسے بہت پیارا ہے۔

کاش کہ ہمارے زعمائے قوم دنیادار کی بجائے دین دار ہوتے تو اس ملک کو چار

چاند لگ جاتے۔ کیا کیا جائے۔

دین کی بات ان کے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جو مالک الملک ہے اور جس کی حکومت میں کسی کو دخل نہیں۔ اب ہماری دعاؤں کو رد نہ فرمایئے گا۔

سکیورٹی یونٹ

غفور صاحب کے ان خطوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور میں ان کے مکان کے سامنے سکیورٹی کا ایک یونٹ بیٹھا دیا گیا۔

غفور صاحب کے خطوں میں مذہبی رنگ نہ تھا۔ روحانی رنگ نہ تھا۔ اس کے برعکس ان خطوں میں دنیاوی عقل کی باتیں تھیں۔ فوجی سٹریجٹی کی باتیں تھیں۔ سیاست کی باتیں تھیں۔ مثلاً جنگ میں ایوب کو مشورہ دیا گیا تھا کہ سیز فائر نہ کرنا۔ اور اگر مجبوری ہو تو بے شک منہ زبانی کر دینا، عملی طور پر نہ کرنا۔

تاشقند کے متعلق مشورہ دیا گیا تھا کہ بلاوے پر تاشقند نہ جانا۔ اور اگر ضروری ہوا تو خود نہ جانا، کوئی نمائندہ بھیج دینا، لیکن صدر ایوب نے ان کے مشورہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ الٹا غصے میں آکر غفور صاحب کے گھر کے سامنے پولیس کی پکی چوکی بٹھا دی۔

جب غفور صاحب کے گھر کے سامنے پولیس کا دستہ آ بیٹھا تو غفور صاحب چل کر ان کے پاس گئے۔ ہر سپاہی سے مصافحہ کیا، مزاج پوچھے اور کہا بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے یہاں ڈیرا بنا لیا ہے۔ میں اس گھر میں بہت تنہا تھا، آپ کے آنے سے رونق ہو گئی ہے۔ ہاں، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف دروازہ بجا دیا کیجیے۔

غفور صاحب جب بھی کھانا کھانے لگتے تو وہ باہر جا کر سکیورٹی والوں سے کہتے، آیئے میرے ساتھ کھانا کھایئے۔ ان کے اس غیر معمولی اخلاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکیورٹی والوں نے رپورٹ کی کہ بہت چالاک اور خطرناک آدمی ہے۔

لیکن کیسے کیوں

پھر جب قدرت اللہ کو ہالینڈ کا سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا گیا تو غفور صاحب کو بڑا صدمہ

ہوا۔ کہنے لگے' یہ اچھا نہیں ہوا۔ شہاب صاحب کا ملک سے باہر چلے جانا۔ پاکستان کے لیے اچھا شگون نہیں ہے۔

میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا' غفور صاحب' شہاب ایک سول افسر ہیں۔ سول افسروں کے تبادلے ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے حکومت پاکستان کو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک سے ایک قابل افسر موجود ہیں۔

غفور صاحب بولے' آپ نہیں سمجھتے۔ چند لوگ مبارک ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے برکت پیدا ہوتی ہے۔ شہاب صاحب کی موجودگی پاکستان کے لیے برکت کا باعث تھی۔ لیکن منفی طاقتیں ہمارے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہی ہیں۔ بہرحال کئی ایک امور ایسے ہیں جن میں شہاب صاحب کی موجودگی کے بغیر پاکستان کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

غفور صاحب کی بات میری پلے نہ پڑی' لیکن غفور کی بات کو میں رد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دنیادی طور پر غفور صاحب بڑے سمجھدار آدمی تھے۔ وہ حالات کے نشیب و فراز کو سمجھتے تھے۔ ڈپلو میٹک اقدامات کی اہمیت کا ادراک رکھتے تھے۔ بہت خوش اخلاق اور باکردار آدمی تھے۔ مجھے علم تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے' بات چھپاتے نہیں۔ ان کی بات درست تھی' لیکن کیسے' کیوں۔ وجہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس موضوع پر انہوں نے صدر ایوب کو بھی کئی ایک خط لکھے تھے۔ اول تو گمان غالب ہے کہ صدر ایوب ان کے خط پڑھتے ہی نہیں تھے' اگر پڑھتے بھی تھے تو یہ بات کسی دانشور کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی' الٹا منفی رد عمل پیدا کرتی۔

حج لسٹ

پھر حج کے سلسلے میں غفور صاحب کی بات نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ اس بارے میں تفصیلات میں اپنی کتاب لبیک میں لکھ چکا ہوں۔

شہاب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم اکٹھے حج پر جائیں گے۔ وعدہ ایفا کرنے سے پہلے ہی شہاب کا تبادلہ ہو گیا اور وہ سفیر بن کر ہالینڈ میں جا بیٹھا۔

ہالینڈ سے اس نے مجھے لکھا کہ آپ حج کے لیے عرضی دے دیں۔ عرضی منظور ہو جائے تو

مجھے اطلاع دیں تاکہ میں جدے پہنچ جاؤں اور ہم دونوں اکٹھے حج پر جائیں۔

میں نے کئی ایک عرضیاں دیں لیکن منظوری حاصل نہ ہوئی میں مایوس ہو گیا۔

قدرتؒ نے مجھے خط لکھا کہ مایوس نہ ہوں۔ اللہ کی درگاہ سے مایوس ہونا گناہ ہے۔ اس سال ہم حج پر ضرور جائیں گے۔ آپ عرضی دے دیں۔ منظور ہو گئی تو خوب نہ ہوئی۔ تو آپ بیروت کے ویزہ کے لیے اپلائی کر دیں۔ ویزہ حاصل کر کے آپ بیروت آجائیں' میں وہاں آپ سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔ پھر ہم دونوں بیروت سے جدے جائیں گے اور حج کے لیے مکہ شریف چلے جائیں گے۔

اگرچہ اس سال بھی میری عرضی منظور نہ ہوئی تھی' لیکن مجھے اس کا رنج نہ تھا۔ چونکہ بیروت جانے کا پروگرام قائم تھا۔

بہرحال میں نے وایا بیروت حج پر جانے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اب کی بار ہمیں حج پر جانے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

انہی دنوں ایک شام دروازہ بجا۔ میں نے دروازہ کھولا' تو باہر غفور صاحب کھڑے تھے۔ اپنی تصنیف لبیک سے اقتباس پیش کرتا ہوں:۔

میں نے کہا' ایڈووکیٹ صاحب آپ یہاں کیسے۔

میری حیرت اس وجہ سے تھی کہ غفور صاحب کو میرے گھر کا پتہ بھی تو معلوم نہ تھا۔

انہوں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ کہنے لگے' پنڈی ایک کام سے آیا تھا۔ سوچا آپ کو اطلاع دیتا جاؤں تاکہ آپ ناحق کی کوفت سے بچ جائیں۔

میں سمجھا نہیں۔

قدرت اللہ شہاب صاحب کا ایک خط موصول ہوا ہے جس میں تحریر ہے کہ آپ، دونوں اس سال حج پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں' غفور صاحب نے کہا۔

جی ہاں' میں نے جواب دیا' مجھے علم ہے۔

غفور صاحب کہنے لگے میں نے شہاب صاحب کو مطلع کر دیا ہے کہ اس سال وہ حج پر نہیں جا رہے ——— لیکن ہم تو جا رہے ہیں' میں نے ان کی بات کاٹی۔ ہم نے پروگرام بنا لیا ہے۔ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ نہیں جا رہے۔

میں نے وہ لسٹ دیکھی ہے' انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

کون سی لسٹ۔

زائرین کی لسٹ۔

زائرین کی لسٹ لیکن ابھی تو قرعہ اندازی نہیں ہوئی۔

غفور صاحب نے پر اسرار انداز میں میری طرف دیکھا' پھر مسکرا دیے۔

وہ لسٹ نہیں' وہ بولے۔

تو پھر کون سی لسٹ' میں نے پوچھا۔

جو زائرین اس سال حج پر حاضری دیں گے' وہ پھر مسکرائے۔ مدینہ منورہ سے جن کی منظوری مل چکی ہے' وہ لسٹ' اس لسٹ میں تو نہ شہاب صاحب کا نام ہے نہ آپ کا۔

حیرت سے میں ہکا بکا رہ گیا۔

وہ مسکرائے بولے' بھائی صاحب میں نے تو متعدد بار آپ کی فائل دستخط کے لیے پیش کی تھی۔ لیکن ہر بار اسے دستخط کے بغیر لوٹا دیا گیا۔

میں نے حیرت سے غفور صاحب کی طرف دیکھا۔

خیر کوئی بات نہیں' وہ بولے' دیر آید درست آید۔ میں نے شہاب صاحب کو مطلع کر دیا ہے۔ انہیں تفصیلات کا علم ہے۔ وہ جلد آپ کو اطلاع دیں گے۔

غفور صاحب کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ انہیں بھلا کیسے پتہ چلا کہ امسال کون حج کرے گا' کون نہیں کرے گا۔ اور یہ لسٹ کیا چیز ہے کیا حج کرنے والوں کی لسٹ قرعہ اندازی سے پہلے ہی تیار ہو جاتی ہے' غفور صاحب کی ساری بات ہی مہمل تھی۔

لہٰذا میں نے اپنی تیاری جاری رکھی۔ اگرچہ اس میں وہ شدت نہ رہی۔ دو روز کے بعد شہاب کا خط موصول ہوا' لکھا تھا۔

باوجوہ اس سال ہم حج پر نہیں جا رہے۔

یہ خط میری عقل سلیم کے کفن میں آخری کیل تھا۔

پھر شہاب صاحب کے ہالینڈ سے وطن واپس آنے سے بہت پہلے' غفور صاحب نے مجھے خط لکھا کہ مدینہ منورہ سے شہاب صاحب کی واپسی کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ پھر وہ کیوں وطن

واپس نہیں آ رہے تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے شہاب صاحب کو بھی لکھا۔

اس سے پہلے انہوں نے مدینہ منورہ سے صدر صاحب کو کئی ایک خط لکھے اور شہاب صاحب کو بھی اس کی اطلاع دی۔

انہوں نے لکھا' کہ یہاں بہت سے بزرگ ایسے ہیں' جنہیں پاکستان سے دلچسپی ہے' جو چاہتے ہیں کہ صدر ایوب کا اقتدار قائم رہے۔ اگرچہ صدر ایوب سے بہت سی کوتاہیاں ہوئی ہیں پھر بھی ان کی خواہش ہے کہ انہیں ایک اور موقع دیا جائے۔ ایک بزرگ کو تو صدر ایوب سے اس قدر ہمدردی ہے کہ انہوں نے صدر ایوب کے لیے مجھے ایک تعویذ بھی دیا ہے' جو میں اپنے ساتھ لا رہا ہوں۔ اللہ کرے کہ تعویذ بروقت پہنچ جائے اور صدر ایوب پہننا گوارہ کر لیں۔

غفور صاحب وہ تعویذ ساتھ لائے لیکن وہ بر وقت نہ پہنچ سکا۔ چونکہ صدر ایوب اقتدار چھوڑ کر جا چکے تھے۔

احمد بشیر

پھر احمد بشیر کا واقعہ عمل میں آیا۔

دلیج ایڈ کا محکمہ ٹوٹا تو احمد بشیر کو سندھ میں انفریشن آفیسر بنا کر بھیج دیا گیا۔ اس کا افسر وزیر تھا پڑھا لکھا تھا۔ جرنلسٹ تھا' لیکن ساتھ ہی سندھ کا وڈیرا تھا۔

احمد بشیر نے اپنے افسر سے چار ایک بار چونکہ چنانچہ کیا' تو اس نے احمد بشیر کو پاس بیٹھا لیا' کہنے لگا' دیکھو' برخوردار تمہارا کام میرے احکامات کی تعمیل کرنا ہے' مجھے عقل سکھانا نہیں ہے' چونکہ چنانچہ کرنا نہیں ہے اور اگر تم نے یہی رویہ رکھا تو ایک دن ہم تمہیں کوئی کام دے کر اندرون سندھ بھیج دیں گے' جہاں سے تم کبھی واپس نہیں آؤ گے۔ تمہاری لاش تک نہیں ملے گی۔

احمد بشیر اسی روز نوکری چھوڑ کر بھاگ آیا۔

اس کے بھاگ آنے کی وجہ ڈر نہیں تھا۔ ڈر تو پردہ تھا۔ پردے کے پیچھے محترمہ فلم تھی۔

احمد بشیر جب سے امریکہ سے فلمی ٹریننگ لے کر آیا تھا۔ اس کے اندر فلم سازی کے

چوہے پھدک رہے تھے۔ ولیج ایڈ کے آخری دنوں میں اس نے مجھ سے کہا تھا' دیکھ عقل مندی یہ ہے کہ ہم دونوں پیپر ورک مکمل کر کے رکھ لیں۔

کیسا پیپر ورک' میں نے پوچھا۔

پہلے فلم کی کہانی کی آؤٹ لائن لکھیں اور ڈسکس کر کے اسے فائنلائز کرلیں۔ پھر اس کا منظر نامہ تیار کرلیں اور آخر میں اس کے ڈائیلاگ مکمل کرلیں۔

یہ کس فلم کی بات کر رہے ہو' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' دیکھ ممتاز' تو اور میں' ہم دونوں کو آخر فلم سازی کا کیریئر اپنانا ہے۔ یہ بات پکی ہے۔ اگر فائینینسر کا انتظام ہو جائے' تو ہم آج ہی نوکری چھوڑ کر کام میں لگ جائیں۔ فائینینسر کا انتظام ہو جائے گا۔ جب تک ہمیں پیپر ورک مکمل کرلینا چاہیے۔

میں نے کہانی کی آؤٹ لائن لکھ دی۔ احمد بشیر نے بڑی بحث کے بعد اسے خود بار بار لکھا اور پھر فائنلائز کر دیا۔

دراصل مجھے ذاتی طور پر فلم سے کوئی دلچسپی نہ تھی' نہ ہی میں فلم سازی کو کیریئر بنانا چاہتا تھا۔ میں یہ سارا کام احمد بشیر کی خاطر کر رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ احمد بشیر کو فلم سازی کا جنون لگا ہوا ہے۔ اس کے دل میں یقین کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس دنیا میں اس لیے اتارا ہے کہ وہ فلم بنائے۔

نیلا پربت

احمد بشیر نے پتہ نہیں' کہاں کہاں سے پیسہ اکٹھا کیا۔ زیادہ تر پیسہ اس نے والد صاحب سے بٹورا۔ یوں نیلا پربت کی فلم سازی شروع ہو گئی۔

اگرچہ نیلا پربت کی کہانی میں نے لکھی تھی۔ لیکن جب احمد بشیر نے اسے سولھویں مرتبہ ریوائز کیا' تو اس میں بحیثیت سٹوری اور ڈائیلاگ رائیٹر' میری دلچسپی ختم ہو گئی۔

روزمرہ برتاؤ میں احمد بشیر ایک بڑا پیارا آدمی ہے۔ اس میں تفاخر نہیں ہے' لیکن جب اس پر کسی کام کا جنون سوار ہوتا ہے تو اس کا تفاخر اس شدت سے ابھرتا ہے کہ وہ خدا بن جاتا ہے۔

جب تک فلم بنتا رہا' احمد بشیر پر مستی کی کیفیت طاری رہی۔ تفاخر کی شدت سے وہ خدا بنا

رہا۔

لیکن بد قسمتی سے فلم فلاپ ہو گیا اور احمد بشیر کی وفات ہو گئی۔ کئی ایک سال اس کی لاش چارپائی پر پڑی رہی۔ حیرت کی بات تھی کہ فلم فلاپ ہونے کے باوجود احمد بشیر کا فلم سازی کا جنون جوں کا توں قائم رہا۔

گھر میں بڑی تنگ دستی تھی، پتہ نہیں اس کی بیوی مودی کس طرح گھر چلا رہی تھی۔ لیکن احمد بشیر نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ میں فلم سازی کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کروں گا۔ حالانکہ وہ قابل آدمی تھی۔ اچھا جرنلسٹ تھا۔ دفتری کام میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کی تین نوجوان لڑکیاں اور مودی سخت مشکلات میں مبتلا تھیں۔ اس کے باوجود وہ فلم کے سوا کوئی اور کام کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ سارا دن چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ آہیں بھرتا، کروٹیں بدلتا۔ اپنی بے چینی کو چھپانے کی کوشش کرتا۔

میں اسے زبردستی غفور صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے کہا، جناب یہ میرا دوست ہے نہ یہ جیتا ہے نہ مرتا ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان میں لٹک رہا ہے۔ اس کے لیے دعا کریں۔

احمد بشیر دعا کو نہیں مانتا۔ وہ روحانیت کو نہیں مانتا۔ اگرچہ اس نے اپنی آنکھوں سے کئی ایسے واقعات دیکھے ہیں۔ جو عقلی طور پر ممکن نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ عقل و دانش پر مکمل طور پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ اس خدا کو نہیں مانتا جسے ہم مانتے ہیں۔ خدا کے متعلق اس کا تخیل مختلف ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا خدا ہمارے خدا سے بہتر ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ وہ اس سلسلے میں غفور صاحب کے پاس جانا اور ان کے مشورے پر عمل کرنا کیسے مان گیا۔

غفور صاحب نے صبر و تحمل سے میری بات سنی کہنے لگے، مجھے افسوس ہے کہ میں اس بات میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ چونکہ میں اس سیکشن سے متعلق نہیں ہوں۔ البتہ میں تمہیں ایک ایسے بزرگ کا پتہ دے سکتا ہوں جو آپ کی امداد کر سکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو۔

مسجد کا بابا

انہوں نے کہا لاہور کے فلاں مضاف میں، فلاں مقام پر ایک ویران مسجد ہے۔ اس مسجد

میں وہ بزرگ ہر جمعرات کو مغرب کے وقت آتے ہیں' دیا جلاتے ہیں اور پھر نماز پڑھ کر چلے جاتے ہیں' جب وہ دیا جلا رہے ہوں تو انہیں پکڑ لیں اور عرض حال کریں۔ وہ لاکھ ٹالیں ٹلنا نہیں' جب تک وہ مدد کرنے کا وعدہ نہ کریں۔ اور ہاں۔ انہیں پتہ نہ چلے کہ میں نے آپ کو وہاں بھیجا ہے۔ ورنہ میری جواب طلبی ہو جائے گی۔

جمعرات کی شام کو احمد بشیر اس مسجد میں جا کر انتظار کرتا رہا۔ آخر ایک بوڑھا داخل ہوا جو دیکھنے میں محنت کش نظر آتا تھا۔ جب وہ دیا جلانے لگا' تو احمد بشیر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ بوڑھا بہت سٹپٹایا کہنے لگا' میاں جی تم سے کسی نے مذاق کیا ہے۔ میں تو ایک محنتی' مزدور آدمی ہوں۔ میں تمہاری مدد کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو خود محتاج ہوں۔ چارپائیاں بنتا ہوں۔ مجھے ان باتوں سے کیا واسطہ۔ بڈھے نے بڑی منتیں کیں' لیکن احمد بشیر نے اسے نہ چھوڑا اور اپنی بات پر اڑا رہا۔

آغا

آخر بڈھے نے پینترا بدلا' بولا' میاں تو چاہتا کیا ہے۔ احمد بشیر نے کہا بابا یا تو مجھے زندگی عطا ہو یا میری لاش کو دفنا دیا جائے۔

بڈھا بولا' یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے۔ تو بورے والا چلا جا۔ وہاں موچی محلے میں لکڑیوں کا ٹال ہے' اس کے مقابل کے مکان میں ایک شخص رہتا ہے۔ اس کا نام آغا ہے۔ اسے جا کر مل۔ اپنا مدعا بیان کر' شاید تیرا کام اس کے ہاتھوں ہو جائے۔ اسے کہنا تمہیں ہم نے بھیجا ہے۔ پھر بڈھے نے زیر لب کہا' اسے تو ہم سمجھ لیں گے جس نے تجھے یہاں بھیجا ہے۔

بورے والے جا کر احمد بشیر نے موچی محلے کا پتہ لگایا پھر ٹال کے سامنے گھر کا دروازہ بجایا۔ اندر سے کوئی عورت بولی' آغا تو میدان میں گئے ہوئے ہیں' فٹ بال کھیلنے کے لیے۔

احمد بشیر پوچھتا پوچھتا' میدان میں پہنچا۔ وہاں فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا۔ میچ کے اختتام پر احمد بشیر نے آغا کو دیکھا تو حیران ہوا۔ وہ ادھیڑ عمر کا پہلوان نما آدمی تھا۔ احمد بشیر نے سوچا' یہ بھلا میرے لیے کیا دعا کرے گا۔

آغا سے عرض حال کیا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا اگر فٹ بال کے متعلق کوئی بات ہوتی تو میں کچھ نا کچھ کرتا۔ دعا سے مجھے کیا تعلق۔ احمد بشیر نے کہا میں خود نہیں آیا۔ مجھے آپ کے پاس

مسجد کے بابا نے بھیجا ہے۔

آغا بولا' ضرور بابا نے آپ کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ احمد بشیر یہ سن کر بڑا مایوس ہوا' واپس لاہور آ گیا۔

چند ایک دن کے بعد اتفاقاً" سر راہے غفور صاحب مل گئے۔ ہنس کر پوچھنے لگے' احمد بشیر صاحب آپ کا کیا بنا' میری تو جواب طلبی ہو گئی۔

احمد بشیر نے سارا واقعہ انہیں سنایا۔

غفور صاحب بہت ہنسے۔ کہنے لگے مسجد والے بزرگ ملے تھے۔ انہوں نے مجھے ڈانٹا خبردار جو پھر کسی کو ہمارا پتہ دیا۔ پھر فرمایا' اگر وہ سائل ملے تو اسے کہہ دینا کہ تیرا کام ہو گیا ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد حمید جہلمی' احمد بشیر کے گھر آیا اور اس کے احتجاج کے باوجود اسے گھسیٹ کر چارپائی سے اٹھایا اور امروز کے دفتر میں لے گیا۔

حیرت کی بات یہ نہ تھی کہ حمید جہلمی' احمد بشیر کو لے گیا بلکہ یہ کہ احمد بشیر اس کے ساتھ چلا گیا اور اس نے اپنی ضد کے خلاف غیر فلمی کام کرنا گوارا کر لیا۔

جب سے آج تک احمد بشیر صحافت کا کام کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ کبھی کبھی فلم سازی کے خواب دیکھتا ہو۔ لیکن اس پر فلم کا وہ جنون سوار نہیں ہے۔

یعقوب زنجانی

ایک دن میں انار کلی کے قرب وجوار میں گھوم رہا تھا کہ غفور صاحب مل گئے کہنے لگے۔ آپ ادھر کدھر۔ کیا یعقوب زنجانی کی حاضری دے کر آئے ہیں۔

یعقوب زنجانی کون ہیں' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے آپ یعقوب زنجانی کو نہیں جانتے۔

میں نے کہا' غفور صاحب میں تو جاہل مطلق ہوں۔

بولے۔ داتا صاحب کی آمد سے پہلے یعقوب زنجانی لاہور کے داتا تھے۔ جب داتا صاحب کو لاہور آنے کا حکم ملا تھا' تو آپ نے فرمایا تھا کہ لاہور میں یعقوب زنجانی جو ہیں۔ میرا وہاں جانا بے کار ہو گا۔ حکم ہوا کہ آپ بہرحال عازم سفر ہو جائیں۔

جب داتا صاحب لاہور میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ یعقوب زنجانی کا جنازہ آ رہا ہے۔

غفور بولے' یعقوب زنجانی شہاب صاحب کے بہت بڑے سپورٹر ہیں۔ جب بھی بزرگوں کی میٹنگ ہوتی ہے اور تجاویز پیش ہوتی ہیں۔ تو زنجانی صاحب کسی نا کسی طور شہاب صاحب کو سپانسر کر دیتے ہیں۔ آپ جب بھی لاہور تشریف لائیں تو آپ کو چاہیے کہ یعقوب زنجانی صاحب کی حاضری دیں۔ گوالمنڈی سے جو سڑک بانس بازار کے پاس سے گزر کر میو ہسپتال کے ساتھ ساتھ ایک روڈ کو جاتی ہے' وہاں سے ایک گلی گھومتی ہوئی جاتی ہے اور ایک مسجد کے قریب بند ہو جاتی ہے۔ اس مسجد کے صحن میں ایک چبوترے پر دو قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یعقوب زنجانی کی ہے۔

شام کا وقت تھا مسجد پر ویرانی اور اداسی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میں اکیلا بیٹھا سوچ رہا تھا' یا اللہ یہ کیا بھید ہے۔

یہ تیرے بندے کتنے پراسرار ہیں' جو فوت ہونے کے بعد بھی فعال رہتے ہیں۔

یہ تیرا دفتر' کیسا دفتر ہے' جہاں فائلیں چلتی ہیں' تجاویز پیش کی جاتی ہیں' سفارشیں چلتی ہیں۔ میں بھی ایک سفارشی ہوں جو اتنے بڑے بزرگ کی خدمت میں بیٹھا ہوں' ورنہ میری کیا حیثیت ہے' میں اس لائق نہیں کہ تیری خدمت میں حاضری دوں۔ میں ایک ناپاک غلیظ آدمی ہوں۔ میں ذاتی حیثیت سے حاضر نہیں ہوا۔ میں تو قدرت اللہ کے حوالے سے حاضر ہوا ہوں۔ اگر تو میرا سلام قبول کر لے تو یہ تیری کرم نوازی ہو گی۔

پینتیسواں باب

ان جانی سمت

دو سال قدرت اللہ کے قریب رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان بعد بڑھتا گیا' بڑھتا گیا۔

میں محسوس کرنے لگا میں شہاب کی بیرونی شخصیت سے واقف تھا۔ اس کی شخصیت کے نیوکلس سے بے خبر تھا۔

شہاب کی بیرونی شخصیت میں دو پہلو اہم تھے۔ ایک تو وہ آئی سی ایس افسر تھا۔ دوسرے وہ جانا پہچانا تھا۔ لیکن نہ وہ اپنے عہدے کو اہمیت دیتا تھا نہ ادب کو۔

چوتھی سمت

قدرت کو اپنی تعریف سننا سخت ناگوار محسوس ہوتا تھا۔ کوئی اس کی تعریف کی بات چھیڑ دیتا تو وہ فوراً موضوع بدل دیتا۔ بات کا رخ بدل دیتا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اپنی تعریف سن کر اسے اذیت ہوتی ہو لیکن اس کی ادبی تخلیقات کی تعریف کرتے تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ سارے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی بلکہ وہ ازخود ادب کی بات چھیڑ دیا کرتا تھا۔ جب کبھی کوئی نئی چیز لکھتا تو بڑے اہتمام سے مجھے سناتا اور پھر پوچھتا کیسی ہے۔

ایک دن میں نے پوچھا' میں نے کہا' شہاب صاحب آپ کی کوئی تعریف کرے تو آپ پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے اور آپ کوشش کرتے ہیں کہ بات کا رخ بدل جائے' لیکن آپ کی ادبی تخلیق کی تعریف کی جائے تو آپ کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں' چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے' کیا بات ہے اس تعریف سے اس قدر الرجک اور اس تعریف پر شادیانے۔

قدرت مسکرا کر کہنے لگا' اس لیے کہ میں ادیب ہوں۔

میں نے کہا' آپ ادیب نہیں ہیں۔

اچھا تو آپ مجھے ادب سے خارج کر رہے ہیں۔

خارج نہیں کر رہا۔ آپ ادیب ہیں اونچے پائے کے ادیب ہیں۔ لیکن ادب آپ کا مرکز نہیں ہے ایک ضمنی قسم کا شغل ہے۔ عہدے کو آپ اہمیت نہیں دیتے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کے اندر کوئی تیسری چیز ہے' جسے آپ اہمیت دیتے ہیں اور تیسری چیز' جو آپ کی شخصیت کا نیوکلس ہے اس پر آپ نے پردے ڈال رکھے ہیں۔

قدرت نے کہا' شاید کچھ ہو مجھے اس کا ادراک نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے بات کا رخ بدل دیا۔

اب تک کئی واقعات رونما ہو چکے تھے جس سے پتہ چلتا تھا کہ قدرت کی شخصیت کا تعلق ایک چوتھی سمت سے ہے۔

چوتھی سمت سے متعلق واقعات پر بات کرنے سے شہاب گریز کرتا تھا۔ بات کو ٹال دیتا یا موضوع بدل دیتا۔

بھائی جان سے پوچھتا۔ تو وہ مسکرا دیتے۔ کہتے کرید نہ کرو مفتی جی۔ کرید سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کرنے والی نہیں ہوتیں۔ آپ کیوں گھبرا رہے ہیں' آپ تو ان کے بہت قریب ہیں' وقت آنے پر ساری بات کھل جائے گی۔

ڈاکٹر عفت سے پوچھتا تو وہ مسکرا کر کہتی میری تو خود مت ماری ہوئی ہے۔ اس گھر کے اسرار مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔

چاہیے تو یہ تھا کہ بھائی جان کے کہنے پر میں قدرت کی شخصیت کے اس پر اسرار عنصر کو جانے بغیر مان لیتا۔ تسلیم کر لیتا' تو سکھی ہو جاتا لیکن بزرگوں کے حلقے سے قرب حاصل کرنے کے

باوجود مجھ میں مان جانے کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ جاننے کا خبط ابھی تک جزیرے کے بڈھے کی طرح میرے سر پر سوار تھا۔

بہرحال ایک بات کو میں نے اچھی طرح سے جان لیا تھا کہ قدرت خود بات نہیں بتائے گا۔ ہاں جب کبھی اس پر کیفیت کا عالم طاری ہو گا' چھلکن ہو گی' چھینٹے اڑیں گے' اس وقت شاید اس بھید کے متعلق چند جھلکیاں میسر آ جائیں۔

میں چھلکن کا منتظر رہتا تھا۔

سانڈھنی سوار

پھر ایک اور واقعہ رونما ہوا۔

قدرت نے مجھے بلایا' اس وقت وہ کسی ضروری کام میں مصروف تھا۔ ان دنوں اس کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ غالباً" اس لیے کہ پاکستان کے آئین کا ڈھانچہ تیار ہو رہا تھا۔

قدرت نے کہا' سکیورٹی سے ابھی ابھی مجھے ایک فون آیا ہے۔ گیٹ پر کوئی دیہاتی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

آپ گیٹ پر چلے جائیں' اس سے ملیں۔ پوچھیں کہ وہ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اگر وہ ملنے کی بجائے پیغام دینے پر رضامند ہو جائے' تو آپ اس سے پیغام لے لیں اگر وہ ملنے پر مصر ہو تو مجھے فون پر اطلاع دیں' میں گیٹ پر آ جاؤں گا۔

میں چلنے لگا تو قدرت نے کہا دیکھیئے آپ اس سے علیحدگی میں بات کریں۔ سکیورٹی کے سامنے نہیں۔

سکیورٹی کے کمرے میں ایک دہقان قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ میں اسے باہر لے گیا۔ اکیلے میں اس سے بات کی۔

میں نے کہا دیکھیئے شہاب صاحب اس وقت کام میں مصروف ہیں' اگر آپ انہیں پیغام دینا چاہیں تو مجھے بتا دیں ورنہ۔

میں نے ابھی جملہ ختم نہیں کیا تھا کہ وہ بولا بابو جی مجھے صاحب سے مل کر کیا لینا ہے۔ مجھے اس سے کوئی کام نہیں ہے' میں تو اپنے گاؤں سے آ رہا تھا کہ اس کوٹھی سے پیچھے میدان میں

مجھے ایک سانڈھنی سوار ملا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں رک گیا' وہ کہنے لگا' میاں یہ جو کوٹھی ہے اس کا دروازہ ادھر ہے۔ وہاں جاؤ اس کوٹھی میں ایک صاحب ہیں شہاب صاحب' ان کو ہمارا پیغام دے دو۔ کہنا جو کاغذ آپ لکھ کر پھاڑ چکے ہیں' وہ درست تھا' جو آپ اب لکھ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ سانڈھنی سوار بزرگ صورت آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور پیغام دینے ادھر چلا آیا۔ یہ پلس والے مجھے اندر جانے ہی نہیں دیتے۔

دیہاتی کا پیغام سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ یہ کیسا پیغام ہے۔ سانڈھنی سوار کو کیا پتہ کہ صاحب کیا لکھ رہے ہیں۔ اور پھر اس علاقے میں سانڈھنی سوار۔ یہاں ہم نے نہ تو کبھی سانڈھنی دیکھی ہے اور نہ سانڈھنی سوار۔

میرا خیال تھا کہ دیہاتی کا پیغام سن کر شہاب ہنس پڑے گا۔ لیکن جب میں نے اسے پیغام سنایا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس پر سخت گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے لپک کر ویسٹ پیپر باسکٹ اٹھا کر اسے میز پر الٹ دیا اور پھر پھٹے ہوئے کاغذ کے پرزوں کو جوڑنے لگا۔

پھر بولا' آپ کو اگر فرصت ہو تو میری مدد کریں۔

حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یا اللہ یہ کیا اسرار ہے۔ یہ شخص جو اس قدر ذہین ہے' زیرک ہے کہ ہم بات کرنے کے لیے ابھی منہ ہی کھولتے ہیں تو ہمارا عندیہ سمجھ لیتا ہے' جو اس قدر صاحب رائے ہے کہ سب کی سنتا ہے' لیکن اپنی رائے پر قائم رہتا ہے' جس کے خیالات میں انفرادیت ہے' ندرت ہے' جو پٹے ہوئے رسمی خیالات سے دور رہتا ہے' جسے تواہمات سے دور کا واسطہ نہیں۔ یہ ایک مشکوک اور مبہم سانڈنی سوار کے پیغام کو' جو ایک دیہاتی لے کر آیا ہے' اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے۔

بابوں کے خط

صدر گھر میں جو پہلا کام مجھے سونپا گیا وہ باباؤں کے خطوط کا ریکارڈ رکھنا تھا۔

ان خطوں کی فائیل مجھے دے دی گئی۔

یہ ایک بے کار سا کام تھا۔ ان خطوں کے جوابات لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ بیشتر خطوں میں خط لکھنے والوں کے پتے ہی درج نہ تھے۔ اکثر خطوں میں لکھنے والے کا نام اس

قدر شکستہ اردو میں ہوتا کہ پڑھنا مشکل ہو جاتا۔ ویسے بھی خطوں کو نوعیت اس قسم کی ہوتی کہ وہ جواب طلب نہ ہوتے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ صدر صاحب کی خدمت میں پیش نہیں کیے جاتے تھے۔ چونکہ صدر ایوب پڑھے لکھے تھے۔ مغربی ذہنیت کے مالک تھے۔ توہمات کو نہیں مانتے تھے۔ عقل و دلیل کے قائل تھے۔

ایسے لگتا تھا جیسے ان خطوں کا چارج مجھے دینے کا مقصد میرا ذہن پراگندہ کرنا تھا۔ میں ان خطوں کو بار بار پڑھتا اور سوچ میں پڑ جاتا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والے یہ خط کیوں لکھتے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا۔ ایک بات بہر طور واضح تھی کہ توجہ حاصل کرنا مقصود نہ تھا۔ کئی ایک خطوں میں لکھنے والے کا نام بھی مرقوم نہ ہوتا۔ خط دعا گویا' عاجز پر ختم ہو جاتا۔ تحریر اور انداز بیان خام ہوتے۔ ان میں چند ایک خط معقول اور بامعنی بھی ہوتے۔ ایسے خط عام طور پر قدرت اللہ کے نام ہوتے۔ باقی خط صدر مملکت کے نام ہوتے لکھا ہوتا کہ اللہ نے تجھے بادشاہ بنایا ہے' تو تجھے اپنی رعایا کو عدل دینا ہو گا' غریبوں کا خیال رکھنا ہو گا۔

تقریباً" ہر خط میں پاکستان کی بات لکھی ہوئی تھی۔ ہر بابا پاکستان کی اہمیت کے احساس سے بھرا ہوا تھا۔ کئی ایک خطوں میں پاکستان کے تابناک مستقبل کا ذکر ہوتا' کہ جلد ہی یہ ملک ایک عظیم ملک بن جائے گا۔ ایک عظیم فتح حاصل ہو گی اور پھر یہ ملک دنیائے اسلام کا مرکز بن جائے گا۔ کئی ایک خطوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا تذکرہ ہوتا اور پاکستان کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے جن سے ظاہر ہوتا کہ پاکستان کو اسلام کے نشاۃ ثانیہ سے گہرا تعلق ہے۔

ان خطوں نے مجھے پاگل کر دیا۔ یہ کون لوگ تھے یہ کون سی دنیا تھی۔ کیا یہ مجذوب تھے' یا جاگتے میں خواب دیکھنے کے عادی تھے۔ پھر ایک اور واقعہ ہوا۔

مسجد نبویؐ کی بیل

صدر گھر کے سٹاف کا ایک عزیز حج کر کے واپس آیا تو اس نے قدرت کو پیغام بھجوایا کہ جناب میں مدینہ منورہ میں حاضری دے کر آیا ہوں اور وہاں سے آپ کے نام ایک پیغام لایا ہوں۔ مجھے اجازت دی جائے کہ حاضر ہو کر پیغام پہنچاؤں۔ قدرت نے اسے بلا لیا۔

وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔اس نے کہا' جناب یہ پیغام مجھے روضہ پاک کے چابی بردار نے دیا

ہے۔

وہ جہلم کے رہنے والے ہیں۔ فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ جنگ میں شامل ہوئے۔ پھر رخصت لے کر مدینہ منورہ میں حاضری دی۔ پھر پتہ نہیں کیا کیفیت طاری ہوئی کہ وہیں بیٹھ گے۔ وہیں کے ہو رہے۔ اب وہ روضہ پاک کے چابی بردار ہیں۔ یہ بہت بڑا عہدہ ہے' اعزاز ہے۔ یہ پیغام انہوں نے آپ کے نام بھیجا ہے۔

فرماتے ہیں' جب پاکستان بننے والا تھا تو ہم نے خواب دیکھا کہ مسجد نبویؐ سے ایک بیل پھوٹی اور بڑھتے بڑھتے دور نکل گئی۔ اور اس کے اس سرے پر سبز پتیاں نکل آئیں۔

پھر چند سال کے بعد ہم نے خواب میں وہی بیل دیکھی۔ دیکھا کہ پتے مرجھا گئے ہیں۔ لیکن بیل جوں کی توں قائم ہے۔ اور اس کی جڑیں مسجد بنویؐ میں موجود ہیں۔

انہوں نے فرمایا ہے' کہ اب پھر ہم نے خواب میں وہی بیل دیکھی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ بیل پھر سے سرسبز ہو رہی ہے۔ پھر سے دوسرے سرے پر ہری بھری کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔

انہوں نے فرمایا ہے' کہ شہاب صاحب سے مل کر ہماری طرف سے مبارک باد دینا اور کہنا کہ صدر صاحب کو ہمارا ایک پیغام پہنچا دیں۔ صدر صاحب سے کہیں' کہ بھیڑوں کا رکھوالا خود چھاؤں میں نہیں بیٹھتا۔

اس بوڑھے کے پیغام نے مجھ پر بے حد اثر کیا۔

مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ ایسے پیغامات قدرت کے نام کیوں آتے ہیں۔ قدرت کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ تو صدر کا پی اے ہی ہے نا۔ حکومت میں تو اس کا کوئی مقام نہیں' پھر قدرت کو اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔

مسجد نبویؐ کے چابی بردار' صاحب نظر تھے۔ ان کا پیغام پاکستان سے متعلق تھا اور پیغام تو مملکت کے سربراہ کے لیے تھا' لیکن انہوں نے یہ پیغام قدرت کو کیوں بھجوایا تھا' براہ راست صدر کو بھیجتے۔

چڑ چڑ

پاکستان کی بات سن کر میرے اندر چڑ چڑ ہوتی تھی۔ پاکستان کو کیوں بانس پر چڑھایا جا رہا ہے'

اس کی عظمت کے گن گائے جا رہے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک ہے نہ کسی گنتی میں ہے' نہ شمار میں۔ دنیا میں مسلمانوں کے ایسے کئی ایک ملک ہیں۔ پاکستان تعلیمی طور پر ان پڑھ ہے' اقتصادی طور پر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ سیاسی طور پر ناگفتہ بہ۔ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہی نہیں ہوا۔ وڈیرے حکمران ہیں' عوام آزادی سے محروم ہیں۔ اگر جمہوریت آ بھی جائے تو چلے گی نہیں۔ چل پڑی تو وہ جمہوریت نہیں بلکہ آمریت کی بہن ہو گی مفاد پرستی ہماری ہڈی میں رچی ہوئی ہے۔ اس ملک کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ ملک مسلمانوں کی پناہ گاہ ضرور ہے اور شاید اسی وجہ سے اللہ کی رحمت سے نوازا گیا ہو۔

لیکن اس بوڑھے حاجی کی بات سن کر مجھ پر گویا جادو سا چل گیا۔ میں نے ایسے محسوس کیا جیسے وہ مجھے مبارک باد دینے آیا تھا۔

اس روز مجھے پاکستان کا ہر بوٹا کچھ زیادہ ہی ہرا بھرا نظر آنے لگا۔ ہر سوکھی شاخ پر سبز پتیاں پھوٹتی نظر آنے لگیں۔ میری ایڑیاں ہوا میں اٹھ گئیں۔ چال میں لے پیدا ہو گئی۔ اندر سے عقل کہتی' یہ کیا کر رہا ہے تو' پاگل ہو گیا ہے کیا' جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہے لیکن اس الف لیلوی کیفیت میں عجب سرشاری تھی۔

علم جفر

پھر ہندوستان سے ایک اور خط موصول ہوا۔ جو قدرت اللہ شہاب کے نام تھا۔ لکھنے والا کوئی ریٹائرڈ سب جج تھا۔ لکھا تھا میں کئی ایک سال سے مفلوج پڑا ہوں۔ مجھے علم جفر سے دلچسپی ہے۔ اس علم میں میرا مطالعہ خاصہ وسیع ہے۔ مجھے پاکستان سے دلچسپی ہے۔ میں پاکستان کے مستقبل کے متعلق جفر کی مدد سے دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ خط میں آپ کے لیے نہیں لکھ رہا۔ بلکہ پاکستان کے لیے لکھ رہا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے آپ کو پاکستان سے گہرا تعلق ہے' آپ کے متعلق مجھے چند ایک باتوں کا علم ہوا ہے۔

۱۔ آپ کا نام پہلے کچھ اور تھا۔ پھر بدل دیا گیا۔

۲۔ آپ انقلاب کے تحت جئے ہیں۔

۳۔ اس وقت بھی آپ انقلاب کے موڑ پر کھڑے ہیں۔
۴۔ یہی کیفیت ملک اور اس کے سربراہ کی ہے۔
۵۔ اندازہ ہے کہ یہ تبدیلی بہتر حالات پیدا کرے گی۔
۶۔ پاکستان کے صدر کا قلب بدل دیا گیا ہے۔
۷۔ آپ کار خاص کے آدمی ہیں۔
۸۔ لیکن ابھی آپ اس قدر پر اثر نہیں ہوئے جتنا ہو سکتے ہیں۔
۹۔ بہت جلد آپ پر اثر ہو جائیں گے۔
۱۰۔ آپ کو بہت سے کام کرنے ہیں۔
۱۱۔ آپ اس ملک کی خدمت پر مامور ہیں۔
۱۲۔ یہ صدر پاکستان کی خوش بختی ہے کہ انہیں آپ سا کارندہ حاصل ہے۔
۱۳۔ جلد ہی وہ آپ کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔
۱۴۔ وہ حوا کی بیٹی، جو اس وقت آپ کے قریب ہے، آپ کے دوش بدوش کام کرے گی۔
۱۵۔ صدر مملکت کار نمایاں کریں گے۔
۱۶۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اعزاز کسی دوسرے سربراہ مملکت کے نصیب ہو۔
۱۷۔ اللہ کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں

اس خط کے p.s میں شہاب کے عیب گنوائے گئے تھے۔ لکھا تھا۔

۱۔ نماز میں آپ اپنا راستہ خود کاٹتے ہیں۔
۲۔ آپ دو رخی کا شکار ہیں۔ نہیں چاہتے کہ راستے میں رکاوٹ پیدا ہو۔ پھر خود ہی رکاوٹ پیدا کر لیتے ہیں۔
۳۔ بے شک آپ کا ایمان مضبوط ہے۔
۴۔ آپ کی انا معدوم ہے۔
۵۔ آپ نیت نیک ہیں۔
۶۔ آپ کا قلب آلود نہیں۔
۷۔ لیکن آپ کے ارد گرد جو چمگادڑیں منڈلاتی رہتی ہیں۔ آپ ان سے اثر قبول کرتے

ہیں اور جان بوجھ کر ان کے اثرات کو زائل ہونے نہیں دیتے۔

کامی

اس خط نے بات واضح کر دی کہ قدرت کو کوئی خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ وہ کامی ہے۔ وہ کسی کام پر مامور ہے۔ اسے کوئی اسائن منٹ ملی ہوئی ہے' جس کی اس نے تکمیل کرنی ہے۔

بہر حال مجھے یہ علم نہ ہو سکا کہ اس اسائین منٹ کی نوعیت کیا ہے۔ صرف اتنا ہی پتہ چلا کہ اس کام کو پاکستان سے تعلق ہے۔ اور غالباً" اسی وجہ سے قدرت کو سیکرٹری ٹو دی پریذیڈنٹ کے عہدہ پر فائز کیا گیا ہے۔

قدرت کے اس عہدے پر فائز ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ سینئر نہیں تھا۔ تجربہ کار نہیں تھا۔ اس کی ہسٹری شیٹ سرکار کی وفاداری کی غماز نہیں تھی' الٹا اس کی پالیسی انقلابی تھی۔ یہاں تک کہ امریکی حکومت کے کاغذات میں درج تھا کہ وہ کمیونسٹ خیالات کا مالک ہے۔

بھاگلپور میں اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے اس نے اپنے سینئر برٹش افسروں کو اس وقت حراست میں لے لیا تھا' جب اسے علم ہوا تھا کہ وہ گاؤں کو آگ لگانے کے لئے آئے ہیں۔

پھر قحط کے دوران اس نے عوام کو بچانے کے لیے سرکاری اناج کا ذخیرہ لٹا دیا تھا۔

پاکستان میں جب وہ جھنگ کا ڈپٹی کمشنر تھا تو اس نے کھلی کچہری لگائی تھی۔ جس پر انتظامیہ والے سخت زچ ہو گئے تھے۔ انہیں یہ گوارہ نہ تھا کہ عوام کو اس قدر قریب آنے دیا جائے اور یوں سر چڑھا لیا جائے۔

اس ہسٹری شیٹ کے افسر کو صدر مملکت کا سیکرٹری بنا لینا کہاں کی دانش مندی تھی۔ حیرت ہے کہ اس عہدے کے لیے اس کا چناؤ کیسے عمل میں آیا۔

قدرت نے کبھی اس عہدے کے حصول کے لیے کوشش نہ کی تھی' الٹا اسے یہ عہدہ ناپسند تھا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کے متعلق تفصیلات آپ قدرت اللہ شہاب کی زبانی سنیئے جو شہاب نامے کے ۶۳۱۔ ۶۲۹ صفحات پر درج ہیں۔

تقرری

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو میں ایک میٹنگ کے سلسلے میں لاہور سے کراچی گیا ہوا تھا۔

میٹنگ شروع ہوتے ہی ٹیلی فون آیا کہ کیبنٹ سیکرٹری مسٹر عزیز احمد مجھے اپنے دفتر میں بلا رہے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے کہا کہ گورنر جنرل مسٹر غلام محمد تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم ابھی گورنر جنرل ہاؤس چلے جاؤ۔

غلام محمد صاحب کے ساتھ میری بالکل کوئی واقفیت نہ تھی۔ وزیر خزانہ کے طور پر انہیں فقط چند بار دیکھا تھا۔ میں نے مسٹر عزیز احمد سے اس بلاوے کا مقصد دریافت کیا تو انہوں نے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

غلام محمد صاحب کے ایک بھائی نے لاہور میں کسی فیکٹری کی الاٹ منٹ کے لیے درخواست دی ہوئی تھی۔ مجھے گمان گزرا کہ شاید گورنر جنرل اس سلسلے میں کوئی سفارش کرنے والے ہوں۔ میں نے اپنے اس خدشے کا مسٹر عزیز احمد سے ذکر کیا' تو انہوں نے اس سے بھی اپنی مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ مسٹر غلام محمد سخت طبیعت کے آدمی ہیں۔ اس لیے میں ان کے ساتھ بات چیت میں احتیاط سے کام لوں۔

مسٹر عزیز احمد کا مشورہ پلے باندھ کر میں گورنر جنرل ہاؤس پہنچا۔ ایک اے ڈی سی مجھے اپنے ساتھ اوپر والی منزل میں لے گیا وہاں پر برآمدے میں قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر صوفے لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک گول میز پر بڑے خوبصورت پھول سجے ہوئے تھے۔

مسٹر غلام محمد ایک گدے والی آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے نیلے رنگ کا دھاری دار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ رومال اور جرابیں ٹائی کے ہم رنگ تھیں۔ کوٹ کے کالر میں گلاب کا پھول ٹنگا تھا۔ سر پر کالی جناح کیپ تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ ان کے قریب والی کرسی پر گورنر جنرل کی پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری مس روتھ بورل بیٹھی تھی۔ یہ بڑی طرحدار' نازک اندام' خوبصورت نیم امریکن' نیم سوس لڑکی تھی' جسے وہ واشنگٹن سے منتخب کر کے اپنے ساتھ پاکستان لائے ہوئے تھے۔ مس بورل پر نگاہ پڑتے ہی میں نے دل ہی دل میں مسٹر غلام محمد کے حسن انتخاب کی داد دی۔ اے ڈی سی نے میری آمد کا اعلان کیا تو دونوں نے نظریں گاڑ کر مجھے سر سے پاؤں تک

گھورا۔ اس کے بعد مسٹر غلام محمد نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ چند لمحے عجیب سی خاموشی طاری رہی۔ پھر گورنر جنرل نے بچوں کی طرح غوں غاں کر کے کچھ بولنا شروع کیا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح بولتے رہے، لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے۔ اور کس زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔

جب وہ خاموش ہوئے تو مس بورل بولی۔ "ہز ایکسیلینسی فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو سیکرٹری ٹو گورنر جنرل کی پوسٹ کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس نازک زمانے میں یہ بڑی اہم ذمہ داری ہے۔ ایچ۔ ای امید رکھتے ہیں کہ آپ ان کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کریں گے ایچ۔ ای کا حکم ہے کہ آپ ابھی نیچے جائیں اور اپنی پوسٹ کا چارج سنبھال لیں۔"

یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ صاف انکار کرنا تو مشکل تھا، اس لیے میں نے ایک عذر لنگ پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں اس وقت پنجاب گورنمنٹ میں ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ جب تک صوبائی حکومت مجھے وہاں سے فارغ نہ کرے کسی اور پوسٹ کا چارج لینا بڑے بے ضابطگی ہو گی۔"

یہ بات سن کر مسٹر غلام محمد غصے میں آ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے کڑک کر کچھ دیر پھر غوں غاں کی، جس کا مفہوم مس بورل نے مجھے یوں سمجھایا۔ "ہز ایکسیلینسی فرماتے ہیں پنجاب گورنمنٹ جہنم میں جائے۔ جس بے ضابطگی کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ بھی آپ کے سمیت جہنم میں جائے۔ پنجاب کے چیف منسٹر ملک فروز خاں نون اتفاق سے نیچے بیٹھے ہیں۔ انہیں ابھی یہاں بلایا جا رہا ہے تاکہ وہ آپ کو پنجاب سے فارغ کر دیں۔ اس کے بعد آپ فوراً نیچے جا کر اپنی پوسٹ کا چارج سنبھال لیں۔"

یہ تیر نشانے پر نہ بیٹھا، تو میں نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ "جناب میری والدہ اور سامان لاہور میں ہے۔ چارج لینے سے پہلے کیا میں وہاں جا کر انہیں کراچی لا سکتا ہوں؟"

اب مسٹر غلام محمد کا پارہ بے حد اوپر چڑھ گیا اور وہ کرسی میں بل کھا کھا' زور زور سے چیخنے لگے۔ ان کے منہ کے ایک کونے سے لعاب دھن کی پچکاری سی چلی اور کوٹ کی آستین پر گر گئی۔ مس بورل نے نیپکن سے ان کا کوٹ صاف کیا اور مجھے مخاطب کر کے کہا" ہز ایکسیلینسی اپنی شدید خفگی کا اظہار کیا ہے کہ آپ حجت بہت کرتے ہیں۔ ایچ۔ ای کا حکم ہے کہ آپ اس ناپسندیدہ عادت کو فوراً ترک کر دیں ورنہ آپ کو پچھتانا پڑے گا۔"

یہ سین ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک اے ڈی سی پنجاب کے چیف منسٹر ملک فیروز خان نون کو لے کر برآمدے میں نمودار ہوا۔ ملک صاحب کو دیکھتے ہی' مسٹر غلام محمد نے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا اور غاؤں غاؤں کر کے کچھ بولتے رہے۔ مس بورل ترجمانی کے فرائض سرانجام دیتی رہی۔ اس کے بعد چیف منسٹر نے مجھے کہا" یہ پوسٹنگ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ مبارک ہو۔ فوراً چارج سنبھالو۔ باقی ضابطے کی کاروائیاں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو چیف منسٹر نے آنکھ مار کر مجھے چپ کرا دیا۔ اس طرح سربراہ مملکت سے میرا پہلا انٹرویو ختم ہوا اور میں اگلے نو برس کے لیے اس بیت الجن میں مقید ہو گیا۔

ریٹائرڈ سب جج کا خط اٹھا کر میں نے راجہ اور وانی کی طرف بھاگا۔ راولپنڈی میں صرف دو شخص تھے جن سے میں بے تکلفی سے دل کی بات کہہ سکتا تھا۔

وہ دونوں بڑی توجہ سے میری بات سنتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ انہیں مجھ سے عقیدت تھی۔ وہ میری ہر بات سے اثر لیتے تھے۔

خواجہ غلام دین وانی

راجہ اور وانی دونوں ہی مومن قسم کے آدمی تھے۔ ان میں ایمان کے ڈھیر لگے ہوئے تھے وہ ہر بات پر ایمان لے آتے اور پھر سبحان اللہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے۔ غلام دین وانی تو مسلمان آدمی تھا' صوم و صلوۃ کا پابند' نیکی کا متوالہ' خدمت گزار' عقیدت سے بھرا ہوا' مہمان نواز اتنا

صراط مستقیمی کہ پاس بیٹھ کر گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اس کی بیگم بھی نیک اور رسم زدہ تھی۔ بیگم کو میاں کے خلاف صرف ایک شکایت تھی کہ میاں کمانے کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔

بیگم کی شکایت بالکل جائز تھی۔ میاں پڑھا لکھا تھا۔ وکیل تھا۔ لیکن وکالت کا کام کرنے سے گریز کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وکالت جھوٹا پیشہ ہے۔ اس میں سچائی اور دیانت داری کا فقدان ہے۔

وانی نے کبھی وکالت کو نہ اپنایا تھا۔ اسے اپنانے کی جگہ اس نے یہ گوارہ کیا کہ کچہری میں ایک دری بچھا کر بیٹھ گیا۔ ایک مہر بنوائی اور یوں اوتھ کمشنر بن گیا۔

کچھ دیر کے لیے وانی حکومت آزاد کشمیر میں وزیر بھی رہا تھا۔ لیکن اس کے گھر والوں کو وانی کے اس عہدے کا چنداں فائدہ نہ ہوا تھا۔ نہ تو اس نے وزارت کا ٹھاٹھ باٹھ اختیار کیا' نہ سٹف کالر پہنا' نہ آواز میں رعونت پیدا کی۔ نہ بات میں حکم کا رنگ بھرا' الٹا مزدوروں کی طرح عوام کی خدمت میں لگ گیا۔ اور گھر میں مہمان داری کا بوجھ بڑھا لیا۔

غلام دین وانی کی بیگم کو میاں سے دوسری شکایت یہ تھی کہ اس نے نہایت واہیات قسم کے لوگوں کو دوست بنا رکھا تھا۔ میرے نام پر تو محترمہ کھلم کھلا لاحول پڑھا کرتی تھی۔

وانی کے گھر ہم جایا تو کرتے تھے' لیکن ڈرتے ڈرتے۔ غلام دین وانی میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی جو آج بھی دائم و قائم ہے۔

ہم اس سے کہا کرتے تھے وانی اگر تو دیانت داری کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو بے شک کر' اگر تو خدا خوفی کے مرض میں مبتلا ہے تو ٹھیک ہے' اگر تو اصولوں کے مطابق جینا چاہتا ہے تو بے شک جی۔ اگر تو عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو بیشک کر' تجھے کون روکتا ہے لیکن تو دوسروں سے کیوں توقع رکھتا ہے کہ وہ ایسے ہی زندگی بسر کریں' جیسے تو کرتا ہے۔ اگر وہ بددیانتی کرتے ہیں تو بڑے کریں' اگر وہ رشوت لیتے ہیں تو بڑے لیں۔ تو اپنی جان کیوں ہلکان کرتا ہے۔ رشوت وہ لیں' دھوکا وہ کریں' جان کو روگ تو لگائے' یہ کہاں کی خردمندی ہے۔

لیکن وانی مجبور تھا۔ وہ دوسروں کے جرائم پر خود کو سزا دینے پر طبعاً" مجبور تھا۔ وہ لوگوں کو ایسے واقعات سناتا۔ سیاسی ہیرا پھیریوں پر کڑھتا اور یا پھر ارباب بست و کشاد کو شکایتوں بھرے خط لکھتا رہتا تھا۔

میرا ساتھی

اس کے برعکس راجہ شفیع ایک متوازن فرد تھا۔ وہ محکمہ بحالیات میں ایک کلرک تھا۔ اس قدر خوش پوش تھا کہ دیکھ کر لگتا جیسے کوئی بڑا افسر ہو۔ بات کرنا جانتا تھا۔ ہر شخص سے اس کی حیثیت کے مطابق بات کرتا۔ حتی الوسع غریبوں کی مدد کرتا۔ اس میں تعلقات عامہ کی بڑی صلاحیت تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ سارا شہر اسے جانتا تھا۔ اس کے تعلقات بڑے وسیع تھے۔ طبیعت کا راجہ تھا۔ ہر بات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ شاہ خرچ تھا۔ پوٹھوہار کا رہنے والا تھا۔ یہاں اپنی زمینیں تھیں' جہاں سے پیداوار آتی رہتی تھی۔

بھائی جان کے حلقہ کے کچھ لوگ راجہ پر اعتراض کرتے تھے۔ کہ وہ دالیں' مونگ پھلی' بھٹے' ایسی قسم کی چیزیں بھائی جان کو تحفے کے طور پر دیتا رہتا تھا اور یوں بھائی جان کو رسمی پیر بنائے جا رہا تھا اور اگر وہ اپنی اس حرکت سے باز نہ آیا تو سرکار قبلہ کا مزار پیر خانہ بن جائے گا۔

مرد قلندر پیر خانوں کے سخت خلاف تھے۔ زندگی بھر انہوں نے اپنے آستانے کو پیر خانہ بننے نہ دیا تھا۔ فوت ہونے سے پہلے انہوں نے تاکید کی تھی کہ مزار پر کسی متولی کو بیٹھنے نہ دیا جائے۔ مزار پر چھت نہ ڈالی جائے۔ چار دیواری کو اونچا نہ کیا جائے۔

بھائی جان طبعاً" پیروں اور پیر خانوں کے حق میں نہ تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی سرکار قبلہ کے احکامات کی خلاف ورزی کرے۔

بھائی جان پسند نہیں کرتے تھے کہ راجہ انہیں چھوٹے چھوٹے تحائف بھیجے۔ ایک بار بھائی جان نے کہا' راجہ صاحب آپ ہمیں یہ چیزیں نہ بھیجا کریں ہم یہ پسند نہیں کرتے۔

اس پر راجہ جوش میں آگیا تھا۔ پہلی مرتبہ اس نے بھائی جان کے روبرو غصے میں بات کی تھی۔ کہنے لگا' بھائی جان آپ کے اصول سر آنکھوں پر' لیکن ہماری خواہشات بھی کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔ ہمارے دل میں بھی چند ایک چاؤ ہیں۔ آپ انہیں اچھا جانیں یا برا' ہم ان کو اندر سے نکال نہیں سکتے۔ وہ ہمارے خون میں رچے ہوئے ہیں۔

بھائی جان میں ایک چھوٹا سا زمیندار بھی ہوں۔ زمین سے جب کوئی چیز آتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ انہیں بھی بھیجوں جن سے مجھے عقیدت ہے۔ میں آپ کو پیر نہیں بناتا۔ اپنے

دل کی ایک چھوٹی سی خوشی پوری کرتا ہوں۔ آپ پر احسان نہیں دھرتا۔ آپ میری اسی چھوٹی سی خوشی کو کیوں روک رہے ہیں۔ یہ سن کر بھائی جان کا سارا غصہ بہہ گیا اور وہ گردن لٹکا کر بیٹھ گئے۔

راجہ شفیع اول تو بات نہیں کرتا تھا۔ جب کرتا تو منہ سے تھوک کا فوارہ چل نکلتا۔

شہاب کے گھر وہ اکثر جایا کرتا تھا' شہاب سے تو کبھی تفصیلی ملاقات نہ ہوتی تھی۔ لیکن عفت سے ملتا اور اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔ عفت مجھ سے کہا کرتی تھی' شہاب سے ملنے والے آپ سب درشنی پہلوان ہیں' کام کا آدمی صرف راجہ شفیع ہے۔

ایک دن راجہ شفیع کو ایک کام آ پڑا۔ گاؤں کا ایک آدمی تھا جسے چپڑاسی لگوانا تھا۔ راجہ نے عفت سے کہا کہ شہاب سے کہہ کر فلاں آدمی کو دفتر میں چپڑاسی لگوا دے۔

شہاب نے کہا راجہ سے کہنا کہ چپڑاسی لگانا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی افسر لگوانا ہو تو میں یقیناً" مدد کروں گا۔

ایک دن راجہ گھر گیا تو شہاب موجود تھا۔

راجہ نے کہا شہاب صاحب ہم چھوٹے لوگ ہیں۔ آپ کی طرح بڑے لوگ نہیں ہیں۔ ہم تو چپڑاسی لگوانے کی درخواست ہی کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں پڑھے لکھے آدمی کہاں ہیں کہ انہیں افسر لگانے کی سفارش کریں اگر آپ چپڑاسی نہیں لگوا سکتے' تو ہم جیسے چھوٹے آدمیوں سے راہ و رسم کیوں رکھتے ہیں۔

راجہ کی بات سن کر قدرت بہت شرمندہ ہوا' وہ چار روز فون پر مختلف افسروں کی منتیں کرتا رہا کہ وہ راجہ کے آدمی کو چپن رکھ لیں۔

راجہ مجھ سے اکثر ملتا رہتا تھا وہ میرا واحد ساتھی تھا۔ لیکن وہ میری ذہنی پریشانیوں کو دور نہ کر سکتا تھا۔

شہاب کے متعلق وہ خط لے کر میں راجہ کے پاس گیا۔ میں نے کہا راجہ یہ کیا جھمیلا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔

اس نے غور سے وہ خط پڑھا' کہنے لگا' سبحان اللہ کیا خط ہے۔ کتنی اچھی خبریں ہیں اس خط میں۔

میں نے کہا یار یہ قدرت اللہ شہاب کون ہے' کس کام پر مامور ہے۔

وہ ہنسا بولا' مفتی ہم پینڈو لوگ ہیں ہم پیڑ نہیں گنتے،ہم تو صرف پھل کھاتے ہیں۔

میں نے کہا آخر پتہ بھی تو چلے۔

پتہ چلا کر کیا کرنا ہے۔ مفتی یہ بتا کیا کوئی ایسا بھی ہے جسے پوری بات کا پتہ چلا ہو۔ کسی کو چک لالہ تک پتہ ہے' کسی کو گوجر خان تک پتہ ہے' کوئی نہ کوئی تو ہو گا جسے جہلم تک پتہ ہو گا۔ سیدھی بات ہے کہ شہاب ایک بزرگ ہے۔ ورنہ سرکار قبلہ اس کی دستار بندی نہ کرتے اور اسے کوئی کام کرنا ہے جو پاکستان سے متعلق ہے۔ اتنی سی بات ہے۔ ہماری لیے یہی کافی ہے۔ اب تو خواہ مخواہ کرید میں لگا ہے کہ وہ کونسا کام ہے' اس کی نوعیت کیا ہے' اسے کیوں یہ کام دیا گیا ہے' کس نے دیا ہے۔

تو تو پانی کو چاٹی میں ڈال کر اسے بلوہ رہا ہے۔ بے کار ہے' مکھن نہیں نکلے گا۔

انہی دنوں بھائی جان مری سے آ گئے۔

مَیں وہ خط لے کر بھائی جان سے جا ملا۔

خط پڑھ کر بھائی جان مسکرا دیئے۔

میں نے عرض کی بھائی جان' میرا ذہن ماؤف ہو چکا ہے۔

اس وقت ہم سب سرکار قبلہ کے مزار پر بیٹھے تھے۔ راجہ بولا۔ جناب یہ جو مفتی ہے' اسے سوچنے کی بیماری ہے۔ یہ جاننا چاہتا ہے۔

سیدھی بات

بھائی جان مسکرائے' بولے سوچنے کی کوئی بات ہی نہیں۔ سیدھی سیدھی بات ہے۔ مفتی صاحب اللہ کے بندے ہر جگہ موجود ہیں' اپنے اپنے کام پر مامور ہیں۔

ستارہ بھی کام پر مامور ہے۔

ابھی وہ زیر تربیت ہیں۔

انشاء اللہ بہت جلد وہ تربیت مکمل کر لیں گے۔

قدرت اسباب پیدا کر رہی ہے۔

شاید ایران سے کانفیڈریشن ہو جائے۔

سکھوں کو ایک ریاست مل جائے۔

ہو سکتا ہے کہ سکھ ہمارے ساتھ مل جائیں۔

اب کشمیر کے لیے جنگ کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ ویسے ہی مل جائے گا۔ جموں ادھر چلا جائے گا۔ وادی ادھر آ جائے گی۔

نہرو بھی جانے والا ہی ہے۔

سب کچھ سرکار قبلہ کے پروگرام کے مطابق ہو رہا ہے۔

اس روز بھائی جان کہہ دینے کے موڈ میں تھے۔ ایسے ہی جیسے قدرت چھلکن کی کیفیت میں ہوتے تھے۔ شاید بھائی جان بھی چھلکن میں تھے۔ مگر ان کے انداز میں وہ سرشاری اور مستی نہ تھی جو قدرت کی چھلکن میں ہوتی تھی۔ بھائی جان کنٹرول میں تھے۔

جب کبھی بھائی جان کہنے کے موڈ میں ہوتے' تو ہم چپ چاپ بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے بولے' مفتی صاحب سوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ کی نگری میں اپنے طور طریقے ہیں۔ اپنا نظام ہے' جو ہم دنیاداروں کے ادراک میں نہیں آ سکتا۔

ہدایات

مفتی صاحب بس دو ایک باتیں یاد رکھیں' بھائی جان نے کہا۔

ایک تو یہ کہ وہ قادر مطلق ہے۔ ہر بات میں آخری فیصلہ اس کا ہے۔ کوئی مستقبل کی بات کرے یا پیش گوئی کرے تو اس پر یقین نہ کریں اور اگر کریں بھی تو یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آخری فیصلہ اس کا ہو گا۔ وہ چاہے تو اپنے فیصلے کو بھی بدل دے۔

کبھی کائنات کے نظام پر نکتہ چینی نہ کریں۔

اللہ کے کاموں میں حجت نہ کریں۔

پاکستان کے متعلق فکر نہ کریں۔

پاکستان کا فکر کرنے والے اللہ کے بندے موجود ہیں۔

یہ نہ سوچیں کہ کس طرح ہمیں فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ سوچیں کہ ہم کس طرح دوسروں کے کام آسکتے ہیں۔

پھر بھائی جان کی توجہ سرکار قبلہ کی طرف مبذول ہو گئی۔ پرانی باتیں یاد آ گئیں' کہنے لگے۔

ہم پانچ بھائی تھے۔ نانک چند تھا' سکندر تھا' محمد دین تھا' غلام محمد تھا' میں تھا' تین خام نکلے اس لیے ختم کر دیے گئے۔ سکندر نے کہا میں کشمیر جاؤں گا۔ گیا' مگر لوٹ آیا۔ پھر بھیجا گیا' پھر واپس آ گیا۔ حکم عدولی کی وجہ سے ختم کر دیا گیا۔ محمد دین نے بھی حکم عدولی کی' غلام محمد نے بھی' نانک چند بھارت چلا گیا۔ پھر اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ دو سال سے کوئی خط موصول نہیں ہوا۔

بھائی جان کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے' بیعت کو نبھانا بہت مشکل ہے۔ بیعت کے بعد ہر بات حکم بن جاتی ہے' ہر وقت حکم عدولی کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

بیعت کے بعد تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ پھر کوتاہی ہو جائے تو نتیجہ وہی ہوتا ہے' جو سکندر کا ہوا۔ راجہ صاحب فقیری بہت مشکل ہے۔ بیعت کرنے کی نسبت دوست ہونا بہتر ہے۔

مشن

اس کے چند روز بعد ایک روز میں نے دیکھا کہ قدرت کی آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں' زبان میں لکنت ہے اور انداز میں عجیب قسم کی اچھل ہے۔ اس نے گھنٹی بجائی۔

آپ پی اے کو بلا رہے ہیں' میں نے پوچھا۔

ہاں اس نے جواب دیا' مجھے ڈکٹیشن دینا ہے۔

میں نے کہا' شہاب صاحب آپ ڈکٹیشن نہ دیں۔

کیوں' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' جناب آپ اس وقت پریذنٹ ایبل نہیں ہیں۔ آپ کو لوگوں کے سامنے نہیں جانا چاہیے اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ مجھے کچھ ہے کیا' اس نے پوچھا

اس وقت آپ ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ جیسے ٹھرے کی دو بوتلیں پی رکھی ہیں۔

وہ مسکرایا' کہنے لگا' عفت بھی شک کر رہی تھی۔

میں نے بھارت کے ریٹائرڈ سب جج کا خط کھول کر اسے دکھایا۔ آپ کو پتہ ہے' وہ بولا' کہ اگر میں اپنے مشن میں ناکام ہوا تو کیا ہوگا۔

کیا ہو گا۔

میں سڑک کے کنارے ایک گوشت کے لوتھڑے کی طرح پڑا رہوں گا۔ میرے جسم میں کیڑے پڑے ہوں گے۔ میرے جسم سے اس قدر بدبو آ رہی ہو گی کہ راہ گیر ناک پر رومال رکھ کر گزریں گے۔

یہ سن کر مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔

میرا جسم مفلوج ہو گا' قدرت نے کہا' مگر میری حسیات قائم ہوں گی۔ بلکہ نارمل انسان کی نسبت چار گنا زیادہ تیز ہوں گی تاکہ میں اپنی تکلیف کو شدت سے محسوس کروں۔

یہ سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ قدرت ایک خوش قسمت آدمی ہے۔ اسے کوئی رتبہ حاصل ہے۔ اس کی حیثیت اعزازی ہے۔ وہ ایک بزرگ ہے' جسے پر اسرار طاقت حاصل ہے۔ اس کی یہ بات سن کر میں گھبرا گیا۔ میرے مفروضے صابون کے بلبلوں کی طرح پھوٹ گئے۔ مجھے خیال آیا کہ قدرت کی نسبت تو میں زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میرے سر پر تلوار نہیں لٹک رہی۔ میں ایک آزاد آدمی ہوں۔

اور آپ کو پتہ ہے' اس نے کہا۔ اس کی آواز سن کر میں چونک کر جاگ پڑا۔

کیا' میں نے پوچھا۔

کہ میری کیفیت ایسی ہو گی کہ کوئی میرے قریب نہیں آئے گا۔ کراہت کی وجہ سے لوگ مجھ سے دور بھاگیں گے۔

لیکن' میں نے پوچھا' یہ پابندی آپ پر کب عائد ہوئی۔ کیا پیدائشی ہے یا ——————

۱۹۳۶ء میں' اس نے جواب دیا' دفعتاً" ایک طوفان چلنے لگا' پنڈورا کا صندوق کھل گیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ دلی کے ایک بہت بڑے بزرگ تشریف لائے اور انہوں نے مجھے پابند کر دیا۔ لیکن مجھ پر اس کی بڑی رحمتیں ہیں۔ بڑی رحمتیں ہیں۔ اگر یہ رحمتیں نہ ہوتیں تو میں کب کا ریزہ ریزہ ہو چکا ہوتا۔ میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کیفیت کے باوجود جو اس پر طاری تھی۔ اس اکسٹیسی کے باوجود' اس کیف و مستی کے باوجود' اس میں ایک ٹوٹ تھی۔ ایک بے پایاں احساس بے بسی اس کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ میرے دل میں جاننے کا جنون' کرید کی خواہش جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا'

جیسے وہ بزرگ نہ تھا۔ بلکہ ایک عام انسان تھا' تھکا ہارا ہوا' بے بس انسان۔ اور وہ اسرار جو اسے لپیٹے ہوئے تھا۔ وہ دراصل ایک زنجیر تھی' ایک مجبوری' لاچاری۔

اس روز ساری رات مجھے نیند نہ آئی۔

چھتیسواں باب

چمگادڑیں

قدرت اللہ شہاب باکردار آدمی تھا۔ اس میں بہت سی مثبت خصوصیات تھیں۔ کچھ خصوصیات قدرت نے وراثت میں پائی تھیں۔ والد اور والدہ دونوں ہی پاکیزہ اور سادہ مزاج تھے۔ قدرت کے والد بہت ذہین تھے وہ امتحانات میں فسٹ کلاس فسٹ آیا کرتے تھے۔ والدہ بڑی عابدہ تھیں۔ قدرت کا ایمان تھا کہ اس کی زندگی میں جتنی بھی برکت تھی وہ والدہ کی دعاؤں کی وجہ سے تھی۔

قدرت کی شخصیت میں دو بڑی زبردست قوتیں تھیں۔ اس میں سہہ جانے' برداشت کر لینے کی قوت عام انسان سے بہت زیادہ تھی۔ دوسرے اس کی ول پاور اس قدر طاقت ور تھی کہ دوسرے کو زچ کر سکتا تھا۔

مضحکہ خیز

قدرت میں طمع نہیں تھی' حرص نہیں تھی۔ نمائش نہیں تھی' لیکن ساتھ ہی اس میں چند ایک کمزوریاں بھی تھیں' یہ کمزوریاں بڑی مضحکہ خیز تھیں۔

مثلاً اس میں ایک جھجک تھی۔ ایک عجیب قسم کی ہچکچاہٹ تھی۔ لیکن وہ اپنے آہنی عزم

کی مدد سے اس جھجک اور ہچکچاہٹ کو دور نہ کر سکا تھا۔ جب بھی وہ حملہ کرتی' وہ گھبرا کر پیچھے ہٹتا۔ اسے ایک دھچکا لگتا' لیکن جلد ہی سنبھل جاتا۔

مجھے شک پڑتا تھا کہ قدرت بھی میری طرح احساس کمتری کا شکار ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اس پر فوری طور پر قابو پا سکتا تھا۔ دراصل قدرت میں دو بڑے طاقت ور پرزے لگے ہوئے تھی۔ ایک بریک دوسری شاک ابزاربر۔

شاید اسی وجہ سے وہ سفارش نہیں کر سکتا تھا۔ جب بھی اسے سفارش کرنی پڑ جاتی تو اندر ہچکچاہٹ کی مدھانی چل پڑتی۔ پھر وہ اسے التوا میں ڈالتا رہتا' ڈالتا رہتا۔ فرار کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ مجبور ہو جاتا تو فون پر سفارش کرتے ہوئے پسینے چھوٹ جاتے۔ سفارش کرتے ہوئے اس کا رویہ متوازن نہ رہتا تھا۔ ایسی بے بسی اور آہ و زاری سے منتیں کرتا کہ اس پر ترس آنے لگتا۔ میں نے اسے اپنے ماتحتوں کی منتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

بنیادی طور پر قدرت اکیلا تھا۔ محفل سے کتراتا تھا۔ ملاقاتی رخصت ہوتا تو وہ اطمینان کا سانس لیتا۔ وہ اینٹی سوشل نہ تھا' اسوشل تھا۔

قدرت میں اونچائیوں کا خوف تھا۔ جب وہ ہوائی جہاز کی سیڑھی چڑھتا تو اس پر خوف طاری ہو جاتا۔ جوں جوں چڑھتا جاتا' توں توں کرب بڑھتا جاتا۔ جب آخری سیڑھی پر پہنچتا تو اسے جان قبض جیسا عذاب سہنا پڑتا۔

اسلام آباد میں جب انہوں نے آخری مکان بدلہ تو قدرت نے اپنے لیے اوپر کی منزل کا کمرہ منتخب کیا۔

میں نے پوچھا' انہوں نے آپ کو اوپر کی منزل کا کمرہ کیوں دیا ہے

کہنے لگا' میں نے خود منتخب کیا ہے۔

میں نے کہا' شہاب صاحب آپ خود کو کیوں اذیت دیتے ہیں۔

کہنے لگا' خود کو قابو میں رکھنا ہی تو ساری بات ہے۔ واہ کیا بات ہے' میں نے کہا۔ پہلے خود کو ایڑ لگاؤ۔ جب وہ بدکے تو لگام کھینچو۔

واہ' اس نے جواب دیا' آپ نے تو بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی۔

میں نے کہا' جناب ہم تو اسے ایذا پسندی کہتے ہیں۔

پرانی چیزیں

کچھ لوگوں کو پرانی چیزوں سے خدا واسطے کا لگاؤ ہوتا ہے۔ ان میں پرانی اور بے کار چیزوں کو پھینک دینے کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہ چیزیں کسی مقصد کے لیے نہیں سنبھالی جاتیں' اس لیے نہیں کہ کام آئیں گی۔

سیانے کہتے ہیں' عورتیں اس لیے چیزیں نہیں پھینکتی کہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر میں نے پھینک دیں تو پڑوسن اٹھالے گی اور انہیں کام میں لے آئے گی۔ وہ چیزوں کو اس لیے سنبھال کر نہیں رکھتیں کہ داشتہ آید بکار۔

وہ مرد جنہیں پرانی چیزوں سے محبت ہوتی ہے۔ وہ پڑوسی کے ڈر کے وجہ سے انہیں سنبھال کر نہیں رکھتے۔ یہ تو آرٹ فار آرٹ سیک قسم کا شوق ہے۔ یہ شوق ادیبوں میں عام ہوتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب میں بھی پرانی چیزوں کو سنبھال کرر کھنے کی عادت تھی۔ بے کار چیزوں کو سنبھالتا تھا' لیکن روپیہ پیسہ بے دریغ بانٹتا تھا۔ جب وہ ہالینڈ میں مقیم تھا تو اس کے بیشتر خط ایک ہی نفس مضمون کے حامل ہوتے تھے۔

اتنے روپوں کا چیک بھیج رہا ہوں۔ ساتھ لوگوں کے پتے ارسال کر رہا ہوں۔ آپ ان لوگوں کو اتنے اتنے روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔

اشفاق احمد نے اپنے مضمون بابا صاحب میں قدرت اللہ شہاب کے کمرے اور الماری کا نقشہ کھینچا ہے۔ لکھتا ہے۔

> "قدرت اللہ شہاب کے کمرے میں بے شمار کتابیں رسالے جریدے فہرستیں' فائلیں' پلنگ پر' میزوں پر' تپائیوں پر' فرش پر اور کرسیوں پر پڑی رہتی تھیں۔ اور ان کے درمیان بیٹھنے بلکہ کھڑے ہونے تک کی جگہ نہ ملتی تھی۔ کوئی شخص ان کے کسی پلندے کو اٹھا کر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو گھبرا سے جاتے تھے اور ہاتھ کے کمزور اشارے سے منمناتے کہ اس انبار کو یہیں رہنے دو۔ بیٹھنے کے لیے ایک اور کرسی تلاش کر کے لے آؤ۔
>
> الماریوں کے اندر دواؤں کی خالی ڈبیاں' تھرما میٹروں کے خول' پرانی سیفٹیوں کے

سیٹ، سینٹ اور کلون کی خالی شیشیاں، کف لنکس، استعمال شدہ پن، دھوپ کی عینکوں کے پرانے خول، سوکھے ہوئے مارکر، ٹوٹے ہوئے دستوں والے لیٹر اوپنر، پرانے زمانے کی ٹارچیں اور متعدد اقسام کے کوٹ صاف کرنے والے برش، اور ان کے ساتھ ہزاروں اقسام کی نادر، بے وقعت، لایعنی لیکن جاذب نظر چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ آپ ان چیزوں کو دیکھ سکتے تھے۔ میرا مطلب ہے الماری کے پٹ کھلیں تو۔ ان چیزوں کو اٹھانے، دیکھنے، ان کے بارے میں پوچھنے، یا انہیں مانگنے کی اجازت نہ تھی۔

شہاب کی شخصیت کے تضادات کا بھی جواب نہیں تھا۔

الماریاں بے کار، بے مصرف چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بنک اکاؤنٹ خالی تھا۔ عفت کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی کہ قدرت کی تنخواہ کٹوتیوں کے بعد دفتر کے اسسٹنٹ جتنی بنتی تھی۔

وقت آبسیشن

وقت کے متعلق قدرت کو آبسیشن تھی۔ ملک سے باہر جانا ہوتا تو وہ آٹھ دن پہلے تیاری میں مصروف ہو جاتا اور ذہنی طور پر چوبیس گھنٹے پہلے ایئرپورٹ کی انتظار گاہ میں جا بیٹھتا۔

ادبی محفل میں جانا ہوتا تو اسے بڑی کوفت ہوتی۔ وقت مقررہ سے پانچ منٹ پہلے وہ ہال میں جا بیٹھتا اور اسے گھنٹوں ادیبوں کا انتظار کرنا پڑتا۔

میں کہتا، شہاب صاحب، اگر ادبی بزم کا وقت پانچ بجے ہو تو ہمیں ساڑھے چھ آنا چاہیے، چوں کہ جلسہ سات سے پہلے شروع نہیں ہوتا، لیکن آپ ضد کر کے پانچ بجے آ جاتے ہیں اور پھر آپ کو کوفت ہوتی ہے۔

نہیں نہیں، وہ کہتا، اٹ از آل رائٹ۔

میں کہتا، جناب اوپر سے تو آپ آل رائٹ ہیں۔ اندر سے چڑ چڑ دانے بھون رہے ہیں۔

وہ بات کا رخ بدلتا۔ کہتا، یہ ادیب لیٹ کیوں آتے ہیں۔

یہ ادیبوں کی ریت ہے اور انہوں نے بڑی محنت سے اس ریت کی پرورش کی ہے، میں جواب دیتا۔

لیکن ادیب وقت پر بھی آسکتے ہیں۔

بے شک آسکتے ہیں۔ پر آئیں گے نہیں۔

لیکن کیوں۔

دے وانٹ ٹو بھی ڈفرنٹ۔ بس اور کیا۔ آپ کی مشکل یہ ہے کہ جب آپ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ پانچ بجے مجھے ادبی محفل میں جانا ہے تو پھر آپ پونے پانچ کے بعد گھر میں بیٹھ نہیں سکتے۔

ہاں ایک بے چینی سی لگ جاتی ہے' وہ جواب دیتا۔

آپ تو بڑے خوش قسمت ہیں شہاب صاحب۔ اس لیے کہ آپ ذہنی طور پر ۲۴ گھنٹے پہلے ریلوے پلیٹ فارم پر جا بیٹھتے ہیں۔ میری والدہ آٹھ دن پہلے ریلوے پلیٹ فارم پر جا بیٹھتی ہے۔

ایک دن میں نے قدرت سے کہا' مجھے آپ سے ایک چیز مانگنی ہے۔

بولا' مانگیے۔

میں نے کہا' مجھے اپنا کوئی سا پرانا سوٹ دے دیں۔

پرانے کا کیا مطلب۔

میں نے کہا کوئی گھسا پٹا۔

آپ اسے کیا کریں گے۔

پہنوں گا۔

تو چلیے میں آپ کو ایک نیا سوٹ خرید دیتا ہوں۔ وہ بولا۔

مجھے نیا نہیں چاہیے۔ ایسا والا چاہیے جس سے آپ کی خشبو آئے۔

وہ مسکرایا بولا' خشبو نہیں میرے بدن میں ایک بو سی ہوتی ہے جب میں دھونے کے لیے عفت کو جرابیں دیتا ہوں تو وہ انگلیوں سے ناک بند کر لیتی ہے اور برا سا منہ بناتی ہے۔

بس مجھے ایسا ہی چاہیے' میں نے کہا۔

اچھا میں دیکھوں گا' وہ بولا۔

وہ زچ ہو کر رہ گیا۔ پرانا سوٹ دینا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ نیا سوٹ خرید کر دینے کے لیے تیار تھا۔

عورت

قدرت کی سب سے بڑی کمزوری عورت تھی۔ ایسی عورت جو جاذب نظر ہو اور اسی وجہ سے راستے سے بھٹک گئی ہو۔

ایک بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ خواتین قدرت کو دیکھ کر اس پر ریجھ کیوں جاتی تھیں۔ کیوں اس کے گرد منڈلاتی تھیں۔ قدرت کے خدوخال' قد کاٹھ کوئی تفصیل جاذب نظر نہ تھی۔ اس کی آنکھ غنڈی نہیں تھی۔ اس میں بلاوا نہیں تھا۔

کہتے ہیں عورت سب سے پہلے مرد کی آنکھ کو دیکھتی ہے۔ اس میں بلاوا ہو تو دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ ٹھنڈی آنکھ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

قدرت کی آنکھ کبھی کبھی چمک تو مارتی تھی' لیکن وہ چمک بلاوے کی چمک نہ ہوتی۔ الٹا قدرت کی آنکھ میں ایک جھجک تھی۔

میں دو باتوں پر حیران ہوا کرتا تھا۔

کہ عورتیں قدرت پر کیوں ریجھتی تھیں۔ اس کے گرد کیوں منڈلاتی تھیں کہ قدرت صراط مستقیم سے بھٹکی ہوئی حسیناؤں میں کیوں دلچسپی لیتا تھا۔ قدرت کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ پاس پاس دو جائے نماز بچھے ہوں اور وہ کسی ایسی خاتون کے ساتھ نماز پڑھے۔

میں زندگی بھر جنس کا طالب علم رہا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ عورت اکٹھے نماز پڑھنے پر کیسے راضی ہو جاتی ہے۔

پھر مجھے محترمہ رابعہ بصری کی بات یاد آجاتی۔ جب رابعہ بصری کو زبردستی چکلے میں بٹھا گیا گیا۔ جب بھی گاہک آتا تو پتہ نہیں کیسے وہ اسے اس بات پر رضامند کر لیتیں کہ پہلے اکٹھے نماز پڑھ لیں' پھر عیاشی۔

جب گاہک نماز پڑھ رہا ہوتا تو رابعہ بصری اللہ کی منت کرتی۔ یا باری تعالیٰ یہاں تک تو اسے میں لے آئی ہوں اب تو جانے اور تیرا کام۔

مجھے خیال آتا' شاید قدرت بھی یہی کام کر رہا ہو۔

بہرحال ایک بات یقینی تھی کہ قدرت کئی ایک پٹڑی سے اتری ہوئی حسیناؤں کو پھر سے صراط مستقیم کی سڑک پر چڑھا چکا تھا۔

میڈم

پھر ایک بڑی طرح دار بیگم جسے میڈم کہہ کر بلاتے تھے' قدرت کی جانب مائل ہو گئی۔ وہ ادھیڑ عمر کی تھی' لیکن اس میں اس قدر بشاشت اور شگفتگی تھی کہ حیرت ہوتی تھی۔ بہت پڑھی لکھی تھی اور اس قدر آزاد منش تھی کہ اسے کوئی جھجک نہ تھی۔ ہر موضوع پر بات کرتی۔ آنکھوں میں دعوت عام تھی۔ کوئی ہو' کیسا ہو۔

صرف نظر کو عادت تماشہ نہیں تھی۔ اس کے جسم کے بند بند کو عادت تماشہ تھی۔ مرد کو دیکھ کر دف بجنے لگتی تھی۔ کسی بات کو چھپاتی نہ تھی۔ میاں سے کہتی' میں کیا کروں' میں ایسے ہی بنائی گئی ہوں۔ میاں بے چارا بے بس تھا' اسے روک نہیں سکتا تھا' دیکھ دیکھ کر شاید اسے دیکھنے کی لت پڑ گئی تھی شاید وہ پیپنگ ٹام بن چکا تھا۔

میڈم نے آ کر قدرت کو چیلنج کیا۔ اس معاملے میں قدرت بڑا نڈر بے باک سپاہی تھا۔ اس نے چیلنج قبول کر لیا۔ ہم ڈر گئے' اب کیا ہو گا۔ دو بڑی طاقتوں میں تصادم ہو گا۔ ایک کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ پورا ایک مہینہ میدان کارزار گرم رہا۔

میڈم شام کو آ جاتی۔ کہتی' آیئے ڈرائیونگ "سپری" ہو جائے اور وہ دونوں موٹر میں بیٹھ کر چلے جاتے۔ پھر آدھی رات کو لوٹتے۔

میں نے شہاب سے پوچھا' آپ جو روز ڈرائیونگ پر جاتے ہیں تو وہاں کرتے کیا ہیں۔

بولا' کچھ بھی نہیں۔

تو پھر جانے کا فائدہ۔

میں ڈرائیونگ کرتا ہوں اور میڈم باتیں کرتی ہیں۔

کیسی باتیں۔

اپنی رام کہانیاں سناتی ہیں۔

میڈم کی کہانیاں رام کہانیاں تو نہیں ہو سکتیں' راون کہانیاں ہوں گی۔

ہاں راون کہانیاں ہی ہیں۔ بے چاری نے بڑے مصائب جھیلے ہیں۔

وہ تو خود جنسی راون ہے۔

وہ مانتی ہے۔ کہتی ہے' میں ایک مردار ہوں۔ میرے ارد گرد گدھ بیٹھے رہتے ہیں اور وہ اپنی چونچیں ہری کرتے رہتے ہیں۔

"بڑی اچھی تشبیہہ دی ہے۔"

بے چاری جسمانی طور پر مجبور ہے۔ کہتی ہے' میرا جی چاہتا ہے کہ میرے ارد گرد گدھ بیٹھے رہیں اور ٹھونگے مارتے رہیں۔ بے چاری جسم کے ہاتھوں مظلوم ہے۔

"آپ کو ترس آتا ہے۔"

ہاں۔ بد قسمت ہے۔

وہ توقع کرتی ہوتی ہو گی کہ آپ بھی ٹھونگا ماریں۔

شاید' وہ بولا۔

چاہتی کیا ہے' میں نے پوچھا۔

وہ چاہتی ہے کہ اس گندے نالے سے باہر نکل آئے۔

واہ' میں نے کہا' بیک وقت دو متضاد خواہشات۔

یہ بڑی تکلیف دہ کیفیت ہے' شہاب نے جواب دیا۔

پورا ایک مہینہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔

پھر چار ایک دن وہ نہ آئی تو میں نے پوچھا' وہ میڈم کیا ہوئی۔ آتی نہیں۔

قدرت نے سرسری انداز میں کہا' مدینہ شریف چلی گئی۔

کیا عمرہ کرنے۔

نہیں' وہ بولا' اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں ہمیشہ کے لیے مدینہ شریف میں آباد ہو جاؤں گی۔

دس پندرہ دنوں کے بعد قدرت نے مجھے ایک خط دکھایا۔

میں نے پوچھا' کہاں سے آیا ہے۔

بولا مدینے شریف سے۔

میڈم نے بھیجا ہے کیا۔

نہیں' وہ بولا۔

پھر کس نے بھیجا ہے۔

پتہ نہیں وہ بولا۔ گم نام خط ہے۔ دیکھ لیجئے۔

وہ دو سطری خط تھا۔ لکھا تھا' یہ آپ نے کیا کیا۔ ایک غلاظت بھری پوٹلی کو یہاں بھیج دیا۔

قدرت ان خواتین کو بیٹس یا چمگادڑیں کہا کرتا تھا۔ ہمیشہ ایک نا ایک چمگادڑ اس کے گرد پھیرے لیتی رہتی تھی۔ عفت یہ حالات دیکھ کر دل ہی دل میں کڑتی رہتی تھی۔

پھر ایک روز اس نے بھائی جان سے بات کی۔ بھائی جان بولے دیکھو بیٹی۔ ہم بھی تھوڑی بہتی نگاہ رکھتے ہیں۔ اگر آپ ان پر اعتماد نہیں کر سکتیں تو ہم پر اعتماد کرو۔ جو وہم آپ کے دل میں ہے' وہ غلط ہے' ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ شہاب صاحب جب باہر جاتے ہیں' یا ڈرائیونگ کرتے ہیں تو وہ اکیلے نہیں ہوتے۔ ان کے ساتھ ان کے محافظ ہوتے ہیں۔

ایک بچے کا سوال ہے

پھر ایک چمگادڑ آ گئی۔

وہ شہاب کے دفتر میں آئی۔ سکیورٹی نے فون کیا' جناب ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

کون ہے' قدرت نے پوچھا۔

اپنا نام مسز عزیز بتاتی ہے۔ عمر رسیدہ ہے۔ بیوہ ہے۔

کس کام کے لیے ملنا چاہتی ہے۔

کہتی ہے کہ شہاب صاحب مجھے نہیں جانتے۔ میں مدینہ منورہ سے ان کے لیے ایک پیغام لائی ہوں۔

قدرت نے کہا' انہیں بھیج دیجیے۔

کچھ دیر کے بعد وہ داخل ہوئی۔ شہاب نے اسے بڑے احترام سے ریسیو کیا۔ فرمایئے' وہ بولا۔

خاتون نے کہا' میں تخلیے میں بات کروں گی۔

قدرت نے اپنے پی اے کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

کہنے لگی' میں سرزمین حجاز سے آئی ہوں مجھے باری تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جاؤ شہاب سے

ملو اور اسے کہو کہ ایک بچہ دے دے۔

بچہ دے دے؟ میں سمجھا نہیں' قدرت نے کہا۔

آپ کا بچہ میرے بطن سے ہو' وہ بولی۔

قدرت یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ بولا' لیکن یہ تو گناہ کا بچہ ہو گا۔

کوئی بات نہیں یہ تو حکم ایزدی ہے' اس نے کہا۔

قدرت یہ سن کر چپ ہو گیا۔

میں بیوہ ہوں' وہ بولی۔ شادی کے بعد میرا خاوند صرف تین ماہ جیا۔ پھر فوت ہو گیا۔ میں نے دوسری شادی نہیں کی ساری زندگی عبادت میں گزار دی۔

دیر تک قدرت سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر سر اٹھا کر بولا' محترمہ میں آپ کے پیغام پر شک نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ آپ کو یہ حکم ملا ہو۔ لیکن مجھے ابھی تک کوئی ایسا حکم نہیں ملا۔

شاید آپ کو جلد براہ راست حکم مل جائے' خاتون نے کہا۔

جب تک آپ انتظار کریں۔ قدرت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جب محترمہ چلی گئی تو قدرت نے مجھے بلایا۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا خیر تو ہے۔

کہنے لگا ایک پر اسرار وزیٹر آیا تھا۔

کون تھا۔

عورت تھی۔ کہتی تھی' مجھے اللہ نے حکم دیا کہ آپ کا بچہ جنوں۔

کیا واقعی۔

ہاں' وہ بولا۔

اسے یہ کہتے ہوئے شرم دامن گیر نہ ہوئی' میں نے پوچھا۔

بالکل نہیں' وہ بولا۔

پاگل خانے سے چھوٹ کر تو نہیں آئی تھی۔

نہیں وہ بولا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ اس کی دعوت مخلصانہ تھی۔ اس کے چہرے پر شہوانی جھلک نہیں تھی۔ حرص نہیں تھی۔ ہوس نہ تھی۔

میں نے کہا' فرض کیجیے آج رات خواب میں آپ کو حکم دیا جاتا ہے تو۔

تو ————— وہ بولا ————— تو میں لا حول پڑھ دوں گا۔

کوئی عابدہ تھی کیا۔

قدرت نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ بولا' عبادت کے سوا کوئی اور شغل نہیں ہے۔

عبادت کرنے والوں کو بھی سلف ڈی لیوژن ہوتی ہے کیا؟ میں نے پوچھا۔

ہوتی ہی اسے ہے جو عابد ہو' وہ بولا۔

لیکن کیوں' میں نے پوچھا۔

اسلام حدیں توڑنے کے حق میں نہیں ہے۔ متوازن بانٹ ضروری ہے۔ دنیا اور دین میں توازن پیدا کرنا لازم ہے۔

قدرت کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ زبان تھتھلانے لگی تھی۔ چھلکن' چھلکن میرے دل سے ایک زیر لبی ابھری۔

میں نے کہا۔ شہاب صاحب ایک بات ہے۔

کہیئے' اس نے کہا۔

راستہ روکنا

آپ کی شخصیت آپ کے جسم اور خدو خال میں کوئی میل اپیل نظر نہیں آتی۔ آپ کی آنکھ چمک مارتی ہے۔ لیکن اس چمک میں جنسی دعوت نہیں ہوتی۔ پھر یہ خواتین آپ کی طرف کیوں کھنچی آتی ہیں۔ اس کشش کا راز کیا ہے؟

یہ کشش نہیں وہ بولا۔

تو پھر کیا ہے۔

وہ مسحور ہو کر نہیں آتیں۔

تو کس لیے آتی ہیں۔

میرا راستہ روکنے کے لیے آتی ہیں۔—۱

آپ انہیں انکریج کیوں کرتے ہیں۔

۱۔ ضمیمے میں خط نمبر vii اور viii ملاحظہ کریں۔

ہیوتو' وہ بولا۔

کیوں۔

یہاں وہ کچھ دیر سر لٹکائے' خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔

یہاں جنگل کا رول چلتا ہے' کل آربی' کلڈ

لڑویا مرو والی بات ہے' ہے نا' میں نے کہا۔ میرے گرد و پیش میں ہر وقت ایک نا ایک چمگادڑ ناک لگائے بیٹھی رہتی ہے۔

قدرت پر چھلکن کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ وہ چپ ہو گیا' پھر سر اٹھا کر بولا۔ کراچی میں بیگم مرزا نے مجھے زچ کر رکھا تھا۔ وہ فاؤل پلے تھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ میں نہتا تھا۔ میں اپنا ہتھیار برت نہیں سکتا تھا۔ میری پوزیشن ایسی تھی' احترام حایل تھا' تہذیب حایل تھی' میں بھگوڑا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

میں چپ چاپ بیٹھا رہا' مجھے معلوم تھا وہ کہہ دینے کے موڈ میں ہے۔ وہ مجھے نہیں سنا رہا تھا۔ صرف اپنا دل ہلکا کر رہا تھا۔ کہنے پر بندش بہت بڑی اذیت ہے۔

پھر وہ مسز بورل تھی' وہ بولا۔ وہ بڑی حسین عورت تھی۔ ایک دن' اچک کر وہ میری گود میں آ بیٹھی۔ خوف سے میرا دل بیٹھ گیا' میں نے اسے اٹھا کر فرش پر دے مارا اور بھاگا۔

پھر جب تک وہ صدر گھر میں رہی' ناک میں بیٹھی رہی اور میں خوف سے تھر تھر کانپتا رہا۔

آپ کو یاد ہو گا وہ بولا' جب پچھلی بار ہم مری گئے تھے۔

رنگین انگلیاں

ایک ڈیڑھ مہینے کی بات تھی۔ قدرت کو ایک کام پڑ گیا تھا۔ اسے مری جانا پڑ گیا۔ مجھ سے کہنے لگا' اگر آپ فارغ ہوں تو آپ بھی ساتھ چلیے' صرف دو گھنٹے کا کام ہے۔ پھر فراغت ہو گی' گپ رہے گی۔ میں آمادہ ہو گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قدرت میٹنگ میں چلا گیا۔ ساری شام ہم ویران سڑکوں پر گھومتے رہے۔

رات کے آٹھ بجے کھانے کے بعد قدرت نے کہا' چلیے ایک پان کھائیں۔

میں نے کہا' شہاب صاحب اب تو چلنا مشکل ہے۔

اچھا تو میں جاتا ہوں' آپ کے لیے بھی پان لے آؤں گا' قدرت چلا گیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ دس پندرہ منٹ میں واپس آ جائے گا' لیکن ایک گھنٹہ گزر گیا دو گھنٹے گزر گئے' وہ نہ آیا تو میں گھبرا گیا۔ پان کی دوکان کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ میں اسے ڈھونڈنے کے لیے پان کی دوکان پر پہنچا۔

اتفاق کی بات تھی کہ پان والا شہاب کو بھی جانتا تھا اور مجھے بھی۔ میں نے اس سے پوچھا کیا شہاب صاحب ادھر آئے تھے؟

ہاں آئے تھے' وہ بولا۔ انہوں نے دو پان خریدے۔ عین اس وقت ایک بیگم صاحبہ آ گئیں۔ شہاب صاحب نے ایک پان اس خاتون کے لیے بنوایا' پھر وہ دونوں نیچے کی طرف چلے گئے۔ میں مطمئن ہو کر واپس آ گیا اور پھر سے انتظار کرنے لگا۔ تقریباً رات کے ایک بجے وہ لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا۔

میں نے گھبرا کر پوچھا' کیوں کیا ہوا۔

اس وقت نہیں' وہ بولا۔ میری ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ مجھے نیند کی ایک گولی دے دیجیے۔

گولی کھا کر وہ لیٹ گیا۔

میں حیران تھا کہ ہڈیاں کیسے ٹوٹیں۔ اس خاتون نے توڑیں یا اس کے رشتے داروں نے۔

اگلے روز میں نے قدرت سے یہی سوال پوچھا' لیکن وہ ٹال گیا۔

پھر کئی ایک دن کے بعد بیٹھے بٹھائے اس نے خود بات چھیڑی۔

ہاں تو شہاب نے کہا' آپ کو وہ رات یاد ہو گی جو ہم نے مری میں گذاری تھی۔

ہاں' میں نے جواب دیا' جب اس محترمہ نے آپ کی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔

نہیں' محترمہ نہیں' وہ بولا۔

تو اس کے رشتے داروں نے توڑی ہوں گی۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

پھر ——— میں نے پوچھا۔

وہ ایک بوڑھا بابا تھا۔

بوڑھے بابا نے ہڈیاں توڑ دیں؟

ہاں۔ وہ بولا۔ پان لے کر میں واپس آ رہا تھا تو سڑک پر ایک بڈھا کھڑا تھا۔ اس کے سر پر ایک گٹھڑی تھی۔ اس نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگا' صاحبا مجھے نیچے جانا ہے' اس ڈنڈی پر۔ میں سڑک کے نیچے اترتا ہوں۔ تو مجھے گٹھڑی پکڑا دینا۔

میں نے سوچا بڈھا بہت ضعیف ہے کیوں نا گٹھڑی اس کے گھر تک پہنچا دوں۔ میں نے پوچھا' باباجی آپ کا گھر کہاں ہے ؟

وہ بولا' یہ پاس ہی ہے نیچے کھڈ میں۔

جب ہم دونوں جنگل میں پہنچے تو بابا نے کہا۔ گٹھڑی یہاں رکھ دے اور اس پتھر پر بیٹھ جا۔

میں بیٹھ گیا۔ پھر اس بڈھے نے مجھے اس قدر جھاڑ پلائی کہ میں خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی زبان کی تلوار چلائی۔ اس کی زبان زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ اس کی آواز لاٹھی کی طرح لگتی تھی۔ وہ اس قدر حقارت سے مجھ سے مخاطب ہوتا کہ میں سن ہو کر رہ جاتا۔ اس کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں' جیسے سانپ کی آنکھیں چمکتی ہیں۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر میری ساری قوت سلب کر لی۔ مجھ میں بولنے کی طاقت نہ رہی۔ ذہن شل ہو گیا اور میں دو گھنٹے وہاں لاش کی طرح پڑا رہا۔

لیکن وہ کہتا کیا تھا' میں نے پوچھا۔

کہتا تھا' تو سمجھتا ہے کہ تو نے اس عورت کو پان پیش کیا تھا۔ اس کی تواضع کی تھی۔ اخلاق کا مظاہرہ کیا تھا' نہیں ایسا سمجھتا ہے تو تو خود کو دھوکا دے رہا ہے۔ دراصل تو نے اسے پان اس لیے پکڑایا تھا کہ اس عورت کی رنگین اور طرح دار انگلیوں کے لمس کی لذت حاصل کر سکے۔

کیا کیا کیا میں نے اسے ٹوکا' انگلیوں کا لمس اور لذت۔

شاید وہ ٹھیک کہتا تھا' قدرت بولا' جب وہ خاتون آئی تھی تو میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ بڑی پرحس انگلیاں ہیں۔ اور مجھے ایسے لگا جیسے وہ گلابی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا تھا کہ اس نے نیل پالش نہیں لگایا ہوا تھا۔

لیکن اس بڈھے کو کیا حق حاصل تھا کہ آپ کو سرزنش کرے' میں نے پوچھا۔

اس کی سرزنش میں اپنائیت تھی۔ قدرت کی آواز مدھم پڑ گئی۔ بڈھے نے کہا' یہ چگادڑیں تیرا راستہ کھوٹا کرنے کے لیے آتی ہیں۔ ان سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے' اگنور دم' ڈیوائن

ڈسڈین، لیکن تو ان کی چیلنج کو قبول کر لیتا ہے چمگادڑوں میں بڑی طاقت ہے۔ تو اتنا مضبوط نہیں کہ مقابلہ کر سکے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ قدرت چپ ہو گیا۔

تصادم، عورت اور ضبط

میں نے کہا آپ ایک فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔

میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ مسلسل کش مکش میں رہتا ہوں۔ وہ بولا۔

مجھے ایک بات بتائیے۔ آپ فرار کا راستہ کیوں نہیں اپناتے۔ کیا اس لیے کہ آپ کو تصادم پسند ہے یا عورت۔

مجھے دونوں ہی پسند ہیں۔ تصادم سے میری انا کو تسکین ملتی ہے۔

اور عورت سے، میں نے پوچھا۔

عورت مجھے اچھی لگتی ہے۔ وہ پھر خاموش ہو گیا۔ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر دفعتاً" اس نے سر اٹھایا بولا، آپ بھائی جان سے بات کیجیے شاید وہ فیصلہ کرنے میں میری مدد کر سکیں۔

بھائی جان نے بڑے غور سے میری بات سنی۔ پھر دیر تک خاموش رہے۔ بولے، وہ جو بھی کرتے ہیں ٹھیک کرتے ہیں۔ ہماری کیا حیثیت ہے کہ ان کے معاملات میں دخل دیں۔

میں نے کہا مجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہ چمگادڑوں سے طاقت اخذ کرتے ہیں اور دوسری جانب ٹرانسفر کر دیتے ہیں۔ بلھے شاہؒ والی بات ہے۔ بلھیہ کی رب دا پاٹا ایدھروں پٹ کے اودھر لانا۔

بھائی جان مسکرا دیئے۔ بولے، بڑوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ ہمارے سرکار قبلہ بھی کسی زمانے میں یہ شغل کیا کرتے تھے۔ وہ پہلوان تھے۔ روز اکھاڑے میں کشتی لڑتے تھے۔ اس قدر طاقت ور تھے کہ سبھی ان سے خائف رہتے تھے۔ اپنی قوت ضبط کو آزمانے کے لیے وہ چکلے میں چلے جاتے اور کسی خوش شکل طوائف کے چوبارے پر چڑھ جاتے، اسے رات بھر کے لیے بک کر لیتے۔ پھر اسے کہتے کپڑے اتار دے، خود بھی برہنہ ہو جاتے اور پھر طوائف کی گود میں بیٹھ جاتے۔ بیٹھے رہتے، بیٹھے رہتے، جب تک خواہش کا جذبہ غالب رہتا، بیٹھے رہتے۔ پھر اٹھ بیٹھتے۔ طوائف سے کہتے، کپڑے پہن لے۔ خود کپڑے پہنتے اور

پھر طوائف کو رقم دے کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے لیے دعا کرتے اور واپس آ جاتے۔

اتنا ضبط‘ میں نے پوچھا۔

انہیں اپنے ضبط پر بڑا مان تھا‘بھائی جان نے کہا۔

شادی شدہ تھے کیا۔

جوانی میں شادی کی تھی۔ چند مہینے چلی۔ پھر کہنے لگے‘ اسے نبھانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اور انہوں نے بیوی کو طلاق دے دی۔

میں نے کہا نا‘ وہ بولے‘ بڑے آدمیوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ بس دیکھتے جاؤ‘ کریدو نہیں۔ کریدنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ کریدو گے تو اپنی ہی مت ماری جائے گی۔

مفتی صاحب ہمارا کام ان کی مدد کرنا ہے۔ جہاں تک ممکن ہے ان کی خدمت کریں گے۔ ان کا سرکار قبلہ سے رابطہ ہے اور ہم حکم کے غلام ہیں۔

آپ کا بھی یہی مسلک ہونا چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہے خدمت کرو۔ پوچھو نہیں۔ کریدو نہیں۔ حجت نہ کرو۔

لیکن بھائی جان‘ میں نے کہا‘ میں سمجھنا چاہتا ہوں۔ جاننا چاہتا ہوں۔

بھائی جان بولے مفتی جی۔ ان معاملات کو سمجھنے کے لیے ایک حس چاہیے‘ ایک خصوصی حس۔ عقل کے زور پر آپ نہیں سمجھ سکتے۔ ہماری عقل ناقص ہے‘ جو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے‘ اس کے گمراہ ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ کیا پتہ کسی روز اللہ کی مہربانی سے آپ میں وہ حس پیدا ہو جائے۔ پھر ساری باتیں واضح ہو جائیں گی۔

راجہ شفیع بولا‘ بھائی جان یہ مفتی جو ہے یہ جاننے کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔

جو چکر میں پھنس جاتا ہے وہ ڈوب جاتا ہے‘ بھائی جان نے کہا‘ تیر نہیں سکتا۔ لیکن ہم مفتی کو ڈوبنے نہیں دیں گے۔ اسے ابھی کام کرنا ہے۔ بہت سا کام کرنا ہے۔ ابھی تو ڈوڈی تیار ہو رہی ہے۔ جب پھول کھلے گا تو ساری بات سامنے آ جائے گی۔

مسز دین۔ دی کِلّر

پھر ایک‘ بس بھری چمگادڑ میدان میں آ گئی۔ اور ہم سب کے گرد چکر کاٹنے لگی۔ اس میں

تصادم کا حوصلہ تھا۔ بے پناہ جرأت تھی۔ اتنی جاذبیت تھی کہ آتے ہی ہم سب کو مسحور کر لیا۔ بہت بڑا میدان کار زار گرم ہوا۔ شدید تصادم عمل میں آیا۔ قدرت کا ضبط پاش پاش ہو گیا۔ اسے اپنے تحفظ کا فکر دامن گیر ہو گیا اور وہ ایک ہزیمت شدہ' زخمی سپاہی کی طرح میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔

مسزدین ایک ادھیڑ عمر کی بیوہ تھی' شگفتہ' ہنس مکھ حسینہ۔اس کا بند بند زندگی سے سرشار تھا۔ شخصیت ایسی کہ ہر راہ گزر متوجہ ہونے پر خود کو مجبور پاتا۔ اور پھر حواس گم' قیاس گم' دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا۔ جدھر سے گزرتی لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے۔ اس کا حسن صرف خد و خال نہ تھا۔ اس کی ہر حرکت حسین تھی۔ گریس ہی گریس۔ ڈگننٹی ہی ڈگننٹی۔وہ تو حسن کی شہزادی تھی۔

مسزدین کو اپنی طاقتوں کا شعور تھا۔ وہ شعوری طور پر اس بات کا اہتمام کرتی تھی کہ کوئی بچ کر نہ جائے۔ "الٹراما" فرصت کش مکش نہیں دیتی تھی۔ گیسوئے تابدار کے جال کو پھیلائے رکھتی تھی۔ وہ اپنی اپیل کی تلوار صرف خواص پر نہیں چلاتی تھی۔ ہر راہ گیر کو بے مقصد تفریحاً" زخمی کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ شی وازاے رِکّلر۔

پتہ نہیں وہ کہاں سے آئی تھی۔ کیوں آئی تھی۔ پتہ نہیں قدرت اسے کیوں جانتے تھے۔ کب سے جانتے تھے۔

ایک روز راجہ شفیع ہانپتا ہوا میرے گھر آیا اور دھڑام سے آرام کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی حادثہ ہوا ہو۔ اس کے اوسان خطا تھے۔

کیا ہوا راجہ' میں نے پوچھا۔

ذرا ٹھہر جا' وہ بولا' مجھے دم لینے دے۔

خیریت تو ہے' میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ دیر تک وہ پڑا رہا۔ پھر اٹھ بیٹھا۔

کیا ہوا۔ میں نے پھر پوچھا۔

کہنے لگا' مارے گئے' مفتی مارے گئے۔ توبہ ہے۔ ایک مصیبت اور کھڑی ہو گئی' مصیبت نہیں قیامت۔ پتہ نہیں ہمارا کیا ہو گا۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہمارا گھرانا مصیبتوں سے گھر گیا ہو۔ کچھ

ہونے والا ہے مفتی۔

تو بات تو کر۔

آج صاحب کا فون آیا تھا۔ راجہ شفیع' شہاب کو صاحب کہا کرتا تھا۔ صاحب نے کہا' راجہ صاحب آپ فارغ ہیں کیا۔ میں نے کہا' جی کیا حکم ہے۔ کہنے لگے' ابھی دس پندرہ منٹ میں آپ کے دفتر کے گیٹ پر ایک کالی موٹر رکے گی۔ آپ مہربانی کرکے دفتر کے گیٹ پر چلے جائیں اور ان کا انتظار کریں۔ میں نے کہا' جی بہتر۔ پھر اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہو گا' میں نے پوچھا' صاحب کہنے لگے' ان کے میاں فوت ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ سرکاری بنگلہ خالی کر رہی ہیں۔ انہیں فوری طور پر ایک بنگلہ کرائے پر لینا ہے۔ آپ ان کی مدد کریں۔

بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ خیر میں گیٹ پر جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر کے بعد کالی موٹر آ گئی۔ اس میں سے ایک خاتون باہر نکلی۔ میک اپ کے بغیر سادہ سے کپڑوں میں' وہ اتنی بنی ٹھنی لگتی تھی کہ میں اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ مجھے بڑی بے تکلفی سے ملی یوں جیسے سال ہا سال سے ہم ایک دوسرے سے واقف ہوں' کہنے لگی' آپ راجہ شفیع ہیں نا۔ میں نے کہا' جی میں راجہ شفیع ہوں۔ صاحب نے مجھے فون کیا تھا۔

مجھے پتہ ہے' وہ بولی۔

آیئے اندر دفتر میں۔ ایک پیالہ چائے' میں نے خاتون سے کہا۔

نہیں راجہ' وہ بولی' ہماری پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں دو گھنٹے کے اندر اندر ایک بنگلہ ہائر کرنا ہے۔ اٹ از اے مسٹ راجہ۔ اینڈ یو ہیو ٹو ڈو اٹ۔

پھر جو میں نے دیکھا۔ تو دیکھتا ہوں کہ سڑک پر لوگ چلتے چلتے رک گئے ہیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ دفتر کی جانب دیکھا تو شاف کھڑکیوں سے جھانک رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ یہ پوچھیں گے کہ کون تھی' تو میں کیا جواب دوں گا۔

پھر اس نے بے تکلفی سے میری بانہہ پکڑ لی۔ بولی' چلو جلدی چلیں۔ تاخیر کی تو یہاں بھیڑ لگ جائے گی۔ اتنی بے تکلفی۔ میں تو سخت گھبرا گیا۔

مفتی دو گھنٹے ہم شہر میں کھجل ہوتے رہے۔ جہاں بھی جاتے لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھتے۔

تجھے پتہ ہے مفتی' میں تو سارے شہر میں جانا پہچانا ہوں۔ لوگ میری جانب دیکھ کر آنکھیں مارتے تھی۔ ایک نے تو کہہ دیا۔ راجہ' آج تو تو سچ مچ کا راجہ بنا ہوا ہے اور مفتی وہ ایک ایک بات نوٹ کرتی تھی۔ سنتی تھی مسکراتی تھی۔ میں سب جانتی ہوں کی سی مسکراہٹ۔

پھر تو نے اسے بنگلہ کرائے پر لے دیا' میں نے پوچھا۔

اے کلاس بنگلہ لے کر دیا ہے۔ بڑی خوش تھی۔

پھر وہ مجھے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ جاتے ہوئے کہہ رہی تھی' راجہ پھر کب ملو گے۔ خالی مکان ڈھونڈنے کی بات نہیں' اسے فرنش بھی کرانا ہو گا۔

یہ تو کوئی ایسی بات نہیں' میں نے کہا' تو تو کہتا تھا مارے گئے۔

میری تو جواب طلبی ہو جائے گی' وہ بولا۔ سارا دفتر پوچھے گا۔ راجہ وہ کون تھی۔ سارا شہر کہے گا' راجہ آجکل اونچی ہوا میں اڑتا ہے۔ دفعتاً" وہ چونکا۔ اور پھر ایک اور بات ہے' وہ بولا۔

وہ کیا' میں نے پوچھا۔

لگتا ہے صاحب سے خاتون کے پرانے تعلقات ہیں۔ میں نے دوبار صاحب کی بات کی تو بولی ہاں میں جانتی ہوں اسے۔ وہ تو بند دروازہ ہے' نہ خود باہر آتا ہے' نہ کسی کو اندر جانے دیتا ہے۔

اچھا یہاں تک۔ بڑی بے تکلفی ہے' میں نے کہا۔

دیکھ لو' وہ بولا' مجھے تو ایسے لگتا ہے' جیسے ان کا افیر چل رہا ہو۔

نہیں راجہ' میں نے کہا' تجھے نہیں پتہ۔ قدرت کے سر پر تو دو گرزوں والے کھڑے رہتے ہیں ہر وقت۔ کسی کو انگلی لگانے کی اجازت نہیں دیتے۔

یار مفتی' ہم تو اچھی خاصی بھول ۔ بھلیوں میں پھنس گئے ہیں' وہ بولا۔

چند ایک دنوں کے بعد مجھے خود دین کے ہاں جانا پڑا۔ قدرت نے کہا' میں ذرا مصروف ہوں۔ اگر اپ ان کے ہاں جا کر یہ پیکٹ دے آئیں تو۔

میں دے آتا ہوں' میں نے جواب دیا۔ آپ مجھے اتا پتہ دیں۔ قدرت نے ایک پیکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا پھر ایک کاغذ پر مکان کی لوکیشن کا نقشہ بنا دیا۔

جب میں روانہ ہونے لگا تو قدرت نے کہا' ذرا احتیاط سے لے جانا۔ پیکٹ میں قرآن کریم

کا نسخہ ہے۔

کاوورڈ

میری عادت ہے کہ زیادہ حسین یا بنی ٹھنی یا مہذب عورت کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہوں۔ خاتون سے ملنے سے میں خوف زدہ تھا۔ ڈرتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دوں جو اسے ناگوار ہو اور وہ میری باتیں قدرت کو نہ بتادے۔

مجھے دیکھ کر وہ بولی' آیئے آیئے بڑی دیر لگائی آپ نے آنے میں' بیٹھیے۔ گھبراتے کیوں ہیں آپ۔ میں آپ کو جانتی ہوں۔

کب سے جانتی ہیں آپ مجھے۔

جب سے آپ نے شہاب سے ملنا جلنا شروع کیا ہے۔ میں نے تو آپ کو دیکھا تھا کراچی میں۔

میں تو آپ سے ضرور ملتی۔ لیکن اس نے مجھے منع کر دیا تھا۔

آپ انہیں کب سے جانتی ہیں۔

۱۹۵۶ء سے۔ ابھی آپ کراچی نہیں آئے تھے' تب سے۔

پھر تو آپ زیادہ جانتی ہیں' میں نے کہا۔

کچھ فرق نہیں پڑتا' وہ بولی چاہے آپ اسے ایک سال سے جانتے ہیں یا دس سال سے وہ تو دروازہ بند کر کے بیٹھا ہوا ہے کہ کوئی جان نہ لے۔

مجھے آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ کون ہے' میں نے کہا۔

اونہوں' اتنا بھی نہیں' وہ بولی' سیدھی سیدھی چیز ہے۔

مجھے تو ٹیڑھی لگتی ہے۔ میں نے کہا۔

آپ خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں' اس لیے۔ ورنہ وہ ایک سادہ شخصیت ہے' سادہ اور معصوم۔ ایک بچہ ہے۔ اس میں جھجھک ہے' گھبراہٹ ہے' خوف دامن گیر رہتا ہے' وہ فیصلہ نہیں کر پاتا۔ کشمکش میں پڑا رہتا ہے۔ بزدل ہے' جرات کا فقدان ہے۔ کاوورڈ ہے۔

ان میں بلا کا عجز ہے۔ ہمدردی ہے۔ خدمت ہے' نیکی ہے' ان میں بہت مثبت خصوصیات

ہیں۔ میں نے کہا۔

مفتی صاحب وہ بولی۔ جب تک سٹرینگتھ نہ ہو۔ جرأت نہ ہو نیکی کا جذبہ بے کار ہے۔ آپ لوگوں نے اسے خواہ مخواہ دیوتا بنا رکھا ہے۔

دین کا قدرت کے متعلق رویہ بڑا بے باک تھا۔ وہ قدرت کو مرد کی حیثیت سے دیکھتی تھی۔ میں اسے انسان کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد راجہ آگیا۔ وہ غصے میں تھا۔ کہنے لگا' مفتی ہم سب غلطی کر رہے ہیں' ہم ڈاکٹر عفت سے زیادتی کر رہے ہیں۔ ہم دین کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔

راجہ قدرت کے گھر جایا کرتا تھا۔ اس کا عفت سے گہرا رابطہ تھا۔ عفت کے چھوٹے چھوٹے کام کرتا۔ گھر کے متعلق انتظامات کرتا۔ راجہ طبعاً" ڈومیسٹک تھا اور گھر کے متعلق انتظامات کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ قدرت سے ملنے سے ہچکچاتا تھا' لیکن عفت کو بڑے شوق سے ملتا تھا۔ اس کی تمام تر ہمدردیاں عفت کے ساتھ تھیں وہ دین کے بے باک ارادوں کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ گمان غالب ہے کہ اس نے عفت کے دل میں شک کا بیج بو دیا تھا۔

ایک دن راجہ مجھ سے ملا۔ کہنے لگا' مفتی یہ بیوہ خاتون تو بہت بڑی تماش بین ہے۔ مجھے مالک مکان ملا تھا۔ کہنے لگا' راجہ صاحب آپ نے میرا بنگلہ کیسے لوگوں کو دے دیا ہے۔ میرا مکان تو بدنام ہوتا جا رہا ہے۔ وہاں نوجوان افسران کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ ایک آتا ہے' ایک جاتا ہے۔ آدھی رات تک ٹریفک جاری رہتی ہے۔

پھر ایک اور صاحب آ گئے' راجہ نے کہا جو اسی علاقے میں رہائش رکھتے ہیں' جہاں دین رہتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ میں نے کہا' یہ نئی کرایہ دار خاتون جو آپ کے علاقے میں آئی ہے اس کی رہت بہت کیسی ہے۔

کیا بات ہے' اس خاتون کی' وہ بولا' سبحان اللہ۔ اتنی مخیر ہے کہ بنگلے میں یتیموں اور بیواؤں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ پھر بنگلے میں روز قرآن خوانی ہوتی ہے باقاعدہ قاری صاحب آتے ہیں۔ درس ہوتا ہے۔ اڑوس پڑوس کے بچے باقاعدہ درس لیتے ہیں۔ مہینے میں ایک مرتبہ مولود شریف ہوتا ہے۔ راجہ شفیع کہنے لگا' مفتی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ تجھے آتی ہے کیا؟

میں نے جواب دیا، کچھ کچھ آتی ہے۔ ساری نہیں۔
کیا سمجھ میں آتی ہے تجھے۔

میدان جنگ گرم ہے۔ دو طاقتیں متصادم ہیں۔ ایک طرف قرآن ہے، دوسری طرف خواہش ہے۔ ایک جانب خیر ہے، دوسری جانب شر ہے۔

یہ خاتون دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے راجہ۔ اندھیرے اجالے پنجہ آزما ہیں۔ بے چاری دین۔

راجہ غصے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا کہنے لگا، تمہاری یہ فلسفہ بازی نہیں چلے گی۔ تم شہاب صاحب کی ناجائز طرف داری کر رہے ہو۔ تم عفت پر ظلم کر رہے ہو۔ بس میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ معاملہ بھائی جان کو پیش کر دوں گا۔

ان دنوں بھائی جان مستقل طور پر پنڈی میں رہائش پذیر ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے رکھا تھا اور وہ اسلام آباد کا ایک بنگلہ تعمیر کروا رہے تھے۔

حکم کے پابند

اگلے روز ہم دونوں بھائی جان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بھائی جان پر اثر ڈالنے کے لیے راجہ نے بڑی جذباتی تقریر کی۔ کہنے لگا، بھائی جان میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم سب عفت باجی سے دھوکا کر رہے ہیں۔ ہمیں مسز دین کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ تو اعلانیہ دعویٰ کرتی ہے کہ شہاب صاحب اس کی مٹھی میں ہیں۔

بھائی جان پہلے تو چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے پھر مدھم آواز میں بولے، راجہ جی، دین ہماری ہمشیرہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دین ہمارا بھائی ہے۔ وہ خاتون نہیں مرد ہے، اس میں جرأت ہے، حوصلہ ہے۔ شہاب صاحب ہچکچا رہے ہیں۔ ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ اب وہ اپنا وعدہ کیوں نہیں نبھاتے۔ اب تو راستے کی رکاوٹ دور ہو چکی ہے۔ انہوں نے خوا مخواہ دین کو مخمصے میں ڈال رکھا ہے۔ بے چاری عذاب میں مبتلا ہے۔

بھائی جان کی بات سن کر ہمیں پسینہ آ گیا۔ راجہ ٹھنڈا ہو کر بیٹھ گیا۔

میں حیران تھا، یہ بھائی جان کو کیا ہوا۔ ہم نے تو دین کی بات کو ان سے چھپا کر رکھا ہوا تھا،

لیکن یہ تو دین کو بھائی بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں' یہ کیا بھید ہے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر گویا ہوئے کہنے لگے' وہ خاتون دو دفعہ ہم سے مل چکی ہے۔ ہمارے گھر آئی تھی۔ پھر اس نے ہم سے کہا بھائی جان مجھے دربار میں لے چلئے۔ میں بابا کی حاضری دینا چاہتی ہوں۔ ہم نے سرکار قبلہ کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے کہا' انہیں لے آؤ۔ وہ یہاں از خود نہیں آئی۔ ہم نے اسے بلایا ہے۔

ہم تو راجہ جی حکم کے پابند ہیں' بھائی جان بولے' ہم تو سرکار قبلہ کے ایک ادنیٰ کامی ہیں۔ اس لیے ہم دین کو دربار میں لے گئے۔ وہ وہاں بیٹھ کر روتی رہی۔ سرکار قبلہ نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ بس بات ختم ہو گئی۔

راجہ صاحب اس خاتون پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ اس نے بہت دکھ سہا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ مزید دُکھ سہے۔وہ مدینہ منورہ سے ہو آئی ہے۔ مسجد نبویؐ میں واویلا کر کے آئی ہے۔ کہتی ہے' جتنے دن بھی میں وہاں رہی۔ رات کو دیکھتی رہی' کہ میں مسجد نبویؐ کے ایک کالم سے لگ کر کھڑی ہوں۔ دوسرے کالم کا سہارا لیے عفت کھڑی ہے۔ اور درمیان میں شہاب صاحب بیٹھے ہیں۔

اس نے بڑی عبادت کی ہے۔ اس کی صرف ایک مانگ ہے۔ اس کی مانگ پوری ہونی چاہیئے۔ اس نے ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا ہے' راجہ جی۔

لیکن بھائی جان' راجہ نے ہمت کر کے کہا' دین کی شہرت اچھی نہیں۔ اس کے گھر پر نوجوان افسر آتے جاتے ہیں' تانتا لگا رہا ہے۔

بھائی جان بولے' راجہ صاحب' ہمیں اس بات سے کیا لینا دینا۔ وہ جانتے ہیں' سب جانتے ہیں۔ ہم نے تو سرکار قبلہ کے احکامات کی پیروی کرنا ہے۔

راجہ جوش میں آ گیا' کہنے لگا' بھائی جان اس میں صاحب کی بدنامی ہے' ہم سب کی بدنامی ہے۔

بھائی جان نے زچ ہو کر زیر لب کہا' دین ضد کیے بیٹھی ہے۔ کہتی ہے' ہاں یہ سچ ہے' لیکن میں مجبور ہوں۔ میں اس تندور میں روٹی کی طرح لگی ہوئی ہوں۔ یہ بات میرے بس کی نہیں ہے' صرف آپ مجھے اس دلدل سے نکال سکتے ہیں۔ وہ اپنا وعدہ ایفا کیوں نہیں کرتے۔ جو وہ مجھے

سہارا دیں تو میں اس لت پت سے نجات حاصل کر سکتی ہوں۔

آپ نے شہاب صاحب سے اس بات کا ذکر کیا ہے کبھی' میں نے بھائی جان سے پوچھا۔

وہ سب جانتے ہیں' بھائی جان نے جواب دیا۔ انہیں ہر بات کا پتہ ہے' لیکن وہ ہچکچا رہے ہیں۔ انہیں جرأت سے کام لینا چاہیئے۔ سچی بات یہ ہے مفتی صاحب کہ ہمیں ان کی سمجھ نہیں آئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں' جیسے کہ وہ کر رہے ہیں۔ بہر حال ہمیں ان کا ساتھ دینا ہے اور دیکھیے راجہ جی آپ کو عفت بیٹی کے دل میں شکوک پیدا نہیں کرنے چاہئیں۔ اب جو پیدا ہو گئے ہیں تو آپ ہی انہیں دور کریں۔ آپ انہیں سمجھائیں۔ یہ آپ کا کام ہے اور اسے آپ ہی کو سرانجام دینا ہو گا۔

بولتا گونگا

بھائی جان کی باتیں سن کر میں دو دن سوچتا رہا۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں دین سے کھل کر بات کروں گا۔

شام کو جب میں دین کے گھر پہنچا تو وہ مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔ جب تک وہ نماز پڑھتی رہی' میں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

میرے سامنے مسز دین نہیں تھی بلکہ کوئی اور خاتون تھی' دنیاوی لاگ لگاؤ سے پاک' کوئی جتی ستی' جس نے خود کو حوالے کر رکھا ہو۔

اس نے سلام پھیرا' دعا مانگی اور پھر میرے پاس آ بیٹھی' کہنے لگی' نہیں ایسے نہیں کیا کرتے۔

کیا مطلب' میں نے پوچھا۔

خاتون جب نماز پڑھ رہی ہو اسے ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھتے۔

آپ تو نماز پڑھ رہی تھیں۔ کسی اور لگن میں تھیں کیا آپ نے کیسے نوٹ کیا کہ میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہوں۔

کوئی خاتون مرد کی ٹکٹکی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی یکسوئی ٹوٹ جاتی ہے۔ خاتون کی عورت باہر نکل آتی ہے۔

مجھے معلوم نہ تھا۔ آئی ام ساری' میں نے کہا۔

آپ نے میری نماز کھوٹی کر دی۔

میں نے موضوع بدلا' میں آج ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔

کوئی پیغام لائے ہیں کیا' اس نے پوچھا۔

نہیں' میں نے کہا' بھیجا نہیں گیا خود آیا ہوں۔

فرمایئے۔

ایک سوال پوچھنے آیا ہوں۔

پوچھیے' وہ بولی۔

پوچھنے آیا ہوں کہ آپ کون ہیں۔

دو ایک ساعت کے لیے وہ خاموش رہی' پھر بولی۔

آپ نے یہ سوال اس سے پوچھا ہے کبھی۔

نہیں۔

کیوں نہیں پوچھا۔

پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بات ٹال دیتے ہیں۔

صرف بات ہی نہیں وہ لوگوں کو بھی ٹال دیتا ہے۔

کیا آپ کو بھی ٹال رہے ہیں۔

مجھے سب سے زیادہ۔

کیوں ٹالتے ہیں۔

خوف دامن گیر ہے۔

کس کا خوف' میں نے پوچھا کیا لوگوں کا خوف۔

نہیں' اس نے سر نفی میں ہلایا' میرا خوف۔ وہ میرے ہاتھوں سے خوف زدہ ہے۔ میری بانہوں سے خوف زدہ ہے۔ اپنی بانہیں مت چلاؤ۔ چپ چاپ بیٹھی رہو۔ ورنہ میں تیرے بازو پیچھے کر کے باندھ دوں گا۔ وہ میرے لمس سے ڈرتا ہے۔ ایک بار میں نے زیادتی کی تھی۔ خوف سے اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ اس روز میں نے جانا' مجھے اس پر ترس آگیا۔

اس کی حالت غیر تھی۔ اس قدر غیر تھی کہ میں خوف زدہ ہو گئی۔

یہ کب کی بات ہے' میں نے پوچھا۔

ابتدائی ایام کی' وہ بولی۔ میں اس کی جانب متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے دو ایک بار دیکھا تھا لیکن اس میں توجہ طلب کرنے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ نہ شخصیت' نہ نگاہ۔ کوئی میل اپیل نہ تھی۔

پہلے وہ میری طرف متوجہ ہوا تھا۔ بڑی شدت سے متوجہ ہوا تھا۔ میں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ کوئی بات ہوتی تو اہمیت دیتی نا۔

اک صرف عہدہ ہی عہدہ تھا نا۔ مجھے کوئی غرض نہ تھی۔ میرے پاس سب کچھ تھا۔ جدھر دیکھتی' سرنگوں ہو جاتے۔ لوگ میرے اشارے کے منتظر تھے۔ جو چاہتی ہو جاتا۔

وہ تو اب بھی ہے' میں نے کہا۔

نہیں' اس نے ہلکی سی آہ بھری۔ پتہ نہیں اس نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ میں ایک تھی اس نے مجھے دو کر دیا ہے۔

وہ میرے ہاں آتا تھا۔ اور اور —————— وہ اٹھ بیٹھی۔ اور دیوان پر جا کر بیٹھ گئی۔

اور کیا' میں نے پوچھا۔

ذرا آیئے اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا' ادھر آیئے۔ میرے پاس۔ میں پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ بولی' اب بیٹھ جایئے۔ اونہوں' یہاں نہیں میرے قدموں میں بیٹھ جایئے۔ میں ہچکچایا۔ مسکرائی' بولی' ڈریئے نہیں' بیٹھ جایئے۔

وہ جب بھی آتا تھا۔ یوں میرے قدموں میں بیٹھ جاتا تھا' جیسے آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور پھر وہ بولتا۔ بولے جاتا' بولے جاتا۔

وہ تو گونگا ہے' میں نے کہا۔

ہاں گونگا ہے۔ گونگے کو زبان لگ جاتی تھی۔ اور وہ بولے جاتا۔ بول بول کر اس کی زبان میں لکنت آ جاتی۔ آنکھیں چڑھ جاتیں۔ ایک عجیب مستی کیف۔ پہلے میں سمجھتی رہی کہ وہ پی کر آتا ہے۔ وحشت ہو کر بات کرتا ہے۔ ایک دن میں نے اسے کہا' میری پاس ایک بڑی عمدہ چیز ہے۔ آپ شوق کریں گے کیا۔ یہ کہہ کر میں نے الماری سے بوتل نکالی اور اس کے سامنے رکھ

دی۔

نہیں' وہ بولا' مجھے اس کی ضرورت نہیں میں اس سے بے نیاز ہوں۔ مجھے تمہارا نشہ ہی کافی ہے۔

مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی۔ یہ کیسا آدمی ہے۔ جو مستی کے عالم میں بھی' نہ مجھے ہاتھ لگاتا ہے' نہ مجھے ہاتھ لگانے کی اجازت دیتا ہے۔

اور پتہ ہے وہ کیا کہا کرتا تھا کہتا میں' تجھے اپنے پروں پر بٹھا کر آسمانوں کی سیر کراؤں گا۔ نہیں میں بڑا بول نہیں بول رہا۔ مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ اپنے بازوؤں پر بٹھا کر تجھے اوپر لے جاؤں۔

تجھے پتہ نہیں' میں نے تیرے لیے کیا کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ کی بڑی منتیں کی ہیں۔ بڑی آہ و زاری کی ہے۔ باری تعالیٰ سے میں نے صرف ایک چیز مانگی ہے اور وہ تو ہے۔

اب تو میری ہے۔ کوئی تجھے ہاتھ نہیں لگا سکے گا' اگر کسی نے ہاتھ لگایا تو وہ مفلوج ہو جائے گا۔

یہ سن کر میں تڑپ کر دین کے قدموں سے اٹھا۔

وہ ہنسی' ڈر گئے۔

ہاں' ڈر گیا' میں بڑا ڈرپوک ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتی۔

ایک اور دو

جانتی ہوں' وہ بولی' جانتی ہوں۔ میں نے علی پور کا ایلی پڑھی ہے۔ اس نے مجھے بھیجی تھی۔

وہ تو خرافات کا پلندہ ہے' میں نے کہا۔

بے شک ہے' مگر وہ سچ ہے۔ اس کی ایک ایک سطر بولتی ہے۔ کہتی ہے' میں سچ ہوں۔ اس میں ایلی ایک ہے دو نہیں۔ ایک ہونا بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ چاہے خیر ہو یا شر' مگر ایک ہو۔

اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ مفتی صاحب اس نے مجھے دو کر دیا' وہ بولی۔

وہ کیسے' میں نے پوچھا۔

بڑی الجھی ہوئی کہانی ہے۔

یہی تو میں سننے آیا ہوں۔

۱۹۵۶ء میں اس نے میری طرف توجہ دی۔ میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ توجہ تو میرا مقدر ہے۔ جو بھی آتا ہے مجھ پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ توجہ کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔ راہ چلتے لوگ دیکھتے ہیں' پہلے حیرت سے دیکھتے ہیں' پھر مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں' پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ نگاہوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ میں تو توجہ سے اکتائی پھرتی ہوں۔

۱۹۵۶ء میں یہ پہلی مرتبہ مجھے ملا۔ میں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ پھر بھی اس کا انداز دوسروں سے مختلف تھا۔ اس کی نگاہ میں حرص نہیں تھی' صرف اپرسی ایشن تھی۔

پھر ایک دن اس نے مجھ سے ایک فرمائش کی۔ عجیب فرمائش تھی۔ وہ منت سے کہنے لگا' آؤ اکٹھے نماز پڑھیں' میں اس بات پر بڑی حیران ہوئی۔ بہر صورت میں نے اس کی بات مان لی۔ نماز کی نیت باندھ کر میں کھڑی تو ہو گئی' لیکن میری توجہ اس کی جانب رہی کہ یہ کیا کرتا ہے۔

اگلے روز اس نے مجھے کیسٹ بھجوا دیے۔ ان پر قرآن کریم ریکارڈ کیا ہوا تھا۔ میں نے ایک کیسٹ سنا۔ قاری کی آواز بڑی میٹھی اور رسیلی تھی۔

اگلی مرتبہ جب یہ آیا تو اس نے کہا' آؤ ہم اکٹھے قرآن سنیں۔ پھر وہ یہیں میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اور ہم قرآن کریم سنتے رہے۔ میں سمجھی سر پھرا آدمی ہے' الٹی سلٹی فرمائش کرتا رہتا ہے۔ بہر صورت کراوڈ سے مختلف ہے۔ کراوڈ کے مطالبات سے میں اکتائی ہوئی تھی' اس لیے میں اس میں نیم سی دل چسپی لینے لگی۔

(۲) دو جاء نماز

آہستہ آہستہ مجھے قرآن پاک سننے کی عادت پڑ گئی۔ جب کبھی یہ مجھ سے ملنے آتا تو میرا جی چاہتا کہ یہ مجھ سے کہے' آؤ اکٹھے نماز پڑھیں۔ یوں آہستہ آہستہ میں نماز پڑھنے لگی۔ جب بھی میں نماز پڑھتی تو دو جاء نماز بچھاتی' پہلو بہ پہلو۔ میں اس بات پر ہنسا کرتی تھی کہ میں دو جا نماز کیوں بچھاتی ہوں۔ پھر یہ ہوا کہ نماز پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا کہ ساتھ والے جاء نماز پر یہ کھڑا ہے۔

یہ خبط بڑھتا گیا۔ پھر ۱۹۵۹ء میں ایک طوفان بن کر چھا گیا۔ جیسے سویا ہوا جن جاگ اٹھا ہو۔ میں جو دوسروں کی توجہ کا مرکز تھی' جس نے کبھی کسی کو توجہ نہ دی تھی' اس شخص پر توجہ مرکوز

کر کے بیٹھ گئی۔ اب میں اس کا انتظار کرنے لگی۔ میری زندگی کی سب دلچسپیاں ختم ہو گئیں۔ سارا دن قرآن کریم سنتی' نمازیں پڑھتی اور اس کا انتظار کرتی۔

مفتی صاحب' وہ بولی میں انتظار کرنے والوں میں سے نہیں ہوں' میں آہیں بھرنے والی نہیں ہوں۔ میں ایک بے چین روح ہوں۔ میں سہنے والی نہیں ہوں' کرنے والی ہوں۔ میں جو چاہتی ہوں کر گزرتی ہوں۔ راستے کی مشکلات سے خوف زدہ نہیں ہوتی۔ اس بات کی پرواہ نہیں کرتی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ جو چاہے کہیں' پڑے کہیں۔ جب میں اس کی متلاشی بنی تو مجھے پتہ چلا کہ یہ تو جھجک کا مارا ہوا ہے۔ پتہ نہیں اس کے دل میں کس کس کا خوف ہے۔ اس میں جرأت نہیں۔ ہی از اے کاورڈ۔

آپ تو کہہ رہی تھیں کہ اس نے مجھے دو کر دیا ہے' میں نے کہا۔

ہاں' وہ بولی' اس نے میری توجہ قرآن کریم کی طرف موڑ دی' لیکن میں پورے طور پر جذب نہ ہو سکی۔ میری میں ویسی کی ویسی ہی رہی۔ اب میں کشمکش میں پڑی ہوں۔ میرے چاروں طرف قرآن کریم کی روشنی ہے اور بیچ میں ذات کا شعلہ ہے۔ یا میں اسے بھسم کر دوں گی یا خود بھسم ہو جاؤں گی۔ میرے راستے میں جو بھی آئے گا' بھسم ہو جائے گا۔

میں نے بھائی جان کو سب کچھ بتا دیا ہے' وہ بولی۔

وہ کیا کہتے ہیں' میں نے پوچھا۔

انہوں نے مجھے دو خط لکھے ہیں' مائی ڈیر دین سے شروع' یور فین تک' وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

لکھتے کیا ہیں' میں نے پوچھا۔

انہوں نے مجھے مان لیا ہے۔ کہتے ہیں' ہاں تم نے ان کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔ میں عفت سے بھی مل چکی ہوں۔

عفت سے مل چکی ہیں آپ' میں نے حیرت سے پوچھا۔

بالکل' وہ بولی' میں کوئی چور نہیں ہوں۔ کسی کے گھر میں نقب نہیں لگا رہی۔ کسی کا حق نہیں چھین رہی۔ صرف اپنا حق مانگ رہی ہوں' میں چاہتی ہوں کہ ایک بار کھل کر اس سے بات کروں۔ لیکن وہ مجھے موقعہ نہیں دے رہا۔ موقعہ ملے تو اسے ٹال دیتا ہے۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں مفتی صاحب۔

میں ——————؟ میں نے حیرت سے دہرایا۔

میں آپ کے گھر آجاؤں اور آپ اسے فون کر کے بلالیں' وہ بولی۔

اور ان کو نہ بتاؤں کہ آپ ان کو ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے کہا۔

کیوں نہ بتائیں' وہ بولی' کوئی چوری نہیں' کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں' صاف کہیں کہ میں اس سے ایک آخری فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔

اور اگر وہ نہ آئے تو۔

بے شک نہ آئے۔ نہیں آئے گا تو از خود فیصلہ ہو جائے گا۔

بھگوڑا

میں نے وین سے طے کر لیا۔

اگلے روز میں نے شہاب کو فون کیا۔ میں نے کہا' آپ میرے گھر آجائیں۔ ان دنوں میں ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ میرا مکان بلاک کے ایک سرے پر تھا۔ وہ ایک چھوٹا مکان تھا۔ ایک جانب ڈرائینگ روم تھا' دوسری جانب رہائشی کمرے تھے۔ تخلیے کے لیے ڈرائینگ روم بڑا موزوں تھا۔ باتوں کی آواز رہائشی حصے تک نہیں پہنچتی تھی۔

شہاب نے پوچھا' خیریت تو ہے۔

میں نے کہا' بالکل خیریت نہیں ہے۔

وہ گھبرا گیا' کیا ہوا۔

میں نے کہا' ہوا نہیں۔ ہونے والا ہے۔

پوچھا' کیا ہونے والا ہے۔

میں نے کہا' میرے ڈرائینگ روم میں آپ کی وین سے تخلیے میں ملاقات ہونے والی ہے۔

وہ از سر نو گھبرا گیا' کہنے لگا' آپ اسے ٹال نہیں سکتے۔

میں نے کہا' شہاب صاحب ٹالیے نہیں۔ کب تک ٹالیں گے۔ آپ ٹالنے سے بات ختم نہیں ہو جاتی' تذبذب بڑھتا ہے۔ میں نے کہا' شہاب صاحب جو ہونا ہے لازماً ہو گا۔ آپ

ہونے دیجیے۔

وہ مان گیا۔

مقررہ وقت پر دین آ گئی' میں نے اسے ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد شہاب آ گیا۔ اسے بٹھا کر میں اندر چلا گیا۔

میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو گا۔ پندرہ منٹ کے بعد ڈرائینگ روم میں دھماکا سا ہوا۔ میں بھاگ کر باہر نکلا۔

دین بڑے وقار سے ڈرائینگ روم کے بیرونی دروازے میں کھڑی تھی۔

کیا ہوا' میں نے پوچھا۔

بھگوڑا' بھاگ گیا' وہ بولی۔

میں دوڑ کر سڑک پر پہنچا دیکھا کہ دور شہاب دوڑے جا رہا تھا' دوڑے جا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں نے شہاب کے گھر فون کیا۔

جواب ملا کہ وہ تو دورے پر کراچی چلے گئے۔

اگلے دن دین مجھے اپنے گھر لے گئی۔ سارا دن وہ دیوانہ وار کراچی فون کرتی رہی۔ وہ کرب میں مبتلا تھی۔ ہوش و حواس قائم نہ تھے۔ ایک دیوانگی طاری تھی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ بھائی جان رضامند ہیں۔ سرکار قبلہ نے اجازت دے دی ہے۔ عفت مان گئی ہے۔ مدینہ منورہ سے منظوری مل گئی ہے۔ اب یہ شخص میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ بولو مفتی۔

میں گھبرایا ہوا اس کے پاس بیٹھا تھا۔ مجھے کیا پتہ' میں نے کہا۔

میں اسے بھسم کر دوں گی' وہ چلائی۔

میں نے بھائی جان کو یہ واقعہ سنایا۔ سن کر منفعل ہو گئے۔ منہ سے نہ بولے۔

پتہ نہیں اس روز مجھے کیا ہوا تھا۔

میں بھائی جان پر برس پڑا۔ میں نے کہا' بھائی جان یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے۔ یہ قدرت اللہ شہاب کون ہے۔ یہ محترمہ کون ہے۔ آپ ایک با اصول آدمی ہیں۔ باکردار آدمی ہیں۔ لیکن آپ نے اس سلسلے میں اپنے سارے اصول توڑ دیے ہیں۔ آپ بالکل اس کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ آپ نے ہمیں مخمصے میں ڈال دیا ہے۔ ہمیں پتہ نہیں چل رہا کہ کیا کرنا ہے'

کدھر جانا ہے۔ ہمارا راستہ کھوٹا کر دیا ہے۔

دیر تک بھائی جان سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر بولے' وہ ہماری غلط فہمی تھی' ہم سمجھتے تھے کہ ہم اصولوں پر چل رہے ہیں۔ وہ غلط فہمی دور ہو گئی ہے' جو حکم کے پابند ہوں انہیں اصولوں سے کیا لینا دینا۔ بھائی جان کی آواز بھیگی بھیگی تھی۔

اس کے چند ایک دنوں بعد عکسی میرے پاس آیا۔ کہنے لگا' ابو مجھے ایک پورٹریٹ بنانے کی آفر ملی ہے۔ ایک ہزار روپیہ' مان لوں کیا۔

کس کی پورٹریٹ۔ میں نے پوچھا۔

کوئی محترمہ ہے' وہ بولا' بیگم دین۔

میں چونکا اور میرا دل ڈوب گیا۔

زلفی منجم

میں نے عکسی سے پوچھا' تم بیگم دین کو جانتے ہو۔

بالکل جانتا ہوں' وہ بولا۔

کب ملاقات ہوئی۔

اکثر ہوتی ہے۔ پہلے وہ مجھے اپنا ڈرائینگ روم دکھانے کے لیے لے گئی تھی۔ پھر اس نے کہا مجھے کسی نجومی کے پاس لے چلو' میں اپنے مستقبل کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔

میں نے کہا' یقینی نہیں کہ نجومی سچ بتا سکے۔

کوئی بات نہیں' وہ بولی' دل کی تسلی ہی سہی۔

کیا تم اسے نجومی کے پاس لے گئے' میں نے پوچھا۔

ہاں' وہ بولا' میں اسے زلفی کے پاس لے گیا۔

زلفی نے کیا بتایا' میں نے عکسی سے پوچھا۔

چار چھ باتیں۔

کہ تم حال ہی میں بندھن سے آزاد ہوئی ہو۔

تم دوبارہ شادی کرو گی۔

وہ جس کی خواہش ہے' اسے پاؤ گی۔

وہ شخص وردی میں ہے' شاید فوجی ہو۔

تم سوشل ورکر کی حیثیت سے شہرت پاؤ گی۔

مرد تمہیں چاہیں گے' آرزو کریں گے' لیکن تم پر اثر نہ ہو گا۔

تم ملک کی خدمت کرو گی۔

یہ جذبہ تم پر آسیب کی طرح سوار ہو جائے گا۔

بس ایسی ہی باتیں تھیں' عکسی نے کہا۔ دیکھو بابا' وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا' بیگم دین ہر قیمت پر ستارا کو حاصل کر کے رہے گی۔ وہ بڑی پُر عزم خاتون ہے۔

مجھے پسینہ آگیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ بات صرف چند لوگ جانتے ہیں۔

ہاں تو کیا ارادہ ہے تمہارا' میں نے عکسی سے پوچھا۔

کس بارے میں۔

بیگم دین کی پورٹریٹ بناؤ گے۔

بناؤں گا' وہ بولا' لیکن ——————

لیکن کیا۔

مجھے پتہ ہے کہ بنے گی نہیں۔

کیوں۔

بابا' وہ بولا' اس عورت میں ایک بے نام چارم ہے' ایک کشش ہے' ایک مقناطیسی قوت ہے۔ وہ کیسے آئے گی۔ شی از اے وری ان یو یوال لیڈی۔

شہاب کراچی کے دورے سے واپس آیا تو اس نے آتے ہی مجھے فون کیا۔ آپ محترمہ سے ملے تھے کیا؟

منائی

نہیں' میں نے کہا۔

مت ملیے' وہ بولا' انہیں انکریج نہ کیجیے۔

میں نے پوچھا' کیا ہوا؟

وہ بولا' بات ختم ہو گئی۔ وہ جسم سے بے نیاز نہیں ہو سکتیں۔

مجھے یقین نہ آیا۔ کیسے' میں نے پوچھا۔

انہوں نے شیطانی قوتوں کو مدد کے لیے پکارا ہے۔

کیا آپ کے خلاف جادو کیا ہے۔

ہم سب کے خلاف ثاقب' عفت اور میں' سب کے خلاف جادو نہیں' شیطانی عمل' بڑی مشکل ہوئی۔ مجھے شیطان سے لڑنا پڑا۔

کیا کیا کیا۔ کلام کے زور پر لڑنا پڑا۔

نہیں' وہ بولا' فزیکلٹی...... اور اس نے فون بند کر دیا۔

چند ایک دنوں کے بعد راجہ نے فلیش مین ہوٹل سے مجھے فون کیا بولا' فوراً یہاں آ جاؤ۔

کیا بات ہے' میں نے پوچھا۔

وہ بے ہوش پڑی ہیں۔

کون بے ہوش پڑی ہے۔

اس نے خواب آور گولیاں کھالی ہیں۔

کس نے' میں نے پوچھا۔

دین نے' وہ بولا۔ ہوٹل والے انہیں سی ایم ایچ لے جا رہے ہیں۔ تم فوراً یہاں پہنچو۔

نہیں راجہ بلکہ تم یہاں آ جاؤ فوراً۔

پاگل ہو تم' وہ چلایا۔

بھائی جان کا حکم ہے۔ میں نے جھوٹ بولا۔

بھائی جان کو علم ہے کیا۔

ہاں انہیں پتہ ہے۔

دو دن کے بعد ہسپتال سے فون موصول ہوا کہ محترمہ دین خطرے سے باہر ہیں۔ پتہ نہیں وہ فون کس نے کیا تھا۔

سینتیسواں باب

پُراسرار

ایک روز دفتر میں ایک صاحب تشریف لائے' دیکھنے میں عوامی سے آدمی تھے' لیکن انداز بڑا اَن جھک تھا۔ بری بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گئے' کہنے لگے' شہاب صاحب سے ملنا ہے۔

میں نے کہا' جناب شہاب صاحب تو دورے پر گئے ہوئے ہیں۔

کب آئیں گے' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' جناب دو ایک دن میں آئیں گے۔

اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ کہنے لگا' یہ تو بڑی مشکل ہو گئی۔

میں نے کہا' آپ دو دن کے بعد تشریف لائیں۔

بولا' میرے پاس تو اتنا وقت نہیں ہے کہ انتظار کر سکوں اور کام اشد ضروری ہے۔

ایثار رائی

میں نے سوچا یااللہ یہ کیسا سائل ہے کہ جس کے پاس انتظار کرنے کے لیے وقت نہیں ہے اور کام اشد ضروری ہے پھر اس نے اپنا تعارف کرایا کہنے لگا' میرا نام ایثار رائی ہے میں صحافی

ہوں

کیا آپ ان سے انٹرویو لینا چاہتے ہیں' میں نے پوچھا۔

نہیں جی' وہ بے تکلفی سے بولا' انٹرویو کیا لینا ہے۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ پرانا نیاز مند ہوں۔ جب وہ جھنگ میں ڈپٹی کمشنر تھے' تب سے میں جھنگ کا رہنے والا ہوں۔

کیا کام ہے آپ کو ان سے۔

نجی کام ہے' وہ بولا۔ ہاں' وہ رک گیا' پھر کہنے لگا اگر آپ کو ان کا فون نمبر معلوم ہو تو میں ابھی ان سے فون پر بات کر لوں۔

جی نہیں مجھے نہیں معلوم' میں نے جواب دیا۔

اس نے سگریٹ کے چار ایک کش لگائے۔ کہنے لگا' میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ ممتاز مفتی ہیں نا۔

میں چونکا۔

وہ بولے گیا۔ جانتا تو دیر سے ہوں۔ البتہ ملاقات کا موقع آج ہی ملا ہے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے جانتے ہیں' میں نے کہا۔

او نہیں جی۔ ہم صحافی لوگ ہیں۔ جاننا ہمارا کام ہے۔ جاننے کے لیے ہم صبح شام کھجل ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا' معلوم ہوتا ہے آپ شہاب صاحب سے صحافی کی حیثیت سے ملنے نہیں آئے بلکہ دوست کی۔

وہ مسکرایا۔ بولا۔ ہاں جی شہاب کی مہربانی ہے کہ وہ مجھے دوست جانتے ہیں ورنہ صحافی کی کیا حیثیت ہے۔ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا۔

میں نے کہا آپ سے ایک بات پوچھوں۔

پوچھیے' وہ بولا بے تکلف پوچھیے۔

آپ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں نا۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں۔

ہاں وہ بولا میرا خیال ہے کہ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔

تو یہ بتایئے میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا' کہ شہاب کون ہے۔

وہ میرا سوال سن کر چونکا۔ کون ہے کا مطلب اس نے پوچھا۔

میرا مطلب ہے کہ گذشتہ چار سال سے میں شہاب صاحب سے منسلک ہوں' لیکن مجھے آج تک شہاب صاحب کا سرا نہیں ملا۔

وہ ہنسنے لگا۔ بولا میں ان کا دوست ہوں۔ کئی سال ان کے قریب رہا ہوں۔ بے شک شہاب بڑا پیارا آدمی ہے' لیکن اس کا سرا مجھے بھی نہیں ملا آج تک۔ کسی کو نہیں ملا۔

جب وہ جھنگ کا ڈپٹی کمشنر تھا تو وہ اکثر بھیس بدل کر حالات کی ٹوہ لگانے باہر نکلا کرتا تھا۔ ساتھ مجھے لے جاتا تھا۔ ہم دونوں حلیہ بدل لیتے تھے۔

میں سمجھا نہیں' میں نے کہا۔ کس بات کی ٹوہ لگانے۔

وہ مسکرایا۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا۔ وہ جس طرح پرانے زمانے کے بادشاہ رات کے وقت بھیس بدل کر نکلتے تھے کہ دیکھیں ہماری رعایا کس حال میں ہے۔

پھر تو آپ ان کے بہت ہی قریب ہیں۔ میں نے کہا۔

ہاں بہت قریب ہوں وہ بولا' لیکن شہاب قریب ہونے کے باوجود فاصلہ قائم رکھتا ہے۔

ڈپٹی کمشنر۔ اصلی' جعلی

ایثار جوش میں آ گیا۔ بولا' مفتی صاحب کیا آپ نے سنا ہے کبھی کہ علاقے کا ڈپٹی کمشنر ایک موچی کے پاس سربازار دو دو گھنٹے بیٹھا رہے۔

ایک دن میں نے پوچھا' میں نے کہا' شہاب صاحب یہ موچی کون ہے' جس کے پاس آپ عقیدت بھرے انداز میں بیٹھے رہتے ہیں۔

شہاب نے کہا' وہ موچی نہیں۔ وہ بھی اس علاقے کا ڈپٹی کمشنر ہے۔ میں بھی ڈپٹی کمشنر ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اصلی ہے' میں جعلی ہوں۔

گھوڑے شاہ

پھر وہ گھوڑے شاہ تھا۔ گھوڑے شاہ اک مست تھا۔ آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ ہوش و حواس ٹھکانے نہ تھے' لیکن شام کے وقت وہ ایک مخصوص جگہ آ بیٹھتا تھا۔ کچھ دیر بیٹھا رہتا پھر دفعتاً" اٹھ کر دوڑ لگاتا پچاس قدم دور ایک کھمبے تک دوڑتا جاتا پھر دوڑتا ہوا واپس آ کر بیٹھ کر ہانپنے لگتا۔

پندرہ بیس منٹ بیٹھا رہتا۔ پھر دوڑ لگاتا۔ شہر کے لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ جب وہ دوڑتا ہے تو اس پر کشف کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس لیے مستقبل کو جاننے کے شوقین گھوڑے شاہ کے گرد گھیرا ڈالے رکھتے تھے۔ جب وہ دوڑتا تو چار پانچ سائل اس کی پیچھے پیچھے دوڑتے۔ اس سے پوچھتے' بابا' کیا میں مقدمہ جیت جاؤں گا۔ بابا کیا محبوبہ سے میرا بیاہ ہو جائے گا' کیا میری ماں کو صحت حاصل ہو گی۔ دوڑتے ہوئے وہ صرف ایک فقرے میں ہر سوال کا جواب دیتا تھا۔

ایثار رائی بولا' ایک دن شہاب نے مجھے بلایا کہنے لگا چلو گھوڑے شاہ کو دیکھیں۔ میں نے کہا جناب وہاں تو سائلوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔

کہنے لگا' کوئی حرج نہیں۔ ہم ٹوپی کمبل اوڑھ کر جائیں گے۔

میں نے کہا شہاب صاحب آپ تو کشف کو نہیں مانتے۔ نہیں' میں نہیں مانتا' وہ بولا۔

تو پھر آپ گھوڑے شاہ سے کیا پوچھیں گے۔

کچھ پوچھنا نہیں میں اسے آزمانا چاہتا ہوں' وہ بولا۔ تفریحاً"۔

خیر جی ایثار نے کہا' پہلے دن تو ہمیں موقعہ نہ ملا۔ بھیڑ زیادہ تھی۔ مفتی صاحب ہم وہاں تین دن جاتے رہے۔

تیسرے دن اتفاق سے وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ جب گھوڑے شاہ دوڑا تو شہاب صاحب نے بھی ساتھ دوڑ لگا دی۔

واپسی پر میں نے پوچھا' کیوں آپ نے گھوڑے شاہ کو کیسا پایا۔

بولے' ٹھیک ہے۔ فراڈ نہیں۔

آپ نے کیا پوچھا تھا' میں نے کہا۔

بولے' میں نے پوچھا تھا' کہ میرا کیا ہو گا؟

پھر اس نے کیا بتایا۔

کہنے لگا۔ پردہ ہے' پردہ ہے' پردہ ہے۔

اس کا مطلب کیا ہوا' میں نے پوچھا کیسا پردہ۔

کہنے لگے' یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ پردے کا کیا مطلب ہے؟ لیکن یہ فقیر فراڈ نہیں ہے۔

یہ کہہ کر شہاب صاحب نے موضوع بدل دیا۔

ایثار مسکرایا۔ مجھے پتہ ہے جب انہیں بھید رکھنا ہو تو وہ موضوع بدل دیا کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے مزید کرید نہ کی۔

ایثار کی باتیں میرے لیے کام کی باتیں تھیں۔ اس کا انداز بے تکلف تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ کہہ دینے والا ہے۔ اس کی بیان کی ہوئی جھلکیاں میرے فریم میں فٹ بیٹھ رہی تھیں' جو میں نے اپنے مشاہدے کے زور پر شہاب کے متعلق اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا۔ اس لیے میں نے جان بوجھ کر اس گفتگو کو طول دینا شروع کر دیا۔

ایثار صاحب میں نے پوچھا' شہاب فقیروں' باباؤں اور مستوں میں کیوں دلچسپی لیتے ہیں۔

پتہ نہیں' وہ بولا' جھنگ میں وہ صرف آٹھ دس مہینے ڈی سی رہے۔ اس دوران میں ان کی توجہ دو باتوں پر مرکوز رہی' ایک تو بابوں کی طرف اور دوسرے غریبوں' حاجت مندوں اور عوام کی طرف۔

تشہیر

ایک روز شہاب نے مجھ سے پوچھا' ایثار صاحب یہ بتائیے کہ ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے مجھے جھنگ کے عوام کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

میں نے کہا' سب سے بڑی بات تو آپ کر چکے ہیں۔ آپ نے کھلی کچہری لگا دی ہے۔ عوام سیدھے آپ کے پاس آتے ہیں اور اپنے مسائل پیش کرتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ آپ باغ کے راستے پیدل گھر جاتے ہیں' وہ باغ میں عرضیاں ہاتھ میں لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ جنہیں آپ بر سر راہ وصول کرتے ہیں۔

وہ تو ہے' وہ بولے' اسے چھوڑیں آپ کوئی تجویز بتائیں۔

میں نے کہا' جھنگ تعلیمی طور پر بڑا بیک ورڈ علاقہ ہے۔

کیوں' انہوں نے پوچھا۔

اس لیے کہ تعلیمی سہولتیں مہیا نہیں کی گئیں اور لائق لڑکوں کے ماں باپ اس قدر غریب ہیں کہ وہ تعلیم کا خرچہ اٹھا نہیں سکتے اور علاقے کے زمیندار نہیں چاہتے کہ کامیوں کے بیٹے تعلیم یافتہ ہو جائیں۔

اگلے روز ہی شہاب صاحب نے ایک حکم نامہ جاری کر دیا۔ راشن ڈپوؤں پر ایک پیسہ فی من کے حساب سے تعلیمی سرچارج لگا دیا۔ یوں چالیس ہزار روپے جمع ہو گئے۔ اور انہوں نے نادار مگر لائق طلبا کے ماہانہ وظیفے لگا دیے۔

ایک دن میں نے غصے میں کہا' شہاب صاحب یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ان تعلیمی وظائف کے بارے میں پریس میں کوئی خبر نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں آپ نے منع کر دیا ہے۔

اس پر شہاب صاحب مسکرائے۔ بولے' ہمیں کام سے غرض ہے۔ تشہیر کو چھوڑیے ایثار صاحب۔

آف دی ریکارڈ

ایثار نے ایک نیا سگریٹ سلگایا۔ بولا' پتہ نہیں کیوں شہاب صاحب کو تشہیر سے چڑ تھی۔ جب بھی وہ مجھ سے بات کرتے تو کہتے ایثار صاحب یہ باتیں آف دی ریکارڈ ہیں۔

میں نے کہا' ایثار صاحب آپ تو شہاب صاحب کے انٹرویو لیا کرتے ہیں۔

ایثار قہقہہ مار کر ہنسا۔ عجیب آدمی ہیں جب گپ شپ کے دوران بات سناتے ہیں' تو تفصیلات دیتے ہیں جب اشاعت کے لیے انٹرویو لیتا ہوں تو تفصیلات گول کر جاتے ہیں۔ جب میں پوچھتا ہوں آپ نے تو مجھے یہ بات یوں سنائی تھی۔ اب آپ اسے مختصر کر کے رہے ہیں۔

جواب میں وہ کہتے ہیں' وہ بات آف دی ریکارڈ تھی۔

ایثار کی طبیعت مجھے بے حد پسند آئی۔ اس کی باتوں میں صحافیانہ عنصر نہ تھا۔ صحافی تو کائیاں ہوتے ہیں۔ باتوں میں ہیرا پھیری برتنے کی عادت ہوتی ہے۔ ایثار کی باتوں سے پینڈو کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کی بات میں بے باک تھی۔

میں نے کہا' ایثار صاحب میں آپ کا وقت تو ضائع نہیں کر رہا۔

وہ ہنسا بولا'

میرا وقت قیمتی نہیں ہے اور مجھے یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ میں تو شہاب صاحب سے ملنے آیا تھا۔

میں نے کہا' مجھے شہاب کی باتوں سے دلچسپی ہے۔

نہ نہ' وہ بولا' مفتی صاحب شہاب صاحب کی باتوں کا مزا لیں بڑا ہی میٹھا آدمی ہے۔ تحقیق نہ کریں ورنہ پاگل ہو جائیں گے آپ۔ اس کا سرا نہ کسی نے پایا ہے نہ کوئی پائے گا۔ مجھے بھی یہ خبط ہوا تھا۔ کچھ دیر ڈُب جھلکے کھاتا رہا۔ پھر ایک دن مجھے عقل آگئی۔ میں نے خود سے کہا' ایثار رائی آم کھا پیڑ نہ گن۔

میں نے کہا' یہ بتایئے کہ شہاب کو پیروں فقیروں سے کیوں دلچسپی ہے۔

اونہوں' وہ بولا' فقیروں سے دل چسپی ہے۔ پیروں سے نہیں۔ پیروں کو وہ برا جانتے ہیں' کہتے ہیں یہ لوگ ٹھگ ہیں بھولے بھالے مسلمانوں کو لوٹتے ہیں۔

میں نے کہا ایثار صاحب مجھے اس بات کا علم ہے کہ قدرت اللہ شہاب غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ عوام کے لیے کام کرتے ہیں۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ شہاب صاحب کون ہیں؟

وہ مسکرایا بولا' آپ کا مطلب ہے کہ شہاب صاحب کوئی ہیں۔

میں نے کہا' ہاں' وہ عوام کی مدد صرف نیک دلی اور ہمدردی کی وجہ سے نہیں کرتے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان پر ایسے کام کرنا عاید ہے۔

کیا مطلب' ایثار نے پوچھا۔

میں نے کہا' مجھے شک پڑتا ہے کہ ان کا کوئی مقام ہے اور اس مقام کی وجہ سے ایسے کام کرنا ان پر عاید ہے۔

اس کا مجھے علم نہیں' ایثار نے جواب دیا۔ البتہ ایک بات یقینی ہے کہ شہاب ایک پراسرار آدمی ہے۔ ان کا بھید کسی نے نہیں پایا۔

ایم بی خالد

پھر صدر کے پی اے خالد صاحب تھے۔ میں التزاماً ان سے شہاب کی بات چھیڑ لیتا تھا کہ شاید شہاب کا بھید کھلے۔

ایم بی خالد نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے۔ عنوان ہے "ایوان صدر میں سولہ سال"۔ یہ کتاب خالد صاحب کی یاداشتوں کا مجموعہ ہے۔ مصنف کے بارے میں اس کتاب کا تعارفی نوٹ میں نے لکھا ہے۔ ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

حیرت ہے کہ ایم بی خالد نے ۱۶ سال صدر گھر کے اکھاڑے میں کس طرح گزارے۔ اگر خالد میں تماش بینی یا ذاتی مفاد کے عنصر ہوتے تو بات سمجھ میں آ جاتی۔ لیکن خالد تو پیدائشی طور پر صراط مستقیمیہ ہے۔ شاید یہ بیماری موروثی ہو۔ بچپن میں ہی خالد میں اسلامی ذوق بیدار ہوا۔

پھر ایک عالم دین کی باتیں سن سن کر اس میں مزید ابال آ گیا۔ جوانی میں ہی خالد صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو گیا۔ داڑھی رکھ لی۔ اس زمانے میں داڑھی رکھنا فیشن میں نہ تھا اُلٹا پڑھے لکھے لوگ معیوب سمجھتے تھے۔ خالد کے دل میں تبلیغ کا جذبہ تھا خدمت کا جنون تھا۔

پھر ایک روز ان جانے میں خالد عالم دین کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے مصروف کار دیکھ کر خالد کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ راہبروں پر اعتماد نہ رہا۔ عمل کر شاہراہ کج روپگڈنڈی بن کر رہ گئی۔ داڑھی منڈوا دی۔ صوم و صلوٰۃ تاک پر رکھ دیئے۔

دو ایک سال عدم اعتماد کی کیفیت قائم رہی' پھر اتفاق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح ہاتھ لگ گئی۔ اسلامی کردار کی عظمت از سر نو اجاگر ہوئی بے اعتمادی دھل گئی۔ توجہ اسلام کے ظاہری کوائف سے ہٹ کر باطن پر مرکوز ہو گئی۔ اسلامی کردار مطمع نظر بن گیا جس پر وہ آج تک سختی سے عمل پیرا ہے۔

ایک ایسا شخص جسے ہر حالت میں سچ کہہ دینے کی بری عادت ہو' جو لوگوں کو خوش کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو' جو صورت حالات سے بے نیاز ہو کر قدم اٹھانے کا عادی ہو' نمائشی مسکراہٹ سے عاری ہو' بلا تعمل لیس سر کھنے کا عادی نہ ہوا' وعدہ خلافی کو ناقابل معافی سمجھتا ہو' حقوق العباد کا دیوانہ ہو' ایسے آدمی کا سولہ سال صدر گھر میں ملازمت کرنا میرے لیے حیران کن بات ہے۔ خصوصاً" اس زمانے کا صدر گھر جو اقتدار کا واحد مرکز تھا۔

خالد کا اصلی نام محمد بشیر تھا۔ وہ والدین کے لیے نیک بشارت لایا تھا جب وہ بڑا ہوا تو اس راز کو اخفا کرنا پسند نہ کیا۔ پتا نہیں کیوں' اس نے محمد بشیر کو ایم بی میں کیما

فلاج کر لیا۔ اور ساتھ خالد کی کلی ٹانک لی۔

صدر گھر میں خالد صدر صاحب کا پی ایس تھا اور میں صدر کے سیکرٹری کا او ایس ڈی۔ سیکرٹری قدرت اللہ شہاب تھے۔ خالد کے ساتھ میں تقریباً" دو تین سال صدر گھر میں رہا۔ ہمارے تعلقات بڑے خوش گوار لیکن رسمی رہے۔ ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ میں برائے نام مسلمان تھا۔ خالد اسلام جیتا تھا۔ میں مغرب زدہ تھا وہ مشرقی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ وہ اصولوں پر کار بند تھا۔ میں اصولوں سے بے نیاز' میں "ہے" کی دنیا میں جیتا تھا۔ خالد "کیا ہونا چاہیے" کا دلدادہ تھا۔

ریٹائر ہونے کے بعد خالد نے اپنی یاداشتوں پر ایک کتاب لکھی جس میں جگہ جگہ شہاب کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں سے مختصر اقتباسات اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں کہ خالد صاحب نے شہاب صاحب کو کیسے پایا۔

کیسا پایا

۱۔ پہلے روز شہاب صاحب صدر گھر میں آئے تو کسی کو پتا ہی نہ تھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ کیوں آئے ہیں۔ ایک کونے میں فالتو کرسی پر دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ایک ایک فائل گود میں رکھ کر اسے پڑھتے رہے۔

۲۔ ان میں ایک عجیب قسم کی جھجک تھی۔ شرمیلے اور کم آمیز تھے۔

۳۔ ایوان صدر میں شہاب اپنا مصلّٰی ساتھ لائے تھے۔ ظہر اور عصر کی نمازیں اپنے کمرے کے ایک کونے میں ادا کرتے تھے۔

۴۔ انہیں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا' تو ان کی بیگم کے قول کے مطابق اس کی وجہ مجاہدہ تھی۔

شہاب کثرت عبادت کو چھپانے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ ایسی جگہ نماز پڑھتے جہاں وہ دروازے سے نظر نہ آئیں۔ رمضان میں سخت

مجاہدہ کرتے تھے جس طرح کہ فرقہ ملامتیہ کے بزرگ کرتے ہیں۔

۵۔ ۱۹۶۰ء میں شہاب صاحب نے سول سروس سے استعفٰی پیش کر دیا۔ صدر نے پوچھا آپ ملازمت سے کیوں الگ ہونا چاہتے ہیں۔

شہاب نے کہا سول سروس کو چکھنا مقصود تھا۔ ہضم کرنے یا ہضم ہو جانے کا ارادہ نہ تھا۔

بقول شہاب صاحب سول سروس کے چوہے دان سے رہائی پانے کی یہ ان کی دوسری کوشش تھی۔

حج پر گئے تو جی پی فنڈ سے قرضہ لیا۔

اور حج سے متعلقہ تمام تر مرحلے خود کیو میں کھڑے ہو کر سرانجام دیے حالاں کہ دفتر کے حوالے سے تمام انتظامات بیٹھے بٹھائے عمل میں لائے جا سکتے تھے اور یہ تمام مرحلے انہوں نے چوری چوری ادا کیے۔

۷۔ جب صدر ایوب کی جمہوریت کی سپیشل گاڑی چلی جو جگہ جگہ رکتی تھی اور ان جگہوں پر جلسے ہوتے تھے تو:

ایک جلسہ گاہ میں شہاب ذرا دیر سے پہنچے۔ مجسٹریٹ قسم کے ایک افسر جلسہ گاہ کے گیٹ پر کھڑے تھے۔ انہوں نے شہاب کو روک لیا کہنے لگے دوسری طرف عام پبلک کا دروازہ ہے' ادھر سے جائیے۔ شہاب صاحب چپ چاپ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں صدر ایوب کی آوازیں سنائی دیں۔ شوہاب شوہاب۔ اے ڈی سی نے دیکھا کہ درخت تلے کھڑے ہیں۔ وہ بھاگ کر ان کے پاس گیا اور انہیں جلسہ گاہ میں لے آیا۔

۸۔ اسی سفر کے دوران ایک جلسے میں صدر صاحب کے سٹاف کے لیے خصوصی نشستیں تھیں۔ شہاب صاحب بھی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ منتظمین میں سے ایک نے دیکھا کہ وہ کرسی پر اس عاجزانہ انداز میں بیٹھے ہیں' تو اسے شک پڑ گیا کہ ضرور یہ کوئی باہر کا آدمی ہے۔ اس نے آ کر

شہاب کو بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ بولا جاؤ ادھر پبلک میں بیٹھو۔ شہاب اٹھ بیٹھے ابھی دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ صدر ایوب نے آواز دی ادھر آؤ شوہاب۔

۹۔ ایوان صدر سے رخصت ہوتے وقت شہاب صاحب نے صدر ایوب کو ایک فریم شدہ آیت تحفے کے طور پر دی۔ اس آیت کا مطلب تھا۔

لوگو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم خود کرتے نہیں ہو۔ خدا کے نزدیک ایسی بات بہت ناراضگی کی ہے۔ کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

۱۰۔ یحییٰ خان کا زمانہ شہاب کے لیے کرب و بلا کا زمانہ تھا۔ لندن میں پناہ گزین تھے۔ یونیسکو سے ایک سو ڈالر ماہوار ملتے تھے۔ اسی پر گزارہ تھا۔ پنشن ضبط ہو چکی تھی۔ ان دنوں فاقے بھی آئے۔ بیگم کو فاقوں نے اس قدر نڈھال کر دیا کہ بالآخر خالق حقیقی سے جا ملیں۔

۱۱۔ ریٹائرمنٹ سے کچھ دیر بعد شہاب صاحب داڑھی رکھ کر بے نقاب ہو گئے' ورنہ نظر نہ آنے والی داڑھی تو اس وقت بھی تھی' جب ۱۹۵۴ء میں پہلی مرتبہ ایوان صدر میں داخل ہوئے تھے۔

۱۲۔ گورنر جنرل ہاؤس میں قدرت اللہ شہاب کی آمد غلام محمد کے پرسنل سٹاف کے لیے باعث رحمت ثابت ہوئی۔

گورنر جنرل کی ناراضگی پر سینئر سٹاف ہمیشہ طوفان کا رخ جونیئر سٹاف کی طرف موڑ دیا کرتے تھے۔ شہاب صاحب کی آمد پر یہ رسم ٹوٹ گئی۔ شہاب دوسروں کی خطاؤں کو بھی اپنے کھاتے میں ڈال کر خوش ہوتے تھے۔ یوں سارا اسٹاف شہاب کا گرویدہ ہو گیا۔

۱۳۔ قدرت اللہ شہاب اردو کے ادیب تھے مگر شاید کم ہی لوگوں کو علم ہو گا کہ ان کی انگریزی اردو سے کہیں بہتر تھی۔

۱۴۔ سکندر مرزا کے دور میں جوڑ توڑ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ

شروع ہوا تو شہاب صاحب بہت دلگیر ہوئے اور سول سروس سے کنارہ کشی کی کوشش شروع کر دی۔

۱۵۔ شہاب صاحب دوسرے افسروں کی طرح بول چال کے دھنی نہ بن سکے۔ البتہ دوسروں کی سنتے اور لطف اٹھاتے۔ اپنے اندر کا ابال صرف قلم کے ذریعے خارج کر سکتے تھے۔ زبان کے استعمال میں اناڑی تھے۔

۱۶۔ ایوان صدر میں چھ برسوں کے دوران ہمیں یہ حسرت ہی رہی کہ شہاب صاحب کسی ماتحت کی کوتاہی یا گستاخی پر کبھی تو سرزنش کریں۔

۱۷۔ وہ ڈیلی الاؤنس قبول کرنے سے انکار کر دیا کرتے کہ فلاں عزیز کے ہاں ٹھہرے ہیں یا ان کا کوئی خرچ نہیں ہوا۔ اسلام آباد سے لاہور تک کا کرایہ واپس کر دیتے کہ فلاں عزیز کی کار میں آئے تھے۔

۱۸۔ غلام محمد اپنے جائز حق سے دست بردار نہیں ہوتے تھے، لیکن شہاب صاحب کو جائز حق سے محرومی بھی احساس محرومی میں مبتلا نہ کر سکتی تھی۔

۱۹۔ ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۳۰ جون کو کلیم منظور کرانے کی آخری تاریخ تھی۔ شہاب صاحب کے چھوٹے بھائی حبیب اللہ شہاب نے کراچی سے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ فیملی کا کلیم بھائی جان کی میز کی فلاں دراز میں کئی مہینوں سے رکھا ہوا ہے۔ آپ وہاں سے نکال کر بھائی صاحب کے دستخط کرا لیں اور وقت مقررہ ختم ہونے سے پہلے داخل کرا دیں۔ شہاب نے میرے اصرار پر دستخط تو کر دیئے مگر اس انداز سے جیسے کوئی مکروہ فعل سرزد ہو رہا ہو۔

۲۰۔ شہاب صاحب محض نمبر بنانے کی خاطر صدر ایوب کے آگے پیچھے نہیں پھرا کرتے تھے۔

خالد صاحب کی کتاب میں شہاب صاحب کے متعلق اور تفصیلات بھی ہیں جو ان کے کردار پر روشنی ڈالتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تمام تر سروس کے دوران ان کا رویہ قطعی طور پر منفرد تھا۔ اور ان کی انفرادیت میں پر اسراریت کا عنصر نمایاں تھا۔

استعفٰی

مثلاً" شہاب صاحب نے کئی ایک بار سول سروس سے استعفٰی دیا جس کی تفصیلات ایم بی خالد نے اپنی کتاب میں رقم کی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب نے ۱۹۴۱ء میں انڈین سول سروس کی ابتداء کی اور ۱۹۷۶ء میں ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ اس چھتیس برس پر محیط سروس کے دوران انہوں نے چار مرتبہ سول سروس سے علیٰحدہ ہونے کی ناکام کوشش کی۔ ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ چار کے علاوہ بھی انہوں نے ایک آدھ بار استعفٰی لکھ کر جیب میں تیار رکھا مگر پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ سول سروس کی تاریخ میں قدرت اللہ شہاب واحد فرد ہیں جنہوں نے استعفٰی پر استعفٰی دیا۔ مگر بقول ان کے "سول سروس کے چوہے دان سے رہائی نہ مل سکی۔" اور ساٹھ سال کی طبعی عمر تک گلے میں پڑا ڈھول انہیں بجانا ہی پڑا۔

> پہلا استعفٰی انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اس وقت دیا جب کہ ان کو انڈین سول سروس میں داخل ہوئے صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے۔ دوسرا استعفٰی پاکستان میں سکندر مرزا کی صدارت کے دوران دیا اور تیسرا ایوب خاں کے دور حکومت میں۔ دوسرا اور تیسرا استعفٰی اس لئے منظور نہ ہوا کہ صدر پاکستان انہیں پسند کرتے تھے۔ چوتھا استعفٰی انہوں نے یحییٰ خاں کے عہد میں دیا۔ یہ اس وجہ سے نامنظور ہوا کہ صدر پاکستان انہیں بہت نا پسند کرتے تھے اور چاہتے کہ "بچ بچ کے نہ جائے۔"

میرے پرانے کاغذات میں ان کے اس استعفٰی کا قلمی نسخہ موجود ہے جو انہوں نے صدر ایوب خان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ پریزیڈنٹ ہاؤس کے لیٹرپیڈ کے چھ صفحات پر مشتمل اس استعفٰی سے ان کی شخصیت اور ان کے غم کی خوب عکاسی ہوتی ہے۔ ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

"میں جناب صدر کی خدمت میں ایک ذاتی درخواست پیش کرتا ہوں۔

۲۔ پورے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سول سروس سے ریٹائرمنٹ لے لوں۔ اس کی وجہ کسی قسم کی مایوسی یا احساس محرومی نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس میں محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں میرے لیے اپنے من کی پسند کی زندگی بسر کرنا اب ممکن ہو سکے گا۔

۳۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نے انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی تو میرا ارادہ محض بیورو کریسی کا تجربہ حاصل کرنا تھا اور اس کے لیے میں نے اپنے ذہن میں پانچ سال کا عرصہ کافی سمجھ رکھا تھا مگر پاکستان کے قیام سے میرے لیے نئے دور کا آغاز ہوا اور میں نے سول سروس چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جنوری ۱۹۵۸ء میں مجھے اس وقت کے صدر کی خدمت میں اپنا استعفٰی پیش کرنا پڑا کیوں کہ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ میرے لیے ان حالات میں ملازمت جاری رکھنا تو درکنار زندہ رہنا بھی ممکن نہیں۔ میں ملک چھوڑ کر جلا وطنی کی زندگی گزارنا چاہتا تھا خواہ مجھے اپنی پنشن سے بھی محروم ہونا پڑتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا کرنے کی اجازت نہ مل سکی۔ اس کے بعد انقلاب آ گیا اور میرے سروس کیریئر کا خوشگوار ترین دور شروع ہوا جو تا حال جاری ہے۔

۴۔ مجموعی اعتبار سے سول سروس کے دوران میرے ساتھ مہربانی کا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ ہر قسم کی معاشرتی' سیاسی یا حسب نسب کی قوت نہ ہونے کے باوجود میں اکثر قابل رشک عہدوں پر فائز رہا ہوں۔ ابھی حال ہی میں میرے درجے (STATUS) اور تنخواہ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ محض حسد کی بناء پر اکا دکا تلخ واقعات کے سوا سول سروس کے

اندر باہر میرے خلاف کسی کے دل میں مخاصمت پیدا نہ ہوئی۔ میرے سامنے مزید ترقی کا راستہ کھلا ہے اور کسی بھی سول سرونٹ کے لیے اس سے بہتر سازگار حالات نہ ہوں گے' جس کے لیے میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہوں' لیکن اس کے باوجود ذاتی وقار اور تحفظ کی اس کیفیت سے دستبردار ہونا چاہتا ہوں کیوں کہ میرے نزدیک اچھی اور آرام دہ زندگی کے علاوہ بھی انسان کے مقاصد ہو سکتے ہیں۔

۵۔ میں اپنے طبعی رجحان کے مطابق آزاد' گمنام اور ایک عام آدمی کی مانند زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوں۔ میری اس خواہش کے پس پردہ کوئی سیاسی معاشرتی یا مالی عنصر نہیں ہے۔

۶۔ کسی زمانے میں میری اولین تمنا تھی کہ نوجوانوں میں اخلاقی اور روحانی اقدار پیدا کروں لیکن میں نے اب محسوس کیا ہے کہ مجھ میں ایسا کرنے کی پوری صلاحیت موجود نہیں کیونکہ میں نے اپنی جوانی کی ایام نوجوانوں کے تجربات حاصل کرنے اور سمجھنے کی بجائے بے مقصدر گزار دیے ہیں۔ اس کے علاوہ میں خود میں ایسی اخلاقی اور روحانی توانائی محسوس نہیں کرتا کہ دوسروں کے لیے مشعل راہ بن سکوں۔ مجھے اپنی اس کمی کا اعتراف بھی ہے اور افسوس بھی۔

۷۔ لامحالہ مجھے اپنے ثانوی مقاصد کی طرف لوٹنا پڑا ہے اور وہ یہ ہے کہ ادبی اور کلچرل فیلڈ میں کام کروں۔ ایک اعلیٰ افسر کے روپ میں نہیں بلکہ ایک عام شہری کی حیثیت سے میرا سول سرونٹ ہونا ہی میرے پاؤں کی زنجیر ہے۔ تعمیری اور قومی موضوعات پر بھی میں وہ کچھ نہیں لکھ سکتا' جس کے لکھنے کی میں صلاحیت رکھتا ہوں جو کچھ بھی لکھوں گا یا کہوں گا اس پر میرے سول سرونٹ کی چھاپ لگ سکتی ہے اور اسے سرکاری یا اجرت کا پراپیگنڈا کہا جائے گا یہ صورت حال میری اور میرے مشن کے لیے نقصان دہ ہو گی۔ میں ثقافت اور ادب کو محض وقتی

(HOBBY) کے طور پر نہیں بلکہ پیشے کے طور پر اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

۸۔ میرے مد نظر ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہمارے ملک میں رائے عامہ۔ صرف دانشور طبقے کی رائے کو سمجھا جاتا ہے اور جو لکھے گئے لفظ سے بنتی یا بگڑتی ہے۔ اس ذریعہ ابلاغ کا بے دریغ استعمال ہوتا رہا ہے جس کے سبب منفی روایات نے جنم لے لیا ہے۔ اگر کوئی تنقید کی غرض سے لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کی تحریر میں تلخی اور بعض اوقات دشنام طرازی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی تعریف کے دو حرف لکھتا ہے تو اس پر خوشامدی ہونے کا لیبل چسپاں ہو جاتا ہے۔ لکھنے لکھانے کا یہ فیشن جاری رہے گا۔ کیوں کہ لکھنے والے کے مزاج میں تلخی ہے یا وہ احساس محرومی کا شکار ہے یا اس کی تحریر کے پس پردہ ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ اگر کوئی ادیب ان تین کمزوریوں سے پاک ہو تو کم از کم وہ ابتدا تو کر سکتا ہے چاہے یہ ابتدا کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اس وقت تعمیری اور مضبوط رائے عامہ' ملک کی اہم ترین ضرورت ہے اور وہ ضرورت ہے جسے کوئی حکومتی ادارہ پورا نہیں کر سکتا۔ یہ کام صرف کھلی فضا میں ہو سکتا ہی۔ میری تمنا ہے کہ میں اس کام کا بیڑا اٹھاؤں۔

۹۔ میری دیرینہ خواہش ایک اور بھی ہے۔ میں جناب رسالت ماب ﷺ کی حیات طیبہ پر کل وقتی کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سیرت پر ایسی کتاب جو دلچسپ ہو' مکمل ہو اور دور جدید کے اذہان کو متاثر کر سکے۔ غیر مسلم سوانح نگاروں نے اس موضوع کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے' جب کہ مسلمان سوانح نگاروں کا قلم جذبات اور عقیدت کی نظر ہو گیا۔ جدید دور کا ذہن' مسلم یا غیر مسلم' مختلف اپروچ کا متقاضی ہے۔ میں اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس کام کے لیے بہت وقیق مطالعہ اور تحقیق درکار ہے اور میں اسے اپنی زندگی کا آخری مشن بنانے

کا ارادہ رکھتا ہوں۔

۱۰۔ میں نے یہ لمبا مضمون محض اس خیال سے تحریر کیا ہے کہ یہ واضح کر سکوں کہ سول سروس سے ریٹائر ہونے کی غرض وغایت صرف وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کر دی۔ ایک چالیس سالہ شخص عزت اور خوش حالی کی نوکری چھوڑ کر کسی نئے کیریئر کا آغاز کرنے سے گھبراتا ہے۔ جس میں نئے سرے سے جدوجہد اور کشمکش کا امکان ہو' لیکن میرے ضمیر میں جو خلفشار برپا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ تجربہ اپنی ذات پر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس مشن میں پوری طرح کامیاب نہ بھی ہو سکا تو بھی مجھے افسوس نہ ہو گا کیوں میری یہ کوشش دیانتداری پر مبنی ہو گی کہ میں اپنے لیے اور اپنے ملک کے لیے کچھ کر لوں۔

۱۱۔ اگر میں اپنے انتخاب کردہ پیشے میں خاطر خواہ انکم نہ بھی پیدا کر سکا' حالانکہ مجھے یقین ہے کہ کر سکوں گا' میری پنشن ہمارے لیے کافی ہو گی۔ کیوں کہ ہم میاں بیوی سادہ سے سادہ زندگی بھی گزار سکتے ہیں۔ میری بیوی جو ڈاکٹر ہے کام کرنے پر آمادہ ہے۔ میں نے اپنی شریک حیات کی مکمل رضامندی بلکہ حوصلہ افزائی پر ہی یہ انتہائی قدم اٹھانے کا عزم کیا ہے۔

۱۲۔ اپنے اس فیصلے میں جناب صدر کی خوشنودی بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔ گذشتہ ڈیڑھ سال جو میں نے جناب صدر کی خدمت میں گزارا ہے وہ میرے کیریئر کا بہترین اور خوشگوار ترین عرصہ ہے۔ جناب صدر نے ملک میں نئی زندگی کا احساس پیدا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں الگ ہو کر اپنا اصل کام شروع کرنا چاہتا ہوں اصل میں میرا مشن ہی جناب صدر کے افکار اور فلسفے کی تشریح ہو گا۔ سول سرونٹ کی حیثیت سے میں صرف عام قسم کا WRITING فائل ورک کر سکتا ہوں۔ الگ ہو کر میں ان کے افکار کو پھیلانے اور عام کرنے کے لیے کتابیں لکھ

سکوں گا، لکچر دے سکوں گا۔

۱۳ فی الحال میری درخواست پر کسی کاروائی کی ضرورت نہیں البتہ اگر جناب صدر میری تجویز کو اصولی طور پر تسلیم کر لیں تو میں تیاری شروع کر دوں گا اور جب جناب صدر خود مناسب سمجھیں گے علیحدہ ہو جاؤں گا۔

آخری دن

جب شہاب صاحب ایوان صدر سے رخصت ہوئے تو انہوں نے ایوان صدر میں اپنے مشاہدات پر ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا۔ "ایوان صدر میں میرا آخری دن"

ایم بی خالد نے اپنی کتاب میں اس مضمون سے اقتباسات دیئے ہیں:۔

شہاب صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا چھ صفحات پر محیط اس خط کا مسودہ (ڈرافٹ) میرے پاس موجود ہے۔ اسی طرح میرے پاس ان کے اس مضمون کا آٹھ فل سکیپ صفحات کا ڈرافٹ بعنوان "ایوان صدر میں میرا آخری دن" موجود ہے۔ اس مضمون میں غلام محمد کا تذکرہ کرنے کے بعد سکندر مرزا کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"جنرل سکندر مرزا کے ماتحت کام کرنے کا عرصہ میرے لیے کم اعصاب شکن نہیں تھا۔ جب ۱۹۵۶ء میں پاکستان اسلامی جمہوریہ بنا اور جنرل سکندر مرزا نے جمہوریہ کے پہلے صدر کا حلف اٹھایا تو میں پھولا نہ سماتا تھا کہ اپنے ملک کے پہلے صدر کا سیکرٹری ہوں، مگر افسوس کہ یہ جذباتی کیفیت بہت قلیل المدت ثابت ہوئی۔ وزارتیں بننے اور ٹوٹنے کا سلسلہ اس برق رفتاری سے شروع ہوا کہ طبیعت اچاٹ ہونے لگی، ہر صبح دفتر میں آنے سے پہلے ریڈیو پاکستان سے صبح کا خبرنامہ ضرور سن لیتا تاکہ اگر راتوں رات کابینہ بدل چکی ہو تو میں اپنا کوٹ اور ٹائی ساتھ لیتا چلوں تاکہ حلف اٹھانے کی تقریب میں اپنے فرائض منصبی ادا کر سکوں۔

ایک مرتبہ کسی صاحب نے آدھی رات کو مجھے ٹیلی فون کر کے پوچھا کہ کل صبح نئی کابینہ کتنے بجے حلف اٹھائے گی' تاکہ وہ وقت پر پہنچ سکیں۔

ایک دفعہ نئی کابینہ کئی روز تک حلف نہ اٹھا سکی' کیوں کہ وہ "تر" اور "خشک" وزارتوں کی تقسیم پر سمجھوتہ نہ ہو سکا تھا۔ بالآخر جب سودا طے ہو گیا تو وزراء کرام حلف اٹھاتے ہی اپنی اپنی وزارت کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اچانک انکشاف ہوا کہ وزارت تعلیم کسی نے قبول نہیں کی۔ مجھے بھگایا گیا کہ جاؤ دیکھو کون سا وزیر ابھی تک گاڑی کی انتظار میں کھڑا ہے۔ اتفاق سے ایک صاحب جن کی ٹانگ میں تکلیف تھی اور بھاگ نہیں سکتے تھے ابھی پورچ میں گاڑی کے منتظر تھے۔ انہیں پکڑ کر لایا گیا کہ چلو تعلیم کی وزارت کا قلمدان بھی سنبھال لو۔ وہ بندہ خدا راضی نہ ہوتا تھا اور بڑی مشکل سے وزارت تعلیم اس کی مرضی کے خلاف اس کے سر تھوپ دی گئی"۔

حلف برداری کی تقریبات میں شرکت کرنے کے علاوہ میرا دوسرا کام صدر پاکستان کے لیے تقریریں تیار کرنا ہوتی تھیں۔ مجھے مہارت حاصل ہو گئی تھی کہ ہر موقع کے لیے چار پانچ صفحات کی تقریر گھسیٹ دوں. کیوں کہ مجھے علم تھا کہ مقرر اور سامعین دونوں خود سمجھتے ہیں کہ کچھ کہا جا رہا ہے۔ کہ اس کا وہی مطلب نہیں ہے بلکہ آرٹ برائے آرٹ والی بات ہے۔

ایک مرتبہ ایک ہی دن میں دو تقریبات تھیں۔ ایک تقریب سائنس کانفرنس اور دوسری ہسٹری کانفرنس کا افتتاح تھا۔ میں نے ایک ماسٹر ڈرافٹ تیار کر لیا اور پھر نفس مضمون کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ الفاظ کی ردو بدل کر دی۔ ایک تقریر میں کہا گیا تھا کہ سائنس تاریخ ساز کردار ادا کرتی ہے اور دوسری تقریر میں کہا گیا تھا کہ ہسٹری بذات خود ایک سائنس ہے۔ بقیہ متن ایک جیسا تھا۔ سوئے اتفاق سے اے ڈی سی نے

دونوں مواقع پر غلط تقریر جناب صدر کو پڑھنے کے لیے تھمادی۔ چونکہ سائنس اور ہسٹری میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے کسی کو بھی اس غلطی کا احساس نہ ہو سکا' البتہ پریس کے نمائندوں کو متن حوالے کرتے وقت ضرور احتیاط برت لی گئی تھی۔

سول سروس

مارشل لاء کے نفاذ کے متعلق ایم بی خالد لکھتے ہیں کہ۔

سات اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات جب وفاقی اور صوبائی وزارتوں اور اسمبلیوں کو توڑ کر جنرل سکندر مرزا نے مارشل لاء نافذ کیا تو اس کارروائی میں قدرت اللہ شہاب شریک محفل نہیں تھے۔

سول سروس کے متعلق ایم بی خالد رقم طراز ہیں کہ:۔

قدرت اللہ شہاب نے آئی سی ایس اور سی ایس پی کی تہمت خود لگوائی ورنہ سول سروس کے وہ اہل نہ تھے۔ ان کے ایک سینئر کولیگ جناب ایم بی احمد نے ایک دفعہ I.C.S کی اصلی نوعیت سمجھائی۔ انہوں نے بتایا کہ I.C.S کی تربیت لے کر اپنی پہلی پوسٹنگ پر جو E.A.C کی اسامی پر تھی پروٹوکول کے مطابق کمشنر صاحب بہادر پر کال کرنے چلے گئے۔ جا کر دیکھا کہ کوٹھی کے برآمدے میں ملاقاتیوں کی لمبی قطار کرسیوں پر بیٹھی ہے جن میں کچھ خان بہادر اور رائے بہادر قسم کی چیزیں بھی تھیں۔ ایم بی احمد چپڑاسی کو اپنا کارڈ دے کر قطار کی آخری خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کہ باری پر بلائے جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد چپڑاسی نے دروازے کی چک اٹھائی کمشنر صاحب بہادر نمودار ہوئے۔ اور ایم بی احمد سے ہاتھ ملا کر انہیں کمرے میں لے گئے۔ سامنے بٹھا کر خوب مرمت کی کہ تم کیسے I.C.S ہو تمہیں چاہیے تھا کہ ملاقاتیوں کو نظر انداز کر کے چک اٹھا کر اندر آجاتے اور تعارف کراتے۔ تم انہی

لوگوں کے درمیان آ کر بیٹھ گئے جن پر تم نے حکومت کرنی ہے۔ اس تنبیہہ کے بعد میم صاحبہ کو بلوایا' تینوں نے کافی پی اور پھر نئے I.C.S افسر کو کمشنر اور لیڈی کمشنر باہر گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ یہ تھی وہ سول سروس اور یہ تھا وہ عذاب جس میں قدرت اللہ شہاب نے اپنے آپ کو خود مبتلا کیا۔ چوں کہ خود کردہ را علاجے نیست اس لیے وہ سعی پیہم اور کوشش بسیار کے باوجود اس عذاب سے نجات نہ پا سکے اور ساٹھ سال کی طبعی عمر کو پہنچ کر ہی رہائی نصیب ہوئی۔

قدرت اور خالد

قدرت اللہ شہاب سے میرا تعارف اکتوبر ۱۹۵۴ء کی اس صبح کو ہوا جب وہ کراچی میں گورنر جنرل غلام محمد کے سیکرٹری کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ عہدے کے اعتبار سے گورنر جنرل کے پرسنل سٹاف میں وہ سب سے سینئر افسر تھے اور میں پی۔ اے ٹو گورنر جنرل' پرسنل سٹاف میں سب سے جونیئر۔ وہ گورنر جنرل سیکرٹریٹ کے سربراہ بھی تھے اور اس طرح ہم دونوں میں افسر و ماتحت کا رشتہ بھی تھا جو وقت کے ساتھ سرکاری حدود پھلانگ کر دوستی کی شکل اختیار کر گیا اور ۳۲ برس تک قائم رہا' حتیٰ کہ شہاب صاحب دنیاوی رشتے ناطے توڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔

شہاب صاحب چھ برس تک گورنر جنرل اور بعد ازاں صدر پاکستان کے سیکرٹری رہے۔ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں ایوان صدر کو خیرباد کہا اور ۱۹۶۸ء میں ان کی جلاوطنی کے دوران بھی ہماری خط و کتابت رہی اور ایک مرتبہ ملاقات بھی ہوئی۔ وطن واپس تشریف لانے کے بعد وہ وزارت تعلیم سے منسلک تھے کہ ۱۹۷۵ء میں میری پوسٹنگ بھی وہیں ہو گئی اور ایک بار پھر مجھے ان کی قربت میں کام کرنے کی سعادت نصیب

ہوئی۔

سیّد شبیر شاہ

جب میں ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی آیا تو یہ شہر چھوٹا سا قصبہ تھا' یہاں صرف چند ایک جانی پہچانی شخصیتیں تھیں۔ ان شخصیتوں میں ایک شخصیت ایسی تھی جو ہر آنے والے کی توجہ جذب کر لیتی تھی۔ انہیں لوگ شاہ صاحب کہتے تھے۔

شاہ صاحب کا انداز گفتگو اس قدر پر زور اور بے باک تھا کہ ایسے لگتا تھا جیسے وہ شہر کے گورنر لگے ہوئے ہیں ان کا لب و لہجہ پنجابی جاٹ کا تھا۔ طور طریقے سے درویش نظر آتے تھے۔ اس حد تک عمل کے قائل اور منہ زبانی کے خلاف تھے کہ لگتا تھا جیسے فوجی ہوں۔ ڈسپلن کے بڑے قائل تھے۔ پروفیشن کے لحاظ سے صحافی تھے' دبانگ قسم کے صحافی۔ کسی کو معاف نہیں کرتے تھے' چوک میں کھڑے ہو کر بڑوں پر نقطہ چینی کیا کرتے تھے اور ان سب اوصاف کے باوجود غریبوں کے بڑے ہمدرد تھے' منہ زبانی نہیں عملی ہمدردی۔

راولپنڈی کے دانشور شاہ صاحب سے بہت متاثر تھے۔

کچھ دیر کے بعد پتہ چلا کہ شاہ صاحب بنیادی طور پر خاکسار ہیں اور علامہ مشرقی کے پروانے ہیں۔ ان کا نام شبیر شاہ تھا مگر ہم انہیں کالا شاہ کہا کرتے تھے۔

ایک روز وہ ہمارے دفتر میں آ گئے یہ دفتر کشمیر پبلسٹی کا ڈائرکٹوریٹ تھا۔ وقفے کا وقت تھا۔ ہم سب ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

آتے ہی بولے' کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ روٹین فائلیں چلانے سے تم مقبوضہ کشمیر کو آزادی دلا دو گے۔ بھائی میرے اس کام کے لیے عمل کی ضرورت ہے۔ کرسیوں پر بیٹھ رہنے سے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔

کچھ دیر تک وہ ہم سب کو ڈانٹتے رہے پھر ہنسنے لگے' بولے' مشکل یہ ہے کہ ہم برائے نام مسلمان ہیں .... میں بھی منہ زبانی مسلمان ہوں اور جب تک ہم سچے مسلمان نہیں بنیں گے پاکستان کی مشکلات حل نہیں ہوں گی۔ خالی نمازیں پڑھنے سے ہم مسلمان نہیں بن سکتے۔ ہمیں اسلامی کردار پیدا کرنا ہو گا۔ اسلام عمل کا نام ہے' پیہم عمل' جہاد۔

میری ہم کار دوست مس ربیعہ فخری نے میرے کان میں کہا شاہ صاحب خاکسار ہیں۔

خاکسار

معاً مجھے وہ دن یاد آگیا جب میں نے پہلی مرتبہ خاکسار کو دیکھا تھا۔

تقسیم سے پہلے ان دنوں میں باغبان پورہ گورنمنٹ ہائی سکول میں ٹیچر تھا۔ ہم مصری شاہ میں ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ میری بیوی بیمار تھی۔ ہمارا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ برادری والے میرے دشمن ہو رہے تھے۔ میرے قریبی رشتے دار خلاف تھے' مجھ سے ملتے نہ تھے اس لیے کہ میں نے محلے والوں کی مرضی کے خلاف محلّے کی ایک خاتون سے شادی کر لی تھی مجھ پر اغوا کا مقدمہ چل رہا تھا۔

ان دنوں ہم انڈر گراونڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ ہم کہاں رہتے ہیں۔

ایک روز جب میں سکول سے واپس آیا تو دیکھا کہ خاکی کپڑوں میں ملبوس ایک شخص ہماری سیڑھیوں میں کھڑا ہے۔ میں اسے دیکھ کر ڈر گیا۔ شاید کچہری کا پیادہ ہو۔ یا شاید خفیہ پولیس کا آدمی ہو۔

مجھے دیکھ کر اس نے زبردست سلوٹ مارا۔ اس پر مجھے تسلی سی ہو گئی۔ خفیہ پولیس کا ہوتا تو مونچھ مروڑتا۔ سلوٹ نہ مارتا۔

آپ کس سے ملیں گے' میں نے پوچھا۔

میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں' وہ بولا۔

کیسی ڈیوٹی۔

ہمیں پتہ ہے کہ آپ یہاں اکیلے ہیں اور آپ کی گھر والی بیمار ہیں۔ اس لیے یہاں میری ڈیوٹی لگا دی گئی ہے کہ جب آپ دفتر جائیں تو میں یہاں موجود رہوں۔ اگر بی بی جی کو کوئی ضرورت ہو تو اسے پورا کروں۔ ڈاکٹر کو بلا لاؤں یا ہسپتال لے جاؤں۔

اس کی بات سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

میری تسلی کے لیے وہ بولا' جناب میں خاکسار ہوں۔ مصری شاہ میں ہمارا دفتر ہے آپ کو کسی قسم کی ضرورت ہو تو دفتر جا کر رپورٹ کر دیں۔

ایک مہینہ خاکسار ہمارے گھر پر ڈیوٹی دیتے رہے' پھر مجھے علم ہوا خاکسار ایک تحریک ہے جو علامہ مشرقی نے چلائی ہے۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی کہ ایک اعلیٰ پائے کا حسابی اور خدمت خلق کی تحریک۔

میں نے علامہ کی تصنیف تذکرہ بڑی مشکل سے حاصل کیا' لیکن بار بار پڑھنے کے باوجود میں ان کی دقیق زبان کو سمجھ نہ سکا۔ بہر حال میرے دل میں خاکسار کی عزت پیدا ہو گئی۔

پھر ۱۹۵۵ء میں پہلی مرتبہ میں بھائی خواجہ جان محمد بٹ سے ملا تو انہوں نے برسبیل تذکرہ کہا' بھئی میں تو خاکسار ہوں۔ تحریک ختم ہو چکی ہے' لیکن خاکسار سپرٹ جوں کی توں قائم ہے۔

جن

یوں شبیر شاہ کی میرے دل میں عزت پیدا ہو گئی۔ شاہ جی دوسرے خاکساروں سے مختلف تھے۔ وہ خالی عمل اور خدمت نہیں تھے' ساتھ دانشور بھی تھے اور اس قدر "دوکل" تھے کہ تنبیہہ کا سوٹا ہاتھ میں لیے پھرتے۔

ان کے خلوص اور سچائی کے سب قائل تھے۔ ان دنوں راولپنڈی میں سیروز سینما کے قریب ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا' اس جس کا نام ودگی تھا۔ ادیب لوگ اکثر ودگی میں آ بیٹھتے' چائے پیتے اور ادب پر بحثیں کرتے۔ ودگی میں ادیبوں کو ادھار پر چائے اور کھانا مل جاتا تھا۔

کبھی کبھی شاہ صاحب ودگی میں آ جاتے اور پھر وہاں ان کی پاٹ دار آواز گونجتی۔

یہ تم کیسا ادب تخلیق کر رہے ہو جو لوگوں کو سلاتا ہے' جگاتا نہیں۔ کچھ ایسی تخلیقات کرو جو انسان کو عمل پر ابھاریں۔ اٹھو' وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی۔

پنڈی کے بیشتر ادیب شاہ کے مداح تھے' منہ زبانی مداح۔ ان پر شاہ کے پیغام کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ صرف ان کی شخصیت سے متاثر تھے۔ شاہ کی شخصیت راولپنڈی کے ادیبوں' دانش وروں اور اہل کاروں پر چھائی ہوئی تھی۔

انہی دنوں شاہ صاحب نے پنڈی سے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار شائع کرنا شروع کیا جس کا نام پکٹوریل تھا۔ اس کام میں میں نے بھی شاہ صاحب کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس دوران میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ شاہ صاحب کام کے حوالے سے انسان نہیں بلکہ جن

ہیں۔ انہیں صبح شام دن رات کام کرتے دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے جان لیا کہ ہم دوست نہیں بن سکتے کیوں کہ ہم میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ البتہ میرے دل میں ہمیشہ کے لیے شبیر شاہ کی عزت قائم ہو گئی۔

دو سال کراچی میں رہنے کے بعد جب میں واپس پنڈی آیا تو دارالخلافہ کراچی سے پنڈی منتقل ہونے کی وجہ سے شاہ صاحب کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئے تھے۔

اس مصروفیت کے متعلق شبیر شاہ اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں۔

> تو یہ تھی مطمئن' کشادہ' صحت افزا اور مسائل سے آزاد راولپنڈی جو صدر ایوب کے یہاں پر منتقل ہونے کے بعد ہم سے چھینی جا رہی تھی اور دیا کیا جا رہا تھا؟ انتظامیہ' مقننہ اور عدلیہ کی مرکزیت' اقتصادی اور ثقافتی ترقی کے نئے امکانات' کمتری اور پس ماندگی کے احساس سے نجات اور مساویانہ حیثیت کا یقین۔ یہ مساویانہ حیثیت کا احساس ہی تھا جس کا امتحان راولپنڈی میں پہلے سے مقیم اخبار نویسوں کو ایک فوری ٹکراؤ کی شکل میں در پیش ہوا۔
>
> صدر ایوب کے راولپنڈی منتقل ہونے سے پہلے کراچی کے کئی اخبار نویس یہاں آ چکے تھے تاکہ نئے دارالحکومت میں اپنی ذمے داریاں نبھانا شروع کر دیں۔ وہ آ تو گئے مگر ان کا رویہ ہمارے ساتھ ایک قابض فوج کی طرح تھا۔ ان کی نگاہوں میں ہم ایک ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے صحافی ہونے کی وجہ سے گاڑی بانوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے' اس لیے ہمیں ان "مہذب" اور "مقتدر" لوگوں کی ہمہ گیر بالا دستی کو قبول کرنا پڑا۔ اس میں وہ اکیلے نہیں تھے' وزارت اطلاعات اور پریس انفارمیشن کا تمام عملہ پرنسپل انفارمیشن آفیسر مسٹر ڈکلس کی قیادت میں کراچی سے آنے والے اخبار نویسوں کا ہمنوا تھا۔ انہوں نے ایک مسئلے پر فوراً" طاقت آزمائی کا فیصلہ کر لیا' وہ مسئلہ تھا پریس کلب کا۔

ایک صحافی کی حیثیت سے شاہ صاحب صدر ایوب اور قدرت اللہ شہاب سے ملتے رہتے

تھے۔ اپنی خودنوشت میں شبیر شاہ لکھتے ہیں۔

میں صدر ایوب کو فوج کے سربراہ کی حیثیت سے تو کچھ کچھ جانتا تھا' سربراہ حکومت کی حیثیت سے اس وقت جاننے کا موقع ملا جب انہوں نے راولپنڈی کو ملک کا صدر مقام بنایا۔ وہ یہاں آئے تو ان کے ساتھ قدرت اللہ شہاب بھی بطور پرنسپل سیکرٹری اسی طرح منسلک تھے جیسے وہ کئی سال تک غلام محمد اور سکندر مرزا کے ساتھ تھے۔

شہاب صاحب سے میری پہلے کوئی واقفیت نہ تھی' مگر جلد ہی انہوں نے مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا' یا یوں کہیے کہ میرے لیے اپنے دفتر کے دروازے واکر دیئے۔ ہو سکتا ہے یہ نوائے وقت' کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہدایت اختر کی وجہ سے ہو' جو صحافت میں اس وقت میرے قریب ترین ساتھی اور شہاب صاحب کے ہم وطن تھے (دونوں کا جموں سے تعلق تھا) یا ممتاز مفتی کے شہاب کے عملے میں شامل ہونے کی وجہ سے ہو جن کے ساتھ شہاب صاحب کا ذہنی اور عجیب و غریب قسم کا روحانی رشتہ تھا۔ اس رشتے کی نوعیت کو تو میں نے کبھی سمجھنے کوشش نہ کی' تاہم شہاب صاحب سے کچھ اس طرح کی قربت ہو گئی کہ انہوں نے اپنے قیام کے دوران صدر ایوب کے اندرون ملک کم و بیش ہر دورے میں مجھے ساتھ رکھا۔

پیر فقیر

شاہ صاحب کو پیروں فقیروں سے سخت نفرت تھی۔ وہ مقبروں' گدیوں اور پیر خانوں کے سخت خلاف تھے۔ اتفاق سے ایک دن شاہ صاحب نے شہاب' بھائی جان اور مجھے سائیں اللہ بخش کے مزار پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ اس پر وہ طیش میں آ گئے۔ مجھے سخت جھاڑ جھپاڑ کی۔ کہنے لگے' آپ کا دوست شہاب ایک قابل آدمی ہے' مسلمان آدمی ہے' صاحب کردار شخصیت ہے' یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔

کیا کر رہا ہوں' میں نے پوچھا۔

بولے' آپ اسے گمراہ کر رہے ہیں۔

اچھا' میں نے جواب دیا' شاہ جی میں تو سمجھتا ہوں کہ شہاب مجھے گمراہ کر رہا ہے۔

نہیں نہیں مذاق کی بات نہیں' وہ بولے' میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔ آپ اسے درگاہوں پر لے جاتے ہیں۔ عرس پر لے جاتے ہیں۔ پیروں فقیروں کی منڈلیوں میں لے جاتے ہیں۔ یہ سب جگہیں افیون اور بھنگ خانے ہیں۔ آپ ایسا کرنے سے باز آجائیں آپ کا یہ رویہ ملک کے مفاد کے منافی ہے۔

اپنی خودنوشت میں وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:۔

شہاب صاحب بیوروکریٹ نوع سے تعلق رکھتے تھے' مگر بیورو کریسی کے خواص سے عاری معلوم ہوتے تھے۔ دانشور بھی سمجھے جاتے تھے مگر ان کی اکثر حرکتوں سے معروف قسم کی دانش اور منطق کی کوئی بو نہیں آتی تھی۔ مثلاً" وہ مفتی' غلام دین دانی اور کئی ایک دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کئی گمنام افراد کی قبروں پر جاتے اور بڑے انہماک سے بھنڈارا کھاتے۔

اس کے باوجود ان میں ایک کشش تھی' اور مجھے ان کے پاس جانے میں خوشی محسوس ہوتی۔ خبروں کے لیے نہیں 'صحبت کے لیے' بحث و تمحیص کے لیے 'جس میں میرا ذوق و شوق تو کافی نمایاں ہوتا' مگر وہ اسے یونہی لیتے اور کم گوئی کا چولا اوڑھے مختصر جملہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ان کی یہ کمی مفتی اور دانی پوری کرتے۔

قد میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے صدر ایوب جیسے چھ فٹ' بارعب اور خوبرو سربراہ مملکت کی معیت میں کچھ بے تعلق معلوم ہوتے' تاہم شہاب صاحب میں ایک غیر محسوس رعنائی تھی۔ ان کے مزاج کی سادگی' لباس' صحبت اور گفتگو میں پروٹوکول قسم کے ہر حجاب کا عدم وجود اور اس بناء پر میری دعوت کو بھی بلا جھجک قبول کر لینا' ان کے اطوار اور

کلام کی پاکیزگی' ان کا صدر ایوب کے لیے چپکے سے "بادشاہ" کا لفظ استعمال کر دینا اور اگلے ہی لمحے اس کے برعکس فقرہ گھسیٹر دینا' ان سب نے ان کو ایک منفرد حیثیت دے رکھی تھی۔ اس کے باوجود وہ شخص اندر سے بڑا پختہ تھا اور جب فیصلہ کرنے پر آتا تو کسی کی پروانہ کرتا۔ شہاب صاحب نے جس استقلال سے مجھے صدر ایوب کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کیا' وہ ان کے اپنے انداز کے مطابق تھا' میرا اس میں بہت کم دخل تھا' تاہم اس سے میرے اپنے پہلے سے قائم شدہ فلسفۂ حیاتِ میں پختگی پیدا ہوئی۔

شاہ صاحب شہاب کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے۔ کہتے تھے۔ اس شخص پر امید رکھی جا سکتی ہے کہ یہ کچھ کر کے دکھائے گا۔ یہ ایک سچا مسلمان آدمی ہے۔

شاہ صاحب بار بار شہاب سے ملا کرتے' ان سے کھل کر باتیں کرتے۔ اپنی تجاویز پیش کرتے' شہاب بڑی توجہ سے شاہ کی باتیں سنا کرتا تھا اور ان کی اکثر باتوں میں ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔

ایک دن شاہ نے کہا' مفتی یوں مزا نہیں آتا۔ تو کسی دن شہاب کو میرے گھر لے آ۔ اکٹھے کھانا کھائیں گے اور دل کھول کر باتیں کریں گے۔ کیا وہ میرے گھر آ جائیں گے' اس نے پوچھا۔ پتہ نہیں' میں نے جواب دیا' لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں شہاب کے دل میں آپ کے لیے بڑی عزت ہے۔

ہاں مفتی' شاہ نے کہا' کئی ایک بار انہوں نے میری مدد کی ہے۔ بن کہے مدد کی ہے۔ اس حوالے سے شاہ صاحب اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:۔

نئے آئین کے نفاذ کے کوئی دو تین ماہ بعد ہم چند اخبار نویس صدر ایوب کے ساتھ کئی مقامات سے ہوتے ہوئے کوئٹہ گئے اور واپسی پر انہی کے ساتھ ایک دو دن کے لیے کراچی ٹھہر گئے۔ میں میٹروپول ہوٹل میں اپنے کمرے سے باہر نکلا تو چوہدری ظہور الٰہی مل گئے۔ کہنے لگے "آپ

سے کچھ باتیں کرنی ہیں' کل انشاء اللہ!" شام کو شہاب صاحب کی خواہش کے مطابق میں اور ہدایت اختر فاروق ریسٹورنٹ میں کھانے پر اکٹھے ہوئے تو شہاب صاحب نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہا: "شاہ جی' پروگریسو پیپر لمیٹڈ کو چوہدری ظہور الٰہی کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے مجھ سے پاکستان ٹائمز راولپنڈی کے لیے چیف رپورٹر کے بارے میں پوچھا تھا' میں نے آپ کا نام دیا ہے۔ اگر وہ پیش کش کریں تو انکار نہ کرنا"۔ دوسرے دن یہی بات چوہدری صاحب نے کہی اور معاملہ طے ہو گیا۔ چند ہفتوں کے بعد چودھری محمد حسین نے اپنے تمام حصص چودھری ظہور الٰہی کے ہاتھ بیچ دیئے اور میں نے یکم نومبر ۱۹۶۲ء کو پاکستان ٹائمز سے پانچ سال الگ رہنے کے بعد' پھر سے اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔

جذبہ میں شدت

شہاب نے شاہ صاحب کی دعوت کو منظور کر لیا اور ہم دونوں شاہ صاحب کے گھر چلے گئے' اس روز شبیر صاحب بہت موڈ میں تھے۔ تین گھنٹے وہ شہاب کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ اپنی تمام تجاویز کا تھیلا شہاب کے سامنے دھر دیا۔ شہاب بڑے انہماک اور توجہ سے سنتا رہا۔ اگلے روز میں نے شہاب سے پوچھا میں نے کہا' شاہ کیسا آدمی ہے۔

شہاب مسکرایا۔

میں نے کہا' تالیے نہیں' ٹھیک سے بتایئے کہ شاہ کیسا آدمی ہے۔ شہاب نے مسکرا کر کہا۔ مسلمان آدمی ہے۔ سلف لس ہے۔ مخلص ہے مگر اوور انتھیوزی ا۔سٹک ہے۔

مطلب یہ کہ جذبہ والا ہے' میں نے پوچھا۔

نہیں' وہ بولا۔ ان کے جذبے میں شدت ہے۔

یہ تو ایک خوبی ہے' میں نے جواب دیا۔

شہاب نے سر نفی میں ہلا دیا۔

میں نے کہا' شہاب صاحب میں ساری زندگی اس کی خوبی سمجھتا رہا ہوں اور اس بات پر مجھے فخر ہے کہ میرے جذبے میں شدت ہے۔

شہاب نے پھر سر نفی میں ہلا دیا۔ بولے حضور اعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر جذبہ میں شدت ہو تو توازن پیدا نہیں ہوتا اور اسلام کے نزدیک توازن ایک ضروری کیفیت ہے۔

شہاب کی یہ بات سن کر میں لاجواب ہو گیا' لیکن میں نے دل سے یہ بات تسلیم نہ کی اور نہ ہی شاہ کو بتائی۔ کیسے تسلیم کرتا۔ میرے کردار کا بنیادی عنصر شدت تھا۔ تسلیم کر لیتا تو میرے یقین کی دنیا دھڑام سے ملبے کا ڈھیر بن جاتی۔

آخری دنوں میں جب شہاب ہالینڈ جا رہے تھے' شاہ صاحب مجھے ملے۔ کہنے لگے' مفتی مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔

کیا بات ہے' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے' یہ تمہارا دوست مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔

کون سا دوست' میں نے پوچھا۔

شہاب صاحب کی بات کر رہا ہوں۔

وہ میرا دوست نہیں ہے' میں نے کہا۔

شاہ صاحب چونکے' کیا مطلب۔

جس طرح آپ میرے دوست نہیں ہیں' میں نے کہا' حالاں کہ تیرہ سال سے ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ ہے۔

شاہ صاحب پھر چونکے۔

میں آپ کی عزت کرتا ہوں' لیکن ہم دونوں کے درمیان احترام کی ایک دیوار حائل ہے۔ ایسی ہی احترام کی دیوار شہاب اور میرے درمیان حائل ہے۔ اس سے بھی بڑی' اس سے بھی اونچی۔ میں اس کا مداح ہوں۔ وہ باکردار آدمی ہے لیکن ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

شاہ بولے' بے شک وہ صاحب کردار ہے۔ نیک ہے' مسلمان ہے۔ بات کو سمجھتا ہے۔

ہمدرد ہے' ہر بات توجہ سے سنتا ہے' مانتا ہے' لیکن عمل میں نہیں لاتا۔ کیوں اگر وہ میرے مشورے پر چلتا تو آج یہ نہ ہوتا۔

کیا نہ ہوتا' میں نے پوچھا۔

اسے یوں صدر ایوب سے کاٹ نہ دیا جاتا۔ اسے علم تھا کہ یہ ہو گا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کیا۔ عجیب پر اسرار آدمی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شاہ صاحب' میں نے جواب دیا' وہ میری سمجھ میں بھی نہیں آیا' مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ اللہ کا 007 ہو۔

شہاب لے بیٹھے

میرے تمام دوستوں کو مجھ سے شکایت تھی۔

یار مفتی تجھے کیا ہو گیا ہے' عمر پوچھتا۔

اسے قدرت اللہ شہاب ہو گیا ہے' اعظمی جواب دیتا۔

تم دونوں احمق ہو' مسعود قریشی کہتا' بھئی کس سے گلہ کر رہے ہو۔ یہ شخص وہ مفتی نہیں ہے جو ہمارا یار ہوا کرتا تھا۔

شہاب ہالینڈ چلا جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا' عماد تسلی دیتا۔

اونہوں' مسعود سر نفی میں ہلا کر کہتا' خوش فہمی میں نہ رہو۔ آلنے سے گرا بوٹ پھر آلنے میں نہیں بیٹھتا۔

لیکن یار' عمر کہتا' شہاب تو بڑا پیارا آدمی ہے۔

بہت پیارا' عماد لقمہ دیتا۔

ارے پیارے ہی گڈے گوڈوں میں بیٹھتے ہیں' اعظمی چلاتا وہ بڑا پیارا آدمی ہے' بڑا نیک آدمی ہے۔ بارہ دری کی طرح سب دروازے کھلے ہیں' لیکن کسی کو اندر آنے نہیں دیتا' مسعود کہتا۔

یہ مفتی تو اندر بیٹھا ہے' عمر چلاتا۔

نہیں بھائیو' میں جواب دیتا' میں بھی تمہاری طرح باہر کھڑا ہوں یقین جانو۔

چاہے اندر ہو یا باہر' مسعود کہتا' لیکن یہ سچ ہے کہ:۔

ہمارا یار تھا رنگین و خوش نوا مفتی
مگر اسے بھی جناب شہاب نے لے بیٹھے

اڑتیسواں باب

تبادلہ

ڈھائی سال میں شہاب کے او ایس ڈی کی حیثیت سے صدر گھر میں رہا۔

پھر شہاب کو انفرمیشن سیکرٹری بنا دیا گیا اور میں اس کے ساتھ وزارت اطلاعات میں چلا گیا۔

۱۹۶۳ء میں شہاب کو ہالینڈ کا سفیر بنا کر ہیگ بھیج دیا گیا۔ صدر گھر میں میری کوئی دفتری حیثیت نہ تھی۔ میں قدرت اللہ شہاب سے منسلک رہا' ان کے دفتر سے نہیں۔ مجھے برائے نام قسم کے کام سونپے جاتے تھے۔

دفتر کے افسر مجھے بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔

انہیں اس بات پر غصہ آتا تھا کہ یہ کون ہے جسے سیکرٹری اتنی اہمیت دیتا ہے۔ جسے دفتر میں کوئی الگ کمرہ نہیں دیا گیا۔ کوئی خصوصی کام نہیں دیا گیا' لیکن جسے ہر وقت سیکرٹری اپنے پاس بٹھائے رکھتا ہے اور ہر بات میں اس کے مشورے کو اہمیت دیتا ہے۔

ان کا یہ غصہ بڑی حد تک جائز تھا۔ چونکہ میرا کوئی سٹیٹس نہ تھا۔

قدرت اللہ نے میرے لیے ایک خصوصی پوسٹ منظور کروائی تھی۔ یہ پوسٹ ایک فالتو پوسٹ تھی جس کی صدر گھر میں چنداں ضرورت نہ تھی۔

قدرت اللہ کا رویہ میرے متعلق معذرت خواہ نہ تھا۔

طبعی طور پر میرے ذہن میں سیاست کا خانہ سرے سے خالی ہے۔ مجھے سیاسی امور میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

مجھے شعور ہی نہ تھا کہ گرد و پیش میں سیاسی سطح پر کیا ہو رہا ہے۔ دفتری سیاست کے بارے میں مجھے صرف ایک بات کا علم تھا کہ صدر کا ملٹری سیکرٹری ہر بات میں شہاب کی اعلانیہ مخالفت کرتا تھا۔

صدر گھر میں ملازمت کے دوران میں کبھی صدر ایوب سے نہیں ملا تھا۔ کبھی سلام کرنے کے لیے بھی حاضری نہ دی تھی۔

ایک روز پتہ نہیں کس تقریب پر صدر گھر کے تمام ملازم صدر ایوب کو مبارک باد دینے گئے تھے۔ قدرت اللہ نے مجھ سے کہا آپ بھی صدر صاحب کو مبارک باد دے آئیں۔ میں نے کہا' میرا صدر صاحب سے کیا واسطہ میں تو آپ کا او ایس ڈی ہوں۔ ہاں آپ مبارک باد دینے جائیں تو ساتھ میری طرف سے بھی دے دیں۔

شہاب نے کہا' عالی صاحب بھی تو صدر کے او ایس ڈی ہیں ۔ وہ جب بھی مجھ سے ملنے آتے ہیں تو پہلے صدر صاحب کو جا کر سلام کرتے ہیں۔

میں نے کہا' شہاب صاحب عالی بڑا آدمی ہے۔ نواب ہے وہ رکھ رکھاؤ کے آداب جانتا ہے۔ میں تو ایک چھوٹا آدمی ہوں' احساس کمتری کا مارا ہوا۔ آپ نے تو خواہ مخواہ مجھے صدر گھر کے پنجرے میں ڈال دیا ہے۔ ہنس راجوں میں کوا ہوں' ویسے شہاب صاحب ایک بات کہوں۔

کہیے' شہاب مسکرایا۔

میں نے کہا' کسی وقت مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ آپ بھی ہنس راجوں میں کوا ہیں۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا' کہنے لگا مجھے بھی کبھی کبھی ایسے ہی محسوس ہوتا ہے۔

پیشی

ان ڈھائی سال کے دوران صرف ایک بار میری صدر ایوب کے سامنے پیشی ہوئی تھی۔ ایک چارج شیٹڈ ملزم کی حیثیت سے۔

ہوا یوں کہ شہاب کو صدر صاحب نے کسی کام سے کراچی بھیجا ہوا تھا۔ اس کی غیر حاضری

میں صدر صاحب کے لیے اردو میں ایک تقریر لکھنی پڑ گئی۔ ملٹری سیکرٹری نے میرے نام حکم جاری کیا کہ او ایس ڈی دو گھنٹے کے اندر اندر تقریر لکھ کر اپ ڈول کے لیے مجھے پیش کرے میں نے تقریر لکھ کر بھجوا دی۔

ملٹری سیکرٹری کے کمرے سے ایک شور و غوغا بلند ہوا۔ سارے دفتر والے سہم گئے پھر صدر گھر کا چپڑاسی دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا' کہنے لگا آپ و بلا رہے ہیں۔ سخت غصے میں ہیں۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی جھڑکیوں کی ایک بوچھاڑ پڑی۔ پھر بولے' آپ اتنے بد تمیز ہیں کہ صدر کی خدمت میں پنسل سے لکھا ہوا مسودہ بھیجتے ہیں۔

میں نے کہا' جناب میں سکرپٹ رائٹر ہوں اور سکرپٹ رائیٹر ہمیشہ پنسل میں لکھتا ہے۔

اس پر ایک اور بوچھاڑ پڑی۔

بولے اور تمہاری اردو کیسی ہے۔ اس میں زبان کی چاشنی ہی نہیں۔

میں نے کہا' جناب عالی ہم سکرپٹ رائٹر چاشنی والی اردو نہیں لکھتے۔

غصہ بھری ایک اور بوچھاڑ پڑی چھوٹی میز لڑ کھڑاتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

پتہ نہیں ملٹری سیکرٹری نے کیا کچھ لکھ کر اسے صدر صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔

صدر ایوب نے میری طلبی کر لی۔

میں پیدائشی طور پر ایک ڈرپوک آدمی ہوں۔ چھوٹی سی بات واقعہ ہو جائے تو ڈر سے جان نکل جاتی ہے' لیکن اللہ نے مجھ ایسے ڈرپوکوں کے تحفظ کے لیے ایک قانون بنا رکھا ہے کہ خطرہ حد سے گزر جائے تو خوف معدوم ہو جاتا ہے میں نے زندگی میں جتنے بھی جرات کے کارنامے کیے ہیں وہ اسی اصول کے مرہون منت ہیں۔

جب میں صدر ایوب کی خدمت میں حاضر ہوا تو خوف معدوم ہو چکا تھا اور میں ان کے روبرو یوں کھڑا تھا جیسے ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے استادہ ہو۔

یہ پہلا دن تھا جب میں نے صدر ایوب کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا' اتنا مردانہ حسن' اتنی بارعب شخصیت۔

انہوں نے میرا سکرپٹ ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ کہنے لگے' آپ شہاب صاحب کے او ایس ڈی ہیں۔

میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

کہنے لگے' یہ سکرپٹ آپ نے لکھا ہے۔

جی ہاں۔

آپ نے اسے پنسل میں کیوں لکھا ہے' انہوں نے پوچھا۔

آپ کی آسانی کے لیے' میں نے جواب دیا۔

میری آسانی کے لیے' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

جناب میں سکرپٹ رائٹر ہوں۔ ہم تقریریں کچی پنسل سے لکھتے ہیں تاکہ جو ردو بدل آپ کرنا چاہیں اسے ربڑ کی مدد سے مٹا کر نئی عبارت لکھ دی جا سکے اس طرح سکرپٹ تبدیلیوں کے باوجود فیئر رہتا ہے۔ صاف ستھرا رہتا ہے آپ کو پڑھنے میں تکلیف نہیں ہوتی۔

وہ مسکرائے' بولے' معقول بات ہے۔

میں نے کہا' جناب اتنا وقت نہیں ہوتا کہ تقریر کو دوبارہ لکھا جائے گا۔

ٹھیک ہے' وہ بولے۔

کچھ وقفے کے بعد کہنے لگے' مجھے تو اردو کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ لیکن اس سکرپٹ پر یہ بھی اعتراض ہے کہ زبان میں چاشنی نہیں ہے۔

میں نے کہا' جناب اگر میں چاشنی والی زبان لکھوں تو آپ کے لیے پڑھنا مشکل ہو جائے گا۔ آپ غلطیاں کریں گے۔ مجھ پر لازم ہے کہ بول چال والی زبان لکھوں۔

ایوب صاحب ہنسنے لگے۔ بولے' آپ ٹھیک کہتے ہیں......... آپ کو اجازت ہے کہ پنسل میں سکرپٹ لکھیں۔

میں نے سلام کیا اور باہر نکل آیا۔

صدر صاحب کی خدمت میں میری اس پیشی کی تفصیلات جب ملٹری سیکرٹری تک پہنچیں تو ان کے کمرے سے میز پر مکے مارنے' چیزوں کو ٹھڈے مارنے اور اسی نوعیت کی دوسری آوازیں آنے لگیں۔

یہ کھسیانے غصے کی آوازیں تھیں۔

شہاب کے دفتر کے لوگ مونچھ پر تاؤ دے رہے تھے۔ دو ایک صاحب میرے پاس بھی آئے اور تحسین بھری نظروں سے مجھ دیکھنے لگے۔

شہاب دورے سے واپس آیا تو دفتر والوں نے بڑے فخر سے یہ بات اسے سنائی۔

شہاب نے مجھ سے پوچھا' آپ کی طلبی ہوئی تھی کیا؟

میں نے کہا' جی ہوئی تھی۔

پھر کیا بات ہوئی۔

میں نے کہا' صدر صاحب نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ بے شک پنسل میں تقریر لکھا کرو۔

شہاب ہنسنے لگا' بولا آپ تو نمبر لے گے۔ مجھے تو تقریریں سیاہی میں لکھنی پڑتی ہیں۔

میں نے کہا آپ سکرپٹ رائٹر نہیں ہیں۔ آپ تو اردو دان ہیں۔

اچھا تو آپ نے صدر صاحب کے پاس میری شکایت کی۔ بالکل کی' میں نے کہا' یہاں سبھی ایسا کرتے ہیں۔ اندر ہی اندر یہاں بڑے افسر آپ کو صدر ایوب سے کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں میرے منہ کو بھی خون لگ گیا ہے آئندہ سے مجھ سے محتاط رہیں۔

کہنے کو تو میں نے یہ بات ہنسی میں کہہ دی مگر سچی تھی۔ دفتر میں شہاب کی نیک نامی کے تذکرے تھے۔ بیوروکریٹس سے شہاب کے تعلقات بظاہر نہایت اچھے تھے' لیکن اندر سے سب کھلتے تھے۔ صدر ایوب شہاب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تو صدر ایوب نے کہہ دیا تھا۔شوہاب تم میری ہڈیوں میں رچ بس گئے ہو۔ تمہیں اندر سے نکالنا بہت مشکل ہے۔ شاید میں کبھی کامیاب نہ ہو سکوں۔

صدر ایوب

صدر ایوب بڑے معقول آدمی تھے۔ دوسرے کی بات بڑے غور سے سنتے۔ عقل و دلیل کے قائل تھے۔ دل میں کسی قسم کا تعصب نہ تھا۔ ان کی سوچ سیکلر تھی۔ اسلام کے لیے دل میں کوئی خاص جذبہ نہ تھا۔

شہاب مسلسل اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ صدر ایوب کی توجہ اسلام کی طرف مبذول کرائے۔

صدر ایوب کی والدہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ جب بھی ایوب گھر سے رخصت ہونے لگتے تو وہ انہیں روک لیتیں۔ کہتیں ذرا ٹھہرو۔ پھر قرآن کریم اٹھا کر لے آتیں اور بیٹے سے کہتیں میں قرآن کریم اٹھاتی ہوں تو اس کے نیچے سے گزرو۔ دیکھ بڑے ادب سے سر جھکا کر گزرنا۔

ایک دفعہ وہ بیمار پڑیں اور شہاب عیادت کو گیا تو شہاب سے کہنے لگیں، میری وفات کے بعد ایوب کو پیغام دینا اسے کہنا کہ زندگی بھر جو میں تیرے لیے کرتی رہی ہوں وہ اب تجھے خود کرنا ہو گا۔

صدر ایوب اپنی والدہ کی بڑی عزت کرتے تھے لیکن ان کی ایسی باتوں کا اثر نہ لیتے تھے۔
شہاب کی کوشش تھی کہ آہستہ آہستہ ایوب کو اسلامی نقطہ نظر کی جانب لے آئے۔ وہ ایک دم بات کرنے کے حق میں نہ تھا۔ آج ایک بات کرتا۔ وہ بھی سرسری طور پر بر سبیل تذکرہ۔ ایسی بات جو دل میں کانٹے کی طرح لگ جائے اور سوچنے پر مجبور کر دے آٹھ دن کے بعد دوسری بات چلا دیتا تھا۔

سب سے پہلے شہاب نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ صدر ایوب کو تحفے کے طور پر دیا۔ پھر اقبال کے کلام کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ پھر ایک نوٹ میں اقبال کے فلسفہ خودی کو آسان الفاظ میں بیان کیا۔

ایم بی خالد نے اپنی کتاب ایوان صدر میں سولہ سال میں اس نوٹ کا تذکرہ کیا ہے اور نوٹ کا متن بھی پیش کیا ہے لکھتے ہیں۔

شہاب صاحب نے اس نوٹ میں خودی کا عنوان دے کر نیچے لکھا تھا۔

KHUDI IS INDIVIDUALS SELF RESPECT

FEEL HUMBĖLER BEFORE THE HUMBLE.

PROUDER BEFORE THE PROUDE

IN NATIONS INDEPENDENCE:-

SOVEREIGNITY IN ECONOMICS

SELF SUFFICIENCY IN SOCIAL & POLITICAL ORDER:-

EMERGENCE OF A SUPER MAN

AN AMIR WHO IS SILKY.SOFT IN PEACE

STEELY HARD IN WAR

IN PROPHET HOOD:-

MOHAMMAD. A LEADER WHO IS BENIGN & RUTHLESS

ACCORDING TO NEED.

REFLECTION OF PROPHETS OWN ATTRIBUTES.

ہالینڈ کو روانگی سے پہلے ایک روز شہاب نے بڑے دکھ سے کہا۔ کہنے لگا' میں صدر ایوب کو اسلام کی جانب راغب کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ میں نے بڑی کوششیں کیں' لیکن بات نہیں بنی۔ پھر ایک مرتبہ جب شہاب ہالینڈ سے رخصت پر آیا۔ ان دنوں رمضان شریف کے دن تھے۔ ۲۷ ویں رمضان کو جب وہ صدر ایوب سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وہ مے نوشی میں مصروف ہیں۔ اس پر شہاب کو بہت صدمہ ہوا۔

شہاب کے دل میں صدرِ ایوب کی بڑی عزت تھی۔

ایک روز میں نے شہاب سے پوچھا کہ آپ جو صدر ایوب کی عزت کرتے ہیں۔ کیا اس لیے کہ وہ ملک کے صدر ہیں۔

نہیں اس لیے نہیں' شہاب نے جواب دیا' بلکہ اس لیے کہ وہ صاف ستھرے کردار کے مالک ہیں۔ نیک نیت ہیں اور فہم و فراست والے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ وہ پاکستان کو وہ مقام دلا سکتے ہیں جس کے ہم متمنی ہیں۔ اس لیے آپ ان کے قیام کے لیے دعا کریں۔

میں نے کہا' شہاب صاحب میری دعا سے کیا ہوتا ہے۔

کہنے لگا' ہوتا ہے آپ کو دعا کی طاقت کا شعور نہیں۔

میں نے کہا' آپ خود دعا کریں۔

بولا' انفرادی دعا میں وہ اثر نہیں ہوتا جتنا اجتماعی دعا میں ہوتا ہے۔

شہاب کی صدر ایوب کے متعلق کیا رائے تھی۔ اس کا اظہار شہاب نے ایک مضمون میں کیا تھا' جس کا عنوان تھا۔ ایوان صدر میں میرا آخری دن۔

ایم بی خالد نے اپنی کتاب "ایوان صدر میں ۱۶ سال" میں شہاب صاحب کے اس مضمون کا حوالہ دیا ہے۔

ایم بی خالد لکھتے ہیں:۔

آخری دن

ایوان صدر میں میرا آخری دن کے مضمون کا مسودہ آٹھ فل سکیپ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں سے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

ایوب خاں ہمیشہ اپنی ذات سے بلند ہو کر غور و فکر کرنے کے عادی ہیں۔ کیونکہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ آج کے بعد ایک کل بھی آتا ہے۔ جب وہ خود نہیں ہوں گے تو ملک ہو گا۔ ان کے مدنظر اپنی ذات نہیں بلکہ ملک اور قوم کا مستقبل ہوتا ہے۔

ایوب خاں جیسے سربراہ مملکت کے ساتھ کام کرنا میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ اور میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ عرصہ میری اپنی تعلیم کی تجدید کے لیے بہت مفید ذریعہ ثابت ہوا۔ میں نے صدر ایوب سے بے شمار سبق سیکھے۔ مثلاً

نمبر ا: دماغ کو کبھی کبھار استعمال کرنے کی بجائے مسلسل کرتے رہنا چاہیے۔ اللہ کی طرف سے عطاء کردہ انسانی جسم کا اہم ترین عضو دماغ ہی تو ہے جسے استعمال کرنے میں لوگ اکثر کنجوسی کر جاتے ہیں۔

نمبر ۲: دوسرے شخص کی پیٹھ پیچھے ایسی کوئی بات نہ کہی جائے جو اس کی موجودگی میں نہ کہی جا سکتی ہو۔

نمبر ۳: خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں نہ رہو' اگر اس دوران خوب سے بھی محروم ہو جانے کا امکان ہو۔ تصوراتی دنیا کو حقیقی دنیا سے علیحدہ نہ سمجھنا چاہیئے۔

نمبر ۴: سفارش کا دوسرا نام اقربا پروری ہے اور یہ جرم ہے' بالخصوص اگر کسی دوسرے حق دار کو اس کے جائز حق سے محروم رکھنے کا باعث بنے۔

نمبر ۵: پسند اور ناپسند انسانی فطرت کا خاصہ ہیں۔ پسند کی بنیاد دانش مندی اور خلوص پر ہو مگر ناپسند کو بھی ناقابل اصلاح نہ سمجھنا چاہیے۔

نمبر ۶: تجزیہ بے خوف اور بے لاگ ہونا چاہیے۔ ذاتی پسند یا ناپسند' دوستی یا ایسی کوئی دوسری چیز درمیان میں حائل نہیں ہونی چاہیئے۔

نمبر ۷: کام' کام' کام ———— اور کام۔

نمبر ۸: حرکت میں برکت ہے۔ جمود انسان کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتا۔

نمبر ۹: خوف خدا اور ایمان کامل حکمت کا سرچشمہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان والے لوگ کسی حالت میں بھی ہمت نہیں ہارتے۔

قدرت اللہ شہاب مضمون کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ صداقتیں میں صرف کتابوں میں پڑھا کرتا تھا۔ میرے لیئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ حکومتی سطح پر بھی ایک ایسے شخص کو بھی ان پر عمل پیرا دیکھا جو ہمہ مقتدر ہونے کے سبب ان اقدار سے صرف نظر کر سکتا تھا۔"

"اب جب کہ میں آٹھ برس کے بعد ایوان صدر سے رخصت ہونے والا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی دانش گاہ سے جا رہا ہوں۔ جہاں میں نے پہلے چار برسوں میں یہ سیکھا کہ حکومت کرنے کا غلط طریقہ کیا ہے اور بعد کے چار برسوں میں یہ سیکھا کہ حکومت کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔"

مشورہ اور حکم

فہم و فراست کے باوجود صدر ایوب میں ایک معصومیت سی تھی۔

ایک مرتبہ ان کے بیٹے نے جو ان دنوں صدر کا اے ڈی سی تھا۔ باپ سے ایک سو روپے قرض لیے۔ پے ڈے کے دن صدر ایوب نے ایک نوٹ شہاب کے نام لکھا کہ اے ڈی سی کی تنخواہ سے ایک سو روپیہ کاٹ لیا جائے۔

ایک روز صدر ایوب کا بیٹا اجازت حاصل کیے بغیر صدر کی گاڑی لے گیا۔ اس پر صدر ایوب کو بہت غصہ آیا اور وہ سرہانہ اٹھا کر بیٹے کا انتظار کرنے لگے تاکہ جب بھی وہ آئے تو اس کو سرہانے سے سرزنش کی جائے۔

ایک روز صدر ایوب کو والدہ کا پیغام موصول ہوا کہ علاقے کا پٹواری پہلے مجھ سے سو روپے لیا کرتا تھا۔ اب وہ سو روپیہ نہیں لیتا کہتا ہے' تیرا بیٹا بادشاہ بن گیا ہے اب تو میں ہزار روپیہ سے کم نہیں لوں گا۔

اس بات پر صدر ایوب گھبرا گئے انہیں بات سمجھ میں نہ آئی۔ انہوں نے شہاب کو بلایا تاکہ مشورہ لیں۔

شہاب نے کہا' پٹواری ٹھیک کہتا ہے' اسے ایک ہزار روپیہ دیں۔ صدر ایوب غصے میں بولے تو کیا آپ رشوت کو جائز سمجھتے ہیں۔

شہاب نے جواب دیا کہ میں رشوت کو بہت برا سمجھتا ہوں' لیکن اس قسم کے لین دین اب دستور بن گئے ہیں۔ لیگالائیز ہو گئے ہیں۔ اس رسم کو توڑنے کے لئے صبر و تحمل درکار ہے۔

صدر بولے' آپ ہری پور جا کر اس کا فیصلہ کر آئیں۔

شہاب' صدر ایوب کے فیصلوں میں مداخلت نہیں کرتا تھا' لیکن جب کبھی صدر ایوب شہاب سے مشورہ مانگتے تو وہ بے خوف و خطر اپنی رائے کا اظہار کر دیتا۔

شہاب کی رائے ہمیشہ منفرد ہوتی تھی۔

ایک روز صدر ایوب نے چڑ کر کہا' جب بھی آپ سے مشورہ کرتا ہوں تو آپ میرے سر پر پتھر مار دیتے ہیں' یہ کیا بات ہوئی بھلا۔

شہاب نے کہا' آپ مجھ سے مشورہ نہ مانگا کریں۔ صرف حکم دیا کریں۔ حکم کی تعمیل میرا فرض ہے۔

صدر ایوب بولے' لیکن میں آپ کا مشورہ لینا چاہتا ہوں۔

شہاب بولا' تو اختلاف رائے کو برا نہ مانئے۔

صدر بولے برا نہیں مانتا۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ بات مجھے کیوں نہ سوجھی۔

قدرت اللہ شہاب کے تعلقات صدر ایوب سے بہت اچھے تھے۔ صدر ایوب ہر بات میں

شہاب کا مشورہ لیتے تھے اور اس کے مشوروں کی قدر کرتے تھے۔ یہی بات قدرت اللہ کے زوال کا باعث بن گئی۔

بیورو کریٹس اگرچہ شہاب کی بہت عزت کرتے تھے لیکن دل ہی دل میں انہیں شہاب بہت کھٹکتا تھا۔ انہیں یہ شکایت تھی کہ ایک جونیئر افسران پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ شہاب کی ذاتی صفات تسلیم کرنے کے باوجود انہیں اس بات پر غصہ تھا کہ شہاب نے صدر ایوب کو مٹھی میں لے رکھا ہے۔

پاکستان کے سیاست دان شہاب کی حق میں نہ تھے وہ چاہتے تھے کہ اپنے مفاد کے مطابق صدر ایوب کو سانچے میں ڈھالیں۔ اس امر میں شہاب بہت بڑی رکاوٹ تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ صدر ایوب شہاب کے اثر سے نکل جائیں۔

محترمہ امریکہ

امریکہ بھی شہاب سے نالاں تھا۔

ایک روز شہاب کے پاس ایک امریکی خاتون آ گئی۔

کہنے لگی' مسٹر شہاب میں دو ماہ سے آپ کے کردار اور اعمال کا جائزہ لے رہی ہوں۔ اس عرصہ میں میں نے آپ کی شخصیت اور عزائم کا پورے طور پر جائزہ لیا ہے۔

پھر آپ کس نتیجے پر پہنچی ہیں' شہاب نے پوچھا۔

میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آپ ام پاسیبل شخصیت ہیں آپ کا سرا نہیں ملتا۔

شہاب مسکرایا بولا' آپ اس زحمت میں کیوں پڑی ہیں۔

محترمہ بولی۔ یہ میری اسائن منٹ ہے۔

تو پھر میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں' شہاب نے پوچھا۔

وہ بولی' مجھے آپ سے یہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں لیکن کر رہی ہوں۔

شہاب نے کہا' تو نہ کریں نا۔ کیوں کرتی ہیں آپ۔

وہ بولی' اس لیے کر رہی ہوں کہ حالات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آپ سے کھل کر بات کر لینے میں نقصان نہیں ہو گا الٹا فائدہ رہے گا۔

شہاب نے کہا، محترمہ شاید میں آپ کو گمراہ کر دوں۔

محترمہ ہنسی کہنے لگی، مسٹر شہاب کسی کو گمراہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ لوگ اس لیے گمراہ ہوتے ہیں کہ وہ خود گمراہ ہونا چاہتے ہیں اس میں عافیت سمجھتے ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ بھی خود گمراہ ہونا چاہتی ہیں، شہاب نے کہا۔

دیکھئے مسٹر شہاب، وہ بولی، آئی ام ڈیڈ سیریس۔ میں نے امریکی ریکارڈ میں آپ کی فائل کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ آپ کیمونسٹ خیالات کے مالک ہیں۔ شاید اس لیے کہ انڈیا میں سروس کے دوران آپ نے ایسے غریب نواز کام کیے جو انتظامیہ کی خلاف ورزی پر محمول کیے جاسکتے ہیں۔ آپ نے قحط کے دوران بھوکے حاجت مندوں کو شہہ دی کہ وہ چاولوں کا ڈپو لوٹ لیں۔ پھر آپ نے بڑے برطانوی افسروں کو حراست میں لیا۔

یہاں پاکستان میں جب آپ جھنگ کے ڈپٹی کمشنر تھے تو آپ نے کھلی کچہری لگا دی۔ شاید ان باتوں کی وجہ سے آبزرورز کو یقین ہو گیا کہ آپ کیمونسٹ ہیں۔ کچھ دیر کے لیے وہ رک گئی پھر بولی، لیکن دو ماہ کی آبزرویشن کے بعد میں کامل یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کیمونسٹ نہیں ہیں، نہ ہی آپ فنڈا مینٹلسٹ ہیں۔

تو پھر میں کیا ہوں، شہاب نے شرارةً" پوچھا۔

مجھے نہیں پتہ آپ کیا ہیں، وہ بولی، بہرحال آپ کیمونسٹ نہیں ہیں اور امریکی حکومت کی یہ غلط فہمی دور ہونی چاہیے۔ یہ بات امریکہ کے انٹرسٹ میں ہے اور آپ کے انٹرسٹ میں بھی۔

بہرحال یہ بات امریکہ کے حکومتی حلقوں میں طے شدہ تھی کہ شہاب کیمونسٹ خیالات کا حامی ہے۔ اس لیے امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ شہاب اور صدر ایوب کا باہمی رابطہ قائم رہے۔

پھر چین سے دوستی کے قیام کی وجہ سے دونوں سپرپاورز شہاب کو اس عہدے سے ہٹانے کے لیے صدر ایوب پر دباؤ ڈالنے لگیں۔

صدر ایوب بہت اچھے صدر تھے، لیکن سیاست میں کچے تھے۔ وہ ٹالنے کے فن سے واقف نہ تھے۔ انہوں نے دباؤ کے تحت قدرت اللہ شہاب کو سیکرٹری ٹو پریذیڈنٹ سے ہٹا کر وزارت اطلاعات کا سیکرٹری بنا دیا۔

استعفیٰ

اس تبدیلی سے کوئی عملی فرق نہ پڑا' چوں کہ صدر ایوب اور شہاب کا رابطہ جوں کا توں قائم رہا۔ اس پر بیرونی دباؤ نے شدت اختیار کر لی اور صدر ایوب مجبور ہو گئے۔

جب شہاب کو علم ہوا کہ اس کا تبادلہ زیرِ غور ہے تو اس نے صدر صاحب کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔

اس پر صدر ایوب گھبرا گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شہاب مستعفی ہو جائیں۔ انہوں نے شہاب سے کہا کہ میں آپ کا استعفیٰ منظور نہیں کروں گا۔ آپ کوئی سی وزارت میں بحیثیت سیکرٹری اپنی تعیناتی کروالیں۔

شہاب اپنی ضد پر اڑا رہا۔

صدر ایوب میں بڑا تحمل تھا۔ انہوں نے سوچا کہ وقت کے ساتھ ساتھ شہاب کی ضد کمزور پڑ جائے گی۔

ان دنوں صدر ایوب مری میں مقیم تھے۔ انہوں نے شہاب کو حکم دیا کہ آپ روز مری آئیں تاکہ ہم باہمی بات چیت سے اس مسئلے کا حل تلاش کر سکیں۔

پندرہ روز شہاب روزانہ مری جاتا رہا۔

سرکار قبلہ کے دربار میں جب یہ خبر پہنچی تو سبھی لوگ فکر مند ہو گے۔

بھائی جان خاموش ہو گئے۔

سائیں کرم دین' بولے' صدر ایوب اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔ کوئی انہیں جا کر سمجھائے کہ ایسا کرنے سے وہ خود کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

آغا صاحب نے کہا' یہ تو ہونا ہی تھا۔ شہاب نے میرا کام نہیں کیا۔ میں نے سرکار قبلہ سے شکایت کی۔ اس کا نتیجہ سامنے آگیا ہے۔ شہاب اپنے کیے کی سزا پا رہے ہیں۔

راجہ شفیع غصے میں بولا' بھائی جان آپ شہاب صاحب کو کیوں نہیں روکتے۔ انہیں مستعفی ہونے سے روکیے۔

بھائی جان بولے' وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں ہم ان کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔ ہاں اگر وہ چاہیں تو ہم کچھ معاملات میں ان کی مدد ضرور کر سکتے ہیں۔

راجہ شفیع سمجھتا تھا کہ مرد قلندر سائیں اللہ بخش کا روحانی مرتبہ بلند تر تھا۔ اور وہ شہاب کو اپنے پروگرام کے مطابق چلنے پر مجبور کر سکتے تھے۔

ابتدائی دور میں میرا بھی یہی خیال تھا لیکن بعد میں میری یہ خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔

جب شہاب نے مزار پر حاضری دی تھی اور بھائی جان کے بیان کے مطابق سرکار قبلہ چند ایک اولیاء کو ساتھ لائے تھے اور سب نے مل کر شہاب کی دستار بندی کی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے سرسری طور پر شہاب سے پوچھا تھا کہ سائیں اللہ بخش سے رابطہ قائم ہوا۔ اور شہاب نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا تھا۔ کہ ہاں ایک سایہ سا میری موٹر کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہتا ہے۔

اس کے بعد مسز دین کے معاملے میں' میں نے دیکھا کہ بھائی جان نے شہاب کے لیے اپنے تمام اصول طاق پر رکھ دیے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ جب بھی میں بھائی جان سے بات کرتا تو وہ مسکرا کر کہتے' آپ کیوں فکر کرتے ہیں آپ تو ہیڈ کوارٹر میں متعین ہیں۔ ان سب باتوں کو جان کر مجھے علم ہو چکا تھا کہ شہاب "چیز دیگری" ہے۔ مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ چیز دیگری کی نوعیت کیا ہے۔

میں نے راجہ شفیع کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی' لیکن راجہ کے لیے یہ بات قابل قبول نہ تھی کہ شہاب۔ سائیں اللہ بخش کے اثر و رسوخ سے بالاتر ہے۔

راجہ شفیع نے محفل میں بیٹھے ہوئے میرے کان میں کہا' مفتی تو بالکل نہ گھبرا میں بھائی جان سے کہہ کر حالات کا رخ موڑ دوں گا۔ شاید صدر صاحب اپنا فیصلہ ہی بدل دیں۔

غلام دین وانی نے کہا' بھئی جو اللہ کو منظور ہے وہی ہو گا۔

بالکل درست کہہ رہے ہیں' آپ بھائی جان بولے' وہ مالک ہے' جو اس کا حکم ہو گا وہی عمل میں آئے گا۔

غلام دین وانی بولا' مجھے تو شہاب صاحب سے ایک شکایت ہے کہ وہ مجھے صبح کی نماز پڑھنے نہیں دیتے۔

ہم سب حیرت سے وانی کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔

وانی بولا' جب میں فجر کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو سامنے آ کھڑے

ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی میرے جسم سے گویا جان نکل جاتی ہے۔ اٹھنے کی سکت نہیں رہتی۔

تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ شہاب چلے جائیں تاکہ فجر کی نماز میں رکاوٹ دور ہو جائے' کسی نے پوچھا۔

بالکل نہیں' دانی نے جواب دیا' ان کا یہاں رہنا پاکستان کے لیے باعث برکت ہے۔

کئی ایک دن دربار میں ہمارے درمیان اسی موضوع پر بات چلتی رہی۔

ایک دن غفور صاحب کا فون آگیا۔ انہوں نے پوچھا۔ شہاب صاحب کہاں ہیں۔ میں نے کہا جناب وہ تو مری گئے ہوئے ہیں۔ آج کل وہ روزانہ صدر صاحب سے گفتگو کرنے مری جاتے ہیں۔

ہاں مجھے علم ہے' غفور صاحب نے کہا۔

آپ کو کیسے علم ہے' میں نے پوچھا' ابھی تو بات راز میں ہے۔

وہ ہنسے کہنے لگے' کچھ باتوں کا ہمیں پتہ چل جاتا ہے۔

میں نے کہا' یہ بتایئے کہ کیا شہاب صاحب کو استعفٰی دے دینا چاہیے۔

مجھے علم نہیں وہ بولے' اس بارے میں شہاب بہتر جانتے ہیں۔ البتہ میں نے صدر صاحب کو ایک خط لکھ دیا ہے۔ اگر شہاب صاحب آپ سے علیحدہ ہو گئے تو وہ تمام برکات جو ان کی وجہ سے آپ کو حاصل ہیں ختم ہو جائیں گی۔ یہ بات آپ کے لیے بھی نقصان دہ ہو گی اور ملک کے لیے بھی۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ شہاب سے رابطہ قائم رکھیں اور کسی دباؤ کی پرواہ نہ کریں۔

انہی دنوں کے دوران ایک دن دربار میں ختم کی تقریب تھی۔ اتفاق سے شہاب کو صدر سے ملنے مری نہیں جانا تھا۔

سفیر

بھائی جان کے کہنے پر شہاب مزار پر آ گئے۔

وہاں سب کی موجودگی میں ان کے تبادلے کی بات چھڑ گئی۔

بھائی جان نے کہا' آپ استعفٰی دینے پر کیوں مصر ہیں۔

شہاب نے جواب دیا' کہ میری سوچ کے مطابق یہی مناسب ہے۔

بھائی جان بولے۔ آپ مالک ہیں جو چاہیں کریں' لیکن اگر استعفےٰ منظور نہ ہوا' تو یقیناً" آپ کو تبادلہ منظور کرنا ہو گا۔

ہاں وہ تو ہے' شہاب نے کہا۔

ہمارا خیال ہے کیوں نا آپ کسی جگہ کے سفیر بننا قبول کرلیں۔

ہاں' شہاب نے کہا' لیکن ان کا ارادہ ہے کہ مجھے یو این او میں بھیج دیا جائے۔

آپ کا کیا ارادہ ہے' بھائی جان نے پوچھا۔

میں یو این او کی دلدل میں پھنسنا نہیں چاہتا۔ وہاں کوئی کام نہیں ہوتا۔ نہیں ہو سکتا۔ بس بے کار کی تقریریں سنو اور اونگھتے رہو۔

سفارت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے' بھائی جان نے پوچھا۔

میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں جدے کا سفیر بنو' لیکن مجھے جدے نہیں بھیج سکتے۔ مجبوری ہے دراصل میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ مجھے کسی اہم سفارت میں بھیجیں۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ کوئی چھوٹی سی جگہ ہو۔ کوئی کام وام نہ ہو۔ اور وہاں میں اپنا کام کر سکوں۔

اپنے کام کا کیا مطلب ہے' راجہ نے پوچھا۔

بھائی جان بولے' اپنے کام کا مطلب اپنا کام ہے اور کیا۔

بہرحال اس روز بھائی جان نے برملا کہہ دیا کہ شہاب استعفےٰ پر ضد نہ کریں بلکہ کسی سفارت میں تعیناتی کرالیں۔

اگلے روز شہاب نے مجھے فون کیا۔ کہنے لگا' آپ فارغ ہوں تو یہاں آ جائیں۔

یہاں کہاں' میں نے پوچھا۔

میں گھر میں ہوں۔

دفتر نہیں آ رہے کیا۔

نہیں' وہ بولا۔

مری جائیں گے کیا۔ صدر صاحب سے ملنے۔

نہیں' وہ بولا۔ آپ آ جائیں۔

گھر پہنچا تو دیکھا کہ شہاب شب خوابی کے لباس میں اطمینان سے بیٹھا ہے۔

میں نے کہا' آپ تو چھٹی کے موڈ میں بیٹھے ہیں۔
ہاں' وہ بولا' چھٹی کا موڈ ہے آج۔
معلوم ہوتا ہے آپ نے فیصلہ کر لیا ہے۔
کیسا فیصلہ' اس نے پوچھا۔
مستقبل کے متعلق فیصلہ' میں نے کہا' کیا آپ نے بھائی جان کا مشورہ قبول کر لیا ہے۔
کون سا مشورہ۔
سفیر بن کر باہر جانے کا مشورہ۔
وہ مسکرایا' میں فیصلہ کرنے والا کون ہوں۔
تو کیا صدر صاحب فیصلہ کریں گے۔
وہ تو خود مجبور ہیں' اس نے کہا' پتہ نہیں اللہ کو کیا منظور ہے۔
تو اللہ سے پوچھ لیجئے نا' میں نے اسے چھیڑا۔
ان سے کون پوچھ سکتا ہے۔ ان کی تو منت کی جا سکتی ہے۔ آپ کو نور بابا کی وہ دعا یاد ہے جو انہوں نے قصائی کی زندگی کے لیے کی تھی۔
میں نے سر نفی میں ہلا دیا۔
انہوں نے کہا تھا' یا اللہ یہ قصائی ہمیں اچھا گوشت دیتا ہے جو ہم تیرے بندوں کو کھلاتے ہیں۔ اگر تو اس کی زندگی بڑھا دے تو تجھے کون پوچھنے والا ہے۔
ہاں' میں ہنسا' عجیب دعا مانگی تھی نور بابا نے۔
مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی کہ تجھے کون پوچھنے والا ہے' شہاب نے کہا۔

نمازی ٹوپی

بے شک نہ پوچھیے' ان کی منت کیجیے' میں پھر اپنے موضوع پر آ گیا۔
زندگی بھر میری یہ آرزو رہی ہے کہ مجھے جدہ میں سفیر بنا دیا جائے۔ لیکن منظوری نہیں ملی' شہاب نے کہا۔
آپ نے کوشش کی تھی کیا' میں نے پوچھا۔
آپ کو پتہ نہیں' وہ بولا' فارن آفس جدے کی سفارت کو جیل خانہ سمجھتا ہے' کوئی شخص

جدے میں سفیر بن کر جانے کے لیے تیار نہیں۔

اچھا' میں نے حیرت سے کہا' پھر منظوری کیوں نہ ملی۔

جدے میں سفارت کی منظوری مدینے شریف سے ملتی ہے۔ جو صاحب وہاں متعین ہیں۔ انہیں اپنا تبادلہ منظور نہیں' یہ کہہ کر شہاب خاموش ہو گیا۔

دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

پھر وہ کہنے لگا' میں آج لاہور جا رہا ہوں۔

کوئی ضروری کام ہے کیا' میں نے پوچھا۔

ہاں بہت ضروری۔ اگر آپ فارغ ہوں تو آپ بھی چلیے' وہ بولا۔

میں وہاں کیا کروں گا؟

سارا دن گپیں ماریں گے۔

کوئی میٹنگ نہیں کیا' میں نے پوچھا۔

نہیں' وہ بولا' میرا ذاتی کام ہے۔

کتنے دن رہیں گے وہاں۔

تین دن' وہ بولا' میں رات کو چلا جایا کروں گا' صبح آ جایا کروں گا۔

کوئی چمگادڑ ہے کیا' میں نے پوچھا۔

نہیں' وہ مسکرایا۔

میں بہت حیران ہوا۔ یہ کیسا کام ہے جو رات کے وقت ہو گا اور مسلسل تین راتیں۔

ہم شام کے وقت لاہور پہنچ گئے۔ ریسٹ ہاؤس میں دو کمرے پہلے سے ہی ریزرو تھے۔

لاہور پہنچتے ہی قدرت نے تیاری شروع کر دی۔ پہلے غسل کیا پھر کپڑے بدلے۔ شلوار قمیض۔ جب اس نے سر پر کپڑے کی نمازی ٹوپی پہنی تو میں چونکا۔ میں نے سوچا۔ ضرور قدرت نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ کوئی نئی چمگادڑ ہو گی۔ میں نے طنزاً" کہا۔ خشبو لگا لیجیے۔

پروٹوکول

ہاں' لگاؤں گا' وہ بولا۔ غالباً" اس نے میری طنز کو محسوس کر لیا۔ کہنے لگا' میں دربار جا رہا

ہوں۔

دربار کون سے دربار۔

کہنے لگا' داتا کے دربار۔

ارے میں تو سمجھا تھا ہیرا منڈی جا رہے ہیں۔

وہ مسکرایا۔

اگر آپ داتا کے ہاں جا رہے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

کیا حرج ہے' میں نے کہا۔

آپ وہاں جا کر کیا کریں گے۔

میرا تعارف ہو جائے گا' اپنی تو کوئی حیثیت نہیں' میں نے کہا' شاید آپ کے ساتھ جانے سے داتا کی ایک نگاہ مجھ پر بھی پڑ جائے۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔ یاد ہے ملتان میں آپ مجھے دونوں درگاہوں پر لے گئے تھے۔

اگر لے جا سکتا تو ضرور لے جاتا' وہ بولا۔

کوئی پابندی حائل ہے کیا' میں نے پوچھا۔

ہاں' وہ بولا۔ پروٹوکول کا مسئلہ ہے۔

شہاب چلا گیا تو میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ضرور یہ اپنے تبادلے کی بات کرنے آیا ہے۔ شاید جدے کے لیے منت ترلا کرنا ہو' نہیں' نہیں جدے کے لیے نہیں۔ جدے پر تو سرکار مدینہ منورہ کا حکم چلتا ہے۔ شاید استعفٰے کی بات ہو۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔

شہاب دربار میں بیٹھا رہا۔ میں بے چینی سے دربار کے باہر گھومتا پھرا۔

صبح سویرے شہاب نے دروازہ کھٹکھٹایا اس کے گونگے چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا' یا شاید مایوسی ہو۔

اس کے چہرے سے میں کبھی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ قیصر سچ کہتا تھا۔ کہا کرتا تھا' ممتاز دیکھ جس کا چہرا گونگا ہو اس سے خبردار رہنا۔

کیوں کیا ہوا' میں نے پوچھا۔

ہاں ہو گیا' وہ بولا۔

انہوں نے اجازت دے دی' میں نے کرید نے کے لیے پوچھا۔

ہاں دے دی۔ اس نے بات کا رخ بدلا۔ ہم آج ہی واپس چلے جائیں گے۔

کیا واقعی۔

ہاں' وہ بولا۔

آپ نے تو تین راتوں کی حاضری کا پروگرام بنایا تھا۔

ہاں اس نے کہا' میرا خیال تھا کہ ———— لیکن انہوں نے اجازت دے دی۔

اسی روز ہم واپس راولپنڈی چلے آئے۔

ہالینڈ

اگلے روز شہاب نے فارن آفس سے رابطہ کیا۔ اسے پتہ چلا کہ ہالینڈ کی سفارت خالی پڑی ہے۔

شہاب نے عزیز احمد کو فون کیا۔ وہ کراچی دورے پر تھے۔ شہاب نے کہا میں آپ سے ایک نجی بات کرنا چاہتا ہوں جو فون پر نہیں ہو سکتی اور بے حد ضروری ہے۔

عزیز احمد نے کہا' تو آ جایئے۔

اسی رات شہاب کسی کو بتائے بغیر کراچی چلا گیا۔ اور اگلی صبح واپس آ گیا۔

شہاب نے عزیز احمد سے کہا' کہ کسی طریقے سے مجھے یو این او جانے سے بچا لیں اور مجھے ہالینڈ بھجوا دیں۔

اگلے روز عزیز احمد نے صدر ایوب کو فون پر بتایا کہ شہاب کی یو این او میں تعیناتی کرنے میں فارمیلیٹیز کی وجہ سے دو تین مہینے لگ جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ شہاب کی فوری تعیناتی ہالینڈ کے سفیر کی حیثیت سے کر دی جائے۔ بعد میں انہیں یو این او بھیج دیں گے۔

صدر ایوب مان گئے۔

یوں شہاب کی تعیناتی ہالینڈ کے سفیر کی حیثیت سے طے ہو گئی۔

پھر رسمی دعوتوں اور سنڈ آف کا ایک سلسلہ چل پڑا اور وہ اس قدر مصروف ہو گیا کہ اس سے بات کرنی مشکل ہو گئی۔ بہرحال میں نے موقعہ پا کر کہا' شہاب صاحب وعدہ کیجیے کہ جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ کم از کم دو یا تین گھنٹے اکیلے میں گزاریں گے۔ میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

شہاب نے وعدہ کر لیا۔

آخری ملاقات

ہالینڈ جانے سے پہلے ایک روز قدرت کا فون آیا' اگر آپ فارغ ہوں تو آ جایئے گا۔

کیوں خیریت' میں نے پوچھا۔

آپ نے کہا تھا نا کہ جانے سے پہلے مجھ سے اکیلے میں ملیے۔

جب میں شہاب کے گھر پہنچا تو وہ آرام کرسی ڈالے لان میں بیٹھا تھا۔

کہنے لگا' میرے جانے پر آپ ڈسٹربڈ تو نہیں ہیں۔

نہیں تو۔

بہت ہی اچھی بات ہے' وہ بولا۔ میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا اور اس سے پہلے آپ کو ہالینڈ بلاؤں گا۔ میں نے اس سلسلے میں سارے انتظامات مکمل کر لیے ہیں' پچاس ہزار روپے کی منظوری لے لی ہے۔

کس سلسلے میں بلالیں گے آپ' میں نے پوچھا۔

کوئی سا کام کریں گے۔ کرنے کے لیے بہت سے کام ہیں اور سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ وہاں مکمل فراغت ہو گی۔ گپ لگائیں گے۔ بہرحال پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آپ میری نفسیات سے واقف نہیں' میں نے جواب دیا۔ بڑے سے بڑا واقعہ ہو جائے تو بھی میں شاک نہیں ہوتا۔ مجھے دھچکا نہیں لگتا' پھر جب واقعہ ہو جاتا ہے تو غم بوند بوند گرتا رہتا ہے مہینوں گرتا رہتا ہے۔

ہر فرد کے غم کے کوائف مختلف ہوتے ہیں۔ میرا ایک دوست تھا۔ مرزا اعظم بیگ۔ کوئی غم بھرا واقعہ ہوتا تو وہ ہابڑے کا شکار ہو جاتا تھا۔

ہابڑا کا مطلب، شہاب نے پوچھا۔

وہ کھاتا جاتا کھاتا جاتا، گلٹن بن جاتا۔ میں نے وضاحت کی۔

حیرت ہے، وہ بولا، لوگوں کی تو بھوک اڑ جاتی ہے۔ بہر حال آپ کو گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

میں عقلیہ انسان نہیں۔ شہاب صاحب، میں نے کہا۔

الطاف گوہر

اس نے موضوع بدلا۔ کہنے لگا۔ میری جگہ الطاف گوہر آ رہے ہیں۔ وہ بڑے قابل آدمی ہیں۔

مجھے علم ہے۔ کہ وہ ٹیلنٹڈ ہے۔

بہت ذہین ہیں۔

یہ تو میں جانتا ہوں کہ ٹیلنٹڈ آدمی ہے، مگر آدمی کیسا ہے وہ، میں نے پوچھا۔

بڑا ہمدرد آدمی ہے۔ آپ تو اسے جانتے ہو گے۔ ادبی آدمی ہے۔

ادبی تو ہے، مگر انسان کیسا ہے۔

بہت اچھا انسان ہے۔ ذہین ہے، ایفیشنٹ ہے۔ عقل کا دلدادہ ہے۔ دوسرے کی بات غور سے سنتا ہے کھلے ذہن سے سنتا ہے۔ متعصب نہیں ہے۔ اوپن مائنڈڈ ہے، لیکن منفرد سوچ کا مالک ہے۔ یہ باتیں سول سروس میں نہیں چلتیں۔

سول سروس میں پیچھے پیچھے چلنے والا پھلتا پھولتا ہے۔ آگے چلنے والا مار کھا جاتا ہے۔ وہ سول سروس میں زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ یہ ہماری سول سروس کا المیہ ہے، وہ ایسے شخص کو اچھا نہیں جانتی جس میں LEADERSHIP ہو۔ انفرادیت کو برداشت نہیں کرتی۔ آپ کیوں گھبراتے ہیں اس نے بات کا رخ بدلا۔

آپ فروری ۶۶ء میں ریٹائر ہو جائیں گے۔ فروری ۶۵ء میں آپ ریٹائرمنٹ کی چھٹی پر چلے جائیں گے۔ صرف ایک سال تو ہے۔ اس دوران میں میں آپ کو ہالینڈ بلا لوں گا دیکھئے مفتی صاحب، اس نے کہا، آپ کو رزق کی کمی نہیں ہو گی اِنشاء اللہ کبھی نہیں۔ اگر آپ میری اس بات پر یقین رکھیں گے تو سکھی رہیں گے۔

مجھے رزق کا فکر نہیں ہے' میں نے جواب دیا۔

تو پھر آپ مجھے کیا کہنا چاہتے تھے۔

رکاوٹ آزمائش

وہ ایک اور مسئلہ ہے۔ میں نے کہا۔

تو بتایئے۔

وہ بہت تکلیف دہ مسئلہ ہے۔

آپ کو یاد ہو گا آپ مجھے کراچی میں ایک بزرگ بابا کے پاس لے کر گئے تھے۔ اس بابا کے ڈیرے پر ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا۔ وہ اپنا پروفیشن چھوڑ کر بابا کا بالکا بن گیا تھا۔

جب ہم بابا سے مل کر واپس آ رہے تھے تو آپ نے کہا تھا' یہ ڈاکٹر بابا کی آزمایش ہے۔

مجھے یاد نہیں' وہ بولا۔

آپ نے کہا تھا ہر بابا کے ساتھ کوئی نہ کوئی فرد ایسا ہوتا ہے جو اس کی آزمایش کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ اس کی ہر بات میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ آپ نے کہا تھا کچھ بابا لوگ کو شعور ہوتا ہے کہ وہ شخص ان کی آزمایش ہے کچھ کو شعور نہیں ہوتا۔ یاد آیا آپ کو کہ نہیں۔ اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ البتہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ ہر بابا کے ساتھ ایک آزمائشی فرد لگا ہوتا ہے جو اس کی ہر بات میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر اس کا علم نہیں لیکن بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ بات سچی ہے' اس نے جواب دیا۔

کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ میں آپ کے راستے کی رکاوٹ ہوں۔ میں آپ کی آزمائش ہوں۔ جب بھی میں یہ سوچتا ہوں تو مجھے سخت دکھ ہوتا ہے۔ اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ میں کہیں بھاگ جاؤں۔ خود کو معدوم کر دوں۔

یہ سن کر شہاب خاموش ہو گیا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے کہا کہ' مفتی کی دوستی ایک پھوڑے کی طرح ہے۔ جس کی ٹیسوں میں لذت ہے۔

وہ مسکرا دیا بولا' ہاں میں نے سچ کہا تھا' لیکن مفتی صاحب اول تو میں بابا نہیں ہوں۔ بزرگ نہیں ہوں۔ ایک عام سا انسان ہوں' آپ خواہ مخواہ مجھ سے عقیدت لگائے بیٹھے ہیں۔ میں تو آپ سے دوستانہ تعلقات کا خواہاں ہوں۔

شہاب صاحب مجھے ٹالیے نہیں' میں نے احتجاجا" کیا۔

چلیے آپ کی خوشی کی خاطر فرض کیجئے کہ میں بابا ہوں' وہ مسکرا کر بولا۔

اور آپ میری آزمائش ہیں' میرے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ اس صورت میں تو مجھے آپ کا ممنون احسان ہونا چاہیے آپ تو فزکس کا اصول جانتے ہیں کہ اگر رکاوٹ نہ ہو تو حرکت ممکن نہیں ہو سکتی۔ اگر کشش ثقل نہ ہو تو بوٹے اگ نہیں سکتے۔ باباؤں کے راستے میں رکاوٹیں نہ ہوں تو وہ آگے بڑھ نہیں سکتے۔ مدارج طے نہیں کر سکتے۔ ایسا تو نہیں کہ آپ خود کو اہمیت دینے کے لیے اپنے آپ کو میرے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ عین اس وقت عفت آگئی۔ کہنے لگی' ٹھیک تو کہتے ہیں۔ مفتی جی۔ یہ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہی تو ہیں۔ یہ اکیلے نہیں۔ بھائی جان ہیں' راجہ ہے اور یہ ہیں۔ سبھی ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ ان کی وجہ سے میرا جی نہیں چاہتا کہ ہالینڈ جاؤں۔ شہاب کی اس بات کی وجہ سے میں ساری رات سو نہ سکا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کے خیال آتا۔ واٹ اے مین۔ واٹ اے مین' جو راستے کی رکاوٹوں کا ممنون احسان ہے' جو آزمائش کو خوش نصیبی سمجھتا ہے۔



عکسی مفتی (۱۹۶۸ء)

عکسی ، قدرت اللہ شہاب ، تہمینہ

ہالینڈ



پروفیسر اشفاق حسین (۱۹۵۷ء)



ولایت بیگم (ہمشیرہ)، صغرا خانم (والدہ)، مظفر مفتی (بہنوئی)



اقبال مفتی (بھانجا)

انتالیسواں باب

بے نام اُداسی

قدرت اللہ شہاب کے جانے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے بتی بجھ گئی ہو اور گھپ اندھیرا چھا گیا ہو۔

ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

طبعی طور پر میری ساخت کچھ ایسی تھی کہ کسی غمناک واقعہ پر مجھے ایک دم صدمہ نہیں ہوتا۔ واقعہ کے بیت جانے کے بعد اداسی اور غم بوند بوند گرنا شروع ہو جاتے اور پھر بوند بوند گرتے رہتے، گرتے رہتے۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ کسی واقعہ کے بعد اندھیرا گھپ ہو گیا ہو۔ ویسے بھی قدرت اللہ سے میرے تعلقات کسی خاص نوعیت کے نہ تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک عظیم کردار کا حامل تھا۔

احترام کی دیوار

میرے دل میں اس کے لیے جذبہ احترام تھا۔ وہ میرا دوست نہیں تھا، کیوں کہ ہم دونوں کے درمیان احترام کی دیوار حائل تھی۔ اس کے کردار کی تین خصوصیات نے مجھے متاثر کیا تھا۔

اس میں بلا کی وسعت قلب تھی۔ بڑی سے بڑی، بری سے بری بات بھی اس کے دل کو

میلا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ لوگوں کی نیک دلی پر بہت خوش ہوتا تھا' لیکن لوگوں کی برائیوں' عیبوں یا بدنیتوں پر آزردہ نہیں ہوتا تھا۔

بھائی جان اور قدرت اللہ میں سب سے بڑا فرق یہی تھا۔

بھائی جان اصولی آدمی تھے۔ قدرت اللہ نے کبھی اصول کو انسان پر فوقیت نہ دی تھی۔

بھائی جان دوسروں کی کمیوں' کجیوں یا بدنیتوں پر آزردہ ہو جایا کرتے تھے۔ وہ تلقین کے دلدادہ تھے۔ قدرت اللہ نے کبھی تلقین نہ کی تھی۔

قدرت اللہ کی دوسری خوبی جس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اس کا جذبہ ہمدردی تھا۔ اس نے کبھی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا جذبہ ہمدردی نظر نہیں آتا تھا' صرف محسوس ہوتا تھا۔ جیسے دہکتے کوئلوں پر راکھ جم جاتی ہے اور انگارے نظر نہیں آتے' لیکن ان کی گرمی یا تپش محسوس ہوتا رہتا ہے۔

قدرت اللہ کی تیسری خصوصیت جس نے مجھے متاثر کیا اس کا عجز تھا۔ عملی طور پر وہ خود کو کسی شخص سے بہتر نہیں سمجھتا تھا۔ میں اسے ایک پاکیزہ شخص سمجھتا تھا' کیوں کہ وہ عبادت گزار تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہر سانس کے ساتھ کلام پڑھنے کا عادی ہو۔

چوں کہ مجھے علم تھا کہ میں پاک نہیں ہوں۔ بلکہ جسمانی ذہنی طور پر ناپاک ہوں۔ اس لیے میں نے قدرت سے کبھی ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ میں کبھی اس کمرے میں نہیں سویا تھا جس میں قدرت سوتا تھا۔

ہم دونوں اکٹھے لاہور جاتے اور اشفاق کے گھر ٹھہرتے تو بانو میرا بستر قدرت کے کمرے میں لگا دیتی تھی۔

نہیں بانو' میں کہتا' میں اس کے کمرے میں نہیں سوؤں گا۔

لیکن کیوں' وہ پوچھتی۔

وہ آدمی رات کو عبادت کرتا ہے نا۔

تو پھر' وہ کہتی۔

نہیں بانو میں اس کے کمرے کی پاکیزہ فضا کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔

ابتدائی ایام میں ایک دو بار ہم دونوں اکٹھے بذریعہ ریل کراچی دورے پر گئے تھے۔

قدرت اللہ نے ایک کوپے ریز رو کرا لیا تھا۔ اس نے میرا بستر اوپر کی سیٹ پر لگا دیا تھا۔

میں کوپے میں سو نہ سکا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے اندر کا اضطراب اس قدر بڑھ گیا کہ سانس لینے میں دشواری ہو گئی جب بات برداشت سے باہر ہو گئی تو میں دبے پاؤں نیچے اترا اور پھر چپکے سے کوپے سے باہر نکل گیا۔ صرف تھرڈ کلاس کے ڈبے کھلے تھے۔ بھیڑ کچھ زیادہ ہی تھی۔ جیسے کیسے مجھے ڈبے کے فرش پر اکڑوں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ تنگی اور گرمی کے باوجود میں وہاں یوں اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے نعمت غیر مترقبہ مل گئی ہو۔

دن چڑھا تو شہاب کا پی اے مجھے ڈھونڈتا ہوا آ گیا۔

کہنے لگا' چلیے صاحب بلا رہے ہیں۔

شہاب نے مجھ سے بالکل نہ پوچھا کہ آپ کہاں چلے گئے تھے۔ کیوں چلے گئے تھے۔ کہنے لگا' کراچی آنے والی ہے' اپنا سامان درست کر لیجیے۔

کچھ دیر کے بعد میں نے خود ہی بات چھیڑی۔ میں نے کہا' میں چلا گیا تھا۔

بولا' ہاں جب آپ گئے تھے تو میں جاگ رہا تھا۔ پہلے میں آپ کی بے چینی کو محسوس کرتا رہا۔ پھر آپ چلے گئے اچھا کیا چلے گئے۔

میں نے بات ٹالنے کے لیے جھوٹ بولا۔

میں نے کہا' میں ایئرکنڈیشن سے الرجک ہوں۔

ہاں' وہ بولا' میں بھی ہوں۔

پھر آپ "اے سی" میں کیسے سوتے ہیں۔

آپ ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور سکھی ہو جاتے ہیں۔ میں خود سے لڑتا رہتا ہوں۔

خود سے لڑنا تو اچھی بات ہے۔

نہیں' اس نے جواب دیا' ہار نہ ماننا بھی تو شوکت نفس کی اک صورت ہے۔ ہار ماننے میں کتنا سکھ ہے۔

شہاب کے کردار کی ان تین خصوصیات کی وجہ سے میرے دل میں اس کا احترام تھا۔

لیکن کسی محترم کے چلے جانے کے بعد یوں گھپ اندھیرا تو نہیں ہو جاتا۔ زندگی میں خلا تو نہیں پیدا ہو جاتا۔

یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے۔ میں سوچ میں پڑ جاتا۔

بے شک وہ محترم تھا' محسن تھا' اس کے ہونے سے مجھے بڑے دنیاوی فائدے حاصل تھے۔ ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی' لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ زندگی ایک خلاء میں بدل جائے۔ دلچسپیاں بے معنی نظر آنے لگیں۔ دوست بیگانے محسوس ہونے لگیں۔

کراہتا حبشی

انہی دنوں۔ ایک نیا نیا ٹیپ ہمیں حاصل ہوا تھا۔ اس میں طفیل کے گانے بھرے ہوئے تھے' یہ گانے سٹوڈیو میں ریکارڈ نہیں کیے گئے تھے۔ ریکارڈنگ کچی تھی۔ لیکن نمائشی اہتمام سے پاک تھی۔

جب وہ "بول مٹی دِیّا باوِیّا" چیخ کر کہتا تو ایسے لگتا جیسے کوئی حبشی کراہ رہا ہے۔ دکھ سے بے حال ہو کر چیخ رہا ہے۔

اگرچہ گیت کا مکھڑا خاصہ بے معنی تھا۔

بول مٹی دیا باویا وے۔

تیرے دکھاں نے مار مکایا وے۔

میرا سانول ماہی۔

ان دنوں طفیل کے انداز اور آواز میں واقعی حبشی عنصر تھا۔ ن م راشد کے حبشی جیسا۔ جس نے صدیوں جبر سہا ہو۔

سارا سارا دن میں ٹیپ لگائے رکھتا۔ یوں پڑا سنتا رہتا' جیسے مگرمچھ سمندر کے کنارے دھوپ میں ریت پر پڑے رہتے ہیں۔

مجھ پر ایک عجیب قسم کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ گہری گاڑھی اداسی اور اس اداسی کو دور کرنے کی خواہش نہ تھی۔ الٹا جی چاہتا تھا اور گاڑھی ہو جائے۔

ایسی کیفیت مجھ پر زندگی میں کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔ محبتوں میں جدائی کے کئی بار موقعے آئے تھے۔ ایسے موقعوں پر بے چینی سی محسوس ہوا کرتی تھی۔ بے چینی کے طوفان میں ایک سکون کا حلقہ ہوتا تھا چلو اچھا ہوا قسم کا احساس۔ بھلا ہوا میری جھجھری ٹوٹی۔ میں تو پاپنیا بھرن سے

چھوٹی' قسم کا چور احساس۔

اگر میں چاہتا تو اس اداسی کو دور کر سکتا تھا۔ راولپنڈی میرے دوستوں سے بھرا ہوا شہر تھا۔ مسعود تھا' عماد تھا' عمر تھا' عظمی تھا' پھر میرے پرانے دفتر کے لوگ تھے۔ مس فخری تھی جس نے مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا تھا۔ حالانکہ اسے علم تھا کہ میرا ساتھ دینے سے وہ اپنی ملازمت خطرے میں ڈال رہی ہے۔

ان دنوں بھائی جان نے پھر سے مری میں رہائش اختیار کر لی تھی کبھی کبھار وہ پنڈی آ جاتے۔ ان کے آنے کی سب کو اطلاع ہو جاتی۔ ہم سب راجہ شفیع' وانی' ملک آغا اوز میں' دربار میں جا بیٹھتے پھر وہاں ایک غیر رسمی قسم کی محفل لگ جاتی۔

پتہ نہیں کیوں دربار کے متعلق میرے دل میں وہ جوش و خروش نہیں رہا تھا۔ بھائی جان کی عزت میرے دل میں جوں کی توں قائم تھی۔ لیکن دل میں وہ کشش نہ رہی تھی۔

ڈاوانڈول

میں اپنے دل کی بات کسی سے نہ کہہ سکتا تھا۔ صرف راجہ شفیع ایسا فرد تھا جسے میں دل کی بات بتا سکتا تھا۔ راجہ مجھ سے پوچھتا' یہ تجھے کیا ہو گیا ہے مفتی۔ نہ تو دربار میں حاضری دیتا ہے۔ نہ اپنے پرانے دوستوں سے ملتا ملاتا ہے۔ دوگی میں تو نہیں آیا کبھی۔ حلقے کی محفل میں تو نہیں جاتا۔ بات کیا ہے۔

میں جواب دیتا' پتہ نہیں راجہ مجھ پر اک بے نام اداسی چھائے رہتی ہے۔

کسی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے کیا۔ ایسا ہے تو مجھ کو بتا۔ بس ایک اشارہ کر دے۔ میں اسے اٹھا کر یہاں نہ لے آؤں تو میرا نام راجہ نہیں۔

نہیں راجہ محبت نہیں ویسے ہی اداسی ہے۔

وہ تو ہے جب پتا پڑتی ہے تو سارے گھرانے پر پڑتی ہے۔ آج کل سب ڈاوانڈول ہو رہے ہیں۔ بھائی جان کا کاروبار رکا ہوا ہے۔ سائیں جی بیمار پڑے ہیں۔ تمہاری یہ حالت ہے۔ وانی بھی گھر بند ہوا بیٹھا ہے اور میں کواچی گاں کی طرح اکیلا مارا مارا پھرتا رہتا ہوں۔ دراصل راجہ یہ بات نہیں سمجھا تھا کہ میں دربار سے کٹ گیا ہوں۔

ڈیٹیچ ہو گیا ہوں۔ اور قدرت اللہ پر مرکوز ہو چکا ہوں۔ راجہ نے قدرت اللہ کی شخصیت کا مشاہدہ نہیں کیا تھا اس لیے وہ یہ اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ قدرت اللہ میرا مرکز بن چکا ہے۔

میں خود اس بات پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

بھائی جان کے مجھ پر بڑے احسانات تھے۔ انہوں نے مجھ میں بیداری پیدا کی تھی۔ مجھے خرافات سے نکال کر پاکیزہ فضا میں لے آئے تھے۔ مجھ پر رقت طاری کر کے میری پراگندگی کو بڑی حد تک دھو کر صاف کر دیا تھا۔ مجھ پر خصوصی توجہ کی تھی اور مجھے بڑی محبت دی تھی۔

مجھے خیال آتا کہ کیا میں بے پیندے کا لوٹا ہوں جو بے وجہ لڑھک جاتا ہے

میں نے ایک دن قدرت اللہ سے بات کی تھی۔

میں نے کہا' میں گلٹی محسوس کر رہا ہوں۔

کس بات پر' اس نے پوچھا۔

میں بھائی جان سے کٹ گیا ہوں۔ ڈیٹیچ ہوا جا رہا ہوں۔

نہیں' وہ بولا' اگر آپ بھائی جان سے ڈیٹیچ ہو جاتے تو آپ کو یہ احساس نہ ہوتا کہ آپ ان سے ڈیٹیچ ہو گئے ہیں۔

آپ مجھے حوصلہ تو نہیں دے رہے' میں نے پوچھا۔

قطعی نہیں' وہ بولا' کیا آپ کے دل میں ان کے لیے احترام نہیں رہا۔ احترام جوں کا توں قائم ہے' میں نے جواب دیا' لیکن لگن نہیں رہی۔

پہلے تھی کیا' اس نے پوچھا۔

تھی' بہت زیادہ تھی۔

یہ لگن آپ نے خود لگائی تھی کیا۔

نہیں خود نہیں لگائی تھی۔ میں نے جواب دیا۔

لگن لگانے والا لگن لگاتا ہے نا' جس سے چاہے لگا دے۔ آپ خود کو اس کے حوالے کر دیں تو سب پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ پھر سینس آف گلٹ نہیں ہوتا۔

لگن لگانے والے کے بارے میں میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ اور حوالگی' سپردگی کی مجھ میں

سرے سے اہلیت ہی نہ تھی۔

میرے گھر والے بھی میری اس کیفیت پر بہت پریشان تھے۔

میری بیوی میری اس کیفیت پر ناراض تھی۔

میری بیوی ایمن آباد کی شیخانی ہے۔ ایمن آباد کے شیخ نومسلم ہیں۔ اپنی گذشتہ بت پرستی پر وہ بہت شرمندہ ہیں۔ اس سینس آف گلٹ کی وجہ سے جو ان کے اندر دبکا بیٹھا ہے۔

وہ کسی بندے کو کوئی روحانی مرتبہ دینے کو کفر سمجھتے ہیں۔

میری بیوی کسی پیر فقیر کو نہیں مانتی۔ وہ سپر نیچر کرامات سے یکسر منکر ہے۔ اس نے بھائی جان کو کبھی اہمیت نہ دی' نہ ہی مرد قلندر کو بزرگ مانا تھا۔

وہ شہاب سے میری عقیدت پر تمسخر آمیز ہنسی ہنس دیتی تھی۔ ان دنوں میری کیفیت پر اسے غصہ آتا تھا۔ کہتی۔ یہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ پیری فقیری کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ اپنی سدھ بدھ نہیں رہی۔

میری بیٹیاں مجھے گم صم دیکھ کر سہمی ہوئی تھیں۔

میرا بیٹا عکسی میری اس کیفیت پر پریشان نہ تھا۔ ایسے لگتا تھا' جیسے وہ جانتا ہو' سمجھتا ہو' اگرچہ اس نے کبھی منہ سے اس کا اظہار نہ کیا تھا۔ ان دنوں عکسی پینٹنگ کا شغل چھوڑ چکا تھا۔ اسے لوک گیتوں سے دل چسپی ہو گئی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت ریکارڈنگ میں صرف کرتا تھا۔ عکسی برہا کے گیت ٹیپ کر کے مجھے دیتا۔ کہتا ابو۔ یہ سنیے یہ گیت بہت ہی اچھے ہیں۔

تزکیہ نفس

پھر اتفاق سے غفور صاحب آ گئے۔

غفور صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ بات چھپاتے نہیں تھے۔ برملا کہہ دیتے۔

آتے ہی پوچھنے لگے ہالینڈ سے کوئی خط آیا۔

جی ہاں۔ آتے ہیں۔ خط نہیں مختصر نامے۔

وہ ہنسے بولے' ہاں ان کے پاس خط لکھنے کی فرصت کہاں۔

کیوں۔ میں نے پوچھا' کیا ہالینڈ کے ایمبیسی میں کام زیادہ ہے۔

نہیں وہ مسکرائے۔ آپ کو نہیں پتا کیا ——— کہ انہوں نے کوشش کر کے ہالینڈ میں تبادلہ کیوں کروایا تھا۔

نہیں مجھے نہیں پتہ۔

وہ مسکرائے بولے' اس لیے کہ وہاں کوئی سرکاری کام نہیں ہے۔

آپ تو کہتے ہیں انہیں خط لکھنے کی ضرورت نہیں۔

مفتی صاحب وہاں وہ اپنا کام کرنے کے لیے گئے ہیں' انہوں نے تزکیہ کا بہت بڑا پلان بنایا ہوا ہے۔ مثلاً" وہ یہاں اعتکاف اور دیگر وظائف نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں چپ رہنا ممکن نہ تھا۔ مراقبے نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہالینڈ میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی لائبریری ہے۔ جس میں قلمی نسخے بڑے بہتات میں ہیں۔

یہ بتایئے کہ آپ کے اندازے کے مطابق وہ کب واپس آئیں گے۔

پانچ سال لگیں گے' غفور نے جواب دیا' ایک ہالینڈ میں' دو مصر میں' پھر شاید دو جدے میں۔ مفتی صاحب آپ ان کے جانے پر رنجیدہ خاطر نہ ہوں۔ انہیں جانا ہی تھا۔ ان کا جانا ملک کے مفاد میں ہے۔ گیارہ ماہ پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ آپ باہر چلے جائیں۔ کچھ دیر کے لیے'۔ لیکن وہ ٹال مٹول کرتے رہتے۔ ٹال مٹول ان کی عادت میں داخل ہے' اگر اس وقت چلے جاتے تو بہتر ہوتا۔ خیر اب بھی ٹھیک ہے۔

میں نے پوچھا' غفور صاحب' ایک بات بتا دیجئے۔ مجھے بتائیں گے نا؟

بولے' پوچھیے۔

گولڈ اینڈ تھیف

میں نے کہا' یہ بتایئے کہ قدرت اللہ شہاب کون ہے۔

اس پر غفور مسکرا دیئے۔ کہنے لگے' یہ بات میرے علم سے باہر ہے۔ مجھے صرف یہ پتہ ہے کہ وہ اچھے آدمی ہیں اور ان کا یہاں ملک میں رہنا ملک کے لیے باعث برکت ہے۔

لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ ان کا ملک سے باہر جانا ضروری تھا۔

وہ بھی درست ہے۔ غفور نے کہا۔ آپ کو پتہ ہے کہ اچھے لوگوں کے راستے میں رکاوٹیں

رہتی ہیں۔ آپ نے وہ محاورہ سنا ہو گا کہ وہیر دیر از گولڈ دیر از تھیٹ۔

کیا وہ واقعی میں گولڈ ہیں۔

ہاں' وہ بولے' مجھے اس بات کا علم ہے۔

مجھے تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ پیتل ہوں۔

بالکل' وہ بولے جو گولڈ ہوتا ہے وہ گولڈ دکھتا نہیں۔ جو دکھتا ہے وہ گولڈ نہیں ہوتا۔

غفور صاحب کی باتیں سن کر مجھے ٹھنڈا ہو جانا چاہیے تھا۔

لیکن اس کے برعکس ردعمل ہوا۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ خود پر غصہ۔ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ یہ کس طرف چل پڑا ہوں۔ ہٹاؤ مجھے روحانیات سے کیا لینا دینا ہے۔ اگر دنیا کے ساتھ ساتھ اللہ کا ایک نظام چل رہا ہے۔ تو بسم اللہ پڑا چلے۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے۔ آئی ڈونٹ بلانگ ٹواٹ اور میں جاننے کی دھن میں کیوں لگا ہوں۔

دنیا میں بیسیوں باتیں ایسی ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے۔ نہیں سمجھ سکتے۔ روحانی نظام بھی ان میں سے ایک ہے میں خواہ مخواہ کا شرلاک ہومز بنا بیٹھا ہوں۔ اپنی زندگی حرام کر رکھی ہے۔ ہٹاؤ' قدرت اللہ چاہے اللہ میاں کا سپاہی ہے یا لفٹین' وہ جو بھی ہے پڑا ہو۔ مجھے کیا لینا دینا ہے۔

خود فریبی

دو دن میں ذہن میں ڈال کر یہی خیال سوچتا رہا۔

تیسرے دن' میں گھر سے باہر نکل گیا۔ ووگی میں جا بیٹھا۔ ریڈیو سٹیشن پہنچا۔ مسعود' عمر' عماد سے گپیں مارتا رہا۔ مس فخری سے شرارتیں کرتا رہا۔

شام کو جب میں واپس گھر پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ خوش وقتی کی یہ ساری ایکسر سائز سلف امپوزڈ تھی۔ آمد نہیں' بلکہ آورد تھی۔ خود فریبی تھی۔ اپنے دوستوں میں میں وہ نہ تھا جو ہوا کرتا تھا۔

پھر دو ایک دن میں دربار میں جا کر بیٹھا رہا۔ سائیں اللہ بخش سے باتیں کرتا رہا' جیسے پہلے کیا کرتا تھا' لیکن ان باتوں میں وہ لگن نہ تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ مزار مجھے اوپرا اوپرا الگ رہا تھا۔

دل ہی دل میں میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں ملک' راجہ' آغا یا دانی نہ آ جائے۔ کہیں

انہیں پتا نہ لگ جائے کہ مجھ میں وہ جوش عقیدت نہیں رہا تھا' کہ وہاں میں نہیں تھا۔ بلکہ میرا بت تھا۔

میں نے آٹھ دس دن زندگی کے معمولات میں دلچسپی لینے کی کوشش کی' لیکن بات نہ بنی بے کار ہے' بے کار ہے۔

میں نے سوچا۔ ضرور قدرت اللہ نے مجھے کیل دیا ہے۔

مجھ پر جادو کر دیا ہے۔

پہلے بھائی جان نے مجھ پر رقت کر کے بھگو دیا تھا۔

اب قدرت اللہ نے جادو کے زور پر مجھے اکیلا کر دیا ہے۔

چاروں طرف ایک ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ اس ویرانے کے عین مرکز میں میں ایک مرقدی پتھر کی طرح گڑا ہوا تھا اور اس پتھر پر قدرت اللہ کبوتر کی شکل میں بیٹھا غرغٹ غوں' غرغٹ غوں کر رہا تھا۔ اور دور کوئی دکھی زخمی حبشی کراہ رہا تھا۔

درداں مار لیا وے

میرا دل ڈر دا نہ بولے

آغا حنیف

پھر آغا حنیف کی بات چل نکلی۔

میرے نزدیک آغا حنیف کی شخصیت ایک معمہ تھی۔ ایک جانب تو آغا حنیف دور جدید کا نمائندہ تھا۔ خوش لباس تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ڈرائی کلینرز کی دکان سے نکل کر آیا ہو۔ باقاعدگی سے قیمتی سوٹ پہنتا۔ پتلون کی کریز کی دھاریوں نمایاں رہتی جیسے تلوار ہو' بھڑکیلی توجہ طلب نکٹائی۔ دوسری جانب وہ سائیں اللہ بخش کے حجرے میں ۳۵ سال سے روز بلاناغہ حاضری دیتا تھا۔ دفتر سے سیدھا ان کے ڈیرے پر پہنچتا۔ دیر تک سائیں اللہ بخش کی محفل میں بیٹھا رہتا۔

ایک روز سائیں اللہ بخش نے آغا سے کہا' یہ کیا کہ آپ سارنگی کے غلاف جیسا لباس پہن کر محفل میں آ جاتے ہیں۔

سائیں صاحب نے یہ جملہ یا تو ازراہ مذاق کہا ہو گا یا اس لیے کہ پتلون پہن کر فرش پر بیٹھنا

تکلیف دہ ہوتا ہے۔

اس دن کے بعد آغا حنیف نے کبھی پتلون پہن کر محفل میں حاضری نہ دی۔ ساتھ ہی اس نے اپنی خوش لباسی بھی نہ چھوڑی۔ وہ باقاعدہ سوٹ پہن کر ٹپ ٹاپ دفتر جاتا۔ ساتھ ایک تھیلے میں پاجامہ لے جاتا۔ سائیں اللہ بخش کے ڈیرے کی ڈیوڑھی میں پتلون اور ٹائی اتار کر تھیلے میں رکھ لیتا اور پاجامہ پہن لیتا۔ آغا حنیف' سائیں اللہ بخش کا بہت احترام کرتا تھا۔ ان کے احکامات کی پابندی کرتا تھا لیکن محفل میں زیادہ گفتگو نہیں کرتا تھا۔

آغا حنیف کے بھائی بھی کبھی کبھی سائیں جی کے ڈیرے پر حاضری دیتے تھے۔ ان کے دلوں میں سائیں جی کا بڑا احترام تھا۔

آغا کا سارا خاندان ہی مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اعلیٰ عہدوں کے باوجود بڑے انکسار سے دربار میں حاضری دیتے تھے اور دربار میں حاضری دینے والوں سے برادرانہ سلوک کرتے تھے۔

آغا حنیف تھا تو محکمہ ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم' لیکن اسے لکھنے پڑھنے سے بہت دلچسپی تھی۔ اکثر ادبی حلقوں میں جایا کرتا تھا۔

تقسیم سے پہلے برصغیر کی ایک ادبی سوسائٹی تھی جس کا نام (pen) تھا۔

آغا حنیف اس معروف ادبی تنظیم کا علاقائی سیکرٹری تھا۔ باقاعدہ جلسے کرتا تھا۔ اس کے ایک بھائی ضیاء بڑے پائے کے شاعر تھے۔ ان کے کلام کے رنگ میں علامہ اقبال کے کلام کی جھلک تھی۔

آغا حنیف نے ملٹری اکاؤنٹس کا محکمانہ امتحان دے رکھا تھا۔ افسری کا یہ امتحان بہت سے لوگوں نے پاس کر رکھا تھا اور وہ سال ہا سال سے اس امید پر بیٹھا کہ کب اس کی باری آئے اور افسر کی حیثیت سے اس کی تعیناتی ہو۔

افسری

آغا حنیف کو افسر بننے کا بہت شوق تھا۔

سائیں اللہ بخش نے آغا سے وعدہ کر رکھا تھا کہ ہم تمہیں افسر بنائیں گے۔ ضرور بنائیں گے۔

جب کبھی آغا حنیف کے افسر بننے کا امکان پیدا ہوتا تو وہ آ کر سائیں اللہ بخش سے بات کرتا، کہتا جناب میرا نام نائب تحصیل داری کے لیے ریکمنڈ کیا گیا ہے۔ آپ دعا فرمائیں۔

اس پر اللہ بخش کی آنکھوں میں ایک چمک لہرا جاتی۔ بڑی ترنگ میں کہتے، اچھا تو اب آغا صاحب نائب تحصیل دار بنیں گے۔ ساتھ ہی وہ ہاتھ میں کوئی قلم یا لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کر اسے زمین پر یوں زور سے رگڑتے جیسے وہ پیچ کس ہو۔ دیر تک وہ خود کلامی میں محو رہتے۔ اچھا تو آغا صاحب تحصیل دار بنیں گے، تحصیل دار بنیں گے، تحصیل کے حاکم بنیں گے، حکومت کریں گے۔

پھر حالات ایسا پلٹا کھاتے کہ آغا کے نائب تحصیل دار بننے کی بات کھٹائی میں پڑ جاتی۔ بغیر کسی وجہ کے بات التوا میں ڈال دی جاتی۔

کچھ دیر کے بعد پھر آغا حنیف کی ترقی اور افسری کا نیا چانس نکل آتا اور آغا یہ خوشی کی خبر سائیں جی کو سناتا کہتا، حضور اب نائب ڈائرکٹری کا چانس نکلا ہے۔ میرا کیس زبردست سفارش کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ آپ دعا کریں۔

اس پر سائیں اللہ بخش کہتے، اچھا تو آپ نائب ڈائرکٹر بنیں گے وہ بار بار دہراتے مسکراتے اور اپنا پرانا پیچ کس چلاتے رہتے۔

پھر حالات ایسا پلٹا کھاتے کہ آغا کی ترقی کے امکانات کسی وجہ کے بغیر پس پشت ڈال دیئے جاتے۔

ایک روز بھائی جان نے آغا کی غیر موجودگی میں سرکار قبلہ سے کہ، حضور آغا حنیف کو افسر بن جانے دیجیے نا، انہیں افسر بننے کا شوق ہے۔

جلالی بابا

اس پر سائیں اللہ بخش نے بڑے غصے سے بھائی جان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بولے جان محمد ہم اپنا وعدہ ضرور نبھائیں گے، لیکن۔

بھائی جان یہ سن کر خوف زدہ ہو گئے چوں کہ سائیں اللہ بخش جلالی طبیعت کے واقع ہوئے تھے۔ ان کے پانچ مرید تھے جنہوں نے سائیں صاحب کی بیعت کر رکھی تھی، ایک ہندو تھا، چار

مسلمان۔ سائیں جی نے لغزش یا حکم عدولی کی وجہ سے تین مریدوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ چوتھا جو ہندو تھا وہ بھارت بھاگ گیا تھا۔ صرف جان محمد باقی رہ گئے تھے۔

جان محمد بٹ خوبصورت نوجوان تھے۔ خوش پوش تھے۔ پروقار تھے۔ جوانی میں خواتین کی توجہ ان پر مرکوز رہا کرتی تھی۔

کسی نے سائیں اللہ بخش سے بھائی جان کی شکایت کر دی۔ کہنے لگا' سائیں جی اپنے بالکے کا دھیان کرو۔ وہ تو مرغیوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔

یہ سن کر سائیں کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں۔ بولے' اگر وہ مرغیوں کے پیچھے دوڑتا ہے' تو کیوں نہ اسے حلال کر لیں۔ عین اسی وقت خوش قسمتی سے سائیں کرم دین آ گئے۔ سائیں کرم دین زندگی بھر بزرگوں کی محفل میں بیٹھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے وقت بزرگ کی توجہ کے رخ کو بدلنا ضروری ہوتا ہے۔

سائیں کرم دین نے کہا۔ سرکار جان محمد مرغیوں کے پیچھے نہیں دوڑتا۔ الٹا مرغیاں اس کا پیچھا کرتی ہیں۔ اور وہ بیچارہ جان بچاتا پھرتا ہے۔

یوں بھائی جان ہلاکت سے بچ گئے۔

آغا کی بات پر سائیں اللہ بخش کو غصے میں دیکھ کر انہیں گمان ہو گیا کہ حتی الوسع سرکار قبلہ آغا کو افسر بننے نہیں دیں گے۔ پھر جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا' تو بھائی جان نے کہا' حضور یہ نہ بھولیے کہ آپ نے آغا کو افسر بنانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔

ہاں وہ بولے ہمیں یاد ہے۔ ہم وعدہ پورا کریں گے' لیکن وقت کی کوئی قید نہیں۔

پھر سائیں صاحب کا وصال ہو گیا' لیکن آغا کو ترقی نہ ملی' وہ افسر نہ بنا۔

شاید بھائی جان آغا حنیف کو مشورہ دیتے کہ جب افسر بننے کا امکان پیدا ہو تو آپ سرکار قبلہ کو اس کے بارے میں اطلاع نہ دیں' چونکہ ظاہر تھا کہ سائیں اللہ بخش نہیں چاہتے تھے کہ آغا کو ایسے محکمے میں افسری ملے۔ جہاں حرام کی کمائی کھانے کا امکان ہو۔

آغا حنیف بظاہر ایک متحمل فرد تھا۔ اخلاق کا پابند تھا۔ اس کا برتاؤ لوگوں سے بہت اچھا تھا۔ بڑا ہمدرد تھا۔ خدمت گزار تھا' لیکن اس کے اندر بلا کا غصہ دبا ہوا تھا۔ غصے کا اظہار کبھی کبھار ہوتا تھا' لیکن جب ہوتا تو گویا آتش فشاں پھٹ جاتا تھا۔ اس میں مجذوبیت کا عنصر موجود تھا۔ شاید اس

بنا پر سائیں اللہ بخش نہیں چاہتے تھے کہ آغا کو اقتدار حاصل ہو۔

مشکل یہ تھی کہ آغا حنیف کسی بات میں بھائی جان سے مشورہ کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ بھائی جان کو نہیں مانتا تھا' چونکہ وہ سمجھتا تھا' کہ مرتبے میں کسی صورت وہ بھائی جان سے کم تر نہ تھا چونکہ اس کا سائیں اللہ بخش سے براہ راست تعلق تھا۔ اور یہ تعلق بہت قدیم تھا۔ وہ اکثر ہمیں طعنہ دیا کرتا کہ آپ تو احکامات مری سے لیتے ہیں۔(مری میں بھائی جان مقیم تھے) ہم تو براہ راست سرکار قبلہ کے حکم کے پابند ہیں۔

دُو رخی

میں سوچ میں پڑ جاتا۔ ایسا کیوں ہے کہ ایک ہی بزرگ کے دو بالکے۔ ایک دوسرے سے خار کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بر سرپیکار رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ بڑے اخلاق سے ملتے ہیں' لیکن درپردہ دل ہی دل میں یہ جذبہ موجود رہتا ہے کہ دوسرے کو نیچا دکھائیں۔ رقابت اور کمپیٹیشن کا جذبہ رچائے رکھتے ہیں۔

پیرو مرشد کو اس دو رخی کیفیت کا علم ہوتا ہے' مگروہ التزاماً" دخل انداز نہیں ہوتے۔

قدرت اللہ شہاب سے ملنے کے بعد اس کے توسط سے مجھے اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ عام طور سے بزرگ ایک دوسرے سے پرخاش رکھتے ہیں۔ اور اس پرخاش کا عملی طور پر اظہار کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

مجھے اس بات کا بھی شعور ہو چکا تھا کہ ہر بزرگ کو اپنے مرتبے پر مان ہوتا ہے کہ ہر بزرگ میں ایک ایسی ہی "میں" ہوتی ہے جیسے عام آدمیوں میں ہوتی ہے۔ انہیں اپنے سٹیٹس کا احساس ہوتا ہے۔

بزرگوں کے درمیان اختلافات ہوتے ہیں۔ کولڈ وار ہوتی ہے' دبی دبی ڈھکی چھپی لڑائی۔ ان میں اعلانیہ جنگیں بھی ہوتی ہیں۔ جو کبھی کبھی ہلاکت تک پہنچ جاتی ہیں۔

میرے لیے یہ عجیب انکشافات تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ بزرگی "میں" کی نفی کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

قدرت اللہ شہاب کے کردار کا بنیادی عنصر عجز تھا۔ وہ کسی شخص کو خود سے کمتر نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن بزرگوں کے ساتھ اس کا رویہ قطعی طور پر مختلف ہوتا تھا۔ عام آدمیوں سے وہ جھک کر بات کرتا تھا' لیکن بزرگوں سے بات کرتے ہوئے وہ تن کر کھڑا ہو جاتا۔

مدینہ شریف سے مجھے ایک بزرگ کا خط موصول ہوا' لکھا تھا' ہم یہاں شہاب صاحب کے لیے دعائیں کر رہے ہیں۔

خط پڑھ کر میرے دل میں شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہوا شہاب کو خط دکھایا تو وہ بڑی بے نیازی سے بولا' دعائیں کرنے کے لیے ان کی ڈیوٹی لگی ہوئی ہو گی۔

قدرت کا جواب سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

حجت

ایک دن میں نے قدرت اللہ سے پوچھا کہ آج کل بزرگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ کیا وجہ ہے۔

بولا' آج کل بزرگ تو ہیں' لیکن سیکشن افسر قسم کے ہیں۔

ایک دن حجت کے متعلق بات ہو رہی تھی۔ اس روز قدرت اللہ چھلکن کے عالم میں تھے۔ اس کیفیت میں وہ عجیب و غریب قسم کی باتیں کر دیا کرتے تھے' ایسی باتیں جو وہ عام حالت میں کرنے سے گریز کیا کرتے تھے۔

کہنے لگے' ایک صاحب تھے جو ریاضی میں ایم اے کر چکے تھے انہیں روحانیت کا شوق چڑھ آیا۔ عبادت کرنے لگے' پھر تزکیہ نفس کیا۔ وہ روزانہ داتا صاحب کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے۔ وہ اس مرتبے پر پہنچ گئے کہ داتا صاحب کے روبرو بیٹھ کر حاضری کی صورت پیدا ہو گئی۔ ایک روز وہ داتا صاحب کے روبرو بیٹھے تھے۔ داتا صاحب نے کوئی بات کی تو وہ بولے' نہیں سرکار یہ بات تو ریاضی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ داتا صاحب نے غصے سے ان کی جانب دیکھا اور اپنی بات پھر دہرا دی۔ ان صاحب نے اپنا اعتراض پھر دہرا دیا۔ اس پر داتا صاحب نے ان کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ ان کی بائیں آنکھ پھوٹ کر بہہ گئی۔

لیکن کیوں' میں نے پوچھا۔

قدرت بولے' بزرگ حجت برداشت نہیں کرتے' حجت کرنا پروٹوکول کے خلاف ہے۔

یہ سن کر میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔ داتا اور کسی کو تھپڑ ماریں۔ وہ داتا جو صرف دینا جانتے تھے۔ جو اب بھی وصال کے بعد سائلوں کو دے رہے ہیں' دیئے جا رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ سائلوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا ہے یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ بات آغا صاحب کی ہو رہی تھی۔

مجذوبیت

آغا حنیف میں دبی ہوئی شدت تھی جس کا اظہار کبھی کبھار ہوتا تھا۔ ایک روز آغا مزار پر آئے' آتے ہی انہوں نے خلاف معمول با آواز بلند سائیں اللہ بخش کو للکارنا شروع کر دیا۔ گالیاں دینی شروع کر دیں۔ آغا کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ چہرہ سوجا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

پھر وہ تشدد پر اتر آئے۔ مزار کی چوکھٹ کو اکھاڑنے کی کوشش کی۔ مزار پر پتھراؤ کیا۔ سرکار قبلہ کو مخاطب کر کے نازیبا باتیں کیں۔ مزار کے قریب رہنے والے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ وہ حیرت سے آغا کی طرف دیکھ رہے تھے' لیکن کسی میں اتنی جرات نہ ہوئی کہ آغا صاحب سے کچھ کہے۔

می را

می را مزار کا خادم تھا۔ میرے کا مکان مزار کے پہلو میں تھا۔ وہ ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑی میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتا تھا۔ اور مزار کی خدمت کیا کرتا تھا۔ جھاڑو دیتا' صفائی کا خیال رکھتا۔ میرے کی حیثیت ایک چوکیدار خادم کی تھی۔ میرا مزار کا متولی نہیں تھا۔ سائیں اللہ بخش کا حکم تھا کہ مزار پر کوئی شخص متولی بن کر نہ بیٹھے۔ مزار پر چھت تعمیر نہ کی جائے۔ مزار کی چار دیواری کو اونچا نہ کیا جائے۔

بھائی جان نے ہمیں بتایا تھا کہ سرکار نہیں چاہتے کہ ان کی قبر کو مقبرہ بنا دیا جائے اور وہاں متولی آ بیٹھیں۔

بھائی جان نے ہمیں بتایا تھا کہ دو ایک افراد نے مزار پر بیٹھنے کی کوشش کی تھی' لیکن

تیسرے دن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے تھے۔ یہ بڈھا بڑا ڈاڈا ہے۔ کسی کو مزار پر بیٹھنے نہیں دیتا۔

جب بھائی جان مری سے آئے تو میرے نے آغا صاحب کی اس مجذوبانہ کیفیت کی رپورٹ دی۔

بھائی جان یہ سن کر چپ ہو گئے۔

راجہ شفیع نے کہا' آغا صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

میرا بولا' جناب اس روز آغا صاحب اپنے آپ میں نہیں تھے۔

وانی نے کہا' یہ صاحب مزار کی تذلیل ہوئی۔

بھائی جان بولے' شاید آغا صاحب کو کچھ ملنے والا ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولے۔

ضرور ملنا چاہیے۔ انہوں نے تیس سال سرکار قبلہ کی خدمت کی ہے اور فقیر کی خدمت رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔

راجہ کہنے لگا' یہ تو مجذوبانہ رنگ ہے۔ ظاہر ہے کہ فقیر نے جو دیا ہے آغا صاحب میں اسے سنبھالنے کا ظرف نہیں ہے۔

بھائی جان بولے' جو دیتا ہے وہ ساتھ ظرف بھی دے گا۔

وانی نے کہا' آپ آغا سے بات تو کریں۔

نہیں بھائی جان نے کہا' یہ آغا اور سرکار قبلہ کا معاملہ ہے۔ ہم اس میں دخل دینے والے کون ہیں۔

اسی روز آغا صاحب کے دونوں بھائی مزار پر آ گئے۔ وہ بھائی جان کی خدمت میں وفد کی صورت میں آئے تھے انہوں نے آ کر بتایا کہ آغا ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ گھر میں با آواز بلند فحش گالیاں دیتے ہیں' نازیبا حرکتیں کرتے ہیں۔ جناب ہم ایک شریف خاندان کے فرد ہیں۔ آغا کی یہ کیفیت ہمارے لیے باعث بدنامی ہے۔ ازراہ کرم ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائیں۔

بھائی جان بولے' ہمیں ایسا لگتا ہے' جیسے آغا صاحب کو مرتبہ ملنے والا ہے۔

نہیں جناب' انہوں نے جواب دیا۔ ہمیں ایسا مرتبہ نہیں چاہیے جو باعث بدنامی ہو اور روحانی کوفت کا باعث ہو۔

بھائی جان نے کہا' دیکھیے یہ معاملہ دینے والے اور لینے والے کے درمیان ہے۔ دینے والا جانے اور لینے والا۔ہماری کوئی حیثیت نہیں کہ اس بات میں دخل دیں۔ آپ سرکار قبلہ کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کر دیں اور دعا کریں کہ آغا حنیف کو ظرف عطا کیا جائے کہ وہ سرکار قبلہ کی دین کے متحمل ہو جائیں۔

درخواست

آغا حنیف نے ہمیں بتائے بغیر ایک درخواست صدر ایوب کی خدمت میں بھیجی تھی۔ جس میں لکھا تھا کہ میں ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہوں۔ افسری کا محکمانہ امتحان پاس کر چکا ہوں۔ تقرری کا انتظار ہے۔ عالی جاہ میں ادبی ذوق رکھتا ہوں اور ایک انٹرنیشنل ادبی سوسائٹی کا سیکرٹری رہا ہوں۔ ادیبوں اور صحافیوں سے میرا رابطہ ہے' میں اس بات کا خواہاں ہوں کہ مجھے وزارت انفرمیشن میں کوئی سیٹ عطا کی جائے۔ صدر ایوب نے یہ عرضی قدرت اللہ شہاب کو بھیج دی۔ لکھا' اگر اصولی طور پر ممکن ہو تو آغا حنیف کو وزارت اطلاعات میں کوئی پوسٹ دے دی جائے۔

جب یہ درخواست شہاب کے پاس آئی تو وہ بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے' آغا صاحب نے یہ بات مجھ سے کیوں نہ کی۔ وہ درخواست چند ایک ماہ ویسے ہی پڑی رہی۔

میں نے چار ایک بار شہاب کو یاد دلایا کہ آغا کی عرضی پر آپ نے کوئی ایکشن نہیں لیا۔

ہر بار وہ جواب دیتا' کہ ہاں۔ بڑا اچھا کیا کہ آپ نے مجھے یاد دلایا۔

جب بھی میں آغا کی عرضی کی بات کرتا تو شہاب یہی جملہ دہرا دیتا' لیکن عملی طور پر کچھ بھی نہ کرتا۔

ایک روز تنگ آ کر میں نے شہاب سے کہا۔ کیا آپ بھی آغا کے لئے سرکار قبلہ کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔

اس نے پوچھا' سائیں اللہ بخش صاحب کی کیا پالیسی تھی۔

میں نے اسے ساری بات بتائی کہ جب کبھی آغا صاحب کے افسر بننے کے امکانات پیدا ہوتے تھے' سرکار قبلہ التزاماً" رخنا ڈال دیتے تھے۔ آپ بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔

یہ سن کر شہاب چپ ہو گیا۔ میں نے ضد کی تو بولا۔ ہاں آغا صاحب کی تعیناتی سائیں اللہ

آ جایئے' اندر سے گھمبیر آواز آئی۔

اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ چھ سات سائل بیٹھے ہیں۔ درمیان میں بابا بیٹھا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر جا بجا قرآنی آیات کے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ ایک دیو ہیکل تسبیح ایک طرف ڈھیر کی ہوئی ہے۔

سائل باری باری بابا سے اپنے مسائل کے متعلق پوچھتے۔ بابا بڑے غور سے ہر سائل کی بات سنتا اور پھر گردن لٹکا کر گہری سوچ میں پڑ جاتا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ سر اٹھاتا اور سائل کو جواب دے دیتا۔

صغیر کو دیکھ کر بابا ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا آپ خیریت سے ہیں صغیر صاحب۔

جی قاضی صاحب' اللہ کا شکر ہے۔

کیسے آنا ہوا' قاضی نے پوچھا۔

آپ نے فرمایا تھا نا کہ منگل کو آنا اس لیے میں حاضر ہو گیا ہوں۔

بابا مسکرایا بولا' صغیر صاحب آج تو سوموار ہے۔

اوہو صغیر بولا' میں سمجھا منگل ہے۔

کل آیئے نا' بابا نے کہا' پھر میری طرف مخاطب ہوئے بولے۔

فرمایئے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔

صغیر بولا' یہ میرے عزیز دوست ہیں۔

ہاں تو فرمایئے' بابا نے مجھے مخاطب کیا۔

مجھے تو جناب کچھ نہیں پوچھنا' میں نے جواب دیا میں تو صرف سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں' میں نے کہا۔

خوب خوب بڑی کرم نوازی ہے آپ کی' بابا نے کہا۔

صغیر بولا۔ حضور ان کے ایک دوست ہیں۔ ان کی تعیناتی ملک سے باہر ہو گئی ہے۔ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کب واپس آئیں گے۔

ان کا اسم گرامی بابا نے پوچھا۔

جناب ان کا نام ہے قدرت اللہ' صغیر نے جواب دیا۔

قاضی بابا سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

پھر دفعتاً بابا نے سر اٹھایا بولے' یہ تو آپ نے اچھا نہیں کیا۔

صغیر صاحب۔ یہ تو آپ نے زیادتی کر دی۔

بابا کی اس بات پر ہم حیران ہوئے۔

بابا بولے' میں تو ایک چھوٹا سا آدمی ہوں۔ آپ نے بکری کو شیر کے روبرو بٹھا دیا۔ نہ صغیر صاحب کہاں بکری کہاں شیر۔

بخش خود کریں گے۔ مجھے مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

جب شہاب ہالینڈ روانہ ہونے لگا تو میں نے پھر آغا کی عرضی یاد دلائی۔

کہنے لگا' میں نے وہ عرضی الطاف گوہر کو دے دی ہے وہ اس پر ایکشن لیں گے۔

یہ بات حیران کن تھی چونکہ شہاب ہر سائل سے اظہار ہمدردی کیا کرتا تھا اور حتی الوسع کوشش کرتا کہ اس کی مدد کرے' کیا مرد قلندر نے اسے منع کر دیا تھا کہ آغا کی عرضی پر ایکشن نہ لے۔

تعیناتی

یہ بات میرے لیے حیران کن تھی۔ الطاف گوہر بنیادی طور پر فنانس کے افسر تھے۔ انہیں رولز اور ریگولیشن کا علم تھا' پھر انہوں نے یہ غلطی کیوں کی کہ آغا کی جو ملٹری اکاؤنٹس میں ایک ریگولر پوسٹ پر فائز تھے ایک کانٹریکچول پوسٹ دے دی۔

آغا مجھ سے ملے کہنے لگے' مفتی صاحب زبان بند رکھیئے گا۔ اس بے ضابطگی کی طرف توجہ نہ دلائیے گا۔ سرکار قبلہ کا وار چل گیا ہے۔ مجھے یقیناً افسری ملے گی۔ مرد قلندر کے حکم کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا آغا صاحب میں تو زبان بند رکھوں گا' لیکن اگر اے او نے بے ضابطگی کی نشاندہی کر دی تو۔

اے او آپ کا دوست ہے وہ بولے۔ آپ اسے بات سمجھا دیں۔

صغیر ہمارے اے او تھے میں صغیر صاحب سے ملا۔ صغیر صاحب سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔ اور وہ طبعاً" ہمدردانہ رویہ رکھتا تھا۔

صغیر کو بات بتائی تو وہ بولا' نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ الطاف گوہر ایسی غلطی نہیں کر سکتے۔ میں نہیں مانتا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں' لیکن جب کاغذات آپ تک پہنچیں تو غلطی کی نشاندہی نہ کرنا۔

تقریباً" ایک سال آغا اس کنٹریکچول آسامی پر کام کرتا رہا۔ اس کے بعد اس کے پیرنٹ محکمے ملٹری اکاؤنٹس سے ایک خط موصول ہوا۔ لکھا تھا آپ نے ہمارا آدمی بنام آغا حنیف مستعار لے رکھا ہے۔ مہربانی سے اس کے متعلق حتمی فیصلہ کریں یا تو اسے اپنے محکمہ میں

پرمانسنٹ پوسٹ دے دیں بصورت دیگر اسے واپس بھیج دیں۔

اس خط کو پڑھ کر الطاف گوہر کو احساس ہوا کہ غلطی ہو گئی ہے۔ الطاف گوہر حیران تھے کہ یہ غلطی کیسے ہوئی۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ الطاف گوہر کو کیا پتا تھا کہ یہ ایک مرحوم قلندر کی شرارت تھی۔ الطاف گوہر اس بات کو کیسے سمجھتے وہ تو ایک سکہ بند دانشور تھے۔ صرف عقل کو مانتے تھے۔ ان کے ذہن میں قابلیتوں اور صلاحیتوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

قدرت اللہ شہاب الطاف گوہر کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ کہتے تھے' اس شخص کو اللہ نے بڑی صلاحیتیں دی ہیں' مگر سول سروس میں کامیابی حاصل نہیں ہو گی۔

میں نے پوچھا' کامیابی کیوں نہ ہو گی۔

بولے' سول سروس میں پیچھے پیچھے چلنے والوں کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ آگے چلنے والوں کو نہیں۔ سول سروس میں میڈیا کر پھلتے پھولتے ہیں۔

بہرحال۔ آغا کی تعیناتی میں غلطی کو دور کرنا لازم ہو گیا۔

اور الطاف گوہر نے جوں توں کر کے آغا کے لیے انفرمیشن افسر کی آسامی نکالی اور آغا کو افسری مل گئی۔

یہ خبر آغا کو ملی تو وہ جلال میں آ گئے' بولے شہاب نے تو کچھ نہ کیا تھا اور اسی لیے انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ آخر کار قبلہ خود میدان میں آ گئے۔ ان کی بات کو کون ٹال سکتا ہے۔

بھائی جان بولے' یہ بڈھا بڑا ڈاڈا ہے۔

اس پر صغیر بہت حیران ہوا۔ کہنے لگا مفتی جی' یہ کون بزرگ ہے۔ جس نے بیورو کے تمام افسروں کو اندھا کر دیا۔

میں نے کہا۔ تم حاضری دینا چاہتے ہو کیا۔

شیر اور بکری

بولا ہاں' پھر کہنے لگا۔ میرا بھی ایک بابا ہے۔ میں بھی آپ کو لے چلوں گا اس کے پاس۔

صغیر مجھے سیٹلائٹ ٹاؤن کے ایک مکان میں لے گیا۔

اس نے دروازہ بجایا۔

پھر مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ بے شک بزرگوں کو کچھ طاقتیں حاصل ہوتی ہیں' لیکن ان کو استعمال کرنے پر اتنی پابندیاں ہوتی ہیں کہ پنجابی کی یہ کہاوت صادق آتی ہے کہ

"دھن پر بھانی جیڑی سرہانے دُدھ رکھ کے سوندی۔"

مطلب ہے کہ اس چودھرایں کا بڑا دل گردہ ہے جس کے سرہانے دودھ رکھا ہو اور وہ اسے پیے بغیر سو جائے۔

ایسے ہی بزرگوں کا حال ہے دودھ کی گڑوی سرہانے رکھی ہے' لیکن پینے کی ممانعت ہے۔

کہتے ہیں حضرت علیؓ جنگ میں تلوار زنی کر رہے تھے۔ ایک دشمن کو گرا دیا۔ اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے' سینے میں تلوار بھونکنے والے تھے کہ دشمن نے ان کے چہرے مبارک پر تھوک دیا۔ آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ دشمن کو قتل کیے بغیر اٹھ بیٹھے اور اسے چھوڑ دیا' کسی نے پوچھا' یہ کیا کیا آپ نے۔ فرمایا' اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تھا' اس کے بعد اسے قتل کرتا تو اس میں ذات کا غصہ شامل ہوتا اور انتقام کا عنصر بھی آ جاتا۔ جنگ میں تو صرف اللہ کے نام پر قتل کرنے کی اجازت ہے۔

میں نے جانا' بزرگ پر لازم ہے کہ وہ لاگ لگاؤ سے پاک ہو۔ بندہ بشر ہوتے ہوئے لگاؤ سے پاک رہنا۔ بے حد مشکل ہے۔

میں نے جانا کہ بزرگ کسی کے دوست نہیں ہوتے' کسی کے دشمن نہیں ہوتے۔ کسی کے عزیز نہیں ہوتے۔ کسی کو عزیز نہیں رکھتے۔ اگر انہیں حکم ہو جائے کہ بیٹے کو قربان کر دو' تو وہ بڑے اطمینان سے بیٹے کو انگلی لگا کر قربان گاہ کی طرف چل پڑتے ہیں۔

جوں جوں میں بزرگ کے مفہوم کو سمجھتا گیا توں توں میرے دل میں بزرگوں کے لیے احترام اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے گئے۔ احترام اس لیے کہ وہ اللہ والے ہیں اور ان میں اتنا دل گردہ ہے' اتنا صبر ہے' تحمل ہے' برداشت کرنے کی طاقت ہے کہ وہ ذات کی نفی کرنے کی ہمت رکھتے ہیں اور ہمدردی اس لیے کہ وہ اتنے مجبور ہیں پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ آؤ ہم تمہیں بزرگ بنا دیں' تو میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ نہ حضور مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالیے' میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھ پر یہ ظلم نہ کیجیے۔

کرامتیں

ان دنوں جب میں بزرگوں کے تذکرے پڑھا کرتا تھا تو مجھے تذکرے لکھنے والوں پر بڑا غصہ آتا تھا۔ تذکرے بزرگوں کی کرامتوں سے بھرے ہوتے تھے۔ کوئی تذکرہ نویس' صاحب تذکرہ کے کردار کے متعلق نہیں لکھتا تھا کہ وہ کتنے عظیم کردار کے مالک تھے۔کوئی اس پر روشنی نہیں ڈالتا تھا۔ کوئی انہیں انسان کی حیثیت دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ سبھی بزرگ کی بات کرتے ہیں ان کی سپر نیچرل قوتوں کی بات کرتے تھے۔ کشف کی بات کرتے تھے' کرامتوں کی بات کرتے تھے۔ ان کی بشری کمزوریوں کی بات کرتے نہیں تھے۔اس مسلسل کشمکش کی بات نہیں کرتے تھے۔ جس میں وہ گرفتار رہتے ہیں۔ اس مسلسل امتحان اور آزمائش کی بات نہیں کرتے جس کے تحت وہ زندگی گزارتے ہیں۔ بزرگوں کے تذکرے پڑھ کر قاری سمجھتا ہے کہ بزرگ ایک صاف ستھرا' نہلایا دھویا ہوا' پاک صاف شخص ہوتا ہے' جو ایک اعزازی تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور جسے سپر نیچرل قوتیں حاصل ہوتی ہیں۔

ولایت

اس زمانے میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جب انسان کو بزرگی عطا ہوتی ہے تو کپڑے کی طرح اسے دھو کر استری کی دی جاتی ہے' کوئی الائش باقی نہیں رہتی۔

ایک دن میں نے شہاب سے اس بارے میں پوچھا۔

کہنے لگا' مجھے تو اس بارے میں علم نہیں' لیکن بزرگوں سے سنا ہے کہ بزرگی عطا ہوتی ہے تو تمام حسیات میگنی فائی MAGNIFY ہو جاتی ہیں' رجحانات میں تیزی آ جاتی ہے' شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ خواہشات میں دھار پیدا ہو جاتی ہے

کیا مثبت رجحانات میں ہی شدت پیدا ہوتی ہے' میں نے پوچھا۔

نہیں' وہ بولا' مثبت اور منفی دونوں رجحانات چار چھ گنا تیز ہو جاتے ہیں۔

میں نے پوچھا' یہ ولایت کیا چیز ہے۔

کہنے لگا' غفور صاحب نے ایک مرتبہ بتایا تھا مجھے۔

چالیسواں باب

بزرگ اور آزمائش

بزرگ

دراصل ان دنوں میں بزرگ کے مفہوم کو نہیں سمجھتا تھا۔

ان دنوں میں سمجھتا تھا کہ بزرگ بڑے طاقت ور لوگ ہیں۔ مستقبل میں جھانک سکتے ہیں۔ لوگوں کے رخ بدل سکتے ہیں تقدیریں بدل سکتے ہیں۔ کرامات دکھا سکتے ہیں اور یہ طاقتیں انہیں مجاہدہ اور عبادات کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں پھر بزرگوں سے رابطہ کے بعد آہستہ آہستہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ بزرگوں کے متعلق میرا نظریہ بالکل غلط تھا۔

بزرگ تو بڑے عاجز اور بے بس ہوتے ہیں۔ عام انسان کی طرح آزاد نہیں ہوتے بلکہ احکامات کے پابند ہوتے ہیں۔ اتنی پابندی کہ ان کا بال بال بندھا ہوتا ہے۔ اخلاق کی پابندی، خدمت خلق کی پابندی، شریعت کی پابندی، پراٹوکول کی پابندی، ایک کڑے ڈسپلن کی پابندی اور سب سے بڑھ کر کلم کی پابندی۔ کلم کے چناؤ میں ان کی اپنی مرضی کا دخل نہیں ہوتا۔

داتا صاحب کی کتاب پڑھ کر مجھے پتہ چلا کہ دنیاوی نظام کے ساتھ ساتھ انڈر گراونڈ ایک روحانی نظام چل رہا ہے جہاں ایک کڑا نظم و ضبط رائج ہے۔ جہاں جواب طلبیاں نہیں ہوتیں،

اپنی پوزیشن کو صاف کرنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا بلکہ نام کاٹ دیا جاتا ہے۔ سال ہا سال کا مجاہدہ ایک چھوٹی سی لغزش کی وجہ سے مٹی میں مل جاتا ہے۔

بزرگ لوگوں پر مسلسل خوف طاری رہتا ہے' اللہ کا خوف کہ جانے یا ان جانے میں حکم عدولی نہ ہو جائے۔ کہیں وہ لاگ لگاؤ کے پھیر میں نہ آ جائیں۔ کہیں نفس شبخون نہ مارنے دے۔

ابتدائی ایام میں جب مجھے شعور نہ تھا کہ شہاب چھلکن کے عالم میں ہے' جب مجھے علم نہ تھا کہ جو بھرے ہوتے ہیں وہ چھلک بھی جاتے ہیں' جب مجھے یہ شک نہیں پڑا تھا کہ وہ کامی ہے اور کسی کام پر مامور ہے' یا وہ بھرا ہوا ہے۔ اس نے اتفاقاً" کہا تھا' اگر میں اپنے مشن میں کامیاب نہ ہوا تو جانتے ہو کیا ہو گا۔ میں ایک اپاہج ہوں گا۔ سڑک کے کنارے پڑا ہوں گا۔ میرا سارا جسم گل چکا ہو گا۔ اس میں سنڈیاں رینگتی ہو گی۔ لیکن میرا ذہن بالکل ٹھیک ہو گا۔ حسیات بیدار ہوں گی' تاکہ اذیت کا احساس ہوتا رہے اور میری کیفیت ایسی ہو گی کہ لوگوں کو مجھ سے کراہت آئے گی۔ جسم سے بدبو کے بھبھاکے اٹھیں گے۔ کوئی شخص میرے قریب نہیں پھٹکے گا۔

اس کی یہ بات سن کر مجھے حیرانی ہوئی۔ یہ کس مشن کی بات کر رہا ہے۔ صدر کے سیکرٹری کا کیا مشن ہو سکتا ہے بھلا۔ یہی نا کہ صدر کے احکامات کی تعمیل کرے اور اگر صدر ناراض ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا ناکہ نوکری سے برخواست کر دے۔

۱۹۶۸ء میں جب شہاب اور میں نے اکٹھے حج کیا تھا۔ حج کے دوران شہاب نے مجھے بتایا کہ عام بزرگوں کو حج کرنے کا شوق نہیں ہوتا۔ چوں کہ جب وہ مسجد حرام میں داخل ہوتے ہیں تو جیسے جوتا باہر اتارنا پڑتا ہے' ایسے ہی جوتے کے ساتھ اپنی دستار بزرگی کو بھی اتارنا لازم ہوتا ہے۔ چوں کہ حرم میں صرف بندے کی حیثیت سے داخل ہو سکتے ہیں اور یہ یقینی نہیں ہوتا کہ واپسی پر انہیں قبائے بزرگی مل جائے گی ملے ملے' نہ ملے نہ ملے۔

پھر مجھے پتہ چلا کہ قیامت کے بعد جب جزا سزا کی کچہری لگے گی' تو عام آدمی سے پوچھا جائے گا کہ اس نے کتنے اچھے کام کیے اور ہر اچھے کام کا اجر دیا جائے ' لیکن بزرگ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کو سو نیکیاں کرنے کی استطاعت دی گئی تھی' لیکن آپ نے صرف ۳۰ نیک کام کیے۔ اتنے کم کیوں کیے جواب دو۔

نہ مانیں۔' سوواٹ۔

میں نے کہا اس روز آپ کو پیغام ملا تھا۔ کہ یہ نوٹ جو آپ لکھ رہے ہیں غلط ہے' جو لکھ کر پھاڑ چکے ہیں' وہ صحیح تھا۔ کیا یہ مافوق الفطرت پیغام نہیں تھا۔

دیکھیے وہ بولا۔'مافوق الفطرت واقعہ نہ تھا' کسی کرم فرمانے ہدایت دی تھی۔ فرض کیجئے اگر وہ سپرنیچرل بھی تھا تو میں اسے عمل میں نہیں لایا تھا۔ میں مافوق الفطرت واقعات جنریٹ نہیں کرتا۔ اگر مجھ پر ایسے واقعات ہوتے ہیں تو یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

یہ واقعات کون عمل میں لاتے ہیں۔

مجھے علم نہیں۔ غالباً" دی فورسز بی یونڈ۔

قدرت اللہ شہاب نے شہاب نامے کے آخری باب میں لکھا ہے کہ چھبیس سال مجھ سے خفیہ خط و کتابت ہوتی رہی۔ اگر شہاب مجھے یہ بات بتا دیتا تو میرا کرید کا جذبہ ختم ہو جاتا۔ لیکن شہاب نے مجھے یہ بات کبھی نہیں بتائی تھی۔

شہاب کے متعلق میں نے چند باتیں محسوس کی تھیں۔

۱۔ کہ وہ ایک بلند کردار کا مالک ہے۔

۲۔ کہ وہ بہت اچھا انسان ہے۔

۳۔ اللہ کا عاجز بندہ ہے۔

۴۔ حضورؐ سرور کائناتؐ کا ادنیٰ غلام ہے۔

۵۔ اسے پر اسرار ہدایات ملتی رہتی ہیں اور سرزنش ہوتی رہتی ہیں۔

۶۔ اس نے کبھی دعویٰ نہ کیا تھا کہ وہ بزرگ ہے یا اسے کوئی منصب حاصل ہے۔

۷۔ چوں کہ ہدایات ملتی تھیں اس لیے ظاہر ہے کہ وہ کسی کام پر مامور تھا۔ اسے کچھ کرنا تھا۔ کیا کرنا تھا' اس کام کا مجھے علم نہ ہوا۔ البتہ اس نے چھلکن کے عالم میں کئی بار مجھے بتایا تھا کہ اگر میں اپنے مشن میں کامیاب نہ ہوا تو میرا حشر کیا ہو گا۔

تو شہاب سے میری دلچسپی صرف اسرار کی وجہ سے تھی یا اس کے عظیم کردار کی وجہ سے' میں اس کا احترام کرتا تھا۔

اگر وہ بزرگ ہوتا۔ یا بزرگ ہونا تسلیم کر لیتا اور مجھ سے کہتا کہ میری بیعت کر لو اور

میرے مرید بن جاؤ' تو میں یقیناً انکار کر دیتا اس لیے کہ مجھ میں حوالگی اور سپردگی کی اہلیت سرے سے موجود نہیں ہے۔ مجھ میں عمل کی صلاحیت نہیں ہے اور میں جسمانی اور ذہنی طور پر ایک ناپاک شخص ہوں۔ پاکیزگی میرے مقدر میں نہیں ہے۔

انہوں نے تصویر کھینچی تھی۔ کہنے لگے' جب ولایت ملتی ہے تو کچھ اس قسم کا منظر ہوتا ہے کہ سمندر کا کنارا ہوتا ہے۔ سامنے اتھاہ سمندر ہوتا ہے۔ طوفان زدہ سمندر' جو بے کنارہ ہوتا ہے' ولی کو ایک ٹوٹا ہوا چپو اور پھوٹی ہوئی کشتی دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں میاں اب تیری ہمت ہے۔ اس روحانی سمندر میں جتنی دور جا سکتا ہے چلا جا۔

یہ تو بڑی بے بسی اور بے چارگی کی بات ہے' میں نے کہا۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ ولایت بہت بڑا اعزاز ہے۔

ہاں ہے' وہ بولا' بڑا اعزاز ہے۔ ساتھ ہی بہت بڑی بے بسی ہے' بے چارگی ہے۔ دونوں پہلو ہیں۔ لوگ صرف ایک پہلو دیکھتے ہے۔

شہاب جی مجھ سے ایک وعدہ کریں' میں نے کہا۔

کیا' وہ بولا۔

مجھے اس کشٹ سے بچالیں۔

کیا مطلب' وہ بولا۔

مجھے ڈر ہے کہ بھائی جان یا کوئی اور بابا مجھے اللہ کی راہ پر نہ ڈال دے۔ مجھے وردی نہ پہنا دے۔ دیکھنے میں ایک بودا اور کمزور آدمی ہوں' آرام طلب ہوں' محنت یا مشقت کا اہل نہیں۔ میری قوت ارادی بہت کمزور ہے۔ مجھ میں حوصلہ نہیں' صبر نہیں' برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔ میں ایک عام بندے کی حیثیت سے جینا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا' میں ڈرتا ہوں اگر بھائی جان یا کسی اور نے مجھے سپاہی کی وردی پہنا دی تو میں مارا جاؤں گا۔ آپ جانتے ہیں' میں ایک جذباتی آدمی ہوں' میں سالک نہیں بن سکتا۔ مجھ میں توازن کا فقدان ہے۔ میری طبیعت میں مجذوبیت کا عنصر حاوی ہے۔ میں عقل و خرد کھو دوں گا۔ اپنا ہوش نہیں رہے گا۔

وہ میری بات سن کر خاموش ہو گیا۔

پھر بولا' لوگ تو یہ اعزاز حاصل کرنے کی خواہش کرتے ہیں۔

شاید میں بھی کرتا۔ اگر آپ سے نہ ملتا تو شاید کرتا' لیکن میں نے تصویر کا دوسرا رخ دیکھ لیا

ہے۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔

میری بات سن کر وہ پھر خاموش ہو گیا۔

کہنے لگا مفتی صاحب آپ کو سن کر حیرت ہو گی کہ میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں ایک عام مسلمان اللہ کا بندہ بن کر جینے سے بہتر کوئی صورت نہیں' کوئی مرتبہ نہیں۔

بے شک آپ ایک مسلمان ہیں' میں نے کہا' لیکن آپ عام بندہ نہیں ہیں۔ جواب میں اس نے کچھ کہنا چاہا' لیکن میں نے اسے چپ کرا دیا۔

میں نے کہا شہاب صاحب' ہیوی لائیز دی ہیڈ دیٹ ویرز دی کراؤن۔

اگر ایسا ہوتا

اگر شہاب ایک بار میرے سامنے تسلیم کر لیتا کہ میں ایک بزرگ ہوں تو ساری بات ہی ختم ہو جاتی۔ میں اسے ایک بابا مان لیتا۔ میرے دل میں اسرار کی حیرت نہ رہتی اور میرے اندر کے دانش ور کو جاننے کا خبط نہ رہتا۔ اس کے برعکس مان کر میں سکون سے بیٹھ جاتا۔ یوں میری زندگی کا رخ ہی بدل جاتا اور شاید الکھ نگری لکھنے کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔

مجھے شہاب سے صرف اس لیے دلچسپی پیدا ہوئی کہ اس کی زندگی میں پر اسرار باتیں واقعہ ہوتی تھیں اور میں اس اسرار کا بھید جاننا چاہتا تھا۔

ایک بار میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا بھی تھا۔

میں نے کہا' شہاب صاحب آپ کی زندگی میں یہ جو مافوق الفطرت نوعیت کے واقعات ہوتے ہیں' اس کی کیا وجہ ہے۔

مجھے نہیں معلوم' اس نے جواب دیا۔

ہوتے تو ہیں نا' میں نے پوچھا۔

ہاں شاید۔ آپ انہیں مافوق الفطرت سمجھتے ہیں۔ میں مافوق الفطرت کو مانتا ہی نہیں۔

بزرگ لوگ جو کرامتیں دکھاتے ہیں' میں نے کہا۔

چھوٹی بات ہے' وہ بولا۔

اس کے بغیر لوگ انہیں مانتے نہیں۔

(WAVE LENGTH) کا کچھ کچھ سراغ ملنے لگا ہے۔ دعا کرتے بھی رہیں اور بھائی جان اور سائیں صاحب سے کرواتے بھی رہیں۔

اس چھ مہینے میں تزکیہ نفس کی سعی لاحاصل بھی کی۔ نفس تو موٹا ہی رہا' لیکن جسم ضرور پتلا ہو گیا۔

تقلیل طعام' تقلیل منام' تقلیل کلام اور تقلیل نام کا مفہوم سمجھنے کی تھوڑی بہت کوشش کی چنانچہ اب تک ۱۹ پاؤنڈ وزن گھٹ چکا ہے۔ دنبہ ذبح کر کے ساڑھے نو سیر چربی تسلے میں ڈال کر سامنے رکھیں تو صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر بے کار بوجھ اتر گیا ہے۔

وثوق سے کہنا تو محال ہے لیکن ذوقاً" یہی اندازہ لگتا ہے۔ انشاء اللہ'

اگلے سال ارض منور کی زیارت نصیب ہو گی۔ قیام طویل ہو یا مختصر' ہر صورت میں آپ کی شراکت کا اہتمام بھی ضرور ہو گا' انشاء اللہ۔

یہ خطوط میرے لیے حیران کن تھے۔ مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شہاب صاحب کیوں تزکیہ نفس میں مصروف تھے۔ ایسا لگتا تھا' جیسے کوئی زبردست کوتاہی سرزد ہو گئی ہو۔ جس کی وجہ سے پرائسچیت کرنا ضروری تھا۔

لیکن میری دانست میں کوئی کوتاہی تو نہ ہوئی تھی۔

ہوا صرف یہ تھا کہ صدر ایوب نے بیرونی اور شاید اندرونی دباؤ میں آ کر شہاب کو حکومت کے معاملات سے الگ کر دیا تھا۔

ذاتی طور پر شہاب کو حکومت یا عہدے سے دلچسپی نہ تھی۔

ایڈووکیٹ غفور صاحب تو برملا کہہ رہے تھے کہ شہاب کا حکومت سے الگ ہو جانا ملک کے حق میں نقصان دہ ہے۔ خود صدر صاحب کے لیے نقصان دہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ شہاب صاحب کی حکومت سے وابستگی' ملک کے لیے باعث برکت ہے۔

بھائی جان بھی شہاب کی علیحدگی پر فکر مند تھے۔ سائیں کرم دین کہتے تھے' صدر نے شہاب کو الگ کر کے اپنے پاؤں میں خود کلہاڑی ماری ہے

شہاب نے پاکستان سے روانگی سے پہلے ہم سب سے کہا تھا کہ صدر ایوب کو سپورٹ کرنا

ضروری ہے ان کی کامیابی کے لیے دعا کرتے رہیں۔ ان کا رہنا ضروری ہے وہ کارکن ہے خدمت کر سکتا ہے۔ بھائی جان نے کہا تھا کہ ' شہاب صاحب کے جانے کے بعد نفسانفسی پھیل جائے گی۔ ہم سب کے حصے میں آئے گا بقدر محبت۔ ذمہ دار لوگ نکال دیے جائیں گے۔

پھر جب شہاب صدر ایوب سے خدا حافظ کہنے جانے والے تھے تو لاہور سے غفور صاحب کا فون آ گیا تھا۔ غفور نے کہا' آپ صدر ایوب سے آج نہ ملیے۔ میں آ رہا ہوں۔ زبانی بات کروں گا۔ آپ صدر صاحب سے اظہار ناراضگی نہ کیجیے' بات بہت اہم ہے۔

شام کو غفور صاحب آ گئے۔ پتہ نہیں۔ انہوں نے شہاب سے کیا کیا باتیں کیں۔

مجھ سے ملے تو کہنے لگے' شہاب صاحب کا باہر جانا ضروری ہے۔ گیارہ ماہ پہلے میں نے شہاب صاحب سے کہا تھا کہ باہر چلے جائیں یہاں نفسانفسی کا طوفان آنے والا ہے' لیکن وہ نہ گئے اگرچہ اب دیر ہو چکی ہے' لیکن پھر بھی ٹھیک ہے۔ یہ ملک کے وسیع تر مفاد کے لیے ضروری ہے۔ انشاء اللہ انہیں چند ماہ کے بعد واپس بلا لیا جائے گا۔ پھر ان کی حیثیت زیادہ پر اثر ہو گی۔

میرا اندازہ ہے کہ چھ ماہ کے بعد واپس آ جائیں گے۔ اگرچہ وقت کے متعلق صرف اللہ کی ذات کو علم ہے۔

شہاب صاحب صدر سے ملے تو صدر نے کہا' ہماری عارضی علیٰحدگی ضروری ہے۔ جو جو کچھ تم نے ملک کے لیے کیا ہے' مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔

صدر نے کہا' شہاب تم میری کھال کے نیچے جا چکے ہو۔ تمہیں نکالنے کے لیے ہڈیاں توڑنی پڑیں گی۔

پاکستان

یہ ساری باتیں ایک ایک کر کے مجھے یاد آتی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اصلی بات کیا تھی۔ میں بری طرح سے کنفیوز ہو رہا تھا۔ سوچتا کہ پاکستان کو اتنی اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ چوں کہ اسلامی جذبے کے زور پر قائم ہوا ہے' اس لیے اسلامی ملک ہے' لیکن اسلامی ملک تو دنیا میں بیسیوں ہیں۔ پھر اسے خصوصی اہمیت کیوں دی جا رہی

اکتالیسواں باب

انوکھے خط

پھر ہالینڈ سے خط موصول ہونے لگے۔

یہ خط عجیب قسم کے خط تھے۔

میں ایسے خطوں سے واقف نہ تھا۔

ان خطوط نے رہا سہا پردہ بھی اٹھا دیا اور قدرت اللہ کی شخصیت وضاحت سے سامنے آ گئی۔

خوشاب کے ایڈووکیٹ غفور صاحب نے سچ کہا تھا۔ قدرت اللہ نے جان بوجھ کر ہالینڈ میں اپنی تعیناتی کرائی تھی تاکہ وہاں ایک کونے میں بیٹھ کر تزکیہ نفس کر سکے۔

مجاہدہ اور شوق

۳ فروری ۱۹۶۴ء کے خط میں لکھا تھا۔

لے ..... یہاں آنے کے بعد بہت عرصہ تک ذہنی جمود چھایا رہا۔ رمضان شریف پر تکیہ تھا' لیکن بارہ روزے بھی گزر گئے اور کوئی آفاقہ نہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں مار مار کر شل ہو گیا۔ ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ مخالف عناصر (دنیاوی نہیں) نے چاروں طرف بندھ باندھ رکھے ہیں۔ ناکامی کا احساس بڑھتا رہا' لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ

ناکامی کی وجہ اپنے اپنے شوق کی کوتاہی ہے۔

یہ بھی عجب گورکھ دھندا ہے۔ مجاہدہ میسر ہو تو شوق میں کوتاہی رہ جاتی ہے۔ شوق تیز ہو تو مجاہدہ کمزور رہ جاتا ہے۔ ان دونوں کو ہم آہنگ کرنا اپنے بس کا روگ تو ہے نہیں۔ چنانچہ مجبور ہو کر ہاتھ پاؤں ڈال دیئے۔

جہاں محنت اور شوق دونوں اپنی اپنی جگہ ناکام رہے تھے۔ وہاں عجز کی بے بسی کام آ گئی۔

اپنی محنت، کوشش یا شوق سے حالات پر قابو پانے کی کوشش میں ایک قسم کا دعویٰ ہوتا ہے۔ عاجزی میں مجبوری اور صبر۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ اب چند یوم سے کچھ افاقہ محسوس ہو رہا ہے۔ خدا کرے یہ رو جاری رہے۔

اپنا جائزہ لیا تو اس اندرونی بندش کی وجہ کچھ کچھ سمجھ میں آئی۔ پچھلے اگست میں جب واقعات نے پلٹا کھایا اور صبح شام مری کا آنا جانا شروع ہوا تو جو نتیجہ نکلا اس میں خدا کی کوئی بہتری ہی تھی۔ زبان سے یہی کہا۔ دماغ سے یہی سمجھا، لیکن دل میں کہیں، کسی خفیہ گوشے میں شکست کا احساس پھنسا رہا۔ کہ آخر ایسا ہوا تو کیوں ہوا۔

پاکستان میں تو دعوتوں، دوستوں، عزیزوں کے ہنگاموں میں یہ احساس دبا رہا، لیکن یہاں کی تنہائی اور دفتر کے عالم بے کاری نے اندر ہی اندر اس احساس کو ہوا دی۔ خدا کی طرف سے بہتری کا انتظام ایک طرف۔ اندر ہی اندر یہ احساس شکست و مایوسی دوسری طرف۔ اس تضاد اور خلیج میں دل و دماغ اور روح کے لیے جو جو بند نہ بندھیں وہ کم ہیں۔ یہ تضاد ایک قسم کا کفران نعمت تھا۔ شکر ہے کہ اب یہ بات سمجھ آ گئی۔ چنانچہ اب میں نسبتاً نارمل محسوس کر رہا ہوں۔ اب انشاء اللہ جلد ہی لکھنا بھی شروع کر دوں گا۔

۵ جون[۱] کے خط میں قدرت اللہ نے لکھا۔

میں اب ہمہ تن اپنے پروگرام میں لگ گیا ہوں۔ پچھلے چھ ماہ گویا (IN TUNING) کا عرصہ تھا۔ اب کہیں جا کے صحیح FREQUENCY کی

۱۔ اصل خط ضمیمہ میں دیکھئے۔ خط نمبر X

ہے۔ جب پاکستان کا آئین بنا تھا تو اسے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دیا گیا تھا۔ اس پر شہاب بے حد خوش ہوا تھا۔ بھائی جان اور سائیں جی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

پاکستان کا اسلامی جمہوریہ بن جانا بھی محض ایک اتفاقی امر تھا۔ صدر ایوب اور اس کی کابینہ سیکولر مزاج کے لوگ تھی اور انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اقوام عالم میں باوقار حیثیت حاصل کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ پاکستان کو سیکلر حیثیت دی جائے۔

صدر ایوب نے باری باری کابینہ کے ہر رکن سے پوچھا تھا کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ ہر رکن نے سیکلر کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ آخر میں انہوں نے قدرت اللہ سے بھی پوچھا تھا۔ حالاں کہ قدرت اللہ کابینہ کا رکن نہ تھا۔ لیکن صدر ایوب اخلاقاً" قدرت سے پوچھا کرتے تھے۔

قدرت اللہ نے کہا تھا' مجھے اتفاق نہیں ہے۔ دنیاوی نقطہ نظر سے میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کو اسلامی جمہوریہ ہونا چاہیئے۔ اس پر صدر ایوب نے کہا تھا کہ آپ اپنے دلائل پیش کریں اور قدرت اللہ نے جواب دیا تھا کہ جناب میں مقرر نہیں ہوں۔ تقریر نہیں کر سکتا اگر آپ اجازت دیں تو میں کل لکھ کر اپنے دلائل پیش کر سکتا ہوں۔

اگلے روز کابینہ میں قدرت اللہ نے لکھ کر اپنے دلائل پیش کیے تھے اور حیرت کی بات تھی کہ ساری کابینہ نے قدرت اللہ کے دلائل کو تسلیم کر لیا تھا۔

ان سب باتوں سے یہ پتا چلتا تھا کہ قدرت اللہ کی ڈیوٹی پاکستان میں نفاذ اسلام سے متعلق تھی۔

کوتاہی

قدرت اللہ نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ صدر ایوب کو اسلامی نقطہ نظر کی طرف لائے۔ قدرت اللہ نے انہیں قرآن کریم کے مطالعے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ علامہ اقبال کے کلام کی طرف توجہ دلائی تھی' لیکن اس میں وہ پورے طور پر کامیاب نہ ہوا تھا۔ صدر ایوب کے سیکلر زاویہ نظر کو بدل نہ سکا تھا۔

میری دانست میں قدرت اللہ کی یہی ایک کوتاہی تھی' لیکن یہ کوتاہی تو صدر ایوب کی تھی۔

بھر قدرت اللہ کیوں محسوس کر رہا تھا کہ تزکیہ نفس ضروری ہے۔

؎ قدرت اللہ شہاب کے ۶۴۔۷۔۱۷ کے خط نے بات کو اور الجھا دیا۔ لکھا تھا۔

..... پانچ جولائی کو مجھے لندن سے بلاوا آیا تھا۔ آٹھ دن وہاں رہ کر پرسوں ہی واپس آیا ہوں (بھائی جان بھی تو ۵ جولائی ہی کو بولے تھے۔)

لندن میں اچھی ملاقاتیں رہیں۔ دنیا کا ہر موضوع زیر سخن آیا' لیکن نہ واپسی کی بات انہوں نے اٹھائی نہ میں نے۔ دونوں کا انداز کچھ ایسا تھا کہ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں یہ ذکر چھیڑوں' تمہیں غرض ہو تو بولو۔ چنانچہ دونوں اس موضوع پر خاموش رہے۔

اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت پوشیدہ ہے۔ آم کو درخت پر لگا رہنے دیں' تو وہ سرد گرم کھا کر خود بخود موسم کے مطابق پکتا ہے۔ اگر اسے پرالی میں رکھیں تو دوسروں کی مرضی کے مطابق پکتا ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہو کہ دونوں ایک دوسروں کی پرالی سے محفوظ رہیں اور فقط اس واحد ذات کی رضا کا انتظار کریں۔ واللہ العلم۔

یہ خط صدر ایوب کے دورہ انگلستان کے متعلق تھا۔ لندن میں شہاب اور صدر ایوب کی آٹھ روز مسلسل ملاقاتیں رہیں' لیکن دونوں میں سے کسی نے شہاب کی وطن واپسی کی بات نہ کی۔

کیوں واپسی کی بات نہ کی۔ واپسی کیوں ضروری تھی۔ وہ کون سی طاقتیں تھیں جو صدر صاحب اور شہاب کے ملاپ کے درمیان حائل تھیں۔

یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔

کبھی کبھی میرے دل میں احتجاج پیدا ہوتا۔

علی پور کا ایلی

ممتاز مفتی یہ تو کہاں آ پھنسا ہے۔ یہ بزرگ لوگ کیسے لوگ ہیں۔ یہ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی اور سطح پر چلتے ہیں۔ تو اس سطح سے واقف نہیں ہے۔ تو ان کی باتوں کو نہیں

سمجھ سکتا اور اگر سمجھنے کی کوشش کرے گا تو شاید بالکل ہی "نان پلس" ہو کر رہ جائے "یو ڈونٹ بلانگ ٹو دم۔"

تو تو سیدھا سادا ایلی ہے۔ کسی محبوبہ کی دہلیز پر جا کر بیٹھ' وہی تیری جگہ ہے۔

دفتر میں مجھے کوئی کام نہیں دیا گیا تھا۔ الطاف گوہر نے مجھے پھر سے او ایس ڈی بنا کر وزارت اطلاعات میں بھیج دیا تھا۔ اس کا رویہ مجھ سے بڑا ہمدردانہ تھا۔

سارا دن میں دفتر میں بیٹھ کر پرانی یادوں میں کھویا رہتا تھا۔

ادب سے مجھے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

۱۹۶۱ء میں میں نے علی پور کا ایلی ختم کر دی تھی۔

۲ ان دنوں اشفاق احمد کو پرنٹنگ کا شوق چرایا تھا۔ اس نے ایک مصور رسالہ "داستان گو" جاری کیا تھا اس رسالے میں طباعت کے نئے نئے تجربات کیا کرتا تھا۔ اس نے پرنٹنگ کی دو مشینیں منگوائی تھیں اور سمن آباد کے گھر میں ان مشینوں کو لگوا لیا تھا اور بانو نے سکرپٹ لکھنے چھوڑ کر پرنٹنگ کا شغل اپنا لیا تھا۔

اشفاق احمد نے میری خود نوشت علی پور کا ایلی میں بڑی دلچسپی لی تھی۔ وہ دلچسپی نہ لیتا تو شاید میں کتاب کو جلد مکمل نہ کرتا۔ اشفاق احمد کو یقین تھا کہ یہ کتاب گلڈ کا ایوارڈ حاصل کرے گی۔

میں نے علی پور کا ایلی اس خیال سے نہیں لکھی تھی کہ وہ ادبی اہمیت کی حامل ہو گی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو مجھے شعور تھا کہ میں اردو زبان سے واقف نہیں ہوں۔ دوسرے کتاب ادب کے نقطہ نظر سے نہیں لکھی گئی تھی۔

تضادات

مجھے اردو ادب سے یہ شکایت تھی کہ اس میں تہذیب اور رکھ رکھاؤ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اخلاق سے گرے ہوئے خیالات اور کرداروں کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا جاتا۔ کردار کی صحیح عکاسی نہیں کی جاتی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک ایسی کتاب لکھوں جس میں رکھ رکھاؤ نہ ہو۔ جو اخلاق زدہ نہ ہو۔ جو انسان کی شخصیت کے تضادات کو وضاحت سے بیان کرے

اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی آپ بیتی لکھوں جس میں میں اپنی کمزوریوں اور کمینگیوں کو سچائی سے بیان کر دوں۔ چوں کہ ان دنوں مجھ میں جرأت نہ تھی' اس لیے میں نے اسے جگ بیتی کی شکل میں لکھا تھا میرا خیال نہیں تھا کہ اس کتاب کو کسی قسم کی ادبی حیثیت حاصل ہو گی۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ مجھ سے بہتر ادبی شعور رکھتے تھے۔ چونکہ انہوں نے باقاعدہ اردو ادب کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے برعکس میں نے صرف انگریزی ادب پڑھا تھا' وہ بھی نفسیات کے حوالے سے۔

پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جب میں صدر گھر میں او ایس ڈی ہوا تو چک لالہ میں مجھے ایک مکان الاٹ کر دیا گیا۔ ایک ڈیڑھ سال کے بعد ہمیں گریسی لائن میں ایک کوارٹر مل گیا۔ اس لیے ہم گریسی لائن میں آ گئے۔

وہاں آئے ابھی دو ایک دن ہوئے تھے کہ شام کے وقت پڑوسیوں کی لڑکی آئی۔ کہنے لگی۔ کراچی سے میرے انکل آئے ہیں۔ انہیں سونے سے پہلے پڑھنے کی عادت ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی کتاب ہو تو دے دیجیے' صرف رات کے لیے چاہیے کل وہ کراچی واپس چلے جائیں گے۔

ابھی میں نے کتابوں کے بنڈل نہیں کھولے تھے۔ اتفاق سے علی پور کا ایلی کھلی پڑی تھی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر وہ کتاب اسے دے دی۔

کیا واقعی

اگلے روز وہ لڑکی کتاب واپس دے گئی۔ کہنے لگی' انکل ساری رات کتاب ہی پڑھتے رہے' سوئے نہیں۔

آٹھ دس دن کے بعد وہ لڑکی پھر آ گئی۔ کہنے لگی' کراچی والے انکل پھر آئے ہیں۔ پہلے تو وہ کام سے آئے تھے' اب کہتے ہیں' میں صرف کتاب پڑھنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ مجھے وہ کتاب دے دیں۔

میں نے کہا' بی بی آپ کے کراچی والے انکل کرتے کیا ہیں۔

کہنے لگی' ان کا اپنا بزنس ہے۔

میں نے کہا' ضرور وہ اپنے کام سے آئے ہوں گے۔

کہنے لگی' ہمیشہ کام سے آتے ہیں۔ بائی ایئر آتے ہیں۔ ایک رات رہتے ہیں۔ اگلے روز کام کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔

میں نے کہا اب کی بار بھی کام سے آئے ہوں گے۔

بولی' نہیں' وہ کہتے ہیں مجھے کوئی کام نہیں ہے میں تو صرف کتاب پڑھنے کے لیے آیا ہوں۔ کتاب ختم کر کے واپس چلا جاؤں گا۔

کیا واقعی؟

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بزنس مین ہوائی جہاز کا کرایہ خرچ کرے۔ اپنا وقت ضائع کرے ایک کتاب پڑھنے کے لیے۔

ٹھیک ہے گنہگار کی محفل کو چھوڑ کر جانے کو کس کا جی چاہتا ہے۔ لیکن ایلی تو ایک کچا گنہگار ہے۔ گنہگار کم۔ کم' احمق زیادہ۔

حاتم طائی

پھر دفعتاً" قدرت اللہ کے کردار کا ایک اور پہلو سامنے آ گیا۔ اس کا ایک خط موصول ہوا۔ اس خط میں ایک چیک ملفوف تھا۔ ساتھ ایک پرچہ تھا جس میں چار آدمیوں کے نام اور پتے لکھے ہوئے تھے۔ ہر نام کے سامنے رقم لکھی ہوئی تھی۔ نیچے ہدایت تھی کہ ان لوگوں کے پتوں پر منی آرڈر بھیج دیے جائیں۔ اس معاملے میں تساہل کو کام میں نہ لائیں۔ ہر صورت میں انہیں یہ رقوم پہلی تاریخ سے پہلے موصول ہو جانی چاہئیں۔ اگر منی آرڈر فیسوں سے کچھ بچ جائے تو اسے اپنے پاس امانت کے طور پر رکھ لیں۔ اگر زاید خرچ ہو تو مجھے واپسی ڈاک اطلاع دیں۔

اس نوعیت کے پہلے خط کو تو میں نے اہمیت نہ دی' لیکن جب ہر تیسرا خط اسی نوعیت کا موصول ہونے لگا تو میں حیران رہ گیا۔

دراصل میں سمجھتا تھا کہ خرچ کرنے میں قدرت اللہ خاصہ بخیل واقعہ ہوا ہے۔ خرچ کرنے میں وہ بڑا محتاط تھا۔

ایک دفعہ میں نے عفت سے شکایت کی۔ وہ ہنسی کہنے لگی' ننگی نہائے گی کیا' نچوڑے گی

کیا۔ ہماری تو تنخواہ کٹوتیوں کے بعد اس قدر قلیل رہ جاتی ہے کہ مشکل سے دال روٹی چلتی ہے۔ میں ان سے کہہ رہی تھی کہ کم از کم ڈرائینگ روم کے لیے ایک اصلی قالین تو خرید دو۔ اس پر شہاب صاحب کہنے لگی' بے شک خرید لو۔ کٹوتی اور بڑھ جائے گی۔ دال روٹی سے چٹنی روٹی پر آنا پڑے گا۔

میں حیران ہوا کہ یہ قدرت کو کیا ہوا جو ایک دم حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے لگا ہے۔ اتنی خیرات اور اس قدر تواتر سے کہیں ہالینڈ میں ڈرگ کے کاروبار میں پتی تو نہیں ڈال دی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مجاہدہ جو چل رہا ہے کھانے پینے کے اخراجات سے نجات مل چکی ہو گی' لہٰذا بچت خیرات کے طور پر بانٹی جا رہی ہے۔ مجھے عفت اور ثاقب پر ترس آنے لگا۔ وہ بے چارے آٹے میں گھن کی طرح پس رہے ہوں گے۔

امام بری

پھر خبریں آنے لگیں وہ آ رہے ہیں۔ آ رہے ہیں۔

بھائی جان کا مری سے خط آیا کہ سنا ہے وہ آ رہے ہیں۔ آپ پتہ لگا کر مجھے اطلاع دیں۔

سائیں کرم دین بولے' آخر انہیں آنا ہی پڑے گا۔ آج آئیں یا کل' آنا تو ہے ہی۔

شہاب کے بہنوئی امین صاحب نے کہا' سنا ہے کہ آ رہے ہیں۔ شاید چھٹی پر آ رہے ہوں۔

غفور صاحب کا فون موصول ہوا۔ کہنے لگے' چلو چھٹی پر ہی سہی' لیکن ہو سکتا ہے کہ انہیں روک لیا جائے۔ آنے والے حالات کچھ ایسے ہیں کہ انہیں روک لیا جائے تو بات بن جائے گی۔ میں صدر صاحب کو لکھ رہا ہوں کہ حالات کا تقاضہ ہے کہ انہیں روک لیا جائے۔ اس میں ملک کی بھلائی ہے۔

پھر ایک دن جب میں دفتر میں بیٹھا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑکی میں قدرت اللہ کھڑا ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ نظر کا دھوکا ہے وش فل تھنکنگ ہے' لیکن قدرت اللہ بول پڑا۔ کہنے لگا اگر آپ کو فرصت ہو تو آ جائیے۔

کہنے لگا' میں ایک مہینے کی رخصت پر آیا ہوں۔ آیئے ذرا امام بری تک ہو آئیں۔

اس پر مجھے حیرت ہوئی۔

راولپنڈی میں ہم تین چار سال اکٹھے رہے تھے' لیکن قدرت نے کبھی امام بری کی بات نہ کی تھی۔

ان دنوں امام بری کی خانقاہ کو لوگوں نے تماشہ بنا رکھا تھا۔ سالانہ عرس پر نور پور کا سارا گاؤں مجرا خانے میں بدل جاتا تھا۔

سارا سال تماش بین روپے جوڑتے رہتے تھے کہ پلی پلی جوڑی ہوئی رقم عرس کے میلے میں لنڈھا دی جائے۔ یہ میلا سٹینس میلا بن چکا تھا۔

عرس سے پہلے ہی گاؤں کے تمام مکانات کرائے پر لے لئے جاتے تھے۔ پھر بڑی حسین اور پرکشش رنڈیاں بک کر لی جاتیں۔ اعلیٰ قسم کے ڈیرے اور چنچل گانے والیوں کو حاصل کرنے کے لیے کمپیٹیشن ہوتے تھے۔

ڈیروں میں فرش بچھا دیے جاتے' گاؤ تکیے لگا دئے جاتے۔ رات پڑتی تو ڈیروں پر محفلیں لگ جاتی۔ چاروں طرف تماش بین بیٹھ جاتے' درمیان میں رنڈی کا ناچ شروع ہو جاتا۔ پھر ویلیں یوں چلتیں جیسے برکھا میں بوندیاں پڑتی ہیں۔ ہن کی بارش ہوتی۔

عام تماش بین جن کا کوئی ذاتی ڈیرا نہ ہوتا بڑے بڑے گروہوں میں بٹ جاتے' پھر وہ باری باری ہر ڈیرے پر جاتے۔ گانا سنتے' ناچ دیکھتے' واہ واہ کرتے۔ رنڈی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ویلیں دیتے اور پھر اگلے ڈیرے کا رخ کرتے۔

یوں دس بارہ دن ساری ساری رات دھما چوکڑی لگی رہتی تھی اور امام بری اپنے گرد لگا ہوا میلہ حیرت سے دیکھتے' یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

یہ سب کچھ سال ہا سال ہوتا رہا۔

جب میری ملازمت ریڈیو سے متعلق تھی۔ تو کئی بار امام بری کے میلے پر میری ڈیوٹی لگا دی گئی' لیکن میں نے انکار کر دیا چوں کہ میلے کے دنوں میں وہاں جانا مجھے گوارہ نہ تھا۔

پھر ایوب کے دور میں امام بری کے میلے میں ان خرافات پر پابندی لگا دی گئی۔

اسلامی شہر

جب قدرت نے امام بری کی درگاہ پر جانے کی بات کی تو میں حیران ہوا۔ اس سے پہلے اس

نے کبھی امام بری کی یا ان کے مزار پر جانے کی بات نہ کی تھی۔

یہ آپ کو دفعتاً امام بری کی حاضری دینے کی بات کیسے سوجھی' میں نے قدرت اللہ سے پوچھا۔

کہنے لگا' ہالینڈ میں اسلامی کتابوں کی دنیا بھر میں سب سے بڑی لائبریری ہے۔ اس لائبریری میں بے شمار قلمی مسودات ہیں۔ اتفاق سے ایک قلمی مسودہ دیکھنے میں آیا' جس میں لکھا تھا کہ امام بری نے فرمایا تھا کہ ہمارے علاقے میں ایک اسلامی شہر آباد ہو گا' جو دنیا کے اسلامی ملکوں کا مرکز بنے گا۔

وہ قلمی کتاب کب کی لکھی ہوئی تھی' میں نے پوچھا۔

دو' ڈھائی سو سال پہلے کی' وہ بولا۔

میری ہنسی نکل گئی۔

آپ ہنس رہے ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آیا کیا' اس لیے پوچھا۔

یقین کی بات نہیں' میں نے کہا' اسلام آباد کی بات ہے جو اس وقت زیر تعمیر ہے۔

اسلام آباد کی کیا بات ہے' اس نے پوچھا۔

اسلام آباد بنگلوں کا شہر ہے جس کی تعمیر میں نہ اسلامی رنگ ہے' نہ پاکستانی۔

اسلام آباد نے امام بری اور ان کے نور پور شاہاں کو آؤٹ آف باؤنڈ قرار دے دیا ہے۔ انتظامیہ امام اور ان کی درگاہ پر شرم ساری محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے ان تمام سڑکوں کو توڑ دیا ہے۔ جو نور پور جاتی تھیں اور نور پور کو جانے والے تانگوں کو اسلام آباد شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

وہ مسکرایا' کہنے لگا' بزرگوں کے ساتھ پڑھے لکھے لوگ ایسا ہی برتاؤ کیا کرتے ہیں۔

قدرت اللہ کی رخصت کے دوران کئی ایک محفلیں ہوئیں۔ امین کے گھر جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اشفاق احمد کے گھر' مزار پر' دربار میں۔

یہ افواہ گرم تھی کہ قدرت اللہ کو روک لیا جائے گا۔

قدرت اللہ کے کردار میں ایک بات واضح تھی۔ وہ ذاتی خواہش کو دل میں رچانے سے احتراز کرتا تھا۔ سرسری قسم کی خواہشات آتی تھیں' اس کے دل کا دروازہ کھٹکھٹاتی تھیں' لیکن وہ

انہیں اندر داخل ہونے نہ دیتا تھا۔ ذات سے ہٹ کر خواہشات پوری نہ ہوتیں تو بھی اسے دھچکا نہیں لگتا تھا۔ قدرت اللہ نے پاکستان کے قیام اور استحکام کے متعلق صدر ایوب سے بڑی امیدیں استوار کر رکھی تھیں۔

لیکن جب وہ صدر صاحب سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وہ سامنے بوتل اور گلاس رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔

مجاہدہ

چھٹی کے اختتام پر جب قدرت جانے لگا تو میں نے کہا' چند ایک باتیں جاننا چاہتا ہوں۔

کیا جاننا چاہتے ہیں آپ' اس نے پوچھا۔

اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ سے دلچسپی ہے۔ دیکھیے شہاب صاحب آپ میری عقیدت کا مذاق نہ اڑایا کریں۔

نہیں مذاق نہیں اڑاتا' وہ بولا' آپ عقیدہ پالیے عقیدت ایک چھوٹی چیز ہے۔

میں ایک چھوٹا آدمی ہوں' جذباتی ہوں۔ میرے اندر عقیدے کا خانہ خالی ہے۔ لیکن میری عقیدت میں خلوص ہے۔ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میری خلوص بھری عقیدت کا مذاق اڑائیں۔

میری بات اسے لگی۔ بری طرح لگی' بولا' ہاں پوچھیے۔ آپ کیا جاننا چاہتے ہیں۔

ایک شرط ہے' میں نے کہا' مجھے ٹالیے نہیں۔

یہ بتائیے کیا آپ نے التزاماً" ہالینڈ میں سفیر بننے کی کوشش کی تھی۔

ہاں' اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

اس لیے کہ آپ کو وہاں مجاہدہ کرنے کا موقعہ ملے۔

ہاں' وہ بولا۔

آپ مجاہدہ کیوں کرنا چاہتے تھے۔

مجاہدہ ایک دھوبی ہے' وہ بولا' وہ آپ کو زمین پر پٹخ پٹخ کر دھو دیتا ہے۔

میں اپنی کثافت کو صاف کرنا چاہتا ہوں۔

آپ یہاں بھی مجاہدہ کر سکتے تھے۔

نہیں' وہ بولا' یہاں کئی ایک باتیں ممکن نہ تھیں۔ یہاں کم کھاؤ کم سوؤ تو ممکن تھے کم بولو ممکن نہ تھا۔ مجاہدے سے فراست بڑھ جاتی ہے۔ مجھے کشف پسند نہیں وہ ایک چھوٹی چیز ہے۔

فراست سے کیا ہوتا ہے' میں نے پوچھا۔

لوگوں کے اندرونی ڈھانچے نظر آنے لگتے ہیں۔ جب عفت کا بھائی فوت ہوا' تو عفت کو بڑا صدمہ ہوا۔

ایک دن اتفاق سے میری نظر پڑ گئی۔ دیکھا کہ عفت کے اندر قصائی چھرا پکڑے گوشت کاٹ رہا تھا۔ مجھے عفت پر ترس آنے لگا۔

دیکھیے مفتی صاحب' وہ بولا' مجاہدے سے کچھ نہیں ہوتا۔ باہر کی دنیا جیسے ہے ویسے ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی واقعہ نہیں ہوتی۔ تقدیر بھی وہی رہتی ہے' بدلتی نہیں' صرف زاویہ نظر بدل جاتا ہے۔ دکھ ویسا ہی رہتا ہے' لیکن اس کی دھار کاٹتی نہیں۔ باتیں وہی رہتی ہیں لیکن باتوں کی وہ اہمیت نہیں رہتی۔ ذات سے اخراج ہو جائے تو واقعات اور احساسات پرسل نہیں رہتے۔

میری زندگی مکمل طور پر بدل چکی ہے' اس نے کہا۔ بیوی سے ہم آہنگی زیادہ ہو گئی ہے۔ ذات کافی پیچھے ہٹ گئی ہے۔ پہلے صدر ایوب کو منزل سمجھ لیا تھا حالاں کہ وہ راستے کا ایک سنگ میل تھا۔ اب وہ بات نہیں رہی۔ اگرچہ پھر بھی مقابلتاً" صدر ایوب پاکستان کی ناؤ کو کھے کر پار لگا سکتا ہے۔ دوسروں کی نسبت اس میں زیادہ صلاحیت ہے۔ نظر کے سامنے جتنے بھی لوگ ہیں' ان سب میں صدر ایوب بہتر ہے' لیکن صدر میں دین اور اللہ کا جذبہ بڑھ نہیں پایا۔ نقطہ نظر میں مزید وسعت پیدا نہیں ہوئی' بلکہ محدود ہوتا جا رہا ہے' دنیاوی ہوتا جا رہا ہے۔ وہ عظمت نہیں رہی۔ جمہور کی بجائے ڈنڈے کی طرف رغبت ہو گئی ہے۔ ممکن ہے' یہی بات رکاوٹ بن گئی ہو۔ ویسے اللہ بہتر جانتا ہے۔

آپ کی واپسی کی کیا صورت ہے' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' دو صورتیں ہیں۔ یا تو میری شرائط پر مجھے واپس بلایا جائے۔ اور یا واپسی ایوب کے بعد عمل میں آئے۔

آپ صدر ایوب سے بات کیوں نہیں کرتے' میں نے پوچھا۔
نہیں وہ بولا' اگر میں واپسی کے لیے کہوں تو ذات کا مسئلہ بن جائے گا۔ یہ ذات کا مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جیسے چاہیں ویسے ہی کریں۔
ویسے مفتی صاحب' وہ بولا' اگر میں "وِل" کروں تو وہ مجھے بلانے پر خود کو مجبور پائیں گے' لیکن میں "وِل" کیوں کروں۔

پھر مس بورل

میں نے کہا یہ بتایئے کیا اب بھی ہیگ میں چمگادڑیں پھڑ پھڑاتی ہیں۔ نہیں' وہ مسکرایا' چمگادڑیں ختم ہو چکی ہیں۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
کس سوچ میں پڑ گئے آپ' میں نے پوچھا۔
بولا' پرانی بات یاد آ گئی۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے میں نے رمضان مبارک کی ستائیسویں کو جاگنے کا پروگرام بنایا تھا۔
عین موقعہ پر مس بورل کا فون آیا کہ لنچ میرے ساتھ کھاؤ نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نہ رکھا۔ جب روزہ ہی نہ رکھا تو رات جاگنے کی بات بے معنی ہو گئی۔ پچھلے رمضان ہالینڈ میں ستائیسویں کو شب بیداری کا پروگرام بنایا۔ اسی روز فون آیا۔ مس بورل نیویارک سے بول رہی تھی۔ کہنے لگی' میں آ رہی ہوں' مجھے پیرس میں ملیے اور پھر اپنے ساتھ ہیگ لے جایئے۔ میری والدہ میرے ساتھ ہو گی۔
دس سال کے بعد پھر وہی بات۔ مقصد ستائیسویں شب کا پروگرام فسخ کرنا تھا۔
کیا مس بورل کو اس بات کا شعور تھا' میں نے پوچھا۔
نہیں' قدرت نے کہا' اس بے چاری کو کیا پتہ کہ اسے استعمال کیا جا رہا ہے۔
کون استعمال کرتا ہے' میں نے پوچھا۔
پتا نہیں کون' شر کی قوتیں اور کون۔
شر کی قوتیں آپ کو ہدف کیوں بناتی ہیں۔
صرف مجھے ہی نہیں۔ کوئی بھی ہو' جو راستے پر چل نکلے جس کے پہنچ جانے کا خطرہ ہو۔

آپ راستے پر چل نکلیں تو وہ آپ کا راستہ کاٹیں گی۔

پھر کیا مس بورل آئیں' میں نے پوچھا۔

نہیں' وہ بولا' میں نے سوچے سمجھے بغیر دو ٹوک انکار کر دیا۔ نہیں میں نہیں آ سکتا۔ وہ یہ جواب سن کر ششدر رہ گئی۔

قدرت اللہ کے جانے کے بعد پھر اداسی چھا گئی۔

وقت آ گیا ہے

ایک روز غلام دین وانی کا فون آیا۔

کہنے لگا' میں آ رہا ہوں۔

کس خوشی میں' میں نے پوچھا۔

مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے۔

اس کے انداز سے ظاہر تھا جیسے ایمرجنسی کی بات ہو۔ اتفاق سے راجہ شفیع میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ راجہ نے پوچھا' کیا بات ہے؟

میں نے کہا' وانی آ رہا ہے۔ کہتا ہے' مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ سخت گھبراہٹ کے عالم میں ہے۔ جیسے ایمرجنسی ہے۔

راجہ ہنسا' بولا' وہ تو ہمیشہ ایمرجنسی کے عالم میں رہتا ہے۔

ہم تو ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے ہیں راجہ' میں نے کہا۔

ہاں' وہ بولا' بھائی جان نے کہا تھا' آزمائش آتی ہے تو سارے گھرانے پر آتی ہے۔ دیکھ لو شہاب صاحب چلے گئے ہیں۔ بھائی جان سخت مضطرب ہیں ان کی بیگم ہسپتال میں ہیں' بیمار ہیں۔ ان کا چھوٹا بیٹا گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

یہ سن کر میں چونکا' کہاں چلا گیا ہے۔

پتا نہیں' راجہ بولا' لگتا ہے جیسے بھائی جان کی نظر پڑ گئی ہے۔ اسے اپنا ہوش نہیں رہا۔ گھر سے باہر نکل گیا ہے۔ جاننے والوں میں سے چند ایک نے اسے دیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس پر مجذوبیت کا عالم طاری ہے۔ ہوش ٹھکانے نہیں' پاگلوں کی طرح پنڈی میں آوارہ پھر رہا ہے۔

اچھا ——— تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے راجہ سے پوچھا۔

بے کار ہے' وہ بولا' نہ تم کچھ کر سکتے ہو نہ میں۔

اتنے میں وانی آ گیا۔ وہ شدید گھبراہٹ میں مبتلا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی بولا' لو بھئی وقت آ گیا۔

کیسا وقت' راجہ نے پوچھا۔

جس کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ وہ بولا۔

نہیں بھائی نہیں' میں نے کہا' وقت تو ملتوی ہو گیا ہے۔ اگر وہ وقت آ گیا ہوتا' جس کا ہم انتظار کر رہے ہیں تو قدرت اللہ کو روک لیا جاتا۔

پتہ نہیں' وانی بولا' مجھے تو واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ وقت آ گیا ہے۔

خواب آیا ہے کیا' راجہ نے طنزاً" پوچھا۔

ہاں وہ بولا۔ خواب آیا ہے۔ آج صبح فجر کی نماز کے وقت دیکھتا ہوں کہ بھائی جان گھوڑے پر سوار ہیں۔ ہاتھ میں تلوار ہے۔ سائیں کرم دین دوڑ کر آتے ہیں۔ ہم سب کو اکٹھا کرتے ہیں۔ راجہ' مفتی' آغا اور مجھے سب کو کہتے ہیں' آ جاؤ آ جاؤ کشمیر جانے کا وقت آ گیا ہے۔

وانی کے اس جواب پر میں اور راجہ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔

میں نے کہا' وانی' میں نفسیات کا طالب علم ہوں۔ ۱۹۵۵ء میں جب مرد قلندر نے مجھ پر رقت طاری کی تھی تو میں اس عجیب و غریب مشاہدے پر اس قدر حیران ہوا کہ میں نے ڈائری لکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور چونکہ مجھے نفس لاشعور سے دلچسپی ہے اس لیے میں نے اپنے اور اپنے عزیزوں کے خواب بھی نوٹ کرنے شروع کر دیئے تھے۔

سب سے زیادہ خواب مجھے ۱۹۵۷ء میں آئے جب میں کراچی جانے والا تھا۔ ان خوابوں سے پتہ چلتا تھا' جیسے کراچی میں کچھ ہو گا' کوئی بہت بڑا واقعہ' عظیم واقعہ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ میری جان ہمارے خواب تو وانٹنگ ٹو بیلیو WANTING TO BELIEVE کے مظہر ہوتے ہیں۔

راجہ ہنسنے لگا۔ بولا' وانی دن رات کشمیر کی آزادی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ اسے کشمیر کی آزادی کے خواب آنے ہی ہوئے۔ ظاہر بات ہے۔

جنگ

دانی کے خواب کے ایک ہفتے کے بعد بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔

یہ حملہ اتنا ناگہا تھا کہ سارا پاکستان سناٹے میں آ گیا۔

چھ ستمبر کی رات کو سارے لاہور کو جگا دیا گیا' اعلان کر دیا گیا کہ انٹیلی جنس کی رپورٹ ہے کہ کل صبح بھارت لاہور پر حملہ کرے گا۔ اس لیے لاہور کے عوام کو خبردار کیا جاتا ہے کہ بتیاں بجھا دو' گھروں سے باہر میدانوں میں نکل آؤ تاکہ بم باری سے جانی نقصان نہ ہو۔ اس اعلان کو سن کر لاہور والے ڈر کر پناہ لینے کی بجائے جہاد کے نعرے لگانے لگے۔

لاہور پر بم باری ہوئی تو لاہوریئے خندقوں میں پناہ لینے کی بجائے چھتوں پر چڑھ گئے اور بھارتی ہوا بازوں کو کے دکھانے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے میں میں کرنے والوں کے دلوں سے یکسر میں معدوم ہو گئی ہو اور پاکستان کی محبت از سر نو جاگ اٹھی ہو۔ چاروں طرف سے پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کے نعرے گونج رہے تھے۔ پاکستان اور اسلام کا تعلق جو گرد آلود ہو چکا تھا' پھر سے ابھر آیا تھا۔

پاکستانی افواج میں تو یہ جذبہ کبھی گرد آلود نہ ہوا تھا۔ ان میں شہادت کے لیے تازہ تڑپ پیدا ہو گئی تھی۔

جب صدر ایوب نے ریڈیو پر بھارت کے حملے کا اعلان کیا حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صدر ایوب بول رہے ہیں۔

ان کے انداز میں گھبراہٹ تھی' ہچکچاہٹ تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے گھٹنے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ جہاد کی بات نہیں کر رہے تھے' جنگ کی بات کر رہے تھے۔ وہ مملکت خداداد کی بات نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ ملک کی بات کر رہے تھے ان کے لہجے میں اسلامی جوش نہ تھا۔

میں نے بھائی جان سے بات کی' میں نے کہا' بھائی جان ساری امیدیں جو میں نے صدر ایوب سے استوار کر رکھی تھیں' خاک میں مل گئی ہیں۔ لگتا ہے وہ عظمت جو پاکستان کے کسی ایک سربراہ کو ملنے والی ہے' صدر ایوب کے نصیب میں نہیں ہے۔

سب اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ بولے' وہ مالک ہے جو چاہے کرے۔ ہم تو اس کے چاکر ہے'

لیکن مفتی صاحب، شاید آپ نے صدر صاحب کو مناسب طور پر نہ جانچا ہو۔

بھائی جان آپ دیکھ رہے ہیں۔ نا، میں نے کہا، راتوں رات عوام کا قلب بدل گیا ہے۔ تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ ہم نے محسوس کیا ہے کہ یہ ایک اسلامی ملک ہے، لیکن بھائی جان، صدر صاحب کا رویہ عوام سے ہم آہنگ نہیں تھا۔

مفتی ٹھیک کہتا ہے، وانی والا۔ صدر کی تقریر میں وہ جوش نہ تھا جو عوام میں دفعتاً" جاگ اٹھا ہے۔

بھائی جان بولے، بھئی ہم تو حکم کے پابند ہیں۔ ہمیں حکم ہے کہ صدر ایوب کو سپورٹ کرنا ہے، اللہ صدر کو توفیق عطا فرمائے۔

افواہیں یا خبریں

پھر افواہوں کا ایک طوفان چل پڑا۔

اگر میں مرد قلندر کے دربار پر جا کر دعا نہ کرتا۔ اگر مجھ پر رقت طاری نہ ہوتی۔ اگر میں بھائی جان سے عقیدت نہ پالیتا۔ اگر مجھے قدرت اللہ شہاب سے ملنے کا موقعہ نہ ملتا تو میں بھی ان خبروں کو افواہ سے زیادہ حیثیت نہ دیتا۔

جو بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جو بات قدرت کے ظاہری اصولوں سے ہٹ کر ہوتی ہے، جس بات کا سائنس کی لیب میں تجربہ نہیں کیا جا سکتا، اس کو ہم دانش ور افواہ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ ہم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری عقل محدود ہے، کہ قدرت کے کچھ اصول ایسے بھی ہیں جن کا ہمیں ادراک نہیں ہے اور صرف چند حقائق ایسے ہیں جن کا سائنسی لیب میں تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے باوجود دانش ور ہر اس بات کو، جسے وہ سمجھ نہیں سکتے، افواہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔

بہرحال اب ان مشاہدات کے بعد میرے لیے وہ افواہیں نہیں بلکہ خبریں تھیں۔

لاہور کا ایک مست جو کبھی نہیں بولا تھا۔ اور جسے لوگ چپ شاہ کہتے تھے، گلی کوچوں میں

گھوم پھر کر چلانے لگا لوگو! دیکھو اللہ تعالیٰ کیا کیا معجزے دکھاتے ہیں۔ ڈرو نہیں فتح ہماری ہو گی۔

سیالکوٹ سے آنے والے لوگوں نے بتایا کہ ہم نے سینکڑوں سفید گھڑ سوار دیکھے جو سفید وردیاں پہنے ہوئے تھے' ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ کہتے تھے کہ ہم محاذ پر جا رہے ہیں۔

روز نامہ جنگ کو مدینہ منورہ سے خط موصول ہوا۔ لکھا تھا' جس روز لاہور پر حملہ ہوا۔ اسی رات مدینہ منورہ میں مقیم دو افراد نے خواب میں دیکھا کہ حضور اعلیٰ صلعم گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ پوچھا حضورؐ اتنی جلدی میں کہاں جا رہے ہیں فرمایا' پاکستان میں جہاد کے لئے جا رہے ہیں۔

معروف حکیم نیر واسطی ان دنوں مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ وطن واپس آ کر انہوں نے ایک نشریے میں کہا کہ لاہور کی ایک خاتون جو اٹھارہ سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہے اور روز روضہ مبارک کی جالی کے پاس بیٹھی رہتی ہے' اس نے ۶ ستمبر کو بتایا' میں نے حضور صلعم سرور کائنات کو دیکھا سخت گھبراہٹ اور عجلت میں باہر نکلے۔ لٹیں کھلی تھیں' گیسو پریشان تھے۔ میں نے کبھی ان کو ایسی عجلت اور پریشانی کے عالم میں نہیں دیکھا تھا۔

نیر واسطی صاحب نے کہا کہ ایک بزرگ جو روز روضۂ مبارک میں ان سے ملا کرتے تھے۔ ۶ ستمبر کو غائب ہو گئے ان کے ایک مرید نے بتایا کہ وہ پاکستان جہاد پر گئے ہیں۔

ایک اور بزرگ نے نیر واسطی کو بتایا کہ تمام شہداء' شہداء بدر کی معیت میں گھوڑوں پر سوار ہو کر پاکستان گئے ہیں۔

وقار النساء کالج کی پرنسپل کے بھائی نے جو پی اے ایف پشاور میں ملازم تھا' بتایا' کہ بم پٹرول کے ٹینک میں گرا اور حیرت کی بات ہے کہ بجھ گیا۔

سیالکوٹ پر حملہ کرنے والی بھارتی فوج محاذ کو خالی دیکھ کر خود بخود رک گئی۔ انہوں نے سمجھا کہ محاذ کا خالی ہونا۔ پاک فوج کی چال ہے۔ مقصد بھارتی فوج کو گھیرے میں لینا ہے۔

برق صاحب نے اپنے بیان میں کہا کہ سرگودھا پر بہت سے بم گرائے گئے صرف دو بم پھٹے جو ٹارگیٹ سے دور پھٹے حالاں کہ سرگودھا کے اڈے پر سارے ہوائی جہاز باہر تھے۔

جنگ کے دوران عکسی اور میں دونوں قاضی صاحب سے ملے۔ ان کا ڈیرا ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔

پاکستان اور دعا

ہم نے قاضی صاحب سے عرض کی کہ پاکستان کے لیے دعا کریں۔ قاضی صاحب بولے، مفتی صاحب میں آپ کے لیے دعا کر سکتا ہوں۔ دوسروں کے لیے دعا کر سکتا ہوں پاکستان کے لیے دعا کرنے کی میری کوئی حیثیت نہیں ہے پاکستان کے لیے بڑے بزرگ کام کر رہے ہیں۔ میں تو اک چھوٹا آدمی ہوں۔ بڑے کام بڑوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں بڑے بزرگ میدان جنگ میں پاکستان کی حفاظت کر رہے ہیں ورنہ یہ کیسے ہوتا کہ پنڈی میں ۲۱ بم گرائے جائیں اور ان میں سے صرف پانچ پھٹیں۔

ہمیں کیا پتہ ہے کہ ہمارے پانچ سو جوان محاذ پر بھارتیوں کو پانچ ہزار دکھائی دیتے ہیں یا پانچ لاکھ۔ البتہ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ فتح ہماری ہو گی۔

بھارتی قیدیوں کے بیانات حیران کن تھے۔

انہوں نے کہا کہ تلواروں والی فوج نے ہمیں بڑا نقصان پہنچایا۔ ان کی تلواروں سے بجلی نکلتی تھی۔

سیالکوٹ میں پکڑے جانے والے قیدیوں نے پوچھا کہ پاک فوج میں وہ سفید وردیوں والے کون تھے۔

کھیم کرن کے قیدی نے کہا، سرخ وردیوں کے گھڑ سواروں نے بھارتی فوج کو زچ کر دیا۔

ایک بھارتی پائلٹ قیدی نے کہا کہ ملتان میں تین بوڑھے بھارتی بم کیچ کر کے پرے پھینک دیتے تھے۔

بھارتی پائلٹ

بھارت کے ایکس ای این کا پائلٹ بیٹا، جو بیل آوٹ کر گیا تھا، پکڑا گیا تو اس نے بتایا کہ پتہ نہیں کیا ہوا۔ مجھے چاروں طرف سے آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ بیل آوٹ بیل آوٹ حالاں کہ کوئی پاکستانی جہاز میرا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ میں اس قدر کنفیوز ہو گیا کہ بیل آوٹ کر دیا۔

بھارتی جرنیل کرنیپا کا بیٹا جو پائلٹ تھا، پکڑا گیا تو اس نے اپنے بیان میں کہا کہ میں

راوی کے پل کو تباہ کرنے کے لیے آیا تھا۔ دریا پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دریا پر ایک نہیں بلکہ چھ پل ہیں۔

ایک اور پائلٹ قیدی نے بتایا کہ ہم دوارکا پر حملہ کرنے آئے تھے۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ حالات سازگار تھے لیکن جونہی ہم دوارکا پہنچے تو پتہ نہیں ایک گاڑھا بادل کہاں سے آگیا اور اس نے دوارکا کو چھپا لیا۔

پاکستان کے صحافی اور ادیب جو مختلف محاذوں کا دورہ کر کے آئے تھے' انہوں نے بتایا کہ جہاں بھی بھارتیوں نے ہتھیار ڈالے' وہ محض غلط فہمی کی وجہ سے ڈالے چونکہ پاک فوجیوں کی تعداد بہت کم تھی' لیکن بھارتی فوج نے سمجھا کہ پاک فوج تعداد میں بہت زیادہ ہے۔

سیز فائر

جنگ ۶ ستمبر سے شروع ہوئی تھی۔ ۲۳ کو سیز فائر ہو گئی۔

سیز فائر کے احکامات سن کر فوجی کمانڈر بہت سٹپٹائے' اس لیے کہ پاکستان کی فوجیں جگہ جگہ بھارت کے علاقے کے اندر دور تک پیش قدمی کر چکی تھیں۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق سیز فائر منظور کر لینا' سخت حماقت تھی چوں کہ سیز فائر کا فیصلہ دباؤ کے تحت کرنا پڑا تھا۔

غفور ایڈووکیٹ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ جنگ میں میری ڈیوٹی سرگودہا پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے نقصان ہونے نہیں دیا' اللہ احسان ہے۔

کہنے لگے' میں نے بروقت صدر صاحب کو خط لکھ کر بتایا تھا کہ سیز فائر کے لئے دباؤ پڑے گا آپ ٹالتے رہیے۔ اگر آپ کو تسلیم کرنا پڑے تو بے شک منہ زبانی تسلیم کر لیں۔ عمل کرنے میں تاخیر کریں اور فرض کیجیے سیز فائر عملی طور پر کرنا پڑے تو صرف دو یا تین گھنٹے کا ہو' لیکن صدر صاحب نے اس تجویز کے کسی حصے پر بھی عمل نہ کیا۔

بزرگوں کا خیال تھا کہ اس جنگ میں پاکستان کا پلہ بھاری تھا۔ پاکستان کو غیبی امداد حاصل تھی۔ لیکن صدر صاحب میں جذبہ جہاد نہیں تھا' اس لیے بات بن کر بگڑ گئی۔

ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے سربراہ میں جب تک اسلام اور جہاد کے لیے جذبہ نہ ہو گا کچھ نہ ہو سکے گا چوں کہ پاکستان کی تمام تر اہمیت صرف اسلام کے حوالے سے ہے۔

ا۔ اکتوبر ۶۵ء میں قدرت اللہ کا خط ملا جو انہوں نے ۲۰ کو لکھا تھا۔ اس خط میں قدرت اللہ نے جنگ کے متعلق اظہار خیال کیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

آزمائش کا دور

ا۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان پر جو فضل کیا ہے۔ وہ مقام شکر بھی ہے اور مقام عبرت بھی۔ ہم لوگ جیسے جھوٹے سچے مسلمان ہیں' وہ تو ظاہر ہے۔ اس پر بھی خدا نے ہمارے نمائشی ایمان کی لاج رکھ لی۔

آزمائش کے وقت جو خوارق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ وہ "مصلحتاً" ہوتے ہیں۔ "عادتاً" نہیں' اس لیے ان پر شادیانے بجانا یا آئندہ کے لیے ان پر تکیہ کرنا مناسب نہیں۔ اصلی چیز تو تیاری ہے۔ اسلحہ بندی کے علاوہ ایمان کی تیاری بھی۔

۲۔ افراد اور قوموں کی زندگی میں دعا بھی بڑا اثر رکھتی ہے۔ کچھ لوگ اپنے لیے دعا کرتے ہیں' اور کچھ دوسروں کے لیے' یہ سب دعائیں اپنی اپنی جگہ جائز' ضروری اور موثر ہیں' لیکن کچھ لوگ۔ خال خال۔ ایسے بھی ہیں جو محض اللہ کی رضا کے لیے اس کی عبادت کرتے ہیں۔ جب تک کسی ملک یا قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں' اس ملک پر مصیبت تو آ سکتی ہے' لیکن تباہی نہیں' دعا اور کوشش کریں کہ پاکستان میں ایسے لوگ ہمیشہ موجود رہیں۔

۳۔ ہندوستان کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔ بین الاقوامی منڈی میں بھی انصاف اور ایمانداری بہت کم یاب ہے۔ ہمارے لیے ابھی آزمائش کا دور شروع ہوا ہے ختم نہیں ہوا۔

قدرت اللہ اپنے خطوط یا بیانات میں ضبط سے کام لینے کا عادی تھا۔ اس نے کبھی بڑھا چڑھا کر بات نہ کی تھی۔ اس کی بات مختصر ہوتی۔ غیر ضروری تفصیلات کو قدرت حذف کر دیتا تھا۔

لہ اصل خط ضمیمہ میں دیکھیئے: خط نمبر Xii

اس کا کہنا تھا کہ شدت اور جذباتیت روحانی دنیا میں DISQUALIFICATION سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس غفور صاحب کھل کر بات کر دینے کے عادی تھے اور ان کا انداز جذباتی تھا۔

غفور کا خط

غفور صاحب کا کہنا تھا کہ یہ جنگ پاکستان کے لیے ایک زریں موقع تھا جو صدر صاحب کی بے حسی کی وجہ سے ضائع ہو گیا۔

ا۔ ۲ فروری ۶۶ء کو غفور صاحب نے قدرت اللہ شہاب کو ہیگ میں ایک خط لکھا۔ اس خط کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

ہمارے حکمران طبقے کو یہ علم نہیں کہ ملک میں روحانی انقلاب آ رہا ہے جس سے صرف پاکستان اور ہندوستان ہی متاثر نہ ہوں گے بلکہ پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ملک میں درویشوں کی تعداد کثرت سے ہے یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو چشم زدن میں ہندوستان تو کیا' ان ملکوں میں انقلاب لا سکتے ہیں جہاں اسلام کا نام و نشان نہیں۔

سترہ روزہ جنگ ہندو پاک کے واقعات کو اگر آپ غور سے مطالعہ فرمائیں' تو انسانی عقل و فکر حیران رہ جاتی ہے۔

میرے بہت سے فوجی دوست کہتے ہیں کہ اس جنگ نے انہیں صحیح اور سچا مسلمان بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی اور نبیؐ آخر الزمان کی کرم نوازی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم اتنی شدید فوجی اور جنگی غلطیاں کر کے فتح حاصل کی ہے۔

یہ جنگ درویشوں کی کمانڈ کے تحت روحانی ایٹمی قوت سے لڑی گئی۔

تم بزدل ہو

۲۸ اگست ۶۶ء کو غفور صاحب راولپنڈی تشریف لائے۔ مجھ سے ملنے کے لیے میرے گھر

ا۔ ضمیمہ میں اصل تفصیلی خط ملاحظہ کریں۔ خط نمبر 1☆

آئے۔ انہوں نے مجھے بتایا' کہنے لگے' صدر ایوب سے ہم نے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں' چوں کہ صدر ایوب کے کردار میں کئی ایک خوبیاں ہیں۔ وہ مخلص ہیں' نیک نیت ہیں۔ لوگوں کی بھلائی چاہتے ہیں' خود پسند نہیں' ذاتی مفاد کے قائل نہیں' لیکن طبعاً" وہ سیکلر ہیں۔ ان میں اسلامی رجحان نہیں ہے اور وہ کچھ زیادہ ہی ریشنل ہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ قدرت اللہ انہیں گائیڈ کرتے رہیں۔ اب شہاب صاحب کے جانے کے بعد وہ چند ایسے لوگوں کے زیر اثر آ گئے ہیں' جو انہیں صحیح مشورہ نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا اسی وجہ سے میری ڈیوٹی لگ گئی تھی کہ میں انہیں باقاعدہ خط لکھوں۔

غفور صاحب نے بتایا کہ جنگ کے بعد میں مکہ معظمہ میں تھا۔ مکہ شریف کے ایک مجذوب نے مجھے ایوب کے نام سے پکارا۔ میں نے کہا میں ایوب نہیں ہوں' غفور ہوں۔ اس نے میری بات پر توجہ نہ دی اور مجھے ایوب کہنے پر مصر رہا۔ پھر اس نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ بولا ایوب تم بزدل ہو۔ تم جہاد کرنے سے ڈرتے ہو۔ کافر سے جہاد نہیں کرو گے' بولو۔

غفور صاحب نے کہا' میں نے اس واقعہ کی خبر بذریعہ خط صدر پاکستان کو پہنچا دی تھی۔

بزرگوں کی میٹنگ

پھر مکہ معظمہ میں بزرگوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں زیادہ تر بزرگ صدر ایوب کے خلاف تھے۔ دو تین ایسے بھی تھے جو صدر ایوب کے حق میں تھے۔ اور چاہتے تھے کہ انہیں ایک اور موقع دیا جائے۔

غفور صاحب نے کہا کہ میں نے اس واقعہ کی صدر ایوب کو اطلاع دی۔ میں نے صدر صاحب کو لکھا کہ اگر آپ کو ان باتوں کا یقین نہیں آتا تو فی الفور اپنا کوئی افسر بھیج دیجیے تاکہ وہ خود آ کر دیکھ لے کہ یہاں فضا ان کے خلاف ہے۔

غفور صاحب نے کہا افسوس کہ صدر ایوب نے اپنا افسر بھیجنے میں بہت دیر کر دی۔ انہوں نے اعوان صاحب کو بھیجا۔ اعوان صاحب جب مکہ معظمہ میں پہنچے تو میں وہاں سے آ چکا تھا۔

غفور صاحب نے کہا کہ مکہ شریف سے آنے سے پہلے مجھے مکہ کے ایک بزرگ نے تعویز دیا کہ ایوب صاحب اسے پہنے رکھیں۔ پاکستان میں آ کر میں نے بہت کوشش کی وہ تعویز صدر

صاحب تک پہنچاؤں' لیکن کوشش کے باوجود کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا' میں غفور صاحب کے اس خط کے اقتباسات پیش کر رہا تھا جو انہوں نے ۲۷ جنوری کو شہاب صاحب کو لکھا تھا۔ یہ ضمنی تفصیلات دینا اس لیے ضروری تھا تاکہ آپ غفور صاحب کے خط کے متن کو سمجھ سکیں۔ ہاں تو غفور صاحب نے شہاب کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ۔

> چوں کہ آپ کا اصرار تھا کہ آپ کو ایک مفصل خط تحریر کروں۔ اس واسطے میں نے بالکل واشگاف الفاظ میں پوری جنگ کی کیفیت جو کہ میں واپسی از حج پر محترم اعوان صاحب کی معرفت صدر صاحب کو پہنچائی تھی' تحریر کروا دی اور وہ تعویز' جو میں صدر صاحب کے لیے مکہ شریف کے ایک مجذوب بزرگ سے لایا تھا' بھی بھجوا دیا۔
>
> ...... وہ بزرگ جنہوں نے مجھے مکہ مکرمہ میں صدر صاحب کے لیے تعویز دیا تھا' کئی بار خواب میں ملے ہیں' کہتے ہیں' ایوب نے وعدہ خلافی کی۔

بیالیسواں باب

عکسی مفتی

میری تاریخ پیدائش گیارہ ستمبر ۱۹۰۵ء تھی، لیکن پتہ نہیں کیوں میری سروس بک میں ۱۲ جنوری ۱۹۰۶ء لکھی ہوئی تھی۔ حکومت پاکستان کے مروجہ قانون کے مطابق مجھے جنوری ۱۹۶۱ء میں ریٹائر ہو جانا چاہیے تھا، لیکن جب میں پچپن سال کا ہوا تو قانون میں ترمیم کر دی گئی اور ریٹائرمنٹ ۵۵ سال سے بڑھا کر ساٹھ سال کر دی گئی۔

۱۹۶۶ء میں میرا خیال تھا کہ ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۵ سال کر دی جائے گی، لیکن اس کے برعکس وہ پھر سے ۵۵ سال کر دی گئی جنوری ۱۹۶۵ء میں میں لیو بیفور ریٹائرمنٹ پر گھر جا بیٹھا۔

ذات کا ایلی

میری ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ادب کے لیے کچھ لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے خیالات اور مشاہدات کی دنیا جو میں نے ۵۰ سال میں بڑی محنت اور مطالعہ سے بنائی ہوئی تھی، جس کے زور پر میں ادبی مضامین لکھا کرتا تھا، تنکوں کے گھروندے کی طرح میرے قدموں میں ڈھیر ہوئی پڑی تھی اور وہ نئی طلسماتی دنیا جس میں میں داخل ہوا تھا، ابھی تک میرے لیے ایک حیران کن چیز تھی۔ جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس لیے میرا ذہن

گومگو کے عالم میں تھا۔ اس صورت حال میں لکھنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے مگر ایسے ہوتا ہے کہ کوئی پرانی عادت یا نشہ جو آپ چھوڑ چکے ہوں' وقفوں کے بعد پھر سے آپ پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس کیفیت کو ایک شاعر نے خوب بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

وہ شیشہ ہائے مے کشی کہ مصلحت اسی میں تھی
جنہیں وہیں پڑے پڑے۔ وہیں کی خاک کھا گئی
پھر ان کو ڈھو رہا ہوں میں
یہ کیا بنا رہا ہوں میں

کبھی کبھار بیٹھے بٹھائے مجھ پر ایلی حملہ کر دیتا تھا۔ وہ میرے روبرو آکر کھڑا ہو جاتا۔ مجھ سے کہتا' یہ تو کیا کر رہا ہے۔ یہاں سے تجھے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یہ طلسماتی دنیا جس میں تو جی رہا ہے' یہ تجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ یہ تیری دنیا نہیں ہے۔ یوڈونٹ بلانگ ٹواٹ۔ تو تو خشکی پر رہنے والا ہے۔ کیوں خواہ مخواہ گہرے پانیوں میں غوطے کھا رہا ہے۔ تجھ میں بزرگ بننے کی خواہش نہیں ہے' صلاحیت نہیں ہے۔ تیرے کردار میں استقامت نہیں ہے پھر تو یہاں کس امید پر بیٹھا ہے۔ صرف اس لیے کہ اپنی CURIOSITY کی تسکین کر سکے۔ صرف جاننے کی خواہش کی تکمیل تو مقصد حیات نہیں بنائی جا سکتی۔ آج تجھے اس ماحول میں جیتے ہوئے دس گیارہ برس ہو چکے ہیں' لیکن روحانی دنیا کے متعلق تو کچھ بھی نہیں جان سکا۔

قدرت اللہ شہاب ایک وسیع سمندر ہے' جس کی نہ کوئی سمت ہے نہ کنارا۔ تجھے آج تک سمجھ نہیں آیا کہ وہ کون ہے کس کام پر مامور ہے۔ چھوڑ اسے۔ اسے اپنا کام کرنے دے تو اپنا کام کر۔ تو تو ذات کا ایلی ہے۔ "ذات دی کوہڑ کرلی چھتیریاں نال جھپے" چل کسی خاتون کے در پر جا کر بیٹھ۔ یہی تیری اصلیت ہے۔ یہی تیری منزل ہے گذشتہ تین سال میں' ایلی نے دو تین بار مجھ پر حملہ کیا تھا اور ایسا شدید وار کیا تھا کہ میں کئی دن زخمی پرندے کی طرح تڑپتا رہا تھا۔

بھائی جان سے میری عقیدت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اگرچہ دل میں ان کا احترام جوں کا توں قائم تھا۔ مرد قلندر کی خدمت میں میں باقاعدہ حاضری دیا کرتا تھا' لیکن دل میں اک خوف سا در آیا تھا۔ بھائی جان کے الفاظ میں وہ بہت ڈاہڈے تھے۔ طاقت ور تھے اور کوتاہی کو برداشت

عزیز و اقارب

۴۲۔ عکسی مفتی
۴۳۔ اپنے سبے گانے



پروفیسر نذیر احمد



صباح مفتی



مقبول قریشی



مظہر مفتی



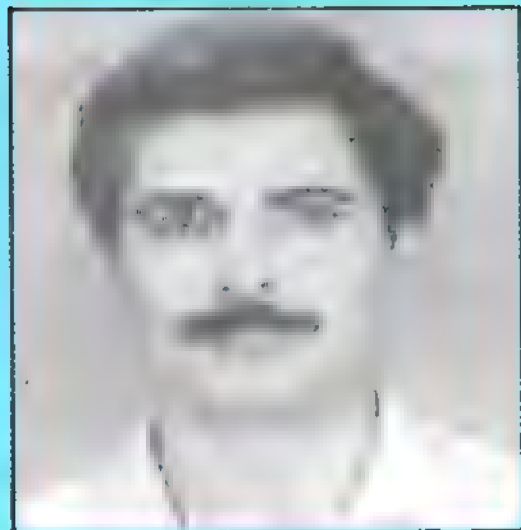
امجد مفتی (بھائی)



انجم نذیر وڑائچ



ڈاکٹر امانت مفتی



نوید بٹ



تمکینہ مفتی



فریدہ (بھانجی)



سویرا



عکسی تصویر بناتے ہوئے



نقش اور نیلو

نہیں کرتے تھے۔ قدرت اللہ اپنے عظیم کردار اور وسعت دل کی وجہ سے میری زندگی کا مرکز بن چکا تھا اور اس جذبہ عقیدت میں محبت کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

آ رہے ہیں

پھر ایک دم قدرت اللہ کی واپسی کی خبریں آنے لگیں۔

دو ایک صحافیوں نے مجھے بتایا کہ باہر کے اخبارات میں ان کے آنے کی خبریں چھپی ہیں۔

راجہ شفیع دوڑا دوڑا میرے پاس آیا کہنے لگا' شہاب صاحب واپس آ رہے ہیں۔

وانی نے مجھے فون کیا کہنے لگا' بھائی یہ کیسی خبریں سن رہا ہوں۔

مری سے بھائی جان کا خط آیا کہ سننے میں آیا ہے کہ ستارا واپس آ رہے ہیں۔ اس کے متعلق معلومات حاصل کر کے مجھے لکھیں۔

سائیں کرم دین بولے۔ یقیناً" واپس آئیں گے' انہوں نے انہیں ملک سے باہر بھیج کر فاش غلطی کی تھی' اب بھگت رہے ہیں۔

میرے دوست شبیر شاہ نے کہا' مبارک ہو شہاب صاحب آ رہے ہیں۔ پتہ چلا ہے کہ وہ وزارت تعلیم کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کریں گے۔

پھر غفور صاحب کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا'

شہاب صاحب کی واپسی کے احکامات مدینہ منورہ سے چھ ماہ پہلے جاری ہو چکے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیوں نہیں آ رہے۔ آنے میں کیوں تاخیر کر رہے ہیں۔

آخر میں قدرت کا خط موصول ہوا لکھا تھا' امکان غالب ہے کہ ہم واپس آ رہے ہیں۔ اب کی بار شاید وزارت تعلیم تعیناتی ہو گی۔

لیکن قدرت اللہ کی آمد سے پہلے ایک ایسا واقعہ رونما ہوا۔ جس نے میرے ذہن کا فیوز اڑا کر رکھ دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یہ کیا ہوا۔

یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ میں ملازمت سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ میں نے سرکاری گھر خالی کر دیا تھا اور قریب ہی ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔

اس مکان کی ایک سمت اونچی سطح پر تین کمرے تھے' جن کے ساتھ ساتھ ایک لمبا برآمدہ

تھا۔ مکان کی دوسری سمت ایک ڈرائنگ روم تھا' جس کے ساتھ ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ درمیان میں ایک خاصا وسیع صحن تھا۔

ہم نے عکسی کو ڈرائینگ روم اور چھوٹا کمرہ رہائش کے لیے دے رکھا تھا۔

کمرے میں سورج

ایک روز صبح سویرے میری بیوی اقبال نے مجھے جگایا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔

میری بانہہ پکڑ کر وہ مجھے برآمدے میں لے گئی۔ وہ دیکھو' اس نے صحن میں بچھے ہوئے تخت کی طرف اشارہ کیا۔ تخت پر عکسی بیٹھا تھا۔ اس کا چہرا' دوسری جانب تھا۔

میں اسے صحن میں بیٹھے دیکھ کر حیران ہوا۔ اس لیے کہ وہ کبھی صحن میں نہ بیٹھا تھا اور صبح سویرے کبھی نہیں جاگا تھا۔ ان دنوں وہ سی ایس ایس امتحان کی تیاری میں مصروف تھا' اس لئے رات کے ایک دو بجے تک پڑھتا رہتا تھا۔

بہرصورت میں عکسی کے قریب گیا۔

اس نے منہ موڑ کر میری طرف دیکھا۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔ چہرا مسخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور یوں جل رہی تھیں جیسے کوئلے دہکتے ہیں۔

مجھے خوف زدہ دیکھ کر اس نے اپنی ابنارمل کیفیت کو دبانے کی شدید کوشش کی جس کی وجہ سے اس کا چہرا اور بھی بھیانک ہو گیا۔ بولا' کچھ بھی نہیں ابو کچھ بھی تو نہیں۔

کچھ تو ہے' میں نے کہا۔

نہیں نہیں' وہ بولا' کوئی خاص بات نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ ایک عام سا مشاہدہ ہے۔ جو پاکستان کے نوجوانوں کو ہو گا۔ آپ کو بھی ہو گا۔

لیکن ہوا کیا' میں نے پوچھا۔

پاکستان کی عظمت

ایک مشاہدہ ایک ویژن' وہ بولا' پاکستان کی آنے والی عظمت کا ویژن۔ رات کے پچھلے پہر

سورج میرے کمرے میں گھس آیا۔ اس وقت اس میں حدت نہیں تھی صرف نور ہی نور تھا۔ میں چکا چوند ہو گیا۔ ابو' وہ سورج سمٹ کر پاکستان بن گیا۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھا فضا کو گھورتا رہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر دیوانگی کے اثرات بالکل نمایاں تھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے میری جانب منہ موڑا بولا' ابو یہ مشاہدہ بہت سوں کو ہو گا۔ سب اس کا تماشہ کریں گے۔

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد بولا' آپ پاکستان کو نہیں جانتے ابو' نہیں جانتے۔ اس کی آواز پھٹی پھٹی تھی جیسے کوئی ڈرا ہوا ہو' سہا ہوا ہو۔ آپ نہیں جانتے وہ کہنے لگا' لیکن میں جانتا ہوں' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' لیکن میں بتا نہیں سکتا کہ کیا دیکھا ہے۔ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا' صرف مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

وہ پھر خاموش ہو گیا اور ٹکٹکی باندھ کر فضا میں دیکھنے لگا' جیسے بیتے ہوئے کو پھر سے بیت رہا ہو۔

ابو' وہ پھر بولا' پاکستان نے دنیا کی راہنمائی کرنی ہے۔ دنیا کو راستہ دکھانا ہے۔ اب میں سول سرونٹ ہوں۔ مجھے پاکستان کی چاکری عطا کر دی گئی ہے۔ بہت سوں کو یہ چاکری عطا کی جائے گی' بہت سوں کو اب مجھے مطالعہ کرنا ہے' مطالعہ' مطالعہ' مطالعہ۔

اس دن کے بعد عکسی کے معمولات بدل گئے۔ اس نے نمازیں پڑھنی شروع کر دیں۔ قرآن کریم سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ پڑھتا رہتا۔

میرے دل میں شبہات پیدا ہو گئے۔ رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ یقیناً عکسی مجذوب بنا دیا گیا ہے' لیکن اس پر کس نے نظر ڈالی ہے۔ کیا قدرت اللہ نے۔ نہیں وہ تو ہالینڈ میں بیٹھے ہیں کیا بھائی جان نے یا مرد قلندر نے ان تینوں کے سوا کون ہو سکتا ہے۔

چٹ کپڑی' تذلیل

پھر عکسی کے ایک دوست نے لات مار کر پاکستان کی عظمت کا وہ سورج پاش پاش کر دیا۔ کہنے لگا' یہ سب فتنہ و فساد ایک لڑکی کا اٹھایا ہوا ہے۔ عکسی اسے چاہتا ہے' لڑکی بھی عکسی کو بہت

پسند کرتی ہے۔ دونوں آپس میں ملا کرتے تھے۔ پھر عکسی کو پتہ چلا کہ گھر والے لڑکی کی شادی کر رہے ہیں۔ اس پر عکسی ان کے گھر چلا گیا اور لڑکی کے عزیز و اقارب سے' جو فوج میں افسر تھے' بات کی۔ جواب میں لڑکی کے بھائی اور باپ نے عکسی سے بد کلامی کی اور تذلیل کرکے اسے گھر سے نکال دیا۔ اس شاک سے عکسی کے ذہن کا توازن قائم نہیں رہا۔

میں اس لڑکی سے مل چکا تھا۔

ایم اے کے بعد میں نے عکسی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنا جیون ساتھی خود تلاش کرو۔ تلاش کرنے کے بعد مجھے بتا دینا۔ پھر میرا کام شروع ہو جائے گا۔ اس کے لواحقین سے میں خود جا کر ملوں گا۔ منتیں کروں گا' ہاتھ جوڑوں گا' اگر پھر بھی وہ راضی نہ ہوئے تو ہم لڑکی کو اغوا کر لیں گے۔

ایک دن عکسی میرے پاس آیا کہنے لگا' ابو آپ فارغ ہیں کیا۔ اگر فارغ ہیں تو ذرا باہر آیئے۔ میں آپ کو اپنے ایک دوست سے ملانا چاہتا ہوں۔

جب میں ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ ایک بھرے جسم کی سنجیدہ چٹ کپڑی لڑکی تھی۔

میں نے زندگی میں چٹ کپڑی خواتین تو دیکھی تھیں۔ لیکن چٹ کپڑی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ لڑکیاں تو رنگ دار ہوتی ہیں' دھاری دار ہوتی ہے۔

چٹ کپڑی سفید اور سادہ لباس پہنتی ہے۔ بظاہر لگتا ہے جیسے وہ سنگار سے بے نیاز ہو۔ دراصل چٹ کپڑی سنگار کرنے میں درجہ کمال حاصل کر چکی ہوتی ہے۔ وہ اس انداز سے سنگار کرتی ہے کہ تاثر "سادگی" کا قائم رہتا ہے اور یوں نظر آتا ہے جیسے وہ سنگار سے بے نیاز ہو۔

کہتے ہیں کہ چٹ کپڑی کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔ اور وہ مہربان ہو جائے تو جنت میں جانے کی آرزو نہیں رہتی۔

کئی ایک دن میں نے تذبذب میں گزارے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا یہ محبت میں تذلیل کا نتیجہ تھا یا واقعی عکسی کو کوئی مشاہدہ ہوا تھا۔ اس معاملے میں میرے حلقہ ارباب میں قدرت اللہ کے سوا کوئی شخص نہ تھا جو میری راہ نمائی کر سکتا۔ میرے جاننے والوں میں قدرت اللہ ہی ایسا فرد تھا جو روحانیت اور عقل و دانش کو ہم آہنگ سمجھتا تھا۔ میری طرح انہیں متضاد نہیں سمجھتا

تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ عقل و خرد روحانیت کے لیے باعث تقویت ہیں۔

اس لیے میں قدرت اللہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

عکسی کی زندگی نشیب و فراز سے بھری ہوئی تھی۔

جب وہ دو سال کا ہوا تو اس کا باپ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

جب وہ چار سال کا ہوا تو امی ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی' پھر باپ پتہ نہیں کہاں سے آ گیا۔ وہ عکسی کو انگلی لگا کر اپنے ساتھ لے گیا۔

خوف زدہ بچہ

اسے بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کبھی کوئی چھوڑ جاتا ہے کبھی کوئی آ جاتا ہے۔ اسے لوگوں پر بھروسہ نہ رہا تھا۔

گھر میں صرف ابا تھے اور بوڑھی دادی اماں۔ وہ باہر کھیلنے نہ جاتا تھا کہ کہیں وہ دونوں اسے چھوڑ کر نہ چلے جائیں۔

باپ سکول ماسٹر تھا۔ جب وہ پڑھانے کے لیے سکول جاتا تو عکسی ضد کر کے باپ کے ساتھ چلا جاتا۔ جتنی دیر ابا پڑھاتا رہتا' عکسی دیوار سے لگ کر کھڑا رہتا' جب ابا سٹاف روم میں جاتا تو عکسی ساتھ جاتا اور وہاں کرسی سے لگ کر کھڑا رہتا۔

عکسی ایک اکیلا اور خاموش بچہ تھا۔

پھر گھر میں ایک امی آ گئی۔

یہ وہ امی نہ تھی۔ پتہ نہیں کون سی امی تھی۔ وہ اور بھی گھبرا گیا۔

۱۹۵۱ء میں جب وہ پنڈی آئے تو عکسی کو سینٹ میری سکول میں داخل کر دیا گیا۔

جس گھر میں عکسی پرورش پا رہا تھا' وہاں کاغذ تھے' کتابیں تھیں' پنسلیں تھیں۔ باپ سارا دن چٹائی پر بیٹھ کر سکرپٹ لکھا کرتا تھا۔ پاس ہی ریڈیو دھرا ہوتا جو ہر وقت چالو رہتا کیوں کہ ابا موسیقی کے بغیر لکھ نہ سکتا تھا۔ گھر میں کوئی قانون نہ تھا اصول نہ تھا پابندی نہ تھی۔ گھر میں غربت تھی اور آزادی تھی۔

باپ کے چند ایک دوست تھے وہ سب ریڈیو میں ملازم تھے۔ عمر تھا' مسعود تھا' مرزا تھا' عماد

تھا' یوسف ظفر تھا۔ وہ اکثر گھر آ جاتے ۔ آتے ہی چیختے چلاتے' نعرے مارتے' قہقہے لگاتے' مذاق اڑاتے یا تاش کی بازی لگا لیتے۔ ہارنے والے سے جرمانہ وصول کرتے اور جب جرمانے کی رقم کافی ہو جاتی تو وہ عکسی کو للکارتے اور اسے کلفہ خریدنے کے لیے بازار بھیج دیتے۔ پھر عکسی منڈلی میں کلفے کی سروس کرتا۔ کھا پی کر وہ سب نعرے لگاتے ہوئے چیختے چنگاڑتے ہوئے چلے جاتے اور ابا پھر سے چٹائی پر بیٹھ کر لکھنے لگتا تھا۔

چھوٹا

عکسی کا کوئی اپنا دوست نہ تھا۔ اس لیے وہ ابا کے دوستوں میں بیٹھا رہتا تھا۔ اسے ابا کے دوستوں سے سخت شکایت تھی کہ وہ اس سے سارے کام کروایا کرتے تھے۔ عکسی چائے لاؤ۔ عکسی پانی۔ عکسی تاش کہاں ہے' لیکن انہوں نے کبھی عکسی کو دوست کی حیثیت نہ دی تھی۔ ان کے نزدیک وہ محض ایک چھوٹا تھا۔ کوئی ایک آتا آ کر باری باری سب سے ہاتھ ملاتا' لیکن عکسی کو چھوڑ دیتا۔ اس پر عکسی سخت احتجاج کرتا کہ اسے اہمیت نہیں دی' پھر جب عکسی کے احتجاج میں غم و غصے کا عنصر پیدا ہو گیا تو انہوں نے عکسی کو کچھ کچھ اہمیت دینا شروع کر دی۔

انہی دنوں عکسی میں بیداری کی پہلی کرن پھوٹی۔

اگرچہ اس کے باپ کو پکے راگ کی پہچان نہ تھی۔ موسیقی کے متعلق صرف کتابی علم حاصل تھا۔

.... نہ گلے میں راگ تھا نہ کان میں وہ خصوصی حس تھی جو موسیقار کے لیے از بس ضروری ہوتی ہے۔ لیکن ایک بات ضرور تھی۔ پکا راگ سن کر اس کے باپ پر ایک عجیب سا بے نام اثر ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ جب بھی لکھنے بیٹھتا ریڈیو پر موسیقی لگا لیتا' کوئی ایسا سٹیشن جہاں سے ایسا گانا نشر ہو رہا ہوتا جس میں پکے راگ کی آمیزش ہوتی۔

پہلی بیداری

عکسی اور اس کی دونوں بہنوں کو پکے راگ سے چڑ تھی۔ جب بھی اسے موقع ملتا وہ سٹیشن بدل دیتا اور ایسی جگہ ریڈیو لگا دیتا جہاں سے فلمی گانے نشر ہو رہے ہوتے۔

پھر ایک روز ایک عجیب بات عمل میں آئی باپ لکھنے میں مصروف تھا۔ ریڈیو چل رہا تھا۔ ریڈیو پر فلمی گیت ہو رہے تھے۔ عکسی چپکے سے آیا اس نے ریڈیو کی سوئی گھما کر پکا راگ لگا دیا۔ باپ نے حیرت سے عکسی کی طرف دیکھا۔ یہ کیا ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید مجھے خوش کرنے کے لیے عکسی نے پکا راگ لگایا ہے۔

لیکن چند ایک دنوں میں بات کھل کر سامنے آ گئی۔ عکسی کی بہنوں نے باپ سے شکایت کی کہ بھائی انہیں فلمی موسیقی سننے نہیں دیتا' سوئی گھما کر پکا راگ لگا دیتا ہے۔ باپ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی' لیکن اس نے بات کو زیادہ اہمیت نہ دی' چونکہ عکسی کے جسم خدو خال اور طور طریقے سے یہ کبھی ظاہر نہ ہوا تھا کہ وہ ایک ذہین لڑکا ہے یا اس میں فنکارانہ حساسیت ہے۔ دیکھنے میں وہ ایک میڈیا کر لڑکا تھا' بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے بے حس ہو۔

جب عکسی جونیئر کیمبرج میں پہنچا' تو باپ نے فیصلہ کر دیا کہ سینٹ میری سکول چھوڑ دے اور میٹریکولیشن کی تیاری کرے۔ سینٹ میری کے ڈاکٹر برنر نے عکسی کو سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اپنے ڈیڈی کو میرے پاس بھیجو۔

ڈاکٹر برنر نے کہا' یہ بچہ سینئر کیمبرج کرے گا۔

نہیں یہ بچہ میٹرک کرے گا' باپ نے جواب دیا۔

نہیں' ڈاکٹر برنر بولا' یہ میرا فیصلہ ہے۔

آپ فیصلہ کرنے والے کون ہیں' باپ نے پوچھا۔

میں اس کا ٹیچر ہوں' وہ بولا۔

میں اس کا باپ ہوں۔

آپ ٹیچر کی اہمیت کو نہیں جانتے' برنر نے کہا۔

جانتا ہوں' باپ بولا' میں نے بارہ سال بچوں کو پڑھایا ہے۔

حیرت ہے' ڈاکٹر برنر بولا' کہ پھر بھی آپ بات نہیں سمجھتے۔

کوئی ٹیچر بھی بات نہیں سمجھتا' چوں کہ وہ کتابی دنیا میں جیتا ہے۔ مسٹر برنر آپ بھی کتابی دنیا میں جیتے ہیں۔

بہرحال ہم اس بچے کا سرٹیفکیٹ اشو نہیں کریں گے' ڈاکٹر برنر نے کہا۔

ٹھیک ہے' باپ نے کہا' کل سے عکسی سکول نہیں آئے گا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عکسی نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے میٹریکولیشن پاس کر لیا۔

اس زمانے میں باپ کی زندگی میں انقلاب آیا تھا اور وہ مرد قلندر کے مزار پر جانے لگا تھا۔ عکسی بھی اس کے ساتھ باقاعدہ مزار پر حاضری دیتا تھا۔ راجہ شفیع اور وانی اس کے دوست بن گئے تھے اور بھائی جان اس پر شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ پھر وہ کراچی چلے گئے۔

طبلہ

کراچی میں عکسی باپ کے ساتھ ولیج ایڈ کے دفتر میں چلا جاتا دفتر میں ساز تھے' پروجیکٹر تھے' کیمرے تھے' ٹیپ ریکارڈر تھے' احمد بشیر تھا' ابن انشا تھا اور حفیظ جالندھری تھا۔

دفتر کے باہر قیصر تھا' جس کے ساتھ باپ بیٹا دونوں سارا دن کراچی میں آوارہ گردی کرتے تھے۔ شام کے وقت احمد بشیر کے گھر محفل موسیقی لگتی تھی۔

پیارنگ سے شدھ موسیقی سن سن کر پتہ نہیں کیا ہوا۔ ایک روز جب طبلچی نہ آیا تو عکسی نے اٹھا کر طبلہ بجانا شروع کر دیا۔ یہ ایک حیران کن بات تھی۔

عکسی کی صلاحیت کو دیکھ کر پیارنگ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے عکسی کو طبلے کے متعلق تربیت دینا شروع کر دیا۔ چھ مہینے عکسی طبلہ بجانے کے شغل میں لگا رہا' پھر اس نے طبلہ بجانا چھوڑ دیا۔

ایک دن میں نے پوچھا' تم نے طبلہ بجانا کیوں چھوڑ دیا۔ کہنے لگا' ابو طبلہ بجانا مقصود نہ تھا۔ تال سمجھنا چاہتا تھا سو سمجھ گیا ہوں' تال کا بھید مل گیا ہے' اور وہ اندر رچ گئی ہے۔ بس یہی چاہتا تھا اب طبلہ بجانا وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔

پھر کراچی سے ہم واپس پنڈی آ گئے اور عکسی گارڈن کالج میں داخل ہو گیا۔

اس کے بعد عکسی میں ایک تبدیلی واقعہ ہوئی۔ پہلے وہ سارا وقت میرے ساتھ گزارتا تھا۔ اب زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔

پینٹنگ

ایک روز میں نے پوچھا آج کل کہاں رہتے ہو۔

وہ غصے میں بولا' دیکھو بابا آج تک میں آپ کے دوستوں کے ساتھ رہا ہوں۔ آپ کے دوستوں کی رفاقت نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ میرا کوئی دوست نہیں' ساتھی نہیں۔ کوئی ہم عمر میرے قریب نہیں آتا۔ کہتے ہیں' تم ہم میں سے نہیں ہو۔ میں ان کے ساتھ رہوں تو اکھڑا اکھڑا رہتا ہوں۔ لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اپنے ہم عمر دوست بناؤں گا۔ دوستوں کا اپنا حلقہ بناؤں گا۔

چند ایک ماہ ہمارے راستے الگ رہے' پھر ایک روز میں نے دیکھا کہ وہ گھر کے باہر ایزل لگائے کینوس پر چاقو سے رنگ تھوپ رہا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ظاہر تھا کہ وہ واں خاخ سے متاثر ہے۔

تصویر بنا رہے ہو' میں نے پوچھا۔

ہاتھ آزما رہا ہوں' وہ بولا۔

میں حیران ہوا' یہ لڑکا موسیقی سے پینٹنگ کی طرف کیسے آ گیا۔

پانچ چھ مہینے وہ ہاتھ آزمانے میں لگا رہا۔ اس دوران میں گھر میں سات آٹھ کینوس اکٹھے ہو گئے' گھڑوں کا ایک ڈھیر' درختوں کا ایک جھنڈ' قلعے کا بیرونی منظر' مری کا شہر دھوپ چھاؤں میں۔ مری کا لینڈ سکیپ قدرت اللہ شہاب کی بیوی ڈاکٹر عفت کو اس قدر پسند آیا کہ وہ اٹھا کر گھر لے گئی۔

پھر وہ عکسی سے کہنے لگی' چھوڑ کالج والج کو بی اے ایم اے میں کیا رکھا ہے۔ آؤ ہم مل کر پینٹنگز کا کاروبار کرتے ہیں۔ تو تصویریں بناتا جا' میں بیچتی جاؤں گی۔ تیری اس تصویر کو دیکھ کر بہت سی میری ملنے والیاں خریدار بن گئی ہیں۔ پانچ سو روپے میں ایک تصویر بیچوں گی۔

پھر دفعتاً" پینٹنگ کرنے کا بخار اتر گیا اور عکسی کالج کی ایکٹیویٹیز میں حصہ لینے لگا پہلے DECLAMATION پھر بحث۔ پھر وہ کرکٹ کھیلنے لگا اور گوگلی گیند پھینکنے میں خاصی شہرت پا گیا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ دفعتاً" اسے سٹیج پلے کی لگن لگ گئی اور اس نے کئی ایک ماہ کی محنت کے بعد ایک پبلک سٹیج پلے کر ڈالا۔

اسٹیج پلے کے بعد اس کی توجہ آڈیو اور ویڈیو کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ سارا سارا دن کباڑیوں کی دکانوں پر جنک میں پرزوں کو تلاش کرتا اور پھر آ کر مجھے کہتا ابو' ہزاروں کا ریکارڈر

بیسیوں میں بک رہا ہے اور ابو کباڑیے کو پتہ ہی نہیں کہ اس کے جنک میں سٹیج ساؤنڈ سسٹم پڑا ہوا ہے۔ جو کوڑیوں کے مول بک جائے گا۔ اس زمانے میں عکسی نے شدت سے محسوس کیا کہ اس کا باپ ایک غریب آدمی ہے اور وہ ایسی چیزوں کو خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود گھر میں کئی ایک مشینیں آ گئیں' ریکارڈر' ایکس چینجر' لاوڈ سپیکر۔

پھر ایم اے میں نفسیات کے پریکٹیکلز کے لیے اسے چھ ماہ کے لیے لاہور گورنمنٹ کالج میں جانا پڑا۔

چھ ماہ وہ اشفاق اور بانو کے گھر رہا۔ وہاں اس نے اشفاق سے بہت کچھ سیکھا چوں کہ اشفاق کی جملہ قابلیتوں میں مستری کی قابلیت بھی موجود ہے۔ وہ مشینوں سے کھیلتا رہا ہے۔ بڑے پیار سے انہیں ہاتھ لگاتا ہے۔ اپنے بیٹوں سے کہتا ہے' ظالموں اس ننھی سی جان پر کیوں ظلم کرتے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ وہ اتنی سی ہے لیکن اتنا بڑا کام کر رہی ہے۔

بانو نے عکسی کے گرد ممتا کے ڈھیر لگا دیئے اور اسے لت پت کر دیا۔ اشفاق کے گھر نے عکسی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔

پھر وہ گارڈن کالج میں لیکچرار ہو گیا۔

سی ایس پی

انہی دنوں میں نے عکسی سے کہا' ایک بات مانو گے۔

کہنے لگا کہیے۔

میں نے کہا' پہلے وعدہ کرو کہ تم زندگی بھر گورنمنٹ کی نوکری نہیں کرو گے۔

کیوں' اس نے پوچھا۔

اگر گورنمنٹ کی نوکری کرنی ہے تو سی ایس ایس کرنا لازم ہو گا۔سی ایس ایس کے بغیر گورنمنٹ کی نوکری کرنا بے عزتی ہے۔

اچھا' وہ بولا' اگر آپ چاہتے ہیں تو میں سی ایس ایس کر لوں گا۔ اس کے بعد وہ سی ایس ایس کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

عکسی کو مطالعہ کا شوق نہ تھا' لیکن اسے امتحان پاس کرنے کا گر آتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ہمیشہ

اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتا تھا اور پوزیشن حاصل کرتا تھا' وہ کہا کرتا تھا ابو امتحان نہ تو مطالعہ سے پاس ہوتا ہے نہ محنت سے۔ امتحان سوجھ بوجھ کے زور پر پاس ہوتا ہے۔

ایک سال کے بعد عکسی میرے پاس آیا کہنے لگا' ابو میں نے سی ایس ایس کی تیاری مکمل کر لی ہے۔ میں اچھی پوزیشن حاصل کروں گا۔

بڑی خوشی کی بات ہے' میں نے کہا۔

لیکن وہ بولا' میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔

پوچھو۔

کہنے لگا' کیا یہ ضروری ہے کہ میں سی ایس پی بنوں۔

میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور کہا' میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم عزت کی نوکری کرو۔

ابو میں سی ایس پی کو عزت کی نوکری نہیں سمجھتا۔

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

میں سی ایس پی بننا نہیں چاہتا' وہ بولا۔

تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا' میں نے پوچھا۔

اس لیے' اس نے جواب دیا' کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں محنت سے جی چراتا ہوں۔ اب فیصلہ آپ پر ہے اگر آپ چاہیں کہ میں سی ایس پی بنوں تو میں امتحان دے دوں گا ورنہ نہیں۔

میرا المیہ یہ ہے کہ میں نے اپنے بچوں کو یہ خوش فہمی دے رکھی ہے کہ میں وسیع القلب باپ ہوں اور ان کی رضامندی کے بغیر کوئی بات ان پر ٹھونسنا پسند نہیں کرتا۔

بہرحال اس روز میرا جی چاہتا تھا کہ فراخ دلی کا وہ ڈھونگ چاک چاک کر کے رکھ دوں' لیکن مجھ میں جرات نہ ہوئی۔ میں نے سینے پر پتھر رکھ کر عکسی سے کہا،کوئی بات نہیں۔ اگر تم سی ایس پی کو عزت کی نوکری نہیں سمجھتے تو نہ سہی ٹھیک ہے۔

ان دنوں عکسی کی کئی ایک سیلیاں تھیں پتہ نہیں' وہ اس کی فین تھیں' دوست تھیں' یا محبوبائیں تھیں۔

میں نے ایک دن عکسی سے کہا' عکسی اب تجھے شادی کر لینی چاہیے بہتر ہے کہ تو اپنا جیون

ساتھی خود تلاش کرے، مجھے اس کا نام پتہ دے باقی میرا کام ______

اس کے کچھ دیر بعد وہ چٹ کپڑی کو گھر لے آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ابو اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ایک دوست سے مل لیں۔

میں ڈرائینگ روم میں گیا تو وہاں۔ چٹ کپڑی بیٹھی تھی۔

کنڈیشننگ

قدرت اللہ شہاب کی آمد کے بعد کئی ایک دن میں اس سے بات نہ کر سکا۔ لوگ آتے رہے۔ قدرت سے ملتے ملاتے رہے۔

بڑی دیر کے بعد مجھے موقعہ ملا۔

میں نے قدرت اللہ کو ساری بات سنائی۔ میں نے کہا یا تو عکسی مجذوب ہو گیا ہے یا کسی ذہنی بیماری کا شکار ہو گیا ہے اور یا چٹ کپڑی کی محبت میں تذلیل سہار نہیں سکا۔

میری بات سن کر ڈاکٹر عفت قہقہہ مار کر ہنسی۔ کہنے لگی اس واقعہ کو چٹ کپڑی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آپ کیسے جانتی ہیں، میں نے پوچھا۔

میں جانتی ہوں، وہ بولیں۔ ایک ایک تفصیل جانتی ہوں۔

آپ کو کشف ہوتا ہے کیا؟ میں نے پوچھا۔

مجھے عکسی نے ہر بات خود بتائی ہے۔ لڑکی کے واقعہ کو سورج سے کوئی تعلق نہیں۔ چوں کہ دونوں واقعات ساتھ ساتھ ہوئے اس لیے غلط فہمی کی گنجائش ہے۔

تو کیا عکسی کو واقعی مشاہدہ ہوا ہے، میں نے قدرت سے پوچھا۔

مجھے علم نہیں کہ مشاہدہ ہوا ہے یا نہیں، وہ بولا، لیکن یہ تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دماغی خلل نہیں ہے۔

مجھے تو مجذوبیت لگتی ہے، میں نے کہا۔

آپ کو پتہ ہے کہ مجذوبیت کیا چیز ہے، ڈاکٹر عفت نے پوچھا۔

مجھے نہیں پتہ، میں نے کہا، لیکن میں مجذوبیت سے خوف زدہ ہوں۔ میری شخصیت میں

سالک کا عنصر موجود نہیں ہے' مجذوبیت کا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کسی روز اگر آپ کے میاں کی آڑی ترچھی نظر مجھ پر پڑ گئی تو میں پاگلوں کی طرح بازاروں میں گھوم پھر رہا ہوں گا' چہرا سوجا ہو گا' منہ سے رال ٹپک رہی ہو گی۔

میری بات سن کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

میں نے عفت سے مخاطب ہو کر کہا' بی بی تمہیں پتہ نہیں یہ بزرگ کتنے طاقت ور ہوتے ہیں۔

بھائی جان کے بیٹے سے پتہ نہیں کیا کوتاہی ہو گئی تھی۔ بھائی جان نے ایسی کڑی نظر ڈالی کہ لڑکا کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل گیا اور پنڈی میں دو دن پاگلوں کی طرح آوارہ گھومتا پھرا۔ اسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔

راجہ شفیع دو دن شہر میں اسے ڈھونڈتا پھرا۔ اگر وہ لڑکے کو تلاش نہ کرتا تو پتہ نہیں وہ کدھر نکل جاتا۔ یہ بزرگ بڑے طاقت ور لوگ ہوتے ہیں' جو چاہیں کر دیں۔ میں تو خوف سے تھر تھر کانپتا ہوں۔

اس پر قدرت اللہ سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا' مفتی صاحب گھبرایئے نہیں' عکسی کی یہ کیفیت کنڈیشننگ ہے۔ یہ ضروری تھی' آپ اسے ڈاکٹوریٹ کے لیے چیکو سلواکیہ بھیج دیں۔ اس کی اپنی خواہش ہے کہ وہ چیکو سلواکیہ جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عکسی کو سکالر شپ پر چیکو سلواکیہ بجھوا دیا اور وقتی طور پر مجھے اطمینان ہو گیا۔

پریشان کن خط

لیکن پراگ سے جو خط مجھے موصول ہوئے وہ بے حد پریشان کن تھے۔ یہ وہ عکسی نہیں تھا' جس سے میں واقف تھا۔ایسے لگتا تھا جیسے کوئی اور روح عکسی میں حلول کر گیا ہے' ایک تو غیر از معمول اس میں مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ ایسی ایسی کتابیں پڑھ رہا تھا جنہیں اسکے ڈاکٹوریٹ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہر مہینے مجھے عکسی کو دس پندرہ کتابیں بھیجنی پڑتی تھیں۔ سائنسی موضوعات پر کتابیں۔

دوسری حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے خطوط میں جابجا پاکستان اور اللہ کا تذکرہ ہوتا۔ سائنس کے حوالے سے' یا فلسفے کے حوالے سے' یا ویسے ہی۔ اگرچہ وہ اپنے خطوط میں ضبط و تحمل سے بات کرتا تھا۔ ذاتی کیفیت کے اظہار سے گریز کرتا۔ لیکن دبی ہوئی شدت اچھل کر باہر نکل آتی جسے محسوس کر کے میرے روبرو اس کا سوجا ہوا مسخ شدہ چہرہ معلق ہو جاتا' آنکھیں بوٹی کی طرح سرخ ہوتیں۔ مثلاً اس کے خط سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

ابو چک ایک مایوس قوم ہے۔ انہوں نے اپنی امیدوں کے تمام انڈے مارکسزم کی ٹوکری میں ڈال رکھے ہیں مارکسزم کا رنگین وعدہ ایفا نہ ہوا جس سے انہیں دھچکا لگا اور سارے انڈے ٹوٹ گئے۔

اہل مشرق کے پاس اللہ ہے۔ اہل مغرب کے پاس زر ہے۔ چک کے پاس نہ اللہ ہے نہ زر ہے' پھر چک کس امید پر جیے۔ اسے پتہ نہیں کہ وہ کون ہے کدھر سے آ رہا ہے' کدھر کو جا رہا ہے' اس کی منزل کیا ہے' زندگی کا مقصد کیا ہے۔

چک کی گہری مایوسی سے ایک طوفان ابھر رہا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پاکستان میں ایک طوفان بن رہا ہے۔ چک کے دل میں ابھرنے والا طوفان مثبت نہیں۔ پاکستان میں بننے والا طوفان مثبت ہے۔ پاکستان میں عظیم واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اللہ ایک عظیم پلانر ہے وہ معجزوں کو پسند نہیں کرتا۔ چھوٹے چھوٹے واقعات سے عظیم نتائج پیدا کرتا ہے۔

پاکستان میں عظیم واقعات رونما ہوں گے۔

عکسی کے ہر خط میں کسی نا کسی بہانے پاکستان اور خدا کا تذکرہ موجود ہوتا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ پراگ میں بیٹھا ہے' لیکن اسے اپنے اردگرد چاروں طرف پاکستان ہی پاکستان نظر آتا ہے۔ اس کے کئی ایک خط تو تبلیغی مضامین کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً:

مشاہدہ

بابو۔ اللہ نہ کتابوں میں ہے نہ عبادتوں میں۔ قرآن کریم پڑھتے رہو پڑھتے رہو' پھر بھی آپ اللہ کو نہیں جانیں گے۔ عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسے آپ صرف مشاہدے کے

ذریعے جان سکتے ہیں۔

ایسا مشاہدہ اللہ کی جانب سے آتا ہے۔ یا تو یہ مشاہدہ آزمائش ہوتی ہے یا انعام۔

جن کو اس مشاہدے سے نوازا جاتا ہے وہ اسے جان لیتے ہیں۔ ان میں انڈرسٹینڈنگ پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً محبت کا تجربہ شادی کا تجربہ جنس کا تجربہ.........

عکسی کے خطوط سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سورج' جو اس کے بیڈ روم میں طلوع ہوا تھا اس کی کرنیں ابھی تک عکسی کو گھیرے ہوئے تھیں۔

دو سال کے بعد عکسی چیکو سلواکیہ سے واپس آ گیا' لیکن یہ وہ عکسی نہیں تھا۔ جس کے ساتھ میں نے زندگی کے تیس سال گزارے تھے۔

وہ ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح تھا۔ لگتا تھا جیسے ٹوٹا ہوا ہو۔ وہ زیادہ سنتا تھا۔ زیادہ محسوس کرتا تھا' لیکن بہت کم بولتا تھا۔

مجھے آج تک علم نہیں ہوا کہ پراگ میں عکسی پر کیا بیتی۔

لیکن وہ تیس نوٹ بکیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے مشاغل اور ذہنی کیفیات کا پتہ دیتی تھیں۔

ان کاپیوں میں مختصر نوٹ تھے۔ موضوع وحدانیت تھا' کہیں اعداد کی بنا پر وحدانیت کا مسئلہ حل کیا ہوا تھا کہیں روشنی اور رنگ کی بنیاد پر۔

عکسی کی آمد پر ہم سب نے متفقہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ چیکو سلواکیہ یا پراگ کی بات نہیں کریں گے تاکہ اس میں ناخوش گوار یادیں پیدا نہ ہوں۔

ایک دن جب عکسی اور میں اکیلے بیٹھے تھے تو میں نے پراگ کی بات چھیڑ دی۔ شاید اس لیے کہ میں حقیقت حال جاننے کے لیے بے قرار تھا۔ میں نے کہا عکسی پراگ میں تو تم پھانسی پر لٹکے رہے۔

ہاں ابو' وہ بولا' پھانسی پر لٹکا رہا' کاش وہ دن لوٹ آئیں اور میں پھر سے پھانسی پر لٹک جاؤں' لیکن اب شاید ایسا نہ ہو۔ اس نے لمبی آہ بھری بولا' کھو دیا ابو سب کھو دیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آواز بھرا گئی۔ کہنے لگا' اب میں ایک خالی برتن ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ غبارے سے ساری پھونک نکل گئی ہے اور چھچھڑا باقی رہ گیا ہے۔ کوئی مقصد نہیں رہا۔ کوئی منزل نہیں

رہی۔ بس خلا میں ٹنگا ہوا ہوں اور خود بھی ایک خلا ہوں۔

سمیر نگیب

پھر یہ خلا سمیر نگیب کی آمد پر پر ہو گیا۔

سمیر نگیب ایک مصری نوجوان تھا' خوش شکل رنگین مزاج ہنس مکھ۔ وہ یونیسکو کا ایک ایکسپرٹ تھا۔ جسے پاکستان کے لوک گیت اکٹھے کرنے کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔

یونیسکو' وزارت تعلیم سے اکثر مطالبات کیا کرتی تھی جو کاغذی نوعیت کے ہوتے تھے اور جنہیں پورا کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ یونیسکو کا یوں ایک جیتے جاگتے آدمی کو لوک گیت جمع کرنے کے لیے بھیج دینا ایک غیر معمولی بات تھی۔

وزارت تعلیم کو کیا پتہ کہ گیت کیا ہوتا ہے' سر کیا ہوتی ہے' تال کیا ہوتی۔ سمیر نگیب کی آمد پر ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

بہرحال انہوں نے سمیر کو انٹرکان میں ٹھہرا دیا۔ بولے' ہم چند روز میں لوک گیتوں کا انتظام کر دیں گے' آپ انتظار کریں۔

دیر تک وہ بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ پھر اکتا کے باہر نکل گیا۔ کسی سے گیتوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے چوباروں کا پتہ دے دیا۔ سمیر نگیب کو چوبارے بہت پسند آئے وہاں مشرقیت کی جھلک تھی۔ دو مہینے سمیر نگیب بائیوں سے گیت سنتا اور چٹکیاں بجاتا رہا۔

پھر کسی نے سمیر کو بتایا کہ یہ گیت تو چوبارہ گیت ہیں لوک گیت نہیں ہیں۔ اس کا دل ٹوٹ گیا وہ سیدھا سیکرٹری تعلیم کے پاس پہنچا۔

لوک ورثہ

اتفاق سے ان دنوں قدرت اللہ سیکرٹری تعلیم تھے۔ انہوں نے عکسی کو سمیر کا معاون مقرر کر دیا۔

عکسی نے سمیر نگیب کو سمجھایا کہ بھائی پاکستانی لوک گیت اکٹھے کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے لوک گیت بائیوں کے چوباروں میں نہیں ملتے نہ ہی آرٹ کاؤنسلوں میں ملتے ہیں۔ انہیں جمع

کرنے کے لیے بھی گاؤں گاؤں گھومنا پڑے گا' ان گاؤں میں جو شہروں سے دور واقع ہیں' جن پر ابھی شہری اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ وہاں جانے کے لیے مقامی لباس پہننا ہو گا اور ٹرک ہوٹلوں میں قیام کرنے کی عادت ڈالنی ہو گی۔

آٹھ دن عکسی سمیر نکیب کو ٹریننگ دیتا رہا۔ یونیسکو کے ایکسپرٹ کے لیے یہ ایک انوکھی ٹریننگ تھی۔

پھر وہ دونوں سندھ' بلوچستان' تھرپارکر' مکران اور سرحد کے دور افتادہ گاؤں کی جانب نکل گئے' جہاں مظلوم پاکستانی کلچر مغرب زدہ شہروں' کالا صاحب اور جدیدیت کے حملے سے ابھی بچا ہوا بیٹھا ہے۔ جہاں لوک ساز دیواروں پر ٹنگے ٹنگے کرم خوردہ ہو چکے ہیں۔

پتہ نہیں عکسی نے وہاں کیا دیکھا۔ بہرحال چند مہینوں کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس پر لوگ ورثے کا جنون سوار تھا۔ چیکوسلواکیہ میں اس کی دیوانگی کا مرکز مطالعہ تھا' اب لوک ورثہ ہو گیا۔

جہانگیر

عکسی کا ایک لنگوٹیہ دوست تھا۔ جہانگیر۔

جہانگیر ایک کمزور بچہ تھا۔ بچپن سے ہی اسے ایک بیماری لگی ہوئی تھی۔ اس کا بچپن اور جوانی اس بیماری کے خلاف مسلسل جدوجہد میں گزرے تھے۔

جہانگیر والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے والدین کو بیٹے سے والہانہ محبت تھی۔ میں نے زندگی بھر اس قدر پیار کرنے والے والدین نہیں دیکھے۔ جہانگیر سے پیار ان کا واحد مقصد حیات تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

جہانگیر کا والد آرمی میں سول افسر تھا۔ لیکن اس پر فوج کی چھاپ نہیں لگی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھوں سے بشاشت کے چھینٹے اڑتے رہتے تھے۔ اور وہ ہر وقت جذبہ محبت سے بھیگی بلکہ چھلکتی رہتیں۔ اس کے انداز میں ایک بے نام تازگی تھی۔ مزاح کی حس تھی اور خدمت کا جذبہ تھا۔

جہانگیر بھی عام نوجوانوں جیسا نہیں تھا۔ اس کی شخصیت میں تین صلاحیتیں نمایاں تھیں۔

ایک تو اس میں میڈیم کی حس تھی' ایک بے نام روحانی رابطہ۔ دوسرے اس میں تمثیل کی بڑی صلاحیت تھی اور مزاح کی حس اس نے والد سے ورثہ میں پائی تھی۔

جہانگیر کو بڑے با معنی خواب آیا کرتے تھے۔ غالباً" اس کی وجہ اس کی میڈیم اسٹک حس تھی۔

جس زمانے میں وہ ایم بی بی ایس میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں میرا قدرت اللہ شہاب سے نیا نیا رابطہ ہوا تھا۔ ایک دن جہانگیر میرے پاس آیا کہنے لگا۔

انوکھے خواب

یہ قدرت اللہ شہاب کون صاحب ہیں۔

میں نے کہا' بھئی وہ صدر کے سیکرٹری ہیں۔

وہ تو مجھے پتہ ہے' اس نے جواب دیا۔

وہ میرے باس ہیں۔

یہ بھی مجھے علم ہے' وہ بولا۔

میں نے کہا' تم پوچھنا کیا چاہتے ہو۔

کہنے لگا' میں ان سے کبھی نہیں ملا۔ نہ ہی میں انہیں جانتا ہوں لیکن ———— وہ رک گیا۔

لیکن کیا' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' مجھے مسلسل قدرت اللہ شہاب کے خواب آتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا شاید تم قدرت اللہ کے بارے میں سوچتے رہتے ہو گے۔

کہنے لگا' جاگتے میں میں نے ان کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔

شاید عکسی تم سے شہاب کی باتیں کرتا رہتا ہو۔

بالکل نہیں' وہ بولا۔ عکسی نے کبھی ان کے متعلق مجھ سے بات نہیں کی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے' میں نے کہا۔

یہی تو میں کہتا ہوں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے' لیکن یہ ہو رہا ہے۔ مسلسل ہو رہا ہے۔

خواب میں تم کیا دیکھتے ہو۔

میں نے خواب میں کبھی قدرت اللہ شہاب کو نہیں دیکھا' میرا مطلب ہے وہ کبھی میرے سامنے نہیں آئے۔ لیکن خواب ان کے متعلق ہوتے ہیں۔

جہانگیر کی بات نے میرے ذہن کو چکرا کر رکھ دیا۔

اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ کہنے لگا' مثلاً دیکھتا ہوں کہ کاروں کا ایک لمبا جلوس جا رہا ہے۔ ایک کار سے کوئی شخص سر نکال کر کہتا ہے۔ آجاؤ' آجاؤ' تم بھی آجاؤ۔ گاڑی رک جاتی ہے اور میں اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔

پھر میں ان سے پوچھتا ہوں۔ یہ جلوس کس کا ہے۔

وہ جواب میں کہتے ہیں۔ تجھے نہیں پتہ کیا۔ یہ جلوس قدرت اللہ شہاب کا ہے۔

عجیب خواب ہے' میں نے کہا۔

اور یہ خواب مجھے کئی دنوں سے مسلسل آ رہا ہے۔

مسلسل یہی خواب' میں نے پوچھا۔

چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن مرکزی بات نہیں بدلتی۔ مثلاً' وہ بولا' دیکھتا ہوں کہ بہت سے لوگ جا رہے ہیں۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ اتنے سارے لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہوں۔

پھر میں چلتے چلتے ان سے پوچھتا ہوں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں' تجھے نہیں پتہ۔

میں جواب دیتا ہوں کہ مجھے نہیں پتہ۔

وہ کہتے ہیں ہم جلسے پر جا رہے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں' کس کا جلسہ ہے۔

وہ جواب دیتے ہیں' قدرت اللہ شہاب کا جلسہ ہے۔

مقبول قریشی

پھر مقبول قریشی تھا۔ جسے ایسا ہی خواب آیا تھا۔

مقبول قریشی میرا داماد ہے۔ میری بڑی بیٹی سوریا کی مقبول قریشی سے شادی ہوئی تھی۔
جب اس کی جانب سے شادی کا پیغام آیا تھا۔ ان دنوں وہ سی۔ اے کی ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ ان دنوں قدرت اللہ شہاب ملک سے باہر تھے۔

میں نے انہیں خط لکھا جس میں مقبول قریشی کے کوائف درج تھے اور ساتھ ہی ایک فوٹو گراف ملفوف تھی۔

قدرت اللہ نے جواب دیا کہ میں نے مقبول قریشی کو غور سے دیکھا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اچھا آدمی ہے اور انشاء اللہ موزوں رہے گا۔ آپ معاملہ اللہ پر چھوڑیں اور مقبول قریشی کا پیغام منظور کر لیں۔

مقبول قریشی ایک خوش مزاج خوش پوش نوجوان تھا۔ اس میں مزاح کی حس موجود تھی' لیکن بنیادی طور پر وہ ایک سنجیدہ اور عقلیہ نوجوان تھا۔ سوواٹ رویے کو ناپسند کرتا تھا۔
اکاؤنٹس میں ہونے کی وجہ سے وہ جذباتی رویے کا قائل نہ تھا۔ وہ پیری مریدی کو ناپسند کرتا تھا۔

مقبول قریشی عام طور سے خواب نہیں دیکھا کرتا تھا۔
نہ جاگتے کے' نہ سوتے کے۔

ایک روز وہ سخت گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ کہنے لگا' میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا ہے۔ عام طور پر مجھے خواب نہیں آتے۔ کبھی کبھار آتے بھی تو وہ با معنی نہیں ہوتے۔ کنفیوزڈ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خواب بالکل واضح تھا۔
میں نے پوچھا۔ کیا دیکھا تم نے۔

بولا۔ دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا ہجوم ہے۔ وہ سب کسی تقریب پر جا رہے ہیں۔ ان میں بڑا جوش و خروش ہے۔ میں بھی اس ہجوم میں شامل ہو جاتا ہوں۔
ہم دیر تک چلتے رہتے ہیں۔

آخر ہم ایک بہت بڑے عظیم الشان قلعے میں پہنچتے ہیں۔ قلعے کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ ایک بہت بڑے ہال کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ سامنے ایک اونچا سٹیج بنا ہوا ہے۔ اس پر ایک تخت بچھا ہوا ہے۔

میں لوگوں سے پوچھتا ہوں' یہاں کونسی تقریب ہو رہی ہے۔

وہ کہتے ہیں' تم دیکھ نہیں رہے سامنے تخت بچھا ہے۔

یہاں تاج پوشی ہو گی۔

کس کی تاج پوشی۔

وہ جواب دیتے ہیں۔ جن کی تاج پوشی ہونی ہے۔ وہ ابھی نہیں آئے۔

اتنے میں سٹیج پر ایک شخص نمودار ہوتا ہے۔

یہ کون ہے' میں نے ان سے پوچھتا ہوں۔

یہ اس تقریب کا ناظم ہے وہ جواب دیتے ہیں۔ یہ آنے والے بادشاہ کو تاج پہنائے گا۔

پھر جو میں دیکھتا ہوں تو ناظم نے دونوں ہاتھوں میں تاج اٹھا رکھا ہے ——— ارے ' حیرت سے میری چیخ نکل جاتی ہے۔ یہ تو قدرت اللہ شہاب ہے۔ ساتھ ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

بڑا عجیب و غریب خواب ہے۔ میں نے کہا۔

ایسا خواب مجھے کبھی نہیں آیا۔ مقبول نے کہا۔

تم قدرت اللہ کے متعلق سوچتے رہتے ہو گے' میں نے کہا۔

قطعی نہیں' وہ بولا۔ میں نے ان کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ میں تو انہیں سر سری طور پر جانتا ہوں۔

تینتالیسواں باب

اپنے بے گانے

برصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان اور بھارت کے درمیان باؤنڈری لائن مقرر کرنے میں بڑی بے انصافی کی گئی تھی۔

ضلع گورداسپور جو مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا' بھارت میں شامل کر دیا گیا تھا۔ بٹالے کے مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔

مفتیاں محلے میں رہنے والے عزیز و ارقارب اور برادری کے تمام لوگ پاکستان میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ زیادہ تر لوگ قافلے کی صورت میں پاکستان پہنچے تھے۔ کچھ راستے میں شہید کر دیے گئے جو پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے وہ جگہ جگہ بکھر گئے۔

ہمارے چند ایک قریبی عزیز لاہور میں مقیم ہو گئے۔

جب عکسی اور میں پاکستان میں پہنچے تو ہماری حیثیت لاوارثوں کی تھی۔ رشتے داروں سے میل ملاپ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کوئی ہمیں منہ لگانے کے لیے تیار نہ تھا۔ ان کے دل میرے خلاف غم و غصہ اور حقارت کے جذبے سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے ملنے کے روادار نہ تھے۔ چند ایک جو ملتے تھے بہت محتاط رہتے۔ چوری چوری ملتے تاکہ کسی کو پتہ نہ چل جائے۔

دوسری شادی

شہزاد کی وفات کے بعد میں دوسری شادی کرنے کے حق میں نہ تھا۔ مجھے کثرت ازواج سے سخت نفرت تھی' چونکہ میری زندگی والد صاحب کی کثرت ازواج کی وجہ سے تباہ ہو چکی تھی۔

اماں نے مجھے دوسری شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اماں کہتی تھی۔ دیکھو ممتاز بے شک اپنے لیے دوسری شادی نہ کرو' لیکن اس بچے کی طرف دیکھو۔ کیا بچہ اکیلا تن تنہا لاوارث زندگی گزارے گا۔ کیا اسے گھر نصیب نہ ہو گا۔ مجھ پر بھروسہ نہ کرو' میں تو جانے والی ہوں۔ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ اس بچے پر رحم کرو۔

شادی سے پہلے میں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جس روز میری بیوی نے عکسی سے بد سلوکی کی' اسی روز میں علیحدگی اختیار کر لوں گا۔ میری بیوی اقبال بیگم کا مجھ پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے گھر میں سوتیلے پن کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ یہاں تک کہ جب اس کی اپنی بیٹیاں بڑی ہو گئیں تو ایک دن ان کی موجودگی میں میرے منہ سے نکل گیا کہ جب عکسی کی ماں فوت ہوئی تو۔

لڑکیاں یہ سن کر حیران رہ گئیں۔ وہ ماں سے پوچھنے لگیں۔ کیا عکسی ہمارا سگا بھائی نہیں ہے۔ جب انہیں حقیقت حال کا پتہ چلا تو وہ دو دن روتی رہیں۔

میں خوف زدہ تھا کہ دوسری شادی عکسی پر ایسے اثرات پیدا نہ کرے جو والد صاحب کی دوسری شادی نے مجھ پر کیے تھے۔ میری زندگی کے دھارے کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

ابا کی دوسری شادی کے بعد دفعتاً" میری ماں اپنے ہی گھر کی نوکرانی بنا دی گئی تھی۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا' جب میں ڈھائی سال کا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں ایک نوکرانی کا بیٹا تھا۔ گھر میرا اپنا گھر نہ تھا۔ اپنا گھر مجھے کبھی نصیب نہ ہوا۔

دوسری امی نے ہم سے بڑی بد سلوکیاں کیں۔ جس کی وجہ سے احساس کمتری میرے بند بند میں رچ گیا۔

میری دوسری امی سیالکوٹ کی مٹیار تھی۔ وہ بڑی خوبصورت عورت تھی۔ وہ میری آئیڈیل بن گئی۔ اس لیے عورت کے ساتھ میرا لو ہیٹ (LOVE HATE) تعلق قائم ہو گیا۔

میری جنسی جذبات سپریس (SUPRESS) ہو کر رہ گئے۔
میرے دل میں فادر ہو سٹیلٹی کا جذبہ گھر کر گیا۔
یہ تمام جذبات منفی نوعیت کے تھے۔
نتیجہ یہ ہوا کہ میری ساری زندگی میں جنس کا زہر گھل گیا۔ یہ تفصیلات میں علی پور کے ایلی میں قلم بند کر چکا ہوں۔ یہاں صرف حوالے کے طور پر انہیں دہرانے پر مجبور ہوں۔

والد صاحب

میری دوسری امی کی حکومت نو دس سال چلی۔ اس کے گھر کوئی بچہ نہ ہوا۔ اور وہ وفات پا گئیں۔

اس کے بعد والد صاحب نے دو اور شادیاں کیں۔ اس وقت میں دسویں پاس کر چکا تھا۔ ان شادیوں کا مجھ پر کوئی خاص اثر مرتب نہ ہوا۔ پھر یہ بھی ہے کہ میری تیسری اور چوتھی والدہ کے مجھ سے خوش گوار تعلقات رہے۔

والد صاحب بھی میری جانب ملتفت رہے۔ لیکن اس کے باوجود میں ان کے گھر کو اپنا نہ سمجھ سکا۔

اس گھر پر جو بیگانگی کی مہر لگ چکی تھی وہ جوں کی توں قائم تھی۔

والد صاحب سے میں نے زندگی بھر اچھا سلوک نہ کیا۔ اب سوچتا ہوں تو مجھ پر شرمندگی طاری ہو جاتی ہے کہ والد صاحب کی جو جو عادتیں مجھے ناپسند تھیں' ادھیڑ عمر کے بعد وہ سب عادتیں ایک ایک کر کے مجھ میں پیدا ہوتی گئیں اور میری کوششوں کے باوجود تقویت پاتی گئیں۔

چونکہ والد صاحب کے گھر کو گھر نہ سمجھا۔ اس لیے اس کے افراد خانہ کو بھی نہ اپنایا۔ بھائی بہنوں کو بیگانے سمجھا۔

تیسری والدہ سے میری دو بہنیں تھیں۔ کشور اور انور۔
چوتھی والدہ سے تین بھائی تھے۔ امجد' ارشد اور سلمان۔

۱۹۶۰ء میں جب میرے والد فوت ہوئے تو اس وقت میں اس سپیشل گاڑی میں سوار تھا' جو صدر ایوب کو متعارف کرانے کے لیے کراچی سے پشاور تک چلائی گئی تھی اور جس میں ملک بھر

کے شاعرادیب فن کار اور دانش ور سوار تھے۔

مجھے والد صاحب کی وفات کی خبر گاڑی میں ملی تھی' لیکن میں نے اپنا سفر جاری رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں کرائسس کا آدمی نہیں ہوں۔ کرائسس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بھاگ جاتا ہوں۔ دوسرے میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ یہ کہیں کہ باپ کی وفات کے بعد بڑا بن کر آ بیٹھا ہے۔

امجد مفتی' سلمان مفتی

وفات سے پہلے والد صاحب نے ایک دن مجھے پاس بٹھا کر بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ممتاز میری ایک بات مان لو۔ تم باقی بہن بھائیوں سے تعلق رکھو یا نہ رکھو یہ تمہاری مرضی ہے۔ لیکن امجد سے ضرور تعلق قائم رکھنا۔ وہ بڑا اچھا لڑکا ہے۔

سارے بہن بھائیوں میں امجد واحد بیٹا تھا جس سے ابا نے محبت کی تھی۔

اس بات پر مجھے خوشی محسوس ہوتی تھی کہ ابا امجد سے محبت کرتے تھے' لیکن ان کی محبت کا انداز مجھے پسند نہ تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ امجد کو اپنا بچہ جمورا بنا رہے ہوں۔

وہ اسے اپنے جیسا بنا رہے تھے۔ اس کی صلاحیتوں کو اپنے سانچے میں ڈھال رہے تھے۔

اس پر میں نے کئی بار احتجاج بھی کیا تھا۔

میں کہتا تھا ابا۔ امجد نے اپنے دور میں زندگی بسر کرنا ہے۔ اسے جدید دور کے مطابق تربیت دیجئے۔ اسے اپنی کاربن کاپی نہ بنائیے۔ ایسا کرنے میں انا پرستی کا رنگ ہے۔

اس بات پر ابا مجھ سے متفق نہ تھے۔

امجد ہر بات میں ابا کی ہاں کی ہاں ملاتا تھا۔ میرے خیالات اس کے لیے قابل قبول نہ تھے۔

پھر اس کی شادی کی بات چل نکلی۔

ابا چاہتے تھے کہ امجد کی شادی اپنے رشتے داروں میں کریں۔

مجھے یہ بات پسند نہ تھی۔ اس لیے کہ ابا کے رشتے دار دور جدید سے سراسر بے گانہ تھے۔

جب امجد کی شادی کی بات طے ہو رہی تھی تو میں ابا سے جا کر ملا۔ میں نے کہا' ابا' اللہ کے واسطے امجد کی شادی اپنے رشتے داروں میں نہ کریں۔

تمہیں کیوں اعتراض ہے' ابا نے کہا' وہ لوگ میری بہت عزت کرتے ہیں۔

میں نے کہا' ابا کیا امجد کی شادی آپ اس لیے کر رہے ہیں کہ آپ کی عزت بڑھے۔ یہ تو انا پسندی ہوئی' آپ کو چاہیئے کہ امجد کی شادی ایسی جگہ کریں جو اس کی زندگی کے لیے باعث خوشی ہو۔

آپ اس کی شادی کسی تعلیم یافتہ لڑکی سے کریں۔ کسی ماڈرن گھرانے میں کریں۔

کسی ماڈرن گھرانے میں رشتہ کرنا مجھے منظور نہیں' انہوں نے کہا۔

ابا سے مایوس ہو کر میں نے امجد کو سمجھانے کی کوشش کی' لیکن امجد نے میری بات کو اہمیت نہ دی۔ الٹا اس نے سمجھا کہ میں اس کی شادی میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ابا کی وفات کے بعد امجد نے اپنا رنگ نکالا۔ اس کی شخصیت میں اتنی مثبت خصوصیات پیدا ہو گئیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

اس میں غنا کا وصف اس شدت سے پیدا ہوا کہ اس نے ہر شخص کی خدمت کرنے کو اپنا شعار بنا لیا۔ امجد کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ اس نے زندگی بھر مجھ سے محبت کی ہے۔

سلمان مفتی بچپن میں ہی پولیو کا شکار ہو گیا تھا۔ ۱۹۹۱ میں سلمان فوت ہو گیا۔ میری طبعی غفلت کی وجہ سے بہنوں سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔

سخاوت کرامت امانت

بھائی بہنوں کے بعد میرے کزن تھے۔ ماموں زاد۔ پھوپی زاد اور خالہ زاد۔

سب سے زیادہ روابط ماموں زاد بھائیوں سے تھے۔ وہ میرے دوست بھی تھے اور رشتہ دار بھی۔

تقسیم کے بعد سخاوت لاہور آ گیا تھا۔ کرامت ریلوے میں ملازم تھا اور ان دنوں ملتان میں متعین تھا۔ امانت جو ڈاکٹر بن چکا تھا وہ فیصل آباد میں مقیم ہو گیا تھا۔

محلے میں معتوب ہونے کے باوجود میرے کزن میرے ساتھ رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے۔

پھر سخاوت پر افتاد آ پڑی۔ اسے جوڑوں کا عارضہ لاحق ہو گیا اور وہ معذور ہو کر صاحب فراش ہو گیا۔

کرامت کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس کی بیوی نے اس سے اچھا سلوک نہ کیا اور وہ بری طرح دربدر ہوا۔ آخری ایام میں وہ اپنے بیٹے بدر کے پاس آ گیا۔ بدر ہوائی فوج میں اونچے عہدے پر فائز تھا اور لالہ زار راولپنڈی میں مقیم تھا۔ میں کرامت کو ملنے جایا کرتا تھا۔ چونکہ وہ میرا لنگوٹیہ تھا۔ میں اکثر اسے کہا کرتا' کرامت تیری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ تو بے کار پڑا رہتا ہے۔ سگریٹ اور چائے پیتا رہتا ہے۔ شراب کی بندش ہو چکی ہے۔ اب تو کس امید پر زندگی سے چمٹا ہوا ہے۔ اب بس کر معافی دے اور رخصت ہو۔

جواب میں وہ مسکراتا کہتا' ممتاز تو مجھ سے چھ ماہ بڑا ہے۔

عرصہ دراز تک ہماری نوک جھونک چلتی رہی۔

پھر ایک روز وہ رخصت ہو گیا۔

میں نے میت کے کان میں کہا' کیوں بے تو تو کہتا تھا میں تجھ سے چھ ماہ مہینے بڑا ہوں اب بول۔

مجھے محسوس ہوا جیسے اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں کھل گئے۔ اس مسکراہٹ میں بڑی بے بسی تھی۔

ڈاکٹر امانت مفتی اپنے باپ پر گیا تھا۔ اس کا باپ مبارک علی ہمارے محلے میں واحد بزرگ تھا۔ آخری ایام اس نے مسلسل عبادت اور تزکیہ میں گزارے تھے۔

میں اسے دیکھ کر حیران ہوا کرتا تھا۔ اکثر اماں سے کہتا' اماں یہ تیرا بھائی کیسا انسان ہے۔ بالکل بے جان' جیسے پانی ہو۔ اسے گلاس میں ڈال لو یا کٹورے میں۔

ڈاکٹر امانت بھی اپنے باپ کی طرح بڑا عبادت گزار تھا۔ بڑا ہمدرد بڑا غنی۔ اس کا کردار دیے کی طرح روشن تھا' لیکن اس دیے تلے اندھیرا تھا۔ گھر میں وہ چڑ چڑ دانے بھونتا رہتا تھا۔

میں اسے دو ایک بار قدرت اللہ کے پاس لے گیا تھا۔

میں قدرت سے کہا کرتا۔ یہ کیسا گورکھ دھندا ہے' یہ شخص جو گرد و پیش کو ہمدردی اور خدمت سے روشن کیے رکھتا ہے' اس کے اپنے گھر میں کیوں اندھیرا ہے۔

جس کا مسلک لوگوں کو سکھی رکھنا ہو۔ وہ خود کیوں بے چین رہے۔ کیوں اضطراب زدہ رہے۔

قدرت مجھے کہتا۔ میں بھی نہیں سمجھ پایا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔

ایسا ہونا نہیں چاہیے، مگر ایسا ہوتا ہے جو سکھ بانٹتا ہے خود سکھی نہیں رہتا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جو دوسروں کو سکھ بانٹتا ہے وہ خود کو سکھ نہیں دیتا۔

ڈاکٹر امانت بہر طور زندگی بھر میری پناہ گاہ رہا۔

جب کبھی میں کسی جذباتی گھمنگھیری میں غوطے کھاتا تو خود کو بچانے کے لیے ڈاکٹر امانت کی طرف اٹھ بھاگتا۔

امانت میرے اضطراب کو دیکھتا، سمجھتا۔ جانتا کہ میں ڈانواں ڈول ہوں۔ ڈب جھلکے کھا رہا ہوں، لیکن اس نے مجھ سے کبھی نہ پوچھا تھا کہ کیا ہوا، کیوں ہوا۔ اس نے کبھی مجھ پر نکتہ چینی نہ کی تھی، کبھی تلقین نہ کی تھی۔ میں جاتا اور اس کی آغوش محبت وا ہو جاتی۔

اماں

جب سے میں شہزاد کو گھر لے آیا تھا۔ اماں میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی، پھر جب ہم بٹالے سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے تھے تو اماں کی بے چینی اور بڑھ گئی تھی۔ شاید اس میں میری دانشورانہ بے پرواہی کا بھی دخل ہو۔ چوں کہ میں نے اماں سے ویسا سلوک نہ کیا تھا جس کی وہ حقدار تھی۔ اس نے زندگی بھر مصائب سہے تھے۔ میرے گھر میں آ کر بھی اماں کو نہ تو وہ توجہ حاصل ہوئی نہ وہ مقام جو اس کے دلی سکون کا باعث ہو سکتے۔ اس لیے اماں کی بے چینی بڑھتی ہی گئی۔ وہ مشکل سے دو مہینے میرے پاس گزارتی تھی۔ پھر بے چین ہو جاتی۔ اس کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ پر تول رہی ہے۔

پھر ایک دن وہ میرے پاس آ بیٹھی اور بڑی لجاجت سے کہتی، ممتاز میں ہو آؤں۔

دراصل میرے گھر میں بھی اماں نے اپنا مقام نہ بنایا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ میرے گھر کو اپنا گھر سمجھتی اور ساس بن کر زندگی بسر کرتی۔ لیکن اسے ساس بننا نہ آیا۔ ایک طویل عرصہ اپنے گھر میں نوکرانی بن کر رہنے کی وجہ سے اس کی انا کے پر ہمیشہ کے لیے جھڑ گئے تھے۔ وہ میرے گھر میں بھی نوکرانی بن کر رہتی تھی۔

ہر دو ماہ کے بعد وہ میرے پاس آ بیٹھتی اور معذرتی انداز میں کہتی، ممتاز میں ہو آؤں۔

ہاں ہاں اماں جب تیرا جی چاہے۔ میں جواب دیتا۔

پھر ہم ایک تاریخ مقرر کر لیتے۔

اور اماں آٹھ دن پہلے ریلوے پلیٹ فارم پر جا بیٹھتی۔

یا وہ میری ہمشیرہ کے گھر چلی جاتی اور یا ڈاکٹر امانت کے گھر' ڈاکٹر امانت کے گھر پہنچ کر وہ یوں محسوس کرتی جیسے بلخ جمیل میں آ گئی ہو۔ امانت اماں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اس نے اماں کو "بڑی" کا مرتبہ دے رکھا تھا۔ ہر بات میں اس کا مشورہ لیا جاتا۔ اس سے پوچھا جاتا۔ اس کی بات کو حکم کا درجہ دیا جاتا۔ اس کے برعکس میرے گھر میں بات بات پر میں اماں سے کہا کرتا اماں تو نہیں سمجھتی۔ امانت اپنے گھر میں اس کے لیے ایک تخت بچھا دیتا تھا۔ لے پھوپھی یہاں بیٹھ اور حکم چلا' لیکن اماں کو حکم چلانا نہیں آتا تھا۔ وہ گھبرا کر تخت سے اٹھ بیٹھتی اور گھر میں کام ڈھونڈتی پھرتی۔ ذات کی کامی جو تھی۔ زندگی بھر اس نے کپڑے سی کر' پتنگیں بنا کر' جلدیں باندھ کر ہمیں خوش رکھنے کے لیے پیسہ کمایا تھا۔

امانت کے گھر کی کھڑکیوں کے پردوں کو دیکھ کر وہ کہتی امانت اگر ان پردوں پر نیلے رنگ کی پٹی لگ جائے تو یہ پھر سے نئے ہو جائیں۔ پھر وہ پردوں پر پٹی ٹانکتی رہتی۔

کپڑے کے ٹکڑوں کو دیکھ کر کہتی امانت میں ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک رنگ برنگی رضائی نہ بنا دوں' پھر وہ ٹکڑوں کو جوڑنے بیٹھ جاتی۔ امانت کے گھر میں اماں جی اٹھتی تھی اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔ فیصل آباد کے بڑے قبرستان میں ایک چھوٹی سی قبر ہے۔ جس پر ایک پتھر لگا ہوا ہے' اس پتھر پر مدھم حروف میں والدہ ممتاز مفتی لکھا ہوا ہے۔

اماں خط لکھتی تو نیچے اپنا نام نہیں لکھتی تھی۔ اس کا نام صغرا تھا۔ میں پوچھتا اماں تو اپنا نام کیوں نہیں لکھتی۔ اماں کہتی۔ صغرا تو چند ایک سال کے لیے جئی تھی' پھر تو پیدا ہو گیا تو صغرا ختم ہو گئی۔ والدہ ممتاز بن گئی۔ پھر ساری زندگی وہ تیری لیے جئی۔ خود کے لیے نہیں۔ ساری زندگی وہ والدہ ممتاز رہی۔

فریدہ' نذیر

مرنے سے پہلے اماں نے مجھے ایک وصیت کی تھی۔

کہنے لگی' ممتاز تو نے سارے رشتے داروں سے ناطہ توڑ لیا ہے۔

میں نے کہا' نہیں اماں' میں نے نہیں توڑا۔ ٹوٹ گیا ہے۔

چاہے کچھ بھی ہے' وہ بولی فریدہ سے تعلق نہ توڑنا۔ میرے لیے۔

فریدہ میری ہمشیرہ کی بیٹی ہے۔

فریدہ سے تعلقات قائم رکھنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ اس لیے کہ فریدہ میں وہ تمام عیب موجود ہیں۔ جو مجھ میں ہیں۔ مثلاً" میری طرح وہ ایک جذباتی لڑکی ہے۔ میری طرح اس کے جذبات کا شیرہ بڑا گاڑھا ہے۔ میری طرح وہ بھی غصیل ہے۔ اس کا غصہ بھی بھڑ بھڑ بھا بھڑ کا ہے۔ میری طرح وہ بھی منہ پھٹ ہے۔ میری طرح وہ بھی ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ کر زندگی گزار رہی ہے۔ میری طرح اس کی بریک بھی کام نہیں کرتی۔

سیانے کہتے ہیں ایک جیسے پرندے ایک ہی درخت پر بیٹھ جاتے ہیں۔ انسان کی بات اور ہے۔ ایک جیسی خواہشات کے لوگ تو مل بیٹھتے ہیں لیکن ایک جیسے اوصاف کے لوگ مل بیٹھ نہیں سکتے۔ بہرحال میں اور فریدہ ابتدائی ایام میں لڑ لڑا اور جھگڑ جھگڑ کر تھک گئے تو مل بیٹھے ہیں۔ فریدہ نے میری بڑی عزت کی ہے۔

پھر فریدہ کے میاں ہیں پروفیسر نذیر احمد۔

نذیر احمد تحقیق اور تنقید کے آدمی ہیں۔ وہ CREATIVE CRITICISM کے قائل ہیں اور اس قدر عقلی ادیب ہیں کہ ہماری تحریروں میں بعد المشرقین ہے۔ اس کے باوجود میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں ان کا مداح ہوں۔

لطیف' مظہر مفتی

پھر میری پھوپھی زاد کزن لطیف تھی۔ وہ بڑی باغ و بہار خاتون تھی۔ لطیف نے مجھ سے بہت محبت کی۔ ہم دونوں یوں اکٹھے رہتے تھے۔ جیسے لنگوٹیے ہوں۔

لطیف' شہزاد کی پڑوسن تھی۔ دراصل وہ دونوں ایک ہی مکان میں رہتی تھیں۔ درمیان میں کوئی دیوار نہ تھی۔ اسے علم تھا کہ میں شہزاد کے گرد کیوں پھیرے لیتا رہتا ہوں' لیکن اس نے کبھی مجھے ٹوکا نہ تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بات اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ ٹوکنا بیکار ہے۔ اس

لیے وہ میری ہمدرد دوست تھی۔

لطیف ایک بڑی دکھی خاتون تھی۔

اس کا میاں جو میرا خالہ زاد تھا' ایک ڈاکٹر تھا۔ اسے مغربی طریق زندگی اس قدرت پسند آ گیا کہ وہ شادی کے دو ایک سال بعد گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ بس لطیف کا سہاگ دو ایک سال قائم رہا۔ پھر اس پر زندگی بھر کی تنہائی مسلط کر دی گئی۔

میاں جانے سے پہلے اسے اپنی نشانی کے طور پر ایک بیٹا دے گیا۔ زندگی بھر مظہر مفتی ماں کا واحد سہارا رہا۔

بچپن میں مظہر۔ شہزاد اور میرا راز دان اور پیغام بردار تھا۔ بڑا ہو کر وہ میرا دوست بن گیا۔

حیرت کی بات ہے کہ بے توجہی اور علیحدگی کے باوجود باپ ہمیشہ مظہر کا آئیڈیل رہا۔ ۱۹۴۷ء میں مظہر کا باپ دہلی کا ہیلتھ آفیسر تھا۔ فسادات کے دوران وہ پہاڑ گنج میں اپنی ڈیوٹی ادا کرنے گیا تو ہندو بلوائیوں نے اسے شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ایسی درندگی کا غماز تھا کہ گاندھی نے خود اظہار ہمدردی کیا۔ مظہر جوان ہوا تو وہ بھی باپ کی طرح انگریز تھا۔ اس میں بڑی صلاحیتیں تھیں' مگر وہ بروئے کار نہ آ سکیں۔ بہرحال مظہر نے مجھ سے بڑی محبت کی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے متاثر رہے۔

تمکینہ' صباح مفتی

ویسے تو شہزاد کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔

لیکن ہم دونوں کی حماقت کی وجہ سے ان کی زندگیاں ایک المیہ میں بدل گئیں۔

اغواء سے پہلے میں نے شہزاد کو بہت سمجھایا تھا کہ بچوں کو ساتھ نہ لے جائیں لیکن وہ نہ مانی۔

میں نے کہا' دیکھ مالی مشکلات ہوں گی جنہیں بچے برداشت نہیں کر سکیں گے۔

آخر میں فیصلہ ہوا کہ بچے' بچے نہیں جوان ہیں' اپنا اچھا برا پہچانتے ہیں۔ لہذا ان سے پوچھ لیا جائے۔

بچوں نے یک زبان ہو کر کہا ہم ماں کے ساتھ رہیں گے چاہے کچھ بھی ہو۔

پھر ایسے حالات پیش آئے کہ بچے رل گئے۔

شہزاد کا بیٹا قیس بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا' لیکن اس میں بے پرواہی تھی۔ آوارگی تھی

جب میں راولپنڈی پہنچا تو شہزاد کی سب سے چھوٹی بیٹی تمکینہ کا میاں پنڈی میں ملازم تھا۔

تمکینہ کی شادی بہت چھوٹی عمر میں کر دی گئی تھی۔

تمکینہ کا میاں مجھے پسند نہیں کرتا تھا وہ مجھ سے میل میلاپ رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

اس لیے تمکینہ چوری چوری مجھ سے ملتی تھی۔

تمکینہ کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔

کئی ایک سال ہم چوری ملتے رہے' پھر وہ بندش ٹوٹ گئی۔ جب تمکینہ کے بچے جوان ہو گئے تو وہ مجھ سے اعلانیہ ملنے لگے۔ اس کا بیٹا صباح مفتی پیش پیش تھا۔

آخری ایام میں میرے رشتے داروں نے صدق دل سے مجھے معاف کر دیا۔ لیکن وہ جھجک جو قائم ہو چکی تھی نہ گئی۔

رفیق وہرہ

رفیق وہرہ وہ واحد رشتہ دار تھا جس نے ہم سے زندگی بھر رابطہ قائم رکھا۔

رفیق اقبال بیگم کا بھائی تھا۔

اقبال بیگم کے تین بھائی تھے۔ عبدالقیوم' عبدالمجید اور عبدالرفیق۔

عبدالقیوم جہلم میں مقیم ہو گیا تھا۔ عبدالمجید نے تحصیل علم کے بعد فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

تقسیم کے بعد امین آباد کے شیخ کراچی مراجعت کر گئے تھے اور انہوں نے موٹر پارٹس بزنس کو اپنا لیا تھا۔ چونکہ کاروبار کی اہلیت ہڈی میں رچی ہوئی تھی' اس لیے بہت جلد انہوں نے موٹر پارٹس بزنس میں ایک مقام پیدا کر لیا۔

اقبال بیگم کے والد یوسف وہرہ تقسیم سے پہلے جنوبی ہند میں پچمری میں ٹھیکے داری کا کام کرتے تھے۔

تقسیم کے بعد یوسف وہرہ بھی اپنے بیٹے عبدالرفیق کو ساتھ لے کر کراچی چلے گئے۔

واپسی

۴۴- محمد ہُڈ
۴۵- ترڑخ - الرجی
۴۶- ہارٹ اٹیک ، مکان



علامہ سیّد فیضی



محمد امین (شہاب کا بہنوئی)



حبیب اللہ شہاب (قدرت اللہ کا بھائی)

ممتاز مفتی ، پروین عاطف ، مومی پیٹلا (لندن)



ممتاز مفتی ، کمال ، تہمینہ ، عکسی ، والدہ تہمینہ

یوسف وہرہ تاجر پیشہ ہونے کے باوجود دیانت دار آدمی تھے۔ کراچی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جو حربے استعمال کیے جاتے تھے وہ یوسف وہرہ کے لیے قابل قبول نہ تھے اس لیے رفیق کو کاروبار چلانے کے لیے راولپنڈی آنا پڑا۔ یوں ہمارا رابطہ قائم رہا۔

رفیق میرا سالا بھی تھا دوست بھی اور بھائی بھی۔

مشکل کے وقت وہ ہمیں سہارا دیتا تھا۔

عام حالات میں وہ میرا ساتھی تھا۔

چوالیسواں باب

محمدؐ ہڈ

قدرت اللہ شہاب ہالینڈ سے واپس آئے تو ہمارے درمیان وہ پہلے والا رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ درمیان میں فاصلے حائل ہو گئے۔ہالینڈ سے واپسی پر کچھ عرصہ وہ اپنے بہنوئی امین صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ امین الیکشن کمشن میں کام کرتے تھے۔ اور انہیں پشاور روڈ پر چوہڑ ہرپال کے قریب محکمے نے ایک بنگلہ الاٹ کر رکھا تھا۔

ان دنوں میں سیٹلائٹ ٹاؤن میں رہتا تھا۔

ڈیڈ ڈرنک

قدرت اللہ سیکرٹری تعلیم کی حیثیت سے آئے تھے۔ ان کا دفتر اسلام آباد میں تھا۔ اس لیے ہماری ملاقاتیں وقفوں سے ہوتی تھیں۔ دو ایک ملاقاتوں کے بعد میں نے محسوس کیا۔ جیسے قدرت اللہ وہ قدرت نہ ہو۔ ایک خط میں میں نے اس کا اظہار غفور صاحب سے کیا۔

انہوں نے جواب دیا۔ آپ درست کہتے ہیں' لیکن گھبرایئے نہیں۔ دراصل شہاب صاحب نے ہالینڈ میں اس قدر شدت سے مجاہدہ کیا ہے کہ ان کی شخصیت کے گرد ایک ہالہ ابھر آیا ہے۔

پھر ایک واقعہ رونما ہوا۔

ڈاکٹر عفت نے اطلاع دی کہ وہ لاہور سے پنڈی پہنچ رہی ہے۔ ڈاکٹر عفت اپنے عزیزوں سے ملنے لاہور گئی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا چلو میں بھی عفت سے مل آؤں۔ اس لیے اپنے سکوٹر پر بیٹھ کر میں ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ جہاز لیٹ تھا' اس لیے میں ایئرپورٹ کی کنٹین میں جا بیٹھا۔ اس زمانے میں ایئرپورٹ کی کنٹین ایئرپورٹ سے ملحقہ ایک عمارت میں تھی۔

کچھ دیر کے بعد شہاب کی ہمشیرہ اور بچے کنٹین میں داخل ہوئے۔ ان کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ سانس گویا اکھڑے ہوئے تھے۔ وہ انتہائی خوف زدہ کیفیت میں تھے۔

کیوں کیا ہوا' میں نے پوچھا۔

بولے' ہم تو بال بال بچ گئے۔

یہ تو معجزہ ہے کہ ہم بچ گئے ہیں ورنہ مال روڈ پر ڈھیر ہوئے پڑے ہوتے۔

میں تو بیٹھی درود شریف پڑھتی رہی' ہمشیرہ بولی۔

توبہ ہے' گڈی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

لیکن ہوا کیا' میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں ماموں جان کو کیا ہوا۔ انہوں نے ایسی زگ زیگ گاڑی چلائی' گڈی نے کہا۔ جیسے سانپ چلتا ہے۔ چوک پر کھڑے سپاہیوں نے سیٹیاں بجائیں۔ سامنے سے آنے والی گاڑیاں رک گئیں۔ پٹڑی پر چلنے والے راہ گیر حیرت سے دیکھنے لگے۔

لیکن ایسا کیوں ہوا' میں نے پوچھا۔

اتنے میں قدرت اللہ کے بہنوئی داخل ہوئے۔ ان کا چہرا غصے سے سوجا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

وہ میرے قریب آ کر رک گئے بولے۔ اس لیے کہ دی باسٹرڈ از ڈیڈ ڈرنک۔ انہوں نے انگلی میری جانب اٹھا کر کہا۔ یو آسک ہم۔

جب قدرت اللہ کنٹین میں داخل ہوا تو گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

اس دوران میں امین صاحب نے دو ایک بار میری طرف دیکھا یوں جیسے کہہ رہے ہوں۔ آسک ہم۔ واہائی ڈونٹ یو آسک ہم۔

پتہ نہیں کیوں مجھ میں قدرت اللہ سے بات کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

پھر امین صاحب اٹھے اور قدرت اللہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور تشدد بھرے غصے سے چلائے۔

وہائی ڈڈ یو ڈواٹ۔ وہائی۔ وہن یو ورڈیڈ ڈرنک۔ قدرت اللہ کا سر جھکا ہوا تھا' وہ ڈائیننگ ٹیبل پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

امین نے پھر اسے للکارا' جواب دو۔ تم نے ایسا کیوں کیا۔

قدرت اللہ نے سر اٹھایا اور امین کی طرف بڑی معذرت اور بے بسی سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔

پھر اس کی دائیں آنکھ سے ایک آنسو ڈھلکا اور گال پر رک گیا۔ معاً" مجھے خیال آیا کہ یہ وہی نشہ ہے۔ وہی پرانی اکسٹیسی' جس میں چھلکن عمل میں آتی تھی۔ کیا ہالینڈ کے مجاہدے میں وجدان میں اس قدر شدت پیدا ہو گئی تھی۔

قدرت اللہ ایک تن تنہا۔ اکیلا فرد تھا۔ گھر میں عفت کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ کوئی اس کی کیفیات سے واقف نہ تھا۔ ہمشیرہ نہ بہنوئی نہ ان کے بچے۔ دفتر میں کسی کو علم نہ تھا کہ یہ مخص صاحب کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

محمد امین

عفت کی پوزیشن بھی بڑی ٹیڑھی تھی۔ وہ جانتی تو تھی' لیکن بتانے پر پابندی تھی۔ نہ گھر والوں کو بتا سکتی تھی' نہ میاں سے کھل کر بات کر سکتی تھی۔

قدرت کا بہنوئی کشمیری تھا۔ وہ ایک صراط مستقیمی فرد تھا۔ نیک دل تھا۔ سخی تھا۔ محبتی تھا' جذباتی تھا۔ شدت کا مارا ہوا تھا۔ اور بے حد غصیل تھا۔ وہ خود جھوٹ بولنے سے گریز کرتا تھا۔ جھوٹ بولنے والے کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ منہ پھٹ تھا۔ اصولوں کا پابند تھا۔ پکا مسلمان تھا۔ صوم صلوٰۃ کا پابند تھا۔ دفتر میں وہ اپنی رائے کا برملا اظہار کر دیتا تھا اور کسی قسم کے فیورٹزم کو گوارا نہ کرتا تھا۔ حکومت کے احکامات بھی اگر اصول و قانون سے ہٹ کر ہوتے تو وہ ان کی تعمیل سے برملا انکار کر دیتا تھا۔

وہ پیر پرستی کے سخت خلاف تھا۔ عمل اور صرف عمل کا قائل تھا۔

حاجی عبدالمعبود

ایک روز قدرت کہنے لگا مفتی صاحب میں چار ایک دن کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو آپ بھی چلیے۔

آپ دورے پر جا رہے ہیں کیا۔ میں نے پوچھا۔

نہیں۔ اس نے جواب دیا۔ ایک ذاتی کام ہے۔

کوئی چمگادڑ ہے کیا۔

وہ مسکرایا۔ چمگادڑیں تو ختم ہو گئیں۔ ہالینڈ میں ایک کرم نوازی یہ ہوئی کہ چمگادڑیں ختم ہو گئیں۔

تو پھر لاہور میں کون سا ذاتی کام ہے۔ میں نے پوچھا۔

ایک بزرگ سے ملنا ہے۔ بہت بڑے بزرگ ہیں۔ چلیے آپ بھی مل لیجیے۔ دراصل عفت کے ایک چچا کی دیرینہ خواہش ہے کہ حاجی صاحب انہیں بیعت کے لیے قبول کر لیں۔

آپ کی سفارش مان لیں گے کیا؟

نہیں نہیں وہ گھبرا کر بولا۔ وہ تو بہت بڑے بزرگ ہیں۔ میری کیا حیثیت ہے کہ سفارش کروں۔ آپ کے دوست غفور صاحب ایڈووکیٹ ہیں نا وہ بھی خواہش مند ہیں کہ حاجی صاحب انہیں بیعت کر لیں۔

دفعتاً میرے ذہن میں حاجی صاحب کی بڑائی کا احساس اجاگر ہوا۔ اچھا۔ اتنے بڑے ہیں وہ، میں نے پوچھا۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں حاجی صاحب نے شرکت کی تھی، اس وقت وہ نوجوان تھے۔ اب ان کی عمر ۱۳۰ کے قریب ہو گی۔

بینائی بالکل ٹھیک ہے۔ دانت دوبارہ اگے ہیں، بال سفید ہو کر دوبارہ کالے ہو گئے ہیں۔ ۵۴ حج کر چکے ہیں۔ اب ۵۵ ویں حج پر جا رہے ہیں۔

یہ کوائف سن کر میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔

اتنے بڑے بزرگ ہیں۔ میں نے پوچھا۔

جناب مہاجر مکی کی بیعت ہیں' وہ بولا۔ مہاجر مکی صاحب بہت بڑے بزرگ تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں انہوں نے ہندوستان میں پہلی اسلامی ریاست قائم کی تھی۔ جو چند ماہ چلی' پھر انگریزوں نے اسلحہ اور کمک حاصل کر لی اور اس اسلامی ریاست کو تسخیر کر لیا۔

کہتے ہیں قدرت اللہ نے کہا کہ اس وقت جناب مہاجر مکی کو ایک مجذوب مست نے خبر دی تھی کہ تمہارے خواب کی تعبیر آج سے نوے سال کے بعد نکلے گی۔

اچھا' پھر میں نے پوچھا۔

انگریزوں نے مہاجر مکی صاحب کو قید کر لیا' قدرت نے کہا' لیکن ایک روز انہوں نے دیکھا کہ جیل کے تمام دروازے کھلے ہیں۔ اس لیے جیل سے باہر نکل آئے اور سیدھے کراچی کی طرف پیدل چل پڑے۔ مہینوں چلتے رہے پھر جہاز میں سوار ہو کر مکہ مکرمہ پہنچے اور باقی زندگی وہیں بسر کی اسی وجہ سے انہیں مہاجر مکی کہتے ہیں۔

یہ حاجی صاحب مہاجر مکی صاحب کے مرید ہیں نا' میں نے پوچھا۔

ہاں' شہاب نے جواب دیا۔ ان کے چار مرید تھے صرف حاجی صاحب بقید حیات ہیں۔

حاجی عبدالمعبود کے کوائف جان کر میں بے حد متاثر ہوا۔ اس لیے قدرت اللہ کے ساتھ لاہور چلا گیا۔ شہاب نے مجھے بتایا کہ حاجی صاحب چھاؤنی میں ایلگن روڈ پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ایلگن روڈ پر عفت کے عزیزوں کی بہت بڑی کوٹھی تھی۔ جو اب خستہ حالت میں تھی۔ صرف دو ایک کمروں میں رہائش تھی۔

ساری کوٹھی ویران پڑی تھی۔ آباد کمروں میں دو ایک خستہ حال بوڑھی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔

شہاب نے پوچھا' وہ بزرگ کہاں ہیں۔

ایک خاتون نے جواب دیا وہ ادھر ہال کمرے میں ہیں۔ دو ایک بار آپ کا پوچھ بیٹھے ہیں۔ آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

حاضری یا زیارت

ہال کمرا بڑا خالی اور اندھیرا کمرا تھا۔ اس کے ایک پرلے سرے پر چارپائی بچھی ہوئی تھی۔

میز پر ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ چارپائی کے نیچے ایک گٹھڑی بندھی پڑی تھی۔ چارپائی پر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔

قدرت اللہ ہال میں داخل ہوا تو میں جان بوجھ کر پیچھے رہ گیا۔

قدرت کو دیکھ کر وہ بوڑھا لپک کر اٹھا قدرت کا ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔ سبحان اللہ' سبحان اللہ کہہ کر وہ قدرت کا ہاتھ پکڑ کر چومتا اور اس کو آنکھوں سے لگاتا رہا۔

یہ منظر دیکھ کر میں رک گیا۔

حاجی صاحب بار بار کہہ رہے تھے۔ ہم نے حضور قبلہ سے عرض کی تھی کہ ہمیں بھی ان صاحب کی زیارت کرائیے' جن پر آپ خوش ہیں۔ ہم نے سرکار قبلہ کی ۴۵ سال خدمت کی' حکم بجالائے۔ لیکن سرکار ہم سے اتنے خوش نہیں ہیں جتنے آپ سے ہیں۔

حاجی صاحب پھر سے قدرت کے ہاتھ چومنے لگے۔

پھر بولے' ہم نے درخواست کی تھی کہ ہمیں بھی زیارت کرا دیں تو حضور نے ہماری درخواست مان لی۔ حضور کی بڑی کرم نوازی ہے کہ انہوں نے آپ کی زیارت کرا دی۔

سبحان اللہ' سبحان اللہ' وہ پھر قدرت کے ہاتھ چومنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر میں چپ چاپ باہر نکل گیا۔ اس عالم میں ان دونوں میں مخل ہونے کی مجھ میں جرأت نہ ہوئی۔

ہال سے باہر نکل کر میں ایک چبوترے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ یہ کیا بھید ہے' قدرت اللہ بزرگ سے ملنے آیا ہے یا بزرگ کو قدرت اللہ کی زیارت کرائی گئی ہے۔ یہ بزرگ صاف بات کیوں نہیں کرتے۔ سیدھی بات کیوں نہیں کرتے۔ کیوں خواہ مخواہ کے الجھاؤ ڈالتے ہیں۔

پھر دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ قدرت اللہ کون ہے۔ جس کی حاجی عبدالمعبود جیسے بزرگوں کو زیارت کرائی جاتی ہے۔ جس پر حضرت مہاجر مکی صاحب اس قدر خوش ہیں۔

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ہال کمرے سے باہر نکلے۔ آگے آگے قدرت اللہ تھے۔ پیچھے حاجی صاحب آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں اٹھا' آگے بڑھ کر حاجی صاحب کو سلام کیا۔ حاجی صاحب نے وعلیکم السلام تو کہہ دیا۔ لیکن انہوں نے میری جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اس پر قدرت اللہ بولا۔ حاجی صاحب یہ میرے عزیز دوست ممتاز مفتی ہیں۔

اچھا اچھا' وہ بولے اور میری جانب دیکھے بغیر شہاب کے ساتھ باتوں میں مصروف رہے۔

قدرت اللہ نے مجھے اشارہ کیا کہ ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔

ٹپ بوائے

قدرت نے کار کا دروازہ کھولا اور اگلی سیٹ پر حاجی صاحب کو بڑے ادب اور احترام سے بٹھایا' پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اشارہ کیا۔ بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔

حاجی صاحب قدرت سے مسلسل باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ قدرت اللہ نے ہالینڈ میں حضرت مہاجر مکی صاحب سے رابطہ پیدا کیا تھا۔ اور وہ رابطہ اس قدر گہرا ہو گیا تھا کہ روبرو بیٹھ کر بات کرنے کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور قدرت اللہ کو ان کی خوشنودی میسر آئی تھی۔

انار کلی میں جا کر گاڑی رک گئی ریلیجس سوسائٹی کے مقابل انار کلی سے باہر ایک معمولی سی چائے کی دوکان تھی۔

ایک طرف چائے کا جہازی دیگچہ چولہے پر چڑھا ہوا تھا۔ جس میں کڑک چائے گرم ہو رہی تھی۔ دوسری جانب چار ایک بنچ رکھے ہوئے تھے۔ جن پر چند ایک لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دوکان میں صرف ایک لڑکا تھا۔ جو سروس پر مامور تھا۔

یہ لڑکا جسم کا بھرا ہوا تھا۔ قد چھوٹا تھا۔ لباس میلا تھا۔ بال کھڑے کھڑے تھے' چہرے پر ایک بے نام سی بے حسی طاری تھی۔ ایک آنکھ میں پھولا تھا جس کی وجہ سے چہرا اور بھی بد نما ہو گیا تھا۔

حاجی صاحب لاہور چھاؤنی کی ایلگن روڈ سے روز بس میں بیٹھ کر اس چائے خانے پر آتے تھے۔ ایک پیالہ چائے کا پیتے اور پھر اس لڑکے کو چھ آنے ٹپ دے کر واپس چلے جاتے تھے۔

تین مرتبہ شہاب اور میں حاجی صاحب کے ساتھ اس دکان میں گئے۔ وہاں چائے پی اور پھر حاجی صاحب کو ایلگن روڈ پہنچا کر واپس آ گئے۔

میں نے قدرت سے پوچھا۔ میں نے کہا یہ حاجی صاحب اس ہوٹل بائے کو چھ آنے دینے کے لیے کیوں آتے ہیں۔

پتہ نہیں' بولا۔

اگر بچے کو رقم دینی مقصود ہے تو ایک دم پانچ دس روپے کیوں نہیں دے دیتے۔

پتہ نہیں وہ بولا۔ بہت بڑے بزرگ ہیں۔ بڑے بزرگوں کے بھید وہی جانتے ہیں۔

یہ ایک معمولی سی بات ہے' اس میں کیا بھید ہو سکتا ہے بھلا' میں نے کہا۔

ہمیں نظر نہیں آتا نا۔ کچھ نا کچھ مقصود تو ہو گا۔ کوئی مصلحت ہو گی۔ کوئی حکم ہو گا۔ آپ اور میں ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

انوکھا اعزاز

اچھا ایک بات بتائیے' میں نے کہا۔

وہ میری جانب متوجہ ہو کر بیٹھ گیا۔

گذشتہ تین ملاقاتوں کے دوران میں نے حاجی صاحب کو چھ بار سلام کیا ہے۔ تین بار آپ نے میرا تعارف کرایا' یہ میرے دوست ہیں۔ ہے نا۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

لیکن انہوں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری جانب نہیں دیکھا۔ شاید آپ نے نوٹ نہ کیا ہو۔

کیا تھا وہ بولا۔

اتنی بے اعتنائی بھی تو نہیں ہونی چاہیئے۔ مانا کہ میں ایک عام آدمی ہوں۔ منہ زبانی مسلمان ہوں۔ پاکیزگی سے محروم ہوں' لیکن آخر ایک انسان ہوں۔

وہ چاہے توجہ کریں یا نہ کریں۔ قدرت نے کہا۔ ان کے قریب بیٹھنے کی وجہ سے زندگی میں برکت پیدا ہوتی ہے۔

کیا وہ واقعی بڑے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

بہت بڑے' وہ بولا۔ عالم ہیں' شاعر ہیں۔ ان کی نوٹ بک میں ساٹھ ہزار شعر لکھے ہوئے ہیں۔ ۲۰ ہزار شعر انہیں زبانی یاد ہیں۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ موصل کے رہنے والے ہیں۔ یہاں آ کر غیر علاقے میں بس گئے ہیں۔ چار ایک دن کی پیدل مسافت کے

بعد سڑک پر پہنچتے ہیں۔ ہر سال حج پر جاتے ہیں۔ سارے یورپ میں گھومے ہوئے ہیں۔

اتنے بڑے ہیں' میں نے کہا۔

ہاں وہ بولا بہت بڑے۔

پھروہ آپ کے ہاتھ کیوں چومتے ہیں۔ کیوں انہیں آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

یہ ان کی کرم نوازی ہے' قدرت نے جواب دیا۔

اس کے بعد حاجی صاحب کا قدرت اللہ سے رابطہ پیدا ہو گیا۔ جب بھی حاجی صاحب حج پر جاتے تو راستے میں ایک رات قدرت اللہ کے پاس رکتے۔ قدرت فوراً" مجھے اور عکسی کو فون کرتے آجائیے' آجائیے۔ حاجی صاحب آئے ہوئے ہیں۔

ہم دونوں مودبانہ سلام کر کے حاجی صاحب کے پاس جا بیٹھتے۔ حاجی صاحب ہم سے مخاطب ہوئے بغیر قدرت اللہ سے باتوں میں مصروف رہتے یوں جیسے قدرت کے علاوہ کوئی اور کمرے میں موجود ہی نہ ہو۔

ہر پانچ دس منٹ کے بعد جب بھی موقعہ ملتا۔ قدرت حاجی صاحب سے کہتے۔ یہ میرے دوست ہیں ممتاز مفتی' ساتھ ہی میری جانب اشارہ کرتے۔ حاجی صاحب میری جانب دیکھے بغیر سرسری طور پر اچھا اچھا کہہ کر پھر سے قدرت سے باتوں میں مصروف ہو جاتے۔

اگلی مرتبہ جب حاجی صاحب پھر تشریف لاتے تو قدرت پھر مجھے فون کرتے۔ اس وقت ان کے انداز میں اس قدر معصوم خوشی ہوتی جیسے کوئی بچہ اپنے کسی ساتھی کو لڈو کھلانے کے لیے بلا رہا ہو۔

ایک دفعہ میں نے قدرت سے کہا چھوڑو جی وہاں آنے کا فائدہ آپ کے حاجی صاحب تو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے' بات کرنا تو الگ بات ہے۔

یہ سن کر قدرت گھبرا گیا کوئی حرج نہیں' کوئی حرج نہیں' وہ بولا بے شک حاجی صاحب متوجہ نہ ہوں۔ ہمارے لیے' یہ اعزاز کیا کم ہے کہ ان کے قریب بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔

ایک روز میں نے غصے میں کہا۔ شہاب صاحب یہ کیسے بزرگ ہیں۔ اس پر قدرت گھبرا گیا۔ بولا' نہ ایسی بات نہ کہیئے مفتی صاحب بزرگی اللہ کا ایک گفٹ ہے وہ جسے چاہیں عطا کر دیں۔ چاہے کالے چور کو عطا کر دیں۔ بزرگ کو جج کرنے والے ہم کون ہیں۔ جج کرنے کی عادت اچھی

عادت نہیں ہے' جب ہم کسی کو جج کرتے ہیں تو خود کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور اسے اپنے سامنے یوں کھڑا کر لیتے ہیں۔ جیسے وہ ملزم ہو۔

ایک روز قدرت نے مجھ سے پوچھا۔ آپ کا کوئی ایسا دوست ہے کیا جو عربی دان ہو۔

آپ کا مطلب ہے کوئی عالم دین ہو' میں نے پوچھا۔

نہیں' نہیں' وہ بولا' علما میں سے نہیں ویسے ہی عربی دان ہو۔

میں نے کہا' بتائیے بات کیا ہے۔

کہنے لگا' حاجی صاحب کی ایک غزل ہے۔ عربی میں ہے اس کا ترجمہ کرانا ہے۔

دکھائیے تو میں نے کہا۔

سید فیضی

قدرت نے میز پر پڑا ہوا ایک کاغذ اٹھایا اور مجھے تھما دیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کاغذ پر قرآن کریم کی آیت لکھی ہوئی ہو۔ دو دن میں سوچتا رہا کہ میرا ایسا کون دوست ہے جو عربی دان ہو۔ میں نے مسعود سے پوچھا عمر سے پوچھا عماد سے پوچھا' کسی نے حامی نہ بھری۔ پھر میں نے ریڈیو سٹیشن پر مذہبی پروگرام کے سیکشن کو فون کیا تو جواب میں فیضی بولا۔

فیضی' میں نے پوچھا' تو یہاں کیسے آ گیا۔

فیضی ہنسا۔ کہنے لگا ریڈیو والوں نے ایک ٹاک کے لیے بلایا ہے۔

سید فیضی میرا پرانا دوست تھا۔ بیورو آف ریفرنس اینڈ ریسرچ میں ہم دونوں اکٹھے کام کیا کرتے تھے۔ وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں دسترس رکھتا تھا۔ فارسی کا شعر پڑھتا تو ایسے لگتا جیسے ابھی ابھی ایران سے آیا ہو۔ عربی بولتا تو لگتا جیسے قرآن کریم پڑھ رہا ہو۔

اسلامی تقریبات میں دوسرے علماء کے ساتھ فیضی کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ وہاں سٹیج پر کھڑے ہو کر جب وہ تقریر کرتا تو ایسے لگتا جیسے حلق کے تمام پردے بدل گئے ہوں۔ سنتے تو یقین نہ آتا تھا کہ فیضی بول رہا ہے۔ فیضی کی شخصیت میں بڑے تضادات تھے۔ وہ بیک وقت عالم بھی تھا' ادیب بھی' مولوی بھی اور رند بھی تھا۔ اس میں رنگین مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر بات پر ہنستا' ہر اڑتے ہوئے رنگین پلو کی طرف متوجہ ہو جاتا' ہر نسائی آواز پر کان کھڑے ہو

جاتے آنکھیں اثر سے بھیگ جاتیں۔ پتلیاں لیٹیں مارتیں۔

میں نے چلا کر کہا' یار فیضی میں تو تجھے ڈھونڈ رہا ہوں۔

بولا' مجھے ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔

مشکل کیوں ہے۔

بولا' آج کل ہم یہاں سے اڑایا وہاں جا بیٹھا کے دور سے گزر رہے ہیں۔

میں نے کہا' یار ایک عربی کی غزل ہے اس کا ترجمہ کرانا ہے۔ کہنے لگا' میرے گھر آ جاؤ۔

فیضی نے غور سے مسودہ پڑھا۔ مسکرایا۔ کہنے لگا یہ تو قصیدہ ہے۔

اچھا۔

کس نے لکھا ہے' اس نے پوچھا۔

دفعتاً" میں نے کاغذ پر نظر دوڑائی دیکھا تو قدرت اللہ نے پہلے ہی حاجی عبدالمعبود صاحب کے دستخط کاٹ رکھے تھے تاکہ کسی کو یہ علم نہ ہو قصیدہ کس نے لکھا ہے۔

ڈاک سے موصول ہوا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا۔

فیضی ہنسا' بولا کسی نے شہاب صاحب کی سفارش کرانی ہو گی۔ جبھی تعریفوں کے چھکے لگائے ہیں۔ ہاں انداز روایتی ہے۔

چلو کسی کا کام ہو جائے گا۔ تو کیوں اعتراض کرتا ہے۔ میں نے کہا۔

اونہوں' فیضی بولا' شہاب صاحب بڑے کائیاں ہیں وہ کام کر دیں گے' لیکن اس قصیدے کے فریب میں نہیں آئیں گے۔

فیضیؒ کا ترجمہ پڑھ کر میں پھر سے سوچ میں پڑ گیا۔ لکھا تھا۔

قصیدہ

ا۔ بہترین سلام ہو ان خوبیوں پر جو اس کی فطرت میں شامل ہیں اور اچھی عادتیں ہی قبولیت کی کفیل ہوا کرتی ہیں۔

۲۔ عزت اور وقار کو اس کی ذات سے تخلیق حاصل ہے کیونکہ وہ شہاب جیسی منزلت رکھتا ہے اور کوئی ایسی فضیلت نہیں جس میں وہ بڑھا ہوا نہ ہو۔

۳۔ وہ سفیروں کا سردار شہاب ہے جس کی خوبیوں کے خزانے سے نیکیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہتی ہیں۔

۴۔ ہر طرح کے کمالات نے اسے گھیرے میں لے رکھا ہے اور اس کی ذات کو تمام فخریہ القابات حاصل ہیں۔

۵۔ کوئی بلندی نہیں جو اس کی وجہ سے اپنے کمال پر نہ ہو۔ دسترس سے ثریا بہت بلند ہے۔

۶۔ ہالینڈ میں حسن و سرخوشی سے اس نے ضیا پائی ہے بالکل پورے چاند کی مانند جو کبھی ڈوبنے والا نہیں۔

۷۔ یہ سلام ایک خاص بندے کی طرف سے ہے جو مدینے کا رہنے والا ہے' اور وہ سب سے بہتر وسیلے والے اللہ کے رسولؐ کا قرابت دار ہے۔

۸۔ وہ تیری خدمت میں بغرض ملاقات حاضر ہوا اور اس نے تیری ذات سے اخلاق کے میٹھے چشمے بہتے دیکھے۔

۹۔ ایسی ایسی باتیں ممدوح سے منسوب ہیں کہ خلق خدا اس کا ذکر کرتی ہے اور لوگ ان باتوں کو نقل و حکایت کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

۱۰۔ اگر تم کرم و عنایت کا میرے ساتھ سلوک کرو تو تم اس کے اہل ہو اور خوبیوں والے انسان ہو۔

۱۱۔ ورنہ میری بد قسمتی ہو گئی اور میں محروم رہ جاؤں گا۔ ایک کریم النفس انسان کی دریا دلی اور بخشش سے۔

انجام بخیر

اس قصیدے کو پڑھ کر بات بالکل ہی واضح ہو گئی کہ حضرت مہاجر مکی نے حاجی عبدالمعبود کو شہاب صاحب سے ملوایا تھا اور حاجی صاحب ان سے فیض یاب ہونے کے متمنی تھے۔ یہاں تک تو بات واضح تھی۔ پھر خیال آتا کہ شہاب کون ہے۔ یہ بھید نہیں کھلتا تھا۔

پھر آخری ایام میں قدرت کی وفات سے چند ایک سال پہلے۔ میرے ایک دوست نے مجھے

بتایا کہ حاجی صاحب اسلام آباد کے ایک بنگلے میں مقیم ہیں۔

شام کو قدرت سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ آپ کو پتہ ہے کیا کہ حاجی عبدالمعبود صاحب آجکل اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ ان کے ۴۳' ۴۴ حج مکمل ہو چکے ہیں اور اب وہ مستقل طور پر اسلام آباد میں سکونت رکھتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ جب میں قدرت کو یہ خبر سناؤں گا تو وہ حیران رہ جائے گا۔ اس کے برعکس قدرت نے نہایت اطمینان اور سکون سے جواب دیا۔ کہنے لگا ہاں مجھے علم ہے۔ حاجی صاحب اپنے بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں۔

کیا وہ آپ سے ملنے نہیں آئے۔

قدرت نے سر نفی میں ہلا دیا۔

تو چلیے ہم جا کر ان سے مل آتے ہیں۔

اچھا۔ چلیں گے۔ قدرت نے بات ٹال دی۔

میں نے بڑی مشکل سے حاجی صاحب کے گھر کا پتہ لگایا پھر یہ خوشخبری قدرت کو بتائی۔ لیکن اس نے پھر بات ٹال دی۔

ایک روز میں نے قدرت کو پکڑ لیا میں نے کہا' دیکھیے ٹالنے کا کیا مطلب ہے۔ میں تو حاجی صاحب سے ملنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ میں تو آپ کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ ان سے نہیں ملنا چاہتے تو صاف انکار کر دیجیے۔ ٹالنے کا مطلب۔

میری بات سن کر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا' حاجی صاحب اب حاجی صاحب نہیں رہے۔

حاجی صاحب حاجی صاحب نہیں رہے میں نے حیرت سے دہرایا۔ کیا مطلب ہے آپ کا۔

ہاں وہ بولا۔ وہ سینائل ہو گئے ہیں۔

پھر تو وہ ہمدردی کے مستحق ہیں' میں نے جواب دیا۔

ہاں ہمدردی کے مستحق ہیں۔ وہ بولا۔

دفعتاً" میں نے محسوس کیا کہ حاجی صاحب سینائل ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہو گئے ہیں۔

ایسی کیفیت میں ہمدردی کام نہیں آتی کیا میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سرہلا دیا۔ کچھ کام نہیں آتا۔ صرف اللہ کی ذات۔ وہ خاموش ہو گیا۔ دعا کیجیے کہ انجام بخیر ہو۔

محمد ﷺ ہڈ

جب بھی کوئی ایسا واقعہ ہوتا تو میرے دل میں یہ سوال ابھرتا کہ قدرت اللہ کون ہے۔ کیا وہ کسی کام پر مامور ہے۔ کوئی فیلڈ آفیسر ہے یا سیکرٹریٹ سے تعلق رکھتا ہے۔ چاہے وہ کاہی تھا یا افسر تھا۔ میرے لیے اس بات کا کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اس کے عہدے کی فضیلت سے میں کبھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ مجھے بزرگ بننے کی خواہش نہ تھی۔ نہ ہی میں بیعت کرنے کا متمنی تھا۔

الٹا میں تو خوف زدہ تھا کہ کہیں قدرت اللہ مجھے ایسا رخ نہ بخش دے جو مجھے کہیں اور لے جائے۔

میں تو اس کے کردار سے متاثر ہوا تھا۔ اس کے کردار کی عظمت نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس میں بلا کی وسعت قلب تھی۔

عکسی نے چیکو سلواکیہ سے واپسی پر مجھے وہ ایک بار سمجھانے کی کوشش کی تھی کہنے لگا بابا آپ خوامخواہ الجھاؤ میں پڑے ہیں۔ سیدھی بات ہے۔ شہاب صاحب کا مسلک محمدؐ ہڈ ہے۔ وہ حضورؐ کے نقش قدم پر چلنے کوشش کرتے ہیں۔ ہر بات پر وہ سوچتے ہیں کہ ان حالات میں حضورؐ کا طرز عمل کیا ہوتا۔

عکسی کہنے لگا' میں نے شہاب صاحب سے پوچھا تھا کہ یہ بتائیے کہ افضل ترین عبادت کون سی ہے۔ انہوں نے کہا میری دانست میں افضل ترین عبادت ہے۔

IDENTIFICATION WITH MOHAMMAD حضورؐ کا تصور کرو کہ خصوصی حالات میں ان کا رد عمل کیا ہوتا۔ ان کے جذبات کیا ہوتے محسوسات کیا ہوتے۔ عکسی نے کہا بابا آپ کو بھی انہوں نے بتایا ہوگا۔ ہاں مجھے بھی یہی بتایا تھا میں نے جواب دیا۔

وفات

ایک روز قدرت اللہ نے مجھ سے کہا ایک خبر آئی ہے۔ آپ نے سنی ہے کیا۔

نہیں تو' میں نے جواب دیا۔

کہنے لگا' غفور صاحب وفات پا گئے۔

مجھے بری طرح دھچکا لگا۔ میں ایک دم چپ ہو گیا۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

ہاں وہ بولا مجھے بھی یہ خبر سن کر صدمہ ہوا تھا۔ میرا ذہن دھندلا گیا تھا۔ اسی روز مجھے صدر ایوب نے بلا بھیجا۔ مجھے دیکھ کر صدر صاحب بولے' شوہاب خیر تو ہے۔ تم آج اکھڑے اکھڑے کیوں ہو۔

میں نے کہا' جناب میرے ایک محسن انتقال کر گئے ہیں۔

کون۔ انہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا' جناب وہ میرے ہی محسن نہیں تھے۔ آپ کے بھی محسن تھے۔ پاکستان کے خیرخواہ تھے۔

کون تھے وہ' صدر نے پوچھا۔

میں نے کہا جناب وہی جو آپ کو خط لکھا کرتے تھے اور آپ ان خطوں پر بہت جھنجلایا کرتے تھے۔ انہوں نے آپ کو کئی ہدایت نامے بھیجے تھے کہ تاشقند خود تشریف نہ لے جایئے گا۔ پریشر پڑے گا' لیکن سیز فائر میں التوا کیجئے گا۔

ہاں ہاں' صدر بولے' مجھے یاد ہے۔

میں نے کہا' اگر آپ ان کی ہدایات پر عمل کرتے تو آج نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور آپ پاکستان کے مرد مجاہد کا نام پاتے۔

ان کے خطوط کہاں ہیں میں انہیں دیکھنا چاہوں گا۔ صدر نے کہا۔

اب کیا فائدہ ہے اب تو تیر کمان سے چھوٹ چکا ہے۔

شہاب نے کہا' اس وقت صدر صاحب کی حالت قابل ترس تھی۔ تھکا ہوا' ہارا ہوا' ٹوٹا ہوا۔ کہنے لگے' شہاب عقل سے ہٹ کر باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں کوشش کے باوجود میں انہیں اہمیت نہ دے سکا۔

یہ ہماری نااہلی ہے' شہاب نے کہا۔ ملک کی بدقسمتی ہے کہ آپ کو یقین نہ دلا سکے۔

ادھورہ پیغام

میں نے پوچھا' شہاب جی یہ آپ کو خبر کیسے ملی۔

قدرت نے کہا۔ انتقال کے دو ایک دن پہلے انہوں نے مجھے ایک خط لکھا تھا۔ انہوں نے لکھا کہ لاہور سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے داتا صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ داتا صاحب نے فرمایا کہ ہمارا پیغام شہاب کو پہنچا دو۔ انہوں نے پیغام دیا۔ میں نے عرض کی کہ جناب خوشاب پہنچ کر انہیں خط لکھ دوں گا۔ داتا صاحب نے فرمایا تاخیر نہ کرنا۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔

ان کے فرمان کے مطابق آپ کو خط لکھنے بیٹھا تو محسوس کیا کہ یہ پیغام خط میں لکھنے والا نہیں۔ اس لیے جلد خود آکر عرض کروں گا۔

پھر وہ آپ سے آکر ملے' میں نے پوچھا۔

نہیں قدرت نے کہا۔ انہیں اتنی مہلت نہ ملی۔ غالباً" انہوں نے داتا صاحب کے اشارے کو سمجھا نہیں۔

حیرت کی بات ہے۔ میں نے کہا' اب آپ کو پیغام کے بارے میں کیسے پتہ چلے گا۔ چلیے لاہور جاکر داتا صاحب کی حاضری دیجیے۔

قدرت نے نفی میں سرہلا دیا۔ یہ پروٹوکول کے منافی ہے' پھر قدرت نے ایک دم بات بدلی کہنے لگا' غفور صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ انہیں آپ کو بھی ایک پیغام دینا تھا۔

میرے نام پیغام میری ہنسی نکل گئی۔ شہاب صاحب میری کیا حیثیت ہے کہ کوئی بزرگ مجھے پیغام دے' کیوں میرا مذاق اڑاتے ہیں آپ۔

قدرت ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا' میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ کے نام کسی بزرگ کا پیغام نہیں تھا۔ داتا صاحب کی بات نہیں۔ غفور صاحب نے اپنی جانب سے آپ کو پیغام دینا ہو گا۔ انہوں نے خط میں لکھا تھا کہ اسلام آباد آؤں گا تو مجھے مفتی صاحب کو بھی ایک پیغام دینا ہے' وہ آپ کے دوست تھے نا' قدرت نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ شاید وہ دوست کی حیثیت سے پیغام دینا چاہتے ہوں۔

میں نے محسوس کیا جیسے قدرت اللہ بات بنا رہا ہو۔

پینتالیسواں باب

تزطخ، الرجی

ایک روز راجہ شفیع آ گیا۔ کہنے لگا، تجھے صاحب بلا رہے ہیں۔
کیا کہتے ہیں، میں نے پوچھا۔
بولا، کہتے ہیں انہیں کہیئے اگر فرصت ہو تو آ جائیں۔
تو گیا تھا کیا ان کے گھر یا وہ تجھے ملے تھے۔
ہاں، وہ بولا۔ میں عفت سے ملنے گیا تھا۔ وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ عفت لاہور گئی ہوئی ہے۔
شہاب اکیلا ہے کیا۔
بالکل، وہ بولا۔

میں شہاب کے گھر پہنچا تو وہ بیٹھا تلاوت کر رہا تھا۔ اس روز رمضان کی ستائیسویں تاریخ تھی۔

دفعتاً" مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلطی کی۔ ۲۷ ویں کو مجھے شہاب کے ہاں نہیں جانا چاہیے تھا چوں کہ رمضان کی ستائیسویں۔ شہاب کا عبادت کا دن تھا اور میری موجودگی ماحول کی پاکیزگی کے منافی تھی۔

ایک تو میں روزے سے نہیں تھا۔ دوسرے میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ میرے

کپڑے اور جسم کبھی پاک نہیں ہوئے تھے۔ چوں کہ جوانی سے ہی مجھے مسلسل بول کی بیماری تھی۔

ستار دعا

تقریباً" ۱۹۴۰ء کی بات ہے جب میں منٹگمری کے گورنمنٹ سکول میں پڑھاتا تھا۔ تو میرا ایک دوست غلام محمد نے جو ان دنوں کمیٹی میں تانگا انسپکٹر تھا۔ مجھے احساس دلایا تھا کہ میں ایک ناپاک شخص ہوں۔ غلام محمد میں دو خصوصیات نمایاں تھیں۔ ایک تو وہ سختی سے شریعت کا پابند تھا' دوسرے وہ ستار بجانے کا رسیا تھا۔

نماز پڑھنے لگتا تو جائے نماز کے ساتھ ستار رکھ لیتا۔ نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیر کر مصلے پر بیٹھے بیٹھے ستار بجانے لگتا۔

ایک دن میں نے غلام محمد سے کہا۔ تیرا بھی جواب نہیں مصلے پر بیٹھ کر ستار بجاتا ہے۔

وہ بولا' نہیں ستار نہیں بجاتا۔ دعا مانگتا ہوں۔

میں نے کہا' دعا مانگنے کا یہ طریقہ ہے کیا۔

بولا' تجھے نہیں پتہ۔ ستار مجھ سے بہتر دعا مانگتی ہے۔ اللہ کی منتیں کرتی ہے۔ ہاتھ جوڑتی ہے' پاؤں پڑتی ہے میں اپنا سارا دکھ درد اپنے ترلے' ہاڑے ستار میں منتقل کر دیتا ہوں اور وہ اللہ کے حضور میں فریادی بن جاتی ہے۔ غلام محمد اللہ سے یوں باتیں کیا کرتا تھا جیسے اللہ اس کے سامنے بیٹھا ہو۔ اسے اللہ سے بہت پیار تھا۔ ایسا پیار جیسے بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے۔

ایک دن میں نے کہا' غلام محمد تجھے اللہ کیسے مل گیا۔

کہنے لگا' یہ میرے مرشد سرکار قبلہ کی دین ہے۔ وصال کے وقت وہ فرمانے لگے غلام محمد ہم تجھے کون سا تحفہ دیں ہمارے پاس تو صرف ایک ہی چیز ہے۔

انہیں سپرد خاک کرنے کے بعد جب میں گھر آیا تو دیکھا کہ اللہ صوفے پر بیٹھا ہے۔

پیشاب کا مٹکا

غلام محمد کے پاس ایک نوٹ بک تھی جس میں گیت غزلیں اور ٹھمریوں کے بول لکھے ہوئے

تھے جنہیں وہ ستار پر گنگنایا کرتا تھا۔ ان گیتوں میں جگہ جگہ غلام محمد کے پیرو مرشد کا نام لکھا ہوا تھا۔ ایک روز میں نے غلام محمد سے کہا' یار اگر جو تو اپنی نوٹ بک مجھے دو دن کے لیے دے دے تو میں اس میں سے کچھ گیت لکھ لوں' پھر میں کاپی تجھے لوٹا دوں گا۔

غلام محمد نے میری بات مان لی اور کاپی مجھے دے دی۔

اسی رات دو بجے کے قریب میرا دروازہ بجا' بجتا رہا۔ میں گہری نیند سویا رہا۔

پھر میری پڑوسیوں نے دیوار پر چڑھ کر مجھے آوازیں دیں۔

کہنے لگے' باہر آپ کا کوئی مہمان دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

باہر غلام محمد کھڑا تھا۔

میں نے کہا' تو غلام محمد۔ اس وقت خیر تو ہے۔

بولا' بالکل خیر نہیں۔ تو مجھے میری گیتوں والی کاپی دے دے۔

میں یہ سن کر حیران ہوا۔ کیا رات کے دو بجے تو اپنی نوٹ بک لینے آیا ہے۔

بولا' سرکار قبلہ مجھے سونے نہیں دے رہے۔ بہت ناراض ہیں۔ کہتے ہیں تو نے ہماری کاپی پیشاب کے مٹکے میں ڈال دی ہے۔ ابھی جا اور کاپی لے آ۔

اس روز پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میں پیشاب کا مٹکا ہوں۔ ناپاک ہوں۔

پہلے یہ احساس صرف جسم تک محدود تھا۔

پھر ۱۹۵۶ء میں جب میں بھائی جان سے ملا تو مجھے اپنی ذہنی ناپاکیزگی کا احساس ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ ذہنی طور پر میں کس قدر ناپاک تھا۔ جسمانی غلاظت سے کہیں زیادہ ناپاک۔

آج تک کوششوں کے باوجود۔ میں ان غلاظتوں کو دور نہیں کر سکا۔

ہاں تو اس روز شہاب کے گھر پہنچا تو مجھے شدت سے احساس ہوا کہ آج مجھے اس کے ہاں نہیں آنا چاہیے تھا چوں کہ اس روز ایک تو رمضان کی ستائیسویں تھی اور دوسرے جمعہ کا دن تھا۔

پھر خیال آیا شاید شہاب نے مجھے کام سے بلایا ہو۔ شہاب نے مجھے دیکھتے ہی کہا' بڑا اچھا ہوا آپ آ گئے' عفت لاہور گئی ہوئی ہے اور میں اکیلا ہوں۔ اس لیے میں نے آپ کو بلا لیا کہ گپ

شپ رہے گی۔

میں نے کہا آج ستائیسویں ہے۔ آپ کے لیے عبادت کا دن ہے۔

عبادت

ہاں ہاں' وہ بولا' عبادت اپنی جگہ ہے گپ شپ اپنی جگہ۔ یوں کرتے ہیں کہ جمعہ شاہ بری لطیف کی مسجد میں جا کر پڑھتے ہیں' پھر وہاں ادھر ادھر چکر لگاتے ہیں۔ افطار کر کے مغرب کی نماز پڑھ کر واپس گھر آ جائیں گے' پھر بے شک آپ چلے جانا۔

پروگرام کے مطابق شہاب نے شاہ بری کے چاول کھا کر افطار کیا۔ مغرب کی نماز ادا کی اور گھر آ گئے۔

راستے میں میں نے پوچھا' آپ عبادت کیسے کرتے ہیں۔

بولا' بس اللہ کا نام لیتے ہیں۔ چاہے کیسے بھی لو۔ قرآن کریم کی تلاوت کرو یا کلام پڑھو۔

آپ کیا پڑھتے ہیں' میں نے پوچھا۔

بولا' میں تو نفل پڑھ لیتا ہوں۔

میں نے کہا' اگر آپ اجازت دیں تو ــــــــــــ

تو کیا اُس نے پوچھا۔

میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کیسے عبادت کرتے ہیں۔

نوابجیکشن' وہ بولا۔ بے شک دیکھ لیں۔

عشاء کی نماز کے بعد ایک بڑے کمرے کے ایک کونے میں اس نے جائے نماز بچھالیا۔

آپ بھی نفل پڑھیں گے' اس نے پوچھا۔

نہیں میں نے جواب دیا' میں دیکھوں گا۔

کمرے کے دوسرے کونے میں میں بیٹھ گیا۔

شہاب نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا کھڑا ہونے کا انداز ہی انوکھا تھا۔ یوں نہیں جیسے نمازی کھڑے ہوتے ہیں' بلکہ یوں جیسے اللہ تعالیٰ اس کے سامنے تخت پر بیٹھے ہوں۔ وہ سراپا عجز بن کر کھڑا تھا۔

میں اس کی طرف دیکھتا رہا' دیکھتا رہا۔

میرا خیال تھا کہ ابھی وہ رکوع میں جائے گا۔ لیکن وہ جوں کا توں کھڑا رہا' بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اس کے جسم کا بند بند عجز سے بھیگا ہوا تھا۔

دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ میں اپنی موجودگی سے فضا کو ناپاک کر رہا ہوں۔ مجھے بھی کچھ پڑھنا چاہیئے مجھے صرف درود تاج یاد تھا۔ یہ جناب اللہ بخش صاحب کی دین تھی۔ میں نے درود تاج پڑھنا شروع کر دیا۔ ساری رات شہاب عجز میں بری طرح لت پت کھڑا رہا۔ رات بھر میں اس نے چند ایک بار رکوع اور سجود کیا ہو گا۔ پھر پچھلے پہر وہ دھڑام سے چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

ترخ

اس نے دو ایک بار میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا' لیکن میں اس کے اشارے کو سمجھ نہ سکا۔ پھر مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ مجھے بلا رہا ہے۔ قریب گیا تو اس نے ٹیلی فون کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے فون اس کے قریب رکھ دیا۔ اس نے ڈائل کیا' پھر مدھم آواز میں پتہ نہیں کیا کہا۔ اور پھر چادر اوڑھ کر پڑ گیا۔

میں حیران کھڑا تھا یااللہ یہ کیا بات ہے قدرت مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا۔ کیا یہ بھی عبادت کا حصہ ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ موٹر اندر داخل ہوئی۔ ایک صاحب باہر نکلے بولے' شہاب صاحب کہاں ہیں۔

میں نے پوچھا' آپ کی تعریف۔

بولا' میں صدر کا میڈیکل آفیسر ہوں۔

میں اسے شہاب کے کمرے میں لے گیا۔

ابھی وہ معائنہ کر رہا تھا کہ ایک اور گاڑی بنگلے میں داخل ہوئی۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ عفت کو دیکھ کر مجھے حوصلہ ہو گیا اور میں بھاگ کر نیچے گیا۔

ایک نہیں سب

عفت نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا' شہاب تو خیریت سے ہیں' دفعتاً" بات سمجھ میں آگئی کہ

شہاب بیمار ہے۔ اس نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلایا ہے' لیکن عفت لاہور سے کیسے آ گئی۔

عفت نے ڈاکٹر سے بات کی تو پتہ چلا کہ شہاب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔

عفت فارغ ہوئی تو میں نے پوچھا' آپ لاہور سے کیسے آ گئیں۔

کہنے لگی شہاب کو کوئی تکلیف ہونے والی ہو تو مجھے چار دن پہلے پتہ چل جاتا ہے۔ لاہور میں میں نے محسوس کیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے ایک بکرا حلال کروا کے گوشت بانٹا' پھر پی آئی اے کی ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کل رات کے جہاز میں ایک ان کنفرمڈ سیٹ کے لیے میں ایئر پورٹ پر انتظار کرتی رہی' لیکن بات نہ بنی۔ البتہ آج صبح کی فلائیٹ میں سیٹ مل گئی۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے کہ بنگلے میں ایک ٹیکسی داخل ہوئی اور قدرت کا چھوٹا بھائی حبیب کراچی سے آ گیا۔ آتے ہی بولا۔ قدرت خیریت سے ہے۔

قدرت اللہ سے مل کر جب حبیب باہر نکلا تو میں نے پوچھا' آپ کیسے آئے۔

کہنے لگا' کل دوپہر سے میری طبیعت خراب ہونی شروع ہوئی۔ ایک بے نام بے چینی۔ میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ شام کو بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ میں نے ایک ٹرانکوئیلائزر کھایا اور لیٹ گیا۔ لیکن بے چینی کم ہونے کی بجائے عذاب بن گئی۔ میں سمجھ گیا کہ قدرت کا معاملہ ٹھیک نہیں۔ میں نے پی آئی اے کو فون کیا۔ خوش قسمتی سے نائٹ بس میں ایک سیٹ مل گئی اور میں چلا آیا' جب بھی قدرت کو کوئی تکلیف ہونے والی ہوتی ہے تو میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک بے چینی لگ جاتی ہے پھر وہ اس قدر شدت اختیار کر لیتی ہے کہ عذاب بن جاتی ہے۔

حبیب شہاب

حبیب' سٹیٹ بنک میں پبلک ریلیشنز کا ڈائریکٹر تھا۔ طبعی طور پر وہ جرنلسٹ تھا۔ وہ ایک عقلیہ آدمی تھا۔ اس کی زندگی میں عقل اور دلیل کی بڑی اہمیت تھی۔ ایکسٹروورٹ تھا۔ سوشل تھا۔ شدت سے حقیقت پسند تھا۔ جذباتی لوگوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ طبیعت میں مذہبی رجحان نہ تھا۔ پیروں فقیروں کو اچھا نہیں جانتا تھا۔ لاگ لگاؤ کا قائل نہ تھا۔ اس کے باوجود

قدرت اللہ سے اسے بڑی محبت تھی اور جب بھی قدرت پر کوئی مصیبت آنے والی ہوتی تو وہ بے چین ہو جاتا' بے وجہ بے چین ہو جاتا۔ ایک بے نام بے چینی اسے اپنی گرفت میں لے لیتی۔

قدرت کہا کرتا تھا۔ حبیب اور میرے درمیان ایک عجیب سا تعلق ہے۔ میرے دکھ درد حبیب کو ٹرانسفر ہو جاتے ہیں اور اس کی خوشیاں میرے نام منتقل کر دی جاتی ہیں۔

میں نے بھائی جان کو یہ بات بتائی تو وہ سخت کنفیوز ہو گئے' کہنے لگے' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

بھائی جان کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے کہا' شاید شہاب نے یہ بات مذاق میں کہی ہو۔

بھائی جان نے سر نفی میں ہلا دیا۔ بولے نہیں' وہ ایسے مذاق نہیں کرتے۔

بہرحال اس روز حبیب کی کیفیت دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ قدرت سچ کہتا ہے۔ قدرت کو ہارٹ اٹیک کی تکلیف اس قدر شدید نہ تھی جتنی حبیب کی بے چینی میں ظاہر ہو رہی تھی۔

اس روز میں خود فیوز ہو چکا تھا۔ یااللہ یہ کیسا خاندان ہے۔ قدرت پر کچھ واقعہ ہونے والا ہو تو بیگم کو چار دن پہلے علم ہو جاتا ہے اور بھائی کے بے وجہ اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔

ماں جی

پھر مجھے وہ رات یاد آ گئی جب حبیب کو گردے میں پتھری کی تکلیف تھی۔ ناقابل برداشت تکلیف اور دونوں بھائی ڈرتے تھے کہ کہیں ماں جی کو پتہ نہ چل جائے۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

اس وقت دروازہ بجا تھا۔ اور ایک صاحب نے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا تھا انہیں نمبو پلاؤ۔

قدرت اسے نمبو پلاتا رہا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد حبیب غسل خانے کی طرف بھاگا۔ پیشاب میں پتھری کے دو ٹکڑے نکل کر باہر گرے۔

دونوں بھائی بہت خوش تھے کہ ماں جی کو پتہ نہیں چلا۔ اتنے میں ماں جی داخل ہوئیں۔ حبیب سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں' شکر ہے دونوں پتھر نکل گئے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ یااللہ یہ کیسا خاندان ہے۔ ایک قدرت ہی نہیں۔ سارے افراد ہی کسی ان جانی طاقت کے زیر اثر ہیں۔ اس روز میں نے محسوس کیا کہ قدرت اللہ گھر والوں کا مرکز تھا۔

چند ایک روز کے بعد میں شہاب کا حال جاننے کے لیے گیا۔

میں نے کہا آپ کو ہارٹ اٹیک کیوں ہوا۔

کہنے لگا' ہارٹ اٹیک نہیں ہوا۔

میں نے پوچھا' پھر کیا ہوا۔

بولا' چینی کی پیالی پر زیادہ دباؤ پڑ جائے تو وہ ترخ جاتی ہے' مجھے بات سمجھ میں نہیں آئی' میں نے کہا' بجھارتیں نہ بجھوائیے صاف بات کیجیے۔

بولا' صاف بات ہی تو کی ہے۔ اس رات میں نے خود پر زیادہ دباؤ ڈال دیا۔ اس لیے ترخ گیا۔

میں نے کہا گذشتہ چار پانچ برس میں آپ کئی بار ترخے ہیں۔

ہاں شاید' وہ بولا۔

کیا زیادہ دباؤ ڈالنے میں لذت حاصل ہوتی ہے۔

وہ مسکرا دیا اور پھر اس نے بات بدل دی۔ کہنے لگا' آپ کی الرجی کا کیا حال ہے۔

الرجی کا کوّا

میری الرجی بہت پرانی تھی۔

ہفتے میں دو ایک مرتبہ دورہ پڑتا تھا۔

جسم پر پھنسیاں نکل آتیں۔ خارش ہوتی۔ آگ سی لگ جاتی تھی۔ پھر میں انٹی ہسٹمینک گولیاں پھانکتا رہتا۔ پتہ نہیں میں کتنی ہزار گولیاں پھانک چکا تھا۔

ڈاکٹر کہتا' یہ الرجی ہے۔ مجھے الرجی کا مفہوم سمجھ میں نہ آتا تھا۔

ان دنوں الرجی ایک نئی بیماری تھی۔ جس کی کئی ایک شکلیں تھیں۔ پھنسیاں نکلتیں یا چھینکیں آتیں یا آنکھ ناک سے پانی بہتا۔ الرجی کا کوئی مستقل علاج نہ تھا۔ گولی کھاؤ اور اچھے ہو جاؤ' پھر گولی کھاؤ اور اچھے ہو جاؤ۔

بس زندگی بھر گولیاں پھانکتے رہو۔ گولی کھانے سے پہلے پھنسیوں کی تلخی ہوتی۔ گولی کھانے کے بعد پھنسیاں تو دب جاتیں مگر گولی کی تلخی شروع ہو جاتی۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ

الرجی کس چیز سے ہے۔ صرف چیزوں سے ہی نہیں کسی فرد سے بھی ہو سکتی تھی اور حالات سے بھی۔

ان دنوں لاہور میں ایک الرجی سپیشلسٹ آیا ہوا تھا جو تجزیہ کر کے بتاتا تھا کہ الرجی کس چیز کی ہے۔ وہ مریض کے خون میں مختلف چیزیں ڈالتا تھا۔ جس چیز سے خون میں ابال آ جاتا۔ اس چیز کا نام بتا دیتا تھا کہ آپ فلاں چیز سے الرجک ہیں۔ اس چیز سے پرہیز کریں۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ لاہور جا کر الرجی سپیشلسٹ کو دکھاؤں۔ لاہور جانے سے پہلے میں قدرت اللہ کے ہاں گیا۔ میں نے کہا' میں الرجی سپیشلسٹ کو دکھانے لاہور جا رہا ہوں۔ قدرت نے کہا' فرض کیجیے سپیشلسٹ کہتا ہے کہ آپ کو گوشت سے الرجی ہے تو؟

تو کیا' میں نے جواب دیا' میں گوشت کھانا چھوڑ دوں گا۔

اچھا۔ بہت اچھا' وہ بولا' لیکن اگر اس نے کہا کہ آپ کو پان سے الرجی ہے تو۔

تو ——— تو۔ مشکل ہے' لیکن میں کوشش کروں گا کہ پان کھانا چھوڑ دوں۔

چلئے مان لیا کہ آپ پان کھانا چھوڑ دیں گے' لیکن اگر سپیشلسٹ نے کہا کہ آپ کو اپنی بیوی سے الرجی ہے' تو آپ کیا کریں گے۔

اس پر عفت قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ بولی' آپ ان کی باتیں نہ سنیئے یہ تو ویسے ہی اناپ شناپ بول رہے ہیں۔ آپ مجھ سے بات کیجیے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔

ہاں جی تو ڈاکٹر صاحبہ آپ بتائیے کہ الرجی کیا ہوتی ہے' شہاب نے کہا۔

عفت بولی۔ مفتی صاحب الرجی کوے کی مانند درخت کی کسی ٹہنی پر بیٹھ جاتی ہے۔ آپ سپیشلسٹ سے پوچھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کوا فلاں ٹہنی پر بیٹھا ہے' پھر آپ پتھر مار کر اسے اڑا دیتے ہیں' مگر وہ درخت کی دوسری ٹہنی پر جا بیٹھتا ہی۔ یوں الرجی گئی تو نہ' اس نے شکل بدل لی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

میں نے کہا' تو آپ کا مطلب ہے کہ میرا لاہور جانا بے کار ہے۔

بالکل' وہ بولی۔

تو پھر میں کیا کروں۔ ساری عمر کھجاتا رہوں اور گولیاں پھانکتا رہوں۔

کسی بزرگ سے کہو دعا کرے' عفت نے کہا۔

بزرگ کہاں دعا کرتے ہیں جو راضی بہ رضا ہوں وہ کیوں دعا کریں گے' میں نے کہا۔

یوں میرا لاہور جانے کا پروگرام ختم ہو گیا۔

مست

ان دنوں میں سیٹلایٹ ٹاؤن کے ڈی بلاک میں رہتا تھا۔ اگلے روز ہمارے گھر کی دہلیز پر ایک مست آبیٹھا' اس کا چہرہ ڈراؤنا تھا۔ کپڑے میلے کچیلے۔ اسے دیکھ کر گھن آتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا بیماری تھی۔ ہر دو گھنٹے کے بعد وہ چلاتا' روٹی روٹی۔ اسے جو بھی دیتے کھا لیتا پھر دو گھنٹے کے بعد چیخیں مارنے لگتا' روٹی روٹی۔

میری بیوی کہنے لگی' یہ کیا مصیبت آپڑی ہے۔ اسے یہاں سے اٹھاؤ۔ میں نے دو ایک بار مست سے بات کرنے کی کوشش کی کہ بابا ادھر بیٹھ جا کر۔ تو نے تو ہمارا راستہ روک لیا ہے۔ اس نے میری بات کی طرف توجہ نہ کی۔

چند ایک دنوں کے بعد مست نے کھجانا شروع کر دیا۔ اس کے جسم پر بڑے بڑے چھالے نکل آئے' کھجا کھجا کر چھالے زخم بن گئے۔

ہم سب خوف زدہ ہو گئے کہ مست کی کھجلی گھر کے اندر آگئی تو سب گل جائیں گے' لیکن کوششوں کے باوجود ہم اسے اپنی دہلیز سے اٹھا نہ سکے۔ ایک دفعہ دو محلے داروں نے اسے گھسیٹ کر سامنے بند دوکان کے چھجے تلے لٹا دیا' لیکن اگلی صبح جب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ پھر ہماری دہلیز پر آبیٹھا ہے۔ یوں دس پندرہ دن گزر گئے۔

دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ ان دنوں کے دوران مجھے الرجی کا دورہ نہیں پڑا تھا۔

شہاب کی طرف گیا تو بر سبیل تذکرہ' مست کی بات کر دی۔ میں نے کہا' حیرت کی بات ہے کہ ہم تو ڈرتے تھے کہ مست کی کھجلی گھر میں داخل ہو جائے گی' لیکن اس کے برعکس اس ہفتے مجھے الرجی کا دورہ نہیں پڑا۔ قدرت نے مست کی بات سن کر اس میں دلچسپی لینی شروع کی۔ مست کے متعلق کئی ایک سوال پوچھے میری الرجی کے متعلق وہ غیر معمولی دلچسپی لیتا رہا۔

میں نے کہا' شہاب جی مجھے شک پڑتا ہے۔

کیا شک پڑتا ہے' اس نے پوچھا۔

کہ یہ مست خود آ کر میری دہلیز پر نہیں بیٹھا' بلکہ بٹھایا گیا ہے تاکہ میری الرجی سلب کر لے۔

ہاں' وہ بولا' ہو سکتا ہے۔ شاید بھائی جان نے بٹھایا ہو۔

اونہوں' میں نے جواب دیا۔ بھائی جان ایسے کرتب نہیں کرتے وہ تو صراط مستقیمی ہیں۔

شاید آپ کے سرکار قبلہ سائیں اللہ بخش نے بھیجا ہو' وہ بولا۔

ہاں ہو سکتا ہے۔

آپ بھائی جان سے پوچھیں' قدرت نے کہا۔

پوچھوں گا۔ مجھے بتایئے کیا یہ لوگ اتنے طاقت ور ہوتے ہیں۔

ہاں' وہ بولا۔ سنا ہے یہ لوگ بہت طاقت ور ہوتے ہیں۔

یہ تو بڑی زیادتی ہے' میں نے کہا' کہ ایک شخص کو بچانے کے لیے دوسرے کو روگ لگا دیا جائے۔

جب میں رخصت ہونے لگا' تو وہ بولا' ٹھہریئے مجھے بھی شہر جانا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ موٹر سائیکل یہیں رہنے دیں۔ آپ کے گھر جا کر میں بھی مست کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

اس روز غیر از معمول وہ میرے گھر کی ڈیوڑھی میں دیر تک بیٹھا مست کو دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ اس کے بعد بھائی جان سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں مست کی بات سنائی۔ میں نے کہا' بھائی جان ایک مہینے سے وہ میرے گھر کی دہلیز پر بیٹھا ہے۔ اس دوران میں مجھے الرجی کا دورہ نہیں پڑا۔ لگتا ہے جیسے میری الرجی اس نے سلب کر لی ہے۔ کھجا کھجا کر اس کا جسم زخموں سے بھر گیا ہے۔

آم اور درخت

بھائی جان میری باتیں غور سے سنتے رہے۔

میں نے کہا' جناب ایسے لگتا ہے جیسے وہ خود میری دہلیز پر آ کر نہیں بیٹھا بلکہ اسے بھیجا گیا ہے۔

شاید' وہ بولے' ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا' شاید سرکار قبلہ کا کرم ہو۔

بھائی جان سوچ میں پڑ گئے' پھر پوچھنے لگے' کیا آپ نے سرکار قبلہ کی خدمت میں درخواست پیش کی تھی کہ مجھے الرجی سے بچانے کے لیے دعا کیجیے۔

نہیں' میں نے جواب دیا۔

سوچ لیجیے' وہ بولے شاید ————

جی نہیں میں نے ان کی خدمت میں کبھی گزارش نہیں کی۔

یہ سن کر وہ پھر خاموش ہو گئے۔ دیر تک خاموش رہے پھر سر اٹھایا اور مسکرانے لگے بولے' مفتی جی' آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ آپ آم کھائیے۔ پیڑ کیوں گنتے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ آپ پر لوگ مہربان ہیں۔ کرم نوازیاں ہو رہی ہیں۔

اگلے روز راجہ شفیع آ گیا۔ اس نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ کہنے لگا' مفتی یہ کیا بری عادت ہے تجھے۔ چھوڑ اسے تو آم کھا پیڑ کیوں گنتا ہے۔

یہ میرے بس کی بات نہیں راجہ' میں نے جواب دیا۔

بھائی جان تجھ سے ناراض ہیں۔ کہتے ہیں اسے سمجھا جا کر کہ بال کی کھال اتارنے کی عادت چھوڑ دے۔

دراصل راجہ شفیع ایک سچا مرید تھا۔ وہ جانے بغیر ماننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مجھ میں جاننے کا جنون تھا ماننے کی توفیق نہ تھی۔

اس کے بعد جب بھی میں شاب سے ملتا تو وہ پوچھتا' مست کا کیا حال ہے کیا ابھی بیٹھا ہے۔ کیا آپ کو الرجی کی شکایت ہوئی۔

چار ایک بار مجھے شک پڑا کہ شاید یہ شہاب کی شرارت ہو۔ لیکن دل نے کہا نہیں۔ شہاب اس قسم کی شعبدہ بازی کو پسند نہیں کرتا۔

مہنگا سودا

پھر ایک دن میں جو گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ مست موجود نہیں۔

میں نے لڑکوں سے پوچھا' جو گلی میں کھیل رہے تھے۔

ایک لڑکا بولا' وہ سامنے کی بند دوکان کے تھڑے پر چادر لپیٹے پڑا ہے۔ واقعی میں وہ دکان کے تھڑے پر چادر لپیٹے پڑا تھا۔

اگلے روز علاقے کی پولیس نے آ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے' آپ کے بیانات لینے ہیں۔

میں نے پوچھا' کس سلسلے میں۔

بولے' اس مست کے بارے میں جو آپ کی دہلیز پر بیٹھا رہتا تھا۔

اسے کیا ہوا' میں نے پوچھا۔

وہ فوت ہو گیا ہے۔

اگلے دن میں شہاب سے ملا تو میں نے کہا' بڑا ظلم ہوا۔

کیا ہوا؟ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' مست فوت ہو گیا۔

یہ تو قسمت کی بات ہے' وہ بولا' اس کا وقت آ گیا ہو گا۔

میں نے کہا' پتہ نہیں کیوں۔ لیکن میں گلٹی محسوس کر رہا ہوں۔

وہ کیوں؟

اس مست نے میری الرجی سلب کر لی اور اپنی جان کر قربانی دے دی۔

شہاب نے جواب نہ دیا۔

آٹھ دس ماہ کے بعد مجھے پھر سے الرجی کی پھنسیاں نکل آئیں۔

شہاب اس پر مسکرایا۔ بولا' سائیں جی سے کہو شاید وہ کوئی اور مست بھیج دیں۔

میں نے کہا' شہاب جی۔ یہ تو بڑا مہنگا سودا ہوا کہ ہر دس ماہ کے بعد ایک مست کی قربانی دے دو۔

چھیالیسواں باب

حج ، ہارٹ اٹیک، مکان ،

پھر حج کی بات چل نکلی۔

دراصل حج کی بات کئی ایک سال سے چل رہی تھی۔

حج کے متعلق میں نے تمام تفصیلات اپنی کتاب لبیک میں درج کر دی ہیں۔ جنہیں یہاں دہرانا مناسب نہیں چند ایک اہم باتیں یہ تھیں کہ۔

حج پر جانے کی خواہش میرے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سب سے پہلے حج پر جانے کی خبر مجھے راجہ بازار کے فوارہ چوک میں کھڑے ایک مست نے دی تھی۔ پھر لاہور چھاؤنی کی ا۔لگن روڈ کی کوٹھی میں ایک نوجوان مست نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ شہاب اور میں برآمدے میں بیٹھے تھے۔ دفعتاً باہر ایک شور برپا ہو گیا۔ بہت سی عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔ ان میں ایک مرد کی آواز بھی تھی۔ وہ چیخ رہا تھا چلا رہا تھا۔

پھر وہ ہماری جانب آ گیا۔ آتے ہی شہاب سے بولا تو اسے حج پر کیوں نہیں لے جاتا۔ لے جانا' پھر اس نے مجھے بہت سا کریانہ تھمادیا۔ لے' وہ بولا' رکھ لے یہ تیرا خرچہ ہے۔

پھر وہ شہاب کی طرف اشارہ کر کے بولا' یہ شخص ایمان والا ہے۔ عمل والا ہے۔ یہ پانچ حج کرے گا۔ اس کی گاڑی پر جھنڈا لگے گا۔ فائل بنی ہوئی ہے' صرف دستخط کرنے باقی ہیں' پھر وہ

شہاب سے مخاطب ہو کر بولا' اونہوں' تو چاہے نہ چاہے یہ تو ہُو گا جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔

ایک بار شہاب نے بھی مجھ سے بر سبیل تذکرہ کہا تھا' انشاء اللہ ہم اکٹھے حج پر جائیں گے۔ آپ حج پر جانے کی عرضی دے دیں۔

پھر دو تین سال میں باقاعدہ حج پر جانے کی عرضی دیتا رہا' لیکن قرعہ اندازی میں میرا نام نہ نکلا۔ اس اثنا میں شہاب کا تبادلہ ہو گیا اور وہ ہالینڈ چلا گیا۔

حج کا پروگرام

میں نے خط میں اسے اطلاع دی کہ اس سال بھی میرا نام نہیں نکلا۔ جواب میں اس نے مجھے ۳۰ دسمبر ۶۵ء کو خط لکھا' جس میں حج کا پروگرام لکھا تھا۔ مجھے اس قسم کی ہدایات دی گئی تھیں۔

۱۔ حج کے لیے درخواست دے دیں۔ اگر نام نکل آیا تو خوب۔

۲۔ اگر نام نہ نکلے تو آپ بیروت آ جائیں۔ امریکن ایکسپریس سے کہیں کہ وہ ٹکٹ بنا دیں۔

کراچی سے بیروت

بیروت سے جدہ

جدہ سے بیروت

بیروت سے ایمسٹرڈم ——— لندن ——— پیرس

پیرس سے ایمسٹرڈم

ایمسٹرڈم سے کراچی

۳۔ کراچی سے یوں روانہ ہوں کہ ۲۶ یا ۲۷ کو بیروت پہنچ جائیں باقی بکنگ اوپن رکھیں۔

۴۔ ہم انشاء اللہ ۲۷ مارچ کی شام کو بیروت پہنچ جائیں گے۔

میں اس پروگرام کے مطابق تیاری کر رہا تھا کہ آخری ایام میں۔ غفور صاحب میری گھر آ گئے۔ ان کی آمد میرے لیے حیرت انگیز تھی چوں کہ انہیں میرے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ کہنے لگے' میں راولپنڈی کسی کام سے آیا تھا۔ سوچا' آپ سے ملتا جاؤں۔

میں نے حج کی تیاری کے متعلق بات کی تو کہنے لگے' کیا آپ کو شہاب صاحب نے اطلاع

نہیں دی کہ اس سال آپ حج کے لیے نہیں جا سکیں گے۔ مدینے شریف سے منظوری نہیں ملی۔
چند ایک روز کے بعد شہاب صاحب کا خط ملا لکھا تھا باوجوہ اس سال ہم حج پر نہیں جا سکیں گے۔

۱۹۶۶ء کے آخر میں شہاب واپس پاکستان آ گیا اور اس نے مرکزی وزارت تعلیم کے سیکرٹری کا چارج لے لیا اور ۱۹۶۸ء میں ہم دونوں حج پر چلے گئے۔

مرد قدیم

حج میں میرا سب سے بڑا مشاہدہ مرد قدیم تھے۔ مسجد نبویؐ میں جب ہم فجر کی نماز کی تیاری کر رہے تھے' تو مرد قدیم اس جانب سے تشریف لائے جدھر مسجد کا بر آمدہ تھا۔ ادھر سے مسجد میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

ان کے بشرے کی طرف دیکھ کر میں حیران ہوا۔ ان کے چہرے پر آہنی عزم اور سنجیدگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوہے کے بنے ہوئے ہوں اور اس قدر قدیم ہوں کہ تاریخ کے کسی ورق سے نکل کر آئے ہوں۔

بر آمدے سے وہ سیدھے ہماری جانب آئے۔ اس وقت ہم فجر کی نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے۔ پیچھے سے آ کر انہوں نے ہم دونوں کو الگ کیا اور ہمارے درمیان آ کھڑے ہوئے۔

اس بات پر مجھے بڑا غصہ آیا۔ ہمیں الگ کرنے کیا ضرورت تھی۔

پندرہ بیس منٹ وہ ہمارے ساتھ رہے۔ انہوں نے ہم سے منہ سے کوئی بات نہ کی' لیکن ان کے ہاتھ متحرک رہے اور وہ باتیں کرتے رہے ان کے جسم میں محبت بھری لہریں تھیں۔ اپنائیت تھی' کرم نوازی تھی۔ ان کی شخصیت سے عجیب سی وائبریشنز نکل رہی تھیں۔ سلام پھیرنے کے بعد میں نے قدرت کی طرف دیکھا وہ عجز کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

لیکن اس کی آنکھوں میں دبی دبی پھلجھڑی چل رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ سمجھتا ہے' جانتا

اصل مفصل خط ضمیمے میں دیکھیں۔ خط نمبر XX

ہے۔

رکلوٹیں

حج کے دوران مجھے چار ایک باتوں کا پتہ چلا۔

مکہ مکرمہ میں شہاب کو چار ایک بار انجائینا کا دورہ پڑا۔ دو تین بار اس کے جسم کے جوڑ اکڑ گئے۔ حرکت کرنا ممکن نہ رہا۔ جب بھی کوئی اہم مقام آتا تو اس کے راستے میں کوئی رکلوٹ کھڑی ہو جاتی۔

حج سے واپسی کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ کہ مکہ معظمہ میں ایسے حادثات کیوں عمل میں آئے تھے۔

مجھے نہیں پتہ' وہ بولا' بس میرے راستے میں رکلوٹیں کھڑی کر دی گئی تھیں۔

کس نے رکلوٹیں کھڑی کیں' میں نے پوچھا۔

بولا' پتہ نہیں غالباً" دی فور بزبی یونٹ۔

وہ خیر کی طاقتیں تو نہیں ہو سکتی نا۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

ایک بات بتایئے میں نے کہا' آپ کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی۔ آپ خود ہی کہا کرتے ہیں کہ رکلوٹوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ صرف اس کا راستہ روکا جاتا ہے جس کے پہنچ جانے کا خطرہ ہو۔

ہاں' وہ بولا' ہونا تو ایسا ہی چاہیے لیکن ———— بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

ایک بات اور ہے' میں نے کہا' یہ رکلوٹیں صرف مکہ معظمہ میں پیش آئیں۔ مدینہ منورہ میں نہیں۔

توجہ اور مرکز

مدینہ منورہ تو رحمت ہی رحمت ہے' اس نے جواب دیا۔

حج کے دوران قدرت اللہ بار بار مجھے ایک بات سمجھاتا رہا کہ دیکھو یہاں توجہ مرکز سے نہ

ہٹے۔ گرد و پیش میں چاہے کوئی واقعہ پیش آئے۔ کوئی جھگڑا ہو یا بحث' کوئی غیر معمولی واقعہ' کوئی اخلاق سوز واقعہ' کچھ بھی ہو اس کا نوٹس نہ لیں۔ دل آزردہ نہ کریں' غم نہ کھائیں' غصہ نہ کریں۔ مرکز سے توجہ نہ ہٹائیں۔ ایسے واقعات صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ آپ کی توجہ ہٹ جائے۔

مدینہ منورہ کے ہوٹل میں ایک روز میں غم و غصہ سے بھرا بیٹھا تھا۔ اتفاق سے قدرت آ گیا میری طرف دیکھ کر بولا' کیوں کیا ہوا۔

کچھ نہیں' میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

آپ بڑے ڈسٹربڈ ہیں' وہ بولا۔

میں نے کہا' سعودی حکومت نے جو افسر آپ کے ساتھ اٹیچ کر رکھا ہے' اس کی دیدہ دلیری پر حیران ہوں۔

اس نے کیا کیا ہے' شہاب نے پوچھا۔

ایک پاکستانی لیڈی ڈاکٹر کو پھنسا لیا ہے۔ دونوں نے یہ سامنا کمرا بک کروایا ہے۔ اعلانیہ اکٹھے رہتے ہیں۔ شہاب صاحب یہاں مدینہ شریف میں ایسی اخلاق سوز حرکت۔

مفتی صاحب اس نے جواب دیا' وہ یہ اخلاق سوز حرکت صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ آپ کا حج کھوٹا کر دیں۔ آپ غم و غصہ کا شکار ہو جائیں۔ آپ کی توجہ مرکز سے ہٹ جائے یہ آپ کے خلاف ایک سازش ہے۔

عام انسان

حج کے دوران دوسری بات جو قدرت اللہ نے مجھے سمجھائی' یہ تھی کہ حرمین شریف میں زائر کو عام انسان کی حیثیت سے رہنا چاہیے۔ بزرگی کا احساس پیدا نہ ہو۔ عہدے کا احساس نہ ہو' بڑائی کا احساس نہ ہو صرف انسان عام انسان۔

قدرت اللہ اس پر عملی طور پر پابند تھا۔

جب بھی وہ حج یا عمرہ کے لیے سعودی عرب آتا تو ایک عام زائر کی طرح کیو میں کھڑا ہو کر ویزا حاصل کرتا۔ کیو میں کھڑا ہو کر پی آئی اے کی ٹکٹ بنواتا اور فارن ایکس چینج حاصل کرتا۔

حالانکہ وہ ایسے عہدے پر فائز تھا کہ یہ تمام مرحلے دفتر میں بیٹھے بٹھائے طے ہو سکتے تھے۔

دھکے کھانے کا مزا

مدینہ منورہ میں وہ روز صبح تین بجے مجھے جگاتا اور ہم دونوں حجرہ مبارک کے باہر کیو میں کھڑے ہو جاتے' جب مسجد نبویؐ کا حجرہ مبارک والا دروازہ کھلتا تو وہ دھکے کھاتا ہوا اندر داخل ہوتا اور حجرہ مبارک میں نفل کی نیت باندھ کر کھڑا ہو جاتا' پھر زائرین کا ریلا اندر داخل ہوتا قدرت اللہ کو دھکا لگتا اور وہ یہاں سے وہاں تک لڑھکتا جا پہنچتا۔ پھر سے دھکا لگتا تو وہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا ادھر آ پہنچتا۔ حجرہ مبارک میں نوافل پڑھنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ کئی بار وہ دیوار سے جا ٹکراتا۔ چوٹ لگتی' لیکن اس کی نیت نہ ٹوٹتی۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران تین مرتبہ پاکستان ڈسپنسری کے ڈاکٹر نے قدرت اللہ کو پیغام بھیجا کہ آج رات کو مسجد نبویؐ خصوصی طور پر فلاں اہلکار کے لیے چند گھنٹوں کے لیے کھلے گی۔ اگر آپ چاہیں تو آپ بھی ان کے ہمراہ مسجد میں جا کر نوافل ادا کر سکتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور معذرت کر دی کہ میری طبیعت خراب ہے اس لیے میں حاضری نہیں دے سکوں گا۔ اس کے باوجود تہجد کے وقت اس سے مجھے آ جگایا بولا چلئے حجرہ مبارک میں جانے کا وقت ہو گیا اور وہ حجرۂ مبارک میں حسب معمول دھکے کھاتا رہا۔

اگلی مرتبہ جب پھر خصوصی طور پر مسجد نبویؐ کے کھلنے کی خبر آئی تو عفت بگڑ گئی۔ کہنے لگی' آپ کو تو دھکے کھانے میں مزا آتا ہے۔ ہمیں آپ جانے سے کیوں روکتے ہیں۔ میں روکتا تو نہیں اس نے جواب دیا اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو بے شک جائیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ خصوصی پاس بھجوا دیں گے۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا' آپ بھی عفت کے ساتھ ہو آئیں۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

عفت غصے میں بولی' کیوں آپ کو کیا ہے۔

میں نے کہا' انہیں دھکے کھانے میں مزا آتا ہے۔ مجھے انہیں دھکے کھاتے دیکھنے میں مزا آتا ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ

حج کی روئیداد لکھنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہ موضوع اسلام سے تعلق رکھتا تھا۔ اور میں مذہب میں کورا تھا۔ کئی ایک سال گزر گئے' پھر میرے ایک دوست قاسم محمود نے جو ان دنوں سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر تھے۔ مجھے خط لکھا کہ ہمارے لیے کوئی سفرنامہ لکھو۔

میں نے سوچا چلو حج کا سفرنامہ لکھ دیتا ہوں دو تین قسطوں میں ختم کر دوں گا۔ پھر جو لکھنے بیٹھا تو لکھتا ہی چلا گیا۔

پہلی چند ایک قسطوں کے بعد قاسم محمود کا پیغام ملا کہ مضمون ختم کر دیں چوں کہ مالکان کو علما دوستوں نے کہا ہے کہ یہ کیسی خرافات شائع کر رہے ہیں آپ۔

پندرہ روز کے بعد قاسم محمود کا پیغام موصول ہوا کہ حج کے مضمون کو ختم نہ کریں' اگلی قسط جلد از جلد بھیجیں۔

میں نے پوچھا' یہ کیا تماشا ہے ایک سانس میں کہتے ہو مت لکھو دوسرے میں کہتے ہو کہ لکھو۔ فوراً" لکھو۔

اس نے بتایا کہ پہلے چند علماء نے منع کیا تھا۔ اس کے بعد قارئین کے خطوط موصول ہونے لگے۔ یہ خطوط تعریفی خطوط تھے اس لیے مالکان نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے۔

۱۹۷۵ء میں یہ سفرنامہ کتابی شکل میں لبیک کے عنوان سے شائع ہو گیا۔

میں نے چند ایک کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں پر ادبی پرچوں اور اخباروں میں رسمی قسم کی تنقید کی گئی تھی' لیکن لبیک کی اشاعت پر قارئین کے اتنے خط موصول ہوئے کہ میں حیران رہ گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بیشتر خطوں میں لکھا تھا کہ آپ نے لبیک میں میرے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

دانش وروں نے کہا کہ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد صرف یہ کہ قدرت اللہ کو ولی کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

ایک مرشد تین درویش

ادیبوں نے کسی نا کسی حوالے سے اس کتاب کا مضحکہ اڑایا۔ مثال کے طور پر ذیل میں ایک

کالم پیش کرتا ہوں جس میں ایک جانے پہچانے بڑے افسانہ نگار نے لبیک کی رونمائی پر یہ عنوان لگایا۔

افسانہ نویس نے حج کیا اور سفرنامہ لکھا: "ایک مرشد تین درویش" مفتی صاحب نو سو افسانے لکھ کر حج کو چلے۔ مفتی بھی ایسے ویسے نہیں۔ ممتاز مفتی۔ کیا کیا افسانہ لکھا۔ "آپا" لکھا' "ان کہی" لکھی "علی پور کا ایلی" لکھا' پھر حج پہ گئے۔ حج کا ثواب تو قدرت اللہ شہاب کی نذر کر دیا۔ اپنے لیے بس حج کا سفرنامہ لکھا۔

یہ سفرنامہ ' لبیک' کے نام سے شائع ہوا۔ انٹر کانٹی نینٹل میں اس کی افتتاحی تقریب ہوئی۔ اعجاز حسین بٹالوی نے صدارت کی' مگر اعجاز حسین بٹالوی نے تو کوئی سفر حج نہیں کیا' پھر کیا چیز تھی جو حاجی ممتاز مفتی کو پسند آئی۔ قصہ یہ ہے کہ سفر حج تو سفر کی انتہا ہے' انتہا میں دونوں رنگ ہیں' مگر آغاز سفر میں اکٹھے ہیں کہ دونوں کا سفر حیات بٹالہ سے شروع ہوا تھا۔

اعجاز حسین بٹالوی نے صدارت کا حق کماحقہ ادا اور مصنف کو بالکل ایسا ہی خراج تحسین پیش کیا جیسا کہ مقررہ صدر صدارتی تقریر میں تقریب کے ہیرو کو پیش کیا کرتے ہیں۔ کہا کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کبھی حج کا سفرنامہ اس شان کا نہیں لکھا گیا۔ پھر اپنے محاکمہ کو قدرے نرم کیا اور کہا کہ کم از کم برصغیر پاک و ہند میں اس شان کا سفرنامہ کبھی نہیں لکھا گیا۔

مفتی صاحب نے بھی تو اس سفرنامہ میں کمال دکھایا ہے کہ روایتی لوگ تو اس خبر ہی سے شہید ہو جاتے ہیں کہ ایک افسانہ نگار نے حج کا سفرنامہ لکھا۔ ادبی مخلوق یہ دیکھ کر داد دیتی ہے کہ ادیب نے حج ضرور کیا مگر اپنی لبرل آن پر حرف نہیں آنے دیا۔

اس تقریب میں اور حضرات نے کتاب پر مضمون پڑھے۔ سید قاسم محمود

نے کتاب کے جواب میں کتاب باندھی۔ جس ڈھب سے ممتاز مفتی نے اپنا سفرنامہ لکھا تھا اسی ڈھب سے سید قاسم محمود نے مضمون باندھا اور اتنا مفصل باندھا کہ لگتا تھا مفتی صاحب کی کتاب سید قاسم محمود کے مضمون کا ابتدایہ ہے۔ سامعین لق دق بیٹھے تھے اور سید قاسم محمود رواں تھے' یہ خبر اڑتے اڑتے انٹر کانٹی نینٹل کی انتظامیہ تک پہنچی کہ آج ایک ایسے مضمون کا انٹر کانٹی نینٹل کے سٹیج پر آغاز ہوا ہے کہ ڈنر کے اوقات اس میں لیٹ ہو جائیں' تو کچھ عجب نہیں' ہم نے دیکھا کہ ہوٹل کے منتظمین بار بار شالیمار ہال میں آ کر جھانکتے ہیں فکر مندی سے مضمون نگار کو دیکھتے ہیں۔ کتاب کے ناشر سیف اللہ صاحب سے سرگوشی کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

تقریبوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ تقریب کسی نہ کسی منزل پر جا کر ختم ہو جاتی ہے اور مقالہ کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر تمام ہو جاتا ہے' یہ مضمون بھی بالآخر ختم ہو گیا اور سامعین نے اس کے ختم کے ساتھ گرم جوشی سے تالیاں بجائیں۔

اس تقریب میں ایک مضمون ذوالفقار تابش نے پڑھا اور کتاب سے گزر کر اس شخصیت کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کی جس نے اس تذکرے کو بہت رونق بخشی ہے۔ یہ قدرت اللہ شہاب ہیں۔ ذوالفقار تابش کے بیان سے معلوم ہوا کہ اس صاحب کرامت بزرگ کے گرد تین درویش اکٹھے ہوئے ہیں۔ ممتاز مفتی' اشفاق احمد' ابن انشاء ہر درویش مرشد کے متعلق الگ بیان دیتا ہے اور نرالی داستان سناتا ہے۔

اعجاز حسین بٹالوی کہتے تھے کہ ہم نے بھی شہاب کو دیکھا اور جانا ہے پتہ نہیں مفتی صاحب نے انہیں کس آنکھ سے دیکھا اور وہاں کیا جلوہ پایا۔

سودا جو ترا حال ہے ویسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

یہ اس تقریب کا مختصر احوال تھا تفاصیل اس کی بہت ہیں مگر خوف فساد خلق ان کے بیان سے روکتا ہے۔

کالم نویس کو یہ شکایت تھی کہ مصنف نے حج کی روئیداد میں افسانہ نویسی کی ہے۔

انہیں یہ شکایت بھی تھی کہ ممتاز مفتی کو صدر گھر میں مرشد کیوں ملا۔ اس کار خیر کے لیے انہیں خانقاہوں یا پیر خانوں کی جانب رجوع کرنا چاہیئے تھا۔ انہوں نے اپنے کالموں میں بار بار اس کا تذکرہ کیا۔

ترقی پسند

پھر ترقی پسندوں نے اس کتاب کے خلاف ایک مہم چلا دی۔ انہوں نے ایک خبر بھیجی کہ ماسکو میں ایک ادبی کانفرنس ہوئی جس میں ممتاز مفتی کے مضمون "حج بیت اللہ" پر جو سیارہ ڈائجسٹ میں قسط وار چھپ رہا ہے۔ تبصرہ کیا گیا۔

کانفرنس میں کہا گیا کہ ایسے مضامین لکھے جائیں جو قارئین کو مذہب سے بے زار کریں جیسے کہ حج بیت اللہ۔

اس پر رفیق ڈوگر نے ہفت روزہ "زندگی" کے ۳۰ دسمبر تا ۹ جنوری ۷۲ء کے شمارے میں ایک کالم لکھا جس سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔

> گذشتہ دنوں روس میں امن بذریعہ قلم کار کانفرنس ہوئی۔ اس میں ایشیا اور افریقہ کے ترقی یافتہ ادیب' روس کی ہدایات اور خرچے پر غریب عوام اور ممالک کی جبری ترقی کے ذرائع پر غور و فکر کرتے رہے۔ پاکستان اور بھارت کے بہت سے "اہل دل" اور "اہل درد" بھی درد بٹانے کے لیے سیر کو گئے۔ پاکستانی کمیونسٹوں کے جد اعلیٰ جناب سجاد ظہیر اسی کانفرنس میں امن کے بوجھ تلے دب کر اس دنیا سے چل دیے تھے۔ اس کانفرنس میں برصغیر میں پائیدار قیام امن اور بھارت پاکستان کنفیڈریشن کے قیام کے لیے ان ادیبوں کو ایک لائحہ عمل دیا گیا۔ اس کی تفصیل

اسرائیل کے ایک جریدے YEDI OF AHARONOT میں شائع ہوئی ہے۔

کانفرنس میں اس مقصد کے لیے پاس کی جانے والی قرار داد میں کہا گیا کہ "بنگلہ دیش" کے قیام کے بعد برصغیر میں عوامی تحریک اور پرولتاری فکر کی کامیابی کو مزید مستحکم کرنے کے لیے پاکستان اور بھارت کے درمیان ثقافتی دیواریں توڑ دینا چاہئیں۔ پاکستان اور بھارت میں کنفیڈریشن کا قیام اور پائیدار امن اسی صورت ممکن ہے کہ پاکستان میں جنسیاتی ادب اور دہشت پسند تحریروں کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ دہشت پسند کہانیوں اور پرانے ہندی جنسی انداز کے افسانوں کی تشہیر بے حد ضروری ہے' جس میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مذاق اڑایا جانا چاہئے۔ قرار داد میں کہا گیا ہے' اس سلسلے میں پاکستان میں روسی سفارت خانے کا تعاون بہت ضروری ہے اور امریکی مراکز اطلاعات سے بھی مدد حاصل کرنا چاہیے۔ کراچی سے نکلنے والے دو رسائل "عالمی ڈائجسٹ" اور "سب رنگ ڈائجسٹ" کی خدمات کو سراہا گیا ہے اور لاہور کے رسالہ "سیارہ ڈائجسٹ" کے جنوری ۱۹۷۳ء کے مضمون "حج بیت اللہ" کی تعریف کی گئی ہے۔ برصغیر' خلیج کی ریاستوں اور مشرقِ وسطیٰ کے ترقی پسند مصنفین کو اس محاذ پر فوری جہاد امن شروع کر دینے کی تلقین کی گئی ہے۔

ایک روز شہاب اور اشفاق بازار سے کچھ کتابیں خرید کر لائے تو اشفاق کہنے لگا' یار مفتی تیری کتاب "لبیک" ادبی کتابوں کی دوکان پر نہیں ملتی۔ اسلامی کتابوں کی دوکان پر ملتی ہیں۔

شہاب بولا۔ قرآن کریم اور حدیث کی کتابوں میں رکھی ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے' میں نے کہا' میرا خیال تھا اس کتاب پر بڑے اعتراضات ہوں گے۔

ہاں ہونا تو یہی چاہیے تھا' اشفاق نے کہا۔

معلوم ہوتا ہے کسی اللہ کے بندے نے اس کتاب کو سپانسر کر دیا ہے۔

وہ کون اللہ والا ہے جو اسے سپانسر کرے گا' اشفاق نے کہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا' مفتی بہرحال یہ کتاب تمہاری نہیں ہے۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس کتاب کی رائیلٹی کھاؤ۔

ساری رات میں سوچتا رہا۔ اشفاق سچ کہتا ہے۔ یہ کتاب میری کتاب نہیں ہے مجھے اس کی اشاعت میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔

اگلے روز میں نے نیشنل کونسل کے ماہ نامہ "کتاب" میں اعلان کر دیا کہ لبیک کے حقوق مصنف کے حق میں محفوظ نہیں ہیں۔ جو شخص چاہے اسے مصنف کی اجازت کے بغیر شائع کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر باربرا میٹکاف

حال ہی میں ایک امریکی ڈاکٹر باربرا میٹکاف نے "لبیک" پر تحقیق کرنے کے بعد ہفتہ وار لٹریری ٹائمز کیم تا سات جون ۱۹۹۰ء کے شمارے میں ایک چار کالمی مضون شائع کیا ہے جس کا انٹرویو ہے :۔

"BARBRA METCALF QUESTIONS THE ASSUMPTION THAT ISLAM IS MONOLIHICALLY INTOLEVANT OF SATIRICAL TREATMENTS OF RELIGIOUS ORTHODOXY AND EXAMINES THE URDU WRITER MUMTAZ MUFTI'S LABBAIK AN ACCOUNT OF HIS PILGRAMAGE TO MECCA, A BOOK CONTINUOUSLY IN PRINT SINCE ITS PUBLICATION IN 1975."

ہارٹ اٹیک

حج سے واپسی کے چند ماہ بعد مجھے دل کا دورہ پڑ گیا۔ رات کے دس بجے کے قریب مجھے چھاتی میں درد ہوا۔ میں سمجھا کہ شاید درد ریح ہے۔ مجھے اکثر ہوا کی شکایت ہو جاتی تھی۔ درد بڑھتا گیا' بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ ناقابل برداشت ہو گیا۔ دفعتاً" مجھے احساس ہوا کہ یہ تو ہارٹ اٹیک ہے۔

رفیق شیخ نے دو تین بار کہا' میں ڈاکٹر لے آتا ہوں۔ لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ رفیق میرا سالہ ہے۔ ان دنوں ہم دونوں سیٹلائیٹ ٹاؤن میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

میراج کا پروگرام بنا تو رفیق نے مجھ سے کہا کہ تمہارے چلے جانے کے بعد اقبال اور بچے اکیلے رہ جائیں گے چوں کہ عکسی ابھی چیکو سلواکیہ سے واپس نہیں آیا تھا۔

کہنے لگا' ہماری گلی میں ایک مکان خالی پڑا ہے بہتر ہے حج پر جانے سے پہلے مکان بدل لیں۔ اس کے کہنے پر میں نے مکان بدل لیا تھا۔

مجھے چھاتی میں درد ہوا تو اقبال نے رفیق کو بلا لیا۔ جب درد نا قابل برداشت ہو گیا تو رفیق ٹیکسی لانے کے لیے بھاگا۔ پھر دفعتاً" یوں ہوا جیسے کسی نے پانی کی مشک مجھ پر گرا دی ہو اور میں بے جان ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔

ہولی فیملی ہسپتال میں انہوں نے مجھے پے تھے ڈین کا ٹیکہ لگا کر سلا دیا۔

اگلے روز ڈاکٹر آیا تو میں نے اسے بتایا کہ مجھے دل کا دورہ پڑا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا' آپ فکر نہ کریں۔ ابھی پتہ چل جائے گا پہلے آپ چار ایک ٹسٹ کروالیں۔ تین دن میں کیو میں کھڑے ہو کر ٹسٹ کرواتا رہا۔ چوتھے دن میں نے ڈاکٹر سے کہا' جناب میں قلم مزدور آدمی ہوں۔ گھر چلانے کے لیے سکرپٹ لکھتا ہوں۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ گھر چلا جاؤں اور سکرپٹ لکھنے شروع کر دوں۔

ڈاکٹر نے کہا' آپ کے ٹسٹوں کے نتائج آ جائیں گے میں انہیں دیکھ کر آپ کے بارے میں فیصلہ کر سکوں گا۔

اگلے روز وہ گھبرایا ہوا آیا کہنے لگا' آپ کو کارو نری انفاکشن ہوا تھا۔ بہت شدید ہارٹ اٹیک تھا۔ آج سے آپ بیڈ ریسٹ پر ہیں۔

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب مجھے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ پہلے روز ہی احتیاط کے طور پر مجھے بیڈ ریسٹ کا حکم دیتے۔ اس پر ڈاکٹر ناراض ہو گیا اور میں اس کی اجازت لیے بغیر گھر چلا آیا۔

کوئیکس

چھ مہینے کے بعد میں ڈاکٹر کے کلینک میں گیا۔ انہوں نے میرا ای سی جی کیا اور خوشی سے

چلائے' واہ صاحب آپ کی ریکوری تو خوب رہی۔ آپ کا تو سکار بھی نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے ہماری دوائیاں بڑے اہتمام سے کھائی ہیں۔

میں نے کہا' جناب میں نے سیانے لوگوں سے مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا قلب کے لیے بہترین دوا طب میں ملے گی۔ اس لیے میں خمیرہ مروارید کھاتا رہا۔ کلورسٹرل کے لیے مجھے بائیو کیمی میں ایک ایسی دوا مل گئی جو خون نہ تو گاڑھا ہونے دیتی ہے نہ پتلا کرتی ہے۔

یہ سن کر ڈاکٹر صاحب سخت بگڑے بولے' آپ پڑھے لکھے ہو کر کونیکس کی دوا کھاتے ہیں۔

میں نے کہا' ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی آپ فرما رہے تھے کہ کمال کی ریکوری ہوئی ہے۔ سکار تک مٹ گیا ہے۔

اس پر وہ اور بگڑے۔ بولے' آپ علاج کے لیے میرے پاس نہ آئیں۔ آپ انہی سے مشورہ کریں جن کی دوا کھاتے ہیں۔

ہارٹ اٹیک کے بعد ہسپتال میں لوگ مجھ سے ملنے کے لیے آتے رہے۔

مکان

سب سے پہلے میری بیوی آئی۔ کہنے لگی' آپ ہارٹ اٹیک کرا کے بیٹھ گئے ہیں اور ہمارے لیے اتنا بھی نہیں کیا کہ سر چھپانے کے لیے ایک کوٹھڑی بنوا دیتے۔ مجھے اس کی بات سن کر بڑا غصہ آیا کہ میں دل کے عارضے سے پڑا ہوں اور یہ بی بی گھر کا مطالبہ کر رہی ہیں۔

ویسے اس کی بات سچی تھی۔ لاہور میں جو گھر ہمیں الاٹ ہوا تھا وہ ہم چھوڑ کر راولپنڈی چلے آئے تھے۔

پنڈی میں حکومت نے سرکاری ملازموں کو سیٹلائیٹ ٹاؤن میں پلاٹ دینے کی سکیم بنائی تھی۔ میں نے بھی ایک عرضی دے دی تھی۔ میرا کلیم منظور ہو گیا تھا۔ ابھی پلاٹ نام زد نہیں ہوا کہ میرا تبادلہ کراچی ہو گیا تھا۔

یوں میرے نام کوئی پلاٹ یا مکان الاٹ نہیں ہوا تھا۔ میری بیوی کے جانے کے بعد میرا ایک دوست احسان میری خبر لینے کے لیے آ گیا۔ احسان سی ڈی اے میں اکاؤنٹس افسر تھا۔ میں

نے کہا' تمہارے جیسے دوستوں کا کیا فائدہ ہے۔ دیکھو ابھی ابھی میری بیوی مجھ سے لڑ کر گئی ہے کہ تم ہارٹ اٹیک کرا کر بیٹھ گئے ہو اور ہمارے لیے ایک کوٹھڑی کا انتظام بھی نہیں کیا۔

احسان نے کہا' ایک عرضی لکھ دو۔

میں نے کہا' واہ' دل کے مریض سے عرضی لکھواتے ہو۔

اس نے کہا' اچھا ایک کاغذ پر اپنے دستخط کر دو۔ چھ مہینے کے بعد مجھے ایک خط موصول ہوا۔ جس میں لکھا تھا کہ تمہارے نام اسلام آباد کے ایف۔ سکس سیکٹر میں ایک ۴۰ x ۹۰ کا پلاٹ الاٹ کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا پانچ ہزار روپے ادا کر کے پلاٹ پر قبضہ حاصل کر لیں۔

میرے لیے پانچ ہزار کی رقم بہت بڑی رقم تھی۔ پاکستان میں میری ملازمت صرف پندرہ سال کی تھی۔ میری پنشن کمپوٹیشن کے بعد ۲۰۷ روپے بنی تھی۔ میں نے جوں توں پلاٹ تو حاصل کر لیا' لیکن مکان تعمیر کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

تین سال کے بعد سی ڈی اے کے نوٹس موصول ہونے شروع ہو گئے کہ اگر آپ نے مکان تعمیر نہ کیا تو پلاٹ ضبط کر لیا جائے گا۔

میں سی ڈی اے کے افسر اعلیٰ سے جا ملا۔ میں نے کہا' جناب میں ایک رائٹر ہوں۔ قلم مزدوری کرتا ہوں۔ مکان بنانے کی توفیق نہیں رکھتا' اگر آپ ادیب کے حوالے سے مجھے خصوصی اجازت دے دیں کہ جب بھی توفیق ہو' مکان بنوا لوں تو شکر گزار ہوں گا۔ انہوں نے میری درخواست کو منظور نہ کیا۔

آفرز

پھر پلاٹ کی آفرز آنے لگیں۔ بیس ہزار روپیہ' پچیس ہزار روپیہ' تیس ہزار روپیہ' جب ۴۵ ہزار کی آفر آئی تو میرا دل ڈول گیا۔

میں پھر سی ڈی اے کے افسروں سے جا ملا۔ میں نے کہا' عالی جاہ' میرا ایمان ڈول گیا ہے۔ پلاٹ کی آفرز ۴۵ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔

میرا خیال تھا کہ وہ کہیں گے کہ نہیں آپ پلاٹ کو بیچ نہیں سکتے یہ قانون کے خلاف ہے۔

وہ مدہم آواز میں بولے' بیچ دیجیے۔ بس آپ کو پرسنٹ ایج دینا پڑے گا۔

امین

یہ سن کر میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔

پھر امین صاحب آ گئے۔ وہ غصے میں لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔

امین صاحب۔ قدرت اللہ کے بہنوئی تھے۔

امین صاحب کی شخصیت میں تین اوصاف نمایاں تھے۔ ایک تو وہ سراسر صراط مستقیمیے تھے۔ دوسرے خدمت خلق کے دیوانے تھے اور تیسرے بڑے غصیل تھے۔

انہوں نے آتے ہی کہا' میں نے سنا ہے آپ اپنا پلاٹ بیچ رہے ہیں۔ خبردار جو آپ نے پلاٹ بیچا۔

میں نے کہا' امین صاحب مکان تعمیر کرنے کے لیے رقم نہیں ہے۔

کتنے روپے ہیں آپ کے پاس' انہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا' صرف چودہ ہزار روپے۔

کہنے لگے' چودہ ہزار کا چیک کاٹ دیجیے ابھی اس وقت۔

اگلے روز میں نے شہاب سے بات کی۔

شہاب کہنے لگا' آپ کو مبارک ہو۔ اگر آپ کے گھر کی تعمیر کا ذمہ امین نے لے لیا ہے تو آپ کا مکان بن گیا۔ امین کو گھر تعمیر کرنے کا جنون ہے۔ وہ لوگوں کے گھر تعمیر کرتے رہتے ہیں۔ سارا دن بازاروں کی خاک چھانتے ہیں تعمیر کی سستی ترین چیزیں خریدتے ہیں اور باقی وقت لیبر کی سپرویژن میں صرف کرتے ہیں۔ میرا گھر بھی انہوں نے بنایا تھا۔ میرے پاس بھی رقم نہ تھی۔

لیکن شہاب صاحب' میں نے کہا دو لاکھ روپے آئیں گے کہاں سے۔ امین جادوگر نہیں۔ نہ ہی وہ کروڑ پتی ہے۔

وہ مسکرایا بولا' ایسے کاموں میں غیبی امداد ہو جاتی ہے۔ شہاب نے سچ کہا تھا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے رقمیں آتی گئیں۔ انجانے وسیلے پیدا ہوتے گئے۔ انجانی جگہوں سے رقمیں آتی گئیں اور ۱۹۷۷ء میں میرا مکان بن گیا۔

سنتالیسواں باب

تنگ دستی، خوف و ہراس

پھر جنرل یحییٰ حکومت کے سربراہ بن گئے۔
انہوں آتے ہی مارشل لا نافذ کر دیا۔

جنرل یحییٰ

انہوں نے سیکرٹریوں کی ایک میٹنگ بلا لی جس میں سول افسروں کو سخت جھاڑ جھپاڑ کی اور اپنی حکومت کے متعلق منہ پھاڑ کر دعوے کیے۔ ہم یوں کر دیں گے، ہم ووں کر دیں گے۔

اس پر قدرت اللہ شہاب نے غیر از معمول مارشل لاء کا مذاق اڑایا۔ کہنے لگا' جناب آپ کے مارشل لاء کی کیا بات ہے نالیاں صاف ہو رہی ہے۔ مکھیاں ماری جا رہی ہیں۔ قصابوں کی دوکانوں پر جالیاں لگوائی جا رہی ہیں۔ خاک روب بیگار پر سڑکیں صاف کر رہے ہیں۔

یہ سن کر جنرل کا پارہ چڑھ گیا اس نے سیکرٹریوں سے کہا' اس شخص کا ذہن چل گیا ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ ورنہ اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اس پر بیوروکریٹس نے شہاب کو گھیرے میں لے لیا اور اسے سمجھانے لگے۔
اگلے روز شہاب نے اپنا استعفٰی پیش کر دیا۔

ادھر جنرل نے شہاب کے تبادلے کے حکامات جاری کر دیے۔ عثمانی کو تعلیم کا سیکرٹری نامزد کر دیا اور شہاب کو ریونیو ممبر بنا دیا۔ اس کے علاوہ جنرل نے چیدہ چیدہ آدمیوں کو ڈیوٹی لگائی کہ وہ باری باری شہاب کو سمجھائیں کہ وہ اپنا استعفٰے واپس لے لے۔ ان میں راجہ محمود آباد بھی شامل تھے۔

جنرل یحیٰی جبر جنگ قسم کا آدمی تھا۔ اسے تین باتوں سے دلچسپی تھی۔ ایکسرسائز آف پاور۔ شراب نوشی اور موٹی عورتیں۔

رات کے وقت شراب نوشی کا دور شروع ہو جاتا تھا۔ کمرے میں موٹے گوشت کی دلدل بچھ جاتی جس میں جنرل یوں لت پت پڑا رہتا جیسے سمندر کے کنارے کیچڑ میں مگرمچھ لت پت پڑا رہتا ہے۔

میں نے شہاب سے کہا' یہ آپ نے کیا کیا۔ خوامخواہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔

شہاب نے جواب دیا' ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم سب جی حضوریے ہیں' حکومت کا کوئی بھی سربراہ آئے۔ جائز طریقے سے آئے یا ناجائز طریقے سے۔ حکومت کرنے کی اہلیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ چاہے زانی ہو' میخوار ہو۔ چاہے جسمانی طور پر مفلوج ہو' صاحب کردار ہو یا نہ ہو ہم جی حضوریے اس کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور ذاتی مفاد کے لیے اس کے گن گاتے ہیں۔ تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقائق پس پشت چلے جاتے ہیں اور فینٹیسی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا' جناب آپ نے سانپ کی دم پر پاؤں رکھا ہے۔ اب کیا ہو گا؟ آپ کی مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔

خوش قسمتی سے انہی دنوں شہاب کو یونیسکو سے بلاوا آگیا۔ ڈائریکٹروں کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے وہ پیرس روانہ ہو گیا۔ کراچی میں وہ عثمانی سے ملا اور اسے چارج دے دیا۔

پیرس سے اس نے ڈاکٹر عفت کو فون کیا کہ فوراً" لندن پہنچو۔ عفت اور ثاقب چپ چاپ لندن روانہ ہو گئے۔

بھائی جان نے کہا' انہوں نے اچھا کیا کہ یہاں سے چلے گئے۔ یہاں مفاد پرستوں کا دور دورہ ہو گا۔ جی حضوریے گھیرا ڈال لیں گے۔ نفسا نفسی ہو گی۔ آپا دھاپی چلے گی' لیکن آپ گھبرائیں

نہیں۔ یہ دور صرف ایک یا دو سال چلے گا۔

راجہ نے کہا' جناب ہم سب کے حالات خراب ہو رہے ہیں۔ ہم سب مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔

بھائی جان بولے جب مصیبت آتی ہے تو ایک فرد پر نہیں آتی' سارے گھرانے پر آتی ہے۔

تین جیل

راجہ نے کہا بھائی جان مصیبت جب بھی آتی ہے ہمارے گھرانے پر ہی آتی ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ آپ کیوں نہیں کوشش کرتے کہ شہاب کی مناسب جگہ پر تعیناتی ہو جائے۔ بھائی جان مجھے مخاطب کر کے بولے' آپ کو علم ہو گا کہ وہ کس جگہ تعیناتی چاہتے تھے۔

میں نے کہا' جناب انہوں نے اس بارے میں مجھ سے بات نہیں کی البتہ راجہ محمود آباد سے کہا تھا۔

کیا کہا تھا' بھائی جان نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا' انہوں نے جدہ کی سفارت کے لیے کہا تھا۔ راجہ محمود آباد صاحب نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔ کہنے لگا' فارن سروس میں تین مقام جیل خانے کے مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ جلال آباد' جدہ اور جکارتہ۔ جدہ کی پوسٹ جے الیس کے برابر ہے۔

پھر شہاب صاحب نے کیا کہا' بھائی جان نے پوچھا۔

شہاب نے کہا' مجھے منظور ہے۔

شہاب صاحب' جرنیل صاحب کو جی حضوریوں کی ضرورت ہے' اگر آپ جی حضوریے بننے کے لیے تیار ہیں تو جو چاہیں گے' ملے گا۔ اگر جی حضوریے بننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو جو وہ چاہیں گے اسے گوارا کرنا پڑے گا۔

ٹھیک کہتے تھے راجہ محمود آباد' بھائی جان بولے۔

بھائی جان' میں نے کہا۔ شہاب صاحب کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کہتے ہیں چڑی ہوں اور ایک نہیں دو لوں گا۔ جرنیل کو کھری کھری سناؤں گا اور جدہ کی پوسٹ بھی لوں گا۔

بھائی جان مسکرائے۔ کہنے لگے' ہمیں بھی ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

اسی شام کو راجہ شفیع آ گیا۔ وہ بہت غصے میں تھا' آتے ہی مجھ سے لڑنے لگا۔ کہنے لگا' میں بڑی مشکل سے بھائی جان کی توجہ شہاب صاحب کی تعیناتی کی جانب مبذول کرتا ہوں تاکہ وہ انہیں جدہ میں تعینات کرا دیں' لیکن تم ان کی توجہ دوسری باتوں کی طرف الجھا دیتے ہو۔ میرا کیا کرایا برباد کر دیتے ہو۔

دراصل راجہ یہ سمجھتا تھا کہ بھائی جان شہاب کے رویے کو بدلنے پر قادر ہیں۔ اس کے برعکس میں یہ سمجھتا تھا کہ بھائی جان شہاب کے پروگرام پر چلنے پر مجبور ہیں' چاہے وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔

میں نے بہت کوشش کی تھی کہ راجہ کو یہ بات سمجھاؤں' لیکن میں بری طرح سے ناکام ہوا تھا۔

راجہ شفیع دراصل رسمی قسم کا مرید تھا۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا کہ چالاکی سے بھائی جان کا رخ بدلے اور انہیں اپنی ضروریات کے مطابق استعمال کرے۔ مجھے اس کی روش پسند نہ تھی۔ اس لیے میں محسوس کرتا تھا کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ اس کے باوجود میں راجہ کے خلوص کا معترف تھا۔

فینٹیسی

شہاب کے جانے کے بعد دفعتاً" بے وجہ مجھ میں فینٹیسی کا ایک طوفان جاگ پڑا۔ تصویریں۔ فحش تصویریں' ننگی تصویریں۔

میں جوانی سے ہی فینٹیسی کی بیماری کا شکار تھا۔

جب بھی میں فارغ ہوتا تو میرے ذہن میں ایک قلم چلنے لگتا" ننگی تصویریں' ہوس سے بھرے ہوئے مناظر۔ قابل اعتراض خیالات۔ فحش سچوایشنز۔

پہلے میں اس صورت حال میں التزاماً" دلچسپی لیتا تھا۔ جب مرد قلندر اور بھائی جان سے متعارف ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ عادت میری ذہنی ناپاکیزگی کو ہوا دیتی ہے۔ میں نے بھائی جان سے بات کی۔ انہوں نے فرمایا آپ کلمہ پڑھا کریں' پھر میں نے اس کیفیت پر لاحول پڑھنا

شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد اس ذہنی بیماری میں تخفیف تو ہو گئی' لیکن اس کے باوجود بیٹھے بٹھائے کبھی کبھار دورہ پڑ جاتا۔ میں نے شہاب سے بات کی۔ اس نے کہا دورہ پڑتا ہے تو پڑنے دو۔ اسے اہمیت نہ دو۔ اہمیت دو گے تو اسے تقویت ملے گی۔

اگرچہ شہاب کا بتایا ہوا طریقہ مشکل تھا۔ اس کی نسبت لاحول پڑھنا آسان تھا۔ لیکن لاحول پڑھنے میں حفظ ماتقدم کی کیفیت تھی اور اس طرز عمل میں دورے کو خواہ مخواہ اہمیت ملتی تھی۔

بہرحال چار پانچ سال میں فینٹیسی کے دورے تقریباً" ختم ہو چکے تھے۔ لیکن ان ایام میں پتہ نہیں کیا ہوا۔ ایک دم بلا وجہ فینٹیسی کا ایک طوفان چلنے لگا۔ میں نے لاحول پڑھا۔ جتنا لاحول پڑھتا اتنا ہی طوفان تیز ہوتا۔ پھر میں نے اس اگنور کرنے کی کوشش کی' لیکن عبث۔

میں بھائی جان کے گھر کی طرف بھاگا۔ وہاں مکان پر تالہ لگا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ ان کی بیوی بیمار ہے اور ہسپتال میں داخل ہے۔

پھر میں راجہ شفیع کی طرف چل پڑا۔

راجہ غیر از معمول ترنگ میں تھا۔

میں نے کہا راجہ تجھے کیا ہوا۔

بولا' سب چوپٹ ہو گیا۔

کیا مطلب۔

بولا' ایز یو ور۔ میں اپنی اصلیت کی طرف مڑ گیا ہوں۔ سارا دن تاش کھیلتا ہوں۔ سٹیکس کے ساتھ۔

منہ زبانی نہیں۔ پچھلے ہفتے پانچ سو جیتے۔

ارے میں چلایا' تمہاری زبان میں لکنت کیوں ہے۔

ایک چسکی لی ہے۔ تم لو گے۔ وہ مڑا الماری کا پٹ کھولا اور بوتل نکال کر میز پر رکھ دی۔ ایک گھونٹ پی لو۔ وہ بولا' پھر چوبارے پر جا کر گانا سنیں گے۔

وہاں میری ایک پرانی سہیلی رہتی ہے۔

راجہ شفیع سے بات کرنا بے کار تھا۔ اس کی تو اپنی چرخی الٹی چل گئی تھی۔

تنگ دستی

ادھر قدرت کے متعلق بڑی پریشان کن خبریں آ رہی تھی تھیں۔ وہ لندن کے مضافات میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہائش پذیر تھا۔ تنخواہ بند ہو چکی تھی۔ استعفےٰ منظور نہیں کیا گیا تھا۔ پنشن کی ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ کوئی بنک اکاؤنٹ نہ تھا۔ یونیسکو کے ماہانہ اجلاس کے الاؤنس پر گزر بسر کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ الاؤنس بہت کم تھا۔

قدرت اللہ کا چھوٹا بھائی حبیب شہاب جو سٹیٹ بینک میں پبلک ریلیشنز کا ڈائریکٹر تھا۔ ان دنوں قدرت سے ملنے کے لیے لندن گیا تھا اس کے بیان کے مطابق:

> قدرت اس کی بیوی ڈاکٹر عفت اور بیٹا ثاقب اس چھوٹے سے گاؤں میں کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ صبح ناشتے پر ایک سوکھا ٹوسٹ۔ دوپہر کے کھانے پر ایک تازہ ٹوسٹ چائے میں بھگو کر اور رات کو ایک ٹوسٹ آملیٹ کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ ان کے ساتھ کئی ایک روز رہنے کے بعد جب میں واپس آیا تو مجھے کھانے سے کوئی رغبت نہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دل اور پیٹ میں کانچ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو۔ کیوں کہ کئی تکلیف وہ منظر دل و دماغ پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔
>
> سات سالہ ثاقب پیدل یا بائیسکل پر سکول جاتا تھا۔ سکول جاتے آتے بار بار اس کا سائیکل برف میں پھنس جاتا تھا۔
>
> برف و باراں میں قدرت کا پیدل سفر۔ خود سودا لاتا۔ لائبریری جاتا۔ کمیٹی کے تلکے پر کپڑے دھوتا۔
>
> عفت کی پریشان حالی، بے بسی، آبدیدہ آنکھیں، گرتی ہوئی صحت۔ ان سب مصائب کے باوجود قدرت کی گفتگو میں نہ تو تلخی تھی اور نہ اس نے کبھی کسی کے روبرو ان مصائب کا رونا رویا تھا۔

حبیب شہاب

حبیب شہاب طبعاً قدرت اللہ سے مختلف تھا۔ وہ ایک جرنلسٹ تھا۔ سوشل تھا۔ بات

چیت کرنے کا دلدادہ' میل جول کا شوقین۔ قدرت کی طرح وہ انٹرو ورٹ نہیں تھا' بلکہ ایکسٹروورٹ تھا۔ قدرت کی پر اسرار زندگی کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے اسے راز دان کا رول ادا کرنا پڑا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے بیانات میں بہت محتاط ہے۔ بہرحال اسے اپنے بڑے بھائی کے کردار کی عظمت کا شدت سے احساس ہے اس مضمون میں جو اشفاق احمد نے اپنی کتاب ذکر شہاب میں شائع کیا ہے۔ اپنے بڑے بھائی کے متعلق حبیب لکھتا ہے کہ:۔

> یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا عظیم انسان نہیں دیکھا جس نے ہمیشہ ضبط اور کسر نفسی سے کام لیا' جسے اللہ نے ذہانت اور دیانت کی خوبیوں سے نوازا۔ جو غریبوں کا دوست رہا' جو عزیز و اقارب و دوست احباب کے لیے شفقت' محبت اور خلوص کی دولت سے مالا مال تھا۔ قدرت کی ذات کی یہ صفات بچپن ہی سے آشکار تھیں۔ بچپن ہی سے اپنے ہم عمروں میں منفرد نظر آتا تھا۔

اس کے بعد پتہ چلا کہ جنرل یحییٰ نے کچھ فوجی افسروں کو لندن بھیجا ہے تاکہ وہ قدرت اللہ کو گرفتار کر کے پاکستان لائیں اور اگر یہ پروجیکٹ ممکن نہ ہو تو اس کے بیٹے کو اغوا کر لیں' تاکہ وہ پاکستان آنے پر مجبور ہو جائے۔

یہ خبر قدرت اللہ تک پہنچ گئی چوں کہ لندن کے سرکاری حلقوں میں اس کے خیر خواہ بھی موجود تھے۔ قدرت کی گرفتاری کا امکان اس قدر تکلیف دہ نہ تھا جتنا ثاقب کا اغوا۔ ماں کو پتہ چلا تو وہ غم و غصے سے دیوانی ہو گئی۔ ثاقب سکول جاتا تو وہ دروازے میں کھڑی رہتی۔ قدرت باہر نکلتا تو فکر دامن گیر ہو جاتا۔ اللہ خیر کرے خیریت سے واپس آ جائیں۔

حبیب اور قدرت کے تعلقات عجیب سے تھے۔ قدرت کو کوئی تکلیف پہنچنے والی ہوتی تو حبیب پر اک بے نام بے چینی طاری ہو جاتی تھی۔ اور قدرت کی جانب اٹھ بھاگتا۔ کٹک کے ہانٹڈ ہاؤس میں جب قدرت بدروحوں کے گھیرے میں پھنس گیا تھا۔ تو قدرت نے حبیب کو بلایا نہیں تھا۔ حبیب از خود وہاں پہنچ گیا تھا۔ لندن میں جب قدرت تنگ دستی کا شکار ہوا تھا۔ تو حبیب از خود وہاں پہنچ گیا تھا۔

ایک روز میں نے قدرت سے پوچھا۔ میں نے کہا' یہ کیا اسرار ہے کہ جب آپ کسی مشکل

سے دو چار ہوتے ہیں تو حبیب کو پتہ چل جاتا ہے اور آپ کی طرف اٹھ بھاگتا ہے۔

وہ مسکرایا بولا' حبیب اور میرے درمیان ایک عجیب تعلق ہے۔ میرے دکھ اور تکلیفیں حبیب کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔

قدرت نے کہا' وہ ہر مشکل میں میرے کام آتا ہے۔

بچپن میں جب ہم گلگت میں گورنر گھر میں رہتے تھے' ان دنوں مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہاں چھوٹی چھوٹی کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ میں روز ایک کتاب کرائے پر لیتا تھا۔ حبیب اور میں دونوں گھر سے اپنے اپنے بستے اٹھا کر سکول کے لیے نکلتے آوٹ ہاؤسز میں چند ایک کوٹھڑیاں خالی پڑی تھیں۔ سکول میں جانے کے بجائے میں ایک کوٹھڑی میں گھس جاتا۔ حبیب سے کہتا کہ تو کوٹھڑی کی باہر سے کنڈی لگا دے۔ میں وہاں سارا دن کتاب پڑھتا رہتا' جب حبیب سکول سے واپس آتا تو کنڈی کھول کر مجھے باہر نکالتا اور پھر ہم دونوں بستے اٹھائے گھر میں یوں داخل ہوتے جیسے سکول سے آئے ہوں۔ کہنے لگا' میں نے حبیب کو دھونس دے رکھی تھی کہ اگر تو نے راز فاش کیا تو کے مار مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گا۔

میں نے کہا' شہاب صاحب یہ بتائیے کہ جب آپ کٹک میں ہانٹڈ ہاؤس کے بدارواح کی وجہ سے سخت پریشان تھے تو کیا حبیب کو آپ نے بلایا تھا یا وہ از خود آگیا تھا۔

از خود آگیا تھا' اس نے جواب دیا۔

پابند

میں نے کہا شہاب صاحب آپ نے جو کٹک کے ہانٹڈ ہاؤس کا نقشہ کھینچا ہے وہ عام ہانٹڈ ہاؤس سے بہت مختلف ہے میں نے بھی چند ایک ہانٹڈ ہاؤس دیکھے ہیں' بلکہ بٹالے میں ہمارے محلے میں کئی ایک مقامات ہانٹڈ تھے۔ ہانٹڈ ہاؤس میں عجیب نوعیت کے واقعات ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ کیلا چھیلو تو اندر سے ریت برآمد ہو۔ ہانٹڈ ہاؤس میں ڈاکیہ آسکتا ہے' لیکن وہ ہڈیوں کا پنجر نہیں بنتا۔

شہاب صاحب ہانٹڈ ہاؤس کا یہ واقعہ اکثر سنایا کرتے تھے' لیکن ہر بار تفصیلات میں فرق پڑ جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ جھوٹ بولتے تھے بلکہ یہ کہ پورا سچ بیان نہیں کرتے

تھے۔ کسی کو راولپنڈی سے روات تک کی تفصیلات بتاتے تھے' کسی کو گجر خان تک۔ وہ پوری بات اس لیے نہیں بتاتے تھے کہ لوگوں کو اس راز کا پتہ نہ چل جائے جو ان کی شخصیت اور زندگی کو احاطہ کیے ہوئے تھا۔ شہاب نامہ کے آخری باب میں انہوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ ۳۶ سال انہیں نائینٹی کی جانب سے ہدایات موصول ہوتی رہیں۔

قدرتؒ اللہ نے ان ہدایات کی نوعیت کو بھی چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ ہدایات اویسیہ سلسلے کی تعلیم سے متعلق تھیں۔ بات بیٹھتی نہیں' اس لیے کہ کسی سلسلے کی تعلیم اتنی طویل نہیں ہوتی کہ ۳۶ سال ہدایات ملتی رہیں۔

پاکستان ٹائمز کے شبیر شاہ نے بالکل سچ کہا تھا کہنے لگا'

مفتی میرا تو ذہن خراب ہو گیا ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

میں نے کہا' کون سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

وہ بولا' تیرے شہاب کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ شخص بارہ داری کی مصداق ہے۔ دروازے کھلے ہیں' لیکن اندر جانا ممکن نہیں۔

شبیر شاہ نے کہا' وہ میری باتیں بڑے غور سے سنتا ہے مجھ سے ہر بات پر اتفاق کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں دیکھئے شہاب صاحب یہ مفاد پوست جی حضور یے صدر کے ارد گرد گھیرا تنگ کیے جا رہے ہیں۔ دونوں سپر پاورز آپ کے حق میں نہیں ہیں روس آپ کو امریکی ایجنٹ سمجھتا ہے۔ امریکہ آپ کو کیمونسٹ سمجھتا ہے۔ یہ سب لوگ مل کر کوشش کریں گے کہ آپ کو صدر ایوب سے کاٹ دیں۔ آپ پر لازم ہے کہ آپ ان کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیں۔

مفتی' قدرت اللہ شہاب کو ان باتوں کا احساس ہے۔ اس کے باوجود وہ صدر کے لیے' ملک کے لیے اور اپنے تحفظ کے لیے عملی طور پر کچھ نہیں کر رہا۔ کیا یہ حیران کن بات نہیں ہے۔

اگر اس وقت مجھے یہ علم ہوتا کہ وہ ان ہدایات کا پابند ہے' جو اس کے بیان کے مطابق ۳۶ سال نائینٹی اسے دیتا رہا تو میں شبیر شاہ کو مطمئن کر دیتا اور خود بھی مزید کرید کی کوشش نہ کرتا' لیکن یہ بات مجھے شہاب نامے کے آخری باب کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوئی' جب قدرت وفات پا چکا تھا۔

یہ سچ ہے کہ میں نے قدرت کو چار ایک ہدایات نامے موصول کرتے ہوئے خود دیکھا تھا'

لیکن مجھے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ سراسر ہدایت ناموں کا پابند ہے۔

خیرو شر کی جنگ

ایک روز جب شہاب چھلکن کے عالم میں تھا تو اس نے مجھے بانٹڈ ہاؤس کے متعلق ایک نئی تفصیل سنائی۔ کہنے لگا' میں نے شدت سے محسوس کیا کہ بلا کی روح کو چین نصیب نہ ہو گا جب تک اس کی ہڈیاں جلا کر گنگا میں نہ بہائی جائیں۔ اس لیے ہم سب نے مل کر کمرے کے اس کونے کو کھودنے کے انتظامات کیے' جہاں بلا دفن کی گئی تھی۔ ہم نے گڑھا کھودا اور اس کی ہڈیاں نکال کر گڑھا بند کر دیا اور پھر اس پر سیمنٹ لگا دیا۔

اس بات کی خبر ہندو جادو گروں نے میرے افسر کو دی۔ اس نے فوراً" میرے افسران بالا کو رپورٹ دی کہ قدرت اللہ نے ایک ہندو لڑکی کو قتل کر کے کمرے کے اندر ہی گڑھا کھود کر دفن کر دیا ہے۔ اس نے افسران بالا کو مشورہ دیا کہ فوراً" پولیس کو حکم دیا جائے کہ کوٹھی کو گھیرے میں لے لے اور کوئی افسر اس بات کی تحقیق کرے کہ کمرے کو کھودا گیا ہے یا نہیں۔

شہاب نے کہا' جب پولیس آئی تو میرا دل بری طرح سے دھک دھک کر رہا تھا۔ میں اللہ سے دعا مانگتا تھا کہ یا اللہ تو ہی لاج رکھنے والا ہے مجھے ڈر تھا کہ جب وہ کمرے کی دری کو اٹھائیں گے تو نیچے تازہ سیمنٹ ہو گا۔ اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔

شہاب نے بتایا کہ پھر ایک معجزا رونما ہوا جسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

پولیس نے دری اٹھائی تو سیمنٹ خشک تھا جیسے سالوں پہلے کا لگا ہوا ہو۔

میں نے کہا شہاب صاحب ظاہر ہے کہ یہ کہانی بانٹڈ ہاؤس کی نہیں۔ یہ تو خیرو شیر کی جنگ معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف ہندو جادو گر تھے دوسری طرف خیر کی طاقتیں تھیں۔

شاید ایسا ہی ہو' وہ بولا۔

شاید شہاب نے اس واقعہ کو خیرو شر کی جنگ کی شکل اس لیے نہ دی کہ وہ ڈرتا تھا کہ لوگ پوچھیں گے کہ خیر کی طاقتوں نے قدرت اللہ کا ساتھ کیوں دیا۔ اس سے بھید کھلنے کا خطرہ تھا۔

اگرچہ حبیب شہاب ۔ قدرت کا راز دان تھا۔ اس نے ہانٹڈ ہاؤس کے کوائف دیکھے تھے۔ اس نے نائنیٹی کے خطوط بھی دیکھے ہوں گے' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حبیب شہاب کو بھی

اس راز کا علم نہ تھا جو قدرت کی زندگی کا محور تھا۔ جزو اعظم تھا۔

جب حبیب بانٹڈ ہاؤس میں گیا تھا تو اس کے ساتھ اس کی بھابی ہیڈی شہاب بھی تھیں ہیڈی ایک جرمن خاتون تھیں جو قدرت کے بڑے مرحوم بھائی کی بیوہ تھیں۔ حبیب کا بیان ہے کہ اس کی بھابی ہیڈی نے ۱۸ سول لائینز کے بانٹڈ ہاؤس میں جو واقعات دیکھے ان کا اس پر اس قدر شدت سے اثر ہوا کہ وہ روحانی دنیا کی قائل ہو گئیں۔ کلام کی عظمت ان پر اس شدت سے آشکار ہوئی کہ وہ عابدہ بن گئیں۔ آج بھی وہ حبیب کے گھر میں رہتی ہیں اور ان کا شغل صرف اور صرف عبادت ہے۔

نائینٹی

حبیب شہاب اپنے مضمون میں نائینٹی کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

> پھر نائینٹی کے نام سے ایک پراسرار شخصیت برسوں تک مسلسل قدرت اللہ کی رہنمائی کرتی رہی۔ رہنمائی کا یہ عجیب و غریب طریقہ بھی قدرت جیسے روشن ضمیر اور راہ حق کے متلاشی کے ساتھ ہی پیش آ سکتا تھا۔ نائینٹی کے پیغامات کی تحصیل و ترسیل سے میں بھی کئی طرح سے مستفید ہوا۔
>
> یہ ذکر ایک دوست کے سامنے چل نکلا انہوں نے کچھ گستاخی کے کلمات استعمال کیے فوراً ہی بجلی کا بلب دھماکے سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قدرت اللہ نے نائینٹی کی شخصیت پر پردہ کیوں ڈالا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے قدرت اللہ خوف زدہ تھا کہ اگر میں نے ان صاحب کا نام لے دیا تو لوگ کہیں اتنے بڑے بزرگ اس کی راہ بری پر مامور ہوئے تھے۔ قدرت اللہ کون تھا۔ اس بھید کو کھولنے سے احساس تفاخر پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ قدرت اللہ کو ہر بات گوارا تھی ماسوائے اس بات کے جو اس کے عجز کی دولت کو لوٹ لے۔

اس نے مجھے حکم دے رکھا تھا کہ اپنی تحریروں میں دو بزرگوں کے بارے میں کبھی بات نہ

کرنل۔ ایک حضرت بختیار کاکی" اور دوسرے جناب مہاجر مکی" صاحب۔

جن دنوں میرا مضمون "حج بیت اللہ" سیارہ ڈائجسٹ میں قسط وار چھپ رہا تھا تو اتفاق سے ایک قسط کے مسودے پر قدرت کی نظر پڑ گئی۔ اس نے وہ قسط بڑے غور سے پڑھی اور اس میں سے پانچ صفحے کاٹ دیئے اور پھر مجھ سے کہنے لگا' از راہ کرم اپنی تحریروں میں ان دو بزرگوں کا ذکر نہ کیا کریں۔

کیوں نہ کیا کروں' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' کہیں آپ بے ادبی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔

میں نے کہا' یہ کیسے ہو سکتا ہے شہاب صاحب میرے دل میں ان بزرگوں کی بے پناہ عزت ہے۔

وہ بولا' ٹھیک ہے' لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے بے تکلفانہ انداز میں کوئی ایسی بات لکھ دیں جو ناگوار خاطر ہو۔

ہاں تو بات قدرت اللہ شہاب کی زندگی کے اس دور کی ہو رہی تھی جب وہ لندن کے ایک مضافاتی گاؤں میں تنگ دستی اور خوف و ہراس میں وقت کاٹ رہا تھا۔

اس کے خطوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ تنگ دستی فاقوں کی سرحد چھونے لگی تھی۔ یا ثاقب کے اغوا کے خوف و ہراس کی وجہ سے نیندیں اڑ گئی تھیں۔ قدرت اللہ میں غیر معمولی طاقت ضبط تھی۔ وہ تینوں ماں باپ بیٹا بظاہر یوں زندگی گزار رہے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

محمود ہاشمی

میں نے اپنے ایک دوست محمود ہاشمی کو خط لکھا کہ قدرت اللہ کا اتا پتا لگائے۔

محمود ہاشمی میرا بہت پرانا دوست تھا۔

تقسیم سے پہلے جب میں گوجرہ کے ہائی سکول میں ٹیچر تھا تو وہاں میرے ایک ہم کار تھے۔ خلیل ان کا نام تھا۔ وہ عربی ماسٹر تھے۔ ان دنوں محمود ہاشمی ان کے گھر میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ ایک خوبصورت' ہنس مکھ لیکن خاموش نوجوان تھا۔

ان دنوں ہم تین چار دوستوں نے مل کر ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ یہ مکان اسی گلی

میں واقعہ تھا جس میں خلیل کا مکان تھا۔

خلیل کی بیوی صراط مستقیم کی قائل تھی اور طبیعت کی جابر تھی۔ اگر خلیل سے کوئی ملنے جاتا اور دیر تک ان کی بیٹھک میں بیٹھ رہتا تو وہ ہاون دستے کی منگلی یا کوئی بڑا سا پتھر بیٹھک کے دروازے پر زور سے دے مارتی اور چلا کر کہتی' تو نے ابھی بازار سے سودا لانا ہے۔ اس پر خلیل جی اچھا کہہ کر مہمان سے معذرت کر کے بیگم کی خدمت میں حاضر ہو جاتا' خلیل میں بلا کا تحمل تھا' مٹھاس تھی۔ محمود اس گھر میں پرورش پا رہا تھا۔ اس لیے ڈرا ڈرا سہا ہوا نوجوان تھا۔

خلیل کی بیگم کو ہمارے ڈیرے سے بیر تھا۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ ہمارا ڈیرا چھڑوں کا ڈیرا تھا اور ہمارے طور طریقے شریفانہ نہ تھے۔

واقعی ہمارے طور طریقے شریفانہ نہ تھے۔ ہم سارا دن تاش کھیلتے رہتے تھے۔ گیت گاتے تھے اور اپنے ہیڈ ماسٹر کے خلاف سازش میں مصروف رہتے تھے۔

خلیل اور محمود کو اجازت نہ تھی کہ وہ ہم سے ملیں۔ وہ چوری چوری ہم سے ملا کرتے تھے۔ خلیل نماز کے بہانے گھر سے نکلتا۔ اس کی بیوی دوروازے کے پردے سے دیکھتی رہتی کہ کدھر جاتا ہے۔ ہمارا مکان گلی کے کونے پر تھا۔ خلیل ہمارے مکان سے گزر کر موڑ مڑ جاتا۔ موڑ پر کچھ دیر رک کر انتظار کرتا جب اسے یقین ہو جاتا کہ بیگم مطمئن ہو کر اندر چلی گئی ہو گی تو وہ دبے پاؤں لوٹتا اور ہمارے مکان میں داخل ہو جاتا۔ محمود بھی ایسے ہی کیا کرتا تھا۔

ہم بار بار خلیل سے تقاضا کیا کرتے کہ بھائی ہمیں گھر کا پکا ہوا کھانا کھلا۔ ہمارے تقاضے بڑھ جاتے تو وہ بیوی سے کہتا کہ مسجد میں دو درویش مسافر آئے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے کھانا پکا دے۔ درویشوں کے لیے کھانا پکانے کے لیے وہ فوراً" تیار ہو جاتی تھی۔ کھانا تیار ہو جاتا تو اسے ٹرے میں لگا کر وہ محمود کو دیتی کہ سیدھا مسجد کو جانا اور درویشوں کو کھانا کھلانا۔ محمود ٹرے اٹھائے آتا تو وہ دروازے میں کھڑی ہو کر دیکھتی رہتی۔ جب محمود ہمارے مکان سے گزر کر موڑ مڑ جاتا تو وہ مطمئن ہو کر اندر چلی جاتی اور محمود ڈرتا ڈرتا ہمارے مکان میں آ داخل ہوتا اور ہم بڑے جوش و خروش سے ضیافت اڑاتے۔ اس وقت محمود کہتا' اگر انہوں نے آپ کا شور و غل سن لیا اور انہیں شک پڑ گیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے۔

تقسیم کے بعد بھی محمود مجھے لاہور میں گاہے گاہے ملتا رہا تھا۔

پھر وہ مصنف بن گیا۔ اس نے ایک کتاب لکھی۔ "کشمیر اداس ہے"۔

اس کتاب کی اشاعت پر وہ محمود ہاشمی بن گیا۔ محمود میں بڑی ادبی صلاحیتیں تھیں' لیکن ادب کی طرف اس کی توجہ نہ رہی۔

قدرت اللہ سے محمود ہاشمی کے تعلقات اس کتاب کی وجہ سے قائم ہو گئے تھے۔

پھر جب شہاب آزاد کشمیر میں جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا تو اسے انٹیلی جنس کی جانب سے ایک خط موصول ہوا کہ دو کشمیری ایجنٹ مقبوضہ کشمیر کی سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے والے ہیں۔ آپ سرحد پر نگران کھڑے کردیں۔ جونہی وہ داخل ہوں۔ انہیں گرفتار کر لیا جائے۔

سکون ہی سکون

یہ دونوں نوجوان محمود ہاشمی اور یوسف بچ تھے۔

قدرت اللہ انہیں گرفتار کرنے کی بجائے اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔ چند ایک روز انہوں نے قدرت کے ساتھ قیام کیا۔ قدرت کہا کرتا تھا۔ ان دونوں نوجوانوں کے آنے سے رونق ہو گئی۔ ساری ساری رات ادبی مسائل پر بحثیں ہوتیں' گپیں چلتی۔ قدرت کو ان سے ایک شکایت بھی تھی۔ کہتا تھا ایسے ست الوجود تھے کہ چائے بنانے کے لئے سٹور سے لکڑی لانا گوارا نہ کرتے تھے۔ میری سرکاری فائلوں کو جلا کر چائے بنا لیتے تھے۔

اس کے بعد محمود ہاشمی لندن چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک سری لنکن خاتون سے شادی کر لی اور ایک درسگاہ میں اردو پڑھانے لگا۔

شہاب کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے محمود ہاشمی بہت موزوں شخص تھا۔ اس کے شہاب سے بھی مراسم تھے اور میرا تو پرانا دوست تھا۔

میں نے محمود کو خط لکھا کہ شہاب سے جا کر مل اور پتہ لگا کہ وہ کس حال میں ہیں۔

اس نے مجھے جواب میں لکھا کہ میں دو ایک بار پہلے بھی شہاب سے مل چکا ہوں' اب پھر گیا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سے گاؤں میں چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں اور اس گھر میں اطمینان سکون راضی بارضا کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ وہ اسی خوش اخلاقی سے ملتے ہیں۔ ان کے اندر کا بھید کسی

نے نہیں پایا۔ میں نے کئی بار کوشش کی تھی کہ شلب سے مکمل مل جاؤں' لیکن میں نے محسوس کیا کہ تیل اور پانی کا ملاپ ہے۔ ایک گلاس میں دونوں اکٹھے ہو بھی جائیں تو بھی تیل تیل رہتا ہے اور پانی پانی۔

اڑتالیسواں باب

صیہونی جادو

قدرت اللہ شہاب نے شہاب نامے میں اسرائیل کے دورے کے خفیہ مشن کی روئیداد سرسری طور پر بیان کی ہے' لیکن اس نے اسرائیلی جادو کا ذکر نہیں کیا۔

شہاب نامے میں کہا ہے کہ جب اسرائیل نے فلسطینی علاقے پر قبضہ کر لیا تو یونیسکو نے اس پر عاید کر دیا کہ وہ فلسطینی بچوں کو ان کی مذہبی تعلیم سے محروم نہ کریں۔ فلسطینی اساتذہ انہیں تعلیم دیں اور وہ کتابیں سکولوں میں پڑھائی جائیں' جو یونیسکو میں سے منظور شدہ ہوں۔

اسلام دشمنی

اسرائیل نے حامی تو بھر لی لیکن عملی طور پر اس کی خلاف ورزی کی۔ انہوں نے فلسطینی اساتذہ کو تنخواہیں دے کر گھروں میں بٹھا دیا اور یونیسکو کی منظور شدہ کتابوں کی بجائے ایسی کتابیں رائج کر دیں جن میں اسلام' سیرت مبارکہ اور عربی تاریخ و ثقافت کے خلاف گمراہ کن پراپے گنڈا رقم تھا۔ مثلاً" یونیسکو کی منظور شدہ کتاب میں THE HOLY PROPHET OF ISLAM لکھا ہوتا جسے اسرائیلی اپنی کتابوں میں THE FALSE PROPHET OF ISLAM میں بدل دیتے تھے۔

عربوں کو اسرائیل کی اس چال کا پتہ چل گیا۔ انہوں نے یونیسکو کو رپورٹ دی' لیکن جب بھی یونیسکو کی انکوائری پارٹی اسرائیل جاتی تو اسرائیلیے فلسطینی اساتذہ کو بلا لیتے اور سکولوں سے اپنی کتابیں نکال لیتے اور یونیسکو کی منظور شدہ کتابیں بچوں میں بانٹ دیتے۔

یونیسکو کا ادارہ سمجھتا تھا کہ عربوں کی شکایت تعصب پر مبنی ہے۔

اس صورت حال میں عربوں نے قدرت اللہ شہاب سے درخواست کی کہ وہ اسرائیل کا خفیہ دورہ کرے اور اس بات کا ایسا ثبوت لے آئے کہ یونیسکو کو یقین آجائے کہ عربوں کی شکایات دوست ہیں۔

شہاب نامے میں اس خفیہ دورے کی تفصیلات موجود ہیں۔

بہرصورت قدرت اللہ نے اسرائیل میں دو کام کیے۔

ا۔ یونیسکو کے لیے تعلیمی ثبوت حاصل کیے۔

۲۔ اور ایک رات مسجد اقصیٰ میں تن تنہا بسر کی۔

مسجد اقصیٰ

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ میں ایک رات بسر کرنے کے لیے اسرائیل گیا تھا۔ تعلیم سے متعلقہ ثبوت حاصل کرنے کے کام نے اسے موقعہ فراہم کیا۔

اگر اس کا مقصد تعلیمی ثبوت حاصل کرنا ہوتا تو اسرائیل ان سے اس قدر خوفناک انتقام نہ لیتا اور قدرت دو سال کے لیے صیہونی جادو کے زیر اثر ایک اپاہج بدبو دار گوشت کا لوتھڑا نہ بنا رہتا اور جب پاکستان واپس آتا تو آدھا آدمی نہ ہوتا۔

شہاب نامہ میں قدرت لکھتا ہے کہ میں مسجد اقصیٰ میں صرف اس لیے گیا تھا کہ وہاں رات بھر سو کر اپنی نیند پوری کر سکوں۔ یہ بات قابل یقین نہیں ہے تن تنہا ایک عظیم الشان پُرہیبت مسجد میں جو ہمارا قبلہ اول ہے سونے کی غرض سے جانا۔ میری عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔ اس بارے میں شہاب کا اپنا بیان ہے کہ۔

> قبلہ اول کی چار دیواری کے اندر جب میں اکیلا رہ گیا تو تاریخ اور تقدس کے مہیب سناٹے نے مجھے سر سے پاؤں تک غڑاپ سے نگل لیا۔ مجھے

یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی پاکیزہ شیش محل میں ایک کتا غلطی سے بند ہو گیا ہے۔ لرزے کے بخار کی طرح میرے تن بدن پر کپکپی طاری ہو گئی اور دانت بے اختیار کٹ کٹ بجنے لگے۔ مرگی کے مریض کی مانند تشنج میں گرفتار ہو کر آنا" فانا" لڑھکتا ہوا میں ایک ایسی ٹائم ٹنل میں جا گرا جہاں پر نسل انسانی کی ہزاروں سال کی خوابیدہ تاریخ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی اور کہکشاں کی طرح جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی شاہراہوں پر بڑے بڑے ذی شان پیغمبروں کے قدموں کی خاک سے نور کے چشمے پھوٹنے لگے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پھر اللہ کے آخری نبی خاتم النبین رحمت اللعالمین حضرت محمد ﷺ جنہیں اللہ کی پاک ذات شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی تھی تاکہ ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھائے۔

اسی مسجد میں فرش سے عرش تک نوری فرشتوں نے وہ راستہ منور کر دیا جس پر نبوت کا سفر اختیار کر کے حضور ﷺ نے رسالت کی معراج کو پایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کے قریب جنت الماویٰ ہے۔ جب اس سدرۃ المنتہیٰ کو لپٹ رہی تھی۔ جو چیزیں لپٹ رہی تھیں نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائب دیکھے۔

خبر نہیں وہ وصال کی گھڑی تھی یا فراق کا لمحہ کہ عین اس وقت فضا میں اذان کی آواز گونجی اور بچپن میں کہیں پڑھا ہوا یہ پرانا شعر مجھے بے اختیار یاد آ گیا۔

خدا سمجھے موذن سے کہ ٹوکا عین عشرت میں
چھری مجھ پر چلا دی نعرہ اللہ ہو اکبر سے

جس شخص کے مسجد اقصیٰ کے متعلق یہ جذبات ہیں جو مندرجہ بالا کوٹیشن میں پیش کیے گئے ہیں۔ وہ وہاں سونے کے لیے نہیں جائے گا۔

بھید نہ کھلے

گمان غالب ہے کہ اسرائیلی راہبوں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ کوئی شخص مسجد اقصیٰ میں ایسا عمل کر گیا ہے، جو اسرائیل کے لیے تباہی کا باعث ہو گا۔ اس لیے اسرائیلی جادو قدرت اللہ کے خلاف حرکت میں آ گیا۔

میری دانست میں تعلیمی نصاب کا مسئلہ اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا چونکہ یونیسکو زیادہ سے زیادہ حکم جاری کر سکتا تھا لیکن اسرائیل کو اس پر عمل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

تعلیمی مسئلہ اس قدرت اہم نہ تھا کہ اسرائیل قدرت اللہ کو خوف ناک جادو کی گرفت میں جکڑ لیتا۔

پھر یہ بھی ہے کہ قدرت اللہ نے شہاب نامے میں اسرائیلی جادو کا تذکرہ کیوں نہ کیا حالاں کہ یہ قدرت اللہ کی زندگی کا المناک ترین واقعہ تھا۔ اسرائیلی جادو کی وجہ سے جب وہ وطن واپس لوٹا تو وہ آدھا آدمی تھا اور اسرئیلی جادو کی وجہ سے ڈاکٹر عفت فوت ہوئیں۔

میرا اندازہ ہے کہ قدرت اللہ نے شہاب نامے میں اس کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا کہ کہیں یہ بھید نہ کھل جائے کہ مسجد اقصیٰ میں اس رات کے دوران میں اس نے کیا عمل کیا اور یہ بھی کہ اس کے اسرائیلی دورے کا بنیادی مقصد مسجد اقصیٰ میں وہ عمل کرنا تھا۔

صرف میں ہی ان خیالات کا حامل نہیں ہوں اور لوگ بھی ہیں جنہیں قدرت اللہ کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا اور وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذکر شہاب میں ذوالفقار احمد تابش اپنے مضمون قدرت اللہ شہاب میں لکھتے ہیں کہ:

ذوالفقار تابش

> مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے شہاب نامہ کے کئی اہم واقعات زیادہ تفصیل سے شہاب صاحب کی زبانی سنے ہیں اور میں بعض ایسے واقعات کا بھی سامع ہوں جو انہوں نے اپنی طبیعت اپنے مزاج اور اپنی افتاد طبع کے باعث شہاب نامے میں تحریر نہیں کیے مثلاً انہوں نے

شہاب نامہ میں ان صوفیوں اور اہل اللہ کا بہت ہی کم ذکر کیا ہے' جن سے یورپ میں ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔

انہوں نے اپنے خفیہ دورہ اسرائیل کی اصل غرض وغایت بیان نہیں کی۔

انہوں نے نہیں بتایا کہ ان کی بیوی ڈاکٹر عفت کی علالت کا اصل باعث کیا تھا اور یہ کہ علالت کے دوران عفت نے کس حیرت انگیز قوت برداشت' صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا تھا۔ مرض الموت میں انہوں نے کس طرح انگلستان کے ڈاکٹروں کو حیران کیا کہ ان کے ڈاکٹر انہیں WONDER LADY کہنے لگے تھے۔

شہاب صاحب نے اپنی کتاب میں یہ نہیں بتایا کہ دورہ اسرائیل کے بعد صیہونی ایجنٹوں نے کس طرح ان کا تعاقب کیا' ان پر تشدد کیا اور انہیں ایسی بیماریوں میں مبتلا کر دیا جن کے ساتھ انہیں باقی زندگی ایک مسلسل اذیت کے ساتھ گزارنی پڑی۔

شہاب صاحب نے اپنی آپ بیتی میں یہ بھی نہیں بتایا کہ پاکستان اور بیرون پاکستان کن روحانی ہستیوں سے ان کا ربط خاص تھا اور اس ربط کی نوعیت اور غایت کیا تھی۔

حجاب

یہ سب باتیں وہ کیوں ضبط تحریر میں نہیں لائے۔

میرا خیال ہے کہ شہاب صاحب اپنی ذات اور شخصیت کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کا باعث ان کی ذات کا انکسار اور خود شناسی کا احساس تھا۔

انہیں اپنی ذات کا بول بالا کرنے کا مطلق شوق نہ تھا۔ وہ ہر اس بات سے گریز کرتے تھے جو انہیں دوسروں میں نمایاں یا ممتاز کر سکتی ہو۔ وہ حجاب کے آدمی تھے اور حجاب میں رہنا انہیں اچھا لگتا تھا۔

چنانچہ شہاب نامہ میں ان کا لہجہ بڑا مودب' انکسار بھرا بلکہ معذرت خواہانہ سا ہے۔

وہ دوسروں کی تعریف اور توصیف اور ان کا کردار بیان کرنے پر تو خوب زور قلم دکھاتے ہیں' لیکن جونہی کوئی ایسا واقعہ سامنے آیا جس میں ان کی اپنی ذات کی کوئی برائی یا صفت ظاہر ہوتی ہو تو وہ طرح دے جاتے ہیں یا بہت ہی سپاٹ لہجے میں اسے بیان کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

شہاب نامہ میں انہوں نے جہاں اپنے خفیہ دورہ اسرائیل کا احوال بیان کیا ہے ان کا انداز بیاں قدرے دبا دبا ہے' جیسے انہیں یہ فکر دامن گیر ہو کہ ان کی بڑائی ظاہر نہ ہو جائے۔

پھر وہ ہمیں یہ بھی نہیں بتاتے کہ دورہ اسرائیل میں انہوں نے جو ایک شب مسجد اقصیٰ میں گزاری تھی' اس کا اصل مقصد کیا تھا۔

لفٹ

ان دنوں یونیسکو کی میٹنگ میں شرکت کے لیے قدرت اللہ کو پیرس میں رکنا پڑتا تھا۔ بڑی محنت کے بعد قدرت نے پیرس کے کسی کونے میں ایک چھوٹا سا گمنام ہوٹل ڈھونڈ نکالا تھا جس میں ایک چھوٹا سا کمرہ موجود تھا جس کا کرایہ بہت کم تھا۔

چوں کہ وہ دن بڑی تنگ دستی کے دن تھے۔ سارے گھر کا خرچہ یونیسکو کے الاؤنس پر چلتا تھا۔ اس لیے قدرت کی کوشش ہوتی کہ پیرس کے قیام کے دوران کم سے کم خرچ ہو۔

ہوٹل کا مالک قدرت کی سادگی اور سچائی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے حکم جاری کر دیا کہ یہ چھوٹا کمرہ کسی اور گاہک کو نہ دیا جائے' ایسا نہ ہو کہ مسٹر شہاب آ جائے اور اس کے پاس رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔

اسرائیل سے واپسی کے بعد قدرت نے تمام ثبوت جو وہ اسرائیل سے لایا تھا۔ یونیسکو کے سامنے پیش کر دیئے۔ انہی دنوں جب وہ شاہراہ پر بس سٹاپ پر کھڑا یونیسکو جانے کے لیے بس کا انتظار کر رہا تھا تو ایک لمبی کالے جھنڈے والی موٹر کار اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ کار کا

ڈرائیور باہر نکلا قدرت اللہ سے کہنے لگا آپ کو یونیسکو جانا ہے نا۔ ہم بھی ادھر جا رہے ہیں۔ آیئے تشریف لایئے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ قدرت کار میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ پچھلی سیٹ پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ قدرت اللہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے فوراً بعد اس نے محسوس کیا کہ فضا مکدر ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ ایک لمبی سوئی اس کے جسم میں بھونک دی گئی ہے۔ پھر اسے ہوش نہ رہا۔ پتہ نہیں اس کے بعد قدرت کو کہاں لے جایا گیا' اس پر کیا عمل کیا گیا۔

اگلی صبح پولیس نے دیکھا کہ اسی شاہراہ پر بس سٹاپ پر قدرت اللہ بے ہوش پڑا ہے۔ اس کی جیب سے ہوٹل کا پتہ برآمد ہوا۔ پولیس پہلے اسے ہسپتال لے گئی۔ جب ہوش آیا تو اسے ہوٹل میں پہنچا دیا۔

قدرت کا بیان ہے کہ جب سے وہ سوئی میرے جسم میں داخل ہوئی۔ میں محسوس کرنے لگا جیسے میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہوں۔ مجھ میں اٹھنے بیٹھنے چلنے کی ہمت نہ رہی۔ یوں جیسے ریڑھ کی ہڈی جسم سے نکال دی گئی ہو۔

شراب کی بوتلیں

ڈاکٹر عفت کا بیان ہے کہ اسرائیلی جادو کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ ایک روز میں نے الماری کھولی تو اس میں دو شراب کی خالی بوتلیں پڑی تھیں۔ میں حیران ہوئی کہ یہ بوتلیں کہاں سے آئیں۔ میں نے دونوں بوتلیں اٹھائیں اور باہر کوڑا ڈرم میں پھینک دیں۔ اگلے روز میں نے پھر الماری کھولی تو اس میں شراب کی دو اور خالی بوتلیں پڑی تھیں۔

ڈاکٹر عفت سوچ میں پڑ گئی۔ ادھر شہاب کی یہ کیفیت تھی کہ چارپائی پر لاش کی طرح پڑا رہتا تھا۔ ڈاکٹر عفت کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ قدرت اللہ شہاب شراب کے نشے میں دھت تو نہیں رہتا۔

اگلے روز پھر الماری میں دو شراب کی بوتلیں پڑی ملیں۔ شکوک کو تقویت ملنے لگی۔

مجھے اس بات کا علم نہیں کہ قدرت نے بیگم کو اسرائیلی جادو کا واقعہ سنایا تھا یا نہیں۔ گمان غالب ہے کہ اس نے کالی موٹر اور لمبی سوئی اور بے ہوشی کی بات عفت سے نہیں کی تھی۔

عفت پہلے مصائب کا شکار تھی۔ بیٹے کے اغوا کے خوف کی وجہ سے وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مسلسل فاقوں سے اس کا برا حال تھا۔

ادھر شہاب حتیٰ الوسع دوسروں کو اذیت دینے سے احتراز کرتا تھا۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ قدرت نے عفت سے اسرائیلی جادو کی بات نہ کی تھی اور وہ خاموشی میں اس عذاب کو جھیل رہا تھا جو اسرائیلی جادو نے اس پر طاری کیا تھا۔

اور بات

پھر ایک روز بھید کھل گیا۔ عفت الماری سے دو بوتلیں اٹھا کر باہر ڈسٹ بن میں پھینک کر واپس آئی اور اتفاق سے پھر الماری کھولی تو وہاں دو اور بوتلیں پڑی تھیں۔ پھر جتنی بار وہ الماری کھولتی اس میں دو بوتلیں پڑی ہوتیں۔ یہ دیکھ کر اس کے شکوک رفع ہو گئے اور اسے خیال آیا کہ یہ تو کوئی اور بات ہے۔

پھر وہ اور بات کھل کر سامنے آ گئی۔

ایک روز اس نے نلکا کھولا تو پانی کی بجائے خون چلنے لگا۔ عفت ڈر گئی پھر گھر میں جگہ جگہ بکرے کی کٹی ہوئی سریاں نظر آنے لگیں۔

ڈیڑھ دو سال قدرت جادو کے اس عذاب میں مبتلا رہا۔ اس کی ہڈیوں پر ہتھوڑے چلتے رہے۔ اس کے جوڑوں میں میخیں ٹھکتی رہیں۔ لوگوں کو اس کے جسم سے بدبو آتی تھی۔ بس میں بیٹھتا تو لوگ ناک پر رومال رکھ لیتے تھے۔

ڈیڑھ دو سال کے بعد جب اس نے اللہ کے حضور میں التجا کی تو جادو کا طلسم ٹوٹا اور پھر خیر کی طاقتوں نے اس کے اعضا کو جوڑنے کا عمل شروع کر دیا۔

جب تک جادو کا طلسم چلتا رہا اس نے اپنے خطوں میں اس کا ذکر نہ کیا۔ یہ جتنی تفصیلات اوپر دی گئی ہیں۔ ان کا علم مجھے قدرت اور عفت کے واپسی پر ہوا۔

لیکن جب اسرائیلی طلسم ٹوٹا تو اس نے ایک خط میں کچھ تفصیلات لکھ بھیجیں جنہیں پڑھ کر میں حیرت میں ڈوب گیا۔ وہ ایک ہولناک خط تھا۔ اس خط کی عکسی نقل میں کتاب کے آخر میں ضمیمہ میں پیش کر رہا ہوں۔ یہاں اس خط سے اقتباسات درج ہیں۔

کون سنے کون سنائے

۴ مئی ۱۹۷۱ء[1]

پیارے ممتاز

السلام علیکم ——————————————————

——————————————————————

پیارے ممتاز آپ کو معلوم ہے کہ میں اللہ کا نام لے کر اسرائیل چلا گیا تھا۔ میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا ——————————

——————————————————————

وہ دن اور آج کا دن۔ اللہ اللہ۔ غیب کا علم تو صرف خدا کے پاس ہے، لیکن جس دن میں نے یونیسکو میں اپنے دورے کا اعلان کیا اس دن سے یہودیوں کے هاروتی ماروتی جادو نے مجھے بری طرح دبوچ لیا۔ مجھے بہت سے اچھے بھی اور برے بھی روحانی تجربے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ہولناک تجربہ بلا کی روح کا تھا، جس کا ایک چھوٹا سا حصہ میں نے ۱۸ سول لائن میں بیان کیا ہے۔ وہ تو ایک مری ہوئی مظلوم لڑکی کی چیخ و پکار تھی جو صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کی ہڈیوں کو اس کے اپنے دھرم کے مطابق سپرد آتش کیا جائے۔

لیکن اب کے تو مجھ غریب کا واسطہ صیہونیت کے اس زندہ عفریت سے پڑا جو مادی اور دیگر اطوار پر ساری دنیا پر کسی نہ کسی طرح چھایا ہی ہوا ہے۔

جو کچھ مجھ پر گزری ۔ وہ کون سنے اور کون سنائے۔ میرے گوشت پوست کا ریشہ ریشہ بننے اور ٹوٹنے ———— مکڑی کے جالے کی طرح۔ بار بار بننے اور ٹوٹنے لگا۔ میرے تن بدن میں میری ہڈی ہڈی کو سڑک کے پتھر توڑنے والے مزدور کھٹا کھٹ۔ کھٹا کھٹ توڑتے گئے۔

---

[1] اصل خط ضمیمہ میں ملاحظہ کریں۔ خط XVi

کٹھا کھٹ ہتھوڑا

جب میں چلتا تھا تو واقعی مجھے یوں لگتا تھا جیسے کوئی یک بازو' یک پا' یک چشم اپاہج ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے بورے کو گھسیٹتا ہوا' گرتا پڑتا' گالیاں کھاتا۔ گالیاں دیتا' اسی اپنے ایک پاؤں پر اسی ایک جگہ کھڑا ہو۔

پیارے ممتاز۔ میں کیسے بتاؤں مجھ پر کیا کیا بیتی اور کیسے کیسے بیتی۔ جب میں اپنے اندر خشبو پاتا تھا' لوگ مجھ سے یوں بھاگتے تھے جیسے میں سڑا ہوا کوڑھی ہوں۔ جب میں اپنے اندر بدبو سونگھتا تھا' لوگ مجھے معطر سمجھتے تھے ——— سوائے عفت اور ثاقب کے۔ ثاقب تو خیر بچہ ہے' لیکن عفت تو بہر کیف ڈاکٹر بھی ہے۔ چند بار وہ ضرور بیوی کے سوالوں اور جوابوں سے دو چار ہوئی ہوگی ۔ تین چار دفعہ اس کی استفہامیہ نگاہوں نے مجھے گھورا اور اس کی زخم خوردہ مشکک نظروں نے مجھے التزاماً دیکھا بھی' لیکن خدا اسے خوش رکھے انجام کار اس نے مجھے وہی گردانا جو میں واقعی ہوں یا نہیں ہوں۔

عفت واقعی گریٹ ہے۔ اس سے اچھی بیوی کسی کو مل ہی نہیں سکتی۔ اس کشمکش سے تنگ آکر ایک روز میں نے اللہ میاں سے عرض کیا کہ' الہی تیری بے شمار عادات میں سے ضرور یہ بھی ایک عادت ہوگی' لیکن میرے اللہ میں تو مرچلا۔ اگر تو نے خودکشی حرام نہ کی ہوتی تو یااللہ تیری قسم' میں ضرور خودکشی کرلیتا۔

بس وہ دن اور آج کا دن وہ جادو ٹوٹ گیا۔ مری کے گھروں کی چھتوں پر ٹائلیں دیکھی ہیں آپ نے۔ اب ہر روز یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہی سڑک کے پتھر کوٹنے والے مزدور میرے تن بدن کی شکستہ ٹائیلوں کو چونے اور سیمنٹ سے جوڑ جوڑ کر دوبارہ ٹھونک رہے ہیں۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں کا ہونا (خاکم بدہن)

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

یقین جانئے۔ توڑنے اور جوڑنے کے عمل میں۔
ہتھوڑی برابر کی چلتی ہے۔
اذیت دونوں میں ہے
ایک میں درد کی۔
دوسرے میں لذت کی۔

آپ کا
ق

قدرت اور میں

سوال یہ ہے کہ قدرت نے یہ خط مجھے کیوں لکھا۔

اپنی قلبی واردات' روحانی مشاہدات اور وجدان کی کیفیات کو زبان پر لانے کی اسے عادت نہ تھی۔

میں نے اس نوعیت کی قدرت اللہ کی جتنی بھی باتیں اپنی تحریروں میں قلم بند کی ہیں' وہ میں نے بڑی چالاکی سے اگلوائی تھیں۔

جب بھی وہ کیفیت میں سرشار ہوتا۔ میں دیکھتا کہ پیالہ بھرا ہوا ہے۔ لبالب ہے۔ تو میں ایسی بات چھیڑ دیتا تھا جس سے چھلکن پیدا ہو چھینٹے اڑیں۔

ہم دونوں کا تعلق' عجیب سا تعلق تھا۔

وہ میرا ساتھی نہ تھا۔ ہمارے مشاغل الگ الگ تھے۔

وہ میرا مرشد نہیں تھا۔ مجھے کسی کو رہبر بنانے کی خواہش نہ تھی۔

میں اس کا مرید نہ تھا چوں کہ حوالگی اور سپردگی کے جذبے سے ناواقف تھا۔ مجھ میں سپردگی کی اہلیت نہ تھی۔

ہمارے راستے الگ الگ تھے۔

وہ میرا دوست نہ تھا۔ ہم میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔

وہ صراط مستقیمی تھا۔ میں آوارہ۔

وہ سراسر عمل کا قائل تھا۔ میں سراسر منہ زبانی۔

وہ نہ کہنے پر مجبور تھا' میں کہہ دینے پر۔

وہ عقیدے کا قائل تھا' میں عقیدت کا مارا ہوا تھا۔

سیانے کہتے ہیں۔ جب کوئی کسی راز سے بھر جاتا ہے تو وہ دیوار سے باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

گمان غالب ہے کہ میں قدرت کے لیے ایک دیوار تھا۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے مجھے تیس سال کیسے گوارا کیا۔ اس ضمن میں میرا خیال ہے کہ قدرت ذات کا دھوبی تھا۔ اس نے سر راہ ایک میلا چکٹ کپڑا دیکھا اور اسے اٹھالیا' پھر تیس سال وہ اٹھالینے کی لاج پالتا رہا۔

ممکن ہے اس جادو کے متعلق اس نے اشفاق احمد کو بھی خط لکھا ہو۔ چوں کہ اشفاق احمد اس کا دوست تھا لیکن اشفاق احمد نے مجھ سے کبھی اس کے بارے میں بات نہیں کی۔

حصہ بقدر جثہ

قدرت اللہ کا خط پڑھ کر میرے غبارے سے پھونک نکل گئی مجھے اپنا فینٹیسی کا طوفان بھول گیا۔

اتفاق سے اسی روز راجہ شفیع کا ٹیلی فون آگیا کہ بھائی جان مری سے آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے کل صبح دربار پر پہنچ جاؤ۔ اگلے روز دربار میں بھائی جان وانی راجہ اور میں بیٹھے تھے۔

میں نے بھائی جان سے کہا' جناب میں تو پہلے ہی فینٹیسی کے طوفان کے حملے سے زچ ہوا بیٹھا تھا کہ کل شہاب صاحب کے خط نے کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ میں نے خط بھائی جان کی طرف بڑھا دیا۔

بھائی جان نے کہا آپ اسے پڑھ کر سب کو سنا دیں۔

خط سن کر محفل پر خاموشی طاری ہو گئی۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

پھر راجہ غصے میں چلایا' بھائی جان یہ کیا ہو رہا ہے۔

بھائی جان نے کچھ جواب نہ دیا۔

راجہ بولا۔ ادھر شہاب صاحب پر ہتھوڑے چل رہے ہیں۔ ادھر ہم سب AS YOU WERE ہوئے جا رہے ہیں۔

بھائی جان سر لٹکا کر بیٹھے رہے۔

راجہ نے وانی سے پوچھا' وانی تم پر کیا بیت رہی ہے۔

وانی نہایت اطمینان سے بولا۔ اللہ کا احسان ہے۔ بس اتنا سا ہے کہ مجھے شہاب صاحب فجر کی نماز پڑھنے نہیں دیتے۔

بھائی جان چونکے۔ شہاب صاحب نماز پڑھنے نہیں دیتے؟ انہوں نے پوچھا۔

جی' وانی بولا۔ صبح جب میں جاگتا ہوں اور اٹھ کر وضو کا ارادہ کرتا ہوں تو شہاب صاحب سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں' بس یوں ہوتا ہے جیسے میرے جان نکل گئی ہو۔ مجھ میں اٹھنے کی سکت نہیں رہتی۔

آپ کا وہم ہے' بھائی جان بولے' شہاب صاحب نماز سے کیسے روک سکتے ہیں۔

شاید وہم ہی ہو' وانی بولا۔

اور یہ مفتی جو ہے' راجہ چلایا' اس سے پوچھیے کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔

ہم سب پر بیت رہی ہے' بھائی جان نے کہا' میں بھی آپ کا بھائی ہوں۔ میں بھی شامل ہوں' وہ بولے پھر کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر سر اٹھا کر بولے' پتہ نہیں انہوں نے مسجد اقصیٰ میں کیا کچھ کیا ہے کہ صیہونی شر بیدار ہو گیا ہے۔ ہم سب کو جھیلنا ہو گا حصہ بقدر جثہ۔

دو مجبور

آپ ان کی مدد کیجئے نا' راجہ بولا۔

ہم بڑوں کی باتوں میں دخل دینے والے کون ہیں' وہ بولے۔

میں نے اپنے خط میں یہ سب باتیں شہاب کو لکھ دیں۔

جواب میں قدرت نے مجھے جھاڑ پلا دی۔

اس نے ۲۳ جون[۱] ۱۹۷۱ء کو پیرس سے مجھے خط لکھا جس سے اقتباس ملاحظہ ہو:

آپ کا خط پڑھ کر کچھ دیر متذبذب رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک محض ذاتی تجربے کو اتنے لوگوں تک پھیلانا چاہیئے تھا یا نہیں۔

پھر تسلی ہوئی کہ آخر کیا مضایقہ ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ جب سے وہ سحر ٹوٹا اس کی شگفتگی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

قلبی، ذہنی اور روحانی زخم تو بالکل صحت یاب ہو گئے ہیں، لیکن جسم کی ٹیسیں بہت ہولے ہولے ختم ہو رہی ہیں. جیسے ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑنے کے بعد بھی عرصہ دراز تک نرم رہتی ہے۔

اس کے جواب میں میں نے قدرت کو دو حرفی خط لکھا غالباً" یہ میرا مختصر ترین خط تھا۔ لکھا تھا:۔

عالی جاہ میں بار بار آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں۔

کہ ہم اپنی جینز کہ وجہ سے مجبور ہیں۔

آپ نہ کہنے پر مجبور ہیں۔

میں کہہ دینے پر مجبور ہوں۔

۱۔ اصل خط ضمیمہ ملاحظہ کریں۔ خط نمبرXVii

انچاسواں باب

ایلی کی واپسی

ایلی کی آنکھ کھل گئی۔
صحن میں چاندنی کی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
چند ایک چارپائیوں پر لوگ چادریں لپیٹے پڑے تھے۔
رات کی رانی کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

وہ ہاتھ

ارے وہ چونکا اس کے قریب والی چارپائی پر کوئی چادر میں لپٹے پڑا تھا —— ہائیں وہ ہاتھ۔
اس کا بازو سرہانے تلے دبا ہوا تھا اور سرہانے سے حنا مالیدہ ہاتھ مٹھی بن کر باہر نکلا ہوا تھا۔
شہزاد کے ہاتھ کو دیکھ کر اس کا دل زور سے دھڑکا۔ شہزاد کے ہاتھ کو دیکھ کر ہمیشہ اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔

صرف شہزاد کا ہاتھ ہی نہیں۔ ایلی کو نسائی ہاتھوں سے عشق تھا۔ راہ چلتے ہوئے جب بھی اسے کوئی خاتون نظر آتی تو چہرے کے بعد اس کی نظر اس کے ہاتھوں کو تلاش کرتی۔ اگر ہاتھ دبلے پتلے ہوتے تو اس کی دلچسپی ختم ہو جاتی۔ اسے چٹے سفید بھرے بھرے ہاتھوں سے عشق تھا۔

شہزاد تو خیر ساری کی ساری پیاری تھی اور وہ کئی ایک سال خاموشی میں اس کی پرستش کرتا رہا تھا۔ شاید ایلی کو اپنے جذبے کا اظہار کرنے کی کبھی جرات نہ پڑتی۔ اگر اس رات شہزاد کا ہاتھ اس کے ہونٹوں کے اس اس قدر قریب نہ آ جاتا۔

اور وہ بچھو کی طرح ڈنک نہ مارتا۔

اس رات گھر کے سب لوگ جاگ رہے تھے۔ وہ سب شہزاد کے گھر کے صحن میں لیٹے ہوئے تھے۔

ایلی کی دادی کی حالت بڑی نازک تھی وہ آخری دموں پر تھی۔ سب اس انتظار میں تھے کہ کب آواز پڑے اور وہ کوٹھا پھلانگ کر علی احمد کے گھر جا کر میت کے گرد بیٹھ کر قرآن خوانی کریں۔

ایلی بھی صحن کے ایک کونے میں کھٹولی پر پڑا تھا۔ دادی کی موت دکھ کی بات نہ تھی چونکہ وہ نوے یا سو سال کی عمر پا چکی تھی اور اتنی لمبی عمر پانے کے بعد اگر وفات ہوتی تو دستور کے مطابق محلے والیاں رونے کی بجائے خوشیاں منایا کرتی تھیں۔ لیکن ایلی کو دادی کی موت کا بڑا صدمہ تھا۔ گھر میں دادی وہ واحد فرد تھی جس نے ایلی سے محبت کی تھی۔

ایلی کو پیاس لگی۔ اس نے پڑے پڑے آواز لگائی' کوئی ہے اللہ کا بندہ جو مجھے پانی پلائے۔ اس کا خیال تھا کوئی بچہ یا اس کی بہن اس کے لیے پانی لے آئے گی۔

آواز لگانے کے بعد وہ پھر دادی کے خیال میں کھو گیا۔

پھر دفعتاً" اس کے ہونٹوں پر لمس محسوس ہوا۔ ایلی نے آنکھیں کھولیں لیں۔ شہزاد کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں کے اس قدر قریب دیکھ کر وہ ٹھٹھکا بچھو نے ڈنک مار دیا۔

وہ دیوانہ وار اس ہاتھ کو پکڑ کر چومنے لگا۔

چاند کی چاندنی میں شہزاد حیرت سے بت بنی کھڑی تھی۔ تُو ایلی۔ ایلی تُو۔

اس رات شہزاد کا ہاتھ اس قدر قریب دیکھ کر اس نے اپنا شوق بھرا ہاتھ بڑھایا اور اسے پکڑ لیا۔

دفعتاً" ساتھ والی چارپائی پر شدید حرکت ہوئی۔ کسی نے ہاتھ چھڑا کر بازو سمیٹ لیا اور

کروٹ بدل لی۔

ہاں شہزاد ہمیشہ ہاتھ چھڑا کر کروٹ بدل لیا کرتی تھی۔ پتہ نہیں شہزاد کو اپنا ہاتھ پکڑا دینے سے کیوں بغض تھا دراصل شہزاد کو کسی قسم کے جسمانی قرب سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی دور بیٹھا اپنی نگاہوں سے اس پر پوجا کے پھول برساتا رہے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ جب ایلی زیادہ ہی ضد کرتا' تو وہ بڑے انجانے انداز میں اس سے پوچھتی' کیا ہے تمہیں؟

کچھ بھی نہیں' وہ جواب دیتا۔

کیا چاہتے ہو؟ وہ چڑ کر کہتی۔

ایلی کی نگاہیں اس کے ہاتھ پر مرکوز ہو جاتیں۔

ہاتھ پکڑ کر کیا کرو گے؟

وہ پھر خاموش ہو جاتا۔

اچھا لو۔ وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر کہتی' جیسے جان چھڑا رہی ہو۔ پھر وہ اپنے کام میں یوں لگ جاتی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو' جیسے اس ہاتھ سے اسے کوئی تعلق ہی نہ ہو' جسے ایلی نے تھام رکھا ہوتا۔

چاند بدلی سے باہر نکل آیا۔ ایلی چونکا۔

ارے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ساتھ والی چارپائی کے سرہانے سے وہی ہاتھ پھر ویسے ہی باہر نکلا ہوا تھا۔

اس نے پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزاد پھر اس کا ہاتھ جھٹک کر کروٹ بدل لے گی' لیکن ایسا نہ ہوا وہ ہاتھ جوں کا جوں ایلی کی گرفت میں پڑا رہا' بلکہ اور بھی ڈھیلا پڑ گیا جیسے خود کو اس کے حوالے کر دیا ہو۔ دیر تک وہ ہاتھ تھامے پڑا رہا۔

پھر کوئی آہٹ سنائی دی اور شہزاد کے ہاتھ نے ایلی کے ہاتھ پر محبت بھرا دباؤ ڈالا۔ اور پھر الگ ہو گیا۔

عالم بی بی

وہ خاتون جس نے ایلی کو پھر سے جگا دیا تھا اور اس کا ہاتھ دبا کر کروٹ بدل لی تھی۔ ایک مہمان خاتون تھی۔

اگلے روز جب وہ رخصت ہونے لگی تو اس نے مجھے خدا حافظ کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ خدا حافظ نہ ہو۔

بلکہ جی آیاں نوں' کہہ کر رہی ہو۔ جیسے وہ انجام نہیں بلکہ آغاز ہو اور جب وہ گاڑی میں سوار ہوئی تو بات کیے بغیر مجھے بلا گئی۔ ضرور آئے گا۔

وہ ادھیڑ عمر کی خاتون تھی۔ چہرا چوکور تھا۔ آنکھیں لگاؤ کی بھیگ سے بھری ہوئی تھیں۔ رنگ نہ گورا تھا نہ سانولا۔ لگتا تھا۔ جیسے ہلدی ملی ہوئی ہو۔ خدوخال میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی۔ طبیعت میں شدت نہ تھی' تلخی نہ تھی' شوخی نہ تھی' آواز مدھم مدھم' انداز ٹھہرا ٹھہرا۔

میں نے احمد بشیر کی بیوی مودی سے پوچھا' یہ کون تھی۔

وہ بولی' یہ ہماری پڑوسن ہے' عالم بی بی۔

عالم بی بی' یہ بھی کوئی نام ہے۔

کہنے لگی' نام تو علیمہ عالیہ ہے۔ بڑا مشکل نام ہے۔ میں تو اسے عالم بی بی کہہ کر بلاتی ہوں۔ ہمارے محلے رام نگر میں گھر کے پاس ہی ایک سکول میں پڑھاتی ہے۔ میاں فوت ہو چکا ہے۔ بچے جوان ہیں۔ طبیعت کی بڑی اچھی ہے۔ مالی مشکلات میں گھری ہوئی ہے' بے چاری۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ اس روز سے مجھے عالم بی بی ہو گئی۔ اٹھتے بیٹھتے میرے سامنے وہ ہاتھ لٹکا رہتا۔ اور وہ ہاتھ بولتا' مجھے تھام لو' تھام بھی لو اب۔

ساری رات خواب میں وہ ہاتھ میرا ہاتھ تھامے رکھتا۔ ہلکا سا دباؤ۔ ہلکی سی بھیگ' اور لگاؤ ہی لگاؤ۔ صبح جاگتا تو وہ میری آنکھوں کے سامنے لٹک جاتا۔ لکھنے لگتا تو کاغذ پر اٹک جاتا' پڑھتا تو کتاب کے صفحات پر چھائے رہتا۔

ایک بات بڑی عجیب تھی' وہ یہ کہ بات الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔ زندگی بھر میں ہاتھ کا طالب رہا تھا۔ اب وہ ہاتھ خود طلب سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھے ڈھونڈتا تھا' بلاتا تھا' اکساتا تھا۔

اس ہاتھ نے پتہ نہیں کیا کر دیا۔ میرے ذہن میں سائیں اللہ بخش' بھائی جان اور قدرت اللہ دھندلانے لگے' دھندلاتے گئے۔

راجہ "قیصر" مسعود

میرا جی چاہتا تھا کہ میں راجہ شفیع سے جا کر ملوں اور اپنی ہاتھ بیتی اسے سناؤں' لیکن جب

میں راجے کی طرف جانے کا ارادہ کرتا تو راجہ میرے روبرو آ کھڑا ہوتا' پھر وہ لڑکھڑاتے ہوئے جا کر الماری کھولتا' اس میں سے بوتل نکالتا اور کہتا' چھوڑ مفتی ان باتوں کو ایک چسکی بھر لو ر پھر ہم اکٹھے الماس کے پاس جا کر اس سے گانا سنتے ہیں۔ کیا گیت سناتی ہے۔ واہ تو سنے تو پاگل ہو جائے۔ بول ہیں۔

وہ شیشہ ہائے میکشی
کہ مصلحت اس میں تھی
جنہیں وہیں پڑے پڑے
وہیں کی خاک کھا گئی
پھر ان کو ڈھو رہا ہوں میں
یہ کیا بنا رہوں میں

پھر قیصر میرے روبرو تن کر آ کھڑا ہوتا۔ کہتا'

ابے او میں نے تجھے کہا نہیں تھا۔ کہ یہ تو کن لوگوں سے شیر و شکر ہونے کی کوشش کر رہا ہے' تو شباب کے پیچھے پیچھے کیوں چل پڑا ہے۔ اونہوں' یہ ساتھ نہیں نبھے گا۔ تو تو ذات کا ایلی ہے' ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف مڑتی ہے سمجھے۔ تو کسی بائی کے چوبارے کی دہلیز پر جا کر بیٹھ وہی تیری جگہ ہے۔ کوے کو وہائٹ واش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اوپر سے سفیدی اتر جائے گی۔

اور پھر وہی کالا رنگ' وہی کائیں کائیں۔

پھر ایک روز مسعود قریشی آ گیا۔ مسعود سے میں بات کر سکتا تھا۔ ہمارے درمیان کوئی پردہ نہ تھا۔

میں نے کہا' یار مسعود میں تو مارا گیا۔

بولا' بڑی خوشی کی بات ہے۔

میں نے کہا' میں سنجیدہ ہوں۔

بولا' میں بھی سنجیدہ ہوں۔ دیکھ مفتی۔ زندگی کی لذت خالی جینے میں نہیں۔ مسلسل جینے میں نہیں۔ بلکہ جینے مرنے' جینے مرنے میں ہے۔ اور دیکھ ایک بات یاد رکھ ہم تیرے پاس صرف اس لیے آتے ہیں کہ یہاں گنہگار کی محفل لگی ہے۔ گنہگار کی محفل چھوڑ کر جانے کو کس کا جی چاہتا

ہے۔

اور یاد رکھ مفتی' تو اگر صالح بن کر بیٹھ گیا تو ہم تیرے پاس نہیں آئیں گے۔

پھر وہ ہاتھ حرکت میں آگیا۔ کبھی میری چہرے کو سہلاتا' کبھی بالوں میں انگلیاں پھیرتا اور کبھی جسم کو تھپتھپاتا۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ شہزاد کا ہاتھ نہیں تھا۔ کیونکہ شہزاد کے ہاتھ نے کبھی اکسایا نہ تھا۔ پھر اردو بورڈ سے بلاوا آگیا۔

ان دنوں شہاب کی سفارش پر اشفاق احمد نے مجھے اردو بورڈ میں ایڈیٹر کی آسامی پر لگا رکھا تھا۔ جب بھی بورڈ کی میٹنگ ہوتی یا کوئی اور امور قابل توجہ ہوتے تو ڈائریکٹر اردو بورڈ ایڈیٹروں کو بلا لیتے۔

وہ گھر' یہ گھر

۱۹۴۷ء سے جب بھی میں کسی کام سے لاہور جاتا تھا تو ہمیشہ اشفاق احمد کے ہاں ٹھہرتا تھا۔ پہلے دو مزنگ روڈ میں' جہاں اشفاق کے والدین اور بھائی بہن رہتے تھے۔ پھر اشفاق کی شادی کے بعد اشفاق بانو کے گھر۔

اشفاق بانو کے گھر پہنچتا تو میں یوں محسوس کرتا جیسے بطخ تالاب میں آگئی ہو۔

ان دنوں احمد بشیر بھی لاہور میں رہتا تھا۔ احمد بشیر نے ہمیشہ سے مجھ سے بڑی محبت کی ہے' اس کی بیوی اور بیٹیاں بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے' لیکن میں کبھی احمد بشیر کے ہاں ٹھہرا نہ تھا۔ جب بھی لاہور جاتا احمد بشیر سے ملتا ضرور تھا۔

احمد بشیر اس بات پر بہت کڑھتا تھا۔ اسے اشفاق کی طبیعت پسند نہ تھی۔ ابتداء میں وہ مجھ سے کہا کرتا تھا' یار مجھے بات سمجھ میں نہیں آتی' اشفاق کی طبیعت تم سے قطعی طور پر مختلف ہے' پھر تم اس گھر میں کیسے رہتے ہو۔ میں کہتا اس لیے کہ وہاں بانو ہے۔ کیسی' میری' نوکی ہے۔ ای ہے اور وہ گھر۔ مجھے اس گھر سے محبت ہے۔ احمد بشیر کی بات سچی تھی۔ اس کی طبیعت بالکل میرے جیسی تھی اور نیلم پپو مودی سب میری دوست تھیں۔

اس مرتبہ وہ ہاتھ میری بانہہ پکڑ کر احمد بشیر کے گھر لے گیا۔

میں سوٹ کیس اٹھائے گھر میں داخل ہوا۔ تو سارے گھر میں حیرت بھری خوشی کی لہر دوڑ

گئی۔

اگلے روز بھانڈا پھوٹ گیا۔ بھید کھل گیا۔ عالم بی بی سامنے آ کھڑی ہوئی۔

ہوس بھرا قرب

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ ہوس میرے بند بند سے پھوٹ نکلی۔

ایلی نے زندگی میں کئی محبتیں کی تھیں' لیکن ان تمام محبتوں میں ہوس کا عنصر پیش پیش نہیں ہوتا تھا۔ الٹا ایلی اپنی محبتوں میں جسمانی قرب سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اس کے لیے محبت ایک ذہنی کیفیت تھی' ایک سرشاری اور بس۔ عالم بی بی نے تو گویا بھس میں آگ لگا دی۔

رات کے وقت وہ کوٹھا پھلانگ کر عالم بی بی کے پاس جا پہنچتا۔ جب وہ آدمی رات کے وقت کوٹھے کا پردہ پھلانگ کر جاتا۔ تو اسے اچھی طرح احساس ہوتا کہ نیلم اور پپو جاگ رہی ہیں اور وہ منہ پر اوڑھی ہوئی چادر میں' دیدبان بنا کر دیکھ رہی ہیں اور مسکرا رہی ہیں کہ اس ۴۶ سالہ بڈھے کو کیا ہوا کہ آدمی رات کو پردے پھلانگ رہا ہے۔

ادھر عالم بی بی کا جسم لٹا پٹا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ کئی ایک سکندر اعظم حملے کر چکے تھے۔ وہ کئی ایک بار یہ کھیل کھیل چکی تھی۔ اور اب وہ جسم اس حد تک مضروب ہو چکا تھا کہ اسے طلب نہ رہی تھی' مردہ' بے حس۔

وہ اس عمر کو پہنچ چکی تھی کہ اب کسی سکندر کے حملے کی امید نہ رہی تھی۔ ایلی کے اس ناگاہ حملے سے وہ حیرت زدہ ہو گئی۔ اس حیرت میں خوشی کا عنصر اس قدر بھرپور تھا کہ اس کے جسم کے بند بند سے پھول کھل اٹھے۔

نیلم پپو

نیلم اور پپو یہ دیکھ کر چٹکیاں مارنے لگیں۔

نیلم اور پپو دونوں ہی بڑی سریلی تھیں۔ گلے میں شُدھ سُر بھری ہوئی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں میں تال تھی۔ سارے جسم میں لے تھی۔ جب وہ مل کر گایا کرتی تھیں تو سماں بندھ جایا کرتا تھا۔

ان دنوں ان کی چھوٹی بہن بشریٰ جسے ہم سب گوپی کہا کرتے تھے' سوکھے کاٹھ جسم کی مالک

تھی۔ اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی' وہ ہر وقت اپنے لنگڑے استاد کے ساتھ بچوں کے پروگرام کی تیاری میں لگی رہتی تھی۔

گانے میں نیلم بیچ نقل تھیں۔ بڑی سے بڑی مشکل بندش کی نقل اتارنا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ ان کی امی مودی تو کراچی میں پیارنگ سے موسیقی کی تعلیم بھی لیتی رہی تھی۔

جب بھی عالم بی بی ان کے گھر میں قدم رکھتی تو دونوں بڑی سنجیدگی سے گانے لگتیں میرا پیا گھر آیلو۔ آیا ری میرا پیا گھر آیا۔

مودی' عالم بی بی کے بدلے ہوئے انداز' اکڑی ہوئی گردن اور پھلجھڑیاں چلاتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر چڑ جاتی۔ یہ کیا پاکھنڈ مچایا ہوا ہے۔ انہوں نے' وہ کہتی' لیکن احمد بشیر سب کو ایک جگہ بٹھا کر ڈانٹ دیتا تھا کہ خبردار ممتاز کو کچھ نہ کہنا۔ جو وہ کرتا ہے اسے کرنے دو۔ اس کا راستہ نہ کاٹنا۔ طعنہ نہ دینا۔

نیلم بیچ کے انداز میں ایک مفرح حوالہ ہوتا تھا۔ وہ ایک پھلجھڑی سی چلا دیتی تھیں۔

تلی چوچو۔ پروین

اور پروین عاطف کی تو بات ہی اور تھی۔ اس کی باتوں میں بڑا رنگ رس تھا۔

۱۹۴۵ء میں جب میں پہلی بار پروین کے ماموں اشفاق حسین سے ملا تھا تو' اس کے ہاں گیا تو میں سرتال کے لیے تھا' لیکن وہاں بیٹھ جو گیا' ایسا بیٹھا کہ آج تک اٹھ نہیں سکا۔ میرا بیٹھ جانا اس لیے نہیں تھا کہ اس کے گھر میں موسیقی کی محفل لگتی تھی' بلکہ اس لیے بیٹھ گیا تھا کہ اشفاق حسین کی باتوں نے مجھے اٹھنے نہ دیا تھا۔

اشفاق حسین کے پاس کوئی خصوصی بات نہ تھی۔ اس کے پاس بات کہنے کا انداز تھا۔ وہ انداز بڑا جاذب تھا۔

پروین عاطف کی خوبی یہ تھی کہ وہ باتوں کی پھلجھڑیاں چلانے میں ماہر تھی۔ عام سی بات کرتی۔ اس میں بات چاہے بہت ہی کم ہوتی' لیکن پھلجھڑی چل جاتی۔

پروین کو میں نے اس زمانے میں دیکھا تھا جب وہ تلی چوچو تھی۔ اعضا بے تکے اور بے ڈھنگے تھے۔ ان دنوں وہ اپنے والدین کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

احمد بشیر کے اپنے والدین کے ساتھ اچھے تعلقات نہ تھے۔ والدہ سے ازلی بوسینلیٹی تھی۔ والد سے لگاؤ تھا' لیکن اس کے والد صراط مستقیمی تھے۔ اس لیے ان سے بنتی نہ تھی۔

احمد بشیر کے والد سمجھتے تھے کہ میری وجہ سے ان کا بیٹا راستے سے بھٹک گیا تھا۔

اسی بنا پر پروین سے میرا میل جول نہ ہو سکا۔

پھر پروین کی شادی ہو گئی۔

جب احمد بشیر نیلا پربت فلم بنا رہا تھا تو ایک مرتبہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں ایک حسین و جمیل لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے احمد بشیر سے پوچھا' یہ کون ہے۔ احمد بشیر نے کہا' تم نے پروین کو نہیں پہچانا کیا۔

میں نے کہا' یہ وہ پینو ہے جو تلی چوچو تھی۔ نہیں' میں نہیں مانتا۔

پروین بولی' شکر ہے آپ نے پوچھا تو۔ میں بھی گنتی شمار میں آ گئی۔

پھر پروین احمد بشیر کے گھر آنے جانے لگی۔

جب اسے پتہ چلا کہ میں عالم بی بی کے لیے ان کے گھر آتا ہوں' تو وہ بولی' اللہ اس بی بی کا بھلا کرے اس گھر میں ایلی نے قدم رنجا تو فرمایا۔

نیلم پپو کوئی ٹھمری چھیڑ لیتیں۔ پروین پھلجھڑیاں چلاتی۔ مودی چڑتی چڑ چڑ دانے بھونتی۔ احمد بشیر قہقہے مارتا۔ ایلی عالم بی بی کے پھیرے لیتا رہتا۔ یوں دن گزرتے۔ کیا دن تھے وہ۔

باز آ

پنڈی پہنچ کر مجھے خیال آیا کہ چلو قدرت اللہ کو اطلاع ہی دے دو کہ بطخ تلاب میں پہنچ گئی۔ فضاؤں میں اڑنے والے پنچھیو خدا حافظ۔ ساتھ ہی میں نے عالم بی بی کا قصہ بیان کر دیا۔

جواب میں قدرت[1] اللہ کا ۵ جولائی کا لکھا ہوا ایک خط موصول ہوا۔ جس میں سے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

---

[1]۔ اصل خط ضمیمے میں ملاحظہ کریں۔ خط نمبر XViii

قونیہ میں مولانا رومؒ کے مزار کی پیشانی پر مثنوی کی یہ رباعی درج ہے۔

باز آ باز آ ہر آں چہ ہستی باز آ
گر کافر و گبرو بت پرستی باز آ
ایں در گہ ما در گہ نومیدی نیست
سو بار اگر توبہ شکستی باز آ

مولانا روم بے شک عارف کامل تھے۔ لہٰذا انہوں نے جو کچھ کہا ہے سچ ہی کہا ہو گا۔ پھر ڈر کس کوتوال کا ہے ـــــــ جہاں تک کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا والا تاثر ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ غلطی البتہ یہ ہے کہ رائی کو پربت سمجھ لیا جائے۔ ایسے پربت میں سے چوہیا تو بڑی بات ہے مچھر بھی نکل آئے تو غنیمت ہے۔

یہ تو محض ابتدائی خط تھا اس موضوع پر اصلی قدرت اللہ نے چند دن بعد یعنی [1] ۱۱ جولائی کو انگریزی میں تحریر کیا تاکہ میری بیوی نہ پڑھ سکے۔ لکھا تھا:۔

اصلی خط

I have purposely delayed my reply by a few days to avoid the temptation of rushing into trite sermonising. It is quite easy to be extremely sensible and reasonable and objective about other peoples love affairs. But it is difficult with those who are actually involved in it.

2. I am writing this after picturing myself in the same boat in which you happen to be sailing up

---

۱۔ اصل خط ضمیمے میں ملاحظہ کریں۔ خط نمبر XiX

& down in the stormy ocean of desire.

3. This is quite a natural episode and it can happen to normal human beings alone. Remorse is good only if it does not become morbid. Morbid remorse can be much corroding than outright sin.

4. Sex sin is an affair between man, woman and God. If it gets committed without flourishing it as a virtue and if later it causes remorse in the Innemost recesses of the conscience then the whol thing can be left to the inscrutible mercy of God. In this context, it is good to take solace from Maulana Room's lines I had tried to quote in my previous letter.

باز آ باز آ ہر آں چہ ہستی باز آ
گر کافرو گبرو بت پرستی باز آ
ایں درگہ ماور گہ نومیدی نیست
سو بار اگر توبہ شکستی باز آ

5. But once sex - sin descends to the level of violating human rights of the people other than the man and women involved, it becomes an offence against society and as such culpable by Divine as well as social & penal laws. This must be avoided.

6. In my judgement all thoughts and possibility of marriage must be fully and irrevocably averted. Family circumstances on both sides are such that matrimony cannot but fall in the purview of para No. 5 above weighing in the scale of prudence adherence to para No. 4 in the oft. repeated commission of sin (Will be far preferable to the complex consequences) of para no. 5, emanating from marraige. At our age and maturity we ought to be able to abide by this simple arithmetical calculation.

گاؤزگریں

7. I am emphasising against matrimony because this thought can spring at any time on the crest of desire, love, sex, compassion, or just self pity and morbid remorse. so be on the quard.
8. Please keep me informed at short intervals, write in symbols because there is no need for anybody else to know any thing about it.
9. It is easy to enter in the realm of God's grace. But it is exceedingly difficult to fall out of it. Frail mortals may violate divine injunction a hundred times but if it is not in a

spirit of wilful defiance - there is always hope. The faintest flicker of healthy fear in the depth of consciousness keeps this hope alive. It is small things - like this flickers - that swings. The pendulum of mens faigh and destiny. So be of good cheer.

10. I no longer insist that you meet Bhai Jan immediately. Take your own time. Meanwhile write to be quite frequently.

کالے مول نہ ہوندے بگے

اب میں اس خط کو پڑھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک عظیم خط ہے اور لکھنے والے کو وسعت قلب کا آئینہ دار ہے' لیکن ان دنوں جب مجھ پر عشق نہیں' محبت نہیں' بلکہ ایک جنون سوار تھا' میں نے اس خط سے کوئی اثر نہ لیا۔ قدرت کے لیے میرے دل میں جو عقیدت تھی وہ اس قدر مدھم پڑ چکی تھی کہ میں نے الٹا خود کو اس بد رو میں اور بھی لت پت کر دیا۔ ۶۵ سال کی عمر کے باوجود میں نے ۲۱ سال کے نوجوان کے مشاغل اپنا لیے۔

رات کو میں کوٹھے پھلانگتا۔

چوروں کی طرح عالم بی بی کے گھر کی ڈیوڑھی میں چھپا رہتا کہ گھر والے صدر دروازہ بند کر لیں۔ عالم بی بی کے نوجوان بچے سو جائیں تو باہر نکل کر چپکے سے عالم بی بی کی آغوش میں جا پہنچوں۔ حالانکہ عالم بی بی کی آغوش لٹی پٹی تھی۔ وہ میرا انتظار نہیں کرتی تھی۔ اسے جسمانی قرب کی خواہش نہ تھی اور وہ اپنے نوجوان بچوں سے سخت خائف رہتی تھی۔ لیکن میں تو عالم بی بی کی خوشبو کا دیوانہ تھا' چاہے وہ التفات کرے نہ کرے' لیکن مجھے اس کے قرب کا احساس رہے۔

شقو اور باتو میری اس کایا پلٹ پر حیران رہ گئے۔ شقو تو اپنی طبیعت کے مطابق اندر ہی اندر

سلگتا رہا۔ دھواں دیتا رہا۔ بانو سٹپٹا کر رہ گئی بولی' مفتی جی یہ کیا ہوا۔

کون مفتی جی کس کی بات کر رہی ہو۔

اپنے مفتی جی کی' وہ بولی۔

مفتی لد گیا۔ کوے نے جو مور کے پر لگا رکھے تھے وہ اتار پھینکے۔ اب ایلی سے بات کرو۔

بچے حیران تھے کہ مفتی اور ایلی کا قصہ کیا ہے۔

بانو بولی' شہاب صاحب کو پتہ چلا تو وہ کیا کہیں گے۔

کہیں گے' کالے مول نہ ہوندے بگے۔

بھانویں سو من صابن لگے۔

بانو بولی' یہ بی بی ہے کون۔

میں نے کہا ایک عام سی گھسی پٹی عورت ہے۔

یہ سب اس بی بی کا پھیلایا ہوا شر ہے۔

نہیں بانو' میں نے جواب دیا۔ اس بے چاری میں شر کہاں سے آیا۔ وہ تو خود مظلوم ہے۔

آپ بھی مظلوم ہوں گے' اس نے طعنہ دیا۔

نہیں بانو' میں نے جواب دیا۔ شر میں خود ہوں۔ قدرت نے میرے اندر کے شر کو دبا دیا تھا۔ وہ سمٹ گیا تھا۔ موقعہ کی تاک میں رہا۔ اب اس نے شبخون مار دیا۔

پھر ایک روز میں نے عالم بی بی کو انگلی لگائی اور اسے بانو کے گھر لے گیا۔ اسے دیکھ کر سارا کا سارا گھر ہکا بکا رہ گیا۔

اشفاق احمد' بشیر اور مودی کو عالم بی بی پر غصہ آتا تھا۔ صرف بانو ایک واحد فرد تھی جسے اس حادثے پر دکھ ہوا۔ غصہ نہیں آیا۔

پھر احمد بشیر اور اشفاق احمد مل بیٹھے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کبھی مل بیٹھے نہ تھے۔ ان دونوں کی طبائع میں مل بیٹھنے کا عنصر سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

ان دونوں نے کہا یہ مفتی تو جوہڑ میں ڈوب گیا۔ اسے دلدل میں لت پت ہونے کی لت پڑ گئی ہے۔ اسے کیسے بچایا جائے۔

دونوں نے فیصلہ کیا کہ قدرت اللہ خط کو لکھا جائے' جس میں اس واقعہ کی تفصیلات درج

ہوں اور اس سے اپیل کی جائے کہ وہ مفتی کو سرزنش کرے۔

انہیں علم نہ تھا کہ میں نے ابتداء میں ہی قدرت کو مطلع کر دیا تھا کہ آپ نے جس کڑوی گولی پر شوگر کوٹنگ کی تھی۔ وہ اتر گئی ہے اور کڑواہٹ پھر سے اپنے جوبن پر ہے۔

پھر عالم بی بی کی بات گھر تک پہنچ گئی۔ میری بیوی غصے سے بھوت بن گئی۔ بیٹیوں نے بات کئے بغیر خاموش پروٹسٹ کیا۔ صرف عکسی خاموش رہا' یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

راجہ شفیع کی وفات

میں نے سوچا چلو راجہ سے بات کرو۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ عالم بی بی خود آئی تھی یا بھیجی گئی تھی۔ میں خود گرا تھا یا دھکا دیا گیا تھا۔

راجہ کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ وہ دورے پر جہلم گیا ہوا ہے۔

دوبارہ گیا تو پتہ چلا کہ راجہ بیمار ہے' جہلم کے ہسپتال میں داخل ہے۔ پھر ایک روز جب ہم بھائی جان کے ساتھ دربار میں بیٹھے تھے تو دفعتاً" بھائی جان کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ بیٹھے بیٹھے تڑپ کر رہ گئے۔ پھر وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ آخر بولے۔ کہنے لگے' ذرا راجہ کے گھر جا کر پتہ تو لگائیں۔

راجہ کے گھر گیا تو گھر مقفل تھا۔ پڑوسی نے بتایا کہ سب لوگ جہلم گئے ہوئے تھے۔

اگلے دن خبر آئی کہ راجہ فوت ہو گیا۔

ہم سب دیوانہ وار راجہ کے گاؤں کی طرف بھاگے۔

راجہ کو دفنانے کے بعد جب میں واپس آ رہا تھا تو مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ خود کو دفنانے کے بعد واپس آ رہا ہوں۔

راجہ کے جانے کے بعد میں بالکل ہی اکیلا رہ گیا۔

پھر ایک روز ایک اور حادثہ ہوا۔

میں نے عالم بی بی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ عالم بی بی نہ تھی۔

تتلی کے پر جھڑ گئے تھے' نیچے سے سنڈی نکل آئی تھی۔

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ کیا اس عورت کے لیے میں نے زندگی کے تین سال گنوا دیے۔

اپنوں کو ناراض کر لیا۔ گھر کی آبادی کو تلف کر دیا۔ بانو کو دکھی کر دیا۔ کیسی' سیری' نوکی کو پریشان کیے رکھا۔ احمد بشیر اور مودی کو دکھی کیے رکھا۔

یااللہ' میں نے پہلی بار بڑے عجز سے عرض کی' یااللہ کیا میری آنکھیں میری ہیں یا یہ فورسز بی یونڈ کی تابع ہیں۔ کیا یہ ویسے دیکھتی ہیں جیسے میں چاہتا ہوں یا ویسے جیسے وہ چاہتی ہیں۔

پچاسواں باب

دو اپاہج

بن باس کاٹ کر جب وطن واپس پہنچے تو وہ۔ وہ افراد نہ تھے جو ۳ سال پہلے یہاں سے انگلستان روانہ ہوئے تھے۔ بظاہر وہ ثابت نظر آتے تھے، لیکن اندر ان کا بند بند ٹوٹا ہوا تھا۔

جب ذوالفقار علی بھٹو ملک کے سربراہ بنے تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ قدرت اللہ کی پنشن کی منظوری دے دی اور انہیں وطن واپس آنے کا مشورہ دیا۔

جب وہ وطن واپس آئے تو بھٹو نے کہا کہ جتنے سال آپ نے انگلستان میں گزارے ہیں۔ اتنی مدت کے لیے ہم آپ کی ملازمت میں توسیع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ پنشن لے لیں۔ لیکن قدرت اللہ نے بھٹو کی اس آفر کو تسلیم نہ کیا۔ بھٹو کی خواہش تھی کہ قدرت اللہ سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ قدرت اللہ فوری طور پر پنشن پانے کے حق میں تھا۔ قدرت اللہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھٹو کی خواہش کو رد کر دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت نے پنشنر بننے کے بعد ایک سال کے کنٹریکٹ پر ملازمت کرنا تسلیم کر لیا۔ جب ایک سال گزر گیا تو اطلاع دیے بغیر استعفٰے دیے بغیر' پاکستان ٹائمز میں ایک مضمون شائع کرا کر کہ "سی ایس پی ملازمت میں میں نے کیا پایا کیا کھویا" گھر آ بیٹھا۔

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو علم نہ تھا کہ یہ وہ کیوپو شہاب نہیں ہے جس کے ساتھ انہوں

نے صدر ایوب کے زمانے میں مل کر کام کیا تھا۔

آدھا آدمی

جب شہاب اور عفت لندن سے واپس آئے تو غالباً" کسی کو بھی پتہ نہ لگا کہ یہ قدرت اللہ آدھا آدمی ہے۔ اور اس کی بیوی ڈاکٹر عفت' وہ ڈاکٹر عفت نہیں ہے' بلکہ ایک بند بند ٹوٹی ہوئی خاتون ہے۔

جب قدرت چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا تو ابتدائی معائنے کے لیے ڈاکٹر نے اسے لٹا دیا۔ دیر تک ڈاکٹر اس کا معائنہ کرتا رہا۔ پھر دفعتاً" وہ چونکا۔

کہنے لگا' آپ یہاں کیسے آئے ہیں۔

قدرت اللہ اس سوال پر حیران ہوا۔ بولا' جناب میں گاڑی میں آیا ہوں۔

ڈاکٹر نے کہا' نہیں' یہ بتائیے کہ گاڑی سے میرے کمرے تک کیسے پہنچے ہیں' آپ۔

قدرت نے کہا' جناب چل کر آیا ہوں۔

ڈاکٹر بولا' چل کر آئے ہیں۔ نہیں میں نہیں مانتا یہ ہو نہیں سکتا کیوں کہ آپ کی بائیں ٹانگ میں دوران خون نہیں ہو رہا ہے۔

پندرہ سال قدرت اللہ اسلام آباد کی سڑکوں پر ایک مردہ ٹانگ کو گھسیٹتا رہا اور اس نے کسی پر ظاہر ہونے نہ دیا کہ ہر قدم اس کے لیے ایک عذاب ہے۔ صرف ٹانگ ہی نہیں' پتہ نہیں قدرت کے جسم کا کون کون سا جوڑ پورے طور پر نہ جڑا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ توڑنے والی طاقتوں نے اس غم و غصہ سے بھری ہوئی شدت سے ضربیں لگائی تھیں کہ جوڑنے کے عمل میں بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں اور ان جسمانی خامیوں کے ساتھ قدرت نے اپنی بقیہ زندگی بسر کی تھی۔ یہ بات آخری دم تک اس لیے راز رہی کہ قدرت میں برداشت کرنے کی قوت عام آدمی سے بہت زیادہ تھی اور جب دکھ حد تک پہنچ جاتا تھا تو اس میں وجدان کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

لندن میں عفت کو مسلسل فاقوں' میاں کی گرفتاری کا ڈر اور بیٹے کے اغواء کے خطرے نے کھوکھلا کر دیا تھا۔

پھر عفت کو زہرباد ہو گیا۔

حصّہ بقدرِ جُثّہ

بھائی جان نے سچ کہا تھا کہ جادو کے چھینٹے سب پر پڑیں گے جو جتنا قریب ہو گا اتنے ہی زیادہ۔

بھائی جان کی اہلیہ بغیر کسی وجہ سے بیمار پڑ گئی تھیں۔ ہفتوں ہسپتال میں رہیں بھائی جان ان کی خدمت کرتے کرتے چور ہو گئے تھے۔ بالآخر وہ فوت ہو گئیں۔

سائیں کرم دین صاحب فراش ہو گئے۔ دو سال چارپائی پر پڑے رہے۔ اٹھنا بیٹھنا ممکن نہ رہا' پھر وفات پا گئے۔

راجہ شفیع ریح کی تکلیف کی وجہ سے جہلم ہسپتال میں داخل ہوا اور ریح نے دل کو جکڑ لیا۔ وہ ہلاک کر دیا گیا۔

یقیناً" اشفاق پر بھی اثر ہوا ہو گا' لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور ہے۔

اس نے ہمیں کبھی کچھ نہیں بتایا۔

مجھ پر ایلی نے حملہ کر دیا تھا۔

سب پر کچھ نہ کچھ ہوا۔ لیکن عفت پر جو قیامت ٹوٹی اس کا حال بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

عفت نے کہا یہ بیماری نہیں اسرائیلی جادو ہے۔ جادوگر میرے گرد پھیرے لیتے رہتے ہیں۔ وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔

پھر عفت کی حالت خراب ہو گئی تو اسے میو ہسپتال لے گئے۔

دو دنیاؤں کے درمیان

شہاب نے بتایا کہ ہسپتال میں عفت فوت ہو گئی تھی۔ کئی ایک منٹ مردہ پڑی رہی۔ ڈرپ جو اسے لگی ہوئی تھی رک گئی۔ یوریا کو صاف کرنے کے لیے جو سیلائن واٹر کی بوتلیں لگی ہوئی تھیں وہ بھی رک گئیں۔

عفت نے بعد میں بتایا کہ وہ چلی گئی تھی۔ وہاں ماں جی' عفت کا مرحوم بھائی اور بیٹا آ گئے۔ کہنے لگے' نہیں ابھی نہیں۔ ابھی تم واپس جاؤ۔ عفت نے کہا' اللہ کے واسطے مجھے واپس نہ بھیجو۔ میں واپس جانا نہیں چاہتی۔

اس کے بعد اوپر سے پروانہ آ گیا کہ' ابھی نہیں ابھی کچھ انتظار کرو اور وہ مجھے واپس چھوڑ گئے۔

اس پر ہسپتال کے ڈاکٹروں نے کہا کہ یہ کیس ہمارے بس کی بات نہیں ہے کبھی دل حرکت کرنا بند کر دیتا ہے۔ کبھی خود بخود چل پڑتا ہے۔ کبھی بیماری یوں ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے کبھی ہوئی ہی نہ تھی۔ آپ انہیں گھر لے جائیں۔

پھر وہ عفت کو بانو کے گھر لے آئے۔

بانو دل و جان سے اس کی خدمت میں لگ گئی۔ لیکن ان دنوں عفت کی کیفیت عجیب سی تھی۔ وہ سائیکک ہو چکی تھی۔ وہ اس دنیا میں خود کو ایڈ جسٹ نہ کر سکی۔ وہ پورے عزم سے "ول" کرتی کہ واپس چلی جائے اور یوں کومے میں چلی جاتی۔ پھر جاگتی' پھر ہوش کھو دیتی۔ وہ کئی ایک دن دونوں جہانوں میں یوں لٹکتی رہی جیسے گھڑی کا پنڈولم لٹکتا ہے۔ کبھی ادھر' کبھی ادھر۔

بانو کا بیان

بانو نے بتایا کہ عفت ذہنی طور پر اس حد تک اس دنیا میں جی رہی تھی کہ جب عفت ادھر آتی اور دیکھتی کہ بانو اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی ہے تو وہ حیرت سے پوچھتی' بانو تو ادھر کیسے آ گئی۔ نہ نہ نہ' جا واپس چلی جا۔ وہاں اشفاق تیرا انتظار کر رہا ہے۔ اسے تیری ضرورت ہے۔ جا چلی جا۔ پھر وہ پورے ہوش میں آ جاتی تو کہتی' بانو تجھے نہیں پتہ یہ بیماری نہیں یہ جادو ہے۔ جادوگر میرے گرد پھیرے لیتے رہتے ہیں۔ دراصل یہ ایک جنگ ہے خیر و شر کی جنگ۔

ان دنوں عفت بہت کم لوگوں کو پہچانتی تھی۔ شہاب کو قدسیہ کو اور اپنی ہمشیرہ کشور کو۔

ایک روز پتہ نہیں وہ کیسے موڈ میں تھی۔ بڑی خوش تھی۔

کہنے لگی' مجھے پتہ تھا کہ شہاب زیادہ دیر نہیں جیں گے اور بیٹے کی پرورش مجھے کرنی ہو گی۔

مجھے غفور صاحب نے بتایا تھا' پھر مسز دین نے بتایا' کہتی تھی' مجھے خود شہاب نے بتایا ہے کہ اس کی زندگی سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں ہے' یہ اچھا ہے کہ ثاقب کی پرورش عفت کرے گی۔ وہ مجھ سے بہتر جانتی ہے کہ لڑکے کو کیسے تربیت دینی چاہیے۔

عفت نے کہا۔ اس کے بعد جب ہم مدینہ منورہ گئے۔ تو پہلے تو میں نے عرضی پیش کی کہ یا حضور بچے کی پرورش کے لیے اس کے باپ کی زندگی دراز کر دیجیے۔ میری زندگی ان کو عطا کر دیجیے۔

پھر میں ضد کر کے بیٹھ گئی کہ حضور سائل کی درخواست کا جواب مرحمت ہو۔ تب تک سائل حضور کے قدموں میں بیٹھی ہے۔ میں وہاں بیٹھی رہی' بیٹھی رہی' پھر مسجد نبویؐ کا ایک خادم آیا بولا' جا بی بی' خیر ہی خیر ہے۔

پھر قدرت نے فیصلہ کر لیا۔ بولا' یہاں پاکستان میں بات نہیں بنے گی۔ شاید لندن میں علاج ہو سکے۔ اس نے عفت کو لندن لے جانے کی تیاری شروع کر دی۔

نور بابا کے ڈیرے کے دو خادم جو پڑھے لکھے تھے قدرت سے آ ملے۔ کہنے لگے' لندن جانا غلط اقدام ہے۔ آپ انہیں ڈیرے پر بھیج دیں۔ انشاء اللہ شفا ہو گی۔ پھر سب عزیز و اقارب نے مشورہ دینا شروع کر دیا ان سب کا خیال تھا کہ یہیں علاج کروایا جائے۔

نور بابا کے ڈیرے میں ایک بہت تجربہ کار معالج بھی تھا' اس نے کہا' میں ایسے بیسیوں مریضوں کو رو بصحت کر چکا ہوں' آپ انہیں لندن نہ لے جائیں۔ یہیں علاج ہو جائے گا۔

قدرت تذبذب میں پڑا تھا۔ اسے پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کرے۔

میں نے پوچھا آپ کیوں کشمکش میں مبتلا ہیں۔

کہنے لگا' میرے مشورہ کاروں میں صیہونی اثر تلے کام کرنے والے لوگ بھی ہیں۔ یہ معالج تو یقیناً" زیر اثر ہے۔

کیا نور بابا جانتے ہیں' میں نے پوچھا۔ ہاں وہ بولا' انہیں پتہ ہے۔ کہتے ہیں یہ میری آزمائشیں ہیں۔

تو پھر آپ چلے کیوں نہیں جاتے۔

عفت پہلے بھی لندن کے ہسپتال میں گئی تھی۔ شہاب نے کہا وہاں اس کے جسم پر چھالے

ہی چھالے نکل آئے تھے۔ منہ میں چھاپے زبان پر چھالے حلق میں چھالے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سانس مشکل سے آتی تھی۔ پورے بارہ دن کھانا پینا بند رہا۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا۔ ذہن فیوز ہو گیا ہے۔

بانو کے گھر میں عفت بار بار کوما میں چلی جاتی تھی۔

قدرت اللہ شش و پنج میں پڑا تھا کہ لندن لے جاؤں یا نہیں۔

میں ایک ڈرپوک آدمی ہوں۔ کرا سس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میں لاہور سے بھاگ آیا۔

اور عفت لندن چلی گئی اس کے ساتھ اس کی ہمشیرہ تھی۔

بانو اتنے دن کھٹالی میں پڑی رہی کہ پگھل کر پانی ہو گئی۔ وہ لندن چلے گئے' تو بانو چھلک چھلک کر چھینٹے بن کر بکھر گئی۔

آخری باب

بانو شہاب کی لگن میں اس قدر کھو چکی تھی کہ ہر بات میں اس سے پوچھتی تھی۔ کیا کروں۔ ہم سب میں صرف بانو ہی کو شہاب پر حق الیقین تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر بانو نے مردا بریشم میں ایسے واقعات کیوں نہ درج کیے جو شہاب نامے کے آخری باب کی تصدیق کرتے۔

بانو نے یہ چشم دید واقعات شاید اس لیے بلیک آوٹ کر دیئے کہ قدرت اللہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی زندگی کے ایسے واقعات کو نشر کیا جائے' لیکن اگر قدرت چاہتا تھا کہ اس کی زندگی کے ایسے واقعات کو راز رکھا جائے تو اس نے شہاب نامے میں آخری باب کا اضافہ کیوں کیا۔

قدرت اللہ نے آخری باب کے علاوہ شہاب نامے کے تمام باب ہمیں پڑھ کر سناتے تھے۔ آخری باب میں نے قدرت کی وفات کے بعد پڑھا۔ اگر وہ آخری باب مجھے سنا دیتا' تو میں ضد کر کے بیٹھ جاتا کہ میری جان یا تو اس آخری باب کو حذف کر دیجیے اور شہاب نامے کے سارے باب از سر نو لکھیے۔

میرا اندازہ ہے کہ قدرت کا آخری باب لکھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ آخری باب لکھنا اس پر عاید

کر دیا گیا تھا۔

بہرحال اگر قدرت شہاب نامے میں آخری باب شامل نہ کرتا تو میں الکھ نگری نہ لکھتا۔

بہرحال عفت کو علاج کے لیے لندن بھیج دیا گیا۔ اس کے ساتھ اس کی قریبی عزیزہ چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد لندن سے ایک تار آیا۔ لکھا تھا۔

Iffat resisting death come

اس تار کو دیکھ کر شہاب اور اس کا بیٹا ثاقب دونوں لندن چلے گئے۔

تقریباً ایک مہینے بعد ۷۴-۱-۱۰ [ا] کا لکھا ہوا شہاب کا خط ملا۔ جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

بائے فرینڈ

ہم یہاں پہنچے تو عفت کوما میں تھی۔

پانچ چھ روز تک ثاقب کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ ملی۔

اس بار حملہ بے حد شدید تھا۔

لاہور سے کئی سوگنا زیادہ۔

دو روز میں بے چاری کا دل بارہ مرتبہ رکا۔ مشینوں سے Revive کیا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ اب وہ رو بصحت ہے۔ ابھی چھ سات ہفتے اور ہسپتال میں رہنا پڑے گا۔

اس کے بعد خبر آئی کہ قدرت اللہ ریل گاڑی میں کنیٹربری کے ہسپتال میں جاتا ہے جہاں عفت داخل ہے۔ گھنٹوں عفت کے پاس چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔

عفت کی پڑوسن مریضہ نے یہ دیکھ کر کہا' بی بی تیرا یہ بائے فرینڈ تجھ سے بڑا پیار کرتا ہے۔ آنے میں کبھی ناغہ نہیں کرتا اور پھر آکر گھنٹوں تیرے سامنے بیٹھ رہتا ہے۔

عفت نے کہا' یہ میرا میاں ہے۔

ا۔ اصل خط ضمیمے میں ملاحظہ کریں۔ خط نمبر XXV

پڑوسن بولی' میں نہیں مانتی کبھی خاوند بھی بیوی سے اتنا لگاؤ رکھتے ہیں۔

عفت کی وفات

پھر خاموشی چھا گئی' لندن سے کوئی خبر نہ آئی۔ البتہ افواہیں سننے میں آتی رہیں۔ میرے ایک جاننے والے نے لکھا کہ عفت کی بیماری اسے چھوڑ گئی ہے اور اب وہ بالکل صحت مند ہے۔ شہاب' عفت اور ثاقب ایک مکان میں رہتے ہیں۔ وہ تینوں بڑے مطمئن ہیں' آرام سے زندگی گزار رہے ہیں' یوں جیسے پک نک پر ہوں۔

مجھے ان خبروں پر یقین نہیں آتا تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جادو کا اثر یوں اڑ جائے۔ اگر جادو کا اثر زائل بھی ہو جائے تو بھی ٹوٹتے ہوئے اعضا کو جوڑنے والے ہتھوڑا چلا رہے ہوں گے۔

جیسے شہاب سے ہوا تھا۔

شہاب کا کوئی خط موصول نہ ہوا کہ راز کھلتا۔ شاید شہاب بات بتانا نہ چاہتا ہو۔

میں انتظار میں بیٹھ گیا کہ کبھی آئے گا اور چھلکن کی صورت پیدا ہو گئی تو شاید بات کھلے۔

پھر دفعتاً خبر آئی کہ عفت وفات پا گئیں۔

پتہ چلا کہ کوئی بیماری نہ ہوئی۔ ہارٹ اٹیک نہ ہوا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ ایک دن اطمینان سے چارپائی پر لیٹ گئی اور فوت ہو گئی۔

عفت کی وفات کے بعد جب قدرت واپس آیا تو میں اسے دیکھ کر ڈر گیا۔

پہلے جب وہ واپس آیا تھا تو آدھا آدمی تھا۔

اب وہ محض ایک ایسا کھگا تھا۔ جس میں سے شہد چو گیا ہو۔

پھر جلد ہی چھلکن ہوئی۔ اتفاق سے میں موجود تھا۔

میں نے عفت کی بات چھیڑ دی۔

وہ میری باتیں سنتا رہا' لیکن خاموش بیٹھا رہا۔ آنسو آتے رہے اور وہ پیتا رہا۔ میرے سامنے مشہور نظم "ہوم دے براٹ ہر وار پر ڈیڈ" کا نقشہ کھنچ گیا۔

میں نے کہا' شہاب صاحب آپ تو کہتے تھے کہ آپ چلے جائیں گے اور ثاقب کی تربیت

عفت کرے گی۔

کیا میں نے کہا تھا' وہ حیرت سے بولا۔

ہاں میں نے جواب دیا۔ آپ نے مجھ سے نہیں دین سے کہا تھا۔

میں کیا کر سکتا تھا' وہ بولا۔ عفت مدینے شریف سے احکامات لے آئی تھی۔ میں مجبور ہو گیا۔ ساری بات الٹ ہو گئی۔

پھر بند ٹوٹ گیا اور بات کھل کر سامنے آگئی۔

بولا' جب ہم لندن پہنچے تو عفت کوما میں تھی۔ انہوں نے کہا' ملاقات بے کار ہے کوما سے جاگے گی تو آپ اسے مل لینا۔

ڈاکٹروں نے شاک دیے۔ جو ممکن عمل ہو سکتا تھا کیا' لیکن کوما نہ ٹوٹا۔ چند ایک دن گزر گئے۔

پھر ہم نے دوبارہ درخواست کی تو ڈاکٹر مان گئے بولے'

ملاقات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوما ٹوٹنے کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں ہم گئے تو وہ بے ہوش پڑی تھی۔

دیر تک ہم خاموش کھڑے رہے۔ اسے دیکھتے رہے پھر ثاقب کا صبر ٹوٹ گیا۔ اس نے چلا کر آواز دی ——— امی عفت نے آنکھیں کھول دیں۔

ڈاکٹر حیران ہو گئے۔ یہ کیا ہوا۔

ساری رات ہم باپ بیٹا اللہ کے حضور سرنگوں رہے۔

منتیں کرتے رہے۔

اگلے روز ڈاکٹر نے بتایا کہ عفت کی بیماری دور ہو چکی ہے۔ لیکن شدت کی کمزوری باقی ہے۔ اسے چھ ہفتے ہسپتال میں رہنا ہو گا۔ اس کے بعد وہ گھر جا سکتی ہے۔

یہ کیسے ہوا میں نے قدرت سے پوچھا۔

مہلت

پتہ نہیں' وہ بولا' شاید اللہ تعالیٰ کو ہماری منتوں اور ترلوں پر ترس آگیا اور انہوں نے

مہلت عطا کر دی۔ ہم باپ بیٹے کی صرف اتنی سی درخواست تھی کہ یا باری تعالیٰ ہم تینوں ماں باپ اور بیٹا کبھی اطمینان اور سکون سے گھر میں نہیں رہے۔ ہمیں مہلت عطا کر کہ ہم تینوں ایک گھر میں آرام و سکون سے کچھ عرصہ اکٹھے رہیں۔

جب عفت ہسپتال سے ڈسچارج ہوئی تو ہم تینوں ایک مکان میں آرام اور سکون سے رہنے لگے۔ صرف ثاقب کو علم نہ تھا کہ ہمیں مخصوص عرصے کے لیے مہلت عطا کی گئی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ بیماری دور ہو گئی ہے۔

ہم دونوں کو پتہ تھا کہ مہلت ملی ہے اور ہم دونوں اس کوشش میں لگے رہتے کہ کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے کہ ثاقب کو پتہ چل جائے۔

وہ عجیب دن تھے' وہ بولا' اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ ہم ایک ایک دن گنتے رہتے تھے۔ ایک ایک گھنٹہ گزرنے کا احساس ہوتا تھا۔ آج کا دن گزر گیا۔

اب اتنے دن باقی رہ گئے۔ صرف اتنے دن۔

شہاب نامے میں صرف دو مضمون ہیں۔ جن میں جذبہ ہے' دکھ ہے' آنسو ہیں' ماں جی اور عفت۔ عفت کا مضمون شہاب نے ان دنوں لکھا تھا جب وہ دن گن رہے تھے۔

عفت کا مضمون پہلے ایک ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ جس نے بھی اسے پڑھا اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

شہاب نامے میں عفت کے باب میں کرنل اطہر کی تحریر بھی شامل ہے اس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"سعیدہ بھابھی سیالکوٹ سے آئی تھیں۔

کہنے لگی' سیارہ ڈائجسٹ میں شہاب نامہ میں عفت کی موت کا ذکر ہے۔ میں پڑھتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔

میں اس روز سرگودھا دورے پر جا رہا تھا راستہ بھر اس کا خیال رہا کہ قدرت اللہ شہاب نے ایسی کیا چیز لکھی ہے کہ انسان روتا رہے۔

سرگودھا کے ایئر فورس میں جا کر ٹھہرا اور سب سے پہلے اگست ۱۹۷۴ء کا سیارہ ڈائجسٹ منگوایا اور وہ مضمون ایک دو تین دفعہ پڑھا۔

یہ بھی عجیب بات ہے قدرت اللہ شہاب کا ماں جی جب پڑھا تھا۔ تو فوراً" وضو کر کے ماں جی کی روح کو ایصال ثواب پہنچایا تھا۔ شہاب کی تحریریں اور میرے اس جذبہ میں کیا تعلق ہے۔ میں نہیں جانتا صرف بیان کر سکتا ہوں۔

شہاب نامے میں عفت کا باب پھر سے پڑھیے۔

دو جون کا دن ہے۔ میاں بیوی دونوں ایک پارک میں بیٹھے پک نک منا رہے تھے۔

عفت کی بیماری اسے قطعی طور پر چھوڑ چکی ہے۔

باپ ماں بیٹا ایک گھر میں رہ رہے ہیں۔ انہیں ایسی فراغت حاصل ہے جو شاید پہلے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ میاں بیوی کو جو ایک دوسرے سے رومانی قرب حاصل ہے پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔

عفت خود کہتی ہے' بہشت شاید ایسا ہی ہو گا۔

ان باتوں کے باوجود تحریر میں دکھ بھرا ہوا ہے۔ لفظوں میں نہیں۔ بین السطور میں دکھ بھرا ہے۔ جو بھی پڑھتا ہے روتا ہے۔ کیوں' اس لیے کہ میاں بیوی دونوں کو علم ہے کہ عفت کے انتقال میں صرف پندرہ دن باقی ہیں اور وہ دونوں آپس میں یوں باتیں کر رہے ہیں جیسے آپس میں مل نہیں رہے بلکہ بچھڑنے والے ہیں۔

پھر عفت بڑے لاڈ پیار سے اپنی وصیت بتاتی ہے۔

اس مضمون میں جو دکھ بھرا ہے وہ عفت کی موت کا دکھ نہیں ہے۔ بلکہ دونوں میاں بیوی میں اس احساس کا دکھ ہے کہ عفت جا رہی ہے۔ یہ قہقہہ اس کا آخری قہقہہ ہے۔ یہ اس نے آخری بار مجھے کو کا کہہ کر بلایا ہے۔ اور پھر شہاب کے دکھ کو اس احساس نے اور بھی گہرا کر دیا ہے کہ عفت اپنی زندگی مجھے دان کر گئی ہے۔

اس مضمون میں میرا ذکر بھی ہے۔

جاننا اور ماننا

پتہ نہیں شہاب نے عفت کے منہ میں یہ الفاظ کیوں ڈال دیئے کہ ممتاز مفتی تمہیں میری نسبت بہتر جانتا ہے۔

ابتدائی ایام میں میں نے ایک دن عفت سے کہا تھا۔

میں نے کہا' ڈاکٹر مجھے ایک بات بتاؤ گی۔

کہنے لگی' پوچھیے۔

میں نے کہا' سچ سچ بتانے کا وعدہ کرو تو پوچھوں۔

بولی' کیوں جھوٹ بولوں گی خواہ مخواہ۔

میں نے کہا' یہ بتاؤ کہ قدرت اللہ شہاب کون ہے۔

وہ سٹپٹا گئی۔ بولی' کیا مطلب۔

میں نے کہا' لگتا ہے قدرت اللہ شہاب کوئی ہے۔

He is some body لیکن کیا ہے۔ کون ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بولی' میری بھی سمجھ میں نہیں آتی———— مفتی جی جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں میری تو مت ماری گئی ہے۔ کبھی کسی کمرے سے تازہ پھولوں کی خشبو آنے لگتی ہے۔ کئی کئی دن آتی رہتی ہے۔ شہاب اس کمرے کو لاک کرا دیتے ہیں کہ کوئی اندر نہ جائے۔ کبھی کسی کمرے سے قرآن خوانی کی آوازیں آتی ہیں۔

تو مجھ سے ایک معاہدہ کر لے۔ میں نے کہا۔

بولی' کیا۔

میں نے کہا' اگر مجھ پر بھید کھلے تو میں تجھے بتادوں گا' تجھے بھید کا پتہ چلے تو تو مجھے بتا دینا۔

کہنے لگی' ٹھیک ہے۔

پھر ایک روز آدھی رات کے بعد غالباً" ایک بجے اس نے مجھے فون کیا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی کہنے لگی' شہاب ابھی تک گھر نہیں آئے۔

میں نے کہا' اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کسی فنکشن میں پھنس گئے ہوں گے۔

کہنے لگی' میں سب انکوائری کر چکی ہوں۔ کوئی فنکشن نہیں تھا۔

میں خود گھبرا گیا۔ اچھا میں جاتا ہوں۔

وہ بولی آج تک مجھے بتائے بغیر وہ اتنی دیر باہر نہیں رہے۔ وہ رونے لگی۔

تو رو رہی ہے ڈاکٹر' میں نے حیرت سے پوچھا' تو بڑی تھڑدلی ہے۔

رسمی معمولات

۵۱۔ داستان سرائے
۵۲۔ محشر رسول نگری
۵۳۔ پیر خانہ
۵۴۔ پاکستان
۵۵۔ چھوٹا منہ



ثاقبہ رحیم الدین



رفیق وہرو



سویرا، نیلو، نقش (بیٹیاں)



محشر رسول نگری



صدیق راعی

بولی نہیں تھڑدلی نہیں۔ مجھے ہر دم ان کی سلامتی کا فکر رہتا ہے وہ گھرے ہوئے ہیں۔ اس نے فون بند کر دیا۔۔

میں اٹھ کر کپڑے پہننے لگا۔ ساتھ ہی سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں کہ فون پھر بجا۔ میں نے چونکا اٹھایا۔ شہاب بول رہا تھا۔

کہنے لگا' آپ تکلیف نہ کریں۔ میں صحیح سلامت گھر پہنچ گیا ہوں۔

میں نے دھیمی آواز میں پوچھا' کوئی فرانسیسی تھی۔

ہنس کر بولا' نہیں۔

میں نے کہا' تو دیسی مال تھا کیا۔

بولا نہیں۔ دی فورسز بیانڈ۔

میں نے کہا' یہ چمگادڑیں بھی تو فورسز بیانڈ کی ایجنٹ ہیں۔

بولا'' کل بات کریں گے اور فون رکھ دیا۔

مفت میں کھٹ گئی

جب وہ ہالینڈ جا رہے تھے تو میں نے عفت سے کہا' ڈاکٹر تو نے معاہدے کا پاس نہیں کیا۔

بولی' کون سا معاہدہ ؟

میں نے کہا' تو جان گئی ہے کہ شہاب کون ہے' لیکن تو نے مجھے بتایا نہیں۔

بولی' نہیں مفتی جی میں تو کچھ بھی نہیں جان پائی۔ مجھ پر بھید نہیں کھلا۔ صرف ایک بات کا پتہ چل گیا ہے۔

کیا' میں نے پوچھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں بجانے لگی اور یوں جھومنے لگی جیسے جھولے پر بیٹھی ہو۔ بولی مفتی جی میں تو مفت میں ''کھٹ'' گئی۔ مفت میں ''کھٹ'' گئی۔

کیا کھٹ لیا' میں نے پوچھا۔

سب کچھ۔ سبھی کچھ' اس نے جھومر ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ اسے جانے بغیر مان چکی تھی۔

میں تذبذب میں پڑا تھا۔ مانتا تھا پھر جانے لگتا۔ پھر مان جاتا۔
پھر جانے لگتا' یوں نہ ماننا نصیب ہوا نہ جاننا۔
شہاب کی وفات کے بعد مجھے لندن سے بلاوا آگیا۔
الطاف گوہر نے افتخار عارف کے اردو مرکز کی جانب سے بلایا تھا۔
مجھے لندن دیکھنے کا شوق نہ تھا۔ سوچا چلو دوستوں سے مل آؤں گا۔ الطاف گوہر تھا۔ یوسفی تھا' افتخار عارف تھا' محمود ہاشمی تھا۔ پروین بھی ان دنوں وہیں تھی اور ڈاکٹر مزمل مفتی تھا۔
لیکن سب سے زیادہ تمنا مجھے عفت کی قبر دیکھنے کی تھی۔
میں نے پروین عاطف کو خط لکھا۔ اللہ کے واسطے وہیں رہنا۔ چلی نہ آنا۔ میں آ رہا ہوں۔ اگر تم نہ ہوئی تو کتا شیش محل میں کھو جائے گا۔
وہاں میں صرف آٹھ دس دن رکا۔
الطاف گوہر نے اپنا پبلک ریلیشنز افسر مسٹر جان کو میرے پاس بھیج دیا کہ جاؤ مفتی کو جگہیں دکھا دو۔ مجھے جگہیں دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ مجھے زبردستی وسٹ منسٹر ایبے میں لے گیا۔ اتنے مردے دیکھ کر چار دن سر درد رہا۔ افتخار عارف نے کہا' کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا' مجھے کسی بھرے چوک میں چھوڑ آؤ۔ میں لندن کے لوگوں کو دیکھوں گا۔
دل کی بات میں نے کسی کو نہ بتائی۔ گڈی آئی تو میں نے اس سے بات کی۔ میں نے کہا۔
چل مجھے عفت کے پاس لے چل۔
کینٹر بری پہنچا تو ایسے لگا جیسے میں اسے جانتا تھا۔ گرجا بھی مانوس تھا' جیسے لندن کی گلیاں مانوس تھیں۔ ہم زندگی بھر کتابوں میں لندن اور اس کے مضافات ہی دیکھتے رہے تھے۔
کینٹر بری میں اس روز سیل کا میلا لگا ہوا تھا۔ وہاں بڑی عورتیں تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بھی پاکستانی خواتین کی طرح مظلوم ہوں۔ میاں کا ظلم سماج کا ظلم' اولاد کا ظلم۔
پھر میں عفت کی قبر پر کھڑا تھا۔ اس قبر کا رخ سارے قبرستان سے الگ تھا۔
میں نے فاتحہ پڑھی۔ پھر زیر لب کہا' اب تو تم جان گئی ہو گی۔
میں نے سر اٹھایا۔ وہ قبر کے اوپر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں بجا رہی تھی۔ مفتی جی میں تو ایویں ہی کھٹ گئی۔ ایویں مفت میں کھٹ گئی۔ سب کچھ۔ سبھی کچھ۔

اکیاون واں باب

داستان سرائے

اپنے شخصیتوں کے دوسرے مجموعے "اور اوکھے لوگ" کا انتساب میں نے "داستان سرائے" کے نام کیا ہے' جہاں میں نے زندگی کے بہترین لمحات گزارے ہیں۔

اشفاق احمد

داستان سرائے زندگی بھر میرا "ہوم" رہا۔ میرا اپنا گھر کبھی "ہوم" نہ بن سکا۔ وہ ہمیشہ ہاؤس ہی رہا۔ اپنے گھر میں میں ہمیشہ بیگانہ رہا۔ یہ نہیں کہ میرے گھر والوں نے مجھے بیگانہ سمجھا۔ وہ تو مجھے سمجھتے رہے' لیکن میں خود کو بیگانہ سمجھتا رہا۔

اشفاق احمد میرا بہت پرانا دوست ہے۔

اشفاق احمد کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔

ہم چوالیس سال سے ایک دوسرے کے قریب رہ رہے ہیں۔ اس دور میں بھی جب وہ اشفاق احمد نہیں بنا تھا' صرف شفو تھا اور اس دور میں بھی جب وہ اشفاق احمد بن گیا ہے۔

اشفاق احمد نے مجھے ایک سویٹ ہوم عطا کیا۔

اشفاق احمد نے مجھے ایک ماں عطا کی۔ جتنی ممتا بھری محبت بانو نے مجھے دی ہے' جتنی

خدمت اس نے کی ہے، کسی اور نے نہیں کی۔ جتنی اپنائیت مجھے کیسی سیری نو کی بانو کے بچوں نے اور اس کی امی مسز جنتھہ نے دی ہے کسی اور نے نہیں دی۔

اردو ادب میں میں نے اشفاق احمد سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

جب میں ریٹائرمنٹ کے بعد مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا تو اشفاق احمد نے اردو بورڈ میں مجھے ایڈیٹر کی آسامی پر تعینات کر دیا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قدرت اللہ شہاب جو میری زندگی کا عظیم ترین مشاہدہ ہے۔ وہ بھی اشفاق احمد کی دین ہے، چونکہ بنیادی طور پر وہ اشفاق احمد کا دوست تھا۔

اشفاق احمد ہی نہیں اس کے سارے بھائی، قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

اشفاق احمد کے والد بڑے خان خوب آدمی تھے۔ ان کی قابلیت ہفت رخی تھی۔ ساتھ ہی وہ بڑے جابر ہیڈ آف دی فیملی تھے، جب وہ گھر میں پاؤں دھرتے تو سناٹا چھا جاتا۔ ان کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا تھا۔ گھر میں سب سے بڑی پرابلم یہ تھی کہ کس طریقے سے بڑے خان صاحب کو رام کیا جائے۔ غالباً" اسی وجہ سے سب بھائیوں میں احتیاط، مصلحت اور دنیا داری کی خصوصیت پرورش پا گئی۔ صرف ایک بھائی کے اندر ری ایکشن پیدا ہوا۔ اسے کہہ دینے کی عادت پڑ گئی۔ منہ پر کہہ دینے کی۔ سچ کہہ دینے کی۔ دنیا داری سے بے نیاز، غصیل، عمل کا متوالہ۔

اشفاق کو ابتداء سے ہی دل کی بات کہہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔

میری دانست میں اشفاق احمد کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کی شادی بانو قدسیہ سے ہو گئی۔ اگرچہ بظاہر اس شادی کی وجہ سے دونوں میاں بیوی پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

تلقین شاہ

اشفاق کی شخصیت دو حصوں میں بانٹی جا سکتی ہے۔ ایک تو وہ دور جس میں وہ اشفاق احمد تھا۔ اور دوسرے وہ جب وہ شاہ صاحب بن گیا۔

وہ ایک عام سا ریڈیو پروگرام تھا، ''حسرت تعمیر'' جو اشفاق نے سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے

شروع کیا تھا۔ اس پروگرام میں اشفاق نے شاہ جی کا رول اپنا لیا۔

اشفاق احمد اچھا اداکار بھی ہے۔ اس کی وجہ اس کا کان ہے۔ اس کا کان عام لوگوں سے زیادہ سنتا ہے اور اس کا حلق سنی ہوئی آواز کو ہو بہو ری پروڈیوس کر سکتا ہے۔

پتہ نہیں یہ کیسے ہوا کہ اشفاق احمد نے پروگرام کے شاہ صاحب کو ایک منفی کردار عطا کر دیا۔ خسیس' مردم آزار۔ منہ پر اور' پیٹھ پر کچھ اور عام طور پر ریڈیو والے رسمی چیزیں پیش کرتے ہیں' رسمی اور اخلاقی۔ انہوں نے کبھی منفی کردار پیش کرنے کی اجازت نہ دی تھی۔ لیکن اشفاق احمد کا شاہ صاحب چل نکلا۔ سامعین نے شاہ صاحب کے منہ سے اپنے اندر کی خباثتوں کا ذکر سنا تو نہال ہو گئے۔ پھر اس پروگرام کا نام تلقین شاہ رکھ دیا گیا۔ اور اشفاق پٹھان سے سید بن گیا۔

یہ پروگرام اس قدر پاپولر ہوا کہ بات کہاں تک جا پہنچی۔ ہوا یہ کہ ایک روز پروگرام کے دوران شاہ صاحب نے اپنے ملازم ہدایت اللہ سے کہا کہ ٹوکرا لے جاؤ اور مالٹے اور کنو کے چھلکے جہاں بھی پڑے ملیں' انہیں ٹوکرے میں ڈال کے لے آؤ۔

ہدایت اللہ نے پوچھا' شاہ جی چھلکے اکٹھے کرنے کا کیا فائدہ ہو گا۔

شاہ جی نے کہا' احمق تجھے نہیں پتہ ہم ان چھلکوں کو اپنے صدر دروازے کی سائیڈ پر ڈھیر کر دیں گے۔

ہدایت اللہ نے پوچھا' آقا اس کا کیا فائدہ ہو گا۔

شاہ جی بولے' محلے والے دیکھیں گے۔ ان کے دلوں میں ہماری امارت کا رعب پڑے گا۔ ہمارا سوشل سٹیٹس اونچا ہو گا۔

یہ پروگرام ریڈیو سے رات کو نشر ہوا۔

صبح اشفاق احمد باہر نکلا تو دیکھا کہ صدر دروازے کی سائیڈ پر مالٹے اور کنو کے چھلکوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔

شہرت کا گھنگھرو

اشفاق احمد یہ دیکھ کر چھن۔ نن' نن' نن ہو کر رہ گیا اس کے اندر کا گھنگھرو بج گیا۔ پھر وہ گھنگھرو بار بار بجا حتیٰ کہ ٹیلی ویژن کے اور ڈراموں کے دوران گھنگھرو کے ساتھ مردنگ بھی

گونجا۔ اس کے بعد اشفاق احمد کی شخصیت کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔

اس کے پروانوں نے اسے ہوا دی۔ غبارہ ابھرا۔ ابھرتا گیا۔

اشفاق احمد بنیادی طور پر ایک شریف النفس انسان ہے۔ اس کے اندر خیر کا عنصر حاوی ہے۔ اسے غصہ ضرور آتا ہے' لیکن وہ اسے نکالنا نہیں جانتا۔ لہٰذا اندر چڑ چڑ ہوتی رہتی ہے۔ بھٹیاری دانے بھونتی رہتی ہے۔ اس کا غصہ خود کو ضرب لگاتا رہتا ہے۔ لہولہان کر دیتا ہے۔

اشفاق احمد کسی کے خلاف سازش نہیں کر سکتا۔ اپنی پارٹی نہیں بنا سکتا۔ جال نہیں پھیلا سکتا۔

اسے شہرت کھا گئی۔

کہنے لگا' ادب کا حلقہ بہت چھوٹا ہے۔

میرا پیغام وسیع تر ہے۔

اس لیے میں میڈیا کا آدمی ہوں۔

ان دنوں اسے علم نہ تھا کہ میڈیا تو سرکار کی باندی ہے ٹی وی شہرت کا بھانبڑ تو لگا دیتی ہے' لیکن بھڑ بھڑ جلنے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کی مٹھی رہ جاتی ہے۔

شہرت نے ہم دونوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دی' پھر بھی ہمارے تعلقات جوں کے توں قائم رہے۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ وہ سلف سفیشنٹ اور سلف سینٹرڈ ہو گیا۔ دال کا وہ دانہ بن گیا جو گلتا نہیں۔ پھر بھی میرے لیے کوئی فرق نہ پڑا۔ اس کا گھر تھا۔ بانو تھی' مسز جتھہ تھی' سیری تھا' کیسی تھا' ثوئیلہ تھی' نوکی تھا۔ اس بہشت سے مجھے کوئی نکال نہ سکتا تھا۔

قدرت اللہ بھی اشفاق کے گھر آیا کرتا تھا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب داستان سرائے تعمیر نہ ہوا تھا۔ اشفاق اور بانو سمن آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ اس میں دو تین پیڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو ایک کالی سیاہ ہانڈیاں چولہے پر چڑھی رہتی تھی۔ ایک فرائی پین اور ایک لوہے کی کڑاہی دیوار سے لگی رہتی تھی۔

ہم اس باورچی خانے میں ٹھس ٹھسا کر بیٹھ جاتے بانو پکاتی اور ہم کھاتے۔

بناسپتی اور اصلی

وہاں قدرت اللہ آ جاتا۔ بڑے ادب سے بانو کی خدمت میں عرض کرتا۔ بیگم صاحبہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے میاں کو دو گھنٹے کے لیے باہر لے جاؤں۔ یقین جانیے میں دو گھنٹے کے اندر اندر آپ کے میاں کو واپس ڈیلیور کر دوں گا۔

بانو کہتی' آپ کھانا کھالیں پھر بے شک۔

نہیں محترمہ' وہ جواب دیتا' کھانے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ کہیں باہر سے نان کباب کھالیں گے۔

جب بھی میں لاہور جاتا تو بانو مجھ سے شکایت کرتی تھی' کہتی' اشفاق کا ایک نیا دوست بنا ہے جب بھی آتا ہے ہم سے بات نہیں کرتا۔ ایک بیگانہ انداز سے اجازت مانگتا ہے اور خان کو باہر لے جاتا ہے۔ ہمیں گھاس نہیں ڈالتا۔

کوئی بڑا احمق ہے' میں اسے جواب دیتا' جو تم جیسی خاتون سے رابطہ نہیں رکھتا۔

وہ ہنستی' مفتی جی آپ مجھے مکھن نہ لگایا کریں۔

میں کہتا' میں کیا لگاؤں گا وہ تو اللہ نے لگا کر بھیجا ہے۔

بانو بہت بڑی طاقت ہے اس کے پاس دو بہت مہلک ہتھیار ہیں۔ افیکشن اور خدمت۔

آہستہ آہستہ اس نے قدرت اللہ کو رام کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ اسی باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر سرسوں کا ساگ' پائے اور دال چاول کھانے لگا۔

پھر قدرت اللہ سے میں متعارف ہو گیا۔ اشفاق نے تعارف کرا دیا۔ پہلے تو میں اسے ملنے سے گریز کرتا رہا۔ چونکہ میں پیدائشی طور پر چھوٹا آدمی ہوں اس لیے بڑے افسروں سے الرجک ہوں۔

پھر آہستہ آہستہ مجھے پتہ چلا کہ بڑا افسر ہونے کے باوجود وہ بھی میری طرح چھوٹا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں بناسپتی چھوٹا ہوں' وہ اصلی چھوٹا ہے۔ اس کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ پراسرار آدمی ہے۔ اسے ہدایات ملتی ہیں۔ لہٰذا ضرور وہ کسی منصب پر فائز ہے۔ خصوصاً" جب بھائی جان نے کہا کہ سرکار قبلہ نے اس کی دستار بندی کی ہے تو میں بے حد متاثر ہوا۔

جذباتی مجذوب

اس دن سے میں نے داستان سرائے میں بیٹھ کر پرچار کرنا شروع کر دیا۔ میں نے بار بار بانو اور اشفاق سے کہا' پیارو یہ گھُنّا آدمی جو تم پر اس قدر مہربان ہے۔ صرف نیک انسان ہی نہیں' سی ایس پی افسر ہی نہیں۔ بھائی جان کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بلند پائے کا بزرگ ہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ تم کو دوست رکھتا ہے۔

پھر میں قدرت اللہ کی شخصیت کی پر اسرار باتیں سناتا رہتا۔ اشفاق اور بانو بڑے انہماک سے میری باتیں سنتے رہتے اور اثر سے بھیگ جاتے' لیکن پھر وہ اپنے پر پھڑ پھڑاتے اور پھر سوکھے کاٹھ ہو کر بیٹھ جاتے۔

دو تین سال میں بولتا رہا۔ وہ سنتے رہے۔ لیکن بات جہاں دھری تھی وہیں دھری رہی۔

غالباً" شفو بانو مجھے ایک جذباتی مجذوب سمجھتے تھے۔ اس لیے میری باتوں پر انہوں نے کان تو دھرا پر دل نہ دھرا۔

ویسے بات بھی درست تھی۔ میں ایک جذباتی آدمی ہوں اور مجھ میں مجذوبیت کا عنصر موجود ہے۔ لیکن غالباً" انہوں نے میرے خلوص کی جانب توجہ نہ کی۔

قدرت اللہ کے مرتبے کے متعلق انہیں احساس دلانے میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہ تھا۔ مجھے ایک خزانہ ملا تھا اور میں چاہتا تھا کہ میرے دوست بھی اس لوٹ کے مال میں حصہ دار بن جائیں۔

نور بابا کا ڈیرا

پھر نور بابا کا قصہ چل نکلا۔

نور بابا ایک بزرگ تھا۔ اس کا ڈیرہ لاہور چھاؤنی میں کیولری روڈ پر تھا۔ نور بابا کے دو کام تھے۔ بنیادی کام یہ تھا کہ وہ ہر آنے والے کو گوشت روٹی کھلاتا تھا۔ اس کے ڈیرے پر آٹھ نو لمبی لمبی داڑھیوں والے بابے کام کرتے تھے۔ چار ایک صبح شام روٹیاں پکاتے رہتے دو ایک ہانڈی پکانے پر مامور تھے۔ اور دو ایک چھوٹے موٹے کام کرنے پر۔ نور بابا کا دوسرا کام دوا دارو کا تھا۔

ڈیرے پر دو بڑے بڑے بارک نما ہال کمرے تھے۔ ایک بہت کھلا صحن تھا۔ ایک بے چھتی

مسجد تھی۔

صحن کے ایک جانب ان ڈور مریضوں کا وارڈ تھا' جہاں چارپائیوں پر مریض آسمان تلے لیٹے رہتے تھے۔ نور بابا دن میں دوبار وارڈ کا راؤنڈ لگاتا۔ ہر مریض کا حال پوچھتا اور دوا تجویز کرتا تھا۔

نور بابا غذا کے ذریعے علاج کرتا تھا۔ کہتا تھا غذا دوا سے بہتر ہے چونکہ اس میں شفا کا عنصر وافر ہوتا ہے۔ زیادہ تر مریضوں کا علاج مفت ہوتا تھا۔ صاحب حیثیت مریض کو اجازت تھی کہ وہ غذائی دوا کی قیمت ادا کردے۔ دوا کی قیمت' قیمت خرید کے مطابق لی جاتی۔

نور بابا اپنے ڈیرے میں بابا بن کر نہیں بیٹھتا تھا۔ بلکہ چاروں طرف گھومتا پھرتا۔ کسی کو پانی پلا دیتا۔ کسی کے لیے گرم روٹی لے آتا۔ کسی کا حال احوال پوچھتا۔ ڈیرے میں اس کی حیثیت ایک کامی کی تھی' بابا کی نہیں۔ ڈیرے کا خرچ کیسے چلتا تھا اس کا مجھے علم نہیں۔

پتہ نہیں کیسے اتفاق سے یا ویسے ہی ایک روز اشفاق نور بابا کے ڈیرے پر جا پہنچا۔

شوق تحقیق

اشفاق کی عادت ہے کہ اسے کوئی نئی چیز مل جائے تو وہ اس کی تحقیق میں لگ جاتا ہے۔ اس کے اندر گھس جاتا ہے۔

جب وہ مکان بنوا رہا تھا تو فن تعمیر کے اندر گھس گیا۔ جب نلکے لگوا رہا تھا تو اس نے ٹوٹیوں کے متعلق تمام معلومات حاصل کرلیں۔ کون کون کمپنی ٹوٹیاں بناتی ہے۔ ٹوٹی کا منہ کتنا کھلا ہونا چاہیے۔ اس کا واشل کتنا دیرپا ہونا چاہیے۔ ان دنوں وہ برانڈرتھ روڈ پر جا پہنچا۔ اور اس تحقیق میں لگ گیا کہ وہاں کیا کیا بکتا ہے' کہاں کہاں بنتا ہے۔ کیا کیا باہر سے آتا ہے۔ کیا کیا خانہ ساز ہے۔ اشفاق احمد تحقیق کا متوالہ ہے۔

نور بابا کے ہاں پہنچا' تو وہاں بھی' دلی نہیں بلکہ ذہنی تحقیق میں لگ گیا کہ روحانیت کیا شے ہے۔' تصوف کیا ہے۔

نور بابا دیکھنے میں تو ایک عوامی فرد تھا۔ وہ پیروں اور مرشدوں کی طرح مسند پر نہیں بیٹھتا تھا۔ مسئلے نہیں چھانٹتا تھا۔ سرکار قبلہ بن کر ارشادات فرمانے کا عادی نہ تھا۔ وہ ایک لمبا سا چغہ پہنے رکھتا اور ننگے پاؤں یوں گھومتا پھرتا جیسے کوئی خدمت گار ہو' لیکن جب بات کرتا تو بڑی بڑی

صوفیانہ سچائیاں چھوٹے چھوٹے جملوں میں بر سبیل تذکرہ کہہ جاتا۔ اس کے پاس ایسے بیسیوں جملے تھے' جنہیں سن کر دانش ور چونک جاتے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتے۔

افورازمز

یہ جملے Aphorisms ہے۔ مثلاً" ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔ حکم سمجھنے کی چیز نہیں تعمیل کی ہے شوکت نفس انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی۔ ان جملوں نے اشفاق کو متوجہ کر لیا۔

صرف اشفاق کی ہی بات نہیں ان جملوں نے مجھے بھی بے حد متاثر کیا۔ میری سوچ کو نئے زاویے عطا کیے۔

داستان سرائے کے وسیع و عریض برآمدے میں اشفاق نے دو بڑے بورڈ لگا رکھے تھے۔ جن پر انوکھی واروات کے اخباری تراشے۔ بڑے بڑے Sayings کتبے۔ پینٹنگز۔ لگا دیے جاتے تھے جو ہر دس پندرہ دنوں کے بعد بدل دیے جاتے۔ نور بابا سے متعارف ہونے کے بعد مہینوں ان بورڈز پر بابا کے ارشادات لگے رہے۔

پھر وہ قدرت اللہ کو بھی نور بابا کے ہاں لے گیا اور قدرت اللہ وہاں دو زانو ہو کر مودبانہ بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر عفت کو نور بابا کا طریق علاج بہت پسند آیا۔ کہنے لگی' میں بھی ان خطوط پر ایک معمل چلاؤں گی۔ بابا نے کہا' آپ اسی معمل میں آکر کام کیجیے۔ ہمارے پاس پہلے ہی ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر کام کر رہے ہیں۔

نور بابا مجھے بہت پسند تھا۔ اس میں عجز تھا۔ خدمت تھی' پھر ایک روز پاکستان پر بات چل نکلی۔

پیدل

نور بابا بولا' پاکستان بننے سے بہت پہلے' ہندوستان کے بڑے بڑے بزرگوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ ہم بھی اس میں شامل تھے۔ وہاں فیصلہ ہوا تھا کہ ایک اسلامی مملکت بنا دی جائے۔ ہم نے

بھی اس فیصلے پر دستخط کیے تھے۔

مجھے بابا کی یہ بات بہت کھلی۔ اتنا بڑا دعویٰ اور یوں برملا۔ اور پھر اتنا تفاخر۔

کسی نے کہا' بابا جی یہ جو پاکستان ہے یہ کیا اسلامی مملکت ہے۔

بابا بولا پتر۔ ابھی تو بیج پڑا ہے' ابھی بوٹا نکلے گا اور جب بوٹے پر پھول لگا تو ساری دنیا حیرت سے دیکھے گی۔

پھر ایک بات چل نکلی۔ پتہ نہیں کس نے چلائی۔ کس نے اچھالی۔ وہ بات قدرت نے سن لی ' پھر میں نے دیکھا کہ قدرت بہت بے چین ہے۔ میں نے اسے کبھی بے چین نہیں دیکھا تھا۔

ایک روز قدرت نے مجھ سے پوچھا۔ کیا یہ سچ ہے کہ اشفاق نور بابا کی بیعت کرنے والا ہے۔

میں نے جواب دیا' مجھے علم نہیں' لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں یہ نہیں ہو سکتا۔

کیا مطلب' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' بیعت کا مطلب ہے خود کو کسی کے سپرد کر دینا۔

تو وانی حساب کم و بیش را' کی سی سپردگی۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

میں نے کہا' اشفاق خود کو کسی کے سپرد نہیں کر سکتا۔ بالکل میری طرح ہے۔ مجھ میں بھی سپردگی کی اہلیت نہیں ہے۔ اشفاق ڈیرے پر صرف اس لیے جاتا ہے کہ اپنا شوق تحقیق پورا کرے اور اس لیے بھی کہ ڈیرے پر اسے بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

بہرحال' وہ بولا' آپ اشفاق کو سمجھائیں۔

میں اشفاق کو سمجھاؤں گا تو وہ چڑ جائے گا۔ آپ خود کیوں نہیں سمجھاتے۔

اسے میری طرف سے کہیں کہ نور بابا ایک Pedestrian ہے۔

وہ کیا ہوتا ہے۔ اپ کا مطلب ہے پیدل ہے۔ گھڑ سوار نہیں۔

قدرت مسکرا دیا۔

میں نے کہا' شہاب صاحب آپ اشفاق کی جانب توجہ کیوں نہیں دیتے۔

وہ مسکرایا بولا' میں اس قابل ہوتا تو پھر آپ کی منت کیوں کرتا۔

میں نے بانو سے یہ بات کہہ دی۔

وہ میری بات سن کر خاموش ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ اس بچی بھگت نے یہ بات میاں کو بتا دی ہو گی' لیکن اشفاق پر اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔

الٹا وہ شہاب کی موجودگی میں نور بابا کی باتیں کچھ زیادہ ہی جذبے سے سنانے لگا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ کچھ ہو گیا۔

بانو پر دفعتاً" انکشاف ہوا کہ قدرت اللہ ایک بڑا بزرگ ہے۔ بانو کے بچے عقیدت کے جذبے سے چھلکنے لگے' قدرت اللہ نے اپنا گھنڈ" اتار دیا۔ جب بھی قدرت اللہ لاہور جاتا تو بانو شفو سیری' مسز چھٹہ بانو کے تمام بیٹے بہویں سب قدرت کے ارد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے' پھر مسئلے مسائل چل پڑتے۔ سوال پوچھے جاتے۔ قدرت اللہ ان سوالات کے جواب دیتا۔ بات کی وضاحت کرتا۔ نقطے حل کرتا۔

ایک سال کے اندر اندر قدرت داستان سرائے پر ایک بزرگ کی حیثیت سے چھا گیا۔

داستان سرائے والے انتظار کرتے کہ کب شہاب صاحب لاہور آئیں۔ خود شہاب کی خواہش ہوتی کہ وہ لاہور جائے۔

دراصل جب سے ڈاکٹر عفت فوت ہوئی تھیں قدرت کو"ہوم" نصیب نہ ہوا تھا۔

بے گھر

وہ اپنی ہمشیرہ کے گھر رہتا تھا۔ اس کا بہنوئی امین' ہمشیرہ محمودہ اور ان کے تینوں بچے گڈی۔ بلو اور ٹپل سب اس کی عزت کرتے تھے۔

امین پیر فقیر کا قائل نہ تھا وہ خود ایک صراط مستقیم تھا۔ وہ قدرت اللہ کو ایک نیک آدمی سمجھتا تھا اور بس۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ قدرت اللہ نے اپنے گھر والوں کی نظر بندی کر رکھی تھی کہ ان کو قدرت کی اصلیت کا پتہ نہ چلے۔ مثلاً قدرت کا معمول تھا کہ وہ صبح تین بجے جاگتا۔ تہجد ادا کرتا

پھر سوٹی پکڑ کر باہر نکل جاتا اور دو گھنٹے اسلام آباد کا چکر لگاتا' پھر گھر آکر فجر کی نماز پڑھتا اور پھر سو جاتا۔ گھر والوں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ آدمی رات کے وقت شہر کا چکر کیوں لگاتا ہے۔ وہ وقت نہ تو چہل قدمی کا ہوتا ہے نہ جاگنگ کا۔

ایک دن میں نے قدرت سے پوچھا' آپ جو رات کے تین بجے اسلام آباد کا چکر لگاتے ہیں تو شہر کے کتے آپ کا استقبال کرتے ہوں گے۔

ہاں' اس نے جواب دیا۔ بڑے کتے ہیں اس شہر میں۔ مگر اس وقت سیر کرنے کا بڑا مزا آتا ہے۔

میں نے کہا' شہاب صاحب آپ انسانی ذہن کی توہین نہ کیا کریں۔

اس نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا' شہاب جی یا تو بات کہہ دیا کیجیے اور یا چھپانا مقصود ہو تو ایسے چھپایئے کہ چھپ جائے۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا مجھے علم نہ تھا کہ کوئی ایسا عمل وظیفہ بھی ہوتا ہے جو چلتے چلتے پڑھا جاتا ہے۔

اس نے کہا آپ نے کبھی صبح سویرے چہل قدمی کی ہے۔

میں نے کہا جناب صبح کے وقت مجھ پر شیطان غالب ہوتا ہے۔ رات کو نیند آئے نہ آئے۔ صبح کو وہ تھپک تھپک کر سلا دیتا ہے۔

بہر حال وہ گھر جس میں قدرت رہتا تھا اس کے لیے گھر نہیں تھا۔ گھر والوں کو علم نہ تھا کہ وہ کون ہے۔

میرا گھر

کبھی کبھی وہ میرے گھر بھی آیا کرتا تھا۔

میرے گھر میں صرف دو افراد اسے جانتے تھے' مانتے تھے' عکسی اور میں۔ میری بیوی شیخانی ہے۔ شیخ نو مسلم ہیں۔ وہ صرف اللہ کو مانتے ہیں۔ کسی بزرگ پیر یا فقیر کو نہیں مانتے۔ بزرگ کو ماننا میری بیوی کے نزدیک بت پرستی کے مترادف ہے۔ کرامت کی بات سن کر وہ تمسخر سے ہنس دیتی ہے۔ عقیدت کا وہ مذاق اڑاتی ہے۔ اور معجزے کو لاف زنی سمجھتی ہے۔

میری تین بیٹیاں ہیں۔ سویرا' نیلو' نقش۔ان کی شادی کے سلسلے میں زبردست رکاوٹیں آ کھڑی ہوئی تھیں۔ میری بیوی ان رکاوٹوں کی وجہ سے سخت پریشان تھی۔ پھر بغیر کسی کوشش کے' بغیر کسی وجہ کے وہ تمام رکاوٹیں باری باری دور ہو گئیں۔ یوں دور ہو گئیں۔ جیسے کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ اس پر میری بیوی حیران رہ گئی' لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ اس میں شہاب کا ہاتھ تھا۔ میری بیٹیوں کو احساس ہے کہ شہاب نے مدد کی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے بآواز بلند اس بات کو تسلیم نہ کیا تھا۔

کبھی کبھی میں جوش عقیدت سے سرشار ہو کر گھر میں شہاب کی بزرگی کی بات کرتا تو میری بیوی میرا مذاق اڑاتی۔

اس کا بے ادب رویہ دیکھ کر میں خوف زدہ ہو جاتا۔ یوں گھر میں شہاب کی بات کرنا میرے لیے ممنوع تھا۔

۱۹۷۲ء میں عکسی کی شادی ہو گئی۔

میں نے عکسی کو صاف کہہ رکھا تھا کہ میں تیرے لیے رشتہ تلاش نہیں کروں گا۔ جس لڑکی سے تو شادی کرنا چاہتا ہے اس کا نام اور پتہ ایک پرچی پر لکھ دے۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دے۔ اگر لڑکی والوں نے رشتہ قبول کر لیا تو بہت خوب' نہ کیا تو ہم لڑکی کو اغوا کر کے لے آئیں گے۔

جی ایم اثر

عکسی نے ایک پرچی پر جی ایم اثر کی بیٹی تہمینہ کا نام لکھ دیا۔ جی ایم اثر کو میں جانتا تھا۔ وہ ایک جانا پہچانا دانش ور تھا۔ سب سے پہلے ہماری ملاقات اشفاق کے گھر میں ہوئی تھی۔ ان دنوں ہم اسے ڈپٹی کہا کرتے تھے۔

پہلے وہ ڈپٹی تھا۔ پھر گورنمنٹ کالج میں اقبالیات پڑھانے لگا۔ یہ پروفیشن بھی اسے جذب نہ کر سکا تو وہ انگریزی روزنامہ سی ایم جی میں صحافی بن گیا۔ اس کے کالموں اور ایڈیٹوریل کی دھوم مچ گئی۔ پھر سول اینڈ ملٹری گزٹ بند ہو گیا۔ تو وہ تربیلہ میں پبلک ریلیشنز آفیسر بن گیا۔ تربیلہ ایک انٹرنیشنل شہر تھا۔ اس شہر میں تہمینہ پل کر جوان ہوئی تھی۔

جی ایم اثر کی شخصیت میں تین خصوصیات نمایاں تھیں۔ وہ ایک پڑھا لکھا قابل آدمی تھا۔

اس قدر کلچرڈ تھا کہ بڑی شدت سے رکھ رکھاؤ کا متوالہ تھا اور تیسرے محبوبہ صراحی اور بوتل کا دلدادہ تھا۔

جی ایم اثر نے میری کسی تحریر پر نکتہ چینی کی تھی۔ غالباً" وہ تحریر قدرت اللہ سے متعلق تھی۔ اس نے مجھے ایک خط لکھا کہ جناب آپ مافوق الفطرت باتیں کر کے کیوں اپنا وقار اور قارئین کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ایسے خط مجھے اکثر آیا کرتے تھے۔ جن کا میں نے کبھی جواب نہ دیا تھا۔ پتہ نہیں جی ایم اثر کے خط کو دیکھ کر مجھے کیوں غصہ آ گیا اور میں نے جواب میں لکھا کہ محترم کتا اپنے محلے میں بھونکتا اچھا لگتا ہے۔ میں اپنے محلے ادبی دنیا میں بھونکتا ہوں آپ بھی اپنے محلے صحافت میں بھونکیے۔

میرے خط کو دیکھ کر وہ بھونچکارہ گیا اور مجھ سے ناراض ہو گیا۔

عکسی کی پرچی کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ اگر اثر نہ مانا تو کیا ہو گا۔

تہمینہ

پھر اتفاق سے میں نے تہمینہ کو دیکھ لیا۔ تہمینہ بہت ہی ذہین لڑکی تھی۔ بڑی ایکسٹروورٹ۔ جرات سے بھرپور۔ منہ پھٹ۔ قابلیت میں اپنے باپ جیسی۔ باپ کی پرستار' لیکن اونچی میں والی۔ محبت کرنے والی' ساتھ ہی غصیل۔ بھانبڑ لگانے والا غصہ' وہ تو اغوا کرنے والی تھی۔ ہونے والی نہیں۔

یہ تو مشکل پڑ گئی' میں نے سوچا اگر جی ایم اثر نے انکار کر دیا تو اس لڑکی کو اغوا کرنا تو مشکل ہو جائے گا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اثر کو خط لکھا کہ اگر تم وسعت قلب سے کام لو اور گذشتہ گستاخی کو معاف کر دو تو میں بعد احترام تمہاری خدمت میں حاضر ہو کر استدعا کروں کہ اگر تم میرے بیٹے عکسی مفتی کو اپنی فرزندی میں قبول فرماؤ تو یہ میرے لیے باعث اعزاز ہو گا۔

اثر نے کھلے دل سے معافی دے دی اور عکسی تہمینہ کی شادی ہو گئی۔ تہمینہ پڑھی لکھی تھی۔ اونچی ناک والی تھی' ویسٹ اوری اینٹڈ تھی۔ اس نے ہمارے گھر میں آ کر شاب کا تذکرہ سنا' تو وہ سوچنے لگی کہ یہ شاب کیا شے ہے جو اس گھر پر بھوت کی طرح سوار ہے۔ اسے شاب

کے نام سے چڑ ہو گئی۔

پھر چند ایک ماہ کے بعد ایک عجیب حادثہ رونما ہونے لگا۔ عکسی رات کے وقت چارپائی سے اچھلتا پھر گرتا پھر اچھلتا گرتا۔ یوں جیسے کوئی اٹھا کر پھر دے مارتا ہو۔ وہ گھبرا گئی' یہ کیسی بیماری ہے۔ اس نے کہا میں ڈاکٹر کو بلا لاتی ہوں۔ عکسی نے منع کر دیا۔

پھر اس ''اچھل گر'' نے شکل بدلی اور اس کی گردن مڑنے لگی۔ جھٹکا لگتا تو گردن بائیں سے دائیں جانب مڑ جاتی۔ پھر جھٹکا لگتا تو دائیں سے بائیں جانب مڑ جاتی۔ تمینہ نے عکسی سے پوچھا' یہ کیا ہو رہا ہے۔ پہلے تو عکسی لیت و لعل کرتا رہا۔

اسرائیلی چھینٹے

پھر اس نے تمینہ کو بتایا کہ چیکو سلوو یکیہ میں ایک شام وہ کمرے میں بند بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ دروازہ بجا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک حسین و جمیل خاتون کھڑی تھی۔ وہ از خود اندر داخل ہو گئی۔ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بولی میرا نام زہرہ ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ دراصل میں اپنی سہیلی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہ لڑکی باتیں کرتی رہی اور ساتھ ہی کمرے کی دیوار پر انگلی سے کچھ لکھتی رہی۔ عکسی نے کہا' وہ بڑی شستہ انگریزی بولتی تھی۔ زہرہ کے جانے کے بعد۔ مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں ایک قمیض میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ حالاں کہ باہر شدت سے برف پڑ رہی تھی۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ یہ بڑا لمبا قصہ ہے۔ عکسی نے کہا' اس روز سے مجھ پر ایسی کیفیات وارد ہوتی رہتی ہیں۔ تمینہ یہ سن کر خوف زدہ ہو گئی۔

میں نے تمینہ سے کہا' تو قدرت اللہ کے پاس جا' اسے ساری بات سنا۔ شاید وہ مدد کر سکے۔

وہ غصے میں چلائی۔ قدرت اللہ کیا ڈاکٹر ہے۔ کہ وہ مدد کرے گا۔ آپ لوگ پڑھے لکھے ہو کر کیسی باتیں کرتے ہیں۔

اتفاق سے اسی روز قدرت اللہ ہمارے ہاں آ گیا۔ تمینہ نے اسے ساری بات بتائی۔

کہنے لگا' آپ قرآن کریم پڑھی ہوئی ہیں کیا۔

ہاں' وہ بولی۔

کہنے لگا' جب عکسی پر ایسی کیفیت طاری ہو تو آپ چاروں قل شریف پڑھا کریں۔

اگلی بار دورہ پڑا تو تہمینہ نے آدھے دل سے قل پڑھنے شروع کیے۔ جوں جوں وہ قل شریف پڑھتی گئی، عکسی کی گردن کی حرکت مدھم پڑتی گئی۔

تہمینہ بڑی حیران ہوئی کہ یہ آیات ہیں یا جادو ہیں۔

سات آٹھ دن کے بعد عکسی کے دورے ختم ہو گئے۔

یوں تہمینہ بھی شہاب کو کچھ ماننے لگی۔ اس طرح ہمارے گھر میں شہاب کو ماننے والے دو کی بجائے ڈھائی ہو گئے۔

پھر بھی ہمارا گھر شہاب کے لیے ایک بیگانہ جگہ تھی۔

مردِ ابریشم

آخری چند ایک سال کے دوران داستان سرائے شہاب کا گھر بن گیا تھا۔ بانو اس کی بہت بڑی مرید تھی۔ سیری نے خود کو مکمل طور پر شہاب کے حوالے کر رکھا تھا۔ اس دور میں بانو نے جتنی خدمت شہاب کی کی، کسی اور نے کبھی اس کی اتنی خدمت نہیں کی ہو گی۔

جب بانو نے مردِ ابریشم کی تصنیف کا اعلان کیا تو میں بہت خوش ہوا کہ کوئی تو ایسے واقعات بیان کرے جن سے شہاب نامہ کے آخری باب کی تصدیق ہو۔

ٹی وی پر پروگرام ہوا تو اشفاق احمد نے شہاب کی بزرگی کا تذکرہ نہ کیا۔ بانو کی مردِ ابریشم آئی تو محسوس ہوا، جیسے کتاب صرف اس لیے لکھی گئی ہو کہ یہ ثابت کیا جائے کہ شہاب سے جتنے قریبی تعلقات بانو کے میاں اور اس کے بچوں کی تھے اور کسی کے نہ تھے۔

کتاب پڑھ کر میں سمجھا، میں اسے تعصب بھری نظر سے دیکھ رہا ہوں۔ پھر ٹیلی فون آنے شروع ہو گئے۔

مفتی، بانو نے یہ کیا، کیا۔ اتنی بڑی مصنفہ ہوتے ہوئے یہ کیا کیا۔

کیا کیا، میں پوچھتا۔

اپنے گھرانے کو بوسٹ کرنے کے لیے کتاب لکھ دی۔

کیا مطلب۔

کتاب کہتی ہے کہ قدرت اللہ شہاب کے جس قدر قریبی تعلقات خاں صاحب اور بچوں

سے تھے اور کسی سے نہ تھے۔

یہ بالکل سچ ہے' میں جواب دیتا۔ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن مفتی اس بات پر کتاب تو نہیں لکھی جاتی۔

مجھ میں آج تک اتنی جرات پیدا نہیں ہوئی کہ بانو کو یہ بات بتاؤں۔

باون واں باب

محشر رسول نگری

عفت کی موت کے بعد ایک دم سکوت چھا گیا۔

یوں جیسے جھکڑ چلنے کے بعد ایک دم خاموشی چھا جائے۔ ویرانی بھری' مردنی بھری خاموشی۔

یہ جھکڑ ایک جھٹکے سے رک گیا۔

شاید اس جھٹکے کی وجہ سے بھائی جان بیٹھے بٹھائے "آنا" "فانا" رخصت ہو گئے۔

جب قدرت اور میں بھائی جان کی قبر پر بیٹھے تھے تو میں نے کہا' یہ کیا ہوا' "آنا" "فانا"' کسی کو خبر نہ ہوئی۔

قدرت نے مدھم آواز میں جواب دیا' نہیں انہیں خبر تھی۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

بولا' چند دن پہلے ان سے ملا تھا۔ انہوں نے مجھے الوداع کہی تھی۔ کہنے لگے ہم جا رہے ہیں۔ مفتی کو خبر نہ دینا۔ صرف ہمارا سلام پہنچا دینا۔

ویرانگی' مردنی

اس کے بعد ایک ویرانگی چھا گئی۔

جیسے تماشا ختم ہونے کے بعد "دی اینڈ" کی تختی آجاتی ہے۔

جب عفت کی وفات کے بعد قدرت لوٹا تھا تو وہ' وہ قدرت اللہ نہ تھا جس سے ہم واقف تھے۔ ایک ایسا بوڑھا بابا' جو لاگ لگاؤ سے باہر آچکا ہو۔ جسے کچھ ہونے کی پرواہ نہ رہی ہو۔ کچھ کرنے کا فکر نہ رہا ہو۔ ایک ایسا کامی جو دریاں بچھا چکا ہو' کرسیاں لگا چکا ہو' ڈائس سجا چکا ہو۔ اپنے کاموں سے فارغ ہو چکا ہو اور اب اپنی مہلت کے دن گن رہا ہو۔ اور دعائیں مانگ رہا ہو کہ انجام بخیر ہو۔

پہلے قدرت اللہ انفرادیت سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا ہر کام منفرد تھا۔ یہاں تک کہ اس کی عبادت کا انداز بھی منفرد تھا۔ خدمت خلق کا تصور منفرد تھا۔ اللہ کا تخیل منفرد تھا۔

انفرادیت کے علاوہ اس میں بے پناہ "اُدھ" تھی کچھ کرنے کا خاموش عزم۔ وہ ہر وقت چاک و چوبند رہتا تھا۔

وہ ایک دریا تھا۔ جو پہاڑی علاقے میں بہہ رہا تھا۔ گرتا اچھلتا' جھٹکے کھاتا' سر ٹکراتا' چوٹیں کھاتا پر بہے جاتا۔ چوٹ کھا کر وہ تازہ دم ہو جاتا تھا۔

عفت کی وفات کے بعد جیسے وہ پہاڑی دریا۔ سمندر میں جا گرا۔ سمندر بن گیا۔ نہ بہاؤ رہا' نہ سمت رہی' نہ حرکت رہی' نہ اچھل رہی' نہ چھلکن۔

شاید اس کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ وہ منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اور منزل کیا ہے۔ اختتام' دی اینڈ' موت۔

میں بھی وہ ممتاز مفتی نہ تھا جو ۱۹۵۸ء میں پہلی بار قدرت سے ملا تھا۔

پانی ہی پانی

میں نے اتنا کچھ دیکھا تھا' اتنی دیر کرید میں لگا رہا تھا' عقل کے گھوڑے دوڑائے تھے' پوچھ گچھ کی تھی' ایسے اصحاب سے بھی ملا تھا جو جانتے تھے' لیکن ان سب کوششوں کے باوجود کچھ سمجھ نہ پایا تھا۔

مجھے صرف یہ پتہ چلا تھا کہ قدرت اللہ ایک عظیم انسان ہے۔ باکردار آدمی ہے۔ اللہ کو کندھوں پر بٹھائے پھرتا ہے۔ حضور اعلیٰ ﷺ کا ادنیٰ ترین غلام ہے۔ بخش دینے والا ہے۔ دیالو

ہے۔ عجز سے بھرا ہوا ہے۔

لیکن مجھے یہ پتا نہ چلا تھا کہ وہ کون ہے۔

یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ کسی کام کرنے کے لیے آیا ہے۔

کسی عظیم شخصیت کی آمد کے لیے جگہ بنانے بھیجا گیا ہے کہ جا' جاکر دریاں بچھا' کرسیاں لگا' ڈائس سجا۔ کہ اسے ہدایات ملتی ہیں۔ سرزنشیں ہوتی ہیں۔ شر کی طاقتوں کے حکم سے' اس کے گرد چمگادڑیں پھیرے لیتی رہتی ہیں کہ اس کی راہ کاٹیں۔

یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر اندازے لگائے تھے' لیکن مجھے یہ علم نہ ہو سکا تھا کہ قدرت اللہ کون ہے۔ میرے شعور کا بند بند گواہی دیتا تھا کہ قدرت اللہ کوئی ہے' لیکن کیا ہے' کون ہے' کس منصب پر فائز ہے' اس کا مجھے پتہ نہ لگ سکا تھا۔

کھوج لگا لگا کر میں ہار گیا تھا اور پھر میں نے مان لیا تھا کہ وہ بڑا انسان ہے اور مان لینا بھی تو موت ہے۔

میں نے جانے بغیر اپنی کشتی اس وسیع سمندر میں ڈال دی تھی۔ مجھے علم نہ تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میری منزل کیا ہے۔ بس پانی ہی پانی چاروں طرف پانی ٹھہرا ہوا پانی' نہ بہاؤ' نہ حرکت' نہ رخ۔

پیر بھائی

جب وہ سب ساتھ والے کمرے میں چائے پینے کے لئے چلے گئے تو اس نے میری بانہہ پکڑ لی۔ بولا' بیٹھ جاؤ۔ اس کا قد چھوٹا تھا' جسم لاغر تھا۔ انداز غیر بزرگانہ تھا۔ آنکھیں کوئلوں کی طرح دہک رہی تھیں۔ آواز میں رعب تھا۔

میں بیٹھ گیا۔

بولا' تمہیں پتہ ہے کہ ہم اسلام آباد میں کیوں آئے ہیں۔

میں نے سر نفی میں ہلا دیا۔

کہنے لگا' ہم اپنے پیر بھائی سے ملنے آئے ہیں۔ صرف اسے دیکھنے کے لیے' اس سے ملنے کے لیے ہم نے کوئٹہ سے اسلام آباد تک' اتنا لمبا سفر کیا ہے۔

جی' میں نے جواب دیا۔

کہنے لگا' تمہیں پتہ ہے ہمارا پیر بھائی کون ہے۔

جی نہیں' میں نے جواب دیا۔

تم ہمارے پیر بھائی ہو' وہ بولا۔ تم۔

میں ——— محشر صاحب میرا تو کوئی پیر بھائی نہیں ہے۔ نہ میں کسی کا مرید ہوں۔

ہے' تمہارا پیر ہے۔ اس نے مجھے ڈانٹا۔

میں نے کہا جناب میں نے کسی کو پیر بنایا ہی نہیں۔

پیر بنائے نہیں جاتے' وہ بولا۔

آپ کیوں مجھ سے مذاق کر رہے ہیں' محشر صاحب۔ آپ تو خود بزرگ ہیں۔

کون کہتا ہے میں بزرگ ہوں' وہ بولا۔

میرے دوست مجھے یہاں زبردستی لائے ہیں کہتے تھے' آؤ تمہیں ایک بزرگ سے ملا لائیں۔

سمندر

وہ قریب تر ہو گیا۔ بولا۔ وہ سب احمق ہیں۔ انہیں کیا خبر۔ دیکھئے ہم نے آپ کی کتاب "لبیک" پڑھی ہے۔ اس میں ایک فقرے نے ہمیں چونکا دیا۔ آپ نے لکھا تھا' کاش کہ میں اپنی کشتی کسی ندی یا دریا میں ڈالتا۔ مجھے یہ تو پتہ چلتا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ میری منزل کہاں ہے' لیکن میں نے اپنی کشتی سمندر میں ڈال دی۔ اب مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میری سمت کیا ہے' میری منزل کہاں ہے۔ وہ رک گیا' پھر بولا' ہمارا بھی یہی حال ہے۔ ہم نے بھی اپنی کشتی سمندر میں ڈال دی تھی۔ اب نہ کوئی سمت ہے' نہ منزل' بس ہمیں سمجھ میں آ گیا کہ تم ہمارے پیر بھائی ہو۔ اور ہم یہاں صرف اپنے پیر بھائی کی زیارت کرنے آئے ہیں۔

محشر کی بات سن کر میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔

محشر سے ملنے کی مجھے قطعی طور پر خواہش نہیں تھی۔

میرے دوستوں نے زبردستی مجھے اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیا تھا' جیسے میں بھس کی ایک بوری

تھا۔

ہوا یہ کہ رات کے آٹھ بجے فور مسکیٹرز نے میرے گھر پر دھاوا بول دیا۔ سردیوں کے دن تھے' میں لحاف میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔

کہنے لگے' چلو تمہیں ایک بزرگ سے ملا لائیں۔

میں نے کہا' نہ بھائی مجھے کسی بزرگ سے ملنے کی خواہش نہیں ہے۔

عمر بولا' یار تو' تو بزرگوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔

نہ بھائی' میں نے کہا' ایک سے ملا ہوں۔ جب سے توبہ کرلی ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔

مسعود نے قہقہہ لگایا اور وہ چلے گئے۔

محشر کے ہاں پہنچے تو انہوں نے پوچھا۔ دیر سے کیوں آئے۔

وہ بولے' حضور' ایک دوست کو ساتھ لانا چاہتے تھے۔ اس نے آنے سے انکار کردیا۔

مسعود نے کہا' وہ کہتا تھا۔ مجھے بخشو۔ بلی لنڈوری ہی بھلی۔

عماد بولا' وہ کہتا تھا جب سے ایک بزرگ سے ملا ہوں۔ میں نے توبہ کرلی ہے۔ خدا محفوظ رکھے۔

محشر نے قہقہہ لگایا۔ بولا سیانا معلوم ہوتا ہے۔ ہم بھی اگر توبہ کرلیتے تو آج پھانسی پر نہ لگے ہوتے۔

وہ بھی کئی ایک سال سے پھانسی پر لٹکا ہوا ہے۔ مسعود نے کہا۔

کیا نام ہے اس کا' محشر نے پوچھا۔

ممتاز مفتی' اعظمی نے جواب دیا۔

ممتاز مفتی' محشر بولے۔ اسے تو آنا پڑے گا۔ اسے کہو اگر سیدھی طرح سے نہ آیا تو ہم بلوانا بھی جانتے ہیں۔

اگلے روز فور مسکیٹرز پھر آ گئے۔ کہنے لگے' بچو سیدھی طرح سے چل پڑو ورنہ محشر صاحب بلوانا بھی جانتے ہیں۔

رند بزرگ

محشر رسول نگری ایک رنگ رنگیلا طرح دار رند بزرگ تھا۔ سارے ریڈیو پاکستان میں اس

کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کی کرامات کے چرچے تھے۔ جو بھی آتا اسے انگلی لگا کر ساتھ لے جاتا۔ وہ ہر کسی کے لیے ہر دم تیار رہتا تھا۔ اس کی محفل ہمہ وقت بجی رہتی تھی۔

ان دنوں وہ سعادت کے گھر میں مہمان تھا۔ بہت سے لوگ اسے ملنے آتے تھے۔ ہر وقت چائے' بسکٹ' سموسے' کباب چلتے تھے۔ اندر سے کھانے یوں پک کر آتے تھے جیسے اندر بیوی کی جگہ کوئی ہوٹل کا چیف بیٹھا ہو۔

سعادت ایک خوش شکل بارعب اور خوش لباس شخص تھا۔ وہ ان دنوں کسی سرکاری کارخانے کا مینجنگ ڈائرکٹر تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ پیری فقیری اور کرامات کا قائل ہو سکتا ہے' لیکن جس ذوق اور خلوص سے وہ محشر اور اس کے دوستوں اور مریدوں کی خدمت میں لگا رہتا تھا' دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

سعادت

میں نے اعظمی سے پوچھا' یار یہ دونوں کیا چیزیں ہیں۔

کون سی چیزیں' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' یہ محشر اور سعادت۔

کہنے لگا' یہ محشر تو کوئی اونچی چیز ہے' اس کا بھید کسی نے نہیں پایا۔ غنڈے اور بزرگ کا مرکب معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ سعادت۔

سعادت نے سی ایس ایس کا امتحان دیا تھا چونکہ بلوچستان سے تھا' پاس ہونا اور سلیکشن میں آنا یقینی تھا۔ لیکن۔ انٹرویو میں ٹھس ہو گیا چونکہ ہکلاتا تھا۔

اگلے سال سعادت کے باپ نے محشر کو انگلی لگائی اور ساتھ لے گیا۔ انٹرویو میں سعادت ہکلانا بھول گیا۔ پاس ہو گیا سلیکٹ ہو گیا۔ اسسٹنٹ کمشنر لگ گیا' پولیٹیکل ایجنٹ بن گیا۔ اب وہ محشر کے گرد پھیرے لیتا رہتا ہے۔ کوئی مشکل آپڑے تو محشر کو کوئٹہ سے پکڑ کر لے آتا ہے۔

اسلام آباد سے رخصت ہونے لگا تو محشر نے کہا مفتی ہم نے تجھے اسلام آباد کا چارج دے دیا۔ جا موج کر۔

اس وقت اس پر عجیب کیفیت طاری تھی۔

اس وقت وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

دبلا۔ پتلا' منحنی لیکن بے حد چاک و چوبند۔ ذہین' تیز طرار' یوں بیدار جیسے کوئی سپاہی جو چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا ہو۔

بظاہر وہ آرام فرما رہا تھا' لیکن آرام اس سے کوسوں دور تھا۔ اس کی بوٹی بوٹی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

اگرچہ اس کے چہرے پر داڑھی تھی۔ تراشی ہوئی۔ مٹھی بھر' لیکن ایسے لگتا تھا۔ جیسے بے داڑھی ہو۔ بالکل بے اثر۔ نہ وہ عمر کا مظہر تھی نہ معززیت' نہ بزرگی کا۔ لگتا تھا جیسے منڈوے کی ہو۔ جو ایکٹر لگا لیتے ہیں۔

اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے چھوٹے سے نحیف' ونزار جسم مین اتنی زیادہ جان ڈال دی گئی ہے کہ سہارنا مشکل ہو رہا ہے۔

اسے دیکھ کر مجھ پر خوف سا طاری ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو جھنجھوڑا۔ میں نے کہا محشرجی میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ آپ مجھے اسلام آباد بخش رہے ہیں۔

اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا' مجھے اقتدار نہیں چاہیے۔ بزرگی کی طلب نہیں۔ میں تو ایک انسان کا مارا ہوا ہوں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بزرگی کی طلب کسے ہے' بولو' ہم بھی تو انسان کے مارے ہوئے ہیں۔

مسعود بولا۔ تم دونوں مردم گزیدہ آپس میں فیصلے کر لو ہم تو چلتے ہیں۔

اگلے دن قدرت نے فون کیا کہنے لگا کل رات کہاں گئے ہوئے تھے آپ۔

میں نے کہا' اپنے پیر بھائی سے ملنے گیا تھا۔

آپ نے کسی کو پیر بنا لیا ہے کیا' اس نے پوچھا۔

نہیں' میں نے جواب دیا' وہ کہتا تھا' پیر بنائے نہیں جاتے' بن جاتے ہیں اور جو بنائے جاتے ہیں وہ چلتے نہیں۔

بڑی دلچسپ بات ہے' قدرت بولا۔

وہ کہتا تھا تیرا پیر بھی سمندر ہے' میرا بھی سمندر ہے۔ نہ ہمارا کوئی رخ ہے' نہ سمت ہے' نہ منزل۔

وہ کون تھا' قدرت نے پوچھا۔

مجھے نہیں پتہ وہ کون تھا' میں نے جواب دیا' لیکن وہ مجھے اسلام آباد کا بادشاہ بنا گیا ہے۔ اب آپ مجھ سے باادب باملاحظہ ہوشیار رہیں۔

چند روز کے بعد چھیڑ خانی کے لیے میں نے محشر کو ایک خط لکھا کہ واہ عالی جناب آپ تو مجھے اسلام آباد کا بادشاہ بنا گئے تھے۔ یہاں کا تو سپاہی بھی مجھے گھورتا ہے۔ مونچھ مروڑتا ہے اور گھورتا ہے۔ کم از کم جاتے ہوئے پولیس کو تو بتا جاتے کہ میں کون ہوں۔

محشر نے جواب دیا۔ آپ ماضی پرست ہیں۔ پرانے خیالات میں جکڑے ہوئے ہیں۔

پرانے زمانے میں بادشاہ حکم کرتے تھے اور رعایا تعمیل کرتی تھی۔ آج کل لوگ حکم کرتے ہیں اور بادشاہ تعمیل کرتا ہے۔

میں نے وہ خط قدرت کو دکھایا' وہ مسکرایا۔

بولا' سچ کہتے ہیں۔ پہلے مرشد آگے آگے چلتا تھا اور مریدوں کا رخ بدلتا تھا۔ لگتا ہے' جیسے اب حکم ہے کہ پیچھے پیچھے چلو اور رخ بدلو۔

چند دنوں کے بعد محشر کی جانب سے ایک کتاب موصول ہوئی۔ عنوان تھا' شمشاد خراماں۔ دیکھا تو وہ محشر کے مرشد کا تذکرہ تھا۔

شمشاد خراماں

اس تذکرے کو پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔

مجھے ان' اسلامی کتابوں سے کوئی دل چسپی نہیں جو فلسفے بیان کرتی ہیں۔ مسائل پر بحث کرتی ہیں یا وظائف اور ان کے حیرت انگیز اثرات کی بات کرتی ہیں۔

مجھے صرف تذکروں سے دل چسپی ہے۔

دقت یہ ہے کہ تذکرے سرکار قبلاؤں کے ہوتے ہیں' آں حضرتوں کے ہوتے ہیں۔

تذکروں میں ارشادات ہوتے ہیں۔ کرامتیں ہوتی ہیں اور ان پر احترام کا اتنا گاڑھا قوام لگا

ہوتا ہے کہ لگتا ہے جیسے صاحب تذکرہ ہم میں سے نہ ہوں، بلکہ کسی اور نوع سے تعلق رکھتے ہوں۔

کبھی کسی تذکرہ نویس نے اس عظیم انسان کا ذکر نہیں کیا، جو ہر بڑے بزرگ کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر منصب عطا ہوتا ہے۔ لوگ داتا کا ذکر کرتے ہیں۔ ان عظیم انسانی خصوصیات کا ذکر نہیں کرتے، جن کی وجہ سے انہیں داتا کا منصب عطا کر دیا گیا۔

میں نے صرف ایک تذکرہ ایسا پڑھا تھا جس میں ایک عظیم انسان کا ذکر تھا، حضور ﷺ کا تذکرہ۔

شمشاد خراماں بھی ایک خادم خلق انسان کا تذکرہ تھا۔ میں نے اس تذکرے پر تبصرہ بھی کیا تھا جو درج ذیل ہے۔

کبھی کسی تذکرہ نویس نے اس عظیم انسان کا ذکر نہیں کیا، جو ہر بڑے بزرگ کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر منصب عطا ہوتا ہے۔ لوگ داتا کا ذکر کرتے ہیں۔ ان عظیم انسانی خصوصیات کا ذکر نہیں کرتے، جن کی وجہ سے انہیں داتا کا منصب عطا کر دیا گیا۔

میں نے صرف ایک تذکرہ ایسا پڑھا تھا جس میں ایک عظیم انسان کا ذکر تھا، حضور ﷺ کا تذکرہ۔

شمشاد خراماں بھی ایک خادم خلق انسان کا تذکرہ تھا۔ میں نے اس تذکرے پر تبصرہ بھی کیا تھا جو درج ذیل ہے۔

تبصرہ

نام کتاب :	شمشاد خراماں۔
مصنف :	محشر رسول نگری۔
ناشر :	سجاد پبلی کیشنز۔ کوئٹہ۔
پرنٹر :	پاکستان پریس جناح روڈ۔ کوئٹہ
صفحات :	۱۲۵ صفحات۔
قیمت :	دس روپے۔

شمشاد خراماں ایک تذکرہ ہے۔

کتاب کا عنوان بذات خود اس حقیقت کا مظہر ہے کہ یہ تذکرہ رسمی نہیں بلکہ اس نوع کی دوسری کتابوں سے مختلف اور منفرد ہے۔ مصنف کے زاویہ نظراور اسلوب بیاں میں سادگی' بے تکلفی' خلوص اور روانی ہے۔

اس تذکرے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ محشرصاحب نے صاحب تذکرہ' اپنے سرکار قبلہ اور خود کے درمیان رسمی احترام کی فلک بوس دیوار کھڑی نہیں کی۔ بلکہ جذبہ احترام کو سمیٹ کر اپنے دل کی گہرائیوں کے بند بند میں رچابسالیا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ صاحب تذکرہ قاری کے سامنے ایک انسان کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ ایک ایسا انسان جو ہمارے روبرو مسند پر بیٹھا ہوا نظر نہیں آتا بلکہ ہمارے شانہ بشانہ کھڑا ہے۔ ہمدردی' محبت اور خدمت کے احساسات سے سرشار' مساوات کے جذبے سے بھیگا ہوا۔

محشرصاحب نے اپنی تصنیف کا جو جواز پیش کیا ہے وہ بھی منفرد اور اچھوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

حضور (ﷺ) کی سیرت

"حضور اعلیٰ ﷺ آج بھی زندہ ہیں۔ اگر ہمیں نظر نہیں آتے تو یہ ہماری نگاہوں کا قصور ہے۔"

"جس طرح قدرت نے اپنے آخری رسولؐ کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحے کو تاریخ عالم کے اوراق میں محفوظ کر دیا ہے اسی طرح اس نے یہ اہتمام بھی کر رکھا ہے کہ ہر دور میں ایسے نفوس قدسیہ پیدا ہوتے رہیں جن میں رسول مقبولؐ کی سیرت و اخلاق کی مختلف جھلکیاں فردا فردا پائی جائیں۔"

"گویا قدرت نے چاہا کہ قیامت تک ہر دور میں آنحضرتؐ کے خلق عظیم کے آئینے چہرہ تابی کرتے رہیں اور مردان حق کے پردے میں حضور ﷺ کی ایک ایک ادا اعجاز دکھاتی رہے جس طرح صدیق اکبرؓ میں آنحضرتؐ کے جمال' فاروق اعظمؓ میں آپ کے جلال۔ عثمان غنیؓ میں آپؐ کی حیا و استغنا۔ سلمانؓ و ابوذرؓ میں آپؐ کے فقر و

عشق۔ مصعبؓ میں آپؐ کے نطق۔ خالدؓ میں آپؐ کی شجاعت۔ بلالؓ میں آپؐ کی خوش نوائی۔ زیدؓ و حبیبؓ میں آپؐ کی استقامت۔ علیؓ میں آپؐ کی حجت قاطع اور شبیرؓ میں آپ کے جذبہ تسلیم و رضا کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اسی طرح اس امت میں قرون اولیٰ کے بعد بھی ایسے نفوس قدسیہ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جن میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نا ایک جھلک موجود تھی اور وہ اس کے نور سے اہل عالم پر حق کی چھت قائم کرتے رہے۔"

"ایسے اللہ والے آج بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی ہر دور میں موجود رہیں گے تاکہ آنحضرتؐ کی رحمت اللعالمینی کی تصدیق ہوتی رہے۔"

"اس کتاب میں امت محمدیہؐ کی ایک ایسی ہی صاحب دل شخصیت کا ذکر مقصود ہے۔"

ان الفاظ میں مصنف نے گویا (MOHAMMAD HOOD) کا تخیل پیش کیا ہے جس کی جھلکیاں بزرگان دین اور صوفیا کے تذکروں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ ایک اچھوتا تخیل ہے۔

حرف اول میں مصنف نے ضمنی طور پر بر سبیل تذکرہ اپنے خاندان کے متعلق ضروری حقائق بیان کر دیے ہیں جو ان کے ذہنی رجحانات پر روشنی ڈالتے ہیں اور مصنف کے زاویہ نظر کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

محشر صاحب کے آبا و اجداد خود برگزیدہ لوگوں میں سے تھے۔ لہٰذا طلب حق کی تڑپ محشر نے ورثہ میں پائی، لیکن تلاش کی سمت کا تعین کرنا بہت مشکل تھا۔ اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

"چوں کہ آج کل مادیت کا دور ہے اور لوگوں کو جان سے زیادہ تن عزیز ہے۔ اس لیے مردان خدا مست بھی اپنے آپ میں پوشیدہ ہو گئے ہیں۔
جو خوان معرفت پہلے سب کے لیے عام تھا۔ اب صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے، جن کے دلوں میں حق کی حقیقی پیاس ہو۔
امت مسلم کے لیے یہ کس قدر محرومی کا مقام ہے کہ آج بھی فیضان معرفت کے چشمے موجود ہیں، لیکن قدرت نے ان کو اپنی کبریائی کی چادر میں اس طرح چھپا رکھا ہے کہ عوام ان سے مستفید نہیں ہو سکتے"۔

عام طور پر تذکرے میں مرد حق کے حالات زندگی بیان کیے جاتے ہیں اور کرامات کا ذکر کیا

جاتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے اقوال زریں درج ہوتے ہیں۔

کچھ تذکرے ایسے بھی ہیں جن میں حالات زندگی کی نسبت اقوال کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ قوال کی روشنی میں صاحب تذکرہ کا کردار خود بخود ابھرتا ہے۔

اس ضمن کے تذکروں میں تذکرہ غوثیہ سر فہرست ہے۔ ایک روز ارشاد ہوا کہ تحت صاحب تذکرہ کی شخصیت کو اتنی خوب صورتی اور تاثر سے اجاگر کیا گیا ہے کہ قاری اثر سے بھیگ جاتا ہے۔

محشر صاحب نے زیر نظر تذکرہ کو ایک نیا اسلوب بخشا ہے۔ صاحب تذکرہ کے حالات زندگی کا ذکر کرتے ہوئے۔ بر سبیل تذکرہ وہ تصوف کے بڑے بڑے اور اہم مسائل پر تبصرہ کرتے ہیں۔ یہ تبصرے ساری کتاب میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔ انداز بیان بحث و مباحثہ کا رنگ اختیار نہیں کرتا۔ بڑے بڑے حقائق کو سرسری انداز اور ہلکے پھلکے الفاظ میں ادا کر دیتے ہیں جو قاری پر خوشگوار اثر چھوڑتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ افکار و مسائل پر گفتگو کے باوجود کتاب بوجھل نہیں ہو پاتی۔

مثلاً" عبادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"زندگی کے تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرنے کا نام عبادت ہے۔"

عشق

عشق کے متعلق لکھتے ہیں کہ :۔

"عشق عشقہ سے ہے۔"

عشقہ بیل ہے جو کسی درخت سے چمٹ جائے تو اسے خشک کر دیتی ہے۔
اطبا کے نزدیک عشق جنون کی ایک قسم ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے غایت احتیاط کے باعث اپنے کلام میں عشق کا لفظ استعمال نہیں فرمایا۔

"قرآن کریم اور احادیث نبوی میں متعدد مقامات پر "حب" کا لفظ

استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اپنے سچے اور نیکو کار بندوں سے سب پر اور بندوں کی اپنے مولا سے محبت شدید پر دلالت کرتا ہے۔ گویا بندہ اللہ تعالیٰ کا محب بھی ہے اور محبوب بھی۔"

عبادات اور عشق کے باہمی تعلق کی وضاحت یوں کرتے ہیں :۔

"اللہ تعالیٰ کی محبت بھی عبادت کا ایک فرد ہے۔ عشق کامل کا مفہوم عبادت میں شامل ہے۔ گویا عشق عبادت کا ایک جزو ہے۔

قرآن اور سنت سے بیگانہ فقرا نے عشق الٰہی کا ایک مجازی تصور پیدا کر لیا ہے جس کا سراغ حقیقی صوفیا و فقرا کے ہاں نہیں ملتا ہے۔

اس مجازی تصور سے سکُر کو حاصل عشق سمجھا جانے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ اس میں گرفتار ہوئے وہ سکُر سے بے حال ہو گئے اور رفتہ رفتہ عبادت کے قرآنی تقاضوں کو پورا کرنے سے معذور ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی نقالوں نے شرعی حدود ہی کو پامال کر دیا۔"

محشر صاحب کا اسلوب بیان بہت دل نشین ہے۔ زیر نظر تصنیف میں انہوں نے بڑے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً کتاب کے چند ایک ابواب کے عنوان ملاحظہ ہوں۔ مشاہدہ حق' کرامات کا ظہور' اعجاز خودی' ایمان بالغیب' مقام عبودیت وغیرہ کتاب میں کل سترہ ابواب ہیں۔ آخری دو ابواب قلندری سلسلے کے بزرگان کے بارے میں ہیں۔

آخر میں صاحب تذکرہ کے بارے میں چند کوائف قابل توجہ ہیں :۔

آپ کا اسم گرامی شمس الدین شمشاد تھا۔ وطن مالوف گجر گڑھی تھا جو مردان سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ نے پولیس میں ملازمت کر لی' لیکن جلد ہی انہیں پتہ چل گیا کہ فرنگی کی حکومت کے تحت ان سے ایسے فرائض ادا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا رہے گا جو جذبہ حب الوطنی کے منافی ہے۔

لہٰذا آپ محکمہ پولیس سے مستعفی ہو گئے۔ اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر بن گئے۔

اس دوران میں آپ سید حسین شاہ قلندر سے فیض حاصل کر چکے تھے لہٰذا بقیہ زندگی

خدمت میں گزار دی۔

اس تذکرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ نہ یہاں کوئی ذکر خانقاہی ہے' نہ گدی نشینی' نہ دستار بندی' نہ کوئی سرکار قبلہ ہیں' نہ مریدان خدمت گزار۔ ہمدردی اور خدمت سے سرشار ایک ڈاکٹر ہے جس کا مسلک خدمت خلق ہے۔

محشر صاحب بھی رسمی مرید کا کردار ادا نہیں کرتے۔ وہ اپنے سرکار قبلہ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں جیسے ان کا باہمی رشتہ دوستی کا ہو۔

> "شمشاد حسن صورت سے متصف تو تھا ہی' لیکن وہ حسن سیرت کا بھی مالک تھا۔ میں نے پہلی ہی صحبت میں اس کی شخصیت میں بے پناہ کشش اور ایسی محبوبیت پائی کہ جس کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔
> یہ محبوبیت یقیناً" اس لیے تھی کہ وہ خدائی نظر میں محبوب تھا۔ جس کا باعث صرف مخلوق خدا کی خدمت کرنا تھا اور اس نے اپنی پوری کمائی لوگوں کی امداد کرنے پر صرف کر دی۔ ڈاکٹری محض رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ تھی۔"

اپنے پیر و مرشد کے متعلق اس غیر رسمی انداز سے بات کرنا مصنف کی انفرادیت' خلوص اور رسم خانقاہی کے خلاف ایک جہاد ہے۔

محشر صاحب کوئٹہ کے ایک معروف شاعر ہیں۔ آپ کے کلام میں صوفیانہ رنگ ہے۔ آپ کی طبیعت میں زہد خشک کے بجائے انداز رندانہ کا رنگ ہے جو ان کے صوفیانہ مسلک کو ڈھانپنے کا ایک پردہ ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی میں کوئی نمائش عنصر نہیں۔ غالباً" اس لیے کہ مصنف کا مقصد صرف تشہیر حق ہے۔

یہ تذکرہ پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ واقعی ہم دونوں پیر بھائی تھے۔ میرا جی چاہتا تھا میں بھی ایک ایسا ہی تذکرہ لکھوں۔ لیکن ہم دونوں کے سفر میں ایک فرق تھا۔ محشر ابتدا سے ہی تسلیم و رضا تھا میں شک و شبہات کی دلدل طے کر کے آیا تھا۔

ترپین واں باب

پیر خانہ

دراصل قدرت اللہ اسی روز فوت ہو چکا تھا جس روز اس نے کینٹربری کے قبرستان میں عفت کا تابوت لحد میں اتارا تھا۔

اس کے بعد بارہ سال وہ گویا ایک کھگا تھا جس سے شہد چو چکا ہو' ایک رسمی بزرگ' معمولات' معمولات' معمولات۔

پانچ وقت مسجد میں جا کر نماز پڑھتا تھا۔ تہجد پڑھنے کے بعد اسلام آباد کا چکر لگاتا' ساتھ کچھ پڑھتا۔ فجر کی نماز کے بعد لیٹ جاتا۔ آٹھ نو بجے اٹھ کر ناشتہ کرتا اور پھر دوپہر کے کھانے تک قرآن کریم کی تلاوت کرتا۔ ظہر کے بعد پھر لیٹ جاتا۔ پھر نمازیں' نفل اور پتہ نہیں کیا کیا۔

رمضان شریف کے مہینے میں خصوصی عبادات کے لیے قدرت مری میں قیام کرتا تھا۔ مری میں وہ ایک مکان کرائے پر لے رکھتا تھا جس میں مختصر سا سامان رکھا ہوتا۔ جب بھی خصوصی عبادات کا موقعہ آتا وہ مری چلا جاتا تھا۔

فقط اللہ ہو

ایک روز میں نے کہا' شہاب صاحب وہ جتنے پردے آپ نے اوڑھ رکھے تھے' سب اتر گئے۔

کہنے لگا' میں سمجھا نہیں۔

میں نے کہا' وہ دن بھی تھے جب آپ چھپ کر غسلخانے میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگر میں کسی سے کہہ دیتا کہ آپ بزرگ ہیں تو آپ کو غصہ آتا تھا۔ جب میں نے لبیک لکھی تھی تو آپ مجھ پر سخت ناراض ہوئے تھے۔ اب آپ ننگے ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ اب آپ ایک چکو ٹوپی پہن لیں۔ ایک گیروا چوغا اوڑھ لیں تسبیح ہاتھ میں پکڑ لیں اور جائے نماز پر بیٹھ جائیں۔

وہ مسکرایا بولا' ہاں کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ کسی روز میں سر عام بیٹھا ہوں گا میرے سامنے کالی سیاہی کی دوات ہو گی ہاتھ میں بانس کا قلم ہو گا اور میں تعویز لکھ رہا ہوں گا۔

میں نے کہا' معلوم ہوتا ہے اللہ تعالٰی کو انفرادیت پسند نہیں' وہ صرف رواجی بزرگ پسند کرتے ہیں۔ شہاب صاحب آپ بنیادی طور پر انقلابی تھے۔ یاد ہے۔

جب	کہیں	انقلاب	ہوتا	تھا
قدرت	اللہ	شہاب	ہوتا	تھا

وہ مسکرایا۔

پھر آپ مار کھا کھا کر راہ راست پر آ گئے اور خالص ملا بن گئے۔ جب پردے تھے تو آپ کس قدر جاذب نظر تھے اور اب۔ اب تو سپاٹ ہو گئے ہیں۔ فقط اللہ ہو' اللہ ہو' اللہ ہو۔

اس نے کچھ جواب نہ دیا۔

پابند اور آوارہ

میں نے کہا۔ آپ مجھ پر ناراض ہوا کرتے تھے کہ میں بات کہہ دیتا ہوں۔ یاد ہے۔

قدرت نے سر اثبات میں ہلایا۔ کہنے لگا' اللہ تعالٰی کو اخفائے راز پسند نہیں۔

میں نے کہا' شہاب صاحب میں اللہ تعالٰی نہیں ہوں۔ میں اس کا ایک حقیر بندہ ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کے گن گاؤں۔ چٹکیاں مار مار کر لوگوں کو بتاؤں کہ وہ کتنا عظیم ہے۔ وہ میرا کتنا خیال رکھتا ہے۔ قدم قدم پر مجھ پر کرم نوازیاں کرتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کے عظیم بندوں کی عظمتوں کو بیان کروں۔ ڈھول بجا بجا کر بیان کروں۔ شہاب صاحب آپ اللہ کے بندے ہیں۔

آپ پابند ہیں۔ نہ کہنے پر مجبور ہیں۔

میں ایک عام آدمی ہوں۔ آزاد ہوں۔

آپ بے شک نہ کہیے، لیکن مجھے کہنے دیجیے۔

ذاتی وڈیائی کرنے کے لیے نہیں کہوں گا۔

آپ کے گن نہیں گاؤں گا۔ آپ کی عظمت صرف اس لیے ہے کہ آپ اللہ والے ہیں۔

شہاب جی سب تعریف اللہ کی ہے صرف اللہ کی، پھر ہم کیوں نہ بولیں۔ کیوں نہ بتائیں۔ کیوں نہ ڈھول بجائیں۔

اس روز میں جلال میں تھا۔ پتہ نہیں میں کیا کیا بولتا رہا، بولتا رہا اور وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

چرچا

پھر معمولات کی بنا پر قدرت کا چرچا ہونے لگا۔

پڑوس میں رہنے والی خاتون ایک روز اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لے کر قدرت کے پاس آ گئی۔ کہنے لگی، میری بیٹی کے لیے دعا کریں۔ اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ کوئی رشتہ نہیں آیا۔

قدرت نے کہا۔ بی بی آپ اس کی ماں ہیں۔ جو دعا ماں اپنے بچوں کے لیے کر سکتی ہے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا آپ اللہ کے حضور میں دعا کریں۔ انشاء اللہ قبولیت حاصل ہو گی۔ البتہ آپ بیٹی سے کہیں کہ کسی نماز کے بعد یہ کلام اتنی مرتبہ پڑھے۔ خاص وقت پر خاص جگہ پر۔ وقت نہ بدلے جگہ نہ بدلے۔ ناغہ نہ ہو۔

حسن اتفاق سے دس دن کے اندر اندر اس لڑکی کے لیے رشتہ آ گیا۔ بات طے ہو گئی۔ نکاح ہو گیا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

پھر سارے محلے کی مائیں کیو لگا کر شہاب کے گھر کے باہر آ کھڑی ہوئیں۔

محلے کے بعد بات سکولوں، کالجوں میں پہنچی۔ ایک میلہ لگ گیا۔

سویرا نیلو نقش

شہاب کا پراپے گنڈا کرنے میں میری اپنی بیٹی بھی شامل تھی۔ میری منجھلی بیٹی اسلام آباد یونیورسٹی سے ایم اے پاس کرنے کے بعد بینک کی وی آئی پی برانچ میں کام کرنے لگی۔ پھر وہ امریکی ہوا کمپنی میں تکشیں بنانے پر مامور ہو گئی۔

ہم لوئر مڈل کلاس کے لوگ ہیں۔ اونچے رشتوں کے متمنی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود کوئی رشتہ نہ آیا۔

لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے میں ہم دونوں ہی فیل ہیں۔ میں بھی' میری بیوی بھی۔ اپنوں نے کہا بھئی کچھ کرو۔ اشتہار دو' کوئی مائی تلاش کرو۔ ہم نے شدت کی کوششیں کیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ چھ سات رشتے آئے۔ میری بیٹی نے باری باری سب ریجکٹ کر دیئے۔ اس پر مجھے بڑا غصہ آیا۔ لڑکی مجھ سے کھل کر بات ہی نہیں کرتی تھی۔

کہیں سے شہاب نے یہ بات سن لی۔

ایک روز میری عدم موجودگی میں وہ میری بیٹی سے ملا۔

پوچھا' آپ کو کوئی رشتہ پسند نہیں آیا کیا۔

جی نہیں' وہ بولی۔

اچھے نہیں تھے کیا۔

خاصے تھے۔

پھر' آپ نے ناپسند کیوں کیے۔

شہاب صاحب جی' وہ بولی' میں نے ایک لڑکے سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں شادی تم سے کروں گی۔

تو اس سے کر لیجیے شادی' شہاب نے کہا۔

کر نہیں سکتی' وہ بولی۔

آپ ابو کو ان کے گھر بھیجیں۔

ابو تو چلے جائیں گے' وہ بولی پر' لڑکے کے ابو نہیں مانیں گے۔ وہ بڑے جبر جنگ ہیں۔ جائنٹ فیملی کے ہیڈ ہیں۔ ان کے حکم کے بغیر گھر میں پتّا نہیں ہلتا۔

وہ خاندان سے باہر شادی کے خلاف ہیں۔

اچھا تو ان کا بیٹا ان سے درخواست کرے' شہاب نے کہا۔

اونہوں' اس میں اتنی جرأت نہیں کہ ابو سے بات کرے۔

قدرت اللہ یہ سن کر گھبرا گیا' کہنے لگا' اس طرح تو آپکی شادی ہو گی ہی نہیں۔

نہ ہو' وہ بولی' میں نے وچن دیا ہے' شہاب جی وہ کیسے توڑوں۔

چھ سات ماہ کے بعد میرے ایک عزیز دوست ضیاء جالندھری نے مجھے فون کیا۔ کہنے لگا' مفتی صاحب آپ فارغ ہیں کیا۔

میں نے کہا' بالکل ہوں۔

بولا' ہم آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا' پیارے میں کیا یہاں کا ڈپٹی کمشنر لگا ہوا ہوں کہ ملنے کے لیے مجھ سے اجازت طلب کرنا ضروری ہے۔

وہ دھیمی آواز میں بولا' میرے ایک دوست آپ سے ملنے کے خواہاں ہیں۔ وہ رشتے کے سلسلے میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے مدھم آواز میں جواب دیا' ضیاء صاحب میں بڑا احمق ہوں۔ میں نے اپنی اولاد میں یہ پراپے گنڈا کر رکھا ہے کہ میں بڑا وسیع القلب باپ ہوں۔ اس وجہ سے میں نے زندگی میں بڑی مار کھائی ہے۔ کیا کروں مجبور ہوں اب بدل بھی نہیں سکتا۔ اس لیے مجھے اپنی بیٹی سے پوچھنا پڑے گا۔

جب مجھے پتہ چلا کہ جناب نذیر وڑائچ اسی لڑکے کے والد ہیں جس سے نیلو نے وعدہ کر رکھا تھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

میں نے نیلو سے پوچھا' میں نے کہا' تو تو کہتی تھی کہ لڑکے کے والد کے حکم کے بغیر گھر میں پتا نہیں ہل سکتا۔ یہ پتا کیسے ہل گیا۔

بولی' پتہ نہیں۔

میں نے کہا' ہم میں کوئی ان سے ملا تھا کیا۔

نہیں تو' اس نے جواب دیا۔

کیا لڑکے نے باپ سے بات کی تھی۔

اس میں اتنی جرات نہیں ہے۔ اس لیے اس کا امکان نہیں ہے۔

پھر ——— تو نے کسی سے بات کی تھی کیا۔

بولی' شہاب صاحب کو بتایا تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں ان سے بات چھپا نہ سکی۔

حیرت اور غصے میں بھرا ہوا میں شہاب کے پاس چلا گیا۔

میں نے کہا' یہ کیسے کیا آپ نے؟

کیا ہوا؟ اس نے پوچھا۔

نیلو کے رشتے کی بات پکی ہو گئی۔

کہاں' اس نے پوچھا۔

جہاں وہ چاہتی تھی۔

یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے' وہ بولا۔

پر یہ کیسے ہوا۔ آپ نے کیا کیا۔

اس نے بات بدلی۔ بولا' اب تو رقم کا فکر کرنا چاہیئے شادی کے لیے۔ آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں کیا۔ اگر نہیں تو بے تکلف مجھ سے قرض لے لیں۔ قرض حسنہ۔

یااللہ۔ یہ تیرے بندے کیسے انسان ہیں' میں چلایا۔

صرف نیلو کی ہی بات نہیں۔ میری دوسری بیٹیوں سویرا اور نقش کی شادیوں میں بھی ایسی ہی رکاوٹیں حائل ہو گئی تھیں۔ وہ سب ایسے ہی حیرت انگیز انداز میں دور ہو گئیں۔

میرج بیورو

نیلو نے اپنی سہیلیوں سے بات کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو چار لڑکیاں میرے گھر آ گئیں۔ کہنے لگیں' ہمیں شہاب صاحب سے ملوا دو۔

یااللہ یہ کیا مصیبت ہے' میں نے سوچا' کیا شہاب نے میرج بیورو کھول رکھا ہے۔

اگلی مرتبہ جب میں شہاب سے ملا تو میں نے کہا' کیوں نا ہم میرج بیورو کھول لیں۔ یہ تو موج ہو گئی۔ ایک ہزار روپیہ کی فیس رکھ لیں۔ دس پرسنٹ میرا رہا۔ میں آپ کا بالکا بن کر پراپے گنڈا کروں گا۔ چند مہینوں ہم کروڑپتی ہو جائیں گے۔

وہ مسکرایا۔ بولا' مفتی صاحب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ سلسلہ بند کر دوں۔

پوچھا۔ وہ کیوں۔

کہنے لگا' کل مجھے بیٹھے بیٹھے خیال آیا تو میں خوف زدہ ہو گیا۔

کس بات پر۔

مجھے خیال آیا کہ اگر کوئی لڑکی چھ مہینے بلا ناغہ وظیفہ کرتی رہے' لیکن مقصود حاصل نہ ہو تو

اس کا کلام پر یقین نہ رہے گا۔ ایمان ڈول جائے گا اور اس کی ذمہ داری مجھ پر ہو گی۔

میں نے کہا شہاب صاحب آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ ہم اسے قادر مطلق تو کہتے ہیں۔ مگر صرف ہونٹوں سے' دل سے نہیں۔ ہم کہتے ہیں یااللہ تو کیسا اللہ ہے۔ میں چھ مہینے سے تیرے حضور میں آہ زاری کر رہا ہوں' لیکن تجھ پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ واہ میرے اللہ۔ کیا خدائی اس طرح کی جاتی ہے۔

میری بات سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بولا' لوگوں کے ایمان کو متزلزل کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ یہ سلسلہ ختم کرنا ہو گا۔

میں نے کہا' شہاب جی میں اس مسئلے کا حل بتاؤں۔

بولے' کیا۔

میں نے کہا' آپ ایک وظیفہ کر لیں۔ اللہ سے منظوری لے لیں۔

کیسی منظوری' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' آپ اللہ سے التجا کریں کہ یااللہ میرے در پر صرف اس سائل کو بھیجنا جس کا کام تو نے کر دینا ہو۔ میں نے کہا' دیر کی بات ہے۔ مجھے ایک بابا ملا تھا۔ کہتا تھا۔ ہم نے منظوری لے رکھی ہے۔ ہمارے در پر صرف وہی سائل آتا ہے جس کا کام ہو جانا ہو۔

اچھا وہ بولا' تو پھر اس بابے نے خدائی کا دعویٰ کر دیا ہو گا۔

میں اس کی طنز کو نہ سمجھا' پتہ نہیں' میں نے جواب دیا۔

کام نہ ہو' قدرت نے کہا' تو اس میں ایک خوبی بھی ہوتی ہے کہ سائل کو احساس ہو جاتا ہے کہ کام کرنے والا بابا نہیں ہوتا۔ کلام نہیں ہوتا صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے۔

اللہ کا نام

آپ اللہ کی ذات کے وجود کا احساس دلانا چاہتے ہیں نا' میں نے کہا۔

سبھی اس کام میں مصروف ہیں' وہ بولا' آپ بھی ——————

میں بھی۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں آپ بھی' وہ بولا۔

میں نے کہا' شہاب جی کیوں جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔ اتنے بڑے بزرگ ہو کر جھوٹ

بولتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے۔ میری تحریروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ میں نے علی پور کا ایلی لکھی۔

آپ نے کہا' "علی پور کا ایلی" ایک سرکس ہے جس میں ممتاز مفتی ہنٹرباز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یاد ہے۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

پھر میں نے "روغنی پتلے" لکھی تو آپ کے صدارتی کلمات کیا تھے' یاد ہیں۔

آپ نے کہا تھا ممتاز مفتی۔ پچاس سال سے کہانیاں لکھ رہا ہے۔

اتنی محنت اور کلوش کے بعد اس نے کیا ڈسکور کیا۔

عورت۔ سبحان اللہ کیا ڈسکوری ہے۔

ودمن

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

میں نے کہا شہاب صاحب میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اللہ کا نام لوں۔ وہ جو میرا سب سے بڑا محسن ہے۔ اس نے قدم قدم پر مجھ پر کرم فرمائیاں کی ہیں۔ شہاب صاحب جی میں شکر گزاری کے جذبے سے اس قدر بھرا ہوا ہوں جیسے کنواں پانی سے بھرا ہوتا ہے لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے اس کا نام لوں۔ شہاب جی دانش وروں کے محلے میں رہتے ہوئے اس کا نام لینا بڑا مشکل ہے۔ کاش کہ کوئی مجھے سکھا دے کہ میں کس طرح اس کا نام لوں۔ ایسے کہ بات پہنچ جائے دلوں میں کھب جائے۔ شہاب جی آپ اشفاق احمد کے اور ڈراموں کی بڑی تعریفیں کرتے ہیں' کرتے ہیں نا۔ بے شک اشفاق احمد مجھ سے زیادہ قابلیت کا مالک ہے۔ اس کی تحریر میں اثر ہے' اس لیے کہ وہ آپ کا دوست ہے' آپ سے قریب تر ہے' لیکن اگر آپ مجھے اختلاف رائے کی اجازت دیں تو کہوں کہ مجھے اس قسم کے ننگے پراپے گنڈے سے اتفاق نہیں ہے۔ ایسے ڈرامے تو پڑھے لکھوں میں ری ایکشن پیدا کرتے ہیں۔

اشفاق کہتا ہے کہ' ایسے ڈرامے عوام پر اچھا اثر ڈالتے ہیں۔ شہاب جی ہمیں عوام پر اثر نہیں ڈالنا وہ تو پہلے ہی اللہ ہو' اللہ ہو سے بھرے بیٹھے ہیں۔ اثر تو دانش وروں پر ڈالنا ہے اوپنین میکرز پر۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے' لیکن ایسا ہوتا تھا۔ لازما" ہوتا تھا' جب بھی میں قدرت سے کوئی خاص معلومات حاصل کرنے کے لیے کچھ پوچھتا تو کچھ نا کچھ ہو جاتا کوئی ایسی بات کہ ہماری توجہ بٹ جاتی۔

صدیق رائی

اس روز صدیق رائی آ گیا۔ سلام کرنے کے بعد وہ ایک کونے میں مودبانہ بیٹھ گیا۔ رسمی خیر وعافیت کے بعد کہنے لگا۔

جناب والا آپکی ہدایات کے مطابق گذشتہ تین سال سے میں وظیفہ پڑھ رہا ہوں۔ کبھی ناغہ نہیں کیا جگہ نہیں بدلی۔ وقت ادھر ادھر نہیں ہوا۔ اب دوسرا سبق عطا فرمایئے۔ قدرت کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا' نہیں صدیق صاحب ابھی آپ کا سبق کچا ہے۔ پکا ہو جائے گا تو بات کریں گے۔

صدیق نے کہا' جناب والا مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ سبق پکا ہو گیا ہے۔

قدرت نے بڑے اعتماد سے کہا' ہم خود آ کر بتائیں گے۔

ارے یہ کیا ہوا۔ ایک دم قدرت کا انداز بدل گیا' لہجہ بدل گیا۔ میں سے ہم ہو گیا۔ وہ تو خالص پیر بن گیا۔

شاید صدیق کے علاوہ اور لوگ بھی ہوں جو قدرت سے سبق پڑھتے ہوں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں' صرف صدیق ہی ایسا فرد تھا' جس نے قدرت سے درخواست کی تھی کہ مجھے کچھ پڑھنے کے لئے عطا کیجیے۔

قدرت نے پوچھا تھا' آپ کس مقصد کے لیے پڑھنا چاہتے ہیں۔ میرا کوئی مقصد نہیں' صدیق نے جواب دیا تھا۔

صدیق رائی۔ ایثار رائی کا بھائی ہے۔ وہ جھنگ کے رہنے والے ہیں اور قدرت اللہ شہاب کو اس زمانے سے جانتے ہیں جب وہ جھنگ کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ جب وہ ایک موچی کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ کہتا تھا' یہ موچی نہیں' یہ بھی ڈپٹی کمشنر ہے' فرق یہ تھا۔ کہ یہ اصلی ہے' میں جعلی ہوں۔

جب علاقے کی کسی دوشیزہ کے گھر پیر صاحب کی پگڑی نازل ہو جاتی تھی تو قدرت بن

بلائے دوشیزہ کے گھر جا پہنچتا اور پیر صاحب اسے دیکھ کر سرے سمیت وہاں سے بھاگ جاتے۔

ایثار راعی کے قدرت سے اچھے تعلقات تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ صحافی تھے۔

ایک روز ایثار نے کہا' شہاب صاحب میرا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ بیچارہ ریلوے میں کلرک ہے۔ اسے کوئی اچھی نوکری دلا دیجئے۔

شہاب نے کسی کی منت کر کے صدیق کو نیف ڈک میں ۷ اگریڈ کی نوکری دلا دی تھی۔

نیک آدمی

صدیق کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ نیک آدمی تھا۔ نیک آدمی میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ وہ توقع رکھتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی نیک ہوں۔ نیک نہ ہوں تو اسے غصہ آتا ہے یا کم از کم دل میں حقارت پیدا ہوتی ہے۔

سیانے کہتے ہیں اتنے اجلے نہ بنو کہ دوسرے میلے نظر آئیں۔ صدیق اتنا اجلا تھا کہ وہ گردو پیش پھیلی ہوئی کرپشن کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کا غصہ مجذوبانہ تھا۔ اس نے نیف ڈیک میں ساتھیوں اور افسروں سے اس پھیلی ہوئی کرپشن کے خلاف احتجاج کیا' چیخا' چلایا اور بالآخر استعفٰے دے کر گھر آ بیٹھا۔

شہاب کو پتہ چلا تو چڑ گیا۔ صدیق کے لیے جو دل میں گڈول تھی وہ ختم ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صدیق نوکری کے لیے چاروں طرف بھکاری بن کر گھوما پھرا۔ خوار ہوا' لیکن نوکری نہ ملی۔

میں قدرت سے جا کر لڑا' میں نے کہا' شہاب جی آپ بزرگ ہیں۔ غصہ کھانا آپ کا کام نہیں۔ کدورت پالنا میرا کام ہے' آپ کا نہیں۔ آپ کا کام معاف کر دینا ہے۔ آپ جن کے غلام ہیں وہ سراسر رحمت تھے۔

قدرت نے کہا' آپ صدیق کو سمجھائیں کہ غصہ نہ کیا کرے۔

میں نے جواب دیا' شہاب جی میں کیسے سمجھاؤں میں نے تو خود گڑ کھایا ہے' کھاتا رہتا ہوں۔ آپ اس کے لئے گڈول پیدا کریں۔ اسے ٹھنڈا کریں۔

پھر صدیق کو ایک چھوٹی موٹی نوکری مل گئی' لیکن اس کی نیکی کا تفاخر اور غصہ ویسے ہی رہا۔

پھر پتہ نہیں کیوں اسے بابوں کے پاس جانے کی لت پڑ گئی۔ کئی ایک بابوں کے در پر پڑا

رہا۔ آخر وہ ڈھیری حسن آباد کے رحیم بابا کے ہاں جا پہنچا۔ جو سالکوں کو اپنے حقے کا پانی پلایا کرتا تھا۔

ایک روز صدیق نے بابا سے عرض کی کہ ' حضور مجھے غلاموں کی فہرست میں شامل کر لیجیے۔

رحیم بابا نے کہا' تیرے اپنے گھر میں جو بزرگ ہے اس کے پاس جا' ہمارا وقت کیوں ضائع کرتا ہے۔

اس پر صدیق پھر شہاب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ کہنے لگا۔

مجھے رحیم بابا نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔

شہاب نے کہا' یہ بابے یونہی لوگوں کو اپنے سر سے ٹالتے ہیں۔ یہاں کوئی بزرگ نہیں ہے۔

صدیق نے کہا' مجھے کچھ پڑھنے کے لئے عطا کیجے۔

شہاب نے بھی ٹالنے کے لیے کچھ پڑھنے کے لیے دے دیا۔

پتہ نہیں کتنے سال وہ سبق پکاتا رہا۔ پھر ایک دن جب وہ پڑھ رہا تھا تو ایک آواز سنائی دی یا شاید ایک احساس ہوا۔ فیلنگ ہوئی کہ سبق پکا ہو گیا ہے۔

پھر یہ سبق بازی چلتی رہی' چلتی رہی حتیٰ کہ یہ مقام آگیا کہ قدرت اللہ صدیق کی راہ نمائی کرنے لگا مثلاً شہاب کا صدیق کے نام ایک ابتدائی خط ملاحظہ ہو۔

ہدایات

برادر عزیز

السلام علیکم

خط ملا۔ وظائف میں کبھی کبھی دل جمعی اور یکسوئی کے ساتھ دل نہ لگنا ایک قدرتی امر ہے' اسے اصطلاحاً" قبض کہتے ہیں۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ اس کی جانب التفات نہ کیا جائے اور دل لگے یا نہ لگے کوشش کر کے اپنے معمولات جاری رکھیں۔

رفتہ رفتہ قبض کی حالت بسط میں بدل جاتی ہے عام طور پر یہ بھی ترقی کا ایک زینہ ہی سمجھنا چاہیے

برے خواب آتے ہیں تو آتے رہیں' نہ ان کی طرف دھیان دیں' نہ پریشان ہوں۔

آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ دفتری حالات بھی سلجھتے ہی رہیں گے۔

ایثار صاحب کو سلام

نیاز مند

قدرت اللہ شہاب

میرا اندازہ ہے کہ صدیق سے قدرت اللہ کی دل چسپی کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس میں استقامت تھی۔ صدیق نے کبھی ناغہ نہ کیا تھا۔ یہ بات قدرت کو بہت پسند تھی۔ اس خوشنودی کا یہ نتیجہ تھا کہ قدرت ہر سال صدیق کو لیلتہ القدر کی پیشگی خبر دیا کرتا تھا۔ مثلاً ذیل کا خط ملاحظہ ہو:۔

مری

۱۰[۱] جون ۱۹۷۴ء

عزیزم۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ شدید گرمی کے باوجود آپ کے معمولات جاری ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیں اور ان کو بدستور جاری رکھیں۔

یہی آپ کی سب سے بڑی کمائی ہے جس کا اجر انشاء اللہ آپ کو کسی وقت ایسا ملے گا جو آپ کے خواب خیال میں بھی نہیں۔

رمضان المبارک کی اکیسویں شب کو رات کے گیارہ بجے سے فجر کی نماز تک جاگتے رہیں۔ گیارہ بجے دو رکعت نماز نفل برائے توبہ پڑھیں۔ ہر رکعت میں تین بار قل ہو اللہ پڑھیں اور تین بار آیت کریمہ بھی پڑھیں۔

۱۔ اصل خط ضمیمے میں ملاحظہ کریں۔ خط نمبر XXi

سلام پھیرنے کے بعد گیارہ بار درود شریف پڑھ کر ایک تسبیح یہ دعا پڑھیں۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ

یہ دعا سورہ انبیاء کے چھٹے رکوع میں ۸۹ ویں آیت ہے۔ وہاں پر اچھی طرح دیکھ کر اعراب درست کرلیں۔

ایک تسبیح یہ دعا پڑھنے کے بعد گیارہ بار درود شریف پڑھیں۔ اس کے بعد پھر ایک تسبیح یہی دعا پھر گیارہ بار درود شریف۔

اسی طرح تہجد کا وقت ہونے یا سحری کا وقت آنے تک یہی کرتے رہیں۔ پھر اپنے صدق دل سے اولاد کی دعا مانگیں۔

پھر تہجد کے کچھ نفل پڑھ کر سحری کھائیں اور فجر پڑھ کر سو رہیں۔

اس دعا کی برکت سے حضرت زکریہ علیہ السلام کو سو برس کی عمر میں فرزند عطا ہوا تھا۔ اگرچہ ان کی اہلیہ بھی عاقرہ تھیں۔

ستائیسویں کی شب کو سورہ انبیاء یٰسین اور الصّٰفّٰت کے علاوہ وہی کچھ پڑھیں جو پہلے پڑھا کرتے تھے۔

یہ خط ملنے کی اطلاع ضرور دیں۔

امید ہے آپ بمعہ بیگم خیریت سے ہوں گے۔ والسلام

نیازمند

قدرت اللہ شہاب

شاید ایسی ہدایات اور اطلاعات قدرت اللہ کسی اور کو بھی دیتے ہوں۔ مجھے اس کا علم نہیں۔

محروم خوش قسمت

جہاں تک میرا سوال ہے' میں نے قدرت کو ابتداء ہی میں کہہ دیا تھا۔ کہ شہاب جی مجھے اس جھنجھٹ میں نہ ڈالیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ میں استحکام نہیں ہے۔ میں ایک ناپاک فرد

ہوں۔ مجھ میں کشٹ اٹھانے کی ہمت نہیں۔ آرام طلب ہوں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے بزرگ بننے کی طلب نہیں اگر آپ میں اتنی طاقت ہے تو مجھے ایک اچھا انسان بنا دیں۔ دعا کریں۔

یہ بات میں قدرت کے سامنے مسلسل دہراتا رہا تھا۔

اس کے باوجود آخری [1] ایام میں وہ میری توجہ کلام کی طرف مبذول کراتا رہا۔ لیکن مجھ میں کلام اپنانے کی توفیق پیدا نہ ہوئی۔

شکر ہے نہ ہوئی ورنہ مجھ پر پابندیاں عائد ہو جاتیں اور میں یہ کوائف آپ کی خدمت میں پیش نہ کر سکتا اور اس عظیم انسان کے لیے جذبہ شکر گزاری کا اظہار نہ کر سکتا۔ وہ عظیم انسان جو حضور اعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ ترین غلام تھا۔

مثال کے طور پر ذیل کا خط ملاحظہ ہو جو قدرت نے مجھے مری سے لکھا۔

مری

۲۶ [2] جون ۸۳ء

محترمی ممتاز مفتی

السلام علیکم۔ کل صبح میں آپ کی طرف آنے والا تھا۔ ٹیلی فون پر معلوم ہوا کہ آپ رفیق صاحب سے ملنے پنڈی گئے ہوئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہد رفیق صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں شفا عطا فرمائے۔

نفی اثبات کا ورد کرنے کے لیے آپ کے لیے ایک نہایت آسان طریقہ سمجھ میں آگیا ہے۔ اس میں نہ کوئی وقت اور نہ کوئی جگہ مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی خاص طریقے پر بیٹھنا بھی نہیں۔ جس وقت آپ فارغ ہوں۔ فوراً سانس باہر نکالتے ہوئے Exhale

---

۱۔ ضمیمے میں خط نمبر XXiii ملاحظہ کریں۔

۲۔ اصل خط ضمیمے میں ملاحظہ کریں۔ خط نمبر XXii اور XXiii

خاموشی سے زبان ہلا کر لَا اِلٰہ کہیں۔ اور سانس اندر کی طرف لاتے ہوئے Inhale اسی طرح خاموشی سے زبان ہلا کر اِلّا اللہ کہیں۔ اسی طرح ہر سانس کو Exhale کرتے ہوئے لَا اِلٰہ اور Inhale کرتے ہوئے اِلّا اللہ کہتے رہیں۔ اسے پاس انفاس کہتے ہیں۔ یہ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے یا لیٹے ہوئے فارغ اوقات میں کرتے رہیں۔ اس کو اس طرح پکائیں کہ یہ بالکل عادت ثانیہ بن جائے۔ جہاں فرصت ہوئی وہیں سانس کے آنے جانے میں خود بخود نفی اثبات شروع ہو گیا۔ صرف غسل خانے میں حاجات ضروریہ کے وقت ایسا نہ کیا جائے۔ کچھ لوگ اس میں ایسی مشق بہم پہنچاتے ہیں' کہ غسل خانے میں زبان دانتوں تلے دبا کر رکھتے ہیں تاکہ ذکر جاری نہ ہو جائے۔ وضو کی کوئی قید نہیں۔

اگلے جمعہ تک خوب مشق کریں' اور بتائیں کہ کوئی مشکل تو در پیش نہیں آرہی۔ اگر اس پر کسی قدر عبور حاصل ہو جائے تو ساری عمر کے لیے سب امور کے لئے کافی ہے۔

والسلام

نیاز مند۔ قدرت اللہ شہاب

میں نے چند ایک روز کوشش بھی کی تھی۔

لیکن جو فینٹیسی کا مریض ہو۔ جس کا ذہن خرافات سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا میری یہ کوشش سعیٔ لاحاصل ثابت ہوئی۔

حیرت کی بات ہے کہ میری ان کمیوں' کجیوں کے باوجود قدرت اللہ مجھ سے مایوس نہ ہوا۔ اس نے زندگی بھر مجھ جیسے ناپاک گنہگار کو گوارا کیا۔

اس نے ایسا کیوں کیا۔

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

لگتا ہے کہ وہ سمندر تھا۔ خس و خاشاک اور غلاظت اسے ناپاک نہیں کر سکتے تھے۔

چون واں باب

پاکستان

میں نے فون کا چونگا اٹھایا۔ قدرت بول رہا تھا۔
آپ لاہور جا رہے ہیں کیا۔
میں نے کہا' جی جا رہا ہوں۔
کسی کام کے لیے جا رہے ہیں کیا۔
میں نے کہا' کام نہیں۔ عیاشی کرنے جا رہا ہوں۔
کیسی عیاشی۔

تیل اور پانی

داستان سرائے میں قیام کرنا بذات خود عیاشی ہے۔ وہاں میری ماں ہے۔ وہ مجھے چوگے کھلاتی ہے۔ بھنی ہوئی ماش کی دال۔ مسی روٹی۔ گھٹا ساگ' ثابت مسر' شیرے والی گاجریں' پھر بانو سے باتیں ہوں گی۔ باتیں ہی باتیں۔ باتیں ہی باتیں۔ قدرت اللہ کی باتیں۔ اشفاق کی شکائتیں۔

شکائتیں کیوں' اس نے پوچھا۔

اس لیے کہ وہ مجھ سے دل کی بات نہیں کرتا۔ کسی سے دل کی بات نہیں کرتا۔ چالیس

سال سے ہم دونوں ایک گلاس میں پڑے ہیں۔ لیکن الگ الگ' وہ تیل ہے میں پانی ہوں۔

وہ ہنسا۔

اشفاق کی شکائتیں کرتا ہوں تو بانو کو دکھ ہوتا ہے' وہ غصے میں کہتی ہے' کیا میرے خان صاحب میں کوئی خوبی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں' اس میں بیسیوں خوبیاں ہیں۔ مجھ سے زیادہ خوبیوں کا مالک ہے' پر وہ تیل بن کر رہتا ہے' پانی نہیں بنتا۔

وہ ہنسا۔

میں نے کہا' مجھے آپ سے بھی شکایت ہے کہ تیل کو پانی میں نہ بدل سکے۔

فکر نہ کریں' وہ بولا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کب ہو جائے گا۔ آپ نے کھجور کا درخت لگا بھی دیا تو کیا فائدہ ———

صوفی برکت علی

اس نے بات کا رخ بدلا۔ کہنے لگا۔ اگر لاہور میں آپ کو فرصت ملے تو صوفی صاحب کو سلام کر آئیں۔

وہ کون ہیں' میں نے پوچھا۔

سالار والے جائیں۔ سب پتہ چل جائے گا۔

میں نے حامی بھرلی۔ جی اچھا۔ لیکن میرا ارادہ نہیں تھا کہ صوفی صاحب کی خدمت میں حاضری دوں ۔ مجھے کسی اور بزرگ سے ملنے کی خواہش نہ تھی۔ میں نے سوچا کہ قدرت پوچھے گا تو ٹال دوں گا۔ بہانہ بنالوں گا۔

داستان سرائے میں پہنچا تو عیاشی کا ایسا نشہ آیا کہ صوفی صاحب کی بات ہی ذہن سے نکل گئی۔

رات کو دس بجے فون بجا۔ اتفاق سے میں فون کے پاس تھا' چونکا اٹھایا۔ میرے ایک دوست یوسف بول رہے تھے۔ انہوں نے میری آواز پہچان لی۔ بولے' آپ یہاں ہیں۔

میں نے کہا' ابھی آیا ہوں۔

بولے' ملاقات ہونی چاہیے۔

میں نے کہا' ہونی چاہیے۔

بولے' لیکن میں تو کل جا رہا ہوں۔

میں نے کہا' مت جاؤ۔

کہنے لگا' جانا ضروری ہے۔

ضروری ہے تو جاؤ۔

بولے' ایک صورت ہے۔ میں صبح جاؤں گا شام تک واپس آ جاؤں گا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ میرے ساتھ چلیں راستے میں گپ شپ رہے گی۔

میں نے پوچھا' جانا کہاں ہے۔

کہنے لگے' صوفی برکت علی صاحب کی حاضری دینی ہے' سالار والے۔

میں نے سوچا' دیکھو کس چالاکی سے مجھے پابند کر دیا گیا ہے۔

اگلے روز ہم کار میں سالار والے جا رہے تھے۔ میرا دوست اور ایک بہت بڑا ادبی' اسلامی شاعر عبدالعزیز خالد۔

ہم تینوں گپیں مارتے ہوئے سالار والا پہنچ گئے۔

وہاں صوفی صاحب کو دیکھا تو میں حیران ہوا۔ ایک نحیف و نزار منحنی آدمی' جس میں ایک من جان ٹھونس رکھی تھی۔ ٹک کر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اندر خون کی جگہ پارہ بھرا ہوا ہے۔ اتنی بے چینی ٹرانسمٹ کر رہے تھے۔ کہ گرد و پیش سے بھبھاکے اٹھ رہے تھے۔

جمعہ کی نماز پڑھانے کے بعد صوفی صاحب نے فرمایا۔

> "لوگو جان لو کہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب یو این او کوئی قدم اٹھانے سے پہلے پاکستان سے پوچھے گی' "کیا میں یہ قدم اٹھا لوں؟" اس وقت ہم تو رخصت ہو چکے ہوں گے' اگر ایسا نہ ہوا تو آ کر ہماری قبر پر تھوکنا۔"

میں تو ششدر رہ گیا۔ یااللہ' اتنا بڑا دعویٰ ایک بزرگ کی زبان سے۔

یااللہ یہ پاکستان کیا شے ہے۔ کیوں لوگ اس کی عظمت کی باتیں کرتے ہیں۔

جب میں بھارت یاترا کے لیے گیا تھا اور اشفاق حسین اور میں ایک دکان سے ہومیو پیتھی

کی کتابیں خرید رہے تھے تو ایک سکھ خاتون آگئی۔ بڑی بے تکلفی سے ہمیں پوچھنے لگی۔ کد آئے تسی پاکستان توں۔

میں نے کہا بی بی تجھے کیسے پتہ چلا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔

کہنے لگی: تواڈے منہ تے جو لکھیا ہویا ہے۔

میں نے پوچھا: وہ کیسے؟

بولی' چلو بازار وچ جا کھڑو یئے۔ تسی لوکاں دے منہ تکنا۔ جدے منہ تے رونق ہووے تے لشکدا ہووے بس جان لو و کہ او' پاکستانی اے۔ ساڈی تے سمجھ وچ نہیں اوندا۔ حالات بھیڑے نے' پر چہریاں تے رونق اے' بازاراں وچ رونق اے' پیسے دی بھرمار اے۔ چیزاں دی بھرمار اے۔ سڑکاں تے موٹراں ای موٹراں۔ دکاناں وچ مال ای مال۔ سانوں تے سمجھ نہیں اوندی اے' کی ہو ریا اے۔

میں نے پوچھا بی بی آپ کیا کرتی ہیں۔

بولی' میں ائیر انڈیا دی ہوسٹس آں۔

۱۹۸۶ء میں میں نے پاکستان پر ایک مضمون لکھا تھا جو درج ذیل ہے۔

مملکت خداداد

اگرچہ پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے لیکن بڑا پر بہار ہے۔ حسین مناظر سے مالا مال' رنگا رنگی کا جواب نہیں۔ کسی جانب زرخیز مناظر اور میدان پھیلے ہوئے ہیں کسی جانب پہاڑوں کی سر بہ فلک چوٹیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں ہری بھری وادیاں لیٹی ہوئی ہیں۔ چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ پھول ہی پھول رنگ برنگے پھول۔ کسی جانب ریت کے صحرا ہیں۔ کسی جانب سنگلاخی ویرانے۔ مناظر کے لحاظ سے پاکستان گوناگوں ہے' مالا مال ہے۔ یہاں ہر قسم کی آب و ہوا ملتی ہے۔ ہر قسم کی نباتات طرح' طرح کے چرند پرند۔

یہ علاقہ بڑا قدیم ہے۔ پتہ نہیں کتنی تہذیبیں قائم ہوئیں' پھلی پھولیں اور پھر تباہ ہو گئیں۔ آج بھی یہاں جگہ جگہ ڈھیریاں موجود ہیں۔ جنہیں کھودو تو آثار کی دولت نکل آئے۔ میرا بیٹا عکسی مفتی حال ہی میں پیرس گیا' تو وہاں موسیو کیور ئیل سے ملا۔

موسیو کیور ئیل بین الاقوامی شہرت کا مالک' آثار قدیمہ کا ماہر ہے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ

یہاں کے آثار قدیمہ کا ڈائریکٹر جنرل تھا۔ کراچی کا میوزیم اسی نے بنایا تھا۔ وہ عکسی سے مل کر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ اچھا تو تم پاکستان سے آئے ہو بھئی پاکستان کا نام تو انڈیا ہونا چاہئے تھا۔ یہ نام دراصل سکندر اعظم نے رکھا تھا۔ دریائے سندھ کو انڈس کا نام دیا اور اس سے پچھلے علاقے کو انڈیا کہا۔ موسیو نے کہا' پاکستان جدوجہد کا علاقہ ہے۔ زندگی کا نشان ہے۔ حرکت برکت کا علاقہ ہے۔ لوگ آتے رہے جاتے رہے۔ جرنیل آئے شہنشاہ آئے۔ محققین آئے' صوفی آئے سیاح آئے اس سے پچھلا علاقہ تو قیام کا علاقہ تھا۔ ٹھہراؤ کا علاقہ۔

پھر موسیو نے عکسی سے پوچھا' کیوں نوجوان کیا تمہیں پاکستان کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہے۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان کی آبادی ساڑھے آٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ سو میں سے ۹۷ مسلمان ہیں سو میں سے ۷۷ دیہات میں رہتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے پاکستان دنیا کے تمام ملکوں میں نویں نمبر پر آتا ہے کئی علاقوں میں آبادی گنجان ہے۔ کئی بہت کم آباد ہیں۔ کہیں مربع کلو میٹر میں ۲۲۹۔ افراد بستے ہیں کہیں صرف ۱۲۔ پاکستان پر اللہ کا بڑا کرم ہے۔ یہاں عورتوں کا تناسب کم ہے یہ چھوٹی سی تفصیل ملک کے اخلاق پر بڑا اثر رکھتی ہے۔

پاکستان چار صوبوں پر مشتمل ہے سندھ سرحد بلوچستان اور پنجاب۔

ہر صوبے کا رہن سہن اور روایات مختلف ہیں۔ سرحد اور بلوچستان کے کلچر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اسی طرح سندھ اور پنجاب کے رہن سہن میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہر صوبے کے اندر ایسے خطے موجود ہیں جن کا رہن سہن اور روایات مختلف ہیں۔ اس تنوع میں تضادات بھی ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ روایات کے اس تضاد میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس ہم آہنگی کا ماخذ اسلام ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ رنگ برنگے پھول ایک تاگے میں پروئے ہوئے ہیں اور یہ تاگا اسلام کی روح ہے۔ یہاں اسلام کے لیے جذبہ عام ہے۔ یہ جذبہ ان علاقوں میں طاقتور ہے۔ جنہیں آج کی اصلاح میں پس ماندہ علاقے کہا جاتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو قیام پاکستان کا باعث بنا۔ یہی جذبہ استحکام پاکستان کا ضامن ہے۔ آج کل ساری دنیا میں ایک کھچڑا کلچر نے یورش کر رکھی ہے۔ یہ کھچڑا کلچر شہروں میں اتنی دھول اڑا رہا ہے کہ دنیا کے تمام ممالک خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک عالمی اکٹھ کیا۔ کہنے لگے۔ بھائیو اگر یہ کھچڑا یونہی دھول اڑاتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے تمہارے کلچر اس دھول میں دب جائیں گے اور ان

کا نشان تک نہیں رہے گا۔ اس لیے آؤ ہم سب اپنے کلچر محفوظ کر لیں۔ اس پر بہت سے ملکوں نے لوک ورثہ کے ادارے بنا لیے۔ خوش قسمتی سے پاکستان نے بھی لوک ورثہ کا ادارہ قائم کر لیا۔

پاکستان کے بڑے بڑے شہر بھی اس کلچر کی یلغار سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ اس کے علاوہ فرنگی یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے تو آبادیاتی روایت کا بیج بو گیا جس کی وجہ سے گورا صاحب کے جانے کے بعد کالا صاحب نے اس کی گدی سنبھال لی۔ فرنگیت ختم نہیں ہوئی اس نے روپ بدل لیا ہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے شہری علاقوں میں ہماری روایت کمزور پڑ گئی۔ ہماری مغربی طرز تعلیم نے روایت کو اور بھی کمزور کر دیا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو یہ احساس ہی نہیں رہا کہ روایت ہی ہماری پہچان ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود حیرت کی بات ہے کہ پڑھے لکھے شہریوں میں جدیدیت کی گرد کے نیچے اسلامی جذبہ جوں کا توں قائم ہے اور ایمرجنسی کے وقت گرد کو جھاڑ کر یوں گرد سے باہر نکلتا ہے جیسے الہ دین نے چراغ رگڑ دیا ہو۔ اگرچہ یہ جذبہ عمل سے محروم ہے پھر بھی یہی جذبہ ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے لیکن جہاں تک ڈویلپمنٹ کا سوال ہے۔ ارباب اختیار نے ہمیشہ شہری علاقوں کو ترجیح دی ہے۔ لینڈ ریفارم کئی بار آئیں، چمکیں، گرجیں لیکن برسے بغیر چلی گئیں۔

ہماری سیاست کا انداز تعمیری نہیں بلکہ تخریبی ہے۔ ایسے لیڈر ہمیں بہت کم ملے جو ذات کو قومی مفاد پر قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ہمارے معاشرے کا نظام ابھی تک جاگیردارانہ ہے۔ اسلامی یا مغربی جمہوریت سے بے گانہ ہے۔ لہٰذا ہمارے زیادہ تر لیڈر وڈیرا ذہنیت کے مالک ہیں۔ وہ حاکمیت کے دلدادہ ہیں اور ”میں“ کے حوالے کے بغیر سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسی وجہ سے ہم نے اس مملکت خداداد کا ایک بازو کٹوا دیا۔

ہمارے بہت سے بھائی روزی کمانے کے لیے ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ حصول روزگار اور تنہائی کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔ گاڑھے پسینے کی کمائی گھر بھیجتے ہیں لیکن گھر والے اپنے چاؤ پورے کرنے اور ناک اونچی رکھنے کے لیے بے دریغ خرچ کیے جا رہے ہیں۔

ہمارے تاجر نو دولتی ذہنیت کے مالک ہیں۔ ان میں صبر نہیں، استحکام نہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوؤں نے مسلمانوں پر کاروبار میں داخل ہونے والے سب دروازے بند کر رکھے

تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ دروازے کھلے تو منافع دیکھ کر تاجروں کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ منافع کی شرح بڑھاتے گئے۔ ذخیرہ اندوزی کرتے گئے۔ دراصل ابھی تک مسلمانوں کا مزاج کاروباری رنگ میں نہیں رنگا گیا۔ کاروبار میں وہ آج کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ مستقبل بعید کے حوالے سے نہیں سوچتے۔ اس لیے قیمتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ بڑھتی جا رہی ہیں۔

سرکاری دفتروں میں رشوت ستانی زوروں پر ہے چھپ چھپ کر نہیں علانیہ رشوت لی جاتی ہے۔ اور پھر اس کے حصے آپس میں بانٹے جاتے ہیں۔ رشوت کے ماہانے مقرر ہیں۔ رشوت لینا رواج بن گیا ہے۔ اس پر کوئی اخلاقی یا سماجی بندش نہیں رہی۔ وزیر مالیات نے حال ہی میں بیان دیا تھا کہ ہمارے ہاں اربوں روپے رشوت میں دیئے جاتے ہیں۔ تاجر لوگ بخوشی رشوت دیتے ہیں ایک تو ان کے جائز اور ناجائز کام جلد از جلد تکمیل پا جاتے ہیں۔ دوسرے رشوت کا بوجھ تاجر پر نہیں پڑتا بلکہ خریدار پر بانٹ دیا جاتا ہے۔ اہل کار مال باہر سے منگواتے ہیں چاہے وہ مال ملک میں موجود ہو' تاکہ کمشن زیادہ ملے اور صیغہ راز میں رہے۔ کمشن کا لالچ انہیں مال کی کوالٹی سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس وقت ملک کے حالات بہت مایوس کن ہیں۔ تاجر' اہلکار' عوام سب پاکستان کو کھا رہے ہیں' کھاتے جا رہے ہیں۔ سب جانے ان جانے میں اس ٹہنی کو کاٹنے میں مصروف ہیں جس پر ہمارا آشیانہ ہے۔ حالات کی طرف دیکھیں تو پاکستان کو عرصہ دراز سے صفحہ ہستی سے مٹ جانا چاہیے تھا لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ ملک ابھی تک قائم ہے اور صرف قائم ہی نہیں بلکہ ہر طرح سے پھل پھول رہا ہے۔

بازاروں میں جاؤ تو کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ سڑکوں کو دیکھو تو کاریں یوں چل رہی ہیں جیسے شہروں میں آوارہ کتے۔ خواتین کو خریداری کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ کپڑے اور زیور کی دوکانوں پر بھیڑ لگی ہے۔ ہر چوتھی دکان کھانے پینے کی ہے۔ لوگ کھا رہے ہیں' چکن تکے کھا رہے ہیں کباب کھا رہے ہیں بالٹی گوشت کی کڑاہیاں سامنے رکھی ہوئی ہیں۔

پہلے گوشت پاؤ کے حساب سے بکتا تھا۔ اب کلو اور سالم بکروں کے حساب سے بکتا ہے۔ گھر گھر ڈیپ فریزر رکھے ہوئے ہیں۔ قصائی چھاتی نکال کر گردن اٹھا کر اور مونچھ مروڑ کر چلتا ہے۔ سکولوں کالجوں میں داخلے کے لیے قصائی کی سفارش چلتی ہے۔ لوگوں کو دیکھئے چہروں پر چمک ہے۔ ہونٹوں پر فلمی گیت ہے۔ انداز میں سو واٹ ہے۔ یوں گھومتے پھرتے ہیں۔ جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ پاکستان ترقی کیے جا رہا ہے۔ معیار زندگی اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ پر کیپیٹا

Per Capita انکم بڑھتی جا رہی ہے۔ پاکستان کی بین الاقوامی حیثیت بڑھ رہی ہے۔ دنیا میں جگہ جگہ پاکستان کا ذکر ہو رہا ہے۔

ایسا کیوں ہے! یااللہ یہ بھید کیا ہے؟

ایک طرف اتنی زبوں حالی دوسری جانب خوشحالی۔ ہم کانٹے بو رہے ہیں پھر پھول کیوں اگ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے دو رخ ہیں۔ ایک تو حقائق کا رخ اور دوسرا پر اسرار رخ جو سمجھ میں نہیں آتا۔ حیران کن سہی مگر بہت واضح ہے۔ حقائق کے زاویئے سے دیکھیں تو پاکستان ایک عام اسلامی ملک ہے جسے دوسرے اسلامی ممالک پر کسی لحاظ سے فضیلت حاصل نہیں۔

ہماری لیڈر شپ کی موجودہ کیفیت کسی امید افزا مستقبل کی غماز نہیں بلکہ گردو پیش کے تیور ایسے ہیں کہ مستقبل ڈانواں ڈول نظر آتا ہے۔ حقائق سے ہٹ کر دیکھیں تو حیران کن باتیں سامنے آتی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ قیام پاکستان سے سالہا سال پہلے بزرگوں نے پاکستان بننے کی بشارت دی تھی۔ دنیا میں بیسیوں اسلامی مملکتیں ہیں جو ماضی قریب میں وجود میں آئیں ہیں۔ لیکن کبھی کسی بزرگ نے ان کے قیام کی بشارت نہیں دی تھی۔ کشمیر کے معروف باکمال بزرگ شاہ نعمت اللہ کی پیش گوئیوں سے برصغیر کے مسلمان اچھی طرح واقف ہیں۔ تقسیم سے بہت پہلے یہ پیش گوئیاں زبان زد عوام ہیں۔ یہ پیش گوئیاں فارسی اشعار کی صورت میں ہیں۔ ان میں گذشتہ عالمی جنگوں کا بھی تذکرہ ہے۔ فرنگ کے یہاں سے چلے جانے اور تقسیم ہند کا بھی ذکر ہے۔

انگریزوں نے ان پیش گوئیوں کی اشاعت کو غیر قانونی قرار دیا تھا' لیکن ان کی حیثیت "سینہ بہ سینہ روایت سی" بن چکی تھی۔ اور روایت کو کون "بین" کر سکتا ہے۔ ان پیش گوئیوں میں بھارت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے' پاکستان کی عروج اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے متعلق بھی واضح اشارے ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم کے متعلق شاہ نعمت اللہ فرماتے ہیں:

> انگریز ہندوستان کی حکمرانی چھوڑ دیں گے۔ لیکن اپنی برائیوں کا بیج بو جائیں گے۔ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا' لیکن مکر و بہانہ کے باعث دونوں حصوں میں کشیدگی پیدا ہو جائے گی۔

نصرانیاں باشد ہندوستان سپارند
تخم بدی بکا راند زفسق جاویدانہ
تقسیم ہند گرد و در در حصص ہویدا
آشوب و رنج پیدا ازمکر ازبہانہ

ہندوستان کے عظیم بزرگ جو حضرت مہاجر مکیؒ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان سے متعلقہ کتابوں میں یہ واقعہ درج ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں پہلی جنگ آزادی لڑی گئی جسے فرنگی نے غدر کا نام دیا تھا۔ تو جناب حضرت مہاجر مکیؒ نے ایک علاقے پر قبضہ کر کے وہاں اسلامی حکومت قائم کرلی۔ یہ اسلامی حکومت کچھ عرصہ کام کرتی رہی پھر انگریزوں نے اپنا بکھرا ہوا شیرازہ از سر نو جمع کیا۔ انگلستان سے اسلحہ کی کھیپ اور نفری منگوائی اور پھر سے کھویا ہوا وقار قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے حضرت مہاجر مکیؒ کی اسلامی ریاست کا محاصرہ کرلیا۔ گولہ باری کی اور اس پر تسلط جمالیا۔ حضور مہاجر مکیؒ کو گرفتار کرلیا گیا۔

حضرت مہاجر مکیؒ کا مسلمانان ہند میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔ یہاں تک کہ غیر مسلم بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ انگریز ڈرتا تھا کہ حضور کی گرفتاری پر حالات خراب نہ ہو جائیں ساتھ ہی وہ اپنا وقار قائم کرنے کے لیے ضروری سمجھتا تھا کہ ان کی تذلیل کرے۔ لہٰذا انگریز نے حضور کے ہاتھ باندھ دیئے اور بر سر عام ان کا جلوس نکالا۔ ایک لحیم شحیم سیاہ فام مجذوب نے جلوس کا راستہ روک لیا وہ حضور سے مخاطب ہو کر بولا۔ دیکھ——— یہ نہ سمجھیو کہ تیری یہ کوشش ناکام ہو گئی ہے۔ جو بیج تو نے بویا ہے نوے سال بعد اس میں سے کونپل پھوٹے گی۔ نوے سال بعد قیام پاکستان عمل میں آیا۔

حضرت مہاجر مکیؒ صاحب کے آخری مرید جناب حاجی عبدالمعبود سے جن کا حال ہی میں اسلام آباد میں انتقال ہوا ہے۔ میں چند ایک بار ملا ہوں' انہوں نے اس واقعہ کی تصدیق کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں انہوں نے حصہ لیا تھا۔ ان دنوں وہ جوان تھے۔

شاہ بری لطیفؒ نے آج سے ڈھائی تین سو سال پہلے فرمایا تھا کہ نور پور کے پاس ایک اسلامی شہر آباد ہو گا جو مستقبل میں دنیائے اسلام کا مرکز بنے گا۔

پاکستان کی اہمیت اور عظمت کے بارے میں بزرگان دین نے بار بار تذکرہ کیا ہے۔
صرف بزرگ ہی نہیں' نجومیوں اور جوتشیوں نے بھی بہت پہلے پاکستان کے قیام کی

خبر دی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں مغرب کے ایک معروف ستارہ شناس ایچ آرنیلر کی پیش گوئی روزنامہ ٹریبون میں چھپی تھی کہ آرنیلر نے لکھا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو گا۔ مسلمانوں کی مملکت قائم ہو گی پھر دونوں ملکوں میں اختلافات رہیں گے۔ ان کے باہمی تعلقات ۱۹۹۹ء سے پہلے دوستانہ نہیں ہوں گے۔ ہند اندرونی انتشار کا شکار ہو جائے گا اور مسلمان دلی تک قابض ہو جائیں گے۔

مغربی ستارہ شناس عرصہ دراز سے پیش گوئی کر رہے ہیں کہ دنیا پر ایک صلح امن اور خوشحالی کا دور آنے والا ہے اس دور کو وہ ایکوَیرین ایج یا دی گولڈن ایج کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا پر عجیب و غریب اور مبارک ستاروں کے کانسٹی لیشنز اکٹھے ہو رہے ہیں۔ مسلمان اس دور کو نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ اس دور کے آنے سے پہلے برصغیر پر زبردست تباہی آئے گی۔

پاکستان کے جوتشی بھی انہیں خطوط پر پیش گوئیاں کر رہے ہیں۔ ان میں راولپنڈی کے منجم غازی پیش پیش ہیں۔

اب لیجیے قیام پاکستان کی بات۔ قیام پاکستان عجیب حالات میں عمل میں آیا۔ انگریز اس کے حق میں نہ تھے۔ ہندو اس کے خلاف تھے۔ مسلمانوں کی چند تنظیمیں بھی اس کے حق میں نہ تھیں۔

ایسے حوصلہ شکن حالات میں پاکستان کا قیام ایک معجزے سے کم نہ تھا۔

قیام پاکستان کے لیے قدرت نے ایک ایسے فرد سے کام لیا جو انگریز شخصیت کا مالک تھا جو سیاسی ہیرا پھیری سے ناواقف تھا۔ (جو پاکستانی کلچر سے بے گانہ تھا اور اسلام سے برائے نام واقفیت رکھتا تھا قائداعظمؒ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بلند کردار کے مالک تھے۔ ان کے مدمقابل گاندھی تھا۔ پٹیل تھا نہرو تھا۔ جو سیاسی ہیرا پھیری میں بہت مشاق تھے۔ سیاسی روش میں بلند کردار کامیابی کا ضامن نہیں ہوتا۔ الٹا بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اللہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے کامیابی عطا کرے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے صورت حال کا جائزہ لیا کہ قائداعظم کو ایک اسلامی مملکت کا سربراہ بننا ہے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ قائداعظم کے لیے اسلام کی بنیادی تعلیم از بس ضروری ہے۔ وہ قائد سے بمبئی میں ملے قائد نے ان کا مشورہ مان لیا اس کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے ساتھی قائدؒ کو اسلامی تعلیم دیتے رہے۔ صوفی صاحب سے ملنے کے بعد لاہور سے

واپسی پر میں حیران ہو رہا تھا کہ یااللہ اتنا بزرگ اور۔ اتنا بڑا دعویٰ' قدرت اللہ کا تو کہنا ہے کہ دعویٰ کرنا بزرگ کا کام نہیں۔

پچپن واں باب

چھوٹا منہ

لاہور سے واپس آیا تو میں سیدھا شہاب کی طرف گیا۔

گڈی نے کہا' آج ماموں کا موڈ آف ہے۔

شہاب کا موڈ آف ہو۔ نہیں' میں نہیں مانتا' میں نے جواب دیا۔

سچ کہتی ہوں' وہ بولی۔

شہاب کا تو موڈ ہوتا ہی نہیں۔ وہ تو ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ہے' اس میں اچھل نہیں۔ کبھی کبھی چھلکتا ضرور ہے۔ لیکن یہ چھلکن کسی اور طرح کی ہوتی ہے۔

گڈی بولی' میں ماموں کو جانتی ہوں۔

گڈی

وہ سچ کہتی تھی۔ وہ قدرت اللہ کی ہمشیرہ کی بیٹی ہے۔ گھر میں صرف گڈی شہاب کو جانتی تھی۔

میں نے پوچھا' تجھے کیسے پتہ چلا کہ شہاب کا موڈ آف ہے۔

کہنے لگی' کچھ لوگ ملنے آئے تھے۔ انہوں نے پاکستان کا ذکر کیا۔ ماموں کہنے لگے۔ پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ راستے سے بھٹکا ہوا۔ ہم آج تک اسلام نافذ

نہیں کر سکے اور جب تک اسلام نافذ نہیں ہو گا۔ پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کی اہمیت صرف اسلام کے حوالے سے ہے۔ گڈی کہنے لگی' ماموں کی آواز میں غصہ نہیں تھا' لیکن آواز کے پیچھے شدت تھی۔ ناراضگی تھی۔ میں ماموں کے غصے کو پہچانتی ہوں۔

گڈی کا کمرہ شہاب کے کمرے سے ملحق تھا۔ اس روز میں شہاب کے کمرے میں داخل ہونے لگا تھا کہ گڈی نے مجھے بلا لیا تھا۔

کہنے لگی' آج آپ ماموں سے احتیاط کے ساتھ بات کریں۔

شہاب کے کمرے میں داخل ہو کر میں نے سلام کیا اور غیر از معمول بڑے ادب سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

پھر شہاب بولا' آپ خاموش ہیں۔ خیریت ہے۔ میں نے کہا' جناب میں احتیاط برت رہا ہوں اس لیے۔

اس نے سوالیہ نگاہ سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا' جناب گڈی نے مجھے مشورہ دیا ہے کہتی ہے آج احتیاط سے بات کریں۔ ماموں کا موڈ آف ہے۔

وہ مسکرایا۔

میں نے کہا گڈی کہتی ہے' کچھ ملاقاتی آئے تھے' انہوں نے پاکستان کی عظمت کی بات چھیڑ دی۔ جس پر آپ نے انہیں جھاڑ پلا دی۔

ہاں' وہ بولا' لوگ غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں۔ میں نے آپ کا مضمون پڑھا ہے پاکستان پر۔

جی' میں نے کہا۔

آپ بھی غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

میں نے کہا' شہاب صاحب آپ کو ایک بات یاد دلا دوں۔ اجازت ہے۔

شہاب نے میری جانب دیکھا۔

طمانچہ

۱۹۶۰ء کی بات ہے میں نے کہا' جب آپ مرکزی حکومت کراچی سے پنڈی لائے تھے۔

جب میں صدر گھر کا نیا نیا او ایس ڈی بنا تھا۔ شام کا وقت تھا آپ اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی موجود تھا۔

ایک سائل آ گیا۔ غالباً" وہ تازہ مہاجر تھا۔ بڑی کراری اردو بولتا تھا۔ اس نے اپنی حالت زار کا نقشہ کھینچا تھا۔ رہنے کے لئے مکان نہ تھا' کھانے کے لیے روٹی نہ تھی۔ کئی دن مارا مارا پھرتا رہا' لیکن نوکری نہ ملی تھی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔

شہاب صاحب آپ نے اس سائل سے بڑی ہمدردی جتائی تھی' اسے حوصلہ دیا تھا' فکر نہ کیجیے اللہ تعالیٰ کوئی صورت پیدا کر دیں گے۔ آپ کل دفتر آجائیے ایک عرضی لکھ لائیے۔ شاید کل ہی بات بن جائے۔ حوصلہ نہ ہاریے' آزمائش کے وقت آجاتے ہیں۔

جب وہ رخصت ہونے لگا تو غصے میں بولا' ہم اتنے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں یہاں آکر۔ لعنت ہو پاکستان پر۔

شہاب صاحب یہ سن کر آپ نے بجلی کی طرح کرسی سے اٹھ کر سائل کے منہ پر طمانچہ مار کر کہا تھا گٹ آؤٹ۔ یاد ہے۔

شہاب صاحب میں نے آپ کے ساتھ بیس پچیس سال گزارے ہیں۔ اس دوران میں آپ نے صرف ایک آدمی کو تھپڑ مارا ہے۔ اس لیے کہ اس نے پاکستان کو بد دعا دی تھی۔ اس کے بعد بھری محفل میں جہاں صدر ایوب اور ان کے اہل کار بیٹھے تھے۔ آپ نے ایک وزیر کو گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ اس لیے کہ پاکستان کا وزیر ہوتے ہوئے وہ پاکستان کے خلاف مخبری کرتا تھا۔ یاد ہے۔

ہم تو آپ کے بالکے ہیں شہاب صاحب جو آپ کہتے ہیں۔ سچ ہے' جو آپ کرتے ہیں وہ حق ہے۔ آپ ہی نے ہمارے دلوں میں پاکستان کی اہمیت اور عظمت کا جذبہ پیدا کیا ہے۔

اور اب آپ کہتے ہیں کہ اسلام کے حوالے کے بغیر پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں۔

شہاب نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چند روز بعد وہ مری چلا گیا۔ وہ اکثر عبادات کے لیے مری چلا جایا کرتا تھا۔

اس کے دس پندرہ دنوں کے بعد کٹیا والا بابا کا واقعہ رونما ہوا۔

کٹیا والا بابا

چلتے چلتے میں نے جو سر اٹھا کر دیکھا تو راستہ نامانوس نظر آیا۔ میں نے اسے اہمیت نہ دی اور چلتا رہا' لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا توں توں یہ احساس بڑھتا گیا کہ میں غلطی سے کسی ان جانی سڑک پر نکل آیا ہوں۔ میں نے سوچا کوئی راہگیر ملے تو اس سے پوچھوں کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ کچھ دور سڑک سے ہٹ کر ایک بہت بڑا بڑ کا درخت تھا۔ جس کے قریب ہی گھاس پھوس کا ایک جھونپڑا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک شخص کھڑا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص سے پوچھ لوں۔ جھونپڑے کے برابر پہنچا تو سیٹی سی بجنے کی آواز آئی اور سکوٹر کے پچھلے پہیے کی ہوا نکل گئی۔ میں نے سکوٹر روک لیا۔ کیا مصیبت ہے' میں نے سوچا' اب فالتو پہیہ فٹ کرنا پڑے گا۔ سٹفنی کو دیکھا تو اس میں بھی ہوا نہیں تھی۔ اب کیا ہو گا؟ میں گھبرا گیا۔

میں نے سر اٹھایا تو روبرو وہی شخص کھڑا تھا جسے میں نے جھونپڑے کے سامنے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"پنکچر ہو گیا ہے۔"

"اسے ادھر کھڑا کر دے نا" وہ بولا۔

"یہ سڑک کدھر کو جاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں جاتی" وہ بولا "ادھر پہاڑی کے نیچے جا کر ختم ہو جاتی ہے۔"

"آس پاس کوئی گاؤں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولا "ادھر ایک رکھ ہے۔ وہاں سے روزانہ ٹرک آتا ہے۔ ٹرک آئے گا تو تیرے سکوٹر کے پہیے میں ہوا بھروا دیں گے۔ تو یہاں دھوپ میں کیوں کھڑا ہے؟ جھونپڑے میں جا کر بیٹھ۔ میں سکوٹر کا دھیان رکھوں گا۔"

جھونپڑے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں چادر سی لپٹی پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں پانی کا گھڑا تھا' ساتھ ہی ٹین کا ڈبہ پڑا تھا۔ میں نے پانی پیا اور پھر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔

چادر میں حرکت ہوئی اور ایک دبلا پتلا سفید ریش چہرہ باہر نکل آیا۔
اٹھتے ہی بولا "تو آ گیا۔"

"جی" میں نے جواب دیا "میں راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہوں۔"

"ہاں" بڈھا بڑبڑایا۔ "جب چاہتے ہیں راستے دے دیتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں راستہ بند کر دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "جی، میرے سکوٹر کی ہوا نکل گئی ہے۔ پنکچر ہو گیا ہے۔"

"ہاں" وہ بولا "ہم خود میں ہوا بھرتے رہتے ہیں۔ ان کا کرم ہو جائے تو ہوا نکل جاتی ہے۔"

پہلے تو میں اس کی باتوں پر ٹھٹھکا، پھر سوچا کوئی مجذوب ہے جو اناپ شناپ بول رہا ہے۔

کچھ دیر کے لیے وہ چپ رہا، پھر مدھم آواز میں بولا "تو جو نئے بت بنا رہا ہے، کیا تجھے قلم اس لیے دیا تھا کہ بت بنائے؟"

قلم کی بات سن کر میں چونکا۔ اسے کیسے پتہ چلا کہ میں لکھتا ہوں لیکن بت، بت تو قلم سے نہیں بنائے جاتے۔

دفعتاً وہ بڈھا جوش میں آ گیا۔ کہنے لگا "کیا حیثیت ہے پاکستان کی۔ ایک چھوٹا چھٹنکی سا ملک۔ غریب ملک۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔" وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا، پھر آپ ہی چھڑ گیا، اور یہاں کے لوگ۔ چاروں طرف سے میں میں کی آوازیں آتی ہیں۔ بکرے میں میں کر رہے ہیں ——— کھائے جا رہے ہیں، اللہ کی اس دی ہوئی دیگ کو کھائے جا رہے ہیں۔ ساتھ اپنا اپنا کٹورہ بھرے جا رہے ہیں۔ اپنی اپنی کوٹھالی میں دانے ڈالتے جا رہے ہیں۔ ضرورت نہیں۔ طمع، خالص طمع۔ دوسرے چاہے بھوکے مریں، پڑے مریں، میری کوٹھالی بھر جائے۔ کوئی ملک کا نہیں سوچتا۔ کوئی قوم کا نہیں سوچتا۔ کوئی دین کا نہیں سوچتا۔ آخرت کا نہیں سوچتا۔ بس آپا دھاپی پڑی ہے۔ بادشاہ بھی میں میں کر رہا ہے۔ فقیر بھی میں میں کر رہا ہے۔ بلیاں چھیچھڑوں کی رکھوالی پر بیٹھی ہیں۔ اس ملک کو تم بت بنا رہے ہو۔ خوش خبریاں دے رہے ہو۔ یہ ملک تو اس لائق ہے کہ غرق کر دیا جائے۔ سمجھے؟" اس نے مجھے ڈانٹا غصے بھری نگاہ مجھ پر ڈالی، بول کیا کہتا ہے؟ کیا تجھے اس لیے قلم دیا ہے کہ اس ملک کے قصیدے لکھے؟ بول؟ وہ چلایا۔

میں سر نوائے بیٹھا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔

دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا :

"حرص ہی حرص' طمع ہی طمع' اتنے حریص ہو گئے ہیں کہ اپنی غرض کے لیے اللہ کا نام بیچنے لگے ہیں۔ اسلام کو بیچنے لگے ہیں۔ اسلام کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ اللہ سے مخول کر رہے ہیں۔ جھوٹے' فریبی ——————— جب بڑوں کا یہ حال ہے۔ تو چھوٹوں کا کیا ہو گا اور تو کہتا پھرتا ہے کہ اس ملک پر اللہ کی رحمت ہے' جہاں اللہ کا نام ٹکے ٹکے بک رہا ہے۔ اتنی ناقدری۔ توبہ ہے! توبہ ہے! اللہ کی ناقدری' دین کی ناقدری' وہاں رحمت ہو گی کیا؟ بول" وہ پھر غصے میں چلانے لگا' "تجھے یہاں اس لیے نہیں بلایا ہے کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھا رہے۔"

بے حیثیہ

"مجھے بلایا ہے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اور کیا تو خود آیا ہے یہاں؟" وہ بولا

"ہمیں یہاں تیرا انتظار کرنا پڑا۔ ہمیں پتا تھا کہ تو آئے گا اور تو آگیا۔"

"لیکن میرا کیا قصور ہے بابا؟" میں غصے میں آگیا۔

"ہاں تیرا قصور ہے۔" وہ بولا "جن باتوں کو تو نہیں سمجھتا' نہیں جانتا' ان کے بارے میں کیوں بات کرتا ہے؟ کیوں اللہ کی خلقت کو گمراہ کرتا ہے؟"

"میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں' جانتا ہوں۔ میری تو کوئی حیثیت نہیں بابا" میں نے جواب دیا۔

جو تو بے حیثی ے ہے تو بے حیثی ے بن کے رہ۔ بھتی باتاں نہ بگھار' شیخیاں نہ مار' پر تو بھی ان جیسا ہے' وہ اپنی بات بنانے کے لیے' اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے' اسلام کا نام برت رہے ہیں تو بھی اپنی حیثیت بنانے کے لیے پاکستان کی وڈیائی کی باتیں کر رہا ہے۔"

" غلط ہے' بالکل غلط غصے سے میری کنپٹیاں بجنے لگیں" میں تو صرف وہ باتیں لکھ دیتا ہوں جو تمہارے جیسے باباؤں کی زبانی سنتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی طرف سے بات نہیں کی۔ میں نے کبھی بڑھا چڑھا کر بات نہیں کی۔ میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں جانتا ہوں۔ تو بتا کیا سالار والا کے اس بابے نے مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد دو اڑھائی سو لوگوں کے سامنے نہیں کہا تھا کہ

ایک دن آنے والا ہے جب یو این او ہر قدم اٹھانے سے پہلے پاکستان سے پوچھے گی' کیا مجھے قدم اٹھانے کی اجازت ہے اور انہوں نے کہا تھا اگر ایسا نہ ہوا تو تم آ کر میری قبر پر تھوکنا——— بتا کیا اس بابے نے جھوٹ بولا تھا؟ بول بابا۔ چپ کیوں ہو گیا ہے۔"

وہ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہنے لگا "نہیں' وہ بابا جھوٹ نہیں بولتا۔"

"کیا نور پور کے بابے نے اڑھائی سو سال پہلے نہیں کہا تھا کہ یہاں ایک اسلامی شہر آباد ہو گا' جو عالم اسلام کا مرکز بنے گا ؟" بول۔

"کہا تھا"۔ اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"کیا دو صدیوں سے بابے یہ کہتے نہیں آ رہے کہ ایک دن آنے والا ہے جب ساری دنیا میں اسلام کا ڈنکا بجے گا؟"

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"کیا مرڑ کے بابا نے جس کے حضور مجھے بھیجا گیا تھا' پاکستان بننے سے پہلے شاہ دکن کو دعوت نہیں دی تھی کہ آ تجھے شہنشاہ ہند بنا دیں۔ کیا دکن کے سی این سی پنڈی میں آ کر بابا سے نہیں ملے تھے؟ بابا نے نشاۃ ثانیہ کی خبر نہیں سنائی تھی۔ پاکستان کی مرکزی حیثیت کی بات نہیں کی تھی؟ بتا" میں غرّایا۔

"تو نہیں سمجھتا" وہ بولا "بزرگوں کی باتیں برحق ہیں' لیکن تجھ میں سمجھ کی کمی ہے۔ تو ان کی بات کے رخ کو نہیں سمجھتا اور انہیں اس طرح بیان کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ تجھے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دیکھ" وہ توقف سے بولا "پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں' کچھ حیثیت نہیں۔ ایک چھوٹا سا عام سا غریب ملک۔ ساری اہمیت اللہ کے دین کی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے' جب اللہ کے دین سے دنیا منور ہو گی۔ اور اللہ کا بھیجا ہوا وہ بندہ جس کے وجود سے دنیا منور ہو گی' پاکستان میں آئے گا۔ ان کا قیام پاکستان میں ہو گا۔ انشاء اللہ' پاکستان کی عظمت ان کے قیام سے وابستہ ہے۔ بذات خود نہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔

پھر تڑپ کر بولا "دیکھ ضروری نہیں کہ وہ صاحب پاکستانی نژاد ہوں۔ کیا پتا کہ وہ یورپ کے ہوں یا افریقہ کے ہوں یا کہیں کے ہوں' البتہ ان کا قیام پاکستان میں ہو گا اور یہ پاکستان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے' وڈیائی ہے۔ دیکھ وہ بولا "کوئی بابا حتمی بات نہیں کر سکتا۔ کسی کو مجاز نہیں

کہ وہ حتمی بات کرے۔ وہ قادر مطلق ہے' جو چاہے کرے۔ آخری فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولا "آئندہ سے بڑوں کی باتوں پر قلم نہیں اٹھانا سمجھا؟" اس نے مجھے ڈانٹا۔ پھر وقفے کے بعد دھیمی آواز میں بولا "ہم تمہیں دو لفظ دیتے ہیں۔ ان کا ورد کرتے رہنا۔ قریب پڑے چند کاغذات سے اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔

"میں پاک حالت میں نہیں رہ سکتا" میں نے کہا۔

"کچھ پروا نہیں" وہ بولا۔

"میں عربی نہیں پڑھ سکتا" میں نے کہا۔

"اچھا" وہ رک گیا۔ پھر بولا "ٹھیک ہے" اور کچھ لکھنے لگا لکھنے کے بعد اس نے کاغذ کا ٹکڑا ایک پرانے لفافے میں ڈالا اور وہ لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ کہنے لگا "گیارہ مرتبہ صبح اور گیارہ مرتبہ سوتے وقت اس کا ورد کیا کر۔ اب تو جا۔ اللہ تجھے سمجھنے کی توفیق عطا کرے۔"

میں اٹھ بیٹھا۔ باہر میرا سکوٹر سڑک کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے سکوٹر اسٹارٹ کیا وہ چل پڑا۔

کچھ دور جا کر دفعتاً" مجھے یاد آیا کہ میرے سکوٹر کا پہیہ تو پنکچر تھا۔ میں سکوٹر روک کر نیچے اترا۔ پہیے کو دیکھا۔ ہوا ٹھیک ٹھاک تھی' پھر میں نے سٹفنی کو دیکھا وہ بھی ہوا سے بھری ہوئی تھی۔ یہ کیسے ہوا؟ مجھ پر حیرت طاری ہو گئی۔ دیر تک اسی عالم میں چلتا رہا' پھر جو نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ راستہ مانوس تھا۔

شک و شبہ

ساری رات میں سوچتا رہا۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ اگلی شام کو میں پھر سکوٹر لے کر چل پڑا تاکہ اس سڑک کا پتا لگاؤں جس پر میں غلطی سے مڑ گیا تھا۔

کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد وہ سڑک مل گئی۔ میں اس پر چل پڑا۔ بڑ کے درخت کو دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی' لیکن بڑ کے آس پاس جھونپڑا دکھائی نہ دیا۔ بڑ کے نیچے ایک آدمی نماز پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ جب وہ فارغ ہوا' تو میں نے پوچھا "یہاں ایک جھونپڑا تھا۔"

"جھونپڑا؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "نہیں تو" وہ بولا "یہاں کوئی جھونپڑا نہیں۔"

"تو ادھر کب آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بابو" میں رکھ میں کام کرتا ہوں۔ روزانہ ادھر سے گزرتا ہوں۔ دوبار۔ میں نے کبھی جھونپڑا نہیں دیکھا۔"

"میں کل آیا تھا" میں نے کہا "بڑی دیر اس جھونپڑے میں بیٹھا رہا تھا"۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے میں پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا تھا۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب میں نے پاکستان پر مضمون لکھا تھا۔ اسے شائع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔

میں ایک منہ زبانی مسلمان ہوں۔ میری زندگی عمل سے یکسر خالی ہے۔ میری زندگی میں چار ایک ایسے واقعات ہوئے ہیں جنہیں بیت کر مجھے پتا چلا کہ ہماری دنیاوی زندگی کے متوازی ایک روحانی نظام بھی چل رہا ہے۔

لیکن بنیادی طور پر میں ایک ادیب ہوں' دانشور ہوں۔ میرا باطن شکوک و شبہات سے اٹا پڑا ہے۔ ایسے واقعے سے میں چند ایک روز متاثر ہوتا ہوں' پھر منکر ہو جاتا ہوں۔

چند ایک روز میں سوچتا رہا' پھر شکوک و شبہات نے گھیر لیا۔ سوچا' شاید میں نے خواب دیکھا ہو یا شاید وہ جھونپڑا اور وہ بوڑھا میرے ذہن کی اختراع ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سڑک پر آنے جانے والوں نے وہ جھونپڑا نہ دیکھا ہو۔ ضرور یہ میرے ذہن کی اختراع ہو گی۔ یوں میں نے خود کو مطمئن اور محفوظ کر لیا۔

پھر دو ایک ماہ کے بعد میں نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک مڑا تڑا لفافہ برآمد ہوا۔ اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا' اوپر بسم اللہ لکھی ہوئی تھی۔ نیچے لکھا تھا: گیارہ بار صبح جاگتے وقت اور گیارہ بار رات سوتے وقت ورد کرو۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔

جب میرے مضامین کا مجموعہ رام دین شائع ہوا تو میں نے اپنے مضمون پاکستان میں یہ واقعہ بھی شامل کر دیا۔

کنویں کا مینڈک

قدرت اللہ مری سے واپس آیا تو میں کوئٹے جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔

آپ کوئٹے کس سلسلے میں جا رہے ہیں' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' جناب وہاں ایک ادبی محفل ہو رہی ہے انہوں نے بلایا ہے۔ پی آئی اے کا ٹکٹ بھیجا ہے۔

کہنے لگا' وہاں کوئی مضمون پڑھیں گے آپ۔

میں نے جواب دیا' مضمون لکھنے سے توبہ کر لی ہے۔

وہ کیوں' اس نے پوچھا۔

بڑی ڈانٹ پڑی ہے شہاب صاحب۔ کہتے ہیں جو تو نہیں جانتا' بے حیثیت ہے تو بے حیثیت بن کر رہ۔

میں نے شہاب کو کٹیا والے بابا کا سارا واقعہ سنا دیا۔

وہ بڑے غور سے سنتا رہا۔ تفصیلات پوچھتا رہا' لیکن مجھے ایسا لگتا تھا۔ جیسے اس کی حیرت مصنوعی تھی۔

میں نے کہا شہاب جی ساری غلطی میری ہے۔ میں کنوئیں کا مینڈک تھا۔ ایک دن کنویں میں سمندر کا مینڈک آ گیا۔ کنویں کے مینڈک نے پوچھا' تو کہاں سے آیا ہے۔

وہ بولا' میں سمندر سے آیا ہوں۔ سمندر بہت بڑا ہوتا ہے۔

کنویں کے مینڈک نے اپنے اندر ہوا بھری۔ پھولا کر بولا' کیا سمندر اتنا بڑا ہوتا ہے۔ سمندر کے مینڈک نے کہا' نہیں اس سے بہت بڑا۔ کنویں کے مینڈک نے اور ہوا بھری اور پھولا۔ پوچھا' کیا اتنا بڑا؟

شہاب صاحب کنویں کا مینڈک اپنے اندر ہوا بھر بھر کر بالآخر پھٹ گیا۔

میں نے توبہ کر لی ہے۔ شہاب صاحب۔ اس دنیا کے اصول نرالے ہیں۔ جو جانتا ہے۔ وہ بتاتا نہیں جو نہیں جانتا اسے کہنے کا حق نہیں۔

شہاب گھبرا گیا' بولا آپ سمجھے نہیں۔

میں نے کہا شہاب صاحب اتنے سال ہو گئے ہیں۔ میں کبھی سمجھا بھی تھا کیا۔

کنویں کا مینڈک اپنے کنویں میں بڑا خوش تھا۔ سمندر کے مینڈک نے آ کر سب تہس نہس کر دیا۔

ثاقبہ

کوئٹہ پہنچے تو وہاں قلم قبیلہ نے ادیبوں اور شاعروں کا ایک میلہ لگا رکھا تھا۔ اس میلے کی خصوصیت یہ تھی کہ بھیڑ تو تھی لیکن کھوے سے کھوا نہیں چھلتا تھا۔ میلہ ہو اور ساتھ نظم ہو یہ بات میرے لیے نئی تھی۔

ادیبوں کو مختلف ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا تھا اور میزبانوں کا ایک قافلہ ہر وقت گردش میں رہتا۔ پوچھتا' آپ کا قیام مناسب ہے۔ کوئی تکلیف تو نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو

میزبانوں کی قافلہ سالار بات کرتی تو منہ سے پھول جھڑتے۔ مہمان دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا۔ کان کھولے رکھتا کہ رس گھلتا رہے۔

سچی بات یہ ہے کہ مجھے ادبی محفل سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ میں تو کوئٹہ اس لیے گیا تھا کہ محشر سے ملوں گا۔ اس سے چھیڑ خانی رہے گی' کہوں گا عالی جاہ مجھے کسی عوامی شہر کی بادشاہت بخشیے اسلام آباد میں اپنی دال نہیں گلتی۔ وہاں تو صاحب رہتے ہیں' جو حکم چلانا جانتے ہیں' حکم ماننا نہیں۔

پہلی فرصت ملی تو میں پوچھتا پوچھتا محشر کے گھر پہنچا۔

میں نے چھوٹتے ہی کہا محشر صاحب میں تو مارا گیا۔ آپ کے شہر میں آ کر لٹ گیا۔

وہ جہانگیر بن کر بیٹھ گیا' بولا' فریادی۔ بولو کس نے لوٹا۔

میں نے کہا' ظل الٰہی ایک خاتون نے لوٹا۔

بولا کون ہے وہ محترمہ۔

میں نے کہا' عالی جاہ وہ ہمارے میزبانوں کی قافلہ سالار ہے۔

بولا' فریادی کیا حسن کے زور پر لوٹا۔

میں نے کہا' جناب والا ظاہری حسن نے بھی' لیکن اندر کے حسن نے تو تباہی مچا دی۔ کہتے

ہیں وہ کوئٹے کے گورنر کی بیگم ہے' لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ گورنر تو حکم چلانے پر مامور ہوتے ہیں۔ خدمت کرنے پر نہیں۔

وہ کہنے لگا' اس معاملے میں مابدولت کچھ نہیں کر سکتے۔ اس شہر کا بچہ بچہ اس محترمہ کے عشق میں سرشار ہے۔ اور علاقے کے بڑے بوڑھے محترمہ کے میاں کے گن گاتے ہیں۔

پہلے کچھ لوگ پہاڑوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ جب سے یہ آئے ہیں۔ لوگوں نے پہاڑوں سے اترنا شروع کر دیا ہے۔ دونوں ہی سم قاتل ہیں' کیا میاں' کیا بیگم۔ میاں نے خانوں کو رام کرنا اپنا رکھا ہے۔ بیگم نے جگہ جگہ' شہر شہر بچوں کی اکاڈمیاں چلا رکھی ہیں۔ اور یہاں اتنی بڑی ادبی تنظیم قلم قبیلہ چلا رکھی ہے۔

مفتی صاحب آپ تو نرے اندھا دھند ہیں۔ بھائی میرے مقام دیکھ کر عشق لگایا کریں۔

محشر بھی کیا رند بزرگ تھا۔ جب وہ اسلام آباد آیا تھا تو اس نے مجھے ڈانٹ لگائی۔ کہنے لگا' تو اپنے محسن کا بھید لگانے میں یوں لگا ہے جیسے وہ مجرم ہو' نہ بھائی بھید نہ اگایا کر۔

تو کیا کروں' میں نے پوچھا۔

ہم ایک وظیفہ دیتے ہیں تجھے۔ دن میں کسی وقت۔ ایک کونے میں بیٹھ کر اپنے مرشد کو سامنے بٹھالیا کر۔ تصور کے زور پر' پھر ایک سو ایک مرتبہ یہ آیت پڑھا کر۔

کون سی آیت' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا یہ آیت۔

یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر

میری ہنسی نکل گئی۔

بولا۔ ہنسو نہیں میں بے حد سنجیدہ ہوں۔

اس روز کوئٹے میں بھی اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا دیکھ مفتی۔ اگر تو کسی محترمہ پر عاشق ہو جائے تو روز دوبار اس آیت کی ایک تسبیح کیا کر۔

ہوش اڑا دیتا ہے اک خاک کے پتلوں کا جمال
خود وہ کیا ہو گا انہیں ہوش میں لانے والا

سکھر کے قاضی صاحب

کہنے لگا' ہم بھی آجکل قاضی سے یارانہ لگائے بیٹھے ہیں۔

کون قاضی' میں نے پوچھا۔

بولا' سکھر کا قاضی۔ تم نہیں جانتے سکھر کے قاضی کو۔

میں نے سر نفی میں ہلا دیا۔

کہنے لگا' اسے تو سارا پاکستان جانتا ہے۔ سیف الزبان ہے۔

جو کہتا ہے حکم بن جاتا ہے۔ قاضی خاندان سے ہے۔ بڑا خاندان ہے۔ پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی۔ کہتے ہیں شاہ باز قلندر کو سلام کرنے گیا تھا۔

انہوں نے کھلے میں بٹھا دیا۔ بارش دھوپ سردی سب جر گیا۔ پھر جب دھوم مچ گئی تو لوگوں نے ایک مکان میں جا بٹھایا۔

اب ایک ہجوم لگا رہتا ہے۔ ہم بھی باقاعدہ حاضری دیتے ہیں۔ ہم پر خاص نظر عنایت ہے۔ رات کو جب آخری گاڑی کوئٹے کو آتی ہے تو ہم اجازت کی درخواست کرتے ہیں۔ جواب میں وہ فرماتے ہیں بیٹھے رہو۔ دو دو گھنٹے بٹھائے رکھتے ہیں۔ گاڑی سٹیشن پر کھڑی رہتی ہے۔

آپ کا انتظار کرتی ہے کیا۔

نہیں' اس نے کہا' ہمیں کون جانتا ہے۔

تو پھر' میں نے پوچھا۔

بس انجن کی کوئی کل بگڑ جاتی ہے۔

مفتی چل تجھے قاضی سے ملائیں' محشر نے کہا۔

میں نے کہا' کبھی پھر سہی۔ اس وقت مناسب نہیں۔

بولا' پکی بات۔

پکی بات' میں نے محشر کے منہ پر جھوٹ بولا۔

مجذوب کا نام سن کر میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔

پرانی بات ہے شاید ۱۹۶۰ء کی۔

راجہ شفیع لال بادشاہ کا بڑا شیدائی تھا۔

لال بادشاہ مری کا ایک مجذوب تھا۔ سارے علاقے میں اس کی دھوم تھی۔
وہ کھلے میں بیٹھتا تھا۔ اس کے گرد سائلوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔
اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی تھی۔
جس سائل پر وہ چھڑی چلاتا۔ وہ سائل خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ سمجھتا کہ بس اب کام ہو گیا۔ کامیابی ہی کامیابی سارے علاقے میں مشہور تھا کہ جس خوش نصیب پر لال شاہ کی چھڑی چل گئی اس کی جملہ مشکلات آسان ہو گئیں۔

لال بادشاہ

پتہ نہیں کیسے راجہ نے عفت کو رضا مند کر لیا کہ لال شاہ کی خدمت میں حاضری دیں۔ عفت نے شہاب کو منا لیا۔ شہاب نے پوچھا کہ لال شاہ مجذوب ہیں یا سالک۔ راجہ نے کہا' پہلے وہ مجذوب تھے۔ اب تو سالک ہیں' سائلوں سے ملتے ہیں۔ ان کے دکھ درد سنتے ہیں۔ پوچھ گچھ کرتے ہیں۔

ہم نے لال شاہ کے ڈیرے پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ مری سے آگے' پتہ نہیں کون سی سڑک پر۔ راجہ بولا' بس یہاں گاڑی روک لیجیے اور کسی مناسب جگہ پر پارک کر دیجیے۔
ہم سڑک سے نیچے اتر گئے۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک کھلا میدان نظر آیا۔ اس کے پرلے سرے پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔
ایک جانب لال شاہ بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے سائل باقاعدہ قطاروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سائل باری باری شاہ صاحب کے پاس جا کر بیٹھ جاتے۔ اپنی مشکل بیان کرتے۔ ہم سب پچھلی قطار میں بیٹھ گئے۔

پھر جو میں نے غور سے لال شاہ کی طرف دیکھا تو خوف زدہ ہو گیا۔ ان کے چہرے پر نورانیت کی بجائے تلخی تھی' تشدد بھری تلخی۔ اس تلخی نے چہرہ مسخ کر رکھا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور ایک آنکھ میں پھولا تھا۔

پھر جو میں نے قدرت کی طرف دیکھا تو اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ ایک لمبے تڑنگے سائل کے پیچھے دبک کر چھپا بیٹھا تھا۔ منہ رومال سے

ڈھانپ رکھا تھا۔

کیوں خیریت' میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ پھر سر سے اشارہ کیا کہ میں جا رہا ہوں۔ آپ کچھ دیر کے بعد آجائیں۔

راجہ نے شہاب کو جاتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گیا۔ اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔

کچھ دیر کے بعد جب میں پہاڑ کی اوٹ میں پہنچا تو دیکھا کہ قدرت ایک پتھر پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس پر وہی کیفیت طاری تھی۔ سانس اکھڑا ہوا۔ رنگ زرد تھا' ارے یہ آپ کو کیا ہوا۔

کہنے لگا' انہوں نے ہمیں دیکھا تو نہیں۔

پتہ نہیں' میں نے کہا' لیکن آپ خوف زدہ کیوں ہیں۔

بولا' اسے تو اپنا ہوش نہیں۔

اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔

یہ مجذوب لوگ بہت طاقت ور ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں سدھ بدھ نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں ان جانے میں کیا کر دیں۔

کبھی کسی طاقت ور مجذوب کے پاس نہیں جانا چاہیے۔

مجذوبیت

میں خود مجذوبیت سے بہت خائف تھا۔

بھائی جان نے ایک مرتبہ غصے بھری نگاہ اپنے چھوٹے بیٹے پر ڈالی تھی۔ وہ چار دن شہر میں مجذوبیت کی حالت میں گھومتا پھرا تھا۔

مجھے شعور تھا کہ مجھ میں مجذوبیت کا عنصر موجود ہے۔ اس لیے میں خائف رہتا کہ سائیں اللہ بخش یا بھائی جان کی ایسی نظر نہ پڑ جائے کہ میں کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جاؤں۔

پھر مجھے ڈاک کے ذریعے ایک خط ملا۔ لکھا تھا۔ شکر ہے مجذوبیت کا خطرہ ٹل گیا۔ خط میں نہ لکھنے والے کا نام پتہ درج تھا' نہ شہر کا نام۔ لفافے پر جو مہر لگی ہوئی تھی وہ پڑھی نہیں جاتی

تھی۔

میں نے وہ خط قدرت کو دکھایا۔ میں نے کہا' پتہ نہیں چلتا کہ یہ خط کس نے لکھا ہے۔

اس نے کہا' چاہے کسی نے بھی لکھا ہے بہرحال خوش خبری دی گئی ہے۔

میں نے کہا' شہاب صاحب ۵۸-۱۹۵۷ء میں دو سال مجھے ایک خواب آتا رہا۔ بار بار آتا رہا۔ شہاب صاحب میں نفسیات میں دلچسپی رکھتا ہوں' اس لیے اپنے خواب لکھ لیا کرتا ہوں۔

۱۹۵۵ء سے آج تک جتنے بھی بامعنی خواب آئے ہیں وہ میں نے اپنی ڈائریوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ خواب مجھے بار بار آتا رہا۔ کبھی کوئی تفصیل نہیں بدلی۔

کیا خواب تھا۔ اس نے پوچھا۔

دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک تخت بچھا ہوا ہے۔ اس تخت پر نورانی شکل کے ایک بزرگ بیٹھے ہیں۔ قریب جانے کی خواہش ہے۔ میں آگے بڑھتا ہوں تو دفعتاً" ایک کالا سیاہ سوکھا سڑا مجذوب درمیان میں آکر لیٹ جاتا ہے اور میرا راستہ روک لیتا ہے۔

عجیب خواب ہے' وہ بولا۔

اسے دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اور میں جاگ اٹھتا ہوں۔

قدرت اللہ نے اس خواب پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔

پھر ایک روز چار یاری نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ کہنے لگے سکھر کے مجذوب بزرگ قاضی صاحب وفات پا گئے ہیں۔ محشر نے ہم کو سکھر بلایا ہے۔ تمہیں ساتھ لانے کی تاکید کی ہے۔

میں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ چاروں سکھر چلے گئے۔

شکر پڑیاں کا مست

ایک سال کے بعد محشر نے ہمیں پھر عرس پر سکھر بلایا۔

محشر نے مجھے دو خط لکھے جس میں انہوں نے دھونس دی تھی کہ اگر اب کی بار نہ آئے تو ہم ایسی جوابی کارروائی کریں گے کہ زندگی بھر کف افسوس ملو گے۔

ہم پانچوں۔ مسعود' عمر' عماد' اعظمی اور میں سکھر جا پہنچے۔

قاضی صاحب کے مزار سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے کے فرش پر دو روز یوں پڑے

رہے' جیسے مچھلیاں ڈبے میں بند پڑی ہوتی ہیں۔

یہ دو دن بڑی رونق میں گزرے۔ محشر کی رندانہ باتیں' مسعود کے چٹکلے' اعظمی کی حاضر جوابیاں' عمر کی چڑچڑ اور میری اناپ شناپ نے رنگ لگا دیا۔

عرس کی تقریب ختم ہوئی تو محشر نے کہا' چلو اب قاضی کے مزار پر فاتحہ اور دعائے خیر پڑھ لیں۔

جب میں فاتحہ پڑھ رہا تھا تو محشر میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس نے میری گردن پکڑی اور سر نوا دیا۔ اس حد تک کہ میرا سر قاضی صاحب کے مرقد پر جا ٹکا۔

میں نے اٹھنے کی بہت کوشش کی' لیکن محشر کی گرفت مضبوط تر ہوتی گئی۔

پانچ منٹ میں اسی حالت میں پڑا رہا۔

پھر جب ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو محشر صاحب کھڑے ہو گئے۔ خاموش' وہ بولے' ہم ایک اعلان کرنے لگے ہیں' اٹینشن۔ دوستو ہم نے تو مفتی کو اسلام آباد کی بادشاہت بخشی تھی۔ آج قاضی صاحب نے اسے شکر پڑیاں کا بابا بنانے کا حکم جاری کر دیا ہے۔

انشاء اللہ چند ایک ہفتے کے اندر مفتی کپڑے پھاڑ کر شکر پڑیاں کی کسی پہاڑی پر جا بیٹھے گا اور اس کے اردگرد سائیلوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔

سکھر سے پنڈی تک ریل گاڑی میں اسی موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ یاروں نے میرا پھلکا اڑا دیا۔

عمر کہتا' یار یہ مفتی بڑا خوش قسمت ہے جہاں جاتا ہے۔ اسے کوئی نہ کوئی عطا ہو جاتی ہے۔

مسعود کہتا' مفتی پر ظلم ہو گا۔ آرام طلب آدمی ہے۔ ننگ دھڑنگ ہو کر شکر پڑیاں پر بیٹھنا پڑا تو کلفی جم جائے گی۔

اعظمی کہتا' یار جب ہم سائل بن کر آئیں گے تو ہمارا خیال رکھنا۔

مسعود کہتا' یہ مست لوگ جو ہوتے ہیں۔ یہ کیا کر سکتے ہیں۔ انہیں تو خود کی سدھ بدھ نہیں ہوتی۔

عماد کہتا' یہ مست لوگ جو ہوتے ہیں جب چاہتے ہیں سدھ بدھ تیاگ دیتے ہیں جب چاہتے ہیں۔ اوڑھ لیتے ہیں۔

گھر پہنچ کر میں نے بڑی کوشش کی کہ یہ بات بھول جاؤں۔

سوچتا محشر نے مذاق کیا ہے' اگرچہ محشر کا قاضی صاحب سے میل ملاپ ضرور ہے' لیکن محشران کا بالکا نہیں ہے۔ اس لیے محشر کے اس اعلان کو اہمیت دینا سراسر حماقت ہے۔

سبز سویرا

پھر اتفاق سے کوئٹہ کا ایک مشہور ہفت روزہ پرچہ سبز سویرا ہاتھ لگ گیا۔ یہ ایک خصوصی اشاعت تھی جس میں تمام تر مضامین قاضی صاحب سے متعلق تھے۔

پرچہ پڑھ کر مجھ پر از سر نو گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

کوئٹہ کے مشہور صحافی محمد یوسف شریف نے برملا لفظوں میں قاضی صاحب اور محشر کے باہمی تعلق کا وضاحت سے یوں اظہار کیا تھا۔

بابا قاضی صاحب قبلہ کی خدمت میں کوئٹہ میں ان کے عقیدت مندوں کو بازیابی کا شرف محشر صاحب قبلہ کے توسط سے حاصل ہوا تھا۔ گویا محشر صاحب قبلہ کوئٹہ میں ان کے نامزد کردہ نمائندے تھے۔ محشر صاحب اس وقت بھی صاحب حال تھے۔

جنہیں وہ مناسب سمجھتے تھے۔ بابا صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتے اور ان کے لیے دعا کی درخواست کرتے۔

بابا قاضی صاحب قبلہ کی خدمت میں پہنچنے کی روئیداد ہفتہ وار اخبار ہذا کے محشر نمبر کے لئے انہوں نے اپنے مضمون میں تفصیل سے لکھ دی ہے۔ اس لیے اس کا اعادہ مناسب نہیں' قاضی صاحب نے مجھے اپنے حلقہ میں شامل کر لیا تھا اور اس کی اطلاع محشر صاحب کے ذریعے ہوئی۔ غالباً" ۱۹۵۲ء کے ماہ نومبر میں مجھے محشر صاحب کے ساتھ قبلہ بابا صاحب کی خدمت میں پہلی دفعہ حاضر ہونے کا موقع ملا' اس کے بعد مسلسل محشر صاحب قبلہ کے ساتھ اور کبھی محشر صاحب کی اجازت سے بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور اپنی ذاتی---------- پریشانیوں اور مصائب سے چھٹکارے کے لیے ان کی دعاؤں سے فیضیاب ہوتے رہے۔

مجذوب کی دین

یہ مضمون پڑھ کر میں خوف زدہ ہو گیا۔ سیدھا قدرت کی طرف بھاگا۔ اسے میں نے سارا قصہ سنایا۔

میری بات سن کر وہ گھبرا گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا' پھر کہنے لگا' آپ کے پاس قاضی صاحب کی کوئی تصویر ہے۔

میں نے کہا' تصویر تو نہیں۔ البتہ سبز سویرا میں ان کا سکیچ چھپا ہوا ہے۔

وہ لے آیئے' وہ بولا۔

میں پرچہ لے کر گیا تو وہ غور سے تصویر دیکھتا رہا' پھر کہنے لگا' یہ تو بہت طاقت ور مجذوب ہیں۔ بہت طاقتور۔ یہ پرچہ یہیں رہنے دیں۔ اس پر مجھے اطمینان ہو گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد جب قدرت اور میں لاہور اشفاق کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے تو مجھے پتہ چلا کہ محشر لاہور آیا ہوا ہے۔ اور سعادت کے گھر ٹھہرا ہوا ہے۔

سعادت کے گھر کا پتہ لگا کر شہاب اور میں محشر کو ملنے گئے۔

محشر کو دیکھ کر میں حیرت زدہ ہو گیا۔ یہ وہ محشر نہیں تھا جس سے میں واقف تھا۔

ایک نحیف و نزار آدمی خالی آنکھوں سے فضا کو گھور رہا تھا۔

شہاب کو دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لڑکھڑایا۔

دو آدمیوں نے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔

محشر سے رخصت ہونے کے بعد جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو میں نے شہاب سے کہا' یہ وہ محشر نہیں تھا جسے میں آپ سے ملوانا چاہتا تھا۔

شہاب نے اثبات میں سر ہلایا۔ بولا' لگتا ہے جیسے رخصت ہوتے وقت قاضی صاحب نے اپنی گٹھری ان کے سر پر دھر دی ہے۔ یہ اتنا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے۔

کچھ دیر کے بعد خبر آئی کہ محشر کو فالج ہو گیا ہے۔

دو سال وہ چارپائی پر بے حس و حرکت کسمپرسی کے عالم میں پڑا رہا۔ پھر فوت ہو گیا۔

چھپن واں باب

ہومیوپیتھی

سیانے کہتے ہیں یہ کائنات ایک گائیڈڈ میزائل ہے۔ لگتا ہے جیسے کچھ شخصیتیں بھی گائیڈڈ میزائل ہوں، جو چلتے چلتے بے وجہ رخ بدل لیتی ہیں یا رنگت بدل لیتی ہیں یا چال بدل لیتی ہیں۔ ڈلکی سے سرپٹ ہو جاتی ہیں یا سرپٹ بے پویا۔

میرا دوست مسعود قریشی ہے۔ وہ بارہ سنگا تھا۔ سینگ چلاتا تھا۔ بے وجہ اس کے سینگ جھڑ گئے اور وہ کبوتر کی طرح غرغٹ غوں۔ غرغٹ غوں کرنے لگا۔

اشفاق حسین

پھر اشفاق حسین ہے وہ جوانی میں سرپٹ تھا۔ ایڈونچرر تھا۔ جرات سے بھرپور تھا۔ زندگی اس کے لیے مسلسل کارناموں کا مجموعہ تھی، پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ اس کا رخ جوں کا توں قائم رہا۔ رنگ ویسے کا ویسا شوخ وشنگ رہا، لیکن بے وجہ دفعتاً" بیٹھے بٹھائے اسے سرپٹ سے پیدل کر دیا گیا۔

میری اپنی زندگی کے کوائف بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ اگر ان دنوں کوئی کہتا کہ تم ایسے ہو جاؤ گے جیسا کہ میں آج ہوں تو میں تمسخر بھرا قہقہہ لگاتا۔

آخری ایّام

۵۶۔ ہومیوپیتھی
۵۷۔ چھوٹا اور بڑی
۵۸۔ وفات
۵۹۔ لکھوں، نہ لکھوں



سید سرفراز شاہ



ڈاکٹر مسعود قریشی (ہومیو)



صغیرہ شیرلی



ڈاکٹر ابدال بیلا



ڈاکٹر اشفاق حسین (ہومیو)



ڈاکٹر نقش مفتی



ڈاکٹر جہانگیر سپیشلسٹ امراضِ چشم



ڈاکٹر نثار احمد سرجن سپیشلسٹ یورالوجی

جب میری ماں نے مجھے بلی ماراں کے حاجی رفیع الدین کی خدمت میں بیعت کے لیے بھیجا تھا۔ اور میں نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا' تو حاجی صاحب نے فرمایا تھا' جاؤ والدہ صاحبہ سے کہہ دو کہ جس بات سے وہ خوف زدہ ہیں وہ ہو کر رہے گی' دھول اڑے گی' تذلیل ہو گی۔ پھر جب دھول چھٹ جائے گی تو انہیں بڑے اچھے لوگ ملیں گے۔ رخ بدل جائے گا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس وقت میں نے تمسخر بھرا قہقہہ لگایا تھا۔ ہونہہ۔ اچھے لوگ' رخ۔

تقسیم سے بہت پہلے جب میں بی اے کا طالب علم تھا اور ہم لاہور میں شپ شیپ فلیٹ میں رہا کرتے تھے تو میں ایک ہومیو پیتھ سے متعارف ہوا تھا۔

ڈاکٹر ہومیو مسعود

جس گلی میں میں گوریوں سے ملنے جایا کرتا تھا' وہاں ایک دوکان میں ایک صاحب بیٹھے ہوتے تھے۔ میز پر چند ایک کتابیں پڑی ہوتیں۔ الماری میں چند ایک شیشیاں اور کرسی کے پاس ایک بیگ۔

ان کی شخصیت میں دو باتیں بڑی نمایاں تھیں' انکساری' عجز اور خدمت۔

ایک روز میں نے مجید ملک سے پوچھا' جو اسی گلی میں رہتے تھے کہ یہ کون صاحب ہیں اور کیا بیچتے ہیں۔

مجید ملک بولا' یہ ڈاکٹر مسعود ہیں۔

میں نے کہا' ڈاکٹر دکھتے تو نہیں۔ ڈاکٹر تو مونچھ مروڑ کر بیٹھتے ہیں۔ یہ تو درویش نظر آتے ہیں۔

کہنے لگا' یہ ہومیو ڈاکٹر ہیں۔

وہ کیا ہوتا ہے۔ ہومیو' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا' ہومیو پیتھی ایک طریقہ علاج ہے۔ مجھے خود تو علم نہیں کہتے ہیں کہ ہومیو پیتھی درویشانہ طریق علاج ہے۔

پھر تو ڈاکٹر مسعود بڑا موزوں معالج ہے' میں نے سوچا۔

ان دنوں میں نے ڈاکٹر مسعود کو پہلی مرتبہ دیکھا' غالباً" وہ پہلے ہومیو پیتھ تھے۔ جنہوں نے

یہ طریق علاج لاہور میں رائج کیا تھا۔

چار ایک سال بعد میرے والد نے ایمپریس پارک میں مکان تعمیر کرایا۔ ایمپریس پارک محمد نگر سے ملحق تھا۔ شاہو کی گڑھی جانے کے لیے ہم محمد نگر سے اس سڑک پر پہنچتے تھے جسے آج کل علامہ اقبال روڈ کہتے ہیں۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ علامہ اقبال روڈ کی ایک دوکان پر ڈاکٹر مسعود بیٹھے ہیں۔ ظاہر تھا کہ انہوں نے گلی چھوڑ کر سڑک پر اپنا مطب بنالیا تھا۔

ایک روز جب وہ فارغ بیٹھے تھے تو میں ان کے پاس جا بیٹھا۔

میں نے کہا' ڈاکٹر صاحب یہ ہومیو پیتھی کیسا طریق علاج ہے۔

کہنے لگے' یہ ایک غریبانہ طریق علاج ہے۔ جو ہمارے ملک میں اور ہمارے مزاج کے لیے بہت موزوں ہے۔

میں نے کہا' جب آپ گوالمنڈی کی ایک گلی میں پریکٹس کرتے تھے تو میں نے مجید ملک سے پوچھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ درویشانہ طریق علاج ہے۔

ہاں' وہ بولے' یہ سچ ہے اس طریق علاج کا موجد ایک درویش تھا۔ اس طریق علاج کے اصول ایسے ہیں جو صرف ایک درویش کو سوجھ سکتے تھے۔

میں نے کہا' آپ میں جو اتنی انکساری ہے' عجز ہے یہ کیا اس طریق علاج کی دین ہے۔

وہ ہنسے کہنے لگے' کوئی بھی طریق علاج ہو۔ معالج میں عجز و انکساری نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔

بات نہیں بنتی کا مطلب' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے' معالج شفا بخشتا ہے۔ اگر اس میں عجز و انکساری نہ ہو تو وہ خدا بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود سے دو ایک ملاقاتیں ہوئیں اس کے باوجود مجھ میں ہومیو پیتھی کو جاننے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ اگر اس روز کوئی شخص مجھ سے کہتا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب تو ہومیو پیتھی کا بہت بڑا پرچارک ہو گا تو میں قہقہہ مار کر ہنس دیتا۔

چند ایک سال بعد وہ دن آیا جب گورے ڈاکٹروں نے مجھے برملا کہہ دیا تھا کہ تمہاری بیوی کا اندر گل گیا ہے اور وہ چند روز کی مہمان ہے اور میں اتفاقاً" لودھیانے کے ڈاکٹر محمود کے پاس چلا گیا اور محمود کی ایک پڑیا نے میری بیوی کو صحت عطا کر دی تھی۔ اس وقت مجھے علم نہ تھا کہ محمود

ہومیو ڈاکٹر ہے۔ اور یہ اعجاز ہومیو پیتھی کا ہے۔

اُلٹی چرخی

ایسے ہی تقسیم کے بعد اشفاق حسین ہومیو ڈاکٹر محمود کے سامنے سائل کی حیثیت سے استادہ تھا۔ یہ لاہور کی بات ہے۔

بیٹھ جاؤ' محمود نے اشفاق حسین کو حکم دیا تھا اور اشفاق حسین بیٹھ گیا تھا۔

وہ آٹھ دن محمود کے مطب کی بنچ پر بیٹھا رہا تھا۔

روز محمود مریضوں کو دیکھتا' انہیں دوائیاں دیتا اور جب مطب کے بند ہونے کا وقت ہوتا تو وہ اشفاق حسین سے کہتا' اب تم جاؤ۔ کل آنا۔

آٹھ دن اشفاق حسین محمود کی حاضری دیتا رہا۔

اشفاق حسین ایسے سلوک کا عادی نہیں تھا۔ لیکن وہاں بیٹھنے پر مجبور تھا۔

اس کی سرپٹ چال چھین لی گئی تھی۔ اسے پیدل کر دیا گیا تھا۔ اس کی طبعی جرأت مفقود ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ اندیشوں اور خوف نے اس کی شخصیت کو جکڑ لیا تھا۔ اشفاق حسین میرا لنگوٹیہ یار ہے۔

ایلو پیتھی نے اشفاق حسین کو جواب دے دیا تھا۔ ان کے پاس اشفاق حسین کے لیے کوئی دوا نہ تھی۔

اشفاق حسین ایلو پیتھی کا دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے گھر میں ایک ڈسپنسری بنا رکھی تھی۔

اشفاق حسین نے اس تبدیلی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ نہیں میں جیوں گا۔ ایکسلیٹر پر پاؤں رکھ کر جیوں گا۔ بریک کی ایسی کی تیسی۔ اسی امید پر وہ محمود کے مطب میں آٹھ روز بیٹھا رہا تھا۔

نوویں دن جب محمود مطب بند کرنے لگا تو اس نے اشفاق حسین کو پاس بلایا' پھر سامنے پڑی ہوئی شیشیوں سے ایک شیشی نکالی۔ ایک خوراک بنائی۔ بولا' منہ کھول۔ اشفاق نے منہ کھولا۔ محمود نے دوا اس کے منہ میں ڈال دی۔ بولا۔ جا بیٹھ جا' آدھ گھنٹہ اسی بنچ پر بیٹھا رہ۔ جو جو کچھ تو محسوس کرے مجھے بتاتا جا سمجھے۔ میں تجھے انڈر آبزرویشن رکھوں گا۔

آدھ گھنٹہ اشفاق حسین وہاں بیٹھا رہا۔

آدھ گھنٹہ محمود اس پر نگاہیں جمائے بیٹھا رہا۔

کیا ہوا؟ محمود نے آدھے گھنٹے کے بعد پوچھا۔

اشفاق حسین نے سر نفی میں ہلا دیا بولا' کچھ بھی نہیں ہوا۔

کچھ بھی نہیں ہوا؟ محمود حیرت سے غصے میں گر جا۔ جاؤ چلے جاؤ۔ گٹ آؤٹ۔ تمہارے اندر کوئی الٹی چرخی لگی ہوئی ہے' جو دوا کو کام کرنے نہیں دیتی۔ دوا کو بے اثر کر دیتی ہے' جاؤ پھر یہاں مت آنا۔ ہمارا وقت ضائع نہ کرنا۔

اشفاق حسین' محمود اور ہومیو پیتھی کو گالیاں دیتا ہوا گھر آ گیا۔

اس وقت اسے علم نہ تھا کہ ایک روز وہ اپنے ہومیو مطب میں بیٹھا ہو گا۔ اور اس کے گرد مریضوں کی بھیڑ لگی ہو گی۔ اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ لوگوں میں شفا بانٹے گا' لیکن خود شفا سے محروم رہے گا۔ اور اس کے اندر لگی ہوئی چرخی جوں کی توں الٹی چلتی رہے گی جو دوا کو اندر جانے نہیں دے گی۔

ہومیو پیتھی سے مایوس ہو کر اشفاق حسین واپس ایلو پیتھی میں چلا گیا۔ ایلو پیتھی کے متعلق اس کا علم اور تجربہ وسیع تھا' جوانی میں ہی اس نے ایمن آباد والے گھر میں ایک ایمرجنسی ڈسپنسری کھول رکھی تھی۔ گاؤں میں کسی کو تکلیف ہوتی تو وہ اشفاق حسین کی ڈسپنسری میں آ جاتا۔ وہاں دوا مفت ملتی تھی۔

زیدی

پھر جب ہم کرشن نگر کے لولی لاج میں مقیم تھے تو اتفاقاً'' زیدی سے ملاقات ہو گئی۔ زیدی ایک ہومیو پیتھ تھا۔ اس نے گھر میں ہی مطب کھول رکھا تھا۔

زیدی بہت بوڑھا تھا۔ کسی کام کاج کے قابل نہ تھا۔ ہاتھ کانپتے تھے۔ آنکھوں میں بینائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ارد گرد ایک دھندلکا سا چھایا رہتا تھا۔ اسے پیسہ کمانے سے دلچسپی نہ تھی۔ اس نے میز پر ایک پیالہ رکھا ہوتا' جس میں ہر مریض دو آنے ڈال دیتا تھا۔ اس کے گھر والے زیدی کے اس شغل پر بہت برہم تھے۔ کہتے تھے' والد صاحب نے یہ کیا میلہ لگا رکھا ہے۔ سارا دن مریض جمگھٹا کیے رہتے ہیں۔ پڑیاں بناتے رہتے ہیں۔ آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے۔

بس رولا ہی رولا ہے۔ ہم انہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں' مگر ان پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ ایک جنون طاری ہے۔

ایک روز میں نے زیدی سے کہا' ڈاکٹر صاحب اگر کوئی مریض پیالے میں دوانی ڈال کر اس میں سے چونی اٹھالے تو۔

تو کیا' وہ بولا' اس کی حاجت پوری ہو جائے گی۔ ہمارا کام حاجت روائی ہی تو ہے۔ چاہے کوئی دو آنے دے یا چونی اٹھالے کیا فرق پڑتا ہے۔

زیدی کا خدمت خلق کا جذبہ دیکھ کر مجھے اس سے لگاؤ پیدا ہو گیا اور میں اکثر اس کے پاس جا بیٹھتا۔

پھر میں نے دیکھا کہ فوجی افسر اس کے پاس آتے تھے۔ سلوٹ مار کر کہتے جناب ہمیں سی ایم ایچ سے ہدایت موصول ہوئی ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری دیں۔

سی ایم ایچ سے دو بیماریوں کے مریض آیا کرتے تھے۔ ایک تو پتھری کے اور دوسرے لاروا کے۔

میں نے ایک دن پوچھا' زیدی جی سی ایم ایچ سے مریض آپ کی طرف کیوں بھیجے جاتے ہیں۔

کہنے لگا' اس لیے کہ دو امراض کا حتمی علاج ہمارے پاس موجود ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی وہ دل اور گردے کے مریض بھی ریفر کیا کریں گے۔

ابتدائی ایام میں جب میں زیدی سے ملا تھا تو اس کی ٹانگ پر ایک ماچس کی تیلی لپٹی ہوئی نظر آتی تھی۔

میں نے پوچھا' یہ کیا چیز ہے۔

بولا' ٹانگ سے ایک کیڑا نکل رہا ہے اسے لاروا کہتے ہیں۔ اسے میں ماچس کی تیلی پر لپیٹتا رہتا ہوں۔ روز آدھ انچ نکلتا ہے۔ اگر یہ سارا نکل آیا تو پھر اس مرض کی اکسیر دوا بن جائے گی۔

اور اگر ٹوٹ گیا تو' میں نے پوچھا۔

ٹوٹ گیا تو اپنی رخصتی ہو جائے گی۔ یہ مرض مہلک ہے۔

پھر تو یہ بڑا سیریس معاملہ ہے۔

وہ ہنسا بولا' میاں ہم نے تو اب جانا ہی ہے۔ آج نہیں تو کل۔ سمجھ لو ہم تو پلیٹ فارم پر بیٹھے ہیں انتظار کر رہے ہیں کہ کب گاڑی آئے۔

زیدی سے قربت ہونے کے باوجود مجھ میں ہومیو پیتھی کو جاننے کا جذبہ پیدا نہ ہوا۔

پھر میں راولپنڈی آ گیا۔

رشید ہومیو

راولپنڈی میں مجھے کالج روڈ پر ایک مکان مل گیا جو بوہڑ بازار چوک کے قریب تھا۔ چوک کے قریب رشید ہومیو کا مطب تھا۔ رشید رنگین شخصیت کا مالک تھا۔ ہم دونوں دوست بن گئے۔

ایک روز میں نے رشید سے کہا یہ آپ کا کیسا سسٹم ہے کہ میٹھی گولیوں پر چلتا ہے۔

بولا' یہ روحانی سسٹم ہے۔

میں نے کہا' اپنے لیے تو بے کار ہوا۔

کہنے لگا' بے کار کیوں۔

میں نے کہا' مجھ میں تو روح ہے ہی نہیں۔

بولا' ہے نہیں تو ہم پیدا کر دیں گے۔

نہ جناب میں نے جواب دیا' خواہ مخواہ کا بکھیڑا۔ بلی لنڈوری ہی بھلی۔

پھر ایک دن رشید سے شرط لگ گئی۔

کہنے لگا' ہماری دوا شخصیت کا رنگ بدل سکتی ہے۔

میں نے کہا' ڈاکٹر لاف زنی نہ کرو۔

بولا' بالکل حقیقت بیانی کر رہا ہوں۔

میں نے کہا' میری شخصیت بدل دو تو جانوں۔

شرط

کہنے لگا' چلو' شرط لگاؤ۔

میں نے کہا' دس روپے۔

بولا' منظور۔

لیکن پتہ کیسے چلے گا کہ شخصیت پر اثر ہوا ہے۔

کہنے لگا' آپ خود آکر رپورٹ کریں گے۔

میں نے پوچھا' دوا کب دو گے۔

کہنے لگا' یوں نہیں۔ جانے میں دوا نہیں دوں گا' انجانے میں دوں گا۔

کئی ایک مہینے گزر گے۔ میں شرط بھول گیا۔

ایک دن مجھے ہلکا سا زکام تھا۔ رشید بولا' ایک خوراک کھالو زکام دور ہو جائے گا۔

میں نے کہا' کھلا دو۔

اس نے دوا میرے منہ میں ڈال دی۔

اگلے دن چھٹی تھی۔ دفتر بند تھا۔ میں پڑا رہا۔

کچھ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا بدلی بدلی ہو۔ چائے پینے کو جی نہیں چاہتا تھا' حالانکہ میں چائے کا رسیا تھا۔ پان کھایا تو اتنا بد ذائقہ لگا جیسے پہلی مرتبہ کھا رہا تھا۔ پڑھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لکھنے بیٹھا تو ذہن بند تھا۔

دو دن یہی کیفیت رہی۔

پھر میں رشید سے جا ملا۔ میں نے کہا' ڈاکٹر کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔

پوچھا' کیسی گڑ بڑ۔

یوں جیسے چت سے پٹ ہو گیا ہوں۔

کیا مطلب' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' مطلب ہے جیسے میں' میں نہیں رہا۔

رشید نے اپنے کمپاؤنڈر کو آواز دی کہنے لگا' مفتی صاحب سے دس روپے وصول کر لو۔

میں نے کہا' وہ کس خوشی میں۔

بولا' آپ شرط ہار گئے۔

اوہ———— شرط مجھے یاد آیا۔

کہنے لگا' آپ نے ابھی کہا ہے جیسے میں میں نہیں رہا۔

ہومیوپیتھی کے اس اعجاز کو دیکھ کر بھی مجھے ہومیوپیتھی کو جاننے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

الرجی

پھر مجھے الرجی ہو گئی اور میں سال ہا سال اینٹی ہسیٹمنک گولیاں کھاتا رہا۔

ان دنوں میں قدرت اللہ کا لو ایس ڈی تھا۔

میں نے ڈاکٹر عفت سے پوچھا کہ یہ الرجی کیا چیز ہے۔

وہ بولی۔ پتہ نہیں۔

میں نے پوچھا یہ بیماری ذہنی ہے یا جسمانی۔

کہنے لگی پتہ نہیں۔

میں نے کہا کوئی تو سپیشلسٹ ہو گا۔

بولی اسے بھی پتہ نہیں ہے۔

پھر کہنے لگی آپ ہومیوپیتھی کیوں نہیں ٹرائی کرتے۔

یہ سن کر میں حیران ہوا۔ میں نے کہا آپ ہومیوپیتھی کو مانتی ہیں۔

بولی۔ ہاں۔ مانتی ہوں۔

میں نے کہا آپ تو ایم بی بی ایس ہیں۔

بولی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

آپ نے ہومیوپیتھی پڑھی ہے کیا۔

صرف ایک دوا پڑھی ہے' وہ بولی' نکس وامیکا۔ میں تو قائل ہو گئی۔ محض اتفاق ہوا۔ شہاب صاحب کی کتابوں میں ہومیوپیتھی کا میٹریا میڈیکا پڑا تھا۔ ساتھ ہی اس کے موجد ہنی مین کی کتاب تھی۔

شہاب کی کتابوں میں ہومیوپیتھی کی کتاب! مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی۔

میں نے قدرت اللہ سے پوچھا' میں نے کہا' آپ نے ہومیوپیتھی پڑھی ہے کیا۔

بولا' سرسری طور پر پڑھی ہے۔

میں نے پوچھا' اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

بولا یہ سسٹم روحانی سسٹم معلوم ہوتا ہے۔

آپ کس بنا پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

کہنے لگا' لگتا ہے جیسے ہنی مین' درویش تھا۔ چوں کہ اتنی بڑی حقیقت صرف کسی درویش پر ہی منکشف ہوتی ہے کہ جس قدر دوا کی مقدار کم ہو گی' اس کی طاقت اسی قدر بڑھ جائے گی۔

پھر آپ ایلو پیتھی کا علاج کیوں کرتے ہیں' میں نے پوچھا۔

یہ مروج سسٹم ہے' اس لیے۔ اور اس میں بھی کئی خوبیاں موجود ہیں۔

گولی کھاؤ' اچھے ہو جاؤ' میں نے طنزاً کہا۔

عفت ہنسی۔ بولی' افاقہ بھی تو بڑی چیز ہے۔ درد سے نجات چاہے وقتی سہی پھر بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

انہی دنوں میرے دروازے پر ایک مست آ بیٹھا تھا جس نے میری الرجی سلب کر لی تھی۔ جس کا بیان میں کسی پچھلے باب میں کر چکا ہوں۔

ان دنوں میں سپنلایت ٹاؤن میں رہتا تھا۔ بدقسمتی سے رشید ہومیو ڈاکٹر وفات پا چکا تھا۔

پھر الرجی نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ دورہ پڑتا تو خون سر کی جانب رش کرتا اور میرے اوسان خطا ہو جاتے۔

میرا بیٹا عکسی' ایم بی بی ایس طبیعت کا مالک تھا۔ وہ مجھے اٹھا کر ہسپتال لے جاتا۔ جاتا تو واپس آنے کی امید دھندلا جاتی۔ ان حالات سے گھبرا کر میں اشفاق بانو کے پاس گیا۔

میں نے کہا' یارو مجھے ہسپتال میں مرنے سے بچالو۔ مرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل مرنا تو ہے ہی' لیکن میں چاہتا ہوں کہ گھر پر مروں' اپنے بستر میں' ہسپتال میں نہیں۔

وہ مجھے ڈاکٹر خان کے پاس لے گئے۔ خان ایگری کلچر کا ڈاکٹر تھا۔ ہومیو پیتھی اس کا شغل تھا۔ سمنٹم وہ آنکھ سے دیکھتا تھا۔ اس کے لیے اس کے پاس ایک مشین تھی۔

ڈاکٹر خان نے میرا معائنہ کیا اور چار دوائیاں تجویز کیں۔

ان دوائیوں نے میری الرجی کو گیس میں بدل دیا۔ اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ارے یہ کیا جادو ہے' میں نے سوچا کہ الرجی کو گیس میں بدل دیا۔

زندگی میں میں نے ہومیوپیتھی کے بڑے بڑے معجزے دیکھے تھے' لیکن اس سسٹم کو جاننے کی خواہش پیدا نہ ہوئی تھی' لیکن اس چھوٹی سی بات نے میرے دل میں ہومیوپیتھی کو جاننے کا جنون پیدا کر دیا۔ جن دنوں میں ہومیوپیتھی پڑھ رہا تھا۔ اشفاق حسین کراچی سے اسلام آباد آ گیا۔ اشفاق حسین میرا پرانا یار تھا۔

اپنا اپنا محکمہ

اگرچہ ہم دونوں اکٹھے نہیں رہے تھے' لیکن اشفاق حسین سے میرا رابطہ نہیں ٹوٹا تھا۔

جب میں نیا نیا پنڈی آیا تھا تو اشفاق حسین کیمل پور کے گورنمنٹ کالج میں لیکچرار تھا اس کی طبیعت میں وہی رنگینی تھی' وہی ایڈونچر تھا' وہی باتوں کی پھلجڑیاں تھیں اور وہی موسیقی کی لگن ان کے علاوہ وہ سپورٹس مین بن چکا تھا۔ کالج میں ٹینس کا بہترین کھلاڑی تھا۔ گھر میں موسیقی کی محفلیں لگتی تھیں۔ برج کے میچ ہوتے تھے۔ کالج میں وہ بڑا پاپولر تھا۔ لڑکیوں کی توجہ کا مرکز تھا۔

اشفاق حسین کو احساس تھا کہ اسے سرپٹ سے پیدل کر دیا گیا ہے' لیکن وہ اس بات کو بھلا دینا چاہتا تھا۔ زبردستی کارنامے کرنا چاہتا تھا۔

دو ایک بار وہ مجھے کیمل پور بھی لے گیا تھا۔

جب بھی میں کسی مصیبت میں پڑ جاتا یا مدد کی ضرورت ہوتی تو اسے پیغام بھجواتا۔ بلیپ۔ بلیپ اور اگلے روز ہی وہ اپنی گاڑی میں پنڈی پہنچ جاتا۔ مانگ کیا مانگتا ہے کے انداز میں کہتا بول کیا چاہتا ہے کیا کسی کو پھینٹی لگانی ہے یا کسی خاتون کو اغوا کرنا ہے یا کسی کپے کو دفنانے کی پرابلم ہے' بول۔

ایک مرتبہ میں نے کہا' تجھے ایک بابا سے ملوانا ہے۔

بولا' نہ بھائی بابوں سے ملنا اپنا کام نہیں۔ یہ محکمہ تیرا ہے' اپنا نہیں۔ ہم سے ہمارے محکمے کی بات کرو۔

پتہ نہیں کیوں پھر اشفاق حسین کالج چھوڑ کر کاروبار کرنے کے لیے کراچی چلا گیا۔

چھوٹا بخار

اشفاق حسین ایمن آباد کے شیخوں میں سے ہے۔ تقسیم کے بعد سارے شیخ کراچی چلے گئے تھے اور انہوں نے چند ایک سال میں کراچی کا آٹو موبائل سے متعلقہ بزنس اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا اور وہ سب لکھ پتی ہو گئے تھے۔

اشفاق حسین کو روپیہ جوڑنے سے نہیں بلکہ خرچ کرنے سے دلچسپی تھی اور جسے روپیہ جوڑنے سے دلچسپی نہ ہو وہ بزنس مین نہیں بن سکتا۔

غالباً" وہ کراچی اس لیے چلا گیا کہ وہ پروفیسری میں مغلیہ ٹھاٹھ سے نہیں رہ سکتا تھا اور مغلیہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنا اس کی واحد آرزو تھی۔

بہرحال بزنس میں اس نے کئی پاپڑ بیلے روپیہ بھی کمایا۔ مگر اس کام میں اس کا جی نہ لگا۔

پھر اسے چھوٹا بخار رہنے لگا۔ آٹھ دس ماہ اس نے کراچی کے تمام سپیشلسٹ چھان مارے' لیکن بخار نہ گیا پھر کسی نے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا اور وہ اسلام آباد آ گیا۔

وہ مجھ سے ملنے آیا تو ان دنوں میں ہومیو پیتھی پڑھ رہا تھا۔

یہ کیا پڑھ رہا ہے تو' اس نے پوچھا۔

ارے' وہ ایک آدھ صفحہ پڑھنے کے بعد چلایا' یہ دیکھ' یہ کیا لکھا ہے۔

کیا لکھا ہے' میں نے پوچھا۔

لکھا ہے کہ جس کے پیشاب سے گھوڑے کے پیشاب کی بو آئے اسے یہ دوا فائدہ پہنچائے گی۔

میں نے کہا' تجھے کیسے پتہ ہے کہ تیرے پیشاب سے گھوڑے کے پیشاب کی بو آتی ہے۔

کہنے لگا' میرا باپ تحصیل دار تھا ہمارے گھر میں ہمیشہ دو گھوڑے رہتے تھے۔

اشفاق حسین نے اس دوا کی ایک خوراک کھائی اور اس کا بخار ٹوٹ گیا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

پھر اسے بھی ہومیو پیتھی پڑھنے کا جنون ہو گیا۔

ہم اکٹھے ہومیو پیتھی پڑھتے رہے۔

ہومیو پیتھی کی کتابیں خریدنے کے لیے ہم اکٹھے بھارت بھی گئے۔

اس دوران میں ایک اور واقعہ ہوا۔

میرے بیٹے عکسی کو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ وہ دو ماہ ہسپتال میں رہا۔

اس کے بعد اسے ایک عجیب سی بیماری لگ گئی۔ شکر اس کے خون میں تحلیل نہیں تھی۔ یہ بیماری ذیابیطس کا الٹ تھی اسے HYPOGLYCIMIA کہتے تھے' لیکن ایلوپیتھی میں اس کا کوئی اعلاج نہ تھا۔ جاپان میں ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے کئی ایک مہینے اس پر تحقیق کی۔ برطانوی ڈاکٹروں نے ٹسٹ لیے' لیکن کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔

عکسی اکثر ہومیوپیتھی کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ کہتا' یہ ابو کو کیا ہو گیا ہے۔ شکر کی میٹھی گولیوں کو دوا سمجھنے لگا ہے۔ ہم سے بات کیے بغیر وہ راولپنڈی کے ایک ہومیو ڈاکٹر سے جا کر ملا۔ دو ایک مہینے ہومیو دوا چوری چوری کھاتا رہا۔ اس دوا سے اسے شفا تو نہ ملی البتہ آفاقہ مل گیا۔ اس آفاقے سے خطرے کی بات ٹل گئی۔ بیماری کا دل پر اثر انداز ہونا موقوف ہو گیا۔

اس پر عکسی نے بھی چپکے چپکے ہومیوپیتھی کا مطالعہ شروع کر دیا۔

ایک روز اشفاق حسین نے کہا یار ہومیوپیتھی پڑھنے کی نہیں کرنے کی چیز ہے۔

میں نے کہا' کر دیکھو۔

ہم دونوں نے ہومیوپیتھی کا ایک جمعہ بازار لگا لیا۔

ہفتے میں ایک بار جمعے کے دن ہم مفت جمعہ بازار لگا لیتے۔ اشفاق حسین مریض دیکھتا دوا تجویز کرتا اور میں پڑیاں بناتا۔

ہم اس بات پر حیران رہ گئے کہ تجربہ نہ ہونے کے باوجود کافی مریض شفایاب ہو جاتے ہیں۔

قدرت اللہ کو پتہ چلا تو وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا' مریضوں کو دوا دینے سے بہترین نوع کی کوئی اور خدمت نہیں ہے۔

میں نے کہا' شہاب صاحب میں کبھی ہومیوپیتھ نہیں بن سکتا۔

کیوں' شہاب نے پوچھا۔

میں نے کہا' ہومیو بننے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یاد داشت اچھی ہو دوسرے کسی اور چیز کی طرف توجہ نہ ہو۔

کیا مطلب' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' ہومیو پیتھی کہتی ہے بس مجھ سے آنکھیں لگائے رکھو اور کسی کی طرف مت دیکھو۔ میں ہومیو نہیں بن سکتا' ایک تو میری یادداشت دھندلا گئی ہے' دوسرے میں ادب سے وابستہ ہوں۔ اشفاق حسین اچھا ہومیو بن سکتا ہے۔

پھر وہ بنتا کیوں نہیں' اس نے پوچھا۔

وہ پریکٹس کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

کہنے لگا' آپ کوشش کر کے اسے منالیں۔ اس میں ایک ہی خطرہ ہے' وہ بولا' پیسہ کمانے کی لت نہ پڑ جائے۔

میں نے کہا وہ پیسہ خرچ کرنے کے لیے کمائے گا' جوڑنے کے لیے نہیں۔

پھر ٹھیک ہے' قدرت بولا۔

ہار اور جیت

ہم سب نے اشفاق حسین کو پریکٹس کرنے پر مائل کرلیا۔

جوں جوں اس کی پریکٹس چلی توں توں اس کی صحت گرنے لگی' خواہ مخواہ ایک نا ایک بیماری لگ جاتی۔ لوگوں کو دوا دیتا تو انہیں شفا ہو جاتی خود دوا کھاتا تو کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کا مزاج چڑچڑا ہو گیا۔ مریضوں سے چڑ چڑ کرنے لگا۔

شہاب نے کہا' یہ تو ہو گا۔ اللہ جس کے ہاتھ میں شفا بخشے گا' وہ خود تو بیمار رہے گا لازماً"۔

وجہ' میں نے پوچھا۔

بولا' تاکہ اسے شعور ہو کہ شفا بخشنے والا وہ خود نہیں کوئی اور ہے۔

میں نے کہا' شہاب جی اگر اشفاق حسین سے کہیں کہ تیرے ہاتھ میں اللہ نے شفا بخشی ہے تو اسے غصہ آتا ہے۔

وہ کیوں' شہاب نے پوچھا۔

کہتا ہے میں محنت کرتا ہوں۔ جان کھپاتا ہوں اور تم کہتے ہو اللہ نے شفا بخشی ہے۔

وہ ہنسا بولا' اگر وہ RESIST کرے گا تو بیماری اور بھی شدت اختیار کرے گی۔ اس سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہتھیار ڈال دو۔

میں نے کہا' ہتھیار ڈال دینا تو ہار تسلیم کرلینا ہے۔

بالکل' قدرت بولا' عام باتوں میں ہتھیار ڈال دینا شکست ہوتی ہے' لیکن اللہ کے معاملے میں ہتھیار ڈالنا فتح ہوتی ہے۔ ہتھیار ڈال دو اور جیت جاؤ' سکھی ہو جاؤ۔

قدرت اللہ کا یہی فلسفہ تھا جس پر وہ زندگی بھر عامل رہا کہ ہتھیار ڈال دو۔ سچے دل سے ہتھیار ڈال دو۔ ہار جاؤ سچے دل سے ہار جاؤ۔ کوئی بحث کرے تو جواباً" بحث نہ کرو' بات نہ بڑھاؤ۔ اس کی بات مان لو۔ کوئی الزام دھرے تو اسے تسلیم کرلو اپنی پوزیشن صاف نہ کرو۔ مان جانے میں بڑا سکھ ہے اور سکھ جیت کا دوسرا نام ہے۔ قدرت اللہ کہتا تھا' دوسروں کو سکھ پہنچاؤ گے' تو آپ خود بخود سکھی ہو جاؤ گے مفت میں۔

شدت

قدرت کا فلسفہ نہ اشفاق حسین اپنا سکتا تھا نہ میں۔ اشفاق حسین کے راستے میں نیں حائل تھی۔ میرے راستے میں میری طبعی شدت۔

بچپن سے ہی میں شدت کا مارا ہوا تھا۔ میری طبعی شدت سے سبھی نالاں تھے۔ بانو' اشفاق احمد' عکسی' میری بیوی' قدرت۔ اگرچہ قدرت نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا' لیکن بات کب چھپی رہتی ہے۔

قدرت نے میرے متعلق جو پہلا جملہ لکھا تھا اس میں ہی بات کھل گئی تھی۔ اس نے کہا تھا ممتاز مفتی کی دوستی ایک پھوڑا ہے جس کی ٹیسوں میں لذت ہے۔

اس جملے کے مفہوم کو میں پورے طور پر نہیں سمجھا تھا۔ آج تک نہیں سمجھ پایا۔

الٹا زندگی بھر میں شدت کو ایک وصف سمجھتا رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر جذبہ مثبت ہے تو شدت ایک خوبی ہے۔

ساری زندگی میں شدت کو اخلاص سمجھتا رہا' حالانکہ وہ ایک بار قدرت نے بر سبیل تذکرہ شدت کی مذمت کی تھی۔

ایک بار جب میں غفور صاحب کے جذبے کے گن گا رہا تھا تو قدرت نے کہا تھا' اونہوں' ان میں توازن نہیں۔

میں نے بات کا مفہوم تو پا لیا تھا' لیکن میں سمجھا یہ اصول صرف بزرگوں پر لاگو ہوتا ہے' عام لوگوں پر نہیں۔

پھر اسی سال کی عمر میں بیٹھے بٹھائے مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ شدت چاہے خیر کی ہو۔ بہرحال ایک تخریبی عمل ہے۔

رجنیش

اس روز میں اشفاق احمد کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اشفاق نے کہا' تجھے ایک چیز سناؤں۔

میں نے کہا' کیسی ہے۔

بولا' سن لے پتہ چل جائے گا۔

اشفاق نے ریڈیو پر ایک کیسٹ لگا دیا۔

کوئی شخص بول رہا تھا۔ ارے' یہ کون بول رہا ہے۔ کیسے بول رہا ہے۔ مدھم۔ میٹھا۔ کیا لے ہے۔ کیا انداز ہے۔ بات کان سے سیدھی دل میں اتر رہی ہے۔

کون ہے یہ' میں نے بانو سے پوچھا۔

بولی' رجنیش۔

کون رجنیش۔ وہ جو امریکہ میں پیر بنا بیٹھا ہے۔ امریکی دھڑا دھڑ اس کے مرید بن رہے ہیں۔

وہی' اشفاق بولا۔

کیا وہ۔ جو فری سیکس کا قائل ہے۔

ہاں وہی۔

نہیں میں نہیں مانتا۔ جنسی عفریت میں اتنی مٹھاس اتنا تاثر۔ رجنیش کے اس ٹاک کا موضوع شدت تھا۔

میں وہ کیسٹ سنتا رہا' سنتا رہا۔ بار بار سنتا رہا۔ اور میں نے زندگی میں پہلی بار جانا کہ شدت تعمیری عمل نہیں ہے۔

پھر مجھ پر رجنیش کے کیسٹ حاصل کرنے کا جنون طاری ہو گیا۔ اشفاق احمد نے اس سلسلے

میں میری مدد نہ کی۔

اشفاق احمد کی علاوت ہے کہ وہ ایسی چیزیں سنبھال کر رکھتا ہے جو دوسروں کو حیران کر دیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ ایسی باتیں یا چیزیں عام کر دی جائیں۔ اس کے برعکس میری یہ علاوت ہے کہ کوئی ایسی نئی چیز یا بات مجھے مل جائے تو میں ڈھنڈورا پیٹ دیتا ہوں' آؤ' آجاؤ' یہ دیکھو یہ کیا ہے۔

بہرحال میں نے بڑی مشکل سے رجنیش کے چند ایک کیسٹ حاصل کر لیے اور انہیں سننے لگا' سنانے لگا۔

جب کبھی میں کیسٹ سن رہا ہوتا اور قدرت اللہ آجاتا تو رجنیش کو سن کر اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر چھا جاتا تھا۔

بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس قدر مٹھاس بھری آواز' مدھم انداز اور دل میں اتر جانے والے بول۔ پھر ناگواری کیوں۔

ایک دن میں نے قدرت سے کہا۔ رجنیش نے مجھے اتنی بڑی حقیقت کا احساس دلایا ہے کہ شدت تعمیری چیز نہیں ہے۔

ہاں' وہ بولا' ساتھ ہی اس نے آپ کے جذبے میں مزید شدت پیدا کر دی ہے۔

بہرحال ذہنی طور پر تو میں نے قبول کر لیا ہے کہ شدت نقص ہے۔

بڑی بات ہے' وہ بولا' لیکن۔

لیکن کیا۔

لیکن ذہنی طور پر مان لینے سے کیا ہوتا ہے۔ جب تک بات دل سے ہو کر عمل میں نہ ڈھل جائے بیکار ہے۔

لیکن ٹھہریئے شدت کی اس بات نے کیا کیا رنگ دکھائے۔ اسے جاننے کے لیے ضروری ہے کہ میں اپنی شخصیت سے آپ کا تعارف کرا دوں۔ میں نے ایک مضمون اپنی کیوں کچیوں پر لکھا تھا۔ عنوان تھا "چھوتا" آگے سے ملاحظہ فرمائیں۔

ستاون واں باب

چھوٹا اور بڑی

چھوٹا

مجھے ممتاز مفتی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ سیانے کہتے ہیں' دو مقامات سے دیکھو تو ٹھیک سے نظر نہیں آئے گا۔

دور سے۔

بہت قریب سے۔

چوں کہ ممتاز مفتی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لیے امکان غالب ہے کہ ٹھیک سے نہیں دیکھا۔ چنانچہ یہ مضمون سند نہیں ہے۔

ممتاز مفتی زندگی میں ربط سے محروم فرد ہے۔ میل اڈ جسٹڈ MAL ADJUSTED پیدائشی طور پر چھوٹا آدمی ہے۔ بڑے آدمی سے مل کر جھجک محسوس کرتا ہے' گھبراتا ہے' کتراتا ہے۔ اسے کسی بنے بجے گھر میں لے جائیے۔ چلا جائے گا' لیکن دل دھک دھک کرے گا' سانس رکے گا' اندر ڈگمگ ڈگمگ ڈولے گا' یہ میں کہاں آگیا ہوں۔

اسے کسی اونچے عہدے پر بٹھا دو۔ بیٹھ تو جائے گا' لیکن یوں جیسے کانٹوں پر بٹھا دیا گیا ہو۔

افسروں کے ساتھ نہیں کھلے ملے گا۔ چھوٹے سٹاف کے درمیان ایٹ ہوم محسوس کرے گا۔ دفتر کے چپڑاسیوں کو سلام کرنا اس کی پرانی علوت ہے۔ افسر کے ساتھ اس کا برتاؤ یا تو جی حضوریا ہوتا ہے اور یا کھچا کھچا۔ میانہ روی سے محروم ہے۔ جی حضوریا ہو تو سراسر جی صاحب! جناب عالی!! یس سر!!!

جسے اچھا سمجھ لے پھر اس کی ہربات میں اچھائی نظر آتی ہے۔ دقت یہ ہے کہ جسے برا سمجھے اس میں بھی اچھائیاں نظر آتی ہیں۔ پھر اسے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ جسے میں اچھا نہیں سمجھتا اس میں اچھائیاں کیوں نظر آتی ہیں؟

شدت

ممتاز مفتی میں شدت ہے۔ اس شدت کا قوام کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہے۔ ایک عالم کسی حکیم صاحب کی دکان پر گئے۔ پوچھا' آپ کے پاس "شیروا" ہے؟ حکیم نے جواب دیا' جناب! شیرا تو ہے پر اتنا گاڑھا نہیں۔ ممتاز مفتی کی شدت شین والی شدت نہیں' شوے والی شدت ہے۔ زندگی بھر وہ شدت کو وصف سمجھتا رہا۔ اس پر ناز کرتا رہا۔ ٹھنڈے میٹھے کرداروں سے الرجک رہا۔ سمجھتا رہا کہ جس میں شدت ہے' اس میں خلوص ہے' سچائی ہے۔ اکاسی سال کا ہوا تو پہلی بار اس نے جانا کہ شدت وصف نہیں' عیب ہے' رکاوٹ ہے اور ٹھنڈے میٹھے لوگوں کے دم کرم سے زندگی ہری بھری ہے۔ یہ بات پہلے اس نے رجنیش کے منہ سے سنی' جو جنسی آزادی کا پرچارک ہے اور اسی وجہ سے رسوائے زمانہ ہے۔ رجنیش کی زبان میں مٹھاس تھی' بجز تھا' تاثر تھا۔ ممتاز مفتی نے رجنیش کی بات سنی' جان لی۔ سچے دل سے مان لی' لیکن اسے عملاً اپنا نہ سکا' کیونکہ شدت اس کی ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی۔

صاحبو! کسی حقیقت کو جان لینا' دل سے مان لینا' لیکن عملی طور پر اپنا نہ سکنا' یوں ہے جیسے پھانسی پر لٹک گئے۔ لٹکے رہے' کاش! وہ شدت کو وصف ہی سمجھتا رہتا۔

غصہ

ممتاز مفتی کو غصہ بہت آیا ہے وہ غصہ جو بھوت بنا دیتا ہے' دھول اڑاتا ہے' خود کو بھلا دیتا

ہے۔ عرصہ دراز ہوا کہ اس نے جان لیا تھا کہ غصہ درحقیقت دوسرے کی خطا پر خود کو سزا دینے کا نام ہے۔ خود کو چاٹی میں ڈال کر بلونے کا عمل ہے۔ جان لینے کے باوجود' مان لینے کے باوجود وہ آج تک خود کو چاٹی میں ڈال کر بلونے پر مجبور ہے۔

اس کے غصے کے کوائف منفرد ہیں۔ مثلاً آپ نے اسے کچھ کہہ دیا۔ جواب میں وہ جی ہاں' جی ہاں' کرتا رہا۔ گھر جا کر بیٹھے بٹھائے اسے خیال آیا کہ آپ نے تو یہ کہا تھا' یعنی آپ نے یہ کہہ کر اس کی توہین کی تھی۔ جواب میں اسے جی ہاں نہ کہنا چاہیے تھا۔ دفعتاً" اسے غصہ آ جائے گا' خون سر کی جانب یورش کرے گا' کنپٹیاں بجنے لگیں گی' ذہن میں آگ لگ جائے گی' ذہنی دھینگا مشتی شروع ہو جائے گی۔

اسے کبھی موقع پر روبرو غصہ نہیں آیا۔ لہٰذا تو تو' میں میں' نہیں ہوئی' ہاتھاپائی کی نوبت نہیں آئی۔ اس کا غصہ کمزور اور ڈرپوک آدمی کا غصہ ہے' بے بسی کا اظہار ہے۔ ہاں' اگر ذہنی دھینگا مشتی کے فوراً بعد آپ سامنے آ جائیں تو روبرو اظہار ہو جائے گا۔ شڑاک سے غصے کی بوتل کھل جائے گی۔

عورت

عورت کے متعلق ممتاز مفتی کا رویہ کھٹ مٹھا ہے' جسے انگریزی میں لوہیٹ ریلیشن شپ Love Hate کہتے ہیں۔ مفتی میں ایک ریڈار قسم کا ریسیور لگا ہوا ہے۔ قرب و جوار میں کوئی عورت آ جائے تو وہ ٹک ٹک کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر آنے والی بانکی نار ہو تو ٹشلوں ٹشاوں کرنے لگتا ہے۔

ممتاز مفتی کو ہر عورت سے عشق ہے' بلالحاظ رنگ اور خدوخال۔ چٹے سفید رنگ پر تو اس کی جان نکلتی ہے۔ دقت یہ ہے کہ اگر خاتون زیادہ ہی قریب آ جائے تو وہ ڈر کر بھاگ اٹھتا ہے۔ یہ لوہیٹ ریلیشن شپ اسی لیے پیدا ہوا کہ بچپن میں جس خاتون سے وہ شدت سے متاثر ہوا تھا وہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔ وہ بڑی حسین خاتون تھی!

فینٹیسی

پیدائشی طور پر ممتاز مفتی کو فینٹیسی کی بیماری لاحق ہے۔ وہ خالی الذہن ہونے کی

کیفیت سے محروم ہے۔ اس پر عائد ہے کہ وہ اپنے ذہن میں کسی خیال کے دہی کی پھٹکی ڈال کر اسے بلوہتا رہے۔ اس کی فینٹیسی شیخ چلی کی طرح امید افزا یا خوش کن نہیں ہوتی۔ اس میں تلخی ہوتی ہے' شرمندگی ہوتی ہے' جنس ہوتی ہے۔ جنسی فینٹیسی سے بچنے کے لیے اس نے شیخ چلیت کا سہارا لیا تھا۔ پہلے کرائیڈن سے سڈنی تک ہوائی جہاز چلاتا رہا۔ پھر دس اووروں میں ساری ایم۔ سی۔ سی ٹیم کو آؤٹ کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک ایسی شعاع ایجاد کر لی جو ایٹمی ری ایکٹروں کو جام کر دیتی تھی۔ اور وہ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر دنیا بھر کے ایٹمی ری ایکٹروں کو جام کرنے میں مصروف رہا۔

ممتاز مفتی ازلی طور پر اکیلا ہے۔ اکیلے دو قسم کے ہوتے ہیں' ایک وہ جو جان بوجھ کر التزاماً الگ رہنا پسند کرتے ہیں۔ محفل لگ جائے تو ڈوبتے نہیں' تیرتے رہتے ہیں دوسرے وہ جو محفل سے گھبراتے ہیں' کتراتے ہیں۔ اکیلے میں سالم محسوس کرتے ہیں' محفل میں ادھورے۔

اگر آپ ممتاز مفتی کو ایک کمرے میں بند کر دیں جہاں اس کی ضروریات اسے ملتی رہیں تو بے شک چھ مہینے کے بعد آ کر دروازہ کھولیں' ممتاز مفتی یوں ہشاش بشاش بیٹھا ہو گا جیسے ابھی ابھی روز گارڈن کی سیر کر کے آیا ہو۔

اس نے زندگی بھر نہ باقاعدہ ورزش کی ہے نہ سیر کی ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر نے کہا' آپ کو چاہیے کہ باقاعدگی سے ہر روز سیر کریں ورنہ آپ بیمار ہو جائیں گے۔ مفتی نے کہا' ڈاکٹر صاحب' سوچ لیجیے کیونکہ میں نے زندگی بھر سیر نہیں کی۔ ڈاکٹر نے کہا' ضرور سیر کریں۔ مفتی نے دس دن سیر کی۔ پھر وہ بیمار پڑ گیا۔ دو مہینے پڑا رہا۔ ٹانگوں میں درد آج تک نہیں گیا۔

مفتی مہمان نوازی سے بڑا الرجک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ڈرتا ہو کہ کوئی آ نہ جائے' وہ مہمان نوازی کیا کرے گا۔ وہ اکثر مہمان سے چائے یا ٹھنڈا پوچھنا بھول جاتا ہے۔ مہمان رخصت ہو جائے تو اسے یاد آئے گا کہ اوہو! چائے کا تو پوچھا ہی نہیں۔ لوگ انتظار کرتے ہیں کہ مہمان آئے تو کھانا کھائیں۔ مفتی انتظار کرتا ہے کہ کب مہمان جائے تو کھانا کھائے۔

مفتی نے عمر بھر کوشش کی ہے کہ اس کا برتاؤ ایسا نہ ہو جو معزز لوگوں کا ہوتا ہے۔ گھر میں اس نے کبھی خود کو ہیڈ آف فیملی نہیں سمجھا۔ اسی وجہ سے اس کی تحریر میں شوخی ہے' بے تکلفی ہے' چھیڑ ہے۔ اس نے کبھی غور سے خود کو آئینے میں نہیں دیکھا۔ ہمیشہ آئینہ سامنے رکھے

بغیر شیو کرتا ہے۔ اگر کبھی اتفاقاً" آئینہ دیکھ پائے تو اسے دھچکا لگتا ہے۔ ارے میں یہ ہوں کیا؟

اس غیر معزز رویے کے نقصانات بھی ہیں جو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً چوراسی سال کی عمر کے باوجود گھر میں اسے ایسی پوزیشن حاصل نہیں جسے قابل رشک کہا جا سکے۔ گھر میں کوئی بھی اس سے خوش نہیں۔ بیوی بچاری بڑی دکھی ہے۔ میاں نے کبھی اکیلے میں بیٹھ کر اس کی دکھ سکھ کی باتیں نہیں سنیں' کبھی اس کی شکایات پر دھیان نہیں دیا' یہاں تک کہ پڑوسن کی بے حیائی کی بات پر بھی کان نہیں دھرا۔

گھر میں کسی کو ادب سے' خصوصاً" اس کی تحریروں سے دلچسپی نہیں۔ بیوی کہتی ' کیوں خواہ مخواہ جھوٹی کہانیاں لکھ کر اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو؟ ایک انٹرویو میں کسی صحافی نے اس کی بیوی سے پوچھا' آپ کے میاں میں کوئی خوبی تو ہو گی جو آپکو پسند ہے۔ جواب میں بیگم نے کہا' کوئی ہو تو بتاؤں نا' کوئی ہے ہی نہیں۔

دراصل مفتی کو توجہ دینے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ اسے بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ کچھ ہانڈی روٹی کے لیے' کچھ ادب کے لیے۔ جو وقت بچتا ہے وہ ہومیوپیتھی کھا جاتی ہے۔

اللہ میاں

اللہ میاں سے مفتی کے تعلقات ادلتے بدلتے رہے ہیں۔ بچپن میں وہ اللہ سے خوف زدہ رہا۔ سمجھتا تھا کہ اللہ نے ایک بھٹی جلا رکھی ہے' ہاتھ میں سوٹا پکڑ رکھا ہے اور جو بھی آتا ہے اسے سوٹا مار کر بھٹی میں ڈال دیتا ہے۔ پڑھ لکھ کر وہ اللہ سے منکر ہو گیا' بلکہ اللہ کی بے ادبی کرنے میں لذت حاصل کرنے لگا۔ جب وہ پچاس سال کا ہوا تو ایک بزرگ نے اس پر رقت طاری کر دی۔ پتا نہیں کیا ہوا۔ اس کا رخ بدل گیا۔ اسے ڈال ڈال' پات پات میں اللہ نظر آنے لگا۔ آج کل وہ حیرت میں ڈوبا ہوا ہے کہ اللہ اس پر اس قدر مہربان کیوں ہے؟ قدم قدم پر اس کی مدد کیوں کرتا ہے؟

فرصت کے وقت وہ اللہ کو پاس بٹھا کر اس سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ کام کی باتیں نہیں' ادھر ادھر کی گپ شپ: اللہ تجھے پتا ہے آج مجھے ایک لڑکی کا خط ملا ہے۔ بڑی بانکی لڑکی ہے۔ لکھتی ہے' جو تو ایلی ہے تو میں بھی ایلن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مفتی کی کہانیوں میں اللہ

زبردستی آگھستا ہے۔ مفتی میں عقیدے کا فقدان ہے' عقیدت کی بھرمار ہے!
اللہ نہ کرے کہ مفتی کو آپ سے عقیدت ہو۔ ہو جائے تو آپ زچ ہو کر رہ جائیں گے۔
مفتی کو شکرگزاری کی بیماری لاحق ہے۔ قدرت اللہ شہاب کو عمر بھر یہ شکایت رہی کہ وہ مفتی کی عقیدت کا شکار ہے اور اس لیے مظلوم ہے۔
مفتی کو ادیب ہونے پر فخر نہیں ہے' بلکہ معذرت ہے۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ ادیب بنے۔ اتفاق سے بن گیا۔ تالی بجی۔ پھر تالی کا ایسا چسکا پڑا کہ آج تک لکھنے پر مجبور ہے۔

ادب

مفتی کو اردو نہیں آتی۔ اس نے کبھی اردو ادب کا مطالعہ نہیں کیا۔ جب اس نے لکھنا شروع کیا تو اہل زبان بڑے ناراض ہوئے۔ انہوں نے شور مچا دیا: مفتی کو زبان نہیں آتی! بند کرو! لکھنا بند کرو۔ وہ سچ کہتے تھے۔ واقعی مفتی کو زبان نہیں آتی تھی۔ وہ کہتے رہے۔ مفتی لکھتا رہا۔ اس نے لکھ لکھ کر اپنی زبان خود وضع کر لی۔ اب لوگ کہتے ہیں کہ مفتی کے لکھنے کا انداز منفرد ہے تو اسے یقین نہیں آتا کیوں کہ اب بھی اسے زبان نہیں آتی۔
مفتی نے لکھ کر ادب پر کوئی احسان نہیں کیا' نہ ہی خدمت کی ہے۔ الٹا ادب نے مفتی پر احسان کیا ہے کہ اسے اہمیت عطا کر دی۔ زندگی بے مصرف نہیں رہی۔ وہ سوچنے والے ادب کو نہیں مانتا۔ کہتا ہے: ادب جذبہ ہے' سوچ نہیں۔ ادب کا مقصد انسان میں مثبت جذبات جگانا ہے۔ ہمدردیاں پیدا کرنا ہے۔ سوچ کو جذبے میں بھگو کر پیش کرنا ہے' اگر تحریر میں تاثر نہیں' اگر وہ قاری میں جذبے کی بھیگ پیدا نہیں کرتی تو بے کار ہے۔

کمپیوٹر

مفتی کا بیان ہے کہ اللہ نے مجھ میں ایک کمپیوٹر لگا رکھا ہے۔ پتا نہیں' اسے اللہ کی دین سمجھوں یا عذاب؟ اس کمپیوٹر نے میری زندگی حرام کر رکھی ہے۔ یہ کمپیوٹر میری ہر بات پر اپنے کو منٹ دیتا رہتا ہے۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں تو وہ چیخ کر کہے گا: کیوں جھوٹ بول رہا ہے؟ اگر میں کہوں کہ میں نے ایک اچھی کہانی لکھی ہے تو وہ بولے گا:

کیوں خود نمائی کر رہا ہے؟ محفل میں کوئی بات کروں تو کہتا ہے: کیوں نمائشی باتیں کرتا ہے؟ کھانے کو ناپسند کروں تو چلاتا ہے: ناشکرا ناشکرا! اس کمپیوٹر کی مسلسل نکتہ چینی کی وجہ سے مفتی اپنی تحریروں میں جھوٹ نہیں بول سکتا' مجبوری ہے۔

محبت

ممتاز مفتی نے بڑی محبتیں کی ہیں' لیکن بڑی دیر کے بعد اسے حقیقت کا شعور ہوا کہ دراصل اسے محبت کرنے کے عمل یا کیفیت سے محبت تھی' محبوب سے نہیں۔ "بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے" کی کیفیت سے محبت تھی محبوب کی اہمیت تو تھی' لیکن ضمنی۔

اس کے محبوب میں چند اوصاف کا ہونا لازم ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ رنگ گورا ہو۔ خدوخال اہم نہیں۔ عمر رسیدہ ہو۔ ہُشیار ہو۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ محبوب میں ہرجائیت کی واضح جھلک یا دھونس موجود ہو۔ مفتی کسی نیک یا وفادار خاتون سے محبت نہیں لگا سکتا۔ آج کل کی لڑکیاں اسے اپیل نہیں کرتیں۔ کہتا ہے: محبت لگانا ایک فن ہے۔ یہ کھٹی مٹھی کچی لڑکیاں بھلا کیا جانیں کہ محبت کیا شے ہے؟

مفتی کے نزدیک محبوب میں ممتا کا ہونا ضروری ہے۔ ممتا بھرے لگاؤ کے ساتھ بے وفائی کی دھونس کا ہونا بھی لازم ہے۔ اسے طوائف قسم کی عورت سے بڑی دلچسپی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس کی کہانیوں میں طوائف کا بڑا تزکرہ ہوتا ہے۔

مفتی کا کہنا ہے کہ محبت میں چار مرحلوں سے گزرنا ضروری ہے' ورنہ آپ کے کردار کی تکمیل نہیں ہو گی:۔

۱۔ کسی سے ٹوٹ کر محبت کرنا۔

۲۔ کامیابی ایسی کہ محبوب دل و جان سے تمہیں اپنا لے۔ تخت پر بٹھا کر مور چھل کرے۔

۳۔ پھر لات مار کر تخت کے نیچے گرا دے تذلیل کرے۔

۴۔ اور آخر میں آپ محبوبہ سے بے نیاز ہو جائیں۔ زخم مندمل ہو جائے' یوں جیسے کبھی لگا ہی نہ تھا۔

مفتی کے نزدیک کردار کی تکمیل کے لیے ان چاروں کیفیتوں سے گزرنا ضروری ہے۔

محبت میں ممتاز مفتی بہت کمینہ ہے۔ فراخ دل نہیں۔ اس کی محبت میں ملکیت کا جذبہ شامل ہوتا ہے۔ اپنی انا کی وجہ سے وہ حوالگی اور سپردگی کے عمل سے محروم ہے' اس لیے وہ شک و شبہات کا شکار رہتا ہے۔ محبوب کے نقاب کے تار گنتا رہتا ہے۔ شاید محبت کرنے سے اس کا مقصد یہی ہو کہ محبوب کے نقاب کے ادھڑے ہوئے تار گنے' دل پر چوٹ لگتی رہے' تڑپن جاری رہے۔

سیانے کہتے ہیں کہ درد حد سے بڑھ جائے تو لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید مفتی شک و شبہات اس لیے پالتا ہے کہ درد کی لذت حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

مفتی کو تفاخر سے شدید نفرت ہے سیلف اسرٹیو Self Assertive خود پسند لوگوں سے وہ الرجک ہے۔ اجلے لوگوں سے حتی الوسع دور رہتا ہے۔ کہتا ہے: اتنے اجلے نہ بنو کہ دوسرے میلے میلے نظر آئیں۔ اپنا گھونسلا اتنا اونچا نہ بناؤ کہ دوسرے بالشتیے نظر آئیں۔

مفتی کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر قدرت اللہ شہاب نے ڈالا۔ اسے سنڈی سے تتلی بنا دیا اور حیرت کی بات ہے کہ تیس سال کی رفاقت میں قدرت اللہ نے اسے کبھی نصیحت نہیں کی۔ کبھی نہیں کہا کہ یہ مت کرو۔

قدرت اللہ سے ملنے سے پہلے وہ کالی بولی رات تھا۔ اس سے ملنے کے بعد بھور سمے بن گیا!

بڑی

ان دنوں میں حاجت مندوں کو ہومیو دوائیاں دیا کرتا تھا۔

پریکٹس نہیں کرتا تھا۔ مفت دوا دیتا تھا اور جب دوا دیتا تو زیر لب کہتا۔ یا اللہ میں نے تو اپنا کام کر دیا اب تو جان اور تیرا کام۔

ایک روز دو لڑکیاں آ گئیں۔ ایک دبلی پتلی . سانولی تھی' دوسری بھرے جسم کی گوری۔ دونوں ہی ڈیپریشن کی ماری ہوئی تھیں۔ میں نے دوا دے دی اور وہ چلی گئیں۔

دس بارہ روز کے بعد پتلی دبلی پھر آ گئی۔ وہ کالج میں لیکچرار تھی۔ میں نے اس سے کہا' مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا تو اس پر روشنی ڈال سکتی ہے۔

بولی' کس بات پر۔

میں نے کہا' آج کل ہر جوان لڑکی کو ڈیپریشن کے دورے پڑتے ہیں۔ جن کے حالات ناساز گار ہیں انہیں بھی۔ جن کے حالات سازگار ہیں۔ انہیں بھی۔ ایسا کیوں ہے۔

کہنے لگی' ہاں۔ یہ سچ ہے' لیکن ایسا کیوں ہے' مجھے معلوم نہیں' جب وہ جانے لگی تو میں نے برسبیل تذکرہ پوچھا۔ وہ تیری ساتھی نہیں آئی۔ کیا نام ہے اس کا۔

صبیحہ' وہ بولی' وہ شہزادی ہے۔ من کی موجن ہے۔ جدھر موڈ انگلی لگا کر لے گیا' چلی گئی۔

یہ سن کر میرے دل میں اک گرہ سی لگ گئی۔ صبیحہ کے خلاف۔

دوا نہیں دعا

کچھ دنوں کے بعد صبیحہ آ گئی۔ کہنے لگی' میری ماں آئی ہوئی ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

بیمار ہے کیا' میں نے پوچھا۔

نہیں تو' وہ بولی۔

پھر مجھ سے ملنا کیوں چاہتی ہے۔

بولی' مجھے معلوم نہیں۔ اماں کہتی تھی ان سے وقت لے آ۔

میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا' لڑکی میں کیا یہاں کا ڈپٹی کمشنر ہوں کہ ملنے کے لیے وقت لینا پڑتا ہے۔

وہ بڑی سنجیدگی سے بولی' اماں اکیلے میں ملنا چاہتی ہے۔

ان دنوں میرے پاس لڑکیاں اور خواتین اکثر آیا کرتی تھیں' مجھے پتہ چل گیا تھا کہ مرد کی نسبت عورت زیادہ بیمار پڑتی ہے۔ مرد بیمار ہو جائے تو وہ بے کار ہو کر پڑ جاتا ہے۔ عورت بیمار ہونے کے باوجود کام کاج میں لگی رہتی ہے۔ قدرت نے اسے ورکنگ صحت عطا کر رکھی ہے۔ وہ بیماری کے ساتھ جینے کی ہمت رکھتی ہے۔

لیکن یہ اکیلے میں ملنے کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

میں نے کہا' آپ کہاں رہتی ہیں۔

بولی' آب پارہ کے ایک کوارٹر میں۔ اس نے پورا پتہ دے دیا۔

میں نے کہا' آپ کالج سے کب فارغ ہوتی ہیں۔

بولی میں کالج نہیں جاتی۔

بہرحال کوئی دفتر تو ہو گا۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ بولی میں بے کار ہوں۔

اچھا' میں نے کہا' میں اکثر آب پارے جاتا رہتا ہوں۔ آج یا کل آپ کے گھر آ جاؤں گا۔

اس روز میں نے غور سے صبیحہ کو دیکھا۔ وہ کم گو تھی۔ لو بلڈ پریشر تھی۔ ٹھہری ہوئی تھی۔ باوقار تھی۔

وہ آب پارے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ کمرے میں کوئی ساز و سامان نہ تھا۔ صرف ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے میں چند برتن پڑے ہوئے تھے۔

گھر میں تین چار لڑکیاں تھیں اور ایک ماں۔

ماں کشمیرن تھی۔ بجھی بجھی سی۔ ممتا کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ لڑکیاں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

ماں بولی' مفتی جی ہمیں دوا کی ضرورت نہیں ہم تو دعا کی محتاج ہیں۔ ہمیں کسی صاحب دعا کا پتہ بتائیے یہ کہہ کر وہ رک گئی۔

پھر بولی' سنا ہے شہاب صاحب صاحب دعا ہیں اور وہ آپ کے دوست ہیں۔ مجھے ان کے پاس لے چلئے میری سفارش کر دیجیے۔

یہ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ یہ کیا اکیلے میں کہنے کی بات تھی۔ میرے پاس تو بہت سے سائل آیا کرتے تھے۔ کہتے ہمیں شہاب صاحب سے ملوا دیجیے۔

میں شہاب کو فون کیا کرتا تھا کہ شہاب صاحب اب تو آپ کی پریکٹس چل نکلی ہے۔ اب تو فیس لگا دیجیے چلیے آپ کو گوارا نہیں ہے تو مجھے ہی اجازت دیجیے کہ میں ملانے کی فیس وصول کر لیا کروں۔

اس پر شہاب مسکرا دیتا۔

ایک دن میں نے یہی بات دہرائی تو سنجیدگی سے بولا' اگر واقعی آپ کو ضرورت ہے تو لگا لیجیے فیس۔

میں نے کہا' شہاب صاحب یہی تو مشکل ہے کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ اس نے میری ہر ضرورت پوری کر رکھی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ صرف میری ضروریات ہی پوری نہیں کر رہا بلکہ عیاشیاں کروا رہا ہے۔ یہ جو میں فیس لگانے کے لیے کہتا ہوں' شہاب صاحب' طمع بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔

رزق بند

آب پارہ سے واپس آ کر میں نے شہاب کو فون کیا' میں نے کہا' ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

پوچھا' کون ہے۔

میں نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ میں نے کہا' آپ وقت دے دیں۔ میں اسے آپ کے پاس لے آؤں گا۔

بولا' اچھا کل بتاؤں گا۔

قدرت اللہ کی عجیب عادت تھی کوئی ایسا مسئلہ پیش آتا تو وہ اس کے بارے میں فوری فیصلہ نہیں کرتا تھا۔ بات کل پر ٹال دیتا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بات ریفر کیے بغیر فیصلہ نہیں کرتا تھا۔ پتہ نہیں ریفر کسے کرتا تھا۔

اگلے روز وہ خود میرے گھر آیا۔ کہنے لگا' آپ فارغ ہیں تو میرے ساتھ چلئے۔ مجھے آب پارے جانا ہے۔ کام ہے ایک۔ واپسی پر اس خاتون سے بھی مل لیں گے۔

میں نے کہا' آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ میں اس خاتون کو یہیں لے آتا ہوں۔

بولا' نہیں وہیں مل لیں گے۔

ہم خاتون کے گھر پہنچے تو گھر والے حیران رہ گئے۔

شہاب چٹائی پر بیٹھ گیا۔ میں باہر نکل آیا۔ تاکہ خاتون اکیلے میں بات کر سکے۔

واپسی پر میں نے قدرت سے پوچھا کہ کیا کیس ہے۔

بولا' اس کی ماں کہتی ہے رزق بند ہے۔ افریقہ میں کسی خاتون نے جادو کر دیا ہے۔ صبیحہ ایم اے انگلش ہے' لیکن ایک سال سے نوکری کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ نوکری

نہیں مل رہی۔ نو دس بھائی بہنیں ہیں۔ باپ بے تعلق ہوا بیٹھا ہے۔ گھر میں کمانے والی صرف صبیحہ تھی۔

خدا حافظ

آٹھ دس دن کے بعد صبیحہ پھر آ گئی۔ کہنے لگی' شہاب نے کہا تھا کوئی بات ہو تو مفتی صاحب کے ذریعے مجھے خبر کر دینا۔

میں نے کہا' پھر۔

بولی' شہاب صاحب نے مجھے کچھ پڑھنے کو دیا تھا' اماں پوچھتی ہے۔ کیا میں بھی پڑھوں۔

میں نے کہا' ٹھیک ہے میں پوچھ کر بتا دوں گا۔

بولی ہم وہ فلیٹ چھوڑ رہے ہیں۔

کیوں' میں نے پوچھا۔

بولی' افورڈ نہیں کر سکتے۔

پھر کہاں جاؤ گے۔

کہنے لگی' ماں مندھرا چلی جائے گی۔ وہاں ہمارا چھوٹا سا گھر ہے۔ ابا کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ میری چھوٹی بہن یونیورسٹی میں فورتھ ایئر کی طالبہ ہے۔ ہوسٹل میں اسے ایک کمرا ملا ہوا ہے۔ میں اس کے پاس جا رہوں گی۔ اگر وہاں مجھے رہنے کی اجازت مل گئی تو۔

ورنہ' میں نے پوچھا۔

ورنہ یہاں کسی لڑکیوں کے ہاسٹل میں جگہ ڈھونڈھوں گی۔

فلیٹ کب چھوڑ رہی ہیں آپ۔

پرسوں' وہ بولی' شام تک۔

میں نے قدرت سے بات کی۔

اس نے کہا' ہاں ماں بھی پڑھے۔ فجر کی نماز کے بعد' ناغہ نہ ہو۔ انہیں یہ اطلاع آج ہی دے دیں۔ میں اسی روز اطلاع دینے چلا گیا۔

جب میں واپس آ رہا تھا تو صبیحہ نے فلیٹ کے پردے سے جھانک کر کہا۔ خدا حافظ۔

وہ خدا حافظ گویا بندوق کی گولی کی طرح میرے دل میں اتر گیا۔ ساری رات مجھ پر خدا حافظ کی چاند ماری ہوتی رہی۔

اگلے دن میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کتاب کھولتا تو سطروں کے پردے سے جھانک کر کوئی کہتی خدا حافظ۔ لکھنے بیٹھتا تو خیالات منتشر ہو جاتے۔ ایسے لگتا جیسے میں خدا ہوں اور صبیحہ نے خود کو میری حفاظت میں دے دیا ہے۔

چاند ماری

دو ایک دن تو میں اس ذہنی کیفیت سے لڑتا رہا' پھر ہتھیار ڈال دیے۔ میں نے اشفاق حسین کو فون کیا۔ میں نے کہا' یار تو فارغ ہے کیا۔

اس نے پوچھا' کیا بات ہے۔

میں نے کہا' میں ایک لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔

بولا' پھر۔

میں نے کہا' تو مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے چل۔

بولا کہاں۔

میں نے کہا' یونیورسٹی میں۔

یونیورسٹی میں پہنچ کر ہم نے اتا پتا لگایا۔ صبیحہ کو تلاش کیا اور پھر وہیں یونیورسٹی کے علاقے میں ہم تینوں ایک چھپڑ کے کنارے جا بیٹھے۔ اور کھڑے پانی پر کنکریاں چلاتے رہے۔

اشفاق حسین صبیحہ سے باتیں کرتا رہا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔

صبیحہ کے خدوخال موٹے تھے۔ جسم بھاری تھا۔ وہ نسائی نخرے سے سرا سر خالی تھی۔ نمائشی نہ تھی۔ توجہ طلبی نہ تھی۔

ترت پھرت نہ تھی۔ اس قدر بے جھجک بات کرتی تھی جیسے لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہو۔ اس کی شخصیت کی تمام تر مٹھاس اس کے طبعی ٹھہراؤ اور بے نیازی کی وجہ سے تھی۔

ہم اس چھپڑ کے کنارے ایک ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے رہے۔ وداع ہوتے وقت اس نے خدا حافظ کی ایک اور گولی داغی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو اشفاق حسین کہنے لگا' اچھی لڑکی ہے مگر بے

کار ہے۔

بے کار کیوں' میں نے پوچھا۔

بولا۔ تم اس کے ساتھ ایک مہینہ چھپڑ پر بیٹھے رہو۔ نہ یہ خود آگے بڑھے گی نہ تمہیں آگے بڑھنے دے گی۔

دوسرے تیسرے روز میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے پھر اشفاق حسین کو فون کیا اور ہم تینوں پھر چھپڑ کے کنارے بیٹھے کنکریاں چلاتے رہے۔

اشفاق حسین نے کہا' یار کسی روز اسے مری لے چلیں وہاں کافی پئیں' کون کھائیں' تکے کباب اڑائیں۔

تم ہوٹل کا ایک کمرہ ریزرو کرا لینا اور میں واپس آ جاؤں گا۔

نہیں' میں نے جواب دیا' یہ مقصود نہیں۔

کہنے لگا' تو مقصود کیا ہے کیا باقی عمر چھپڑ کے کنارے بیٹھ کر کنکریاں چلاتے رہو گے۔

میں نے کہا' مجھے نہیں پتہ کیا مقصود ہے۔ مجھے آوازیں آتی رہتی ہیں۔ خدا حافظ کی چاند ماری ہوتی رہتی ہے۔

وہ بولا' یار میرے مطب میں بیسیوں خواتین آتی ہیں۔ ان میں بڑی بڑی حسینائیں بھی ہوتی ہیں۔ وہ جاتے ہوئے خدا حافظ بھی کہتی ہیں۔ ان کے جانے کے بعد مجھے تو آوازیں نہیں آتیں۔ چاند ماری نہیں ہوتی۔ الٹا تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔

دو ایک بار اشفاق حسین مصروف تھا' اس لیے میں اکیلا ہی یونیورسٹی چلا گیا۔ ہم دونوں ان کھوکھوں کے پاس جا بیٹھے جہاں چائے کھانا اور ٹٹ بٹ بکتے تھے۔

لڑکی نہیں لڑکا

وہ ایک کھلا میدان تھا جس میں کرسیاں اور میز رکھے ہوئے تھے۔ نوجوان کھا رہے تھے اور ہلڑ مچا رہے تھے۔

میں جھجک سے چھلک رہا تھا کہ یہ لڑکے کیا کہیں گے کہ اس لڑکی نے کیسا بائے فرینڈ بنا رکھا ہے۔ صبیحہ کو اس بات کا قطعی احساس نہ تھا۔ وہ ماحول سے بے پروا اور بے نیاز دال چاول کھاتی

رہی جیسے وہ لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہو۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے کہا' دیکھ اللہ کے واسطے مجھے خدا حافظ نہ کہنا۔

وہ بولی' آج ہی تو خدا حافظ کہنے کا موقعہ ہے۔ پہلے تو رسما" کہا کرتی تھی۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا۔

کہنے لگی' میں یہاں سے جا رہی ہوں۔

کیوں۔

بولی وہ مجھے یہاں رہنے کی اجازت نہیں دے رہے۔

کہاں جاؤ گی۔

پتہ نہیں' وہ بولی۔

اس نے یہ بات ایسی بے نیازی سے کہی کہ میں حیرت زدہ رہ گیا۔

مجھے کیسے پتہ چلے گا' میں نے پوچھا۔

بولی' میں فون کر دوں گی۔

چار ایک دن میں فون کے سرہانے بیٹھا رہا۔

کئی ایک بار میرے دل میں خیال آیا کہ جا کر قدرت اللہ سے بات کروں۔ اس سے پوچھوں یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی سال کے بوڑھے پر یہ کیسی بپتا آن پڑی ہے' لیکن میری ہمت نہ پڑتی تھی' حالانکہ مجھ پر کوئی احساس گناہ طاری نہ تھا۔ میں خواہش کے وجہ سے زچ نہیں ہو رہا تھا۔ وصال کی ہوس نہ تھی۔ پھر بھی میں قدرت سے بات کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں قدرت سے بات کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

پھر اتفاقاً قدرت کا فون آ گیا۔ کہنے لگا' آپ فارغ ہوں تو ذرا یہاں آ جائیں۔

میں نے کہا' شہاب جی میں فارغ نہیں ہوں۔ ایک لڑکی کے فون کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ چار دن ہو گئے ہیں۔

کوئی عزیزہ ہے کیا' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' نہیں وہی لڑکی ہے جس کی ماں سے آپ آپارہ میں ملنے گئے تھے۔

اس نے کہا' خیر جب بھی آپ فارغ ہوں ——————

میں نے کہا' شہاب صاحب دعا کریں کہ میں فارغ ہو جاؤں۔

ہار اور جیت

اسی شام میں قدرت اللہ کے گھر چلا گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سے ساری بات کروں اور کہوں کہ مجھے اس پنجرے سے رہائی دلا دے۔

قدرت نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا' اس لڑکی کا ٹیلی فون آیا تھا کیا۔

نہیں' میں نے سر نفی میں ہلا دیا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا' بولا' دیکھئے' اس میں دونوں کا بھلا ہے۔ آپ کا بھی۔ اس لڑکی کا بھی۔ آپ اسے سہارا دیں۔ اس کی مدد کریں۔ اس کا دکھ بٹائیں۔ اس پر احسان نہ دھریں' بلکہ خود کو اس کا احساس مند محسوس کریں' اس میں صرف دو خطرے ہیں۔ ایک تو خواہش یا ہوس پنجہ نہ مارے' وہ تو انشاء اللہ نہیں ہو گا۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ آپ اسے جیت لینے کی کوشش کریں گے۔

محبت جیت نہیں' ہار ہوتی ہے۔ ہار مان لو۔ خود کو حوالے کر دو۔ ہتھیار ڈال دو۔

میں حیرت سے قدرت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں کیا کہنے آیا تھا اور یہ کیا کہہ رہا ہے۔

ساری رات میں سوچتا رہا۔ مجھے شک پڑ رہا تھا کہ یہ خدا حافظ کی گولی کہیں قدرت اللہ نے تو نہیں چلائی تھی۔ کہیں وہ مجھے ہار جانے کی تعلیم تو نہیں دے رہا تھا۔ آخر اس کا کیا مطلب تھا کہ اس میں دونوں کا بھلا ہے۔ اس کا بھی میرا بھی۔ کیا یہ اللہ والے لوگ اتنے طاقت ور ہوتے ہیں کہ دوسرے کے ذہن کو تہس نہس کر کے رکھ دیں۔

اگلے روز صبیحہ کا فون آگیا۔ کہنے لگی' ایف سیون میں مجھے ایک چھوٹا سا کمرا مل گیا ہے۔

وہ کمرا ایک رستے بستے گھر میں واقعہ تھا۔ ماں باپ ادھیڑ عمر کے تھے۔ دونوں بڑے محنتی اور جفاکش تھے۔ بچے نوجوان تھے۔ صبح سے دو بجے تک صبیحہ نوکری کی تلاش میں بسوں پر اور پیدل جوتے چٹخاتی۔ دو بجے میں پہنچ جاتا۔ مجرموں کی طرح دروازہ بجاتا۔

دو گھنٹے ہم اس چھوٹے سے کمرے میں چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ کمرے کا دروازہ ہم التزاماً کھلا رکھتے۔ وہ مجھے بتاتی کہ دن بھر وہ کہاں کہاں نوکری کی تلاش میں گھومتی رہی۔

چند ہی دنوں میں صبیحہ نے گھر والوں کو رام کر لیا۔ وہ ان کے باورچی خانے میں جا کر برتن مانجھ دیتی۔ کمروں کی صفائی کر دیتی۔ بچوں کے ہوم ورک میں مدد کر دیتی۔

چند دنوں میں وہ اس گھر کی فرد بن گئی۔

اس کمرے میں صبیحہ صرف دو مہینے رہی' پھر ایک مکان کا پورشن مل گیا۔ یہ پورشن مکان سے بالکل الگ تھا۔

کردار کے لحاظ سے جتنا میں چھوٹا تھا اتنی ہی وہ بڑی تھی۔

پہلے چند دنوں میں ہی اس نے بات کھول دی تھی۔

کہنے لگی۔ آپ میں اتنی شدت کیوں ہے۔

میں نے کہا' شدت نہیں خلوص ہے۔

نہیں' اس نے جواب دیا' خلوص مدھم ہوتا ہے۔ کہنے لگی' پتہ نہیں کیوں مجھے ایسے لوگ پسند نہیں' جن میں شدت ہو۔ مجھے ٹھنڈے میٹھے لوگ اچھے لگتے ہیں۔

پھر اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ کہنے لگی' میرا باپ ایک معمولی سی ملازمت کرتا تھا۔ پھر وہ ریٹائر ہو گیا۔ اور اس نے ایک معمولی سی دکان کھول لی۔

ہم نو بھائی بہن ہیں۔ لگتا ہے میرے باپ کا بچے پیدا کرنے کے علاوہ کوئی شغل نہ تھا۔

آئیڈیل

بہرحال باپ میرا آئیڈیل تھا اور میں اس کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اس کے وارے نیارے لیتی رہتی۔ بچپن سے جوانی تک میری عادتیں لڑکوں جیسی تھیں۔ لڑکوں کے کھیل کھیلتی۔ درختوں پر چڑھتی۔ پتنگ اڑاتی۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے دسویں پاس کر لی تو باپ نے مجھے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا دکان کی آمدنی اتنی قلیل ہے کہ مشکل سے ہانڈی روٹی چل سکتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم دینا میں افورڈ نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا' بابا' صرف میری فیسیں دے دیجیے باقی اخراجات پورے کرنے کے لیے میں ٹیوشن کر لوں گی۔

باپ نے انکار کر دیا۔

پھر بھی مجھے باپ سے ہمدردی تھی۔ میں نے سوچا کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لوں تاکہ گھر چلانے میں ابا کی مدد کر سکوں۔

پھر اتفاق سے مجھے اپنے باپ کے بینک بیلنس کا پتہ چل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جسے میں دیوتا سمجھ رہی تھی۔ وہ ایک خود غرض اور بے حس شخص تھا۔ آئیڈیل چکنا چور ہو گیا۔ ساتھ میرے بھی پرخچے اڑ گئے۔ ہفتوں بیمار پڑی رہی۔ پھر میرے دل میں ایک عزم جاگا کہ میں اپنی تعلیم از خود حاصل کروں گی۔

چھ سال قدم قدم پر مصیبتیں آئیں اور میں نے انھیں جھیل لیا۔

ایم اے کرنے کے بعد میں گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہو گئی۔ میں اپنے سارے بہن بھائیوں کو اپنے گھر لے آئی اور سب کو تعلیمی اداروں میں داخل کرا دیا۔ ابا یہ دیکھ کر بالکل ہی کنارہ کش ہو گئے۔ بھائی بہنوں نے بے حس ہو کر ناجائز دباؤ ڈال دیے۔ وہ گٹھڑی اتنی بوجھل ہو گئی کہ میری کمر ٹوٹ گئی۔

اتنا قرض چڑھ گیا کہ اتارنا ممکن نہ تھا۔

میں دیوانی ہو گئی۔ ملازمت سے استعفٰے دے کر افریقہ میں لیکچرار کی ایک نوکری قبول کر لی۔

افریقی جادو

افریقہ میں میں ایک مکان میں تن تنہا رہتی تھی۔ خوف تو آتا تھا' لیکن مجبوری تھی۔

پھر ایک روز میرے گھر ایک پاکستانی جوڑا آ گیا۔ ہم وطنوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ بھی وہیں ملازمت کرتے تھے۔

یوں ہمارا آنا جانا ملنا ملانا ہو گیا۔ میاں عمر رسیدہ تھا۔ بیوی جوان تھی۔ اور سخت طبیعت کی تھی۔ وہ میاں کو یوں چلاتی تھی جیسے تانگے والا گھوڑے کو چلاتا ہے۔

پھر بدقسمتی سے اس خاتون کو شک پڑ گیا کہ اس کا میاں میری طرف متوجہ ہو گیا ہے۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کی غلط فہمی دور ہو جائے' لیکن اس کا شک بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ ایک روز وہ آ کر مجھ پر برس پڑی۔ ایسی ایسی غلیظ باتیں کیں' دھونس دی کہ میں خوف زدہ

ہو گئی۔

پھر رات کے وقت میرے گھر سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسے لگتا جیسے کوئی ٹہل رہا ہو۔ دروازے آپ ہی آپ کھل جاتے۔ کوئی کہتا۔ بھاگ جاؤ ورنہ ——————

میں نے ایک افریقی بڑھیا سے کہا' بی بی اگر تو میرے گھر میں میرے ساتھ آ رہے تو میں تجھے الگ کمرا بھی دوں گی اور تنخواہ بھی۔

وہ عورت صرف ایک رات میرے گھر میں رہی اگلے روز ہاتھ جوڑ کر بولی' نہ بی بی اس گھر پر تو کسی نے کالا جادو کروا دیا ہے۔ یہ بد روحیں تجھے چھوڑیں گی نہیں۔

اس پر میں اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ ٹرم ختم کیے بغیر نوکری چھوڑ کر پاکستان واپس آ گئی۔

یہاں آئی تو اماں مجھے دو ایک عاملوں کے پاس لے گئی تھی' وہ کہتے ہیں اس لڑکی کا رزق بند ہے۔ نوکری نہیں ملے گی' شادی نہیں ہو گی۔

دیوانگی

اس کی کہانی سن کر مجھ پر اک پاگل پن سوار ہوگیا۔ نوکری کی تلاش میں سارا سارا دن اسے اپنے سکوٹر پر بٹھا کر میں راولپنڈی اور اسلام آباد کے دفتروں' پرائیویٹ کمپنیوں' فارن ایمبیسیوں کے چکر کاٹتا رہا۔ لوگ مجھے دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ اس بڈھے کھوسٹ کو کیا ہو گیا ہے کہ ایک جوان لڑکی کو گھماتا پھرتا ہے۔

میرے گھر والے اس بات پر نالاں تھے۔ میں نے اپنی بیوی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ ناجائز تعلق نہیں ہے۔ لیکن اسے یقین نہ آیا۔ وہ سچی تھی اسے یہ شکایت تھی کہ اگر تعلق نہیں تو اتنی توجہ کیوں۔ میری بیٹیاں منہ سے کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن وہ مجھ پر ناخوش تھیں۔ میری بہو نے اعلانیہ صبیحہ سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بھری محفل میں اس کی بے عزتی کر دیتی تھی۔

پھر مجھے معلوم ہوا کہ میرے بیٹے کے دفتر میں جگہیں خالی ہیں۔ میرا بیٹا دفتر کا سربراہ تھا۔ میں نے اپنے بیٹے سے ہاتھ جوڑ کر کہا' اللہ کے واسطے صبیحہ کو کوئی جگہ دے دو۔

عکسی نے کہا' میں لڑکی سے انٹرویو کروں گا۔

انٹرویو کے بعد۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر حقارت کی جھلک تھی۔ بولا' بابا ایسی لٹی پٹی لڑکی کو لے کر میں اپنے دفتر کے ماحول کو خراب نہیں کر سکتا۔ البتہ اسے کانٹریکٹ پر کام دے سکتا ہوں۔

عکسی کی بات سن کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ میرا خیال تھا گھر میں صرف ایک فرد ایسا ہے جس کو مجھ پر اعتماد ہے۔

پھر میری چار یاری آ گئی۔

وہ سب میرا مذاق اڑانے لگے۔

عمر بولا' مفتی تو پاگل ہو گیا ہے کیا۔

ہاں' میں نے جواب دیا۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔

اس عمر میں ایک گرل فرینڈ کو اعلانیہ سکوٹر پر لیے پھرتا ہے تو تجھے بدنامی کا ڈر نہیں ہے کیا' مسعود نے کہا۔ نہیں' میں نے جواب دیا' مجھے بدنامی کا ڈر نہیں ہے۔

ارے' اعظمی بولا' تجھے شرم نہیں آتی۔

نہیں آتی' میں نے کہا۔

اگر کسی نے شہاب صاحب کو بتا دیا تو' عماد نے کہا

شہاب صاحب' کون شہاب صاحب' میں نے جواب دیا۔

اونہوں' بے کار ہے وہ سب چلانے لگے۔ لگتا ہے۔ یہ مجذوب ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ شکر پڑیاں کی پہاڑیوں پر ملاقات ہو گی۔

اس اثناء میں ورلڈ بینک کی ایک فرانسیسی خاتون اسلام آباد میں ریسرچ کا کام کرنے کے لیے آ گئی۔ اسے ورکرز کی ضرورت تھی۔

صبیحہ کا کام دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ فرانسیسی خاتون نے صبیحہ کو اپنا نائب بنا لیا۔ وہ خاتون دو ایک مرتبہ مجھ سے بھی ملی۔ اس کی آمد پر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا۔ الٹا میں چڑ چڑ دانے بھوننے لگا۔

دراصل میں صبیحہ کا خدا بن بیٹھا تھا۔ میں اسے اپنی مخلوق سمجھنے لگا تھا۔ میں اس پر احکام چلاتا تھا۔

یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ اس سے نہ ملو۔ ایسے نہ رہو۔ ویسے نہ رہو۔

صبیحہ طبعاً" اپنی مرضی کی مالک تھی۔ وہ بڑی خود دار تھی۔ وہ میرے رویے پر خوش نہ تھی بلکہ وہ مجھ سے سخت تنگ آ چکی تھی۔ فرانسیسی خاتون نے کہا یہ تیرا دوست تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔

وہ سچ کہتی تھی میں پاگل ہو گیا تھا۔ تین سال یہ پاگل پن میرے سر پر سوار رہا۔ میری دو خواہشات تھیں' ایک یہ کہ اس کا رزق مکمل جائے' دوسری یہ کہ اس کی شادی ہو جائے۔ میرے طرز عمل میں شدت کم ہونے کی بجائے دو چند ہو چکی تھی۔

نیا جنم

ایک روز بانو' شہاب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی۔ اب بس کیجیے شہاب بھائی۔ مفتی کی تو ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔

شہاب نے کہا' مجھے بھی ترس آنے لگا ہے۔

ان دنوں فرانسیسی خاتون کی سفارش پر ورلڈ بینک نے افریقہ میں تحقیق کرنے کے لیے ایک گروپ میں صبیحہ کا نام بھی شامل کر لیا تھا۔ اور وہ لندن چلی گئی تھی۔

مخلوق کے جانے کے بعد خدا اکیلا رہ گیا تھا۔ یہ تنہائی اس قدر تکلیف دہ تھی کہ میں قدرت کے پاس چلا گیا۔ میں نے کہا" شہاب صاحب' اللہ کے واسطے مجھے اس دیوانگی کے چکر سے نکال لیجیے۔

قدرت بہت افسردہ تھا۔ خاموش تھا۔ میں نے دو تین بار اپنی درخواست دہرائی وہ بولا' مفتی صاحب آپ نے ایک بہت اچھا موقعہ ضائع کر دیا۔

مجھے اس کا احساس ہے شہاب صاحب' میں نے جواب دیا۔

احساس ہے تو ایسا کیوں کیا۔

شہاب صاحب میں کوّا ہوں۔ ازلی طور پر کوّا ہوں' کبوتر نہیں بن سکتا۔ احساس کے باوجود کوشش کے باوجود نہیں بن سکتا۔ مجھے پتہ ہے کہ میں ہار نہ مان سکا۔ اسے جیت لینے کی خواہش جنون بن گئی۔ بے شک میں گردن زدنی ہوں' لیکن اللہ کے واسطے مجھے بچا لیجیے۔

قدرت دیر تک خاموش رہا' پھر بولا۔ اللہ کی خدمت میں منتیں کیجیے کہ وہ آپ کو اس جنون سے بچالے۔

میں نے کہا گیند آپ نے لڑھکایا تھا' کیا اب آپ اسے روک نہیں سکتے۔

یہی آپ کی غلط فہمی ہے۔ وہ بولا' گیند اسی نے لڑھکایا تھا وہی روک سکتا ہے۔

کیا آپ میری مدد نہیں کرسکتے' میں نے پوچھا۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ بولا' آپ کو خود کچھ کرنا پڑے گا۔

کیا کرنا پڑے گا۔

اس کی منت کرنی پڑے گی' ترلا کرنا پڑے گا۔ توبہ کرنی پڑے گی

کس طرح' میں نے پوچھا۔

کلام پڑھنی پڑے گی۔ یا اللہ میرے ذہن سے غیر اللہ کو نکال دے۔

میں نے کہا' شہاب صاحب میں ایک ناپاک آدمی ہوں۔ مجھ سے وظیفہ نہیں پڑھا جائے گا۔

مجبوری ہے' وہ بولا۔

دو دن میں سوچتا رہا۔ پھر میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ میں نے کہا شہاب صاحب آپ جو فرمائیں گے میں کروں گا اللہ کے واسطے مجھے بچالیجیے۔

دو مہینے میں بلاناغہ خصوصی اوقات پر خصوصی مقام پر بیٹھ کر اللہ کے حضور منت سماجت کرتا رہا کہ اے اللہ میرے ذہن سے غیر اللہ نکال دے۔

دو مہینے کے بعد ایک روز بیٹھے بیٹھے میں نے محسوس کیا جیسے میرے سر کا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں ہلکا پھلکا ہو گیا جیسے میں نے نیا جنم لے لیا ہو۔ میں نے قدرت کو فون کیا۔ میں نے کہا مبارک ہو۔

کہنے لگا' کس بات کی مبارک۔

میری رہی برتھ کی مبارک شہاب صاحب میں آزاد ہو گیا ہوں۔

بولا' اب ایک بات کا وعدہ کیجیے۔ اب خدمت کرنی ہو گی۔ جہاں تک ہو سکے۔ احسان کئے بغیر' جتائے بغیر عمر بھر' الٹا خود کو اس کا احسان مند سمجھتا ہو گا۔

اٹھاون واں باب

وفات

آخری ایام میں قدرت اللہ کے معمولات میں شہاب نامہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

ویسے تو قدرت عرصہ دراز سے شہاب نامہ لکھ رہا تھا۔ وہ شہاب نامے کے کئی ایک باب ادبی محفلوں میں پڑھ چکا تھا۔ خصوصاً سلسلہ میں۔

سلسلہ اور رابطہ

سلسلہ اسلام آباد کی ایک ادبی تنظیم تھی جو ادا جعفری نے شروع کی تھی۔ اس تنظیم میں زیادہ تر ارکان سول افسر اور ان کی بیگمات تھیں۔ اس تنظیم کا مقصد عدیم الفرصت اہلکاروں کو ادبی تخلیقات کی جانب مائل کرنا تھا۔

ایک روز قدرت نے مجھ سے کہا اگر آپ فارغ ہوں تو چلیے ایک ادبی محفل میں ہو آئیں۔

کہاں ہو رہی ہے‘ میں نے پوچھا۔

ادا جعفری کے گھر۔

وہ ادا۔ جو ساز ڈھونڈتی رہی‘ میں نے پوچھا۔

قدرت نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

مجھے ادا سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

سرسری تعارف کے بعد ادا نے ایک رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا۔ کہنے لگی اس پر دستخط کر دیجیے۔ میں نے پوچھے بغیر دستخط کر دیئے۔ یوں ان جانے میں' میں سلسلے کا رکن بن گیا۔

سلسلے کے اجلاس میں ہم نے قدرت اللہ شہاب نامے کے چند ایک باب سنے تھے۔

نورالحسن جعفری کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اسلام آباد چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ ادا کے جانے کے بعد جو سلسلے کی روح رواں تھی' یہ تنظیم زیادہ دیر نہ چل سکی۔

پھر ہم نے سلسلے کے خطوط پر نوجوان لکھنے والوں کی ایک تنظیم بنائی۔ جس میں سنیئر جونیئر کا امتیاز نہ تھا۔ کوئی عہدے دار نہ تھا۔ صرف منشایاد رابطہ افسر تھا۔ نوجوان ادیبوں نے تجویز پیش کی کہ پہلا اجلاس شہاب نامے کے باب سے شروع ہو۔

قدرت اللہ کو بطور مہمان بلایا گیا۔ اس نے شہاب نامے کا باب پڑھا جب رابطہ کے اراکین کو پتہ چلا کہ قدرت اللہ رکن نہیں ہے' تو انہوں نے بیک آواز شور مچا دیا کہ قدرت کو رکن بنایا جائے۔ ارکان نے بہت اصرار کیا تو قدرت اللہ نے رکن بننا تسلیم کر لیا۔ پھر رابطہ کو محفلوں میں شہاب نامے کے چند باب پڑھے گئے۔

اس کے علاوہ کبھی کبھی قدرت مجھے فون کیا کرتا۔ کہتا' اگر آپ فارغ ہیں تو آ جائیے۔ میں آپ کو شہاب نامے کا نیا باب سنانا چاہتا ہوں۔

شہاب نامہ

آخری ایام میں دفعتاً" قدرت اللہ شہاب نامے کی اشاعت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پہلے مسطر اور سائز طے کرنے میں لگا رہا۔ اس کے بعد اس نے عکسی سے کہا کہ کوئی کاتب تلاش کرے جو باقاعدگی سے کتابت شروع کر دے۔

عکسی نے ایک کاتب اس کام پر لگا دیا۔ کاتب ہر جمعرات کو آتا۔ کتابت شدہ صفحات دے جاتا اور مسودے کا کچھ حصہ کتابت کے لیے لے جاتا۔

ایک روز میں نے قدرت سے کہا' اگر آپ خود کتاب کی اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔

وجہ' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا آپ اشاعت تو کرلیں گے مگر ڈسٹری بیوشن نہیں کر سکیں گے۔ یوں کتاب کی سرکولیشن نہیں ہو گی۔ اس لیے لازم ہے کہ آپ اسے کسی ایسے ناشر کو دیں جو ڈسٹری بیوشن کا ماہر ہو۔

قدرت اللہ اور میرے درمیان اس بات پر پرانا جھگڑا چلا آتا تھا۔ اس کے ایک دوست کا بھائی قدرت اللہ کی کتابیں چھاپتا رہتا تھا۔ نہ وہ قدرت اللہ سے اجازت لیتا نہ اسے اطلاع دیتا تھا اور نہ ہی مصنف کو کوئی اعزازی کتاب بھیجتا تھا۔

میں قدرت سے کہا کرتا کہ کتاب آپ کی پراپرٹی ہے۔ جس پر آپ کے ورثا کا حق ہے۔ آپ اپنے ورثا کی حق تلفی کے مجاز نہیں ہیں۔ بے شک آپ کتاب کی رائلٹی نہ لیں' لیکن معاہدے کے بغیر کسی کو کتاب چھاپنے کی اجازت نہ دیں۔

شہاب نامے کے متعلق بھی ہمارے درمیان اسی بات پر جھگڑا تھا۔

اس کے علاوہ قدرت کی خواہش تھی کہ کتاب کی قیمت کم رکھی جائے۔ میرا کہنا تھا کہ مصنف کتاب کی قیمت کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔

بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخری سال کے دوران اس کی تمام تر توجہ شہاب نامے کی اشاعت پر مرکوز تھی۔ وہ بڑی بے صبری سے کاتب کا انتظار کرتا۔ کاتب کے آنے میں ناغہ ہو جاتا تو وہ خاصہ فکر مند ہو جاتا تھا۔ حالاں کہ فکر مند ہونا اس کی سرشت میں نہ تھا۔

آخری باب

پھر ایک روز اس نے اعلان کیا کہ میرا ارادہ ہے کہ کتاب میں اسلام پر ایک باب لکھوں' یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ دفعتاً یہ خیال اسے کیوں آیا۔ شہاب نامہ تو مکمل ہو چکا تھا۔ ایک دم پلان میں تبدیلی کیوں ہوئی۔ دراصل میں اسلام پر باب کا مفہوم نہیں سمجھا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اس باب میں۔ وہ اسلام کے بارے میں بنیادی باتیں لکھے گا جو عام اسلامی کتابوں میں ہوتی ہیں۔ یا شاید مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے انداز میں اسلام کے بنیادی مسائل کا تذکرہ کرے گا' چوں کہ قدرت اللہ۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی تحریروں کا بڑا مداح تھا۔

پانچ چھ دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تو کہنے لگا۔ یہ بتائیے کہ میں آخری باب کا نام کیا رکھوں۔

میں نے کہا' شہاب صاحب نہ میں اسلام سے واقفیت رکھتا ہوں نہ اردو زبان سے۔ آپ کسی زبان دان سے پوچھیئے۔

کئی ایک دن وہ آخری باب کا نام سوچتا رہا۔ لوگوں سے پوچھتا رہا۔ پھر ایک دن فون پر کہنے لگا' مجھے نام مل گیا ہے۔ اس کی آواز مسرت سے یوں چھلک رہی تھی جیسے کسی بچے کو غبارہ مل گیا ہو۔

میں نے پوچھا' کیا نام ملا۔

بولا۔ چھوٹا منہ بڑی بات' کیسا ہے۔

میں نے کہا بے حد موزوں ہے۔

وہ کیسے' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا آپ نے خود کو ہمیشہ چھوٹا سمجھا' مانا اور اسلام کو ہمیشہ بڑی بات سمجھا۔

شہاب نامے کی کتاب مکمل کر کے مسودہ ناشر کے حوالے کر کے وہ مطمئن ہو گیا۔

وفات سے چار ایک دن پہلے میں اتفاقاً" شہاب کے گھر گیا تو وہ اکیلا ڈائننگ روم میں بیٹھا تھا۔

اسے دیکھ کر میں چونکا۔ میں نے کہا' شہاب صاحب یہ کیا ہو گیا۔ آپ ایک دم اس قدر دبلے پتلے ہو گئے ہیں۔ آپ ٹھیک تو ہیں۔

اس کی آنکھ میں فاتحانہ چمک لہرائی۔ بولا' مجھ پر دو کرم نوازیاں ہو گئی ہیں۔

کیا' میں نے پوچھا۔

مجھے کھانے پینے اور سونے سے بے نیاز کر دیا گیا ہے' اس نے فرط انبساط سے کہا۔

یہ ہماری آخری بات تھی۔

چونکہ پھر لوگ آ گئے تھے۔ بات کی وضاحت نہ ہو سکی۔

وفات

چوبیس جولائی کو شام کے پانچ بجے کے قریب مفتا یاد آ گیا۔ کہنے لگا' جلسے میں آپ کو لینے

آیا ہوں۔

کہاں' میں نے پوچھا۔

بولا' ایک ادبی محفل میں جانا ہے۔

میں نے کہا' منشا جی تجھے پتہ ہے۔ میں ادبی محفلوں میں نہیں جاتا۔

کہنے لگا' پتہ ہے لیکن اس محفل میں تو جانا ہو گا۔

میں نے کہا' وہ کس خوشی میں۔

کہنے لگا میں نے وعدہ کیا ہے کہ آپ کو لاؤں گا۔

چلو بھئی میں ہنسا۔ تمہارا وعدہ پورا ہو جائے۔ چاہے اپنا کباڑہ ہو جائے۔

یہ محفل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں تھی۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ افسر زیادہ تھے۔ ادیب کم کم۔ خالدہ حسین کے ساتھ شام منائی جا رہی تھی۔

دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد جب میں واپس گھر پہنچا تو تہمینہ نے کہا' شہاب صاحب کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔

میں نے اس خبر کو خاص اہمیت نہ دی۔ شہاب کی زندگی میں دل کا دورہ تو عام سی بات تھی۔ بیسیوں بار اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ جب بھی میں اس سے پوچھتا تو وہ کہتا۔ کوئی بات نہیں۔ شیشے کے برتن پر زیادہ دباؤ پڑ جائے تو تڑخ جاتا ہے۔

آخری ایام میں ایلوپیتھی کی دواؤں کا ری ایکشن شروع ہو گیا تھا۔ اس نے لندن کے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا' اپنی کیفیت بیان کی اور اسے بتایا کہ میں آپ کی تجویز کردہ دوائیاں باقاعدگی سے کھاتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر حیران رہ گیا۔ کہنے لگا' آپ اتنے برس سے مسلسل وہی دوائیاں کھا رہے ہیں۔ دوائیوں کا ری ایکشن ہونا ہی تھا۔

قدرت نے مجھے فون کیا۔ کہنے لگا' کیا ہومیو پیتھی میں دل کی ایسی ادویات ہیں جو ری ایکشن پیدا نہیں کرتیں۔

میں نے کہا' یقیناً" ہیں۔ لیکن دوا کھانے کا فائدہ۔

کیوں' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا' مجھے آپ کے دل پر ترس آتا ہے۔ ایک طرف آپ اس پر ضرب لگاتے

رہتے ہیں۔ دوسری طرف اسے تقویت دینے کے لیے دوائیاں کھاتے ہیں۔

میں نے تمینہ سے پوچھا۔ شہاب کو کب دورہ پڑا۔

کہنے لگی شام کو دورہ پڑا۔انہوں نے عکسی کو فون کیا' عکسی نے شہاب صاحب کی حالت دیکھی تو انہیں کار میں ڈال کر ہسپتال لے گیا۔ ثاقب بھی ساتھ تھا۔

میں نے کہا ذرا فون کر کے پتہ لگاؤ کہ وہ اسے کس ہسپتال میں لے گئے ہیں۔

تمینہ نے کہا۔ بیڈ نیوز۔ شہاب صاحب ہسپتال میں پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں وفات پا گئے۔

یہ خبر سن کر میں شل سا ہو گیا۔

غم مختلف شخصیتوں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں پر غم کی خبر بجلی کے کرنٹ کی طرح گرتی ہے۔ کچھ لوگوں پر غم کا دھارا چل کر انہیں بھگو دیتا ہے۔ کچھ لوگ غم کی خبر سن کر خالی الذہن ہو جاتے ہیں۔ پھر غم بوند بوند گرتا ہے۔ گرتا چلا جاتا ہے۔

شہاب کی وفات کی خبر سن کر میں خالی الذہن ہو گیا۔ مجھے پتہ تھا کہ اب غم بوند بوند گرے گا گرتا رہے گا۔ میرا سب سے بڑا محسن چلا گیا تھا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مشاہدہ' وہ مجھ پر اللہ کی عظیم ترین کرم نوازی تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں اکیلا رہ گیا تھا۔ جیسے کسی مٹی کے پیالے سے دودھ نکال لیا جائے۔

احمد بشیر کی خبر

اگلی صبح قدرت کے سب عزیز و اقربا اسلام آباد پہنچ گئے تھے۔ بانو' اشفاق اور احمد بشیر بھی آ گئے۔

بھری محفل میں احمد بشیر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا' یار کیا میں نے تجھے بتایا نہیں تھا۔

کیا' میں نے پوچھا۔

کہ شہاب تجھ سے پہلے فوت ہو گا' اس نے جواب دیا۔

میں نے سر نفی میں ہلا دیا۔

احمد بشیر کہنے لگا چند ایک ماہ گزرے کہ ایک دن شہاب صاحب میرے گھر آ گئے۔ وہ عجب

کیفیت میں تھے' چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔ زبان میں لکنت تھی۔ لگتا تھا جیسے پی کر آئے ہوں۔ دُھت۔

مجھ سے کہنے لگے' آج میں بہت خوش ہوں' بہت خوش۔ آج مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میں کب وفات پاؤں گا اور انشاء اللہ خاتمہ بخیر ہو گا۔

کہنے لگے' میں مفتی سے پہلے مروں گا۔ لیکن تم یہ بات مفتی کو نہ بتانا۔

احمد بشیر کہنے لگا' شہاب صاحب کی یہ بات سن کر میں نے سوچا چلو دو ایک مہینے ممتاز کو نہیں بتاؤں گا' پھر بتا دوں گا۔ شہاب کی بات بھی پوری ہو جائے گی اور ممتاز کو بھی خبر ہو جائے گی۔

نہیں تم نے مجھ سے یہ بات نہیں کی' میں نے کہا۔

وہ بولا' غالباً" میں بتانا بھول گیا۔

جنازہ پڑھنے کے بعد لوگ میت کا آخری دیدار کرنے کے عادی ہوتے ہیں' لیکن میں نے کبھی میت کی شکل نہیں دیکھی۔ اس روز پتہ نہیں کیوں میں دیدار کرنے والوں کی قطار میں کھڑا ہو گیا۔

قدرت کو دیکھ کر میرے دل میں ترس کا ایک طوفان اٹھا۔ اس کے بند بند میں رچا ہوا عجز موت کے بعد باہر نکل آیا تھا۔ عجز اس کی شخصیت کا بنیادی وصف تھا اور وہ عجز اس قدر گہرا اور شدید تھا کہ اس نے شہاب کی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ بندگی' بے بسی' بے چارگی کا دل دہلا دینے والا منظر۔

کچھ بھی تو نہیں بدلا

اگلے روز جب میں جاگا تو دفعتاً" مجھے یاد آیا کہ قدرت اللہ تو چلا گیا ہے۔ اور میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ ایک خالی برتن۔ میرے دل میں غم بوند بوند گرنے لگا۔

پھر جو میں نے صوفے کی طرف دیکھا جو میرے بیڈ کے سامنے لگا ہوا ہے۔ اور جس پر وہ آ کر بیٹھا کرتا تھا۔

ارے ———— وہ تو صوفے پر بیٹھا تھا۔ ویسے ہی کونے میں سمٹا ہوا۔ کہہ رہا تھا' کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔

دو دن میں اسے صوفے پر بیٹھے دیکھتا رہا۔

میں نے سوچا کہ میرا ذہن چل گیا ہے اور مجھے ہیلوسی نیشن ہونے لگے ہیں۔

چلو اچھا ہوا کہ ذہن چل گیا' میں نے سوچا۔

یاد داشتوں کی چاند ماری سے بچنے کے لیے یہ ایک ڈفنس میکے نزم ہے۔ انسان اپنے تحفظ کے لیے کیا نہیں کرتا۔

پھر وہ صوفے سے اٹھ کر میرے اندر آ بیٹھا۔

وہ کہتا ہے

جب بھی میری بیوی مجھ پر کوئی الزام دھرتی ہے اور وہ اکثر مجھ پر الزام دھرتی رہتی ہے۔ اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ اسے کہوں کہ بی بی میرا قصور نہیں ہے ———— عین اس وقت قدرت میری منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے' کہتا ہے' جو وہ کہتی ہے اسے مان لو۔ کہو' ہاں جی۔ جھگڑا نہ کرو۔ مان لینے میں بڑا سکھ ہے۔

میں بڑا غصیل آدمی ہوں اور میرا غصہ سدھ بدھ مار دینے والا غصہ ہے۔ اک جھکڑ چلتا ہے ٹہنی ٹہنی پتا پتا لرزتا ہے اور پھر گرد ہی گرد۔

جب مجھے غصہ آنے لگتا ہے تو قدرت میرے کان میں کہتا ہے۔ چھلنی بن جاؤ۔ اس جھکڑ کو گزر جانے دو' اندر رکے نہیں۔ روکو گے تو چینی کی دکان میں ہاتھی گھس آئے گا۔ غصہ کھانے کی نہیں' پینے کی چیز ہے۔

جب میں کسی چیز کے حصول کے لیے بار بار کوشش کرتا ہوں تو قدرت کی آواز آتی ہے' نہ ضد نہ کرو۔ اللہ کو اجازت دو کہ وہ اپنی مرضی کو کام میں لائے۔

جب میں دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے' نہ۔ ہار جاؤ۔ ہار جانے میں ہی جیت ہے۔

کیا وہ مجھ سے کبھی مایوس نہ ہو گا

جیتے جی قدرت نے کبھی مجھے نصیحت نہ کی تھی۔ وہ بہت کم گو تھا۔ لیکن فوت ہونے کے

بعد وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا ہے۔ اس کی باتوں میں نصیحت کا رنگ نہیں ہوتا۔ تحکم ہوتا۔ دھونس نہیں ہوتی نہ اس کی بات میں منت ہوتی ہے۔ ترلا ہوتا ہے۔

جب میری بیوی کسی رشتہ دار کے خلاف شکایت کرتی ہے تو وہ میرے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس دیتا ہے کہتا ہے' سُنیئے نہیں۔ لیکن یوں کہ بیگم کو احساس نہ ہو کہ سن نہیں رہے۔ ہاں ہاں کرتے رہیئے ورنہ اسے دکھ ہو گا کہ میری بات پر توجہ نہیں دی۔

میرے دوست دانش ور' کبھی کبھی اپنے کالموں میں میرا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔

حال ہی میں ایک صاحب نے سرخی جمائی۔ سنو سنو ناؤ میں ندی ڈوب گئی۔ فرائیڈ کا پیرو کار صوفی بن بیٹھا۔ اس پر مجھے بڑا غصہ آیا کہ نہ تو اسے فرائیڈ کے مفہوم کا علم ہے' نہ صوفی کا مطلب جانتا ہے۔ میرے پاس بھی قلم ہے۔ میں بھی ——————قدرت نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ نہ' وہ بولا' اگنور ہم۔ ڈیواین ڈسڈین۔

جب بھی میں شہرت حاصل کرنے کی غرض سے نمائشی بات کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے' شہرت سائے کی مصداق ہوتی ہے جو اس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ ان کے ہاتھ نہیں آتی۔ جو اس کے آگے' اس سے دور بھاگتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے چلی آتی ہے۔

جب میں تھکا ہوتا ہوں۔ کوئی مریض دوا لینے کے لیے آتا ہے اور میں اسے ٹالنے کی سوچتا ہوں تو وہ کہتا ہے' دے دیجیے۔ دوا دیجیے شاید آپ کی یہی بات اللہ کو پسند آ جائے۔

قدرت اللہ کی باتوں سے میں بے حد متاثر ہوں۔ میں نے گذشتہ تیس سال اسے ان باتوں پر عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں ان باتوں کی عظمت کا احساس رکھتا ہوں' لیکن میں ان باتوں کو عملی طور پر اپنا نہیں سکتا۔ میں اس کی سرگوشیوں کو سنتا ہوں۔ لیکن ان پر عمل نہیں کر پاتا۔

اسے علم ہے کہ میں ایک منہ زبانی شخص ہوں اور عمل سے کورا ہوں۔ اس کے باوجود وہ ہر قدم پر مجھے احتیاط کا درس دیتا رہتا ہے۔ وہ آج تک مجھ سے مایوس نہیں ہوا۔

اور مرنے کے بعد بھی اس نے مجھے اکیلا نہیں ہونے دیا۔ الٹا وفات کے بعد وہ میرے اندر رچ بس گیا ہے۔ میرے اور قریب آ گیا ہے۔

کہ قدرت اللہ زندگی میں مجھ سے ملا' یہ میرے اللہ کی مجھ پر سب سے بڑی کرم نوازی ہے۔

کہ وفات کی بعد بھی اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ قدرت اللہ کی کرم نوازی ہے۔
صاحبو میں کتنا خوش نصیب انسان ہوں۔

انسٹھ واں باب

لکھوں، نہ لکھوں

قدرت اللہ کی وفات کے بعد یہ سوال پھر سے کھڑا ہو گیا کہ میں "الکھ نگری" لکھوں یا نہ لکھوں۔

یہ ذہنی کشمکش عرصہ دراز سے چل رہی تھی۔

۱۹۶۱ء میں نے علی پور کا ایلی لکھی تھی۔ وہ میری خود نوشت کا پہلا حصہ تھی۔ لیکن میں نے اسے آپ بیتی کی شکل میں نہیں لکھا تھا۔ ان دنوں مجھ میں اتنی جرات نہ تھی، حوصلہ نہ تھا کہ ان واقعات کو اپناتا جو علی پور کے ایلی میں درج ہیں۔

علی پور کا ایلی

علی پور کا ایلی کی اشاعت پر ناقدوں نے اس پر مختلف آرا قائم کیں۔ کسی نے کہا کہ یہ ناول ہے۔ کسی نے کہا کہ ناول نہیں بلکہ داستان قسم کی چیز ہے۔

جب ایلی کی اشاعت ہوئی تھی، اس وقت میں الکھ نگری کی دہلیز پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے لیے یہ ایک انوکھا مشاہدہ تھا۔ بہرحال میں نے اعلان کر دیا کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ ' ایلی اور الکھ نگری ہو گا۔

میں نے سوچا کہ کیوں نا میں اسے قسطوں میں لکھوں اور ساتھ ساتھ سیارہ ڈائجسٹ میں

شائع کرتا رہوں

ایلی اور الکھ نگری کی چند ایک قسطیں سیارہ ڈائجسٹ میں شائع بھی ہوئیں۔ شاید اشاعت کا یہ سلسلہ چلتا رہتا' لیکن سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر بدل گئے۔ ایک نئے مدیر آ گئے۔

نئے مدیر میری تحریروں کو شائع کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کے برتاؤ کو دیکھ کر میں نے مزید قسطیں لکھنی بند کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد مجھ میں اتنی جرات پیدا ہوئی کہ علی پور کے ایلی کو اپنا لوں۔ میں نے اعلان کر دیا کہ علی پور کا ایلی میری آپ بیتی ہے۔ میں ایلی ہوں۔ ادھو اس کتاب میں صرف حقائق بیان کیے گئے ہیں' کسی قسم کی افسانہ نویسی نہیں کی گئی۔

خبردار

اس کے بعد میرے دوست اور جاننے والے سونٹے اٹھائے آ گئے۔ کہنے لگے' دیکھ مفتی اگر تجھے بھرے چوک میں اپنے غلیظ پوتڑے دھونے اور ننگے ناچنے کا شوق ہے' تو بے شک تو اپنا شوق پورا کر۔ لیکن خبردار الکھ نگری میں ہمارا ذکر نہ کرنا۔

ان کی بات درست تھی۔ علی پور کا ایلی میں نے قیام پاکستان کے بارہ سال کے بعد لکھی تھی۔ تقسیم کی وجہ سے میرا گاؤں بٹالہ ہندوستان میں شامل کر دیا گیا تھا اور میرے تمام عزیز و اقارب ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے۔ بہت سے شہید ہو گئے' جو باقی بچے وہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔ لٰہذا علی پور کا ایلی کے کردار پہچانے نہ گئے تھے۔

اب بات مختلف تھی۔ میرے ساتھی جنہوں نے الکھ نگری کے کردار بننا تھا۔ میرے سامنے تھے' جو فوراً پہچانے جاتے وہ اپنی زندگی کی ہر بات کو عام کرنے کے حق میں نہ تھے۔

پھر میری ملاقات قدرت اللہ سے ہوئی۔ وہ بھی اپنے ذاتی مشاہدات کو عام کرنے کے حق میں نہ تھا۔

میں نے اپنی عادت کے مطابق لبیک اور دوسرے مضامین میں شہاب کے متعلق کئی ایک باتیں لکھ دی تھیں' اس پر وہ بہت برہم ہوا تھا۔

آخری باب

قدرت اللہ شہاب کی وفات کے بعد جب شہاب نامہ شائع ہوا تو اس کا آخری باب چھوٹا

منہ بڑی بات پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔

تیئس سالہ رفاقت کے دوران قدرت اللہ نے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی کہ چھبیس سال اسے ہدایات موصول ہوتی رہی تھیں۔

میں نے خود دو ایک پیغامات سنے بھی تھے' جو قدرت اللہ کو پر اسرار طریقے سے دیے گئے تھے۔ اسے وارننگ دی گئی تھی۔ میں نے ایک خط بھی دیکھا تھا جو کبوتر کی شکل میں اڑتا ہوا آیا تھا اور اس کی قدموں میں گر کر خط کی صورت اختیار کر لی تھی' لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اسے مسلسل چھبیس سال ہدایات ملتی رہیں تھیں۔

شہاب نامے' کا آخری باب ساری کتاب سے مختلف نوعیت کا تھا۔ لگتا تھا جیسے مخمل پر ٹاٹ کا پیوند لگا دیا گیا ہو۔

ساری کتاب ایک ذہین' عقل مند' متوازن شخص کی روئیداد تھی' جس نے آخری باب میں ایک دم درویش بن کر مصلّہ بچھا کر' تسبیح ہاتھ میں پکڑ کر' اللہ اللہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور خلق خدا کو اللہ اللہ کرنے کی تلقین شروع کر دی تھی۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ قدرت اللہ نے یہ باب کیوں لکھا۔

قدرت اللہ نے ایک دم اتنا بڑا بھید کیوں کھول دیا۔

اس کا مسلک تو بھید رکھنا تھا کھولنا نہیں۔

اس نے ساری عمر بھید رکھا تھا۔

اب کیوں کھول دیا۔

اگر شہاب نامے میں آخری باب شامل نہ کیا جاتا تو بھی شہاب نامے کی قدر و منزلت میں کمی واقعہ نہ ہوتی۔ الٹا آخری باب شامل کرنے سے بات الجھ گئی تھی۔ قاری سوچتا کہ یہ آخری باب کا درویش پہلے ۵۸ ابواب میں کیوں چھپا بیٹھا رہا۔

پھر دفعتاً" مجھے یاد آیا کہ پلان کے مطابق شہاب کا شہاب نامے میں آخری باب شامل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ جب شہاب نامے کی کتابت ہو رہی تھی تو دفعتاً" قدرت نے اسلام پر ایک باب لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

شاید یہ فیصلہ بھی ہدایت پر مبنی ہو۔

نکتہ چینوں نے کہا کہ آخری باب قدرت اللہ شہاب کی تحریر نہیں ہے۔ یہ باب ان کے چیلوں چانٹوں نے تخلیق کر کے شہاب نامے میں شامل کر دیا ہے۔

اس سے پہلے بھی کچھ لوگ اپنے کالموں میں ہمیں سلسلہ شہابیہ کے چار درویشوں کے طعنے دیا کرتے تھے۔ اس پر میں نے سوچا کہ مجھ پر لازم ہے کہ الکھ نگری لکھوں اور لوگوں کو بتاؤں کہ یہ آخری باب کا درویش۔ ایک حقیقت تھا اور وہ قدرت اللہ کی تمام تر زندگی پر حاوی رہا تھا۔

اگر شہاب نامے میں آخری باب شامل نہ کیا جاتا تو میں الکھ نگری نہ لکھتا۔

کشمکش

بہرحال قدرت کی وفات کے بعد یہ کشمکش پھر سے جاری ہو گئی کہ لکھوں یا نہ لکھوں۔ میرے ذہن سے آواز آئی' دیکھ مفتی الکھ نگری لکھنے سے تیرا مقصد اپنی شخصیت کو بوسٹ کرنا نہیں ہے۔ شہاب کو بزرگ ثابت کرنا نہیں ہے' چونکہ شہاب نے کبھی بزرگی کا دعوی نہیں کیا تھا۔ اس کے کردار کا جزو اعظم تو عجز تھا۔ وہ خود کو اللہ کا ایک عاجز بندہ سمجھتا تھا اور حضور اعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ ترین غلام۔ الکھ نگری میں قدرت اللہ کی تعریف کرنا مقصود نہیں ہے۔ تعریف تو صرف اللہ کی ذات کی ہے۔ پھر تو الکھ نگری لکھنے سے کیوں ہچکچاتا ہے۔

پھر دل سے آواز آئی شاید میری یہ تحریر قدرت اللہ کے لیے آزردگی کا باعث ہو۔

نہیں میں چلاتا قدرت اللہ کی آزردگی مجھے گوارا نہیں' کسی قیمت پر گوارا نہیں۔ میرے لیے قدرت اللہ کی گڈول سے بڑھ کر اور کوئی چیز قابل حصول نہیں ہے۔

موقعہ کے گواہ

انہی دنوں ٹی وی نے شہاب نامے پر ایک پروگرام تشکیل دیا۔ اس پروگرام میں تین شرکاء تھے۔ جمیل الدین عالی' اشفاق احمد اور میں۔ یہ پروگرام شرکاء کے درمیان بات چیت پر مبنی نہ تھا۔ ہر شخص کو الگ الگ کتاب اور مصنف کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنا تھا۔ جمیل الدین عالی نے کتاب کی ادبی حیثیت اور قدرت اللہ کے کردار کی تعریف کی اور آخری باب کے متعلق کہا کہ میں شہاب صاحب کے کردار کے اس پہلو سے واقف نہیں ہوں' لہٰذا اس بارے

میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

اشفاق احمد نے کتاب اور مصنف کے متعلق رسمی باتیں کیں اور پتہ نہیں کس مصلحت کے تحت آخری باب کا ذکر ہی نہ کیا۔

موقعے کا ایک گواہ منحرف ہو گیا۔

پھر بانو قدسیہ نے اپنی کتاب مرد ابریشم میں قدرت اللہ پر عزت و احترام کے پھول برسائے اور اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ قدرت اللہ سے جس قدر قریبی تعلقات خان صاحب اور ان کے بچوں کے تھے اور کسی کے نہ تھے۔

مرد ابریشم میں بانو قدسیہ نے شہاب نامے کے آخری باب کے حوالے سے کچھ نہ لکھا۔

موقعے کا ایک اور گواہ کسی مصلحت کے تحت منحرف ہو گیا ——— میں اکیلا رہ گیا۔

اصحاب کشف

پھر مجھے خیال آیا کیوں نا کسی صاحب کشف بزرگ سے پوچھوں کہ الکھ نگری لکھوں یا نہ لکھوں۔

سب سے پہلے میں نے صدیق رائی سے پوچھا۔ میں نے کہا یار اگر قدرت اللہ سے تیرا رابطہ قائم ہے تو مجھے پوچھ کر بتا کہ میں الکھ نگری لکھوں یا نہ لکھوں۔

چند روز کے بعد صدیق نے مجھ سے کہا کہ ہاں ہاں لکھیئے، لکھنے میں کیا حرج ہے۔

صدیق کی بات میں وزن نہیں تھا، خود اعتمادی نہ تھی۔ مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔

پھر میں نے ایک دو اور بزرگوں سے پوچھا۔ انہوں نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔

میں نے پھر صدیق سے پوچھا۔ میں نے کہا، یار تو مجھے ٹرخا نہیں۔ اگر تو صاحب کشف ہے تو مجھے صرف یہ پوچھ دے کیا الکھ نگری قدرت اللہ کے لیے آزردگی کا باعث تو نہ ہو گی۔

چند روز کے بعد صدیق نے کہا کہ پہلی بار جب آپ نے پوچھا تھا تو ناخوشگواری کا احساس ہوا تھا،

اب نہیں ہوا۔ مطلب ہے، اب اجازت ہے۔

صدیق کی یہ بات بھی مجھے یقین نہ دلا سکی۔

پھر میں نے کراچی کی محترمہ عطیہ سے پوچھا۔

وہ بولیں' ضرور لکھئے۔

ان کے جواب سے بھی میں مطمئن نہ ہوا۔

پھر اتفاق سے لاہور کے سید سرفراز شاہ صاحب سے میرا رابطہ ہو گیا۔

ہوا یوں کہ لاہور کی ایک خاتون صغیرہ شیریں مجھے خط لکھا کرتی تھی۔

ادبی حوالے سے یا قدرت اللہ شہاب کے حوالے سے مجھے بہت سے خط موصول ہوتے رہتے تھے۔

صغیرہ شیریں کے خطوں میں نہ ادبی حوالہ ہوتا تھا نہ شہاب کا۔ اس کے خطوں کا رنگ مختلف تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں' درگاہوں پر جایا کرتی تھیں' دعا کی شدت سے قائل تھیں۔ البتہ ہومیو پیتھی میں دلچسپی رکھتی تھیں۔

شاہ صاحب

ایک بار پتہ نہیں میں نے اسے خط میں کیا لکھ دیا۔

جواب میں اس نے لکھا کہ میں نے آپ کا خط اپنے دوستوں کے دوست کو دکھایا ہے۔

اس پر مجھے غصہ آیا کہ میرا خط کسی کو دکھانے کی کیا ضرورت تھی' لیکن میں خاموش رہا۔

صغیرہ شیریں نے میرے متعلق کچھ خوش فہمیاں پال رکھی تھیں۔ میں نے اسے لکھا کہ بی بی میں ویسا نہیں ہوں' جیسا تو سمجھتی ہے۔

انہی دنوں میں نے اپنی شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا' جس کا عنوان تھا "چھوٹا"

میں نے شیریں کو اپنے خط میں "چھوٹا" کی ایک کاپی بھیج دی۔

چند دنوں کے بعد صغیرہ شیریں کا جواب موصول ہوا۔ لکھا تھا' میں نے آپ کا مضمون اپنے دوستوں کے دوست کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ انہوں نے اسے پڑھا' مسکرائے اور فرمایا "اتنے بھی نہیں۔"

میں نے صغیرہ شیریں کو غصے بھرا خط لکھا اور پوچھا کہ تمہارے یہ دوستوں کے دوست کون ہیں۔ جنہیں تو میرے خط دکھاتی رہتی ہے۔

جواب میں اس نے لکھا کہ یہ شاہ صاحب ہیں' جو صاحب کشف ہیں اور صاحب دعا ہیں۔ میں گذشتہ چھ سال سے ہفتہ وار ان کی خدمت میں حاضری دے رہی ہوں۔

میں نے صغیرہ کو لکھا کہ اگر تیرے شاہ صاحب واقعی صاحب کشف ہیں تو تو ان سے پوچھ دے کہ کیا مجھے الکھ نگری لکھنے کی اجازت ہے اور کیا مجھے اتنی مہلت ملے گی کہ میں کتاب مکمل کر سکوں۔

صغیرہ شیریں کے اگلے خط میں شاہ صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک پرچی ملفوف تھی۔ لکھا تھا۔ ہم نے الکھ نگری مکمل شکل میں دیکھ لی ہے۔"

شاہ صاحب کے یہ الفاظ سیدھے میرے دل میں اتر گئے۔ شک و شبہات دور ہو گئے۔ کوئی کشمکش نہ رہی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا۔ بہر حال میں نے الکھ نگری لکھنی شروع کر دی۔

پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دینے کا موقعہ ملا۔ انہیں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ ایک جوان آدمی ہیں' جدید علوم سے واقف' ایک ماڈرن آدمی' باخبر' کلچرڈ' سادہ اور منکسر مزاج۔ فقیر جو ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے ہاتھ میں دنیا لئے زندگی بسر کر رہا ہے۔

جس نے دین اور دنیا میں عملی طور پر ایسا توازن پیدا کر رکھا ہے جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے اور مسلمانوں کی شناخت ہے۔

پھر سید سرفراز شاہ نے اس موضوع پر مجھے مفصل خط لکھا۔ جس کا متن درج ذیل ہے۔

لاہور سے

۵ جولائی ۱۹۹۰ء

جناب مفتی صاحب

السلام علیکم۔ محبت نامہ ملا۔ خوش خطی ایسی کہ چوم لینے کو جی چاہے۔ اگر سوال کی اجازت ہوتی تو آپ سے آپ کا خط مانگ لیتا۔

جناب آپ کی کتاب الکھ نگری تو مکمل ہو چکی اسی دن اسی لمحے جب آپ فقیر کے ڈیرے تشریف لائے تھے۔ اب تو اس سے آگے کی بات ہوتی ہے۔

مفتی صاحب تصوف یا روحانیت پر کتاب آپ کے ذمے قرض ہے اور قرض بنا لوٹائے ادا نہیں ہوتا۔ کتاب لکھتے وقت احتیاط کیجئے گا کہ مبالغہ آرائی نہ ہونے پائے کہ اسی نے تعلیم یافتہ ذہنوں کو تصوف سے دور کر دیا۔ حالانکہ یہ شرح پر ۱۰۰ فی صد عمل درآمد کی ایک راہ تھی۔ تاریخ اس پر گواہ ہے۔ فقیروں نے کوئی وسائل نہ ہوتے ہوئے بھی تن تنہا لاکھوں کفار کو مسلمان کرلیا۔ اس کے برعکس کوئی مولوی آج تک صرف ایک غیر مسلم کو مسلمان نہ کر سکا۔ اپنے تمام تر وسائل کے باوجود۔ امید ہے آپ کی کتاب تصوف یا روحانیت کے بارے میں اکثر شکوک کو صاف کر دے گی اور یہ ایک بڑی خدمت ہو گی۔

امید ہے ان دنوں آپ کی طبیعت ٹھیک ہوگی۔ فالسہ کھاتے رہیئے۔ بیگم صاحبہ کی طبیعت کیسی ہے تحریر کیجئے گا۔

حیرت ہے آج آپ کو خط لکھتے وقت بجلی نہیں گئی ورنہ تو ہمیشہ آپ کو خط اندھیرے میں ہی لکھا گیا۔ معلوم نہیں آپ کو سمجھ میں آیا کہ نہیں یا آپ مروت میں ہی برداشت کر گئے۔

والسلام

سرفراز

ہم میں سے

انہیں دیکھ کر میں سمجھا کہ یہ شاہ صاحب کے کوئی کارکن ہیں۔

اصل شاہ صاحب ابھی تشریف لائیں گے۔ سفید ریش ہوں گے' لمبا چغہ زیب تن ہو گا' انداز معززیت سے بھرپور ہو گا' جیسے مروجہ عالم دین' بزرگ یا پیر فقیر ہوتے ہیں۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے کہ علمائے کرام' بزرگ اور پیر صاحبان کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے' جیسے وہ ہم میں سے نہ ہوں' جیسے وہ کوئی مختلف مخلوق ہوں۔

شاہ صاحب کے پاس بیٹھ کر میں نے محسوس کیا جیسے وہ ہم میں سے تھے' جیسے میرے پاس کوئی دوست یا ساتھی بیٹھا تھا۔ اس کے برعکس علمائے دین کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے جسے دیکھ کر

۱۔ اصل خط ضمیمے میں ملاحظہ کریں۔ خط نمبر XXV

محسوس ہوتا ہے جیسے نقیب کہہ رہے ہوں۔ ہٹو بچو' باادب' باملاحظہ ہوشیار' عالی جناب' عالم دین قدم رنجا فرما رہے ہیں۔

شاہ صاحب کو دیکھ کر میرا یقین ایمان کامل میں بدل گیا اور میں نے محسوس کیا جیسے میں ان کی خدمت میں خود حاضر نہیں ہوا بلکہ بھیجا گیا ہوں۔

شاہ صاحب کا اسم گرامی سرفراز اے شاہ ہے' وہ ایک معروف کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے مرشد محترم سید یعقوب علی شاہ ہیں جن کا وصال ۱۳ اگست ۱۹۸۶ء کو ہوا' مزار اقدس لاہور میں واقعہ ہے۔ ان کا سلسلہ چشتیہ' صابریہ' وارثیہ ہے۔ اس سلسلے میں رواج کے مطابق خلافت سب سے کم عمر کے مرید کو عطا کی جاتی ہے۔

سید سرفراز شاہ کو خلافت ۱۹۸۴ء میں عطا ہوئی تھی۔ جب سے خدمت خلق جاری ہے۔ ہفتے میں ایک دن سوموار کو مغرب کی نماز کے بعد حاجت مندوں اور سائلوں سے بلا امتیاز اور بلا افتراق و تفریق ملتے ہیں۔ مشورہ دیتے ہیں' دعا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں پیر خانے کا رنگ سراسر مفقود ہے۔

انہی دنوں پراسٹریٹ گلینڈ کی وجہ سے میں بیمار پڑ گیا۔

میں نے حسب معمول ہومیو پیتھی کا علاج شروع کر دیا۔

چند روز دوا کھانے کے بعد افاقہ ہو جاتا۔ پھر دورہ پڑ جاتا۔

یہ دورے بڑے تکلیف دہ تھے اور بار بار پڑتے تھے۔

میری بیٹی نقش جو ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے' اس نے کہا' ابو یہ ایک مکینیکل رکلوٹ ہے' اسے کٹوائے بغیر چارہ نہیں۔ دوا کام نہیں کرے گی' آپ آپریشن کروالیں۔

سرجن نثار

ایک روز وہ مجھے زبردستی ہسپتال لے گئی۔ یورالوجسٹ سرجن ڈاکٹر نثار سے ملوایا۔

ڈاکٹر نثار کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔ اس میں روحانیت لہریں لے رہی تھی۔ آنکھ بھری ہوئی تھی۔ لہریں اٹھ رہی تھیں۔ چھینٹے اڑ رہے تھے۔

اگر ڈاکٹر نثار یورالوجسٹ سرجن نہ ہوتا تو شاید میں آپریشن کروانے پر رضامند نہ ہوتا۔

آپریشن ہوا تو مثانے میں سوڈومانو بکٹیریا داخل ہو گئے' جو پیپ بناتے ہیں۔ انفکشن ہو گئی۔ پیٹ میں سوراخ کر کے نلکی لگا دی گئی جس سے پیشاب براہ راست تھیلے میں خارج ہو جاتا تھا۔

ہسپتال میں میں تین مہینے پڑا رہا۔

ان دنوں مجھے صرف ایک فکر دامن گیر تھا' کیا مجھے الکھ نگری کو مکمل کرنے کی مہلت ملے گی۔ مرنے کا خوف نہ تھا۔ مرنے کے لیے تو میں عرصہ دراز سے تیار بیٹھا ہوں۔ اللہ نے ایک بھرپور زندگی عطا کی۔ اتنی "رج" زندگی شاید ہی کسی کو عطا ہوئی ہو۔ صرف ایک خیال دامن گیر تھا کہ الکھ نگری ادھوری نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر نثار روزانہ راؤنڈ پر آتے تو میں ان سے کہتا ڈاکٹر میرے لیے دعا کرو۔ لوگ ہنستے تھے کہ یہ کیسا احمق مریض ہے' جو ڈاکٹر سے دوا کی بجائے دعا کی بات کر رہا ہے۔

ان دنوں سرفراز شاہ مجھے حوصلے دیتے رہے۔ مجھے یقین دلاتے رہے کہ الکھ نگری مکمل ہو گی۔ انشاء اللہ' بلکہ ابھی تو آپ کو ایک کتابچہ لکھنا ہے۔

ابدال بیلا

شاہ صاحب اور شیریں کے علاوہ ڈاکٹر نقش اور ڈاکٹر ابدال بیلا میری ہمت بندھاتے رہے۔

چھ سات سال گزرے' مجھے ڈاک کے ذریعے ایک کتاب موصول ہوئی۔ کھول کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ کتاب نہ تھی بلکہ کتاب کے پروف تھے جن پر جلد چڑھا رکھی تھی۔ یہ کتاب کہانیوں کا ایک مجموعہ تھی۔ ساتھ ایک خط تھا۔ لکھا تھا دیکھئے کتاب اشاعت کے لیے بالکل تیار ہے' لیکن یہ چھپے گی نہیں' جب تک آپ اس کا دیباچہ نہ لکھیں گے۔

یہ ایک انوکھا طرز تخاطب تھا۔ وہ خط نہیں تھا بلکہ ایک دھونس تھا' لیکن اس دھونس تلے' بے پایاں خلوص تھا۔ میں نے سوچا یہ کون صاحب ہیں جو خلوص میں بھیگی ہوئی دھونس دے رہے ہیں۔

ارے یہ تو اک طالب علم ہے۔ وہ بھی ایم بی بی ایس کا۔ ایم بی بی ایس کے طالب علم کو تو

سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اس شخص نے اتنی ساری کہانیاں کیسے لکھ لیں اور پھراثر رسوخ کا یہ عالم کہ پبلشر بھی ڈھونڈھ لیا۔ پبلشر تو پرانے لکھنے والے کو بھی نہیں ملتے۔

کہانیاں پڑھیں تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ روایتی رنگ میں رنگی ہوئی اتنی پختگی۔ اتنی بھیگ۔۔۔ یہ بندہ ہے یا جن ہے اس جن کا نام ابدال بیلا تھا۔

پھر ابدال بیلا نے مجھے خط لکھنے شروع کر دیے۔ طویل خط اپنے تجربات مشاہدات' آپ بیتے واقعات' شرارتیں' محبتیں' سب کچھ۔

میں نے ابدال بیلا کو لکھا کہ آپ کے خط بے حد دلچسپ ہوتے ہیں' پر اثر ہوتے ہیں' لیکن نہ تو مجھے خط و کتابت کی عادت ہے اور نہ میرے پاس وقت ہے۔ لہٰذا آپ کو ایک ہاتھ کی تالی بجانی پڑے گی۔

ڈاکٹر بیلا نے لکھا کچھ پرواہ نہیں' ہم ایک ہاتھ کی تالی بجانے کے عادی ہیں۔

ڈاکٹر بیلا کی ایک ہاتھ کی تالی کے جواب میں اگرچہ میرا ہاتھ نہیں ہلتا تھا' لیکن دل ضرور ہلتا تھا۔

یہ ایک ہاتھ کی تالی کئی ایک سال بجتی رہی۔

پھر ڈاکٹر بیلا کا تبادلہ اسلام آباد نیول ہیڈ کوارٹر میں ہو گیا۔

وہ روزانہ ہسپتال آتا تھا۔ بشاش پر امید۔ مجھ سے کہتا۔ ابھی تو آپ نے الکھ نگری مکمل کرنی ہے۔

تجھے کیسے پتہ ہے کہ وہ مکمل ہو جائے گی۔

مجھے پتہ ہے' وہ جواب دیتا۔ میرے اندر کوئی بولتا ہے۔ کہتا ہے۔ مفتی سے کہہ دے یہ کتاب مکمل ہو گی۔

پھر عکسی کا لنگوٹیہ جہانگیر آ جاتا ہے۔ جواب آئی سپیشلسٹ ہے۔

ڈاکٹر جہانگیر ایک میڈ ۔مسٹک فرد ہے۔ اس کی کسی نامعلوم سمت سے تار جڑی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اک پھلجھڑی چلتی رہتی ہے اور وہ اپنے مدھم زیرلب انداز میں کہتا ہے یو ول بی آل رائیٹ۔

شاہ صاحب۔ ڈاکٹر نثار۔ ڈاکٹر جہانگیر' ڈاکٹر ابدال بیلا اور ڈاکٹر نقش' ان سب نے

دل میں امید کی کرن جگائے رکھی۔

اس کتاب کی تکمیل شاہ صاحب کی مرہون منت ہے۔ وہ مسلسل میرا حوصلہ بندھاتے رہے۔

ساٹھواں باب

حرفِ آخر

آج میں عمر کے ۸۷ ویں سال میں ہوں۔ زندگی کی گہما گہمی سے گزر چکا ہوں۔ پلیٹ فارم پر بیٹھا انتظار کر رہا ہوں کہ کب گاڑی آئے اور میں سوار ہو کر رخصت ہو جاؤں۔

مجھے بیتی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں۔

میری زندگی میں دو چار باتیں حیران کن ہیں۔ پہلی بات یہ کہ جب بھی میری زندگی میں کوئی مشکل مقام آیا تو اللہ نے ہاتھ بڑھا کر مجھے بچا لیا۔ ان دنوں میں بھی جب میں اللہ کو نہیں جانتا تھا نہیں مانتا تھا اور ان دنوں میں بھی جب میں نے اسے جان لیا۔ مان لیا۔

ایسا کیوں ہوا۔ وہ مجھ پر اتنا مہربان کیوں تھا کیوں ہے۔ مجھ میں ایسا کوئی وصف نہ تھا نہ ہے۔ جس کی وجہ سے مجھ پر کرم فرمائیاں کی جاتیں۔ الٹا میں ایک بگڑا ہوا بچہ تھا جنسی جذبات میں لت پت نوجوان تھا۔ میرا ذہن شک و شبہات سے بھرا ہوا تھا۔ مغرب زدہ تھا۔

میں منہ زبانی مسلمان تھا۔ میں نے اپنی ساری زندگی فادر ہوسٹیلٹی میں گزار دی۔ میں نے اپنی ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔

مجھ میں کوئی بھی ایسا وصف نہ تھا جس کی وجہ سے مجھے نوازا جاتا۔

دوسری حیران کن بات یہ تھی کہ جوانی میں جب ماں نے مجھے دلی کے حاجی رفیع الدین کی

خدمت میں بھیجا جو چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ تو انہوں نے مراقبہ کر کے فرمایا کہ والدہ صاحبہ سے کہہ دیجیے کہ جس بات سے وہ خوفزدہ ہیں وہ ہو کر رہے گی۔ بڑی بدنامی ہو گی رسوائی ہو گی تذلیل ہو گی یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا' لیکن آخری عمر میں انہیں بڑے اچھے لوگ ملیں گے۔

حاجی صاحب کی بات حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ میری وجہ سے بڑی بدنامی ہوئی رسوائی ہوئی تذلیل ہوئی اس دوران میں بھی ہر مشکل کے وقت اللہ نے مجھے ہاتھ بڑھا کر بچالیا۔

جب محلے دار لاٹھیاں اٹھائے مجھے تلاش کر رہے تھے تو دفعتا" میرے منہ پر ایگزیما کے چھالے نکل آئے جو پھوٹ کر زخم بن گئے اور ایک جراح نے کپڑا جلا کر میرے منہ پر تھوپ دیا۔ میرا منہ کالا ہو گیا۔ محلے دار کئی بار میرے قریب سے گزر گئے' وہ مجھے پہچان نہ سکے۔

مجھ پر چوری اور دھوکہ دہی کا مقدمہ چل رہا تھا۔ عدالت میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو میری ضمانت دیتا کوئی مجھے جانتا نہ تھا۔ جو جانتے تھے وہ میرے دشمن ہو رہے تھے۔ عین اس وقت ایک تھانے دار پتہ نہیں کہاں سے آگیا۔ اس نے عدالت سے عرض کی کہ جناب میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔

وکیل نے کہا تم اس کی ضمانت نہیں دے سکتے کیوں کہ تم تھانے دار ہو۔

تھانے دار نے اپنی پیٹی اتار کر میز پر رکھ دی بولا:

عالی جاہ! اب تو میں ضمانت دے سکتا ہوں۔

وہ تھانے دار کون تھا مجھے علم نہیں۔ اس نے کیوں میری خاطر اپنی نوکری داؤ پر لگا دی۔

حیرت انگیز طریقوں سے اللہ نے مجھ پر کرم فرمائیاں کیں۔

پھر تقسیم کے وقت جب میں پاکستان آرہا تھا تو میں کیسے بچ گیا۔ کئی ایک ایسے اتفاقات ہوئے جن کی وجہ سے ہم سب خیریت سے پاکستان میں آپہنچے۔ کیا وہ اتفاقات تھے۔ نہیں اتنے سارے مثبت اتفاقات نہیں ہو سکتے۔ قدم قدم پر میری مدد ہوتی رہی۔ کیوں؟

یہ ان دنوں کی بات ہے' جب میں اللہ کو نہیں مانتا تھا' پھر بھی مجھ پر حیرت طاری رہی' اتنے اتفاقات۔ تسلسل سے اتنے مثبت اتفاقات یہ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا۔

پھر بابے مجھے کہتے رہے۔ اوپر چلا جا۔ جہاں سبز پہاڑیاں ہیں وہاں ایک بڈھا بابا تیرا انتظار کر

رہا ہے۔ مجھے ان باتوں پر غصہ آتا تھا۔ کون بڈھا کیوں انتظار کر رہا ہے۔ نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ میں بابوں کو نہیں مانتا۔ میں ایک آزاد آدمی ہوں جو چاہوں گا کروں گا۔

پھر ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مجبوراً مجھے لاہور چھوڑ کر راولپنڈی آنا پڑا۔ سائیں اللہ بخش اور خواجہ جان محمد بٹ دونوں بزرگ میرے منتظر تھے۔ انہوں نے مجھ پر رقت طاری کر دی۔ پھر میرا رخ بدل دیا۔ یہ ایک حیرت انگیز معجزانہ تبدیلی تھی۔ چاروں طرف مجھے اللہ ہی اللہ نظر آنے لگا۔ مجھ پر اتنی بڑی کرم فرمائی کیوں کی گئی اب حیرت کے ساتھ ساتھ میرے دل میں شکرگزاری کے جذبات پیدا ہو گئے۔ مجھے خواجہ جان محمد بٹ سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ پھر بھی میں عقیدے سے بے گانہ رہا۔

اس کے بعد میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ کراچی میں پہلی بار میں قدرت اللہ شہاب سے ملا۔

میں ازلی طور پر ایک چھوٹا آدمی ہوں۔ اس لیے بڑے افسروں سے ملنے سے الرجک ہوں' لیکن قدرت اللہ شہاب کے عجز اور وسعت قلب سے متاثر ہو کر میں اس کی جانب کھنچا چلا گیا۔

اس کے قریب گیا تو اس کے چند ایک اوصاف دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔

وہ بہت ذہین تھا۔ قابل تھا۔ خود کو کسی شخص سے برتر نہیں سمجھتا تھا۔ اس میں بلا کا عجز تھا۔ رواداری تھی۔ برداشت تھی۔ صبر تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی میں ایک پر اسرار عنصر ہے۔ اسے ہدایات موصول ہوتی ہیں وارننگ دی جاتی ہیں۔

پھر میں کئی سال اس پر اسرار عنصر کا کھوج لگانے میں لگا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ کوئی ہے اس کی کوئی حیثیت ہے۔ بزرگوں میں اس کا کوئی مقام ہے۔

اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ اللہ کا ایک کامی ہے اور کسی خاص کام کو سرانجام دینے کے لیے مقرر ہے۔ مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون سا کام ہے اور اس کا کیا سٹیٹس ہے۔

بہرحال میرا دل اس کے لیے جذبہ عقیدت سے سرشار ہو گیا۔ میرا ایمان ہے کہ میری تمام تر زندگی کا سب سے بڑا مشاہدہ قدرت اللہ شہاب ہے اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر سب سے بڑا کرم کون سا کیا تو میں جواب دوں گا کہ سب سے بڑا کرم یہ ہے کہ اللہ نے مجھے قدرت اللہ شہاب عطا کیا۔

میرے دل میں اس کے لیے جذبہ عقیدت تھا جو اس کے لیے باعث پریشانی تھا۔ وہ کہتا تھا۔ عقیدت اچھی چیز نہیں۔ عقیدہ پالو۔

مجھ میں جذباتیت تھی' شدت تھی۔ وہ ان دنوں خصوصیات کو "ڈس کوالی فیکیشن" سمجھتا تھا۔

پھر ایک اور بات تھی اس پر بات چھپانا عائد تھا۔ طبعاً" بھی وہ کہنے والا نہیں تھا اس کے برعکس میں طبعاً" کہہ دینے پر مجبور تھا۔

مجھے شک پڑتا تھا کہ میں اس کی آزمائش تھا۔ اس کے راستے کی رکاوٹ تھا۔

سیانے کہتے ہیں کہ ہر بزرگ کے ساتھ ایک رکاوٹ لگی ہوتی ہے۔ جو اس کی آزمائش کے لیے لگادی جاتی ہے۔

بہرحال حیرت کی بات ہے کہ اس نے مجھے گوارہ کیا۔ صرف گوارہ ہی نہیں کیا۔ اس کے توسط سے میری زندگی میں برکتیں پیدا ہوئیں۔ رزق ملا۔ قلم ملا۔ شہرت ملی۔ نیک نامی ملی۔ سکون ملا۔ اتنا سکون ملا کہ لگتا ہے جیسے دنیا میں ہی مجھے بہشت عطا کر دیا گیا ہو۔

مجھ پر بڑی کرم نوازیاں کی گئیں' لیکن میں عمل کی توفیق پیدا نہ کر سکا۔ مجھے عقیدے کی دولت نہ ملی۔ میں منہ زبانی ہی رہا۔ یہ میری اپنی خامی تھی جو آج تک قائم ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے متعلق میرا ایمان ہے حق الایمان کہ مستقبل قریب میں پانچ سات سال کے اندر اندر قدرت اللہ شہاب کا نام ایک بار پھر ابھرے گا۔ اس وقت یہ بھید کھلے گا کہ قدرت اللہ شہاب کون تھا۔ اور وہ کس کام کو سرانجام دینے کے لیے آیا تھا۔

شہاب نامے میں کل ۵۹ باب ہیں۔ ۵۸ ابواب میں شہاب نے جو کچھ لکھا ہے' وہ جھوٹ نہیں ہے' لیکن سچ بھی نہیں ہے۔ ان ابواب میں اس نے اپنی زندگی کی چوتھی سمت کے متعلق ذکر نہیں کیا۔

اخفائے راز کرنے کا اس کا ارادہ نہیں تھا۔ جب وہ کاتب سے ۵۷ ابواب لکھوا چکا تو دفعتاً" اس نے آخری دو باب بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ آخری باب میں اخفائے راز کر دے۔ اسے علم تھا کہ آخری باب لکھنے سے پہلے ۵۸ باب اپنی وقعت کھو دیں گے' لیکن وہ ایک ادنیٰ غلام تھا اور حکم کا پابند تھا۔ شہاب نامے کے متعلق میرا کہنا ہے کہ ۵۸ ابواب

ضمیمہ (خطوط)

صدر پاکستان "ستارہ امتیاز" ایوارڈ عطا کر رہے ہیں (1986)

منشی پریم چند ایوارڈ۔ عالمی اردو کانفرنس (بھارت) (1989)



شام ملاقات میں اکادمی کے چیئرمین ممتاز مفتی کو محمد حسین ہیکل کی کتاب "حیات محمد ﷺ" پیش کر رہے ہیں درمیان میں افتخار عارف ڈی جی اکادمی کھڑے ہیں' سٹیج پر عزیز ملک بیٹھے ہیں (1991)



ممتاز مفتی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ (1991)

بس صرف آخری باب سچا ہے۔ باقی ۵۷ ابواب جھوٹ نہیں مگر سچ بھی نہیں ہیں۔

جب میں نے لبیک لکھی تو دانش وروں نے کہا کہ مفتی نے یہ کتاب اس لیے لکھی ہے کہ یہ ثابت کرے کہ قدرت اللہ شہاب ولی تھا۔

عام طور پر ولی فیلڈ افسر ہوتے ہیں۔ قدرت اللہ فیلڈ افسر نہیں تھا۔ اسے سیکرٹریٹ سے تعلق تھا۔

قدرت اللہ کی وفات کے بعد اتفاقاً لاہور کے ایک بزرگ سید سرفراز احمد شاہ صاحب سے میرا رابطہ پیدا ہوا۔

محترمہ صغیرہ شیریں صاحبہ وسیلہ بنیں اور میں نے محسوس کیا کہ میں خود شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا بلکہ مجھے ان کی خدمت میں بھیجا گیا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کی کرم نوازیاں وفات کے بعد بھی جاری و ساری ہیں۔

جناب شاہ صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں، حالانکہ مجھ میں کوئی ایسا وصف نہیں کہ وہ مجھے قابل اعتنا سمجھیں۔

شاہ صاحب بہت بڑے بزرگ ہیں۔ وہ صاحب کشف اور صاحب دعا ہیں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

صاحبو! میں نا اہل ہونے کے باوجود ایک بڑا خوش نصیب فرد ہوں۔ دعا فرمائیں کہ میرا انجام بخیر ہو۔

محترمی! آپ کا مکتوب ملا۔ مایوسی کی تو کوئی وجہ نہیں دیکھتا۔ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں

اور ہر بات وہ بہتر کرتا ہے۔ انشاءاللہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اپنا فضل و کرم فرمائیں گے۔ میری دعا ہے کہ [illegible] آپ بہت خوش رہیں۔ میرا معاملہ تو آپ کے ساتھ یوں ہے کہ جیسے [illegible] ناچیز کی دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرمایا جائے گا۔ میں تو ایک ناچیز انسان ہوں اور میری کیا بساط ہے لیکن وہ رحیم و کریم ہے اگر ہم جیسے گنہگاروں کو اپنی رحمت سے نواز دے تو اس کی بخشش میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ بہرحال اسی در کا بھروسہ ہے۔ [illegible] حالات بہتر ہو جائیں گے انشاءاللہ۔ یقین رکھیں

ستارہ کی نوازش کا مجھے احترام ہے۔ لیکن حیران ہوں کہ وہ کیوں اس ناچیز کو [illegible] سے ملنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ شاید انہیں کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ میری اتنی عزت افزائی کی جائے۔ میں ایک عام انسان ہوں جس کا کوئی لمبا قد نہیں جس میں کوئی خوبی نہیں۔ البتہ ایک جذبہ ضرور دل میں رکھتا ہوں کہ خدمت کرنے والوں کا ساتھ۔ خدا اور اس کے بندوں کی خدمت کرنے والوں کا ساتھ۔ اسلام کی سربلندی چاہنے والوں کا خاک پا۔ اور ایک بندۂ خدا کے در کا ادنیٰ سا خادم۔ اور بس۔ آپ زیادہ کو نہیں۔ ستارہ کا مجھ سے ملاقات کرنے کی ضرورت نہیں۔ محبت [illegible] کسی وقت خود ہی ملاقات کرا دیتی ہے۔ جیسے تعلق [illegible] پیدا ہو جاتا ہے تو میں پہلے اب تو رکھتا ہوں تو اسلام سے لگاؤ رکھنے والا ہوں۔ انشاءاللہ کبھی ملاقات ہو ہی جائے گی۔ ان کی ضیافت کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اسلام کی خدمت کی مزید توفیق فرمائے۔

ستارہ اور ہلال کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ دعا کی جائے۔ دعا تو ساری مخلوق کر رہی ہے

لیکن ہاں۔ دعا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ستارہ اور ہلال کا لفظ [illegible] جانشین حال ہیں۔ [illegible] نے اپنے [illegible] سا اشارہ کیا ہے (لیکن یہ بھی ہستی کی لئے امانت) جب [illegible] ایک قیام کا نقشہ آئے جس کا نشان قرار دیا گیا۔ یہی نشان [illegible] ہے۔ یہی نشان سلطنت کا [illegible] حکومت کے سربراہ آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ قدرت میں [illegible]

پڑھیں جیسے وہی کام لیا جاتا ہے۔ اب یہ فن کا چند افراد کا کام ہے کہ وہ اس طرح اپنے فرائض بجا لاتے ہیں
ستارہ اور ہلال کا سا نہ معلوم وقت تک لا ابدی ہے۔ پاکستان۔ وطن اور قوم ان کی خدمت داری اُن کے
شہزادوں پر بار گراں۔ اس لیے بطریق احسن سبکدوش ہونا ان کا فرض ہے۔ کوتاہی قابل مواخذہ
[illegible] باعث سربلندی۔ جو کچھ کیا جا رہا ہے اگر اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا تو الحمد للہ کام گزشتہ دنوں سے زیادہ
ہو گیا۔ بہرحال دعا میں کرتا رہتا ہوں۔ تسلی رکھیں۔ میری دعائیں اگر وہ کسی کے لیے ہیں تو اُن کے ہی لیے ہیں
اللہ پاک انہیں توفیق دے کہ وہ خدا کی خوشنودی حاصل کریں۔ اس بات کو کرتا ہے۔ ہاں محبت کو کرتا ہے۔
خدا رحم میں راہ میں ثابت قدم رکھے آمین ثم آمین۔

منشی صاحب۔ ان صفحات کو جو لکھے جا رہے ہیں لکھنے کی کوشش کی [illegible] عنوان مطلب تو نہیں
نکال لینا۔ یہ باتیں ویسے ضمناً ذکر کی ہیں۔ ویسے ہم اللہ کا کام کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔ لہذا بس۔

آپ نے فرمایا ہے کہ [illegible] تک پہنچ گیا ہے۔ اشفاق اگر ملتا ہے
تو کہیں لاہور میں ملے گا۔ روزنامہ کا کام خود ہی کر لے گا اور اس کو [illegible] دیں گے۔ آپ تو یوں ہی فکر کرتے رہے
کہ [illegible] خدا کرے آپ کو [illegible] ہے۔ ایسے خیال دل سے نکال دیں۔ وہ [illegible] جاتی
ہے اس کو [illegible] قبول کر لیں۔ یہ کام خود بخود انجام پاتے رہتے ہیں۔

اشفاق [illegible] جلد فرما چاہیے۔ [illegible] سالانہ چندہ میں اپیل کر دیں تا کہ پرچہ
[illegible] نام جاری کر دیں۔ [illegible] کا رشتہ مزید پختہ ہو جائے۔ دیکھئے اشفاق صاحب جواب دیتے ہیں
یا نہیں۔ ان کی مصروفیت میں تو [illegible] ہے۔ اب اللہ ان پر مزید کرم نوازی فرماتے
[illegible] عرض کر دیں [illegible] والسلام [illegible]

جواب کا منتظر

دعاگو

[illegible]

[illegible]

II

٢٥٦

دوشنبہ
٢٩-١٢-٥٩

برادرم شفیق صاحب۔

السلام علیکم،

آپ نے اس سے پیشتر خط کا جواب نہ دیا۔ کس طرح فرمایا،
نہ کریں ہم آپ کے مکتوب کا [illegible] براہ [illegible]
تھے ہیں۔ خط [illegible] کریں۔ خواہ بات [illegible]
حضور کے [illegible] ۔ ستارہ صاحب، راجہ اور [illegible] ملاقات ہوئی۔
حضور کا صرف ارشاد تھا۔ کہ آپ [illegible] ستارہ کا [illegible] دربار [illegible]۔
ستارہ نے [illegible] کبھی [illegible] تھا۔ مگر [illegible] مسعود [illegible]۔ اس [illegible]
[illegible] آ گئے۔

حضور کا ستارہ خط آیا ہے۔ اور راجہ کو بھی [illegible] کا خط
[illegible] ۔ آپ سے بھی [illegible] ۔ [illegible] ۔ اللہ کا شکر ہے۔
حضور کا اللہ حافظ [illegible] ستارہ صاحب سے معلومات [illegible] ہوسکیں گی۔ کیا آج
[illegible] ضروری [illegible] ۔ [illegible]
کی ملاقات کو [illegible] ۔ راجہ سے بھی [illegible] کریں۔
[illegible] سے بھی [illegible] ذکر مت کرنا۔ [illegible]
کو اپنے تک ہی رکھیں۔ ضروری ہے۔ [illegible] ستارہ
ہے۔ جو کسی وقت [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] ۔ تو [illegible] السلام [illegible] عرض کریں۔ [illegible]
ستارہ [illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible]"
اب آج کو [illegible] ۔ ستارہ [illegible] ۔
[illegible] کا [illegible] کریں

آپکا
[illegible]

[illegible]

III

برادرِ محترم مفتی صاحب

السلام علیکم۔ آپ کے دونوں مکتوب موصول ہوئے۔ چند دنوں سے طبیعت پریشان خاطر رہی [illegible]
جواب میں تاخیر ہو گئی، معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے [illegible] مسودہ [illegible] [illegible]
مسودہ [illegible] [illegible] [illegible]
بہتر سمجھتا ہوں۔ [illegible] اتفاق [illegible] اس معاملہ میں
[illegible] صاحب الرائے [illegible] مسودہ [illegible] قابلِ عمل [illegible] اس کا
مشورہ دیں گے۔ البتہ ایک چیز میری سمجھ [illegible] لوگ کس طرح سمجھتے ہیں کہ وہ علیحدہ
ہو کر [illegible] ملک و ملت کی زیادہ خدمت کر سکتے ہیں [illegible] حالت کے؟ [illegible] گروہوں [illegible] بندگانِ خدا
[illegible] افراد کو ترجیح دے رہے ہیں۔ یہ چیز کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ دیکھیے [illegible]
[illegible] ذریعہ [illegible] سکتی ہیں۔

[illegible] کتاب [illegible] فرائض [illegible]
[illegible] ان شاء اللہ [illegible] مقامات [illegible] کر رہا ہوں۔
[illegible]
[illegible] کی فرصت ہے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible] فرائض سے فارغ
نہیں۔

آپ کے مکان کے متعلق راجہ صاحب [illegible] وہیں اُن کا [illegible] مکان

[illegible] مکان پر اپنا قبضہ کر دیا ہے ۔ تو آج بعد

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دعاگو

[illegible]

13.6.60

IV

محترم بھائی صاحب

سلام مسنون۔ آپکا عید کارڈ اور خط مل گئے تھے۔ بہت بہت شکریہ۔ میں اب خدا کے فضل اور بھائی جان اور آپ سب بھائیوں کی دعاؤں کے صدقے بالکل ٹھیک ہوں۔ صرف ذرا کمزوری باقی ہے سو جس خدا نے ایسی مشکل آسان کر دی وہی یہ تکلیف بھی رفع کر دیگا۔

آپ نے چیزوں کے متعلق لکھا تھا کہ بھائی جان نے فرمایا ہے باقاعدگی سے کھاتی رہوں۔ ان کے متعلق یہ عرض ہے کہ تقریباً مہینہ بھر سے نہیں کھا سکی۔ کیونکہ ان کے لئے پاکیزگی لازم ہے۔ اور جب سے آپریشن ہوا ہے میں اس قابل نہیں ہوئی کہ نماز پڑھ سکوں۔ اب جب بھی نماز شروع کر دونگی پھر باقاعدہ شروع کر دوں (انشاء اللہ)

قدسیہ کے متعلق معلوم ہو کر بہت افسوس ہوا۔ بیچاری کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ مجھے یہ معلوم ہوا تھا مگر اس نے یہ نہیں لکھا تھا کہ Miscarriage ہو گئی ہے یوں ذکر کیا ہوا تھا کہ دنوں پہلے ہسپتال گئی تھی۔

آپ نے اپنے تبادلہ کا بھی خوب لکھا ہے - کہ ہو (گیا)
ہی گیا ہے اور نہیں بھی ہوا - آپا عطیہ تک جانے
کا امید ہے اب تو فیصلہ ہو گیا ہو گا - خدا
بہتر کرے -

شہاب امید ہے روس چلے گئے ہوں گے - وہ
تین روز ہوئے تو ذکر آیا تھا کہ وہ ایک روز میں
جانے والے ہیں - ان بیچاروں کو بھی دوسری
پریشانی اٹھانا پڑی - میری بہن اور بھائی بہن
کی بھی - ہم دونوں کا دنیاوی ڈاکٹروں نے تو
علاج کر دیا - اب وہاں جا کے دیکھئے کہ دونوں
کا اصل مقصد پورا ہو جائے - اور ہماری سختیاں
بھی دور ہو جائیں - شہاب جیسے نیک اور شریف
آدمی کو نواب کھزان میرے ساتھ اتنا لمبا بھگتنا
پڑا - پچھ باقی خاندان کی پریشانیاں دیکھے
سے - شادی کی تو بیوی بھی کوئی خوشی نہ
دے سکی - پتہ نہیں کن گناہوں کی سزا
مل رہی ہے - خدا معاف کرے -

پتہ نہیں کیا لکھ گئی ہوں - بعض دفعہ
بہت پریشان ہو جاتی ہوں - معلوم نہیں
انجام کیا ہوگا - ان ا ر سالوں میں

بہت دکھ دیکھے ہیں - پر ناشکری نہیں کرنی چاہیے
پھر بھی ہزاروں سے بہت بہتر ہیں - ایک وہ بھی
ہیں جن کا دکھ میں کوئی سنگی نہیں بنتا یہاں کم از
غمخوار تو ہیں -

میرے خیال میں اب کافی ہو گیا -

بزرگان حال کی خدمت میں سلام -

ممانی جان کی خدمت میں بہت بہت سلام -
عرض کر دیجیئے گا -

والسلام

محتاج دعا

عفت

V

۱۸۔ حبیب اللہ روڈ لاہور
12-1-76

باسمہ سبحانہ

برادر محترم قبلہ مفتی محمد حبیب مسلمہ

السلام علیکم۔ بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا
مورخہ 20/12/75 کو غالباً میرا کوئی کام نہ تھا اور مورخہ 23/12/75 تا 2/1/76
تک ہائی کورٹ بند رہنے کے سبب میں خوشاب اپنے گھر چلا گیا
آپکا گرامی نامہ غالباً میری غیر حاضری میں یہاں پہنچا جو کوٹھی کے
نوکروں نے عام ڈاک میں رکھ دیا۔ چند روز ہوئے میں نے جب
وہ عام ڈاک کا پلندا دیکھا تو آپکا نوازش نامہ پا کر خوشی بھی
ہوئی اور ان نوکروں پر رنج بھی۔ اگر یہ لوگ مجھے وقت پر دیتے
تو میں آپ کو جواب جلد تحریر کر سکتا۔ حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ معذرت خواہ
ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ میں ایک شکستہ بیمار اور گنہگاران ذنوب

اللہ تعالیٰ آپ کو دین سے متعلق نیک ظن رکھنے کا اور مستقیم معاملات

حسبِ ارشاد میں نے دربار الٰہی میں دعا کردی ہے۔ نتائج خوشگوار

نظر آتے ہیں اللہ کریم برکت فرمائیں۔

سعادت صاحب کا گرامی نامہ محررہ مورخہ 12/5/65 کو موصول ہوکر

ملتی ایک مفصل خط انکی خدمت میں مورخہ 16/5/65 کو ارسال کیا تھا

جو کہ غالباً ان کو مل گیا ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سنسر والوں نے

اسے روک لیا ہو۔ کیونکہ اسمیں تاشقند کی ناکامی کا مفصل

حال تھا۔ آج میں انہیں دوبارہ خط لکھ رہا ہوں۔

حج کے متعلق مجھے بھی انہوں نے تحریر فرمایا تھا مگر ابھی امسال

تیاری ہے اور یہ نہیں بھی امسال حج کے لئے جاؤں یہ سال 65ء

میں مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو بلاوا

آیا تھا وہ میری اہلیہ صاحبہ کے خواب میں حضورؐ نے دوبار ان الفاظ

میں ارشاد فرمایا۔ "اچھا اسے بھیج دو۔" "بہت اچھا تم اسے

بھیج دو" ایک دفعہ کا حکم تو سال 65ء میں پورا ہوگیا۔ خدا کی شان ہے

نہ میرے پاس پیسہ تھا۔ نہ دو خواہشات ہی رہی تھی اور نہ ہی ارادہ ہی تھا

لیکن اتنی بات تھی کہ حضورؒ کا حکم آگیا اور میں مطمئن ہو گیا۔ اس سال بھی حالات وہی ہیں۔ میں نے درخواست دی ہے۔ نہ میرے پاس کوئی روپیہ ہے نہ ہی کوئی ایسا ذریعہ کار گر نظر آرہا ہے بجز اس بات کے کہ مستجاب خدمتی ہے میں اس سال حج کے لیے آجاؤں۔ ممکن ہے حضورؒ کا دوبارہ ارشاد مجھے پھر موقعہ عطا کر دیوے۔ آپ نیک آدمی ہیں میرے لیے دعا کریں کہ میں اس سال پھر حضورؒ کے قدموں پر سر رکھ سکوں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ضرور حج کرائیں اگر ہو سکے تو اسی سال

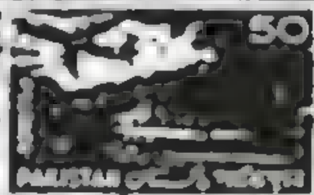
مستجاب کی آمد کی منظوری تو سرکار عالم نے عرصہ قریب نو دس ماہ سے عطا فرما دی تھی لیکن نہ معلوم عمل درآمد ہونے میں کیا دیر ہے میں نے خود شیخ صاحب کو لکھا تھا کہ وہ واپس آجاویں لیکن انہوں نے اس بات کو پسند نہ کیا تھا۔ ان کے نہ آنے سے سلسلہ دعوت کو جو نقصان ہوا ہے حد تحریر سے باہر ہے۔ یہاں چار درویشوں نے صدر پر اپنے زور کا غلبہ حاصل کیا ہوا ہے کہ بعض معاملات میں اسکی عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہے کہ پوری قوم نے یک جہتی سے ان کا ساتھ دیا۔ میں نے صدر صاحب کو مختلف اوقات میں ہدایات

کیونکہ مجھے معلوم اب ہوتا ہے مرا نہیں معلوم نہیں ہوگی یا اگر ووٹ
ہونے کے بعد انہوں نے عمل نہیں کیا تو پوری قوم کا مولیفین ہے۔ شہاب
اگر وقت پر واپس آ جاتے۔ مسٹر بھٹو کے ہمراہ ہی تو ہم سیکیورٹی
کونسل کی میٹنگ۔ اگر میں وہ ہوتے تو بہتر کوئی نتائج بھی برآمد ہوتے
میں نے صدر سے کہا تھا جو وقت ہی ڈیڑھ دہلی کا دورہ تھی
جب تک شہاب ان ملاقاتوں میں شامل نہ ہوتے وہ غلطی نہ
سرزد ہوتیں۔ افسوس ہے کہ صدر نے سخت غلطی کی ہے۔ قوم کا
اعتماد کھو دیا ہے کیونکہ چار درویش کامیاب ہیں۔
کل مدینہ میں طلبا سے ملاقات ہوئی۔ یہ مسلح مدینہ شریف سے
فتح مکہ کو سامنے لے رہے تھے دستری کی ذلیل موت کا ذکر ہے
چار ماہ پہلے صدر کو کہہ دیا تھا۔ شہاب کو بھی لکھا تھا۔ خدا
جانے صدر میں کیوں اتنی بصیرت نہیں جبکہ میں نے اپنی مکمل اور
مفصل عادت کے علاوہ مکہ شریف سے ایک تعویذ بھی دیا تھا
اور میں وہاں وعدہ کر آیا تھا مگر اب کا نہ کرنا چھوڑ گیا۔ اب جو خدا
کو منظور ہو۔

امید ہے کہ آپ کبھی کبھی یاد فرماتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو
سلامت رکھیں۔ والسلام۔ نیازمند عبدالغفور ایڈووکیٹ

BY AIR MAIL

AEROGRAMME



His Excellency [illegible] Shahid
Pakistan's Ambassador to
Holland - The Hague.
Holland.

Second fold here

Hafiz [illegible] Malik
[illegible]
4. [illegible] Road [illegible]

۲۶ فروری [illegible]

[illegible] ثاقب برادرم محترم و حمیدہ صاحبہ

السلام علیکم - عید مبارک - آپکا عید کارڈ موصول ہوکر

باعث راحت ہوا - چونکہ آپکا اصرار تھا کہ آپ کو ایک مفصل خط

[illegible] ذہن پورے طور

[illegible] صاحب کی وفات

[illegible] کی تحریر کردی اور وہ تعویذ جو میں صدر صاحب

[illegible] ایک بزرگ سے لانا تھا میں بھیج دیا

[illegible] اور صدر صاحب کا دورہ

[illegible] الفاظ میں لکھے

اگر وہ خط آپکے [illegible] جاتا تو [illegible] کے بعد کی خاطر

[illegible]

[illegible] کا خیال تو کرتے ہیں لیکن

[illegible] خطوط [illegible] ہوتے ہیں - [illegible]

وہ خطوط [illegible] کے لئے از حد بہتر ہوتے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کر دی لیکن بے نتیجہ رہی

[illegible]

[illegible] شکر ہے کہ [illegible]

[illegible] تو کیا ان ملکوں میں [illegible]

[illegible] صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]

[illegible]

[redacted]

[illegible]

5۔ [illegible] برداشت کر سکیں گے

6۔ [illegible] کے باوجود [illegible]

[illegible] پاکستانی افواج [illegible]

[illegible] کشمیر کا مسئلہ [illegible]

[illegible] حکومت پاکستان [illegible]

7۔ [illegible] حکومت کا [illegible]

[illegible]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible]

[illegible]

VII

پنڈی:
۱۷ اکتوبر ۶۴

مکرمی۔ السلام علیکم

آج آخرکار وہ تاریخ بھی آگئی جس روز ہم پنڈی سے وداع ہوئے تھے۔ پنڈی کی اہمیت محض دربار اور بھائی جان کی وجہ سے ہے۔ الوداع کی اہمیت محض اس وجہ سے ہے کہ اس عمل میں واپسی کا شائبہ لرزتا ہے۔ البتہ تاریخ کی اہمیت کچھ بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ بات جیسے کہ مادیت کا ایک جانا پہچانا پیمانہ ہاتھ میں رہے! (ورنہ یوں تو: اسی تاریخ کو انگلستان میں ٹوری پارٹی کی شکست ہوئی اور روس میں خروشچیف کا اقتدار ختم ہوا، اور ...... خیر!!)

اس ایک سال کا جائزہ لیا، تو ایکا ایکی آپ کے پیار کا ایک اور چھلکا ادھڑ گیا۔ آغاز میں تھوڑی بہت رضا اور کچھ رغبت کا دخل ہو سکتا ہے۔ لیکن اب آخر میں یکسر مجبوری اور لاچاری۔ چنانچہ یہ نیا چھلکا اترا نہیں، بلکہ ادھڑا ہے۔

پہلے مجھے یہ شکایت رہی کہ جب بھی نماز روزے، ورد وظائف میں شدت پیدا ہوئی، چھاڈر دل کی پھڑپھڑاہٹ میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ "منکشف" ہوا، کہ اس کی حقیقی وجہ کچھ اور تھی۔ در اصل نماز روزے، ورد وظائف کا مقصود

نہ اللہ تھا نہ اللہ کا رسول۔ رسمی عقیدے چھاڑ رہی تھیں اور ان کی جگہ ٹوٹ پھوٹ تھی۔ کیسی بیان کی لطافت اور کلام کی بلاغت نے ہمیشہ اس کو رنگین بنا کے دکھایا۔

—

بیان کی لطافت اور کلام کی بلاغت بھی اللہ میاں کی پسندیدہ صفات میں سے ایک صفت ہے۔ یہی ایک صفت آڑے آگئی۔ اسی صفت کی شان بے نیازی کے صدقے ہم گنہگاروں کا ہذیان بھی عرفان بنتا رہا۔

—

کیسی کتاب ہے؟

—

پچھلے ایک برس میں پہلے سے کہیں زیادہ نماز روزہ، ورد وظائف کا مشغلہ رہا۔ لیکن نہ تو کوئی جھاڑ اڑی، نہ کسی سے پڑ پھڑائے — باطن میں وہ تاریکی چھٹ رہی تھی جس میں جھاڑیں بیدار ہوتی ہیں۔ لیکن ظاہر کی حس کو یہ روشنی اندھیرا نظر آنے لگی۔ دشمنوں نے اس عالم میں سڑک پر جھاڑو دینے والا مہتر آگے بڑھا، جیل کا چار دیواری کا داروغہ بھر کر آ گیا —— اور آپ کے پیارے کا یہ چھلکا بھی ادھڑ گیا۔

خدا جانے ابھی کتنے اور چھلکے باقی ہیں؟ لیکن ترقی کے اس زینے میں مسرت اور شادمانی کا کچھ اور ہی نشاط ہے!

—

۳

اب آمدم بر سرِ مطلب :-

۱ - شبیر محمد کے متعلق آپ کے خط کا انتظار رہا - فی الحال اسے دو کورس دیدیں -

۲ - دو سو روپے کا منی آرڈر حسبِ ذیل پتہ پر بھیج دیں :-

محمد اشراق خان
۴۷۶
تھانہ پولیس - باغ - آزاد کشمیر

۳ - کچھ عرصہ پہلے فرزند جیب کو بہاولپور پانچ سو روپے کا منی آرڈر آپ نے بھیجا تھا - اس کی رسید ملی یا نہیں ؟

۴ - معلوم نہیں کہ آپ کے پاس شرح بالا جو حساب کل کا پورا فوٹو بنا کر گئی ہے بھی یا نہیں ہے ؟ آخر ہیں تو بے تکلف لکھ دیں - میں صرف اس کی وجہ سے تکلیف کر رہا ہوں کہ آپ بھی کبھی (دنیا داری کے معاملات میں) تکلف کا نام نہ لیجئے - (دین کا تکلف البتہ اپنی جگہ ہے !!)

نیاز مند
محمد اشفاق احمد

VIII

38/8

دہلی
۲۶ / اگست

مکرمی - السلام علیکم

ابھی ابھی آپ کا چوتھا خط ملا ، جس پر شاید غلطی سے پانچواں نمبر لگا ہوا ہے ! اپنی تاخیر کی وجہ کل لکھ چکا ہوں - امید ہے مل گیا ہوگا۔

خدا خدا کرکے آپ مشکل گھاٹی سے نکل آئے ہیں - دعاؤں نے بڑا ساتھ دیا ۔ تمنائے مقسوم تو اٹل ہوتی ہے - لیکن قضائے مبرم دعا سے ٹل جاتی ہے - خدا کا شکر ہے کہ وہ ٹلی - بھائی جان اور ساجدہ کی ضرور دعا کرتے رہیں -

پرانی گھاٹیاں آسان ہوتی تھیں - حمّاد ڈرون وغیرہ کی آمیزش سے منزلیں رنگین رہتی تھیں - اب دوسری بات ہے - ایک تو لق و دق صحرا - پھر اس میں گھاٹیاں - اور وہ بھی خط الاستوا کی ! خدا کا شکر ہے کہ وحشت طاری نہیں ہوئی۔

آپ کے خطوط میں جو امور جواب طلب ہیں ، ان کے متعلق الگ لکھوں گا -

بھائی جان و ساجدہ صاحبہ سے دعا کی درخواست میں دیر نہ کریں -

نیاز مند
[illegible]

Letter Posted
on 1.9.65.

ڈیئر بیگ -

IX

۳ رفروری - ۱۹۶۷ء

محترمی - السلام علیکم

خط سے خبریں معلوم ہوئیں - معلوم نہیں کیوں، مجموعی تاثر
آپ کا کچھ depression کا ہوا - چند خبریں ہی ایسی تھیں -

۱- رشید فاروقی کا فارم الطاف گوہر کو روانہ کر دیا
ہے - براہ راست Est. Div کو بھیجنا مناسب نہ
تھا - مجھے خبر ملی ہے کہ ڈپٹی سیکرٹری کے لئے اس کا نام
منظور ہو چکا ہے -

2- یہ سن کر تسلی ہوئی کہ بھائی جان کی طبیعت پہلے سے کچھ
بہتر ہے - میرا سلام ان تک پہنچاتے رہیں - عفت کا بھی -

3- دانی کو کیا ہوا؟ خدا رحم کرے - مجھے ہمیشہ سے ڈر
رہا ہے کہ روحانی بزرگوں یا مقامات پر دنیاوی خواہشات
لے کر جایا جائے، تو مبتدی کے لئے اس میں مایوسی کے
خطرات ہیں - ابتدا میں معاملات دنیا کے لئے اہل دنیا کے
پاس اور دین کے لئے اہل اللہ کے پاس جانا چاہئے - جب عقیدہ
راسخ ہو جائے، اور دل میں صبر اور شکر کی ہمت پیدا ہو تو
پھر دونوں چیزوں کو خلط ملط کیا جا سکتا ہے ---- اگرچہ

خطرات پھر بھی بدستور قائم رہتے ہیں۔ والی سے کنارہ کشی نہیں ہونا
چاہیئے۔ اس کے ساتھ رابطہ جاری رکھنا چاہیئے۔ نہ معلوم
کس وقت مقلب القلوب اس کی حالت بدل دے۔

4۔ آپ کی ڈونالڈ اوبری کو ضرور پریشانی ہی ہوا ہوگا۔ انہیں دوسری
بات کا خطرہ نہیں ہے۔ ان کے اعمالنامے میں درج ہے کہ ان کا عمل
محض ہم جنس باہم جنس پرواز پر ہے۔ اسی یادداشت میں اکیلا رانش
پشاور یونیورسٹی سے خارج بھی کیا گیا تھا ——— علاقہ سرحد میں
یہ پابندی شاید طبقہ نسواں پر ہی ہے۔ مرد اس سے مستثنیٰ ہیں!

5۔ نقوش کا آپ بیتی نمبر بالکل ذہن سے اتر گیا تھا۔ آپ
نے لکھا تو یاد آیا۔ ابھی تک کچھ لکھا نہیں ہے۔ اگر دو مہینے
کا وقت ہو تو کچھ بھیج دونگا۔ اس سلسلے میں آج ہی طفیل کو
بھی خط لکھ رہا ہوں۔

6۔ جیسا پہلے بھی لکھ چکا ہوں، یہاں آنے کے بعد بہت عرصہ تک
ذہنی جمود چھایا رہا۔ رمضان شریف پر تکیہ تھا، لیکن
بارہ روزے بھی گزر گئے اور کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں
مار مار کر شل ہو گیا۔ ہمیشہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ مخالف
عناصر (دنیاداری نہیں) نے چاروں طرف بند باندھ رکھے ہیں۔
ناکامی کا احساس بڑھتا رہا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ
یقین بھی تھا کہ ناکامی کی وجہ اپنے شوق کی کوتاہی ہے۔

یہ بھی عجیب گورکھ دھندا ہے ۔ مجاہدہ میسر ہو تو شوق میں کوتاہی رہ
جاتی ہے ۔ شوق تیز ہو تو مجاہدہ کمزور رہ جاتا ہے ۔ ان دونوں
کو ہم آہنگ کرنا اپنے بس کا روگ تو ہے نہیں ۔ چنانچہ مجبور ہو کر
ہاتھ پاؤں ڈال دئیے ۔ جہاں محنت اور شوق دونوں اپنی
اپنی جگہ ناکام رہے تھے ۔ وہاں عجز کی بے بسی کام آگئی ۔
اپنی محنت ، کوشش ، یا شوق سے حالات پر قابو پانے کی کوشش
میں ایک طرح کا دعوےٰ ہوتا ہے ۔ عاجزی میں مجبوری
اور صبر ۔ نتیجہ ظاہر ہے ۔ چنانچہ اب چند یوم سے کچھ
افاقہ محسوس ہو رہا ہے ۔ خدا کرے یہ رَو جاری رہے ۔
اپنا جائزہ لیا ، تو اس اندرونی بندش کی وجہ
کچھ کچھ سمجھ میں آئی ۔ پچھلے اگست میں جب واقعات نے پلٹا
کھایا ، اور صبح و شام مری کام نا جانا شروع ہوا ، تو جو
نتیجہ نکلا اس میں خدا کی کوئی بہتری ہی تھی ۔ زبان سے بھی
کہا ، دماغ سے بھی سمجھا ۔ لیکن دل میں کہیں ، کسی خفیہ
گوشے میں شکست کا احساس چھپا رہا ، کہ آخر ایسا
ہوا تو کیوں ہوا ؟ پاکستان میں تو دعوتوں ، دوستوں ،
عزیزوں کے ہنگاموں میں یہ احساس دبا رہا ۔ لیکن یہاں
کی تنہائی اور دفتر کے عالم بیکاری میں نے اندر ہی اندر
اس احساس کو ہوا دی ۔ خدا کی طرف سے بہتری

کا انتظام ایک طرف ، اندر ہی اندر یہ احساسِ شکست
و مایوسی دوسری طرف ۔ اس تضاد اور خلیج میں
دل اور دماغ اور روح کے لئے جو جو بند نہ بندھیں وہ کم
ہیں ۔ یہ تضاد ایک قسم کا کفرانِ نعمت تھا ۔ شکر
ہے کہ اب یہ بات سمجھ میں آگئی ۔ چنانچہ اب میں نسبتاً
نارمل محسوس کر رہا ہوں ۔ اب انشاءاللہ جلد ہی لکھنا بھی
شروع کر دوں گا ۔

7 ۔ راجہ صاحب کا خط مل گیا تھا ۔ اُسے بھی ایک دو روز میں جواب دوں گا ۔
عکسی کا کیا حال ہے ؟ مولوی صاحب اب نئے نئے فقرے بولنے لگے
ہیں ۔ عفت اس کے ساتھ مگن ہے ۔ اسلم اور شیر محمد سردی
کے مارے کمرے میں دبکے رہتے ہیں ۔ سرفراز نیو یارک چلا گیا ۔
راستے میں دو روز یہاں ٹھہرا تھا ۔ اس کے ساتھ بہت زیادتی
ہوئی ہے ۔ کشمیر منسٹری سے ممتاز کا پتہ مل سکے تو لے کر
مجھے بھیج دیں ۔ جو پتہ میرے پاس تھا ، اس پر خط لکھا تھا ۔ لیکن
جواب نہیں آیا ۔ شاید کہیں اور تبدیل ہو گیا ہو ۔ خدا را
جلد لکھ دیا کریں تو اچھا ہے ۔ مجھے بھی جلد جواب دینے کا
بہانہ ملتا رہے گا ۔ راجہ صاحب کو سلام ۔

شہاب

بیادِ منیر ،
[illegible]

X

سرینگر

3.5 جون 1964

مکرمی - السلام علیکم

وہاں کے ہنگامے اب امید ہے کچھ ساکن ہو چکے ہونگے - انسان کی شکل و وضع کیا کیا رنگ اختیار کرتی ہے - لیکن قدرت کی ستم ظریفی کا ایک چھینٹا سارے رنگ دھو ڈالتا ہے - خدا تو عالم الغیوب اسی مناسبت سے کہا گیا ہے -

2 - شیخ صاحب آئے تو پنڈت جی لد گئے - دیکھئے شیخ و برہمن کا یہ روایتی اونٹ اب کشمیر میں کس کروٹ بیٹھتا ہے -

اس دوران میں دانی صاحب کیسے کیسے چمکے ؟ کیا انہوں نے وہ پرانا ناطہ واقعی منقطع کر دیا ہے ؟ نہ کیا ہوتا تو اس وقت ان کو اور بھی سہارا ملتا - انسان کی جلد بازی بھی کیا کیا گل کھلاتی ہے -

3 - میری بھی یہی خواہش ہے کہ آپ کے ہاں کا

موجودہ گروپ کام کر رہا ہے۔ کام اچھا ہو رہا ہے۔ لیکن عنادی اور فسادی عنصر بھی گھات میں لگے ہی رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں خبروں یا افواہوں سے مطلع کرتے رہیں۔

4 - میں اب پھر سے اپنے پروگرام میں لگ گیا ہوں۔ پچھلے چھ ماہ گویا tuning کا عرصہ تھا۔ اب wave-length کی frequency صحیح کیسی جا رہی ہے کا کچھ کچھ سراغ ملنے لگا ہے۔ دعا کرتے بھی رہیں اور بھائی جان اور ساتھی صاحب سے کرواتے بھی رہیں۔

5 - اس چھ مہینے میں تزکیۂ نفس کی سعی لاحاصل بھی کی۔ نفس تو موٹا ہی رہا لیکن جسم ضرور پتلا ہو گیا۔ تقلیل طعام، تقلیل منام، تقلیل کلام، اور تقلیل انام کا مفہوم سمجھنے کی بھی تھوڑی بہت کوشش کی۔ چنانچہ اب تک 19 پاؤنڈ وزن گھٹ چکا ہے۔ دنبہ ذبح کر کے ساڑھے نو سیر چربی تسلے میں ڈال کر سامنے رکھیں تو صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر بیگار بوجھ اتر گیا ہے!

6 ۔ دلوتی سے کہنا تو محال ہے ۔ لیکن ذوقاً یہی اندازہ لگتا ہے انشاءاللہ اگلے سال ارض منور کی زیارت نصیب ہوگی ۔ قیام طویل ہوا یا مختصر، ہر صورت میں آپ کی شراکت کا اہتمام بھی ضرور ہوگا ۔ انشاءاللہ ۔

7 ۔ بیٹی بخیریت پہنچ گئی ہے ۔ اب اپنی والدہ کے پاس پڑھنے جا رہی ہے ۔ عون خیریت سے ہے ۔ اور آپ سب کو سلام کہلواتی ہے ۔ ثاقب بفضلہ خوش و خرم ہے ۔ اکثر "منشی صاحب" اور "دوجے صاحب" کو یاد کرتا ہے ۔

8 ۔ آپ کے خط اب دیر دیر سے آنے لگے ہیں ۔ وجہ ضرور مصروفیت ہوگی ۔ مصروفیت کا لحاظ بھی لازم ہے ۔ لیکن کم از کم ہفتے میں ایک خط کی رفتار اگر قائم ہو جائے تو شاید زیادہ گراں نہ گزرے ۔

9 ۔ نماز کے بارے میں مزید خبر دیں ۔ کیا کوئی ڈاکٹر یہ بتا سکتا ہے کہ اس کے کان کے لئے کس قسم کا آلہ مفید رہے گا ۔

والسلام

نیاز مند

فرحت الرحمان

١٦/٦

XI

مکرمی۔ السلام علیکم

دونوں خط مل گئے۔ بھائی جان کا ارشاد سن کر
دل مطمئن ہو گیا۔ ان لوگوں کی باتیں وہ لوگ ہی جانیں۔
اپنا کام تو فقط یہ ہے کہ جب تک بشارت نہ سن لیں
منتظر رہیں۔ جب سن لیں تو مطمئن ہو کے بیٹھ جائیں۔
چنانچہ اب بیٹھے ہیں!

بھائی جان اور ساسی جی کی خدمت میں میرا سلام
عرض کرتے رہیں۔

۲۔ 5 جولائی کو مجھے لندن سے بلاوا آیا تھا۔ آٹھ
دن وہاں رہ کر پرسوں ہی واپس آیا ہوں۔ [بھائی جان
بھی تو 5 جولائی ہی کو بولے تھے!

لندن میں اچھی ملاقاتیں رہیں۔ دنیا کا
ہر موضوع زیر سخن آیا۔ لیکن واپسی کی بات نہ
انہوں نے اٹھائی نہ میں نے۔ دونوں کا انداز

کچھ ایسا تھا، کہ "مجھے کیا پڑی ہے کہ میں یہ ذکر چھیڑوں
تمہیں غرض ہو تو بولو۔" چنانچہ دونوں اس موضوع پر
خاموش ہی رہے ۔ اس میں بھی اللہ تعالےٰ کی حکمت پوشیدہ
ہے ۔ آم کو درخت پر لگا رہنے دیں، تو وہ سرد
گرم کھا کر خود بخود موسم کے مطابق پکتا ہے ۔ اگر اسے
پرالی میں رکھیں، تو دوسروں کی مرضی کے مطابق پکتا
ہے ۔ شاید اللہ تعالےٰ کو یہی منظور رہو، کہ دونوں
ایک دوسرے کی پرالی سے محفوظ رہیں اور فقط اُس
واحدِ ذات کی رضا کا انتظار کریں ۔ واللہُ اعلم ۔

۳ ۔ نقوش کا آپ بیتی نمبر دیکھا ۔ بہت اچھا ہوا
کہ میں کچھ نہ لکھ سکا ۔ ورنہ آپ کے مضمون کا آخری
حصہ بے معنی ہو جاتا! اب کم از کم آپ کے مضمون
کی وجہ سے کچھ نہ کچھ بھرم تو قائم رہتا ۔

۴ ۔ لندن میں جاوید سے بھی ملاقات ہوئی تھی ۔ اس

کے ساتھ اشفاق اور قدسیہ کے متعلق گپ ہانکنے کا
موقعہ ملا۔

۵۔ راجہ صاحب، خان صاحب کو ہم سب کی طرف سے
بہت بہت سلام۔ اگر درانی صاحب بھی اپنے ذہن کی
غلام گردشوں سے نکل آئے ہوں تو ان کو بھی سلام۔
جو کچھ اچھا برا وہ محسوس کرتے رہتے ہیں وہ محض
~~معمولہ~~ متخیلہ کا خلل ہے۔ علاج اس کا
اچھا ہے تو لگتا نہیں ہے۔

٦۔ عفت سلام لکھواتی ہے۔ مولوی صاحب بدستور
مفتی صاحب کو اور راجہ صاحب کو یاد کرتے ہیں۔

دعا گو
نیازمند
قدرت اللہ شہاب

۷

XII

پتہ

۲۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء

مکرمی السلام علیکم

آپ کے چاروں خط تقریباً ایک ساتھ ملے ۷ ستمبر اور ۱۲ ستمبر والے پوسٹ کارڈ اور ۲۳ ستمبر اور ۵ اکتوبر والے خط - تاخیر لازمی تھی - غالباً اب تک ہوائی ڈاک کا نظام بحال ہو گیا ہو گا -

۲ - اللہ تعالیٰ نے پاکستان پر جو فضل کیا ہے ، وہ مقام شکر بھی ہے اور مقام عبرت بھی - ہم لوگ جیسے جھوٹے سچے مسلمان ہیں وہ تو ظاہر ہی ہے - اس پر بھی خدا نے ہمارے نمائشی ایمان کی لاج رکھ لی - آزمائش کے وقت جو خوارق وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ مستثنیات ہوتے ہیں عادتاً نہیں - اس لیے ان پر شادیانے بجانا یا آئندہ کے لیے ان پر تکیہ کرنا مناسب نہیں - اصلی چیز تو تیاری ہے - اسلحہ بندی کے علاوہ ایمان کی تیاری بھی -

۳ - افراد اور قوموں کی زندگی میں دکھ بھی

بڑا اثر رکھتی ہے۔ کچھ لوگ اپنے لئے دعا کرتے ہیں کچھ دوسروں کے لئے۔ کچھ دین کے لئے دعا کرتے ہیں کچھ دنیا کے لئے۔ یہ سب دعائیں اپنی اپنی جگہ جائز، ضروری اور موثر ہیں۔ لیکن کچھ لوگ، خال خال، ایسے بھی ہیں جو محض اللہ کی رضا کے لئے اس کی عبادت کرتے ہیں۔ جب تک کسی ملک یا قوم میں دو چار ایسے لوگ موجود ہیں، اس پر مصیبت تو آسکتی ہے لیکن تباہی نہیں۔ دعا اور کوشش کریں کہ پاکستان میں ایسے لوگ ہمیشہ موجود رہیں

۴۔ ہندوستان کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔ بین الاقوامی منڈی میں بھی انصاف اور ایمانداری بہت کمیاب ہے۔ ہمارے لئے ابھی آزمائش کا دور شروع ہوا ہے۔ ختم نہیں ہوا۔

۵۔ پہلے میرا خیال تھا کہ R.C.D. تعاون یا U.S.A. ٹونڈہ کی آسانی کے لئے درخواست دوں۔ ان دو جگہوں نے قومی بقا کی پہلی جنگ میں بڑا اہم پارٹ کھیلا ہے۔ ان مقامات پر تعمیرنو کی ایسی بنیاد پڑنی چاہئے جو آئندہ ہمیشہ ہمارے لئے مشعل راہ اور

ہندوستان کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہو۔ لیکن
پھوپھی نے تدریس قبل از وقت ترک کر دیا۔ ایمان اور استقلال
کے ساتھ انتظار کرنا چاہئے۔ شاید ان کو یا کسی اور جگہ
کی اس سے بھی زیادہ عظمت ملنے والی ہو۔

۶ - ممتاز کی کوئی خبر ملی؟ اس کا ضرور پتہ کریں۔
اور اس کے ذریعہ اس کے لواحقین کا بھی۔ اس کو جو بچے
پیچھے تھے اس کی بھی تفتیش کریں۔

۷ - اگر عکسی کا ارادہ بدل گیا ہے تو کیا مضائقہ
ہے۔ فوج میں شارٹ کمیشن بھی، خاص طور پر اس وقت،
alternative profession
بڑی اہم ہے۔ البتہ چند سال بعد
کی شاید ضرورت پڑے۔ اگر اس کے متعلق اس کا ذہن
صاف ہے تو پھر CSP میں کیا دھرا ہے؟

۸ - طور آذر کا خیال کرتے رہیں۔ راجہ صاحب
اور والی صاحب کو سلام دیں۔ بھائی جان اور سب ہی کی
خدمت میں دعا کے لئے عرض کرتے رہیں
عفت اور سلوی کو بہت بہت پیار۔

والسلام
نیاز مند
[illegible]

XIII

نمبر 36 II

باسمہٖ سبحانہٗ

پیارے ثاقب ہمشیرہ صاحبہ و برادر محترم

السلام علیکم

آج بہت عرصہ کے بعد [illegible] تحریر کر رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے [illegible] خطوط سنسر والوں نے روک لیے ہیں اور آپ تک ان خطوط کی رسائی نہیں ہوئی حالانکہ ان میں جو کچھ تحریر تھا وہ ملک و ملت کی بہبودی کے لیے تھا اور اگر ان ہدایات پر عمل ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ نے جس نہ صرف نصرت و کامرانی عطا فرمانی تھی بلکہ آج تک اسلامی بلاک مستقل خطوط پر قائم ہو جاتا ان پچھلے مہینوں میں بھی کچھ خاص نہیں آیا اور کام اور سلسلے [illegible] جناب صدر صاحب کو جو پروگرام [illegible] نہ پہنچ سکا۔ نامعلوم وہ کس ردی کی ٹوکری میں پڑے ہوں گے۔

اعلان تاشقند کو لوگ تو بہت ہی برا سمجھتے ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس حسن قدم سے خدا نے ہماری عزت رکھ لی ہے ورنہ یہ پورا سال جن خطرات سے پُر تھا ان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر رحم فرمائے۔ یہ سال بڑی اہمیت کا سال ہے جس میں بڑی بڑی تبدیلیاں [illegible] اللہ [illegible] پاکستان کے عوام [illegible] آپ دعا کریں۔

میں نے آپ کا [illegible] سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش کیا تھا۔ حضور نے رکھ دیا ہے۔ شاید اس سال آپ [illegible] میں انشاء اللہ موقعہ پا کر کوشش کروں گا اگر سرکار نے منظوری عطا فرما دی تو زہے نصیب۔ وہ بزرگ بابا جن نے صدر صاحب کے لیے لکھ دیا تھا کئی مرتبہ مجھے مدینہ میں ملے ہیں اور جب بھی ملے ہیں تو مجھے دیکھتے

ہی بس پڑتے ہیں اور جو بعد انہوں نے کہا ہم کو ایک بار پہلے استنبول
مکہ شریف بھیجے۔ میں نے مسٹر A.B. Awan کو خط لکھا ہے
کہ وہ میرے یار ہیں کہ مجھے مکہ شریف بھیجیں لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے
کہ یار زیادہ دنیادار ہے پیسہ اب بہت بنا لیتا ہے

میں نے ایک تھوڑی ہی پہلے دعا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب کی
نماز میں آپ کی بیوی کو حضور نے لاؤ ارشاد فرمایا صرف مجھے جیسے صرف اب دوسری
مرتبہ باقی ہے ایک مرتبہ تو کرم ہو چکا ہے تو حضور نے مسکرا کر فرمایا کہ
ابھی پاکستان میں کام بہت زیادہ باقی ہے تو میں رو پڑا اور حضرت سیدنا
حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سفارش بھی کروائی ابھی میرا کیس بھی
pending ہے آپ نیک آدمی ہیں میرے لیے دعا کریں میں مدینہ منورہ
کی سرزمین سے بہت ہی اداس ہوں۔ ممکن ہے حضور کرم فرمائیں اور جلد ہی۔

کاش! کہ ہمارے زمانے قوم دنیادار کی بجائے دیندار ہوتے
تو اس ملک کو چار چاند لگ جاتے۔ کیا کیا جائے دین کی بات ان کے ایک
کان سے سن کر دوسرے سے نکل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی مالک الملک ہے
اور حقیقی حکومت میں کسی کو دخل نہیں اب ہماری دعاؤں کو رد نہ فرمائیگا
ایک بہت بڑا معرفانی الفضل ہے بہت ہی عنقریب آ رہا ہے اللہ کا
مظلوم و محکوم مخلوق کو سرفرازی بخشی جائیگی ظالم اپنے لاؤ لشکر
سمیت غرق کیا جائیگا۔

آج جب ثاقب صاحب تو حل نے چاہا کہ آپ کے لیے کوئی تحفہ بھیجوں
لیکن ابھی تک کوئی سمجھ نہیں آئی کہ کیا بھیجوں؟ آپ خدا را ثاقب ہی سے پوچھ
لیں کہ آپ کو کیا مطلوب ہے تاکہ میں آپ کو بھیج دوں۔ ہمشیرہ صاحبہ
کو بہت بہت سلام۔ لیکن تو ہی جانتا ہے لیکن دنیاداری حائل ہے
خدا تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے والسلام

نیازمند
محمد عبدالغفور

XIV

بسمہٖ

۲۳ دسمبر ۱۹۶۷ء

محترمہ - السلام علیکم

دونوں خط مل گئے - DFP میں بھیجے جانے کی تجویز محض فضول ہے - آپ فوراً قاسم رضوی سے بات کریں - کہ ساٹھ سال ہونے میں فقط ایک برس باقی ہے - ذاتی وجوہات پر یہ عرصہ یہیں گزارنے دیا جائے - میری طرف سے بھی یہی پیغام ان کو دیں - نیز رشید سے بھی میری طرف سے کہدیں کہ یہ پروپوزل ختم ہونا چاہئے - مزید کوائف سے بروقت مطلع کرتے رہیں - بابا کے پاس بھی جا کے دعا کی جائیں - اور اللہ پر بھروسہ رکھیں - جو کچھ بھی ہوگا اسی کی رضا سے ہوگا - تدبیر شرط ہے - تدبیر کامیاب ہوگئی تو توفیق الٰہی سمجھا جائے - ناکام ہوئی تو بے شک تقدیر الٰہی ہے -

۲ - ساٹھویں سال کے بعد کا پروگرام ابھی سے طے کرنا کیا ضرور ہے؟ انشاءاللہ ایسی ایسی راہیں کھلتی رہیں گی جن کا

ہم جیسے بے ہنر وہم وگمان بھی نہیں رکھتے ۔ اللہ تعالیٰ
اپنے بندوں سے اپنے وقت پر خود ہی کام لیتا ہے ۔

۳ ۔ وزیر سے کیا واقعہ ہوا؟ ذرا تفصیلی لکھیں، تو ہم
بھی کچھ مزا لیں ۔

۴ ۔ ۱۹۶۵ء میں ان شاء اللہ ملاقات کی قوی امید ہے ۔
ہوسکتا ہے کہ پہلے کسی وقت ہفتہ بھر کے لئے چھٹی پر
آ جائیں ۔ لیکن ابھی کوئی امر طے نہیں ہے ۔ صرف سال
طے محسوس ہوتا ہے ۔ پہلے اتنا بھی احساس نہ تھا ۔
رہا مہینوں یا ہفتوں یا دنوں کا تعین، یہ اپنے
بس کا روگ نہیں ہے ۔ آپ میسی گیٹ سے پنڈی کلب
کو دیکھنے کی کوشش کریں تو کچھ بھی نظر نہ آئیگا، سوائے
اس احساس کے کہ مال روڈ پر کہیں ہے ۔ بڑھ کر ڈاک خانہ کے
پاس کھڑے ہو کر دیکھیں، تو سامنے ہوگا ۔ کوئی کہیگا
چار سو گز دور ہے کوئی کہیگا پانچ سو گز ہے ۔ ہوسکتا ہے
کہ تین سو یا چھ سو گز دور ہو ۔ علیٰ ہذا القیاس ۔
فی الحال فقط بڑھ کر ڈاک خانہ تک ہی رسائی سمجھئے!
قصور فاصلے کا نہیں، بلکہ اپنی کوتاہ بینی کا ہے ۔

ہ د

۵ - اگر یہ توقع پوری ہوگئی کہ ہلال صاحب مدینہ منورہ جا رہے ہیں، تو ان کی نیک بختی کی دلیل ہوگی۔ وہ دربار تو ہمیشہ کھلا ہی رہتا ہے۔ خواہ کوئی دین کے لئے وہاں جائے یا دنیا کے لئے۔ البتہ حاضری شرط ہے۔ مقصد دین ہو، تو خود بلاوا آتا ہے۔ ورنہ دھکیل دھکیل کر جانا یا بھیجا جانا پڑتا ہے۔ خدا کرے آنجناب کی کوشش کامیاب ہو۔

۶ - پیر فقیر کا یہ شکوہ بجا ہے کہ اسرار کی بنیاد یا عمل جو راز ہے میں وظیفے کے بجھ رہے۔ اس لئے اخباری بیان بازی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس سے نہ صرف پیر فقیر کے سلب مقام کا خطرہ ہے، بلکہ معتقد کو بھٹکنے کا پہلو بھی ابھر سکتا ہے۔ طویلے کی بلا بندر کے سر۔ یا گیہوں کے ساتھ گھن والی بات ایسے مواقع پر منطبق ہوتی ہے۔ کشف کرامت ذوق ہے۔ ورنہ محض استدراج ہے۔

۷ - جہاں تک صدارتی انتخاب کا تعلق ہے، صدر ایوب کی کامیابی نہایت اغلب ہے۔ یہ کامیابی ذاتی زیادہ اور جماعتی کم ہوگی۔ جماعتی کامیابی کا مرحلہ

ابھی باقی رہتا - اس کی آزمائش صوبائی اور مرکزی
اسمبلیوں کے انتخابات کے وقت ہوگی - ضرورت فقط یہی
نہیں کہ مسلم لیگ کی ذات ۲ جنوری کو کامیاب ہو، بلکہ
اصل مقصد یہ ہے کہ بعد ازاں ان کو اسمبلیوں بھی اس شکل
کی میسر آئیں کہ وہ ملک کا کاروبار بعنوان شائستہ چلا
سکیں - امید ہے کہ ۲ جنوری کے بعد اہل حق اور اہل
تدبیر اس پہلو کی طرف بھی توجہ فرمائیں گے -

۸ - پچھلے خط میں نے ہلال صاحب کے سلسلے میں حدوث
اتفاقات کا جو ذکر کیا تھا، وہ مطلق فاسد لا
نہیں تھا - بعض اوقات فراست کو مکاشفہ پر
فوقیت ہوتی ہے - مکاشفہ میں علم غیب کے دعوے
کی سی شکل ہوتی ہے جو عبدیت کے منافی ہے - اس لئے
اس میں خلل اور متناقض کا احتمال بھی زیادہ
ہے - فراست عین بشری خصوصیت ہے - اس لئے اس میں
بشری حدود کے اندر اندر غلطی کا امکان بھی بہت کم
ہے -

فراست بشری کا تقاضا ہے کہ جس کی لاٹھی
اس کی بھینس - اس حد تک مسٹر ہلال کو کوئی

اندیشہ نہیں۔ لیکن چونکہ بنیادی طور پر جذبۂ دین غالب
نہیں ہے، اس لئے ~~[illegible]~~ اتفاقات کے حوادث کو
نظرانداز کرنا بھی عقلمندی کے خلاف ہے۔ اتفاقی حادثے
کاروبارِ دنیا میں ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں، دین میں نہیں۔

دین کا دامن تھام لینے سے تقدیرِ الٰہی بدل
نہیں جاتی، بلکہ اس کا محل بدل جاتا ہے۔ جیسے
تزکیۂ نفس سے اخلاقِ طبیعہ نہیں بدلتے، فقط ان
کا محل ہی بدلتا ہے۔ مثلاً بخل۔ تزکیہ کے بغیر
نفس ہر جائز ناجائز صرف سے بچنا چاہتا ہے۔ لیکن
تزکیہ کے ~~بعد~~ بعد وہ اسراف سے تو ضرور بچتا مگر
زکوٰۃ سے نہیں۔ چنانچہ بخل کی طبع تو وہی، لیکن
اس کا محلِ وقوع بدل گیا۔

اسی انداز سے دین، لاعلمی، اتفاق،
حادثہ کے تعلق کو بھی سمجھ لیجئے۔

نیازمند
محمد شریف ارشاد

XV

قصيدة

أجل الورى للعاشقين مكمل ... وخير عباد الله جا بيت كامل

تخصص به الشهم الأريحي قلبه ... وحوى كل الفضل وقد سما على الأفاضل

هو السيد الشهم الهمام شهاب الذي ... غدا أنا في الأمثال كثير العقل

وقد حاز أنواع الكمالات كلها ... وفاق بها فخرا على كل كامل

فما من معال أو معالي حاله كذا ... وأين الثريا من يد المتناول

به اشرقت هالند حسن وبهجة ... كما اشرق بين مشرق ومنازل

من العنبر المعروف المكرمة داره ... هو ابن رسول الله خير الرسائل

زمان يحفى بالمسرة وأيت سبيله ... ويروي برأي منك عن النائل

له قصة يبدأ الحديث بذكرها ... ويصغي لها من كل حاكم وناقل

فان حلّ تقصیر بایامه منا   فانتم له اهل ونحن لها اهل
ولا فضل للحظ المنیع من بلا   کریم تخیّر الفضل لیس بباخل

بمقام ۳۳ - ایگلن روڈ -
لاہور چھاؤنی -
۱۷ فروری ۱۹۶۵ء

XVI



united nations educational, scientific and cultural organization
organisation des nations unies pour l'éducation, la science et la culture

place de fontenoy 75 Paris-7e

۴ مئی -

پیارے عمار -

السلام علیکم - وقت پر تو آپ کو میرا خط مل گیا ہوگا -
وہ خط رسمی نہ تھا - واقعی سویرا کے لیے میں نے آپ سے فریاد کی ہے، وہ شاید
میں صرف اپنی بیٹی کے لیے ہی کر سکتا - اللہ اسے خوش رکھے - آمین -

پیارے عمار، آپ کو معلوم ہے کہ میں اللہ کا نام لے کر اسرائیل چلا گیا تھا -
میرا جو مقصد تھا، وہ پورا ہو گیا یعنی ۱۱۵ کتابوں کا ثبوت لایا تھا، جو تاریخی اعتبار سے غلط
تھیں، اور جنھیں پڑھنے پر معصوم عرب بچوں کو تشدد کے ساتھ مجبور کیا جاتا تھا - اللہ کا
الحمد للہ شکر ہے کہ یو۔این۔ نے میرے ثبوت کو سچ مانا، اور آج ان میں سے ۱۱۳
کتابیں اسرائیلی نصاب سے خارج ہو چکی ہیں - دو کتابوں پر کچھ intellectual سا جھگڑا
ہے - وہ دن ... آج کا دن - اللہ، اللہ - غیب کا علم تو صرف خدا کے پاس ہے -
لیکن جس دن میں نے یونیسکو میں اپنے دورے کا اعلان کیا، اسی دن سے یہودیوں کے
روحانی اور روحانی جادوگروں نے مجھے بری طرح دبوچ لیا - مجھے بہت سے اچھے اور برے بھی روحانی
تجربے ہوئے ہیں - ان میں سے ایک خوفناک تجربہ ہمالہ کی روح کا تھا، جس کا ایک چھوٹا سا
حصہ میں نے ۱۸ - پیلی کوٹھی میں بیان کیا ہے - وہ تو ایک مری ہوئی مظلوم لڑکی کی چیخ و
پکار تھی، جو صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کی ہڈیوں کو اس کے اپنے دھرم کے مطابق سپرد
آتش کیا جائے — لیکن اب کے تو کچھ غضب کا واسطہ صیہونیت کے اس زندہ عفریت
سے پڑا، جو مادی اور دیگر اعوان پر ساری دنیا پر کسی نہ کسی طرح چھایا ہی ہوا ہے - جو کچھ
مجھ پر گزری، وہ کون سنے اور کون سنائے؟ میرے گوشت پوست کا ریشہ ریشہ



united nations educational, scientific and cultural organization
organisation des nations unies pour l'éducation, la science et la culture

Place de Fontenoy, 75 Paris

بنتے اور ٹوٹتے — مکڑی کے جالے کی طرح — بار بار
بنتے اور ٹوٹنے لگا۔ میرے تن بدن میں میری
ہڈی ہڈی کو سڑک کے پتھر توڑنے والے مزدور کھٹا کھٹ
کھٹا کھٹ توڑتے گئے۔ جب میں چلتا تھا، تو واقعی مجھے یوں لگتا تھا جیسے
کوئی ایک بازو، ایک پا، ایک چشم اپاہج ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے
بورے کو گھسیٹتا ہوا، گرتا پڑتا، گالیاں کھاتا، گالیاں دیتا،
اسی اپنے ایک پاؤں پر اسی ایک جگہ کھڑا ہو —

پیارے ثمار — میں کیسے بتاؤں مجھ پر کیا کیا بیتی — اور
کیسے کیسے بیتی۔ جب میں اپنے اندر خوشبو پاتا تھا، لوگ مجھ سے یوں
بھاگتے تھے جیسے میں سڑا ہوا کوڑھی ہوں — جب میں اپنے اندر بدبو
سونگھتا تھا، لوگ مجھے معطر سمجھتے تھے —— سوائے عفت اور ثاقب
کے — ثاقب تو خیر بچہ ہے۔ لیکن عفت تو بہرکیف ڈاکٹر بھی ہے۔ چند بار
وہ ضرور بیری کے سوالوں اور جوابوں سے دوچار ہوئی ہوگی۔ جتنی
دفعہ اس کی استہزائیہ نگاہوں نے مجھے گھورا، اور اس کی زخم خوردہ
خشمگیں نظروں نے مجھے الزاماً دیکھا بھی۔ لیکن خدا اسے خوش رکھے —
انجام کار اس نے مجھے وہ گردانا جو میں واقعی ہوں۔ یا نہیں ہوں۔
عفت واقعی گریٹ ہے — اس سے اچھی بیوی کسی کو مل ہی نہیں سکتی —



united nations educational, scientific and cultural organization
organisation des nations unies pour l'éducation, la science et la culture

place de Fontenoy, Paris

اس کشمکش سے تنگ آ کر ایک
روز میں نے اللہ میاں سے عرض کیا، کہ الٰہی تیری بے شمار
عادات میں سے ضرور یہ بھی ایک عادت ہوگی۔ بس میرے اللہ، تو یا اللہ تیری قسم
میں تو مرحلہ — اگر تو نے خودکشی حرام نہ قرار دی ہوئی ہوتی، تو خود
میں ضرور خودکشی کر لیتا — وہ دن اور آج کا دن۔ وہ جادو ٹوٹ
گیا۔ میرے کمروں کی چھتوں پر ٹائلیں دیکھی ہیں؟ اب ہر روز
یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہی سڑک کے پتھر کوٹنے والے مزدور
میرے ذہن کی شکستہ ٹائلوں کو توڑ کر اور سیمنٹ سے جوڑ جوڑ کر دوبارہ (کام چلاؤ)
ٹھونک رہے ہیں۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت!
یقین جانیے، توڑنے اور جوڑنے کے عمل میں تھوڑی
اذیت دونوں میں ہے۔ ایک میں درد کی۔ دوسرے میں لذت کی۔
برابر کی چلتی ہے!
اب آپ ادھر ادھر کی منصوبہ بنا رہا ہوں۔ اس کے
متعلق اگلے خط میں لکھوں گا۔ یہ خط عکسی کو بھی پڑھا دیجئے
ہو سکے تو جواب پیرس کے پتہ پر دیں۔ ۱۴ مئی تک یہاں ہوں۔
ورنہ دوسرا پتہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ آپ کا

23.6.71

پیرس -
۲۲ جون - ۷۱

پیارے ممتاز - السلام علیکم

آپ کا ۲۵ جنوری کا خط Wigmore ہی میں مل گیا تھا - چند روز بعد میں ایک ٹیسٹ پر پیرس آ گیا - کل واپس جا رہا ہوں - اب پھر Wigmore کے پتہ پر ہی لکھیں -

آپ کا خط پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی - یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آپ محض ذاتی تجربے کو اپنے لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے یا نہیں - میری تسلی ہو گئی ہے کہ آپ کا تجربہ کیا مفید ثابت ہو رہا ہے - اللہ کا شکر ہے کہ جب سے وہ کر چکا ہے - اس کی کشش دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے - قلبی، ذہنی اور روحانی زخم تو بالکل صحت یاب ہو گئے ہیں - لیکن جسم کی ٹیسیں آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں - جیسے ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑ جانے کے بعد بھی عرصہ دراز تک نرم ہی رہتی ہے -

اسرائیل کے دورے میں قدم قدم پر جو نوجوان میرا ساتھی اور رہنما تھا - وہ پچھلے ماہ اللہ کو پیارا ہو گیا - ۲۸ سال کا خوبرو بہت ہی ہشاش بشاش نوجوان جو کہ بہادر بھی تھا اور طلسمی بھی - جو سیماب کی طرح مضطرب اور فولاد کی طرح آہنی تھا - اور جو بڑے سے بڑے خطرے کے اوقات میں بھی کسی نہ کسی طرح نماز ادا کر لیتا تھا - وہ حقیقی مجاہد تھا - اور اب اپنی سرزمین کے لئے جہاد کر رہا تھا - پورے دس دن ہم کسی نہ کسی صورت میں ایک دوسرے سے وابستہ رہے - رفتہ رفتہ مجھے اس نوجوان میں ان بزرگوں کی صورت نظر آنے لگی جو جنگ احد یا جنگ بدر میں شہید ہو گئے - ایک روز میں نے اس سے کہا - کہ اگر مجھے کسی کے ہاتھ پر آج بیعت کرنی ہوتی، تو ضرور تمہارے ہاتھ پر کرتا - یہ سن کر وہ رو پڑا - اور کافی عرصہ تک بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا رہا - اس کے بعد اس موضوع پر ہم نے پھر کبھی کوئی بات نہ کی -

چند ہفتے ہوئے کہ اچانک مجھے یونیسکو کی معرفت بیروت سے ایک تار آئی - اس میں کہا گیا کہ وہ ہسپتال میں بیمار ہے - میں اسے اپنا ٹیلیفون نمبر بتاؤں کیونکہ وہ بات کرنا چاہتا ہے - میں نے بذریعہ تار اسے اپنا ٹیلیفون نمبر بھیجا - اگلے روز

صبح صبح ہسپتال کے کمرے سے اس کا فون آیا کہ کچھ اس قسم کی باتیں ہوئیں

میں: یا اخی، کیسے ہو؟

وہ: بیمار ہوں۔ الحمدللہ۔

میں: کیا بیماری ہے؟

وہ: کینسر۔

میں: علاج کیا ہو رہا ہے؟

وہ: لاعلاج ہے۔ الحمدللہ۔

میں: ہسپتال کب چھوڑ رہے ہو؟

وہ: انشاءاللہ کل یا پرسوں۔

میں: گھر کا پتہ بتا دو۔ تاکہ میں تمہاری خیریت سے آگاہی حاصل کرتا رہوں۔

وہ: گھر کا کوئی پتہ نہیں۔

میں: وہ کیسے؟

وہ: کل یا پرسوں جب میں ہسپتال چھوڑوں گا، تو انشاءاللہ اللہ کے حضور میں
اپنے گناہوں کا حساب دے رہا ہوں گا۔

یہ سن کر میں رو دیا۔ وہ ٹیلیفون پر قہقہہ مار کے ہنسا۔ اگلے روز خبر ملی کہ وہ مر گیا۔

اُسے کینسر کیوں ہوا؟ ایسے صحت مند جوان کو اچانک حادثے سے کیوں اُٹھا لیا گیا؟ ان سوالوں کا غالباً کوئی جواب نہیں سوائے اس کے کہ اللہ کی مرضی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس اللہ کے بندے، جواب سادی کلمہ ماردوں۔ فاں حق کی طرح کی۔

[illegible]

برمنگھم

۵ جولائی - ۱۹۶۹

عزیزی - السلام علیکم

قونیہ میں مولانا رومؒ کے مزار کی پیشانی پر مثنوی کی یہ رباعی درج ہے :-

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

مولانا روم بے شک عارف کامل تھے - لہذا انہوں نے جو کچھ کہا ہے صحیح ہی کہا ہوگا ---- پھر ڈر کس سوال کا ہے ؟

× × × × ×

یہاں پر بہت سے غریب الوطنوں کو مشرق والا کالم پسند ہے - اس لئے ارادہ ہے کہ اسے لکھتا رہوں - جہاں تک

گھوڑا پہاڑ اور نکلی چوہیا والا تاثر، وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ غلطی البتہ یہ ہے کہ رائی کو پربت سمجھ لیا جائے۔ ایسے پربت میں سے چوہیا تو بڑی بات ہے۔ کچھ بھی نکل آئے تو غنیمت ہے۔

× × × × ×

خصوصی کچھ والی باتیں اور سانپ یا مانگنا والی چیزیں فی الحال عالمِ خیال کا واہمہ ہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر صبر میں ثبات اور ایمان میں استحکام بخشتی رہا تو بردۂ غیب سے ایسے ایسے عجائب و غرائب نمودار ہو سکتے ہیں جو خواب و خیال کی دسترس سے بھی باہر ہوں۔

× × × × ×

آپ کے خط کا شوق سے انتظار رہتا ہے۔ پھر بھی اگلا خط بھائی جان سے ملنے کے بعد ہی لکھیں۔ عکسی کا حال احوال بھی لکھیں۔ اس ذکر کے بعد اسلام آباد سے اگلا خط میں ’’ایلی‘‘ کے سب کی کیفیت بتاؤں گی۔ عفت اور ثاقب خوش ہیں۔ والسلام

نیازمند قدرت اللہ

XIX

:)

11.7.69

1. I have purposely delayed my reply by a few days to avoid the temptation of rushing into trite sermonizing. It is quite easy to be extremely sensible and reasonable and objective about other people's love affairs. But it is different with those who are actually involved in it

2. I am writing this after picturing myself in the same boat in which you happen to be sailing up and down in the stormy ocean of desire

3. This is quite a natural episode and it can happen to normal human beings alone. Remorse is good only if it does not become morbid. Morbid remorse can be much more corroding than outright sin.

4. Sex-sin is an affair between man, woman and God. If it gets committed without flourishing it as a virtue, and, if, later, it causes remorse in the innermost

recesses of the conscience, then the whole thing can be left to the Inscrutable mercy of God. In this context, it is good to take solace from Maulana Rumi's lines I had quoted in my previous letter:

باز آ باز آ هر آنچه هستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
این درگه ما درگه نومیدی نیست
صد بار اگر توبه شکستی باز آ

5. But once sex-sin descends to the level of <u>violating human rights of people</u> other than the man and woman involved, it becomes an offense against society, and, as such, culpable by Divine as well as social and penal laws. This must be avoided.

6. In my judgment, all thoughts and possibility of <u>marriage must be fully and irrevocably averted</u>. Family circumstances

on both sides are such, that matrimony cannot but fall in the purview of para 5 above: Weighing in the scale of prudence, adherence to para 4 in the oft repeated commission of sin will be far preferable to the complex consequences of para 5 emanating from marriage. At our age and maturity we ought to be able to abide by this simple arithmetical calculation.

7 I am emphasising against matrimony because this thought can spring at any time on the crest of desire, love, sex, compassion or just self-pity and motherly remorse. So be on the guard.

8 Please keep me informed at short intervals. Write in symbols because there is no need for anybody else to know anything about it.

9 It is easy to enter the

realm of God's grace — <u>but it is exceedingly difficult to fall out of it</u>: Frail mortals may violate divine injunctions a hundred times, but if it is not in a spirit of <u>wilful defiance</u> — there is always hope. The faintest flicker of healthy fear and remorse in the unfathomable depth of consciousness keeps this hope alive. It is small things — like these flickers — that swing the pendulum of man's faith and destiny. So be of good cheer.

9. I no longer insist that you meet Bhai Jan immediately. Take your own time. Meanwhile, write to me quite frequently.

Q

-XX-

شیخ ۔
جدہ

۲۰ دسمبر ۱۹۶۵ء

محترمی ۔ السلام علیکم

آپ کے دونوں خطوط مورخہ ۱۲ اور ۱۵ دسمبر آج اکٹھے ملے۔

۲ ۔ حج کے لئے درخواست دیدیں ۔ اگر نام نکل آیا تو حج کا پاسپورٹ بھی اکٹھے ملے گا اور فارن ایکسچینج بھی ۔ اس صورت میں آپ کسی ایسے سمندری جہاز سے روانہ ہوں ۔ جو ۲۰ مارچ کے قریب جدہ پہنچتا ہو ۔ وہاں پر اکٹھے ہو جائینگے ۔

۳ ۔ اگر قرعہ میں نام نہیں نکلتا تو نہ سہی ۔ آپ اپنا انٹرنیشنل پاسپورٹ بروقت تیار کرا رکھیں ۔ یہی کام آئیگا ۔ جب غالباً فارن ایکسچینج نہ دلا سکیں گے ۔ نہ سہی ۔ اس سے صرف

یہ پیش کہ وہ ٹیپ ٹیک سے آپ کو باہر کے
سفر کی اجازت دلوا دے - بغیر ایکسچینج کے
آپ نے چونکہ ہمارے ساتھ ہی ہونا ہے اس لئے
exchange وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے گی۔

۴- آپ American Express والوں سے
بات چیت شروع کریں کہ مندرجہ ذیل رستے کا ٹکٹ
بنوانا ہے:

Karachi —> Beirut
Beirut —> Jedda
Jedda —> Beirut
Beirut —> Amsterdam —> London —>
—> Paris — Amsterdam —> Karachi

کراچی سے یوں چلیں کہ 26 یا 27 مارچ
کو بیروت پہنچ جائیں - بیروت کے بعد باقی
ساری bookings کو Open رکھوائیں۔

۵- ہم انشاءاللہ ۲۷ مارچ کی شام
کو بیروت پہنچ جائیں گے۔ اور ۲۸ کو جدہ
روانہ ہوں گے - بیروت سے جدہ اور جدہ سے بیروت

کی bookings اپنے لئے اور آپ کے لئے بھی کروا
دی ہوئی ہیں - ~~[illegible]~~ جب آپ کا ٹکٹ بن جائیگا
تو وہیں بیروت bookings کو بیروت بھیج کر
confirm کروالیا جائیگا - اس کے بعد پروگرام
آگے رکھیگا -

٦ - امریکن ایکسپریس سے بات کرکے لکھیں
کہ اپنے ٹکٹ پر کیا خرچ ہوگا - پاسپورٹ جب
renew ہو جائے تو اس پر لبنان، سعودی
عرب، وغیرہ کے ویزا لینے ہونگے. جو مارچ
اور اپریل کے مہینوں کے لئے Valid ہوں - اس
میں جیب سے مدد لیں -

٧ . ہم اپنا پروگرام اس قسم کا بنا رہے ہیں -

٢٧ مارچ . امسٹرڈم سے بیروت
٢٨ مارچ . بیروت سے جدہ
—
١٦ اپریل . جدہ سے بیروت -
. بیروت سے امسٹرڈم

انشاءاللہ

۸ ۔ جی یہی چاہتا ہے کہ تذکرہ میں آپ کا نام نہ لکھے ۔ تاکہ بروقت سے ہی چھپا تیار ہو ۔ تاہم درخواست دینا بھی ضروری ہے ۔ اس لئے ضرور دیں ۔

۹ ۔ حج کے بعد شاید آپ کو تھوڑا سا عرصہ اِن اطراف میں گزارنا پڑے ۔ کتاب کے سلسلے میں ۔ اس لئے دیکھ لو یا ۲۷ سے جو آفر آئے ، اس میں وسط مارچ سے تین چار ماہ کی گنجائش رکھیں ۔ اگر اس وقت تک کوئی آفر نہ آئے ، تو اور بھی اچھا ہے ۔ واپسی کے بعد دیکھا جائیگا ۔

بھائی جان واسا لیں جی سے بھی اس پروگرام کی تصدیق کرالیں ۔

والسلام

نیازمند

قدرت اللہ شہاب

XXI

اسلام آباد
۲۸ مئی ۸۶ء

برادرِ عزیز۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط ملا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، آپ کا کوئی بھی خط ایسا نہیں ملا جس کا میں نے جواب نہ دیا ہو۔

والد صاحب کی تعزیت کا شکریہ۔ اگرچہ جیلی صاحب ملتان میں ہوں، تو میری جانب سے ان کا شکریہ ضرور ادا کر دیں۔

کوئی بتا رہا تھا کہ کسی اخبارات کے کالموں میں بھی ادبِ لطیف والے مضمون کا تذکرہ ہوا ہے۔ میری نظر سے بہت سے اخبار نہیں گزرتے۔ اگر آپ نے پڑھے ہوں اور زحمت نہ ہو تو مجھے ان کے تراشے بھی ارسال کر دیں۔ مفتی صاحب ایسے مواد کو بڑے اہتمام سے جمع کرتے رہتے ہیں۔

رمضان شریف کی ۲۱، ۲۳، ۲۵ اور ۲۷ راتوں کو اگر ممکن ہو، تو ہر رات زیادہ سے زیادہ جاگیں۔ بے شک نیند دن کے وقت پوری کر لیں۔

ہر رات اپنے روزمرہ معمولات کے علاوہ مندرجہ ذیل بھی پڑھیں:

(۱) نوافل۔ کم سے کم ۱۲۔ اس سے زیادہ جتنے ممکن ہوں۔

(۲) قرآن شریف کی تلاوت۔ خاص طور پر سورۂ فاتحہ، سورۃ الانبیاء، سورۃ یٰسین، سورۃ صٰفّٰت (یہ سورت یٰسین کے بعد ہے)، سورۃ واقعہ، سورۃ رحمٰن، سورۃ مزمل، سورۃ مدثر، اور چاروں قل۔ اول آخر درود شریف جتنا آسانی سے پڑھا جا سکے۔ اگر ایک رات میں یہ سب نہ پڑھ سکیں، تو ۲۱، ۲۳ اور ۲۵ ویں راتوں میں تقسیم کر کے پڑھ لیں۔ البتہ ۲۷ ویں رات کو پورا پڑھیں۔

سحری کھا کر فجر کی نماز سے پہلے دعا مانگیں۔ مجھے بھی یاد رکھیں۔ شکریہ۔

جب یہ سب معمولات پورے ہو جائیں تو رمضان شریف کے بعد اطلاع دیں۔ (دستخط)۔

نیاز مند

قدرت اللہ شہاب

XXII

26/6/83
5:30 pm

ر ب -
۲۶ جون ۸۳

محترم عثمانی مفتی صاحب -

السلام علیکم - کل صبح میں آپ کی طرف آنے والا تھا ٹیلیفون پر معلوم ہوا کہ آپ رفیق صاحب سے ملنے پنڈی گئے ہوئے ہیں - یہ بھی معلوم ہوا کہ شاید رفیق صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی - اللہ تعالیٰ انہیں شفا عطا فرمائے -

نفی اثبات کا ورد ذکر کرنے کے لئے آپ کے لئے ایک نہایت آسان طریقہ سمجھ میں آگیا ہے - اس میں نہ کوئی وقت، اور نہ کوئی جگہ مقرر کرنے کی ضرورت ہے - کسی خاص طریقے پر بیٹھنا بھی نہیں - جس وقت آپ فارغ ہوں، فوراً سانس باہر نکالتے ہوئے (exhale) خاموشی سے زبان بند کر لا اِلٰہ کہیں - اور سانس اندر کی طرف لاتے ہوئے (inhale) اسی طرح خاموشی سے زبان بند کر اِلّا اللہ کہیں - اسی طرح ہر سانس کو exhale کرتے ہوئے لا اِلٰہ اور inhale کرتے ہوئے اِلّا اللہ کہتے رہیں - اسے پاس انفاس کہتے ہیں - یہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، یا لیٹے ہوئے فارغ اوقات میں کرتے رہیں - اس کو اس طرح پکائیں کہ یہ بالکل عادتِ ثانیہ بن جائے - جہاں فرصت ہوئی وہیں سانس کے آنے جانے میں خود بخود نفی اثبات شروع ہو گیا - صرف غسل خانے میں حاجات ضروریہ کے وقت ایسا نہ کیا جائے - کچھ لوگ اس کی ایسی مشق بہم پہنچاتے ہیں، کہ غسل خانے میں زبان دانتوں تلے دبا کر رکھتے ہیں تاکہ ذکر جاری نہ ہو جائے - وضو کی کوئی قید نہیں -

اگلے جمعہ تک خوب مشق کریں، اور بتائیں کہ کوئی مشکل تو درپیش نہیں آ رہی - اگر اس کی مشق کسی قدر بھرپور حاصل ہو جائے تو ساری عمر کے لئے سب امور کے لئے کافی ہے - والسلام

نیازمند
قدرت اللہ شہاب

XXIII

پیپ -

9 اپریل 65

مکرمی - السلام علیکم -

دونوں خط ملے - عکسی کے نام ایک خط لف ہے - اگر اس سے کام نہ نکلے، تو مناسب ڈرافٹ تجویز کر دیں تاکہ اسی کے مطابق لکھا جائے -

۲ - والی پر خوب فضل ہوا - کبھی کبھی سیاست بھی بہت کام آتی ہے - شیخ کے ساتھ بات چیت تو ہوتی رہتی، خدا کرے والی کو اس حاضری کا خاطر خواہ فائدہ ہو -

۳ - عرس میں میری طرف سے ایک سو ایک روپے حاضر ہیں - بھائی جان سے اجازت لے کر شامل کر لیں - جواب آنے پر چیک بھیج دوں گا -

۴ - فنی اعتبار سے "درود شریف جاری" ہونے کے کئی طریق ہیں - ایک عام اور سیدھا سادا راستہ تو یہ ہے کہ ہر وقت چلتے پھرتے، کام کرتے، بے کار بیٹھے،

با وضو بلا وضو جب خیال آئے کوئی سا بھی درود جو یاد ہو مسلسل پڑھتا رہے۔ دوام کے ساتھ ساتھ کثرت بھی لازم ہے۔ اس میں دیر لگتی ہے۔

دوسرے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے:

(۱) درود تاج ۔ سوا لاکھ (ایک رات میں)

(۲) درود تنجینا ۔ سوا لاکھ (دوسری رات میں)

(۳) نماز والا درود ۔ سوا لاکھ (تیسری رات میں)

تین راتوں میں جب یہ تعداد پوری ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ درود شریف کی زکوٰۃ نکل گئی۔

اس کے بعد دن رات میں درود خضری کم از کم چوبیس ہزار ہر دفعہ ضرور پڑھا جائے۔ خواہ ایک مجلس میں یا تھوڑا تھوڑا کر کے کئی بار میں۔ یہ ضابطہ چالیس دن تک لازمی ہے۔ اس کے بعد اگر درود خضری جب ورد میں جاری رہے تو ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ یا یک بیک ہر بن مُو سے درود کا ذکر جاری ہونے کا راستہ کھل جائے۔

درود تاج اور درود تنجینا کتابوں میں درج ہیں۔ خاص طور پر تاج کمپنی نے چھوٹے چھوٹے کتابچے

ے

شائع ہوئی ہیں، متعدد درود شریف وغیرہ، ان میں موجود ہیں۔

درودِ خضری یہ ہے:

~~صلی اللہ علیہ~~

صَلّی اللّٰہُ علیٰ حبیبہٖ محمّدٍ و آلہٖ وسلّم ٥

(اس کے اعراب اور تلفظ کسی عربی دان سے پوچھ لیے جائیں)

اگر مندرجہ بالا طریق کار پر پوری طرح عمل نہ ہو سکے،

تو حسبِ توفیق درودِ خضری کا ورد کرتے رہنا بھی مفید ہے۔

سنی طریقے اور بھی ہیں۔ لیکن وہ زیادہ دقیق

ہیں اور زیادہ مشقت طلب ہیں۔

دستخط

نیازمند

محمد شہاب الدین

XXV

4, Viners Close,
Sittingbourne Kent U.K.
10.1.74

پیارے ممتاز - السلام علیکم

آپ کا خط اور رسالہ امین قلب کے ذریعہ پہنچا - مفصل جواب چند روز میں دونگا - یہ محض رسید ہے - امید ہے کہ بیگم اور والدہ صاحبہ کی طبیعت بہتر ہو گی -
ہم یہاں پہنچے تو عفت کوما میں تھی - پانچ چھ روز تک تو قلب کو اسکے کمرے میں جانے تک کی اجازت نہ ملی - اس بار حملہ بے حد شدید تھا - لاہور سے کئی سو گنا زیادہ - دو روز میں بیچاری کا دل بارہ مرتبہ رکا - مشینوں سے revive کیا گیا - خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی - اب رو بصحت ہے - ابھی چھ سات ہفتے اور ہسپتال میں رہنا پڑیگا -

قاسم محمود کو فون کر دیں کہ اس کا خط مل گیا ہے - اس بار پوری قسط لوٹا کر بھیجونگا - البتہ قارئین کے نام ایک دو ڈھائی صفحے کا معذرت نامہ پرسوں ایرمیل سے اسے بھیج دونگا - اسے چھاپ دے - میرا پہلا خط نہ چھاپے - سیارہ کے اب دو ہفتے میرے نئے خط کے لئے رکھ چھوڑے - اس کے بعد انشاءاللہ باقاعدہ بھیجا کرونگا - یہ بات اسے ذرا جلدی کہہ دیں -

آپکی کتاب جبر کے نام پیرا از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے - اگلے خط میں کچھ تجاویز بھیجونگا - اور رد بدعت کے لئے دیباچہ بھی - صدیق راہی کا خط آیا ہے - اسے کہیں کہ کرسی میز کے لئے زیادہ نہ گھبرائے - خاموشی سے کام کرے اور سیکھے - اس لائن میں اچھا رہیگا - ثنا کو بھی یہی سمجھا دیں - ثنا ادب مجیب ہے - باقی پھر - اکل دوت جلدی میں ہوں - ہسپتال جانا ہے جو یہاں سے ۱۸ میل دور ہے - والسلام

آپکا

Lahore

5 Jul. 90

جناب مفتی صاحب!

السلام علیکم! محبت نامہ ملا۔ ضمناً غلطی ایسی ہے جرم لینے کو جی چاہتا ہے۔
اگر سوال کی اجازت ہوتی تو آپ سے آپ کا خط مانگ لیتا۔
جناب! آپ کی کتاب انگریزی تو مکمل ہو چکی۔ اس صفحے ہی مجھے جب
آپ فقیر کے ڈیرے تشریف لائے تھے۔ اب تو ایک سے آگے
کی بات ہوتی ہے۔

مفتی صاحب! تصوف یا روحانیت پر کتاب آپ کے ذمے
قرض ہے اور قرض زیادہ ہو تو ادا نہیں ہوتا۔ کتاب لکھتے وقت
احتیاط کیجئے گا کہ مبالغہ آرائی نہ ہونے پائے کہ اسی نے
تعلیم یافتہ ذہنوں کو تصوف سے دور کر دیا حالانکہ یہ
شرع پر سو فیصد عمل درآمد کی ایک راہ تھی۔ تاریخ اس
پر گواہ ہے۔ فقیروں نے کوئی وسائل نہ ہوتے ہوئے بھی تن تنہا
لاکھوں کفار کو مسلمان کر لیا۔ اس کے برعکس کوئی مولوی آج
تک صرف ایک غیر مسلم کو مسلمان نہ کر سکا اپنے تمام تر وسائل

کے باوجود۔ امید ہے آپ کی کتاب تصوف یا روحانیت کے بارے
میں اگر شکوک کو صاف کردے گی۔ اور یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔
امید ہے ان دنوں آپ کی طبیعت ٹھیک ہوگی۔ خالدہ کا خط ملا ہے
بیگم صاحبہ کی طبیعت کیسی ہے۔ تحریر کیجئے گا۔
حیرت ہے آج آپ کو خط لکھتے وقت بھی نہیں گئی۔ ورنہ
تو ہمیشہ آپ کو خط انگریزی میں لکھا گیا۔ معلوم نہیں آپ
کو سمجھ بھی آیا کہ نہیں۔ یا آپ مروت ہی میں برداشت کرتے رہے۔

راقم
[illegible]


I.S.B.N. 969-503-077-7
الفیصل
ناشران و تاجران کتب
اردو بازار لاہور